....اور ایک بُت شکنؒ پیدا ہوا

(حصّہ اوّل، حصّہ دوم)

(سلطان محمود غزنوی کے جہاد اور جاسوسوں کی جذباتی اور واقعاتی داستان)

عنایت اللہ

....اور ایک بُت شکن پیدا ہوا

جلد اول

(پہلا اور دوسرا حصہ)

سلطان محمود غزنوی کے جہاد اور جاسوسوں کی جذباتی اور واقعاتی کہانیاں

عنایت اللہ

علم و عرفان پبلشرز

34۔ اردو بازار، لاہور، فون 7232336 فیکس 7352332
www.ilmoirfanpublishers.com E-mail ilmoirfanpublishers@hotmail.com

نام کتاب	.... اور ایک بت شکن پیدا ہوا (جلد اوّل، جلد دوم)
مصنف	عنایت اللہ
ناشر	گلفراز احمد علم و عرفان پبلشرز، لاہور
مطبع	زاہد نوید پرنٹرز، لاہور
سرورق	فضیل کیانی
سن اشاعت	جون 2008ء
قیمت	-/300 روپے

علم و عرفان پبلشرز

34۔ اردو بازار، لاہور فون: 7232336، 7352332

سیونتھ سکائی پبلیکیشنز

غزنی سٹریٹ الحمد مارکیٹ 40۔ اردو بازار، لاہور

فون 7223584، موبائل 0300-4125230

فہرست

اور ایک بت شکن پیدا ہوا	۱۴
جب مسلمان مسلمان سے ٹکرایا	۵۶
دو مائیں	۸۷
مذہب، مجرم اور مجاہد	۱۱۰
ایک ہی منزل کے مسافر	۱۵۱
بہشت ایک رات کی	۲۰۹
باپ کا پاپ	۲۳۵
چار کنواریوں کی حویلی	۲۵۸
حق جب باطل کے نرغے میں آیا	۲۸۳
جب دشمن پر اعتبار کیا	۳۲۹

پیش لفظ

"داستان ایمان فروشوں کی" کے اس سلسلے کا تعلق سُلطان محمُود غزنوی کے دورِ کے ساتھ ہے۔ دس کہانیوں کا پہلا مجمُوعہ پیش کیا جارہا ہے۔ سلطان محمُود غزنوی کے متعلق کچھ وضاحتیں بہت ضروری ہیں۔

سب سے پہلے اُس بے انصافی، دھاندلی اور تعصّب کی تفصیل سُن لیں جس سے سُلطان محمُود غزنوی کی شخصیت اور جہاد کی تاریخ مسخ کی گئی ہے جن تاریخین نے انگریزوں کے دورِ حکومت میں دس جماعتیں پاس کی ہیں، انہیں ہندوستان کی تاریخ میں سلطان محمُود غزنوی کے سترہ حملے پڑھائے جاتے تھے۔ نمایاں تاثر یہ دیا جاتا تھا کہ محمُود غزنوی لُوٹ مار کے لیے ہندوستان آتا تھا اور بے انداز زر وجواہرات اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔ دلیل یہ دی جاتی تھی کہ اُس کا مقصد لُوٹ مار نہ ہوتا تو وہ یہاں بیٹھ کر حکومت کرتا جس طرح اس کے بعد آنے والے مسلمانوں نے کی تھی۔

یہ صحیح ہے کہ اُس کے بیشتر حملے ہندوستان کے بڑے بڑے مندروں پر ہوتے تھے جہاں کے وہ بُت توڑ کر واپس چلا جاتا تھا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ مندروں میں اُس دور میں زر وجواہرات مہاراجوں کے خزانوں کی نسبت زیادہ ہوتے تھے، اس لیے تاریخ میں یہ مفروضہ شامل کر لیا گیا کہ سُلطان محمُود مندروں پر صرف زر وجواہرات کے لیے حملے کرتا تھا۔ اس مفروضے کے ساتھ یہ جھُوٹ شامل کر لیا گیا کہ بعض بُت بہت بڑے سائز کے تھے جو اندر سے کھوکھلے تھے۔ ان کے اندر خزانے بھرے ہُوتے تھے۔

تھانیسر اور سومنات کے بڑے بُتوں کے متعلق خاص طور پر لکھا گیا ہے کہ ان کے اندر سونا بھرا ہوا تھا اور سونے کے لیے ہی سُلطان محمُود نے یہ بُت توڑے تھے۔ غیر جانبدار اور غیر متعصّب مؤرخوں نے (جن کا تعلق یورپ سے تھا) اصل حقیقت بیان کی ہے۔ اُنہوں نے لکھا ہے کہ تمام بُت ٹھوس تھے۔ ان میں سے جو زیادہ اہم اور مقدس تھے، وہ بھی مٹی کے بنے ہُوتے تھے اور ان پر کانسی چڑھائی گئی تھی۔ تھانیسر کے بُت کو سُلطان اپنے

ساتھ غزنی لے گیا تھا اور اسے توڑ کر اس کے ٹکڑے گھوڑ دوڑ کے میدان میں پھینک دیتے تھے۔

سومنات کے بُت کے متعلق غیر متعصّب مؤرخوں نے لکھا ہے کہ سلطان نے اس کے دو ٹکڑے کیے، پھر دو کے چار، چار کے آٹھ، آٹھ کے سولہ اور سولہ کے بتیس ٹکڑے کر کے انہیں باہر پھینکا اور ان پر سے اپنی فوج گزاری تھی۔

انگریزوں کے دورِ حکومت میں نصابی کتابیں ہندو مصنّفوں کی لکھی ہوتی تھیں۔ انگریزوں کا محکمۂ تعلیم ان کتابوں کو منظور کر لیا کرتا تھا کیونکہ خود انگریز کی دلچسپی اس میں تھی کہ مُسلمانوں کی تاریخ کو مسخ کیا جائے۔ انگریزوں نے خود بھی ہماری تاریخ کا چہرہ مسخ کیا۔ سید احمد شہیدؒ کو ڈاکو کہا اور ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کو "ہندوستانی سپاہیوں کا غدر" کہا۔ کلکتہ کا "بلیک ہول" انگریزوں کا من گھڑت اور بے سر و پا قصّہ ہے۔ انگریزوں نے اپنے اس خدشے کو چھپا کر بھی نہیں رکھا کہ ہندوستان میں حکومتِ برطانیہ کے لیے اگر کوئی قوم خطرہ بن سکتی ہے تو وہ مُسلمان ہیں۔ انگریز کا یہ خدشہ صحیح ثابت ہُوا۔

ہندو سُلطان محمُود غزنوی کو مردِ مجاہد اور بُت شکن کیوں کہتے؟ ہندو تاریخ دانوں نے اورنگ زیب عالمگیر کے ساتھ بھی یہی سلُوک کیا ہے۔ اُنہوں نے انگریزی حکُومت سے یہ فائدہ اُٹھایا کہ سُلطان محمُود کے جہاد کو گھناؤنے طریقے سے نصابی کتابوں میں شامل کیا۔ یہی کتابیں مسلمان بچے بھی پڑھتے رہے۔ سلطان محمُود کی تاریخ کو سترہ حملوں تک محدود رکھا گیا۔

پاکستان معرضِ وجود میں آیا تو بھی وہی نصاب رائج رہا اور سلطان محمُود غزنوی کی سترہ حملوں کی وجہ سے ہی جانا پہچانا جاتا رہا۔ اب بھی آپ کو نصابی کتابوں میں وہی کچھ ملے گا جو انگریزوں کے دور میں لکھا گیا تھا۔ پاکستان میں نصابی کتابیں لکھ کر سکولوں کالجوں کے لیے منظور کرانا ایک کاروبار ہے۔ اس میں لین دین کا خیال رکھا جاتا ہے، کھایا پیا جاتا ہے۔ یہ نہیں دیکھا جاتا کہ ان میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ کہاں تک مُستند ہے اور بچّوں پر اس کے کیا اثرات مُرتب ہوں گے۔

نصابی کتابوں کے علاوہ (آزادی سے پہلے) جو کتابیں عام مطالعہ کے لیے لکھی گئیں، ان میں بھی سُلطان محمود کو لٹیرا ہی ظاہر کیا گیا۔ یہ زہر پاکستان میں بھی پھیلایا گیا۔ مثلاً ۱۹۷۰ء میں

پاکستان میں انگریزی زبان میں ایک کتاب چھپی ہے جو ۱۹۲۷ء میں ہندوستان میں چھپی تھی۔ اس کا مصنف محمد حبیب بی۔ اے (آکسن) ایم۔ ایل۔ سی ہے جو علی گڑھ یونیورسٹی میں تاریخ اور سیاسیات کا پروفیسر رہ چکا ہے۔ یہ کتاب سلطان محمود غزنوی کی زندگی، اس کے کردار اور اس کے کارہائے نمایاں کا ایک تجزیہ و مطالعہ ہے۔ پیش لفظ میں اس مسلمان مصنف نے لکھا ہے کہ مسلمانوں نے سلطان محمود غزنوی کو برگزیدہ شخصیت سمجھنا شروع کر دیا ہے جس سے مصنف (محمد حبیب) کو بہت تکلیف ہو رہی ہے۔ اس مصنف نے کتاب میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ:

○ محمود غزنوی اپنے باپ سبکتگین کا بیٹا نہیں تھا اور یہ اُسے خود بھی شک تھا جس سے وہ بہت پریشان رہتا تھا۔

○ محمود غزنوی ایک لونڈی کے بطن سے پیدا ہوا تھا جو سلطان کے باپ سبکتگین کی بیوی نہیں تھی۔

○ محمود غزنوی کو فروغ و تبلیغِ اسلام کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ لادینیت میں یقین رکھتا تھا۔

○ محمود غزنوی ہندوستان میں لوٹ مار کے لیے آیا کرتا تھا۔

○ محمود غزنوی روزِ حساب پر یقین نہیں رکھتا تھا۔

○ محمود غزنوی نے مرتے وقت لوٹی ہوئی تمام دولت کا اپنے سامنے ڈھیر لگوایا اور وہ بہت رویا۔

○ محمود غزنوی عام شہزادوں جیسا شہزادہ تھا اور شراب اور عورت کا شیدائی تھا

○ محمود غزنوی صرف ہندوؤں کے خلاف ہی نہیں لڑا بلکہ وہ مسلمانوں کے خلاف بھی لڑا کیونکہ اُس کا مقصد اپنی سلطنت کی توسیع تھا۔

اور ایسے ہی کچھ اور الزامات ہیں جو صرف ایک مصنف نے نہیں، بہت سے مصنفوں نے محمود غزنوی پر عائد کیے ہیں۔ ہمارے بچے اگر ان الزامات سے واقف نہیں تو پھر بھی سلطان محمود غزنوی کے متعلق اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتے کہ اُس نے ہندوستان پر سترہ حملے کیے تھے۔

سلطان محمود غزنوی اگر واقعی بُت شکن تھا اور وہ ہندوستان میں اسلام پھیلانا چاہتا تھا

تو اُس نے یہاں بیٹھ کر حکومت کیوں نہ کی؟ — اس سوال کا جواب آپ کو ان کہانیوں میں ملے گا جو ہم پیش کر رہے ہیں۔ وہ جب ہندوستان میں آتا تھا تو پیچھے مسلمان حکمران غزنی کی سلطنت پر کہیں نہ کہیں حملہ کر دیتے تھے۔ سلطان صلاح الدین ایوبی کی طرح سلطان محمود کے بھی اپنی قوم میں دشمن موجود تھے جو اس موقع کی تلاش میں رہتے تھے کہ سلطان اِدھر اُدھر ہو تو غزنی پر قبضہ کر لیا جائے۔ ہندوستان میں ہر فتح کے ساتھ ہی اُسے پیغام ملا کرتا تھا کہ غزنی پر فلاں نے حملہ کر دیا ہے۔ یہ ایک مسلسل خانہ جنگی تھی جو سلطان محمود کو لڑنی پڑی۔ وہاں ایمان فروشوں کی کمی نہیں تھی۔ انہوں نے سلطان محمود کو کبھی مہلت ہی نہ دی کہ وہ ہندوستان میں باقاعدہ اپنا دارالحکومت قائم کر سکتا۔

یہ تو کہا گیا ہے کہ سلطان محمود نے ہندوستان پر حملے کیے تھے مگر یہ کم ہی کتابوں میں لکھا گیا ہے کہ ہندوؤں نے غزنی پر کتنے حملے کیے تھے۔ حملوں میں پہل ہندوؤں نے کی تھی۔ راجہ جے پال نے غزنی پر پہلا حملہ سلطان سبکتگین کے دورِ حکومت میں کیا تھا۔ سلطان سبکتگین کی زندگی نے وفا نہ کی۔ اُس نے اپنے بیٹے سلطان محمود کو وصیت کی تھی کہ ہندوستان کے مہاراجوں کی جنگی قوت سے اپنی سلطنت کو بچانا چاہتے ہو تو انہیں چین سے نہ بیٹھنے دینا۔ وہ غزنی کو نہیں اسلام کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ اگر غزنی ہاتھ سے نکل گیا تو ہندو عیسائیوں کے ساتھ اتحاد کر کے خانہ کعبہ تک پہنچیں گے۔ یہ خیال رکھنا کہ تمہارے حملے انتقامی جذبے کے تحت نہ ہوں بلکہ ان کا مقصد بُت پرستی کا خاتمہ ہو۔ ہندوستان میں محمد بن قاسم کے وقت کے مسلمانوں کو زبردستی ہندو بنایا جا رہا ہے تم ہندومت کا خاتمہ کر دو۔

البیرونی، فرشتہ، گردیزی، عطبی، بیہقی اور ان جیسے کئی اور مؤرخوں نے متفقہ طور پر لکھا ہے کہ سلطان محمود غزنوی اولیا کا معتقد تھا اور وہ اس وقت کے ایک ولی شیخ ابوالحسن خرقانی کا مرید تھا۔ اُس وقت کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ سلطان شیخ خرقانی کے ہاں جایا کرتا تھا لیکن اُس نے کبھی بھی یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ وہ خود سلطان محمود ہے۔ وہ خرقانی کے ہاں اپنے آپ کو سلطان محمود کا قاصد یا ایلچی ظاہر کیا کرتا تھا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ ایک بار شیخ ابوالحسن خرقانی نے اسے پہچان لیا تھا اور یہ کہا تھا — "مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ غزنی کا سلطان اپنا قاصد خود بن کر آتا ہے۔ یہی مسلمان کی شان ہے۔"

اُس وقت کی تحریروں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ سلطان محمود قرآن کا طالب علم اور مذہبی علوم کا شیدائی تھا۔ ایک یورپی مورخ نے یہ بھی لکھا ہے کہ میدان جنگ میں اس کی فوج ہمیشہ تھوڑی ہوتی تھی اور اکثر یوں ہوا کہ وہ دشمن کے ہاتھوں تنہا ہونے لگا۔ یوں لگا کہ شکست صاف نظر آنے لگی۔ ایسے وقت اس نے سر بار یوں کیا کہ گھوڑے سے کود کر اترا اور قبلہ رو ہو کر دو رکعت نفل پڑھے، دعا مانگی اور گھوڑے پر سوار ہو کر بلند آواز سے اعلان کیا —— "مجھے خدا نے اشارہ دے دیا ہے، فتح ہماری ہے" —— اور ہر بار فتح اسی کی ہوئی۔

سلطان صلاح الدین ایوبی جہاں کہیں حملہ کرتا جمعہ کے مبارک روز کیا کرتا تھا اور وقت وہ مقرر کرتا جب مسجدوں میں جمعہ کا خطبہ دیا جا رہا ہوتا تھا۔ سلطان محمود غزنوی ہر حملے سے پہلے میدان جنگ میں دو رکعت نفل پڑھا کرتا تھا۔

"داستان ایمان فروشوں کی" کے اس سلسلے سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ محمد بن قاسم کے بعد ہندوستان میں اسلام کی شمع روشن کرنے والے سلطان محمود غزنوی کے صحیح حالات زندگی اور جہاد کی مکمل تفصیلات پیش کی جائیں تاکہ سلطان کے خلاف جو بے بنیاد پروپیگنڈہ کیا گیا ہے، اسے افسانہ نہ سمجھا جائے۔

بعض قارئین نے سلطان محمود کی اس سلسلہ وار داستان کا موازنہ سلطان صلاح الدین ایوبی کی کہانیوں سے کیا اور دونوں میں ایک فرق کو محسوس کیا ہے۔ جواب میں عرض ہے کہ عزم اور عقیدے کے لحاظ سے دونوں سلطان ایک جیسے تھے۔ سلطان ایوبی صلیبیوں کے خلاف لڑتا رہا اور سلطان محمود کی زندگی اسلام کے دوسرے بڑے دشمن ہندو کے خلاف لڑتے گزر گئی۔ دونوں کو یورپی مورخوں اور موجودہ دور کے جنگی مبصروں نے دنیا کے بہترین جرنیل کہا ہے۔ دونوں کٹر مسلمان تھے اور دونوں قرآن سے راہنمائی حاصل کرتے تھے۔

دونوں میں جو فرق نظر آ رہا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں نے جس جس ماحول میں جہاد کیا، وہ مختلف تھے۔ علاقے مختلف تھے۔ جنگوں کے پس منظر مختلف تھے۔ سلطان ایوبی کے دور میں صلیبیوں اور یہودیوں نے اپنی حسین اور تربیت یافتہ لڑکیاں مسلمان علاقوں میں بھیج رکھی تھیں اور ان کے جاسوس بھی موجود اور سرگرم تھے۔ سلطان محمود کی کہانیوں میں آپ کو کوئی ایسا ہندو جاسوس مرد یا عورت نہیں ملے گی جو غزنی کی سلطنت میں گئی ہو۔ ہندو راجے اپنے جاسوس

غزنی نہیں بھیجتے تھے۔ اس کے برعکس ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں سلطان محمود کے جاسوس موجود رہتے تھے۔ یہاں کے مسلمان ان کی مدد کرتے تھے۔

دونوں سلطانوں کے جاسوسوں میں ایک فرق تھا۔ سلطان صلاح الدین ایوبی کے جاسوس ایمان، کردار اور فرض کے پکے تھے۔ جانیں قربان کر دیتے تھے۔ ایک دوسرے کو دھوکہ نہیں دیتے تھے اور دشمن کے حسین جال میں کم ہی آتے تھے۔ اس کے برعکس سلطان محمود کے بعض جاسوس ہندوؤں کے جال میں پھنس جاتے تھے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ ہندوؤں کی شعبدہ بازی تھی جسے آپ مسمریزم کہہ سکتے ہیں۔ اس زمانے میں ہندوستان کی جادوگری ساری دنیا میں مشہور تھی۔ اس شعبدہ بازی میں لڑکیاں بھی استعمال کی جاتی تھیں۔ سلطان محمود کے بعض جاسوس شعبدہ بازی اور جادوگری کو ایک آدمی کی کرامات سمجھ بیٹھتے تھے۔

ان کی ناکامی کی دوسری وجہ یہ تھی کہ ہندوستان میں کچھ مسلمان برائے نام مسلمان تھے۔ وہ ہندو مہاراجوں کے درباری اور مخبر تھے اور اس طرح خاصی دولت کما لیتے تھے۔ یہ لوگ غزنی کے جاسوسوں کو پکڑوا دیتے یا اپنے ساتھ ملا لیتے تھے۔

یہاں کے مندروں کے اندر کی دنیا طلسم ہوشربا سے کم نہیں تھی۔ مذہب کے پردے میں بدکاری اور عیاشی ہوتی تھی۔ پنڈت مہاراجوں اور ان کی فوجوں کے بالائی افسروں پر چھائے رہتے تھے۔ حکم پنڈتوں کا چلتا تھا۔ یہاں انسانی قربانی بھی دی جاتی تھی۔ پنڈت جس کسی لڑکی کی طرف اشارہ کر دیتے، اس کے ماں باپ کو وہ لڑکی پنڈتوں کے حوالے کرنی پڑتی تھی۔ غزنی کا جو جاسوس اس طلسم میں چلا جاتا، وہ اپنے فرض اور اپنے مذہب کو بھی بھول جاتا تھا۔ اس کے باوجود سلطان محمود غزنوی کا نظام جاسوسی بڑا کارآمد تھا۔ گو سلطان صلاح الدین ایوبی جتنا کارآمد نہیں تھا۔

ہم تاریخ کی بہت سی کتابوں سے مدد اور روشنی لے کر یہ داستان سنا رہے ہیں۔ اس میں میدان جنگ کے جو احوال و کوائف اور سلطان کی جو جنگی چالیں بیان کی گئی ہیں، وہ ہم نے اُس دور کے وقائع نگاروں اور اس کے بعد کے جنگی مبصروں کی تحریروں سے حاصل کئے ہیں۔ ان میں کوئی بھی تفصیل من گھڑت نہیں۔ ہمارا مقصد حقیقت کو سامنے لانا ہے اور ہم کہانی پن اس لیے پیدا کرتے ہیں کہ بچے اور نوجوان بھی دلچسپی سے پڑھیں اور غلط فہمیاں رفع ہو جائیں۔

سلطان محمود غزنوی کے خلاف ایک اور الزام بھی ہے جس کا ذکر نصابی کتابوں میں خاص طور پر لایا گیا ہے۔ یہ ہے فردوسی کا شاہنامہ۔ روایت ہے کہ محمود غزنوی نے فردوسی سے شاہنامہ لکھنے کو کہا اور بے دریغ انعام کا وعدہ کیا تھا مگر شاہنامہ لکھا گیا تو سلطان نے انعام کا وعدہ پورا نہ کیا۔ یہ غم فردوسی کو لے بیٹھا۔ کہا جاتا ہے کہ سلطان محمود شاہنامہ اپنی مدح میں لکھوانا چاہتا تھا۔

غیر جانبدار مؤرخوں نے اس واقعہ کی تردید کی ہے۔ تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ یہ واقعہ من گھڑت ہے۔ سلطان محمود کو اپنی مدح میں شاہنامہ لکھوانے کی فرصت اور ہوش ہی نہیں تھی۔ اس کی عمر ہندوستان میں ہندوؤں کے خلاف اور اپنے ہاں اقتدار پرست غداروں اور ایمان فروشوں کے خلاف لڑتے گزر گئی۔

ایک اور روایت یہ بھی ہے کہ سلطان محمود چاہتا تھا کہ ایسا شاہنامہ لکھا جائے جو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے شروع ہو اور آخر میں سلطان محمود کا ذکر اس طرح آئے کہ اُس نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام کفرستان تک پہنچایا اور سلطان کا ذکر رسولؐ کے غلام کی حیثیت سے آئے لیکن فردوسی نے جو شاہنامہ لکھا، وہ شہنشاہوں اور سلطانوں کی مدح سرائی کے سوا کچھ بھی نہیں تھا چنانچہ سلطان محمود نے اس شاہنامہ کو قبول نہ کیا۔ بہرحال یہ ثابت ہو چکا ہے کہ فردوسی کے شاہنامہ کا واقعہ سلطان محمود کو رسوا کرنے کے لیے گھڑا گیا ہے۔

سلطان محمود کے متعلق مختلف مؤرخوں اور تاریخ دانوں نے جو کچھ کہا ہے، وہ اختصار سے پیش کیا جاتا ہے:

"سلطان ہٹ کا پکا تھا۔ اپنا ارادہ پورا کر کے رہتا، اور مخالفت کم ہی برداشت کرتا تھا لیکن اپنے افسروں کے مشوروں اور تجاویز پر اور اُن کے ذاتی مسائل اور امور پر غور کرتا اور کام کی کوئی تجویز رد نہیں کرتا تھا۔ اُس کی وفات کے بعد اُس کے افسر اُس کا نام ہمیشہ احترام سے لیتے رہے۔" (ابن الاثیر۔ سبط ابن الجوزی۔ بیہقی)

"سلطان خویش پرور نہیں تھا۔ وہ وزارت اور دیگر عہدے صرف انہیں دیتا تھا جو ان کے اہل ہوتے تھے۔" (بیہقی)

سلطان کے سات بیٹے تھے۔ ان کی تعلیم و تربیت کی وہ خصوصی نگرانی کرتا تھا۔ اس نے اپنے بیٹوں کی پرائیویٹ زندگی اور مشاغل پر نظر رکھنے کے لیے تربیت یافتہ جاسوس مقرر کر رکھے تھے جو سلطان کو باقاعدگی سے رپورٹیں دیتے رہتے تھے۔ کوئی بیٹا کہیں بھی کوئی نازیبا حرکت کرے، سلطان اُسے بڑی سخت سزا دیتا تھا۔" (بیہقی۔ گردیزی)

"سلطان اپنی پرائیویٹ زندگی میں اسلامی اصولوں کی پابندی کرتا تھا۔" (ابن الاثیر۔ مجمل)

"ترکمان کے خوبصورت غلام ابوالنجم ایاز کے ساتھ سلطان محمود کی محبت کو شاعروں اور قصیدہ گوؤں نے رومانی رنگ دیا ہے۔ حقیقت یہ تھی کہ ایاز بے شک خوبصورت تھا لیکن اس کے ساتھ سلطان کی محبت اُس کی غیر معمولی ذہانت اور قابلیت کی وجہ سے تھی۔ ایاز کی قابلیت اور فرض شناسی سے متاثر ہو کر سلطان نے اُسے ایک صوبے کا گورنر مقرر کیا تھا۔"

(چہار مقالہ۔ کلیاتِ اطہر۔ فرخی۔ نظامی سمرقندی۔ شیخ فریدالدین اطہر۔ زلالی۔ محمود و ایاز۔)

"سلطان جتنا دانشمند تھا، اتنا ہی بہادر تھا۔ میدانِ جنگ میں جہاں دشمن کا دباؤ زیادہ ہوتا وہاں سلطان خود آگے ہو کر حملہ کرتا تھا۔ اُس کی ذاتی شجاعت کا اثر یہ تھا کہ اس کے سپاہی انتہائی مایوس کن حالات اور دشواریوں میں بھی ایسی بے جگری سے لڑتے تھے کہ متوقع شکست فتح بن جاتی تھی۔" (آدابُ الملوک۔ عطبی)

"سلطان عدل و انصاف کے معاملے میں بڑا سخت تھا۔ کسی کا اُس کے ساتھ خون کا رشتہ یا کسی کا اونچا عہدہ اور رتبہ سلطان محمود کے عدل و انصاف کو موڑ توڑ نہیں سکتا تھا۔ سلطان محمود کے اپنے بیٹے مسعود نے ایک تاجر سے قرض لیا اور مقررہ مدت گزر جانے پر ادائیگی سے پس و پیش کرنے لگا۔ تاجر نے قاضی کی عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا۔ مسعود اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ سلطان کا بیٹا ہونے کی وجہ سے اُسے عدالت میں نہیں بلایا جائے گا۔ اُس نے طلبی پر قاضی کے سامنے جانے سے انکار کر دیا۔ سلطان کو اطلاع ملی تو اُس نے اپنے بیٹے کو گرفتار کروا کے عدالت میں بھیجا۔ قاضی نے اس سے قرض واپس دلایا اور جرمانہ بھی کیا۔"

(سیاست نامہ۔ عافی۔ فرخی۔ سبط ابن الجوزی)

"علی تگین فوج کا اعلیٰ افسر تھا۔ اس نے اسلام کے منافی ایک حرکت کی۔ سلطان کے حکم سے اُسے سرِعام کوڑے لگائے گئے۔" (سیاست نامہ۔ عافی۔ سبط ابن الجوزی)

"عامل نیشاپور نے اپنے رتبے اور سرکاری حیثیت کے رعب میں ایک غریب شخص کے مکان

پر قبضہ کر لیا۔ عورت نے سلطان محمود سے شکایت کی۔ سلطان نے عاملِ نیشاپور کے رُتبے اور حیثیت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اسے سرِ عام کوڑوں کی سزا دی اور سرکاری حیثیت سے برطرف کر دیا۔"

(سیاست نامہ۔ مجموعہ الانساب)

"سلطان محمود نے فقہ پر خود ایک کتاب لکھی تھی اور علما کو دربار میں جمع کر کے ان سے فقہ اور نظامِ شریعت پر کتابیں لکھوائی تھیں۔" (حاجی خلیفہ۔ امام مسعود بن شاہان۔ حکایت السلاطین)

"سلطان مذہب کا پابند تھا۔ نماز باقاعدگی سے پڑھتا اور ہر صبح کا آغاز تلاوتِ قرآن سے کیا کرتا تھا۔ رمضان کے مہینے میں اپنی جائداد کی مالیت اور نقد رقم پر اڑھائی فیصد زکوٰۃ ادا کیا کرتا تھا۔ زکوٰۃ کی رقم اتنی زیادہ ہوتی تھی کہ کسی علاقے میں زلزلے اور سیلاب وغیرہ سے تباہی آ جائے تو زکوٰۃ کی یہ رقم ہی متاثرہ علاقوں کی امداد اور آبادکاری کے لیے کافی ہو جاتی تھی۔"

(فرخی۔ حاجی خلیفہ۔ امام مسعود)

"ذاتی جیب سے غریبوں اور معذوروں کی مدد کرتا تھا۔ طلبہ کو وظیفے دیتا تھا۔ ہندوستان پر حملوں کے لیے جاتا تو بہت سے لوگ رضاکارانہ طور پر ساتھ چلے جاتے اور لڑائی میں حصّہ لیتے تھے۔ سلطان ان رضاکاروں کو فوج کی تنخواہوں کی نسبت زیادہ تنخواہ دیا کرتا تھا۔"

(سبط ابن الجوزی)

"لڑائی کیسی ہی خوفناک صورت کیوں نہ اختیار کر لے اور دشمن کا دباؤ کتنا ہی کیوں نہ بڑھ جاتے، سلطان محمود تیمم کر کے نماز پڑھ لیا کرتا تھا۔ وہ حج کے لیے ترستا رہا لیکن مجبوریاں ایسی تھیں کہ اس کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ حاجیوں کے جو قافلے حج کو جاتے اور آتے تھے، ان کی حفاظت کے لیے فوجی دستے بھیجا کرتا تھا۔ بدو قافلوں پر حملے کرتے تھے۔ سلطان نے ڈاکوؤں کے سرداروں کے ساتھ یہ سودا کر لیا تھا کہ حاجیوں کے قافلوں پر وہ حملے نہ کریں، اس کی بجائے غزنی کے خزانے سے رقم لے لیا کریں۔"

(ابن الاثیر۔ فرشتہ)

"سنی عقیدے کے خلاف کوئی بات برداشت نہیں کرتا تھا۔ سلطان نے افسر مقرر کر رکھے تھے جو ان لوگوں کو سزا دیتے تھے جو سنی عقیدے کے خلاف کوئی نیا عقیدہ پھیلاتے پکڑے جاتے تھے۔ باطنی اور قرامطی عقیدوں کے پیروکاروں اور مبلغوں کو وہ بڑی سخت سزائیں دیتا تھا۔ پھر بھی باز نہ آتے تو انہیں سرِ عام سزائے موت دی جاتی تھی۔ باطل عقیدوں کے بعض

مبلغوں کو سلطان نے زندہ جلا دیا تھا۔ اس نے باطنی، قرامطی اور بہائی فرقوں کی تمام کتابیں سارے ملک کی تلاشی لے کر جمع کیں اور آگ لگا دی۔" (ابن الاثیر۔ ابن الجوزی۔ مجمل)

"سلطان نے ہندوستان میں ہندوؤں کو کبھی بھی اسلام قبول کرنے کا حکم نہ دیا۔ یہ کام عالم اور مبلغ کرتے تھے جو سلطان کی فوج کے ساتھ جایا کرتے تھے۔ اس نے ہندوستان میں ویران مسجدیں آباد اور نئی مسجدیں تعمیر کیں اور مبلغوں سے کہا کہ وہ ہندوؤں کو اسلام سے روشناس کرائیں۔" (البیرونی۔ مولوی ذکاء اللہ۔ گردیزی)

"سلطان کی فوج میں جو ہندو دستے تھے، ان کے لیے غزنی میں اس نے مذہبی آزادی کا حکم دے رکھا تھا۔ اس سلوک سے متاثر ہو کر بہت سے ہندوؤں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔" (المعاری۔ رسالۃ الغفران)

سلطان محمود غزنوی کی تاریخ کو مسخ کر کے اسے رُسوا کرنے اور زر و جواہرات کا لٹیرا ثابت کرنے میں ہندوؤں کے علاوہ ان مسلمانوں کا بھی ہاتھ ہے جو عہ...ل، اقتدار، زر و جواہرات اور سلطانی کے خواہش مند تھے۔

ہم دس کہانیوں کا جو مجموعہ پیش کر رہے ہیں ان میں آپ کو وہ تمام لوازمات ملیں گے جو آپ کے اور آپ کی نوجوان نسل کے اس مطالبے کو پورا کرتے ہیں کہ کہانی تفریحی انداز میں لکھی جائے، اس میں سنسنی خیزی اور سسپنس ہو اور یہ جذبات میں ہلچل بپا کر دے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ کہانیاں اس قومی جذبے کو بھی زندہ و بیدار کریں گی جسے ہمارے ملک میں ذہنی لذت مہیا کرنے والی فحش کہانیوں سے ختم کیا جا رہا ہے۔

عنایت اللہ

مُدیر ماہنامہ "حکایت" لاہور

۔۔۔ اور ایک بُت شکن پیدا ہُوا

یکم نومبر ۹۷۱ء بمطابق ۱۰ محرم ۳۵۷ ہجری کے روز اُمّتِ رسول اللہ کا وہ مردِ مجاہد پیدا ہُوا جسے تاریخ بُت شکن کے خطاب سے پہچانتی ہے۔ یہ تھا سلطان محمود غزنوی۔

دس صدیاں گزر گئی ہیں محمود غزنوی کا نام زندہ ہے۔ وہ پیغام زندہ ہے جو وہ غزنی سے اُس وقت ہندوستان میں لایا تھا جب یہ کفرستان تھا اور یہاں برہمن اور اُس کے خداؤں کے بُتوں کی حکمرانی تھی۔ یہ وہ عظیم پیغام تھا جو خدائے ذوالجلال نے اپنے رسولؐ کو غارِ حرا میں دیا تھا۔ یہ پیغام ایک شمع تھی جسے غارِ حرا کی تاریکی نے نور بخشا تھا ۔۔۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ خدا کے رسول ہیں ۔۔۔ اور یہ بھی کہ کوئی انسان کسی انسان پر حکومت نہیں کر سکتا۔

محمود غزنوی کا نام زندہ ہے، عظیم پیغام زندہ ہے، سومنات زندہ ہے، ہندوستان کے وہ سارے مندر، وہ بُت کدے زندہ ہیں جن کے بُت غزنی کے محمود نے توڑ کر باہر پھینکے اور ان کے پجاریوں سے کہا تھا کہ مٹی اور پتھر کے بُت انسان کے خداوند نہیں ہو سکتے۔ ان میں خدائی کی ذرا سی بھی رمق باقی ہے تو انہیں کہو کہ اپنے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے جوڑ کر میرے جسم کے ٹکڑے کر دیں۔

بُتوں کے ٹکڑے جڑ نہ سکے، محمود کے ٹکڑے ہو نہ سکے۔ محمود نے ان ٹکڑوں کے اوپر سے اپنی فوج گزاری ۔۔۔ پیادہ بھی، سوار بھی ۔۔۔ اُس نے تھانیسر میں بھی یہ مظاہرہ کیا، سومنات میں بھی کیا ۔۔۔ برہمن کے "خدا" اسلامی فوج کے پاؤں تلے پس کر مٹی کے ذرّے اور پتھر کے ریزے بن گئے۔

پھر محمود غزنی میں مر گیا ۔۔۔ ہندوستان کے مندروں کی گھنٹیاں اور سنکھ بج اُٹھے۔ برہمن نے ٹوٹے ہوئے بتوں کی جگہ نئے بُت کھڑے کر دیئے۔

پورے ایک ہزار سال بعد، دسمبر ۱۹۷۱ء میں اسی ہندوستان سے، اسی بُت کدے سے یہ آواز اُٹھی ۔۔۔ "ہم نے اسلامی شجاعت اور روایات کا بُت توڑ دیا ہے۔"

گزرے ہوئے ماہ و سال میں ہمارے کئی اور بُت ٹوٹ گئے ہیں ۔۔۔ ایمان کا بُت، قومی کردار کا بُت، وقار کا بُت، روایات کا بُت، اُمّتِ رسولؐ کی وحدت کا بُت ۔۔۔ ہمارا کوئی بُت سلامت نہیں رہا۔ برہمن کے بڑے ہی حسین بُتوں نے ہم پر ایسا طلسم طاری کیا ہے کہ ہم سب بکھر بکھر کر مٹی کے بُت بن گئے ہیں جنہیں خود پیدا کردہ آندھیاں کھاتی اور اُڑاتی چلی جا رہی ہیں۔

وہ مسجدیں جو محمود غزنوی نے یہاں بنائی تھیں وہ ویران ہیں۔
وہ بُت خانے جو اُس نے ویران کیے تھے وہ آباد اور پُر رونق ہیں۔
اور بُت یہ طعنے دے رہے ہیں کہ مسلم کا خدا کوئی نہیں!

باطل کے بُت توڑنے والے کیسے ہوتے ہیں؟ حق کا بُت کس طرح ٹوٹتا ہے؟ ان سوالوں کا جواب ڈھونڈنے کے لیے ماضی کے اُن تاریک گوشوں کو کھوجنا ضروری ہے جن تک تاریخ کی آنکھ نہیں پہنچی ۔۔۔ اور چونکہ ان گوشوں تک تاریخ کی آنکھ نہیں پہنچی اور سچائی انہی گوشوں میں ہوتی ہے، اس لیے باطل ان گوشوں پر تاریکی کے زیادہ دبیز پردے ڈال دیتا ہے کہ سچائی دبی رہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ باطل شکنی کی تاریخ کا چہرہ مسخ ہُوا اور آج کے دَور کے دو کلمہ گو تاریخ والوں نے بھی لکھ دیا کہ محمود غزنوی کو زر و جواہرات اور خزانوں سے دلچسپی تھی، اور بُت وہ اس لیے توڑتا تھا کہ ان کے اندر زر و جواہرات اور بیش قیمت ہیرے بھرے ہوئے تھے جو ہندو عقیدت کے طور پر ان میں ڈال دیتے تھے۔ سومنات کے بُت کے متعلق بھی یہ کہا گیا۔ مگر غیر مسلم مؤرخوں نے لکھا ہے کہ یہ بُت اندر سے کھوکھلا نہیں ٹھوس تھا۔ محمود غزنوی نے اسے آٹھ ٹکڑوں میں توڑا اور باہر پھینکا جہاں اس کی فوج نے نفرت کے اظہار

کے لیے ان آٹھ ٹکڑوں کے کئی ٹکڑے کیے پھر پوری فوج انہیں پیٹتی ہوئی گزر گئی۔

باطل اور دروغ سے فروغ پاتا ہے، اور جب باطل شکنوں کی اولاد دروغ کو حق مان لیتی ہے تو حق کے بت ٹوٹ جاتے ہیں۔

تاریخ کے تاریک گوشوں میں جھانکئے۔ ایک ہزار سال پہلے کے عینی شاہدوں کی تحریریں پڑھیئے۔ یہ تحریریں بکھری بکھری سی ہیں۔ مگر غور کرو تو کہانی مکمل ہو جاتی ہے۔ بکھری بکھری کڑیاں بھی ملتی ہیں جنہیں ایک دوسری سے ملاؤ تو اس دور کے کئی واقعات کا پس منظر روز روشن کی طرح چمکتا سامنے آجاتا ہے۔ تاریخ کا چہرہ بگاڑا نہیں جا سکتا، تاریخ کو جھٹلایا نہیں جا سکتا جس مٹی میں شہیدوں کا خون اور مظلوموں کا خون رچ بس جاتا ہے، اس مٹی کے ذرے بولتے ہیں شہیدوں اور مظلوموں کی روحیں مٹی کو زبان دے دیتی ہیں۔ پاک مٹی کی آواز سننے کے لیے ایمان کی بصیرت درکار ہے۔ اس آواز کو سمجھنے کے لیے دل و دماغ میں اللہ کا نور ضروری ہے۔

ایمان کی بصیرت نہ ہو، دل و دماغ میں اللہ کا نور نہ ہو تو ہم اللہ کے دھتکارے ہوئے ان لوگوں میں شامل کر دیئے جاتے ہیں جن کے متعلق قرآن نے فرمایا ہے کہ ہم نے ان کے کانوں میں سیسہ ڈال دیا اور دماغوں کو سربمہر کر دیا ہے کہ ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے، اور آخرت میں آگ کا عذاب اور اللہ ہی جانتا ہے کہ وہ عذاب کس قدر بھیانک ہے۔

یہ ۹ء سے دو چار سال پہلے یا دو چار سال بعد کا واقعہ ہے ایران کے بادشاہ نوشیرواں عادل کا سنہری دور مدت گزری ختم ہو چکا تھا اور اس سرزمین پر اب اُن کی حکمرانی تھی جنہیں انصاف سے نفرت اور آمریت سے محبت تھی۔ وہ بادشاہ تھے اور انسانوں کو اپنا غلام سمجھتے تھے۔ انسانوں کو غلام بنانے کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ عدل و انصاف کی بساط لپیٹ کر پھینک دو۔ رعایا کو بھوکا رکھو۔ انہیں بات نہ کرنے دو جس کا گلا گھونٹ دو۔ انصاف اس سے کرو جو بادشاہ کے گیت گائے خوشامدیوں کا ٹولہ پیدا کر دو مشیر اور وزیر اسی ٹولے سے منتخب کرو۔ انسانوں کو تنگدست رکھو

کہ اس حال تک پہنچا دو جہاں انسان کتے کے منہ سے ہڈی چھین کر اپنے بھوکے بچے کے منہ میں ڈال دیا کرتا ہے۔

ایران کے اس بادشاہ نے عدل و انصاف کو ملک بدر کر دیا اور نوشیرواں عادل کے لگائے ہوئے شجر کو جڑوں سے اکھاڑ پھینکا اور اسکے خاندان کو مجبور کر دیا کہ وہ ایران سے نکل جائیں چنانچہ یہ لوگ ایران سے نکل کر ادھر اُدھر بکھر گئے عرش سے فرش پر گرے تو جدھر کو منہ آیا اُدھر کا رخ کر لیا۔ ذریعۂ معاش نے انہیں بکھیر دیا، خانہ بدوش کر دیا۔ انصاف کے علمبردار بے انصافی کا شکار ہوتے ٹہنے مرتے گئے بچے جوان ہوتے گئے اور نسلیں روپوش اور نمودار ہوتی رہیں۔

اسی نسل کا ایک شخص قرار الحکم بن قرار ارسلان، گٹھا ہوا جوان جس پر آباؤ اجداد کی عظمت کے نقوش نمایاں مگر تنگدست اور روزی کا متلاشی بخارا کے ایک جنگل سے گزر رہا تھا۔ کسی ٹھور ٹھکانے کی تلاش میں جا رہا تھا۔ تھک گیا اور ایک درخت تلے بیٹھ گیا۔ قریب گھنی جھاڑیاں اور گھنے پیڑ تھے۔ ان کی اوٹ سے ننھے بچوں کے ہنسنے کھیلنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھی۔ الحکم کو معلوم تھا کہ یہ کوئی خانہ بدوش خاندان ہے۔ وہ لیٹ گیا۔

بچے ہنستے کھیلتے دور نکل گئے۔ خاموشی طاری ہو گئی۔ اس خاموشی سے ایک مترنم آواز ابھری۔ آواز جوان تھی اور مقدس بھی — کوئی عورت تلاوت قرآن کر رہی تھی۔ قرار الحکم پر وجد سا طاری ہو گیا۔ اس کی تھکن دور ہونے لگی۔ سنتے سنتے وہ بدک اٹھا اور اٹھ کر دو بڑا جھاڑیوں سے گھوم کر ادھر گیا جہاں خانہ بدوشوں نے دو پھٹے پرانے، پیوند لگے خیمے لگا رکھے تھے۔ ایک خیمے کے باہر ایک جوان لڑکی قرآن پڑھ رہی تھی۔ وہ اپنی آواز کی طرح دلکش اور حسین تھی۔ دو بوڑھے آدمی الگ بیٹھے رسیاں بنا رہے تھے چند عورتیں اور دو چار مرد بھی تھے۔ قرار الحکم کو دیکھ کر سب اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ وہ اُن کے درمیان چلا گیا۔

"آپ کی اس بیٹی نے ایک آیت غلط پڑھی ہے" — الحکم نے بوڑھوں سے کہا — "مجھے اجازت ہو تو اس کی غلطی درست کر دوں؟"

"ضرور کردو"۔۔۔ ایک بوڑھے نے کہا۔ "ہم نے نہیں سنا کہ یہ صحیح پڑھ رہی ہے یا غلط۔"

"آپ کو سننا چاہئے"۔۔۔ الحکم نے کہا۔ "آپ کہاں سے آئے ہیں؟"

"ہم تُرک ہیں"۔۔۔ بوڑھے نے جواب دیا۔ "تُرک مسلمان۔"

"وہ تو میں نے دیکھا ہے کہ آپ سب مسلمان ہیں"۔۔۔ الحکم نے کہا۔۔۔ "میں ذرا اس کی غلطی درست کردوں۔"

وہ لڑکی کے پاس زمین پر جا بیٹھا۔

لڑکی نے قرآن سے سر اٹھایا۔ قرار الحکم نے دیکھا کہ لڑکی تو بہت خوبصورت ہے۔ لڑکی نے قرآن بند کر دیا۔ اور اپنے خاندان کے آدمیوں کی طرف دیکھنے لگی جیسے پوچھ رہی ہو کہ یہ شخص کون ہے۔

"قرآن کھولو"۔۔۔ الحکم نے لڑکی سے کہا۔ "تم نے ایک جگہ سے غلط پڑھا تھا۔"

لڑکی نے پڑھا۔ وہ لفظ اس نے پھر غلط پڑھا۔ قرار الحکم نے اس کی غلطی درست کی۔ لڑکی نے اُسے شکریے کی نظر سے دیکھا۔

"اس کا مطلب جانتی ہو جو پڑھ رہی ہو؟"

"کچھ کچھ سمجھتی ہوں"۔۔۔ لڑکی نے شرمیلے سے لہجے میں جواب دیا۔ "ہمارے ساتھ ایک بزرگ ہوا کرتے تھے۔ وہ مجھے قرآن پڑھایا کرتے تھے۔ مطلب بھی سمجھاتے تھے۔ وہ مر گئے ہیں۔ انہیں سانپ نے ڈس لیا تھا۔ اب پڑھ سکتی ہوں۔ کچھ سمجھتی ہوں کچھ نہیں سمجھتی۔"

"میں تمہیں اس کا مطلب سمجھاتا ہوں"۔۔۔ قرار الحکم نے کہا۔ "ابراہیمؑ کو یاد کرو۔ بے شک وہ سچے پیغمبر تھے۔ انہوں نے اپنے باپ سے کہا کہ آپ ایسی چیزوں کو پوجتے ہیں جو نہ سُن سکتے ہیں اور نہ بول سکتے ہیں۔ اور نہ آپ کے کچھ کام آسکتے ہیں مجھے ایسا علم ملا ہے جو آپ کو نہیں ملا۔ آپ میرے ساتھ ہو جائیں، میں آپ کو سیدھی راہ پر لے چلونگا"۔۔۔ الحکم نے لڑکی کو اس کا مطلب سمجھا کر کہا۔ "اور آگے دیکھو یہاں خداوند فرماتا ہے۔ "اور جب ابراہیمؑ ان لوگوں سے اور جن بتوں کی وہ پرستش کرتے تھے

اُن سے الگ ہو گئے تو ہم نے ان کو اسحاقؑ اور یعقوبؑ عطا کیے اور سب کو پیغمبر بنایا۔"

۔۔۔ تم سمجھتی ہو یہ کیا قصہ ہے؟ ۔۔۔ وہ بتوں کے آگے سجدے کرتے اور اُن سے مرادیں مانگتے تھے۔ تم نے قرآن میں پڑھا ہے کہ عبادت کے لائق صرف اللہ ہے۔"

قرار الحکم اُسے بتا رہا تھا کہ غیر مسلم کیسے کیسے "خداؤں" کی عبادت کرتے ہیں اور بُت جو سن سکتے ہیں نہ بول سکتے ہیں۔ بت پرستوں کے اپنے بنائے ہوئے ہیں۔ مگر لڑکی خاموشی سے کبھی اُس کے چہرے کبھی سراپا کو دیکھتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں انہماک اور چہرے پر مسرت تھی۔ اس خاندان کے مرد بھی ان کے پاس آ بیٹھے تھے۔

تھوڑی دیر بعد وہ اُٹھ کر چلنے لگا۔ بوڑھوں نے اُسے روک لیا۔ لڑکی سے دور ہٹ کر وہ مردوں میں جا بیٹھا۔ انہوں نے اُس سے پوچھا کہ وہ کون ہے۔ کہاں سے آیا ہے اور کہاں جا رہا ہے۔

"ایران کی زمین ہم پر تنگ ہو گئی ہے"۔۔۔ قرار الحکم نے جواب دیا۔ "جس کے آباؤ اجداد نے عدل و انصاف سے انسان کو اشرف المخلوقات کے درجے تک پہنچایا تھا۔ وہ آج حشرات الارض میں شامل ہو گیا ہے۔ کیا میں کیڑا مکوڑا نہیں ہوں جو دشت و جبل میں پیٹ کی آگ بجھانے اور بے انصافوں اور ظالموں سے بچنے کے لیے مارا مارا پھر رہا ہوں؟ ہم تین چار پشتوں سے اسی حال میں جی رہے ہیں۔ ایک جگہ سے طبیعت اچاٹ ہوتی ہے۔ تو جدھر منہ آئے ادھر کو چل پڑتا ہوں۔"

"تو یوں کہو تم نوشیرواں عادل کی نسل سے ہو"۔۔۔ ایک بوڑھے نے کہا۔۔۔ "ہمارے باپ دادا اُس کے بہت قصے سنایا کرتے تھے، مگر ہم نوشیرواں عادل کو خیالی بادشاہ سمجھتے ہیں۔۔۔۔۔ تمہارا کنبہ کہاں ہے؟"

"اکیلا ہوں"۔۔۔ الحکم نے جواب دیا۔ "بچپن سے مذہب سے لگاؤ ہے۔ مسجدوں میں زیادہ وقت گزارا ہے۔"

"تم باتیں بہت اچھی کرتے ہو"۔۔۔ دوسرے بوڑھے نے کہا۔ "رہنا چاہو تو ہمارے ساتھ رہو۔ جانا چاہو تو ایک رات ہمارے ساتھ گزارو۔"

وہ رات کے لیے رک گیا۔ وہ کوئی عالم فاضل نہیں تھا لیکن خانہ بدوش چونکہ کچھ نہیں جانتے تھے، اس لیے ان میں وہ عالم لگتا تھا۔ باتیں داستان گوئی کے انداز سے کرتا تھا۔ سننے والے مسحور ہوتے جا رہے تھے۔ جوں جوں رات گزرتی جا رہی تھی محفل کی رونق کم ہوتی جا رہی تھی۔ پہلے عورتیں اٹھیں پھر مرد ایک ایک کر کے اٹھنے لگے۔ آخر میں دونوں بوڑھے رہ گئے۔ انہوں نے الحکم سے ذرا زور دے کر کہا کہ وہ ان کے ساتھ رہے۔ الحکم نے محسوس کیا جیسے وہ اسے کسی ذاتی مقصد کے لیے اپنے پاس رکھنا چاہتے ہیں۔ اس نے ان سے پوچھ ہی لیا کہ وہ ان کے کس کام آ سکتا ہے۔

"ہمارے ہاں مردوں کی کمی اور عورتوں کی زیادتی ہے" — ایک بوڑھے نے کہا — "مرد جتنے بھی ساتھ ہوں اچھا ہوتا ہے۔ ہمیں صرف درندوں کا خطرہ نہیں ہوتا، انسان درندوں سے زیادہ خطرناک ہیں۔ یہ لڑکی جس کی آواز پر تم ادھر آئے تھے ہمارے لیے بڑی ہی نازک اور خطرناک ذمہ داری بنی ہوئی ہے۔ تم نے اس کی جوانی اور اس کا حسن دیکھا ہے۔ ہمارے خاندان کے سارے مرد بیویوں والے ہیں۔ باقی سب بچے ہیں۔ اس لڑکی کے لیے ہمیں خاوند نہیں ملتا۔ تم ہمارے ساتھ رہو اور اس کے ساتھ شادی کر لو۔"

"مجھ سے پہلے تمہیں باہر کا کوئی آدمی نظر نہیں آیا؟" — الحکم نے پوچھا — "مجھ جیسے کسی اور کو لڑکی کیوں نہ دے دی؟ باہر کا میں پہلا ہی آدمی یہاں آیا ہوں؟"

"آتے رہے ہیں" — بوڑھے نے جواب دیا — "مگر وہ خریدار تھے۔ ایک دوسرے سے بڑھ کر بولیاں دے گئے ہیں۔ ہم نے ایک بار قیمت لے کر لڑکی دینے کا فیصلہ کر لیا تھا مگر لڑکی نہیں مانی۔ اس نے خودکشی کی دھمکی دی تو ہم چپ ہو گئے۔"

اس دور میں امیر کبیر لوگ لڑکیاں خریدا کرتے تھے۔ ایرانی اور ترک خانہ بدوشوں کی لڑکیاں زیادہ خوبصورت ہوتی تھیں اس لیے گاہک خانہ بدوشوں کی تلاش میں رہتے تھے۔ لڑکیاں فروخت ہونے کو معیوب نہیں سمجھتی تھیں کیونکہ یہ رواج تھا۔ خریدار انہیں باقاعدہ منڈی میں بیچتے تھے۔ غلاموں کی بھی منڈی لگا کرتی تھی۔ لڑکیوں اور غلاموں کے سوداگر عام طور

پر ڈاکو ہوا کرتے تھے جو قافلوں پر حملہ کر کے مردوں اور عورتوں کو پکڑ لاتے تھے۔ خوبصورت لڑکیاں امیروں اور بادشاہوں کے امراء وزراء کے گھروں میں حرموں کے لیے یا حرموں کی ملازمت کے لیے یا مہمانوں کے لیے رکھی جاتی تھیں۔ قحبہ خانوں والے بھی ان کے خریدار ہوتے تھے۔

"کبھی سنا نہیں کہ خانہ بدوشوں کی کسی لڑکی نے بکنے سے انکار کیا ہو" — الحکم نے کہا — "آپ نے اس کی بات کیوں مانی؟"

"یہ ایسی باتیں کرتی ہے جن سے ہم ڈر جاتے ہیں" — بوڑھے نے جواب دیا — "تم جانتے ہو ہم لوگ مذہب کے اتنے پکے نہیں ہوتے۔ کسی آدمی کو اس کی خوبصورت لڑکی کی قیمت اچھی مل جائے اور وہ اس قیمت پر بیوی کو طلاق دے دے تو اس آدمی کا کیا مذہب ہو سکتا ہے۔ لیکن ہم مسلمان ہیں۔ اسلامی اصولوں کے ہم پابند تو نہیں پھر بھی قرآن اور خدا سے ڈرتے ہیں۔ یہ لڑکی کبھی ہمیں کوئی خواب سناتی ہے، کبھی کہتی ہے کہ اسے جنگل میں ایک سفید ریش، نورانی چہرے والے بزرگ نظر آئے تھے اور کہتے تھے کہ کسی کی زرخرید لونڈی نہ بننا، نکاح پڑھوا کر بیوی بننا کیونکہ تم اس بچے کو جنم دو گی جو بھٹکے ہوئے انسانوں کو راستہ دکھائے گا۔"

"ایسے خواب ہر کوئی دیکھتا ہے" — الحکم نے کہا — "میں بھی ایسے خواب دیکھا کرتا ہوں۔"

"دو چاند پہلے کی بات ہے، ہم نے لڑکی کا سودا کر لیا تھا" — ایک بوڑھے نے کہا — "خریدار کے پاس رقم کم تھی۔ ہم نے سونے کے دینار مانگے تھے جو اس کے پاس پورے نہیں تھے۔ لڑکی کو ہم نے خیمے کے اندر بٹھا کر دو آدمی پہرے پر کھڑے کر دیئے کیونکہ لڑکی کہتی تھی کہ بھاگ جاؤں گی۔ ہم نے پہرہ کھڑا کر دیا تو اس نے کہا — 'میری کوکھ سے ناجائز بچہ جنم نہیں لے گا۔ اس سے پہلے تم سب تباہ ہو جاؤ گے' — آدھی رات کو ہم سب گھٹاؤں کی گرج سے جاگ اٹھے۔ بارش اتنی طوفانی کہ جیسے اڑ اڑ کر گرے۔ بجلی کڑکنے لگی تو دل دہل گئے۔ پھر ایسی کڑک ہوئی کہ

ہم سب کی چیخیں نکل گئیں ساتھ ہی سارا جنگل دن کی طرح روشن ہو کر اندھیرا ہو گیا۔ ایک درخت کا بہت بڑا ٹہن کڑکڑ کرتا گرا۔ پھر بار بار زمین اور آسمان روشن ہوتے اور بجلی کڑکتی تھی۔ چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ سب چیختے چلاتے اور کوں کو ڈھونڈتے اور انہیں سینے سے لگاتے پھر رہے تھے صرف یہ لڑکی تھی جو بے خوف تھی ایک جگہ کھڑی چلا چلا کر کہہ رہی تھی —"کوئی آدمی اذان دو جہاں ہو وہیں سجدے میں گر پڑو" — تین آدمی اذان دینے لگے۔ باقی سب قیامت کی بارش میں، پانی اور کیچڑ میں سجدے میں گر پڑے ....

"طوفان بہت دیر بعد تھما۔ ہم نے اس سے زیادہ خوفناک طوفان بھی دیکھے ہیں۔ ہماری چھت آسمان ہے۔ آسمان ہی ہمیں نعمتوں سے نوازتا ہے اور یہی آسمان ہم پر کبھی کبھی آفت بھی نازل کرتا ہے مگر ہم کبھی ڈرتے نہیں تھے۔ اس رات ہمارے دلوں پر جو دہشت طاری ہوئی وہ کچھ اور معنی رکھتی تھی۔ صبح ہوئی۔ سب ایک جگہ ٹھٹھرتے ڈر سے بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ لڑکی ہم سب کو عجیب سی نگاہوں سے دیکھتی آہستہ آہستہ ہمارے آگے سے گزری۔ اس کی آنکھوں میں جانے کیا اثر تھا کہ ہم سب نے نظریں نیچی کر لیں۔ ہمیں اس کی دھمکی یاد آنے لگی — 'میری کوکھ سے ناجائز بچہ جنم نہیں لے گا۔ اس سے پہلے تم سب تباہ ہو جاؤ گے' —

لڑکی کے ہاتھ میں یہی قرآن تھا جو یہ آج پڑھ رہی تھی ....

"ہم نے خیمے سنبھالے۔ سامان اکٹھا کیا اور اسے خشک کرنے لگے۔ بہت دیر بعد دو گھوڑ سوار آئے۔ وہ سونے کے دینار لے آئے تھے۔ انہوں نے تھیلی ہمارے آگے پھینک کر کہا — 'گن لو اور لڑکی ہمیں دے دو' — میں نے تھیلی اٹھا کر گھوڑ سوار کو دے کر کہا — 'ہم لڑکی نہیں دیں گے۔ لے جاؤ اپنا سونا' — دوسرے گھوڑ سوار نے دو دینار اور میرے آگے پھینک کر کہا — 'اور بولو جو قیمت مانگو گے دیں گے' — ہم نے لڑکی نہ دی۔"

"یہ کس کی بیٹی ہے؟"

"یتیم ہے" — بوڑھے نے جواب دیا — "میری بھتیجی ہے۔"

"میرے پاس لڑکی کی قیمت دینے کے لیے کچھ بھی نہیں" — قراقلم نے خالی ہاتھ دکھا کر کہا — "آپ مجھے اللہ کی راہ میں تو یہ لڑکی نہیں دیں گے۔"

"تمہیں ہمارے ساتھ رہنا پڑے گا" — بوڑھے نے کہا — "ہمارے خاندان میں ایک مرد کا اضافہ ہو جائے گا۔ ہر رات ڈاکوؤں کا خطرہ رہتا ہے۔ لڑکی کو ہم چھپائے پھرتے ہیں۔ مرد جتنے زیادہ ہوں گے خطرہ اتنا ہی کم ہو گا۔"

قراقلم کی شادی اس لڑکی کے ساتھ کر دی گئی۔

"تمہیں حاصل کرنے کے لیے میں نے اپنی اور اپنی آزادی کی قیمت دی ہے" — پہلے روز قراقلم نے اپنی بیوی سے کہا — "میں اپنے آپ کو قید میں رکھنے والا آدمی نہیں ہوں۔ یہ بھی نہیں کہتا کہ میرے دل میں تمہاری اتنی محبت پیدا ہو گئی ہے کہ میں آگے نہیں جا سکتا۔ تمہارے چچا نے مجھے تمہارے متعلق سب کچھ بتایا تھا اور کہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ شادی کر لوں اور یہیں رہوں۔ اگر کسی وقت میرا دل یہاں سے اچاٹ ہو گیا تو میرے ساتھ چلو گی؟"

"کیا میں نے آپ کو خدا اور رسولؐ کے نام پر اپنا خاوند قبول نہیں کیا؟" — اس کی بیوی نے جواب دیا — "میرا جینا مرنا آپ کے ساتھ ہے۔ یہ لوگ اب مجھے اپنا قیدی بنا کر نہیں رکھ سکتے۔ میں نے آپ کو دیکھا تھا تو میرے دل نے کہا تھا کہ یہ آدمی تمہیں اپنی بیوی بنانا چاہے تو اسے قبول کر لینا۔"

"سنا ہے تم کہتی ہو کہ تمہیں جنگل میں ایک سفید ریش، نورانی صورت بزرگ ملے تھے جنہوں نے تمہیں کہا تھا کہ تم ایک بچے کو جنم دو گی جو بھٹکے ہوئے انسانوں کو راستہ دکھائے گا۔"

وہ ہنس پڑی اور بولی — "یہ میری خواہش ہے کہ ایسے ہی بچے کو جنم دوں۔ یہ خواہش اتنی شدید ہے کہ مجھے آوازیں سنائی دیتی ہیں کہ تیری نسل کا ایک آدمی جو تیرا بیٹا بھی ہو سکتا ہے، تیرے بیٹے کا بیٹا بھی ہو سکتا ہے، راہِ حق میں اتنا نام پیدا کرے گا کہ دنیا اسے بھول نہیں سکے گی۔"

www.paksociety.com

"تم نہیں جانتی کہ غریبوں کی اولاد باطل شکن نہیں شکم پرور ہوا کرتی ہے"۔۔۔
الحکم نے کہا۔ "یہی کافی ہے کہ خود حق پر رہو اور باطل کی کشش سے بچو۔ ہمارا بیٹا
خانہ بدوش ہوگا۔ اس کا بیٹا بھی خانہ بدوش ہوگا یا کسی امیر کے گھر کسی غلیظ کام
پر نوکر ہوگا۔"

"تو کیا میں وہم میں مبتلا ہوں؟"

"خواہش جو پوری نہ ہو سکے وہم بن کر انسان کا دل بہلائے رکھتی ہے۔" الحکم
نے کہا۔

"اس روز تم میری غلطی درست کرنے آئے تھے۔" بیوی نے کہا۔ "تم
نے مجھے ان آیتوں کا ترجمہ سنایا کہ ابراہیمؑ نے اپنے باپ سے کہا کہ آپ بتوں
کو کیوں پوجتے ہیں جو نہ بول سکتے ہیں نہ سن سکتے ہیں۔ میرے ساتھ ہو جائیں۔
میں آپ کو سیدھی راہ پر لے چلوں گا۔۔۔۔ یہ الفاظ میرے دل میں اٹک گئے۔ اس
کے بعد میں قرآن نہیں پڑھ سکی۔ یہی ایک آواز سنائی دیتی رہی کہ تو ایک ابراہیم کو جنم
دے گی۔ میں نے رات خواب میں ایک نورانی صورت بزرگ کو دیکھا۔ وہ تمہاری طرح
میری یہی غلطی درست کر کے مجھے پڑھا رہے تھے جو تم نے درست کی ہے۔ پھر
انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ تم خوبصورت بچہ بغیر عقل کے چاہتی ہو یا بدصورت
بچہ جو عقل والا ہو۔ میں نے کہا [illegible] وہ بچہ چاہتی ہوں جو حضرت ابراہیمؑ کی طرح
اتنا حق پرست ہو کہ اس کا باپ حق پر نہ ہو تو اس سے بھی الگ ہو جائے۔ میں
نے اس بزرگ سے کہا کہ خدا مجھے لڑکی دے تو وہ اتنی بدصورت ہو کہ کوئی خریدار
اور کوئی ڈاکو اس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کرے۔"

"تم اپنے قبیلے کے رسم ورواج کے خلاف کس طرح ہو گئی ہو؟"۔۔۔
قرار الحکم نے کہا۔ "خانہ بدوشوں کی لڑکیاں فروخت ہونے کو ناپسند تو نہیں کرتیں۔"
"معلوم نہیں میرے دل میں یہ بات کیوں بیٹھ گئی تھی کہ میں شادی کر کے ایک ایک
کی بیوی بن کے رہوں گی۔" بیوی نے جواب دیا۔ "مجھے کسی نے کوئی سبق نہیں دیا۔

میرے دل کی آواز تھی جو مجھے اچھی لگتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ میری خواہش
پوری ہو جائے گی۔"

"دل سے یہ وہم نکال دو کہ تم ایسے بچے کو جنم دو گی جو بڑا ہو کر نام پیدا کرے گا۔"
الحکم نے کہا۔ "ایسی خواہشیں تمہارا دماغ خراب کر دیں گی۔"

اس رات کا طوفان باد و باراں اور بجلی کا کوندنا محض اتفاق ہو سکتا تھا۔ یہ
آسمانی آفت اس کے فوراً بعد آئی جب اس لڑکی کے خریدار آئے تھے اور لڑکی
نے اپنے خاندان کو تباہی سے ڈرایا تھا لیکن یہ اتفاق جو خدا کا اشارہ بھی ہو سکتا
تھا، کام کر گیا۔ قرار الحکم حقیقت پسند آدمی تھا۔ اس نے اسے کوئی معجزہ نہ سمجھا۔ البتہ
اپنی بیوی کے متعلق اسے یقین ہو گیا کہ عقیدے کی پکی ہے اور اس کا حسن جسمانی کم
اور روحانی زیادہ ہے۔

الحکم خانہ بدوشوں کے ساتھ رہا۔ شادی کے دوسرے سال اس کا پہلا بچہ
پیدا ہوا۔ اس کا نام انہوں نے سبکتگین رکھا۔ بچے کی ماں کا یہ وہم اور گہرا ہو گیا
کہ یہ بچہ نام پیدا کرے گا۔ الحکم بعض اوقات اپنی بیوی کی باتیں سن کر ہنس پڑتا تھا۔
"تمہارا دل ابھی اس خانہ بدوش زندگی سے اچاٹ نہیں ہوا؟"۔۔۔ ایک
روز نوجوان بیوی نے قرار الحکم سے پوچھا۔
"میرا دل تو اچاٹ نہیں ہوا۔" الحکم نے جواب دیا۔۔۔ "یہ سوچ آتی ہے کہ
بچے کو میں اس جانوروں جیسی زندگی سے دور لے جاؤں۔ یہ کیا زندگی ہے جانوروں
کی طرح پیٹ بھرنا اور خطروں سے بھاگتے پھرنا۔"
"میں جانتی تھی کہ میری یہ خواہش بھی پوری ہوگی۔"۔۔۔ اس کی بیوی نے کہا
۔۔۔ "میں تمہاری دنیا سے واقف نہیں۔ کیا کوئی ایسی جگہ مل سکتی ہے جہاں یہ
بڑا ہو تو اسے کچھ پڑھایا لکھایا جا سکے؟"
"کسی کے گھر نوکری مل سکتی ہے۔" الحکم نے کہا۔ "خدا کی زمین تنگ نہیں۔

جس نے بچہ دیا وہ اس کی روزی بھی دے گا۔"

"مگر ہمیں چوری چھپے یہاں سے نکلنا پڑے گا" ــــ بچے کی ماں نے کہا ــــ "یہ لوگ تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے کیونکہ تم مجھے مفت لے جا رہے ہو۔ تمہیں انہوں نے میری قیمت کے طور پر اپنے ساتھ رکھا تھا..... میں تمہیں طریقہ بتاتی ہوں۔ کل صبح لکڑیاں چننے کے بہانے نکلیں گے پھر واپس نہیں آئیں گے۔"

انہوں نے ایسے ہی کیا۔ اُس دن بچے کی عمر چھ ماہ ہو چکی تھی۔ میاں بیوی بچے کو اٹھا کر سب کو یہ بتا کر گئے کہ لکڑیاں چننے جا رہے ہیں۔ دوپہر تک واپس نہ آئے تو بوڑھوں کو شک ہُوا۔ انہوں نے دو آدمیوں کو گھوڑوں پر سوار کر کے ان کی تلاش کو روانہ کر دیا۔ ایک شک تو یہ تھا کہ ڈاکوؤں کے ہتھے نہ چڑھ گئے ہوں۔ لڑکی کا حُسن اس کے لیے بہت بڑا خطرہ تھا۔ اتفاق سے کسی مسافر نے گھوڑ سواروں کو بتا دیا کہ اس نے ایک آدمی اور بڑی خوبصورت جوان لڑکی کو بچہ اٹھائے فلاں طرف جاتے دیکھا ہے۔

انہوں نے اس شک پر اُدھر کو گھوڑے دوڑا دیئے کہ الحکم اُن کی لڑکی کو کہیں اور لے جا رہا ہے۔ الحکم اور اس کی بیوی پیدل جا رہے تھے۔ راستہ ناہموار اور دشوار تھا۔ ان کے ایک طرف دریا تھا۔ انہیں گھوڑوں کے قدموں کی آوازیں سُنائی دیں۔ گھوم کے دیکھا۔ دو گھوڑے سرپٹ دوڑے آ رہے تھے۔ ذرا اور
م نے انہیں پہچان لیا۔ سواروں نے تلواریں نکال لی تھیں۔ اس
ے کا پتہ چل گیا۔ الحکم نہتہ تھا۔ یہ اس کی غلطی تھی کہ ہتھیار ساتھ نہیں لایا تھا۔ اس نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔

"دریا میں کود جاؤ۔" بیوی نے کہا۔

"پانی گہرا ہے۔" الحکم نے کہا "تیز بھی ہے۔ وہ گھوڑے دریا میں ڈال دیں گے۔"

"میں کہتی ہوں دریا میں کود جاؤ۔" بیوی نے یوں کہا جیسے اُسے خدا سے اشارہ ملا ہو ــ "بچے کو تم پکڑ لو۔ میں اس کے بغیر تیر سکوں گی۔"

الحکم نے اُس سے پکڑ لیا۔ اُسے ایک ہاتھ پر اٹھایا، اور دریا میں اُتر گیا۔ بچے کو پانی سے اُوپر رکھا۔ وہ ایک ہاتھ اور ٹانگوں سے تیرنے لگا۔ اس کی بیوی بھی دریا میں اتری۔ دریا کا رُخ اُدھر ہی تھا جدھر وہ جا رہے تھے۔ سواروں نے گھوڑے کنارے پر روکے اور انہیں للکارا مگر وہ دریا کے وسط میں چلے گئے تھے۔ آگے پانی کم گہرا تھا۔ وہ نکل گئے۔

ایک شہر میں وہ داخل ہوئے تو ہر کسی کی نظریں اُن پر اٹھتی تھیں۔ یہ الحکم کی بیوی کی کشش تھی۔ چونکہ کپڑوں سے دونوں غریب اور پردیسی لگتے تھے اس لیے لڑکی لوگوں کو اور زیادہ خوبصورت لگتی تھی۔ مفلس کی بیٹی کو کوڑیوں کے داموں خریدا بھی جا سکتا ہے اور اُسے بےخوف و خطر اغوا بھی کیا جا سکتا ہے۔ یہ اس لڑکی کی خوبصورتی کا ہی کرشمہ تھا کہ فوراً الحکم کو گھوڑوں کے ایک بہت بڑے سوداگر کے محل جیسے مکان میں ملازمت مل گئی۔ ملازمت کے ساتھ اُسے اصطبل کے ساتھ ایک جھونپڑا بھی دے دیا گیا۔ الحکم اصطبل میں کام کرنے لگا۔ اس کی بیوی بچے کی خاطر جھونپڑے میں رہتی لیکن اُسے زیادہ دن فارغ نہ رہنے دیا گیا۔ اُسے محل میں کام کرنے کے لیے بُلا لیا گیا۔

اُسے ایک بڑھیا کے سپرد کیا گیا جس نے اُسے نہلایا اور اسے اپنے پاس سے ایسا لباس پہنایا جس میں اُس کے بازو اور اُوپر سے گردن اور سینے کا بالائی حصہ عُریاں رہتے۔ یہ شہزادیوں کا لباس تھا جو اُسے پسند نہ آیا لیکن بڑھیا نے اُسے کہا کہ آقا گندی خادمہ کو پسند نہیں کرتے۔ اس نے یہ لباس پہن لیا۔ اس میں اُسے خود شک ہونے لگا کہ وہ خانہ بدوشوں کی بیٹی نہیں۔ اس کے بال دُھل کر نکھرے اور اس کے شانوں پر بکھرنے تو اُسے پتہ چلا کہ اُس کے بال ریشم جیسے ملائم اور چمکدار ہیں۔

بڑھیا اُسی وقت اُسے آقا کے پاس لے گئی۔ اُدھیڑ عمر آقا کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اُس کے اشارے پر بڑھیا باہر نکل گئی۔ آقا نے لڑکی کو قریب بیٹھنے کو کہا۔ لڑکی کھڑی

رہی وہ آقا کی نیت سمجھ گئی۔ آقا نے اُٹھ کر اُسے بازو سے پکڑا تو وہ بازو چھڑا کر پرے ہٹ گئی۔

"مجھے بتایا گیا ہے کہ تم خانہ بدوشوں کی لڑکی ہو۔" آقا نے کہا۔ "مگر اپنے آپ کو تم کسی بادشاہ کی بیٹی سمجھتی ہو۔ میں تم پر حکم نہیں چلا رہا۔ انعام دوں گا۔ شہزادی بنا کر رکھوں گا۔"

لڑکی دروازے میں جا کھڑی ہوئی۔ آقا کے چہرے پر غصہ صاف نظر آنے لگا۔

"میں سونے کے دینار ٹھکرا کر آئی ہوں۔" الحکم کی بیوی نے کہا۔ "اپنے آپ کو نیلام کرنا ہوتا تو شادی نہ کرتی۔ دریا تیر کر پار نہ کرتی۔ تم اپنی دس بیٹیاں میرے خاوند کو دے دو تو بھی تمہارے قریب نہیں آؤں گی۔"

"خاوند سے ہاتھ دھو بیٹھو گی لڑکی!" آقا نے کہا۔ "بچے کو ترستی رہو گی .... ادھر آؤ۔"

وہ باہر نکل گئی۔

آقا نے غصے سے گرج کر بڑھیا کو بلایا۔ اس کے خادم بھی بھاگے آئے اور حرم کی دو عورتیں بھی آ گئیں۔ اپنے آقا کا غصہ ان کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔

"اگر وہ شہزادی ہوتی تو اور بات تھی۔" آقا نے کہا۔ "وہ میری توہین کر گئی ہے۔"

"ہم اُسے گھسیٹ کر لاتے ہیں۔" — ایک خادم نے

"نہیں۔" — آقا نے کہا۔ "اُس خانہ بدوش بھکارن کو وہ سزا دوں گا جس سے میرے گھر میں سب عبرت حاصل کریں۔" اس نے اپنے دو خاص آدمیوں کو بلایا اور انہیں کہا۔ "وہ جھونپڑا دیکھو جس میں یہ بدبخت لڑکی رہتی ہے۔ آج رات اس کے خاوند کو قتل کر دو۔ لڑکی کو میرے پاس لے آؤ۔ اس کے بچے کو تم جہاں چاہو پھینک دینا۔"

حرم کی جو دو عورتیں وہاں موجود تھیں، انہوں نے ایک دوسری کی طرف دیکھا۔ دونوں کے ماتھوں پر شکن آئے۔ آقا غصے سے پھنکار رہا تھا۔ "کوئی شہزادی ہوتی تو میں برداشت کر لیتا۔ کم بخت خانہ بدوش کی یہ جرأت؟ .... سب چلے جاؤ۔"

الحکم کے قتل اور اس کی بیوی کے اغوا کا وقت رات گہری ہونے کے بعد کا رکھا گیا۔ سورج غروب ہوا تو الحکم اپنے جھونپڑے میں آیا۔ اس کی بیوی اپنے کپڑوں میں تھی۔ وہ بڑھیا کا پہنایا ہوا ریشمی لباس اُسی کے کمرے میں پھینک آئی تھی۔ وہ سوچ ہی رہی تھی کہ اپنے خاوند کو آج کی واردات بتائے یا نہ بتائے مگر یہ فیصلہ کر چکی تھی کہ یہاں ایک اور دن بھی نہیں گزارے گی۔ اسے خاوند کو وجہ بھی بتانی تھی کہ وہ کیوں نہیں رہنا چاہتی۔ اُسے یہ تو معلوم ہی نہیں تھا کہ آج رات اپنے خاوند کو آخری بار زندہ دیکھ رہی ہے اور بچہ بھی اس سے چھن جائے گا۔

اُس نے الحکم کے آگے کھانا رکھا تو جھونپڑے میں ایک عورت داخل ہوئی۔ اُس نے جھونپڑے کا دروازہ بند کر دیا اور الحکم سے کہا۔ "کھانا ختم کرو اور اپنی بیوی اور بچے کو ساتھ لو اور یہاں سے نکل جاؤ۔ شہر میں نہ ٹھہرنا۔"

یہ عورت ان دو میں سے ایک تھی جو آقا کی گرج سن کر اُس کے کمرے میں گئی تھیں۔ یہ آقا کی منظورِ نظر تھیں۔ انہوں نے الحکم کی بیوی کی جھلک دیکھی تھی۔ انہوں نے جب آقا کا یہ حکم سنا کہ الحکم کو قتل اور اس کی بیوی کو اغوا کر لیا جائے تو دونوں نے تنہائی میں میاں بیوی کو بچا لینے کا فیصلہ کر لیا۔ دونوں کو اپنا اپنا لڑکپن یاد آ گیا۔ انہوں نے شادی کے خواب دیکھے تھے مگر اس شخص کی بے نکاحی بیویاں بنیں۔ یہاں سے وہ بھاگ نہیں سکتی تھیں۔ یہاں دولت اور اثر و رسوخ کی حکومت تھی۔ اثر و رسوخ اُسے حاصل ہوتا تھا جس کے حرم میں رونق زیادہ ہوتی تھی۔ ان دونوں نے اپنی قسمت کو قبول کر لیا تھا۔ گناہوں کی دنیا میں آ کر وہ سراپا فریب بن گئی تھیں۔ انہوں نے آقا کو حاکموں میں مقبول بنانے کے لیے اپنے جادو چلائے تھے۔ حرم کی سازشوں اور سیاست میں وہ پیش پیش تھیں اور اپنی خوبیوں اور فریب کاریوں کی بدولت آقا پر چھا گئی تھیں مگر ان کے اندر وہ عورت مر نہ سکی جو ایک خاوند، بستروں سے مخمور ازدواجی زندگی کی متمنی ہوتی ہے۔ انسانی فطرت کے تقاضے دبائے نہ جا سکے۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک اور معصوم لڑکی جو ایک دودھ پیتے بچے کی ماں بھی ہے، غریب اور پردیسی بھی ہے، ایک انسان کی ہوس کا شکار ہو رہی ہے۔ وہ خود تو لڑکپن

ہیں معصومیت اور اپنے خوابوں کو بچا نہیں سکی تھیں، انہوں نے اس لڑکی کو بچانے کا فیصلہ کر لیا۔

یہ فیصلہ تو خدائے ذوالجلال کا تھا کہ اس بچے کی ماں گناہ کے پرستاروں سے محفوظ رہے۔ اس کے لیے خدا نے ان دو عورتوں کو سبب بنایا جو گناہوں میں ڈوب چکی تھیں۔ یہ الحکم کی بیوی کے ایمان کا کرشمہ تھا۔

"میں زیادہ دیر یہاں رک نہیں سکتی۔ اس سے زیادہ کچھ بتا نہیں سکتی"۔۔۔ عورت نے کہا۔ "فوراً نکل جاؤ"۔۔۔ اور وہ چلی گئی۔

الحکم نے حیرت سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ بیوی نے اُسے بتا دیا کہ آج دن اس پر کیا گزری ہے مگر الحکم سوچ میں پڑ گیا۔ بیوی نے اسے کہا کہ اٹھو چلیں۔ الحکم چلنے پر آمادہ نظر نہیں آتا تھا۔ اس نے بیوی سے کہا کہ یہ عورت اس گھر کی خادمہ معلوم ہوتی ہے۔ یہ کسی اور نیت سے یہاں آئی تھی۔ الحکم نے کہا کہ وہ آقا سے ملے گا۔ بیوی ضد کرنے لگی کہ انہیں یہاں نہیں رکنا چاہیے۔

وہ دو آدمی جنہیں قتل اور اغوا پر مامور کیا گیا تھا شراب پی رہے تھے۔ ہتھیار ان کے پاس تھے۔ ایک غریب کا قتل اور اس کی بیوی کو اٹھا لانا ان کے لیے کوئی مہم نہیں تھی۔ انہوں نے شام سے پہلے جھونپڑی دیکھ لی تھی۔ انہیں کسی قانون کا ڈر نہیں تھا۔ وہ خوش تھے کہ انہیں انعام ملنے کا ذریعہ پیدا ہو گیا ہے۔ وہ اُٹھے اور الحکم کی جھونپڑی کی طرف چل پڑے۔ وہ ہنستے کھیلتے جا رہے تھے۔ جھونپڑی کا دروازہ بند تھا۔ ایک نے دوسرے سے کہا کہ تم لڑکی کو پکڑ لینا۔ اُس نے دروازہ کھولا۔ اندر اندھیرا تھا۔ ایک نے گرج کر کہا ۔۔۔ "اٹھو اوئے"۔۔۔ مگر اندھیرے میں کوئی ہلچل نہ ہوئی جواب میں کوئی آواز نہ سنائی دی۔ انہوں نے ایک بار پھر للکارا۔ اب کے بھی خاموشی رہی۔ اندھیرے میں ٹٹولا۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ شاید غلط جھونپڑے میں آ گئے تھے۔ وہ دوسرے جھونپڑے دیکھنے چلے گئے۔

الحکم اور اس کی بیوی شہر سے نکل گئے تھے۔

"ہم پر خدا کی زمین تنگ ہو گئی ہے"۔۔۔ الحکم نے کہا۔ اس کے لہجے میں مایوسی تھی

"مایوس نہ ہو میرے بچے کے باپ!"۔۔۔ اس کی بیوی نے کہا۔ "تم یہ تو نہیں مانتے کہ مجھے خدا کی طرف سے اشارے ملتے ہیں۔ مجھے خدا کی ذات پر یہ اعتماد ہے کہ ہم گناہگار نہیں تو ہمیں سزا نہیں مل سکتی۔ میرے دل میں کوئی خوف نہیں۔ میں نے اس بچے کو جنم دیا ہے جس کا اشارہ مجھے قرآن سے ملا ہے"۔

"تم پاگل ہو"۔۔۔ الحکم نے اسے غصے سے کہا۔ "خدا ہم پر اسی لیے ناراض ہے کہ تم دعویٰ کرتی ہو کہ تم نے پیغمبر کو جنم دیا ہے۔ یہ خبط دماغ سے نکال دو۔ قرآن کو تعویذ نہ سمجھو۔ مجھ سے غلطی ہوئی کہ تم سے شادی کر لی ہے۔ بیوی بدصورت ہو تو اچھی رہتی ہے۔ کہ اب میں تمہاری حفاظت کروں یا کہیں کام کر کے تمہارا پیٹ بھروں"۔

"میں اپنی حفاظت خود کر سکتی ہوں"۔۔۔ اس کی بیوی نے کہا۔ "تم قرآن کے معنی بھی جانتے ہو اور ایسی باتیں کرتے ہو"۔

الحکم نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے دل پر افسوس اور غصے کا قبضہ تھا۔ اس نے مذہب اور خدا سے رشتہ توڑ لیا تھا۔

"واپس چلے چلیں؟"۔۔۔ الحکم نے پوچھا۔

"کہاں؟"

"تمہارے قبیلے میں"۔۔۔ الحکم نے جواب دیا ۔۔۔ "وہ لوگ وہیں ہوں گے یا کہیں چل جائیں گے"۔

"پھر کیوں نہ گھوڑوں والے آقا کے پاس چلے جائیں"۔۔۔ اس کی بیوی نے کہا ۔۔۔ "میں اپنے جسم سے تمہیں بہت دولت کما دوں گی۔ تم آنکھیں بند رکھنا یہی سمجھتے رہنا کہ تمہاری بیوی نیک اور پاک ہے۔۔۔ کیا تم مرد ہو؟ کیسے مرد ہو؟ میں اپنے بچے کو تم جیسا مرد نہیں بننے دوں گی"۔

"پہلے یہ دعا کرو کہ بچہ زندہ رہے"۔۔۔ الحکم نے غصے سے کہا۔

"یہ بچہ زندہ رہے گا، اور ایک روز ابراہیمؑ کی طرح تمہیں کہے گا کہ میرے باپ! جو علم مجھے ملا ہے وہ خدا نے تمہیں نہیں دیا، میرے ساتھ آ جاؤ میں تمہیں سیدھے راستے

"پرلے جاؤں گا۔" وہ کچھ نہ کچھ بولتی رہی اور دونوں چلتے گئے۔ اس کی حالت ہذیانی سی ہوتی جا رہی تھی جیسے زبان بے قابو ہو گئی ہو۔ الحکم پر خاموشی طاری ہو گئی تھی۔

اُس رات سے ان کی زندگی خانہ بدوشی کی صورت اختیار کر گئی۔ فرق یہ تھا کہ وہ جنگلوں کی بجائے شہروں میں رہتے تھے۔ الحکم کو کہیں نہ کہیں نوکری مل جاتی تھی۔ سال دو سال کچھ کما کر وہ کہیں اور چلے جاتے تھے۔ بچہ چار سال کا ہوا تو اس کی ماں نے الحکم سے کہا کہ اب کہیں مستقل ٹھکانہ کر لیں جہاں بچے کو کسی مسجد یا کسی استاد کے پاس بٹھا دیا جائے ورنہ یہ بھی بڑا ہو کر ہماری طرح دربدر مارا مارا پھرتا رہے گا۔ ایک آدھ سال پہلے ماں باپ نے بچے کو قرآن کے سبق دینے شروع کر دیئے تھے۔ ماں بچے کو بڑی غور سے دیکھتی رہتی تھی۔ انہوں نے یہ دیکھا کہ بچہ اسی عمر میں عقل کی باتیں کرنے لگا تھا۔ سبق میں پوری دلچسپی لیتا تھا۔ ماں اسے صاف ستھرا رکھتی تھی۔

کسی قصبے میں ماں کی یہ خواہش بھی پوری ہو گئی۔ وہاں کی مسجد کے امام نے بچے کو اپنی شاگردی میں بٹھا لیا۔ بچے کی ماں اور اس کا باپ امام کی خدمت اور مسجد کی دیکھ بھال کرنے لگے۔ امام جب پہلے روز بچے کو پڑھانے لگا تو اس نے محسوس کیا کہ وہ کسی عام بچے کو کورا سبق نہیں دے رہا۔ الحکم مذہبی تعلیم کے پہلے مرحلے سے بچے کو گزار لایا تھا۔ امام اسے اگلے مرحلے میں لے گیا جہاں پانچ چھ سال کی عمر کے بچے نہیں جا سکتے۔ بچہ جو سوال پوچھتا تھا، ان سے پتہ چلتا تھا کہ وہ اپنی پیدائش کے ساتھ خدا سے کچھ علم بھی لایا تھا۔

یہاں بچے نے کم و بیش چار سال تعلیم حاصل کی۔

بچے کی عمر دس گیارہ سال ہو چکی تھی۔ وہ قرآن اور اس کی تفسیر اور حدیث پڑھ چکا تھا۔ اس نے اپنے استاد سے مزید تعلیم لینا چاہی تو امام نے کہا۔ "یہاں میرا علم ختم ہو گیا ہے" ——— بچہ ایک سوال پر سر پٹخ رہا تھا۔ "علم بغیر عمل کے مکمل ہو سکتا ہے؟ اللہ اور اس کے رسولؐ کا پیغام بزور شمشیر جائز ہے؟ میں ساری دنیا میں قرآن کا پیغام کس طرح پہنچا سکتا ہوں؟" ——— اور ایسے بہت سے سوال تھے جو بچہ پوچھتا تھا اور امام پریشان ہو جاتا تھا۔

"قرار الحکم!" ——— ایک روز امام نے بچے کے باپ سے کہا۔ "بچے کو بخارا لے جاؤ" ———

اس نے کسی عالم کا نام لے کر کہا۔ "اسے ان کی شاگردی میں بٹھا دو۔ اگر بچے کی یہ تشنگی نہ بجھی تو یہ پاگل ہو جائے گا۔ اس میں بڑا پیارا جوہر چھپا ہے۔ علم کے ساتھ اگر اس نے سپہ گری سیکھ لی تو یہ بچہ نام پیدا کرے گا۔ یہ دور جنگ و جدل کا ہے۔ مسلمان آپس میں لڑ رہے ہیں اور کفار مسلمانوں کو غلام بنانے اور اسلام کو مٹانے کی ترکیبیں کر رہے ہیں۔ غریبوں کی قسمت اتنی اچھی تو نہیں ہوتی لیکن اس بچے کو موقع مل جائے تو یہ کسی خطے میں اللہ کی حکمرانی قائم کر دے گا، مگر اسے ایسا موقع مل نہیں سکے گا۔ یہ عدل و انصاف کی باتیں کرتا ہے۔ میں نے اسے ایسا سبق کبھی نہیں دیا تھا۔"

"یہ سبق اسے میں نے دیا ہے" ——— قرار الحکم نے کہا ——— "میں کم علم انسان ہوں۔ میں ایران کے بادشاہ نوشیرواں عادل کی نسل سے ہوں۔ باپ دادا مجھے اُس دور کی جو باتیں سناتے تھے وہ میں اس بچے کو سناتا رہتا ہوں۔ قرآن میں بھی اس نے یہی پڑھا ہے۔"

"اسے بخارا لے جاؤ" ——— امام نے کہا۔ "میں خط لکھ دیتا ہوں۔ وہاں تمہیں بڑا اچھا ذریعہ معاش بھی مل جائے گا.... اور خیال رکھنا۔ اکیلے نہ چل پڑنا۔ ان علاقوں میں ڈاکوؤں اور رہزنوں کا بہت خطرہ ہے۔ تمہارے پاس کوئی دولت نہیں لیکن تمہاری بیوی بہت قیمتی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بیوی سے ہاتھ دھو بیٹھو۔ بچے بھی اغوا ہوتے اور غلاموں کی منڈی میں فروخت ہو جاتے ہیں۔ تھوڑے دن رک جاؤ۔ کوئی قافلہ تیار ہو جائے تو اس کے ساتھ جانا۔"

اُس زمانے میں لوگ ڈاکوؤں سے بچنے کے لیے قافلوں کی صورت میں سفر کیا کرتے تھے۔ اکیلے دکیلے مسافر رہزنوں کے ہاتھوں لٹ جاتے تھے۔ کبھی کبھی قافلوں پر بھی حملے ہوتے تھے لیکن قافلے والے مل کر مقابلہ کرتے، باقاعدہ معرکہ لڑا جاتا اور بچ نکلنے کی صورت پیدا ہو جاتی تھی۔ خوبصورت عورتوں اور کمسن بچوں کو فروخت کیا جاتا تھا۔ جن حاکموں اور بادشاہوں کو ڈاکوؤں کا قلع قمع کرنا چاہیے تھا وہی ان کی اغوا کی ہوئی عورتوں اور بچوں کے خریدار ہوتے تھے۔ امام نے ٹھیک کہا تھا۔ الحکم کی بیوی خوبصورتی کی وجہ سے اور اس کا بچہ کمسنی کی وجہ سے ایک دولت تھی جو اکیلے سفر کرتے لٹ سکتی تھی۔

کوئی قافلہ تیار نہ ہوا، ایک قافلہ وہاں سے گزرا جس میں دو سو مرد، عورتیں اور بچے تھے۔ ان میں زیادہ تر سوداگر تھے جو اپنے محافظ ساتھ لائے تھے۔ وہ بلخ اور بخارا جا رہے تھے۔ الحکم اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ قافلے میں شامل ہو گیا۔

سفر کی پہلی رات آئی۔ قافلے نے ایک وادی میں پڑاؤ کیا۔ کھانا پکا۔ سب نے کھایا اور دن کی مسافت کے تھکے ماندے مسافر سو گئے۔ تین چار آدمی پہرے پر کھڑے کر دیئے گئے تھے۔ پہرہ دار چٹانوں پر اور خیمہ گاہ کے اردگرد گھوم پھر رہے تھے۔ آدھی رات کے قریب انہیں گھوڑوں کے ٹاپ سنائی دیئے جو اُن کی طرف بڑھے آ رہے تھے۔ پہرہ داروں نے کمانوں میں تیر ڈال لیے اور چند ایک ایسے آدمیوں کو جگا لیا جو جوان تھے۔ قریب آنے والی آوازیں کسی قافلے کی نہیں تھیں۔ یہ کسی محاذ کو جاتی ہوئی فوج ہو سکتی تھی یا ڈاکو۔

وادی میں مشعلیں نظر آنے لگیں۔ یہ سواروں کے ہاتھوں میں تھیں۔ سواروں نے قریب آ کر گیدڑوں اور بھیڑیوں کی طرح چیخنا شروع کر دیا اور گھوڑوں کو ایڑ لگا دی۔ پہرہ داروں نے تیر چلا دیئے۔ ایک دو سوار گرے لیکن ڈاکو طوفان کی طرح آئے۔ بعض مسافروں کو جاگنے کی بھی مہلت نہ ملی۔ وہ گھوڑوں تلے کچلے گئے۔ قافلے میں جو لڑنے کے قابل تھے، انہوں نے مقابلہ کیا۔ ڈاکوؤں نے مشعلیں پھینک دی تھیں جو زمین پر پڑی جل رہی تھیں۔ ان کی روشنی میں ساری وادی نظر آتی تھی۔ ماؤں نے بچوں کو سینوں سے لگایا اور جدھر منہ آیا بھاگ اٹھیں۔ بعض بچے چیختے چلاتے اکیلے اکیلے بھاگ اُٹھے۔

الحکم نے اپنی بیوی کو بازو سے پکڑا اور اُسے کسی طرف گھسیٹ کر لے گیا۔ بچہ اُن کے ساتھ چلا تھا لیکن الحکم اپنی بیوی کو بڑی مشکل سے ایک چٹان کے پیچھے لے گیا تو وہاں دیکھا کہ بچہ ان کے ساتھ نہیں ہے۔ ماں نے واویلا بپا کیا تو الحکم نے اُسے سختی سے کہا کہ وہ خاموشی سے چھپی رہے ورنہ ڈاکو اسے پکڑ لے جائیں گے۔ اسے جھاڑیوں میں چھپا کر الحکم اپنے بچے کی تلاش میں نکلا۔ وہ خالی ہاتھ تھا۔ آگے بڑھنے سے ڈرتا بھی تھا۔ خیمہ گاہ میں قتل و غارت ہو رہی تھی۔ عورتیں چیخ رہی تھیں۔ بچے چلا رہے تھے۔ ڈاکو

گھوڑوں سے اُتر آئے تھے۔ اور وہ سامان سمیٹ رہے تھے، اور ان میں سے بعض اپنے کام کی عورتوں اور بچوں کو لے جا رہے تھے۔

ڈاکوؤں کے گھوڑے چلے گئے، اور ان کے ساتھ قافلے کے گھوڑے اور اونٹ بھی چلے گئے۔ رات گزر گئی۔ صبح بچے کھچے لوگ جو رات اِدھر اُدھر چھپ گئے تھے، باہر آئے۔ خیمہ گاہ میں لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ قیمتی سامان اور تمام جانور غائب تھے۔ کچھ بچے مرے ہوئے اور کئی لاپتہ تھے، اور جوان عورتیں صرف وہ موجود تھیں جنہیں بھاگنے اور چھپنے کا موقع مل گیا تھا۔ ان میں الحکم کی بیوی بھی تھی۔ وہ دیوانگی کے عالم میں اپنے بچے کو ڈھونڈ رہی تھی۔ اُسے بچہ تو نہ ملا، بچے کا باپ مل گیا مگر وہ زندہ نہیں تھا۔ اُس کے پہلو میں برچھی یا تلوار لگی تھی۔ لاش خون میں لت پت تھی۔ بیوی بالکل ہی پاگل ہو گئی۔ لاشوں کو بکھرے ہوئے سامان اور گرے ہوئے خیموں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی پھر کسی سے پوچھنے لگی — "تم نے میرا بچہ دیکھا ہے؟ سب سے زیادہ خوبصورت تھا۔"

وہاں سب کی حالت یہی تھی۔ کسی نے اس کی طرف توجہ نہ دی۔ وہ چٹانوں پر چڑھی، اتری، جھاڑیوں کو ٹٹولتی پھرتی، وادیوں میں بھاگتی پھری، اس کی دلدوز اور جگر پاش آواز دور دور تک سنائی دیتی تھی — "سبکتگین .... سبکتگین .... آ جاؤ۔ اپنی ماں کے پاس آ جاؤ۔"

لٹا ہوا قافلہ خوف سے کانپتا، آہ و زاری کرتا چل پڑا۔ چلتا گیا اور ویرانوں میں غائب ہو گیا۔ پیچھے جب گدھوں، بھیڑیوں اور گیدڑوں نے لاشوں اور جاں بلب زخمیوں پر ہلہ بولا، وادیوں میں ایک نسوانی پکار سنائی دے رہی تھی — "سبکتگین .... سبکتگین!" اور جب دو چار روز بعد وہاں بکھری ہوئی ہڈیاں رہ گئیں تو بھی یہ نسوانی پکار سنائی دیتی رہی — "اپنی ماں کے پاس آ جاؤ.... سبکتگین.... سبکتگین!"

اس راستے سے گزرنے والے قافلے، ڈاکو، رہزن اور فوجی بہت مدت تک یہ پکار سنتے رہے۔ انہوں نے کئی کہانیاں گھڑ لیں اور اس آواز کو کسی کی بدروح کہہ کر ادھر سے گزرنا چھوڑ دیا۔

قراالکم مرگیا تھا۔ زندہ ہوتا تو اپنی بیوی کو وہاں سے گھسیٹ کر لے جاتا اور اسے بتاتا کہ غریبوں کے بیٹے باطل شکن نہیں شکم پرور ہوا کرتے ہیں۔ تم دل میں جس خواہش کو جگر کے خون سے سینچتی رہی ہو وہ پوری ہونے والی تھی ہی نہیں۔ یہ خواہش وہم بن کر تمہیں کبھی سفید ریش اور نورانی چہرے والے بزرگ کی صورت میں نظر آتی رہی، کبھی تم نے خواب دیکھے اور انہیں حقیقت سمجھ لیا۔ جہاں دولت، دھوکے اور گناہ کی حکمرانی ہوتی ہے وہاں عقل و دانش والوں کی قسمت سو جاتی ہے۔ نام وہ پیدا کرتے ہیں جن کے پیٹ بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ میرے بچے کی ماں! قرآن کے اشارے ہم جیسے خانہ بدوشوں کے بچوں کے لیے نہیں ہوتے۔

خواہش تھی یا وہم، خواب تھا یا حقیقت، جو کچھ بھی تھا، قراالکم کی بیوی کے ساتھ چلا گیا تھا، اور اس پکار میں سمٹ آیا تھا ــــ "سبکتگین ..... سبکتگین" جسے لوگ کسی کی بدروح کی آواز سمجھتے رہتے۔ پھر یہ ماں اور اس کی پکار تاریخ کی تاریکی میں گم ہوگئی۔

اسلام نے غلاموں کی خرید و فروخت اور کسی کو غلام بنا کر رکھنے کی ممانعت کر دی تھی مگر یہ احکام خلافتِ راشدہ سے آگے نہ چل سکے۔ خلافت تو قائم رہی مگر شہنشاہیت کی صورت اختیار کر گئی۔ پھر سازشوں کا مرکز بنی۔ سلطنتِ اسلامیہ مملکتوں اور ریاستوں میں بٹ گئی، اور خلافت برائے نام رہ گئی۔ خلیفہ کی کوئی قوت نہیں تھی۔ کسی کا جی چاہتا تو خلافت کا احترام کرتا تھا۔ ورنہ من مانی کا دور دورہ تھا۔ حرم اور غلامی کی بدعتیں پھر سے شروع ہوگئیں۔ دولت والوں کے حرموں میں لڑکیاں اور کام کرنے کے لیے غلام ہوتے تھے۔ جس کے پاس لونڈیاں اور غلاموں کی افراط ہوتی اسے اتنا ہی دولت مند اور قابلِ احترام سمجھا جاتا۔

بخارا کے ایک میدان میں لوگوں کا ہجوم تھا۔ بولیاں دی جا رہی تھیں۔ کچھ نیلام ہو رہا تھا۔ ہجوم کے سامنے چند ایک خیمے کھڑے تھے۔ ان کے آگے لکڑی کا چبوترہ تھا۔ تین چار لڑکیاں اس چبوترے پر کھڑی تھیں۔ ایک آدمی ایک لڑکی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بلند آواز سے کہتا ــــ "عمر بیس سال، سیدھی اپنے گھر سے آئی ہے۔ جسم دیکھو کوئی بیماری نہیں۔ کسی کے پاس نہیں رہی ..... بولو ..... تازہ مال ہے جی ایک سو دینار ..... بہت تھوڑے ہیں ..... بولو"

یہ لڑکیاں نیلام ہو رہی تھیں۔ خریداروں میں بردہ فروش بھی تھے، قحبہ خانوں والے، رقاصوں کو رقص اور گانا سکھانے والے اور ان میں امرا، وزرا اور حاکموں کے حرموں کے کارندے بھی تھے۔

اس سے ذرا پرے ایک اور منڈی لگی ہوئی تھی۔ یہاں آدمی فروخت ہو رہے تھے۔ ان میں بچے بھی تھے۔ خریدار انہیں یوں دیکھ رہے تھے جس طرح مویشی خریدنے سے پہلے دیکھے جاتے ہیں۔ قیمت بچوں کی زیادہ تھی۔ یہ آٹھ دس بچے تھے۔ سب رو رہے تھے۔ ان کی عمریں آٹھ سے بارہ تیرہ سال تک تھیں۔ صرف ایک بچہ ایسا تھا جس کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے۔ چہرے پر اداسی تھی۔ یہ سب بچے اس قافلے سے اٹھائے گئے تھے جس کے ساتھ الکم اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ جا رہا تھا۔ عورتیں بھی اسی قافلے کے ساتھ تھیں۔

یہ بچہ جو رو نہیں رہا تھا دوسروں سے زیادہ خوبصورت تو نہیں تھا لیکن دوسروں کی نسبت اچھا لگتا تھا۔ اس کی عمر بارہ سال کے لگ بھگ تھی۔ خریداروں میں حاجی نصر نام کے ایک بڑے آدمی کے نوکر بھی موجود تھے۔ انہیں کسی وقت حاجی نصر نے کہا تھا کہ وہ پختہ عمر کے غلاموں کی بجائے دو چار بچے خریدنا چاہتا ہے تاکہ انہیں اپنے سانچے میں ڈھالا جا سکے اور وہ بڑے ہو کر وفادار رہیں۔ اس کے ان خاص آدمیوں نے بچوں کو دیکھا تو فوراً حاجی نصر کو اطلاع دی۔ وہ آیا۔ اُس نے ہر ایک بچے کو دیکھا۔ اُن کے رونے سے وہ گھبرا گیا۔ اسے یہ بچہ پسند آیا جو اداس تھا، رو نہیں رہا تھا۔

"ان رونے والے بچوں میں خوبصورت بھی ہیں مگر انہیں بہلانا آسان نہیں ہوگا" ــــ حاجی نصر نے اپنے آدمیوں سے کہا ــــ "یہ بچہ لے لینے ہیں"۔

اُس نے بچہ خرید لیا۔ بچہ اس کے ساتھ چل پڑا۔ وہ بچے کو گھر لے گیا۔

"تمہارا نام کیا ہے بچے؟" ــــ گھر لے جا کر حاجی نصر نے پوچھا۔

"سبکتگین"

"تمہارے ماں باپ زندہ ہیں؟"

"معلوم نہیں" — سبکتگین نے جواب دیا — "میں سویا ہوا تھا۔ قافلے پر حملہ ہوا تو میری آنکھ کھل گئی۔ گھوڑے ہمارے درمیان سے گزر گئے۔ میں بھاگ اٹھا۔ ایک آدمی نے مجھے پکڑ لیا اور وہاں سے دور لے جا کر میرے ہاتھ پاؤں رسی سے باندھ دیئے۔ پھر ہمیں یہاں لے آئے۔"

"تمہارا باپ کیا کام کرتا تھا؟"

"امیروں کے گھروں میں نوکری چاکری۔"

"تم رو کیوں نہیں رہے؟"

"جواب دینے سے پہلے میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ آپ کا کیا مذہب ہے؟"

"میں مسلمان ہوں" — حاجی نصر نے جواب دیا۔ "میں حاجی ہوں۔"

"پھر مجھے نہیں بلکہ آپ کو رونا چاہئے" — بچے نے جواب دیا — "آپ کا حج قبول نہیں ہوا۔ مجھے میرے باپ نے بتایا تھا کہ قرآن حکیم کا یہ حکم ہے کہ کوئی انسان کسی انسان کو اپنا غلام نہیں بنا سکتا۔ آپ نے مجھ سے پوچھا ہے کہ میں رو کیوں نہیں رہا..... مجھے پتہ نہیں چل رہا کہ روؤں یا ہنسوں یا کیا کروں۔ اگر میری عمر آپ کی طرح پختہ ہوتی تو میرے لیے فیصلہ کرنا آسان ہوتا۔"

حاجی نصر پھڑک اٹھا۔ اسے قطعاً توقع نہ تھی کہ اس عمر کا بچہ ایسی عقلمندی سے جواب دے گا۔ اس نے بچے سے پوچھا کہ اسے یہ باتیں کس نے بتائی ہیں۔ بچے نے جواب دیا کہ اس کا استاد ایک امام مسجد ہے۔ اس نے امام کا نام بتایا اور کہا۔ "میرے باپ نے مجھے عدل و انصاف کے بہت سبق دیئے ہیں جو کہانیوں کی شکل میں تھے۔ میرا باپ کہا کرتا تھا کہ وہ نوشیرواں عادل کی اولاد سے ہے۔ میری ماں مجھے کہا کرتی تھی کہ اسے خوابوں میں ایک نورانی صورت بزرگ نظر آتے ہیں جو اسے بتاتے ہیں کہ وہ ایک بچے کو جنم دے گی جو باطل شکن ہوگا اور حق کی آواز دور دور تک پہنچائے گا۔ بزرگ نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ بچہ میں نہ ہوا تو وہ میری اولاد سے ہوگا۔"

"تم اپنی ماں کے اس عقیدے پر یقین رکھتے ہو؟"

ص۱۔ تاریخ کامل، ابن اثیر۔ کتاب الانساب۔ پند نامہ (مصنفہ سبکتگین)

"اپنی ماں کے عقیدے پر میں کس طرح یقین رکھ سکتا ہوں" — سبکتگین نے جواب دیا — "غلام کا کیا عقیدہ ہو سکتا ہے؟ کیا آپ نے مجھے جانور سمجھ کر نہیں خریدا؟ جانوروں کا کوئی عقیدہ نہیں ہوتا۔"

"بیشک تم میرے غلام ہو لیکن میں جانوروں کی سطح سے تمہیں بہت اوپر رکھوں گا" — حاجی نصر نے کہا — "تم کوئی کام کر سکتے ہو؟"

"مجھے ماں باپ بخارا کے کسی عالم کے پاس لے جا رہے تھے" — بچے نے جواب دیا — "میرے استاد نے انہیں کہا تھا کہ مجھے بخارا لے جا کر اس عالم کی شاگردی میں بٹھا دیں۔"

"میں تمہیں اپنے بچوں کے اتالیق کے حوالے کر دیتا ہوں" — حاجی نصر نے بچے سے متاثر ہو کر کہا — "تم اس کے نوکر ہو گے اور تم ان سے تعلیم و تربیت بھی لے سکو گے۔"

سبکتگین کی اپنی لکھی ہوئی کتاب "پند نامہ" میں مختصر سا ذکر ہے کہ وہ تین سال مکتب میں رہا۔ اس دوران حاجی نصر مکتب سے باہر رہا۔ "کتاب الانساب" میں کچھ تفصیل ملتی ہے۔ سبکتگین بیمار ہو گیا تو حاجی نصر نے اسے مکتب میں ہی رہنے دیا اور خود غیر حاضر رہا۔ کسی بھی پرانی تحریر سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ حاجی نصر کا منصب یا کاروبار کیا تھا، سوائے اس کے کہ وہ امیر کبیر اور اثر و رسوخ والا آدمی تھا۔

سبکتگین جب اتالیق کے پاس گیا تو اتالیق نے اسے ایک نوکر یا غلام سے بڑھ کر کوئی اہمیت نہ دی لیکن پہلے ہی روز بچے نے اپنی اہمیت جتا دی۔ اتالیق بے خبر تھا اور حاجی نصر کے ایک بچے نے قرآن کا کوئی لفظ غلط پڑھا۔ سبکتگین نے خود بچے کی تصحیح کرنے کی بجائے اتالیق کو بتایا۔ اتالیق حیران ہوا کہ یہ بچہ ہے اور نوکر ہے اور یہ قرآن پڑھنے والے کی غلطی درست کر سکتا ہے۔ اس نے سبکتگین سے پوچھا کہ اس نے قرآن کہاں پڑھا ہے۔ سبکتگین نے اسے اپنے متعلق، اپنی ماں اور اپنے باپ کے متعلق سب کچھ بتا دیا۔ اتالیق نے اس میں دلچسپی لینی شروع کر دی۔ حاجی نصر اپنے بچوں کو مذہب کی اتنی زیادہ تعلیم نہیں دلانا چاہتا تھا جتنا انہیں سپاہی بنانے کا ارادہ تھا۔ بچوں کو گھوڑ

سواری، تیراندازی اور تیغ زنی بھی سکھائی جاتی تھی۔ سبکتگین نے بھی سپہ گری کی تربیت لینی شروع کر دی۔

بچے اسے بہت پسند کرتے تھے، کیونکہ وہ ہنس مکھ تھا اور باتیں بہت اچھی کرتا تھا۔ آتالیق نے دیکھا کہ حاجی نصر کے بچے باپ کی دولت کی وجہ سے نہ پڑھنے میں دلچسپی لیتے تھے نہ سپہ گری میں، اور سبکتگین میں عسکری جوہر موجود تھے۔ آتالیق نے اس کی تربیت میں زیادہ دلچسپی لینی شروع کر دی۔

چودہ برس کی عمر میں سبکتگین پختہ کار سپاہی بن چکا تھا اور علم بھی اس نے بہت حاصل کر لیا تھا۔ آتالیق نے اسے اسلام کی تاریخ سے بھی آگاہ کر دیا تھا۔

حاجی نصر واپس آیا تو وہ سبکتگین کو پہچان نہ سکا۔ وہ اب بارہ سال کی عمر کا لڑکا نہیں بلکہ قدآور جوان تھا۔ حاجی نصر نے اس کی سپہ گری کی مہارت اور گھوڑ سواری دیکھی تو وہ حیران بھی ہوا اور خوش بھی۔ اسے حاجی نصر نے کوئی عسکری قسم کا کام دے دیا۔ بعض تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ اسے غلاموں کی تربیت اور نگرانی پر مامور کیا گیا تھا۔ وہ تھوڑے سے وقت میں حاجی نصر کا دست راست بن گیا۔

اُس وقت الپتگین بخارا کا گورنر تھا اور حکومت عبدالملک کی تھی۔ الپتگین حاجی نصر کا دوست تھا۔ ۹۵۹ء (۳۴۸ھ) میں حاجی نصر الپتگین سے ملنے گیا تو سبکتگین اس کے ساتھ تھا۔ اُس وقت سبکتگین کی عمر بیس سال ہو چکی تھی۔ (بعض مورخ عمر زیادہ بتاتے ہیں) یہ پہلا موقعہ تھا کہ خانہ بدوشوں کا بیٹا جسے ڈاکوؤں نے اغوا کیا اور فروخت کر کے غلام بنایا تھا، ایک گورنر سے ملا۔ گورنر الپتگین نے حاجی نصر سے کہا کہ وہ اپنا یہ غلام اسے دے دے۔ حاجی نصر ایسے قیمتی غلام سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں تھا۔ الپتگین نے اسے بہت زیادہ قیمت پیش کی جو حاجی نصر نے قبول کر لی۔

اُس دور میں الپتگین، سبکتگین، بلکاتگین قسم کے نام ترکوں کے ہوا کرتے تھے۔ سبکتگین کی چونکہ ماں ترک تھی اس لیے اس کا نام ماں نے ترکوں کے ناموں کے مطابق رکھا تھا۔ اُس وقت ترکی میں اسلام پھیلا نہیں تھا۔ کوئی کوئی گھرانہ یا کوئی کوئی

آدمی مسلمان تھا۔ حکومت ایسی ظالم تھی کہ لوگ ترکی سے دوسرے علاقوں کو بھاگے جا رہے تھے۔ ان میں سے بعض خانہ بدوش ہو گئے اور باقی غلاموں کی منڈی میں فروخت ہوئے۔ ترک چونکہ جسمانی لحاظ سے تنومند اور دماغی لحاظ سے مستعد اور عقلمند ہوتے تھے، اس لیے ان کی قیمت زیادہ تھی۔ ان کے رنگ گورے ہونے کی وجہ سے اچھے بھی لگتے تھے۔ غزنی، بلخ، بخارا اور گرد و نواح کے علاقوں میں ترک غلام مشہور تھے اور ترکوں کے متعلق یہی سمجھا جاتا تھا کہ یہ غلام ہی ہوتے ہیں اور یہ بڑے اچھے غلام ہوتے ہیں۔

"تم ان ترک غلاموں میں سے ہو جن کے متعلق ان علاقوں کے لوگ کہتے ہیں کہ بڑے اچھے ہوتے ہیں" — الپتگین نے سبکتگین سے کہا جو اس کے دربار میں غلاموں کی طرح کھڑا تھا — "تم مجھ پر یہ ثابت کرنا چاہتے ہو کہ تم وفادار غلام ہو" — وہ چپ ہو گیا۔

سبکتگین نے آقا کے سامنے سر جھکائے خاموش کھڑا تھا۔ الپتگین اس کے قریب آ کر گرج کر بولا — "سر اوپر کر، سینہ پورا کھولو، میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھو۔ تم ترک ہو، میں بھی ترک ہوں" — سبکتگین اس گرج سے چونک اٹھا۔ الپتگین نے اسے بازو سے پکڑا اور اپنے برابر بٹھا لیا۔

"حاجی نصر نے مجھے بتایا ہے کہ تمہارے پاس علم بھی ہے عمل بھی" — الپتگین نے اسے کہا — "انسان صرف علم سے مکمل نہیں ہوتا نہ صرف عمل سے مکمل ہوتا ہے۔ اصل وصف عمل ہے مگر علم کے بغیر یا کسی عالم کی راہنمائی کے بغیر عمل ناکام رہتا ہے اور صرف علم انسان کو گوشہ تنہائی میں چھپائے رکھتا ہے۔ تم میں دونوں وصف ہیں۔"

"مجھ میں ایسی کوئی خوبی نہیں جس سے اتنے بڑے ملک کا حاکم متاثر ہو" — سبکتگین نے کہا۔

"تم میں یہی خوبی کچھ کم نہیں کہ تم ترک ہو اور تم غلام ہو" — الپتگین نے کہا۔ "میں بھی ترک ہوں اور میں بھی غلام تھا۔ تم پر جو گزر رہی ہے وہ مجھ پر گزر چکی ہے۔ میرا لڑکپن ویسا ہی گزرا ہے جیسا تمہارا گزرا ہے۔ تم مسلمان ماں باپ کے گھر پیدا ہوئے تھے، میرے ماں باپ مسلمان نہیں تھے۔ میں غلامی میں مسلمان ہوا۔ کسی نے مجھے پکا مسلمان

نہیں بنایا تھا۔ میں لے ایک عالم سے اسلام کے اصول سنے تھے۔ میرے دل میں تڑپ تھی، پیاس سی تھی۔ میں نے اس عالم کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور اسلام قبول کیا۔ اُس نے مجھے بتایا تھا کہ اسلام کسی انسان کو اجازت نہیں دیتا کہ وہ کسی انسان کو اپنا زرخرید غلام بنائے اور یہ جو حکمران اور حاکم ہوتے ہیں انہیں خدا نے لوگوں کا اور قوم کا خادم کہا ہے۔ حکومت صرف اللہ کی ہے ..... اگر میں مسلمان نہ ہوتا اور اگر میرے دل میں علم اور عمل کی تڑپ نہ ہوتی تو میں اس منصب تک نہ پہنچ سکتا۔"

"میری ماں مجھے کہا کرتی تھی کہ تم بڑے ہو کر نام پیدا کرو گے"۔ سبکتگین نے کہا۔ "وہ کہتی تھی کہ تم حق کی تلوار سے باطل کو کاٹو گے۔ وہ مجھے قرآن کی یہ آیت بار بار رکھاتی اور سناتی تھی کہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ سے کہا کہ تم اپنے بنائے ہوئے خداؤں کو پوجتے ہو جو سن نہیں سکتے، جو بول نہیں سکتے۔ آؤ میں تمہیں صحیح راستہ دکھاؤں گا ..... ماں مجھے کہا کرتی تھی کہ تم اُن لوگوں کو جو اُن خداؤں کو پوجتے ہیں جو نہ سن سکتے ہیں نہ بول سکتے ہیں، اُس معبود کی راہ دکھاؤ گے جس کے سوا کوئی اور معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں ..... میرا باپ کہا کرتا تھا کہ تمہاری ماں کا عقیدہ صحیح ہے لیکن اس کی خواہش غلط ہے۔ غریب کا بچہ نام پیدا نہیں کر سکتا اور اس میں جرأت اور ہمت نہیں ہوتی کہ وہ بادشاہیوں سے ٹکر لے اور لوگوں کو اپنے عقیدے کا قائل کرے۔ یہ نہیں ہو سکتا۔"

"یہ ہو سکتا ہے"۔ الپتگین نے کہا۔ "عرب کے شتربان اور گڈریئے آدھی دنیا سے اپنا عقیدہ منوا کر اللہ کی حکومت قائم کر سکتے ہیں تو بخارا کا امیر الامراء کیا نہیں کر سکتا! تم خانہ بدوشوں کے بیٹے اور غلام میری برابری میں کس طرح آ بیٹھے ہو؟ کوئی غلام ایسا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا۔ تمہاری ماں کے خواب حقیقت بن سکتے ہیں۔ یہاں تک تمہیں تمہارے ایمان اور کردار نے پہنچایا ہے۔ میں نے تم میں وہ جوہر دیکھ لیے ہیں جو تمہیں اور اوپر لے جائیں گے۔"

"لیکن مجھے اپنی ذات کے لیے کچھ نہیں چاہیے"۔ سبکتگین نے کہا۔ "میں کسی منصب کا خواہش مند نہیں ..... میں کچھ چاہتا ضرور ہوں مگر پتہ نہیں چل رہا کہ میں

کیا چاہتا ہوں۔"

الپتگین ہنس پڑا اور بولا۔ "میں اس کیفیت میں سے گزر چکا ہوں۔ میں بھی نہیں جانتا تھا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ پھر میرا ذہن صاف ہو گیا۔ تمہیں جلدی پتہ چل جائے گا کہ تم کیا چاہتے ہو ..... آج سے تم اپنے آپ کو غلام نہ سمجھو۔"

سبکتگین کے سینے میں ایک تڑپ، عقیدے کی اور کچھ سمجھنے اور کچھ کرنے کی تھی۔ اُسے اس کا کوئی غم نہ تھا کہ اس کی ماں نہیں، باپ نہیں اور وہ غلام ہے۔ اُس نے یہ دیکھ لیا تھا کہ اُس کے اندر ایک عظیم مقصد پرورش پا رہا ہے اور اسے اپنے ذہن میں واضح کرنا ہے۔ اس تڑپ کے ساتھ جوانی کی تپش تھی۔ وہ اپنے آپ میں جسمانی قوت کا اُبال بھی محسوس کرتا تھا۔ اس کی توجہ جوانی کے جذبات کی طرف کم نہیں آتی تھی لیکن یہ تغیر اور یہ انقلاب اُسے بے چین رکھتا تھا۔

دوسری شام، سورج غروب ہونے سے پہلے وہ اصطبل سے ایک اعلیٰ نسل کا گھوڑا لے کر سواری کے لیے باہر نکل گیا۔ شہر سے دُور جا کر اُس نے گھوڑا سرپٹ دوڑا دیا اور اس سے جھاڑیاں پھلانگنے لگا۔ اسے دُور سے کسی عورت کی چیخ سنائی دی اور گھوڑے کے سرپٹ دوڑنے کی آواز بھی۔ اُس نے اُدھر دیکھا۔ ایک سوار گھوڑے سے گر رہا تھا۔ اور گھوڑا بے لگام ہو گیا تھا۔ سبکتگین سمجھ گیا کہ گھوڑے کی زین ڈھیلی ہو گئی ہے اور سوار کے دائیں بائیں لڑھکنے اور سنبھلنے کی وجہ سے گھوڑا ڈر کر بے قابو ہو گیا ہے۔ سبکتگین نے اپنے گھوڑے کا رُخ اُدھر کر کے ایڑ لگائی۔

وہ گھوڑا کبھی دائیں کبھی بائیں کو جاتا تھا۔ سبکتگین نے دیکھ لیا کہ سوار مرد نہیں عورت ہے۔ وہ چیخ چلا رہی تھی۔ سبکتگین کا گھوڑا اُس کے قریب پہنچا تو وہ چلانے لگا۔ "رکابوں سے پاؤں نکال لو ..... لگام کھلی چھوڑ دو"۔ بدکے ہوئے گھوڑے نے جب اپنے تعاقب میں ایک اور گھوڑے کو دیکھا تو وہ اور زیادہ تیز ہو گیا۔ آگے ریگستان تھا۔ گھوڑے کا رُخ اُدھر کو ہو گیا۔ سبکتگین نے اپنے گھوڑے کی رفتار اور تیز کی اور گھوڑے کو بدکے ہوئے گھوڑے کے پہلو میں لے گیا۔ تب اُس نے دیکھا

کہ یہ کوئی جوان لڑکی ہے اور کسی امیر وزیر کی بیٹی ہو سکتی ہے۔ سبکتگین نے اُس کے گھوڑے کی باگ کو وہاں سے پکڑا جہاں گھوڑے کا منہ تھا اور اُس نے لڑکی سے کہا کہ وہ اس کے گھوڑے پر کود آئے۔

اس کوشش کے دوران گھوڑے دریا میں چلے گئے۔ لڑکی پانی میں گر پڑی کیونکہ گھوڑے ایک دوسرے سے دور ہو گئے تھے۔ دونوں رُک گئے۔ سبکتگین دریا میں کود ا۔ لڑکی تیر رہی تھی۔ سبکتگین نے اُسے پکڑ لیا۔ کیونکہ یہ دریا پہاڑی ہونے کی وجہ سے بہت تیز تھا۔ اور پانی بہت ٹھنڈا تھا۔ وہ لڑکی کو اپنے اُوپر ڈال کر باہر نکل آیا۔ پھر دونوں گھوڑوں کو پانی سے نکالا۔ لڑکی کو ڈرا ہوا ہونا چاہیئے تھا لیکن وہ ہنس رہی تھی۔

"تم احمق ہو یا دلیر ہو؟" ـــــ سبکتگین نے کہا۔ "تمہاری موت یقینی تھی۔"

"میں اُس باپ کی بیٹی ہوں جو احمق نہیں دلیر ہے" ـــــ لڑکی نے جواب دیا ـــــ "میں بخارا کے حاکم الپتگین کی بیٹی ہوں۔ تم میرے ساتھ چلو۔ انعام دلاؤں گی۔"

"میرے لیے یہی انعام بہت ہے کہ میں نے اپنے محسن کی بیٹی کو موت کے منہ سے نکال لیا ہے" ـــــ سبکتگین نے کہا ـــــ "میں تمہارے گھوڑے کی زین کس دیتا ہوں۔"

دونوں ہم عمر تھے۔ لڑکی خوبصورت تھی۔ سبکتگین میں بھی جسمانی کشش تھی۔ دونوں تنہا ہو گئے تھے۔ لڑکی نے سبکتگین کے ساتھ اپنے گھوڑے کی زین کسی اور دونوں گھر کو چل پڑے۔ راستے میں لڑکی نے اُس سے پوچھا کہ وہ کون ہے۔ سبکتگین نے اپنے متعلق سب کچھ بتا دیا۔

"رات ابا آپ کا ذکر کر رہے تھے" ـــــ لڑکی نے کہا۔ "وہ شاید تمہیں اپنی فوج میں کوئی عہدہ دیں گے۔"

"اپنی فوج؟" سبکتگین نے کہا ـــــ "اُن کی اپنی فوج کیسے ہو سکتی ہے؟ فوج تو حکمران کی ہوتی ہے۔"

"ابا نے کچھ اور سوچ رکھا ہے" ـــــ لڑکی نے کہا ـــــ "وہ حکومت کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے ہیں، اس لیے بخارا میں جو فوج ہے اس میں اپنے حامی سالار وغیرہ متعین کر رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ حکمران صرف نام کے مسلمان ہیں عیش و عشرت میں پڑے ہوئے ہیں اور یہ لوگ مذہب کی توہین کرتے ہیں۔ ابا کا ارادہ یہ ہے کہ صحیح معنوں میں اسلامی سلطنت قائم کی جائے۔ تمہارے متعلق کہہ رہے تھے کہ کام کا نوجوان ہے۔"

گھر کے قریب پہنچے تو ایک آدمی کھڑا تھا جو رُتبے والا معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے دونوں کو دیکھا۔ دونوں کے کپڑوں سے پانی ٹپکتا دیکھا۔ لڑکی کا حلیہ بدلا ہوا اور بال بکھرے ہوئے اور بے ترتیب دیکھے تو اُس کا چہرہ غصے سے سُرخ ہو گیا۔ اس کے قریب جا کر دونوں گھوڑوں سے اُترے۔

"کہاں سے آ رہی ہو؟" ـــــ اس آدمی نے لڑکی سے پوچھا ـــــ "اور یہ کون ہے؟"

"اور تم کون ہو جو حاکموں کی طرح مجھ سے پوچھتے ہو؟" ـــــ لڑکی نے کہا ـــــ "گھوڑا بے قابو ہو گیا تھا، اور مجھے دریا میں لے گیا تھا۔ یہ میرے پیچھے آیا اور دریا سے نکال لایا" ـــــ لڑکی نے سبکتگین کو بازو سے پکڑا اور اُسے اپنے گھر لے گئی۔

"کون ہے یہ؟" ـــــ سبکتگین نے پوچھا۔

"میرا منگیتر" ـــــ لڑکی نے جواب دیا ـــــ "ابھی سے مجھ پر حکم چلانے لگا ہے.... تم اس سے نہ ڈرنا" ـــــ وہ ایک کمرے میں چلے گئے تھے۔ لڑکی نے بے ساختگی سے سبکتگین کے سامنے آ کر اُس کے ہاتھ پکڑ لیے اور پوچھا ـــــ "تمہاری بیوی ہے؟"

"نہیں۔"

"کوئی لڑکی کبھی تمہیں اچھی لگی ہے؟"

"لڑکیوں کی طرف کبھی دھیان نہیں دیا۔"

"میں اچھی نہیں لگتی؟"

سبکتگین چپ چاپ کھڑا رہا اور اُس کی نظریں جھک گئیں۔

"تم نے کیا سمجھا ہے؟" لڑکی نے پوچھا ـــــ "مجھے بے حیا کہا ہے؟.... بے شرم سمجھا ہے؟.... بولو سبکتگین! اگر مجھے یہی کچھ سمجھا ہے تو میں پھر کبھی تمہاری صورت

نہیں دیکھو گی۔"

"تم کسی اور کی منگیتر ہو؟"

"یہ میرے ابا کا فیصلہ ہے" — لڑکی نے کہا — "یہ آدمی مجھے پسند نہیں۔ یہ مجھے لونڈی بنا کے رکھے گا۔ یہ مجھے کیا کرتا ہے کہ گھوڑ سواری چھوڑ دو۔ مجھے اپنے حرم کی زینت بنانا چاہتا ہے۔ مجھے نمائش کی ایک خوبصورت چیز سمجھتا ہے۔ مجھے ایسا مرد چاہیے جس نے تمہاری طرح لڑکیوں کی طرف کبھی دھیان نہ دیا ہو اور جو میرے ساتھ گھوڑا دوڑائے، میرے ساتھ دریا میں کود جائے۔ میں حرموں کے بادشاہوں کو بتانا چاہتی ہوں کہ اسلام کا زوال اس روز شروع ہوا تھا جس روز تم نے عورت کو سنگھار اور زیبائش کی زنجیروں میں باندھ دیا تھا۔ تم عورت کو اپنے سفلی جذبات کی تسکین کا ذریعہ بنا کر خوار ہوئے۔ اپنے اوپر شراب کا نشہ طاری کر کے تم ذلت کو عظمت سمجھ رہے ہو۔ عورت ایک طاقت ہے مگر تم نے عورت کو اپنی کمزوری بنا رکھا ہے... سبکتگین! حرم کی عورتوں کے بطن سے جو بچے پیدا ہوتے ہیں وہ عظمتِ اسلام کے پاسبان نہیں ہوتے، ہو سکتے ہی نہیں۔ میں اس بچے کو جنم دوں گی جو اسلام کو دور دور تک پھیلائے گا مگر مبلغ اور عالم بن کر نہیں، مجاہد اور تیغ زن بن کر۔"

"میری ماں بھی ایسے ہی خواب دیکھا کرتی تھی" — سبکتگین نے کہا — "مگر اس کا بیٹا غلاموں کی منڈی میں نیلام ہوا۔"

"اسلام کے پاسبان تم جیسے غلام ہوں گے، میرے باپ جیسے غلام ہو سکے" — لڑکی نے کہا — "میرے ابا نے تمہیں بتایا نہیں کہ وہ بھی غلاموں کی منڈی میں نیلام ہوئے تھے؟ آج ان کا رتبہ اور منصب دیکھ لو۔ ان کے ارادے اور ان کا عقیدہ دیکھ لو۔"

"تمہیں کس نے بتایا ہے کہ تم جس عظیم بچے کے جنم کے خواب دیکھ رہی ہو وہ بچہ میرا ہوگا؟" — سبکتگین نے کہا — "یہ جوانی کا جوش ہے، شباب کا خمار ہے۔"

"یہ میرے دل کی آواز ہے" — لڑکی نے جوشیلی سی جھنجھلاہٹ سے کہا — "یہ میری روح کی آواز ہے۔ اپنے دل کو اتنا مردہ نہ کرو سبکتگین!... اگر تم میری محبت کو جسمانی یا محض جذباتی سمجھتے ہو تو یہی سمجھو لیکن میری محبت کو ٹھکرا نہ دینا۔ میں اس شخص کے ساتھ شادی نہیں کروں گی۔"

سبکتگین وہاں سے نکلا تو وہ اپنے اندر عجیب سی ہلچل محسوس کر رہا تھا۔ ایک تو اس کا علم ادھورا تھا جو اسے پریشان رکھتا تھا۔ اس کے دل میں ایک عزم اور ایک مقصد تھا جو ابھی پوری طرح واضح نہیں ہوا تھا۔ اب اس لڑکی نے اس کے ایسے جذبات کو بیدار اور مشتعل کر دیا جن کے متعلق اسے علم ہی نہیں تھا کہ اس میں موجود ہیں۔ اس پر خمار سا طاری ہو گیا۔ اسے صرف اپنی ماں کے جسم کا لمس یاد تھا جس کے ساتھ لگ کر وہ سکون کی نیند سویا کرتا تھا۔ نیند نہ آتی تو سکون ایسا ملتا جو اس کی روح میں اتر جاتا تھا۔ دوسرا جسم اس لڑکی کا تھا جسے اس نے دریا سے نکالتے اپنے بازوؤں میں لیا اور اپنے ساتھ لگایا تھا۔ اس وقت اس نے کچھ بھی محسوس نہیں کیا تھا، سوائے اس کے کہ اس لڑکی کو بچانا اس کا فرض ہے۔

اب لڑکی نے اس کے ساتھ جو باتیں کیں ان سے اس کی ذات میں بھونچال جیسے جھٹکے آنے لگے۔

"یہی وجہ ہے کہ دولت والوں نے حرم آباد کر رکھے ہیں" — اس نے سوچا — "عورت ایک قرار ہے، سکون کا سرچشمہ ہے، ایک خمار ہے۔ انسان تھوڑے سے مطمئن نہیں ہوتا۔ قانع نہیں ہوتا۔ وہ دوسری عورت لاتا ہے، تیسری اور چوتھی لانے کے لیے ناجائز طریقوں سے دولت کماتا ہے۔ بادشاہوں کا خوشامدی بنتا اور انعام پاتا ہے۔ پھر بھی تسکین نہیں ہوتی تو ایمان نیلام کر دیتا ہے۔ اپنے مذہب اور قوم کے دشمن کے آگے بھی جا سجدے کرتا اور زر و جواہرات سے جھولیاں بھرتا ہے۔ یہ تباہی عورت سے شروع ہوتی ہے اور شراب تک پہنچاتی ہے... کیا میں بھی اسی راہ پر چل پڑوں گا؟"

"عورت زیبائش کی چیز نہیں" — اسے الپتگین کی بیٹی کے الفاظ یاد آنے لگے — "عورت بہت بڑی طاقت ہے جسے ان لوگوں نے اپنی بہت بڑی کمزوری بنا لیا ہے" — سبکتگین کو اپنی ماں اور اس کی باتیں یاد آنے لگیں اور اس کے اندر

وہ قوت بیدار ہونے لگی جو ماں نے پیدا کی تھی۔ ایک ایسی عورت کی پیدا کی ہوئی قوت جو بہت خوبصورت تھی۔ اسے سوداگروں نے سونے کے درہم و دینار پیش کیے تھے مگر اُس نے بھی الپتگین کی بیٹی کی طرح سوچا تھا کہ وہ زیبائش کی چیز نہیں۔ اسے اُس بچے کو جنم دینا ہے جو ابراہیمؑ کی طرح اپنے باپ سے اور اپنے قبیلے سے کہے گا کہ تم اُن بتوں کی پُوجا کرتے ہو جو سُن سکتے ہیں نہ بول سکتے ہیں۔ یہ لڑکی بھی یہی کہتی ہے۔

"کیا ہر عورت ایسی ہی خوش فہمیوں اور وہموں میں مبتلا ہوتی ہے؟"

نوشیرواں عادل کو ایک عورت نے ہی جنم دیا تھا۔" سبکتگین کے اندر سے یہ آواز اٹھی۔ یہ آواز اس کے اُستاد کی تھی جو چھوٹی سی مسجد کا امام تھا۔ اس میں اُس کی ماں اور اُس کے باپ کی آوازیں بھی شامل تھیں۔ یہ اُس کے بچپن کی آوازیں تھیں۔ یہ تعلیم و تربیت کی آوازیں تھیں — "عورت کو تفریح اور عیاشی کا ذریعہ بنالو تو طارق بن زیاد، محمد بن قاسم اور نوشیرواں پیدا نہیں ہُوا کرتے ہیں۔"

وہ سر جھکائے ہوئے انہی خیالوں میں گم چلا جارہا تھا۔ اُس نے اپنے گھوڑے کی باگ پکڑ رکھی تھی اور گھوڑے کے آگے آگے پیدل جارہا تھا۔ لڑکی اُس کے دل پر غالب آتی چلی جارہی تھی۔ وہ محسوس کررہا تھا کہ لڑکی بہت اچھی ہے اور وہ اسے پھر بھی ملے گا۔ ضرور ملے گا۔

"او ئے ٹھہرو۔"

ظلم و وحشت کی جھیل میں کسی کی بھاری آواز کا پتھر آن گرا۔ اُس نے رُک کر دیکھا۔ لڑکی کا منگیتر بڑی تیزی سے آرہا تھا۔ سبکتگین کے پاس آکر رُک گیا۔

"حاجی نصر کے بیچے ہوئے غلام کی آئندہ یہ جرأت نہ ہو کہ شہزادیوں کے گھروں میں جا گھسے۔" اس شخص نے کہا۔ "تم ہمارے غلام ہو۔ اگر تم نے حاکم بخارا کی بیٹی کو گھوڑے سے گرنے سے بچایا اور اسے دریا سے نکالا ہے تو یہ تمہارا فرض تھا۔ اس کا تمہیں انعام نہیں مل سکتا۔ اگر تم اسے نہ بچا سکتے تو ہم تمہیں قید خانے میں ڈال کر بھوکا مار دیتے۔"

"میں آزاد ہوں۔" سبکتگین نے بُردباری سے کہا۔ "اور غلام تم ہو۔"

"کیا بکتے ہو۔" اُس نے غصے سے کہا۔ "بھاگو یہاں سے۔ آئندہ اصطبل سے بغیر اجازت گھوڑا نہ کھولنا۔"

"تم اپنے دل کے غلام ہو۔"

"میں تمہارا سر تن سے جُدا کر دوں گا۔" سبکتگین کو غلام سمجھتے ہُوئے لڑکی کے منگیتر نے جو جوانی کی عمر سے کچھ آگے چلا گیا تھا، تلوار نکال لی۔

سبکتگین کے کمربند میں لمبا خنجر تھا۔ اُس نے گھوڑے کی باگ چھوڑ کر خنجر نکال لیا اور بولا — "ڈیڑھ ہاتھ لمبی تلوار کو ڈیڑھ بالشت لمبا خنجر میرے قدموں میں نہ گرا دے تو تمہارے آگے جھک جاؤں گا۔ بڑے شوق سے میرا سر تن سے جُدا کر دینا مگر اس سے پہلے اپنی منگیتر سے پوچھ آؤ کہ وہ تمہیں قبول بھی کرتی ہے یا نہیں۔"

اس آدمی نے سبکتگین کے تیور دیکھے۔ ذرا سی دیر کھڑا رہا اور غصے میں تلوار نیام میں ڈال کر بہت تیزی سے چلا گیا۔ سبکتگین نے خنجر کمربند میں ڈالا، اور گھوڑے پر سوار ہو کر اصطبل کی طرف چلا گیا۔ شام گہری ہو چکی تھی۔ اپنے کمرے میں پہنچا ہی تھا کہ الپتگین کی طرف سے بلاوا آگیا۔ وہ انہی کپڑوں میں جو ابھی خشک نہیں ہوئے تھے، چلا گیا۔

"ابو اسحاق سے تمہارا کیا جھگڑا ہوا ہے؟" الپتگین نے پوچھا۔

سبکتگین نے سارا واقعہ سُنا دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ اس کی بیٹی نے اُسے کیا کہا ہے۔ الپتگین کو یہ صاف گوئی پسند آئی۔

"اپنی بیٹی کا ہاتھ میرے ہاتھ میں نہ دیں۔" سبکتگین نے کہا۔ "میری کوئی حیثیت نہیں مگر اپنی بیٹی کی شادی اس آدمی کے ساتھ کرنے کی غلطی بھی نہ کریں۔"

الپتگین گہری سوچ میں کھو گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے سر اٹھا کر کہا۔ "تم جاؤ سبکتگین!"

"اگر آپ ناراض ہیں تو میں معافی نہیں مانگوں گا۔" سبکتگین نے کہا۔ "میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ میں جھوٹ جیسے گناہ کا بھی مرتکب نہیں ہوا۔"

الپتگین نے مسکرا کر اتنا کہا کہ چلے جاؤ۔

دوسری شام الپتگین کی بیٹی (کسی تاریخ میں اس کا نام نہیں ملتا) حسبِ معمول گھوڑسواری کے لیے نکل گئی۔ سبکتگین بھی اصطبل سے گھوڑا لے کر دریا کی طرف نکل گیا۔ دو گھوڑے دُور دُور تھے، مختلف سمتوں کو جا رہے تھے مگر دُور دریا کے کنارے جا کر ان کے رُخ ایک دوسرے کی طرف ہو گئے، پھر وہ اکٹھے ہو گئے، رُک گئے۔ سوار اترے اور دریا کے کنارے بیٹھ گئے۔

"وہ مجھے ملا تھا" — لڑکی نے اپنے منگیتر کے متعلق بتایا — "بہت غصے میں تھا۔ کہنے لگا میں فوج کا کماندار ہوں اور تم ایک غلام سے کہتی رہی ہو کہ تم نے مجھے قبول نہیں کیا۔ میں نے اُسے صاف بتا دیا کہ میں نے اپنے باپ کے حکم کا احترام کرتے ہوئے اُسے قبول کیا ہے۔ اس نے کچھ دھمکیاں دیں پھر منت سماجت کرنے لگا۔ میں نے اُسے ٹالنے کے لیے کہا کہ میرے ابا سے بات کرو..... رات ابا نے مجھے الگ بٹھا کر کہا کہ سبکتگین نے مجھے ساری بات بتا دی ہے۔ انہوں نے تمہاری صاف گوئی اور بے باکی کی بہت تعریف کی۔ میں نے انہیں بتایا کہ یہ منگیتر مجھے پسند نہیں۔ یہ اچھا آدمی ہے معلوم ہوتا ہے کہ آج دن کو کسی وقت اس کی اور ابا کی باتیں ہوئی ہیں۔"

سبکتگین اس لڑکی کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا جو اسی جیسی جوان تھی۔ کل سے زیادہ خوبصورت لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے کے ایک ایک نقش کو وہ دیکھ رہا تھا۔ لڑکی نے اس کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ وہ اس کے اتنے قریب ہو گئی کہ اس کے جسم کی تپش بھی وہ محسوس کرنے لگا، پھر اس نے اس کی سانسوں کی بھی تپش محسوس کی۔ اس کا اپنا دل اتنی زور سے دھڑک رہا تھا کہ اُسے اس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

"میری ماں تمہاری طرح خوبصورت تھی" — سبکتگین نے کہا۔

"تمہارا بیٹا بھی یہی کہا کرے گا" — لڑکی نے کہا اور ہنس پڑی۔

سورج دریا کے دوسرے کنارے کی چٹان کی اوٹ میں چھپ گیا، پھر شام گہری ہونے لگی اور دریا کے اس کنارے بیٹھے ہوئے دو سائے ایک سایہ بن گئے۔ دریا کی لہروں کا جل ترنگ اور زیادہ پُرسوز ہو گیا۔

ایک مہینہ گزر گیا — سبکتگین الپتگین کے دل میں اتنا اُتر گیا تھا کہ اُس کا معتمدِ خاص اور مشیر بن گیا۔ الپتگین نے اسے اپنا ایک منصوبہ ان الفاظ میں بتا دیا تھا — "مسلم قوم کا شیرازہ بکھر گیا ہے۔ قوم ریاستوں اور چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ گئی ہے۔ کفار انہیں عیاشیوں کا عادی بنا کر انہیں ایک دوسرے کا دشمن بنا رہے ہیں۔ خلافت جو قوم کے مرکز کی علامت تھی ایک برائے نام منصب بن کر رہ گئی ہے۔ ہمارا حکمران عبدالملک ہے۔ اس کی زندگی میں ہی اس کی گدی کے امیدوار اور ان کے حامی آپس میں لڑنے لگے ہیں۔ میرا ارادہ یہ ہے کہ عبدالملک کے مرنے کے بعد اس کے کسی بیٹے کو تخت پر بٹھا دوں مگر اس کا بڑا بیٹا امیر منصور ایسا نہیں ہونے دے گا۔ میں اس صورت میں منصور کا تختہ اُلٹ کر غزنی میں اپنی خود مختار حکومت قائم کر دوں گا۔"

"آپ کی فوج جو یہاں (بخارا میں) ہے آپ کا ساتھ دے گی؟" — سبکتگین نے پوچھا۔

"سالار عبدالملک سے نالاں ہیں" — الپتگین نے جواب دیا۔ "اس کی نسبت وہ میرا حکم ماننے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ میرا ارادہ یہ ہے کہ غزنی کو مرکز بنا کر اردگرد کی مسلمان ریاستوں کو متحد کروں اور کفار کے خلاف جہاد کا آغاز کر دیا جائے۔ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو وہ وقت دور نہیں جب اسلام کی حکمرانی جو ٹکڑوں میں بٹی ہوئی ہے ٹکڑا ٹکڑا غائب ہونے لگے گی۔ معلوم ہوا ہے کہ ہندوستان کے حکمران جو ہمارا جے کہلاتے ہیں لغمان (درہ خیبر) کے راستے ہم پر حملے کے لیے پر تول رہے ہیں۔"

"غزنی کا تختہ الٹنے کا کام آپ مجھے سونپ دیں" — سبکتگین نے کہا — "اس کے لیے ہمیں بہت بڑی فوج کی ضرورت نہیں۔ منصور اور اس کے حامی حاکموں کو گرفتار کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ اپنے منصوبے کے عملی پہلوؤں اور خطروں پر غور کر لیں"

— اس نے ذرا سوچ کر کہا — "آپ محتاط نہیں۔ اتنے بڑے منصوبوں کی کامیابی کے لیے رازداری ضروری ہوتی ہے۔ آپ کا یہ منصوبہ مجھے آپ کی بیٹی سنا چکی ہے۔ اسے اس سے بے خبر ہونا چاہیے تھا۔ اب آپ محتاط ہو جائیں۔ اگر آپ نے اپنے راز چھپائے

رکھے اور دشمن کے راز حاصل کر لیے تو آپ آدھی جنگ جیت جائیں گے۔

الپتگین کو سبکتگین پر اعتماد تھا لیکن اسے یہ توقع نہیں تھی کہ سبکتگین اتنا ذہین اور دور اندیش ہے۔ دونوں نے تخت الٹنے کے منصوبے پر ہر پہلو سے غور کیا اور ایک کارآمد منصوبہ تیار ہو گیا۔

ادھر غزنی کو اسلامی سلطنت کا مرکز بنانے کا منصوبہ تیار ہوا ادھر ایک منصوبہ سبکتگین کے قتل کا تیار ہو گیا۔ یہ الپتگین کی بیٹی کے منگیتر ابو اسحاق نے تیار کیا تھا۔ رتھوں کی دوڑ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ یہ فوج کے سواروں کا مقابلہ تھا جس میں سبکتگین کو بھی شامل ہونے کے لیے مدعو کیا گیا تھا اور اس میں ابو اسحاق کو بھی شامل ہونا تھا۔ ایک وسیع میدان میں مقابلے کے لیے رتھیں کھڑی کی گئیں۔ ہر ایک کے آگے ایک ایک گھوڑا جتا ہوا تھا۔ پہلی دوڑ میں بیس رتھیں تھیں۔ دوڑ شروع ہوئی تو ابو اسحاق نے اپنی رتھ کچھ آگے لے جا کر سبکتگین کی رتھ کے قریب کر لی اور اس کے پہلو کے ساتھ اپنی رتھ دوڑانے لگا۔ سبکتگین نے دیکھا کہ ابو اسحاق اپنی رتھ ذرا آگے کر کے اس کی رتھ کو ایک طرف ہو جانے پر مجبور کر رہا تھا۔ اس طرح اس نے دو تین بار کیا تو سبکتگین نے اپنی رتھ اس کے گھوڑے کے قریب کر کے اسے ایک طرف دھکیلنے لگا۔

تماشائیوں نے چیخ و پکار بنا رکھی تھی۔ رتھیں ہوا سے باتیں کر رہی تھیں ابو اسحاق نے اپنا ہنٹر جو وہ گھوڑے کو مار رہا تھا وہ سبکتگین کو مار دیا مگر سبکتگین نے اپنی رتھ اس کے گھوڑے کے ساتھ لگائے رکھی ابو اسحاق نے چلا کر کہا — "خدا کے لیے ایک طرف ہٹ جاؤ" — سبکتگین نے اپنی رتھ پرے ہٹا لی اور اس کے ساتھ ہی ابو اسحاق کا گھوڑا زمین میں دھنس گیا۔ رتھ اوپر کو گئی اور گھوڑے سے آگے گری۔ ابو اسحاق ہوا میں اڑا اور اپنی الٹی ہوئی رتھ پر گرا۔ پیچھے آنے والی رتھ کا گھوڑا اتنی جلدی رک نہ سکا۔ وہ ابو اسحاق کی رتھ پر چڑھ گیا اور ابو اسحاق جو گرنے سے بے ہوش ہو چکا تھا کچلا گیا۔ سبکتگین نے اپنی رتھ روکی اور واپس آ گیا۔

سب دوڑے گئے۔ دیکھا گیا کہ وہاں گہرا گڑھا تھا جس میں ابو اسحاق کا گھوڑا گرا

تھا۔ اس میدان میں پہلے ایسا کوئی گڑھا نہیں تھا۔ وہاں درختوں کی لمبی اور خشک شاخیں بھی پڑی تھیں۔ ابو اسحاق مر چکا تھا۔ اسی وقت تحقیقات شروع ہو گئی۔ الپتگین نے اعلان کر دیا کہ جو کوئی اس گڑھے کا راز بتائے گا اسے انعام دیا جائے گا۔

شام تک راز فاش ہو گیا۔ اس دوڑ کا اہتمام ابو اسحاق نے ہی کیا تھا۔ اس نے اپنے ایک ہمراز دوست سے کہا تھا کہ وہ سبکتگین کو دوڑ میں شامل ہونے کے لیے کہے۔ دوست نے یہ کام کر دیا۔ ابو اسحاق نے رات کو یہ گڑھا کھدوایا۔ اس کے اوپر خشک ٹہنیاں رکھیں اور اوپر مٹی بکھیر دی۔ گڑھے کی باقی مٹی میدان میں پھیلا دی۔ ڈھکے ہوئے گڑھے پر اس نے کوئی نشانی رکھ دی تھی۔ ابو اسحاق دوڑ کے دوران اسی لیے اپنی رتھ سبکتگین کی رتھ کے قریب لے آیا تھا کہ اسے گڑھے کی سیدھ میں لے جائے۔ سبکتگین کو تو معلوم ہی نہیں تھا کہ اسے موت کے گڑھے میں لے جایا جا رہا ہے۔ اس نے ابو اسحاق کی رتھ کو اپنی رتھ سے پرے دھکیلنا شروع کر دیا۔ اتنے میں گڑھا آ گیا۔ یہاں آ کر ابو اسحاق نے چلا کر کہا کہ خدا کے لیے ایک طرف ہٹ جاؤ — مگر گڑھا آ گیا۔ ابو اسحاق اپنے ہی کھودے ہوئے گڑھے میں اپنے گھوڑے اور رتھ کے ساتھ ایسا گرا کہ موت سے بچ نہ سکا۔ اس نے دوستوں سے کہا تھا کہ سبکتگین کو مار کر وہ الپتگین کی بیٹی کے ساتھ شادی کر سکے گا۔

"خدا نے تمہیں کسی عظیم کام کے لیے زندہ رکھا ہے" — الپتگین نے سبکتگین سے کہا — "میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ میرے منصوبے کی کامیابی کے لیے تم نے وہی کارروائی کی جو تم نے بتائی تھی تو تم میرے داماد ہو گے اور مجھے اس پر فخر ہو گا۔"

اس واقعہ سے ایک آدھ سال بعد غزنی کا حکمران عبدالملک مر گیا۔ الپتگین نے اپنے اثر و رسوخ سے کوشش کی کہ عبدالملک کا چھوٹا بیٹا تخت نشین ہو لیکن بڑے بھائی منصور کی موجودگی میں الپتگین کی خواہش پوری نہ ہو سکی۔ دو روز بعد سبکتگین تین سو منتخب سواروں کے ساتھ غزنی گیا اور ظاہر یہ کیا وہ بخارا کے لوگوں کی طرف سے مبارکباد پیش کرنے آیا ہے مگر اس نے اندر جا کر منصور کو گرفتار کر لیا اور اس کے سواروں نے ہدایت کے مطابق محافظ دستے کو گھیرے میں لے کر ہتھیار ڈلوا لیے۔

منصوبے کی اگلی کڑی کے مطابق الپتگین نے جو فوج کے ساتھ غزنی کے قریب آچکا تھا، طوفان کی طرح آکر شہر کے اہم مقامات پر قبضہ کر لیا۔

گلیوں اور بازاروں میں اعلان ہونے لگے "ظالموں کی حکومت ختم ہو چکی ہے۔ ہم عدل و انصاف لائے ہیں۔ ہم اللہ اور رسولؐ کی حکمرانی لائے ہیں۔" پہلے روز سے ہی ایسے احکام جاری کیے جانے لگے جو لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے تھے۔ جوں جوں دن گزرتے گئے لوگ نمایاں طور پر محسوس کرنے لگے کہ ظلم و تشدد، بدنظمی اور بے انصافی کا دور ختم ہو چکا ہے۔ انھوں نے دل و جان سے نئی حکومت کو قبول کر لیا۔

الپتگین کی حکومت ۹۶۲ء (۳۵۱ھ) میں قائم ہوئی تھی۔ اس نے سبکتگین کو امیر الامرا بنا دیا اور اپنی بیٹی کی شادی اس کے ساتھ کر دی مگر اگلے ہی سال ۹۶۳ء میں الپتگین مر گیا۔ اس کے بیٹے اسحاق نے باپ کی گدی سنبھال لی مگر خوشامدیوں اور چاپلوس قسم کے مشیروں کے گھیرے میں آگیا۔ وہ اس سے اپنے مطلب اور مفاد کے احکام صادر کرانے لگے جو اس کے باپ کے احکام کے الٹ تھے۔ لوگ ایک بار پھر پریشان ہونے لگے۔

امیر سبکتگین نے ایک بار پھر دانشمندی اور جرأت کا مظاہرہ کیا، اور ایک صبح لوگوں نے یہ خبر سن کر سکون محسوس کیا کہ ان کے حاکم اسحاق کو قید خانے میں ڈال دیا گیا ہے اور ان کا نیا سلطان سبکتگین ہے۔ یہ ایک لمبی داستان ہے کہ سبکتگین نے کس طرح اسحاق کو معزول کیا اور کس طرح قوم کی کایا پلٹ دی۔ اس نے فوج اور لوگوں کے دل جیت کر کئی علاقے اپنی سلطنت میں شامل کر لیے اور سب سے پہلے ہندوستان کی طرف توجہ دی۔

اس نے ایک رات خواب دیکھا کہ اس کے محل کے ایک کمرے میں ایک درخت پیدا ہوا جو بڑھتا گیا، چھت پھاڑ کر اوپر چلا گیا اور یہ اتنا زیادہ پھیلا کہ آدھی دنیا پر سایہ کر لیا۔ اس خواب نے سبکتگین کو پریشان کر دیا۔ اس نے خواب اپنی بیوی کو سنایا۔ وہ چپ رہی۔ اس کے فوراً بعد اس کے گھر بیٹا پیدا ہوا۔[1] اس سے اس کی پریشانی اپنے آپ ہی دور ہو گئی۔ اس کی بیوی نے اسے کہا "آپ کے خواب کی تعبیر آپ کے سامنے آگئی ہے۔ میں نے اس بچے کو جنم دیا ہے جو باطل شکن ہوگا۔ آج محرم کی دسویں ہے۔ اس اشارے کو سمجھیے۔"

سبکتگین نے بچے کا نام محمود رکھا۔ بچہ خوبصورت نہیں تھا۔ اس کا رنگ گہرا سانولا تھا مگر سبکتگین نے اسے اپنی توجہ کا مرکز بنا لیا۔ بچپن میں ہی اسے قرآن حفظ کرانا شروع کر دیا۔ اس کے لیے خاص اتالیق رکھے جنہوں نے محمود کو علم بھی دیا اور جنگی تربیت بھی۔ وہ پندرہ سال کا ہوا تو باپ اسے راجہ جے پال کے خلاف جنگ میں لے گیا۔ اسے ہندوؤں کے خلاف لڑا کر کہا "تم بت شکن بنو گے۔"

اور یوں نوشیرواں عادل کی نسل سے ایک بت شکن پیدا ہوا۔[2]

---

[1] صاحب طبقات ناصری کے حوالے سے

[2] صاحب طبقات ناصری بحوالہ بیہقی

جب مسلمان مسلمان سے ٹکرایا

غزنی کے مضافات میں ایک باغ تھا باغ کے وسط میں چھوٹا سا ایک مکان تھا جس کی ساخت اور تعمیر بتاتی تھی کہ کسی شہزادے یا کسی امیر وزیر کا مکان ہے تھوڑا ہی عرصہ پہلے یہاں باغ تھا نہ مکان۔ ویرانہ تھا۔ اب یہ ویرانہ سبزہ زار بن گیا تھا۔ اس میں رنگ برنگے پھولوں کے تختے تھے راہ جاتے لوگ رک کر دیکھتے اور باغ اور مکان کی دلکشی میں کھو جاتے تھے غزنی کے رہنے والے اس باغ کے اردگرد گھومتے پھرتے اور اپنے سلطان سبکتگین کے بیٹے محمود کے ذوق کی داد دیتے تھے۔

یہ باغ اور اس میں یہ مکان محمود غزنوی نے اپنے باپ کو بتائے بغیر چند سال پہلے بنوانا شروع کیا تھا۔ اس نے اپنی ماں سے اجازت لے لی تھی محمود اپنے ماں باپ کا بدصورت اور کوتاہ قد لڑکا تھا۔ اس کے بھائی اچھی شکل وصورت کے تھے لیکن ماں کو سب سے زیادہ پیار محمود سے تھا محمود نے چند سال پہلے جب اسے کہا تھا کہ وہ ایک باغ اور اس باغ میں ایک بہت ہی خوبصورت مکان بنانا چاہتا ہے تو ماں نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ ماں کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

"میں نے آپ کے دل کو تکلیف پہنچائی ہے۔ مادر محترم!" محمود غزنوی نے ماں سے کہا۔ "میں مکان نہیں بنواؤں گا۔"

"نہیں بیٹا!" ماں نے کہا۔ "میں تمہیں خود مکان بنوا دوں گی جس کے اردگرد باغ ہو گا۔"

"پھر آپ کی آنکھوں میں آنسو کیوں آ گئے ہیں؟"

"مجھے وہ وقت یاد آ گیا ہے جب تم پیدا ابھی نہیں ہوئے تھے" ماں نے کہا

"ابھی میں تمہارے باپ کی بیوی نہیں بنی تھی میں ایک شہزادے کی منگیتر تھی لیکن میرے دل اور میری روح میں تمہارا باپ بس گیا تھا مجھے اپنا منگیتر اس لیے پسند نہیں تھا کہ وہ مجھے اپنے حرم کی زینت بنانا چاہتا تھا مجھے کہا کرتا تھا کہ گھوڑسواری چھوڑ دو میں گھر سے دریاؤں میں کودنے اور تیرنے کی شوقین تھی گھوڑسواری اور تیراکی میرے مشاغل تھے میں خوبصورت تو تھی مگر میں نمائش کی چیز نہیں بننا چاہتی تھی۔ میں نے تمہارے باپ سے کہا تھا کہ مجھے وہ خاوند چاہیے جو میرے ساتھ گھوڑا دوڑائے اور جو دریا میں کود جائے....

"میرے عزیز بیٹے! میں حرموں کے بادشاہوں اور امراکو بتانا چاہتی تھی کہ مسلمانوں کا زوال اسی روز شروع ہو گیا تھا جس روز عورت کو سنگھار اور زیبائش کی زنجیروں میں باندھ کر اسے سفلی جذبات کی تسکین کا ذریعہ بنا لیا گیا تھا میں نے تمہارے باپ سے کہا تھا۔ سبکتگین! حرم کی عورتوں کے بطن سے جو بچے پیدا ہوتے ہیں وہ عظمت اسلام کے پاسبان نہیں بن سکتے میں اس بچے کو جنم دوں گی جو اسلام کو دور دور تک پھیلائے گا مگر مبلغ اور عالم بن کر نہیں، مجاہد اور تیغ زن بن کر....

"تمہارے باپ نے ہنس کر کہا۔ میری ماں بھی ایسے ہی خواب دیکھا کرتی تھی مگر میں غلاموں کی منڈی میں نیلام ہوا تھا۔ میں نے اسے کہا تھا۔ اسلام کے پاسبان تم جیسے غلام ہوں گے، دولت والے تو اسلام کو ڈبوئیں گے میرا باپ بھی غلاموں کی منڈی میں نیلام ہوا تھا لیکن غزنی کا سلطان بنا۔ میں نے تمہارے باپ سے کہا تھا کہ میں جس عظیم بچے کے جنم کے خواب دیکھ رہی ہوں وہ بچہ تمہارا ہو گا.... یہ میرے دل کی نہیں میری روح کی آواز تھی سبکتگین کے ساتھ میری محبت جسمانی اور جذباتی نہیں تھی میری روح میں خدا بول رہا تھا....

"خدائے بزرگ و برتر نے اپنی خدائی کا کرشمہ دکھایا میں تمہارے باپ کی بیوی بن گئی۔ تمہارا باپ جو میرے باپ کی طرح غلاموں کی منڈی میں نیلام ہوا تھا غزنی کی سلطنت کا سلطان اور میرے باپ کا جانشین ہوا پھر خدائے ذوالجلال نے تمہارے

باپ کو اشارہ دیا تھا۔ تمہاری پیدائش سے ایک رات پہلے باپ نے یہ خواب دیکھا کہ محل کے ایک کمرے میں ایک درخت اُگا جو بڑھتا چلا گیا۔ درخت چھت پھاڑ کر اوپر چلا گیا اور پھیلنے لگا۔ اس نے آدھی دنیا کو اپنے سائے میں لے لیا۔ تمہارا باپ اس خواب سے کچھ پریشان تھا۔ تم پیدا ہوئے تو میں نے تمہارے باپ سے کہا۔ آپ کے خواب کی تعبیر آپ کے سامنے آ گئی ہے۔ میں نے اُس بچے کو جنم دے دیا ہے جو باطل شکن ہو گا۔ آج محرم کی دسویں ہے۔ اس اشارے کو دیکھیں۔ تم عاشور کی رات پیدا ہوئے تھے۔"

"آپ پہلے بھی مجھے یہ کہانی سنا چکی ہیں" ـــ محمود غزنوی نے کہا۔ "آج آپ نے اتنا زیادہ جذباتی ہو کر وہی بات پھر کیوں سنائی ہے؟"

"اس لیے کہ تمہارا دل باغوں کی رنگینی اور مہک میں اور مکانوں کی دلکشی میں نہ اُلجھ جائے" ـــ ماں نے جواب دیا۔ "اور میرے آنسو اس لیے بہ نکلے تھے کہ تم شہزادے ہو مگر تمہاری عمر جنگلوں اور صحراؤں میں، پہاڑوں اور ویرانوں میں باطل کے خلاف لڑتے گزرے گی۔ میں تمہیں یاد دلانا چاہتی ہوں کہ تم محل کے لیے نہیں، میدانِ عمل کے لیے پیدا ہوئے ہو۔۔۔ تم باغ کے لیے جگہ پسند کر لو اور کام شروع کرا دو۔ جب کبھی میدانِ جنگ سے لوٹو تو دو چار دن اپنی پسند کے مکان میں رہ لیا کرنا۔"

محمود غزنوی نے کام شروع کرا دیا۔ مکان کے لیے تجربہ کار کاریگر اکٹھے کر لیے اور جب راجہ جے پال کی فوج غزنی پر حملے کے لیے آئی*، باغ سرسبز ہو چکا تھا۔ پھول کھل آئے تھے۔ درختوں کے پودے اُٹھ آئے تھے اور اس کے وسط میں ایک خوشنما مکان جس کی دلکشی دیکھنے والوں کی نظروں کو گرفتار کر لیتی تھی، تعمیر ہو چکا تھا۔

* پنجاب کے راجہ جے پال نے غزنی پر حملہ کیا تھا مگر غزنی سے دُور ہی لڑائی ہوئی۔ ہندو فوج پسپا کم اور تباہ زیادہ ہوئی تھی۔ مالِ غنیمت اتنا زیادہ تھا کہ سبکتگین کی فوج کو یہ سامان، اخراجات، گھوڑے، ہاتھی اور اونٹ سمیٹتے بیس دن لگ گئے تھے۔ فتح کا جشن بڑی دھوم سے منایا گیا۔ سبکتگین جب غزنی واپس گیا تو محمود غزنوی نے اسے بتایا کہ اس کا باغ اور مکان

مکمل ہو چکے ہیں۔

"آپ کو یہ میرا چھوٹا سا مکان بہت پسند آئے گا" ـــ محمود غزنوی نے سلطان سبکتگین سے کہا ـــ "آپ دیکھیں گے؟"

سبکتگین کو محمود کی ماں نے بتا دیا تھا کہ ان کا بیٹا غزنی کے مضافات میں اپنے لیے چھوٹا سا ایک مکان بنا رہا ہے۔ سبکتگین اسے چھوٹا سا ہی سمجھ رہا تھا لیکن محمود کے کہنے پر جب وہ اُس کے مکان کو دیکھنے گیا تو ٹھٹھک کے رہ گیا۔ یہ مکان نہیں بلکہ چھوٹا سا محل تھا اور باغ شاہانہ تھا۔

"محمود!" ـــ سلطان سبکتگین نے بیٹے سے کہا۔ "خدا تمہیں یہ محل، یہ باغ اور پھول مبارک کرے۔ تمہارا ذوق عمدہ ہے۔ یہ ایک شہزادے کا ذوق ہے لیکن تم صرف شہزادے نہیں، اسلام کے شاہسوار بھی ہو۔ تم ایک سلطان کے نہیں اسلام کے بیٹے ہو۔۔۔ شاید تم بھول گئے ہو کہ تم ایک غلام کے بیٹے ہو۔ خدا نے مجھے سلطانی عطا کی ہے لیکن اس کے ساتھ ایک فرض سونپا ہے۔ یہ فرض میری ماں کو اُس وقت خوابوں میں اور غیب کے اشاروں کے ذریعے معلوم ہو گیا تھا جب وہ میرے باپ کی ابھی بیوی نہیں بنی تھی۔ مجھے یہ فرض دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے۔۔۔

"میں اسے خدا کی بہت بڑی نعمت سمجھتا ہوں کہ اس مقدس فرض کی ادائیگی مجھے اور میری نسل کو عطا کی گئی ہے۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں اور تمہاری ماں بھی تمہیں بتا چکی ہے کہ تم نے ایک شہزادے اور ایک عام بچے کے روپ میں جنم نہیں لیا۔ میری ماں کی طرح تمہاری ماں کو بھی اس کی روح نے اشارہ دیا تھا کہ وہ ایک باطل شکن کو جنم دے گی۔"

"تو آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مجھے اتنا خوبصورت مکان نہیں بنانا چاہیے تھا؟" ـــ محمود غزنوی نے مایوس ہو کر کہا۔

"ضرور بنانا چاہیے تھا" ـــ سلطان سبکتگین نے کہا۔ "میں تمہیں بتانا یہ چاہتا

ہوں کہ کوئی بھی آدمی جس کے پاس دولت ہے، ایسا مکان بنا سکتا ہے لیکن جو فرض تمہیں سونپا گیا ہے، وہ ہر کوئی ادا نہیں کر سکتا۔ لوگ اونچے مکان اور شہزادے اور بادشاہ اونچی یادگاریں صرف اس لیے بناتے ہیں کہ ان کے مرنے کے بعد بھی لوگ انہیں یاد رکھیں اور ان کا نام لیں مگر اینٹوں اور پتھروں کی عمارتیں مٹ جایا کرتی ہیں۔ یادگار لوگوں کے دلوں میں تعمیر کرو۔ کام وہ کرو جس کی یاد تاریخ کے ہر دور میں تازہ ہو۔ اپنے نام کو ایک مکان کی دیواروں میں قید نہ کرو۔ اسے تاریخ کے چہرے پر کبھی نہ مٹنے والا نقش بنا دو...... اے محمود! دولت، عورت اور خوشنما مکان انسان کی بہت بڑی کمزوریاں ہیں۔ یہ زنجیریں ہیں جن میں جو بندھ جاتا ہے، وہ بنی نوع انسان کے لیے شیطان بن جاتا ہے۔ تم جوان ہو محمود! لڑکپن اور جوانی کا یہ سنگم زندگی کا بڑا ہی خطرناک دوراہا ہوتا ہے۔ انسان اپنے سود و زیاں کو کم ہی دھیان میں رکھتا ہے۔ اگر تم اس عمر میں دنیا کی رنگینی کی راہ پر چل پڑے تو واپسی کے تمام راستے بند ہو جائیں گے۔"

"آپ مجھے اس مکان میں نہیں دیکھیں گے" — محمود غزنوی نے کہا — "میں یہ کبھی بھی نہیں بھولا کہ میں مردِ میدان ہوں۔"

"اگر تم میری زندگی میں کفار سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے تو میں تمہیں اسی مکان میں دفن کروں گا" — سلطان سبکتگین نے کہا — "تمہاری پسند کا یہ مکان تمہاری روح کی پسند کا مقبرہ ہو گا اور یہ باغ ہمیشہ ہرا بھرا رہے گا۔"

سلطان سبکتگین نے ٹھیک کہا تھا۔ آج غزنی کے مضافات میں محمود غزنوی کے اس مکان اور اس باغ کا نام و نشان نہیں ملتا۔ ہندوستان پر اس کے سترہ حملوں کے سترہ یادگاری مینار پورے سترہ نہیں رہے۔ بعض مینار گر کر غائب ہو چکے ہیں لیکن تاریخ میں محمود غزنوی کا نام روشن مینار کی طرح زندہ و تابندہ ہے۔ محمود غزنوی بت شکن کے نام سے ہمیشہ زندہ رہے گا۔

راجہ جے پال تھوڑا ہی عرصہ پہلے مہاراجہ بننے جاتے ہوئے پشاور سے گزرا تھا تو

اس کی شان اور اس کی جنگی طاقت کو دیکھ کر پہاڑ لرز رہے تھے جیسے راستہ دے رہے تھے۔ لوگ ڈر کے مارے دور بھاگ گئے تھے۔ جب راجہ جے پال شکست کھا کر واپس پشاور میں داخل ہوا تو لوگ دور دور سے دوڑے آئے اور حیرت سے دیکھنے لگے کہ یہ ان کا مہاراجہ ہے یا اس کی بدروح۔ اس کی جنگی طاقت لٹے پٹے قافلے کی طرح چلی آ رہی تھی۔ گھوڑوں اور ہاتھیوں کے بھی سر جھکے ہوئے تھے۔ ان کی چال بتاتی تھی کہ یہ کسی بھی قدم پر گر پڑیں گے۔

پشاور میں راجہ کا جو محل تھا وہاں اس کے استقبال کے لیے نقارے بجے۔ محل کے محافظ تعظیم کے لیے دو رویہ کھڑے ہو گئے۔ راجہ نے غصے سے پھٹ کر کہا — "بند کرو یہ غل غپاڑہ" — اس نے اپنے ساتھ کے کسی آدمی سے کہا — "دونوں پنڈتوں کو فوراً حاضر کرو۔"

محل کی فضا میں سناٹا طاری ہو گیا۔ وہاں جو انسان تھے، وہ تو جیسے مر گئے تھے۔ اس سکوت میں دو تین آدمیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں — "پنڈت کہاں ہیں .... پنڈت جی مہاراج کہاں ہیں؟"

راجہ اس کیفیت میں محل کے ایک کمرے میں ٹہل رہا تھا کہ غصے سے اس کی سانسیں دھونکنی کی طرح چل رہی تھیں اور وہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے اپنے دائیں ہاتھ کا گھونسہ بنا کر اپنی ران پر بڑی زور سے ہاتھ مارتا تھا۔ اسے پتہ نہ چل سکا کہ دونوں پنڈت کمرے میں داخل ہو کر دست بستہ کھڑے ہیں۔ یہ سب سے بڑے پنڈت تھے جو بھٹنڈہ میں رہتے تھے۔ اب چونکہ راجہ نے لاہور سے پیش قدمی کی تھی اس لیے وہ لاہور آ گئے تھے۔ انہوں نے ہی راجہ کو کوچ کا شبھ دن بتایا اور یقین دلایا تھا کہ اسے دنیا کی کوئی طاقت شکست نہیں دے سکتی۔ دونوں پنڈت اس کے ساتھ پشاور تک گئے تھے، اور جب راجہ اپنی فوج کے ساتھ پشاور سے نکلا تھا تو دونوں پنڈت گھنٹیاں بجاتے راستے میں کھڑے تھے۔ ان کے ساتھ بارہ کنواریاں تھیں جن کے ہاتھوں میں طشتریاں اور طشتریوں میں اگربتیاں جل رہی تھیں۔ وہ کوئی مذہبی گیت گا رہی تھیں۔ انہوں نے راجہ کے راستے میں پھولوں کی پتیاں بکھیری تھیں۔

"مہاراج!"۔۔۔ ایک پنڈت نے کہا۔ "ہم حاضر ہیں۔"

راجہ رک گیا۔ اُس نے پنڈتوں کو دیکھا۔ اس کی بوڑھی آنکھوں میں قہر اُترا ہُوا تھا۔ وہ سچ اور جھوٹ کے درمیان معلق ہو کے رہ گیا تھا۔

"کیا تم نے جھوٹ بولا تھا یا تمہاری پوتھی نے جسے دیکھ کر تم نے مجھے کوچ کا شبھ دن بتایا تھا؟"۔۔۔ راجہ جے پال نے ان سے پوچھا۔

"نہ ہم نے جھوٹ بولا تھا نہ ہماری پوتھی نے"۔۔۔ ایک پنڈت نے جواب دیا۔۔۔ "ستارے جھوٹ نہیں بولا کرتے، مہاراج! ہم آپ کو پھر حساب جوڑ کر بتا سکتے ہیں۔"

"تم لاکھ حساب جوڑو، میرے سامنے اس وقت یہ شرمناک حقیقت ہے کہ میں شکست کھا کر آیا ہوں اور میری فوج تباہ ہو گئی ہے"۔۔۔ راجہ نے کہا۔۔۔ "اس کی کیا وجہ ہوئی؟ تم لوگوں نے کہا تھا کہ فلاں دن کوچ کرو تو فتح ہوگی۔ تم نے کہا تھا کہ دیوی کی آشیرباد مل گئی ہے۔ تم نے کہا تھا کہ پنڈتوں کو ساتھ لے جاؤ۔ وہ مورتیاں اور کشن مراری کے بُت ساتھ لے جائیں گے اور لڑائی سے پہلے سپاہیوں کے سامنے یہ بُت اور مورتیاں رکھ کر پرارتھنا کرانا، پھر یہ سپاہی پہاڑوں کو بھی ڈھا دیں گے۔ میں نے یہ سارا انتظام کیا۔ وہاں جا کر دیکھ جہاں لڑائی ہوئی تھی۔ وہاں بتوں کے ٹکڑے اور مورتیوں کے پرخچے بکھرے ہوئے ہیں۔ پنڈتوں نے سپاہیوں کو ان کے سامنے بٹھایا، گھنٹیاں بجنے لگیں اور پرارتھنا شروع ہوئی تو مسلمانوں نے ہم پر اس طرح ہلہ بول دیا جس طرح اچانک بگولہ آتا اور راستے میں جو کچھ آئے اڑا کر لے جاتا ہے...."

"تم سمجھتے ہو گے کہ وہ لشکر کی صورت میں آئے تھے۔ نہیں، حملہ کرنے والوں کی تعداد پچاس اور سو کے درمیان تھی۔ رات کا وقت تھا جب عموماً لڑائی نہیں ہُوا کرتی۔ ہمارے کشن مراری کے بُت اور مورتیاں ہمارے اپنے سپاہیوں کے پاؤں تلے روندی گئیں جو ان کے آگے ہاتھ جوڑ کر عبادت کر رہے تھے۔ پنڈت بھاگ گئے۔ سپاہی بکھر گئے۔ اس کے بعد میری فوج کسی بھی وقت مسلمانوں کے سامنے ٹھہر

نہ سکی۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میری فوج کی تعداد تین لاکھ تھی اور مسلمانوں کی فوج کی تعداد ہم سے چار گنا کم تھی۔"

"ہم حساب جوڑ کر بتائیں گے مہاراج!"۔۔۔ ایک پنڈت نے کہا۔۔۔ "معلوم ہوتا ہے ستارے ٹکرا گئے ہیں۔"

راجہ جے پال کو غصے نے باؤلا کر رکھا تھا۔ ایک طرف پنڈتوں کی پوتھیاں اور ستاروں کا علم تھا۔ دوسری طرف اس کے سامنے یہ انتہائی تلخ حقیقت تھی کہ وہ کس عزم کے ساتھ تین لاکھ کا لشکر لے کر غزنی پر قبضہ کرنے اور اس تمام علاقے یعنی آج کے تمام تر افغانستان کو ہندوستان میں شامل کرنے گیا تھا۔ وہ ہندوستان کو مہا بھارت بنانے کا خواب دیکھ رہا تھا مگر وہ اپنی فوج کو سلطان سبکتگین کی فوج کے رحم و کرم پر چھوڑ کر اس کیفیت میں بھاگا کہ پشاور تک اُس نے پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔

اُس کے لیے یہ صورتِ حال بہت ہی تکلیف دہ تھی۔۔۔ وہ چار پانچ ریاستوں کی فوج اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اسے ان مہاراجوں کا سامنا کرنا تھا۔ ایک صورت اور بھی پیدا ہو گئی تھی۔ اُس زمانے میں یہ دستور تھا کہ جو مہاراجہ دو بار دشمن سے شکست کھائے اُسے حکمرانی سے دستبردار ہونا پڑتا تھا۔ جے پال دوبارہ شکست کھا چکا تھا۔ اُسے اپنے بیٹے کے حق میں راج سے دستبردار ہونا تھا۔ اس کا بیٹا انند پال نوجوان تھا۔ جس طرح سلطان سبکتگین نے محمود غزنوی کو عسکری تربیت دی تھی، اسی طرح جے پال نے اپنے بیٹے کو جنگجو بنا دیا تھا مگر انند پال ابھی ریاست کا راج سنبھالنے کے قابل نہیں تھا۔ راجہ جے پال کو یہ خطرہ نظر آ رہا تھا کہ دوسرے مہاراجے اسے راج سے ہٹ جانے کو کہیں گے۔ ان مہاراجوں کی بھی فوجیں تباہ ہوئی تھیں۔ ان حالات میں راجہ جے پال کا دماغی توازن قائم نہیں رہا تھا جب پنڈت نے اسے کہا کہ وہ حساب جوڑ کر بتائیں گے کہ ان کا پہلا حساب جس میں انہوں نے راجہ کو فتح کی خوشخبری سنائی تھی کیوں غلط نکلا ہے، تو غصے سے راجہ

کے ہاتھ کانپنے لگے۔

"میں تمہیں یہ بھی بتا دوں، کہ مسلمان تمہاری طرح زائچے بنائے بغیر لڑنے آئے تھے"۔

راجہ جے پال نے کہا ۔۔۔ "انہوں نے ستاروں کے راستے نہیں دیکھے تھے۔ ہمارے ہاتھ مسلمان فوج کے بہت تھوڑے جنگی قیدی آئے ہیں۔ ان میں سپاہیوں کی تعداد زیادہ ہے۔ وہ اونچے عہدے کے فوجی ہیں۔ میں انہیں تمہارے سامنے کھڑا کر کے پوچھوں گا کہ وہ اپنے مولویوں سے جوتش اور نجوم کے ذریعے فتح کی خوشخبری لے کر آئے تھے؟ ..... مجھے شک ہونے لگا ہے کہ مسلمانوں کا یہ کہنا سچ ہے کہ پتھر کے خدا جھوٹے ہیں۔ مسلمان جس خدا کی عبادت کرتے ہیں، وہ مجھے سچا خدا معلوم ہوتا ہے۔"

"چھی، چھی، چھی ..... مہاراج!" ۔۔۔ ایک پنڈت نے کہا ۔۔۔ "مسلمان ملیچھ ہیں۔ اپنے دیوتاؤں کو اس لیے جھوٹا نہ کہیں کہ آپ کو شکست ہوئی ہے۔ اس کی کئی اور وجوہات ہو سکتی ہیں۔ اس کی یہ وجہ ہرگز نہیں کہ مسلمانوں کا مذہب سچا ہے۔"

"کسی کے گھر ڈاکہ پڑتا ہے تو گھر لٹ جاتا ہے" ۔۔۔ دوسرے پنڈت نے کہا ۔۔۔ "اس سے یہ مطلب ہرگز نہ لیں کہ ڈاکوؤں کا خدا سچا ہے۔ اور لٹنے والوں کا جھوٹا۔"

"میں اپنے مذہب کو سچا سمجھ کر اسے مسلمانوں کے علاقوں میں پھیلانے کے ارادے سے گیا تھا" ۔۔۔ راجہ جے پال نے کہا ۔۔۔ "دیوتاؤں نے میری کیوں مدد نہیں کی؟ مسلمان ہمارے بتوں اور مورتیوں کے ٹکڑے دیکھ کر ہمارے مذہب پر ہنس رہے ہوں گے۔"

"مہاراج! ہمیں زائچہ بنانے کے لیے مہلت دیں۔"

"میں مہلت دیتا ہوں" ۔۔۔ راجہ جے پال نے کہا ۔۔۔ "لیکن ذرا ٹھہرو۔ میں مسلمان قیدیوں کو بلاتا ہوں۔ تم بیٹھ جاؤ۔"

راجہ نے کمرے میں لٹکتا ہوا گھڑیال بجایا۔ دربان اندر آیا تو راجہ نے اسے اپنے دو جرنیلوں کے نام لے کر کہا کہ انہیں فوراً بلا لاؤ اور ان دو مسلمان قیدیوں کو بھی لے آؤ جنہیں دوسرے قیدیوں سے الگ رکھا گیا ہے۔

راجہ جے پال اپنی مسند پر بیٹھا ہوا تھا۔ دربار کے دستور کے مطابق اس کے دو پنڈت اس کے دائیں بیٹھے تھے اور ان کے ساتھ دونوں جرنیل۔

دو خوش وضع گٹھے ہوئے جسموں والے اور دراز قد آدمی اندر لائے گئے۔ ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پاؤں میں بیڑیاں تھیں۔ وہ تھے تو قیدی لیکن ان کی چال ڈھال میں وقار اور جلال تھا۔ ان کے چہروں پر خوف نہیں تھا۔ ندامت نہیں تھی۔ وہ سبکتگین کی فاتح فوج کے کماندار تھے۔ انہوں نے آخری معرکے میں شب خون مارا تھا جو اتنا دلیرانہ تھا کہ دشمن کے عقب میں چلے گئے اور پکڑے گئے تھے۔ دونوں کے جیشوں نے دشمن کو بہت نقصان پہنچایا تھا مگر انہیں خاصی جانیں قربان کرنی پڑی تھیں۔

راجہ جے پال کے ساتھ ایک ترجمان تھا جو غزنی کے خطے کی زبان بولتا اور سمجھتا تھا۔ راجہ نے اس کی وساطت سے دونوں قیدیوں سے باتیں کیں۔

"میں تم دونوں سے کوئی جنگی راز معلوم نہیں کرنا چاہتا" ۔۔۔ راجہ جے پال نے کہا ۔۔۔ "مجھے یہ بتاؤ کہ جب تمہاری فوج لڑائی کے لیے جاتی ہے تو تمہارے مولوی یا جوتشی تمہارے بادشاہ کو بتاتے ہیں کہ فلاں دن کوچ کرو، ورنہ نقصان اٹھاؤ گے؟"

"نہیں" ۔۔۔ غزنی کے ایک جنگی قیدی نظام اوزیری نے جواب دیا ۔۔۔ "ہماری لڑائی ہمارے دین کے دشمن کے خلاف ہوتی ہے۔ دین کے دشمن آپ بھی ہیں، عیسائی اور یہودی بھی ہیں، اور ہمارے مسلمان بھائی بھی ہمارے دین کے دشمن ہو سکتے ہیں۔ ہماری لڑائی جہاد کہلاتی ہے۔ ہم اپنی ریاست کی توسیع کے لیے کسی ملک پر حملہ نہیں کیا کرتے چونکہ ہم خدا کی راہ میں، خدا کے سچے مذہب کی خاطر لڑتے ہیں، اس لیے ہم کوچ، پیشقدمی اور حملے کے لیے ہر دن کو مبارک دن سمجھتے ہیں۔ دن ہو یا رات، بارش ہو یا طوفان، حکم مل جائے تو ہم جہاد کے لیے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔"

"کیا مسجدوں میں تمہارے مولوی اور امام تمہاری کامیابی کے لیے خاص قسم

کی دعائیں مانگتے ہیں؟"

"ہر وہ فرد جو جہاد میں شریک نہیں ہوتا، جہاد پر جانے والوں کے لیے دعا کرتا ہے" ـــــ نظام اودیزی نے جواب دیا۔ "ہر وہ شخص، مرد یا عورت، بچہ یا بوڑھا، خدا کے ساتھ براہِ راست ہمکلام ہو سکتا ہے"

"کیا تم بتا سکتے ہو کہ تمہاری کامیابی کا راز کیا ہے؟" ـــــ راجہ جے پال نے پوچھا۔ "کیا تمہیں معلوم تھا کہ میری فوج کی تعداد کیا تھی؟"

"ہمیں صرف یہ بتایا گیا تھا کہ دشمن کی تعداد ہماری نسبت بہت زیادہ ہے" ـــــ نظام اودیزی نے جواب دیا۔ "آپ کے لشکر کی صحیح تعداد کا علم سلطان اور اس کے سالاروں کو ہوگا۔ ہماری کامیابی کا راز یہ ہے کہ ہم اپنی جانیں خدا کے حوالے کر دیتے ہیں۔ ہمارے جسم نہیں ہماری روحیں لڑا کرتی ہیں"

"یہ میں جانتا ہوں" ـــــ راجہ جے پال نے کہا۔ "میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ اتنی کم نفری سے اتنے بڑے لشکر پر کس طرح غالب آجاتے ہو، میں طریقہ پوچھ رہا ہوں"

"یہ ایک جنگی راز ہے" ـــــ نظام اودیزی نے جواب دیا۔ "یہ نہ میں آپ کو بتاؤں گا، نہ میرا یہ ساتھی بتائے گا۔ صرف یہ بتا دیتا ہوں کہ مردِ مومن ستاروں کی گردش کا پابند نہیں ہوا کرتا۔ جب تک ایمان مضبوط رہتا ہے، اسلام کا مجاہد آسمان سے گرنے والی بجلی بنا رہتا ہے۔ ہماری فوج کے مولویوں نے ہمیں بتایا تھا کہ ہندو بتوں اور تصویروں کی پوجا کرتے ہیں۔ ہم آپ کو عملی طور پر بتا چکے ہیں کہ پتھر کے خدا ہمارے حقیقی خدا سے ٹکرائیں گے تو پاش پاش ہو جائیں گے۔ کیا آپ کی فوج کے ساتھ چھوٹے چھوٹے بت نہیں گئے تھے؟ کوئی ایک بھی بت سلامت واپس آیا ہے؟"

"یہ ملیچھ ہمارے مذہب کی توہین کر رہا ہے مہاراج!" ـــــ ایک پنڈت نے غصے سے کہا۔

"اسے ابھی احساس نہیں ہوا کہ یہ ہمارا قیدی ہے" ـــــ راجہ جے پال نے کہا

ـــــ "یہ اپنے انجام سے بے خبر ہے۔ اگر اس نے مجھے اپنا طریقہ جنگ نہ بتایا تو زندہ کی کھال اتاری جائے گی..... دونوں میں یہ راز معلوم کر کے رہوں گا"

"یہ راز جاننے کے لیے آپ کو اسلام قبول کرنا ہوگا مہاراج!" ـــــ دوسرے قیدی نے کہا۔ "ہمیں قتل کر کے آپ اپنی شکست کو فتح میں نہیں بدل سکتے۔ آپ ہم سے کوئی راز نہیں لے سکتے"

"لے جاؤ انہیں" ـــــ راجہ جے پال نے کہا۔ "انہیں زنجیروں میں رکھو۔ دوسرے جنگی قیدیوں کو قتل کر دو"

دونوں قیدیوں کو لے گئے، تو راجہ جے پال نے پنڈتوں سے کہا۔ "میں اپنی شکست کو فتح میں بدلنا چاہتا ہوں۔ مجھے حساب کر کے بتاؤ کہ میں شکست کو کس طرح فتح میں بدل سکتا ہوں"

پنڈتوں کے چلے جانے کے بعد راجہ جے پال نے اپنے دونوں جرنیلوں سے کہا ـــــ "ان دونوں قیدیوں کو لاہور لے چلو۔ ہم کل روانہ ہوں گے۔ یہ دونوں ہمارے ساتھ جائیں گے"

"آپ ان سے کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں؟" ـــــ ایک جرنیل نے کہا۔ "ہماری شکست کی وجہ صاف ہے۔ سبکتگین کو قبل از وقت پتہ چل گیا تھا کہ ہم حملے کے لیے آرہے ہیں۔ مسلمانوں نے گھات لگائی اور پہلے ہی حملے میں ہماری فوج کا حوصلہ توڑ دیا۔ سبکتگین نے پہاڑیوں میں اپنے دستے گھات میں بٹھا رکھے تھے۔ اس نے شب خونوں اور چھاپوں کی جنگ لڑی ہے۔ وہ تیار تھا اور ہمارے لیے اس کے شب خون غیر متوقع تھے۔ آپ یہ معلوم کریں کہ ہمارے کوچ کی اطلاع غزنی تک کس طرح پہنچی۔ ہماری ریاست میں سبکتگین کے جاسوس موجود ہیں۔ انہیں ڈھونڈنے کی کوشش کریں"

راجہ جے پال بوڑھا بھی ہو گیا تھا۔ شکست نے اس کے دماغ پر ایسا اثر کیا تھا کہ وہ اس کے سوا کچھ اور سننے کے لیے آمادہ ہی نہیں ہوتا تھا کہ اس کی شکست کا

راز کھلوا سکے۔ اب نظام الدین نے اسے کہہ دیا کہ وہ جان دے دے گا، یہ راز نہیں بتائے گا تو اس کے دماغ میں سے گانٹھ پڑھ کر، یہ راز معلوم کر کے رہے گا۔

لاہور کے سب سے بڑے مندر میں پنڈت کئی ہاتھوں والی دیوی کے بت کے آگے لوبان اور اگربتیاں جلائے کچھ پڑھ رہے تھے۔ مندر کو صاف کیا گیا تھا۔ اندر اور باہر سے سجایا بھی گیا تھا۔ مندر میں عام لوگوں کا داخلہ بند تھا۔ اندر صرف بیس پچیس نوجوان لڑکیاں ہاتھوں میں پھولوں کی ٹوکریاں اٹھائے کھڑی تھیں۔ ان میں ایک سے ایک بڑھ کر خوبصورت تھی۔ وہ مندر کے دروازے کے سامنے دو قطاروں میں کھڑی تھیں۔ وہاں فوج کے چند ایک افسر بھی گھوم پھر رہے تھے۔

باہر سے شور اٹھا — "مہاراج کی سواری آ رہی ہے"۔

ہڑبونگ مچ گئی۔ راجہ جے پال لڑکیوں کی دونوں قطاروں کے قریب پہنچا تو لڑکیوں نے اس کے راستے میں پھول پھینکنے شروع کر دیئے۔ راجہ قطاروں کے درمیان سے گزرا تو لڑکیوں نے اس پر پھولوں کی پتیاں پھینکیں۔ وہ پھولوں کو روندتا، پھولوں کی بارش میں گزرتا مندر میں داخل ہو گیا جہاں پنڈت جنتر منتر پڑھ رہے تھے۔ ایک پنڈت نے اس کے ماتھے پر تلک لگایا۔ ایک پنڈت سنکھ اور دوسرا گھنٹی بجانے لگا۔

راجہ جے پال نے کئی ہاتھوں کی دیوی کے بت کے پاؤں چھو کر ہاتھ اپنی آنکھوں اور اپنے ماتھے سے لگائے۔ پھر ہاتھ جوڑ کر قسم کھائی کہ میں شکست کا انتقام لوں گا۔ ہندو مت کو دور دور تک پھیلاؤں گا۔ جس خطے سے اسلام اٹھا تھا اس خطے کو دیوی دیوتاؤں کے دیس میں شامل کر دوں گا۔ اگر نہ کر سکا تو وہیں اپنی جان دے دوں گا۔

وہ خاموش ہوا تو پنڈتوں کی باری آئی۔ انہوں نے اپنی زبان میں بت سے بہت کچھ کہا۔ گھنٹیاں اور سنکھ بجتے رہے۔ عین اس وقت بڑی زور کی گرج سنائی دی۔ باہر سورج کی روشنی ماند پڑ گئی۔ گرج ایک بار پھر سنائی دی۔ پنڈتوں نے ایک

دوسرے کی طرف دیکھا۔ بوڑھے راجہ جے پال نے انہیں دیکھا۔ گرج سنی تو اس کے چہرے پر خوف کے آثار نمودار ہو گئے۔ پنڈت اور زیادہ بلند آواز سے بت کے آگے گڑگڑانے لگے۔ باہر دھوپ بالکل ختم ہو گئی۔ مندر کے اندر بھی نیم تاریکی چھا گئی۔ اس کے ساتھ ہی باہر چیخیں سنائی دینے لگیں۔

"مہاراج!" — بڑے پنڈت نے راجہ جے پال کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے اور ہاتھ جوڑ کر گھبراہٹ کے لہجے میں کہا — "دیوتا سخت ناراض ہیں۔ غزنی کے میدان جنگ میں بتوں کی جو توہین ہوئی ہے اسے دیوتا بخشیں گے نہیں"۔

آسمان سے اتنی زور کا دھماکہ ہوا کہ مندر لرز گیا۔ بت ڈول گیا۔

"پنڈت جی مہاراج!" — راجہ جے پال نے کانپتی ہوئی آواز میں چلا کر کہا۔ — "دیوتا کیا مانگتے ہیں؟ کتنی قربانی مانگتے ہیں؟ کتنے انسانوں کی جان مانگتے ہیں؟ میں اتنے ہی انسانوں کی قربانی دوں گا"۔

اس وقت راجہ جے پال، پنڈتوں اور بتوں پر آسمان کی کڑک، گرج اور چیخوں کا خوف طاری تھا۔ مندر سے کچھ دور مسلمان کسان کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ وہ خوشی سے ناچ رہے تھے۔ ایک دوسرے کو مبارک دے رہے تھے۔ اس طوفانی بارش اور بجلی کی کڑک اور گھٹاؤں کی گرج میں ان کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں — "اللہ نے کرم کر دیا ہے.... اب فصل اٹھے گی.... ڈھول بجاؤ.... ناچو.... نفل پڑھیں گے.... اللہ کا شکر ادا کرو"۔

مسلمانوں کے لیے جو اللہ کا کرم تھا، اسے وہاں کے پجاری اپنے بھگوان کا قہر سمجھ رہے تھے۔ مسلمان مسجدوں میں شکرانے کے نفل پڑھنے کی باتیں کر رہے تھے۔ یہ بارش جو آج برسنے لگی تھی ایک ماہ پہلے برسنی چاہیئے تھی۔ اس تاخیر سے خشک سالی کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا، مگر مسجد اور مندر میں یہ فرق تھا کہ مسجد کا کرم مندر کا قہر تھا۔ مسلمان کسانوں کے بچے بھی باہر نکل آئے اور ناچتے کودتے پھر رہے تھے مگر مندر میں کئی ہاتھوں والی دیوی کے چہرے پر بھی خوف تھا

پنڈت اس بت کے سامنے ہاتھ جوڑے بخشش مانگ رہے تھے۔ باہر جن

لڑکیوں نے راجہ جے پال کے راستے میں پھول بچھا دیے تھے، وہ بادو باراں کے طوفان سے گھبرا کر اندر آ گئی تھیں۔

"مہاراج!" بڑے پنڈت نے راجہ جے پال سے کہا۔ "ایک کنواری کی قربانی۔"

"صرف ایک؟"

"جی مہاراج!" پنڈت نے جواب دیا۔ "صرف ایک کنواری لڑکی ہو۔"

"کسی مسلمان کی کنواری بیٹی کو پکڑ لاؤ اور میرے سامنے اسے قربان کرو" — راجہ نے حکم دیا۔

"نہیں مہاراج!" پنڈت نے کہا۔ "بھگوان کسی ملیچھ کی قربانی قبول نہیں کرتے۔ لڑکی ہندو ہونی چاہیئے۔"

راجہ جے پال نے ان لڑکیوں کی طرف دیکھا جنہوں نے اُس کے راستے میں پھول بچھائے تھے۔ انہیں کنواریاں کہا جاتا تھا۔

"ان میں سے ایک کو لے لو۔ اس رکھ لو" — راجہ جے پال نے کہا۔ "یہ سب کنواری ہیں۔"

لڑکیوں نے ایک دوسری کی طرف دیکھا۔ بعض کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی، پھر سب نے پنڈتوں کی طرف دیکھا۔ پنڈت جھینپ گئے۔ یہ لڑکیاں آج پہلی بار مندر میں نہیں آئی تھیں۔ یہ آتی ہی رہتی تھیں۔ اکیلی اکیلی بھی آتی تھیں۔ دو دو چار چار بھی آتی تھیں۔ ان کے جاننے والے ان کا احترام کرتے تھے کیونکہ یہ مندر کی کنواریاں تھیں۔ لوگوں کی نگاہوں میں پاک اور قابلِ تعظیم تھیں لیکن پنڈتوں اور لڑکیوں کی نگاہیں کچھ اور کہتی تھیں۔ پنڈت لڑکیوں کی نگاہوں کا سامنا کرنے سے گھبرا رہے تھے۔

راجہ جے پال نے ایک لڑکی کو جو سب سے زیادہ حسین اور نوجوان تھی، بازو سے پکڑا اور پنڈت سے کہا۔ "اس کی قربانی دے دو۔"

"میں آپ کے قدموں میں جان دینے کو تیار ہوں" — لڑکی نے کہا۔

"میں اپنے ہاتھ سے اپنی گردن کاٹ دوں گی لیکن مہاراج! میں کنواری نہیں ہوں۔"

"تمہاری شادی ہو چکی ہے تو مندر میں کیوں آئی ہو؟" — راجہ نے پوچھا۔

"میں کسی کی بیوی نہیں"۔ — لڑکی نے کہا۔ "میں مندر کی داسی ہوں پنڈت جی مہاراج مجھے...."

"قربانی کے لیے خاص رنگ، عمر اور شکل و صورت کی کنواری کی ضرورت ہے" — بڑے پنڈت نے لڑکی کی بات پوری نہ ہونے دی اور بولا — "ان میں سے کوئی بھی لڑکی قربانی کے قابل نہیں ہم خود تلاش کریں گے۔ آپ فکر نہ کریں۔ ہم لڑکی کو پورے چاند کی رات سے لے کر اگلے پورے چاند کی رات تک اپنے پاس رکھیں گے۔ اُسے خاص قسم کی غذا دیں گے۔ اُسے خاص پانی سے غسل دیں گے۔ وہ اپنی زبان سے بولے گی کہ مجھے قربان کر دو۔ وہ آپ کو آشیرباد دے گی۔ اُسے اس مندر میں نہیں کسی خاص علاقے میں لے جا کر قربان کیا جائے گا۔"

"یہ کام بہت جلدی ہونا چاہیئے" — راجہ جے پال نے کہا۔

"آپ نے قربانی دینے کا ارادہ کر لیا ہے تو دیوتاؤں کا قہر اسی سے رک گیا ہے" — بڑے پنڈت نے کہا — "آپ سن نہیں رہے کہ آسمان کی گرج دھیمی ہو گئی ہے، طوفان کا زور تھم گیا ہے مہاراج!"

راجہ جے پال مندر سے نکل گیا۔ لڑکیوں کے چہروں پر خوف طاری ہو گیا تھا۔ انہیں ڈر لگ رہا تھا کہ ان میں سے کسی کو قربان کر دیا جائے گا۔

"آج تم سب سمجھ گئی ہو گی کہ ہم نے تمہیں کنوارہ کیوں نہیں رہنے دیا" — بڑے پنڈت نے لڑکیوں سے کہا۔ "ورنہ آج تم میں سے ایک لڑکی کی گردن کٹ جاتی، یا اُسے زندہ جلا دیا جاتا۔ پھر باری باری سب کو قربان کر دیا جاتا۔" پنڈت کے لہجے میں سنجیدگی اور متانت تھی جیسے وہ کوئی مذہبی بات کر رہا ہو۔ "تم اپنے اپنے جسم کی قربانی دے چکی ہو۔"

راجہ جے پال کی سواری برستی بارش میں چلی گئی۔ اُس کے فوجی افسر اور محافظ بھی چلے

گئے۔ مندر میں لڑکیاں اور پنڈت رہ گئے۔ پنڈتوں نے لڑکیوں سے کہا کہ وہ پچھلے کمرے میں چلی جائیں۔ وہ چلی گئیں تو پنڈت بھی اُن کے پیچھے چلے گئے۔

جس وقت راجہ جے پال مندر میں پہنچا تھا اُس وقت غزنی کے دو قیدی نظام اوریزی اور اُس کا ساتھی قاسم بلخی، ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں بندھے ہوئے راج محل میں لائے گئے تھے۔ انہیں لانے کا حکم راجہ جے پال دے گیا تھا۔ دونوں کو راجہ کے انتظار میں تنگ سے ایک کمرے میں بٹھا دیا گیا تھا۔ راجہ نے یہ حکم بھی دیا تھا کہ انہیں قید خانے کے گھٹیا کھانے کی بجائے راج محل کا اچھا کھانا دیا جائے۔ راجہ انہیں خوش کر کے اُن سے وہ جنگی راز معلوم کرنا چاہتا تھا جو انہوں نے اس سے چھپایا تھا، حالانکہ اُن کے پاس ایسا کوئی راز نہیں تھا۔ راجہ نے اپنے جرنیلوں سے کہا تھا کہ وہ ان دونوں کو اتنی عیش کرائے گا کہ ان کے دماغ ماؤف ہو جائیں گے، پھر وہ ان کے دلوں کو گرفتار کرے گا۔ اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ انہوں نے راز کی بات نہ بتائی تو انہیں بہت بُری اذیتیں دوں گا۔"

دونوں کے لیے کھانا لایا گیا تو انہوں نے پوچھا کہ کھانا کس نے پکایا ہے۔ انہیں بتایا گیا کہ یہ راج محل کے باورچی خانے کا پکا ہوا ہے۔ انہوں نے کھانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ انہیں کسی مسلمان کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا دیا جائے خواہ وہ کتنا ہی گھٹیا کیوں نہ ہو اور کھانا کوئی مسلمان لائے... چونکہ راجہ نے حکم دیا تھا کہ ان دونوں قیدیوں کی خاطر تواضع کی جائے، اس لیے ہندو باورچی کے ہاتھ کا کھانا واپس کر دیا گیا۔ کچھ دیر بعد ایک مسلمان ملازم کھانا اٹھائے ہوئے آیا۔ قیدیوں نے یقین کر لیا کہ یہ ملازم واقعی مسلمان ہے۔

وہ جب کھانا کھانے لگے تو اُن کے ساتھ جو سپاہی آئے تھے وہ کمرے سے نکل گئے۔ قیدی زنجیروں میں تھے، اس لیے اُن کے بھاگنے کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ مسلمان ملازم اُن کے پاس بیٹھا رہا۔ اُس نے چور نگاہوں سے دیکھا کہ سپاہی باہر چلے گئے ہیں تو وہ فارسی زبان میں بولا — "خوش نہ ہونا کہ تمہاری خاطر مدارت

ہو رہی ہے۔ یہ سلوک صرف اُس مسلمان قیدی سے کیا جاتا ہے جس کے متعلق شک ہو کہ اس کے پاس کوئی قیمتی راز ہے۔"

دونوں قیدیوں نے چونک کر اُسے دیکھا۔

"دھیان کھانے میں رکھو" — ملازم نے کہا — "بات سرگوشیوں میں کرنا۔ انہیں شک ہو جائے گا۔ میں تمہارا ہی آدمی ہوں... اگر تمہارے پاس کوئی راز ہے تو انہیں نہ بتانا لیکن انہیں دھوکے میں رکھنا۔ ورنہ یہ تمہیں ایسے جہنم میں پھینک دیں گے جہاں ہر روز مرو گے اور ہر رات جیو گے۔ انہیں ایسا دھوکہ دیتے رہو کہ تمہاری زنجیریں کھول دیں۔ میں تمہیں فرار کراؤں گا۔ کسی لالچ میں نہ آنا۔"

اُس وقت بارش، بجلی کی کڑک اور تیز جھکڑ کی چیخوں کی وجہ سے اُن کی باتیں کوئی اور نہیں سن سکتا تھا لیکن بارش کا زور ٹوٹتے ہی راجہ جے پال آ گیا۔ اُسے بتایا گیا کہ غزنی کے دو قیدی آ گئے ہیں۔ راجہ نے انہیں اندر بلا لیا۔

"میں تم سے وہ راز معلوم کرنا چاہتا ہوں" — راجہ نے کہا۔

"ہم ہارنے کے عادی نہیں" — نظام اوریزی نے کہا — "خدا کے سوا ہم کسی کے سامنے نہیں جھکا کرتے اور ہم آپ پر اعتبار نہیں کر سکتے کیونکہ آپ اور آپ کی قوم مسلمان کو دھوکہ دینے اور وعدہ توڑنے کو نیکی سمجھتی ہے۔ اگر ہم زنجیروں میں بندھے ہوئے آپ کو راز کی باتیں بتا دیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم قید کی اذیت سے بچنے کے لیے اپنی قوم کے ساتھ غداری کر رہے ہیں۔ قیدی کی حیثیت سے ہم اپنی زبانیں نہیں کھولیں گے۔"

"تو کیا میں تمہیں اپنا مہمان بنا کے رکھوں؟"

"جو کچھ بھی بنا کر رکھیں، ہم قیدی رہ کر آپ کو اپنا دوست نہیں سمجھ سکتے" قاسم بلخی نے کہا — "آپ ہمارے امرا اور ان کے محافظ دستے کو قید میں مار چکے ہیں۔ آپ نے ہمارے سلطان کے ساتھ وعدہ خلافی کی ہے۔ آپ ہم سے اپنے کام کی بات پوچھ کر ہمارا بھی وہی حشر کریں گے جو آپ ہمارے امرا اور ان کے محافظوں کا کر چکے ہیں۔ ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ آپ اس سے زیادہ تشدد کر

جائیں، آپ کا انجام وہی ہوگا جو ہو چکا ہے۔ صرف ہم آپ کو بتا سکتے ہیں کہ آپ بہت تھوڑی فوج سے ہماری فوج کو کس طرح شکست دے سکتے ہیں۔"

"میں تمہاری زنجیریں کھلوا دوں گا" ــــ راجہ جے پال نے کہا ــــ "اور تمہیں قیدخانے میں نہیں رکھوں گا۔"

"اور جب ہم آپ کو راز کی بات بتا دیں گے تو آپ ہمیں رہا کر دیں گے؟" ــــ نظام اور زیری نے پوچھا ــــ "آپ ہمیں غزنی تک جانے کے لیے سواری دیں گے؟"

"جو مانگو گے دوں گا۔"

"ہم چند دن سوچیں گے، اور آپ کا رویہ دیکھیں گے" ــــ نظام اور زیری نے کہا ــــ "قیدخانے کے سوا ہمیں آپ جہاں جی چاہے رکھیں۔ ہم یہاں سے بھاگ کر جائیں گے کہاں؟ اور یہ بھی خیال رکھیں کہ ہم مسلمانوں کے ہاتھوں کا پکا ہوا کھائیں گے۔ آج بھی ہمارے کہنے پر ایک مسلمان ملازم کھانا لایا تھا۔"

شکست کے مارے ہوئے راجہ جے پال نے اُن کی شرط قبول کر لی اور ان کی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں کھلوا دیں اور حکم دیا کہ انہیں وہی مسلمان ملازم دے دیا جائے جس نے آج انہیں کھانا کھلایا تھا۔ انہیں الگ الگ دو کمروں میں بھیج دیا گیا جہاں ان کے لیے ہر قسم کی آسائش اور سہولت مہیا کی گئی لیکن دونوں قیدیوں کو یہ معلوم نہیں تھا کہ ان کے کمروں کے اردگرد پہرے کا انتظام کر دیا گیا ہے۔

اگلے چند دنوں میں راجہ جے پال کی تمام تر ریاست کے مندروں میں لوگوں کو ایک بار پھر بتایا گیا کہ مسلمان فوج حملہ کرنے آ رہی ہے، اور یہ فوج کوئی مندر سلامت اور کوئی پنڈت زندہ نہیں چھوڑے گی۔ مختصر یہ کہ ہندوؤں کو مسلمان فوج کی بربریت اور وحشی پن سے خوب ڈرایا گیا۔ اور اُن کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف نفرت پیدا کی گئی۔ لوگوں سے کہا گیا کہ وہ اپنے مندروں، اپنے رشیوں، پنڈتوں اور اپنی جوان بیٹیوں کی عزت اور اپنی جانیں بچانے کے لیے زیادہ سے زیادہ رقم سرکاری خزانے

میں جمع کرائیں۔ مندروں میں یہی کچھ بتایا جانے لگا۔ ہندوؤں نے پہلے کی طرح اپنے پیٹ باندھ لیے اور آمدنی کا بیشتر حصہ اپنے مہاراجہ کے خزانے میں جمع کرانے لگے۔

لاہور کے بڑے مندر سے یہ اعلان ہوا کہ مندر میں آنے والے لوگ اپنی کنواری لڑکیوں کو بھی مندر میں لایا کریں۔ اس کی وجہ یہ بتائی گئی کہ کنواری چونکہ گناہگار نہیں ہوتی، اُس کا جسم پاک ہوتا ہے، اس لیے دیوتا اس کی دعا قبول کر لیتے ہیں۔ ہندوؤں کو پنڈتوں نے یہ بھی بتایا کہ اُن کا مہاراجہ جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہے اور جونہی فوج کی ضروریات کے لیے پیسہ جمع ہو گیا، مہاراجہ مسلمانوں کے ملک غزنی وغیرہ پر حملہ کر دیں گے تاکہ مسلمانوں کو حملے کی مہلت ہی نہ ملے۔ تیاریوں کے ساتھ عبادت اور دعا کی بہت ضرورت ہے۔

اس اعلان کی تعمیل میں لوگوں نے اپنی کنواری بیٹیوں کو بڑے مندر میں بھیجنا شروع کر دیا۔ بڑا پنڈت ان سے دعا کراتا تھا لیکن وہ ہر لڑکی کو غور سے دیکھتا تھا کیونکہ اُسے انسانی قربانی دینے کے لیے ایک لڑکی کا انتخاب کرنا تھا۔

پھر راجہ جے پال کو اتنی ہوش بھی نہ رہی کہ غزنی کے دونوں قیدیوں کی طرف توجہ دے سکتا کیونکہ اُن ریاستوں کے مہاراجے لاہور آ گئے تھے جنہوں نے راجہ جے پال کو سلطان سبکتگین کی سلطنت پر حملے کے لیے فوجیں دی تھیں۔ ان میں کالنجر، قنوج، گوالیار، دلی اور کالنجر خاص طور پر قابلِ ذکر تھے۔ دن رات شکست کے اسباب پر گرماگرم بحث ہوتی رہتی تھی جو ہنگامہ آرائی تک پہنچ جایا کرتی تھی۔ مگر کوئی ایک بھی مہاراجہ ایسا نہیں تھا جس نے یہ کہا ہو کہ وہ آئندہ مسلمانوں کے خلاف جنگ میں اپنی فوج نہیں جھونکے گا۔ بحث کا موضوع یہ رہا کہ کس طرح سلطان سبکتگین کو اسی کے علاقے میں ختم کر کے اس کی سلطنت پر قبضہ کیا جائے۔

"اگر ہم یہ علاقے فتح کر لیتے ہیں تو وہاں سے عرب کے علاقوں پر حملے کیے جا سکتے ہیں" ــــ کالنجر کے مہاراجہ نے کہا ــــ "یہ عزم سب کے دلوں میں اُتر جانا چاہیے کہ ہمیں ہندوستان کو مہابھارت بنانا ہے جس کی سرحدیں دجلہ اور فرات تک ہوں گی۔"

اُس منبع کو بند کرنا ہے جہاں سے اسلام اُٹھا ہے اور پھیلتا جا رہا ہے۔ اگر ہم نے اپنا یہ مقصد حاصل نہ کیا تو عرب پر عیسائی چھا جائیں گے۔ مسلمان ریاستوں کے متعلق مجھے پتہ چلا ہے کہ ایک دوسری کی دشمن ہوتی جا رہی ہیں۔ یہ بھی پتہ چلا ہے کہ اُن میں یہ پھوٹ عیسائی ڈال رہے ہیں۔ وہ بے بہا دولت، شراب اور خوبصورت اور چالاک لڑکیوں کے ذریعے چھوٹی چھوٹی مسلمان ریاستوں کے حکمرانوں کو اپنے ہاتھ میں لیتے جا رہے ہیں۔"

"ہم بھی یہ طریقہ اختیار کریں گے" — راجہ جے پال نے کہا۔ "لیکن ہمیں مسلمانوں پر یہ ثابت کرنا ہے کہ ہم جنگی قوت ہیں۔ اس وقت ہماری اور آپ کی اِن فوجوں پر جو بچ کر آئی ہیں، یہ خوف سوار ہو گیا ہے کہ مسلمان اس قدر دلیر اور زبردست لوگ ہیں کہ انہیں کوئی بھی شکست نہیں دے سکتا۔ واپس آنے والے سپاہیوں نے لوگوں پر بھی یہی خوف طاری کر دیا ہے۔ ہمیں سلطان سبکتگین کو ایک شکست دے کر اپنی فوجوں اور اپنے لوگوں کے دلوں سے مسلمانوں کی دلیری کا خوف نکالنا ہے۔ اگر ہم غزنی پر قبضہ کر سکیں تو وہاں سے ہم عیسائیوں کے طریقے استعمال کر کے مسلمانوں کو آپس میں لڑا سکتے ہیں۔"

"ہماری لڑکیاں عیسائی اور یہودی لڑکیوں کی نسبت زیادہ ہوشیار اور ذہین ہیں" — ایک اور راجہ نے کہا — "اپنے مذہب کو پھیلانے، اپنے ملک کو وسیع کرنے اور اپنے دشمن مذہب کو ختم کرنے کی خاطر ہم ہزاروں لڑکیاں قربان کر سکتے ہیں اور ہماری لڑکیاں جو اپنے خاوندوں کے مرنے کے بعد اپنے آپ کو زندہ جلا دیا کرتی ہیں، وہ ایسی قربانی بڑے شوق سے دیں گی جس میں ان کی جان کو کوئی خطرہ نہیں۔ ایک مسلمان کو ختم کرنے کے لیے ہم ایک لڑکی کی عزت قربان کر سکتے ہیں۔"

"میں ایک لڑکی کی قربانی دے رہا ہوں" — راجہ جے پال نے کہا۔

باقی دن راجے فوجوں کی کمی پوری کرنے، سامان کی فراہمی، جانوروں کی خرید اور نئی فوج کی ٹریننگ کے منصوبے بناتے رہے۔ ان منصوبوں سے پتہ چلتا تھا

کہ اب کے غزنی پر جو حملہ ہو گا اسے سلطان سبکتگین کی فوج نہیں روک سکے گی۔ صرف راجے ہی مصروف نہیں تھے، مندروں میں پنڈت وغیرہ بھی لوگوں کو لڑائی کے لیے تیار کرنے میں سرگرم تھے۔

اِدھر اسلام کی تباہی کے لیے متحدہ محاذ مضبوط ہو رہا تھا، اُدھر سلطان سبکتگین کی سلطنت کے اردگرد چھوٹے بڑے مسلمان حاکم اور حکمران سلطان کی تباہی کے پروگرام بنا رہے تھے۔ اگر تین لاکھ کا ہندو لشکر سلطان سبکتگین کو شکست دے دیتا تو ہندو ان چھوٹے بڑے تمام حکمرانوں کو کچل ڈالتے۔ ان کے پاس ہتھیار ڈالنے کے سوا کوئی ذریعۂ نجات نہیں تھا۔ اکیلے سبکتگین نے نہ صرف اپنی اور اپنے مسلمان پڑوسیوں کی سلطنتوں کو بچایا بلکہ اسلام کو بہت بڑے خطرے سے بچا لیا۔ کسی نے اس کا ساتھ نہ دیا۔ اس کا بیٹا محمود اس کا دستِ راست تھا۔

سلطان سبکتگین نے ہندوستان میں اپنے جاسوس بھیج رکھے تھے جو اُسے یہاں کی افواج کی نقل و حرکت اور یہاں کے راجوں مہاراجوں کے عزائم سے آگاہ کرتے رہتے تھے۔ اُسے معلوم تھا کہ راجہ جے پال ایک اور حملہ ضرور کرے گا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اتنی زیادہ فوج مروا کر اور اتنے زیادہ جانور ختم کرا کے راجہ جے پال اتنی جلدی حملہ نہیں کر سکے گا مگر اُس کی اپنی فوج کی حالت اچھی نہیں تھی۔ اس کا بھی بہت نقصان ہوا تھا۔ اس کے سامنے صرف یہی ایک مسئلہ نہیں تھا کہ راجہ جے پال کے اگلے حملے کے مقابلے کی تیاری کرے، کئی اور مسائل درپیش تھے جن میں سب سے بڑا یہ تھا کہ اس کے پڑوسی مسلمان حکمران اُسے برداشت نہیں کر رہے تھے۔

اُس نے دو کارروائیاں کیں۔ ایک یہ کہ تمام پڑوسی حکمرانوں کی طرف ایلچی بھیجے اور انہیں کہا کہ وہ ہندوؤں کے خلاف متحد ہو جائیں لیکن کسی ایک نے بھی تسلی بخش جواب نہ دیا۔ سلطان نے دوسری کارروائی یہ کی کہ آج کے پشاور کے شمال مغرب کے پہاڑی علاقے میں جتنے چھوٹے بڑے قلعے تھے، ان سب پر قبضہ کر لیا۔ یہ افغانیوں اور خلجیوں کے علاقے تھے۔ انہیں سلطان سبکتگین نے اپنی فوج سے بھی

مرعوب کیا اور صوفی اور عالم قسم کے وفد بھیج کر انہیں اسلام کے نام پر اپنا حامی بنایا۔ افغانیوں اور خلجیوں کی کوئی خاص فوجی طاقت نہیں تھی وہ سبکتگین کے اتحادی بن گئے اور اپنے علاقے کے لوگوں کو اُس کی فوج میں بھرتی کرا دیا۔

وقت گزرتا جا رہا تھا۔ محمود غزنوی کی عمر تئیس برس ہو گئی۔ سلطان سبکتگین نے اُسے خراسان کا گورنر مقرر کر دیا۔ مسلمانوں میں خانہ جنگی شروع ہو چکی تھی۔ بخارا کا بادشاہ ابوالمنصور مر گیا۔ اُس کے بیٹے نوح کو اُس کا جانشین مقرر کیا گیا۔ فائق نام کے ایک حاکم نے نوح کے خلاف بغاوت کر دی۔ نوح نے سلطان سبکتگین سے مدد مانگی۔ سبکتگین خود اُسے ملنے گیا اور مدد دی۔

سلطان کی اپنی سلطنت کا یہ حال تھا کہ ایک امیر ابوعلی حسن بن سنجار نے خراسان کے تھوڑے سے علاقے پر قبضہ کر لیا اور امیر فائق کو پناہ دے دی۔ سلطان سبکتگین نے صلح سمجھوتے کے پیغام بھیجے لیکن ان کا کچھ اثر نہ ہوا۔ سلطان کے لیے اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ اپنے ان مسلمان بھائیوں پر حملہ کرے۔ ابوعلی حسن وغیرہ کو عیسائیوں نے درپردہ بہت جنگی مدد دے رکھی تھی۔ انہیں اس مدد پر بہت ناز تھا۔ سلطان سبکتگین اپنی فوج کے ساتھ ترمز پہنچا۔ نوح بھی فوج لے آیا اور سلطان سے جا ملا۔

فائق اور ابوعلی حسن نے جرجان نام کی ایک مسلمان ریاست کے حکمران فخر الدولہ کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ فخر الدولہ کے پاس دارا نام کا ایک سپہ سالار تھا جس کی قیادت اور جنگی فہم و فراست کی دھوم دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہ لشکر اپنی افواج کے ساتھ ہرات کے مقام پر پہنچ گئے۔ سلطان سبکتگین بھی اپنی فوج کو ہرات کے ایک میدان میں لے گیا جسے وہ لڑائی کے لیے موزوں سمجھتا تھا۔ اس کے ساتھ محمود تھا اور بخارا کا حکمران نوح بھی تھا جو اپنی فوج کے ساتھ سلطان کا اتحادی بن کر آیا تھا۔ نوح ابھی لڑکپن کی عمر میں تھا۔ اسی لیے امیر فائق نے بغاوت کر دی تھی کہ یہ کمسن لڑکا گھبرا کر تخت سے دستبردار ہو جائے گا۔

اُس وقت کے عینی شاہدوں کی تحریروں سے وہ منظر صاف نظر آنے لگتا

ہے۔ کہ ادھر ہندوستان میں ہندو مہاراجے مسلمانوں کے خلاف متحد ہو کر دُنیائے اسلام پر حملے کی تیاری کر رہے تھے، اُدھر دُنیائے اسلام کے ایک خطے میں جہاں بُت شکن پیدا ہوئے تھے، مسلمانوں کی فوجیں آمنے سامنے کھڑی ایک دوسری کا خون بہانے کو تیار تھیں۔ کہتے ہیں، سلطان سبکتگین نے اپنے نوجوان بیٹے محمود کو اور بخارا کے حکمران کمسن نوح کو دیکھا تو اُس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

"یہ آنسو ابا جان؟" — محمود غزنوی نے پوچھا۔

"اسلام کے اتحاد کی لاش پر آنسو نہ بہاؤں تو اور کیا کروں بیٹا!" — سلطان سبکتگین نے جواب دیا — "مسلمان متحد تھے تو یورپ کے کفرستان میں بھی انہوں نے اسلامی سلطنت قائم کر دی تھی۔ آج اتحاد پارہ پارہ ہو گیا ہے تو نہ یورپ میں اسلامی پرچم نظر آتا ہے نہ ہندوستان میں۔ اسلامی ملکوں میں سے کئی ایک پر عیسائی قابض ہیں۔ وہ آگے بڑھتے آ رہے ہیں۔ ادھر ہندوؤں کے عزائم بھی یہی ہیں..... تم دونوں کو دیکھ کر میرے آنسو نکل آئے۔ مجھے یہ خیال آ گیا تھا کہ ہم تو آپس میں لڑ جھگڑ کر کل پرسوں اس دُنیا سے اُٹھ جائیں گے، اپنے بچوں کے لیے ہم کیا ورثہ چھوڑ جائیں گے! ہم تمہیں اسلامی سلطنت کے ٹکڑے دے کر جا رہے ہیں، اقتدار کی ہوس، خانہ جنگی اور ایمان فروشی کی طرح ڈال کر جا رہے ہیں۔ ان ایمان فروش اقتدار پرستوں کی اولاد بھی مسلمانی کو مسند کی خاطر اپنا لے گی، ان اسلام کے دشمنوں کے ہاتھ بیچ ڈالے گی....

"مجھے کفرستان کے بُت توڑنے تھے۔ تمہیں باطل شکن بننا تھا مگر ہمارے اپنے بھائی جو ہمارے ہی کعبہ کے پجاری ہیں بُت پرستوں کی شہ اور مدد سے اللہ اور رسولؐ کے احکام کو بھلا بیٹھے ہیں۔ میرے بچو! ہماری قوم کا مستقبل تاریک ہے۔ تخت و تاج کی ہوس اور پورا عالم اسلام کی وحدت کو ریزہ ریزہ کرتی چلی جا رہی ہے۔ تم دیکھ رہے ہو کہ ہر مسلم ریاست کے اندر بھی نفاق اور منافقت ہے۔ یہ لوگ جب متحد ہوتے ہیں تو ان کے اتحاد میں بھی منافقت ہوتی ہے۔ وہ ایک دوسرے سے چھپے ہوئے ہوتے

ہیں۔ ہر ایک کے دل میں سلطانی کی سند ہے۔ خلافت موجود ہے لیکن برائے نام۔"

سلطان سبکتگین بولتے بولتے خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے سر اٹھایا اور کہا — "محمود اور نوح! دونوں فوجوں کو میرے سامنے لاؤ۔"

دونوں فوجیں اُس کے سامنے کھڑی تھیں۔ وہ خود گھوڑے پر سوار تھا۔ اُس نے فوجوں کو ایک نظر دیکھا تو اُس نے اپنے آپ میں زلزلے کا سا جھٹکا محسوس کیا۔ اُس کا گھوڑا ذرا سی اونچی جگہ کھڑا تھا جہاں سے اُسے امیر فائق، بوعلی حسن اور فخرالدولہ کی متحدہ فوج کا کیمپ نظر آ رہا تھا۔

"اللہ کے سپاہیو!" — اُس نے بلند آواز سے کہا — "یہاں سے تمہیں تم جیسی، تمہارے ہی مذہب کی ایک فوج کے خیمے نظر آ رہے ہیں۔ اگر تم اور وہ کندھے سے کندھا ملا لو تو اسلام کی سلطنت کی سرحدیں ایک بار پھر وہاں تک جا سکتی ہیں جہاں تک طارق بن زیاد اور محمد بن قاسم لے گئے تھے، مگر تمہارے اور اُس فوج کے درمیان دشمن حائل ہو گیا ہے۔ تم خدا اور رسولؐ کے نام لیوا ہو۔ وہ تخت و تاج کے پجاری ہیں۔ وہ اپنا دین اور اپنا ایمان نیلام کر چکے ہیں۔ ہندوستان کے بت پرست ہندو ہم پر دو بار حملہ کر چکے ہیں۔ تم نے بہت تھوڑی تعداد میں ہوتے ہوئے اتنے بڑے لشکر کو کاٹ کر رکھ دیا تھا۔ کیوں؟ صرف اس لیے کہ ہندو ہمارے رسولؐ کے دشمن ہیں ....

"اور ... تم ان مسلمانوں کا وہی حشر کرو گے جو ہمارے رسولؐ کے دشمن کے ہاتھ مضبوط کر رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے تم اس فوج کا نعرۂ تکبیر سن کر اپنے گھوڑوں کی باگیں کھینچ لو اور تلواریں نیاموں میں ڈال لو۔ اگر اس دھوکے میں آ گئے تو اس خطے سے اسلام کا خاتمہ ہو جائے گا۔ وہ سلطان کے ساتھی ہیں۔ اُن کے پرچم پر جو چاند اور ستارہ ہے، وہ بہت بڑا فریب ہے۔ اپنے دشمن کو مارنے سے پہلے اپنے اس بھائی کو مارو جو بھائی ہونے کا دھوکہ دے کر دین کے دشمن کا ہاتھ مضبوط کرتا ہے ....

"میں نے بہت کوشش کی ہے کہ یہ لوگ خلوص اور محبت کی زبان سمجھ سکیں مگر وہ

نہ سمجھے۔ میں اپنے بیٹوں کو قتل کر سکتا ہوں، اپنے مذہب کو کمزور ہوتا نہیں دیکھ سکتا۔ اسلام کا سپاہی اپنی حکومت کرنے کے لیے نہیں لڑتا بلکہ اللہ کی حکومت کو مضبوط کرنے اور گمراہ انسانوں کو اس حکومت تلے لانے کے لیے جہاد کیا کرتا ہے۔ کیا تم قوم کی اُن بیٹیوں کو بھول سکتے ہو جو کفار کے قبضے میں آئے ہوئے علاقوں میں عصمت کے موتی لٹا بیٹھی ہیں؟ کیا تم برداشت کر لو گے کہ کوئی کافر تم میں سے کسی کی بیٹی کو ہوس کاری کے لیے استعمال کرے؟ یہ مسلمان حکمران جو تمہارے ساتھ لڑنے کے لیے اپنی فوجیں لائے ہیں، اپنی بیٹیوں کی عزت و آبرو سے دستبردار ہو چکے ہیں۔ وہ اپنے مذہب اور اپنی قوم کے وقار کا کیا تحفظ کریں گے۔"

سلطان سبکتگین کی آواز میں جوش اور جذبات کا لرزہ پیدا ہوتا چلا جا رہا تھا اور اُس کے اثر سے اُس کی اور نوح کی فوج میں بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ سلطان کا ایک ایک لفظ عسکریوں کے دلوں میں اترتا جا رہا تھا۔ جوش و خروش بڑھتا جا رہا تھا مگر سلطان سبکتگین کو اس سے ذرہ بھر خوشی نہ ہوئی۔

اُسی روز اُس نے اپنی فوج کو جنگ کی ترتیب میں کھڑا کر دیا۔ خود قلب میں رہا۔ اس نے محمود اور نوح کو بھی اپنے ساتھ رکھا۔

مخالف کیمپ میں دارا تجربہ کار اور قابل جرنیل تھا۔ اُس نے سلطان سبکتگین کی فوج کو جنگی ترتیب میں تیاری کی حالت میں دیکھا تو فوراً اپنی متحدہ افواج کو جنگی ترتیب میں کر لیا۔ وہ جانتا تھا کہ سلطان سبکتگین کو حملہ کرنے کا موقع دیا تو وہ جیت جائے گا۔ وہ سلطان کی چالوں اور جنگی تجربے سے اچھی طرح واقف تھا۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ سلطان کو مہلت دی تو اُس کے شب خون مارنے والے جیش عقب اور پہلوؤں پر آ جائیں گے اور وہ فوج کو تھکا کر اور بکھیر کر ماریں گے۔ دارا نے نہایت اچھی چال چلی۔ اُس نے قلب پر حملہ کرنے کی بجائے اپنے منتخب دستے دُور کے چکر سے آگے بڑھا کر سلطان کی فوج کے دونوں پہلوؤں پر حملہ کر دیا۔ یہ حملہ غیر متوقع اور شدید تھا۔

مؤرخ لکھتے ہیں کہ سلطان سبکتگین کے لیے دارا کی یہ چال غیر متوقع تھی۔ اُسکے

پہلوؤں کے دستے بے خبری میں دبوچے گئے اور تھوڑی ہی دیر بعد اُن کے قدم اکھڑنے لگے۔ دارا نے اپنی فوج کا خاصا بڑا حصہ اپنے پاس اس مقصد کے لیے رکھا ہوا تھا کہ جب سلطان کے پہلوؤں کے دستے اکھڑنے لگے تو سلطان اپنے دائیں اور بائیں مدد دینے پر مجبور ہو جائے گا۔ اُس وقت دارا قلب پر حملہ کر دے گا۔

سلطان سبکتگین کے لیے بالکل یہی صورتِ حال پیدا ہو گئی۔ شکست صاف نظر آنے لگی۔ اُس نے پہلوؤں کو قائم رکھنے کے لیے اپنے ریزرو ٹروپس سے کمک بھیجی تو قلب کمزور ہو گیا۔ وہ دارا کی چال سمجھ گیا لیکن بے بس ہو گیا۔ اُس کے دونوں پہلو کٹ رہے تھے۔ وہ سامنے کے حملے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس نے محمود اور نوح سے کہا ــــ "میرے بیٹو! آج ہمیں زندگی کا آخری معرکہ لڑنا ہے۔ میدان دشمن کے ہاتھ آگیا ہے"۔

اُس دَور کا مشہور مورخ محمد قاسم فرشتہ لکھتا ہے کہ عین اُس وقت جب سلطان سبکتگین کو اپنی شکست سامنے نظر آ رہی تھی، ایک گھوڑا گرد اڑاتا اور بہت تیز رفتار سے دوڑتا اُس کی طرف آ رہا تھا۔ یہ سوار دشمن کی صفوں سے آیا تھا۔ وہ گرد سے نکلا تو دیکھا کہ اُس کی تلوار نیام میں تھی اور اُس نے اپنی ڈھال اپنی پیٹھ پر ڈال رکھی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ لڑنے کے لیے نہیں دوستی کا پیغام لے کر آیا ہے۔ اُس کے پیچھے دشمن کی فوج کے بہت سے دستے تھے۔

وہ جب سلطان سبکتگین کے سامنے آیا تو سب دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہ دشمن کا کوئی عام ایلچی یا قاصد نہیں تھا، وہ دشمن کا قابل جرنیل دارا تھا۔ وہ گھوڑے سے اُترا۔ اُس نے اپنی تلوار اور ڈھال سبکتگین کے آگے پھینک دی۔

"سلطان! ــــ دارا نے کہا ــــ "میں اسلام کے دشمنوں کے خلاف لڑتا رہا ہوں۔ میں اپنے بھائیوں کے خلاف نہیں لڑ سکتا۔ میں اپنے محفوظہ کے دستے ساتھ لے آیا ہوں۔ میں جن کا سپہ سالار ہوں وہ بادشاہی کے لالچی ہیں۔ میں نے ساری عمر کے جہاد کا جو ثواب کمایا تھا، وہ میں ضائع نہیں کروں گا۔ مجھے خدا کے حضور سرخرو ہونے کا موقع دیں"۔

اُس نے اُن دستوں کو جو اُس کے ساتھ آئے تھے حکم دیا کہ پیچھے مڑیں اور امیر فائق وغیرہ کی فوج پر حملہ کر دیں۔ اُس نے اس حملے کی قیادت خود کی۔ سلطان سبکتگین نے اپنے تمام ریزرو ٹروپس (محفوظہ) کو دو حصوں میں تقسیم کر کے پہلوؤں کو کمک دے دی۔ ایک کی قیادت محمود کے پاس تھی۔ نوح کو سلطان نے اپنے ساتھ رکھا کیونکہ وہ کمسن اور ناتجربہ کار تھا۔

گناہگار کے حوصلے جلدی پست ہو جایا کرتے ہیں۔ فائق اور بوعلی حسن اپنی فوجوں کو سلطان اور دارا کے رحم و کرم پر چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اُن کی کچھ فوج بھی بھاگ کر اُن کے پیچھے پیچھے چلی گئی۔ انہوں نے جرجان جا دم لیا۔ جہاں کے حکمران فخر الدولہ نے انہیں پناہ دی۔ سپہ سالار دارا کے سینے میں ایمان کا شعلہ کچھ ایسا بھڑکا تھا کہ وہ جرجان تک ان غداروں کا تعاقب کرنے پر زور دے رہا تھا لیکن سلطان سبکتگین نے اُسے یہ کہا کہ وہ خانہ جنگی کو طول نہیں دینا چاہتا۔ اس کی بجائے وہ انہیں دوستی اور اتحاد کا پیغام دینا چاہتا تھا۔ محمود غزنوی دارا کا ہم نوا تھا۔ اس کا نوجوان خون اُسے انتقام لیے بغیر چین نہیں لینے دے رہا تھا۔

سلطان سبکتگین نے اپنی فوجوں کو سمیٹا اور غزنی کو کوچ کر گیا۔ محمود غزنوی تھوڑی سی فوج کے ساتھ نیشاپور چلا گیا۔ گورنر کی حیثیت سے اُسے وہیں رہنا تھا۔ نوح اپنے ملک بخارا کو روانہ ہو گیا۔ دارا سلطان کے ساتھ تھا۔

محمود غزنوی نیشاپور پہنچا ہی تھا کہ فوجی قاصد گھبراہٹ کے عالم میں دوڑتے آئے۔ انہوں نے بتایا کہ بوعلی حسن اور امیر فائق کی فوجوں نے حملہ کر دیا ہے۔ فخر الدولہ نے انہیں تازہ دم فوج دے دی تھی۔ وہ سلطان سبکتگین کی فوج کی نقل و حرکت دیکھتے رہے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ سلطان سبکتگین اور دارا فوج کا زیادہ تر حصہ اپنے ساتھ لے گئے ہیں اور محمود تھوڑی سی فوج کے ساتھ نیشاپور میں اکیلا رہ گیا ہے، تو انہوں نے نیشاپور پر حملہ کر دیا۔

محمود غزنوی نے اپنے قاصدوں کو سلطان سبکتگین کے پیچھے دوڑا دیا اور خود فوج

کی کمان سے کر مقابلے کے لیے بڑھا مگر دشمن میدان پر چھا چکا تھا۔ محمود کی پوزیشن اتنی کمزور تھی کہ وہ گھیرے میں آ گیا۔ اس کی فوج بہت تھوڑی بھی تھی اور ہرات کی لڑائی کے فوراً بعد بڑی لمبی مسافت طے کر کے آئی تھی۔ محمود اسے بروقت لڑائی کی ترتیب اور تنظیم میں لا ہی نہ سکا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ محمود کو پسپا ہونا پڑا۔ وہاں تو پسپائی بھی ناممکن نظر آ رہی تھی۔ انجام یہی نظر آ رہا تھا کہ محمود پکڑا جائے گا اور اس کی فوج بھی جنگی قیدی ہو جائے گی یا ماری جائے گی۔

دونوں قاصدوں کے گھوڑے غزنی کی طرف اُڑے جا رہے تھے۔ محمود غزنوی کی قسمت خدا کے بعد ان قاصدوں کے ہاتھ تھی۔ سفر لمبا تھا۔

مورخ لکھتے ہیں کہ دوسرے دن جب بوعلی حسن اور امیر فائق نے اپنے عقب میں گرد کے بادل اُٹھتے دیکھے تو وہ بہت خوش ہوئے کہ فخر الدولہ نے کمک بھیجی ہے اور اب وہ نیشاپور کو ترنوالے کی طرح نگل جائیں گے۔ مگر گرد سے جو فوج نکلی وہ سلطان سبکتگین کی تھی۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ سلطان اتنی جلدی آ جائے گا۔ سلطان کے ساتھ دارا تھا۔ دونوں نے بوعلی حسن اور امیر فائق کی فوج کو گھیرے میں لینے کے لیے اپنی فوج پہلوؤں پر پھیلا دی۔ دونوں باغیوں نے دیکھا کہ پسپائی کے راستے بند ہو چکے ہیں تو انہوں نے اپنی فوج کو سمیٹ کر سلطان سبکتگین کی فوج کے وسط میں آمنے سامنے کا حملہ کر دیا۔

محمود غزنوی جو پسپائی کی حالت میں تھا، پیچھے مڑا۔ مشہور مورخ فرشتہ لکھتا ہے ”محمود نے سخت غصے میں آئے ہوئے شیر کی طرح غداروں کی فوج پر ہلہ بول دیا۔ اُس کی حالت پاگلوں کی سی تھی۔ بوعلی حسن اور امیر فائق کی فوج کٹ گئی مگر ان دونوں غداروں کا کوئی پتہ نہ چلا کہ کدھر نکل گئے ہیں“ — فتح مکمل تھی۔ سانپ کا سر کچل دیا گیا تھا۔

ادھر لاہور میں ہندو راجے مہاراجے غزنی، بلخ، بخارا اور خراسان وغیرہ پر حملہ اور قبضہ کرنے کے لیے متحدہ فوج تیار کرنے میں دن رات مصروف تھے۔ ان تیاریوں میں پوری ہندو قوم شامل تھی۔ مرد اور عورتیں محنت و مشقت کر کے سرکاری

خزانہ بھرنے میں لگی ہوئی تھیں۔ راجوں مہاراجوں نے اپنے اختلافات اور عداوتیں ختم کر ڈالی تھیں۔ ہندوؤں میں لوگوں کے دماغوں میں یہ جنون پیدا کیا جا رہا تھا کہ ہندوستان کو اسلام سے محفوظ کرنے کے لیے اسلامی ملکوں پر قبضہ کرنا مذہبی فریضہ ہے۔

ادھر اسلامی ملکوں میں دو اسلامی فوجیں ایک دوسری کا خون بہا رہی تھیں۔ اقتدار پرست اپنی ہوس کی خاطر اسلام کی عسکری قوت تباہ کر رہے تھے اور قوم کے بیٹے کٹ رہے تھے۔

پشاور، لاہور اور بھٹنڈہ میں غزنی کے جو جاسوس تھے، وہ غزنی کو صحیح اور بروقت اطلاعیں بھیجنے کے لیے موت کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ ان کے جذبۂ ایثار، شجاعت اور فرض شناسی کے مظاہروں کو خدا کے سوا دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔ یہ گمنام جانباز تھے جنہوں نے اپنے اُوپر پردہ ڈالے رکھنے کے لیے اپنے نام بھی بدل ڈالے تھے۔ مگر ان کے ملک کے دو چار ایمان فروش ان کے جہاد پر مٹی ڈال رہے تھے۔

سلطان سبکتگین ذراستانے کے لیے اور فوج کو آرام دینے اور نئی بھرتی کے لیے بلخ چلا گیا اور وہیں قیام کا فیصلہ کیا۔ تب اُسے احساس ہُوا کہ جس بیماری کو وہ دبا رہا اور معمولی سمجھتا رہا ہے، وہ جان لیوا روگ ہے۔ جنگ و جدل نے اُسے اپنی صحت کی طرف دھیان دینے کی مہلت ہی نہیں دی تھی۔ طبیبوں نے اس کا علاج شروع کیا لیکن مرض بڑھتا گیا۔ اُس نے غزنی چلے جانے کا ارادہ کیا اور روانہ ہو گیا مگر وہ اس قدر کمزور ہو چکا تھا کہ تورموز (بلخ سے تھوڑی ہی دور) سے آگے جانے کے قابل نہ رہا۔ وہیں رک گیا۔

”ترجمہ یمنی“ میں لکھا ہے کہ ایک روز نقاہت کی انتہا کے عالم میں سلطان نے شیخ ابوالفتح سے جو اُس کے پاس بیٹھا تھا، کہا ”— ہم بیماری سے صحت یاب ہونے کے لیے پرہیز کرتے ہیں۔ صحت یاب بھی ہو جاتے ہیں۔ ریوڑ سمجھتے ہیں کہ موت نہیں آئے گی۔ مجھے بھیڑ کا خیال آتا ہے۔ اسے قصاب خرید کرے جاتا ہے۔ کبھی کسی ریوڑ

میں اُسے چھوڑ دیتا ہے۔ کبھی اکیلے کہیں باندھ دیتا ہے۔ بھیڑ زندہ رہنے کی آس لگائے رکھتی ہے مگر ایک روز قصاب اُس کی گردن پر چھری پھیر دیتا ہے۔ ایسے ہی ہم کئی بار بستر علالت پر لیٹتے اور اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور ایک روز موت اچانک ہماری گردن دبوچ لیتی ہے، اور ہمیں کچھ سوچنے اور کچھ کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔"

اس سے چالیس روز بعد سلطان سبکتگین نے صرف یہ کہہ کر کہ محمود سے کہنا تجھے بُت شکن بننا ہے، جان اللہ کے حوالے کر دی۔ یہ اگست ۹۹۷ عیسوی (شعبان ۳۸۷ھ) کا مہینہ تھا۔ اُس وقت سلطان کی عمر ۵۵ سال تھی۔ خانہ بدوشوں کا بیٹا جو غلاموں کی منڈی میں فروخت ہوا تھا تاریخ اسلام میں کبھی نہ مٹنے والا نام پیدا کر کے اور اپنے پیچھے تاریخ میں بُت شکن کہلانے والا بیٹا چھوڑ کر اللہ کے حضور چلا گیا۔

محمود غزنوی اپنے باپ کی وفات کی اطلاع پر پہنچا۔ اُس نے باپ کی میت اٹھوائی اور اسے غزنی لے گیا۔ تجہیز و تکفین کے فوراً بعد اُس نے سلطنت کو سنبھال لیا۔ اُس وقت اُس کی عمر چھبیس سال تھی۔

دو مائیں

سلطان سبکتگین کی تجہیز و تکفین کے بعد محمود غزنوی نیشاپور چلا گیا چونکہ وہ مردِ میدان تھا اس لیے اُس نے سب سے پہلے فوج کی تنظیم کی طرف توجہ دی۔ اُس نے غزنی جا کر سلطنت کے کاروبار کو دیکھنا ملتوی کر دیا۔ اُسے یقین تھا کہ حکومت کی مشینری چل رہی ہے، اور اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو اُسے اطلاع مل جائے گی۔ اُس کے دماغ میں سلطانی کا خبط ہوتا تو وہ سب سے پہلے غزنی جاتا اور باپ کی مسندِ سلطانی پر جا بیٹھتا۔

محمود غزنوی علماء، صوفیاء اور اولیاء کا شیدائی تھا۔ ان میں ابوالحسن خرقانی وہ ولی تھے جن کا وہ مرید تھا۔ ایک اور بزرگ ابوسعید عبدالملک صوفیا میں سے تھے جن کا محمود غزنوی معتقد تھا۔ خرقانی کہیں دور رہتے تھے۔ محمود کبھی کبھی اُن کے ہاں سلام اور پند و نصیحت کے لیے جایا کرتا تھا۔ اور ابوسعید کبھی کبھی اس کے ہاں آ جایا کرتے تھے۔ بیہقی لکھتا ہے کہ محمود غزنوی اُن کے استقبال کے لیے دربار سے اٹھ کر باہر جا کھڑا ہوتا تھا۔

محمود غزنوی کے ذہن پر راجہ جے پال اور اُس کے بُت سوار تھے۔ اُس کی توجہ فوجی امور پر مرکوز تھی۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ اُس کی سلطنت کو خوشامدیوں کی دیمک لگ چکی ہے اور خزانہ تیزی سے خالی ہو رہا ہے۔ محمود غزنوی کو یہ اطلاع اُس کی انٹیلی جنس کے ایک آدمی نے دی جو غزنی سے یہی اطلاع دینے آیا تھا۔ اُس نے بتایا کہ سلطنت کی گدی پر اُس کا چھوٹا بھائی اسماعیل بیٹھ چکا ہے۔ اور اس نے

اپنی سلطانی کا فرمان بھی جاری کر دیا ہے۔

اسماعیل سلطان سبکتگین کی دوسری بیوی سے تھا۔ سبکتگین کی وفات کے وقت یہ بیوی اُس کے پاس پہنچ گئی تھی۔ اس نے نزع کے عالم میں سبکتگین سے اس وصیت پر دستخط کروا لیے تھے کہ اسماعیل اس کی سلطنت کا جانشین ہوگا۔ بیشتر غیر مسلم مورخوں نے لکھا ہے کہ سبکتگین نے محمود کو اس لیے جانشین نہیں بنایا تھا کہ وہ اُس ماں کے بطن سے تھا جو غلاموں کی نسل سے تھی اور اسماعیل کی ماں شاہی خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ اُس دور کے وقائع نگاروں کی تحریروں کے مطابق یہی تسلیم کیا جاتا ہے کہ سبکتگین کے آخری لمحات اس قدر شدید تکلیف میں گزرے کہ اس نے نیم غشی کی کیفیت میں اسماعیل کو جانشین مقرر کر دیا۔ اس داستان کی پچھلی اقساط میں تفصیل سے سنایا جا چکا ہے کہ محمود غزنوی کی ماں کون تھی اور کس خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔

محمد قاسم فرشتہ لکھتا ہے کہ اسماعیل نوجوان اور کھلنڈرا تھا۔ اُسے محمود کے مقابلے میں کوئی عسکری تجربہ نہیں تھا۔ جنگوں میں سبکتگین کے ساتھ محمود رہتا تھا۔ سبکتگین نے اسماعیل کو اپنا جانشین مقرر کیا ہی نہیں ہوگا۔ اگر کیا ہی تھا تو اُس کے عالم نزع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسماعیل کی ماں نے اپنے بیٹے کو سلطان بنوایا ہوگا۔

دونوں بھائیوں میں اتنا فرق تھا کہ جب محمود اپنے باپ کی تجہیز و تکفین سے فارغ ہو کر نیشاپور چلا گیا اور راجہ جے پال کا حملہ روکنے یا ہندوستان پر حملہ کرنے کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا، اُس وقت اُس کا چھوٹا بھائی اسماعیل بلخ میں اپنی رسم تاجپوشی میں مگن ہو گیا۔

"سلطان عالی مقام!" — غزنی سے آئے ہوئے آدمی نے محمود غزنوی سے کہا — "اب ہندوستان کے کسی راجہ کو ہماری سلطنت پر حملہ کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ ہمارے دشمن ہماری سلطنت کی تباہی چاہتے ہیں۔ آپ نے اور آپ کے والد مرحوم نے انہیں ناکوں چنے چبوا دیئے ہیں۔ وہ جب بھی آئے، اپنے خون میں ڈوب گئے، مگر سلطان سبکتگین مرحوم سلطنت کی تباہی کا انتظام اپنے ہاتھوں کر گئے ہیں۔"

"فوراً وہ خبر سناؤ جو غزنی سے لائے ہو" — محمود نے کہا۔

"میں نے آپ کو سلطان کہا ہے کیونکہ آپ مرحوم سلطان کے بیٹے ہیں" — اس آدمی نے کہا — "مگر سلطان آپ نہیں، آپ کے برادر خورد اسماعیل ہیں۔ میں آپ کا خادم اور ملازم ہوں۔ مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں کہ سلطنت کی گدی پر کون بیٹھا ہے۔ میں ایک وفادار اور نمک حلال ملازم کی حیثیت سے یہ بتانے آیا ہوں کہ جس دربار میں سالار اور دیگر عسکری کمانڈر احکام اور ہدایات لینے آیا کرتے تھے، وہاں اب خوشامدیوں کا ہجوم ہوتا ہے۔ میں یہ تو نہیں بتا سکتا کہ آپ کے بھائی کے مشیر کون ہیں۔ وہ جو کوئی بھی ہیں، انہوں نے آپ کے بھائی کو چرب زبانی اور چاپلوسی کی زنجیروں میں گرفتار کر لیا ہے۔ بنہایت معمولی حیثیت کے لوگوں کو اعلیٰ رتبے اور درجے دے دیئے گئے ہیں۔ فوج کی تنخواہوں میں اضافہ کر دیا گیا ہے۔ مجھے آپ کے اور آپ کے والد مرحوم کے وفاداروں نے بتلایا ہے کہ خزانہ تیزی سے خالی ہوتا جا رہا ہے۔"

محمود غزنوی کو جیسے چکر آ گیا ہو۔ اُس نے آدمی کو اس ہدایت کے ساتھ رخصت کر دیا کہ وہ وہاں کی مزید اطلاعات فراہم کرے۔ وہ خود اپنی ماں کے پاس گیا جو اُس کے ساتھ رہتی تھی۔

"مجھے خود وہاں جانا چاہیئے" — محمود غزنوی نے اپنی ماں سے کہا — "مجھے وہاں سے آنا ہی نہیں چاہیئے تھا، مگر میرے دل میں سلطانی کی خواہش نہیں تھی۔ میرے فرض کے تقاضے کچھ اور ہیں۔"

"تمہیں وہاں نہیں جانا چاہیئے" — ماں نے اُسے کہا — "تمہارا بھائی تمہیں قتل کرا سکتا ہے۔ تخت و تاج کا نشہ انسان کو وحشی اور درندہ بنا دیتا ہے.... اور یہ بھی سوچ لو کہ وہ اپنے باپ کا جانشین بننے کے قابل ہے تو اُسے سلطان بنا رہنے دو اور فوج کی کمان تم اپنے ہاتھ میں رکھو۔"

"اگر وہ اس قابل ہوتا تو میں اتنا پریشان کیوں ہوتا" — محمود نے کہا — "کیا آپ اُسے جانتی نہیں کہ وہ کس قماش کا لڑکا ہے! مجھے میرے پیر و مرشد نے بتایا ہے کہ نااہل اور خود غرض حکمران کے گناہوں کی سزا پوری قوم کو بھگتنا پڑتی ہے۔ میں سلطان نہیں بننا چاہتا۔ مجھے سلطنت کو بچانا ہے۔ اسے ایک مضبوط قلعہ بنا کر مجھے اسلام

کی شمع ہندوستان کے بت خانے تک پہنچائی ہے.... اگر میرا بھائی مخلص ہوتا تو وہ، مجھے اپنی تاجپوشی پر بلاتا۔ اُس نے مجھے اطلاع تک نہ دی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی نیت صاف نہیں۔ مجھے وہاں جانا چاہیے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ ان دنوں اسماعیل غزنی میں نہیں بلخ میں ہے۔"

"ہم اسے پیغام لکھ کر بھیج دو"۔ ملن نے کہا ۔ "اُس سے پوچھو کہ مجھے جو خبریں ملی ہیں وہ کہاں تک درست ہیں۔ اُس کے جواب کا انتظار کرو۔"

اسماعیل اُس وقت بلخ میں ہی تھا جب قاصد نے اُسے محمود کا پیغام دیا۔ اسماعیل نے کاغذ کھولے بغیر اپنے ایک حاکم کی طرف پھینک کر کہا ۔ "پڑھ کر سناؤ، میرے بھائی نے کیا لکھا ہے"۔

اس حاکم نے کاغذ سیدھے کیے اور بلند آواز سے پڑھنا شروع کیا۔ "عزیز بھائی!"

اسماعیل نے غصے سے اپنی ران پر ہاتھ مار کر کہا۔ "اس نے ہمیں بھائی لکھا ہے! سلطان نہیں لکھا؟"

"نہیں ظلِ الٰہی!" ۔ حاکم نے جواب دیا۔

"یہ بدصورت مسخرا اس قدر گستاخ ہے؟"

"اسے اس کی سزا ملنی چاہیے سلطان عالی مقام!" ۔ ایک درباری نے کہا ۔ "اگر باپ گستاخی کرے تو اُسے بھی سزا ملنی چاہیے۔ خدا اور رسولؐ کے بعد درجہ سلطان کا ہوتا ہے۔ ظلِ الٰہی کی سواری جس راہ سے گذرتی ہے، اس راہ پر رعایا سجدے کرتی ہے۔ آپ کے دشمن آپ کا نام سن کر کانپتے ہیں"۔

"آگے پڑھو" ۔ اسماعیل نے حکم دیا۔

"محمود نے لکھا ہے" ۔ حاکم پیغام پڑھنے لگا ۔ "مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں کہ تم سلطنت کی مسند پر بیٹھ گئے ہو۔ اللہ تمہیں یہ اعزاز مبارک کرے مگر اس سلطنت پر جو خطرے منڈلا رہے ہیں اور اس مسند کے ساتھ جو فرائض اور

ذمہ داریاں وابستہ ہیں، شاید تم ان سے واقف نہیں ہو۔ اگر واقف ہوتے تو اس مسند کو پھولوں کی سیج سمجھ کر آرام سے بیٹھ نہ جاتے۔ سب سے پہلے میرے پاس آتے یا مجھے اپنے پاس بلاتے۔ اگر تم مجھے اس قابل نہ سمجھتے تو مجھے اپنے باپ کا بیٹا سمجھ کر ہی اپنی تاجپوشی میں شریک کر لیتے۔ اس سے مجھے شک ہو رہا ہے کہ تمہاری نیت ٹھیک نہیں رہی۔ درباری چاپلوسوں نے تمہاری ناتجربہ کاری سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے تمہاری نیت ٹھیک نہیں رہنے دی۔ تم جانتے ہو کہ سلطنت کے اندر بھی دشمن موجود ہیں۔ تمہارے سامنے ان کے ساتھ لڑائیاں لڑی گئی ہیں۔ ہندوستان کے بُت پرست ہم پر دو حملے کر چکے ہیں، اور تیسرے حملے کی تیاری کر رہے ہیں۔ اس وقت ہماری ضرورت یہ نہیں کہ دربار لگا کر درباریوں کے سلام اور قصیدے وصول کیے جائیں۔ اس وقت ہمیں خیموں میں ہونا چاہیے....

"اگر تم یہ بہتر سمجھتے ہو کہ تم سلطنت کا کاروبار سنبھال سکتے ہو تو میں جنگی امور سنبھال لیتا ہوں۔ اس وقت جنگی امور کی طرف زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ میں صرف اس صورت میں تمہیں سلطانی سونپ سکتا ہوں کہ تم اچھے اور بُرے میں، دوست اور دشمن میں، نیک اور بد میں تمیز کرنے کے قابل ہو جاؤ مگر مجھے یقین ہے کہ تم اس قابل نہیں ہو۔ تم نے نااہل لوگوں کو رُتبے دے دیئے ہیں۔ ان میں یہ خوبی دیکھی ہے کہ وہ خوشامدی اور چرب زبان ہیں۔ تم نے فوج کی تنخواہ بڑھا کر خزانے پر بے جا بوجھ ڈال دیا ہے۔ تم یہ بھی بھول گئے ہو کہ تم ایک اسلامی سلطنت کے سلطان ہو اور تمہارے اوپر ایک خلیفہ بھی ہے....

"میری ایک تجویز مان لو تاکہ میں وہ فرض ادا کر سکوں جو مرحوم باپ ادھورا چھوڑ گئے ہیں۔

"اگر آپ حکمرانی کے قابل نہیں تو اور کون ہے؟" — ایک اور نے کہا۔

وہاں جتنے درباری موجود تھے، انہوں نے محمود غزنوی کے پیغام کے خلاف باتیں کیں۔ ان سب کو اسماعیل نے رتبے دیئے تھے۔ محمود نے انہی لوگوں سے اسماعیل کو خبردار کیا تھا۔ اسماعیل نے اپنے بڑے بھائی کو اتنی سی بھی اہمیت نہیں دی تھی کہ اس کا پیغام تنہائی میں پڑھتا۔ درباری عہدیداروں نے وہ طوفان کھڑا کیا کہ اسماعیل اس میں اڑنے لگا۔

"آپ کے بڑے بھائی نے اس پر بھی اعتراض کیا ہے کہ آپ نے فوج کی تنخواہیں بڑھا دی ہیں" — وزیر نے کہا — "سلطانِ عالی مقام! آپ کی اس کرم نوازی سے ساری فوج آپ کی مرید ہو گئی ہے۔ آپ کے اشارے پر فوج کٹ مرے گی... اور پیغام میں یہ جو لکھا گیا ہے کہ سلطنت کے اندر بھی ہمارے دشمن موجود ہیں اور ہندوستان کے بت پرست بھی دشمن ہیں... ظلِ الٰہی! جان بخشی کی التجا کرتا ہوں۔ سلطنت کے اندر ہمارا کوئی دشمن نہیں۔ آپ کے والد جن کے خلاف لڑے تھے، انہیں دشمن بنایا گیا تھا اور اس میں آپ کے بڑے بھائی محمود کا ہاتھ تھا۔ وہ چاہتا ہے کہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو اپنی سلطنت میں شامل کرے۔ ہندوستان کے بت پرستوں کی ہمارے ساتھ کیا دشمنی ہو سکتی ہے۔ ہم ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائیں گے۔ ہمیں جنگ و جدل سے کیا۔"

وزیر کی تائید میں کئی ایک آوازیں سنائی دیں۔ صرف ایک بوڑھا تھا جو خاموش بیٹھا کبھی اسماعیل کو اور کبھی ان لوگوں کو دیکھتا تھا۔ جب وزیر نے کہا کہ ہمیں جنگ و جدل سے کیا، تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ خزانے کا مہتمم اعلیٰ فرخ زاد ابراہیم تھا۔

"جو اپنی عزت، اپنا وقار اور اپنا ایمان بیچ ڈالیں، انہیں جنگ و جدل سے کیا" — بوڑھے نے غصے اور جذبات کی شدت سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا — "اسماعیل ابنِ سبکتگین! تو میرے ہاتھوں میں پیدا ہوا تھا، میرے سامنے پل کر جوان ہوا، مگر تو تو بچہ ہے اور ان ایمان فروشوں کے ہاتھوں کھیل رہا ہے۔ یہ تجھے اپنا کٹھ پتلی بنا چکے

ہیں۔ یہ دنیا کے لالچ سے اندھے ہو گئے ہیں، اور تجھے بھی اندھا کر رہے ہیں۔ تو نے اپنے آپ کو اس سلطنت پر ٹھونسا ہے۔ تجھے نہ قوم نے سلطانی دی ہے نہ خدا نے۔ اگر تجھ میں عقل ہے، تو اسے استعمال کر اور گریبان میں منہ ڈال کر سوچ کہ تو اس مسند کے قابل ہے؟... تیرے بھائی نے ٹھیک لکھا ہے کہ تو نے ان لوگوں میں صرف یہ خوبی دیکھی ہے کہ یہ خوشامدی ہیں۔ یہ تجھے تباہی کے راستے پر لے جا رہے ہیں۔ یہ اپنا پیٹ بھر رہے ہیں۔ انہوں نے خزانہ خالی کر دیا ہے۔ یہ تجھے مشورہ دے رہے ہیں کہ ہندوستان کے بت پرستوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاؤ۔ ان کا مطلب صرف یہ ہے کہ کسی سے جنگ و جدل نہ ہو اور ایمان فروش من مانی اور عیش و عشرت کرتے رہیں۔"

"سلطانِ عالی مقام!" — وزیر نے کہا — "یہ بہت بوڑھا ہو گیا ہے۔ اس کا دماغ ٹھکانے نہیں رہا۔ اسے وظیفہ دے کر گھر بھیج دیں۔ جہاں جاتا ہے ایسی ہی واہی تباہی بکتا رہتا ہے۔"

"لے جاؤ اسے" — اسماعیل نے حکم دیا۔

درباری اس پر ٹوٹ پڑے اور اسے دھکیلتے ہوئے باہر لے گئے۔ اس کی آواز سنائی دیتی رہی — "جہاں بھائی سلطنت کی خاطر ایک دوسرے کے دشمن ہو جاتے ہیں وہاں سے رحمت کے فرشتے اٹھ جاتے ہیں...... فتح بیرج کی ہوتی ہے۔"

محمود غزنوی نیشاپور میں اپنے پیغام کے جواب کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ بے چین اور مضطرب تھا۔ جب قاصد پیغام کا جواب لے کر آیا تو محمود کی بے چینی اور اضطراب میں اضافہ ہو گیا۔ اسماعیل کا جواب مختصر تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ اسے باپ سلطنت کا جانشین بنا گیا ہے، اور وہ کسی کے حق میں دستبردار نہیں ہوگا۔ اس نے یہ بھی لکھا کہ اس نے محمود کی یہ گستاخی معاف کر دی ہے۔ آئندہ وہ ایسا پیغام بھیجنے کی جرأت نہ کرے۔

محمود غزنوی نے ماں، اپنے ماموں بوغرا اور اپنے چھوٹے بھائی نصیر الدین یوسف کو بلایا اور یہ صورتِ حال ان کے سامنے رکھ کر کہا — "آپ سب اسماعیل کو جانتے ہیں۔ اس نے میرے پیغام کا جو تحریری جواب بھیجا ہے، یہ اس کے اپنے الفاظ نہیں۔

اُس میں اتنی عقل نہیں۔ مجھے قاصد نے بتایا ہے کہ بلخ میں درباریوں نے میرے پیغام کا کس طرح مذاق اڑایا ہے، اور اسماعیل اُن کے جال میں آچکا ہے۔ ان لوگوں نے فرخ زاد ابراہیم جیسے بزرگ کو جس کا احترام ہمارے والد بزرگوار بھی کرتے تھے، تیغ کی پاداش میں گھسیٹ کر باہر نکال دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سلطنت غزنی سے دین و ایمان اُٹھ گیا ہے۔ میں کسی درباری مشیر سے مشورہ نہیں لیا کرتا۔ میرے مشیر آپ ہیں۔ ہم سب کی رگوں میں ایک ہی خون ہے اور ہم سب کا نظریہ ایک ہے۔ مجھے شک ہونے لگا ہے کہ میرے بھائی اسماعیل کے خون میں ملاوٹ ہے۔"

"وہ میری کوکھ سے پیدا ہوا ہوتا تو ہوس کار بندوں کی بجائے براہ راست خدا سے مشورہ لیتا۔" محمود کی ماں نے کہا۔ "وہ ہے تو تیرے ہی باپ کا بیٹا لیکن اس کی ماں نے اس کے دل میں سلطنت کی ہوس ڈال دی ہے.... اور محمود! میں تجھے منہ کی دعا دیں اُس روز کہتی تھی جس روز تو ہندوؤں کے حملوں کا انتقام ہندوستان پر حملہ کرکے لے گا اور جس روز ہندوستان کے بُت ریزہ ریزہ ہو چکے ہوں گے۔"

"مگر فوج کا سب بڑا حصہ اسماعیل کے قبضے میں ہے۔" محمود نے کہا۔ "اُس نے فوج کی تنخواہوں میں اضافہ کرکے فوج کو اپنا وفادار بنا لیا ہے۔ اُس کا جواب آپ نے پڑھ لیا ہے۔ اُس نے صلح اور سمجھوتے کے راستے بند کر دیئے ہیں۔ کیا آپ مجھے اجازت دیں گے کہ میں، جتنی بھی فوج میرے پاس ہے اس سے بلخ پر حملہ کر دوں؟"

"اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ ...." اس کے ماموں بوعزاز نے کہا۔ "لیکن خطرہ ہے۔ تمہارے پاس فوج تھوڑی ہے۔ پہلے یہ کیوں نہ دیکھ لیا جائے کہ بلخ اور غزنی کی فوج کس حد تک اسماعیل کی وفادار ہے۔"

"میرے پاس وقت نہیں۔" محمود غزنوی نے کہا۔ "ہندوستان سے جو اطلاعیں آرہی ہیں، وہ تشویشناک ہیں۔ وہاں صرف فوج نہیں بلکہ پوری ہندو قوم حملے کی تیاری کر رہی ہے۔ ہندوؤں میں پنڈت بھی غزنی پر حملے کے سوا کوئی بات نہیں کرتے۔ میرے پاس باتوں کے تیر چلانے کا وقت نہیں ہے۔" اُس نے آہ لی اور بولا۔ "مجھے اس وقت ہندوستان میں ہونا چاہئے تھا مگر یہ اسلام کی بدنصیبی ہے کہ ہمارا باپ اپنے ایمان فروش بھائیوں کے خلاف لڑ رہا ہے اور اپنی سرحد سے نکل نہ سکا، اور مجھے بھی خانہ جنگی میں الجھایا جا رہا ہے۔"

"بیٹا!" ماں نے کہا۔ "شکست ہوس کار کی ہوگی۔"

"اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں رہی کہ اسماعیل سلطنت کو تباہ کر رہا ہے۔" محمود کے ماموں نے کہا۔ "... ہمیں سلطنت کو بچانا ہے۔ اس کا طریقہ اس کے سوا اور کوئی نہیں کہ فوج کو استعمال کیا جائے۔"

اُس وقت اسماعیل بلخ میں ہی تھا جب اُسے اطلاع ملی کہ نیشاپور سے اپنی فوج محمود کی کمان میں غزنی کی طرف پیش قدمی کر رہی ہے۔ نیشاپور غزنی کے شمال مغرب میں واقع ہے اور بلخ نیشاپور کی نسبت غزنی کے قریب ہے۔ اسماعیل کو اُس وقت اطلاع ملی جب محمود کی فوج آدھا راستہ طے کر چکی تھی۔ اسماعیل نے اپنے سالاروں، مشیروں اور وزیروں کو بلا کر کہا کہ اس کے بھائی محمود نے اُس کے خلاف بغاوت کر دی ہے اور وہ غزنی پر قبضہ کرنے آرہا ہے۔

"اسے میرے خلاف یہ شکایت ہے کہ میں نے فوج کی تنخواہ بڑھا دی ہے۔" اسماعیل نے سالاروں سے کہا۔ "وہ غزنی کی فوج کو غلاموں کی فوج بنانا چاہتا ہے۔ تمام فوج کو بتا دو کہ محمود کی نیت کیا ہے، اور فوج کو تیاری کا حکم دو۔"

اسماعیل کے مشیروں نے اسی مقصد کے لیے اسماعیل کو فوج کی تنخواہیں بڑھانے کا مشورہ دیا تھا کہ فوج دشمن کے خلاف لڑنے کی بجائے سلطان اسماعیل کے مخالفین کو کچلنے کے کام آئے۔ وزیر اور دیگر مفاد پرست اُمرا اور حاکموں نے فوج کو مزید مراعات دلا کر پروپیگنڈا کرایا کہ محمود فوج کو اپنی کمان میں لے کر ہندوستان پر حملہ کرنا چاہتا ہے اور اس حملے کا مقصد صرف یہ ہوگا کہ وہ ہندوستان کے خزانوں اور زر و جواہرات سے اپنا خزانہ بھر لے۔

اسماعیل کی فوج غزنی سے کچھ دُور اُس مقام تک پہنچ گئی جہاں محمود غزنوی

کی فوج نے آخری پڑاؤ کر رکھا تھا۔ اسماعیل نے اس کے قریب اپنی فوج کو خیمہ زن کر دیا۔ محمود کی دشواری یہ تھی کہ اُس کے پاس فوج بہت کم تھی۔ ایک تو یہ کمی اس کی کمزوری تھی، دوسرے اس کی نیت یہ تھی کہ آپس کے خون خرابے سے گریز کیا جائے۔ اس نے آخری کوشش کے طور پر اپنا ایلچی اس پیغام کے ساتھ اسماعیل کے پاس بھیجا کہ لڑائی کی بجائے صلح سمجھوتے کے لیے دونوں کی ملاقات ہونی چاہیے۔ خانہ جنگی سے فائدہ دشمن کو پہنچے گا۔ محمود نے پیغام میں یہ بھی لکھا کہ ہندوستان کی فوج نے ہماری آپس کی لڑائی کے دوران حملہ کر دیا تو وہ سلطنت ہی نہیں رہے گی جس کی خاطر ہم دو بھائی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے ہیں۔

"میں اُسے نہیں ملوں گا" ___ اسماعیل نے محمود کے ایلچی سے کہا ___ "وہ باغی ہے۔ میں اسے گرفتار کر کے ایسی عبرت ناک سزا دوں گا کہ میری سلطنت میں کسی کو بغاوت کی جرأت نہیں ہو گی۔"

"اُنہوں نے نیک نیتی سے ملاقات کا اظہار کیا ہے" ایلچی نے کہا ___ "اور مجھے اختیار دیا ہے کہ میں آپ کو ملاقات کے لیے آمادہ کروں۔ میں قاصد نہیں، ایلچی ہوں۔ ہم نے پہلی خانہ جنگی میں کیا حاصل کیا ہے؟ اب دیکھ لیں۔ خانہ جنگی ہماری روایت بن گئی ہے۔ آج ایک باپ کے دو بیٹے ایک دوسرے کے خلاف تلواریں تانے کھڑے ہیں۔"

"میں محمود کی نیت کو اچھی طرح سمجھتا ہوں" اسماعیل نے کہا ___ "وہ صلح اور سمجھوتے کی بات صرف اس لیے کر رہا ہے کہ اُس کے پاس فوج بہت تھوڑی ہے اور اُسے اپنی شکست اور اپنی موت نظر آ رہی ہے۔ میں اس کی فوج کو کچل ڈالوں گا اور محمود میرا قیدی ہو گا.... جاؤ اُسے کہہ دو کہ میری اور تمہاری فوجوں کی ملاقات ہو گی۔"

ایلچی جب واپس جانے کے لیے گھوڑے پر سوار ہوا تو اُس نے کہا ___ "ہوس اور غرور نے بڑے بڑے جابر بادشاہوں سے ہتھیار ڈلوائے ہیں" ___ اور اس نے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔

محمود غزنوی نے اپنے باپ کی طرح دو رکعت نفل پڑھے اور خدا کے حضور

سر گرایا ___ "خدائے بزرگ و برتر! اگر میرا فیصلہ غلط ہے تو مجھے ابھی اس دنیا سے اٹھا لے۔ اگر تیرے حضور نیت پرکھی جاتی ہے تو میری نیت دیکھ۔ مجھے دنیا کے جاہ و جلال کی خواہش نہیں۔ میرے دل میں سلطانی کی ہوس نہیں۔ میں تیرے نام کو ہندوستان کے بُت خانوں تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ وہاں اسلام کی شمع جو محمد بن قاسم نے جلائی تھی، وہ بجھ رہی ہے۔ میں اس شمع کو اپنے لہو سے روشن کرنا چاہتا ہوں۔ میرے بھائی میرے راستے کی چٹانیں بن گئے ہیں۔ مجھے ہمت عطا فرما کہ ان چٹانوں کو روند کر اپنی منزل کی طرف نکل جاؤں۔"

اُس نے سالاروں، کمانداروں اور عہدیداروں کو بلا کر کہا ___ "آج دو بھائی دشمن بن کر ایک دوسرے کے سامنے آئے ہیں۔ ہر ایک سپاہی کے ذہن میں ڈال دو کہ تم اپنے بھائیوں کے خلاف نہیں، قوم کے غداروں کے خلاف لڑنے آئے ہو۔ تمہارے چچا، تایا، ماموں یا اُن کے بیٹے اس فوج میں ہوں گے جس کے خلاف تم لڑو گے۔ انہیں بتاؤ کہ بدر کے میدان میں خون کے رشتے ایک دوسرے کے خلاف لڑے تھے اور یہ لڑائی ہمارے رسول مقبول صلعم نے لڑائی تھی۔ آپ حق پر تھے اس لیے تین سو تیرہ نے ایک ہزار کو شکست دی تھی۔ تم بھی حق پر ہو۔ ہمیں وہی نور سب کفرستان تک پھیلانا ہے جس کی خاطر ہمارے رسول صلعم نے خون کے رشتوں کی پہلی جنگ لڑائی تھی۔ ہماری تعداد بہت تھوڑی ہے۔ سپاہیوں کو یقین دلاؤ کہ خدا ہمارے ساتھ ہے۔"

اس کے بعد محمود غزنوی نے سالاروں وغیرہ کو جنگی ہدایات دیں۔ تعداد کی کمی اُسے بہت پریشان کر رہی تھی۔ اُسے اب دھوکے اور چالوں کی جنگ لڑنی تھی۔ اس نے ایک چٹان پر کھڑے ہو کر اپنے بھائی کی خیمہ گاہ کی طرف دیکھا۔ اُس نے اپنے دل پر بوجھ سا محسوس کیا۔ اسماعیل کی فوج ایک لشکر تھا، اور اس لشکر کے آگے ہاتھی تھے (مؤرخوں نے ہاتھیوں کی تعداد دو اور تین سو کے درمیان لکھی ہے) ہاتھیوں کی پیشانیوں اور سونڈوں پر لوہے کے خول چڑھے ہوئے تھے۔ یہ وہ ہاتھی تھے جو راجہ جے پال کے دو

حملوں میں اُس کی فوج سے چھینے گئے تھے۔ سلطان سبکتگین نے یہ ہاتھی غزنی بھیج دیئے تھے۔ یہ جنگی ہاتھی تھے۔

راجہ جے پال جب اسماعیل کی فوج سے کئی گنا زیادہ لشکر لے کر حملہ کرنے آیا تھا تو اُس کے ساتھ سینکڑوں ہاتھی تھے۔ محمود غزنوی نہ اس لشکر سے گھبرایا تھا نہ ہاتھیوں سے۔ اُسے اس احساس نے دلیری دی تھی کہ یہ لشکر اس کے مذہب اور اس کی قوم کے دشمن کا ہے۔ اب اسماعیل کے لشکر کو دیکھ کر اُسے جہاں یہ دکھ ہوا کہ یہ اس کی اپنی فوج ہے جو اس کے خلاف لڑنے آئی ہے، وہاں اُسے یہ خطرہ بھی نظر آیا کہ یہ مسلمان جنگجوؤں کی فوج ہے جو لڑنا اور مرنا جانتی ہے اور جو اُس کی چالوں سے واقف ہے۔ اُسے معلوم تھا کہ یہ فوج صرف اس لیے اس کے خلاف لڑنے آگئی ہے کہ اس کی تنخواہیں بڑھا دی گئی ہیں۔ اس سے اُسے یہ اطمینان ہوا کہ یہ فوج قومی جذبے کی بجائے تنخواہ کے زور پر لڑنے آئی ہے، اس لیے اسے شکست دی جا سکے گی، مگر محمود کا یہ مسئلہ جوں کا توں موجود تھا کہ اُس کی فوج کی تعداد کم تھی۔

اُس نے اپنی قلیل فوج کو چار حصوں میں تقسیم کیا۔ زیادہ تعداد کا حصہ اپنی کمان میں محفوظ میں رکھا۔ دو حصوں کو پہلوؤں کو پھیلایا اور چوتھے حصے کو دشمن کے سامنے رکھا۔ اس نے محسوس کر لیا کہ اُسے چھاپہ مار جنگ لڑنی پڑے گی کیونکہ جم کر لڑنے کے لیے نفری بہت تھوڑی تھی۔ اُس نے اپنے سالاروں سے کہا کہ وہ ذرا سی دیر کے تصادم کے بعد اِدھر اُدھر ہونے کی کوشش کریں اور اسماعیل کی فوج کو پھیل جانے پر مجبور کر دیں۔ اس علاقے میں چٹانیں بھی تھیں۔ محمود نے ان سے فائدہ اٹھانے کے لیے سالاروں اور کمانداروں کو یہ چال بتائی کہ وہ دشمن کو اس طرح بکھیریں کہ اُس کے جیش اور دستے چٹانوں کے درمیان بھی چلے جائیں اور ان کے درمیان چٹانیں آجائیں۔ اس نے جنگ کو طول دینے کی ہدایت بھی دی۔ شبخون مارنے کے لیے حالات سازگار نہیں تھے کیونکہ دونوں طرف کی فوجیں دراصل ایک ہی فوج تھی۔ شبخون مارنے کی مہارت رکھتی تھیں اور اسے شبخون سے بچاؤ کے طریقے بھی آتے تھے۔ مثلاً رات کو دونوں طرف کی خیمہ گاہوں کے اندر بھی اور باہر دور دور تک بڑی مشعلیں جلا کر جگہ جگہ رکھ دی گئی تھیں۔

اُس کے علاوہ تیر انداز گھوڑ سوار خیمہ گاہوں کے اردگرد گھوم پھر رہے تھے۔

محمود غزنوی خیمے سے نکلنے لگا تو اُس کی ماں آگئی۔ محمود دوڑ کر اس کے قدموں میں گر پڑا اور زار و قطار رویا۔ ماں نے اسے اٹھا کر گلے لگا لیا۔

"میری عظیم ماں!" محمود نے رندھیائی ہوئی آواز میں کہا۔ "میرے باپ کی روح مجھ پر لعنت تو نہیں بھیجے گی؟ یہ پہلی لڑائی ہے جو میں اُن کے بغیر لڑ رہا ہوں اور وہ بھی اپنے بھائی کے خلاف۔ مجھے بخش دو ماں! میں اب بھی تلوار نیام میں ڈال لوں گا۔ میں نہیں لڑنا چاہتا۔ آنے والی نسلیں کہیں گی کہ سبکتگین کے بیٹے سلطانی کے تخت پر لڑ مرے تھے۔"

"اب کچھ بھی نہ سوچو۔" ماں نے کہا۔ "خون نیلے ہو جائیں تو آنکھوں میں بھی سیل آجاتی ہے۔ تمہارے بھائی کے خون میں لالچ اور ہوس کی میل آگئی ہے۔ اب کچھ نہ سوچو۔ ذہن سے وہم اور وسوسے نکال دو۔ اب اس فیصلے پر قائم رہو جو ہم کر چکے ہیں۔ میں ساری رات خدا کے حضور سجدے کرتی رہی ہوں ... جا میرے بیٹے! میں تمہیں خدا کے سپرد کرتی ہوں۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔"

وقائع نگاروں کی تحریروں کے مطابق حملے میں پہل اسماعیل نے کی۔ اُس نے تعداد کی افراط کے بل بوتے پر یلغار کے انداز سے آمنے سامنے کا حملہ کیا۔ محمود غزنوی کی ہدایت کے مطابق تیر اندازوں نے ہاتھیوں پر تیر برسائے اور ان پر برچھیاں بھی پھینکیں۔ دشمن کو ہاتھیوں پر بہت بھروسہ تھا لیکن اُس کے سالاروں کو اندازہ نہیں تھا کہ ہاتھی اپنی دہشت، طاقت اور جسامت کے باوجود کچھ کمزوریاں رکھتا ہے۔ محمود نے اسی لیے ہاتھیوں کو زخمی کرنے کو کہا۔ ادھر سے جو ہاتھی زخمی ہوئے وہ اپنی فوج کے لیے مصیبت بن گئے۔ اُن کی چنگھاڑ سے گھوڑے بھی بدکنے لگے۔

محمود غزنوی بلندی سے دیکھ رہا تھا۔ اُس کے سپاہیوں نے بیشتر ہاتھیوں کو بیکار کر دیا تھا مگر یہ کافی نہیں تھا۔ اسماعیل کے حملہ آور دستوں نے ہاتھیوں کے نقصان

کی پرواہ نہ کی۔ ان کی یلغار بڑی تیز تھی۔ محمود کی ہدایت کے مطابق اس کے دستے جم کر لڑنے
کی بجائے ادھر ادھر ہونے لگے مگر دشمن کا دباؤ اتنا زیادہ تھا کہ محمود کی چال کامیاب
ہوتی نظر نہیں آتی تھی۔ وہ اپنے سپاہیوں کو پٹتا دیکھ رہا تھا۔ ایک فرانسیسی مورخ ڈی
ہیبلوٹ لکھتا ہے کہ محمود غزنوی کو اپنی شکست یقینی نظر آرہی تھی۔ صاف پتہ چلتا
تھا کہ اسے پسپائی بچا سکتی ہے، یا کوئی معجزہ۔

اسماعیل نے حکم دے دیا کہ محمود کو زندہ پکڑو۔ دونوں طرف تکبیر کے نعرے گرج
رہے تھے، اور دونوں طرف ایک سے ہی جیسے پرچم پھڑپھڑا رہے تھے۔ محمود کے دستوں
کے نعرے دبتے جا رہے تھے۔ ان کی یہ چال کہ وہ ادھر ادھر ہو کر دشمن کو بکھیر دیں گے
ناکام ہو گئی تھی۔ وہ اب جم کر لڑ رہے تھے۔ مورخوں کے مطابق یہ معرکہ بہت ہی خونریز
تھا۔ دونوں فوجیں قہر اور غضب سے لڑ رہی تھیں مگر محمود غزنوی کے دستوں کا بہت
جلدی ختم ہو جانا یقینی تھا۔

اپنے ان دستوں کو بچانے کے لیے محمود نے دشمن کے دونوں پہلوؤں پر حملے کرا
دیئے لیکن اس انداز سے کہ دستے حملہ کر کے دائیں اور بائیں کو نکلنے کی کوشش کریں۔
یہ چال اس لحاظ سے کامیاب رہی کہ اسماعیل کی فوج پہلوؤں کی طرف پھیلنے لگی۔

محمود کے دستوں نے یہی طریقہ اختیار کر لیا کہ وہ گھوم پھر کر حملہ کرتے اور پہلوؤں کی طرف
نکل جاتے۔ محمود نے اپنے ان دستوں کے لیے جو آمنے سامنے کے تصادم میں الجھ
گئے تھے، یہ حکم دیا کہ وہ پیچھے ہٹنے کی کوشش کریں۔

اس کوشش میں ان کا نقصان ہوا لیکن جو عسکری نکل سکے، وہ نکل آئے۔

سورج غروب ہونے میں تھوڑی سی دیر باقی تھی۔ محمود غزنوی نے پہلے تو سوچا تھا کہ
وہ جنگ کو طول دے گا لیکن اس نے دیکھا کہ اسماعیل کی فوج اس کی مرضی کے
مطابق بکھر رہی ہے تو اس نے شام سے پہلے پہلے معرکے کا فیصلہ کر دینے کا تہیّہ
کر لیا۔ اسے دشمن فوج کے قلب میں اسماعیل کا پرچم دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے
تیر اندازوں کو میدان جنگ کے ارد گرد کی چٹانوں پر بھیج دیا اور اپنے محفوظہ کو حملے
کی تیاری کا حکم دیا۔ جنگی امور کو سمجھنے والوں کی نظر میں یہ خودکشی کا اقدام تھا۔

محمود غزنوی نے اپنی جان اور فوج کا باقی حصہ داؤ پر لگا دیا۔ یہ تازہ دم محفوظہ
تھا۔ محمود نے دشمن کے قلب پر برق رفتار حملے کا حکم دیا اور اس حملے کی قیادت
خود کی۔ ان دستوں میں زیادہ تر سوار تھے۔ محمود نے اپنے تیر انداز دستوں کو ہدایت
دی تھی کہ دشمن اگر بکھر کر چٹانوں کے قریب جائے تو وہ تیر برسائیں۔ محمود غزنوی کے
اس حملے کی ترتیب تیر جیسی ہی تھی۔ اسماعیل کے قلب کے دستے دن بھر کی لڑائی کے
تھکے ہوئے تھے۔ محمود کا محفوظہ تازہ دم تھا۔ محمود کے کہنے پر محفوظہ یہ نعرہ لگاتا جا رہا تھا
۔ "بت پرستوں کے دوستوں کو کچل دو"۔

کچھ تو محمود کا حملہ بڑا اور غیر متوقع تھا۔ اور کچھ اس نعرے کا اثر تھا کہ اسماعیل
کی صفوں میں بددلی پیدا ہونے لگی۔ محمود کے کمانداروں نے ایک اور نعرہ لگانا شروع
کر دیا ___ "اللہ کے سپاہی تنخواہ کے لیے نہیں لڑا کرتے۔"

اسماعیل کے سالاروں نے قلب کو بچانے کے لیے پہلوؤں سے کمک لینے کی
کوشش کی تاکہ محمود کے محفوظہ کو گھیرے میں لیا جا سکے مگر محمود کے پہلوؤں والے دستوں
نے "ضرب لگاؤ اور بھاگو" کے انداز کے چھاپہ مار حملوں سے دشمن کے پہلوؤں کو ایسا
الجھایا کہ وہاں سے کمک نہ جا سکی۔ محمود غزنوی کا قہر ایک تاریخی حقیقت ہے۔ متعدد
مورخوں نے لکھا ہے کہ وہ جب دشمن پر سامنے سے حملہ کیا کرتا تھا تو اس میں اتنا
قہر ہوتا تھا جو دشمن پر دہشت طاری کر دیا کرتا تھا۔ اسماعیل کے قلب پر حملے میں
محمود کا قہر اس کے اپنے قابو میں بھی نہیں آ رہا تھا۔

معرکہ یہ بھی شدید اور خونریز تھا۔ محمود کی نظر اسماعیل کے جھنڈے پر تھی۔ یہ
جھنڈا غائب ہو گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اسماعیل زخمی ہو گیا یا مارا گیا ہے۔ جھنڈا
فوجوں کے جذبے کو قائم رکھا کرتا تھا۔ جھنڈا غائب ہو گیا تو اسماعیل کی فوج کے پاؤں
اکھڑنے لگے۔ محمود کے کہنے پر اس کے سپاہی اعلان کرنے لگے ___ "بت پرستوں کے
بھائیو! تمہارا پرچم گر پڑا ہے۔"

ابھی سورج غروب نہیں ہوا تھا کہ معرکے کا پانسہ پلٹ گیا۔ اسماعیل کی فوج کی
مرکزیت ختم ہو چکی تھی۔ دستوں کو جس طرح تقسیم کیا گیا تھا، وہ ترتیب گڈمڈ ہو گئی۔

ان میں سے سپاہی اور کمانڈر چٹانوں کے درمیان پناہ ڈھونڈنے لگے۔ چٹانوں کے اوپر محمود غزنوی نے اپنے تیرانداز پھیلا رکھے تھے۔ ان کے تیروں نے دشمن کے لیے کوئی پناہ نہ چھوڑی۔ سب سے پہلے قلب کے ایک سالار نے ہتھیار ڈال دیے۔ محمود غزنوی نے کئی ایک گھوڑ سواروں کو حکم دیا کہ وہ تمام میدانِ جنگ میں گھوم جائیں اور اعلان کریں کہ سلطان محمود نے حکم دیا ہے کہ اسماعیل کے کسی بھی فوجی کو ہلاک نہ کیا جائے۔ جو کوئی ہتھیار ڈالنے سے انکار کرے اُسے زندہ پکڑا جائے۔ اگر وہ مزاحمت کرے تو اُسے زخمی کر کے پکڑا جائے۔ اس اعلان سے اسماعیل کے سپاہیوں کے حوصلے بالکل ہی ٹوٹ گئے۔

قلب کے جس سالار نے سب سے پہلے ہتھیار ڈالے تھے، اُس سے محمود غزنوی نے اسماعیل کے متعلق پوچھا۔

"وہ مرا بھی نہیں زخمی بھی نہیں ہوا" — سالار نے جواب دیا — "وہ حملے کی شدت سے ایسا گھبرایا کہ کوئی حکم یا اطلاع دیے بغیر بھاگ گیا" — اُس نے وہ سمت بتائی جس طرف وہ گیا تھا۔

محمود غزنوی نے ایک جیش تیار کر کے حکم دیا کہ اسماعیل کو تلاش کریں اور اُس کے ہاتھ باندھ کر اخلاقی مجرموں کی طرح پیش کریں۔

سورج غروب ہونے تک خانہ جنگی کا یہ انتہائی خونریز معرکہ ختم ہو چکا تھا۔ اسماعیل کے عسکری ٹولیوں میں بیٹھ گئے تھے۔ محمود کے سپاہی ان پر پہرہ دے رہے تھے۔ بڑی ہی بھیانک آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ زخمی کراہ رہے تھے۔ بعض چیخ رہے تھے۔ زخمی ہاتھی چنگھاڑ رہے تھے۔ زخمی گھوڑوں کی آوازیں بڑی ڈراؤنی تھیں۔ رات گہری ہوتی جا رہی تھی۔ معرکے کے بعد کی آوازیں اور زیادہ بلند اور ڈراؤنی ہوتی جا رہی تھیں۔ محمود غزنوی پہلے ہی حکم دے چکا تھا کہ دونوں طرفوں کے زخمیوں کو اٹھا کر ان کی مرہم پٹی کی جائے۔

زخمی اٹھائے جا رہے تھے۔ سینکڑوں مشعلوں کے شعلے گھوم پھر رہے تھے اور

محمود غزنوی گھوڑے سے اُتر کر لاشوں کے درمیان ٹہل رہا تھا۔ اُسے ایک نسوانی پکار سنائی دی — "محمود محمود" — وہ اس آواز کو پہچانتا تھا۔ وہ اس آواز کی طرف دوڑ پڑا۔ یہ اُس کی ماں کی آواز تھی۔ مشعلوں کے گھومتے پھرتے شعلوں میں اُسے اپنی ماں لاشوں سے پھلانگتی اپنی طرف آتی دکھائی دی۔ محمود نے اُس کے قریب جا کر اس کے پاؤں پکڑ لیے۔ ماں نے اُسے اُٹھا کر اس کا سر اور منہ چوما۔ دونوں پر اتنی رقت طاری تھی کہ وہ بول نہ سکے۔

محمود نے ماں کو رخصت کر دیا۔ محمود کا وہاں کوئی کام نہیں تھا لیکن وہ میدانِ جنگ سے جانا نہیں چاہتا تھا۔ اُس پر جذبات کا ایسا غلبہ تھا کہ وہ کسی لاش کے پاس رک جاتا۔ کوئی مشعل بردار قریب سے گزرتا تو محمود اُسے روک لیتا۔ مشعل کی روشنی میں لاش کے چہرے کو غور سے دیکھتا اور آگے چل پڑتا۔ وہ اسی طرح سر جھکائے چلا جا رہا تھا کہ اسے اپنی ماں کی طرح کی ایک اور نسوانی آواز سنائی دی — "محمود" وہ رک گیا۔ دو مشعل برداروں کے درمیان ایک خاتون شاہی لباس میں ملبوس آہستہ آہستہ اُس کی طرف آ رہی تھی۔ وہ خوبصورت عورت تھی۔ شاہی خاندان کی عورت تھی۔ وہ اُس کے باپ کی بیوی تھی مگر اُسے دیکھ کر محمود غزنوی کا خون کھول اٹھا کیونکہ وہ اسماعیل کی ماں تھی۔ محمود اُس کی طرف بڑھنے کی بجائے رک گیا۔ اسماعیل کی ماں اُس کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔

"یہ دیکھنے آئی ہو کہ تمہارے بیٹے نے غزنی کی فوج کے کتنے ہزار آدمیوں کو ایک دوسرے کے ہاتھوں قتل کرایا ہے؟" — محمود نے پوچھا — "کیا یہ سننے آئی ہو کہ آپس میں لڑ کر مرنے والے سپاہیوں کے کراہنے کی آوازیں کیسی لگتی ہیں؟"

"میں کچھ بھی دیکھنے نہیں آئی" — اسماعیل کی ماں نے روتے ہوئے کہا — "میں کچھ سننے نہیں آئی۔ میں اپنے بیٹے کی جاں بخشی کی التجا لے کر آئی ہوں۔"

"کہاں ہے تمہارا بیٹا؟" — محمود نے کہا — "میں نے اُسے دیکھا ہی نہیں۔"

"وہ اپنے خیمے میں ہے" — ماں نے جواب دیا — "بھاگ نکلنے کے رستے بند

ہو چکے ہیں۔ وہ اکیلا ہے۔ سب اُس کا ساتھ چھوڑ گئے ہیں۔"

"کیا وہ بھی اُس کا ساتھ چھوڑ گئے ہیں جنہیں خوشامد کی بدولت تمہارے بیٹے نے کماندار سے سالار بنایا تھا؟" ــــ محمود نے پوچھا ــــ "وہ فقیر بھی اُسے تنہا چھوڑ گئے ہیں جنہیں تمہارے بیٹے نے امیر اور وزیر بنایا تھا؟ ... ظلِ الٰہی اور سلطان عالی مقام کہلانا آسان ہے لیکن ظلِ الٰہی اور سلطان عالی مقام بن کر دکھانا بڑا ہی مشکل ہے۔"

"محمود!" ــــ اسماعیل کی ماں نے التجا کے لہجے میں کہا ــــ "تمہیں حق پہنچتا ہے کہ جو اُلٹی سیدھی زبان پر آئے کہہ دو۔ میں اپنے بیٹے کی زندگی کی بھیک مانگنے آئی ہوں۔"

"اگر تم میری جگہ ہوتیں تو کیا اپنے اسماعیل کو اتنے انسانوں کا خون بخش دیتیں؟" ــــ محمود نے کہا ــــ "اپنے پاپوش دیکھو اور اپنے آپ سے پوچھو کہ جن کے خون سے تمہارے پاؤں لتھڑ گئے ہیں اور جن کے خون کے چھینٹے تمہارے ٹخنوں کے اوپر تک جا پڑے ہیں، وہ کون تھے؟ تم ایک سلطان کی بیوہ ہو، سلطان کی بیوی ہو یا بیوہ، قوم کا ہر فرد اور سپاہی اُس کا اپنا بچہ ہوتا ہے۔ کیا یہ تمہارے بیٹے نہیں تھے جن کے خون سے چھلکتی اور جن کی لاشوں سے ٹھوکریں کھاتی تم مجھ سے اپنے بیٹے کی زندگی کی بھیک مانگنے آئی ہو؟ قوم اور فوج کے خون کے ساتھ کھیلنے والے حکمران اسی انجام کو پہنچتے ہیں جس تک تمہارا بیٹا پہنچ چکا ہے۔ کل کا سلطان آج کا مفرور مجرم ہے۔"

"محمود! میں تمہاری ماں تو نہیں، تمہارے مرحوم باپ کی بیوہ ہوں" ــــ اسماعیل کی ماں نے کہا ــــ "اپنے باپ کی روح کی خاطر مجھے میرا بچہ دے دو۔ میں اس سلطنت سے نکل جاؤں گی۔ تمہارے باپ کو میرے ساتھ اتنی ہی محبت تھی جتنی تمہاری ماں سے تھی۔"

"اور تم نے اس محبت سے یہ فائدہ اُٹھایا کہ اپنے خاوند کو اُس کے نزع کے عالم میں دھوکہ دیا اور اپنے اُس بیٹے کو سلطنت کا بادشاہ بنوالیا جس نے سلطنت کو ڈبونے کا اہتمام کر دیا۔ تم اُس قوم کی ماں ہو جس کی مائیں میری ماں کی طرح اپنے بیٹوں کو جوان کر کے محاذ کو رخصت کیا کرتی تھیں۔ تم نے اپنے بیٹے کو تخت پر بٹھا

کر اُس کے سر پہ تاج رکھا، تم نے اُسے مجرم بنایا۔"

محمود غزنوی نے اپنے پاس کھڑے دو عہدیداروں سے کہا ــــ "اس خاتون کے ساتھ جاؤ اور اس کے بیٹے کو میرے سامنے لے آؤ۔"

اُس وقت اسماعیل اپنے خیمے میں سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اُس نے جب خیمے میں دو عہدیداروں کو داخل ہوتے دیکھا تو وہ اٹھا اور سرتاپا کانپنے لگا۔ اُس نے ان عہدیداروں سے کہا کہ وہ اُسے فرار کرا دیں تو وہ انہیں منہ مانگا انعام دے گا۔ عہدیداروں نے کوئی جواب دیئے بغیر اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ اسے پکڑ کر سلطان کے پاس لے چلو۔ وہ خود ہی ان کے ساتھ چل پڑا۔ اُس کی ماں اس کے پیچھے پیچھے آئی۔

اُسے جب محمود غزنوی کے سامنے کھڑا کیا گیا تو محمود نے اُسے سر سے پاؤں تک دیکھا اور کہا ــــ "تمہاری ماں نے مجھ سے تمہاری زندگی کی بھیک مانگی ہے۔ میں ایک ماں کی استدعا قبول کرتا ہوں۔ تمہیں زندہ رہنے دوں گا۔"

مشہور مؤرخ محمد قاسم فرشتہ لکھتا ہے ــــ "محمود غزنوی نے اسماعیل سے پوچھا ــــ اگر فتح تمہاری ہوتی اور میں تمہارا قیدی ہوتا تو تم میرے ساتھ کیا سلوک کرتے؟ ــــ اسماعیل نے جواب دیا ــــ میں تمہیں عمر بھر کے لیے قید میں ڈال دیتا اور آزادی کے سوا تمہیں زندگی کی ہر آسائش دیتا ــــ محمود غزنوی نے کہا ــــ اور میں تمہارے ساتھ اس سے بُرا سلوک نہیں کروں گا۔ تم ساری عمر کے لیے جرجان کے قلعے میں قید رہو گے جہاں آزادی کے سوا تمہیں زندگی کی ہر آسائش اور سہولت مہیا کی جائے گی۔ اپنی ماں کو اپنے ساتھ لے جا سکتے ہو ــــ اسماعیل نے باقی عمر اپنی ماں کے ساتھ اس قلعے میں گزاری۔"

ایک بہت بڑا خطرہ ٹل گیا۔

اُس وقت جب سلطنتِ غزنی میں ایک اور خانہ جنگی لڑی جا چکی تھی، اور غزنی کی بہترین فوج کی خاصی نفری تباہ و برباد ہو گئی تھی، لاہور میں راجہ جے پال کو یہ اطلاع پہنچ کر سلطان سبکتگین مر گیا ہے۔ اُس نے اپنے جرنیلوں کو بلایا اور انہیں خوشی سے

یہ خبر سنائی کہ اب وہ غزنی کو آسانی سے فتح کر لیں گے کیونکہ سبکتگین مر گیا ہے۔

"کیا ہماری فوج حملے کے لیے تیار ہے؟" — راجہ جے پال نے پوچھا۔

"پہلے دو تجربوں کو سامنے رکھ کر ہمیں جلد بازی نہیں کرنی چاہیئے" — ایک جرنیل نے جواب دیا — "ایک آدمی کے مر جانے سے پوری قوم نہیں مر جایا کرتی....

غزنی کی فوج میں جو جذبہ ہے، وہ اُن کے ایک سلطان کے مر جانے سے نہیں مرے گا۔ ہماری فوج پیشقدمی کے لیے تو تیار ہے لیکن اس میں ابھی لڑنے کا وہ جذبہ پیدا نہیں ہُوا جو مسلمانوں میں ہے۔ ہم وہ جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مندروں میں پنڈت بھی لوگوں کو یہی بتاتے رہتے ہیں کہ مسلمانوں کے خلاف جنگ مذہبی جنگ ہے۔"

"سبکتگین کا بیٹا محمود جوان ہو گیا ہے" — دوسرے جرنیل نے کہا — "میں یہ تو نہیں بتا سکتا کہ وہ پوری فوج کی کمان کے قابل ہے یا نہیں۔ میں نے اس کے دو حملے دیکھے ہیں۔ مجھے اس میں قابلیت اور جرأت نظر آتی ہے۔ ہمیں یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ وہ کس حد تک قابل ہے۔"

"یہ میں تمہیں معلوم کروا دوں گا" — راجہ جے پال نے کہا — "تمہیں معلوم ہے کہ میرے پاس غزنی کی فوج کے اونچے درجے کے دو قیدی ہیں۔ میں ان سے معلوم کر لوں گا۔ آپ لوگ فوج کی تربیت اور تیاری تیز کر دیں۔ میرا ارادہ بہت جلدی غزنی کی طرف کوچ کر دوں گا۔ سبکتگین کا کوئی بھی بیٹا اُس جتنا قابل جرنیل نہیں ہو سکتا۔ مجھے امید ہے کہ اب ہم دو شکستوں کا انتقام لے کر سبکتگین کی سلطنت پر قبضہ کر لیں گے۔ میں ایک لڑکی کی جان کی قربانی بھی دے رہا ہوں۔ پنڈتوں نے لڑکی حاصل کر لی ہے۔ اسے خاص عمل کے بعد قربان کیا جائے گا۔"

راجہ جے پال نے غزنی کے جن دو قیدیوں کا ذکر کیا تھا وہ نظام اور بیری اور کاملی تھے۔ آپ نے اس داستان کی پچھلی قسط میں پڑھا ہے کہ راجہ جے پال ان سے پوچھ رہا تھا کہ غزنی کی فوج کی کامیابی کا راز کیا ہے۔ ان دونوں نے اسے تاثر دے رکھا تھا کہ یہ ایک گہرا راز ہے جو وہ نہیں بتائیں گے۔ راجہ جے پال نے انہیں راج محل

کے ساتھ ایک کمرہ دے رکھا تھا جہاں ایک مسلمان ملازم انہیں کھلاتا پلاتا تھا۔ یہ مسلمان غزنی کا جاسوس تھا۔ وہ خوبرو اور ذہنی اور جسمانی لحاظ سے طرار تھا۔ اس کمرے کے ارد گرد پہرہ تھا۔ راجہ جے پال کو دوسری شکست نے دیوانہ بنا رکھا تھا۔ وہ غزنی پر ایک اور حملے کے لیے فوج کی نئی بھرتی اور تیاری میں اتنا مصروف تھا کہ غزنی کے ان دو قیدیوں کی طرف توجہ نہ دے سکا۔

یہ مسلمان ملازم جس کا نام بلاذری تھا انہیں کہہ رہا تھا کہ وہ راجہ کو کوئی جھوٹ موٹ کا راز بتا دیں ورنہ وہ انہیں قید خانے میں ڈال کر زندگی بھر اذیتیں دے گا۔ بلاذری کا مقصد یہ تھا کہ یہ دونوں راجہ پر اپنا اعتماد پیدا کر لیں تو ان کے فرار کی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ راجہ کو اعتماد میں لینے سے یہ فائدہ بھی اٹھایا جا سکتا تھا کہ اس سے یہ معلوم کر لیا جاتا کہ وہ کب تک غزنی پر حملہ کر رہا ہے اور اب کس طرف سے حملہ کرے گا۔ پشاور کے علاوہ کوئی اور راستہ بھی ہو سکتا تھا۔

"اب راجہ تمہیں بلائے تو اسے دھوکہ دو" — عمران بلاذری نے ایک روز انہیں کہا — "میں نے تمہیں چھپانے کا انتظام کر لیا ہے۔ تمہیں یہاں سے جلدی نکالنا ہو گا۔ ہو سکتا ہے میں یہاں سے غائب ہو جاؤں۔"

"تم کہاں جاؤ گے؟"

"ایک فرض تو سلطنت کی طرف سے مجھ پر عائد ہے جو مجھے پورا کرنا ہے اور کرتا رہتا ہوں" — بلاذری نے کہا — "مگر میں انسان بھی ہوں۔ میرے جذبات بھی ہیں۔ مجھ پر ایک اور فرض آپڑا ہے۔ میں تم دونوں سے کچھ چھپاؤں گا نہیں۔ ہمیں ایک مظلوم کی مدد کرنی ہے۔ پنڈتوں نے راجہ جے پال کو بتایا تھا کہ وہ ایک کنواری لڑکی کی قربانی دے تو اسے فتح ہو گی۔ یہ قوم وحشی ہے اور بربریت پسند۔ کسی عورت کا خاوند مر جائے تو اس کی بیوہ کو اس کی لاش کے ساتھ زندہ جلا دیتے ہیں۔ یہ لوگ انسانی قربانی سے بھی گریز نہیں کرتے۔ پنڈت کو کسی خاص شکل، رنگ اور عمر کی بڑی خوبصورت کنواری لڑکی مل گئی ہے۔ اسے وہ کسی مندر میں لے گئے ہیں۔ اسے قربانی کے لیے تیار کیا جائے گا۔ مجھے اس لڑکی کو بچانا ہے۔"

"اس سے ہمیں کیا فائدہ پہنچے گا؟" — نظام اودیزی نے پوچھا — "یہ کافر اپنی تمام لڑکیوں کو اپنے بتوں کے آگے قربان کر دیں۔ ہمیں اس سے کیا؟"

"یہ لڑکی مجھے اس قدر چاہتی ہے کہ میرے ساتھ چلنے کو تیار تھی" — عمران بلاذری نے کہا — "وہ اسلام قبول کرنے کا بھی فیصلہ کر چکی تھی۔ میں اسے کبھی کا لے جاتا لیکن جاسوس کی حیثیت سے میرا فرض مجھے یہاں سے نکلنے نہیں دے رہا تھا۔ میں یہاں سے کوئی کام کی اطلاع یا راجہ جے پال کے آئندہ عزائم کی صحیح خبر لے کر غزنی کو روانہ ہونا چاہتا تھا۔ لڑکی جب مجھے ملتی، یہی کہتی کہ میں اسے غزنی لے چلوں۔ اتنے میں تم دونوں آگئے۔ یہ بھی میرے فرائض میں شامل ہے کہ تمہیں یہاں سے فرار کراؤں۔ میں لڑکی کو ساتھ لے کر تمہارے ساتھ نکل جانے کا ارادہ کیے ہوئے تھا۔ ایک روز لڑکی مندر میں گئی اور واپس نہ آئی۔ مجھے پتہ چل گیا کہ پنڈتوں نے اسے قربانی کے لیے منتخب کر لیا ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ قربانی دینے میں ابھی بہت دن ہیں۔ مجھے جرم کہو لو جو جی میں آئے کہ لو لیکن میں ڈرتا ہوں کہ محبت فرض پر غالب آجائے گی۔ تم راجہ کو اعتماد میں لو اور یہاں سے نکلو۔ میں تمہیں کچھ دن چھپائے رکھوں گا۔ پھر لاہور سے نکال بھی دوں گا۔"

"تم ہم سے جلدی فارغ ہونا چاہتے ہو" — قاسم بلخی نے کہا۔

"ہاں" — بلاذری نے جواب دیا — "بہت جلدی۔ مجھے راتوں کو نیند نہیں آتی۔"

اس سے ایک دو روز بعد انہیں راجہ جے پال نے بلا لیا۔

"کیا تم میرے سوال کا جواب دینے کے لیے تیار ہو؟" — راجہ نے کہا — "مجھے امید ہے کہ تم اپنے آپ پر رحم کرو گے۔"

"ہاں مہاراج!" — نظام اودیزی نے کہا — "آپ نے ہمارے ساتھ جو اچھا سلوک کیا ہے اس کے عوض ہم آپ کو ہر سوال کا جواب دیں گے۔"

"تمہارا سلطان سبکتگین مر گیا ہے" — راجہ جے پال نے انہیں خبر سنائی۔

دونوں پر چونک اُٹھے لیکن سنبھل گئے۔

"اب غزنی کی سلطنت کو بچانے والا کوئی نہیں رہا" — راجہ نے کہا — "تم اب میرا ساتھ دو۔ میں تمہیں اپنی فوج میں عہدہ بھی دے سکتا ہوں.... مجھے یہ بتاؤ کہ اُس کا بیٹا محمود اپنے باپ کی جگہ فوج کی کمان کر سکتا ہے! اُس میں جنگی قابلیت کتنی کچھ ہے؟"

"اتنی نہیں جتنی سلطان سبکتگین میں تھی" — اودیزی نے جواب دیا — "میدانِ جنگ میں وہ اپنی مخصوص چالیں چلتا ہے۔ اگر آپ کو یہ چالیں بتا دی جائیں تو آپ اسے آسانی سے شکست دے سکتے ہیں۔ آپ کو دوسری شکست محمود کی چالوں نے ہی دی ہے۔"

ان دونوں نے راجہ جے پال کو محمود کی چالیں بتانی شروع کر دیں۔ ان کا حقیقت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔ راجہ نے اپنے جرنیلوں کو بلایا۔ اودیزی اور بلخی انہیں چالیں سمجھانے لگے۔

"ہم آپ کو عملی طور پر بھی یہ چالیں سمجھائیں گے" — قاسم بلخی نے کہا — "لیکن ہم قیدی بن کر آپ کو ان چالوں کی عملی شکل نہیں بتائیں گے۔"

راجہ جے پال نے اُسی وقت حکم دے دیا کہ ان کے کمرے سے پہرہ ہٹا دیا جائے۔ پہرہ ہٹا دیا گیا۔ رات آئی اور گزر گئی۔ اگلے روز عمران بلاذری ان کے لیے کھانا لے کر کمرے میں بیٹھ گیا۔ بہت دیر گزر گئی۔ راج محل سے اودیزی اور بلخی کا بلاوا آیا۔ بلاذری نے قاصد کو بتایا کہ وہ صبح سے کھانا لے کے بیٹھا ہے، وہ دونوں کمرے میں نہیں تھے۔ وہ رات کو ہی نکل گئے تھے، اور بلاذری انہیں ایک گھر میں چھپا آیا تھا۔

مذہب، مجرم اور مجاہد

عمران بلاذری پر کسی نے شک نہ کیا کہ غزنی کے دونوں قیدیوں — نظام اودیزی اور قاسم لمغی — کو اُس نے راج محل سے فرار کرایا ہے۔ اُس نے یہ فرض تو ادا کر دیا تھا مگر اُسے ابھی ایک اور فرار کرانا تھا۔ یہ وہ ہندو لڑکی تھی جو اُس کی محبت کی خاطر اپنا مذہب، اپنا گھر اور اپنا ملک چھوڑنے کو تیار تھی مگر اسے پنڈت، انسانی قربانی کے لیے لے گئے تھے۔

بلاذری خوش وضع، خوش لباس اور خوش گفتار جوان تھا۔ ہر ڈھنگ کھیلنا اور ہر بھیس بدلنا جانتا تھا۔ اُس کی زبان میں جادو کا اثر تھا۔ وہ اُن مردوں میں سے تھا جن کے خدوخال میں، اُن کے ڈیل ڈول اور سراپا میں ایسی کشش ہوتی ہے جو جنس مخالف کو کچھ دیر رک کر دیکھنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ عمران بلاذری شہزادہ نہیں تھا۔ راج محل کا ملازم تھا۔ ملازموں جیسے کپڑے پہنتا تھا۔ ملازموں کی طرح بولتا تھا، مگر غزنی کا جاسوس تھا۔ پنجاب کی اُس وقت کی زبان روانی سے بولتا تھا اور کسی کو کبھی شک نہیں ہوا تھا کہ یہ خوش طبع آدمی راجہ جے پال کی ریاست کے لیے بہت بڑا خطرہ ہے۔

وہ کچھ عرصے سے لاہور میں تھا۔ شہر میں ایک مکان میں اکیلا رہتا تھا۔ اس کے اڑوس پڑوس میں رہنے والے اس کے متعلق اتنا ہی جانتے تھے کہ راج محل کا ملازم ہے، ملتان کا رہنے والا ہے۔ اچھا آدمی ہے اور [illegible] دیر سے گھر آتا ہے۔ اس کی دوستی ایک ہندو جگ موہن کے ساتھ تھی جو اُس کا ہم عمر تھا۔ اُس کا باپ تاجر

تھا۔ جگ موہن اکثر رات کو عمران بلاذری کے گھر آیا کرتا تھا۔ اُن دنوں ہندو اور مسلمان کی دوستی کم ہی دیکھنے میں آیا کرتی تھی۔ مسلمان اقلیت میں تھے اور ہندو ان سے نفرت کرتے تھے۔ راجوں مہاراجوں اور پنڈتوں نے مسلمانوں کے خلاف نفرت پیدا کر رکھی تھی، مگر جگ موہن جو ذات کا برہمن تھا، عمران بلاذری سے پہلی ہی ملاقات میں اتنا متاثر ہوا تھا کہ اسے پیار ملا اور ان کی دوستی ہو گئی۔

دوستی کے ابتدائی دنوں کا واقعہ ہے کہ ایک رات جگموہن بلاذری سے ملنے اُس کے گھر آیا تو جگ موہن رو رہا تھا۔

”آج میری بہن زندہ جلا دی گئی ہے“ — جگ موہن نے بلاذری کو بتایا۔

”کس نے جلائی ہے؟“ — عمران بلاذری نے پوچھا۔

”میرے مذہب نے“ — جگ موہن نے بتایا — ”اُس کی شادی ہوئے ابھی ایک سال بھی پورا نہیں ہوا تھا کہ اُس کا خاوند گھوڑے سے گر کر زخمی ہو گیا۔ آج صبح وہ مر گیا ہے۔ اُس کی بیوی کو بھی اُس کے ساتھ ہی مرنا تھا۔ آج میرے بہنوئی کی لاش چتا پر رکھی گئی تو اُس کے بھائیوں نے میری بہن کو بھی چتا پر کھڑا کر دیا اور چتا کو آگ لگا دی۔ تم نے چتا نہیں دیکھی ہو گی۔ لکڑیوں کا بہت بڑا ڈھیر لگایا جاتا ہے جو چوکور اور اوپر سے ہموار ہوتا ہے۔ اس کی لمبائی انسان کے قد سے کچھ زیادہ ہوتی ہے اور اونچائی کم و بیش ایک گز۔ اس پر لاش رکھ دیتے ہیں۔ لکڑیوں پر تیل یا گھی ڈالتے اور آگ لگا دیتے ہیں۔ میں تو لاش کو بھی جلتے نہیں دیکھ سکتا مگر میں نے اپنی بہن کو اپنے خاوند کی لاش کے ساتھ زندہ جلتے دیکھا ہے....

”کہتے ہیں کہ ہندو عورت اتنی غیرت والی ہوتی ہے کہ اُس کا خاوند مر جائے تو اُس کے ساتھ زندہ جل جاتی ہے۔ اسے ستی ہونا کہتے ہیں۔ جو عورت ستی نہیں ہوتی وہ ساری عمر شادی نہیں کر سکتی۔ وہ خطرہ محسوس کرتی رہتی ہے کہ انسانی کمزوری اسے گناہگار بنا دے گی، اس لیے خاوند کے ساتھ ہی مر جانا بہتر ہے.... میں ستی کو اچھا سمجھتا تھا مگر جب اپنی بہن کو زندہ جلتے دیکھا تو مجھے معلوم ہوا کہ ہمارا مذہب کس قدر بے رحم

...ہے۔ کوئی عورت زندہ نہیں جلنا چاہتی۔ میری بہن کو گھسیٹ کر چتا تک لے گئے اور اُسے اٹھا کر چتا پر کھڑا کر دیا گیا۔ اس کے پاؤں رسیوں سے باندھ دیئے گئے تھے۔ وہ مجھ سے بہت زیادہ محبت کرتی تھی۔ میں اسے بچا نہ سکا۔ وہاں کم و بیش ڈیڑھ سو آدمی تھے۔ کوئی بھی اسے بچانے کے لیے آگے نہ بڑھا۔ سب مذہب کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ میں نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ مجھے لکڑیوں کے جلنے کی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی مجھے اپنی بہن کی چیخیں سنائی دیں....

"میں نے گھوم کر دیکھا۔ شعلے بہت اُٹھ چکے تھے۔ ان میں مجھے اپنی بہن نظر آئی۔ وہ چیخ رہی تھی، پھر جلتی لکڑیوں کی تڑاخ تڑاخ نے اس کی چیخیں ختم کر ڈالیں۔ مجھے غشی آنے لگی۔ میں وہاں سے چلا آیا۔ میں ابھی تک بہن کی چیخیں سن رہا ہوں۔ مجھے اپنے مذہب سے نفرت ہو گئی ہے۔"

"وہ مذہب ہی کیا جس سے انسانوں کو نفرت ہو جائے" — عمران بلاذری نے کہا۔ "وہ مذہب ہی کیا جو انسان کو جینے کے حق سے محروم کر دے۔ کوئی مذہب بربریت کی اجازت نہیں دیتا۔ میں تمہیں اپنے مذہب میں لانے کی کوشش نہیں کر رہا۔ صرف بتا رہا ہوں کہ میرا مذہب عورت کے لیے بہت نرم ہے۔ اگر کسی عورت کا خاوند مر جائے تو اُسے اجازت ہوتی ہے کہ تین ماہ بعد شادی کر لے۔ اگر وہ جوان ہو تو کوشش کی جاتی ہے کہ اُس کی دوسری شادی ہو جائے۔ اسلام عورت کو ذرا سی بھی جسمانی ایذا دینے کی اجازت نہیں دیتا۔"

"ہمارے پنڈت دودھ پیتے بچوں کی قربانی بھی دیا کرتے ہیں" — جگ موہن نے کہا — "ایسا اکثر ہوتا ہے کہ خشک سالی ہو، قحط کا خطرہ ہو، سیلاب کا ڈر ہو تو کسی کا معصوم بچہ پکڑ کر اسے ذبح کر دیا جاتا ہے۔ پھر اس کی لاش جلا دی جاتی ہے۔ اب ہمارا راجہ غزنی سے شکست کھا کر آیا ہے تو پنڈتوں نے اسے کہا ہے کہ وہ ایک کنواری لڑکی کی قربانی دے تو اس کی شکست فتح میں بدل جائے گی۔"

"یہ قربانی کب دی جا رہی ہے؟"

"پنڈت خاص قسم کی لڑکی کی تلاش میں ہیں" — جگ موہن نے جواب دیا — "انہوں نے اعلان کر رکھا ہے کہ لوگ مندروں میں اپنی کنواری بیٹیوں کو بھیجا کریں۔ لڑکیاں مندروں میں جاتی ہیں۔ ابھی پنڈتوں کو خاص قسم کی لڑکی نظر نہیں آئی۔"

"تمہاری کوئی بہن کنواری تو نہیں؟"

"میری چھوٹی بہن کنواری ہے" — جگ موہن نے کہا — "لیکن میں اسے مندر میں نہیں جانے دیتا۔ میرے باپ نے بھی اسے کہا ہے کہ وہ مندر میں نہ جایا کرے... میری بہن بہت خوبصورت ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ پنڈتوں کے سامنے گئی تو وہ اسے قربانی کے لیے منتخب کر لیں گے۔"

عمران بلاذری کو موقعہ مل گیا۔ اس نے جگ موہن کو اسلام کے بنیادی اصول بتائے اور کہا — "ہمارا مذہب بنی نوع انسان کی بہبود اور حقوق دینے کے لیے آیا تھا۔"

جگ موہن کا دل زخمی تھا۔ عمران بلاذری کی باتوں سے اُسے تسکین ہونے لگی۔

"تم نے اچھا کیا ہے کہ اپنی چھوٹی بہن کو پنڈتوں سے چھپا رکھا ہے" — بلاذری نے کہا — "راجہ جے پال نے شکست کھائی ہے تو یہ اس کی غلطی ہے۔ وہ اپنے آپ کو فریب دے رہا ہے اور اپنی قوم کو بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اسے تمہارے پنڈت فریب دے رہے ہیں۔ ہر کوئی بادشاہ یا مہاراجہ کی خوشنودی چاہتا ہے۔ ہر ایک کا اپنا اپنا طریقہ ہوتا ہے۔ یہ مسلمانوں میں بھی ہوتا ہے، عیسائیوں میں بھی۔ پنڈت ہو یا مولوی، اس کے پاس مذہب کی پیشوائی ہوتی ہے، اس لیے وہ مذہب کو موڑ توڑ کر اپنے بادشاہ کو خوش کر لیتا ہے۔ تمہارے پنڈتوں نے بھی یہی کیا ہے۔ راجہ جے پال کو یہ کہنے کی بجائے کہ اپنی غلطیوں اور سلطان سبکتگین کی کامیابیوں کو پرکھے اور اپنی فوج میں رد و بدل کرے، پنڈتوں نے اسے یہ کہ کر اس کا دل بہلا دیا کہ دیوتا ناراض ہیں اور وہ ایک کنواری کی قربانی مانگتے ہیں....

"تم جسے اپنے مذہب کی خرابی کہتے ہو، یہ دراصل تمہارے مذہبی پیشواؤں

کی خرابی ہے۔ انسانوں کی پیدا کردہ خرابیاں ہمارے مذہب میں بھی ہیں۔ ہمارے مولوی اور امام بھی بادشاہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ایسی ایسی توجیہیں پیدا کر لیتے ہیں جنہیں انسانی ذہن قبول نہیں کرتا لیکن اس پر وہ مذہب کی چھاپ لگا کر لوگوں کا منہ بند کر دیتے ہیں۔ اگر بادشاہ اپنے تخت و تاج کی مضبوطی کے لیے مذہب کو استعمال کرے اور مذہب کی آڑ میں بیٹھ جائے تو مذہبی پیشوا اسے مذہب کے ہی اصولوں اور فلسفوں کو توڑ موڑ کر اسے آڑ مہیا کر دیتے ہیں۔ اگر یہی بادشاہ مذہب سے نگاہیں پھیر کر رعایا پر ظلم و تشدد شروع کر دے تو یہی مذہبی پیشوا اس کی دھاندلیوں اور جھوٹ کو مذہبی جواز مہیا کر دیں گے۔ مذہب ہر کسی کے لیے قابل قبول ہوتا ہے، مذہب کو اس کے پیشوا قابل نفرت بنایا کرتے ہیں۔"

"کیا تمہارے مذہب میں انسانوں کی قربانی دی جاتی ہے؟" — جگ موہن نے پوچھا۔

"نہیں" — عمران بلاذری نے جواب دیا — "ہمارا مذہب اسے قتل کہتا ہے۔ اگر ہمارا کوئی مذہبی پیشوا کسی کو انسانی قربانی کے لیے تیار کرے گا تو وہ قاتل کہلائے گا اور سزائے موت پائے گا۔ مسلمان میدانِ جنگ میں اپنی جانیں دیا کرتے ہیں، اور یہی سلطان سبکتگین کی کامیابی کا راز ہے ... میں تمہارے مذہب کی توہین نہیں کرنا چاہتا، حقیقت بیان کرتا ہوں۔ ہم صرف ایک خدا کی عبادت کرتے ہیں۔ ہمارے کئی ایک خدا نہیں، اور ہمارے خدا پتھر اور مٹی کے بھی نہیں۔ اپنی عقل استعمال کرو۔ یہ بت ایک جگہ دھرے رہتے ہیں۔ تم انہیں صرف مندروں میں دیکھ سکتے ہو۔ یہ اپنے اوپر بیٹھی مکھی کو بھی نہیں اڑا سکتے۔ ان میں جان نہیں، روح نہیں۔ ہمت کرو اور ایک بت کو توڑ دو، پھر دیکھنا کہ یہ خدا اپنے ٹکڑے جوڑ سکتا ہے یا نہیں اور یہ تمہارا کیا بگاڑ لے گا۔ ہمارا خدا صرف مسجد میں نہیں رہتا، ہر جگہ موجود ہوتا ہے اور ہمارے دلوں میں بھی رہتا ہے۔ وہ کسی انسان کا خون نہیں مانگتا، نہ کسی کنواری کو اپنے سامنے ذبح کرا کر خوش ہوتا ہے۔"

عمران بلاذری کی زبان کا جادو اس جوان سال ہندو کو مسحور کر رہا تھا۔ اس تاثر کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ بلاذری کی زبان میں سحر تھا اور دوسری وجہ یہ کہ جگ موہن نے اپنی بہن کو زندہ جلتے دیکھا تھا۔ یہ انسانی جذبات تھے جو پنڈتوں اور پتھر کے خداؤں پر غالب آ گئے تھے۔ عمران بلاذری نے اُسے اُس کے مذہب سے منحرف کر دیا تھا، یا انحراف اور نفرت کا بیج بو دیا تھا۔ جگ موہن کے آنسو بہے جا رہے تھے، اور اس کے چہرے پر دہشت کا تاثر بھی تھا۔ اسے جیسے ابھی تک اپنی بہن جلتی نظر آ رہی تھی۔

"تمہارا غم ایسا ہے جو بانٹا نہیں جا سکتا" — عمران بلاذری نے کہا — "میں ہمدردی کے دو چار الفاظ کہہ سکتا ہوں۔ اگر میں تمہارے کسی کام آ سکتا ہوں تو مجھے بتانا۔"

غمزدہ حالت میں ہمدردی کے دو چار الفاظ بھی بہت بڑی مدد ہوتی ہے۔ جگ موہن عمران بلاذری کا مرید ہو گیا۔ اور اس کی باتوں کو دل میں بٹھانے لگا۔ ایک مقصد بلاذری کو کام سے چھپی تھی۔ وہ جگ موہن کو گوشت کا رسیا کیا برہمن [illegible] تھی۔ یہ بھی جگ موہن کے دل بہلاوے کا اہتمام تھا۔ وہ شہر سے دور جنگل میں نکل گئے۔ دونوں نے بہت سے پرندے شکار کیے۔

"عمران!" — جگ موہن نے ہنس کر کہا — "تم نے مجھ سے ان پرندوں کا ناحق خون کرایا ہے۔ تم جانتے ہو کہ میں برہمن ہوں۔ ہمیں گوشت کھانے کی اجازت نہیں۔"

"اگر تم گوشت کھاؤ تو تمہارے خیالات بدل جائیں گے" — بلاذری نے کہا — "میں تمہیں آج گوشت کھلاؤں گا۔ اگر پتھر کے کسی بت نے تمہیں سزا دی تو وہ میں بھگتوں گا۔"

اُس نے پرندوں کے پر اتارے۔ پرندے صاف کیے اور لکڑیاں وغیرہ اکٹھی کر کے آگ پر پرندے بھون لیے۔ وہ نمک ساتھ لے گیا تھا۔ جگ موہن

گوشت کو ہاتھ لگاتے ڈر رہا تھا۔ عمران بلاذری نے زبان کا جادو چلایا تو جگ موہن نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے ایک پرندہ اٹھایا اور دانتوں سے ایک بوٹی منہ میں ڈالی۔ اُس نے گوشت کا ذائقہ پہلی بار چکھا تھا۔ اُس نے جلدی جلدی پورا پرندہ کھالیا۔

"اور کھاؤں گا۔" جگ موہن نے کہا۔

وہ ایک اور پرندہ کھا گیا۔

"میں ایک اور کھلاؤں گا۔" عمران بلاذری نے کہا۔

جگ موہن نے ایک اور پرندہ کھایا۔ پرندوں کی کمی نہیں تھی۔ بلاذری آگ پر پھینکتا، بھونتا اور نمک لگاتا جا رہا تھا۔ جگموہن نے ایک اور پرندہ اٹھایا تو بلاذری نے روک دیا۔

"زیادہ نہیں۔" اُس نے جگ موہن سے کہا۔ "تمہارا پیٹ گوشت کا عادی نہیں۔ شاید زیادہ ہضم نہ کرسکے۔ میرے گھر آتے ہی رہتے ہو میں تمہیں گوشت کا عادی بنا دوں گا۔"

جگ موہن نے بلاذری کے منع کرنے کے باوجود ایک اور پرندہ کھالیا اور بولا۔ "بھاگیں دوڑیں گے تو سب کچھ ہضم ہو جائے گا۔"

اُس روز کے بعد جگ موہن عمران بلاذری کے گھر جاتا تو گوشت کی فرمائش کرتا۔ بلاذری اس کے لیے گوشت تیار رکھتا تھا۔ یہ گوشت کا اثر تھا یا بلاذری کی باتوں کا کہ جگ موہن اپنے مذہب سے متنفر ہو گیا۔

"تم مندر میں جایا کرتے ہو؟" ایک روز عمران بلاذری نے اس سے پوچھا۔

"کبھی کبھی۔" جگ موہن نے جواب دیا۔ "اب تو ایک رسم پوری کرنے جاتا ہوں۔"

"تم جس بت یا مورتی کے سامنے بیٹھ کر عبادت کیا کرتے ہو، اُسے ایک روز کہنا کہ تم گوشت خور ہو گئے ہو۔" عمران بلاذری نے کہا۔ "پھر دیکھنا تمہارا یہ مصنوعی خدا تمہیں کیا کہتا ہے.... وہ کچھ بھی نہیں کہے گا۔ تم اتنے دنوں سے گوشت

کھا رہے ہو تمہیں ان بتوں نے کیا سزا دی ہے؟ البتہ تمہارے کسی پنڈت کو پتہ چل گیا تو وہ تمہارے خلاف طوفان بپا کر دے گا۔"

جگ موہن اپنے مذہب کے خلاف دلیر ہو گیا۔

شام کے بعد کا واقعہ ہے۔ عمران بلاذری اپنے گھر میں تھا۔ ایک بڑی ہی خوبصورت لڑکی اُس کے گھر میں آئی۔ لڑکی کا رنگ گورا، آنکھیں شربتی اور بال بھی شربتی رنگ کے تھے۔ وہ خوبصورت تو تھی ہی لیکن اُس میں جو کشش تھی، وہ اُس کے جسم کی ساخت کی بدولت تھی۔ اس کی چال ڈھال میں انوکھی کشش تھی۔ اس کی عمر بمشکل سولہ سترہ سال تھی۔ عمران بلاذری اس لڑکی کو ایسے وقت جب شام گہری ہو گئی تھی، اپنے گھر میں دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"عمران بلاذری تم ہو؟" لڑکی نے پوچھا۔

"ہاں.... میں ہی ہوں۔"

"میں جگ موہن کی بہن ہوں۔" لڑکی نے کہا۔ "میرا نام رتی ہے۔ جگ موہن کو دیکھنے آئی ہوں۔ میرے باپ کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ گھر میں کوئی مرد نہیں جو کسی سیانے کو بلا لائے۔ مجھے معلوم تھا کہ میرا بھائی تمہارے پاس آیا کرتا ہے۔"

"ہاں.... آیا کرتا ہے لیکن دیر بعد۔" عمران بلاذری نے کہا۔ "رات گہری ہو چکی ہوتی ہے تو آتا ہے۔ میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں کسی وید یا کسی سیانے کو بلا لائیں گے۔"

"تم یہاں اکیلے رہتے ہو؟" رتی نے پوچھا۔

"بالکل اکیلا۔"

"بیوی نہیں؟" رتی نے مسکرا کر پوچھا۔

"ابھی شادی نہیں ہوئی۔"

اس ہندو لڑکی کے چہرے کے تاثرات اور مسکراہٹ سے پتہ چلتا تھا کہ وہ اس گھر سے جلدی نہیں نکلنا چاہتی۔ عمران بلاذری ایک تاثر بن کر اس پر چھا

گیا تھا۔

"تم نے شادی کیوں نہیں کی؟" — رشی نے پوچھا۔

"تمہارا باپ بیمار ہے رشی!" — عمران بلاذری نے کہا "تمہیں جلدی گھر جانا چاہیے۔"

"اتنا زیادہ تو بیمار نہیں" — لڑکی نے کہا — "ویسے بھی تمہارے پاس رک گئی ہوں۔ تمہیں اچھا نہیں لگتا تو چلی جاتی ہوں۔ ... میرا بھائی تمہاری بہت تعریفیں کیا کرتا ہے۔ تمہیں دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ ... تم واقعی اچھے آدمی ہو۔ جگ موہن بہت اداس رہتا ہے۔ اُس نے کھانا پینا بھی کم کر دیا ہے۔"

عمران بلاذری کے منہ سے نکل چلا تھا کہ جگ موہن نے کھانا پینا اس لیے کم کر دیا ہے کہ وہ اُس سے چوری چھپے گوشت کھاتا ہے لیکن اُسے یاد آگیا کہ یہ راز ہے۔ اُس نے کہا — "جس نے اپنی بہن کو زندہ جلتے دیکھا ہو وہ اداس نہ رہے تو کیا کرے ... تمہیں بھی اپنی بہن کا بہت غم ہوگا۔"

رشی نے آہ لی اور اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ رندھی ہوئی آواز میں بولی — "میری قسمت میں بھی شاید زندہ جلنا ہی لکھا ہے۔ کبھی تو جی میں آتی ہے کہ شادی نہ کروں۔"

عمران بلاذری کی نظریں اس کے چہرے پر جم گئیں پھر آہستہ آہستہ نیچے کو پھسلنے لگیں۔ رشی اُسے دیکھ رہی تھی۔ بلاذری تصوروں میں دیکھنے لگا کہ اتنی حسین لڑکی جل رہی ہے ... تصوروں کے شعلے اُس کے اپنے سینے کو جلانے لگے۔

"نہیں رشی!" — بلاذری نے بے تابی سے لپک کر رشی کے کندھے پکڑ لیے اور بولا — "تم نہیں جلوگی۔ تم مرگئیں تو میں تمہاری لاش کو بھٹی میں جلنے دوں گا۔ تمہاری لاش اٹھا لے جاؤں گا۔"

رشی گھبرا گئی۔ بلاذری سنبھل گیا اور کھسیانی سی مسکراہٹ سے بولا — "مجھے معاف کر دینا رشی! مجھے غلط نہ سمجھنا ... میں سمجھ نہیں سکا کہ تم جیسی عورتوں کو زندہ کس طرح جلا دیتے ہیں۔ تمہارے پنڈت اور دوسرے لوگ اتنے پتھر دل کس طرح بن جاتے ہیں۔"

"تم میری قسمت نہیں بدل سکتے عمران!"

عمران نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ دونوں پر خاموشی طاری ہوگئی۔ عمران بلاذری اُس کے اور قریب ہوگیا۔

"میں تمہاری قسمت بدل سکتا ہوں" — اُس نے زیر لب کہا — "اگر تم نے ساتھ دیا تو خدا ہماری مدد کرے گا۔"

"کل آؤں؟" — رشی نے پوچھا

"اسی وقت" — عمران بلاذری نے کہا — "لیکن کوئی دیکھ نہ لے۔ ہمارے مذہب ہمارے لیے مشکل پیدا کر دیں گے ... جگ موہن نے بتایا تھا کہ تمہیں مندر میں نہیں جانے دیا جاتا۔ اُس نے وجہ بھی بتائی تھی۔"

"میں اپنے کسی دیوتا پر قربان ہونے کے لیے تیار نہیں" — رشی نے کہا — "میں دن کو گھر سے باہر نہیں جاتی۔ رات کو نکلتی ہوں۔"

"کل آؤ گی تو باتیں کریں گے" — بلاذری نے کہا — "تم گھر چلو میں کسی حکیم یا سیانے کو لے کر آتا ہوں۔"

وہ رشی کے ساتھ دروازے تک گیا۔ یہ تاریک ڈیوڑھی تھی۔ رشی اس کے قریب ہوگئی۔ عمران بلاذری نے اپنا بازو اُس کی کمر میں ڈال دیا۔

"میں کسی غیر مرد کے اتنی قریب کبھی نہیں ہوئی تھی" — رشی نے کہا — "تمہارے قریب ہوتے ڈر آتا ہے۔ مسلمانوں کے متعلق ہمیں کبھی کوئی اچھی بات نہیں بتائی گئی۔ جگ موہن مجھے یہ نہ بتاتا کہ تم اچھے آدمی ہو تو میں یہاں کبھی نہ آتی ... تم تو بہت اچھے ہو۔"

رشی دروازے سے نکلی تو بھی اس کے ہاتھ میں عمران کا ہاتھ تھا۔ جیسے وہ اس خوبرو مسلمان کے سہارے اپنے مذہب کے سیلابی دریا میں اُتر رہی ہو۔ عمران بلاذری نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہ کی۔ رشی کچھ دیر رکی رہی۔ اُس نے

بے دلی سے عمران کا ہاتھ چھوڑا اور چلی گئی۔ وہ کچھ دور چلی گئی تو عمران باہر نکلا اور ایک حکیم کے گھر کو چل پڑا۔

حکیم کو جگ موہن کے گھر میں داخل کر کے عمران بلاذری واپس آ گیا۔ ڈیوڑھی سے گزر کر صحن میں آیا تو باہر کا دروازہ کھلا اور بند ہو گیا۔ اُس نے گھوم کر دیکھا۔ وہ عورت ہی لگتی تھی۔ وہاں اندھیرا تھا۔ شاید شی پھر آ گئی تھی۔ قریب آئی تو بلاذری نے پہچان کر کہا — "فاطمہ؟ ... تم یہاں کیسے آ گئیں؟"

"صرف یہ پوچھنے آئی ہوں کہ یہ ہندو والی یہاں کیوں آئی تھی؟" — فاطمہ نے پوچھا — "کیا میں اتنی بُری ہوں کہ دُور سے میرے سلام کا جواب دے دیتے ہو؟ ... اور میرے پیغام کا یہ جواب دیتے ہو کہ تمہارے خاوند سے ڈرتا ہوں میرے گھر نہ آنا، ہم نہیں مل سکتے۔"

عمران بلاذری نے جا کر دروازہ اندر سے بند کیا اور فاطمہ کو اپنے کمرے میں لے گیا جہاں تھوڑی دیر پہلے شی آئی تھی۔

"وہ اپنے بھائی کو دیکھنے آئی تھی" — عمران بلاذری نے فاطمہ سے کہا۔ "میں نے آج پہلی بار اس لڑکی کو دیکھا ہے۔ اس کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں ... اور میں تمہارے ساتھ بھی کوئی تعلق نہیں رکھ سکتا فاطمہ! تم مسلمان ہو۔ خاوند والی ہو۔ تمہارے سلام اور تمہارے پیغام جسمانی تعلق کی خاطر ہیں۔ میں گناہگار نہیں کہلاؤں گا۔"

"جسے تم میرا خاوند کہ رہے ہو، وہ مجھ اکیلی کا خاوند نہیں" — فاطمہ نے کہا — "اس کی تین بیویاں ہیں۔ میں سب سے چھوٹی ہوں۔ میری عمر بیس سال سے کچھ مہینے اوپر ہو گی۔ میرے خاوند کی عمر مجھ سے دگنی سے بھی زیادہ ہو گی۔ اس نے تین بیویاں صرف اس لیے رکھی ہوئی ہیں کہ وہ دولت مند تاجر ہے۔ خدا نے اسے ایسی شکل و صورت بھی نہیں دی کہ کوئی عورت اسے پسند کرے۔ اس کا جسم اس قابل نہیں کہ تین بیویاں اس سے خوش رہیں، مگر دولت کے زور پر اُس

نے مجھ جیسی جوان لڑکی کو تیسری بیوی بنا لیا ہے۔ اگر اس قسم کا مرد تین بیویاں رکھ سکتا ہے تو کیا ایک عورت دو خاوند نہیں رکھ سکتی؟ عورت کو اس حق سے کیوں محروم کیا گیا ہے کہ وہ اپنی پسند کے مرد کے پاس جائے؟ مرد کو یہ حق کس نے دیا ہے کہ وہ تین تین چار چار جوان لڑکیوں کو اپنے عقد میں باندھ لے؟"

"اس میں میرا کوئی قصور نہیں" — عمران بلاذری نے بے رُخی سے کہا — "نہ میں نے مرد کو تین اور چار بیویاں رکھنے کا حق دیا ہے، نہ عورت کو ایک سے زیادہ خاوند رکھنے کے حق سے محروم کیا ہے۔ میں تمہارے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا۔ تم چلی جاؤ۔ تمہارے خاوند کو پتہ چل گیا کہ تم یہاں ہو تو میری مصیبت آ جائے گی۔"

"وہ یہاں نہیں ہے" — فاطمہ نے کہا — "پشاور مال لینے چلا گیا ہے۔ وہ ایک مہینے سے زیادہ عرصہ غائب رہے گا۔ مجھے ساتھ لے جانا چاہتا تھا لیکن میں نے ایسی بیماری کا بہانہ بنایا کہ وہ گھبرا گیا۔ وہ دوسری بیوی کو ساتھ لے گیا ہے۔ جو مجھ سے تین سال بڑی ہے۔ اس سے بڑی کہیں اور چلی گئی ہے۔ رات دیر سے آئے گی۔ وہ مجھے کہیں جانے سے نہیں روک سکتی اور میں اس کے راستے میں نہیں آتی ... تم نے مجھے مسلمان کہا ہے۔ میں نام کی مسلمان رہ گئی ہوں۔ میرا کوئی مذہب نہیں۔ میرے باپ کا مذہب اور ایمان سونا چاندی ہے۔ اس نے مجھے مذہب کے نام پر بیچا ہے۔ میری قیمت نقد وصول کر کے میرا نکاح پڑھوایا ہے۔ مجھے اپنے مذہب کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ مجھے یہ بتایا گیا ہے کہ عورت کو مرد کی تفریح کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ میں ایک مرد کی تفریح کا ذریعہ بن گئی ہوں۔ میں اسے اپنا حق سمجھتی ہوں کہ اپنی تفریح کا کوئی ذریعہ پیدا کروں۔ وہ ذریعہ تم ہو۔ کہو اپنی کتنی قیمت مانگتے ہو۔ کیا میں اس ہندو لڑکی جتنی خوبصورت نہیں ہوں؟"

"میں تمہارے خاوند کی قبیل میں سے نہیں ہوں" — عمران بلاذری نے کہا — "مجھے تمہارے حسن اور تمہارے جسم کے ساتھ ذرا سی بھی دلچسپی نہیں۔ اگر میں ایسا

ہوتا کہ میں اس وقت دو نہیں تو ایک شادی ضرور کر چکا ہوتا۔ میری نظر نہ اپنے جسم پر ہے نہ تمہارے جسم پر۔ تم بھی جسم سے توجہ ہٹا لو۔ مسلمان کی دولت اس کی روح ہوتی ہے۔ روح کو پاک رکھو۔"

"تم بچے ہو" — فاطمہ نے کہا — "ڈرتے ہو۔ اپنے آپ کو فریب دیتے ہو۔ میرا جسم روح سے خالی ہے۔ جو عورت نیلام ہو جاتی ہے اُس کی روح مر جاتی ہے۔ تم میری روح کو زندہ کر سکتے ہو۔"

"پھر اپنے خاوند سے طلاق لو اور میری بیوی بن جاؤ۔"

"یہ ممکن نہیں" — فاطمہ نے کہا — "میں تمہارے ساتھ گھر سے بھاگ سکتی ہوں۔ نقد بھی ساتھ لاؤں گی، زیورات بھی۔ جہاں کہو گے چلوں گی" — وہ اُس کے قریب آ گئی۔ باہیں اُس کے گلے میں ڈال کر جذباتی اور مخمور آواز میں بولی — "تم میری زنجیروں سے نکل نہیں سکو گے۔ اپنے خاوند کے سوا میں کسی اور مرد کے جسم سے واقف نہیں۔ تمہیں میرے دل نے چاہا ہے۔ میرا جسم بھی پیاسا ہے، میری روح بھی پیاسی ہے۔"

"تم نفس کی آگ میں نہیں، انتقام کی آگ میں جل رہی ہو" — عمران نے کہا — "اس میں اپنے باپ کو جلاؤ جس نے نقدی لے کر تمہاری جوانی کے خواب اُس ہوس کار خاوند کے حوالے کیے تھے۔ پھر اس خاوند کو اس آگ میں جھونکو۔"

"تم میرا ساتھ دو گے؟"

"تم کیا کرنا چاہتی ہو؟"

"اپنے خاوند کو زہر دے دوں تو مجھے یہاں سے کہیں دور لے جاؤ گے؟"

عمران بلاذری گہری سوچ میں کھو گیا۔ فاطمہ نے اُس کے پہلو میں بیٹھ کر ایک بازو اُس کے گلے میں ڈالا اور گال اُس کے گال سے لگا دیا۔ وہ تڑپ اُٹھا جیسے پنجرے میں بند کر لیا گیا ہو۔

"میں تمہارا ساتھ دوں گا" — اس نے فاطمہ کے بازو سے آزاد ہو کر پرے ہٹتے ہوئے کہا — "لیکن اپنے خاوند کو اُس روز زہر دینا جس روز میں کہوں گا۔ اس سے پہلے میں کہیں اور ذریعہ معاش کا انتظام کر لوں گا۔"

"دھوکہ تو نہیں دو گے؟"

"نہیں۔"

"مجھے اپنے گھر آنے سے تو نہیں روکو گے؟"

"نہ آؤ تو اچھا ہے" — بلاذری نے کہا — "کسی کو شک نہیں ہونا چاہیے کہ تمہارا میرے ساتھ تعلق ہے۔"

فاطمہ مطمئن ہو کر چلی گئی مگر عمران بلاذری کا دم اس طرح گھٹ رہا تھا جیسے اس کی گردن پھانسی کے پھندے میں آ گئی ہو۔ فاطمہ رشی جیسی خوبصورت تھی، اور وہ جذبات کا آتش فشاں پہاڑ تھی۔ اُس کے خاوند کا گھر اسی گلی کے آخر میں تھا جو امیرانہ ٹھاٹھ کی حویلی تھی۔ فاطمہ نے عمران بلاذری کو اپنے گھر کے سامنے سے گزرتے کئی بار دیکھا تھا۔ اس نے کئی بار اس خوبرو مرد کو سلام کیا، پھر ایک غریب سی عورت کی زبانی ملاقات کے لیے پیغام بھیجے تھے مگر عمران اس سے پہلو بچا رہا تھا۔ آج رات فاطمہ نے ایک ہندو لڑکی کو عمران کے گھر سے نکلتے دیکھا تو رقابت نے اسے اتنا دلیر بنا دیا کہ وہ عمران کے گھر آ گئی۔ عمران کو یوں محسوس ہوا جیسے دہکتے انگاروں پر ننگے پاؤں چل رہا ہو۔ فاطمہ نے اپنے خاوند کو زہر دینے کی تجویز پیش کی تو عمران بلاذری کو فرار کا راستہ نظر آ گیا۔ اسے فاطمہ بتا چکی تھی کہ اس کا خاوند ایک ماہ بعد آئے گا۔ بلاذری نے سوچا کہ اس ماہ تک فاطمہ دھوکے میں رہے گی۔

حقیقت یہ تھی کہ عمران بلاذری کو رشی اتنی اچھی لگی تھی کہ وہ اُسے بار بار ملنے کو بے تاب ہو رہا تھا۔ فاطمہ رشی سے کم خوبصورت نہیں تھی لیکن یہ دل کا معاملہ تھا مگر فاطمہ چلی گئی تو بلاذری کے سامنے اپنا فرض آ گیا۔ وہ جاسوسی کے لیے آیا تھا اور اب تک اُس کا بہروپ کامیاب تھا۔ راج محل کی فوجی نوعیت کی سرگرمیوں پر

اُس کی نظر تھی، وہ سلطان سبکتگین تک کئی اطلاعیں اور معلومات پہنچا چکا تھا۔ اُس نے جذباتی لحاظ سے اپنے آپ کو پتھر بنا رکھا تھا مگر رشی اور فاطمہ نے اُسے ایسا دھکا دیا کہ وہ جذبات کے سیلاب میں غوطے کھانے لگا۔ فرض اُس کے ہاتھ سے چھوٹتا نظر آنے لگا۔ تنہائی میں اُس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی اور وہ سنبھل گیا مگر اُسے یہ خطرہ بھی نظر آنے لگا کہ یہ دو لڑکیاں آج رات کی طرح اُس کے پاس آتی رہیں تو وہ فرض کے راستے سے ہٹ جائے گا۔ اُس نے اس کا علاج یہ سوچا کہ وہ یہاں سے نقل مکانی کر جائے گا اور ان لڑکیوں کو پتہ نہیں چلنے دے گا کہ وہ شہر کے کونسے کونے کھدرے میں رہتا ہے۔ اُسے یہ توقع تھی کہ وہ کسی بھی روز لاہور سے غزنی چلا جائے گا۔

وہ آخر انسان تھا، پتھر نہیں تھا انسانی فطرت کی اس سب سے بڑی کمزوری، جسے عورت کہتے ہیں، پر قابو پانا اُس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ وہ چکی کے دو پتھروں میں آ گیا تھا۔

اگلی شام گہری ہوئی تو رشی آ گئی۔ عمران بلاذری گھر میں اکیلا تھا۔ یہ اُن کی دوسری ملاقات تھی لیکن انہیں یوں لگا جیسے وہ بچپن سے اکٹھے کھیلتے جوان ہوئے ہوں۔

"کل تم نے کہا تھا کہ میری لاش کو بھی نہیں جلنے دو گے" — رشی نے کہا — "تم نے ایسے کیوں کہا تھا؟"

"کل تم یہاں اپنے بھائی کو دیکھنے آئی تھیں" — بلاذری نے رشی کے سوال کا جواب دینے کی بجائے پوچھا — "آج کیوں آئی ہو؟"

"تمہیں دیکھنے"

"کیوں؟"

"تم مجھے اچھے لگتے ہو!"

"اسی لیے میں تمہاری لاش نہیں جلنے دوں گا" — عمران بلاذری نے کہا — "تم مجھے

اچھی لگتی ہو۔"

"میں نے کل تمہیں بتایا نہیں تھا" — رشی نے کہا — "میری شادی بھی ایک فوجی کے ساتھ ہو گی۔"

"جو غزنی پر حملے کے لیے جائے گا" — بلاذری نے کہا — "اور تمہاری زندگی اپنی بہن کی طرح جلتی چتا پر ختم ہو جائے گی۔"

"یہ لوگ عورت کو انسان کیوں نہیں سمجھتے؟" — رشی نے رنجیدہ لہجے میں پوچھا — "انسانی قربانی لڑکی کی کیوں دی جاتی ہے؟ کسی مرد کو قربان کیوں نہیں کیا جاتا؟"

"تمہارے مذہب میں تمہارے سوالوں کا کوئی جواب نہیں" — عمران بلاذری نے کہا — "میرے مذہب میں انسانی قربانی کا رواج نہیں۔"

"میں زندہ نہیں جلنا چاہتی" — رشی نے خوفزدہ لہجے میں کہا — "میرے لیے بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں، کوئی پناہ نہیں۔"

یہاں سے بات چلی تو اتنی دور پہنچ گئی جہاں عمران اور رشی ایک ہو گئے۔ اُن کی محبت رُوحوں تک اُتر گئی۔ انہیں یہ بھی احساس نہ رہا کہ رات کتنی گزر گئی ہے۔ وہ اپنے مذہب بھی بھول گئے۔ عمران بلاذری کو اپنے فرض کا بھی احساس نہ رہا۔ رشی کو یقین ہو گیا کہ عمران اُسے پناہ میں لے لے گا۔ وہ جانے کے لیے یوں اُٹھی جیسے جانا نہ چاہتی ہو لیکن اسے جانا تھا اور وہ چلی گئی۔

دو تین روز بعد رشی پھر عمران کے گھر گئی۔ ابھی بیٹھی ہی تھی کہ جگ موہن نے باہر سے عمران بلاذری کو آواز دی۔

"تمہارا بھائی آیا ہے" — عمران نے رشی سے کہا — "تم ساتھ والے کمرے میں چھپ جاؤ۔"

جب جگ موہن اس کمرے میں آیا، اُس کی بہن دوسرے کمرے میں جا چکی تھی۔

"تم نے مجھے گوشت کا ایسا عادی بنا دیا ہے کہ اپنے گھر کی سبزی ترکاری

کو دیکھ کر تھوک ماری جاتی ہے"۔ جگ موہن نے کہا "گھر میں کچھ ہے؟"

عمران بلاذری نے گھر میں پکا ہوا گوشت رکھا ہوا تھا۔ وہ جگ موہن کے آگے رکھ دیا۔ جگ موہن نے یہ بھی نہ دیکھا کہ عمران نے کچھ کھایا ہے یا نہیں۔ وہ سارا گوشت کھا گیا۔

"قربانی کے لیے کنواری لڑکی چن لی گئی ہے یا نہیں؟" — بلاذری نے پوچھا۔

"ابھی نہیں" — جگ موہن نے جواب دیا — "معلوم نہیں پنڈتوں کو کس قسم کی لڑکی کی تلاش ہے"۔

"تمہاری بہن مندر میں جاتی ہے؟"

"نہیں" — جگ موہن نے کہا — "مگر میں سوچتا ہوں کہ اُسے کب تک چھپائے رکھیں گے"۔

عمران بلاذری اس کوشش میں تھا کہ جگ موہن جلدی چلا جائے۔ وہ اُس کی باتوں میں دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔ تھکن اور نیند کا بہانہ کام کر گیا، اور جگ موہن چلا گیا۔ رشی [illegible] تو اُس کے چہرے پر [illegible] تھا۔

"کیا میرے بھائی نے گوشت کھایا ہے؟" — رشی نے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔

"[illegible] تھا" — عمران نے جواب دیا — "مگر میں اُسے بتا ابھی نہیں [illegible] دل کرے [illegible] باتیں سن رہی ہو..... [illegible] گوشت کھا رہا ہے تمہارے دیوتا نے تمہارے بھائی کو کوئی سزا دی ہے؟ مذہب صرف اُن چیزوں کی مخالفت کرتا ہے جن سے نشہ ہوتا ہے اور انسان کی عقل بیکار ہو جاتی ہے۔ مجھے بتاؤ تم کب آؤ گی [illegible] گوشت کھلاؤں گا"۔

رشی دو روز بعد آئی۔ عمران نے اُس کے لیے مرغی بھون کے رکھی ہوئی تھی۔ رشی نے ڈرتے ڈرتے کھائی۔ پھر بولی — "میں جب بھی آؤں میرے لیے گوشت رکھا کرو"۔

انہی دنوں عمران بلاذری کو حکم ملا کہ راج محل کے ایک کمرے میں غزنی کے دو قیدی لائے گئے ہیں جنہیں کھانا دینا ہے کیونکہ انہوں نے کہا تھا کہ وہ مسلمان کے ہاتھ سے کھانا کھائیں گے۔ عمران اُن کے لیے کھانا لے کر گیا اور اُس کی ملاقات نظام ادریزی اور قاسم بلخی سے ہوئی۔ پچھلے باب میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے کہ اُس نے ان کے ساتھ کیا باتیں کیں، انہیں کیا ہدایات دیں اور کس طرح اُن کے فرار کی راہ ہموار کرتا رہا۔

اس دوران رشی اُس کے پاس آتی رہی۔ اب اس کی دو ہی فرمائشیں ہوتی تھیں۔ وہ آتے ہی گوشت مانگتی پھر یہ ضد — "مجھے لاہور سے جلدی نکالو۔ گھر والے میری شادی کی تیاریاں کر رہے ہیں"۔

اگر نظام ادریزی اور قاسم بلخی نہ آ جاتے تو عمران بلاذری کبھی کا رشی کو ساتھ لے کر نکل گیا ہوتا۔ وہ رشی کے ساتھ ہر بار ایک نیا جھوٹ بولتا تھا۔ اُسے یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ وہ غزنی کا جاسوس ہے، اور غزنی کے دو قیدیوں کو فرار کرائے بغیر کہیں نہیں جا سکتا۔ وہ فرض اور محبت کے درمیان پس رہا تھا۔ رشی کی والہانہ محبت اور اُس کے آنسوؤں نے اُسے کئی بار فرض سے ہٹا لیا لیکن ادریزی اور بلخی کو دیکھ کر اُسے فرض یاد آ جاتا تھا۔ ان دونوں کے فرار کی کوئی صورت پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ ان کے کمرے کے باہر سنتری موجود رہتے تھے۔

ایک رات رشی عمران کے گھر سے گئی تو فاطمہ آ گئی۔ عمران پر رشی کے حسن اور اس کی محبت کا نشہ طاری تھا۔ وہ اُسی کے تصور سے دل بہلا رہا تھا۔ فاطمہ نے اُسے اس حسین تصور سے بیدار کر دیا۔ اُسے غصہ آ گیا۔ فاطمہ کسی اور نشے میں آئی تھی۔ یہ نشہ جسمانی تھا۔

"میں نے تمہیں یہاں آنے سے منع کیا تھا" — عمران نے غصے سے کہا — "اپنے خاوند کو واپس آنے دو"۔

"تم مجھے ٹال رہے ہو" — فاطمہ نے کہا — "مانگو۔ اپنی کتنی قیمت

مانگتے ہو۔"

"مجھے کچھ نہیں چاہیئے فاطمہ!"

"تمہیں وہ ہندوانی چاہیئے" ــــ فاطمہ نے طنزیہ لہجے میں کہا ــــ "وہ جو تمہارے پاس آتی رہتی ہے۔ میں چاہوں تو تمہیں پکڑوا سکتی ہوں۔ تم جانتے ہو کہ یہاں ہندوؤں کا راج ہے جو مسلمانوں سے نفرت کرتے ہیں۔ تمہاری چوری پکڑی گئی تو سیدھے قید خانے میں جاؤ گے۔"

"میں اس سے پہلے لڑکی سمیت غائب ہو جاؤں گا" ــــ عمران بلاذری نے کہا ــــ "تم میرے پاس جو اُمید لے کر آئی ہو وہ پوری نہیں ہو سکے گی۔ رتشی کے مقابلے میں میں تم جیسی بیس لڑکیوں کو دھتکار سکتا ہوں۔"

یہ عمران بلاذری کی بڑی خطرناک غلطی تھی۔ اُسے احساس نہیں تھا کہ رقابت عورت کو چڑیل بنا دیا کرتی ہے۔ فاطمہ کے ساتھ جو ظلم ہُوا تھا، اس سے وہ باؤلی ہوئی جا رہی تھی۔ اُس نے شرم و حجاب اتار پھینکا تھا۔ وہ غصے سے چلی گئی۔

فاطمہ کو ہندو عورتوں سے معلوم ہو چکا تھا کہ پنڈت راجہ جے پال کی فتح کی خاطر ایک کنواری لڑکی کی قربانی دے رہے ہیں لیکن انہیں اپنے مطلب کی لڑکی نہیں مل رہی۔ فاطمہ نے اگلا دن بڑی مشکل سے گزارا۔ رات کو وہ مندر میں چلی گئی۔ اُس نے ہندو عورتوں سے باتوں باتوں میں معلوم کر لیا تھا کہ بڑا پنڈت کہاں رہتا ہے۔ وہ پنڈت کے پاس چلی گئی۔ پنڈت اُسے دیکھ کر حیران ہُوا۔ اسے اپنے پاس بٹھایا۔

"آپ لڑکی کی قربانی کب دیں گے؟" ــــ فاطمہ نے پوچھا۔

"جب ہمیں وہ خاص قسم کی لڑکی مل جائے گی" ــــ پنڈت نے کہا ــــ "تم کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"میں آپ کی مدد کرنے آئی ہوں" ــــ فاطمہ نے کہا ــــ "آپ کو علم نہیں کہ شہر کی تمام ہندو لڑکیاں مندر میں نہیں آتیں۔ میں آپ کو ایک لڑکی دکھاؤں گی۔ مجھے اُمید

ہے کہ وہ قربانی کے لیے موزوں ہوگی۔" اُس نے رتشی کے باپ کا نام لیا اور پوچھا ــــ "آپ نے اس کی بیٹی کو کبھی دیکھا ہے؟"

"میں نے تمہیں بھی کبھی نہیں دیکھا تھا" ــــ پنڈت نے کہا ــــ "تم کس کی بیٹی ہو؟"

"میں مسلمان ہوں" ــــ فاطمہ نے جواب دیا ــــ "اور ایک تاجر کی بیوی ہوں۔"

"تمہیں ہماری قربانی اور ہمارے مذہب کے ساتھ کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟" ــــ پنڈت نے پوچھا ــــ "تمہارے دل میں جو کچھ ہے وہ بتاؤ۔"

یہ مندر کے ساتھ ملا ہُوا ایک کمرہ تھا۔ کسی مسلمان کو مندر کے اندر قدم رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ کوئی مسلمان کسی ہندو کے گھر میں داخل نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ مسلمانوں کو ناپاک سمجھا جاتا تھا، مگر پنڈت کو جب فاطمہ کے متعلق پتہ چلا کہ وہ مسلمان ہے تو اُس نے اُسے گھر سے نکالا نہیں۔ وہ چونکا اور بھڑکا بھی نہیں۔ وہ جان گیا کہ یہ جوان سال اور حسین لڑکی کسی اور مقصد کے لیے آئی ہے۔ پنڈت گھاگ اور خرانٹ آدمی تھا۔ اُس نے فاطمہ کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا کہ تمہارے دل میں جو کچھ ہے بتا دو۔

فاطمہ تجربہ کار اور خرانٹ نہیں تھی۔ وہ تو رقابت اور اپنی توہین کی آگ میں جل رہی تھی۔ اُس کی عقل پر شیطانی قوتوں کا قبضہ تھا۔ وہ اپنے ماں باپ سے، اپنے خاوند سے، رتشی سے اور عمران بلاذری سے انتقام لینے پر تلی ہوئی تھی۔ اُس کی تمام تر تخریبی قوتیں بچھو کے ڈنک کی طرح تیار اور مستعد ہو گئی تھیں۔ اُس نے پنڈت کے سوال کے جواب میں اپنے کپڑوں کے اندر سے ایک پوٹلی نکالی اور پنڈت کے آگے رکھ کر کھول دی۔ اس میں سونے کے چند ایک سکے تھے۔ اُس نے پنڈت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

"میں نے جس لڑکی کا نام لیا ہے اس کی آپ انسانی قربانی دے دیں" ــــ فاطمہ نے رازداری کے لہجے میں کہا۔

"اگر یہ لڑکی ہمارے مطلب کی نہ ہوئی تو؟"

"وہ کنواری ہے۔" فاطمہ نے کہا۔ "بہت خوبصورت ہے۔ عمر سولہ سترہ سال ہے۔ اگر وہ قربانی کے مطلب کی نہیں تو بھی اس کی قربانی دے دیں۔"

"ہمارے مذہب میں دخل اندازی نہ کرو لڑکی" — پنڈت نے مذہبی پیشواؤں کے رعب سے کہا۔ "ہم ایک خاص قسم کی لڑکی کی تلاش میں ہیں۔"

"پنڈت جی مہاراج!" — فاطمہ نے کہا۔ "کوئی مذہب انسان کی قربانی کی اجازت نہیں دیتا۔ یہ رسم مذہب کے اُن ٹھیکیداروں نے شروع کی ہے جو اپنے مہاراجہ کو خوش کر کے انعام و اکرام لینا چاہتے ہیں، اور جو لوگوں پر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ وہ خداؤں اور دیوتاؤں کے خاص درباری ہیں اور وہ جس کسی کی بھی جان لینا چاہیں لے سکتے ہیں۔ آپ لوگ اپنے آپ کو عام انسانوں سے بہت اونچا سمجھتے ہیں۔"

"میرے مذہب کی توہین نہ کرو لڑکی" — پنڈت نے دبے دبے غصّے سے کہا۔ "تم نہیں جانتی کہ اس کی سزا کیا ہے۔"

"میں صرف آپ کے مذہب کی بات نہیں کر رہی مہاراج!" — فاطمہ نے کہا۔ "میرے مذہب میں بھی یہی کچھ ہوتا ہے۔ صرف انسانی قربانی نہیں دی جاتی۔ جہاں تک ہمارے اماموں اور مولویوں کا تعلق ہے، وہ آپ کی طرح مذہب کی ٹھیکیداری کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اپنی آواز کو خدا کی آواز کہتے ہیں۔ اپنی خواہشات کو خدا کا حکم بتلاتے ہیں، اور اپنے آپ کو عام انسانوں سے بہت بلند، خدا کے قریب سمجھتے ہیں۔ اس طرح مذہب کی اصلیت پر پردے پڑتے رہتے اور انسان بھٹکتے پھرتے ہیں... پنڈت جی مہاراج! آپ نے اپنا جو درجہ بنا رکھا ہے اس سے نیچے آئیں۔ مجھے اس مندر کے کچھ ایسے راز معلوم ہیں جو آپ سمجھتے ہیں کہ کسی کو بھی معلوم نہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ جسے زخم آتا ہے یا چوٹ لگتی ہے، وہ درد سے کراہتا ہے اور اُس کے کراہنے کو وہ لوگ سن لیتے ہیں جن کے کان ہوتے ہیں۔"

"تم کمسن ہو لڑکی!" — پنڈت کے لہجے میں رعب کی بجائے اپنائیت سی تھی۔ کہنے

لگا۔ "اس عمر میں تم ایسی باتیں کرتی ہو جو پختہ عمر میں بھی نہیں سوچی جا سکتیں۔"

"میرے دل کے زخموں نے مجھے پختہ کار بنا دیا ہے۔" — فاطمہ نے جواب دیا — "یہ میری عقل کی نہیں میرے دل کی آواز ہے۔ میرا دل کراہ رہا ہے، سسکیاں لے رہا ہے۔"

"وہ کونسے راز ہیں جو تم جانتی ہو؟"

"ایک یہ کہ میں حسین اور نوجوان نہ ہوتی تو آپ اتنا ہی سن کر کہ میں مسلمان ہوں مجھے دھکے دے کر اس کمرے سے نکال دیتے۔ کمرے کو دُھلاتے، یہاں لوبان جلاتے، بھجن گاتے، تب یہ کمرہ پاک ہوتا۔ مگر مجھے دیکھ کر آپ بھول گئے کہ مسلمان ناپاک ہوتا ہے۔ آپ نے سونے کے سکوں کو اٹھا باہر نہیں پھینکا۔ آپ کی زبان میں اور آپ کے الفاظ میں پنڈت موجود ہے مگر جن آنکھوں سے آپ مجھے اور سونے کے ان سکوں کو دیکھ رہے ہیں، ان سے پنڈت غائب ہو چکا ہے۔ آپ کی آنکھوں میں مجھے اپنا خاوند دکھائی دے رہا ہے۔ اُس نے میرے باپ کے ساتھ میرے حسن اور میری جوانی کا سودا کیا تھا۔ میں بکی ہوئی چیز ہوں۔ میں اب سودا کرنے سے نہیں ڈرتی۔ اپنے دل کی مراد کی خاطر میں سودا کرنے آئی ہوں۔"

"تم راز کی بات کر رہی تھیں۔"

"دل پر ہاتھ رکھیں اور سنیں" — فاطمہ نے کہا۔ "آپ کو انسانی قربانی کے لیے خاص قسم کی لڑکی صرف اس لیے نہیں مل رہی کہ آپ نے دو دولت والوں کی بیٹیوں پر ہاتھ رکھا لیکن زر و جواہرات لے کر آپ نے ان سے ہاتھ کھینچ لیا۔ میرا خاوند بہت بڑا تاجر ہے۔ وہ نام کا مسلمان ہے۔ وہ اپنے مذہب کا صرف ایک اصول جانتا ہے کہ ایک مسلمان بیک وقت چار بیویاں رکھ سکتا ہے۔ اس کا اٹھنا بیٹھنا اور اس کا دوستانہ ہندوؤں کے ساتھ ہے۔ اُسے بہت سی باتیں معلوم ہیں... میں اپنے ایمان کو ایک طرف رکھتی ہوں۔ آپ اپنے دھرم کو اس دروازے سے باہر رکھ دیں۔ سونے کے یہ ٹکڑے گن لیں، اور سودا کریں۔ کچھ اور چاہیے تو بتا دیں۔"

پنڈت کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ آ گئی جیسے بھیڑیئے نے کمزور سا

شکار دیکھ لیا ہو۔ یہ خندۂ دنداں نما تھا۔ وہ فرش پر بیٹھا تھا۔ فاطمہ اس کے سامنے دو ہاتھ دور بیٹھی تھی۔ پنڈت کا ہاتھ فاطمہ کی طرف بڑھا اور اس کے ہاتھ کو دبوچ لیا۔ پنڈت کے دوسرے ہاتھ نے سونے کے سکّوں والی پوٹلی اپنی طرف سرکا کر گھٹنے کے نیچے کر لی۔ فاطمہ نے اپنا ہاتھ پنڈت کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"میں کیسے یقین کر سکتی ہوں کہ میرا کام ہو جائے گا اور میرے ساتھ دھوکہ نہیں ہوگا؟"

"تم اس لڑکی کو اپنے راستے سے ہٹانا چاہتی ہو نا؟" — پنڈت نے ایسے لہجے میں کہا جو گناہ کے تصور سے شرابی کے قدموں کی طرح ڈگمگا رہا تھا — "ہٹ جائے گی۔"

"اگر اس کے ماں باپ نے آپ کی مٹھی گرم کر دی تو کیا ہوگا؟"

"وہی ہوگا جو تم چاہتی ہو۔"

کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ پنڈت نے ایک ٹانگ لمبی کر کے ایک کواڑ بند کر دیا۔ فاطمہ نے ہاتھ لمبا کر کے دوسرا کواڑ بند کر دیا۔ رات خاموش تھی۔ مندر میں رکھا ہوا اندر کا بُت خاموش تھا۔ پنڈت کے کمرے میں رکھی ہوئی مورتیاں خاموش تھیں۔ کرشن مراری کی مُرلی خاموش تھی۔ مندر کا سنکھ خاموش اور گھنٹیاں خاموش تھیں۔ رشی اپنے گھر اور عمران بلاذری اپنے گھر گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو خواب میں دیکھ رہے ہوں گے۔

مندر میں ان کے خوابوں کا سودا طے ہو چکا تھا۔

اگلے دن کا سورج ابھی ابھی طلوع ہوا تھا۔ عمران بلاذری کچھ دیر پہلے گھر سے اپنے کام کو جانے کے لیے نکلا تھا۔ وہ فاطمہ کے خاوند کی محل جیسی حویلی کے سامنے سے گزرا تو چلمن کی اوٹ سے اُسے فاطمہ کی سرگوشی سے ذرا ہی بلند آواز سنائی دی — "عمران" — وہ رک گیا۔ چلمن سے جھانکتا ہوا فاطمہ کا چہرہ نظر آیا۔ اس چہرے میں اُسے کوئی تبدیلی نظر نہ آئی۔

"اپنا وعدہ یاد رکھنا" — فاطمہ نے کہا۔

عمران بلاذری کا خون کھولنے لگا۔ وہ کچھ بھی نہ بولا اور چل پڑا۔ راج محل کے احاطے میں جا کر وہ اُسی کمرے میں گیا جہاں غزنی کے دو قیدی، نظام ادریزی اور قاسم علی کو رکھا گیا تھا جیسا کہ پہلے سنایا جا چکا ہے، اُن کے ہاتھ پاؤں کھلے ہوئے تھے کمرہ کھلا تھا۔ کمرے کے باہر اور عقب میں دو چار سنتری موجود رہتے تھے۔ چونکہ راجہ جے پال اُن سے راز کی باتیں معلوم کرنے کی کوشش کر رہا تھا، اس لئے انہیں قیدیوں کی طرح زنجیروں میں جکڑ کر قید خانے میں نہیں رکھا تھا۔ ان کی خاطر و تواضع کا ایسا انتظام تھا جیسے شاہی مہمانوں کا ہوتا ہے۔ ان کے مطالبے پر کہ ان کے کھانے پینے کا انتظام کوئی مسلمان کرے، یہ انتظام عمران بلاذری کے ہاتھ میں تھا۔ عمران بلاذری ان کے فرار کا بندوبست بھی کر رہا تھا۔ دشواری صرف یہ تھی کہ وہاں سنتری موجود رہتے تھے۔ عمران غزنی کے ان دونوں قیدیوں سے کہتا رہتا تھا کہ وہ راجہ کو جھوٹ موٹ راز کی باتیں بتا کر اس کا اتنا اعتماد حاصل کر لیں کہ وہ ان کے کمرے کے پہرے سے سنتریوں کو ہٹا دے۔

نظام ادریزی اور قاسم علی نے سوچ لیا تھا کہ وہ راجہ جے پال کو کیا بتائیں گے۔ انہوں نے یہ بھی طے کر لیا تھا کہ وہ راجہ کو پیشکش کریں کہ وہ دونوں اسی کی فوج میں رہیں گے اور پوری مہارت اور وفاداری سے اس کی فوج کو غزنی کی فوجی قیادت کی جنگی چالوں کے مطابق ٹریننگ دیں گے۔ اس طرح فرار کی صورت پیدا ہو سکتی تھی مگر راجہ جے پال لاہور سے غائب ہو گیا تھا۔ وہ اپنی شکست کو فتح میں بدلنے کے لیے دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔ وہ نئی فوج تیار کر رہا تھا اور پڑوسی ریاستوں سے بھی فوج اکٹھی کرتا پھر رہا تھا۔ اسے غزنی پر حملہ کرنا تھا۔

اُس روز عمران بلاذری غزنی کے دونوں قیدیوں کے کمرے میں گیا تو بھی اس نے دونوں پر زور دیا کہ وہ راجہ کو گمراہ کریں اور اس کے منظورِ نظر بن جائیں۔ وہ جس وقت ان کے ساتھ باتیں کر رہا تھا، اُس وقت اس کی محبت پر موت جھپٹ رہی تھی۔ رات فاطمہ نے پورا انتظام کر دیا تھا۔ رشی اپنے گھر میں تھی۔

گھر میں تمام افراد موجود تھے۔ انہیں سنکھ اور گھنٹیوں کی آواز سنائی دی۔ گلی میں بھاگتے دوڑتے قدموں کی دھمک بھی سنائی دی۔ بچوں کا شور و غل بھی سنائی دیا۔
رشی کھڑکی ہی تھی۔ وہ بھی تماشہ دیکھنے باہر کو دوڑی۔ گلی میں ایک جلوس آرہا تھا جس کے آگے آگے بڑے مندر کا بڑا پنڈت تھا۔ اُس کے ہاتھ میں چھوٹی سی ایک گھنٹی تھی جو وہ بجاتا آرہا تھا۔

اُس کے پیچھے چار پانچ پنڈت اور ان کے بالکے تھے۔ وہ سنکھ اور گھنٹیاں بجا رہے تھے۔ ان کے پیچھے ایک خوشنما پالکی تھی جو چار آدمیوں نے اٹھا رکھی تھی۔ پنڈت بھجن گنگناتے آرہے تھے۔ ان کے جلوس کے پیچھے تماشائیوں کا جلوس تھا۔
رشی اپنے دروازے میں کھڑی دیکھ رہی تھی۔ بڑا پنڈت اُس کے قریب آرکا اور اُس کا نام پوچھا تب رشی پر گھبراہٹ طاری ہوئی اور اُسے یاد آیا کہ اس کے باپ اور اس کے بھائی نے اسے پنڈتوں کی نظروں سے بچا کر رکھا ہوا تھا۔ اُس نے اپنا نام نہ بتایا۔
"اس کا نام رشی ہے"۔ جانے یہ کس کی آواز تھی۔
رشی کی ماں، اُس کا باپ اور بھائی بھی باہر آگئے تھے۔ رشی پیچھے ہٹنے لگی۔ پنڈت کے چہرے پر حیرت اور مسرت کا تاثر تھا۔ رشی اُس کے تصوروں سے زیادہ خوبصورت تھی۔
"اندرا دیوی نے اسی کو مانگا ہے"۔ پنڈت نے کہا۔
"نہیں مہاراج!" رشی کی ماں چلاتی ہوئی آگے آئی اور پنڈت اور اپنی بیٹی کے درمیان کھڑی ہو کر بولی۔ "یہ وہ لڑکی نہیں ہے جسے آپ ڈھونڈ رہے ہیں"۔
رشی اپنے دروازے کی طرف پیچھے ہٹنے لگی۔ ایک پنڈت نے آگے بڑھ کر اُس کا بازو پکڑ لیا۔ بڑے پنڈت نے پالکی آگے لانے کو کہا۔ پالکی آگے لا کر رکھ دی گئی۔

"یہ حکم دیوی کا بھی ہے، راجہ کا بھی"۔ بڑے پنڈت نے کہا۔ "اندرا دیوی نے جس کنواری کنیا کو مانگا ہے وہ جس گھر میں رہی اُس گھر پر تمام دیوی دیوتاؤں کا قہر نازل ہوگا۔ اُسے جس ماں نے جنم دیا ہے وہ ماں کوڑھی ہو کر آبادیوں سے دھتکاری

جائے گی..... یہ بیٹی تمہاری نہیں یہ دیوی کی امانت ہے۔ ہم اسے لے جا رہے ہیں"۔

رشی کو گھسیٹ کر پالکی میں دھکیلا جا رہا تھا اور وہ روتی چلاتی اور آزاد ہونے کی کوشش کرتی تھی۔ پنڈتوں کے ساتھ آئے ہوئے ایک آدمی نے رومال جتنا ایک کپڑا رشی کی ناک اور منہ پر رکھ کر ہاتھ دبایا۔ رشی تڑپی اور فوراً ہی اس کا جسم ساکن ہوگیا۔ اس کی آنکھیں بند ہوگئیں اور اس کا سر ڈولنے لگا۔ اُسے پالکی میں ڈال دیا گیا۔ پھر جس طرح یہ جلوس سنکھ اور گھنٹیاں بجاتا آیا تھا۔ اسی طرح واپس چلا گیا۔
محلے کے لوگ رشی کے ماں باپ کو مبارک دینے لگے کہ دیوی نے اُن کی بیٹی کی قربانی قبول کی ہے۔ مذہب کے کٹر پیروکار رشی کے ماں باپ کو رشک کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے مگر جن کی اتنی پیاری بیٹی کو پنڈت ذبح کرنے کے لئے لے گئے تھے، ان کے دلوں کا حال کوئی نہیں دیکھ رہا تھا۔ ان کے کانوں میں ابھی اُس بیٹی کی چیخیں گونج رہی تھیں جیسے چند ہی دن پہلے اس کے خاوند کے ساتھ زندہ جلا دیا گیا تھا۔

شام کے بعد عمران بلاذری گھر آیا تو تھوڑی ہی دیر بعد جگ موہن آگیا۔ وہ زار و قطار رو رہا تھا۔ اُس نے بتایا کہ رشی کو پنڈت لے گئے ہیں۔ بلاذری کو تو جیسے سکتہ ہوگیا ہو۔ جگ موہن نے بتایا کہ پنڈتوں کو کسی نے بتایا ہوگا کہ رشی مندر میں نہیں جاتی اور یہی لڑکی قربانی کے لیے موزوں ہے۔

"تم معلوم کر سکتے ہو کہ اسے کہاں رکھیں گے؟" عمران بلاذری نے پوچھا۔
"اصل بات یہ ہے کہ اس کی جان کی قربانی کب دیں گے؟ ..... معلوم کر دو جگ موہن! میں اسے بچانے کی کوشش کروں گا"۔
"اُسے بڑے مندر میں ہی لے گئے ہوں گے"۔ جگ موہن نے کہا۔ "میں نے سنا ہے کہ انسان کی قربانی فوراً نہیں دی جاتی کہ کسی کو پکڑا اور اُسے مار ڈالا۔ اُسے بہت دن پنڈت اپنے پاس رکھتے ہیں۔ اُسے پاک کرتے ہیں تیار کرتے ہیں اور معلوم نہیں اس پر کیا عمل کرتے ہیں کہ وہ اپنی زبان سے کہنے لگتا ہے کہ مجھے دیوی

کے چرنوں میں قربان کر دو۔ ... میں معلوم کرنے کی کوشش کروں گا مگر تم اسے بچا نہیں سکو گے۔ اگر بچا لاؤ گے تو ہم اُسے اپنے گھر میں نہیں رکھ سکیں گے۔ اُسے پھر لے جائیں گے، اور ہمارے ساتھ تمہارے لیے بھی مصیبت آجائے گی" — وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ ذرا سنبھلا تو بولا۔ "میں اس ملک سے نکل جانا چاہتا ہوں۔ مجھے اپنے مذہب سے گھن آنے لگی ہے"۔

"تمہارے مذہب میں گھن کے سوا ہے ہی کیا؟" — عمران بلاذری نے کہا — "اپنی مذہبی کتابیں پڑھ کر دیکھ لو۔ بھگوت گیتا، رامائن اور مہابھارت پڑھو۔ یہ خبیث اور بربریت سے بھری پڑی ہیں۔ ان میں عہد شکنی اور دھوکہ دہی کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ دیویاں اور دیوتا جنسی اختلاط کرتے دکھائے گئے ہیں۔ ان کتابوں میں ایک سے ایک شرمناک بات لکھی ہے۔ عورتوں اور بچوں کے قتل کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ اگر تمہاری بہن کو فوراً قتل کر دیں تو زیادہ اچھا ہے۔ میں جانتا ہوں وہ جب تک زندہ رہے گی پنڈت اس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے"۔

جگت موہن کی آنکھیں ٹھہر گئیں۔ اُس کا چہرہ لال ہوتا چلا گیا۔

"تم اپنے پتھر کے خداؤں سے ڈرتے ہو" عمران بلاذری نے کہا — "تم ان کا سامنا کرنے سے گھبراتے ہو۔ میں مسلمان ہوں۔ مجھے ان کا کوئی ڈر نہیں۔ میں تمہاری دیویوں اور دیوتاؤں سے تمہاری بہن چھین لاؤں گا۔ اگر میں کامیاب ہو گیا تو تمہاری بہن بھی اور تم بھی میرے ساتھ چلو گے"۔

"کہاں؟"

"یہ اُس وقت بتاؤں گا" عمران بلاذری نے کہا — "لیکن تم دونوں کو میرا مذہب قبول کرنا پڑے گا"۔

"مجھے منظور ہے" — جگت موہن نے کہا — "میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تم ہم دونوں کو یہاں سے کہیں دور لے جاؤ تو ہم مسلمان ہو جائیں گے، اور رشی تمہاری بیوی ہو گی"۔

"لیکن میں رشی کو اس لالچ میں نہیں بچاؤں گا کہ اسے اپنی بیوی بناؤں گا" —

عمران بلاذری نے کہا — "میں تمہارے دیوتاؤں کو شکست دینا چاہتا ہوں۔ میں بھیڑیوں کے منہ سے شکار چھیننے کا تہیہ کر چکا ہوں۔ اس کی خاطر میں جان دینے کو تیار ہوں۔ میں تمہارے راجہ کو بتاؤں گا کہ پتھر کے خدا، مسلمان کے سچے خدا کے سامنے بے جان پتھر سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں ..... تم چلے جاؤ جگت موہن! آرام کی نیند سو جاؤ"۔

جگت موہن چلا گیا۔ عمران بلاذری کی جذباتی کیفیت آگ کی مانند تھی جیسے اس کے اندر آگ بھڑک اٹھی ہو۔ پہلے وہ غزنی کے دو جنگی قیدیوں کو فرار کرانے کی ترکیبیں سوچتا رہتا تھا۔ ان کے فرار کو وہ صرف اس لیے ضروری نہیں سمجھتا تھا کہ وہ قید سے نکل جائیں بلکہ اس لیے کہ راجہ جے پال ان کی خاطر و مدارات مہمانوں کی طرح کر رہا تھا۔ بلاذری کو ایک دو دنوں سے یہ خطرہ نظر آنے لگا تھا کہ ادریزی اور ملکی جو ان میں اور راج محل میں ایسی ایسی خوبصورت اور شوخ لڑکیاں ہیں جن میں سے ایک بھی ان دونوں کے کمرے میں داخل کر دی گئی تو دونوں اپنے ملک اور اپنے مذہب کو بھول جائیں گے اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ راجہ کی فوج کے ہو کے رہ جائیں گے اور غزنی کی فوج کے لیے خطرہ بن جائیں گے۔

عمران بلاذری ان کے فرار کے لیے پریشان ہو رہا تھا مگر اس کے ساتھ ہی رشی کا فرار بھی اس کے کندھوں پر آپڑا۔ وہ رشی کو دل میں بسا چکا تھا۔ اس طرح یہ اس کے لیے ذاتی جذبات کا مسئلہ بن گیا تھا مگر اس کے ساتھ ہی اسے اُس نے ایک چیلنج بنا لیا جیسے ہندوؤں کے دیوتاؤں نے مسلمان کے خدا کو للکارا ہو۔ اس طرح اسے اُس نے مذہب کا معاملہ بنا لیا تھا۔ وہ سوچ سوچ کر پریشان ہو گیا۔ وہ کمرے میں ٹہلتا رہا، سوچتا رہا، حتیٰ کہ اس کا دماغ تھک گیا۔

اس نے اُوپر دیکھا اور اس جذباتی کیفیت میں اسے ایسے لگا جیسے چھت میں ایک ستارہ چمکا ہو۔ اس کے ہاتھ دعا کے لیے اُٹھ گئے۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں، پھر آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اُس کی زبان اپنے آپ چل پڑی۔

"خدائے ذوالجلال! میں جو کچھ کر رہا ہوں، تیرے نام پر کر رہا ہوں۔ مجھے ہمت اور استقلال عطا فرما کہ میں کفر کی اس دھرتی پر ثابت کر سکوں کہ تیرا نام برحق ہے، اور تیری

ذات ہی ہے۔ میں کوئی گناہ نہیں کر رہا میری نیت میں گناہ ہوتا تو فاطمہ مجھ سے ناراض ہو کر نہ جاتی۔ تو دیکھ رہا تھا کہ اس دلکش لڑکی نے مجھے کیسے کڑے امتحان میں ڈال دیا تھا اور میں کس طرح اس میں پورا اترا تھا۔ مجھے روشنی دکھا میرے پروردگار! میری مدد کر۔ اگر میں اپنی ذات کے لیے کچھ کر رہا ہوں تو میری جان لے لے۔ مجھے گناہ کے لیے زندہ نہ رہنے دے۔ اپنے نام کی لاج رکھ لے خدائے ذوالجلال!

اُس نے منہ پر ہاتھ پھیرے تو اس کا ذہن خالی ہو گیا۔ وہ سر جھکا کر کھڑا رہا۔ اچانک اس کے ذہن میں بگولا سا اُٹھا۔ وہ بہت تیزی سے کوٹھڑی کے بکس تک گیا۔ بکس کھولا اور اس میں سے خنجر نکال کر اپنے کُرتے کے نیچے ناف میں اُڑس لیا۔ وہ اُٹھا اور باہر نکل گیا۔

اُس کی چال ایسی تھی جیسے اس کے قدم خود بخود اُٹھ رہے ہوں اور اُس کا دماغ کسی اور طرف جا رہا ہو۔ وہ گلیوں کے موڑ مڑتا گیا، حتیٰ کہ گلیاں ختم ہو گئیں۔ وہ درختوں کے درمیان سے گزر رہا تھا۔ وہ رُک گیا۔ اُس نے پگڑی کھول کر اس طرح باندھ لی کہ اس کا چہرہ بھی ڈھانپا گیا۔ وہ چل پڑا۔ اندھیرے میں بھی اُسے مندر دکھائی دے رہا تھا۔ وہ جاسوس تھا۔ اُسے شہر کے کونے کھدرے سے واقفیت تھی۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ بڑا پنڈت مندر کے ساتھ رہتا ہے۔ رشی وہیں ہو سکتی تھی۔

عمران جلدی رُک گیا اور کچھ سوچا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ رشی اس کے ہاتھ آ گئی تو وہ واپس اپنے گھر نہیں جائے گا، وہیں سے پشاور کا رُخ کرے گا۔۔۔ اُس نے ایک ہی قدم اٹھایا تھا کہ یوں رُک گیا جیسے کسی غیر مرئی انسان نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر روک لیا ہو۔ اسے نظام اوریزی اور قاسم بلمی کا خیال آ گیا اور اس کے ساتھ ہی یہ سوچ بھی بیدار ہو گئی کہ رشی کو بھگا لے جانا اس کی اپنی ذات کے لیے ہوگا۔ اُس کا اصل فرض ان دونوں قیدیوں کو رہا کرانا تھا۔

وہ پریشان ہو گیا اور آہستہ آہستہ مندر کی طرف بڑھنے لگا۔ اُسے یہ احساس ہو گیا کہ اُسے احتیاط کرنی ہے۔ وہ دبے پاؤں چلتا مندر تک پہنچ گیا۔ اندر اندھیرا تھا۔ وہ گھوم کر اُدھر گیا جدھر پنڈت کا گھر تھا۔ یہ مندر ہی کا حصہ تھا۔ وہ دروازے سے چند قدم

دُور تھا کہ دروازہ کھلا۔ کمرے کی روشنی باہر آئی، اور اس روشنی میں اُسے ایک عورت اندر سے نکلتی دکھائی دی۔ پنڈت بھی باہر آیا۔ بلاذری بیٹھ گیا۔ وہاں درخت اور پودے تھے۔ وہ پاؤں پر سرکتا آگے ہوا اور ایک پودے کی اوٹ میں آ گیا۔ اس نے عورت کو پہچان لیا۔ وہ فاطمہ تھی۔

"اب اطمینان سے جاؤ" پنڈت نے اُسے بازوؤں میں لیتے ہوئے کہا۔ "تمہارا کام ہو گیا ہے۔"

"اگر میں اُسے یہاں دیکھ لیتی تو مجھے اطمینان ہو جاتا کہ میرا کام ہو گیا ہے۔" فاطمہ نے کہا۔ "دیکھیں، میں آپ کی خواہش کے مطابق آپ کو کیسی قیمت دے رہی ہوں۔"

"۔۔۔ تو تم پھر اُسی وہم میں پڑ گئی ہو۔" پنڈت نے کہا۔ "اُسے میں یہاں نہیں رکھ سکتا تھا۔ اُسے شیلوں کے مندر میں پہنچا دیا ہے۔ اگر تم یہ چاہتی ہو کہ اُسے کل ہی ختم کر دیا جائے تو ایسا نہیں ہو سکے گا۔ ہمارا ایک خاص طریقہ ہے۔ یہ قربانی پہلی بار نہیں دی جا رہی۔ میں اپنی زندگی میں ایسی چار لڑکیوں اور دو بچوں کی قربانی دے چکا ہوں۔ اس لڑکی کو ہم کم از کم ایک چاند شیلوں کے مندر میں رکھیں گے۔ اسے اس طرح تیار کریں گے کہ اس کی جوانی ہی بدل جائے گی۔ پھر یہ اپنی زبان سے کہے گی کہ مجھے قربان کر دو۔ یہ اپنی زبان سے قربانی کا مقصد بیان کرے گی۔۔۔ میں نے تمہارا مقصد پورا کر دیا ہے۔ وہ

فاطمہ کے پیچھے چلا گیا۔ آگے درخت اور جھاڑیاں تھیں۔ عمران فاطمہ کی دلیری پر حیران ہو رہا تھا۔ اُس کے غصے کا یہ عالم تھا کہ وہ اُسے قتل کرنے پر تیار ہو گیا لیکن اُس نے اپنے آپ پر قابو پا لیا۔ فاطمہ بہت تیز چلی جا رہی تھی اور عمران بلاذری اسی تیزی سے سوچ رہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ کیا سلوک کرے۔ وہ اس کے قریب ہو گیا۔ فاطمہ رک گئی۔

"تمہارا یہ مقصد پورا نہیں ہو گا فاطمہ!" عمران نے اُسے کہا۔ "تم نے اس لڑکی کو اپنے راستے سے ہٹانے کا جو اچھا طریقہ استعمال کیا ہے اس کی سزا تم اسی دنیا میں بھگتو گی۔"

"اوہ ...!" فاطمہ گھبرا گئی اور بولی۔ "میں ڈر گئی تھی کہ کوئی اور ہے۔ تم کہاں سے آ رہے ہو؟"

"جہاں سے تم آ رہی ہو۔" عمران نے کہا۔ "میں چاہوں تو تمہیں قتل کر سکتا ہوں۔ تمہیں غائب کر سکتا ہوں۔ تمہارے خاوند کو بتا سکتا ہوں کہ تمہاری کرتوت کیا ہے۔ کیا تم اس طرح مجھ پر قبضہ کر سکو گی؟"

فاطمہ تو جیسے مر ہی گئی تھی۔

"بولو۔ جواب دو۔" عمران بلاذری نے گرج کر کہا۔

"ایک ہندو لڑکی کے لیے تم اتنا پریشان ہو رہے ہو؟" فاطمہ نے مرے مرے لہجے میں کہا۔

"میری بات غور سے سن لو۔" عمران نے کہا۔ "پھر کبھی تم اس مندر میں آئیں تو زندہ واپس نہیں جا سکو گی۔ میرے گھر میں آؤ گی تو تمہاری لاش جھاڑیوں میں ملے گی۔ میں تمہیں گھر سے باہر نہ دیکھوں۔ اگر تم نے اس پنڈت کو یا کسی اور کو بتا دیا کہ میں تمہیں یہاں ملا تھا تو تمہارا انجام بڑا ہی بھیانک ہو گا۔"

"میں نے جو کچھ کیا ہے تمہیں حاصل کرنے کے لیے کیا ہے۔" فاطمہ اس کے پاؤں میں گر پڑی۔ "میں نے تمہاری ذات میں اپنی نجات دیکھی تھی۔ میرا خیال تھا کہ ہندو لڑکی کو تم نے اپنی آخرت کا زادِ راہ بنا رکھا ہے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم اس کے

اتنے دیوانے ہو۔"

"یہاں سے غائب ہو جاؤ۔"

"مجھے بخش دو عمران!" فاطمہ نے روتے ہوئے کہا۔ "ایک ہندو لڑکی کی خاطر ایک مظلوم مسلمان لڑکی کو نہ دھتکارو۔"

"تم مظلوم نہیں ظالم ہو۔" عمران بلاذری نے اُسے اتنی زور سے ٹھوکر ماری کہ وہ پیچھے کو گری۔ "میں تمہیں بخش سکتا ہوں، تمہیں خدا نہیں بخشے گا۔ تم تڑپ تڑپ کر مرو گی۔ عمر کا پل پل سزا بھگتو گی۔ ساتوں کو چین کی نیند نہیں سو سکو گی۔"

عمران اُسے زمین پر بیٹھا چھوڑ کر چل پڑا۔ تھوڑی ہی دور گیا ہو گا کہ اسے فاطمہ کی چیخ سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی فاطمہ نے اُسے پکارا۔ "عمران!"

عمران بلاذری رک گیا۔ فاطمہ دوڑی آ رہی تھی۔ عمران کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔ اُس کا جسم کانپ رہا تھا۔ بولی۔ "مجھے گھر پہنچا دو۔ ڈر آتا ہے۔ میں نے بلا کچھ دیکھا ہے۔ کوئی چیز تھی۔ روشنی ہوئی تھی۔ اس میں مجھے رشی نظر آئی اور روشنی کے ساتھ ہی غائب ہو گئی۔ تم نے روشنی دیکھی تھی؟ بجلی چمکی تھی!"

"ایک عورت کو اس تنہائی میں ڈراتے مجھے شرم آتی ہے۔" عمران نے کہا۔ "لیکن یہ جان لو کہ بے گناہ لڑکی کا خون تم پر اسی طرح بجلی کی طرح چمکتا اور کڑکتا رہے گا۔"

"مجھے میرے گھر پہنچا دو۔" فاطمہ نے خوف سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں اکیلی نہیں پہنچ سکوں گی۔ مجھ پر رحم کرو عمران!"

عمران اُس کے ساتھ چل پڑا۔ فاطمہ نے اُس کا ایک بازو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ وہ ڈرے ہوئے بچے کی طرح اِدھر اُدھر دیکھتی اور چلتی جا رہی تھی۔ تمام راستہ عمران خاموش رہا۔ فاطمہ ہچکیاں لیتی، چونکتی اور کانپتی رہی۔ اس کا گھر آ گیا تو عمران رک گیا۔

"میں کیا کروں عمران؟" فاطمہ نے اس طرح پوچھا جیسے سخ ٹھنڈ سے اس کے دانت بج رہے ہوں۔

"گناہ کا کفارہ ادا کرو۔" عمران نے کہا۔

"کیسے؟"

"جب ارادہ کرو گی تو مجھے بتانا۔" عمران نے کہا۔ "میں کوئی طریقہ بتا دوں گا۔ اب چلی جاؤ۔"

عمران اپنے گھر کو چل پڑا۔

اگلے روز عمران بلاذری، راج محل میں گیا اور حسب معمول نظام ادریزی اور قاسم ملغی کو ناشتہ دیا۔ اُسے پتہ چلا کہ راجہ جے پال آگیا ہے۔ تھوڑی ہی دیر بعد راجہ نے دونوں قیدیوں کو بلا لیا۔ پچھلے باب میں سنایا جا چکا ہے کہ راجہ کے ساتھ ان کی کیا باتیں ہوئیں۔ انہوں نے عمران بلاذری کی ہدایت کے مطابق راجہ جے پال کو محمود غزنوی کی جنگی چالوں کے متعلق بے بنیاد باتیں بتائیں اور یہ بھی کہا کہ وہ راجہ کی فوج کو عملی طور پر یہ چالیں اور ان کا توڑ سکھا سکیں گے۔ انہوں نے شرط پیش کی کہ انہیں قید سے رہائی نہ دی جائے، صرف سنتری ہٹا دیئے جائیں تاکہ قید کا تصور ختم ہو جائے۔ انہوں نے راجہ پر ایسا اعتماد پیدا کر لیا کہ راجہ نے اُسی وقت ان کے کمرے پر پہرہ دینے والے سنتریوں کو ہٹا دینے کا حکم دے دیا۔

نظام ادریزی اور قاسم ملغی واپس اپنے کمرے میں آ گئے تو انہوں نے عمران بلاذری کو خبر سنائی کہ راجہ جے پال کو اطلاع ملی ہے کہ سلطان سبکتگین فوت ہو گیا ہے اور اب اس کا بیٹا محمود سلطان ہے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ راجہ کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت جلد غزنی پر حملہ کرے گا اور وہ خوش ہے کہ سبکتگین مر گیا ہے۔ اسے توقع ہے کہ وہ محمود کو آسانی سے شکست دے سکے گا۔

اس خبر نے تینوں کو پریشان کر دیا۔ وہ سوچنے لگے کہ سبکتگین کی وفات کا غزنی کی فوجی قیادت پر کیا اثر پڑے گا۔ ادریزی اور ملغی نے محمود کو ایک یا دو دستوں کی کمان کرتے اور لڑتے دیکھا تھا۔ اس حد تک وہ مطمئن تھے لیکن انہیں معلوم نہیں تھا کہ محمود سپہ سالاری کی کتنی کچھ قابلیت رکھتا ہے، اور وہ اپنے باپ کی طرح کم فوج سے اتنے زیادہ لشکر کو شکست دے سکے گا یا نہیں۔ یہ ضروری ہو گیا تھا کہ قید سے فوراً فرار ہو کر غزنی پہنچ جاتے اور سلطان محمود کو راجہ جے پال کے عزائم اور جنگی طاقت سے آگاہ کیا جاتے۔

عمران بلاذری نے انہیں رتی کے متعلق بتا دیا کہ یہ ہندو لڑکی اُسے دل و جان سے چاہتی ہے اور وہ اسلام قبول کرنے کو تیار تھی مگر پنڈتوں نے اُسے انسانی قربانی کے لیے منتخب کر لیا ہے۔ بلاذری نے انہیں یہ بھی بتایا کہ وہ ان دونوں کو لاہور سے نکال دے گا لیکن اس لڑکی کو پنڈتوں کے چنگل سے ضرور آزاد کرائے گا۔ وہ اسے بھی اپنا فرض اور چیلنج سمجھتا تھا۔

کمرے کے سنتری ہٹائے جا چکے تھے۔ عمران بلاذری نے اُسی رات انہیں فرار کرانے کا ارادہ کر لیا۔

عمران ان کے لیے رات کا کھانا معمول سے کچھ دیر بعد لے گیا۔ کچھ وقت ان کے پاس بیٹھا رہا، پھر برتن اٹھائے، راج محل کے محافظوں وغیرہ کے سامنے گزرا۔ کہیں رکا، کہیں گپ شپ لگائی اور سب کے سامنے یوں باہر نکلا جیسے اپنے گھر کو چلا گیا ہو، مگر وہ صرف باہر نکلا تھا، گھر نہیں گیا تھا۔ وہ اُس طرف چلا گیا جدھر باغ تھا۔ وہاں رات کو کوئی نہیں ہوتا تھا۔ باغ اور راج محل کے احاطے کے درمیان دیوار تھی جو اتنی بلند تھی کہ اکیلا آدمی اس میں پھلانگ سکتا تھا۔ دن کے وقت عمران نے دونوں قیدیوں کو کمرے کی کھڑکی کی یہ دیوار دکھائی تھی۔ اس نے ایک درخت بھی انہیں دکھایا تھا جو دیوار سے باہر تھا۔ اس کی ٹہنیاں دیوار پر آئی ہوئی تھیں۔

مقرر کیے ہوئے وقت کے مطابق نظام ادریزی اور ملغی اپنے کمرے سے نکلے اور چھپتے چھپاتے کمرے سے دُور چلے گئے۔ راج محل میں تو جیسے رات آئی ہی نہیں تھی۔ ملازم بھاگ دوڑ رہے تھے۔ محل کے اندر رقص ہو رہا تھا۔ سازوں کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ کئی سجائی گھوڑا گاڑیاں آ رہی تھیں۔ شاید دوسری ریاستوں کے راجے بھی آئے ہوئے تھے۔ جشن کا سا سماں تھا۔ باہر بھی جگہ جگہ بڑے شعلوں والی مشعلیں جل رہی تھیں۔ ادریزی اور ملغی کے لیے یہ مشعلیں مشکل پیدا کر رہی تھیں۔ وہ دیواروں کی اوٹ میں جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ احاطے کی دیوار کی وہ جگہ ابھی دُور تھی جہاں انہیں پہنچنا تھا۔ وہ جدھر جاتے کوئی نہ کوئی آدمی سامنے سے گزرتا نظر آ جاتا۔

وہ اُس مقام تک پہنچ گئے۔ وہاں تک کسی مشعل کی روشنی نہیں پہنچتی تھی۔ عمران بلاذری کی ہدایت کے مطابق ادریسی نے ایک پتھر اٹھا کر دیوار پر آہستہ آہستہ دو چار مرتبہ مارا۔ اس کے فوراً بعد دیوار سے ایک رسّہ آیا۔ دونوں قیدی باری باری رسّے سے اوپر چڑھ گئے۔

"رسّہ باہر پھینک دو" — انہیں نیچے سے عمران بلاذری کی آواز سنائی دی — "اور اس درخت سے نیچے آجاؤ۔"

دونوں نے باری باری درخت کی شاخیں پکڑیں اور جھولتے ہوئے دیوار سے پرے چلے گئے۔ انہوں نے ٹہنی کو پکڑا اور نیچے اُتر گئے۔ انہوں نے رسّہ اٹھا کر پھینکا۔ عمران اُن کے لیے لمبے چغے لے آیا تھا جن میں وہ کندھوں سے ٹخنوں تک ڈھانپے گئے۔ راج محل کے باہر کی دُنیا سو گئی تھی۔ تینوں اطمینان سے خطرے کے علاقے سے دُور چلے گئے اور عمران انہیں اپنے گھر لے گیا۔

"یہاں سے ہمیں جلدی نکل جانا چاہیئے" — ادریسی نے کہا — "گھوڑوں کا انتظام ہو سکتا ہے؟"

"تم یہاں سے اتنی جلدی نہیں جاسکو گے" — عمران نے کہا — "صبح جب راجہ جے پال کو تمہارے فرار کی اطلاع ملے گی تو وہ تمہارے تعاقب کا حکم دے گا۔ ہو سکتا ہے وہ کچھ بھی نہ کرے۔ وہ بہت مصروف ہے۔ میری نظریں اور میرے کان اُسی پر لگے رہتے ہیں۔ غزنی سے یہ جو دوسری شکست کھا کر آیا ہے، اس نے اسے باؤلا کر رکھا ہے۔ ابھی تک یہ فوج کی کمی پوری نہیں کر سکا۔ پوری قوم اس کی مدد کر رہی ہے لیکن یہ صرف مالی مدد ہے۔ دوسرے راجے مہاراجے اسے اپنی فوجیں دینے سے ہچکچا رہے ہیں۔ اس نے ساز و سامان تو بہت جمع کر لیا ہے لیکن ضرورت فوج کی ہے۔ یہاں کا دستور یہ ہے کہ کوئی راجہ دو بار شکست کھا جائے تو اُسے اپنے جانشین کے حق میں راج سے دستبردار ہونا پڑتا ہے۔ راجہ جے پال کے دو حملے ناکام ہو چکے ہیں۔ اس کا جانشین اس کا بیٹا ہے جس نے اسے تیسرے حملے کی اجازت دے دی ہے لہٰذا اب راجہ جے پال ہر قیمت پر فتح حاصل کرنے کے انتظامات کر رہا ہے۔ ہو سکتا ہے اس مصروفیت

میں وہ تمہارے فرار کی پرواہ ہی نہ کرے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ شہر کی تلاشی اور تمہارے تعاقب کا حکم دے دے۔ مجھے کل اُس کا ردِ عمل معلوم کرنا ہے۔ میں تمہیں اس کے مطابق یہاں سے نکالوں گا یا کچھ دن یہیں چھپائے رکھوں گا۔"

نظام اور ادریسی اور قاسم بلخی جاسوس نہیں تھے، فوج کے عہدیدار تھے۔ میدان کے مجاہد تھے اور شب خون مارنے کی مہارت رکھتے تھے۔ بلاذری تجربہ کار جاسوس تھا، اس لیے اس کی سوچ ان دونوں سے مختلف تھی۔ اُس نے انہیں کہا — "اگر تمہیں یہاں زیادہ دن رکنا پڑا اور راجہ جے پال نے کوچ میں جلدی کی تو ہم تینوں اس کے کسی نہ کسی ذخیرے کو آگ لگا دیں گے۔"

"کیا یہ ممکن ہو سکے گا؟"

"کیا ممکن نہیں ہو سکتا؟" — عمران نے جواب دیا — "یہ کام اس راجہ کے دوسرے حملے سے پہلے ہو سکتا تھا مگر یہاں اپنے جو آدمی تھے وہ آپس میں لڑ مرے۔ ان کی لاشوں کے ساتھ ایک لڑکی کی بھی لاش ملی تھی۔ ان کی آپس کی لڑائی کی وجہ شاید یہی تھی۔ ہم اتنے ناکام ہوئے کہ غزنی بروقت اطلاع نہ بھیج سکے کہ حملہ آ رہا ہے۔"

"تم بھی تو ایک لڑکی کے چکر میں پڑ گئے ہو۔"

"لیکن میں اپنے فرض کو اس چکر میں نہیں ڈالوں گا" — عمران بلاذری نے کہا — "میں ایک لڑکی پر غزنی کی عظمت کو قربان نہیں کروں گا۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ میں تم دونوں کو اس لڑکی پر قربان کر دوں لیکن یہ انتظام ضرور کروں گا کہ راجہ جے پال کا لشکر غزنی پر حملے کے لیے جائے تو غزنی سے دُور اور پشاور کے قریب غزنی کی فوج راجہ کا استقبال کرے۔ میرے پاس خبر بھیجنے کا انتظام موجود ہے۔"

"سوچنے والی بات یہ ہے کہ سلطان محمود پوری فوج کی کمان کر سکے گا یا نہیں" — قاسم بلخی نے کہا — "اُسے بہت جلدی خبر مل جانی چاہیئے۔ وہ پڑوس کی مسلمان ریاستوں کے جھنجھٹ میں نہ پڑا ہوا ہو۔"

"غزنی کے حالات کا ہمیں کوئی علم نہیں" — عمران بلاذری نے کہا۔

سلطنت غزنی کے لیے مخدوش تھے سبکتگین کی وفات نے اُن مسلمان حکمرانوں کو پھر سے بیدار کر دیا تھا جنہیں سبکتگین نے دبا لیا تھا۔ اُن کی نظریں غزنی پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ ایک بار پھر خانہ جنگی کی تیاریاں کر رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ محمود میں وہ صلاحیت نہیں جو اُس کے باپ میں تھی، مگر انہیں معلوم نہیں تھا کہ سبکتگین کل سے پہلے سوچ بچار زیادہ کرتا تھا۔ اپنے پڑوس کے مسلمان حکمرانوں سے وہ لڑائی کی بجائے دوستی چاہتا تھا۔ محمود سوچ بچار میں تیز اور عمل میں تیز تر تھا۔ وہ جوانی کی عمر میں تھا۔ باتوں میں وقت ضائع نہیں کرتا تھا۔

غزنی کی سلطنت کی کیفیت یہ تھی کہ کاشغر میں ایلخانیوں کی حکومت تھی۔ یہ لوگ مسلمان تھے۔ دوسری طرف بخارا میں سامانی حکمران تھے۔ یہ بھی مسلمان تھے۔ تیسری طرف آل زیار کی ریاست تھی، اور چوتھی طرف غوریوں کی بادشاہی تھی۔ سلطنت غزنی ان میں گھری ہوئی تھی۔ ان تمام ریاستوں کی جغرافیائی پوزیشن ایسی تھی جیسے ایک مملکت کے صوبے ہوں مگر سب کی نظریں غزنی پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ متحد نہیں تھے۔ وہ اسلام کے رشتے کو بھی بھلا بیٹھے تھے۔

ایک روز اُسے اطلاع ملی کہ بخارا کے بادشاہ نے خراسان کا علاقہ اپنے ایک امیر توزدن بیگ کو دے دیا ہے۔ خراسان سلطنت غزنی کا علاقہ تھا۔ سلطان محمود نے شاہ بخارا کو پیغام بھیجا کہ ہم تو اتحادی تھے، آپ کی اس کارروائی نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ ہم دوستی ختم کر دیں۔ آپ خراسان سے ہاتھ اُٹھا لیں تاکہ ہمارا اتحاد برقرار رہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہندوستان کے مہاراجوں کی متحدہ فوج ہم پر حملے کے لیے آ رہی ہے۔

بخارا سے ایسا جواب آیا جیسے سلطان محمود غزنوی کی کوئی حیثیت ہی نہ ہو۔ لکھا گیا کہ بلخ، ترمز اور ہرات کے علاقے آپ کے پاس ہیں۔ ہم باقی علاقے اُن امراء میں تقسیم کر رہے ہیں جو ہمارے وفادار ہیں۔ سلطان محمود نے صلح صفائی کی ایک اور کوشش یوں کی کہ اپنے ایک حاکم ابوالحسن جموری کو بیش قیمت تحائف دے کر بخارا بھیجا۔ اس نے ان الفاظ کا پیغام لکھا کہ میں نے یقین نہیں کیا کہ بخارا کے دربار سے مجھے یہ توہین آمیز جواب ملا ہے، نہ ہی میں یہ سمجھتا ہوں کہ مجھے خاندانِ سامانی کی دوستی

ترک کرنے پر مجبور کیا گیا ہے۔

اس پیغام کا کوئی جواب نہ آیا اور سلطان محمود کا ایلچی ابوالحسن جموری بھی واپس نہ آیا۔ تھوڑے عرصے بعد سلطان محمود کے ایک جاسوس نے اُسے بتایا کہ ابوالحسن جموری کو بخارا کا وزیر بنا دیا گیا ہے۔ سلطان محمود نے یہ خبر سنتے ہی اپنے منتخب دستوں کو خراسان کے مرکزی شہر نیشاپور کی طرف پیش قدمی کا حکم دے دیا۔ یہ بہت ہی تیز پیش قدمی تھی۔ نیشاپور کے امیر توزدن بیگ کو اُس وقت پتہ چلا جب سلطان محمود کی فوج شہر کے مضافات میں پہنچ چکی تھی۔ توزدن بیگ بغیر مقابلے کے شہر سے نکل گیا اور بخارا جا کر شاہ منصور کو اطلاع دی۔ شاہ منصور سلطان محمود کے مقابلے کے لیے آیا۔

توزدن بیگ نے حکمرانی کا ذائقہ چکھ لیا تھا۔ اُس نے قوم کے ایک غدار امیر فائق کو جال میں پھانس لیا۔ یہ وہی امیر فائق ہے جو سلطان سبکتگین کی زندگی میں بھی خانہ جنگی کا باعث بنا تھا۔ آخر اسے بھاگنا پڑا تھا۔ اب وہ پھر توزدن بیگ کے ساتھ میدان میں آ گیا۔ توزدن سازشی ذہن کا آدمی تھا۔ اُس نے امیر فائق کو ساتھ ملا کر اپنے محسن شاہ بخارا کو گرفتار کر لیا اور اُس کی آنکھیں نکال دیں۔ شاہ بخارا کا چھوٹا بھائی عبدالملک ابھی لڑکپن کی عمر میں تھا۔ توزدن اور فائق نے اُسے سامانی گدی پر بٹھا لیا۔

یہ لوگ جو بظاہر سلطان محمود کے خلاف متحد تھے، اندر سے آپس میں بھی پھٹے ہوئے تھے۔ محمود غزنوی نے ان کی فوج کو اپنی پسند کے میدان میں گھسیٹ لیا۔ غداروں نے مقابلہ کرنے کی بہت کوشش کی لیکن سلطان محمود کے عتاب کے آگے نہ ٹھہر سکے۔ توزدن بیگ ایسا بھاگا کہ پھر اُس کا کہیں پتہ نہ چلا۔ امیر فائق ایسا بیمار پڑا کہ چند دنوں بعد مر گیا۔

کاشغر کا حکمران ایلک خان تھا۔ اُس نے یہ بھی دیکھنے کی ضرورت محسوس نہ کی کہ جنگی اور سیاسی حالات کیا ہیں۔ وہ یہی جان سکا کہ خانہ جنگی ہو رہی ہے جس سے اُسے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ وہ آگے بڑھا اور شاہ بخارا کے چھوٹے بھائی عبدالملک کو قتل کر ڈالا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سامانی خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔ عبدالملک کے قتل سے ایلک خان کوئی فائدہ نہ اٹھا سکا کیونکہ سلطان محمود قہر اور عتاب بن کے سب پر چھا گیا تھا۔ اُس نے بلخ اور

خراسان کو سلطنتِ غزنی میں شامل کر لیا۔

اس خانہ جنگی کی روئیداد اتنی مختصر نہیں جتنی سنائی گئی ہے۔ یہ داستان بڑی ہی طویل اور بڑی ہی افسوسناک بلکہ شرمناک ہے۔ سلطان محمود کی اُس فوج کو خاصا جانی نقصان پہنچا جو وہ ہندوستان کے مہاراجوں کا حملہ روکنے اور جوابی حملہ کرنے کے لیے تیار کر رہا تھا۔ اُس کے خلاف جن فوجوں کو لڑایا گیا وہ بھی مسلمان فوجیں تھیں جن میں اتحاد ہوتا تو آج ہندوستان کی تاریخ مختلف ہوتی جو غدار اور باغی امرا بھاگ گئے تھے، اُن کے گھروں سے یہودی، عیسائی اور ہندو لڑکیاں برآمد ہوئیں۔ وہاں جو لوگ پکڑے گئے، انہوں نے بتایا کہ ان حکمرانوں اور امرا کو غیر مسلموں سے مدد اور شہ ملتی تھی۔ ہندوستان سے ہندو لڑکیاں قرامطی فرقے کے سربراہ بھیجا کرتے تھے۔ یہ فرقہ اپنے آپ کو مسلمان کہلاتا تھا مگر اس کے عقیدے غیر اسلامی تھے۔ یہ فرقہ عیسائیوں کی تخلیق تھا۔ یہی عیسائی سلطان صلاح الدین ایوبی کے دور میں صلیبی کہلانے لگے تھے۔

راجہ جے پال کا جاسوسی نظام نہ ہونے کے برابر تھا۔ اُسے صرف یہ اطلاع ملی کہ سبکتگین فوت ہو گیا ہے۔ غزنی کے دیگر حالات کا اُسے علم نہیں تھا۔ اگر وہ اُس وقت حملہ کر دیتا جب سلطان محمود خانہ جنگی میں اُلجھا ہوا تھا تو وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتا تھا اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ سلطان محمود کے دشمن جے پال کی مدد کرتے۔ یہ اللہ کا کرم تھا کہ اس دشمن کی آنکھیں اور کان بند رہے۔

اس کے مقابلے میں راجہ جے پال کی سب سے بڑی چھاؤنی لاہور میں سلطان محمود غزنوی کے جاسوس بیدار اور سرگرم تھے۔ عمران سات کو غزنی کے دو قیدیوں — نظام اور یزی اور قاسم بلخی — کو اپنے گھر لے گیا تھا۔ اگلی صبح وہ حسبِ معمول راج محل کے احاطے کے اُس کمرے میں جہاں یہ دونوں قیدی رہتے تھے، ناشتہ لے کر گیا اور کمرہ خالی دیکھ کر دروازے میں بیٹھ گیا۔ اُس نے تین چار ملازموں سے پوچھا کہ قیدی کہاں چلے گئے ہیں؟ کسی کو معلوم نہ تھا۔ وہ دروازے کے سامنے ٹہلتا رہا۔ کچھ دیر بعد راجہ جے پال کا بلاوا آ گیا۔ عمران بلاذری نے بتایا کہ وہ ناشتہ لے کر آیا تو قیدی یہاں نہیں تھے۔

"مجھے مسلمانوں پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے تھا" — راجہ جے پال کو قیدیوں کے لاپتہ ہونے کی خبر ملی تو اُس نے کہا۔ "میں نے ان کے کمرے سے پہرہ ہٹا کر غلطی کی تھی ... وہ شہر میں نہیں ہو سکتے۔ تمام راستوں کی ناکہ بندی کر دو۔ پشاور کی طرف سوار دوڑا دو۔ پشاور سے غزنی کی طرف نکلنے والے راستوں کی ناکہ بندی کے لیے قاصد روانہ کر دو۔"

"مہاراج!" — اُس کے وزیر نے کہا — "دو قیدیوں کے فرار سے کیا نقصان ہو گیا ہے! آپ کی توجہ کوچ کی تیاری پر رہنی چاہیے۔ دو قیدیوں کے لیے اتنی زیادہ نفری کو اِدھر اُدھر دوڑا دینا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔"

"ان کے فرار کا مجھے کوئی افسوس نہیں" — راجہ نے کہا — "میں اُن سے جو کچھ معلوم کرنا چاہتا تھا وہ کر لیا ہے۔ میں انہیں سزا دینا چاہتا ہوں۔ انہیں پکڑنے کا بندوبست بہت جلدی کرو۔"

اس کے ساتھ ہی راجہ جے پال کو یہ خبر سنائی گئی کہ انسانی قربانی کے لیے ایک لڑکی منتخب کر لی گئی ہے اور تقریباً پندرہ دنوں بعد اس کی گردن کاٹ کر اس کے خون کا تلک راجہ کے ماتھے پر لگایا جائے گا۔ راجہ کو یہ بھی بتایا گیا کہ اب وہ جب چاہے غزنی پر حملے کے لیے کوچ کر سکتا ہے۔ فتح اُسی کی ہو گی۔

"ہم بہت جلد کوچ کریں گے" — راجہ نے کہا۔

شام کو جب عمران اپنے گھر آیا تو وہ مطمئن اور خوش تھا۔ اس پر کسی نے شک نہیں کیا تھا۔ اور یزی اور بلخی اُس کے پیچھے پڑ گئے کہ وہ انہیں جلدی یہاں سے نکالے۔ عمران نے انہیں بتایا کہ اب وہ کئی دنوں تک اس گھر سے نہیں نکل سکیں گے کیونکہ شہر کے اردگرد ناکہ بندی ہو گئی ہے۔

دروازے پر مخصوص قسم کی دستک ہوئی۔ عمران بلاذری نے مسکرا کر کہا۔ "دوست آئے ہیں۔ کوئی خبر لائے ہوں گے" — اس نے جا کر ڈیوڑھی کا دروازہ کھولا۔ دو آدمی اندر آئے۔ عمران نے دروازہ بند کر کے زنجیر چڑھا دی۔ ان دونوں کو وہ اور یزی اور بلخی کے کمرے میں لے گیا اور تعارف کرایا۔ یہ دونوں آنئی پنجاب کے رہنے والے تھے۔

انہوں نے بتایا کہ راجہ جے پال بہت جلد کوچ کر رہا ہے۔ اب دو کام کرنے ہیں۔ ایک یہ کہ کسی کو غزنی روانہ کرنا ہے جو وہاں راجہ جے پال کے کوچ کی قبل از وقت اطلاع پہنچا دے، دوسرا کام یہ ہے کہ شہر سے باہر تمام فوجوں کی رسد خیمے اور بیل گاڑیاں جمع ہیں۔ آج اس ذخیرے میں بہت زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ اسے آگ لگانی ہے۔

"اس کا کیا انتظام ہے؟" — عمران نے پوچھا — "لاہور میں ایسے انتظام کی کبھی بات نہیں ہوئی۔"

"اس سے پہلے لاہور والوں نے کیا کارنامہ کر دکھایا تھا؟" — ایک جاسوس نے کہا — "ایک ہندو لڑکی کے پیچھے آپس میں لڑ مرے تھے..... اب بھٹنڈہ والوں نے انتظام کیا ہے۔ یہاں کے آدمیوں کو بتانا ضروری ہے۔"

بھٹنڈہ راجہ جے پال کی راجدھانی تھی اس لیے غزنی کے زیادہ تر جاسوس وہیں رہتے تھے جب سے راجہ جے پال نے غزنی پر حملوں کا سلسلہ شروع کیا تھا، اس نے لاہور کو فوج کا مرکز اور مستقر بنالیا تھا۔ غزنی کے جاسوسوں کے ساتھ مقامی آدمی بھی شامل ہو گئے تھے۔ ان میں زیادہ تر جوان سال اور نوجوان تھے یہ ہندو راج کے ستائے ہوئے لوگ تھے، اور غزنی کے حکمرانوں کے لیے راہ ہموار کر رہے تھے۔ اب لاہور میں راجہ جے پال اپنے لشکر کے لیے اپنی رسد اور دیگر سامان جمع کر رہا تھا۔ بھٹنڈہ کے جاسوسوں نے اس ذخیرے کی تباہی کا یہ انتظام کیا تھا کہ بیس پچیس گھوڑسوار عام مسافروں کے بھیس میں لاہور کے مضافات میں پہنچ گئے تھے۔ وہ اکٹھے نہیں آئے ایک دوسرے سے دور دور رہے تاکہ کسی کو شک نہ ہو۔ لاہور کے آدمیوں کو صرف اطلاع دینا ضروری تھا۔

ایک ہی منزل کے مسافر

فوجی ساز و سامان کے اس ذخیرے میں جو راجہ جے پال نے غزنی پر حملے کے لیے لاہور کے مضافات میں ڈھیر کر رکھا تھا، جلدی آگ پکڑنے اور پھیلانے والے ڈھیر خیموں کے تھے۔ یہ ہزارہا خیمے تھے جنہیں لپیٹ کر ڈھیروں کی صورت میں رکھا گیا تھا۔ فوج کے ساتھ رسد لے جانے کے لیے بیل گاڑیاں تھیں یہ ایک دوسری کے ساتھ لگا کر کھڑی کی گئی تھیں۔ ان کے علاوہ اور بھی بے انداز سامان تھا جو کم و بیش ڈیڑھ میل لمبے اور چار پانچ فرلانگ چوڑے رقبے میں پڑا تھا۔ اس رقبے میں درختوں کی بہتات تھی۔

راجہ جے پال کو جلدی کوچ کرنا تھا۔ اس لیے یہ سامان تیاری کی حالت میں باہر ہی پڑا رہنے دیا گیا تھا۔ اس پر پہرے کا معمولی سا انتظام تھا۔ گشتی سنتری گھوڑوں پر اس کے ارد گرد گھومتے پھرتے رہتے تھے۔ ایسا واقعہ پہلے کبھی نہیں ہوا تھا کہ فوجی سامان کو کسی نے کوئی نقصان پہنچایا ہو یا کوئی سامان چوری ہو گیا ہو خطرہ صرف مسلمانوں کی طرف سے تھا لیکن مسلمانوں کی آبادی آٹے میں نمک کے برابر تھی۔ انہیں ہندو اپنا زر خرید غلام سمجھتے تھے۔ یہ تو راجہ جے پال کو معلوم تھا کہ اس کی ریاست میں غزنی کے جاسوس موجود ہیں لیکن اسے کبھی گمان بھی نہیں ہوا تھا کہ مسلمان اس کی جنگی قوت کو کوئی نقصان پہنچا سکتے ہیں اسی خوش فہمی میں مبتلا ہو کر اس نے اتنے بڑے فوجی ذخیرے کی حفاظت کا وہ انتظام نہیں کیا تھا جو ہونا چاہیئے تھا۔

ہندو رعایا کا تو اسے ڈر ہی نہیں تھا۔ اس نے پنڈتوں کے ذریعے ہندوؤں میں مسلمانوں کے خلاف اتنی نفرت پھیلا رکھی تھی کہ ہر ہندو یہ خواہش لیے ہوئے تھا کہ ان

کا راجہ مسلمانوں کے ملکوں پر حملے کرے اور مسلمانوں کو غلام بنا کر ہندو مت میں لایا جائے۔
اس مقصد کے لیے ہندوؤں نے اپنے راجہ کو مالی مدد دی تھی۔ انہوں نے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر روپیہ پیسہ اور سونا دیا تھا۔ مورخ لکھتے ہیں کہ ہندو عورتیں سوت کات کر بازاروں میں بیچتی اور آمدنی راجہ کے خزانے میں جمع کرا دیتی تھیں۔ لہٰذا غزنی پر حملے کے لیے یہ جو فوجی سامان کے انبار اکٹھے کیے گئے تھے ان میں ہندو رعایا کا خون پسینہ شامل تھا۔ سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ کوئی بھی ہندو اس سامان کو نقصان پہنچائے گا۔

نقصان پہنچانے والے لاہور پہنچ چکے تھے۔ یہ شہبازوں سے لڑ جانے والے ممولے تھے۔ آتش نمرود میں کود جانے والے عاشقانِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) تھے۔ وہ اس نظریے کے قائل تھے کہ اپنے دشمن بادشاہ کا تختہ الٹنے کے لیے بادشاہ ہونا ضروری نہیں ہوتا اور فوج کو نقصان پہنچانے کے لیے فوج کی ہی ضرورت نہیں ہوتی۔ ایمان مضبوط ہو تو مضبوط قلعے بھی سر کیے جا سکتے ہیں۔ وہ اُس مذہب کے سرفروش تھے جو محمد بن قاسم عرب کی سرزمین سے اس دھرتی میں لایا تھا۔ وہ ہندوستان میں اسلام کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کے پروانے تھے جو اسے اپنے خون سے جلتا رکھنے کا عزم کیے ہوئے تھے۔

وہ آٹھ گھوڑوں پر تھے۔ ان کے دو ساتھی شام کو عمران بلاذری اور لاہور کے دو تین اور ذمہ دار جاسوسوں کو لاہور میں اپنی موجودگی اور مقصد کی اطلاع دے کر شہر سے نکل گئے تھے۔ وہ غربا سے کپڑوں میں ملبوس ذریعہ معاش کی تلاش میں مارے مارے پھرنے والے مسافر لگتے تھے۔ رات کو جب شہر سو گیا تھا، وہ شہر سے دور ایک جگہ اکٹھے ہوئے اور انہوں نے اس مقصد پر جس کی خاطر وہ آئے تھے، جانیں قربان کرنے کا حلف اٹھایا۔ ایک دوسرے سے ہاتھ ملائے اور ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا۔ انہیں ایک دوسرے کو دوبارہ دیکھنے کی امید کم ہی تھی۔ وہ زندہ واپس جانے کے لیے نہیں آئے تھے۔
گھوڑے کچھ دور باندھ کر وہ ڈیڑھ میل لمبے ذخیرے کی مختلف اطراف کو دو دو ہو کر پھیل گئے۔ ان کے پاس چھوٹے مشکیزے تھے جو مسافر اپنے گھوڑوں اور اونٹوں کے ساتھ پانی کے لیے رکھتے ہیں مگر ان کے مشکیزوں میں پانی نہیں تیل تھا اور ان کے

پاس آگ لگانے والا سامان بھی تھا۔
ایک جگہ سے دو گھوڑ سوار سنتری آگے چلے گئے تو دو جانباز پیٹ کے بل رینگتے آگے گئے اور خیموں کے دو ڈھیروں کے درمیان جا کر رک گئے۔ انہوں نے مشکیزوں کے منہ کھولے اور تیل خیموں کے ڈھیروں پر چھڑک دیا۔ پیشتر اس کے کہ سنتریوں کو تیل کی بو آتی، اسے آگ لگا دی گئی۔ عین اس وقت ایک اور جگہ سے شعلہ اٹھا۔ سنتریوں نے شعلے دیکھے تو انہوں نے گھوڑوں کو ایڑ لگا دی۔ وہ آگ کی دونوں جگہوں تک آئے تو کئی اور جگہوں سے شعلے اٹھے۔ چار جانبازوں نے بیل گاڑیوں پر تیل چھڑک کر آگ لگا دی۔ پیشتر اس کے کہ سنتری جان سکتے کہ یہ آگ کیسے لگی ہے، آگ لگانے والے نکل گئے تھے۔ وہ اپنے گھوڑوں تک پہنچے اور شعلوں کی روشنی سے دور رات کی تاریکی میں غائب ہو گئے۔
ہوا کی رفتار کافی تھی۔ شعلے تیزی سے پھیلنے لگے۔ سوئے ہوئے سنتری جاگ اٹھے۔ جاگے ہوئے سنتری شعلوں کے نرغے سے نکلنے کے لیے بھاگ اٹھے۔ اُن سب کے شور و غوغا اور ہڑبونگ نے شعلوں کی آواز کو اور زیادہ بھیانک بنا دیا۔ شہر میں جتنی بھی فوج تھی بیدار ہو گئی اور آگ پر ٹوٹ پڑی۔ آگ ڈیڑھ میل لمبے اور اس سے نصف چوڑے علاقے میں پھیلی ہوئی تھی۔ درخت جھلس رہے تھے۔ فوج کے لیے آگ پر قابو پانا ممکن نہیں تھا۔ شعلے اتنے اونچے جا رہے تھے کہ کوئی فوجی قریب جانے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ سپاہیوں کو حکم دیا گیا کہ اُس سامان کو بچائیں جس تک ابھی آگ نہیں پہنچی تھی۔
شہر کی تمام تر آبادی جاگ اٹھی۔ مسلمان خوش تھے مگر ہندوؤں پر ہول طاری ہو گیا۔ وہ اس آگ کو آگ کے دیوتا کا قہر سمجھ رہے تھے۔ مندروں کے سنکھ اور گھنٹے بجنے لگے۔ پنڈت بہت سے ہاتھوں والے بتوں اور مورتیوں کے آگے دوزانو ہو کر گڑگڑانے لگے۔ عورتیں مندروں کو دوڑ پڑیں۔ مردوں کو فوجی ہانک کر لے گئے۔ پانی کنوؤں سے نکالا جا رہا تھا۔ گھوڑا گاڑیوں پر بڑے مشکیزے اور ڈول لاکر دریا سے پانی لایا جانے لگا لیکن شعلے اتنے اونچے اور ایسے ہیبت ناک تھے کہ نصف میل دور سے بھی ان کی تپش ناقابل برداشت تھی۔

"تمام سنتریوں کو قتل کر دو۔۔۔۔ انہیں اسی آگ میں زندہ پھینک دو" ــــ یہ راجہ جے پال کی آواز تھی۔ وہ چیختا، چلاتا، حکم دیتا اور گالیاں بکتا پھر رہا تھا جس گھوڑے پر وہ سوار تھا، وہ گھوڑا بھی اسی کی طرح غصے اور بے چینی میں ہنہنا تا تھا۔ اس کے درباری، وزیر اور جرنیل اس کے عتاب سے خوفزدہ فوجیوں اور شہریوں کو حکم اور گالیاں دیتے پھر رہے تھے۔

تھوڑا سا سامان بچایا جا سکا۔ راجہ اور اُس کے جرنیل وغیرہ تھک ہار کر پیچھے ہٹ گئے اور بے بسی کے عالم میں آگ کے قہر کو دیکھنے لگے۔

"یہ معلوم کرنا بہت مشکل ہے کہ آگ کس طرح لگی ہے؟" ــــ راجہ جے پال نے کہا ــــ "یہاں جتنے سنتری تھے، انہیں قید خانے میں لے جا کر اُلٹا لٹکا دو۔ ان میں سے جو بتا دے کہ آگ کس طرح لگی تھی۔ اسے اتار لینا۔ باقی سب کو اسی حالت میں مر جانے دو۔۔۔ پندرہ دنوں کے اندر اندر یہ سامان پورا کرو۔ میں چند دنوں میں کوچ کرنا چاہتا تھا۔ سبکتگین کے مرنے کی اطلاع ملتے ہی ہمیں کوچ کر جانا چاہیے تھا۔ اب جوں جوں وقت گزرتا جائے گا، سبکتگین کے جانشین کو تیاری کا موقع ملتا رہے گا۔"

"یہ مسلمانوں کا کام بھی ہو سکتا ہے" ــــ راجہ کے وزیر اُودھے شنکر نے کہا ــــ "کیا مہاراج کے ذہن میں نہیں آئی کہ غزنی کے دو قیدی بھاگ گئے ہیں؟ یہ ان کی کارستانی بھی ہو سکتی ہے۔"

"تمام مسلمانوں کے گھروں کی تلاشی لو" ــــ راجہ جے پال نے حکم دیا ــــ "کسی پر ذرا سا بھی شک ہو اُسے میرے سامنے لے آؤ۔۔۔ مسلمانوں کے گھروں سے جتنی نقدی، زیورات اور اناج ملے وہ اپنے قبضے میں لے لو۔ لیکن۔۔۔" راجہ نے ذرا سوچ کر کہا ــــ "میں سوچتا ہوں کہ یہ لوگ اتنی جرأت نہیں کر سکتے۔"

"یہ ناپاک قوم اس سے زیادہ جرأت بھی کر سکتی ہے" ــــ ایک جرنیل نے کہا ــــ "آپ غزنی کے دو قیدیوں سے ان کی فتح کا جو راز معلوم کرتے رہے ہیں وہ یہی ہے کہ ان کی قوم میں اتنی زیادہ جرأت ہے جس کا آپ اندازہ نہیں کر سکتے۔ ہمیں ان کی یہ جرأت تو ذلی

[illegible] یہی اعتراف کرتا ہوں کہ یہ جرأت ہماری فوج میں نہیں اور یہ بھی کہ

ہماری فوج کی جو لشکری غزنی کے حملے سے بچ کر آئی ہے، اس پر ابھی تک مسلمانوں کی فوج کا خوف سوار ہے۔"

"تو اپنے سپاہیوں کو بتاؤ کہ یہ ہمارے دیوتاؤں اور مسلمانوں کے پیغمبروں کی لڑائی ہے" ــــ راجہ جے پال نے کہا ــــ "انہیں بتاؤ کہ مذہب کی اس لڑائی میں جو ہندو مارا جائے گا وہ دوسرے جنم میں خوبصورت پرندوں کی شکل میں دنیا میں آئے گا اور کھلی فضاؤں اور خوشنما باغوں میں چہچہاتا اور اڑتا پھرے گا" ــــ راجہ جے پال کے دماغ پر پنڈت سوار تھے۔ وہ حقیقت سے دور ہٹ گیا تھا۔ اس نے کہا "معلوم نہیں کس کے گناہوں سے دیوتا ہم سب سے ناراض ہیں۔ قربانی کے لیے وہ لڑکی مل گئی ہے جسے پنڈت تلاش کر رہے تھے۔ اسے ٹیلوں والے مندر میں پہنچا دیا گیا ہے۔ پندرھویں روز اسے ذبح کر دیا جائے گا۔"

"مہاراج!" ــــ جرنیل نے کہا ــــ "آپ کو برا لگے تو معاف کر دینا۔ فتح حاصل کرنے کے لیے ایک لڑکی کو ذبح کرنا کافی نہیں۔ فوج کے ہر آدمی کو ذبح ہونے کے لیے تیار ہونا پڑے گا۔ آپ کو بھی، مجھے بھی۔ جب تک ہماری قوم ایسے بیٹے پیدا نہیں کرے گی جیسے یہ تھے جنہوں نے ہماری فوج کی ایک سال کی رسد جلا دی ہے، اُس وقت تک ہم مسلمانوں پر فتح حاصل نہیں کر سکتے۔"

"آپ کا خیال ہے کہ یہ آگ مسلمانوں نے لگائی ہے؟" ــــ راجہ جے پال نے پوچھا۔

"جی مہاراج!" ــــ جرنیل نے جواب دیا ــــ "میں سیناپتی ہوں۔ آپ کی ساری فوج کا سربراہ ہوں۔ فوج کی ہر شکست میری شکست ہوتی ہے۔ میں حقائق اور حالات پر نظر رکھتا ہوں میں وہموں اور خوش فہمیوں سے اپنا جی خوش نہیں کر سکتا۔ ایسا کروں گا تو آپ کا راج اور ریاست نابید ہو جائیں گے اور آپ کا راج محل مسجد اور مسلمانوں کا مذہبی مدرسہ بن جائے گا۔ میں آپ کے ساتھ حقیقت کی باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ یہ آگ مسلمانوں نے لگائی ہے۔ میں سنتریوں سے پوچھ چکا ہوں۔ آگ دیکھ بھی چکا ہوں۔ آگ سنتریوں کی غلطی سے لگتی تو کسی ایک جگہ لگتی اور سنتری خود ہی اس پر قابو پا لیتے، مگر یہ آگ بارہ چودہ جگہوں سے شروع ہوئی اور پھیل گئی۔"

"تو کیا غزنی سے آگ لگانے کے لیے فوج آئی تھی؟" ــــ مہاراجہ نے کہا ــــ "کیا شہر

کی ساری مسلمان آبادی نے مل کر بارہ چودہ جگہوں پر آگ لگائی ہے؟"

"میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ آگ یہ غزنی کی فوج نے لگائی ہے نہ شہر کی مسلمان آبادی نے۔" جرنیل نے کہا۔ "یہ کم از کم دس اور زیادہ سے زیادہ بیس آدمیوں کا کام ہے وہ جو کوئی بھی ہیں بہت دلیر ہیں۔ اس قسم کی آگ لگانے والے آگ میں جلنا بھی جانتے ہیں۔ وہ صرف جلانے کے لیے نہیں بلکہ خود جلنے کے لیے بھی آتے ہیں۔"

"کیا ہم انہیں پکڑ کر زندہ نہیں جلا سکتے؟" ــــ راجہ جے پال نے پوچھا

"اگر ہم دس بیس مسلمانوں کو پکڑ کر زندہ جلا دیں گے تو کیا ہوگا؟" ــــ وزیر اُدھر سے نہ رک سکا۔ "دس بیس اور آجائیں گے ہمیں ان کی اُس آگ کو سرد کرنا ہے جو اُن کے سینوں میں جل رہی ہے۔ اسے یہ لوگ ایمان کی شمع کہا کرتے ہیں ہمیں ان کا ایمان ختم کرنا ہے۔ درخت کے پتے توڑ توڑ کر مسلتے رہنے سے درخت سوکھ نہیں جایا کرتا۔ اس کی جڑ کاٹنی ہے۔ آگ پر آگ پھینک کر آپ اسے بجھا نہیں سکتے۔ آگ پانی سے بجھا کرتی ہے۔ آپ کو آگ کی طرح گرم ہو کر نہیں بلکہ پانی کی طرح ٹھنڈا ہو کر سوچنا پڑے گا۔۔۔ یہاں کے مسلمانوں پر آگ کی طرح نہ برسیں۔ ان میں جو سرکردہ لوگ ہیں انہیں انعام و اکرام، دربار کے رتبوں اور عورت کے حسن و جوانی کے جال میں پھانسیں میری نظر ماضی میں وہاں تک جاتی ہے جہاں محمد بن قاسم اس دھرتی پر نمودار ہوا تھا اُس نے شمال مغربی ہند میں اسلام پھیلا دیا تھا اور یہ مذہب محمد بن قاسم کے دور حکومت میں پھیلتا اور ہمارا مذہب سکڑتا سمٹتا چلا گیا۔ محمد بن قاسم کے جانے کے بعد ہمارے پیشواؤں نے مسلمانوں کو اپنے رنگ میں رنگنا شروع کر دیا۔ تشدد اور دہشت گردی سے بھی اسلام کے فروغ کو روکا گیا اور دلکش طریقوں سے بھی۔ سب سے زیادہ کامیاب طریقہ یہ دوسرا ثابت ہوا۔ زر و جواہرات اور عورت نے مسلمانوں کے معاشرتی سربراہوں کو نہ ہندو رہنے دیا نہ مسلمان۔ اسلام کمزور ہوتے ہوتے چند ایک مسجدوں تک رہ گیا ہے۔ انہیں جسمانی مار نہ دیں۔ انہیں روحانی طور پر مردہ کر دیں۔ انہیں پیار اور محبت کا دھوکہ دے کر ان پر اپنی تہذیب کا رنگ چڑھا دیں۔"

"اگر ہم نے غزنی فتح کر لیا تو ہم یہ طریقے استعمال کریں گے۔" ــــ راجہ جے پال نے کہا۔

وہ ڈیڑھ میل کے علاقے میں پھیلے ہوئے شعلوں سے نظر گھمائے باتیں کر رہے تھے۔ راجہ جے پال ویسے تو تاب کھا رہا تھا۔ غزنی پر اس کا حملہ کچھ عرصے کے لیے ملتوی ہو گیا تھا اور غزنی والے فوج کے بغیر حملہ کر گئے تھے۔ اس آگ کا دوسرا اثر یہ ہوا کہ غزنی کے دو مفرور قیدی ــــ نظام اور حُری اور قاسم بھی ــــ راجہ کے ذہن سے اُتر گئے۔

ہندو لڑکی رتی کو پنڈت ٹیلوں والے مندر میں لے گئے تھے۔

ٹیلوں والا مندر کوئی عمارت نہیں تھی۔ اُس دور میں دریائے راوی کی گزرگاہ کوئی اور تھی۔ آج اسے بڈھا دریا کہتے ہیں شہر سے تھوڑی دُور دریا سے ذرا سا ہٹ کر ڈیڑھ میل لمبا چوڑا علاقہ ٹیلوں اور گھاٹیوں کا تھا۔ ان کی مٹی کالی اور چکنی تھی۔ وہاں ٹیلوں کی چٹانیں بھی تھیں بعض ٹیلے سلوں اور کالی مٹی کی آمیزش کے تھے، لمبے بھی، گول اور مخروطی بھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے یہ قدرتی نہیں بلکہ انہیں تراش کر ان شکلوں کا بنایا گیا ہے۔ ان کے ارد گرد درختوں کی بہتات تھی لیکن ان کے اندر کوئی درخت نہیں تھا نہ کوئی سبزہ تھا۔

راجہ جے پال سے پہلے کے کسی دور میں ہندو کاریگروں نے بعض مخروطی ٹیلوں کو تراش کر مندر کے مخروطی اور لمبوترے گنبدوں کی شکل دے دی ہوئی ان کے اندر تراش تراش کر وسیع عمارتیں بنا دی تھیں جو بلند اور کشادہ کمروں جیسی تھیں۔ ان کی دیواروں پر دیویوں اور دیوتاؤں کے بُت تراشے ہوئے تھے۔ ان کمروں کے اندر بھی کمرے تھے تہ خانے اور بالاخانے بھی تھے۔ اُس دور کے وقائع نگار لکھتے ہیں کہ اندر جا کر انسان بھول جاتا تھا کہ وہ کھودی ہوئی زمین اور ٹیلوں کے اندر ہے۔ اندر سے یہ خوشنما اور پختہ عمارتیں لگتی تھیں۔

اس جگہ کو ٹیلوں والا مندر کہتے تھے لیکن وہاں پنڈتوں اور سادھوؤں کے سوا کوئی اور پوجا پاٹھ کے لیے نہیں جا سکتا تھا۔ ایک تو اس لیے کہ راہنما کے بغیر مندر تک کوئی پہنچ ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ ٹیلوں کے درمیانی راستے بھول بھلیوں جیسے تھے۔ جن کا علم نہ رکھنے والے اور بیشتر راستے کہیں نہ کہیں جا کر بند ہو جاتے تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اس

جگہ کے متعلق مشہور تھا کہ یہ روحوں، دیوتاؤں اور دیویوں کا مسکن ہے۔ انسانی قربانی اسی مندر میں دی جاتی تھی۔ دُور سے دیکھنے سے یہ علاقہ پُراسرار اور ڈراؤنا لگتا تھا۔ کوئی اس کے قریب سے گذرنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔

راجہ جے پال کے دَورِ حکومت کے کچھ عرصہ بعد جب سلطان محمود غزنوی نے ہندوستان پر حملوں کا اور بُت شکنی کا سلسلہ شروع کیا تو ٹیلوں کا مندر جس کی فضا انسانی خون اور ہندوؤں کی غیر معمولی طور پر حسین عورتوں کی عصمت کے خون سے متعفن رہتی تھی، اُس کی نظروں سے بچا رہا۔ خدائے ذوالجلال نے محمود غزنوی کے مشن کو یوں مکمل کیا کہ راوی کا رُخ بدل ڈالا۔ سیلاب جو ہر سال آتا تھا ٹیلوں کے علاقے کو بہانے لگا۔ دیوی دیوتاؤں کے بتوں کو راوی نے کیچڑ میں تبدیل کر کے غائب کر دیا پھر اسی کو راوی نے اپنی گزرگاہ بنا لیا۔ ٹیلوں والا مندر ہندوؤں کے کالے عمل میں رہ گیا۔

پہلے تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے کہ جس رات راجہ جے پال کی رسد وغیرہ کے ذخیرے کو جانبازوں نے نذرِ آتش کیا، اُس شام ان میں سے دو آدمی عمران بلاذری کے گھر گئے تھے۔ وہ عمران کو اپنے پروگرام سے آگاہ کر کے چلے گئے تو دروازے پر پھر دستک ہوئی۔ عمران نے دروازہ کھولا تو فاطمہ تیزی سے اندر آ گئی۔ عمران نے دروازہ بند کر دیا۔

"میں نے تمہیں یہاں آنے سے منع کیا تھا" — عمران بلاذری نے فاطمہ کو غصے سے کہا — "پھر کیوں آ گئی ہو؟"

فاطمہ جواب دینے کی بجائے اس کے پاؤں میں بیٹھ گئی اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ کر سسکیاں لینے لگی۔ وہ کانپ رہی تھی۔

"مجھے بچاؤ" — فاطمہ نے سسکتی اور لرزتی آواز میں کہا — "عمران! مجھے اس چڑیل سے بچاؤ۔ وہ مجھے سونے نہیں دیتی۔"

ڈیوڑھی تاریک تھی۔ عمران فاطمہ کو اندر نہیں لے جانا چاہتا تھا کیونکہ وہاں نظام اور زینی اور قاسم بھی موجود تھے۔ انہیں وہ یہ تاثر دینے سے ڈرتا تھا کہ وہ یہاں جاسوسی کے بہانے لڑکیوں کے چکر میں پڑا ہوا ہے۔ فاطمہ سے وہ منہ لگانے کو تیار نہیں تھا مگر اس لڑکی کی

حالت ایسی ہوئی جا رہی تھی کہ عمران نے اسے دھتکارنا مناسب نہ سمجھا۔

"کیسے چڑیل؟ ڈر رہی ہو؟" — عمران نے کہا — "یہ تمہارا گناہ ہے جو چڑیل بن کر تمہیں ڈرا رہا ہے۔"

"میں رتی کو دیکھتی ہوں" — فاطمہ نے کہا — "مجھے اندر لے چلو۔"

"یہیں بات کرو۔"

"مجھے اپنے ساتھ لگا لو" — فاطمہ نے روتے ہوئے التجا کی — "اتنے ظالم نہ بنو عمران! میں خوف سے مر جاؤں گی۔ مجھے پناہ میں لے لو۔"

عمران بلاذری اس کے پاس فرش پر بیٹھ گیا۔ فاطمہ اس کے ساتھ لگ گئی۔ اُس کا جسم کانپ رہا تھا۔

"میری آنکھ لگ جاتی ہے تو رتی مجھے جھنجوڑ کر جگا دیتی ہے۔ میں گھبرا کر اٹھتی ہوں" — فاطمہ نے کہا — "وہ مجھے اندھیرے میں بھی نظر آ جاتی ہے مگر وہ خوبصورت رتی نہیں ہوتی۔ اُس کے دانت درندوں کی طرح اور ناخن خنجروں کی نوکوں کی طرح آگے سے مڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ بولتی نہیں، چیختی یا پھنکارتی ہے۔ مجھے چیرنے پھاڑنے کو آتی ہے لیکن قریب آ کر غائب ہو جاتی ہے۔ میں نے کل رات اپنے کمرے میں اس سے بچنے کے لیے بھاگتے دوڑتے گذاری ہے۔ آج دن بھر مجھ پر خوف طاری رہا۔ وہ دن کو مجھے نظر نہیں آئی لیکن تین چار بار مجھے اُس کی سسکیاں سنائی دیں۔ میں نے کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ کوئی بھی نظر نہ آیا لیکن مجھے ایسے محسوس ہوتا رہا جیسے رتی کمرے میں موجود ہے۔ ... عمران! مجھے اس سے بچاؤ۔"

فاطمہ مظلوم لڑکی تھی۔ اسے نوجوانی کی عمر میں باپ نے پیسے لے کر ایسے آدمی کے ساتھ بیاہ دیا تھا جس کی عمر اُس سے دگنی سے بھی زیادہ تھی اور اُس کی دو بیویاں تھیں۔ فاطمہ صرف جوان ہی نہیں تھی، خوبصورت بھی تھی۔ وہ انتقام کی آگ میں جل رہی تھی۔ اسے عمران اچھا لگا تو اس کے راستے میں رتی نام کی ہندو لڑکی حائل ہو گئی۔ فاطمہ نے اسے راستے سے یوں ہٹایا کہ پنڈت کو معاوضہ دے کر اس لڑکی کو انسانی قربانی کے لیے منتخب کرا لیا۔ فاطمہ فطرتاً گناہگار نہیں تھی۔ انتقام اور رقابت نے اس سے بڑا ہی بھیانک گناہ کرا لیا۔ اس

کا ضمیر اس گناہ کو برداشت نہیں کر رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو رشی کی قاتل سمجھنے لگی۔ یہ ضمیر کا انتقام تھا۔ بے بس اور مجبور لڑکی اب اسقدر خوفزدہ تھی کہ وہ عمران کے قدموں میں آگری۔

"میں نے کل رات تمہیں کہا تھا کہ گناہ کا کفارہ ادا کرو ورنہ جلتی اور کڑھتی رہو گی۔"
—عمران نے اسے کہا۔ "رشی ابھی زندہ ہے جس روز پنڈت اسے ذبح کر دیں گے اُس روز اس کی بدروح چڑیل بن کر تمہارے پاس آجائے گی۔ تم جب تک زندہ رہو گی وہ تم پر غالب رہے گی۔ تم راتوں کو سو نہیں سکو گی۔ تم خودکشی کر لو گی یا پاگل ہو کر گلیوں اور بازاروں میں چڑیلوں کی طرح چیختی چلاتی پھرو گی اور لوگ تم سے دور بھاگیں گے۔"

فاطمہ اور زیادہ خوفزدہ ہو کر عمران بلاذری کے ساتھ لپٹ گئی۔ "مجھے بتاؤ میں کیا کروں۔ اگر ایک رات اور میری یہی حالت رہی تو میں پاگل ہو جاؤں گی۔"

"رشی کو پنڈتوں سے آزاد کراؤ۔" عمران نے کہا۔ اُس نے فاطمہ کو اسی لیے اور خوفزدہ کیا تھا کہ وہ رشی کو آزاد کرانے میں مدد دے۔ اُس نے بہت کچھ سوچ لیا تھا۔

"میں اُسے کیسے آزاد کرا سکتی ہوں؟"

"یہ کام میں کروں گا۔" عمران نے کہا۔ "تم میری مدد کرو۔ تمہاری نجات اسی میں ہے۔ رشی ذبح ہو گئی تو دنیا کے قید خانے سے آزاد ہو جائے گی مگر تمہارا جو حال ہو گا وہ میں تمہیں بتا چکا ہوں۔"

"مجھے جو کہو گے کروں گی۔"

"اٹھو۔" عمران نے اُسے اٹھاتے ہوئے کہا۔ "اندر چلو۔"

عمران اسے ایک اور کمرے میں لے گیا۔ وہ اسے اس کمرے میں نہیں لے جانا چاہتا تھا۔ جس میں نظام اور زبیری اور قاسم لمغی بیٹھے ہوئے تھے۔ فاطمہ پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ عمران نے فاطمہ کو دوسرے کمرے میں بٹھایا اور دیا جلا کر رکھ دیا۔

"اب بے خوف ہو کر اکیلی بیٹھی رہو۔" عمران نے کہا۔ "یہاں تمہیں رشی نظر نہیں آئے گی۔"

عمران اور زبیری اور لمغی کے پاس جا بیٹھا۔ اس نے انہیں فاطمہ اور رشی کے متعلق

سب کچھ بتا دیا اور کہا کہ وہ فاطمہ کو رشی کے فرار کے لیے استعمال کرے گا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ تم نے ہمیں فرار کرایا ہے لیکن ہمیں نہیں کسی اور مصیبت میں ڈال دو گے"۔ نظام اور زبیری نے کہا۔ "تم یہاں عشق و محبت اور عیاشی میں پڑے رہو۔ ہم خود ہی نکل جائیں گے۔"

"میں عشق و محبت اور عیاشی میں نہیں پڑوں گا۔" عمران نے کہا۔ "میں تمہیں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ میں ان پنڈتوں پر ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ ان کے بُت محض پتھر ہیں اور یہ کسی مسلمان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ میں ان سے یہ لڑکی چھین کر ثابت کروں گا کہ کس کا مذہب سچا ہے۔۔۔ میں گھوڑوں کا انتظام کر لوں گا۔ اگر میں نے آج ہی رات اس ہندو لڑکی کو آزاد کرا لیا تو یہاں واپس نہیں آؤں گا۔ تم دونوں میرے ساتھ ہو گے۔ ہم اُدھر سے ہی نکل جائیں گے۔"

"تم نے سوچا کیا ہے؟" قاسم لمغی نے پوچھا۔ "تم وثوق سے کس طرح کہہ رہے ہو کہ تم لڑکی آزاد کرا لو گے؟"

عمران بلاذری نے جو کچھ سوچا تھا وہ اس نے تفصیل سے بتا دیا۔ وہ دونوں رضامند ہو گئے اور تینوں نے بحث مباحثے کے بعد ایک سکیم تیار کر لی — اور عمران فاطمہ کے کمرے میں چلا گیا۔

"یہاں تو رشی کی بدروح نظر نہیں آئی؟" عمران نے فاطمہ سے پوچھا۔

"نہیں"۔ فاطمہ نے جواب دیا۔ "مگر ڈر آ رہا ہے۔"

"تم نے اُسے پنڈتوں سے بچانے کا ارادہ کر لیا ہے اس لیے اب رشی کی بدروح تمہیں پریشان نہیں کرے گی۔ جب وہ آزاد ہو گئی تو تمہیں روحانی سکون حاصل ہو گا۔"

"مجھے یہ تو بتاؤ کہ مجھے کرنا کیا ہے"۔ فاطمہ نے پوچھا۔

"میں تمہیں یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ تم کامیاب ہو گئیں تو تم اپنے گھر واپس نہیں آؤ گی۔" — عمران نے کہا۔ "تم میرے ساتھ غزنی چلو گی۔"

"سچ عمران؟"

"میں تمہیں دھوکہ نہیں دوں گا۔" عمران نے کہا۔ "تم پنڈت کے گھر جاؤ۔ ڈرنا نہیں۔

اگر وہ تمہیں مل جائے تو اُسے کہو کہ تم تیلیوں والا مندر دیکھنا چاہتی ہو۔ میں تمہیں سونے کے سکے دے رہا ہوں۔ یہ پنڈت کو دے دینا۔ وہ مان جائے گا۔ میں تمہارے پیچھے آؤں گا۔ تمہارا کام صرف اتنا ہو گا کہ پنڈت کو تیلیوں والے مندر تک لے جاؤ۔ وہ تمہیں جو شرط بتائے مان لینا۔ تمہیں شاید معلوم نہیں کہ یہ مندر ٹیلوں کے اندر ہے۔ وہاں تک ان پنڈتوں کے سوا اور کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ کسی عام آدمی کو راستہ معلوم نہیں۔"

"اگر وہ نہ مانا تو ہم کیا کریں گے؟" ۔۔۔ فاطمہ نے پوچھا۔

"تم اسے کسی طرح کمرے سے باہر لے آنا" ۔۔۔ عمران نے کہا ۔۔۔ "میں اسے مندر تک لے جاؤں گا۔ اگر نہیں جائے گا تو یہ اُس کی زندگی کی آخری رات ہو گی۔"

"پھر میرا کیا بنے گا؟" ۔۔۔ فاطمہ نے پوچھا۔

"میں کہہ چکا ہوں کہ تم اب اپنے خاوند کے گھر نہیں جاؤ گی" ۔۔۔ عمران نے جواب دیا ۔۔۔ "تم اب میری ذمہ داری میں ہو۔ دل سے تمام خوف اور وہم نکال دو۔ ابھی پنڈت کے ہاں چلی جاؤ۔ میں اُس کے کمرے کے دروازے کے قریب چھپا ہوا ہوں گا۔ میں جھینگر کی آواز نکالوں گا۔ تم اُسے باہر لے آنا۔"

عمران نے اُسے بہت سی ہدایات دیں۔ اس کا حوصلہ بڑھایا۔ اس کا دل مضبوط کیا اور اُسے سونے کے چند ایک سکے دے کر رخصت کر دیا۔ اس کے جانے کے بعد عمران رشی کے بھائی جگ موہن سے ملنے چلا گیا۔ جگ موہن گھر ہی تھا اور بہت اُداس۔ وہ پہلے ہی اپنے مذہب سے متنفر تھا۔ اب اس کی نوجوان بہن کو پنڈت دیوی کے قدموں میں قربان کرنے کے لیے لے گئے تھے۔

"عمران!" ۔۔۔ اُس نے کہا ۔۔۔ "یہ لوگ میری بہن کو ذبح کرنے کے لیے لے گئے ہیں۔ میں کسی پنڈت کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ کسی کو یہ بھی پتہ نہیں چلے گا کہ ان پنڈتوں کو کون قتل کرتا چلا جا رہا ہے ..... تم کیوں آئے ہو؟"

"اس لیے کہ کسی پنڈت کو قتل کیے بغیر تمہاری بہن کو اُٹھا لانے اور غائب کر دینے کا بندوبست کیا جائے" ۔۔۔ عمران نے کہا ۔۔۔ "تم یقیناً میرا ساتھ دو گے۔ جانتے ہو اُسے کہاں لے گئے ہیں؟"

"وہاں تک ہم نہیں پہنچ سکتے" ۔۔۔ جگ موہن نے جواب دیا ۔۔۔ "اُسے ٹیلوں والے مندر میں لے گئے ہیں۔ ہم وہاں گم ہو سکتے ہیں۔ پنڈت ہمیں ان بھول بھلیوں میں بھٹکتا دیکھیں گے تو ہمیں قتل کر دیں گے اور ہماری لاشیں وہیں کہیں زمین میں دبا دیں گے۔ وہاں جانے کی نہ سوچو۔"

"میں بہت کچھ سوچ چکا ہوں" ۔۔۔ عمران نے کہا ۔۔۔ "اگر تمہارے دل میں اپنے مذہب کے خلاف واقعی نفرت ہے تو تمہیں نہ صرف یہ مذہب ترک کر دینا چاہیے بلکہ اس ملک سے ہی نکل جانا چاہیے۔ میں تمہیں اور تمہاری بہن کو اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔"

"میری بہن کہاں ہے؟" ۔۔۔ جگ موہن نے پوچھا۔

"تم ایک کام کرو" ۔۔۔ عمران نے کہا ۔۔۔ "چار گھوڑوں کا انتظام کرو اور دریا کے کشتیوں کے پل سے دُور میرا انتظار کرو" ۔۔۔ عمران نے اسے وہ جگہ بتائی جہاں اُسے انتظار کرنا تھا۔ اُس نے جگ موہن سے کہا ۔۔۔ "اس وقت مجھ سے کچھ اور نہ پوچھنا۔ وقت نہیں۔ اگر میں صبح تک تمہیں دریا کے کنارے نہ ملا تو سمجھ لینا کہ میں زندہ نہیں۔"

جگ موہن بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن عمران بلاذری پر اُسے اس قدر اعتماد تھا کہ اس نے کچھ بھی نہ پوچھا۔ اُس نے اس یقین پر چار گھوڑے لے کر لوی کے کنارے انتظار کا وعدہ کر لیا کہ عمران اس کی بہن کو ساتھ لائے گا اور بہن بھائی عمران کے ساتھ ملک سے نکل جائیں گے۔ اُس نے دل میں یہ وہم پیدا نہ ہونے دیا کہ عمران ہوا میں گھوڑے دوڑا رہا ہے لیکن جگ موہن کے سینے میں انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی اور اس پر جذبات کا غلبہ تھا۔

کچھ دیر رات کے اندھیرے میں بڑے مندر سے کچھ دُور درختوں کے ایک جھنڈ میں عمران بلاذری، نظام ادریزی اور قاسم بھی کھڑے رہے۔ ان کے قریب سے ایک سایہ سا گزر گیا۔

"میں تمہارے ساتھ ساتھ ہوں فاطمہ!" ۔۔۔ عمران نے کہا ۔۔۔ "ڈر نہ جانا۔"

سایہ رک گیا۔ عمران اس کے قریب چلا گیا۔ اس نے فاطمہ کو یہ نہ بتایا کہ وہ اکیلا نہیں،

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس کے ساتھ دو آدمی اور بھی ہیں۔ عمران کو آنے والے حالات کے متعلق یقین نہیں تھا کہ اس کے لیے معاون ثابت ہو سکیں گے، اس لیے وہ جوزف اور بلمی کو فاطمہ سے چھپائے رکھنا بہتر سمجھتا تھا۔ اُس نے فاطمہ کا حوصلہ بڑھایا۔ وہ آگے چل پڑی۔ کچھ دور گئی تو تینوں اس کے پیچھے چل پڑے۔

"میں نہیں سمجھ سکتا کہ تم اس مہم میں کس طرح کامیاب ہو گے" — بلمی نے کہا۔

"میں جو کچھ کر رہا ہوں، اللہ کے نام پر کر رہا ہوں" — عمران نے کہا — "میں نے خدا سے مدد مانگی تھی۔ مجھے جو بھی خیال آتا ہے، وہ خدا کی طرف سے آتا ہے۔ اگر میں سچا ہوا تو خدا مجھے کامیابی عطا کرے گا۔"

فاطمہ سیاہ سائے کی طرح چلتی گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد عمران ہلکا ذرا زور سے کھانس دیتا تھا۔ یہ فاطمہ کے لیے اشارہ تھا کہ وہ اُس کے ساتھ ساتھ چلا آ رہا ہے ...... مندر بہت بڑے بھوت کی طرح کھڑا نظر آنے لگا۔ عمران نے دُور سے روشنی دیکھی۔ یہ پنڈت کے کمرے کے دروازے سے باہر آئی تھی۔ پنڈت نے فاطمہ کی دستک پر دروازہ کھولا تھا۔ عمران کو فاطمہ کمرے میں داخل ہوتی دکھائی دی۔ دروازہ بند ہو گیا۔ روشنی غائب ہو گئی۔

عمران اپنے ساتھیوں کے ساتھ آگے چلا گیا۔ دونوں ساتھیوں کو ذرا دُور درختوں کے پیچھے کھڑا کر دیا اور خود دبے پاؤں دروازے کے قریب چلا گیا۔ دروازے کی درزوں میں سے روشنی آ رہی تھی۔ دروازے تک تین چار سیڑھیاں جاتی تھیں۔ عمران سیڑھیاں چڑھ کر دروازے کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔

"میں سمجھ نہیں سکا کہ تم بچوں کی سی ضد کیوں کر رہی ہو" — پنڈت کہہ رہا تھا — "وہاں کوئی ہندو بھی نہیں جا سکتا، تم تو مسلمان ہو۔"

"میں اُس چڑیل کو آخری بار اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتی ہوں" — فاطمہ نے کہا — "دُور سے دکھا دینا۔"

"مجھے آج رات اُدھر جانا ہی تھا لیکن آدھی رات کے بعد جاؤں گا جب چاند اوپر آ جاتا ہے" — پنڈت نے کہا — "تم اُس وقت تک یہاں رک سکو گی؟"

"ابھی چلیں" — فاطمہ نے کہا — "آپ کی اُجرت آپ کے سامنے پڑی ہے۔ میں آپ کو منہ مانگی قیمت دے رہی ہوں۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ یہ انسانی قربانی محض فریب ہے۔ میں آپ کا بھانڈہ پھوڑ سکتی ہوں۔ میں بہت کچھ کر سکتی ہوں۔ میں آپ کے جال میں نہیں بلکہ آپ میرے جال میں آئے ہوئے ہیں۔ اگر آپ میری یہ ذرا سی خواہش پوری نہیں کر سکتے تو میں واپس چلی جاتی ہوں لیکن میں بتا نہیں سکتی کہ آپ کا انجام کیا ہو گا۔"

فاطمہ بجائے خود ایک سحر تھا جو پنڈت پر غالب آ گیا۔ اس کے ساتھ سونے کے ٹکڑے تھے۔ فاطمہ کی دھمکی بھی کام کر گئی۔ کچھ وقت اور گزرا، عمران کو اندر سے کھسر پھسر سنائی دینے لگی۔

"میں تمہیں دُور سے دکھا کر واپس لے آؤں گا...... چلو" — یہ پنڈت کی آواز تھی۔

عمران دروازے سے ہٹ کر اندھیرے میں چھپ گیا۔ پنڈت اور فاطمہ باہر نکلے۔ دروازہ بند ہوا اور وہ ایک طرف چل پڑے۔ خاصا فاصلہ رکھ کر عمران اپنے ساتھیوں کے ساتھ اُن کے پیچھے چل پڑا۔ آگے کوئی آبادی نہیں تھی، جنگل تھا۔ عمران کو یہ خطرہ محسوس ہو رہا تھا کہ پنڈت کو اپنے پیچھے آہٹ سنائی دے گی اور وہ پیچھے کو آئے گا لیکن اُسے آگے پیچھے کا خیال نہیں تھا۔ وہ فاطمہ کے ساتھ اٹکھیلیاں کرتا جا رہا تھا۔

ٹیلوں کا علاقہ آ گیا۔ پنڈت اور فاطمہ دو ٹیلوں کے درمیان چلے گئے۔ عمران اور اس کے ساتھی بھی بھول بھلیوں میں داخل ہو گئے مگر انہیں ایک خطرہ نظر آنے لگا۔ راستہ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر جا کر مڑ جاتا تھا۔ اور اندھیرا تھا۔ وہ پنڈت اور فاطمہ کی باتوں کی آواز پر چلے جا رہے تھے۔ تین چار جگہیں ایسی آئیں کہ وہ غلط راستے پر ہو چلے تھے۔ انہیں ایک سرنگ میں سے بھی گزرنا پڑا۔ آگے گئے تو انہیں دھیمی دھیمی آواز سنائی دینے لگی جیسے عورتیں مل کر گا رہی ہوں۔ اگر عمران اور اس کے ساتھی یہاں اکیلے آتے اور یہ آواز سن لیتے تو وہ اسے بد روحوں کا گانا سمجھ کر واپس چلے

جائے۔ عمران کو پنڈت کی اصلیت معلوم ہو چکی تھی، اس لیے اُسے ڈر محسوس نہ ہُوا۔

آگے جا کر راستے اس طرح اُلجھ گئے کہ عمران اور اس کے ساتھیوں کے لیے پنڈت اور فاطمہ کو دیکھ کر چلنا ممکن نہ رہا۔ انہیں نظر آنے لگا تھا کہ وہ بھٹک جائیں گے لہٰذا انہیں فاصلہ کم کرنا پڑا اور انہوں نے اپنی رفتار بھی تیز کر دی۔ پنڈت رُک گیا۔

"کون ہو؟" — پنڈت نے پیچھے کو آتے ہوئے کہا۔

عمران اور اس کے ساتھی ایک طرف ہٹ گئے۔ بھاگنا مناسب نہیں تھا۔ وہ راستے سے اِدھر اُدھر ہو کر ٹیلوں کے دامن میں بیٹھ گئے۔ پنڈت ان کے درمیان آگیا۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ اُسے اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ عمران نے خنجر نکالا اور اُٹھ کر خنجر کی نوک پنڈت کے دل پر رکھ دی۔

"یہیں رُکے رہو" — عمران نے کہا — "قتل ہونا پسند کرو گے یا ہمیں رِشی تک لے چلو گے؟ اس مسلمان لڑکی سے جو اُجرت تم نے وصول کی ہے وہ میں جانتا ہوں۔ آج سونے کے جو ٹکڑے تم نے اس سے لیے ہیں وہ اپنے پاس رہنے دو۔ اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو ہمیں رِشی تک لے چلو۔"

"فاطمہ!" — پنڈت نے کانپتی ہوئی آواز میں فاطمہ سے کہا جو اُن کے قریب آگئی تھی — "تم نے مجھے دھوکہ دیا ہے۔"

"تم نے میرا جو بھی کام کیا ہے اس کی تم نے پوری قیمت وصول کی ہے" — فاطمہ نے کہا — "میں نے تمہیں سونے کی شکل میں بھی قیمت دی ہے، جسم کی شکل میں بھی۔ میں اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے آئی ہوں، تم اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرو۔"

دو اور خنجروں کی نوکیں پنڈت کے جسم کے ساتھ لگ گئیں۔ اس پر سکتہ طاری ہو گیا۔ دور سے عورتوں کے گانے کی آواز آ رہی تھی۔ ٹیلوں کے جھرمٹ میں یہ آواز مترنم گونج کی طرح سنائی دے رہی تھی۔ یہ آواز اس دنیا کی معلوم نہیں ہوتی تھی۔

"اس آواز پر ہم خود بھی رِشی تک پہنچ سکتے ہیں" — عمران نے پنڈت سے کہا — "ہم صرف تین آدمی نہیں۔ ہمارے ساتھ بہت آدمی ہیں۔ ہم تمہیں زندہ چھوڑیں گے نہ تمہارے کسی اور پنڈت کو۔ ہم ان گانے والیوں کو بھی اُٹھانے جائیں گے۔ خون خرابے سے بچو اور چل کر وہ ہندو لڑکی ہمارے حوالے کر دو جسے قربانی کے لیے لائے ہو۔ اپنے پتھر کے خداؤں اور مورتیوں کو پکارو۔ تمہاری دیویاں اور دیوتا تمہاری مدد کو نہیں آئیں گے.... چلو۔"

پنڈت خاموشی سے آگے آگے چل پڑا۔ اُس پر تو جیسے سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ مگر یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ اُس نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ عمران اور اس کے ساتھیوں کو کچھ علم نہیں تھا کہ آگے کیا ہے۔ انہیں صرف عورتوں کا گیت سنائی دے رہا تھا۔ راستہ مڑتا، کئی راستوں میں اُلجھتا اور ٹیلوں کے گرد گھومتا جا رہا تھا۔ عمران چوکنا تو تھا ہی، وہ اور زیادہ ہوشیار ہو گیا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ پنڈت انہیں کسی غلط راستے پر ڈال کر غائب ہو جائے اور انہیں پنڈت کے آدمی گھیر کر ختم کر دیں گے۔

راستہ ایک میدان میں داخل ہو گیا۔ یہ کوئی وسیع میدان نہیں تھا۔ چالیس پچاس گز چوڑا اور اتنا ہی لمبا تھا۔ یہ گولائی میں تھا۔ اس کے گرد مندر اور کمرے تھے جو کٹے ہوئے ٹیلوں کو تراش کر بنائے گئے تھے۔ چبوترے بنے ہوئے تھے جن میں بعض پر سادھو قسم کے آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ ہر ایک کے پاس ایک لڑکی بیٹھی تھی اور وہ ہنس کھیل رہے تھے۔ میدان میں دس بارہ جوان لڑکیاں دائرے میں رقص کی اداؤں سے گھومتی اور گا رہی تھیں۔ بہت سی مشعلیں زمین میں گڑی ہوئی تھیں۔ گانے والی لڑکیوں کے درمیان ایک لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ سب نیم عریاں تھیں.... پنڈت رُک گیا۔ اُس نے بے بسی کے عالم میں تینوں مسلمانوں کی طرف دیکھا۔

"لڑکی ہمارے حوالے کر دو" — عمران نے پنڈت کے پہلو میں خنجر کی نوک چبھو کر کہا۔

پنڈت نے بلند آواز سے حکم دیا — "رُک جاؤ"

گانے والیاں خاموش ہو کر ایک طرف ہٹ گئیں۔ پنڈت اور سادھو اُٹھ کھڑے ہوئے۔ رِشی جہاں بیٹھی تھی وہیں بیٹھی رہی۔ عمران اور اس کے ساتھیوں نے منہ اور سر پگڑیوں میں چھپا رکھے تھے۔ انہوں نے خنجر بند کر کے تلواریں نکال لیں اور پنڈت کو آگے لے گئے۔ تمام پنڈتوں، سادھوؤں اور لڑکیوں پر سناٹا طاری ہو گیا۔ بڑا پنڈت

دو تلواروں کے درمیان کھڑا تھا۔ عمران نے آگے بڑھ کر رشی کو اٹھایا۔ رشی اُسے آنکھیں کھولے دیکھتی رہی جیسے عمران کو پہچان نہ سکی ہو۔ عمران نے بلایا اسے جھنجھوڑا مگر وہ اسے دیکھتی ہی رہی۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ اسے کچھ پلایا گیا ہے جس کے اثر سے اس کا دماغ حاضر نہیں۔

عمران نے اسے بازو سے پکڑا اور چل پڑا۔ رشی اس کے ساتھ چلتی آئی۔ عمران نے سب کی طرف دیکھا اور کہا۔ "اگر کسی نے کوئی حرکت کی تو وہ مارا جائے گا۔ تم سب بہت سے آدمیوں کے گھیرے میں ہو۔"

"اس پر یہ اثر کب تک رہے گا؟" — عمران نے پنڈت سے پوچھا۔

"صبح تک اتر جائے گا" — پنڈت نے جواب دیا — "جاؤ۔ اسے لے جاؤ۔"

"تم ہمارے ساتھ چلو گے" — عمران نے کہا۔ "ہمیں راستہ یاد نہیں رہا۔ ہمارے آگے آگے چلو" — عمران نے تلوار کی نوک اُس کی شہ رگ پر رکھ دی۔

پنڈت سدھائے ہوئے جانور کی طرح آگے آگے چل پڑا۔ اس پر دہشت کا غلبہ تھا۔ وہ جب ایک بار پھر گلیوں کی بھول بھلیوں میں داخل ہوئے اُس وقت رسد کے ذخیرے کو آگ لگانے والے ذخیرے میں داخل ہو چکے تھے اور تیل چھڑک کر آگ لگا رہے تھے۔ پنڈت آگے آگے چلا آ رہا تھا۔ عمران، نظام ادریزی اور قاسم علی کے ہاتھوں میں تلواریں تھیں۔ فاطمہ بھی ان کے ساتھ چلی آ رہی تھی۔ رشی دماغی غیر حاضری کی کیفیت میں ساتھ ساتھ آ رہی تھی۔

آخر وہ اس علاقے سے نکل آئے۔ تب انہوں نے دیکھا کہ شہر کی طرف سے آسمان سرخ ہو رہا تھا۔ پھر بلند ہوتے ہوئے شعلے بھی نظر آنے لگے۔ عمران نے گلا پھاڑ کر نعرہ لگایا ... "اللہ اکبر" — اور اپنے ساتھیوں سے ان کی زبان میں کہا — "وہ دیکھو۔ اللہ کے شیروں نے کفار کی کمر توڑ ڈالی ہے۔ غزنی پر حملہ کرنے والوں کو ہمارے خدا نے انہیں خاکستر کر دیا ہے۔"

"یہ کیا ہو گیا" — پنڈت کے منہ سے گھبرائی ہوئی آواز نکلی — "شہر جل رہا ہے۔"

"یہ ہمارے خدا کا قہر ہے جو تم پر گرا ہے" — عمران نے کہا — "اپنی عبادت گاہ کا بول

میں کبھی تم سفلی بدمعاشی سے گریز نہیں کرتے۔ اس بے بس لڑکی کی آہ نے تمہارے شہر کو آگ لگا دی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ انسانی قربانی فریب ہے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ تم نے اس لڑکی کو قربانی کے لیے کس طرح منتخب کیا تھا۔ میں نے تمہارے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ تمہیں زندہ رہنے دیں گے۔ ہم تمہیں زندہ چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ کسی کو پتہ نہ چلے کہ ہم رشی کو لے گئے ہیں۔ تمہارے راجہ نے اس لڑکی کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کوئی اور لڑکی لے آؤ اور اس کی قربانی دے دینا۔ ہم تمہاری فریب کاری پر پردہ ڈالے رکھیں گے۔ اتنی زیادہ رعایت اور جان بخشی کے باوجود تم نے کوئی گڑبڑ کی تو اُن شعلوں کو دیکھ لو۔ جو اس شہر کو آگ لگا سکتے ہیں وہ تم جیسے ایک سو پنڈتوں کو زندہ جلا سکتے ہیں۔"

پنڈت شعلوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس پر جیسے غشی طاری ہوتی جا رہی تھی۔ شعلے بہت اوپر چلے گئے تھے۔ ان کے ساتھ شہریوں اور فوج کا شور و غوغا بھی سنائی دینے لگا تھا۔ پنڈت یوں بیٹھ گیا جیسے گر پڑا ہو۔ اس نے سر ہاتھوں میں لے لیا۔ عمران اور اس کے ساتھی تیزی سے چل پڑے۔ ہر کام خوش اسلوبی سے ہوتا جا رہا تھا۔ یہ خدائی مدد تھی۔

وہ دریا کے کنارے اُس جگہ پہنچے جہاں جگ موہن کو انتظار کے لیے کہا گیا تھا۔ جگ موہن چار گھوڑوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ وہاں سے کوئی پون میل دور گھوڑوں اور گاڑیوں کی آوازیں اور انسانوں کا شور سنائی دے رہا تھا۔ وہ آگ بجھانے کے لیے پانی لے جا رہے تھے۔

"شہر جل رہا ہے" — جگ موہن نے گھبرا کر کہا — "یہ آگ کیسے لگی؟ میرا گھر بھی جل رہا ہو گا۔"

"جل جانے دو" — عمران نے کہا — "تم اب اس گھر میں نہیں جا رہے۔ تم ہمارے ساتھ چل رہے ہو۔ اب اپنے آپ کو ہندو سمجھنا چھوڑ دو۔ ہمارے مذہب کا کرشمہ دیکھ لو۔ تمہاری معصوم بہن کو پنڈت قربانی کے لیے لے گیا تھا۔ میں نے اپنے خدا سے دعا کی تھی کہ مجھے ہمت اور جرأت دے کہ میں اس لڑکی کو بچا کر ثابت کر سکوں کہ سچا خدا مسلمانوں کا ہے.... دیکھ لو۔ سارے شہر کو آگ لگ گئی ہے اور تمہاری بہن تمہارے سامنے کھڑی

ہے۔ اسے ہم دیوتاؤں سے چھین لائے ہیں۔"

"اوہ۔ میری بہن"۔ جگ موہن کے منہ سے نکلا اور وہ دوڑ کر اپنی بہن سے لپٹ گیا مگر بہن لاش کی طرح کھڑی رہی۔ جگموہن کے بلانے اور جھنجھوڑنے کے باوجود اُس نے کسی ردِعمل کا اظہار نہ کیا۔

"اسے تمہارے پنڈتوں نے اس اثر والی کوئی دوائی پلا رکھی ہے"۔ عمران نے کہا۔ "صبح تک اسی حالت میں رہے گی۔۔۔ ہمارا سفر بڑا لمبا ہے۔ بہن کو اپنے ساتھ گھوڑے پر بٹھاؤ اور چلو"۔

جگ موہن نے رشی کو اپنے آگے سوار کر لیا اور فاطمہ کو عمران نے اپنے گھوڑے پر اپنے پیچھے بٹھا لیا۔ اور یزی اور بمبی اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ وہ کشتیوں کے پل سے نہیں گزر سکتے تھے۔ وہاں سنتریوں کا خطرہ تھا۔ انہوں نے ایک جگہ دیکھ لی جہاں دریا کا پاٹ بہت چوڑا اور گہرائی کم تھی۔ وہ دریا پار کر گئے۔ انہوں نے پیچھے دیکھا۔ اب شعلے درختوں کو بھی جلا کر آسمان تک پہنچ رہے تھے۔

"یہ آگ ہمیں یہ فائدہ دے گی کہ کسی کو اِدھر اُدھر کی ہوش نہیں رہے گی"۔۔۔ عمران نے کہا۔ "راجہ جے پال کی اپنی بیٹیاں اغوا ہو گئیں تو وہ انہیں بھی نہیں ڈھونڈے گا"۔

صبح طلوع ہوئی تو جہاں ڈیڑھ میل کے علاقے میں راجہ جے پال کی فوج کی رسد اور جنگی سامان کے انبار لگے ہوئے تھے وہاں راکھ کے ڈھیر پڑے تھے۔ درخت بھی جل گئے تھے۔ ان میں سے ابھی تک دھواں اُٹھ رہا تھا۔ لوگ ابھی تک سلگتے انبار پھینک رہے تھے کیونکہ یہ راجہ کا حکم تھا۔ مسلمانوں کے گھر لوٹے جا رہے تھے۔ راجہ نے رات کو ہی حکم دے دیا تھا کہ مسلمانوں کے گھروں کی تلاشی لو اور وہاں سے جتنی نقدی اور زیور دولت ہاتھ آئیں سرکاری خزانے میں جمع کرا دو اور فوج کے کام کا جو سامان

بھی اُٹھا لاؤ۔

رات کو جب عمران اور اس کے ساتھی بڑے پنڈت سے رشی کو چھین کر لے گئے تو پنڈت شہر کی طرف چل پڑا۔ وہ آگ سے بے نیاز اپنے مندر میں گیا اور اپنے دو آدمیوں کو ساتھ لے کر آگ کی طرف چلا گیا۔ شہر کی ساری آبادی باہر آ گئی تھی۔ شعلوں کی روشنی میں ہر انسان نظر آ رہا تھا۔ ان میں عورتیں بھی تھیں۔ پنڈت اور اس کے آدمی عورتوں کو دیکھتے پھر رہے تھے۔ پنڈت ایک جگہ رک گیا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو ایک نوجوان لڑکی دکھائی اور خود پرے ہٹ گیا۔

کچھ دیر بعد کسی طرف سے گھوڑا گاڑیاں دوڑتی آئیں جو رستے سے ہٹنے کے لیے اِدھر اُدھر ہٹیں۔ پنڈت کے ایک آدمی نے اس لڑکی کو پکڑ لیا جو پنڈت نے انہیں دکھائی تھی۔ دوسرے آدمی نے لڑکی کی ناک پر کپڑا رکھ دیا اور اسے دھکیلتے گھسیٹتے ہوئے اندھیرے میں لے گئے۔ انہیں کوئی بھی نہ دیکھ سکا۔ وہاں سے اٹھا کر مندر میں لے گئے اور صبح طلوع ہونے سے پہلے اُسے بتوں والے مندر میں پہنچا دیا گیا جہاں وہ رشی کی طرح سب کچھ دیکھتی تھی مگر اس کا دماغ سوچنے اور سمجھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

ہندو مت نہ کبھی مذہب کہلا سکا ہے نہ یہ آج مذہب ہے۔ یہ توہمات رسومات اور تعصبات کا مرکب ہے، جسے برہمن کے پیشواؤں نے مذہب کہہ دیا تھا۔ اس نام نہاد مذہب میں خدا کا تصور پیدا نہ ہو سکا۔ شودروں، کمزوروں، بچوں اور عورتوں کی قتل و غارت حیوانی جذبات پرستی، دھوکہ فریب اور دیدہ دلیری اس مذہب کے اصول ہیں۔ اس کے پیشواؤں نے اپنی عیاشی کے لیے ایسے ایسے توہمات پیدا کیے جو ان کے پیروکاروں کے ذہن و دل پر غالب آ گئے اور خدا کی بہت سی شکلیں گھڑ لی گئیں۔ لہٰذا چاند، سورج، گرہن، سیلاب، آگ، سانپ، سمندر اور آسمانی بجلیوں وغیرہ کو انہوں نے مختلف دیوتاؤں سے منسوب کر کے ان کی پوجا شروع کر دی۔ آج تک یہ قوم سانپ کی پوجا کرتی ہے۔ راجہ جے پال اس آگ کو جو بٹھنڈہ کے جانبازوں نے لگائی تھی، اپنے دیوتاؤں کا قہر سمجھتا تھا اور یہ بھی کہتا تھا کہ یہ غزنی کے جاسوسوں کی کارستانی ہے [illegible]

کی باتیں کرتا تھا کبھی کہتا "پنڈت کو بلاؤ۔ دیوتا سخت ناراض ہیں۔ ایک کی بجائے دو لڑکیوں کی قربانی دو۔ فوراً۔۔۔ جلدی"۔۔۔ اور اس کے ساتھ ہی چلا چلا کر کہتا۔۔۔ "مسلمانوں کے گھر جلا دو۔ ان کے گھر لوٹ کر فوج کو دے دو۔ ان کی عورتوں کو میرے سامنے لے آؤ۔"

دیوتاؤں پر اس کا حکم نہیں چل سکتا تھا۔ وہ جانباز جو رسد کے ذخیرے اور اس کے دل میں جو آگ لگا گئے تھے، وہ اس کی دسترس سے دور چلے گئے تھے۔ اس کے سامنے پانچ مسلمان لڑکیاں کھڑی تھیں جو اُس سے پیش کی گئی تھیں۔ یہ شریف گھرانوں کی بیٹیاں تھیں جو مسلمانوں کو سزا دینے کے طور پر گھروں سے زبردستی راجہ کے پاس لے جائی گئی تھیں۔ راجہ تخت پر بیٹھا لڑکیوں کو ایسی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا جن میں طنز بھی تھی اور ہوس بھی۔

"تم خوش قسمت ہو کہ خوبصورت ہو"۔۔۔ راجہ جے پال نے لڑکیوں سے کہا "ورنہ میں تمہارے ساتھ ایسا سلوک کرتا جس سے تمہاری قوم عبرت حاصل کرتی۔ میں تم پر رحم کرتا ہوں۔ تمہیں راج محل میں رکھا جائے گا۔ اپنے مذہب کو بھول جاؤ۔ جس روز تمہارے گھر والے ہمیں آکر بتا دیں گے کہ آگ کس نے لگائی تھی، اُس روز تمہیں آزاد کر دیا جائے گا۔ اُس وقت تک تم۔۔۔"۔۔۔ راجہ طنزیہ ہنسی ہنس پڑا۔

"ہمارا مذہب تمہارے مذہب کی طرح اتنا گھٹیا نہیں کہ ہم اسے تمہارے حکم سے بھول جائیں"۔۔۔ ایک لڑکی نے کہا۔

"بکواس بند کرو لڑکی"۔۔۔ ایک درباری نے گرج کر کہا۔ "تم مہاراج کے دربار میں کھڑی ہو۔"

"مہاراج ہمارا خدا نہیں"۔۔۔ ایک اور لڑکی نے کہا۔ "کمزوروں اور عورتوں پر ہاتھ اٹھانے والا مہاراجہ اس قابل نہیں کہ مسلمانوں کی بیٹیاں اس کی عزت کریں۔۔۔ یاد رکھ مہاراجے! ہم ہنسی خوشی تمہارا ظلم و ستم سہہ لیں گی مگر تیرا انجام بہت بُرا ہوگا۔ تو زندہ جلے گا۔ تیرا کوئی دیوتا تجھے بچا نہیں سکے گا۔ تُو دو بار شکست کھا چکا ہے۔ ایک میں ایک ہزار لڑکیاں اندر دیوی کے قدموں میں ذبح کر دے، شکست تیرے مقدر میں لکھ دی گئی۔ تو ہمیں سزا دے رہا ہے۔ ہمارا خدا تجھے سزا دے گا۔"

"لے جاؤ انہیں"۔۔۔ راجہ جے پال نے حکم دیا۔
سپاہی لڑکیوں کو دھکیلتے گھسیٹتے لے گئے۔

سُلطان محمود غزنوی خراسان اور بخارا کو سلطنتِ غزنی میں شامل کر چکا تھا مگر خانہ جنگی ابھی رکی نہیں تھی۔ اُس وقت خلافتِ بغداد کی گدی پر القادر باللہ عباسی بیٹھا تھا۔ اسلامی نظام کے مطابق تمام مسلمان سلطنتیں اور چھوٹی بڑی ریاستیں خلافت کے تحت آتی تھیں اور خلیفہ کے حکم کی تعمیل ان کے فرائض میں شامل تھی مگر اقتدار کی ہوس اور توسیع پسندی نے مسلمان حکمرانوں کے دلوں سے خلافت کا احترام نکال دیا اور آپس میں عداوت پیدا کر دی تھی۔ خلافت برائے نام مرکز بن کے رہ گیا تھا۔ سبکتگین نے خلافت سے رشتہ نہیں توڑا تھا۔ محمود نے بھی خلافت کی عظمت کو برقرار رکھا۔ خراسان اور بخارا کو سلطنتِ غزنی میں شامل کر کے سلطان محمود نے خلیفہ کو ان الفاظ کا پیغام بھیجا:

"قوم نے پہلی خانہ جنگی میں جو زخم کھائے ہیں، وہ ابھی مندمل نہیں ہوئے تھے کہ مجھے پڑوس کے مسلمان حکمرانوں کے خلاف ایک اور جنگ لڑنی پڑی۔ انہوں نے سلطنت کے حصے بخرے کرنے شروع کر دیئے تھے اور خود ہی حکمران بن بیٹھے تھے۔ میں نے انہیں صلح و صفائی کے پیغام بھیجے۔ انہیں غیر مسلموں کے ہاتھوں میں کھیلنے سے روکا مگر میری امن پسندی کو انہوں نے میری بزدلی سمجھا۔ انہوں نے حالات اتنی جلدی خراب کر دیئے کہ میں آپ سے حکم نہ لے سکا۔ مجھے فوری طور پر جنگی کارروائی کرنی پڑی۔ یہ بظاہر خوش خبری ہے کہ میں نے خراسان اور بخارا کو ان باغیوں اور غداروں سے چھین کر سلطنتِ غزنی میں شامل کر لیا ہے مگر میں اسے خوشخبری نہیں سمجھتا۔ یہ ایک کڑوی المیہ ہے کہ ہم آپس میں لڑے اور دونوں طرف وہ فوج ضائع ہوئی ہے جس سے ہمیں سلطنتِ اسلامیہ کا تحفظ کرنا تھا اور اسلام کے فروغ کے لیے کفرستان کو اسلام کے پرچم تلے لانا تھا۔۔۔

"میں مردِ میدان ہوں۔ مجھے نظر آرہا ہے کہ میری عمر میدانِ جنگ میں گزر جائے گی اور میری لاش کسی محاذ سے اٹھائی جائے گی۔ خدشہ یہ کہ میں اپنے بھائیوں کے خلاف

لڑتا ہوا مارا گیا تو میرا جہاد رائیگاں جائے گا اور میں خدا کے حضور سرخرو نہیں ہو سکوں گا۔ میں اپنی سلطنت کی توسیع نہیں اسلام کا فروغ چاہتا ہوں۔ مجھے تاج سر پر رکھ کر تخت پر بیٹھنے کی سلطنت ہی کب ملے گی۔ مجھے ہندوستان کے بت للکار رہے ہیں۔ راجہ جے پال ہندوستان کی تمام ریاستوں کی فوجوں سے غزنی پر حملے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ میں اُس کی طرف بڑھتا ہوں تو میرے مسلمان بھائی میری پیٹھ پیچھے وار کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے ہندو اور مسلمان ایک ہو گئے ہیں....

"کیا آپ سلمانیوں، طبرستانیوں، غزنویوں، اور ایلمانیوں کو بتا سکتے ہیں کہ ہم سب ایک اُمت ہیں؟ کیا وہ آپ کی بات ذہن نشین کرلیں گے کہ مرکز سے ٹوٹ کر کوئی ایک بھی مسلمان ریاست باقی نہیں رہ سکے گی؟.... خانہ جنگی ابھی ختم نہیں ہوئی۔ مجھے آپ کی حوصلہ افزائی اور دعا کی ضرورت ہے۔ سلطنتِ غزنی کی مالی حالت اچھی نہیں رہی۔ آپ میری مالی مدد نہیں کر سکتے۔ نہ میں آپ سے مالی مدد مانگوں گا۔ میرے لیے دعا کریں۔ میں اللہ سے مدد مانگتا ہوں۔"

بغداد سے خلیفہ القادر باللہ عباسی کا جواب آیا:

"آپ کا پیغام پڑھ کر مجھے افسوس ہوا ہے، حیرت نہیں ہوئی۔ ہماری یہ روایت نئی نہیں کہ اپنے اوپر حکمرانی کا نشہ طاری کر کے اپنے مذہب اور ملی اتحاد کو قربان کر دو۔ یہ لوگ جو آپس کے خون خرابے کا باعث بنے ہوئے ہیں، اسلام کو اپنی اغراض کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ یہ اپنے بھائیوں کا خون بہانے کے لیے عیسائیوں اور یہودیوں تک سے مدد لیتے ہیں۔ اُمتِ رسول اللہ کو اپنی رعایا بنانے کے لیے جھوٹ بول بول کر لوگوں کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکاتے، اکساتے اور خانہ جنگی کے لیے تیار کرتے ہیں۔ یہ ملعونی روایت بن گئی ہے اور یہی ہماری تاریخ بنے گی۔ قوم مسلم کے اُمرا تخت و تاج کے حصول کی خاطر قوم کو گروہوں میں تقسیم کر کے ایک دوسرے کے خون کا پیاسا بنائے رکھیں گے۔ سلطنتِ اسلامیہ ریاستوں میں بٹتی چلی جائے گی۔ کفار انہیں مدد دیتے رہیں گے۔ جلتی پر تیل ڈالتے رہیں گے اور سلطنت کو ٹکڑوں میں کاٹتے چلے جائیں گے....

"یہ اُمرا اور حکمران سمجھ نہیں سکتے کہ مرکز سے کٹ کر ان کی حالت ویسی ہی ہو رہی ہے جیسی درخت سے ٹوٹی ہوئی شاخوں کی ہوتی ہے۔ انہیں پتا پتا ہو کر بکھر جانا اور سوکھ جانا ہے۔ میں ڈرتا ہوں کہ شاخیں اسی طرح ٹوٹ ٹوٹ کر گرتی رہیں تو اسلام کا درخت سوکھ جائے گا....

"خانہ جنگی کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کے لیے اگر آپ کو ایک فیصلہ کن خانہ جنگی لڑنی پڑے تو میں آپ کو اس کی اجازت دیتا ہوں۔ شرط یہ ہے کہ آپ کی نیت میں فتور نہ ہو۔ آپ قوم کو متحد کریں۔ آپ کا مقصد اسلام کا فروغ ہونا چاہیے۔ ہندوستان کے مسلمان ذلت کی زندگی گزار رہے ہیں اور ہندوؤں کے ڈر سے اور ان کی فریب کاریوں سے بھی اسلام سے دستبردار ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ میں آپ کو یہ فرض سونپتا ہوں کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی مدد کو پہنچیں۔ ان کے وقار کا تحفظ کریں۔ ہندوستان کے بت توڑ کر وہاں اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھیں.... اگر آپ کی نیت صاف ہوئی اور آپ کے دل میں جہاد فی سبیل اللہ کا جذبہ ہوا تو اللہ آپ کی مدد کرے گا۔ سلطانی کے لیے لڑنے والوں کو اگر کامیابی حاصل ہوتی بھی ہے تو وہ عارضی ہوتی ہے۔ دائمی فتح ان کی ہوتی ہے جو حق پر ہوتے ہیں۔"

اس پیغام کے ساتھ خلیفہ نے سلطان محمود کو افغانستان، سیستان اور خراسان کی سلطانی کی سند دے کر اسے یمین الدولہ اور امین الملت کے خطابات عطا کیے۔

مشہور مؤرخ اور وقائع نگار محمد قاسم فرشتہ لکھتا ہے کہ راجہ جے پال کے دوسرے حملے کو روکنے میں اور اس کے فوراً بعد خانہ جنگی میں سلطان محمود کی فوج کا جہاں جانی نقصان ہوا وہاں مالی نقصان بھی کچھ کم نہ تھا۔ "فتح البلاد"، "سفرنامہ ابونصر مشکوٰتی" اور ابوالفضل کی تحریریں شاہد ہیں کہ محمود کے دربار میں مختلف علوم کے جتنے عالم تھے، اور جتنی عمدہ فوج محمود کی تھی اور جتنی عمدہ انتظامیہ تھی، اس کی مثال اُس وقت تک کوئی اور مسلمان حکمران پیش نہیں کر سکا تھا، مگر فوج اور سول انتظامیہ کے اس اونچے معیار کو برقرار رکھنے پر بہت خرچ اٹھتا تھا۔ ہندوستان میں اور اردگرد کے دیگر ممالک میں جو جاسوسی

نظام قائم کیا گیا تھا، اس کے اخراجات بھی خاصے زیادہ تھے یہی وجہ ہے کہ سلطان محمود کو مالی پریشانیوں نے گھیر لیا۔

انہی دنوں جب سلطان محمود غزنوی ایک طرف خانہ جنگی میں الجھا ہوا تھا، دوسری طرف ہندوستان کا لشکر غزنی پر حملہ کرنے آ رہا تھا، تیسری طرف مالی پریشانی اور چوتھی طرف یہ عالم کہ جن سے مالی اور فوجی مدد ملنی چاہیے تھی وہ اس کے دشمن ہو گئے تھے، ایک روز اس کے غزنی کے دربار میں دو اجنبی آئے۔ یہ سیستان کے ایک گاؤں کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ان کے گاؤں کو پانی دور سے ملتا تھا۔ انہوں نے گاؤں سے دور ایک ویرانے میں کنواں کھودنا شروع کیا۔ زمین کی سطح کی حالت بتاتی تھی کہ پانی زیادہ گہرائی میں نہیں ہوگا اور زمین نرم ہوگی مگر تین ہاتھ نیچے تک کھدائی کی تو آگے زمین پتھر دل کی سخت ہوگئی۔

"سلطان خراسان و سیستان!" — ایک مسافر نے کہا — "اگر زمین صرف سخت ہوتی اور پتھر کی سلیں ہوتیں تو ہم کھدائی ترک کر دیتے۔ ہم حیران اس پر ہوئے کہ جس نے ہماری کدالوں کو روک لیا ہے وہ چمکتی ہوئی کوئی چیز ہے۔ یہ پتھر نہیں ہو سکتے۔ پتھروں میں ایسی چمک نہیں ہوتی۔ یہ کوئی دھات ہے اور یہ کسی پرانے بادشاہ کا مدفون خزانہ ہے۔ کہتے ہیں کہ جہاں مدفون خزانہ ہوتا ہے وہاں جنات اور خزانہ دفن کرنے والوں کی بدروحیں موجود رہتی ہیں۔ ہم یہ عرض لے کر آئے ہیں کہ اگر یہ خزانہ ہی ہے تو یہ بے نقاب ہو چکا ہے۔ گاؤں والوں پر خوف طاری ہے۔ کوئی بھی خزانے کے قریب نہیں جاتا۔ ہمیں ایک بزرگ نے کہا ہے کہ سلطان کو اطلاع دے دی جائے۔"

سلطان محمود نے اسی وقت ان آدمیوں کے ساتھ اپنے دربار کے دو عالموں اور فوج کے دو چار حاکموں کو اس حکم کے ساتھ بھیج دیا کہ جنات اور بدروحوں سے ڈرنے کی بجائے مزید کھدائی کریں اور معلوم کریں کہ یہ کیا ہے۔

کچھ دنوں بعد سلطان محمود کو اطلاع دی گئی کہ یہ مدفون خزانہ نہیں بلکہ سونے کی کان ہے جو سطح زمین سے صرف چار پانچ ہاتھ نیچے ہے۔ اس کی کھدائی کی گئی تو محکمہ قائم فرشتہ اور گردیزی کے مطابق، خاصے وسیع علاقے میں سونا برآمد ہوا۔ اس کان کی شکل درخت کی سی تھی جیسے درخت گرا کر زمین میں دفن کیا گیا ہو۔ کان، درخت کے ٹہنوں اور ٹہنیوں کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ یہ خالص سونا تھا جو کسی بادشاہ کا مدفون خزانہ نہیں بلکہ زمین کا معدنی خزانہ تھا۔

مذکورہ مؤرخ لکھتے ہیں کہ محمود کے دورِ حکومت میں اس کان سے سونا نکلتا رہا۔ اس کی وفات کے بعد جب اس کا بیٹا مسعود اس کا جانشین ہوا تو وہ اپنے باپ کے الٹ ثابت ہوا۔ اس نے اپنے آپ کو روائتی بادشاہ بنا لیا۔ سلطان محمود نے سلطنتِ غزنی کو خدا کے جس راستے پر ڈالا تھا، وہ راستہ اس کے بیٹے کے دور میں عیش و عشرت اور رنگ رلیوں کی تاریکی میں گم ہوگیا۔ سونے کی اس کان کی دولت رقص و سرود اور جام و مینا میں اڑنے لگی۔ ایک رات شدید زلزلہ آیا۔ زلزلے کا مرکز یہی مقام تھا جہاں سے سونا برآمد ہو رہا تھا۔ وہاں سے زمین پھٹ گئی۔ پھر زمین بیٹھ گئی، اور کان کا پورا علاقہ زمین کے پیٹ میں چلا گیا۔ مسعود نے دور گہرائی تک زمین کھدوا ڈالی لیکن سے مٹی اور پتھروں کے سوا کچھ نہ ملا۔

یہ کان جب برآمد ہوئی تھی اور سلطان محمود غزنوی کو یقین ہو گیا تھا کہ یہ خالص سونا ہے تو وہ اپنے پیر و مرشد ابوالحسن خرقانی کے ہاں حاضری دینے گیا اور انہیں بتایا کہ اس کے باپ نے اس کی پیدائش سے پہلے خواب میں ایک درخت دیکھا تھا جو گھر کے ایک کمرے سے اُگا۔ اٹھا، چھت پھاڑ کر اوپر گیا اور اس نے آدھی دنیا پر اپنے ٹہنوں اور ٹہنیوں کا چھاتہ پھیلا دیا تھا۔

"... اور اس کے بعد میں پیدا ہوا" — محمود نے کہا — "اس خواب کی تعبیر یہ بتائی گئی تھی کہ میں دور دور تک اسلام کی روشنی پھیلاؤں گا۔ اب سونے کی جو کان برآمد ہوئی ہے اس کی شکل بھی درخت کی سی ہے۔ کان گہرائی میں نہیں گئی۔ سطح زمین کے ساتھ ساتھ درخت کی شاخوں کی طرح پھیلی ہوئی ہے۔ پیر و مرشد مجھے بتایئے کہ یہ خدائے ذوالجلال کا کوئی اشارہ ہے؟ کیا ہے؟"

"جو کچھ زمین میں ہے اور جو کچھ آسمانوں میں ہے، اس کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں۔"

— ابوالحسن خرقانی نے کہا ''اور جو تمہارے دل میں ہے خدا کو اس کا بھی علم ہے۔ خدا تمہارے متعلق وہ بھی جانتا ہے جو تم خود بھی نہیں جانتے۔ درخت ایک اشارہ ہے جو تم ہی نہیں، ہر سلطان اور بادشاہ کو سمجھنا چاہیئے۔ خدا ایسے اشارے صرف انہیں دیا کرتا ہے جو اس کے رسولؐ کی اُمت سے ہیں۔ تم نے اگر دل میں خدا اور اُس کے رسولؐ کو جگہ دے رکھی ہے تو اُس کے اشارے کو سمجھو۔ تم نے خدا کی راہ میں جہاد کیا۔ تم نے انہیں بھی شکست دی جو مسلمان ہوتے ہوئے دینِ مسلم سے منحرف ہو گئے اور تخت و تاج کی خاطر حزب اللہ کا خون حزب اللہ کے ہاتھوں بہا دیا۔ تم نے فتح پائی مگر اتنے بدحال ہوئے کہ درہم و دینار کے محتاج ہو گئے۔ تم نے کہا کہ صرف اللہ سے مدد مانگوں گا۔ پس اللہ نے تمہاری مدد کی۔ اپنی زمین کا سینہ چیر کر تیری جھولی بھر دی اور سونا درخت کی شکل میں دیا.....

'' ہر سُلطان کو درخت کی مانند ہونا چاہیئے۔ ایسے درخت کی مانند جو دُھوپ کے جھلسے ہوئے انسانوں کو ٹھنڈی چھاؤں مہیا کرتا ہے۔ زندگی کے کٹھن سفر کے تھکے ہوئے لوگ درخت کے نیچے آ کر تے اور ستاتے ہیں۔ تھکن سے چور جسم تروتازہ ہو جاتے ہیں تو مسافر پہلے سے زیادہ کٹھن سفر کے قابل ہو جاتے ہیں۔ درخت اپنی روزی زمین سے حاصل کرتا ہے، انسان کا خون نہیں چوستا۔ زمین سے ہی لیتا اور لوگوں کو چھاؤں دیتا ہے۔ لوگوں سے لیتا کچھ نہیں ..... محمُود! ٹھنڈی چھاؤں والے گھنے درخت کو تصوّر میں لاؤ۔ اس کی خوبیاں تمہارے سامنے نکھر آئیں گی۔ خدا کا یہ اشارہ نہیں حکم ہے کہ اپنے آپ میں یہ خوبیاں پیدا کرو۔ یہ ذہن میں رکھ لو کہ انسان بڑا بے وفا اور اوچھا ہے۔ درخت کو کاٹ لیتا ہے۔ درخت انسان کو نہیں کاٹتا۔ درخت کٹ جائے تو انسان کے کام آتا ہے۔ اس کا پلنگ بنتا ہے۔ اندھے اور لنگڑے کی لاٹھی بنتا ہے۔ سلطان کا تخت بنتا ہے.....

'' مگر یاد رکھو محمود! جب سلطان اپنے آپ کو انسانوں کا حاکم اور روزی رساں بنا کر اپنے آپ کو درخت کی صفات سے محروم کر لیتا ہے تو تخت الٹتے دیر نہیں لگتی۔ انسان کو دو چیزیں شیطان بناتی ہیں۔ سونا اور سُلطانی۔ وہ انسان بھی شیطان بن جاتا ہے جسے یہ دونوں چیزیں تو حاصل نہ ہوں لیکن وہ اپنے دل میں ان کی ہوس پیدا کر لے۔ جس سر پر

سلطانی کی دستار رکھ دی جائے وہ سر جتنا خدا کے آگے جھکے اتنا ہی بندوں کے آگے جھکے۔ اگر نہیں تو ایسے سلطان کے رکوع و سجود رائیگاں جاتے ہیں کیونکہ یہ دکھاوے کے ہوتے ہیں، اللہ کے بندوں کو فریب دینے کے لیے ہوتے ہیں جس نے اللہ کے بندوں کو جسمانی اور روحانی بھوک دی وہ اللہ کے حضور جا کر دوزخ کو روانہ ہُوا جہاں اس کی رعایا کی آہیں اور فریادیں اور رنج و آلام جو سلطان نے دیئے، وہ سب انگارے بن کر اسے جلاتے رہیں گے، بچھو بن کر اُسے ڈستے رہیں گے.....

'' تُو نے خدا سے مدد مانگی۔ خدا نے تجھے مدد دی مگر دیکھ اور سوچ کہ تُو خدا کا بھیجا ہُوا پیغمبر نہیں، آسمان سے اتارا ہُوا فرشتہ نہیں، پھر خدا نے اپنی زمین کا سینہ چاک کر کے تیری سلطنت کو سونے میں کیوں نہلا دیا؟ یہ سونا تیرا نہیں، تیری سلطنت کا ہے۔ یہ سونا تیری سلطنت کی توسیع کے لیے ہے۔ اگر تُو تخت و تاج کے نشے میں بھول جائے کہ تیرے فرائض کیا ہیں اور بندوں کے کتنے حقوق تیرے سر ہیں تو زمین اپنی دولت نگل لے گی۔ جو خُدا دیتا ہے وہ لے بھی لیتا ہے۔ اس اشارے کو سمجھو محمود!''

اپنے پیر و مرشد ولی ابوالحسن خرقانی سے روحانی فیض حاصل کر کے سلطان محمود نے اپنی توجہ سلطنت کی انتظامیہ اور فوج پر مرکوز کر دی۔ اس نے قوم کو اتنا خوشحال کر دیا کہ لوگ اپنے بیٹوں کو فوج میں بھیجنے لگے۔ سلطان محمود نے حقوق العباد پر سب سے زیادہ توجہ دی۔

سلطان محمود کو ہندوستان کی اطلاع کا انتظار تھا۔

'' اُدھر سے کوئی اطلاع نہ آنے کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ راجہ جے پال شکست تسلیم کر کے بیٹھ گیا ہے'' — سپہ سالار نے کہا ''اس صورت میں ہمیں ہندوستان پر حملے کی تیاری کرنی چاہیئے۔''

'' وہ حملہ ضرور کرے گا'' — سلطان محمود نے کہا ''میں اسے یہ تاثر دینا چاہتا ہوں کہ میں اُس کے ملک پر حملہ کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ کیا یہ بہتر نہیں کہ وہ ایسے حملے سے

دُور ہمارے میدان میں آکر لڑے۔ اگر مجھے اس کی پیش قدمی کی اطلاع قبل از وقت مل گئی تو میں اسے اپنی پسند کے میدان میں لڑاؤں گا۔"

"اب تک لاہور سے کسی نہ کسی کو آجانا چاہیے تھا" ___ سپہ سالار نے کہا ___ "ہمارے آدمی پکڑے نہ گئے ہوں۔"

"چند دن اور انتظار کر لو" ___ سلطان محمود نے کہا ___ "اگر کوئی اطلاع نہ آئی تو میں یہاں سے آدمی بھیج دوں گا۔"

لاہور سے اطلاع جا رہی تھی۔ عمران بلاذری، نظام اوریزی، قاسم بلخی اُس رات جگ موہن، اس کی بہن رشی اور فاطمہ کو ساتھ لے کر لاہور سے نکلے تھے جس رات غزنی کے جاسوس جانبازوں نے لاہور میں راجہ جے پال کی رسد کو نذرِ آتش کیا تھا۔ بڑے پنڈت نے رشی کی جگہ اسی رات ایک اور لڑکی اغوا کروالی تھی اور اسے ٹیلوں والے مندر میں پہنچا دیا تھا۔ یہ لڑکی ہوش میں تھی۔ سب کو دیکھتی تھی۔ اسے جو کہتے تھے وہ کرتی تھی۔ ایک پنڈت اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتا رہتا تھا ___ "مجھے اندرا دیوی کے چرنوں میں قربان کر دو..... مہاراج جے پال کے ماتھے پر میرے خون کا تلک لگا دو..... میرے خون کی چمک دشمن کو اندھا کر دے گی۔"

یہ ایک پُراسرار سا عمل تھا جس میں سے لڑکی کو گزارا جا رہا تھا۔ اُس کے گرد اُسی کی عمر کی لڑکیاں ناچتی اور گاتی رہتی تھیں۔ لڑکی کو خاص قسم کی غذا دی جاتی تھی اور اسے کوئی ایسی چیز کھلائی جاتی تھی جس کے اثر سے اُس کا ذہن اپنے قبضے میں نہیں رہا تھا۔ تین چار دنوں بعد اُس نے وہی کہنا شروع کر دیا جو اس کے ذہن میں ڈالا جا رہا تھا۔ وہ مکمل طور پر ہپناٹائز ہو چکی تھی۔

ایک روز راجہ جے پال کو پنڈت ٹیلوں والے مندر میں لے گئے۔ اُسے پنڈتوں اور سادھوؤں کے جلوس میں مندر کے اندر کئی ہاتھوں والی دیوی کے بُت کے آگے لے جا کر دو زانو بٹھا دیا گیا۔ مندر کی کنواریوں نے اُس پر پھول نچھاور کیے۔ پنڈتوں نے بھجن گائے۔ لڑکی کو ایسے لباس میں راجہ کے سامنے لایا گیا جس میں وہ پری لگتی تھی۔ لڑکی نے بازو پھیلا کر کہا ___ "مجھے اندرا دیوی کے چرنوں میں قربان کر دو۔ مہاراج جے پال کے ماتھے پر میرے

خون کا تلک لگا دو۔"

لڑکی نے اس عمل کے زیرِ اثر جو اس پر کیا جا رہا تھا، سر جھکا دیا۔ ایک پنڈت نے راجہ جے پال کی نیام سے تلوار نکالی۔ اسے راجہ کے سر پر پھیرا اور ایک ہی وار سے لڑکی کا سر اُس کے تن سے جدا کر دیا۔ مندر کے گھڑیال اور گھنٹیاں بجنے لگیں۔ تمام پنڈت، سادھو اور لڑکیاں ہاتھ جوڑ کر دیوی کے بت کے آگے جھک گئیں۔ بڑے پنڈت نے لڑکی کے خون میں انگلی ڈبو کر راجہ جے پال کے ماتھے پر خون کا تلک لگا دیا۔

راجہ جب ان پُراسرار اور ڈراؤنے ٹیلوں سے باہر آیا تو اُس کی گردن تنی ہوئی تھی اور چہرے پر ایسی رونق جیسے اس نے غزنی کی سلطنت فتح کر لی ہو اور محمود غزنوی نے اس کے آگے ہتھیار ڈال دیئے ہوں۔ اس نے اُسی روز جلے ہوئے سامان کی کمی پوری کرنے کے احکام جاری کر دیئے جو اتنے سخت تھے کہ اس کی ریاست کے گھر خالی ہو گئے۔ کسانوں کے ہاں اتنا ہی اناج رہنے دیا گیا کہ وہ صرف زندہ رہ سکیں۔ ہندو رعایا کو پہلے ہی راجہ کا خزانہ بھر رہی تھی۔ مندروں میں پنڈتوں نے لوگوں کے دلوں میں اسلام کے خلاف ایسی نفرت بھر دی تھی کہ اسے مذہب کا فریضہ اور جنون بنا دیا گیا۔ ہندو عورتوں نے زیورات تک راجہ کو دے دیئے۔ راجہ خود ہندو ریاستوں کے مہاراجوں سے ملنے اور فوجی مدد لینے کو نکل کھڑا ہوا۔ اُس نے جیسے قسم کھائی تھی کہ اب کے وہ شکست کھا کر نہیں آئے گا اور غزنی کو ہر قیمت پر اپنی راجدھانی بنائے گا۔

عمران کا قافلہ جس میں نظام اوریزی، قاسم بلخی، جگ موہن، رشی اور فاطمہ شامل تھے، راوی پار کر کے رات بھر چلتا رہا اور وہ لاہور سے بہت دور نکل گئے۔ عمران جاسوس تھا۔ راستوں سے واقف تھا۔ اپنے قافلے کو عام راستے سے دور ہٹ کر لے جا رہا تھا۔ ایک گھنے جنگل میں صبح طلوع ہوئی۔ رشی گھوڑے پر ہی سو گئی تھی۔ عمران نے سب کو وہیں آرام کے لیے روک لیا۔ سب رات بھر کے جاگے ہوئے تھے۔ گھوڑوں کو بھی آرام، چارے اور پانی کی ضرورت تھی۔ ان کا سفر بہت لمبا تھا اور یہ مسافت چوری چھپے طے کرنی تھی۔ رشی کو گھوڑے سے اتارا گیا تو بھی اس کی آنکھ نہ کھلی۔ اسے

لٹا دیا گیا۔ سب لیٹ گئے اور فوراً ہی گہری نیند سو گئے۔

کچھ دیر بعد فاطمہ نے عمران بلاذری کو جگایا اور اُسے پرے لے گئی۔

"تم اس ہندو لڑکی کو بھی ساتھ لے جا رہے ہو اور مجھے بھی" — فاطمہ نے کہا — "میرا مستقبل کیا ہوگا؟"

"اس وقت میرے سامنے سلطنت غزنی کا مستقبل ہے" — عمران نے جواب دیا — "اپنے ملک میں پہنچ کر تمہارے مستقبل کے لیے سوچوں گا۔ میرے فرض کے راستے میں نہ آؤ۔"

"میرے دل میں یا وہم بھر گیا ہے اور یہ مجھے ڈرا رہا ہے" — فاطمہ نے کہا — "تم اپنے ملک کا فرض ادا کر رہے ہو۔ میں نے تمہاری جو مدد کی ہے وہ تمہاری خاطر کی ہے۔ میں نے جو گناہ تمہیں حاصل کرنے کے لیے کیا تھا، اس کا کفارہ اُسی طرح ادا کیا ہے جس طرح تم نے کہا تھا۔ میں یہ دیکھ رہی ہوں کہ تمہیں رشی مل گئی ہے مگر تم مجھے نہیں مل سکو گے۔ اسے تم اپنے لیے لے جا رہے ہو۔"

"کیا تمہاری روح کو چین نہیں آیا؟" — عمران بلاذری نے پوچھا — "یہی رشی تمہیں عزرائیل بن کر ڈرا رہی ہے۔ اب یہ تمہارے ساتھ ہے، تمہیں اس سے ڈر تو نہیں آتا؟ تمہاری روح پر اب گناہ کا کوئی بوجھ نہیں رہا۔"

"میرے ساتھ روح کی باتیں نہ کرو عمران!" — فاطمہ نے نیند اور تذبذب سے بوجھل آواز میں کہا — "میرا جسم بیچا گیا تھا۔ مجھے یہی بتایا گیا ہے کہ جو کچھ ہے جسم ہے۔"

"سنو فاطمہ!" — عمران نے جھنجھلا کر کہا — "معلوم ہوتا ہے ہماری راہیں جدا ہیں، ہماری منزلیں جدا ہیں۔ میں تمہیں اپنا بھید بتا دیتا ہوں۔ میں خدا کی راہ میں لڑنے والا سپاہی ہوں۔ میں تمہارے ملک کا رہنے والا نہیں، میں غزنی کے علاقے کا باشندہ ہوں اور میں غزنی کا جاسوس ہوں۔ یہ دونوں مسلمان اُسی فوج کے عہدیدار ہیں جس نے راجہ جے پال کو دو بار شکست دی ہے۔ یہ دونوں پکڑے گئے تھے اور

وہ یہیں راجہ کی قید میں تھے۔ میں نے انہیں فرار کرایا ہے۔ تم جسم کے حسن اور جسم کی خواہشات پر قربان ہوتی جا رہی ہو۔ ہم جسمانی خواہشات قربان کر چکے ہیں۔ یہ بہن بھائی ہندو ہیں اور اپنے مذہب سے منحرف ہو چکے ہیں۔ یہ فرض بھی میں نے اپنے اوپر لے لیا تھا کہ انہیں کفر سے نکالوں۔ اب تمہیں ثابت کرنا ہے کہ اسلام ایک عظیم مذہب ہے۔ اب جسم کی باتیں چھوڑ دو۔ ہم دشمن کے ملک سے گزر رہے ہیں۔ موت ہمارے تعاقب میں ہے۔ تمہیں اپنے مذہب کی عظمت پر قربان ہونے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔"

عمران جذباتی انداز سے حقیقت کی باتیں کر رہا تھا مگر فاطمہ کے چہرے پر اکتاہٹ سی تھی جیسے عمران کی بات اس کی سمجھ سے بالا ہو، یا وہ سمجھنا ہی نہ چاہتی ہو۔ اُس کے خیالوں میں اپنا ماضی تھا جس میں وہ عمران کے حال اور غزنی کے مستقبل کو فنا کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ اس نے کوئی بات کی تو دیکھا کہ عمران اُس کی طرف متوجہ نہیں۔ اس کی نظریں اپنے سامنے کہیں اور جمی ہوئی تھیں۔ عمران کے منہ سے سرگوشی نکلی — "رشی" — اور وہ اٹھ کر چل پڑا۔ فاطمہ نے دیکھا، رشی آہستہ آہستہ اس طرح چلی آ رہی تھی جیسے خواب میں چل رہی ہو۔

عمران آہستہ آہستہ چلتا اُس کی طرف گیا۔ رشی نے قریب آ کر باہیں عمران کے گلے میں ڈال دیں، پھر چہرہ اس کے سینے سے لگا کر بچے کی طرح گال اس کے سینے سے رگڑنے لگی۔ عمران نے اُس کا سر اٹھایا۔ فاطمہ قریب بیٹھی دیکھ رہی تھی اور اُس کا خون کھول رہا تھا۔

"میں کہاں تھی؟" — رشی نے حیرت زدہ سرگوشی کی — "تم کہاں تھے؟ ہم کہاں ہیں؟ میرا بھائی اور دو آدمی وہاں پڑے ہیں۔ وہ زندہ ہیں؟" — اُس نے فاطمہ کو دیکھا تو عمران سے الگ ہو کر بولی — "یہ کون ہے؟ تمہاری بہن تو نہیں ہو سکتی۔ اسے کہاں سے لائے ہو؟"

"ہوش ٹھکانے کرو رشی! سب کچھ بتا دوں گا" — عمران نے کہا اور اسے بٹھا لیا — "ہم تمہیں پنڈتوں سے چھین لائے ہیں۔"

"یاد آ گیا ہے" — رشی نے کہا — "مجھے پنڈت دیوی پر قربان کرنے کے

لئے پہنے آئے تھے۔ پھر معلوم نہیں کیا ہوا تھا.... وہ کہاں ہیں؟ میں شاید خواب دیکھ رہی ہوں۔"

"اس لڑکی کا نام فاطمہ ہے" — عمران نے کہا "یہ ہماری مدد نہ کرتی تو ہم وہاں تک کبھی بھی نہ پہنچ سکتے جہاں تمہیں دنیا کی نظروں سے اوجھل کر دیا گیا تھا۔"

عمران بلاذری نے اُسے تفصیل سے بتا دیا کہ اسے پنڈت کس طرح اور کہاں لے گئے تھے اور اسے وہاں سے آزاد کرانے کے لیے کس طرح فاطمہ کو استعمال کیا گیا تھا۔ عمران نے یہ بھی اسے بتا دیا کہ فاطمہ ایسے بوڑھے خاوند سے بھاگی ہے جس کی پہلے ہی دو بیویاں ہیں۔ رتی کو فاطمہ اس لحاظ سے تو اچھی لگی کہ اس نے اُسے موت کے منہ سے بچایا ہے مگر اس کی عمر اس کی شکل و صورت اور جسم کا حسن دیکھ کر رتی کے دل میں عمران کے متعلق وسوسے پیدا ہو گئے۔ وہ فاطمہ کو شکی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

اتنے میں نظام اور یزی اور جگ موہن آ گئے۔ وہ رتی کو ڈھونڈ رہے تھے۔ رتی کے دماغ سے اُس دوائی کا اثر اُتر چکا تھا جو اسے شیلوں والے مندر میں پلائی جاتی رہی تھی۔ اسے بالکل یاد نہیں تھا وہ کہاں رہی ہے اور اس کے ساتھ کیا سلوک ہوتا رہا ہے۔

"دوستو!" — عمران نے کہا "ہمارے سامنے بڑی ہی لمبی اور بڑی خطرناک مسافت ہے۔ میرے پاس سونے کے کچھ سکے ہیں جو راستے میں کام آئیں گے لیکن ہم جنگل سے ہی پانی اور خوراک حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔"

"تم نے مجھے بتایا تھا کہ رتی مل گئی تو ہم واپس نہیں آئیں گے" — جگ موہن نے کہا۔ "اس لیے میں گھر سے بہت کچھ چرا لایا ہوں" — اس نے کپڑوں کے نیچے کمر بند کے ساتھ بندھی ہوئی ایک تھیلی کھولی۔ اس میں نقدی کے علاوہ رتی کے زیورات تھے۔

فاطمہ کو بھی عمران نے کہا تھا کہ وہ اُسے اپنے ساتھ لے جائے گا اس لیے وہ بھی نقدی اور زیورات اپنے ساتھ لے آئی تھی۔ نظام اور یزی نے مسلمانوں کے دستور کے مطابق عمران کو میر کارواں قرار دے دیا اور کہا کہ یہ تمام زر اور مال عمران کے حوالے کر دیا جائے

اور اب منزل تک اسی کا حکم چلے گا۔ سب نے یہ فیصلہ منظور کر کے نقدی اور زیورات عمران کے حوالے کر دیئے۔ یہ اچھا خاصا خزانہ تھا۔ اس میں چاندی کے سکے بھی تھے۔ وزن اتنا تھا جو کمر بند کے ساتھ باندھ کر نہیں اٹھایا جا سکتا تھا۔ یہ چمڑے کی ایک تھیلی میں ڈال دیا گیا اور تھیلی عمران نے اپنی تحویل میں لے لی۔ اس نے سب کو خبردار کر دیا کہ راستے میں ڈاکوؤں کا خطرہ ہے۔ اس تھیلی کے علاوہ ڈاکوؤں کے لیے دوسری کشش وہ لڑکیوں کی تھی جو عمر اور حسن کے لحاظ سے ہر کسی کی نظروں کو گرفتار کر لیتی تھیں۔ ڈاکوؤں، رہزنوں اور راجہ کے مخبروں سے بچنے کا طریقہ یہ تھا کہ رات کو سفر کیا جائے۔ چونکہ غزنی جلدی پہنچنا تھا اس لیے کم سے کم آرام اور قیام کرنا تھا۔

سورج غروب ہو گیا تو وہ چل پڑے۔ فاطمہ عمران کے پیچھے سوار ہوئی اور رتی جگ موہن کے پیچھے۔ چلتے چلتے قاسم ملمی نے اپنا گھوڑا پیچھے کر لیا۔ اس کی مجبوری یہ تھی کہ وہ اپنی زبان کے سوا اور کوئی زبان نہیں سمجھتا تھا۔ نظام اور یزی کی بھی یہی مشکل تھی۔ صرف عمران تھا جو ان کی زبان سمجھتا اور بولتا تھا اور وہ ہندوستان کی زبان بھی اپنی مادری زبان کی طرح روانی سے بول سکتا تھا۔ ملمی کو پیچھے ہٹتا دیکھ کر نظام اور یزی نے بھی گپ شپ لگانے کے لیے اپنا گھوڑا پیچھے کر کے قاسم ملمی کے ساتھ کر لیا۔ ملمی نے گھوڑا اور آہستہ کر کے عمران وغیرہ سے زیادہ فاصلے پر کر لیا۔

"کیا تم اس عمران پر اعتماد کر سکتے ہو جو دو جوان لڑکیاں اپنے ساتھ لے جا رہا ہے؟" — قاسم ملمی نے اور یزی سے پوچھا "تم نے اتنا زیادہ خزانہ بھی اس کے حوالے کر دیا ہے۔ یہی دو چیزیں انسان کا ایمان برباد کیا کرتی ہیں.... سونا اور حسین عورت۔"

"اگر عمران قابلِ اعتماد نہ ہوتا تو ہمیں فرار کرانے کی بجائے اس ہندو لڑکی کو پنڈتوں کے قبضے میں جلنے سے پہلے ہی اپنے ساتھ لے کر لاہور سے غائب ہو گیا ہوتا" — نظام اور یزی نے کہا۔ "فاطمہ کو اس نے غیر معمولی دانشمندی سے استعمال کیا ہے۔ چونکہ یہ لڑکی اپنے خاوند سے بھاگنا چاہتی تھی اس لیے عمران نے سلطنت کے قانون کے پیشِ نظر فاطمہ کو خاوند سے نجات دلائی ہے۔"

"ان دونوں لڑکیوں کا غزنی کی سلطنت کے نفع و نقصان کے ساتھ کیا تعلق ہے؟" — قاسم بلخی نے کہا — "یہ اس شخص کی عیاشی کا ذاتی انتظام ہے اور اس کے اخراجات یہ سلطنت کے خزانے سے پورے کر رہا ہے۔ مجھے اس پر اعتماد نہیں رہا۔ تم نے یہ بھی نہیں سوچا کہ فاطمہ خاوند والی عورت ہے۔ جب تک طلاق نہ لے، اس کی شادی کسی اور کے ساتھ نہیں ہو سکتی۔ تم دیکھ لینا عمران اسے اپنی داشتہ بنا لے گا اور اس ہندو لڑکی کو مسلمان کر کے اس کے ساتھ شادی کرے گا۔"

"مجھے تمہاری باتوں سے بد اعتمادی کی نہیں حسد کی بُو آ رہی ہے" — نظام اوریزی نے کہا — "تم اپنا دھیان ان لڑکیوں سے ہٹا لو۔ تمہیں شاید احساس نہیں کہ قید سے ہماری رہائی ہماری کتنی بڑی خوش نصیبی ہے۔ ہمیں اس کافر راجے کے قید خانے میں تڑپ تڑپ کر مرنا تھا۔ ہم مجاہد میدانِ جنگ میں مرنے کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔ ہمیں غزنی پہنچ کر اپنی فوج میں شامل ہونا اور ہندوستان کے کفار کے خلاف لڑنا ہے۔ عمران کسی کو داشتہ رکھتا ہے، کسی کے ساتھ شادی کرتا ہے، ہمارا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے۔"

"ہم فوج کے عہدیدار ہیں" — قاسم بلخی نے کہا — "عمران کا رتبہ ہم سے کم ہے۔ میں اس کے ذاتی کردار کی اصلاح کر سکتا ہوں۔"

"ہم اسے اس سفر میں اپنا امیر مقرر کر چکے ہیں" — نظام اوریزی نے کہا — "اس نے کوئی غلط حرکت کی تو ہم اسے روکیں گے مگر اس کی ذاتی سطح پر ہم کوئی بات نہیں کریں گے۔ ہمیں صحیح سلامت اور بہت جلد غزنی پہنچنا اور سلطان کو خبردار کرنا ہے کہ وہ راجہ جے پال کا حملہ روکنے کی تیاری کر لے۔"

"تم سادہ لوح انسان ہو" — قاسم بلخی نے کہا — "یہ شخص ہمیں دھوکہ دے گا۔"

اُدھر فاطمہ عمران بلاذری کے پیچھے سوار اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھے ہوئے تھی۔ اُس کا جسم گھوڑے کی چال کے ساتھ عمران کے جسم سے مس کرتا جا رہا تھا۔ عمران محسوس کر رہا تھا کہ فاطمہ کی باتوں میں نشے کی کیفیت ہے۔

"تمہیں یہ ہندو لڑکی کیسی آتی اچھی لگتی ہے؟" — فاطمہ نے پوچھا — "وہ مجھ سے زیادہ خوبصورت تو نہیں۔"

"فاطمہ!" — عمران نے کہا — "میں جو باتیں تمہیں کر چکا ہوں انہیں دُہرانے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ میں تمہیں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مسلمان عورت کو غیر مسلم عورت سے مختلف اور بلند ہونا چاہیئے۔ میں اس وقت جسم سے کوئی سروکار نہیں رکھتا۔ تم بہت حسین ہو۔ تمہارا جسم آگ کی مانند ہے جو مجھ جیسے جوان آدمی کے دین و ایمان کو جلا کر راکھ کر سکتا ہے اور تم کوشش کر رہی ہو کہ میں تمہاری آگ کی لپیٹ میں آ جاؤں لیکن میں دنیاوی لذتوں سے دستبردار ہو چکا ہوں۔ میرے ساتھیوں نے مجھے اپنا امیر منتخب کیا ہے۔ میں نے اپنی خواہشات اور اپنے جذبات قافلے پر قربان کر دیئے ہیں۔ امیر مختصر قافلے کا ہو یا پوری قوم کا، اسے اپنی ذات، اپنی خواہشات اور اپنی تمناؤں سے دستبردار ہونا پڑتا ہے۔ اُس کے ذہن میں دوستی اور دشمنی کا تصور بھی بدل جاتا ہے۔ اُسے قافلے اور قوم کے مفادات دیکھنے پڑتے ہیں۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو وہ قوم کا مجرم ہے، غدار ہے۔"

"تم پتھر کے بُت ہو" — فاطمہ نے جھنجھلا کر کہا — "بے جان بُت جن کی پوجا اتنی خوبصورت ہندو عورتیں کرتی ہیں مگر تراشے ہوئے ان پتھروں کے اندر نہ کوئی احساس پیدا ہوتا ہے نہ کوئی جذبہ۔"

اور عمران یوں ہنس پڑا جیسے اُس نے حسین پجاریوں اور پتھر کے بتوں کا مذاق اڑایا ہو۔

اُسی روز کا ذکر ہے کہ ایک پڑاؤ میں فاطمہ عمران کے سامنے اپنے اُبلتے کھولتے ہوئے جذبات کو سرد کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی تشنگی بڑھتی جا رہی تھی مگر عمران کا رویہ وہی تھا جو پہلے روز تھا۔

"تم پتھر ہو" — فاطمہ نے دیوانگی کی کیفیت میں عمران کے منہ پر تھپڑ مار کر کہا — "تم مٹی کی ڈھیری ہو" — اور وہ اُٹھ کر پرے چلی گئی۔

قافلہ پشاور سے ہٹ کر گزرتا اُن پہاڑیوں میں داخل ہو چکا تھا جہاں آج کا درہ خیبر ہے۔ عمران اس راستے سے واقف تھا۔ اس سلسلۂ کوہستان میں پانی کی قلت تھی۔ عمران اس میں داخل ہونے سے پہلے ایک گاؤں میں جا کر قافلے کے کھانے کی چیزیں لے آیا تھا۔ اُس نے سب کو خوشخبری سنائی تھی کہ اب وہ محفوظ علاقے میں آ گئے ہیں جہاں پکڑے جانے کا خطرہ نہیں رہا۔

اسی علاقے میں انہوں نے قیام کیا۔ موسم گرمیوں کا تھا اور یہ پہاڑ بے آب و گیاہ تھے۔ دن کے وقت ان سے شعلے نکلنے لگتے تھے۔ پتھر دہکتے انگاروں کی طرح گرم رہتے تھے۔ آدھی رات تک قافلہ چلتا رہا، پھر آرام کے لیے رک گیا۔ گھوڑے الگ باندھ دیئے گئے۔ سب اِدھر اُدھر لیٹ گئے۔ عمران ہر رات کی طرح سب سے ہٹ کر لیٹا۔ تھکن نے سب کو فوراً سُلا دیا۔ چاند جو آدھی رات کے بعد اوپر آیا کرتا تھا پہاڑیوں کے عقب میں اُبھرا آ رہا تھا۔

قاسم بلخی کی آنکھ کھل گئی۔ اُس نے اپنے قریب سے ایک سایہ گزرتے دیکھا۔ بلخی اُٹھ بیٹھا۔ اُس کے ہم سفر اُس سے دُور دُور گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ قاسم بلخی نے سرگوشی کی — "فاطمہ!" — سایہ رک گیا۔ وہ فاطمہ ہی تھی مگر قاسم بلخی فاطمہ کے علاوہ اور کوئی ایسا لفظ نہیں بول سکتا تھا جو فاطمہ سمجھ سکتی۔ اس نے اشاروں میں اپنا مدعا فاطمہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔ اُس طرف اشارہ کیا جدھر عمران سویا ہُوا تھا۔ پھر نفرت کا اظہار کیا۔ اُس نے اشارے کیے جو فاطمہ سمجھ گئی۔ وہ اسے کہہ رہا تھا کہ عمران اچھا آدمی نہیں اور وہ اسے (فاطمہ کو) دھوکہ دے رہا ہے۔ وہ رشی کے ساتھ شادی کرے گا۔ یہ فاطمہ نے اپنے اتنے قیمتی زیورات عمران کو دے کر غلطی کی ہے۔

قاسم بلخی نے اُس کے ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پر رکھ لیے، پھر اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ فاطمہ کے دہکتے ہوئے جذبات نے اس کے جسم کو تنور بنا رکھا تھا جس میں اس کی رُوح جل گئی تھی۔ فاطمہ ان اشاروں کو سمجھ گئی۔ بلخی نے اُسے اس طرح اپنے بازوؤں میں لے لیا تھا جس طرح وہ عمران کو اپنے بازوؤں میں جکڑ لینے کو بیتاب رہتی تھی۔ قاسم بلخی کے بازوؤں کا گھیرا اور تنگ ہُوا تو فاطمہ کے ذہن میں عمران کی تصویر دھندلی ہونے لگی۔

قاسم بلخی اُسے ذرا اور پرے لے گیا اور ایک جگہ بٹھا کر دبے پاؤں عمران کے قریب چلا گیا۔ عمران تھکن اور جوانی کی گہری نیند سویا ہُوا تھا۔ چمڑے کی وہ تھیلی جس میں سونے کے سکوں اور زیورات کی شکل میں زادِ راہ بند تھا عمران کے سر کے قریب پڑی تھی۔ بلخی نے نہایت آہستہ آہستہ تھیلی کی طرف ہاتھ بڑھایا اور تھیلی اٹھا لی۔ عمران کی آنکھ نہ کھلی۔ بلخی جس طرح دبے پاؤں آیا تھا اسی طرح دبے پاؤں چلا گیا۔ اُس نے فاطمہ کو تھیلی دی اور اُسے اپنے ساتھ گھوڑوں تک لے گیا۔ گھوڑے کچھ دُور بندھے تھے۔ بلخی نے دو گھوڑوں پر زینیں ڈالیں۔ ایک گھوڑے کی لگام فاطمہ کے ہاتھوں میں دی، دوسرے کی خود پکڑی اور نہایت آہستہ آہستہ دونوں چل پڑے۔

کچھ دور پیدل چلے۔ قاسم بلخی نے فاطمہ کو گھوڑے پر سوار ہونے کا اشارہ کیا۔ اس نے سر ہلا کر بتایا کہ وہ گھوڑ سواری نہیں کر سکتی۔ بلخی نے اس کے گھوڑے کی لگام اپنے گھوڑے کی زین کے ساتھ باندھ لی اور فاطمہ کو اپنے گھوڑے پر اپنے آگے سوار کر لیا۔ تھیلی فاطمہ کے ہاتھ میں تھی۔ بلخی نے ایک بازو فاطمہ کے گرد لپیٹ کر اُس کی پیٹھ اپنے ساتھ لگا لی اور گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ اُسے اب بھاگنا تھا۔ دو گھوڑے سرپٹ دوڑے تو ان کے ٹاپوؤں کی آواز بے آب و گیاہ وادیوں میں گونجی۔

سب سے پہلے عمران کی آنکھ کھلی۔ رات کے سناٹے میں دو گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز اتنی بلند سنائی دے رہی تھی جیسے بالکل قریب ہوں۔ عمران نے سب سے پہلے تھیلی دیکھی۔ وہاں تھیلی نہیں تھی۔ نظام اور یزی اور جگ موہن بھی جو جاگ چکا تھا، جاگ اُٹھے۔ انہوں نے جا کر اپنے گھوڑے دیکھے۔ دو گھوڑے غائب تھے۔ قاسم بلخی اور فاطمہ بھی نہیں تھے۔

"وہ دُور نہیں گئے ہوں گے" ـــ نظام اودیزی نے عمران سے اپنی زبان میں کہا ـــ "چلو ہم دونوں ان کا پیچھا کرتے ہیں میں اس شخص کو اپنے ہاتھوں قتل کروں گا۔"

"نہیں" ـــ عمران نے کہا ـــ "وہ جس لڑکی کو لے گیا ہے وہ ہماری ملکیت نہیں تھی اور وہ جو رقم اور زیورات لے گیا ہے، وہ سلطنتِ غزنی کا خزانہ نہیں تھا۔ انہیں پکڑنا ہمارے فرائض میں شامل نہیں بلکہ فرض سے انحراف ہے۔ ... نظام بھائی! میں تم دونوں کو لاہور کی قید سے اسی لیے جلدی فرار کرانا چاہتا تھا کہ راجہ کا اگلا حربہ یہ ہوتا کہ تم دونوں کے درمیان ایک بڑی ہی حسین ہندو لڑکی بٹھا دی جاتی، پھر تم دونوں بھول ہی جاتے کہ تمہارا وطن کون سا اور تمہارا مذہب کیا ہے۔ تم ہندو راج کے آلۂ کار بن کر اپنی سلطنت کے لیے خطرہ بن جاتے۔ یہ نسوانی حُسن اور سونے کا جادو ہے جو پتھر دلوں کو موم کر دیا کرتا ہے۔ یہ دین وایمان کا بڑا ہی سخت امتحان ہوتا ہے۔"

گھوڑوں کی آواز بہت دور چلی گئی تھی اور تھوڑی دیر بعد رات کے سناٹے میں تحلیل ہو گئی۔

"میری تو نیند اڑ گئی ہے" ـــ نظام اودیزی نے کہا ـــ "چلو چل پڑیں۔"

ایک گھوڑے پر رشی کو اور دوسرے پر جگ موہن کو سوار کیا گیا۔ عمران اور اودیزی پیدل چل پڑے۔ انہوں نے طے کیا کہ وہ باری باری گھوڑے پر سوار رہوں گے۔ رشی کے گھوڑے کی باگ عمران نے پکڑ لی اور وہ گھوڑے کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

"وہ فاطمہ کو زبردستی لے گیا ہوگا" ـــ رشی نے کہا۔

"نہیں" ـــ عمران نے کہا ـــ "مجھے یقین ہے وہ خود گئی ہے، بلکہ وہ قاسم کو ساتھ لے گئی ہے۔ اچھا ہوا کہ وہ چلی گئی ہے۔"

صبح طلوع ہوئی تو قاسم بلمی اور فاطمہ بہت دور نکل گئے تھے۔ وہ گھوڑے کو دوڑاتے رہے تھے۔ دوسرا گھوڑا ساتھ ساتھ دوڑتا جا رہا تھا۔ وہ بلمی کے گھوڑے

کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ قاسم بلمی اُس راستے پر جا رہا تھا جو اُن فوجوں نے بنایا تھا جو ہندوستان پر حملہ آور ہوتی رہی تھیں۔ بلمی اسی راستے سے قیدی کی حیثیت سے راجہ جے پال کی بچی کچھی فوج کے ساتھ آیا تھا۔ یہ واحد راستہ تھا جس پر بھٹکنے کا خطرہ نہیں تھا، مگر سورج پہاڑوں کے عقب سے اُبھرا تو قاسم بلمی کو پہاڑوں کا ایک ایک پتھر نظر آنے لگا۔ تب اُسے خیال آیا کہ وہ مجرم ہے، چور ہے اور وہ دور سے نظر آسکتا ہے۔ یہ خطرہ تو تھا ہی کہ عمران اور نظام اودیزی اس کے تعاقب میں آئیں گے، اسی لیے وہ گھوڑا اُڑائے لیے جا رہا تھا۔ وہ پرانا سپاہی اور تجربہ کار سوار تھا مگر ذہن پر جرم کا جو بوجھ تھا، اس نے اُسے سوچنے ہی نہ دیا کہ گھوڑے تھک جائیں گے۔ علاقہ میدانی نہیں، پہاڑی تھا۔ راستہ گھومتا اور اوپر ہی اوپر چڑھتا جا رہا تھا۔

اس گھوڑے کی حالت تو بہت بُری ہو چکی تھی جس پر وہ فاطمہ کے ساتھ سوار تھا۔ اس کا پسینہ اتنا پھوٹ رہا تھا کہ جسم سے ٹپک رہا تھا۔ سانسیں پھول گئی تھیں۔ دوسرے گھوڑے کی حالت اس لیے کچھ بہتر تھی کہ اس کی پیٹھ پر وزن نہیں تھا۔ قاسم بلمی نے گھوڑا روک لیا۔ اِدھر اُدھر دیکھا۔ گھاس کی کہیں ایک پتی بھی نظر نہیں آتی تھی نہ کہیں پانی کا نام ونشان تھا۔ اس خطرے کے پیش نظر کہ اس کے ساتھی اس کے تعاقب میں آ رہے ہوں گے، وہ راستے سے اُتر گیا اور ایک عمودی چٹان کے سائے میں جا رُکا۔ ذرا سی دیر گھوڑوں کو آرام دیا پھر وہ دوسرے گھوڑے پر سوار ہو گئے اور اوپر آ کر راستے پر چل پڑے۔ بلمی نے فاطمہ کو رات کی طرح اپنے آگے بٹھا رکھا تھا۔ رقم والی تھیلی فاطمہ کے ہاتھ میں تھی۔ بلمی نے اس گھوڑے کو بھی دوڑانا شروع کر دیا۔

اُس کے تعاقب میں کوئی بھی نہیں آ رہا تھا۔ عمران اپنے ساتھیوں کے ساتھ انسان کے پیدل چلنے کی رفتار سے چلا جا رہا تھا۔ وہ باری باری گھوڑے پر سوار ہوتے تھے۔ رشی کو سوار ہی رہنے دیا گیا۔ سورج اوپر آ گیا تو بھی وہ چلتے گئے۔ پہاڑوں کا سایہ انہیں فائدہ دے رہا تھا۔ گرمی بڑھ رہی تھی۔ پہاڑ جھلسنے لگے تو انہوں نے راستے سے اتر کر ایک جگہ دیکھ لی جہاں شام تک سایہ رہ سکتا تھا۔ عمران نے اپنے قافلے کو شام تک کے لیے وہاں روک لیا۔

قاسم بلمی کہیں رکنے سے ڈر رہا تھا جس جسم کی لذت کی خاطر وہ خزانے کی تھیلی اور ایک حسین لڑکی کو ساتھ لے آیا تھا، وہ جسم توانائی اور دلکشی سے خالی ہوتا جا رہا تھا۔ فاطمہ نے اپنے پہلوؤں پر ہاتھ رکھ کر اور چہرے پر درد کا تاثر پیدا کر کے قاسم بلمی کو اشاروں میں سمجھایا کہ مسلسل سواری اور گھوڑے کے دوڑنے سے اُس کی پسلیوں اور پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔ بلمی نے مسکرا کر اپنا ایک بازو اس کے سینے کے گرد لپیٹ کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ فاطمہ نے سر اپنا پیچھے کر دیا کہ بلمی کا گال فاطمہ کے رخسار کے ساتھ لگ گیا مگر اُس نے محسوس کیا کہ فاطمہ اب اتنی حسین اور دلکش نہیں رہی جتنی پہلے تھی۔ وہ اپنے اوپر فاطمہ کا بوجھ محسوس کرنے لگا۔ اُس نے فاطمہ کو آگے کر کے اپنے جسم سے الگ کر دیا۔

پسینے سے دونوں کے کپڑے اُن کے جسموں کے ساتھ چپک گئے تھے۔

قاسم بلمی کو کوفت سی بھی محسوس ہوئی پھر اسے غصہ بھی آنے لگا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ یہ گھوڑا بھی تھک گیا تھا۔ مسلسل چڑھائی چڑھتے چڑھتے گھوڑے کا دم خم ختم ہو گیا تھا۔ دوسرا گھوڑا پہلے ہی تھکا ہوا تھا۔ یہ دونوں گھوڑے فوج کے نہیں بلکہ سرائے کے اصطبل میں بندھے رہنے والے کرائے کے گھوڑے تھے جو لوگ تھوڑے سے فاصلے تک جانے کے لیے کرائے پر لے جایا کرتے تھے۔ جنگ موہن بھی یہ گھوڑے یہ کہہ کر لایا تھا کہ مہمانوں کو ساتھ والے گاؤں تک لے جانا اور لانا ہے۔ یہ گھوڑے پہاڑی علاقے میں زیادہ دیر تک بھوک اور پیاس بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

قاسم بلمی کے پاس اس کا یہ علاج تھا کہ تعاقب کو ناکام کرنے کے لیے راستے سے ہٹ کر چلے اور وادیوں کے اندر اندر سے چھوٹا راستہ تلاش کرے۔ وہ گھوڑوں کو نیچے لے گیا۔ سورج سر پر آ گیا تھا۔ پہاڑوں نے ایسی تپش اگلنی شروع کر دی جو برداشت نہیں ہوتی تھی۔ دونوں گھوڑے سے اتر کر چلنے لگے۔ فاطمہ چند قدم چل کر ہار گئی۔ اُسے بار [?] ڈرانے لگے۔ بلمی نے اشاروں میں اس کی حوصلہ افزائی کی اور مسکرایا بھی، مگر بلمی کا اپنا حوصلہ ٹوٹ رہا تھا۔ گھوڑے اب وزن کے بغیر بھی قدم گھسیٹ کر چل رہے تھے۔ بلمی نے ایک چٹان کا سایہ دیکھا اور وہیں بیٹھ گیا۔ فاطمہ اس کے قریب ڈھیر ہونے کے انداز سے بیٹھ گئی۔ رقم اور زیورات کی پوٹلی اس کے ہاتھ میں تھی جسے اس نے قاسم بلمی کے آگے یوں

پھینک دیا جیسے اس کے ساتھ اُسے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ گھوڑے بے چینی سے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔

فاطمہ نے ہاتھ ہونٹوں سے لگا کر بتایا کہ وہ پیاس سے مری جا رہی ہے۔ قاسم بلمی نے سر ہلا کر بتایا کہ یہاں پانی ملنا مشکل ہے۔ فاطمہ نے اشارہ کیا کہ اِدھر اُدھر دیکھتے ہیں۔ بلمی اٹھا اور پانی کی تلاش میں چلا گیا۔ بہت دیر بعد مایوس واپس آیا اور فاطمہ کے پاس بیٹھ گیا۔

سورج غروب ہونے کے بعد عمران کے قافلے نے وہ خشک میوے کھائے جو وہ پشاور کے قریب کے ایک گاؤں سے خرید لایا تھا۔ پانی کا ایک چھوٹا مشکیزہ ابھی باقی تھا۔ تینوں نے پانی پیا اور چل پڑے۔ وہ قاسم بلمی اور فاطمہ سے بہت دُور تھے۔

"ہمارا سفر تھوڑا رہ گیا ہے۔" عمران نے کہا۔ "مگر سفر کا یہی حصہ دشوار اور صبر آزما ہے۔ گھوڑے پیاسے ہیں۔ انہیں ہم دوڑا نہیں سکتے۔ یہ پیاسے نہ ہوں تو بھی پہاڑی علاقے میں دوڑنے کے قابل نہیں۔ ہمیں غزنی پہنچنا ہے۔ ہمیں اچھی قسم کا ایک گھوڑا مل گیا تو ہم میں سے ایک آدمی تیزی سے جا سکتا ہے۔ اگر کوئی سوار مل گیا تو میں اسے قتل کر دوں گا۔ ہمیں گھوڑا چاہیے۔"

"عمران!" — رتی نے ہنس کر کہا۔ "تم اسلام کو خدا کا مذہب کہتے ہو۔ اپنے خدا سے کہو نا، گھوڑوں کو پانی دے دے۔"

"کہنے کی ضرورت نہیں۔" — عمران نے بڑے شگفتہ لہجے میں کہا۔ "یہ گھوڑے پیاس سے نہیں مریں گے۔ ہم خدا کی راہ پر چلے جا رہے ہیں۔ ہم نے یہ سارا سفر خدا کی عافیت میں طے کیا ہے۔ راج جے پال نے نظام اور یزی اور قاسم بلمی کو پکڑنے کے لیے پشاور سے آگے تک راستے روک رکھے ہیں مگر ہم نکل آئے ہیں۔ میں تمہیں اب اپنے متعلق ایک راز بتاتا ہوں۔ میں ملتان کا نہیں غزنی کے علاقے کا رہنے والا ہوں۔ میں غزنی کا جاسوس ہوں اور میرے دونوں ساتھی غزنی کی فوج کے عہدیدار ہیں جو راجہ کے قیدی تھے۔ میں نے انہیں فرار کرایا ہے۔ میں نے تمہیں بھی موت کے منہ سے نکالا ہے۔ چونکہ یہ دونوں کام خدا کی خوشنودی کے لیے کیے ہیں اس لیے خدا نے میری مدد کی ہے

اور وہ دونوں گناہگار ہمیں لوٹ کر بھاگ گئے ہیں۔ ان کا انجام بھیانک ہوگا۔ ہمارے دلوں میں اللہ کی خوشنودی رہی تو یہ پھر ہمیں [illegible] پالا دیں گے"

اور پھر انہوں نے انہیں پانی دیا۔ آدھی رات گزر گئی تھی۔ چاند اوپر آ گیا تھا۔ گھوڑے اپنی چال چلے جا رہے تھے۔ دائیں طرف ایک وادی راستے سے آ ملتی تھی۔ وہاں جا کر دونوں گھوڑے رک گئے۔ لگامیں جھٹکنے پر بھی نہ چلے۔ عمران نے گھوڑوں کے منہ دیکھے۔ دونوں گھوڑے نتھنے پھُلا رہے تھے اور دونوں وادی کی طرف دیکھتے تھے۔ دونوں آہستہ سے ہنہناتے اور وادی کی طرف چل پڑے۔

"اتر آؤ رشی" ——— عمران نے گھوڑے کے پہلو میں جا کر رشی کو اپنی باہوں میں لے کر اتارا اور کہا ——— "انہوں نے پانی کی مشک لے لی ہے۔ پانی قریب ہی ہوگا۔"

دوسرے گھوڑے پر نظام اوریزی سوار تھا۔ وہ بھی اُتر آیا۔ دونوں گھوڑے وادی کے اندر دوڑ پڑے۔ قدرت نے جانوروں کو یہ وصف عطا کر رکھا ہے کہ پانی کی بُو دور سے سونگھ لیتے ہیں۔ بعض چھوٹے چھوٹے جانور اور پرندے بارش سے بہت پہلے محسوس کر لیتے ہیں کہ بارش برسے گی۔ ان دونوں گھوڑوں نے پانی کی مشک لے لی تھی۔ عمران نے پہلے ہی اپنے ساتھیوں کو بتا رکھا تھا کہ اس خشک پہاڑی خطے میں کہیں کہیں پانی مل جاتا ہے۔

گھوڑے دوڑتے گئے۔ عمران بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ گھوڑوں کے پیچھے گیا۔ کچھ دور اندر جا کر گھوڑے رک گئے۔ وہاں پہاڑ کا دامن ایک وسیع اور بلند غار کی طرح کٹا ہوا تھا۔ چاندنی میں وہاں پانی صاف نظر آ رہا تھا۔ وہاں شاید چشمہ تھا۔ گھوڑے پانی پی رہے تھے۔ پانی کی وجہ سے وہاں تھوڑی سی گھاس بھی تھی۔ گھوڑے پانی پی کر گھاس کھانے لگے۔ ان کے سوار بیٹھ گئے تاکہ گھوڑے سیر ہو جائیں۔

اُس وقت قاسم بلمی اور فاطمہ غزنی کی سمت جا رہے تھے مگر وہ جا کہیں بھی نہیں رہے تھے۔ وادیوں میں بھٹک رہے تھے۔ بلمی غزنی کے عام راستے پر جاتے ڈرتا تھا۔ اُسے توقع تھی کہ پہاڑیوں کے اندر ہی اندر سے وہ ملتان میں نکل جائے گا مگر یہ وادیاں ایسی تھیں

کہ گھوم پھر کر ایک دوسری میں گڈمڈ ہو جاتی تھیں۔ گھوڑے بھی رہ گئے تھے اور یہ دونوں انسان بھی تھک ہار گئے تھے۔ بلمی نے گھوڑا روک لیا اور دونوں اتر آئے۔

قاسم بلمی لیٹ گیا۔ اُسے بھوک اور پیاس کے ساتھ نیند بھی پریشان کر رہی تھی۔ فاطمہ اس کے پہلو میں اس طرح لیٹی کہ آدھی اُس کے سینے پر گری۔ بلمی نے اُسے بازوؤں میں دبوچ لیا۔ فاطمہ نے اپنا آپ اُس کے سپرد کر دیا۔ اس کے جسم نے بلمی پر نشہ طاری کر دیا۔ وہ راستے سے تو بھٹک گئے تھے مگر راہِ فرار موجود تھی جو دونوں نے ایک دوسرے میں دیکھ لی۔ وہ تھکن اور اپنے انجام کو بھول گئے۔ قاسم بلمی نے اُسے نشے کی سی کیفیت میں اشاروں میں سبز باغ دکھائے اور وہ خواب و خیال کے باغوں میں پہنچ گئے ——— پھر دونوں گہری نیند سو گئے۔

قاسم بلمی گھبرا کر اُٹھا۔ رات گزر گئی تھی۔ سورج چمک رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ کل وہ اسی جگہ سے گزرے تھے۔ اُس نے فاطمہ کو جگایا۔ وہ ایک دوسرے کا سامنا کرنے سے گھبرا رہے تھے۔ وہ روانہ ہونے کے لیے اُٹھے تو دیکھا کہ گھوڑے غائب تھے۔ ادھر اُدھر دیکھا۔ گھوڑے کہیں بھی نظر نہ آئے۔ بلمی کے دل میں یہ ڈر پیدا ہوا کہ اُس کے ساتھی آ کر ان کے گھوڑے لے گئے اور ان دونوں کو بھٹک بھٹک کر پیاسا مرنے کے لیے چھوڑ گئے ہیں لیکن گھوڑے پانی اور چارے کی تلاش میں دُور نکل گئے تھے۔ بلمی گھبرا کر گھوڑوں کی تلاش میں دوڑا اور مایوس اور خوفزدہ واپس آ گیا۔ اُس نے فاطمہ کا بازو پکڑا اور پاگلوں کی طرح ایک طرف دوڑ پڑا۔

فاطمہ دوڑتے دوڑتے گر پڑی۔ اُس میں تو چلنے کی ہمت نہیں تھی۔ بلمی نے اُسے اُٹھا کر کندھے پر ڈال لیا۔ رقم اور سونے کی تھیلی ہاتھ میں لی اور چل پڑا۔ اس کے دل میں یہی ڈر تھا کہ عمران اور اوریزی قریب ہی کہیں موجود ہیں اور وہ جب بے حال ہو چکا ہوگا تو وہ آ کر اُس سے تھیلی چھین لیں گے اور فاطمہ کو بھی لے جائیں گے۔ چوری کا گناہ، گزشتہ رات کا گناہ مل کر چڑیلوں اور بھوتوں کی طرح اُس کے اردگرد ناچنے لگے۔ وہ بیٹھ گیا۔ فاطمہ کو کندھوں سے اتار کر اس طرح اپنے سینے سے لگا لیا اور بازوؤں میں دبوچ لیا جس طرح پرندہ شکروں سے اپنا گھونسلہ چھپا رکھتا ہے۔ اُس نے تھیلی اپنے نیچے رکھ لی۔ وہ مسلسل وحشت

کھو بیٹھا تھا۔

"قاسم!" — اُسے فاطمہ کی سرگوشی سنائی دی۔ وہ ہوش میں آگئی تھی — "پانی" — فاطمہ کا منہ کھل گیا تھا۔ زبان ہونٹوں پر آگئی تھی۔

فاطمہ کو ہوش میں آتا دیکھ کر بلمی کی ذہنی حالت کچھ سنبھل گئی۔ اُس نے فاطمہ کو اپنے سامنے بٹھالیا اور اس کے کندھے پکڑ کر جھنجھوڑے۔

"تم میری بات نہیں سمجھ سکو گی فاطمہ!" — قاسم بلمی نے اپنی زبان میں بولنا شروع کر دیا — "ہم لالچ کے راستے سے نہیں، خدا کے راستے سے بھٹک گئے ہیں۔ اس راستے سے ہٹ جانے والوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔ میں مردِ میدان تھا۔ میدانِ جنگ میں، ایسی ہی پہاڑیوں میں، برفباری میں، ریگستانوں میں لڑا ہوں۔ میں زخمی بھی ہوا تھا۔ میرے ساتھی بھی زخمی ہوئے تھے۔ بعض کے بازو کٹ گئے تھے، ٹانگیں بھی کٹ گئی تھیں۔ ہم بھوکے بھی رہتے، پیاسے بھی رہتے۔ ہمارے زخموں سے خون بہ گیا مگر ہم میں سے کوئی بھی اس طرح بے بس اور لاچار نہیں ہوا کرتا تھا۔ میرا خون اور پسینہ نکل جانے سے میرے جسم کی توانائی اس طرح ختم نہیں ہوا کرتی تھی۔ جانتی ہو کیوں!"۔۔۔ اُس نے فاطمہ کو جھنجھوڑا مگر وہ اُس کی زبان نہیں سمجھتی تھی۔ منہ اور آنکھیں کھولے اُسے دیکھ رہی تھی۔ وہ اتنا سمجھ گئی تھی کہ جس خوبرو جوان کو اُس نے جذبات کی پیاس بجھانے والا چشمہ سمجھا تھا وہ دماغی توازن کھو بیٹھا ہے۔ چشمہ سوکھ گیا ہے۔

"میدانِ جنگ میں میرا جسم نہیں، میری روح لڑا کرتی تھی" — بلمی نے کہا۔ "میں چور نہیں تھا۔ میں جسمانی لذت کے لیے نہیں، روحانی کیف کے لیے لڑا کرتا تھا۔ اب ہم دونوں کو جسمانی پیاس اور سونے کی ہوس نے گمراہ کیا ہے۔ صرف دو تین دن پیدل چلنے سے میرے جسم میں جان نہیں رہی۔ مجھے اپنے جسم سے بدبو آتی ہے۔ تمہارے جسم سے بھی بدبو آتی ہے۔ ہم گنہگار ہیں فاطمہ! گنہگاروں کی کوئی منزل نہیں ہوتی۔ گنہگاروں کا انجام ہوا کرتا ہے۔ وہ اس دنیا میں عیش کرتے اور اگلی دنیا میں جلتے ہیں یا ہم جیسے اسی دنیا میں جل جل کر مرتے ہیں۔ منزل میرے دوستوں کو ملے گی جو سیدھے راستے

پر جا رہے ہیں۔ منزل اُس ہندو لڑکی اور اُس کے ہندو بھائی کو ملے گی جنہوں نے یہ راز پالیا ہے کہ خدا پتھر اور مٹی کے نہیں ہوا کرتے۔ عمران نے انہیں خدائے وحدہٗ لاشریک دکھا دیا ہے۔ ہمیں ایسے ہی مرنا ہے۔"

اُس کی آواز بلند ہوتی جا رہی تھی اور لب و لہجہ اکھڑتا جا رہا تھا۔ فاطمہ نے گھبرا کر اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ ساز و قطار رو رہی تھی۔

"ہوش میں آؤ قاسم!" — فاطمہ نے روتے ہوئے کہا — "میں تمہارے سہارے آئی ہوں۔"

"مجھے معلوم نہیں تم کیا کہہ رہی ہو" — قاسم بلمی نے اپنی زبان میں کہا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ کہنے لگا — "آؤ، شاید مرنے کے لیے اس سے کوئی بہتر جگہ مل جائے۔"

عمران، نظام اوریزی اور رشی چلے جا رہے تھے۔ سفر کے ڈیڑھ دو دن باقی تھے۔ اب راستہ نیچے اُتر رہا تھا۔ ان کے گھوڑوں کو راستے میں ایک اور جگہ سے بھی پانی مل گیا تھا مگر گھوڑوں کی رفتار تیز نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ دو آدمیوں کو ساتھ پیدل چلنا پڑ رہا تھا۔ دوسری وجہ یہ کہ یہ گھوڑے پہاڑی علاقے میں زیادہ دُور تک دوڑنے کے قابل نہیں تھے۔ نظام اوریزی کو بائیں طرف دُور نیچے وادی میں دو گھوڑے کھڑے نظر آئے۔ وہاں کچھ گھاس تھی جو یہ گھوڑے کھا رہے تھے۔ گھوڑوں پر زینیں کسی ہوئی تھیں۔ کوئی سوار نظر نہیں آتا تھا۔

"عمران!" — نظام اوریزی نے عمران سے کہا — "تم نے کہا تھا کہ کوئی گھوڑا مل جائے تو تم اس کے سوار کو قتل کرنے سے بھی گریز نہیں کرو گے۔ وہ دیکھو۔ دو گھوڑے۔"

"اگر میں خواب نہیں دیکھ رہا تو یہ گھوڑے اپنے ہی معلوم ہوتے ہیں" — عمران نے کہا۔

نیچے اترنے کا راستہ دیکھ کر وہ نیچے اُتر گئے۔ قریب جا کر دیکھا۔ گھوڑے وہی تھے جو قاسم بلمی لے کر بھاگا تھا مگر وہ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ عمران اور نظام اوریزی نے تلواریں نکال لیں۔ خطرہ تھا کہ بلمی مقابلہ کرے گا۔ جگہ ایسی تھی کہ وہ گھات سے اٹھ کر اچانک حملہ کر سکتا تھا۔ تلاش کے باوجود بلمی اور فاطمہ نظر نہ آئے۔ عمران اور نظام نے بلمی کو پکارنا شروع کر

دیا — سامنے آجاؤ قاسم! ہم بھول جائیں گے کہ تم نے کیا کیا ہے ... دوستوں کی طرح آجاؤ قاسم!" — مگر کوئی جواب نہ ملا۔

"عمران!" — نظام ادریزی نے کہا — "اُدھر دیکھو، گدھ اُتر رہے ہیں"۔

وہ فوجی تھا اور کئی جنگیں لڑ چکا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ جہاں جنگ ختم ہوتی ہے وہاں گدھوں کے غول جمع ہو جاتے ہیں۔ میدانِ جنگ کے اِرد گرد کہیں بھی گدھ اُتر رہے ہوں تو یہ ثبوت ہوتا تھا کہ وہاں کسی کی لاش پڑی ہے۔ عمران نے بھی گدھ اُترتے دیکھے۔ وہ اور نظام ادریزی گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ جگ موہن اور رشی پہلے ہی گھوڑوں پر سوار تھے۔ سب اُدھر کو گئے جہاں گدھ اُتر رہے تھے۔ وہ جگہ کم و بیش ایک میل دُور تھی۔

قریب جا کر انہوں نے گدھوں کو پتھر مارے تاکہ دیکھ سکیں کہ وہ کیا کھا رہے ہیں۔ وہ لاشیں تھیں — ایک قاسم لمبی کی دوسری فاطمہ کی۔ گدھوں نے ان کے پیٹ پھاڑ ڈالے تھے۔ انہیں مرے زیادہ دیر نہیں گزری تھی۔ رقم اور سونے کی تھیلی قاسم لمبی کے ہاتھ میں تھی اور ہاتھ کی گرفت اکڑ گئی تھی۔ عمران اس کی انگلیاں کھولنے کی کوشش کرنے لگا مگر اکڑی ہوئی انگلیاں کھلتی نہیں تھیں۔

"رہنے دو عمران!" — نظام ادریزی نے کہا — "یہ خزانہ اسی کے پاس رہنے دو۔ اسی نے اس کی جان لی ہے۔ شاید ان دونوں کی رُوحیں اس خزانے کو دیکھ کر مطمئن ہو جائیں"۔

"مجھے یقین ہے، یہ پیاس بھوک اور تھکن سے مرے ہیں۔ اگر یہ رہزنوں کے ہاتھ چڑھ گئے ہوتے تو یہ تھیلی اور فاطمہ یہاں نہ ہوتیں۔ اکیلا قاسم قتل ہوتا" — عمران نے کہا — "یہ بدنصیب تھوڑا اور آگے تک جا سکتے جہاں ان کے گھوڑے کھڑے تھے تو انہیں پانی مل جاتا ... عبرت حاصل کرو دوستو! اتنی رقم اور اتنا زیادہ سونا انہیں موت سے بچا نہیں سکا۔ سونا کھایا نہیں جا سکتا، پیا نہیں جا سکتا، بلکہ یہ اُن انسانوں کو کھا جاتا ہے جو اس کی ہوس میں دیوانے ہو جاتے ہیں" — اُس نے رشی سے کہا —

"دیکھ لو رضیہ! حُسن کا انجام دیکھ لو۔ فاطمہ اس جوانی اور اس حسن کے جال میں مجھے پھانسنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ قاسم پھنس گیا۔ فاطمہ کو اپنے حُسن پر بڑا ناز تھا"۔

رشی کے جواب رضیہ بن چکی تھی آنسو نکل آتے۔

اب وہ چار تھے اور اُن کے پاس چار ہی گھوڑے تھے۔ وہ روانہ ہو گئے اور شام کو اُس خطّے میں داخل ہو گئے جسے اُس دور میں ملتان کہتے تھے۔ یہ سرسبز خطّہ تھا۔

سلطان محمود غزنوی کو جب اطلاع دی گئی کہ لاہور کے تین آدمی ایک لڑکی کے ساتھ آئے ہیں تو وہ جس کام میں مصروف تھا اسے الگ رکھ کر لاہور سے آنے والوں کو بلا لیا۔ اندر عمران اور نظام ادریزی گئے۔ جبّار اور رضیہ کا سلطان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔ عمران نے سلطان کو اپنی پوری کارگزاری سنائی۔ بھٹنڈہ کے جاسوسوں کا کارنامہ بھی سنایا اور یہ بھی سنایا کہ وہ ایک ہندو لڑکی کو کس طرح انسانی قربانی سے بچا لایا اور اسے اور اس کے بھائی کو مسلمان کر لایا ہے۔ قاسم لمبی کی واردات اور انجام سُن کر سلطان محمود کا چہرہ بجھ گیا۔

"قوم میں زر اور زن کی جو ہوس پیدا ہوتی چلی جا رہی ہے، یہ قوم کو تاریخ سے ناپید کر دے گی" — سلطان محمود نے کہا — "انہی دو چیزوں نے ہمیں خانہ جنگی میں اُلجھا رکھا ہے ... کیا تم یقین سے کہہ رہے ہو کہ راجہ جے پال غزنی پر ضرور حملہ کرے گا؟"

"پورے یقین کے ساتھ" — عمران نے جواب دیا — "اُس کی رسد تباہ ہو گئی لیکن وہاں رسد اور سامان کی کمی نہیں۔ راجہ جے پال اب تک یہ کمی پوری کر چکا ہو گا"۔

"تمہارے دوسرے ساتھی وہاں کیا کر رہے ہیں؟" — سلطان محمود نے پوچھا —

"مجھے صحیح اطلاع ملنی چاہیے کہ وہ کتنی فوج لا رہا ہے اور کب آ رہا ہے"۔

"بھٹنڈہ کے آدمیوں کا کارنامہ آپ کو سنا چکا ہوں" — عمران نے کہا — "وہ وہیں کے رہنے والے جوشیلے نوجوان ہیں اور ادریس الملقب کی نگرانی میں کام کر رہے ہیں۔ ادریس اِدھر کا رہنے والا ہے اور بھٹنڈہ کی ایک مسجد میں امام بنا ہوا ہے۔ راجہ جے پال نے جونہی کوچ کیا، ادریس اطلاع بھیج دے گا"۔

"سلطان محترم!" — نظام ادریزی نے کہا — "آپ کسی کے انتظار میں نہ بیٹھے

ہیں۔ تیاری اور پیش بندی ابھی سے کرلیں۔ راجہ جےپال کی باتیں میرے ساتھ بھی ہوئی ہیں اور میری موجودگی میں وہ اپنے سالاروں اور سپہ سالار کے ساتھ جو باتیں کرتا رہا ہے وہ بھی میں نے غور سے سنی ہیں۔ اب کہ یہ راجہ شکست کھانے نہیں آئے گا۔ ہم اتنی فوج کبھی اکٹھی نہیں کر سکتے جتنی وہ لائے گا۔ مقابلہ چھ اور ایک کا ہوگا۔ ہمیں یہ جنگ بھی گھات اور شبخون کے طریقے سے لڑنی پڑے گی۔ جےپال اس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ سلطان سبکتگین کی وفات کے بعد غزنی میں کوئی قابل فوجی قائد نہیں رہا۔"

"میرے پاس فوج کی کمی نہیں ہونی چاہیے تھی۔" سلطان محمود نے کہا۔ "لیکن فوج ہماری فوج ریاستوں میں بٹ گئی ہے۔ اسلامی فوج کے سالاروں میں بھی حکمران بننے کی ہوس پیدا ہو گئی ہے۔ وہ اب اسلام کا تحفظ کرنے کے قابل نہیں رہے۔ جب سالار سلطان کے خواب دیکھنے لگتے ہیں تو ملک و قوم اپنی موت خود ہی مر لے لگتی ہے۔"

سلطان محمود غزنوی غزنی، بلخ اور خراسان کی سلطنت کے انتظامی امور سلجھا لے اور انہیں بہتر طریقے سے چلانے میں مصروف تھا۔ اس کی توجہ فوج کی بھرتی اور ٹریننگ پر بھی مرکوز تھی۔ اُس نے اُسی وقت اپنے سپہ سالار اور دیگر سالاروں کو بلایا۔ فوج کی بالائی کمان اس کے اپنے ہاتھ تھی۔

"یہ یقین ہو چکا ہے کہ ہندوستان کے راجوں مہاراجوں کی مشترکہ فوج تیسرے حملے کے لیے آ رہی ہے" ـــــ سلطان نے کہا۔ "کمان پہلے کی طرح راجہ جےپال کی ہوگی۔ اس کی نفری کی تعداد کا علم نہیں ہو سکا۔ میرا خیال ہے کہ ایک لاکھ سے کم نہیں ہوگی۔ ہماری تعداد بہرحال کم ہوگی۔ لاہور میں ہمارے آدمیوں نے اس کی رسد اور سامان کا ذخیرہ جلا دیا ہے۔ اس سے اُس کے کوچ میں تاخیر ہو گئی ہے۔ آپ اپنی بدنصیبی کو سمجھتے ہیں۔ آپ اپنی پوری فوج جنگ میں نہیں جھونک سکتے۔ آپ کو کچھ دستے غزنی اور دیگر شہروں پر رکھنے ہوں گے کیونکہ ہم جب دشمن کے خلاف لڑ رہے ہوں گے، آپ کے بھائی آپ کی پیٹھ پر وار کریں گے ...

"یہ ہمارے قومی جذبے کا بڑا ہی سخت امتحان ہے۔ آپ تصور کر سکتے ہیں کہ ہندوؤں کا حملہ کامیاب ہو گیا تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ آپ سلطنت غزنی کے نہیں خانہ کعبہ کے پاسبان ہیں۔ مجھے میرے جاسوسوں نے بتایا ہے کہ ہندو دعوے کرتے ہیں کہ ہندوستان کی سرحد دجلہ اور فرات سے بھی آگے ہے اور اس پر مسلمان قابض ہیں۔ ہندوؤں کو صرف حملہ آور قوم نہ سمجھنا۔ وہ اپنے ساتھ جغرافیائی دعوے اور باطل مذہب لا رہے ہیں۔ وہ اسلام کے فروغ کو روکنے کے لیے اسلام کے اعصابی مرکز پر وار کرنے آ رہے ہیں۔ آپ اپنی سلطنت یا اپنے گھروں کے تحفظ کے لیے نہیں، خدا کے گھر کے تحفظ کے لیے لڑیں گے ...

"آپ کو ایک فائدہ یہ حاصل ہے کہ ہندوؤں کی فوج پر تمہاری دہشت طاری ہے۔ لاہور سے جو دو آدمی آئے ہیں، انہوں نے بتایا ہے کہ ہندوؤں کے پچھلے حملے سے جو فوج بچ کر واپس گئی تھی اُس نے اپنے ملک جا کر خوب دہشت پھیلائی تھی۔ اس کا اثر نئی بھرتی پر بھی ہے۔ میں آپ کو دوسرا فائدہ یہ دینا چاہتا ہوں کہ آپ اپنی سلطنت سے دُور دشمن کی ریاست کے قریب لڑیں اور میدان آپ کی مرضی اور آپ کی سہولت کا ہو۔ یہ میدان پشاور کے قریب ہوگا۔ ہم پیش گھات میں بٹھائیں گے۔ آپ کے پاس لمغان کے چند ایک قلعے ہیں۔ ہم انہیں دھوکے کے لیے استعمال کریں گے ....

"راجہ جےپال ہاتھی بھی لائے گا۔ آپ جان چکے ہیں کہ ہاتھی جتنا خوفناک لگتا ہے، اس میں اتنی ہی خوفناک کمزوریاں ہیں۔ ہم بھی ہاتھیوں کا دستہ استعمال کریں گے لیکن یہ جوابی حملے میں استعمال ہوں گے جو ہم دشمن کے عقب سے کریں گے۔ یہ آخری اور فیصلہ کن حملہ ہوگا۔ طریقہ وہی اختیار کریں کہ آمنے سامنے کے تصادم سے بچیں۔ دشمن کے پہلوؤں پر حملے کریں اور پہلوؤں کو ہی نکل جائیں۔ دشمن کے دستوں کو اپنے پیچھے گھسیٹ کر گھات تک لائیں ...

"دشمن کو کمزور نہ سمجھیں اور اب یہ ذہن میں رکھ لیں کہ خدا نے اگر آپ کو فتح دی اور دشمن پسپا ہوا تو پشاور تک اس کا تعاقب کیا جائے گا اور پشاور کو اپنے قبضے میں لیا جائے گا۔ میں آپ کو ابھی اس زمین کا نقشہ دکھاؤں گا۔ اس سے پہلے آپ دل میں یہ حقیقت اور یہ جذبہ نقش کر لیں کہ آپ خدا کے عظیم مذہب کی بقا کے لیے لڑ رہے ہیں۔ یہ حق اور باطل کی جنگ ہے۔ ہمارے رسولؐ نے ان جنگوں کی ابتدا کی تھی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم اپنے رسول مقبول صلعم کی روایت مقدسہ کو ختم کر ڈالیں اور ہماری روحیں آنے

والی نسلوں کے آگے سرنگوں سرمسار ہوتی رہیں۔ ہمارا نعرہ ہوگا — فتح یا موت!"

اس کے بعد سلطان محمود نے سب کے آگے نقشہ پھیلا کر جنگ کی تکنیکی ہدایات دینی شروع کردیں۔ انہیں گھات اور شبخون کی جگہیں بتائیں۔ آخر میں حکم دیا کہ کل صبح صادق کے وقت فوج کوچ کرجائے گی اور پشاور کی قریبی پہاڑیوں میں جا ٹھہرے گی۔ دستوں کو ہر وقت تیاری کی حالت میں رکھنا ہوگا۔

محمد قاسم فرشتہ، گردیزی اور عطبی کی تحریروں کے مطابق سلطان محمود غزنوی نے اگست ۱۰۰۱ عیسوی (شوال ۳۹۱ ہجری) میں غزنی سے کوچ کیا۔ اس کی فوج دس ہزار منتخب سواروں کی تھی۔ پچاس کے لگ بھگ جنگی ہاتھی تھے جو راجہ جےپال کی فوج سے اُس کے پہلے حملوں میں چھینے گئے تھے۔ پیادہ نفری بہت ہی کم تھی۔ سلطان کی مجبوری تھی کہ اُسے پیادہ فوج اپنی سلطنت میں چھوڑنی پڑی تھی کیونکہ داں سلطانی کے ہوس کاروں کے حملے کا خطرہ تھا۔ اس کے علاوہ سلطان چونکہ گھوم پھر کر لڑنا چاہتا تھا اس لیے وہ سوار دستے ہی ساتھ لایا تھا۔

یہاں ایک وضاحت ضروری ہے۔ اکثر تاریخوں میں لکھا گیا ہے کہ محمود غزنوی نے پشاور پر حملہ کیا تھا۔ یہ غلط ہے۔ یہ ہندوستان میں لکھی ہوئی تاریخ ہے جس میں حقائق اور واقعات کو سرڑ توڑ کر بیان کیا گیا ہے۔ تمام نامور مؤرخوں نے لکھا ہے کہ حملہ راجہ جےپال نے کیا تھا۔ اور محمود غزنوی یہ حملہ روکنے کے لیے پہلے ہی اپنی سلطنت سے نکل آیا اور پشاور کے قریب جنگی پوزیشن میں خیمہ زن ہوگیا تھا۔

راجہ جےپال نے رسد اور سامان کی کمی چند دنوں میں پوری کرلی تھی۔ وہ بہت جلد حملہ کرنے کا تہیہ کیے ہوئے تھا۔ وہ اپنے جرنیلوں سے یہی کہتا پھر رہا تھا کہ وہ سبکتگین مرگیا ہے جس نے میرے حملے روک لیے تھے۔ اب میری راجدھانی غزنی ہوگی۔ اب اُس نے ایک کنواری لڑکی کی قربانی بھی دی تھی۔ وہ کہتا تھا کہ اب دیوتا اُس کے ساتھ جارہے ہیں۔

اس کے باوجود اب دوسرے راجاؤں نے اُسے اتنی فوج نہیں دی تھی جو پہلے دی تھی۔ سلطان بہت دے دیا تھا۔ راجہ جےپال نے لاہور سے کوچ کیا تو اُس کی فوج کی تفصیل یہ تھی۔ بارہ ہزار سوار، تیس ہزار پیادہ اور تین سو جنگی ہاتھی۔ رسد اور سامان والی بیل گاڑیوں کی قطار میلوں لمبی تھی۔ جےپال فیصلہ کن جنگ لڑنے کے لیے سال بھر کی رسد ساتھ لے جارہا تھا۔ اُسے فتح کا اتنا یقین تھا کہ (مؤرخوں کے مطابق) وہ بے انداز خزانہ، سونے اور ہیروں کے ہار اور جواہرات ساتھ لے گیا۔ اس خزانے کا ایک مقصد یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ وہ غزنی کے راستے میں افغان سرداروں کو زر و جواہرات دے کر اپنے ساتھ ملانے کا ارادہ رکھتا تھا۔

اُس نے کوچ بہت تیز کرایا۔ وہ اس زعم میں مبتلا تھا کہ وہ غزنی والوں کو بے خبری میں جالے گا۔ اس نے پشاور صرف ایک رات قیام کیا تاکہ بیل گاڑیاں پہنچ جائیں۔ اُس نے پشاور سے کوچ کیا تو غزنی کے جاسوسوں نے اُس کی ساری فوج اور کوچ کی ترتیب دیکھ لی۔ انہوں نے قبل از وقت سلطان کو بتا دیا کہ راجہ کی نفری کتنی اور کیسی ہے۔

راجہ جےپال کو پشاور سے نکلتے ہی پتہ چل گیا کہ سلطان محمود پہاڑیوں میں خیمہ زن ہے۔ اُسے یقین نہیں آرہا تھا لیکن وہ چوکس ہوگیا۔ اُس نے پشاور اور پہاڑی سلسلے کے درمیان پڑاؤ کا حکم دے دیا تاکہ آگے کی کوئی اطلاع حاصل کرسکے۔ رات کو اُس نے دیکھ بھال کے لیے ایک جیش بھیجا مگر وہ واپس نہ آسکا۔ غزنی والوں نے راجہ جےپال کے ساتھ حساب کتاب کھول لیا تھا۔

صبح ابھی تاریک تھی جب جےپال کی فوج کی خیمہ گاہ کے ایک کونے پر غزنی کے سواروں نے شبخون مارا اور افراتفری پیدا کرگئے۔ ہندوؤں کا جانی نقصان بھی ہوا۔ جےپال نے تیاری کا حکم دے دیا۔ صبح طلوع ہوئی تو اُسے غزنی کی فوج کے دو چار دستے نظر آئے جو سامنے کھڑے تھے۔ جےپال نے حملے کا حکم دے دیا۔ غزنی کے یہ سوار دستے آگے آکر پھیل گئے۔ ہندوؤں نے ہاتھیوں کو آگے کر رکھا تھا۔ سلطان کے سوار ہاتھیوں سے لڑ گئے اور پیچھے ہٹنے اور پھیلنے لگے۔ اُس وقت سلطان محمود چند ایک دستوں کے ساتھ نشیبی علاقے سے بڑھتا ہوا دشمن کے عقب میں آنے کی کوشش کررہا تھا۔ ہندوؤں

نے اُسے دیکھ لیا اور پیچھے کو مڑے۔

سلطان محمود نے حملے کا حکم دے دیا۔ سوار آگے بڑھے۔ گھمسان کا رن پڑا لیکن مسلمان معرکہ سے ہٹنے لگے۔ ہندو اُن کے تعاقب میں آ گئے۔ اس طرح جے پال کی فوج دو حصوں میں بٹ گئی۔ ایک حصہ پہاڑیوں کی طرف منہ کیے بڑھ رہا تھا، دوسرا پیچھے پشاور کی طرف۔ اُس وقت سلطان کے کچھ سوار دستے دونوں حصوں کے درمیان آ گئے۔ انہوں نے دونوں حصوں کے عقب پر حملہ بول دیا۔ راجہ جے پال کا ہیڈکوارٹر درمیان میں تھا۔ اُس کا جھنڈا ایک سوار نے اٹھا رکھا تھا۔ چند ایک مسلمان سواروں نے جھنڈے پر حملہ بول دیا مگر ان میں سے کوئی ایک بھی زندہ نہ رہا۔ جھنڈا نہ گر سکا۔

دوپہر تک میدانِ جنگ کی صورت یہ ہو گئی کہ راجہ جے پال کی فوج جو دو حصوں میں کٹ چکی تھی، بکھر گئی۔ راجہ جے پال آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا ارادہ یہ تھا کہ چونکہ سلطان محمود یہیں ہے اس لیے وہ آگے بڑھ جائے اور غزنی پر جا دھمکے۔ اس کوشش میں راجہ کے جیش مسلمانوں کی گھات میں آنے لگے۔ ان پر تیروں کی بوچھاڑیں پڑیں اور وہ مرتے چلے گئے۔ سلطان محمود کے سوار گھوم پھر کر لڑنے لگے۔ دس ہزار سواروں کا مقابلہ بارہ ہزار سواروں اور تیس ہزار پیادوں سے تھا۔ مسلمانوں کا جانی نقصان خاصا ہو رہا تھا مگر شہیدوں کا لہو رائیگاں نہیں جا رہا تھا۔

راجہ جے پال کی یہ کوشش بُری طرح ناکام ہو رہی تھی کہ مسلمان کہیں جم کر لڑیں۔ وہ جم کر لڑنے کے لیے آیا تھا۔ اس کی فوج کی ٹریننگ انھی خطوط پر ہوئی تھی۔ سلطان محمود نے لڑنے کے لیے جس زمین کا انتخاب کیا تھا، وہ اُس کے طریقۂ جنگ کے لیے موزوں تھی۔ جے پال تو کچھ اور سوچ کر آیا تھا۔ وہ یہاں لڑنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ تاہم اُس نے جنگی اہلیت کا پورا پورا مظاہرہ کیا۔ اُس کی جنگی قوت زیادہ بھی تھی مگر میدان مسلمانوں کے ہاتھ تھا۔ جے پال تعداد کی برتری کے سہارے لڑ رہا تھا۔ اُس نے یہ کوشش بھی کی کہ جنگ ملتوی ہو جائے تاکہ اسے طول دیا جا سکے لیکن مسلمان سواروں نے اسے کامیاب نہ ہونے دیا۔ انہوں نے اللہ اکبر کے نعرے لگانے شروع کر دیے۔

معرکہ بڑا ہی خونریز تھا۔ شام سے پہلے سلطان محمود غزنوی نے پچاس ہاتھیوں

اور دو ہزار گھوڑسواروں سے جے پال کے عقب پر شدید حملہ کر دیا۔ سوار جے پال کے ہیڈکوارٹر کو گھیرے میں لینے میں کامیاب ہو گئے۔ وہاں بڑا سخت معرکہ لڑا گیا مگر جے پال نکل نہ سکا۔ وہ پندرہ حکام کے ساتھ زندہ پکڑا گیا۔ اس کی فوج جو بکھر گئی تھی، پسپا ہونے لگی۔ مسلمانوں نے تعاقب کیا اور وہ پشاور تک جا پہنچے۔ پشاور کے قریبی مضافات میں بھی معرکے لڑے گئے جن کی صورت یہ تھی کہ ہندو جانیں بچانے اور جنگی قید سے نکلنے کے لیے لڑ رہے تھے۔ راجہ جے پال کا جھنڈا گرنے اور اس کی مرکزی کمان ختم ہو جانے سے جنگ کا پانسہ ایسا پلٹا کہ مسلمان سوار جو تعداد میں بہت تھوڑے رہ گئے تھے، ہندو فوج کو ٹولیوں میں بکھیر کر اُن کی وہی حالت کر رہے تھے جو بھیڑیے بھیڑوں کے ریوڑ کی کیا کرتے ہیں۔

شام تک جنگ کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ راجہ جے پال کو صحیح معنوں میں شرمناک شکست ہوئی تھی مگر غزنی کے غازیوں نے خون اور جان کے جو نذرانے دیے اس کی مثال خود غزنی والے بھی کبھی پیش نہیں کر سکتے تھے۔ مشہور مؤرخ گردیزی اور عتبی لکھتے ہیں کہ مسلمان سواروں نے اس احساس کے تحت کہ دشمن کی تعداد بہت زیادہ ہے، تھوڑی تھوڑی نفری کے جیشوں کی صورت میں اس قدر شدید اور برق رفتار حملے کیے کہ ہندوؤں کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ دوپہر تک پانچ ہزار ہندو سوار اور پیادے مارے جا چکے تھے، اور جنگ کا فیصلہ اُسی وقت ہو گیا تھا۔

جنگی مبصرین نے مسلمانوں کی کامیابی کی وجوہات بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہندو فوج پر مسلمانوں کی دہشت پہلے ہی طاری تھی اس لیے ان کا لڑنے کا جذبہ بہت جلدی مجروح ہو گیا۔ سلطان محمود غزنوی نے اپنی فوج کو جو ہدایات دی تھیں ان میں زور اسی پر دیا تھا کہ دشمن کا جذبہ توڑنے کی کوشش کرنا۔ اُس نے اس کا طریقہ یہ بتایا تھا کہ پہلوؤں پر کم تعداد میں حملہ کرو اور نکل جاؤ، پھر گھوم کر آؤ اور یہ سلسلہ جاری رکھو۔ دشمن کو پتہ نہ چلنے دو کہ اب مسلمان سوار کدھر سے آئیں گے اور کتنے آئیں گے۔ سلطان محمود کی کامیابی کی دوسری وجہ اس کا جاسوسی کا نظام تھا جس کے ذریعے اُسے قبل از وقت دشمن کی آمد اور نفری وغیرہ کی اطلاع مل گئی۔ اُس سے اُس نے یہ فائدہ اٹھایا کہ اپنے

ملک سے دُور آ کر اپنی پسند کی زمین کا انتخاب کر لیا۔ یہ کیفیت جو سلطان محمود نے پیدا کرلی تھی، راجہ جے پال کے لیے غیر متوقع تھی۔ کوشش کے باوجود جے پال اس کیفیت کو اپنے حق میں نہ کر سکا۔ آخر گھیرے میں آ کر اسے ہتھیار ڈالنے پڑے۔

پشاور سے کچھ دُور میر انامی ایک گاؤں ہوا کرتا تھا، وہاں راجہ جے پال اور اُس کے اعلیٰ حکام کو سلطان محمود غزنوی کے سامنے لے جایا گیا۔ ایک ترجمان کے ذریعے سلطان اور راجہ کی باتیں ہوئیں۔

"یہ فتح و شکست میری اور آپ کی نہیں" — سلطان محمود نے راجہ جے پال سے کہا۔ "یہ اسلام کی فتح ہے۔ اس عظیم مذہب نے ثابت کر دیا ہے کہ تراشے ہوئے پتھر اور خیالی مورتیاں انسان کا نہ کچھ بگاڑ سکتی ہیں نہ اُسے کچھ دے سکتی ہیں۔ انسان کو خدا نے پیدا کیا ہے۔ زندگی اور موت، فتح و شکست اُسی کے اختیار میں ہے اور وہی عبادت کے لائق ہے۔ آپ کا تیسرا حملہ ناکام ہو چکا ہے۔ اب آپ ایک کنواری لڑکی کی قربانی دے کر آئے تھے۔ دیوتاؤں نے آپ کو اس ناحق قتل کی سزا دی ہے۔ قربانی ہم بھی دیا کرتے ہیں لیکن کسی کو خدا کے آگے ذبح نہیں کیا کرتے۔ میدانِ جنگ میں لاشیں دیکھ لو۔ ہم یہ قربانی دیا کرتے ہیں اور خدا اُسے قبول کر لیا کرتا ہے۔ کیا آپ ہمارے ایمان کو برحق تسلیم نہیں کرتے جنہوں نے دس ہزار کی تعداد میں آپ کے پچاس ہزار کے لشکر کو میدان سے بھگا دیا ہے؟"

"میں مذہبوں کی بحث میں نہیں اُلجھوں گا" — راجہ جے پال نے کہا۔ "میں تسلیم کرتا ہوں کہ ہار گیا ہوں۔ میں جان بخشی کی درخواست کرتا ہوں اور یہ معاہدہ کروں گا کہ آئندہ آپ پر فوج کشی نہیں کروں گا۔"

"پھر آپ اپنے مذہب کا فریضہ سمجھ کر معاہدہ توڑیں گے۔" سلطان محمود نے کہا۔

"میں ایسا نہیں کروں گا" — راجہ جے پال نے کہا — "آپ قیمت بتائیں۔"

"میں اس قیمت میں آپ کا یہ خزانہ شامل نہیں کروں گا جو میرے ہاتھ لگا ہے۔" —

سلطان محمود نے کہا — "یہ مالِ غنیمت ہے۔"

خزانے کا مالِ غنیمت کم نہیں تھا۔ راجہ جے پال افغانیوں کو ساتھ ملانے کے لیے بے انداز خزانہ ساتھ لایا تھا۔ مؤرخ لکھتے ہیں کہ دیگر زر و جواہرات اور نقدی کے علاوہ ہیروں کے پندرہ ہار تھے جن میں ایک کی قیمت اسی ہزار دینار تھی۔ معاہدے کی رُو سے طے پایا کہ راجہ جے پال کو رہا کر دیا جائے گا۔ اس کے عوض وہ اڑھائی لاکھ دینار اور پچاس ہاتھی تاوان کے طور پر ادا کرے گا۔ اُس کے نہایت اہم حکام کو یرغمال کے طور پر قید میں رکھا گیا اور راجہ جے پال کو رہا کر دیا گیا۔ سلطان محمود نے پشاور تک کو اپنی عملداری میں لے لیا اور آج کے درۂ خیبر اور تمام تر سلسلۂ کوہ پر قبضہ کر لیا۔

یہ جنگ بروز جمعرات ۸ محرم ۳۹۲ ہجری (۲۷ نومبر ۱۰۰۱ عیسوی) کے روز لڑی گئی اور اسی روز فتح اور شکست کا فیصلہ ہو گیا۔

سلطان محمود غزنوی اس مقبوضہ علاقے کے انتظامی امور کے لیے کچھ عرصہ پشاور میں رہا۔ اُسے یہاں زیادہ عرصہ رہنا تھا مگر اُس کی اپنی سلطنت کے اردگرد مسلمان حکمران پھر سر اٹھانے لگے تھے۔ ان کی سرکوبی کے لیے ۱۰۰۲ عیسوی کے موسمِ بہار میں غزنی چلا گیا۔

اسی موسم میں راجہ جے پال اپنی قوم کے ہزار ہا جوان بیٹے اور قوم کے گاڑھے پسینے کی کمائی پشاور کے مضافات میں تباہ و برباد کر کے لاہور میں واپس آیا۔ وہ بوڑھا تو تھا ہی، اس شکست نے اُسے اور زیادہ بوڑھا کر دیا۔ آتے ہی اس نے دربار منعقد کیا اور یہ اعلان کیا کہ آج سے اس کا بیٹا انند پال اس کا جانشین ہو گا۔ اس اعلان کے ساتھ وہ راج سے دستبردار ہو گیا۔

اُس نے سب کو راج محل کے پچھواڑے کے باغ میں چلنے کو کہا۔ خود اپنے بیٹے کے ساتھ چل پڑا۔

"تم جیسے بہتر سمجھو گے ویسے راج کرنا" اُس نے اپنے بیٹے انند پال سے کہا — "لیکن یہ میری وصیت ہے کہ غزنی پر حملے کے لیے نہ جانا۔ ہماری فوج مسلمانوں کے خلاف نہیں لڑ سکتی۔ اُن کی فوج کی چالیں نہایت اچھی ہیں لیکن ان کی اصل قوت ان

کا جذبہ ہے اور جوش و خروش ہے جو ہماری فوج میں کوشش کے باوجود پیدا نہیں ہو سکا۔ محمود کو اڑھائی لاکھ دینار کی مالیت کا سونا بھیج دینا، ورنہ وہ تم پر حملہ کرے گا اور تمہاری فوج کا بھی حشر ہوگا جو تم پشاور میں دیکھ آئے ہو۔"

وہ جب محل کے باغ میں پہنچے تو سب دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہاں چتا بنی ہوئی تھی۔ لکڑیوں کا یہ چوکور انبار کسی مرے ہوئے کی لاش کو جلانے کے لیے رکھا گیا تھا مگر راج محل میں کوئی بھی نہیں مرا تھا۔ چتا پر تیل انڈیل دیا گیا تھا اور ایک آدمی جلتی مشعل اٹھائے کھڑا تھا۔

راجہ جے پال کسی سے کوئی اور بات کیے بغیر تیزی سے آگے بڑھا اور چتا پر کھڑا ہو گیا۔ اس نے مشعل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ جو ہمارے مشعل اسے دے دی۔ راجہ نے تیل میں بھیگی ہوئی لکڑیوں پر مشعل کا شعلہ رکھ کر آگ لگا دی۔ اس کا بیٹا اس کی طرف دوڑا لیکن شعلے اتنے اونچے اور اتنے ہیبت ناک ہو گئے تھے کہ کوئی قریب نہ جا سکا۔ راجہ جے پال نے اپنے آپ کو نہایت خاموشی سے جلا ڈالا۔

تمام مؤرخوں نے لکھا ہے کہ راجہ جے پال نے اپنے بیٹے سے کہا تھا کہ وہ سلطان محمود کو تاوان ادا کرے اور مسلمانوں کے خلاف جنگ کو دل سے اتار دے لیکن انند پال نے جو سلطان محمود کا ہم عمر تھا، اپنے باپ کی جلتی چتا کے قریب کھڑے ہو کر اعلان کیا "میں غزنی والوں کو ایک پیسہ تاوان ادا نہیں کروں گا ..... میں باپ کے خون کا انتقام لوں گا۔"

بہشت ایک رات کی

ملتان برصغیر کا واحد مقام ہے جو محمد بن قاسم کے دور سے لے کر اس وقت تک مسلمان ریاست رہا ہے جب مغلوں کا سورج غروب ہو گیا تھا۔ گیارہویں صدی میں بھی ملتان اسلامی ریاست تھا اور اس کے ارد گرد ہندو ریاستیں تھیں۔ یہ وہ دور تھا جب محمد بن قاسم کے بعد دوسرا مجاہد سلطان محمود غزنوی ہندوؤں سے نبرد آزما تھا۔ اس نے ہندوستان کے سب سے طاقتور راجہ جے پال کا غزنی پر تیسرا حملہ اس بری طرح پسپا کیا تھا کہ اس راجہ نے اپنی راجدھانی میں واپس آ کر خودکشی کر لی تھی۔ محمود غزنوی نے پشاور کے بہت سے علاقے پر قبضہ کر کے پشاور کو اپنے سائے میں لے لیا تھا۔ اس طرح اس نے غزنی اور اپنی تمام تر سلطنت کو محفوظ کر لیا تھا۔

اس نے راجہ جے پال کو اس شرط پر رہا کیا تھا کہ وہ واپس جا کر اڑھائی لاکھ دینار تاوان ادا کرے گا اور پچاس ہاتھی بھی بھیجے گا۔ راجہ جے پال نے لاہور پہنچ کر اپنے بیٹے انند پال سے کہا کہ وہ محمود غزنوی کو تاوان ادا کر دے۔ اس کے فوراً بعد اس نے اپنے آپ کو چتا میں جلا لیا۔ انند پال نے دربار میں اعلان کر دیا کہ وہ تاوان ادا نہیں کرے گا اور اپنے باپ کی شکست کا انتقام لے گا۔

یہ واقعہ ۱۰۰۱ عیسوی کا ہے۔

دو سال اور گزر گئے۔ تاوان کی بجائے سلطان محمود غزنوی کو جاسوسوں نے یہ اطلاع دی کہ انند پال اپنے باپ کی شکست کا انتقام لینے کی تیاری کر رہا ہے۔

"..... اور یہ میرے لیے کوئی نئی خبر نہیں" محمود غزنوی نے کہا۔ "میں ذہنی طور پر ایسی

ای صورت حال کے لیے تیار تھا۔ میں نے جے پال کے علاقے پر اسی لیے قبضہ کیا ہے کہ اس کے ساتھی راجوں کو اور اُسے مشورے دینے والوں کو سلطنتِ غزنی آسمان کے ستارے کی طرح دُور نظر آئے۔ میں نے اپنی سلطنت کو نہیں، خانہ کعبہ کو اور خلافت کی گدی کو محفوظ کر لیا ہے۔"

"راجہ جے پال مر گیا ہے" ۔۔۔ ایک سالار نے کہا۔ "اُس کے بیٹے کو ہم خاطر میں نہیں لاتے۔"

"ذرا اور گہرائی میں سوچو میرے دوستو!" ۔۔۔ محمود غزنوی نے کہا۔ "راجہ جے پال کے مر جانے سے بُت پرست ہندوؤں کا عقیدہ نہیں مر گیا۔ یہ دو عقیدوں کی جنگ ہے جو ہند کے راجے نہیں لڑ پائیں گے تو اُن کے مذہبی پیشوا اور دانشور لڑائیں گے۔ دشمن کو حقیر نہ جانو۔ اب یہ سوچو کہ ہم اس دشمن کو کس طرح گھٹنوں بٹھا سکتے ہیں۔"

"اگر آپ ہم سے مشورہ لینا چاہتے ہیں تو ہمیں لاہور کی طرف پیش قدمی کرنی چاہیے" ۔۔۔ ایک سالار نے کہا۔ "لیکن ہمیں ہندوستان میں اپنا ایک اڈہ قائم کرنا پڑے گا تاکہ ہم اور آگے بڑھ سکیں اور محمد بن قاسم کی سلطنت کو بحال کریں۔"

"اڈہ موجود ہے" ۔۔۔ محمود غزنوی نے کہا۔ "کیا ملتان ہمارا اڈہ نہیں بن سکتا؟ ملتان کا حکمران ابوالفتح داؤد بن نصر مسلمان بھی ہے اور ہمارا دوست بھی۔"

"سلطان عالی مقام!" ۔۔۔ محمود غزنوی کے وزیر نے کہا۔ "داؤد بن نصر مسلمان تو ہے، یہ نہ بھولیں کہ وہ قرامطی ہے۔ آپ قرامطیوں کی تاریخ سے واقف ہیں۔"

"اُس نے سلطان سبکتگین مرحوم کے ساتھ دوستی اور ضرورت کے وقت ایک دوسرے کی مدد کا معاہدہ کر رکھا تھا" ۔۔۔ محمود غزنوی نے کہا۔ "وہ ہمیں دھوکہ نہیں دے گا۔"

"عالی جاہ!" ۔۔۔ وزیر نے کہا۔ "دشمن پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ اپنی قوم کے غدار پر کبھی اعتبار نہ کریں۔"

"ایک ایلچی کل صبح ملتان روانہ کر دو" ۔۔۔ محمود غزنوی نے کہا۔ "مجھے امید ہے کہ محمد بن قاسم کی سلطنت کی اس آخری ریاست سے ہمیں پورا تعاون ملے گا۔ داؤد بن نصر ہندوؤں میں رہتا ہے۔ وہ اُن کی نیت اور عزائم کو ہم سے زیادہ اچھی طرح سمجھتا

ہوگا۔ وہ اُن میں گھرا ہوا ہے۔ وہ خوش ہوگا کہ ہم اپنی فوجیں ملتان لا رہے ہیں۔ ہمیں اُس کی اور اُسے ہماری مدد کی ضرورت ہے ..... میں کوئی فوجی ایلچی بھیجوں گا۔"

"عاصم عمر بہتر رہے گا" ۔۔۔ سپہ سالار نے کہا۔ "ابھی جوانی کی عمر میں ہے۔ بات کرنے کا ڈھنگ جانتا ہے اور خوش طبع بھی ہے۔"

"عاصم عمر!" ۔۔۔ محمود غزنوی نے کہا۔ "اُس کے متعلق مجھے کسی نے بتایا تھا کہ وہ ضرورت سے زیادہ خوش طبع ہے۔"

"عاصم جنگی امور کو سمجھتا ہے" ۔۔۔ سپہ سالار نے کہا۔ "اور سمجھا بھی سکتا ہے۔ وہ جب میدانِ جنگ میں دشمن کو اپنے سامنے دیکھتا ہے تو اور زیادہ خوش طبع ہو جاتا ہے۔ یہ کمزوری نہیں خوبی ہے۔"

"اگر تم میں یقین ہے کہ وہی بہتر رہے گا تو اُسی کو بلا لو" ۔۔۔ محمود غزنوی نے کہا۔ "میں اُسے زبانی پیغام دوں گا کیونکہ اُسے دشمن کے علاقے میں سے گزر کر جانا ہے۔ تحریری پیغام پکڑا جا سکتا ہے۔"

عاصم عمر جب ملتان کے حکمران ابوالفتح داؤد بن نصر کے دربار میں گیا تو اُس کی آنکھیں حیرت سے کھل گئیں۔ اس دربار کی شان و شوکت دیکھ کر اُسے شک ہوا جیسے داؤد بن نصر سارے ہندوستان کا بادشاہ ہو۔ وہ سلطان سبکتگین اور سلطان محمود غزنوی کے دربار کا عادی تھا جہاں وہ اُن کے برابر بیٹھا کرتا تھا اور مشورے بھی دیا کرتا تھا۔ ملتان کے دربار میں وہ اپنے آپ کو بہت چھوٹا آدمی سمجھنے لگا۔ داؤد بن نصر تخت پر بیٹھا تھا۔ دو بڑی ہی حسین لڑکیاں اُس کے پیچھے کھڑی مورچھل ہلا رہی تھیں۔ درباری یوں بیٹھے تھے جیسے بُت دھرے ہوئے ہوں۔

"رعایا کے ان داتا!" ۔۔۔ ایک آواز بلند ہوئی۔ "سلطان محمود بن سبکتگین کا ایلچی حاضر ہے۔"

عاصم عمر نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ جان نہ سکا کہ یہ صدا کس کی تھی۔

"غزنی کے ایلچی کو ہم خوش آمدید کہتے ہیں" ۔۔۔ داؤد بن نصر نے بادشاہوں کی

طرح کہا۔ "کیا پیغام لائے ہو؟"

"کچھ تحفے لایا ہوں"۔ عاصم عمر نے بوکھلا کر کہا۔ "پہلے یہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیا سلطان محمود نے تمہیں دربار کے آداب نہیں سکھائے؟" ۔۔۔ داؤد بن نصر نے مسکرا کر کہا۔

"ہمارے ہاں ایسا دربار نہیں ہوتا عالی جاہ!" ۔ عاصم عمر نے کہا۔ "سلطان کا دربار کسی خیمے میں ہوتا ہے یا کسی وادی میں جس پر چٹانوں کا سایہ ہوتا ہے۔ ہم وہاں اکٹھے بیٹھتے ہیں۔"

"یہ میدانِ جنگ نہیں ہمارے معزز مہمان!" ۔ داؤد بن نصر نے کہا۔ "یہاں کوئی درباری ہماری اجازت کے بغیر کھانس بھی نہیں سکتا۔"

"پھر سلطان نے مجھے غلط جگہ بھیج دیا ہے"۔ عاصم عمر نے جرأت مندی سے کہا۔ "مجھے بتایا گیا تھا کہ میں محمد بن قاسم کی سلطنت کی آخری ریاست کے حکمران کے پاس جا رہا ہوں۔ میں اس امید پر آیا تھا کہ ریگزاروں اور چٹانوں کو روند کر اس سرزمین پر آنے اور اسلام کا پرچم لہرانے والے محمد بن قاسم کے جانشین بھی عرب کے مجاہدوں کی طرح بوریا نشین ہوں گے۔"

"تمہیں کس نے بتایا ہے کہ ہم محمد بن قاسم کے جانشین ہیں؟" ۔ داؤد بن نصر نے گرج کر کہا۔ "ہم اس خطے کے فاتح ہیں۔ تم تاریخ سے بے خبر ہو۔ تم نہیں جانتے کہ ہمارے دادا احمد خان لودھی قرامطی نے یہاں آکر ملتان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ پھر بھی ہم تمہیں اجازت دے دیتے ہیں کہ اسے محمد بن قاسم کی فتوحات کی آخری نشانی کہو۔ ہم مسلمان ہیں ہمیں غیر نہ کہو مگر ہمارے دربار کے کچھ آداب ہیں۔"

"اگر ان آداب کا پابند نہ رہ سکنا گناہ ہے تو میں معافی مانگ لیتا ہوں" ۔۔۔ عاصم عمر نے کہا۔ "میں ان آداب سے واقف نہیں ۔۔۔ کیا میں تحفے پیش کروں؟"

"اجازت ہے۔"

دربار کے باہر عاصم عمر کے ساتھ آنے ہوئے چار محافظ کھڑے تھے۔ تحفے

ان کے پاس تھے۔ عاصم عمر نے باہر جا کر اپنے محافظوں سے کہا کہ وہ تحفے اندر لے چلیں ۔۔۔ ان میں بیش قیمت ہیرے بھی تھے اور غزنی کے علاقے کی دلکش اور قیمتی اشیا بھی تھیں۔ ایک تلوار بھی تھی جس کے متعلق عاصم عمر نے داؤد بن نصر کو بتایا کہ یہ راجہ جے پال کی تلوار ہے جو اس نے آخری حملے کی ناکامی کے بعد سلطان محمود غزنوی کے قدموں میں رکھی اور التجا کی تھی کہ اسے بخش دیا جائے، وہ آئندہ غزنی پر حملے کی جرأت نہیں کرے گا۔

عاصم عمر نے آگے بڑھ کر یہ تلوار داؤد بن نصر کے قدموں میں رکھ دی۔

"پیغام کیا ہے؟" ۔۔۔ داؤد بن نصر نے پوچھا۔

"کیا مجھے تنہائی میں بات کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی؟" ۔ عاصم عمر نے پوچھا۔

داؤد بن نصر نے درباریوں پر نگاہ دوڑائی تو تمام درباری اٹھ کر باہر چلے گئے۔ صرف دو لڑکیاں رہ گئیں جو داؤد بن نصر کے پیچھے کھڑی مورچھل ہلا رہی تھیں۔ داؤد کے اشارے پر عاصم عمر اس کے قریب چلا گیا اور اس کے اشارے پر وہ تخت کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"ہمیں دربار کی اس شان و شوکت کو برقرار رکھنا پڑتا ہے" ۔ داؤد بن نصر نے عام انسانوں کے لہجے میں کہا۔ "یہ ہماری مجبوری ہے اور آپ ایسے درباروں سے واقف نہیں۔ یہ آپ کی مجبوری ہے ۔۔۔ کیا آپ کوئی تحریری پیغام لائے ہیں؟"

"راستے میں دشمن کے خطرے کی وجہ سے سلطان نے تحریری پیغام نہیں دیا" ۔ عاصم عمر نے کہا۔ "میں سالار ہوں۔ پیغام چونکہ عسکری نوعیت کا ہے اس لئے سلطان نے مجھے بھیجا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ راجہ جے پال ہماری سلطنت پر تین حملے کر چکا ہے۔ ہر بار اسے ہتھیار ڈالنے پڑے اور اس نے تاوان اور اپنی جان بخشی کے عوض وعدہ کیا کہ وہ آئندہ حملہ نہیں کرے گا۔ اس نے ہر بار وعدہ توڑا۔ آخر اسے خودکشی کرنی پڑی۔ اس کا بیٹا انند پال اس کا جانشین ہے۔ اس نے تاوان ادا کرنے

سے انکار کر دیا اور اب سلطان کو اطلاعیں مل رہی ہیں کہ وہ ہمارے خلاف جنگی تیاریوں میں مصروف ہے۔"

دونوں لڑکیاں داؤد بن نصر کے پیچھے کھڑی مورچھل ہلا رہی تھیں اور وہ عاصم عمر کی باتیں غور سے سن رہی تھیں۔

"آپ کو یہ علم ہے کہ اپنی سلطنت کو محفوظ کرنے کے لیے ہم نے لغمان اور پشاور پر قبضہ کر لیا ہے۔ معاہدے کے مطابق پنجاب ہماری سلطنت کا حصہ بن چکا ہے اور انند پال اور بھاٹنہ (بھیرہ) کا راجہ بجی رائے ہمارے باجگزار بھی ہیں اور ہمارے مقرر کیے ہوئے حاکم بھی۔ اُن کا کوئی حکم اور فرمان سلطان محمود غزنوی کی مہر کے بغیر نافذ العمل نہیں ہو سکتا، مگر دونوں اس معاہدے سے منحرف ہو گئے ہیں۔ سلطان نے فیصلہ کیا ہے کہ پیشتر اس کے کہ یہ دونوں دوسرے راجاؤں کے ساتھ اتحاد کر کے ہم پر فوج کشی کریں، سلطان ان پر فوج کشی کریں جس کے دو مقاصد ہوں گے۔ ایک یہ کہ انہیں شکست دے کر اقتدار سے محروم کر دیا جائے، دوسرے یہ کہ ہند میں محمد بن قاسم کا دورِ حکومت واپس لایا جائے یعنی کم از کم شمال مغربی ہند سلطنتِ اسلامیہ میں شامل ہو جانا چاہیے۔ یہ کارروائی اسلام کے فروغ کے لیے ہو گی۔ ایک اسلامی سلطنت بُت خانہ بن چکی ہے۔"

"اس سلسلے میں ہمیں کیا کرنا ہے؟" — داؤد بن نصر نے پوچھا۔

"میں چونکہ سالار ہوں، اس لیے عسکری رنگ میں بات کروں گا" — عاصم عمر نے کہا — "ہمیں انند پال اور بجی رائے کے علاقوں کے درمیان ایک مقام کی ضرورت ہے جسے ہم اپنا عسکری مستقر بنائیں گے۔ رسد ہمارے قریب ہونی چاہیے۔ آپ کی ریاست چونکہ اسلامی ہے اس لیے یہاں سے عسکری بھرتی بھی کر سکیں گے۔ اس سے آپ کو یہ فائدہ ہو گا کہ ہماری فوج یہاں آ جانے سے ہندو آپ کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکیں گے۔ ہمیں آپ سے اور آپ کو ہم سے مدد ملے گی۔ سلطان کو آپ کی طرف سے یقین دہانی کی ضرورت ہے۔ آپ ہمیں یقین دلا دیں کہ جب ہم پشاور سے [illegible] ان کی طرف بڑھیں گے تو آپ اپنی فوج کو اس مقصد کے لیے تیار

رکھیں گے کہ اگر انند پال یا بجی رائے نے ہم پر راستے میں حملہ کیا تو آپ عقب یا پہلوؤں سے ان پر حملہ کر کے اُکھاڑیں گے۔ ہم آپ کو اکیلا نہیں چھوڑیں گے۔"

"اگر سلطان محمود فوج کشی کرنا چاہتے ہیں تو کریں، ہم انہیں روک تو نہیں سکتے" — داؤد بن نصر نے کہا — "میرے پاس اتنی فوج نہیں کہ میں دو راجاؤں کی فوج کا مقابلہ کر سکوں۔"

"اگر میں آپ کا یہ جواب لے کر سلطان کے پاس گیا تو وہ مطمئن نہیں ہوں گے" — عاصم عمر نے کہا — "میں خود بھی آپ کے جواب سے مطمئن نہیں ہوا۔ فوج میری اور مجھ جیسے سالاروں کی قیادت میں پیش قدمی کرے گی۔ خطروں اور مشکلات کا جائزہ ہمیں لینا ہے۔ میں ادھر آتے ہوئے راستہ اور ارد گرد کی زمین دیکھتا آیا ہوں۔ میں کھیوڑا کے چٹانی علاقے سے گزر کر آیا ہوں۔ میرے لیے یہی راستہ محفوظ تھا۔ فوج کو اس راستے سے نہیں گزارا جائے گا کیونکہ فوج کو روکنے کے لیے یہ علاقہ تیر اندازوں کے لیے نہایت اچھا ہے۔ آپ کے کرنے کا کام یہ ہے کہ آپ اپنے تیر انداز پہلے ہی اس علاقے میں بھیج دیں۔ یہ ہماری فوج کی پیش قدمی کی حفاظت کریں گے۔"

"اگر ہم نے یہ اقدام کیا تو ہمیں اپنے تیر انداز اپنی ریاست سے نکال کر ہندو راجاؤں کے علاقوں میں بھیجنے پڑیں گے۔"

"لغمان اور غزنی راجہ جے پال کے علاقے نہیں تھے" — عاصم عمر نے کہا — "اور لغمان اور ہند ہمارے علاقے نہیں ہیں کہ جے پال نے ہمارے علاقے پر فوج کشی کی اور ہم ان کے علاقوں پر فوج کشی کر رہے ہیں۔ یہ نہ بھولیں کہ جن علاقوں پر یہ راجے قابض ہیں یہ سلطنتِ اسلامیہ کے علاقے ہیں۔ اگر نہ ہوں تو بھی ہمیں ان علاقوں کو اسلام کے پرچم تلے لانا ہے۔"

داؤد بن نصر گہری سوچ میں کھو گیا۔ کچھ دیر بعد بولا — "آپ کے سلطان کا مطالبہ ایسا نہیں کہ اسے فوراً تسلیم کر لیا جائے۔ ہمیں جنگی نوعیت کا اقدام کرنا ہے۔ اس کے لیے ہمیں گہری سوچ بچار کرنی پڑے گی اور اپنے مشیروں سے مشورہ لینا ہو

گا۔ آپ کو تین چار دن رکنا پڑے گا۔“

”کیا میں امید رکھوں کہ مجھے اطمینان بخش جواب ملے گا؟“

”امید رکھنے میں کوئی حرج نہیں“ — داؤد بن نصر نے کہا — ”آپ ملتان کی سیر کریں، شہر کی دیواریں دیکھیں۔ اس کے برج دیکھیں۔ شاید آپ شہر کے دفاع کے لیے کوئی بہتر مشورہ دے سکیں گے..... آپ ہمارے شاہی مہمان ہیں۔ آج رات آپ کے اعزاز میں جشن منایا جائے گا اور بہت بڑی ضیافت ہو گی۔“

ضیافت اتنی بڑی تھی جو عاصم عمر دیکھ کر بھی تصور میں نہیں لا سکتا تھا۔ محل کے باغ میں جشن اور ضیافت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اوپر جو شامیانے اور ارد گرد جو قناتیں لگائی گئی تھیں، وہ یوں لگتا تھا جیسے سونے اور چاندی کے تاروں سے تیار کی گئی ہوں۔ شامیانوں کے ساتھ جو فانوس لٹک رہے تھے، ان کی روشنیوں کے کئی رنگ تھے۔ یہ روشن رنگ شامیانوں اور قناتوں کے چمکتے ستاروں سے منعکس ہو کر ماحول کو طلسماتی بنا رہے تھے۔ کالے رنگ کے چہرے بھی گورے لگتے تھے۔

عاصم عمر پر ایسی پُر کیف کیفیت طاری ہونے لگی جیسے وہ قوس قزح پر خراماں خراماں چلا جا رہا ہو۔ طاؤس اور طبلے کی ہلکی ہلکی سُر تال پر ایک نوجوان لڑکی یوں رقص کر رہی تھی جیسے کوئی حسین ناگن بین کی لے پر بل کھا رہی ہو۔ اُس کے کندھے اور بازو عریاں، ڈھکے ہوئے سینے کے نیچے پیٹ کا خاصہ حصہ عریاں تھا۔ ناف کے نیچے سے ٹخنوں تک اسکا جو لباس تھا، وہ ریشم کی رنگ برنگی رسیاں تھیں جو لٹک رہی تھیں۔ سر کے بال کھلے اور بکھرے ہوئے تھے۔ وہ جب رقص کی اداؤں سے بل کھاتی تھی تو اُس کی کبھی ایک کبھی دوسری ٹانگ ریشم کی رسیوں میں سے ٹخنے سے لے کر کولہے تک عریاں ہو جاتی تھی۔ اس کے جسم کا قدرتی رنگ گورا ہو گا لیکن روشنیوں کے رنگوں نے مل جل کر اُسے ایسا رنگ دے رکھا تھا جو دیکھنے والوں کو مسحور کر رہا تھا۔

یہ رقاصہ تماشائیوں پر سحر طاری کرتی ہوئی ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئی جیسے جل پری نیلے شفاف سمندر میں تیرتے تیرتے لہر اُٹھا کے جل ترنگ میں تحلیل ہو گئی ہو۔ ایسی ہی ایک اور جل پری موسیقی کی لہروں پر تیرتی آئی اور پہلی سے زیادہ کیف پیدا کرنے لگی۔ عاصم عمر داؤد بن نصر سے دور بیٹھا تھا۔ وہاں سینکڑوں مہمان تھے۔ سب کو معلوم تھا کہ یہ ضیافت سلطان محمود غزنوی کے ایلچی کے اعزاز میں دی گئی ہے لیکن کسی کو کسی کا ہوش نہیں تھا کہ کون کہاں ہے۔ سب کی نظریں ان نوجوان لڑکیوں پر جمی تھیں جن کے جسم سُر تال پر تھرک رہے تھے۔

عاصم عمر نے تو جیسے میدان جنگ میں آنکھیں کھولی تھیں۔ بیس بائیس سال سے وہ تھرکتے اور تڑپتے جسم دیکھ رہا تھا لیکن وہ جسم نوجوان رقاصہ لڑکیوں کے نہیں، زخموں سے کٹے ہوئے سپاہیوں اور کمانداروں کے تھے جو تپتی ہوئی زمین پر، پتھروں پر اور ریت پر تھرکتے، تڑپتے اور ہمیشہ کے لیے بے حس ہو جاتے تھے۔ یہ سپاہی اُس کے اپنے بھی تھے، اُس کے دشمن کے بھی۔ اُس نے گھوڑوں، ہاتھیوں اور رتھوں تلے آ کر مرنے والے سپاہیوں کو بھی تڑپتے اور مرتے دیکھا تھا۔ ان جسموں کا رنگ ایک ہی ہوتا تھا — لال سرخ — مرتے وقت دوست اور دشمن اسی ایک رنگ میں رنگے جاتے تھے۔ اس ماحول پر روشنیوں کے رنگ نہیں، ایک ہی رنگ کی گرد چھائی رہتی تھی۔

عاصم عمر کو خاک و خون کے اسی ایک رنگ اور اس میں رنگے ہوئے ایک ہی جیسے ماحول سے پیار ہو گیا تھا۔ اُسے میدان جنگ کی ہولناکی اور ہیبت سے بھی پیار ہو گیا تھا۔ اُس نے اپنے سلطان کا جو دربار دیکھا تھا وہ بھی اسی رنگ کا تھا۔ دربار میں اُس کے چہرے پر جو گرد کی تہہ جمی ہوتی تھی، ویسی ہی تہہ اُس کے سلطان پر جمی ہوتی تھی۔ اُس دربار میں موت کے سائے رقص کرتے تھے۔

داؤد بن نصر کے جشن میں روشنیوں کے رنگوں اور ان رنگوں سے زیادہ حسین جسموں کو موسیقی کی لہروں پر بل کھاتے اور تیرتے دیکھا تو اُس کے سینے کا سپاہی مدہوش ہونے لگا۔ اُسے میدان جنگ کے تصور سے گھن آنے لگی — اُسے خون کی بدبو سے نفرت ہونے لگی۔ داؤد بن نصر کے طلسم ہوشربا میں اُسے محسوس ہوا جیسے وہ پے بہ پے معرکوں سے تھک کر شل ہو چکا ہے اور اب وہ رکاب میں پاؤں جمانے اور گھوڑے پر سوار ہونے کے بھی قابل نہیں رہا ہو۔ اُس کی جو قوت تھی وہ کمزوری بن گئی۔ اُس کا جو عزم تھا وہ

جوانی کا زندگی جذبہ بن گیا۔

دو لڑکیاں رقص کر کے جا چکی تھیں اور اب تیرہ چودہ سال کی عمر کے لڑکے جو لڑکیوں سے زیادہ خوبصورت اور دلکش تھے، جذبات میں ہلچل بپا کرنے والا رقص کر رہے تھے۔ ہر لڑکے کے صرف کولہے رنگدار اور چمکدار ریشمی کپڑے سے ڈھکے ہوئے تھے۔ موسیقی میں عربی رنگ بھی تھا۔ عاصم عمران لڑکوں میں کھویا ہوا تھا کہ عطر اور حسن کا ایک گولہ اس کے سامنے آ رُکا۔ اُس نے چونک کر اوپر دیکھا۔ رقاصہ لڑکیوں جیسی ایک لڑکی اُس کے سامنے کھڑی تھی۔ اُس کے ہونٹوں پر جو مسکراہٹ تھی وہ عاصم عمر نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ لڑکی نے چاندی کی طشتری اُٹھا رکھی تھی۔ اُس پر ایک صراحی اور پیالہ تھا۔

"یہ شاید شراب ہے"۔ عاصم عمر نے گھبرا کر کہا۔ "میں شراب نہیں پیتا، مسلمان ہوں۔"

"شراب نہیں"۔ لڑکی نے کہا۔ "شربت ہے"۔ لڑکی نے عاصم کے سامنے رکھی ہوئی تپائی پر طشتری رکھ کر صراحی سے پیالہ بھر دیا۔

عاصم عمر نے ڈرتے ڈرتے پیالہ اٹھایا اور ہونٹوں سے لگا لیا۔ ایک ہی گھونٹ نے اُس کی آنکھیں کھول دیں۔ اُس نے لڑکی کی طرف دیکھا جیسے اُس سے پوچھنا چاہتا ہو کہ یہ جنت کی نہر کا پانی تو نہیں؟ لڑکی کے ہونٹوں کے تبسم نے ایک طاقتور سالار کی قوت گویائی جیسے سلب کر لی ہو۔ اتنے میں ایک نوعمر لڑکا جو اس لڑکی کی طرح دلنشیں تھا، ایک بڑی طشتری اٹھائے ہوئے آیا۔ اس میں چھوٹے بڑے سالم پرندے رکھے تھے جو روسٹ کئے ہوئے تھے۔ ان سے بھاپ اُٹھ رہی تھی۔ اُس نے ادھر اُدھر دیکھا مہمانوں کے آگے ایسے ہی پرندے اور پیالے رکھے جا رہے تھے۔

لڑکی اور لڑکا چلے گئے۔ عاصم نے پیالہ ہونٹوں سے لگا لیا۔ پھر اُس نے ایک پرندہ اٹھایا۔۔۔ اور پھر اُسے یوں کیف آنے لگا جیسے وہ پرندوں کی طرح اُڑ رہا ہو یا جیسے آگر پھولوں کا رس چوس رہا ہو۔ لڑکی کئی بار آئی۔ لڑکا بھی آیا۔ وہ اُس کے آگے کچھ رکھ بھی دیتے تھے اور کچھ اٹھا بھی لیتے تھے۔ اُسے کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیا کچھ اور کتنا کچھ کھا چکا ہے اور کتنا شربت پی گیا ہے۔

یہی لڑکی اُسے اُس کمرے میں لے گئی جو اُس کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ خوشبو، سجاوٹ اور مسہری نے جیسے اُسے دھکیل کر پیچھے کر دیا ہو۔ وہ اپنے آپ کو اس کمرے اور اس مسہری کے قابل نہیں سمجھ رہا تھا۔ اُس کے قدم رُکنے لگے۔ لڑکی نے اُس کا ہاتھ تھام لیا اور پلنگ پر بٹھا دیا۔ پھر اُس کی پگڑی اُتار کر پرے رکھ دی۔

"یہ شربت نہیں شراب تھی"۔ عاصم عمر نے کہا۔

"ہم سب مسلمان ہیں"۔ لڑکی نے کہا۔ "یہاں وہ شراب نہیں آ سکتی جو کافر پیا کرتے ہیں۔ ہم محمد بن قاسم کے جانشین ہیں۔ ہم اسلام کے پیروکار ہیں۔"

لڑکی نے صراحی میں سے پیالہ بھرا اور اُس کے ہاتھ میں دے دیا۔ وہ پینے لگا۔ جب اُس نے پیالہ رکھ دیا تو لڑکی نے اُس کے دونوں گال اپنے ہاتھوں میں تھام کر آنکھیں اُس کی آنکھوں میں ڈال دیں۔

"یہی زندگی ہے"۔ لڑکی نے خوابناک آواز میں کہا۔ "یہی اسلام ہے۔ کوئی سزا نہیں، کوئی جزا نہیں۔"

عاصم عمر کی آنکھوں کے آگے اس لڑکی کی آنکھیں اور مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی۔ اس کا چہرہ دھندلا گیا۔ عاصم عمر کا ذہن اُس کے قابو سے نکل گیا تھا۔ اُس کے ذہن نے قبول کر لیا تھا کہ یہی زندگی اور یہی اسلام ہے۔ وہ بھول گیا کہ وہ کون ہے اور یہاں کیوں آیا تھا۔ ایک نیم عریاں اور حسین لڑکی کی گرم سانسوں نے ایمان کی شمع گل کر دی۔

شام کو جب مہمان جشن [illegible] کے لئے آ رہے تھے محل کے ایک کمرے میں ان دو میں سے ایک لڑکی جو دن کو داؤد بن نصر کے پیچھے کھڑی مورچھل ہلا رہی تھیں، ایک آدمی کو بتا رہی تھی کہ [illegible] نصر کے لیے کیا پیغام لایا ہے، اور جب رقص کے دوران ایک لڑکی نے عاصم عمر کو شربت پیش کیا تھا، اُس وقت وہ آدمی داؤد بن نصر کے پاس بیٹھا تھا جسے لڑکی نے عاصم عمر کا پیغام سنایا تھا۔

"آپ کو سلطان محمود سے ڈرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟"۔ اس آدمی نے کہا۔ "کیا آپ کو ابھی تک یقین نہیں آیا کہ مہاراج اننگ پال اور مہاراج بجے رائے آپ کی ریاست کی حفاظت کی ذمہ داری اپنے سر لے چکے ہیں؟ [illegible] دونوں کی [illegible]

لیے آپ کے ہاں مقیم ہوں۔ سلطان محمود کو آپ کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ اپنی سلطنت کی توسیع کر رہا ہے۔ اس کے لیے ہندو اور مسلمان ایک ہیں۔"

"کیا آپ کو میری وفاداری پر شک ہے؟" — داؤد بن نصر نے پوچھا — "آپ دیکھ نہیں رہے کہ میں نے اسلام کی روح مار دی ہے اور مسلمانوں کے دلوں سے سزا اور جزا کا تصور ختم کر دیا ہے؟ آپ سے کس نے کہا ہے کہ میں سلطان محمود کا مطالبہ پورا کر رہا ہوں؟ وہ دیکھیں، میں نے اس کے لیے کیا انتظام کر دیا ہے۔ اس لڑکی کو ہم نے انسانوں کو مسحور کرنے اور انہیں اپنا مذہب اور اپنا نام بھی فراموش کرا دینے کے لیے تیار کر رکھا ہے۔"

"یہ کافی نہیں" — اس آدمی نے کہا — "جس طرح یہ ایلچی سالار ہے، اسی طرح میں بھی اپنے پیشے کا فوجی ہوں۔ میں آپ کو جنگی مشورہ دوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ سلطان محمود کو پسند نہیں کرتے۔ آپ یہی چاہتے ہیں کہ سلطان محمود کو دور ہی دور تباہ کر دیا جائے۔ اس کے لیے آپ اس آدمی کو تیار کر سکتے ہیں۔ اسے کہیں کہ سلطان محمود اپنی فوج ملتان لے آئے اور آپ راستے میں اس کی حفاظت کا انتظام کر دیں گے۔ میں آپ کو وہ راستہ بتاؤں گا جس سے وہ فوج لائے۔ میں انتظام کر دوں گا کہ اننڈپال کی فوج اسے راستے میں بے خبری میں تباہ کر دے۔"

"میں نے ایلچی کا ذہن صاف کرنے کا بندوبست کر دیا ہے" — داؤد بن نصر نے کہا — "وہ دیکھو۔ اس نے ایک پیالہ خالی کر لیا ہے۔ وہ شربت سمجھ کر پی گیا ہے۔ کوئی کسر رہ گئی تو یہ لڑکی پوری کر دے گی۔"

عاصم عمر کے چاروں محافظ داؤد بن نصر کے محافظوں کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ ان کا سالار جیتے جی بہشت میں داخل ہو گیا ہے، اور اسے معلوم نہیں کہ یہ ایک رات کی بہشت ہے۔

صبح طلوع ہوئی تو علی الصبح جاگ اٹھنے والا عاصم عمر ابھی گہری نیند سویا ہوا تھا۔ سورج اوپر اٹھ آیا تو اس کی آنکھ کھلی۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ اس کا دماغ واپس آ رہا تھا۔ رات والی لڑکی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں طشتری تھی۔

"تم نے رات مجھے گناہگار کر دیا ہے؟" — عاصم عمر نے گھبراہٹ کے عالم میں پوچھا — "میں یہاں کسی اور کام کے لیے آیا تھا۔"

لڑکی نے طشتری اس کے آگے رکھ کر ایک پیالہ اس کے ہاتھ میں دیا جس میں دودھ تھا۔ اس نے پیالہ رکھ دیا اور بولا — "میں تمہارے ہاتھ سے کچھ بھی قبول نہیں کروں گا۔ مجھے بتاؤ، رات مجھے کیا ہوا تھا؟"

"تم جہنم سے جنت میں آئے ہو" — اسے ایک آواز سنائی دی۔

اس نے ادھر دیکھا۔ ایک لمبا تڑنگا سفید ریش بزرگ کھڑا تھا۔ اس کے سفید نورانی چہرے پر بڑھاپے کی گہری لکیریں تھیں۔ وہ سر سے پاؤں تک ایک سفید لبادے میں ملبوس تھا۔ اس کی داڑھی دودھ کی طرح سفید اور لمبی تھی۔ اس کے ہاتھ میں عصا تھا۔ وہ دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوا تھا۔

"تمہیں گناہوں سے ڈرانے والے خود گناہگار ہیں" — سفید ریش نے کہا — "یہ تمہارے بادشاہ اور تمہارے سلطان ہیں۔ تم میدانِ جنگ کے خون خرابے کے اتنے عادی ہو چکے ہو کہ یہ آسائش تمہیں گناہ کی طرح بری لگتی ہے۔ یہ آسائشیں تمہارا حق ہے جو تم سے چھین لیا گیا ہے۔ تم سے جنگیں لڑائی جاتی ہیں اور تمہیں یقین دلایا جاتا ہے کہ تم لڑتے ہوئے مارے گئے تو سیدھے بہشت میں جاؤ گے، مگر تمہیں یہ بتلانے والا کوئی نہیں کہ بہشت اسی دنیا میں ہے۔ تمہارے بادشاہ اور سلطان تمہیں اس لیے مرواتے ہیں کہ وہ زندگی کی بہشت میں محفوظ رہ سکیں۔ تمہیں کس نے بتلایا ہے کہ اسلام نے عیش و عشرت کو گناہ کہا ہے؟"

سفید ریش کے بولنے کے انداز اور لب و لہجے میں ایسا تاثر تھا کہ عاصم عمر پر خود سپردگی کی وہی کیفیت طاری ہو گئی جو رات لڑکی کو دیکھ کر طاری ہوئی تھی۔ یہ دراصل انسانی فطرت کی کمزوریاں تھیں جو مجسم گناہ کو دیکھ کر اس کے اندر بیدار ہو گئی تھیں۔ سفید ریش بزرگ اسے جو کہہ رہا تھا وہ وہی کچھ سننا چاہتا تھا۔ اسے گناہ کے لیے جواز کی ضرورت تھی جو یہ بزرگ پوری کر رہا تھا۔ یہ اسی انتظام کے تحت ہو رہا تھا جس کا ذکر داؤد بن نصر

نے اپنے ایک ہندو مہمان کے ساتھ کیا تھا۔ عاصم عمر سالاری کے رتبے کا آدمی تھا۔ اسی ایک آدمی کے ذہن اور دل پر قبضہ کر لینے سے سلطان محمود غزنوی کی فوج کے چوتھائی حصے سے آسانی سے ہتھیار ڈلوائے جا سکتے تھے۔

عاصم عمر اس جال میں آچکا تھا۔ اُسے داؤد بن نصر کا پیغام ملا کر آج اُسے ملتان کی سیر کرائی جائے گی۔ اُس کے لیے داؤد کی ذاتی بگھی آگئی جس کے آگے اعلیٰ نسل کے چار گھوڑے جتے ہوئے تھے۔ ساتھ زرق برق لباس میں داؤد کے اپنے محافظ تھے۔ جہاں اُسے سیر کے لیے جایا گیا وہ دریا کے کنارے بڑی خوشنما جگہ تھی۔

عاصم عمر اپنے آپ کو بادشاہوں کے درجے کا آدمی سمجھنے لگا۔

اس کے اپنے جو چار محافظ آئے تھے، اُن کے متعلق اُس نے پوچھا ہی نہیں کہ کہاں ہیں۔ انہیں بھی دربار سے اطلاع دی گئی تھی کہ آج اُن کا سیر کا دن ہے۔ وہ جہاں چاہیں جا سکتے ہیں چنانچہ وہ شہر میں چلے گئے تھے۔

وہ ایک درویش صورت انسان تھا۔ لباس سے بھی درویش ہی لگتا تھا۔ سلیقے سے تراشی ہوئی داڑھی اور چہرے کے نور سے عالم فاضل لگتا تھا۔ ایک پختہ مکان کے دروازے میں داخل ہوتے رُک گیا۔ اُسے چار لمبے تڑنگے غزنوی آتے نظر آئے جن کا لباس بتا رہا تھا کہ مسلمان ہیں اور اجنبی۔ وہ ملتان کے تو لگتے ہی نہ تھے۔ وہ ہندوستان کے کسی خطے کے بھی نہیں تھے۔ درویش ان کے راستے میں رُک گیا۔

”غزنی؟“۔ درویش نے مسکرا کر کہا۔

چاروں رُک گئے اور مسکرانے لگے۔

”کیا آپ لوگ تھوڑی سی دیر کے لیے میرے گھر میں آنا پسند کریں گے؟“۔ درویش نے فارسی زبان میں کہا۔ ”مجھے میزبانی کا شرف بخشیں۔“

اپنی زبان سن کر چاروں درویش کے ساتھ اندر چلے گئے۔ خاطر تواضع کے دوران محافظوں نے درویش کو بتایا کہ وہ سالار عاصم عمر کے ساتھ آئے ہیں جو داؤد بن نصر کے لیے سلطان محمود کا پیغام لایا ہے۔

”عاصم عمر اس وقت کہاں ہے؟“۔ درویش نے پوچھا۔

”ہم نے انہیں شاہی بگھی پر سیر کو جاتے دیکھا تھا“۔ ایک محافظ نے جواب دیا۔

”میں عاصم عمر سے ملنا چاہتا تھا“۔ درویش نے کہا۔ ”لیکن مجھے بتایا گیا ہے کہ وہ شاید اپنے محافظوں سے بھی نہیں مل سکے گا۔“

”کیوں؟“۔ ایک محافظ نے حیران ہو کر پوچھا۔ ”یہاں ایسا خطرہ تو نہیں کہ اُسے قید میں ڈال دیا گیا ہو۔ راجہ بجے پال نے ایک بار ہمارے دو ایلچیوں اور اُن کے محافظوں کو لاہور میں قید میں ڈال دیا تھا۔ وہ قید میں ہی بھوک پیاس سے مر گئے تھے۔“

”وہ قید اچھی ہے جس میں انسان اذیت، بھوک اور پیاس سے مر جاتا ہے“۔ درویش نے کہا۔ ”مگر جن زنجیروں میں آپ کے سالار عاصم عمر کو باندھا گیا ہے وہ بہت بُری ہیں۔ اس قید میں انسان تو زندہ رہتا ہے، اُس کا ایمان اور اُس کا مذہب مر جاتا ہے۔ وہ سپاہی نہیں رہتا۔ یہ اُن حسین اور بے حجاب لڑکیوں کے گیسو اور اُن کے نازک اور کھلتے جسموں کی زنجیریں ہیں جنہیں کل میں اسی مقصد کے لیے پالا جاتا ہے۔ وہ جب رات ضیافت میں گیا تھا تو آپ نے اُسے وہاں دیکھا تھا؟“

”نہیں، الگ کھانا دیا گیا تھا“۔ ایک محافظ نے کہا۔

”اُسے رات شراب پلائی گئی تھی“۔ درویش نے کہا۔ ”اور باقی رات وہ ایک ہندو لڑکی کے نشے میں رہا ہے۔ یہ ہندو جادوگریاں کیا کرتے ہیں۔“

”کیا آپ بھی رات کے جشن میں گئے تھے؟“

”نہیں“۔ درویش نے جواب دیا۔ ”شاہی دربار کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں لیکن میری آنکھیں اور میرے کان دربار میں رہتے ہیں۔ عاصم عمر جو پیغام لایا ہے، میں وہ بھی جانتا ہوں۔“

”خطرہ کیا ہے؟“

”خطرہ یہ ہے کہ عاصم عمر داؤد بن نصر کا مرید اور ہندو راجوں کا نمائندہ بن کر

واپس جائے گا اور سلطان کے لیے ایک دھوکہ دے کر جائے گا" ۔۔۔ درویش نے کہا ۔ "میں سوچ رہا تھا کہ میں ہاشم عمر تک یا آپ لوگوں تک کس طرح پہنچوں۔ ارادہ نیک ہو تو خدائے ذوالجلال سبب پیدا کر دیتے ہیں۔ آپ شہر کی سیر کے لیے آ رہے تھے اور خدا نے مجھے آپ کے راستے میں کھڑا کر دیا۔"

"ہمیں بتایا گیا تھا کہ ملتان اسلامی ریاست ہے۔" ایک محافظ نے کہا ۔۔۔ "اور داؤد بن نصر مسلمان ہونے کی وجہ سے سلطان سبکتگین کے دور سے ہمارا دوست چلا آ رہا ہے۔"

"میں حیران ہوں کہ سلطان محمود نے سب کچھ جانتے ہوئے آپ کو یہاں کی حقیقت کیوں نہیں بتائی۔" درویش نے کہا۔ "یہ مجھ سے سن لو تاکہ تم بھی انہی زنجیروں میں نہ بندھ جاؤ جن میں تمہارا سالار گرفتار ہو چکا ہے ۔۔۔۔ ملتان پر قرامطی فرقہ حکمران ہے۔ یہ لوگ اپنے آپ کو مسلمان کہلاتے ہیں لیکن ان کے عقیدے اسلام کے منافی ہیں، مثلاً یہ کہ نیکی اور بدی، جزا اور سزا محض ڈھکوسلے ہیں۔ انسان کو خدا نے عیش و عشرت کے لیے پیدا کیا ہے۔ ان کے ہاں حرام اور حلال میں کوئی فرق نہیں۔ اس کے باوجود یہ فرقہ اپنے آپ کو مسلمان کہلاتا ہے۔ اس فرقے کے دو بانی تھے۔ ایک عبداللہ اور دوسرا میمون ۔۔۔۔ انہوں نے تیسری صدی ہجری کی ابتدا میں کہیں عرب میں اس کی بنیاد رکھی تھی مگر اس فتنے کے اصل بانی عیسائی مبلغ تھے، اور انہیں یہودیوں کی مدد بھی حاصل تھی۔ بعض مؤرخوں نے اسے ایرانی فرقہ کہا ہے ۔۔۔۔

"اسی سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ فرقہ کیوں پیدا کیا گیا تھا ۔۔۔۔ اسلام کی روح کو مسخ کرنے کے لیے ۔۔۔ اسلام آدھی دنیا میں پھیل چکا تھا۔ لوگ جو سچے مذہب کی تلاش میں تھے، اسلام قبول کر رہے تھے۔ اسلام کا نور بحیرہ روم کے دوسرے کنارے سے بھی دور آگے کفرستان میں چلا گیا تھا۔ عیسائی مبلغوں اور یہودی فتنہ پردازوں نے اس اصول پر عمل کیا کہ کسی مذہبی نظریئے کو تلوار سے نہیں کاٹا جا سکتا۔ اس نظریئے کے پیروکاروں کے قتل عام سے نظریہ ختم نہیں ہو سکتا۔ اگر نظریہ برحق ہو تو یہ ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ مذہبی نظریئے کو تباہ کرنے کے لیے اس میں ملاوٹ کرنا ضروری ہوتا ہے۔

اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس کے قائدین اور پیروکاروں کے ذہنوں پر قبضہ کیا جائے۔ اس کا یہی ایک طریقہ ہے کہ ان میں ذہنی عیاشی اور لذت پرستی پیدا کی جائے ۔۔۔۔

"انسان کی سب سے بڑی کمزوری جنسی جذبہ ہے۔ یہ جذبہ خدا کی نگاہ میں مقدس ہے کیونکہ اسی سے انسان پیدا ہوتا ہے مگر یہی انسان کی سب سے بڑی کمزوری ہے کیونکہ اس کے ساتھ لذت اور فرار وابستہ ہیں۔ ہمارے دشمنوں نے اسلام کو جب بھی نقصان پہنچایا ہے، ہماری قوم کے اسی جذبے کو مشتعل کرنے کے سامان مہیا کیے ہیں جن میں دولت اور عورت سرفہرست ہیں ۔۔۔۔

"عیسائیوں اور یہودیوں نے عبداللہ اور میمون کو زر و جواہرات اور اپنی دلکش بیٹیوں کے ذریعے اپنا غلام بنا لیا اور ان کے ہاتھوں قرامطی فرقے کی بنیاد رکھوائی اور اسے سچا اسلام کہا۔ بظاہر مذہب پر حملہ نہ کیا، مذہب کے اصولوں میں رد و بدل کر کے کہا گیا کہ اصل اصول یہ تھے جنہیں دوسرے فرقے بدلتے رہے ہیں۔ اس فرقے نے مسلمان عورتوں کو بے حجابی کی اجازت دی اور مردوں سے کہا کہ کوئی بھی عمل گناہ نہیں ہے۔ جہنم اور جنت عالموں کے ذہن کی تخلیق ہیں۔ انسان کا حق ہے کہ وہ اسی دنیا کو اپنے لیے جنت بنا لے ۔۔۔۔

"انسان کی یہ فطری کمزوری ہے کہ نیکی کی طرف آہستہ آہستہ بڑھتا اور کبھی پیچھے بھی ہٹ آتا ہے لیکن بدی کی طرف لپکتا ہے۔ قرامطی فرقہ پھیلنے پھولنے لگا۔ تھوڑی سی مدت میں اس کی طاقت اتنی بڑھ گئی کہ انہوں نے ۲۹۰ ہجری میں شام کے مسلمانوں کو پہلے ذہنی پھر جسمانی طور پر تباہ کیا۔ پھر باقاعدہ حملہ کر کے ان کے گھر تباہ کر دیئے اور قتل عام بھی کیا۔ ۳۱۱ ہجری میں انہوں نے دو شہروں کوفہ اور بصرہ کو لوٹا اور یہ شہر اجاڑ دیئے۔ اس کے بعد انہوں نے ابوطاہر نام کے ایک آدمی کو جو مشہور بدکردار تھا، خلافت کی گدی پر بٹھا دیا اور مکہ معظمہ پر قبضہ کر لیا ۔۔۔۔

"قرامطیوں نے اسی پر اکتفا نہ کی۔ خانہ کعبہ سے حجر اسود (سیاہ پتھر) اکھیڑ کر اٹھا لے گئے۔ یہ تاریخی پتھر بیس سال تک ان کے قبضے میں رہا۔ خلفائے انہیں جو ڈھیل دے

رکھی تھی، وہ روک لی اور اُن پر ہلاکو خان کی شکل میں ایسا عذاب الٰہی نازل ہُوا کہ ان کی زیادہ تر تعداد ماری گئی اور اس فرقے کے جو لوگ بچ نکلے، وہ ایران چلے گئے۔ وہاں اُن پر خدا نے زمین تنگ کر دی تو وہ ہندوستان کے ان علاقوں میں آ گئے جہاں آج آپ انہیں دیکھ رہے ہیں....

"داؤد بن نصر کے دادا حمید خان قرامطی نے ملتان کو تباہ کر دیا تھا۔ اسے پھر سے آباد کیا اور اس طرح اپنی دہشت پھیلا کر اپنے فرقے کی تبلیغ شروع کر دی۔ یہ کہتے تھے کہ ہم اپنے ساتھ اصل اسلام لائے ہیں۔ آہستہ آہستہ یہ ریاست جو مسلمانوں کی ریاست تھی اور محمد بن قاسم کی آخری یادگار، قرامطیوں کا مرکز اور اڈہ بن گئی۔ انہوں نے یہاں بدی اور عیش و عشرت رائج کی اور اسے اسلام کہا۔ موجودہ حکمران داؤد بن نصر کے باپ نے ہندو راجاؤں اور مہاراجوں کے ساتھ گٹھ جوڑ کر لیا۔ پہلے اس فرقے کو عیسائی اور یہودی مدد دیتے تھے۔ اب ہندو ان کی پشت پناہی کرنے لگے ہیں....

"میں نے آپ کو قرامطیوں کی تاریخ اس لیے سنائی ہے کہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ آپ ایک زہریلے سانپ سے مدد مانگنے آئے ہیں۔ اگر اس نے مدد کا وعدہ کیا تو یہ دھوکا ہوگا۔"

"آپ کو کیسے پتہ چلا ہے کہ سالار عاصم عمر کیا پیغام لائے ہیں؟" — ایک محافظ نے پوچھا — "اور آپ کو یہ کس طرح معلوم ہُوا ہے کہ انہیں رات شراب پلائی گئی ہے؟.... کیا آپ غزنی کے جاسوس ہیں؟"

"نہیں" — درویش نے جواب دیا۔ "میں سلطان محمود کا نہیں، محمد بن قاسم کا جاسوس ہوں۔ ہم اُس اسلام کے پاسبان ہیں جو محمد بن قاسم یہاں لایا تھا۔ ہم نے زمین دوز جماعت بنا رکھی ہے جو اصل اسلام کا پرچار اور قرامطیوں کے اسلام کے خلاف کام کر رہی ہے۔ ہمارے بعض آدمی شاہی محل میں بھی ملازم ہیں۔ وہ اندر کے بھید معلوم کرتے رہتے ہیں۔ داؤد کو ذاتی طور پر معلوم ہے کہ اُس کے خلاف ایک جماعت سرگرم ہے۔ اُس کے مخبر ابھی تک اس جماعت کا سراغ نہیں لگا سکے۔ ہمیں قبل از وقت پتہ چل جاتا ہے کہ ہمارے خلاف کوئی کارروائی ہونے

والی ہے۔"

"ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

"آپ کو سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ داؤد آپ کا نہیں ہندوؤں کا دوست ہے" — درویش نے جواب دیا۔ "دوسرے یہ کہ آپ کو اپنے اس سالار پر بھی اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔ یہ اگر واپس جا کر سلطان کو کوئی جواب دے تو آپ سلطان کو یہ بتائیں کہ وہ داؤد پر بھروسہ نہ کرے، اور اگر آپ کا سلطان ہندو ریاستوں پر فوج کشی کرنے کا ارادہ کرے تو سب سے پہلے ملتان آئے اور ان قرامطیوں کو ختم کرے.... میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ مسلمان ہو کر اسلام کے ساتھ کھیلنے والی قوم کبھی زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس فرقے کو بھی تباہ ہونا ہے۔ داؤد بن نصر اسلام کا جھانسہ دے کر مسلمانوں پر حکومت کر رہا ہے۔ تباہی اس کے مقدر میں لکھ دی گئی ہے۔"

"ہمیں پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ سالار عاصم عمر کیا کرتے ہیں" — ایک محافظ نے کہا — "ہو سکتا ہے وہ داؤد بن نصر کے دھوکے میں نہ آئیں۔ اگر وہ اُس کے جال میں پھنس گئے تو ہم واپس جا کر سلطان کو یہ باتیں بتا دیں گے جو آپ نے ہمیں بتائی ہیں۔"

عاصم عمر داؤد بن نصر کے پاس بیٹھا تھا۔ اُن کے سامنے ایک نقشہ رکھا تھا جو کسی نے ہاتھ سے بنایا تھا۔

"آپ یہ نقشہ اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں" — داؤد بن نصر نے کہا۔ "میں نے آپ کو راستہ بتا دیا ہے۔ سلطان کی فوج اس رستے سے آئے۔ میں نے آپ کو وہ جگہ بھی بتا دی ہے جہاں سے آپ کی فوج دریائے چناب پار کرے گی۔"

"راستے میں انند پال یا کسی راجے کی فوج ہمارا راستہ ضرور روکے گی" — عاصم عمر نے کہا۔ "آپ نے جو راستہ دکھایا ہے اسے میں محفوظ نہیں سمجھتا.... آپ کی فوج کس طرح ہماری فوج کی حفاظت کرے گی؟"

داؤد نے جواب دیا جس سے عاصم عمر مطمئن نہ ہُوا۔ وہ داؤد کی باتوں اور اُس کے وعدوں کو ذہن جمع و ضرب کی کسوٹی پر پرکھ رہا تھا۔ اُسے کچھ شک سا ہونے لگا۔ اُس نے

داؤد کے ساتھ اتنی بحث کی کہ داؤد پریشان ہو گیا۔

"کیا آپ یہاں کچھ دن اور رہنا پسند نہیں کریں گے؟" داؤد نے اس سے پوچھا۔

"میں اپنے فرض کی خاطر جا رہا ہوں" — عاصم عمر نے کہا — "ورنہ میں تو جانا ہی نہیں چاہتا۔"

"پھر آپ اپنا فرض اس طرح پورا کریں جس طرح میں بتاتا ہوں" — داؤد بن نصر نے کہا — "آپ سلطان کو اسی راستے سے لائیں اور آپ ہمارے پاس آجائیں۔ آپ ہماری فوج کے سالار ہوں گے اور آپ کو یہی عیش و عشرت ملے گی جو آپ کو مل رہی ہے۔ اگر آپ سلطان محمود کو کامیابی سے ہمارے پھندے میں لے آئے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کو اپنی ریاست کا کچھ علاقہ دلا کر خود مختار حاکم بنا دوں گا۔ اتنی حسینہ لڑکی پا کر آپ کا حق ہے کہ آپ اس دنیا کو اپنے لیے جنت نظیر بنائیں۔"

داؤد بن نصر نے وہی باتیں شروع کر دیں جو ایک سفید ریش بزرگ اس کے دل میں اتار چکا تھا۔ داؤد نے یہ بھی کہا کہ ہندوؤں سے بڑھ کر کوئی اچھا دوست آپ کو نہیں ملے گا۔ ان کے ساتھ رہ کر دیکھو۔ بت شکن سلطان کی خواہشات اور اس کے عزائم پر اپنی جانیں قربان نہ کرو۔ کل صبح روانہ ہو جاؤ اور سلطان سے کہو کہ داؤد بن نصر آپ کی راہ دیکھ رہا ہے۔

اسی شام کا ذکر ہے۔ عاصم عمر اپنے کمرے میں تھا۔ اس نے اپنے چاروں محافظوں کو بلا رکھا تھا۔ وہ ان سے کہہ رہا تھا کہ کل صبح واپسی ہو گی۔ انہیں روانگی کے احکام دے کر اس نے محافظوں کو فارغ کر دیا۔ چاروں محل کی ایک غلام گردش سے گزر رہے تھے کہ انہیں اپنے پیچھے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ چاروں نے پیچھے دیکھا۔ ایک عورت آ رہی تھی۔ اس نے ان کے قریب سے گزرتے دھیمی آواز میں کہا — "تم میں سے ایک اسی وقت اس عالم کے پاس چلا جائے جس نے چاروں کو اپنے گھر میں بٹھایا تھا" — یہ کہہ کر وہ آگے نکل گئی۔

ان میں سے ایک محافظ محل میں سے نکل گیا اور درویش کے دروازے پر جا دستک دی۔ دروازہ درویش نے کھولا اور وہ محافظ کو اندر لے گیا۔

"عاصم عمر قرامطیوں کے خوبصورت پھندے میں آ گیا ہے" — درویش نے کہا — "اس نے داؤد کے ساتھ سودا طے کر لیا ہے۔ نقشہ اس کے پاس ہے۔ آپ لوگ کل صبح روانہ ہو رہے ہیں۔ عاصم عمر یہ نقشہ سلطان محمود کو دکھائے گا اور اس پر اسے ایک راستہ دکھائے گا۔ تم سلطان سے کہنا کہ وہ اس راستے سے نہ آئے۔ اسے یہ کہنا کہ جنہیں آپ اپنا مسلمان بھائی سمجھتے ہیں وہ ہندوؤں سے زیادہ خطرناک ہیں... جاؤ، زیادہ دیر یہاں نہ رکو۔"

"وہ کون تھی جس نے ہمیں پیغام دیا تھا کہ ہم میں سے کوئی آپ سے ملے؟" — محافظ نے پوچھا۔

"وہ ایک مظلوم عورت ہے" — درویش نے جواب دیا — "آپ نے اس کی خوبصورتی دیکھی ہو گی۔ اس کے ماں باپ نے منہ مانگی رقم اور کچھ زمین لے کر اس کی شادی ایک بڑے ہی امیر آدمی کے ساتھ کر دی تھی۔ اس آدمی نے ایک سال بعد اسے تحفے کے طور پر داؤد بن نصر کو دے دیا۔ اس کے پاس ایسی لڑکیوں کی کمی نہیں۔ اس نے ڈیڑھ دو سال حرم میں رکھ کر اسے شاہی دربار کی ملازمت دے دی۔ یہ میری بیٹی کی سہیلی تھی۔ کبھی کبھی گھر آیا کرتی ہے اور میری بیٹی سے ملتی ہے۔ پہلے پہل بہت روتی تھی۔ میرے کہنے پر میری بیٹی نے اسے کہا کہ وہ اس خوبصورت جہنم میں رہ کر اسلام کے لیے بہت کچھ کر سکتی ہے۔ چنانچہ وہ مجھے محل کے اندر کی خبریں دیتی رہتی ہے....

"آج جب داؤد بن نصر آپ کے سالار عاصم عمر کو اپنے پھندے میں پھانس کر اسے بتا رہا تھا کہ وہ سلطان محمود کو فلاں راستے سے لائے، اس وقت یہ عورت ان دونوں کو شراب اور شربت پیش کر رہی تھی۔ اس نے دونوں کی باتیں سنیں۔ اسے جونہی وہاں سے چھٹی ملی وہ میرے گھر آ گئی اور ساری بات سنا گئی۔ اب یہ ذمہ داری آپ پر عائد ہوتی ہے کہ سلطان سے کہو کہ عاصم عمر اسے دھوکہ دے رہا ہے اور آپ جو کر رہے ہیں یہ صحیح ہے۔"

"یہ عورت آپ کے پاس آتی رہتی ہے؟" — محافظ نے کہا — "اسے محل سے نکلنے کی اجازت مل جاتی ہے؟ آپ نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ اسے آپ کہیں غائب کر دیں؟"

کوئی مسلمان اسے ساتھ لے کر کہیں اور چلا جائے اور اس کے ساتھ شادی کر لے۔"

"کئی بار سوچا ہے" — درویش نے جواب دیا۔ "لیکن ایسا مسلمان نہیں ملتا جو اسے لے کر کہیں چلا جائے۔ آج اس نے مجھے کہا تھا کہ اگر آپ لوگ پسند کریں اور ہمت کریں تو اسے اپنے ساتھ غزنی لے جائیں۔ اگر اس کے ساتھ کسی نے شادی نہ کی تو وہ باقی عمر کسی مزار پر گزار دے گی یا کسی عالم یا ولی کی خدمت کرے گی۔"

"ہم اسے اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں" — محافظ نے کہا۔ "لیکن اسے سب کے سامنے لے جانا ناممکن ہے۔ ایک صورت یہ ہے کہ اسے کوئی شہر سے دور ہمارے راستے میں کہیں تک پہنچا دے۔ ہمارے لیے دوسری مشکل یہ ہے کہ سالار عاصم عمر شاید ہمیں لڑکی کو ساتھ نہ لے جانے دے۔۔۔۔ اسے ہم سنبھال لیں گے۔"

اگلے روز طلوعِ آفتاب سے بہت پہلے سالار عاصم عمر اپنے چاروں محافظوں کے ساتھ روانہ ہوا۔ اُن کے ساتھ اب ایک اونٹ بھی تھا جو داؤد بن نصر کے دیئے ہوئے تحفوں سے لدا ہوا تھا۔ ایک محافظ کی برچھی کے ساتھ چھوٹا سا سفید جھنڈا بندھا تھا جو اُس نے بلند کر رکھا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہم دوست ہیں۔

قافلہ شہر سے دور نکل گیا۔ دریا بھی پار کر لیا گیا۔ سالار عاصم عمر جب ملتان کی طرف آ رہا تھا تو محافظوں کے ساتھ دوستوں کی طرح باتیں کرتا آیا تھا مگر اب وہ خاموشی سے آگے آگے جا رہا تھا۔ اُس کی گردن بادشاہوں کی طرح تنی ہوئی تھی۔ وہ محافظوں کے ساتھ کوئی بات کرتا بھی تھا تو یہ کوئی حکم ہوتا تھا، یا کوئی ہدایت۔ سورج غروب ہونے کو تھا جب یہ لوگ ایک جنگل سے گزر رہے تھے۔ ایک محافظ نے اپنے ساتھیوں کو ایک طرف اشارہ کیا۔ سب نے دیکھا۔ گھنی جھاڑیوں میں چار آنکھیں اور دو چہروں کے ذرا ذرا سے حصے نظر آ رہے تھے۔ عاصم عمر آگے نکل گیا تھا۔

محافظوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس منصوبے پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا جو انہوں نے گزشتہ رات تیار کیا تھا۔ اس کے مطابق ایک محافظ نے اپنا گھوڑا روک لیا اور گھوڑے کو آہستہ آہستہ گھنی جھاڑیوں اور اونچی گھاس میں لے گیا۔ وہی جوان عورت جس نے انہیں درویش کے گھر جانے کا پیغام دیا تھا، اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ اُس کے ساتھ ایک آدمی

بھی تھا۔ اس نے عورت اس محافظ کے حوالے کی اور خاموشی سے چلا گیا۔ محافظ عورت کو ساتھ لیے وہیں چھپ کر بیٹھ گیا۔ وہ دونوں سوائے مسکرانے کے ایک دوسرے کی زبان نہیں سمجھتے تھے۔ عورت اُسے اشاروں کی زبان میں کہہ رہی تھی کہ چلیں مگر محافظ اُسے بیٹھے اور چھپے رہنے کا اشارہ کر رہا تھا۔

سورج غروب ہو گیا۔ عاصم عمر نے پڑاؤ کا حکم دیا۔ ایک محافظ غائب تھا۔ اُس نے دوسروں سے پوچھا تو تینوں محافظ حیران بھی ہوئے اور گھبرانے بھی۔ انہوں نے بتایا کہ وہ پیچھے پیچھے آ رہا تھا اور اب انہیں پتہ چلا ہے کہ وہ ہمارے ساتھ نہیں ہے۔ عاصم عمر آگ بگولہ ہو گیا۔ تینوں پر خوب برسا۔

"وہ واپس ملتان چلا گیا ہے" — ایک محافظ نے کہا۔ "اس نے ہمیں کہا تھا کہ ملتان اسے اتنا پسند آیا ہے کہ وہ یہاں سے جانا نہیں چاہتا۔ ہم اسے مذاق سمجھتے رہے۔"

"وہ کسی بازاری رقاصہ کو دل دے بیٹھا ہے"۔ دوسرے نے کہا۔ "اُسے تلاش کرنا بیکار ہے۔"

عاصم عمر نے بہت سوچا اور بولا۔ "اس کی تلاش اور تعاقب بے کار ہے۔ بہتر یہی ہے کہ اُسے ذلیل و خوار ہونے کے لیے وہیں جانے دیا جائے جہاں وہ گیا ہے" —

اس نے ایک اتنے اہم محافظ کی گمشدگی کو ذہن سے اتار دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کا ایمان ذہن ملتان میں داؤد بن نصر کے محل میں ہی رہ گیا تھا۔ وہ جسمانی طور پر وہاں سے آ گیا تھا، ذہنی طور پر وہ وہیں تھا۔ ایک محافظ تو معمولی سا آدمی تھا، اُس کی نظروں میں سلطان محمود کی بھی کوئی اہمیت نہیں رہی تھی۔

یہ تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ وہ جب اپنے تین محافظوں کے ساتھ سویا ہوا ہو گا، اُس کا گمشدہ محافظ ایک عورت کے ساتھ دور آگے جا چکا ہو گا۔

سلطان محمود غزنوی پشاور میں اپنے ایلچی سالار عاصم عمر کا انتظار بے تابی سے کر رہا تھا۔ دن پہ دن گزرتے جا رہے تھے۔ سلطان محمود نے کئی بار اس خطرے کا اظہار کیا کہ عاصم عمر اپنے محافظوں سمیت مارا گیا ہے یا ہندوؤں کے کسی قید خانے میں پہنچا دیا گیا ہو گا۔ اُس

نے اپنے سالاروں سے کہہ دیا تھا کہ عاصم عمر اور اس کے محافظوں کو ہندوؤں نے قید میں ڈالا تو وہ اُن کی ریاستوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گا اور وہاں اُسی ہندو کو زندہ رہنے کا حق دے گا جو اسلام قبول کرے گا۔

ایک روز اُسے اطلاع دی گئی کہ سالار عاصم عمر کا ایک محافظ ہندوستان کی بڑی حسین عورت کے ساتھ آیا ہے اور سفر ایسا ہوا کہ پاس زادِ راہ اور سواریوں اور گرد سے دونوں کی حالت بہت بُری ہے۔

"انہیں فوراً اندر بھیجو"۔ سلطان محمود نے گھبرا کر کہا۔ "کوئی حادثہ ہو گیا ہے"۔

محافظ اندر آیا تو اُس کا منہ کھلا ہوا تھا۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں اور اُس کی سانسیں اُکھڑی ہوئی تھیں۔ عورت کی حالت بھی ایسی ہی تھی۔ سلطان محمود کے حکم پر دونوں کو پانی پلایا گیا۔

"سلطانِ عالی مقام!" محافظ نے کہا۔ "ہم راستے میں ذرا سی دیر اس لیے رکتے رہے کہ گھوڑا آرام کر لے۔ ہمیں آپ کے حضور سالار عاصم عمر سے پہلے پہنچنا تھا۔ وہ شاید ابھی نہیں پہنچا۔ وہ آپ کے پیغام کا جواب لا رہا ہے جو سراسر فریب ہے۔ ملتان کا حکمران داؤد بن نصر ہندوؤں سے بڑھ کر آپ کا دشمن ہے۔ بجی رائے اور آنند پال نے اُسے اپنا اتحادی بنا رکھا ہے۔ انہوں نے آپ کو مروانے اور ہماری فوج سے ہتھیار ڈلوانے کا کام داؤد بن نصر کے سپرد کیا ہے۔ اس قرامطی نے عاصم عمر کو ایک نقشہ دیا ہے جس پر وہ راستہ دکھایا گیا ہے جس سے آپ اپنی فوج ملتان لے جائیں گے۔ ہندو راجوں نے آپ کے لیے ایک پھندا تیار کیا ہے"۔

"کیا عاصم عمر کو داؤد بن نصر کی نیت کا پتہ چلا ہے؟" سلطان محمود نے پوچھا۔

"عاصم عمر اپنا ایمان فروخت کر کے آ رہا ہے"۔ محافظ نے سلطان محمود کو بتایا کہ عاصم پر کیسے طلسم طاری کیے گئے ہیں اور وہ اب ہمارا سالار نہیں داؤد بن نصر کا آلۂ کار بن گیا ہے۔ "اُس نے کہا ہے تو وہ اسی فریب میں برابر کا شریک ہے جو آپ کو دیا جائے گا"۔

محافظ نے اس عورت کے متعلق سلطان محمود کو بتایا کہ اُسے کس طرح محل میں پہنچا دیا گیا تھا اور اس نے اپنی رُخصت کو مطمئن کرنے کا کیا ذریعہ اختیار کر رکھا تھا... ایک ترجمان کے ذریعے عورت نے سلطان محمود کو تفصیل سے بتایا کہ داؤد بن نصر کے محل میں کیا ہوتا ہے، وہاں کیسا مذہب رائج ہے اور عاصم عمر کو کس طرح جال میں پھانسا گیا ہے۔ اس نے داؤد اور عاصم عمر کی پوری گفتگو سنائی جو اُس نے اپنے کانوں سنی تھی۔

"اس عورت کو زنانہ میں بھیج دیا جائے"۔ سلطان محمود نے کہا۔ "اور اس محافظ کو ہمارے مہمان خانے میں رکھا جائے۔ جب عاصم عمر آئے تو اُسے پتہ نہ چلنے دیا جائے کہ یہ دونوں اُس سے پہلے آ گئے ہیں"۔

عاصم عمر پانچ چھ روز بعد آ گیا اور سیدھا سلطان محمود کے پاس گیا۔ اُس نے سلطان کو بتایا کہ داؤد بن نصر نے بیش قیمت تحفے بھیجے ہیں اور کہا ہے کہ وہ سلطان کے انتظار میں بے تاب ہو رہا ہے۔ عاصم عمر نے نقشہ سلطان محمود کے آگے رکھ کر بتایا کہ داؤد بن نصر نے ہماری فوج کے لیے یہ راستہ بتایا ہے۔ اس کی فوج اس راستے کے دائیں بائیں کے علاقے میں موجود ہوگی۔ عاصم عمر نے کہا کہ داؤد بن نصر ہمارا مخلص دوست ہے۔

"میں نے اپنی فوج ملتان تک لے جانے کا راستہ دیکھ لیا ہے"۔ سلطان محمود نے کہا۔ "اب مجھے یہ بتاؤ کہ بجی رائے اور آنند پال کی فوجیں کہاں کہاں ہماری فوج پر شب خون ماریں گی اور گھات کہاں کہاں لگائیں گی؟"

عاصم عمر نے حیرت سے سلطان محمود کی طرف دیکھا۔ سلطان محمود نے حکم دیا۔ "ان دونوں کو لے آؤ"۔

ذرا سی دیر میں عاصم عمر کا جو محافظ تھا، محافظ ایک عورت کے ساتھ اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"اس عورت کو پہچانو"۔ سلطان محمود نے عاصم عمر سے کہا۔ "اور یاد کرو کہ جب تم داؤد کے ساتھ اپنے ایمان کا اور میری جان کا سودا طے کر رہے تھے، یہ عورت تم دونوں کو شراب پلا رہی تھی... کیا اپنے گناہ کی ہر ایک تفصیل میری زبان سے سننا چاہتے ہو یا اس عورت کی زبانی؟... کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ اپنی زبان سے اپنے گناہ کا اعتراف کر لو؟"

عاصم عمر اُٹھ کھڑا ہُوا۔ ایمان فروشی اور گناہوں کے اثرات نے اُس کے جسم کی طاقت سلب کر لی۔ اُس کا دماغ سوچنے کے قابل نہ رہا۔ اُس نے اپنی تلوار نکال لی اور بجلی کی سی تیزی سے اُس کی نوک اپنے پیٹ پر رکھی پیشتر اس کے کہ کوئی اُس تک پہنچتا اُس نے دونوں ہاتھوں سے تلوار اتنے زور سے اپنے پیٹ میں داخل کر دی کہ اس کی نوک پیٹھ سے باہر آگئی۔

"اِس کی لاش شہر سے باہر پھینک دو۔" سلطان محمود نے کہا۔ "ایمان فروشوں کو گور و کفن کا حق نہیں ملنا چاہئے۔"

عاصم عمر ابھی تڑپ رہا تھا جب اُسے اُٹھا کر لے گئے۔ سلطان محمود نے اپنے سپہ سالار کو جو وہاں موجود تھا حکم دیا۔ "فوج کو کُوچ کے لیے تیار کرو۔ ہم ملتان پر حملہ کریں گے لیکن ہمیں راستے میں کئی معرکے لڑنے پڑیں گے۔ بُت پرستوں کے ہاتھوں قرامطیوں کا بھی خاتمہ کرنا ہے۔"

باپ کا پاپ

عاصم عمر نے اپنی تلوار اپنے پیٹ میں گھونپ کر غداری کے گناہ کی سزا پالی۔ وہ باہر دھوپ میں پڑا تڑپ تڑپ کر مرا کسی کو اجازت نہیں تھی کہ اُس کے منہ میں پانی کے دو قطرے ٹپکا دیتا۔ سلطان محمود غزنوی نے اُس کے پسماندگان پر یہ کرم کیا کہ انہیں لاش اٹھا لے جانے کی اجازت دے دی۔

عاصم عمر سلطان کی فوج کے پرانے اور تجربہ کار سالاروں میں سے تھا مگر نسوانی حُسن، شراب اور تھوڑے سے علاقے کی حکمرانی کے لالچ نے بڑے بڑے مضبوط قلعے سر کرنے والے اور لاکھوں کے لشکر کو دین و ایمان کی درانتی سے کاٹ پھینکنے والے سالار کی اپنی تلوار اُس کے اپنے پیٹ میں آ اتری۔ عاصم عمر کا بیٹا قاسم بن عمر اسی فوج میں ایک جیش کا کماندار تھا۔ وہ خوبرو نوجوان تھا، دلیر تھا اور فنِ حرب و ضرب کی سوجھ بوجھ بھی رکھتا تھا۔ باپ نے اسے بچپن میں ہی سپاہی بنا دیا تھا۔ اسے جب اطلاع دی گئی کہ اپنے باپ کی لاش لے جائے تو اسے ایک صدمہ تو یہ ہُوا کہ اس کا باپ جو نامی گرامی سالار تھا، مر گیا ہے، اور دوسرا صدمہ یہ ہُوا کہ وہ ملتان گیا تھا اور اسے ہندوؤں نے قتل کیا ہے۔ وہ سمجھا شاید اس کی لاش ملتان سے آئی ہے۔

اسے باپ کی موت کا پیغام دینے والا شخص اپنے ساتھ لے گیا۔ قاسم یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اُس کے باپ کی لاش باہر دھوپ میں پیٹھ کے بل خون میں ڈوبی پڑی تھی اور اس کے پیٹ میں تلوار اتری ہُوئی تھی۔ قریبی عمارت کے برآمدے میں سلطان محمود اور فوج کا سپہ سالار ابوعبداللہ محمد الطائی کھڑا تھا۔ ابوعبداللہ وہ سپہ سالار تھا جس کا ذکر تاریخوں میں سلطان محمود غزنوی کے ساتھ آیا ہے۔ قاسم بن عمر کو اپنے باپ کی لاش کے پاس حیران و پریشان کھڑے

دیکھ کر ابوعبداللہ اُس کے پاس جا کھڑا ہوا۔ اُسے اس نوجوان کماندار پر ترس آ رہا تھا۔ وہ قاسم کے قریب گیا اور اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

"تمہیں اور زیادہ حیران ہونا چاہیے تھا" — سپہ سالار نے کہا — "دل سے اپنے باپ کی محبت نکال کر اپنے عقیدے، اپنے مذہب اور اپنے فرض کی محبت پیدا کرو۔ یہ سوچ کر کہ تمہارا باپ کس طرح مرا ہے تو تمہیں زیادہ صدمہ نہ ہو۔"

"خون کی تازگی بتاتی ہے کہ انہیں یہاں اور ابھی ابھی قتل کیا گیا ہے" — قاسم بن عمر نے کہا — "ان کا قصور کیا تھا؟ یہ تو ملتان گئے ہوئے تھے۔ انہیں کس نے قتل کیا ہے؟"

"تمہارا باپ اپنا قاتل خود ہی ہے" — ابوعبداللہ نے کہا — "یہاں اس کا کوئی دشمن نہیں۔ اس نے اپنے ساتھ خود دشمنی کی۔ اپنے مذہب، اپنے ملک اور اپنی فوج کے ساتھ دشمنی کی۔"

ابوعبداللہ محمد الطائی نے اُسے پوری تفصیل سے سنایا کہ اُس کے باپ کا گناہ کیا تھا۔ قاسم بن عمر توجہ سے سنتا رہا۔

"کیا اپنے باپ کے گناہ کی سزا مجھے بھی بھگتنی پڑے گی؟" قاسم نے پوچھا — "کیا مجھے میرے عہدے سے ہٹا دیا جائے گا؟"

"سلطان نے ایسا کوئی حکم نہیں دیا" — سپہ سالار نے جواب دیا — "سلطان کے بعد میں ہوں جو تمہارے متعلق کوئی فیصلہ کر سکتا ہوں۔ میں نے تمہارے خلاف کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ تم نوجوان ہو۔ میرے سامنے ساری عمر پڑی ہے۔ تم میرے عہدے تک پہنچ سکتے ہو۔ اپنے باپ کے گناہ کا کفارہ ادا کرو۔ سوچو اور دیکھو کہ گناہ میں کشش کتنی ہوتی ہے کہ قاسم عمر جیسا دیندار سالار اس خوبصورت جال میں آ گیا۔ دیکھو کہ گناہ میں کتنی قوت ہوتی ہے کہ قاسم عمر جیسے نامور سالار نے اپنی پوری فوج کو تباہ کرنے اور محمود جیسے سلطان کو شکست دلانے اور ہندوؤں کے ہاتھوں مروانے کا انتظام کر دیا تھا۔ پھر اس سے عبرت حاصل کرو کہ گناہ جب سزا دینے پر آتا ہے تو قاسم عمر جیسا شیر دل سالار بھی اپنے آپ کو ہلاک کر لیتا ہے۔ تم نوجوان ہو۔ نوجوانوں کا ذہن ذرا سی انگوخت پر گناہ آلود خیالوں کا آشیاں بن جاتا ہے۔"

"[illegible] باپ کے گناہ کا کفارہ ادا کرنے کا موقع دیا جائے گا؟"

"تمہیں موقع دیا جا رہا ہے" — ابوعبداللہ نے جواب دیا — "لاش کے پیٹ سے تلوار نکالو اور لاش لے جاؤ۔"

"کیا میں اُس عورت سے مل سکتا ہوں جو ملتان سے آئی ہے اور میرے باپ کے گناہوں کی عینی شاہد ہے؟"

"تم لاش لے جاؤ" — سپہ سالار ابوعبداللہ نے کہا — "میں اس عورت کو تمہارے گھر بھیج دوں گا۔ وہ تمہاری ماں کو بھی ساری بات سنا دے گی۔ تم محافظ دستے کے اُس آدمی سے بھی مل لینا جس کے ساتھ یہ عورت آئی ہے۔"

قاسم بن عمر نے اپنے باپ کی لاش کے پیٹ سے تلوار نکالی۔ سپہ سالار نے لاش قاسم کے گھر لے جانے کا انتظام کر دیا۔

عاصم عمر اپنی بیوی کو پشاور اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ یہ عورت اسی علاقے کی رہنے والی تھی۔ راجہ جے پال نے جب ۹۷۷ء میں غزنی پر فوج کشی کی اور سلطان سبکتگین کے ہاتھوں شکست کھا کر بھاگا تھا تو بہت سی نوجوان لڑکیاں پیچھے رہ گئی تھیں۔ یہ وہ لڑکیاں تھیں جنہیں راجہ جے پال کی فوج کے بڑے بڑے افسروں نے آج کے پنجاب اور سرحد کے علاقوں سے اغوا کیا اور اپنے ساتھ میدان جنگ میں لے گئے تھے۔ ان میں سے ایک کے ساتھ عاصم عمر نے شادی کر لی تھی۔ اسی کے بطن سے قاسم پیدا ہوا تھا۔ وہ ان علاقوں کی زبان بولا کرتی تھی جن پر راجہ جے پال کی حکومت تھی۔ قاسم نے بھی ماں سے یہ زبان سیکھ لی تھی۔

عاصم عمر کی لاش گھر پہنچی تو قاسم کی ماں کی چیخیں نکل گئیں۔ باپ کی خون آلود تلوار قاسم کے ہاتھ میں تھی۔ ماں نے تلوار دیکھی تو اس کی چیخیں تھم گئیں۔ اُس نے حیرت سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا۔

"یہ شخص اس قابل نہیں تھا کہ آپ جیسی عورت اس کا ماتم کرے" — قاسم نے کہا — "اس نے اپنی تلوار سے اپنی جان لی ہے" — قاسم نے تلوار پھینک دی اور بولا — "ماں! مجھے بتا دو کیا میں اسی باپ کا بیٹا ہوں؟ [illegible] نے غدار [illegible]"

اس باپ کے اُغوا میں پرورش پائی ہے؟"

"تیم!" — اُس کی ماں نے بلبلا کر پوچھا "تم کیا کہہ رہے ہو؟ یہ سب کیا ہے؟ تم کیسے غدار کہہ رہے ہو؟ بلخ اور بخارا کی باغی فوجوں سے ہتھیار ڈلوانے والا اور بت پرستوں کو کر الکیسوں کے پہاڑوں سے ٹکرا جانے والا غدار نہیں ہو سکتا۔ یہ تو ملتان گئے تھے۔ وہاں سے کب آئے ہیں؟"

"آپ کو تمام سوالوں کے جواب ملتان کی ایک عورت دے گی" — قاسم بن عمر نے کہا "وہ آتی ہو گی پھر آپ کو ان سوالوں کے جواب اُن محافظوں میں سے ایک دے گا جو اس کے ساتھ ملتان گیا تھا۔ میں نے اُسے بلایا ہے۔ وہ آ رہا ہو گا۔"

محافظ سے پہلے ملتان سے آنے والی عورت آ گئی۔ اُسے سپہ سالار ابوعبداللہ نے بھیجا تھا۔ قاسم نے دیکھا کہ وہ عورت نہیں جوان لڑکی تھی اور وہ بہت خوبصورت لڑکی تھی۔ اس کے چہرے پر اب وہ معصومیت نہیں رہی تھی جو جوانی میں ہوا کرتی تھی۔ اب وہاں مظلومیت کے آثار تھے اور بڑے لمبے سفر کی تھکان کے اثرات، پھر بھی اس کے نقش و نگار میں کشش اور جاذبیت باقی تھی۔

"میرا نام رابعہ ہے" — اُس نے کہا "مجھے آپ کے پاس بھیجا گیا ہے۔"

"میرے خاوند نے ملتان میں کیا کیا تھا؟" — قاسم عمر کی بیوی نے پوچھا۔

"انہوں نے وہاں وہی کچھ کیا تھا جو ایسے ماحول میں جا کر ہر مرد کیا کرتا ہے" — رابعہ نے جواب دیا اور بتایا کہ قاسم عمر کو داؤد بن نصر نے کس طلسم میں گرفتار کر لیا تھا۔ اُس نے کہا — "وہاں تو حسن اور گناہ کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ آپ کے خاوند کے ساتھ مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن داؤد بن نصر نے ان کے ساتھ سلطان محمود کو شکست دلوانے اور ان کی فوج کو راستے میں تباہ کرانے کا سودا طے کر لیا۔ میں اُس وقت دونوں کو شراب پلا رہی تھی اور ان کی حاضری میں موجود رہنا میرے فرائض میں شامل تھا۔ میں اس طلسم کا ایک کل پرزہ بن چکی تھی۔ مجھے میرے باپ نے ایک آدمی کی بیوی بنایا اور اس آدمی نے مجھے داؤد بن نصر کے حرم میں تحفے کے طور پر دے دیا تھا۔ میرا من مر چکا تھا لیکن ایک درویش صفت انسان نے مجھے ایک راستہ دکھا کر میرے ضمیر کو زندہ کر دیا۔ وہ میرے بچپن کی ایک سہیلی کا باپ ہے۔ ان سے میری ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا میں داؤد کے دربار اور محل کے بعض راز ان تک پہنچا کر اپنے خدا اور اپنے ضمیر کو مطمئن کر سکتی ہوں۔"

اُس نے تفصیل سے بتایا کہ قرامطی فرقہ کیا ہے، اور اس فرقے کے اعمال کیا ہیں۔ یہ فرقہ اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے لیکن عیش و عشرت اور ہر گناہ کو جائز قرار دیتا ہے۔

"ملتان اس فرقے کا مرکز بن گیا ہے" — رابعہ نے کہا — "اور مسلمان تیزی سے اسے قبول کرتے جا رہے ہیں۔ وہیں ایسے مسلمان بھی ہیں جنہوں نے قرامطیوں کے خلاف محاذ بنا رکھا ہے۔ یہ درویش اسی محاذ کے قائد ہیں۔ وہ صحیح اسلام کی تبلیغ کرتے ہیں۔ وہ اکثر کہا کرتے ہیں کہ ان کے مالی وسائل محدود ہیں اس لیے غزنی تک کا سفر نہیں کر سکتے۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ سلطان محمود غزنوی کو اکسانا چاہتے ہیں کہ وہ ملتان پر چڑھائی کرے اور اس فرقے کو ختم کرے کیونکہ اسلام کے لیے ہندوؤں کا مذہب اتنا خطرناک نہیں جتنا یہ فرقہ ہے.....

میں ان کے ہاں جاتی رہتی تھی اور داؤد کے محل میں جو کچھ ہوتا تھا وہ انہیں بتاتی رہتی تھی۔ میں نے وہیں سلطان محمود کا نام سنا تھا۔ وہاں ہندو راجے انند پال اور بجی رائے آتے رہتے ہیں اور غزنی کی فوج کو شکست دینے اور سلطان محمود کو ختم کرنے کے منصوبے بناتے رہتے ہیں۔ آپ کے خاوند کے متعلق مجھے پتہ چلا تھا کہ سلطان کی فوج کے سالار ہیں، اس لیے میرے دل میں ان کی بہت عزت تھی مگر محل کی بڑی ہی حسین اور چالاک لڑکیوں کے جال میں آ کر ان کی حالت یہ ہو گئی کہ انہوں نے اپنی ہی فوج کی شکست کا سودا کر لیا۔ میں نے اپنی سہیلی کے باپ کو بتایا۔ انہوں نے آپ کے خاوند کے ایک محافظ کو بلا کر بتایا۔ اس محافظ نے مجھے وہاں سے نکالنے کا انتظام کر لیا۔ ہم دونوں آپ کے خاوند کو دھوکہ دے کر ان سے پہلے سلطان کے پاس پہنچ گئے۔ آپ کے خاوند بہت بعد میں آئے اور انہوں نے سلطان کو دھوکہ دینے کے لیے جھوٹی اطلاعیں دیں۔ سلطان نے مجھے اور محافظ کو ان کے سامنے کھڑا کر دیا۔ میں نے ان کے سامنے ان کی قلعی کھول دی۔ یہ سن کر انہوں نے اپنی تلوار نکالی اور اپنے پیٹ میں گھونپ لی۔"

تیم اور اُس کی ماں خاموشی سے سن رہے تھے۔ رابعہ سنا چکی تو ماں نے اپنے

خاوند کی تلوار اُٹھائی اور قاسم کی طرف بڑھا کر بولی۔ "میں تمہارے سینے میں دشمن کی تلوار اُتری ہوئی دیکھنا چاہتی ہوں لیکن اس سے پہلے تم اس تلوار سے اپنے جیسے ایک سو دشمنوں کو کاٹو گے۔"

"یہ تلوار مجھے نہ دو ماں!"۔۔۔ قاسم بن عمر نے کہا۔ "اس پر جو خون لگا ہوا ہے اس میں شراب کی ملاوٹ ہے۔ یہ تلوار ناپاک ہو چکی ہے۔"

قاسم عمر کو معمولی سے ایک آدمی کی طرح دفن کر دیا گیا۔ اس کی بیوی نے اس کا ماتم ویسے نہ کیا جیسا ایک سالار خاوند کا ہونا چاہئے تھا اور وہ اپنے سینے میں ہندوؤں کے خلاف نفرت کا طوفان روکے ہوئے تھی۔ اس نوجوانی میں ہندوؤں نے عزت اٹھایا اور اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ وہ تو کہ الرتی رہی تھی کہ دعاؤں کا اثر تھا کہ راجہ بال کو شکست ہوئی تھی اور خدا نے اسے ایک مسلمان خاوند دیا جو کچھ عرصہ بعد سالار بن گیا، مگر اسی خاوند کو ہندوؤں کے دوست نے ایسے جال میں پھانسا کہ اسے خودکشی کرنی پڑی۔ بیوہ رابعہ کو بہت خوشی ہوئی تھی کہ سلطان محمود نے ہندوستان پر حملے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

اسی لئے قاسم عمر کے ساتھ پشاور آ گئی تھی۔ وہ اس کے ساتھ ہندوستان جانے کے ارادے سے آئی تھی۔ اس کا دل انتقام کی آگ میں جل رہا تھا مگر صورت حال ایسی بنی کہ اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔

اس نے اپنی امیدیں اپنے بیٹے کے ساتھ وابستہ کر دیں اور اسے انتقام کے لئے تیار کرنے لگی۔ اس نے رابعہ کو ایک زہرہ۔۔۔ بیوہ عورت سمجھ کر اپنے پاس رکھ لیا۔ رابعہ کا یہ کارنامہ تو اسے بہت ہی پسند آیا کہ اس نے سلطان محمود کی فوج کو ایک بہت بڑے دھوکے سے بچا لیا تھا۔

جس روز قاسم عمر ملتان سے نقشہ لے کر چلا تھا جس میں وہ راستہ دکھایا گیا تھا جس سے سلطان محمود کی فوج کو ملتان جانا تھا، اس سے اگلے روز داؤد بن نصر بھیرہ کے راجہ بجی رائے سے ملنے بھیرہ چلا گیا اور اسے بتایا کہ اس نے غزنی کی فوج کو کیا دھوکہ دیا ہے، اور

اب یہ بجی رائے کا کام ہے کہ وہ اس فوج کو راستے میں تباہ کرے۔ بجی رائے اسی روز لاہور راجہ انند پال سے ملنے چلا گیا اور اسے بتایا کہ داؤد کے ہاتھوں اس نے کیا انتظام کرا دیا ہے۔

"کیا آپ نے یہ بھی سوچا ہے کہ داؤد مسلمان ہے اور وہ ہمیں بھی دھوکہ دے سکتا ہے؟"۔۔۔ راجہ انند پال نے کہا۔ "مسلمان پر اتنی جلدی بھروسہ نہیں کرنا چاہئے۔"

"کیا آپ ابھی تک داؤد کو مسلمان سمجھتے ہیں؟"۔۔۔ بجی رائے کہا۔ "آپ اس کی تاریخ سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اگر اس نے ہمیں دھوکہ دینے کی کوشش کی تو یہ اس کی آخری غلطی ہو گی۔ وہ ہم میں گھرا ہوا ہے۔ ہم اس کی ریاست پر قبضہ کر کے اسے قتل کر دیں گے یا قید میں ڈال دیں گے۔ یہ پیش نظر رکھیں کہ محمود کی فوج ابھی حملہ کرنے نہیں آ رہی، ملتان میں رہنے اور یہاں اڈہ بنانے آ رہی ہے۔ یہاں سے محمود میرے اور آپ کے علاقوں پر حملے کرے گا۔ میں نے اپنے دو آدمی پشاور بھیج دیئے ہیں۔ جونہی وہاں سے محمود کی فوج ملتان کے لئے کوچ کرے گی، یہ آدمی تیز رفتار گھوڑوں پر آ کر مجھے اطلاع دیں گے۔ میں اپنے چھاپہ مار ان پہاڑی علاقوں میں بھیج رہا ہوں جو راستے میں آتے ہیں۔ وہ راتوں کو محمود کے ہر پڑاؤ پر حملے کرتے رہیں گے۔ وہ ہماری فوجوں کو ڈھونڈتا رہے گا لیکن اسے ہمارا ایک بھی سپاہی نظر نہیں آئے گا۔ اگر وہ ملتان پہنچ گیا تو اس کے ساتھ آدھی فوج ہو گی اور وہ بھی بغیر سازوسامان کے ہو گی۔ میں نے ملتان میں محمود کے قتل کا انتظام بھی کر دیا ہے۔"

وہ تو بہت دیر تک تبادلۂ خیالات کرتے رہے۔ انند پال اپنے باپ راجہ جے پال کی تین شکستوں کی وجہ سے محمود غزنوی کا باجگزار تھا اور اس نے اسی معاہدے کے مطابق جو اس کے باپ نے آخری شکست کے بعد سلطان محمود سے کیا تھا، تاوان بھی ادا نہیں کیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ سلطان محمود کی فوج اس کے علاقے میں داخل ہو۔ اسے یہ خطرہ نظر آ رہا تھا کہ بجی رائے کی فوج کے چھاپہ مار سلطان محمود غزنوی کی فوج کو نقصان پہنچاتے پہنچاتے اپنا نقصان کرا بیٹھیں گے۔

"چھاپہ مارنے کا جو کمال مسلمانوں کو حاصل ہے وہ ہمارے سپاہیوں میں نہیں ہے"

— انند پال نے کہا۔ "اس کے لیے عقل، دلیری اور پھرتی کی ضرورت ہے۔ آپ اپنے چھاپہ مار بھیج دیں لیکن میں کوئی خطرہ مول نہیں لوں گا۔ محمود کو پشاور سے ادھر آنے کے لیے دریائے سندھ پار کرنا ہے۔ وہاں کشتیوں کا پل ہے جو ہم نے بنایا تھا۔ میں محمود کو یہ پل پار نہیں کرنے دوں گا۔ اپنی فوج کو اِدھر اُدھر چھپا کر رکھوں گا اور وہیں اُس سے ٹکر لوں گا۔ اگر وہ آگے آ گیا تو راستے میں اُسے آپ سنبھال لیں۔ ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ وہ آ جائے تو زندہ واپس نہ جائے۔"

اور وہ آ رہا تھا۔ سلطان محمود نے فوری کوچ کا حکم دے دیا۔ اُس کے پاس رسد اور دیگر سامان کی کمی نہیں تھی۔ اُس نے کوچ سے ایک روز پہلے اپنے سالاروں، نائب سالاروں اور کمانداروں وغیرہ کو بلا کر انہیں کوچ کی ترتیب اور انداز بتایا۔ انہیں جنگی ہدایات اور احکام دیئے اور انہیں بتایا کہ راستے میں کم سے کم پڑاؤ ہوں گے، اور جہاں بھی پڑاؤ ہوگا وہاں شبخون مارنے والے جیش باری باری اردگرد کے علاقے میں گھومتے پھرتے رہیں گے کیونکہ ملتان تک تمام راستے میں ہندوستان کے چھاپہ ماروں کا خطرہ ہے۔

اُس نے ہراول کا دستہ منتخب کرنے کے لیے سپہ سالار ابوعبداللہ محمد الطائی سے کہا اور ساتھ یہ بھی کہا۔ "خیال رکھو ابوعبداللہ! یہ ہراول ویسا نہیں ہوگا کہ آپ کسی ایک دستے کو فوج کے آگے آگے روانہ کر دیں اور اس کے سپاہی آزادی سے لوگوں کے کھیتوں سے بھٹے اور درختوں سے پھل توڑتے اور کھاتے چلے جائیں گے۔ اِس کوچ میں یہ خطرہ ہے کہ جس راستے سے ہم جا رہے ہیں، اس کے درخت، جھاڑیاں، پتھر اور چٹانیں بھی آپ کی دشمن ہیں۔ ہراول دستے کو تیز بھی چلنا ہوگا، اور قدم پھونک پھونک کر بھی رکھنا ہوگا۔ نظر یہی آ رہا ہے کہ ہراول دستے کو معرکے لڑنے پڑیں گے۔"

کمانداروں کو معلوم نہیں تھا کہ سلطان محمود ہراول کے لیے ایسے سخت احکام کیوں دے رہا ہے۔ عاصم عمر کے بیٹے قاسم بن عمر کو ان احکام کے پس منظر کا علم تھا۔ وہ

ابن خلدون سے آگاہ تھا جن کی طرف سلطان محمود اشارہ کر رہا تھا۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

"سلطانِ عالی مقام!" — قاسم بن عمر نے کہا۔ "اگر میری تجویز آپ کے منصوبے میں مداخلت بے جا نہ ہو تو میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہراول میں میرے جیش کو بھیجا جائے۔"

"تمہارا نام؟" — سلطان نے پوچھا۔

قاسم کی بجائے سپہ سالار ابوعبداللہ نے اُٹھ کر جواب دیا۔ "اس کا نام قاسم بن عمر ہے۔ عاصم عمر کا بیٹا۔"

سلطان محمود کے چہرے کے تاثرات میں تبدیلی سی آئی۔ اُس نے ذرا سوچ کر کہا — "ہراول دستے کا انتخاب ہم بعد میں کریں گے۔ اس کماندار کو یہیں رہنے دینا۔ میں اسے الگ کچھ سمجھاؤں گا۔"

کوچ کا دن اور وقت بتا کر اور ہدایات دے کر سلطان محمود نے سب کو رخصت کر دیا۔ سپہ سالار اور قاسم وہیں رہے۔ سلطان نے دونوں کو اپنے قریب بلایا۔

"تم نے اپنے آپ کو ہراول کے لیے کیوں پیش کیا ہے؟" سلطان محمود نے قاسم سے پوچھا۔

"کیونکہ راستے میں وہ خطرے ہیں جو ہماری فوج کے لیے میرے باپ نے پیدا کیے ہیں۔" — قاسم نے جواب دیا۔ "میں چاہتا ہوں کہ جو خطرے باپ نے پیدا کیے ہیں، اُن کا پہلا شکار اُس کا بیٹا ہونا چاہیے۔"

"محترم سلطان!" سپہ سالار ابوعبداللہ نے کہا۔ "اس کی ماں میرے پاس آئی تھی۔ اُسے اپنے خاوند کی خودکشی کا کوئی غم نہیں۔ وہ شرمسار ہے کہ اُس کے خاوند نے آپ کو دھوکہ دینے کی کوشش کی۔ میں اس عورت کی قدر کرتا ہوں۔ اُس نے کہا ہے کہ اس کے بیٹے کو پیش قدمی اور میدانِ جنگ میں اُس جگہ رکھا جائے جہاں موت یقینی ہو اور اسے اپنے جوہر دکھانے کا ایسا موقع ملے کہ یہ بھاگ نہ سکے۔ اُس نے یہ بھی کہا ہے کہ میں اپنے بیٹے کو خدا کی راہ میں قربان کر کے اس کے باپ کے گناہ کا کفارہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔"

"کیا تم میں بھی اپنی ماں کا جذبہ ہے؟" — سلطان نے قاسم سے پوچھا۔ "کیا تم میں

بھی اپنے باپ کی کمزوریاں ہیں۔

"میں آپ کو حلف اور قسم کے سوا کسی اور طریقے سے یقین نہیں دلا سکتا کہ مجھ میں ماں کا جذبہ زیادہ اور باپ کی کمزوریاں کم ہیں"— قاسم نے کہا۔ "سپاہ گری میں میرا استاد میرا باپ تھا۔ میں اس کے متعلق یہی جانتا تھا کہ وہ خوش طبع اور زندہ دل انسان تھا۔ میں صرف سپاہ گری پر نظر رکھتا ہوں۔ میں نے باپ کی لاش دیکھتے ہی کہہ دیا تھا کہ میں اس کی غداری کا ازالہ کروں گا"

"تم شاید نہ جانتے ہو کہ تمہاری ماں کے سینے میں کیسی آگ لگی ہوئی ہے"— سلطان محمود نے کہا— "اسے نوجوانی میں ہند کے فوجی اغوا کر لائے تھے۔ وہ ان کفار کی ہوس کا نشانہ بنی رہی۔ وہ خوش قسمت تھی کہ ہند کی فوج کو شکست ہوئی۔ تمہاری ماں جیسی بہت سی مسلمان لڑکیاں پیچھے رہ گئیں۔ ہم نے سب کی شادیاں اپنی فوج کے آدمیوں سے کر دیں..... تم نوجوان ہو قاسم! شاید تمہارے دل میں ابھی یہ احساس بیدار نہ ہوا ہو کہ مسلمان کو دو چیزوں پر مر مٹنا چاہیے۔ ایک ہے مذہب اور دوسری چیز جسے میں مذہب جتنا مقدس سمجھتا ہوں، قوم کی بیٹیوں کی عصمت ہے۔ ہند میں جو مسلمان رہتے ہیں، وہ بھی ہماری قوم کے افراد ہیں۔ مسلمان لڑکی کی عزت لوٹنا ہندوؤں نے اپنے مذہب کا فریضہ بنا رکھا ہے۔ ہمارے مذہب کا حکم یہ ہے کہ لڑکی کسی بھی مذہب کی ہو، اس کی عزت پر ہاتھ ڈالنا گناہِ کبیرہ ہے اور جب مسلمان کی ایک بیٹی کی عصمت پر کوئی کافر حملہ کرے تو عالمِ اسلام کی نیندیں حرام ہو جانی چاہئیں۔ مسلمان کا ایمان ہونا چاہیے۔ انتقام — اپنی بیٹی کی عصمت کا انتقام؟"

"میں انتقام لوں گا سلطانِ عالی مقام"— قاسم نے کہا۔

"جوانی اندھی ہوتی ہے قاسم"— سلطان نے کہا— "لیکن میرے پیر و مرشد نے مجھے لڑکپن میں بتایا تھا کہ انسان میں گناہوں کو قبول کرنے کی جتنی کمزوری ہوتی ہے اس سے زیادہ اس میں گناہ سے بچنے کی قوت بھی ہوتی ہے مگر قوت کردار میں ہے۔ کردار کی تلوار کو مضبوطی سے پکڑے رکھو تو گناہوں کو شکست دے سکتے ہو۔ مجھے تمہارے باپ کی جسمانی موت کا کوئی غم نہیں، غم اس کی روحانی موت کا ہے۔ وہ اپنی روح کو ملتان میں مار آیا تھا۔ یہاں آ کر اس نے اپنے

جسم کو مارا ہے۔ تم اپنے جسم کو بھول جاؤ۔ روح کو سامنے رکھو۔ میرے پیر و مرشد ابوالحسن خرقانی نے مجھے بتایا تھا کہ انسان کے پاس روح خدا کی امانت ہے۔ اگر اسے ناپاک کر دو گے تو خدا کی امانت میں خیانت کرو گے۔ تمہارے باپ نے روح کو پراگندہ کیا اور تم نے دیکھ لیا ہے کہ وہ کیسی موت مرا ہے.....

"اس سے تو یہ لڑکی خدا کے زیادہ قریب ہے جو عیش و عشرت اور گناہوں کی دنیا میں رہی مگر اس نے ایمان اور روح کو بچائے رکھا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ کفار کے چنگل سے آزاد ہو آئی ہے۔ اسی نے مجھے تمہارے باپ کا دھوکہ بتایا تھا۔ یہ اسلام کی بیٹی کا کردار ہے..... تمہیں معلوم ہے کہ ہمارے کوچ کے راستے میں کیا خطرہ ہے؟"

"معلوم ہے سلطانِ عالی مقام!"— قاسم نے کہا— "مجھے اجازت دی جائے کہ میں اپنی پسند کے سپاہی منتخب کر سکوں۔ کفار کا کوئی چھاپہ مار فوج کے قریب نہیں آ سکے گا"

سلطان محمود غزنوی نے سپہ سالار ابوعبداللہ سے کہا کہ قاسم کو اس کی پسند کے آدمی دیے دیں۔

ہراول کا دستہ جس میں پانچ سو سوار تھے، سب سے پہلے پشاور سے نکلا۔ قاسم بن عمر کا گھوڑا سب سے آگے آگے جا رہا تھا اور راستے کے ساتھ ساتھ، قاسم سے چند قدم دور ایک اور گھوڑا چلا جا رہا تھا جس پر ایک عورت سوار تھی۔ سیاہ نقاب سے اس کی صرف آنکھیں نظر آتی تھیں۔ قاسم کو اس سوار کی موجودگی کا پورا پورا احساس تھا۔ پشاور سے کچھ دور جا کر قاسم نے بازو بلند کیا اور گھوڑا روک لیا۔ ہراول کا دستہ رک گیا۔ قاسم گھوڑے سے اترا۔ ادھر وہ عورت گھوڑے سے اتری۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف بڑھے۔

"اب مجھے خدا کے حوالے کر دو ماں!"— قاسم نے عورت کے پاؤں چھو کر کہا۔

ماں نے قاسم کے دائیں بازو کے ساتھ ایک تعویذ سا باندھ دیا اور بولی— "یہ قرآن کی وہ آیت ہے جو پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر دیتی ہے۔ شرط یہ ہے کہ اپنے دین و ایمان کو مضبوط رکھا جائے۔ انسان کے جسم کی مضبوطی ایمان کی مضبوطی سے قائم رہتی ہے۔ الوداع میرے بیٹے! زندہ آؤ گے تو ماں کو خوشی ہوگی۔ تمہاری لاش آئے گی تو ماں بہت زیادہ خوش ہوگی لیکن میں فتح کی خبر سنوں"— ماں کی آواز حلق میں دب کے رہ گئی۔ اس پر رقت

طاری ہو گئی تھی۔

قاسم کود کر گھوڑے پر سوار ہوا اور ہراول دستہ چل پڑا۔ بہت دور جا کر قاسم نے پیچھے دیکھا۔ اُسے صبح کے دھندلکے میں ایک چٹان پر ایک گھوڑا کھڑا نظر آ رہا تھا۔ اُس کی ماں کا بازو ہوا میں ہل رہا تھا۔ پھر ایک بلند چٹان نے درمیان میں آکر انہیں ایک دوسرے کی نظروں سے اوجھل کر دیا۔

سورج طلوع ہو رہا تھا جب سلطان محمود غزنوی پشاور کے ایک وسیع میدان میں اپنی فوج کے سامنے کھڑا تھا۔ رسد کا بڑا ہی لمبا قافلہ چل پڑا تھا۔ فوج کوچ کے حکم کا انتظار کر رہی تھی۔

"اسلام کے سپاہیو!" سلطان محمود اپنی فوج سے مخاطب ہوا۔ "آج تم میرے حکم سے نہیں، اپنے خدا کے حکم سے کوچ کر رہے ہو۔ تم اُس ملک میں جا رہے ہو جہاں محمد بن قاسم کے مجاہدوں کی اذانیں گونجی تھیں۔ کفار نے وہ اذانیں خاموش کر دی ہیں۔ وہاں اسلام کی شمع بجھ رہی ہے۔ مسجدیں ویران ہو گئی ہیں۔ اُن پر بت پرستوں کی حکمرانی ہے۔ تمہاری بہنوں اور بیٹیوں کی عصمتیں لٹ رہی ہیں۔ وہ مظلوم تمہیں پکار رہی ہیں۔ یہ اللہ اور اُس کے رسولؐ کا حکم ہے کہ دنیا میں کہیں مسلمانوں پر ظلم ہو رہا ہو تو ساری دنیا کے مسلمانوں پر جہاد فرض ہو جاتا ہے۔ یہ قرآن کا حکم ہے کہ کفار کے خلاف اُس وقت تک لڑو جب تک کہ یہ فتنہ ختم نہ ہو جائے۔ ہندوؤں کی فوج تم پر تین حملے کر چکی ہے اور تم تینوں بار اُسے شکست دے چکے ہو۔ ہندو راجے تمہارے ملک کو صرف اس لیے فتح کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام کے سرچشموں کو بند کر دیں۔ یہ جنگ دو فوجوں کی نہیں، دو مذہبوں کی ہے۔ آج ہم یہ ثابت کرنے کے لیے کہ اسلام سچا مذہب ہے، ایک اجنبی ملک میں جا رہے ہیں مگر اس ملک میں اپنے آپ کو اجنبی نہ سمجھنا۔ وہ زمین مسلمانوں کے گھوڑوں کے سموں سے آشنا ہے اور انہی سموں کی دھمک اور نعروں کی گرج کا انتظار کر رہی ہے۔"

سلطان محمود غزنوی کا خطاب جذباتی ہوتا چلا گیا۔ وہ ضروری ہدایات سالاروں اور کمانداروں کو دے چکا تھا۔ اُس نے سپاہیوں کو یہ ذہن نشین کرانا ضروری سمجھا تھا کہ یہ جنگ ملک گیری اور سلطنت کی توسیع کے لیے نہیں بلکہ یہ جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ اس کے جذباتی الفاظ

نے فوج میں ولولہ اور جوش پیدا کر دیا اور سپاہی کوچ کے لیے بے تاب ہونے لگے۔

قاسم بن عمر کا ہراول دستہ دوپہر سے ذرا بعد دریا کے اُس مقام پر پہنچ گیا جہاں کشتیوں کا پل تھا۔ دستہ پل کے وسط میں پہنچا تو تیروں کی بوچھاڑ آئی جو قاسم کے گھوڑے سے چند قدم آگے کشتیوں کے اوپر رکھے ہوئے تختوں میں پیوست ہو گئی۔ قاسم نے گھوڑا روک لیا۔ دوسرے کنارے سے آواز آئی ——— "آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ سب کے سب تیروں سے چھلنی ہو جاؤ گے۔"

"تم کون لوگ ہو؟" ——— قاسم نے بلند آواز سے پوچھا ——— "ہم سلطان محمود غزنوی کے سپاہی ہیں۔ راجہ انندپال ہمارا باجگزار ہے۔ ہمیں اس پل سے گزرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔"

"یہ مہاراج انندپال کا حکم ہے کہ کوئی مسلمان سپاہی اس پل سے آگے نہ آئے" ——— قاسم کو جواب ملا ——— "واپس چلے جاؤ۔"

سامنے والے کنارے پر جھاڑیاں اور چٹانیں تھیں۔ قاسم سمجھ گیا کہ وہاں پل کا محافظ دستہ چھپا ہوا ہوگا۔ اُسے صرف ایک آدمی نظر آ رہا تھا۔ اُس نے اپنے دستے کو پل سے پیچھے چلے جانے کو کہا اور دو سپاہیوں کو ساتھ لے کر دوسرے کنارے پر چلا گیا۔ وہاں صرف ایک ہندو فوجی کھڑا تھا۔ اُس نے قاسم کو بڑے رعب سے پوچھا کہ وہ ان سواروں کو کیوں پل سے گزار رہا ہے؟

"ہم کسی پر حملہ کرنے نہیں آ رہے" ——— قاسم بن عمر نے جواب دیا ——— "حملہ کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔ اس جگہ کا راجہ ہمارا باجگزار ہے۔ ہم خیرسگالی کے لیے آئے ہیں۔"

"جو راجہ تمہارا باجگزار ہے، اُسی نے حکم دیا ہے کہ مسلمان فوج آ رہی ہے۔ اِسے پل سے نہ گزرنے دیا جائے۔" ہندو فوجی نے جواب دیا۔

"تمہارا راجہ تو یہاں ہو نہیں سکتا" ——— قاسم نے کہا ——— "وہ لاہور میں ہوگا یا بھٹنڈہ میں۔"

"مہاراج یہاں سے دو فرسنگ (تقریباً سات میل) دور پڑاؤ کیے ہوئے ہیں" ——— ہندو فوجی نے اُسے بتایا ——— "اگر اُن سے اجازت لینی ہے تو اپنے سلطان کو یا

اپنے وزیر کو اُن کے پاس بھیجو۔"

"میں ہی سلطان ہوں اور میں ہی وزیر ہوں"۔ قاسم نے کہا۔ "مجھے اپنے راجہ کے پاس لے چلو۔ میں واپس نہیں جاؤں گا۔ اگر تم نے مجھے روکنے کی کوشش کی تو میں تمہارے اِن تیراندازوں سے نہیں ڈروں گا جو یہاں پہاڑیوں کے پیچھے چھپے ہوئے ہیں۔ ہم کشتیوں کے بغیر دریا پار کرنا جانتے ہیں۔ ایک غلط حکم پر اپنی جانیں ضائع نہ کرو۔"

ہندو اُسے اپنے ساتھ لے گیا۔ قاسم اِدھر اُدھر دیکھتا گیا۔ اُسے چٹانوں پر تیرانداز بیٹھے ہوئے نظر آئے۔ ان چٹانوں سے نکل کر آگے گئے تو اُسے راجہ انند پال کی فوج کے خیمے نظر آنے لگے۔ قاسم اِس زمین کے خدوخال کو دیکھتا گیا۔ اُس نے محسوس کر لیا تھا کہ یہاں انہیں لڑنا پڑے گا اس لیے زمین سے واقفیت ضروری تھی۔ اُس ویرانے میں راجہ کی موجودگی بتا رہی تھی کہ اُس کی نیت ٹھیک نہیں۔

ہرے بھرے درختوں نے اُس جگہ کو بہت خوبصورت بنا رکھا تھا جہاں راجہ انند پال کی شاہی خیمہ گاہ تھی۔ ہر طرف گھنا سبزہ تھا۔ قاسم کو جب ایک چوکور اور وسیع خیمے میں داخل کیا گیا تو اُسے محل کا گمان ہوا۔ راجہ جے پال اونچی اور سجی ہوئی مسند پر بیٹھا تھا۔ اُس کے پیچھے دو نہایت خوبصورت لڑکیاں کھڑی مورچھل ہلا رہی تھیں۔ راجہ کو پہلے بتا دیا گیا تھا کہ اُسے ملنے کون آ رہا ہے اور وہ کیوں آیا ہے اس لیے وہ چہرے پر رعونت کے آثار لیے ہوئے تھا۔ اُس کے دائیں بائیں فوج کے بڑے افسر اور درباری بیٹھے تھے۔

"کیا تمہارا سلطان دریا پار کرنے کی اجازت چاہتا ہے؟"۔ راجہ انند پال نے پوچھا ۔۔۔ اُس کا ارادہ کیا ہے، وہ کہاں جا رہا ہے؟

"آپ ہمارے باجگزار ہیں"۔ قاسم نے کہا۔ "آپ نے ابھی تک تاوان بھی نہیں دیا۔ معاہدے کے مطابق آپ ہمارے مطیع ہیں۔ آپ یہ پوچھنے کے حق سے محروم ہیں کہ سلطان کیوں دریا پار کرنا چاہتا ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہماری فوج آپ پر حملہ کرنے نہیں آ رہی۔ ہم امن اور اطمینان سے گزر جائیں گے۔"

"ہم تمہاری گستاخی معاف کرتے ہیں"۔ راجہ انند پال نے کہا۔ "ہم کسی کے باجگزار

نہیں ہیں۔ معاہدے کرنے والا میرا باپ تھا۔ وہ مر گیا ہے۔ تمہارے سلطان نے مجھے شکست نہیں دی تھی۔ میں کوئی تاوان ادا نہیں کروں گا۔ اپنے سلطان سے کہنا کہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم اپنی فوج کہاں لے جا رہے ہو۔ ہم تمہیں ملتان جا کر انہیں بنانے دیں گے۔ ہماری نظریں ان پہاڑوں کو چیر کر دیکھ لیا کرتی ہیں کہ ان کے پیچھے کیا ہو رہا ہے۔ ہم تمہیں بتا سکتے ہیں کہ تمہارا سلطان اس وقت کہاں ہے اور اُس کے ساتھ کتنی فوج ہے۔ اُسے کہو واپس چلا جائے۔ ہم اُس کے مطیع نہیں۔ اُسے اگر دریا پار کرنے کی اجازت چاہیے تو خود ہمارے دربار میں آئے۔"

"ہم اپنے سلطان کو کسی ایسے اوچھے مہاراجہ کے دربار میں نہیں جانے دیا کرتے جو غرور سے گردن اکڑا کر بات کرنے کا عادی ہو"۔ قاسم نے کہا۔ "وہ اگر یہاں آنا چاہے گا تو بھی میں اُسے یہاں نہیں آنے دوں گا۔"

"تمیز سے بات کرو"۔ ایک درباری نے گرج کر کہا۔ "تم ہمارے مہاراج اور راج دربار کی توہین کر رہے ہو۔" اُس نے راجہ انند پال کی طرف داد طلب نگاہوں سے دیکھا۔ راجہ مسکرا رہا تھا۔

"تم جا سکتے ہو"۔ راجہ نے کہا۔ "ہم تمہاری جوانی پر رحم کرتے ہیں۔ اس پل پر پھر کبھی قدم رکھنے کی جرأت نہ کرنا۔ اگر تمہارا سلطان لڑنے کے ارادے سے آیا ہے تو ہم تیار ہیں۔ اُسے کہو کہ دریا پار کرنے کی جرأت کرے۔"

"ہم لڑنے نہیں آئے"۔ قاسم نے غصہ پی لیا اور اُسے دھوکہ دینے کے لیے کہا ۔۔۔ "سلطان کا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ ہم جب لڑنے آئیں گے تو آپ سے دریا پار کرنے کی اجازت نہیں لینے آئیں گے۔ ہم آ جائیں گے۔ اب ہم واپس جا رہے ہیں۔"

"کیا یہ سچ ہے کہ تم نے اُسے کہا تھا کہ ہم لڑنے نہیں آئے، واپس جا رہے ہیں؟" ۔۔۔ سلطان محمود نے قاسم سے پوچھا۔ قاسم سلطان کو اطلاع دینے کے لیے کہ انند پال نے دریا پار کرنے سے روک دیا ہے، پیچھے چلا گیا تھا اور اُس نے انند پال کے ساتھ جو باتیں

کی تھیں وہ کمن دھن سُنا رہی تھیں۔

"میں تمہاری دانشمندی کی تعریف کرتا ہوں" ــــ سلطان محمودؒ نے کہا ــــ "اُسے ایسا دھوکہ ملنا چاہیئے تھا۔ میں آج ہی رات دریا پار کروں گا۔ تمہارا سوار دستہ کشتیوں کے پُل کے قریب پہاڑیوں میں چھپا رہے گا۔ تمہاری مدد کے لیے ایک اور دستہ آجائے گا۔ باقی فوج کسی اور جگہ سے دریا پار کرے گی اور انندپال پر حملہ کرے گی۔ تم میرے پیغام کا انتظار کرنا۔ اشارہ ملتے ہی تمہارا دستہ اور حفاظتی دستہ کشتیوں کے پُل سے دریا پار کرے گا۔ میں بتا نہیں سکتا کہ تمہارے سامنے دشمن کا پہلو ہوگا یا عقب۔ تم اپنی عقل استعمال کر کے کارروائی کرنا۔ تم واپس پُل کے قریب چلے جاؤ۔ احتیاط کرو کہ تمہیں یا تمہارے کسی سوار کو دشمن دیکھ نہ سکے۔ پُل پر نظر رکھو۔ کوئی بھی آدمی خواہ وہ کوئی درویش اور فقیر ہی ہو، پُل سے گزر کر ادھر آئے تو اُسے پکڑ لو۔ وہ دشمن کا جاسوس ہو سکتا ہے۔"

سلطان محمودؒ غزنوی نے سپہ سالار ابوعبداللہ کو بلا کر اُسے بتایا کہ راجہ انندپال دریا کے پار فوج لے کر بیٹھا ہے اور اُس نے ہمیں دریا پار کرنے سے روک دیا ہے۔ فوراً ماہی گیروں کے بھیس میں خود جائیں یا کسی اور سالار کو بھیجیں اور دیکھیں کہ دریا کہاں سے پار کیا جا سکتا ہے۔ آج ہی رات دریا پار کر کے انندپال پر حملہ کیا جائے گا۔

سلطان محمودؒ نے قاسم بن عمر سے دریا کے پار کی زمین کے خدوخال کی تفصیل معلوم کر لی تھی۔ اُدھر راجہ انندپال نے اپنی فوج کا کچھ حصّہ دریا کے اُس حصے کے سامنے تیار کھڑا کر دیا جہاں کشتیوں کا پُل تھا۔ یہ جگہ اُس مقام سے ذرا ہی اوپر کی طرف تھی جہاں دریائے کابل دریائے سندھ سے ملتا ہے۔ یہ اٹک کا مقام ہے۔ مشہور تاریخ دانوں نے جن میں فرشتہ، عتبی اور گردیزی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، لکھا ہے کہ سلطان محمودؒ کی فوج نے اوپر جا کر اُس جگہ سے دریا پار کیا جہاں پاٹ چوڑا اور پانی کی گہرائی کم تھی۔ صبح کا اجالا نکھرنے سے پہلے فوج دریا پار کر گئی تھی۔ ان تاریخ دانوں نے لکھا ہے کہ یہ بہار کا موسم تھا۔

راجہ انندپال کو توقع نہیں تھی کہ مسلمانوں کی فوج اتنی جلدی دریا پار کر آئے گی۔ وہ بے خبری کی نیند سویا ہوا تھا جب سلطان محمودؒ کی ذاتی قیادت میں اُس پر حملہ ہو گیا۔ اُس کی فوج پوری طرح تیار نہیں تھی۔ ہندوؤں نے مقابلہ کیا۔ انندپال کی وہی فوج تیاری

کی حالت میں تھی جسے پُل کی حفاظت پر مامور کیا گیا تھا۔ اسے جوابی حملے کے لیے بلایا گیا۔

سورج نکل آیا تھا۔ قاسم کا سوار دستہ بے تابی سے اشارے کا منتظر تھا۔ اُس نے ایک اونچی پہاڑی پر دو آدمی بٹھا رکھے تھے جو دریا پار کے میدانِ جنگ کو دیکھ رہے تھے۔

انھوں نے جب دیکھا کہ دریا کے قریب ہندوؤں کا جو دستہ تھا، وہ میدانِ جنگ کو دوڑ پڑا ہے تو انھوں نے اُوپر سے قاسم کو اشارہ دے دیا۔ قاسم نے اپنے دستے کو برق رفتار یلغار کا حکم دے دیا۔ اُس کے پیچھے ایک اور سوار دستہ تھا۔ دونوں دستے کشتیوں کے پُل سے بہت تیزی سے گزر گئے، اور پھیل کر ہندوؤں کے اُس دستے پر عقب سے ٹوٹ پڑے جو جوابی حملے کے لیے جا رہا تھا۔ راجہ انندپال کو سنبھلنے اور میدانِ جنگ کو سنبھالنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ اُس کے لیے اب یہی چال رہ گئی تھی کہ اپنی جان بچا لے۔ وہ بھاگ نکلا۔ اُس کی فوج بکھر گئی۔ سلطان محمودؒ نے تعاقب کا حکم دے دیا لیکن انندپال بہت پہلے نکل گیا تھا، پھر بھی تعاقب جاری رکھا گیا۔ اُس کی فوج دُور دُور تک بکھر گئی تھی۔ اِن میں سے بہت سے سپاہیوں کو پکڑ لیا گیا، باقی بھاگ نکلے۔

مورخ محمد قاسم فرشتہ کی تحریر کے مطابق جب سلطان محمودؒ کا دستہ جو تعاقب کے لیے گیا تھا دریائے چناب کے کنارے پہنچا، اُس وقت راجہ انندپال دریا پار کر گیا تھا۔ یہ مقام اُس دَور میں سوہدرا کہلاتا تھا اور اب اسے وزیر آباد کہتے ہیں۔ راجہ انندپال کو غریب سے ملاحوں نے اپنی کشتی میں دریا پار کرایا تھا۔ تاریخ دانوں نے اس لڑائی کو معرکۂ دریائے سندھ کہا ہے۔

تعاقب میں سلطان محمودؒ کی فوج بھی بکھر گئی تھی لیکن اُس نے قاصدوں کے ذریعے فوج کو دریائے جہلم کے مشرقی کنارے پر جمع کر لیا۔ اس اجتماع کی تکمیل میں ایک ماہ

بکی رائے کی فوج کے ساتھ ٹکر نہ ہو کیونکہ فوج تھک چکی ہے اور ہمارے ساتھ رسد اتنی زیادہ ہے کہ لڑائی کی صورت میں ہم اسے سنبھال نہیں سکیں گے۔ اس کی حفاظت میں دشواری پیش آئے گی ہمیں اب ملتان پہنچنا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ داؤد بن نصر کو پہلے ٹھکانے لگایا جائے۔ آستین کے سانپ کو مارنا ضروری ہے۔

وہاں سے فوج نے کوچ کیا تو بھی قاسم بن عمر کا دستہ ہراول میں تھا۔ اس کے دستے کے کچھ ساتھی مارے گئے تھے۔

تیسرے روز قاسم اپنے دستے کے آگے آگے جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ اس علاقے کے دو گائیڈ تھے جو گھوڑوں پر سوار تھے۔ قاسم کو چار پانچ سو گز دور ایک آدمی نظر آیا جو گھوڑے پر سوار تھا۔ اس نے گھوڑا روک لیا تھا اور وہ قاسم کے دستے کو دیکھ رہا تھا۔ اس آدمی نے گھوڑا موڑا اور ایڑ لگا دی یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ فوج سے ڈر کر بھاگ اٹھا ہو لیکن قاسم کو یہ خطرہ محسوس ہوا کہ یہ آدمی بکی رائے کی فوج کا آدمی ہو سکتا ہے اور وہ بھیرہ میں اطلاع دے گا کہ فوج آ رہی ہے۔ قاسم نے اپنے گائیڈوں سے پوچھا کہ بھیرہ کتنی دور ہے اور کس سمت کو ہے۔ اسے سلطان محمود کی یہ ہدایت یاد تھی کہ بھیرہ کے دور سے گزرنا ہے۔ اپنے گائیڈوں کو اس نے یہی بتلایا تھا۔ گائیڈوں نے اسے بتایا کہ بھیرہ قریب ہی ہے اور یہ سوار بھیرہ کی سمت گیا ہے۔

قاسم بن عمر نے دو سوار اپنے ساتھ لیے اور اس آدمی کے تعاقب میں گھوڑا دوڑا دیا۔ وہ خاصا آگے نکل گیا تھا لیکن قاسم اور اس کے دو سواروں کے گھوڑے بہت تیز تھے۔ فاصلہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ پھر انہیں بھیرہ کے قلعے کے برج نظر آنے لگے۔ بھاگنے والے اور تعاقب کرنے والوں کے درمیان فاصلہ اور تھوڑا ہو گیا۔

"کمانیں نکالو۔" قاسم نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "یہ شہر تک زندہ نہ پہنچے۔"

دونوں سواروں نے دوڑتے گھوڑوں سے تیر چلائے ایک تیر سوار کی پیٹھ میں اور دوسرا گھوڑے کی پیٹھ میں لگا۔ گھوڑا اور تیز ہو گیا۔ قاسم کے سواروں نے دو اور تیر چلائے لیکن بھاگنے والا سوار پیٹھ میں ایک تیر لیے ہوئے دور نکل گیا تھا۔ دونوں تیر ضائع گئے۔ اب شہر کی دیوار نظر آنے لگی تھی جو عام قلعوں کی نسبت زیادہ اونچی تھی۔ گھوڑا اور سوار شہر کے دروازے

میں داخل ہو گیا۔ قاسم اور اس کے ساتھیوں نے گھوڑے موڑے اور اپنے دستے کی طرف چل پڑے۔

راجہ بکی رائے اپنے دربار میں بیٹھا تھا۔ اسے اس کی فوج کا سپہ سالار جسے وہ سینا پتی کہا کرتے تھے، رپورٹ دے رہا تھا کہ چھاپہ ماروں کو گئے ڈیڑھ مہینے سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے، ابھی تک سلطان محمود غزنوی کی فوج نہیں آئی۔ انہوں نے اسی سلسلے میں وہی نقشہ رکھا ہوا تھا جو داؤد بن نصر نے قاسم عمر کو دیا اور اس پر وہ راستہ بنایا تھا جس سے اسے سلطان محمود کی فوج کو لانا تھا۔ بکی رائے نے اس فوج کو راستے میں شب خون سے نقصان پہنچانے کے لیے چھاپہ ماروں کی خاصی تعداد بھیج دی تھی اور انہیں علاقے تقسیم کر دیئے تھے۔ وہ ہر روز اس خبر کی امید لے کر جاگتا تھا کہ سلطان محمود کی فوج پر چھاپے اور شب خون شروع ہو گئے ہیں مگر ہر روز مایوسی کے سوا اسے کچھ بھی حاصل نہیں ہو رہا تھا۔

"پھر یہ فوج گئی کہاں؟" — بکی رائے نے اپنے سیناپتی سے غصے سے کہا۔ "پشاور سے اطلاع آئی تھی کہ وہاں سے فوج چل پڑی ہے۔ اس کے بعد کچھ پتہ نہیں چلا۔"

"میں آپ سے پھر کہتا ہوں کہ یا داؤد نے آپ کو دھوکہ دیا ہے یا سلطان محمود کا جو سالار داؤد کے پاس آیا تھا وہ دھوکہ دے گیا ہے۔" — سیناپتی نے کہا۔ "آپ مسلمانوں پر بھروسہ کر کے بہت بڑی غلطی کر رہے ہیں۔"

اتنے میں بکی رائے کو اطلاع دی گئی کہ باہر ایک سوار آیا ہے جس کی پیٹھ میں تیر اترا ہوا ہے۔

بکی رائے ابھی کچھ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ وہ آدمی اندر آ گیا۔ اس کی پیٹھ میں تیر اترا ہوا تھا اور خون سے اس کے کپڑے لال ہو گئے تھے۔

"میں نے مسلمانوں کی فوج کا ایک سوار دستہ دیکھا ہے۔" اس آدمی نے کہا اور سمت بتائی جدھر سے دستہ آ رہا تھا۔ "تین سواروں نے میرا تعاقب کیا اور مجھ پر تیر چلائے، ایک مجھے لگا ہے اور دوسرا میرے گھوڑے کو۔ یہ دستہ ہراول کا ہو سکتا ہے۔"

"یہ ہے وہ فوج جس کا ہم انتظار کر رہے ہیں" ۔ بجی رائے نے کہا اور خبر لانے والے زخمی کو نظر انداز کر کے سیناپتی سے کہا ۔ "ہم محمود کو اتنی مہلت نہیں دیں گے کہ وہ شہر کا محاصرہ کر سکے ۔ اُس کی فوج کوچ کی تھکی ہوئی ہوگی ۔ ہم اسے راستے میں روکیں گے اور شہر سے دُور لڑیں گے ۔"

ذرا ہی دیر بعد سنکھ اور نقارے بج اُٹھے ۔ بھیرہ کی فوج میں ہڑبونگ مچ گئی ۔ ہاتھیوں کی چنگھاڑ سنائی دینے لگی ۔ ہزاروں گھوڑے ہنہنانے لگے ۔ فوج کے دیکھ بھال کے آدمیوں کو یہ دیکھنے کے لیے دوڑا دیا گیا کہ مسلمانوں کی فوج کہاں ہے ۔ تھوڑی دیر بعد اطلاع آ گئی کہ سلطان محمود کی فوج شہر سے آٹھ دس میل دُور سے گزر رہی ہے ۔ بجی رائے نے حکم دیا کہ فوج کو اُس راستے پر جنگی ترتیب میں کر دیا جائے ۔ دیکھتے ہی دیکھتے بجی رائے کی فوج شہر سے نکل گئی ۔

قاسم بن عمر واپس جا کر اپنے ہراول کے دستے سے پیچھے سپہ سالار ابوعبداللہ کے پاس چلا گیا اور اُسے بتایا کہ ایک سوار نے انہیں دیکھ لیا ہے اور ہمارے تیروں سے زخمی ہو کر شہر میں چلا گیا ہے ۔ ابوعبداللہ نے سلطان محمود کو اطلاع دی ۔ سلطان پریشان سا ہو گیا تاہم اُس نے رسد کے قافلے کو وہیں روک کر اس کے ارد گرد حفاظت کا انتظام کر دیا ۔ قاسم کو ہی دیکھنے کے لیے بھیجا گیا کہ بجی رائے کی فوج کی نقل و حرکت دیکھ کر اطلاع دے ۔

قاسم بن عمر جو اطلاع لے کر آیا، وہ تشویشناک تھی ۔ بجی رائے نے بھیرہ شہر سے تین چار میل دُور ایسی زمین پر جس کے نشیب و فراز اور خدوخال اُسی کو فائدہ دے سکتے تھے اپنی فوج کو جنگی ترتیب میں پھیلا دیا تھا ۔ سب سے آگے ہاتھی تھے ۔ سلطان محمود نے اس کے مطابق اپنی فوج کو تین حصوں میں تقسیم کیا اور آگے بڑھا ۔ اُسے ہاتھیوں کی کمزوریوں کا علم تھا ۔ وہ جانتا تھا کہ ہاتھی زخمی ہو کر پیچھے کو بھاگتے اور اپنی ہی فوج کو کچلنے لگتے ہیں ۔ چنانچہ اُس نے اُن پیادوں سے آمنے سامنے کا حملہ کیا جو تیروں اور برچھیوں سے مسلح تھے ۔ ہاتھیوں نے حملہ روکنے کے لیے پیش قدمی کی ۔ کئی ہاتھی زخمی ہو کر بے قابو ہوئے ۔ پیچھے کو بھاگے مگر پیچھے بجی رائے کی کوئی فوج نہیں تھی جسے ہاتھی کچلتے ۔ ہاتھیوں کے بھاگنے اور گھوم

پھر کر لڑنے کے لیے زمین خالی رکھی گئی تھی ۔

سلطان محمود ایک جگہ سے میدانِ جنگ کو دیکھ رہا تھا ۔ وہ جہاں متفکر ہوا وہاں وہ بجی رائے کی عقل پر عش عش کر اُٹھا ۔ اُس نے پہلی بار ہاتھیوں کا اتنا دانشمندانہ استعمال دیکھا تھا ۔ بجی رائے کے ہاتھیوں اور اُن کے سواروں سے مسلمان پیادہ حملہ آوروں کا بے دردی سے نقصان ہو رہا تھا ۔ سلطان محمود نے پیادوں کی مدد کے لیے ایک سوار دستے کو حملے کا حکم دیا ۔ کم و بیش ایک ہزار سواروں نے ہلہ بولا تو بجی رائے نے اس دستے کے دونوں پہلوؤں پر اپنے سوار دستوں سے حملہ کرا دیا ۔ مسلمان سوار اپنے پیادوں کی مدد کو پہنچ ہی نہ سکے ۔

ہندو بہت دلیری سے اور اُن کے کمانڈر فنی فہم و فراست سے لڑ رہے تھے ۔ سلطان محمود نے دشمن کے عقب میں دستے بھیجے مگر بجی رائے نے اس کا بھی انتظام کر رکھا تھا ۔ اُس کے دستوں نے سلطان محمود کے دستوں کو راستے میں ہی روک لیا اور کسی سمت سے اُن پر ہاتھی دوڑا دیئے ۔ ہاتھیوں کے سوار تیروں کا مینہ برساتے آ رہے تھے ۔ مسلمان دستوں کے لیے آگے بڑھنا ناممکن اور پیچھے ہٹنا دشوار ہو گیا ۔ اور اس بھیانک جنگ کے پہلے دن کا سورج غروب ہو گیا ۔

سلطان محمود کو شکست اور پسپائی صاف نظر آنے لگی ۔ اُس نے اپنے سپہ سالار ابوعبداللہ کو ساتھ لے کر اور دُور کا چکر کاٹ کر بھیرہ شہر کے قریب جا کر اندازہ لگایا کہ بجی رائے کی توجہ میدانِ جنگ سے ہٹانے کے لیے شہر پر یلغار کی جا سکتی ہے یا نہیں لیکن شہر کے باہر بجی رائے نے تیر انداز دستے مورچہ بند کر رکھے تھے ۔ اس دوران رات کو سلطان محمود کی رسد پر حملہ ہو گیا ۔ یہ سلطان کا طریقہ جنگ تھا جسے ہندو فوج اُس کے خلاف استعمال کر رہی تھی ۔

رات جاگتے گزر گئی ۔ سلطان محمود نے نماز سے فارغ ہوتے ہی دشمن کے ایک پہلو پر پیادہ دستے سے حملہ کرایا مگر پیادے کچلے گئے کیونکہ جسے سلطان محمود پہلو سمجھ رہا تھا وہ پہلو نہیں تھا ۔ سلطان کا یہ دستہ پھندے میں آ گیا ۔ ابوعبداللہ نے قاسم بن عمر کے سوار دستے کو مدد کے لیے آگے بھیجا ۔ اس دستے نے ایک قسم کا خودکش حملہ کیا ۔ بے تحاشا کشت و خون ہو رہا تھا ۔ معرکہ بڑا ہی خونریز اور بھیانک تھا ۔ مورخوں کے مطابق، دونوں فوجوں کا بے انداز نقصان

ہو رہا تھا۔ زمین لال سُرخ ہو گئی تھی — اور دوسرے دن کا سورج بھی گرد و غبار، زخمیوں کی آہ و بکا اور جانوروں کے شور و غل میں ڈوب گیا۔

تیسرے دن سلطان کی فوج تقریباً آدھی رہ چکی تھی اور اُس کی رسد کا خاصا حصہ بھی تباہ ہو چکا تھا۔ اس روز کی لڑائی نے سلطان محمود کو مایوس کر دیا۔ معروف مؤرخ محمد قاسم فرشتہ نے اس خوفناک منظر کا آنکھوں دیکھا حال اِن الفاظ میں بیان کیا ہے — "سلطان محمود اس حد تک مایوس ہو گیا کہ اُس نے جنگ بندی کا فیصلہ کر لیا۔ اُس نے جب اپنی فوج کو بے جگری سے لڑتے دیکھا اور یہ دیکھا کہ کمی فوج کا جذبہ ابھی زندہ ہے تو اُس نے اپنے محفوظہ کے دستوں سے ان الفاظ میں خطاب کیا کہ میں فتح کے لیے اپنی جان خدا کے حضور پیش کرتا ہوں۔ حملے کی قیادت میں خود کروں گا۔ سلطان کے الفاظ اور لہجے اور انداز میں جادو کا اثر تھا۔ محفوظہ کے دستوں کے نعرے نے بھیرہ کے آسمان کو ہلا ڈالا۔ سلطان نے خود اِن دستوں کی قیادت کی اور برق رفتار حملہ بول دیا مگر بجی رائے کے دستوں نے یہ حملہ بھی بیکار کر دیا۔ سلطان نے اپنے دستے پیچھے کر لیے۔ بجی رائے اب زیادہ تر دفاعی جنگ لڑ رہا تھا۔ سلطان محمود گھوڑے سے اُترا اور قبلہ رو ہو کر دو نفل پڑھے۔ سلام پھیرتے ہی وہ تیزی سے اُٹھا اور گھوڑے پر سوار ہو کر اُس نے گلا پھاڑ کر کہا — مجھے خدا نے فتح کا اشارہ دیا ہے۔ مسلمانو! آگے بڑھو — مسلمان سپاہیوں نے نعرۂ تکبیر بلند کیا اور دوسری بار حملہ بولا۔"

فرشتہ لکھتا ہے کہ بجی رائے بھی مسلمانوں کے تابڑ توڑ حملوں سے گھبرا گیا تھا۔ اِدھر جب سلطان خدا کے حضور سجدہ ریز تھا، بجی رائے اپنے دو پنڈتوں کے درمیان اپنے کسی دیوتا کے بُت کے آگے ہاتھ جوڑے کھڑا گڑگڑا رہا تھا۔ اُس کی فوج کا بہت سا حصہ مارا گیا اور باقی فوج تھک چکی تھی۔ بجی رائے کو دوسرے حملے کی اطلاع ملی تو وہ بُت کے پاؤں کو چوم کر میدانِ جنگ میں آیا۔ اُسے ایک بڑی ہی بلند آواز سنائی دے رہی تھی —

"مسلمانو! فتح یا موت ... مسلمانو! یہ بتوں اور ہمارے رسولؐ کی جنگ ہے ... اسلام کے سپاہیو! تمہارے لیے بھاگنے کی کوئی جگہ نہیں۔ لڑتے ہوئے مرو۔ ہتھیار نہ ڈالنا۔"

اب مسلمان جذبے کی جنگ لڑ رہے تھے، اور قیادت سلطان کر رہا تھا۔ سپہ سالار ابوعبداللہ سلطان کے پہلوؤں اور عقب کا خیال رکھے ہوئے تھے۔ مسلمانوں کی تعداد

تھوڑی رہ گئی تھی، اور دوسرا خطرہ یہ کہ سلطان جذبات کے جوش میں آ گیا تھا۔ ابوعبداللہ نے میدانِ جنگ کے حقائق اور احوال و کوائف پر نظر رکھی اور دائیں بائیں سے دشمن پر حملے کراتا رہا۔ اس سے سلطان کا پلّہ کامیاب رہا۔

بجی رائے نے جو دستے شہر کے اردگرد پھیلا رکھے تھے انہیں بھی جنگ میں جھونک دیا — اور سورج غروب ہو گیا۔ اگلے روز بجی رائے کا جھنڈا کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ اُس کی فوج بکھر رہی تھی۔ ابوعبداللہ نے شہر پر یلغار کر دی۔ دروازے توڑ دیئے۔ بجی رائے لاپتہ تھا۔

آخر وہ شہر سے کچھ دور ایک وسیع نشیب میں مسلمان سواروں کو مل گیا۔ اُس کا محافظ دستہ بھاگ گیا۔ بجی رائے کو للکارا گیا کہ ہتھیار ڈال دے مگر اُس نے تلوار اپنے پیٹ میں گھونپ لی۔

سلطان کی فوج نے دو سو اسی ہاتھی زندہ پکڑے اور وہ بھیرہ میں داخل ہُوا۔

رات کو میدانِ جنگ میں لاشیں ہی لاشیں تھیں — ان میں زخمی بھی تھے، زخمی گھوڑے بھی تھے۔ ان کے درمیان مشعلیں گھوم پھر رہی تھیں۔ ایک جگہ قاسم بن عمر زخمی پڑا تھا۔ دور سے ایک نسوانی آواز سنائی دے رہی تھی — "قاسم .... قاسم .... زندہ ہو تو بولو۔"

چار کنواریوں کی حویلی

بھیرہ کی وہ رات آج کی راتوں کی طرح پُر سکون اور خاموش نہیں تھی۔ نو سو چھہتر سال پہلے بھیرہ کی اُس رات کے چاند کا رنگ بھی لال تھا۔ اس چاند کے آگے محمود غزنوی کی فوج کے گھوڑوں اور پیادوں کی تین دنوں اور راتوں کی اُڑائی ہوئی گرد نے پردہ سا ڈال رکھا تھا، اور اس میں سے چھن چھن کر آتی چاندنی میں دُور دُور تک ہزاروں زخمی تڑپ رہے تھے، اور ہزاروں لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ زخمیوں کی آہ و بکا سے زخمی گھوڑوں کی کربناک اور بھیانک چیخوں جیسی ہنہناہٹ اور ہاتھیوں کی چنگھاڑ سے رات کانپ رہی تھی۔ میلوں وسیع میدان میں جیسے لہو کا موسلا دھار مینہ برس گیا تھا۔

آج وہاں خون کا نشان تک نہیں رہا۔ جن شہیدوں کو وہاں دفن کیا گیا تھا، اُن کی ہڈیاں کبھی کی بھیرہ کی خاک میں مل گئی ہیں ــــ اور اس خاک میں سے پاکستان کا خمیر اُٹھا ہے۔ یہ سرزمین للہ کے اُن سپاہیوں کے لہو سے دُھلی دُھلائی ہے جو یہاں کے رہنے والے نہیں تھے۔ وہ بہت دُور سے آئے تھے۔ وہ غزنی کی زمین کے سپوت تھے جنہوں نے بھیرہ کی اُن مسجدوں میں اذانیں دیں جنہیں ہندوؤں نے مسلمانوں کی دل آزاری کے لیے بت خانے اور اصطبل بنا رکھا تھا۔ انہوں نے محمد بن قاسم کے نعروں کو زندہ کیا تھا۔ زخمی مجاہدین کراہتے تھے تو یہی گمان ہوتا تھا کہ اُن کے سینوں سے اللہ اکبر کے نعرے اُمڈ رہے ہیں ــــ اور جب کسی زخمی مجاہد کے جسدِ خاکی سے روح نکلنے لگتی تھی تو وہ اپنے عزیزوں کا نہیں، اللہ کا نام لیتا تھا۔

لاریب وہ ایمان والے تھے۔ وہ جذبۂ اسلام سے سرشار تھے۔ وہ تراشے ہوئے اُن پتھروں کو ضربِ کلیمی سے توڑنے آئے تھے جنہیں گنگا جمنا کے پجاریوں نے "خدا" بنا رکھا تھا۔ وہ اسلام کی اُن بیٹیوں کی عصمت کی پاسبانی کے لیے آئے تھے جنہیں ہند کے راجاؤں

اور مہاراجوں نے اپنی لونڈیاں سمجھ رکھا تھا۔

نو سو چھہتر سال پہلے کی اُس رات اسلام کی آبرو کے پاسبانوں کے جسموں سے لہو نکل گیا تھا اور جو زندہ سلامت تھے، وہ لاشوں کو اور زخمیوں کو مشعلوں کی روشنی میں پہچان اور اُٹھا رہے تھے۔ دُور دُور تک پھیکی پھیکی چاندنی میں مشعلوں کے شعلے تیر رہے تھے۔ دونوں فوجوں کے زخمیوں کی آہ و بکا، زخمی گھوڑوں اور ہاتھیوں کے قیامت خیز شور و غل میں ایک نسوانی آواز سنائی دے رہی تھی "قاسم ..... قاسم ..... کہاں ہو ..... زندہ ہو تو بولو ..... مجھے آواز دو"۔ اور شعلوں کی کہکشاں میں ایک شعلہ بے تابی سے اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ رہی تھی کبھی جھکی تھی، اس کا شعلہ نیچے کو ہوتا تھا، مایوسی سے اُوپر اُٹھتا تھا اور بے قراری سے موت کے میدان میں بھاگتا دوڑتا نظر آتا تھا۔

قاسم بن عمر موت کے اسی میدان میں کہیں زخمی پڑا تھا۔ اُس کا سارا جسم چھوٹے بڑے زخموں سے کٹا پڑا تھا۔ اُسے دُور کی یہ آواز "قاسم ..... قاسم" ــــ کبھی کبھی سنائی دیتی تھی، اور اُسے یہ آواز لہو اور گرد سے بوجھل فضا میں تیرتی محسوس ہوتی تھی۔ کبھی وہ اس آواز کو اگلے جہان کی آواز سمجھ لیتا اور سکون کا سانس لیتا تھا کہ وہ اپنے باپ کے گناہ کا کفارہ ادا کر کے اور اپنا فرض پورا کر کے خدا کے حضور آیا ہے اور اسے فرشتے پکار رہے ہیں۔

پھر اُسے یہ آوازیں اپنی ماں کی محسوس ہونے لگیں۔ اُسے یاد آگیا کہ اُس کے باپ نے سلطان سے غداری کی اور کامیاب ہونے سے پہلے ہی پکڑا گیا تھا، اور اُس نے اپنی تلوار اپنے پیٹ میں گھونپ کر خودکشی کر لی تھی۔ قاسم بن عمر کا زخمی جسم جیسے بیدار ہو گیا ہو۔ اُسے ماں کے الفاظ یاد آنے لگے۔ ماں نے اسے اسکے باپ کے پیٹ سے نکالی ہوئی تلوار دے کر کہا تھا ــــ "میں تمہارے سینے میں دشمن کی تلوار اتری ہوئی دیکھنا چاہتی ہوں لیکن اس سے پہلے تم اس تلوار سے اپنے جیسے ایک سو دشمنوں کو کاٹ دو گے"۔

قاسم بن عمر کو یہ بھی یاد آیا کہ اُس نے یہ تلوار جس سے اس کے باپ نے خودکشی کی تھی، اپنی ماں کی طرف پھینک کر کہا تھا ــــ "یہ تلوار مجھے نہ دو ماں! اس پر جو خون لگا ہوا ہے، اس میں شراب کی ملاوٹ ہے۔ یہ تلوار ناپاک ہو چکی ہے" ــــ اور وہ جب اپنی فوج کے ساتھ

پشاور سے کوچ کر کے آ رہا تھا تو ماں نے اُس کے بازو کے ساتھ قرآن کی ایک آیت کا تعویذ باندھ کر کہا تھا ۔۔۔ الوداع میرے بیٹے! زندہ واپس آؤ گے تو ماں کو خوشی ہوگی۔ تمہاری لاش آئے گی تو ماں بہت زیادہ خوش ہوگی لیکن میں فتح کی خبر سنوں ۔۔۔ اُسے یہ بھی یاد آیا کہ اُس کی ماں نے اُس کے سپہ سالار ابوعبداللہ محمد الطائی سے کہا تھا کہ میں اپنے اس اکلوتے بیٹے کو خدا کی راہ میں قربان کر کے اس کے باپ کے گناہ کا کفارہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔

قاسم بن عمر کے جسم سے خون نکلتا جا رہا تھا۔ وہ خون سے تر زمین پر نیم شہادت کی گود میں پڑا تھا۔ جوں جوں یادیں آوازیں بن کر اُس کے ذہن کے پردوں سے ٹکراتی جا رہی تھیں، اُس کا دماغ بیدار ہوتا جا رہا تھا اور یہ سوال اُسے پریشان کرتا جا رہا تھا ۔۔۔ کیا ہم نے فتح حاصل کر لی ہے؟... کیا میں نے باپ کے گناہ کا کفارہ ادا کر دیا ہے؟ ۔۔۔ اور پھر بہت سے سوال اُس کے ذہن میں رینگنے لگے ۔۔۔ سلطان محمود کہاں ہیں؟ ... سالار ابوعبداللہ کہاں ہیں؟ ... میرے جانباز جیش کے مجاہدین کہاں ہیں؟ ... وہ سب پکڑے تو نہیں گئے؟ مارے تو نہیں گئے؟ ... سلطان پسپا تو نہیں ہو گیا؟ بھیرہ کا قلعہ سر ہوا تھا یا نہیں؟ ... میری خون آلود تلوار میری ماں تک کون پہنچائے گا؟ ... کون اُسے بتائے گا کہ تیرے بیٹے نے اس تلوار سے اپنے آپ کو نہیں سینکڑوں کفار کو ہلاک کیا ہے۔

قاسم بن عمر کو ابھی معلوم نہیں تھا کہ فتح حاصل کی جا چکی ہے اور سلطان محمود اس وقت بھیرہ میں بجی راسئے کے محل میں بیٹھا سالاروں اور کمانداروں سے رپورٹیں لے رہا ہے اور احکام دے رہا ہے، اور بجی راسئے اپنی تلوار سے اپنے آپ کو ہلاک کر چکا ہے۔ قاسم بن عمر نے اُٹھنے کی کوشش کی۔ بڑی مشکل سے اس کوشش میں کامیاب ہوا۔ اُس نے ہر سو دیکھا۔ اُسے بے شمار مشعلیں گھومتی پھرتی نظر آئیں۔ چاندنی جو کبھی کبھی تھی، بالکل ہی پھیکی پڑ گئی ۔۔۔ اُسے پھر نسوانی آواز سنائی دی ۔۔۔ "قاسم ... قاسم ... کہاں ہو" ۔۔۔ آواز دُور تھی۔ اُسے ایک مردانہ آواز سنائی دی ۔۔۔ "یہ لڑکی کسے ڈھونڈ رہی ہے؟ کوئی اس کے ساتھ ہو جاؤ۔ اسے یہاں سے لے جاؤ۔"

"قاسم بن عمر کی لاش تلاش کر رہی ہے۔"

"اسے کہو ہم زخمیوں اور لاشوں کو اُٹھا رہے ہیں ... دیکھو یہ کون ہے۔"

یہ ترک غزنی کی زبان بول رہے تھے۔ قاسم بن عمر نے بلند آواز سے انہیں بتانا چاہا کہ وہ یہاں ہے مگر اُس کی آواز اُسے خود بھی نہ سنائی دی۔ نقاہت زیادہ تھی اور جنگ کے بعد کا ہیبت ناک شور و غوغا بڑھتا جا رہا تھا۔ مشعلیں دُور تو نہیں تھیں لیکن اس کے لیے کچھ دُور تھیں کیونکہ وہ چل نہیں سکتا تھا۔ وہ دو تین قدم ہی چلا ہو گا کہ ایک لاش سے ٹھوکر کھا کر منہ کے بل گرا۔ اُس نے پھر اُٹھنے کی کوشش کی مگر بڑی مشکل سے بیٹھ سکا۔ اُسے سسکی کی طرح آواز سنائی دی ۔۔۔ "پانی"۔

اُس نے دیکھا کہ اس کے سامنے ایک زخمی پڑا تھا۔ اُس نے آب نہیں، پانی کہا تھا۔ قاسم سمجھ گیا کہ ہندوستانی سپاہی ہے۔ قاسم کی ماں ہندوستانی تھی، اس لیے وہ اس ملک کی زبان سمجھتا تھا۔ اس ہندوستانی نے اُس سے پانی مانگا تو قاسم بن عمر کو پیاس کا احساس ہونے لگا۔ اُسے کچھ یاد نہیں تھا کہ اُس نے کب پانی پیا تھا۔ اُس کے ذہن پر ماں غالب تھی، اور فتح۔ وہ برا دل میں رہا۔ اُس کے جیش نے چھاپہ مار لڑائی بھی لڑی اور جب سلطان محمود غزنوی نے اپنی قیادت میں بجی راسئے پر آخری حملہ کیا تو قاسم بن عمر اس حملے میں بھی شامل تھا۔ وہ سلطان ہی کی طرح بھوک اور پیاس سے بے نیاز تھا۔ اُس کی فوج ختم ہو رہی تھی اور پھر ہندوستانیوں کا بھاری تھا۔ فتح دور سے بھٹکتی جا رہی تھی۔

"تم کون ہو؟" ۔۔۔ اُسے آواز سنائی دی ۔۔۔ "بھگوان کے نام پر میرے منہ میں پانی کے دو قطرے ڈال دو" ۔۔۔ اور سپاہی کی سسکیاں نکلنے لگیں۔ یہ شدید درد کی سسکیاں تھیں۔ بھگوان کا نام سن کر قاسم بن عمر کو آگ لگ گئی۔ اُس نے تلوار نکالنی چاہی تو نیام خالی تھی۔ تلوار کہیں گر پڑی تھی۔ اُس نے خنجر نکال لیا۔ عین اُس وقت اُسے زخمی سپاہی کی درد سے کراہتی ہوئی آواز سنائی دی ۔۔۔ "تم شاید مسلمان ہو"۔

"ہاں! میں مسلمان ہوں" ۔۔۔ قاسم بن عمر نے خنجر نیام میں ڈالتے ہوئے کہا ۔۔۔ "مسلمان اپنے دشمن کو پیاسا نہیں مارا کرتا، اور بھگوان تمہیں پانی پلانے نہیں آئے گا ... مگر میرے پاس پانی نہیں۔ میں تمہیں پیاسا نہیں مرنے دوں گا۔ ذرا انتظار کرو میرے آنے تک زندہ رہنا۔"

وہ اُٹھا اور چلا مگر ٹانگیں لڑکھڑانے لگیں۔ بیٹھ کر پاؤں پر سرکتا قریب ایک لاش کے پاس

دیا کا۔ لاش کے ساتھ پانی کی چھوٹی سی چھاگل بندھی ہوئی تھی۔ اس نے چھاگل کھولی اور سرکتا ہوا زخمی ہندوستانی کے پاس گیا۔ بولا "منہ کھولو۔"

"تم مسلمان ہو؟" — ہندوستانی نے پوچھا۔

"ہاں، میں مسلمان ہوں۔"

"پھر رہنے دو" — ہندوستانی سپاہی نے کہا — "میں پانی نہیں پیوں گا۔"

اتنی نفرت! قاسم بن عمر نے سوچا، ہندو مسلمانوں کو اتنا ناپاک سمجھتے ہیں کہ مر جانا قبول کر لیتے ہیں مگر مسلمان کے ہاتھ کا پانی نہیں پیتے!

"پھر اپنے بھگوان کو آواز دو" — قاسم نے کہا — "اگر تم بھگوان کی خاطر لڑے تھے تو انتظار کرو، شاید تمہیں پانی پلانے آ جائے۔ میں خدا کے نام پر لڑتا رہا ہوں۔ میرا جسم قیمہ بن گیا ہے لیکن مجھے پیاس نہیں لگی۔ خدا نے میری روح کو تر بتر کر رکھا ہے۔"

ہندو نے آہستہ آہستہ ہاتھ بڑھایا اور چھاگل اپنی طرف گھسیٹ لی۔ قاسم نے چھاگل اٹھا کر اس کے منہ سے لگا دی۔ ہندو آدھی چھاگل پی گیا۔

"جنگ کا فیصلہ کیا ہوا ہے؟" — قاسم بن عمر نے پوچھا — "تم کچھ جانتے ہو؟"

"میں معمولی سا سپاہی نہیں" — ہندوستانی نے جواب دیا — "دو سو سپاہی میری کمان میں ہوتے ہیں۔ میں راجہ کے مرنے کے بعد زخمی ہوا تھا۔"

"ہمارا سلطان کہاں ہے؟"

"شہر کے اندر ہوگا" — ہندوستانی نے جواب دیا — "اور سنو... تم نے مجھے پانی پلایا ہے۔ میں مر رہا ہوں۔ تمہیں ایک بات بتا دوں۔ ہمیشہ یاد رکھنا۔ میری قوم پر کبھی بھروسہ نہ کرنا۔ یہ ہمارا دھرم ہے کہ مسلمان کو ختم کرنا ہے۔ ہم یہاں کے مسلمانوں کو پریشان بھی کرتے رہے ہیں اور ان میں سے کئی ایک کو اپنا دوست بھی بنایا ہے۔ ہمیں پنڈتوں نے بتایا ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ تہذیبی جنگ مذہب کی جنگ ہے جو اسلام کے خلاف ہمیشہ لڑی جائے گی۔ یہ جنگ ہمارے مرنے کے بعد بھی لڑی جاتی رہے گی۔"

قاسم بن عمر بیدار ہوتا جا رہا تھا اور ہندوستانی کی آواز ڈوبتی جا رہی تھی — اور پھر اس

کی آواز بالکل خاموش ہو گئی۔ اس کے جسم سے خون کا آخری قطرہ بھی نکل گیا تھا۔

سلطان محمود غزنوی جب بھیرہ شہر میں فاتح بن کر داخل ہوا تھا تو شہر کے مسلمان مرد، عورتیں اور بچے باہر نکل آئے تھے۔ وہ خوشی سے چیخ اور چلا رہے تھے۔ بعض سلطان کے گھوڑے کے آگے لیٹ جاتے تھے۔ سلطان پر رقت طاری ہو گئی تھی۔ اس نے اس خطے کے مسلمانوں کو غلامی سے آزاد کرایا تھا لیکن اس کی توجہ کسی اور طرف ہو گئی۔ شہر کے ہندو اپنے بال بچوں کو ساتھ لیے، سروں پر گٹھڑیاں اور بکس اٹھائے شہر سے جا رہے تھے۔ عورتیں اور بچے رو رہے تھے۔

"روک لو انہیں" — سلطان نے حکم دیا — "سورج غروب ہو رہا ہے۔ یہ کہاں جائیں گے۔ ہم کسی کو اجاڑنے نہیں آئے۔ ہم شہر کو لوٹ نہیں رہے۔ آگ نہیں لگا رہے... روک لو انہیں اور انہیں کہو کہ میدان جنگ سے اپنی فوج کے زخمیوں کو اٹھا کر ان خیموں تک پہنچائیں جن میں زخمیوں کی مرہم پٹی ہو رہی ہے۔ ہمارے پاس اس کام کے لیے اتنے آدمی نہیں جو ہیں وہ اپنے زخمیوں اور لاشوں کو اٹھا رہے ہوں گے۔ یہ لوگ اپنے زخمیوں کو اٹھائیں۔"

شہر سے جانے والے ہندوؤں کو روک لیا گیا۔ وہ بہت ڈرے ہوئے تھے۔ انہیں یقین دلایا گیا کہ یہ جنگ ان کے راجہ اور فوج کے خلاف تھی، شہریوں کا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ شہر میں یہ اعلان بھی کر دیا گیا کہ ہندو شہری میدان سے اپنے زخمیوں کو اٹھائیں اور اپنے سپاہیوں کی لاشیں بھی اٹھا کر جلا سکتے ہیں۔

یہ اعلان مسلمانوں نے بھی سنا، وہ سلطان کی فوج کے زخمیوں کو اٹھانے، انہیں پانی پلانے اور ان کی مرہم پٹی کرانے کے لیے شہر سے نکل گئے۔ ان کے ہاتھوں میں مشعلیں تھیں۔ رات گہری ہو گئی تھی۔ ان کی عورتیں بھی میدان میں چلی گئیں۔

اس اعلان کے فوراً بعد شہر کے بڑے پنڈت نے اپنے چیلوں کے ذریعے شہر کے بہت سے ہندوؤں کو مندر میں بلا لیا۔ یہ لوگ جب مندر میں گئے تو مندر کی گھنٹیاں

خاموش تھیں، سنکھ خاموش تھے، بُت اور مورتیاں اداس تھیں۔ بہت سارے ہاتھوں والی دیوی کا بُت مسکرا رہا تھا لیکن یہ مسکراہٹ کھسیانی سی تھی۔ مندر پر موت کا سکوت طاری تھا۔ پنڈت نے کوئی اشلوک نہ پڑھا۔ اُس نے پرارتھنا نہ کی۔ اُس کے چہرے پر سنجیدگی کے گہرے تاثرات تھے۔

"ہماری فوج ہار گئی ہے" ۔۔۔ پنڈت نے کہا ۔۔۔ "ہم نہیں ہارے۔ مسلمانوں کے سلطان نے ہمیں شہر میں رہنے کی اجازت دے دی ہے اور یقین دلایا ہے کہ مسلمان فوجی ہمیں پریشان نہیں کریں گے۔ اگر وہ شہر کو لوٹنا اور جلانا چاہتے تو اب تک یہ کام کر چکے ہوتے۔ ہم اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور شکست کا انتقام لے سکتے ہیں۔ رات گہری ہو گئی ہے۔ ہم اپنا کام آسانی سے کر سکتے ہیں۔ سلطان نے آپ سب کو اپنی فوج کے زخمیوں اور لاشوں کو اٹھانے کی اجازت دے دی ہے۔ ..... آپ لوگ اس کام کے لیے چلے جائیں۔ مشعلیں ساتھ لے جائیں۔ مسلمانوں نے فتح تو حاصل کر لی ہے لیکن ان کی فوج آدھی سے بھی کم رہ گئی ہے۔ اس میں سے زیادہ تر نفری زخمی ہے۔ جو زخمی چل سکتے تھے وہ چل کر آ گئے ہیں۔ باقی سب میدانِ جنگ میں پڑے ہیں ....

"آپ اپنے زخمی اٹھانے کے لیے جائیں۔ کلہاڑیاں، تلواریں اور خنجر ساتھ لے جائیں۔ ہندو اور مسلمان فوجی کو پہچاننا مشکل نہیں۔ جو مسلمان زخمی اُٹھ اور چل نہیں سکتے، انہیں وہیں ہلاک کر دیں۔ اگر یہ زخمی مرہم پٹی کے لیے پہنچ گئے تو چند دنوں میں ٹھیک ہو جائیں گے، اور یہ ہندوستان اور ہمارے مذہب کے لیے بہت خطرناک ثابت ہوں گے۔ شہر کے ہر ہندو گھرانے تک یہ خبر پہنچا دو تو اچھا ہے، ورنہ کوئی ہندو مسلمانوں کو خوش کرنے کے لیے انہیں بتا دے گا کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔ آپ ان کانوں میں جو یہاں موجود ہیں۔ اپنی عورتوں کو بھی ساتھ لے جاؤ۔ مسلمان عورتیں بھی گئی ہیں۔ صبح تک آپ لوگ جتنے مسلمان زخمیوں کو مار سکتے ہیں مار ڈالیں۔ اپنے ملک اور مذہب کے لیے ضروری ہے کہ ہم مسلمان فوج کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچائیں۔ وقت کم ہے۔ فوراً چلے جاؤ۔"

قاسم بن عمر اب کھڑا ہونے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔ وہ ایسی جگہ پڑا تھا جدھر کوئی آ ہی نہیں رہا تھا۔ اُسے قاسم ..... قاسم کی آوازیں سنائی دیتی رہی تھیں۔ وہ بھی خاموش ہو چکی تھیں۔ وہ مایوس ہو چکا تھا۔ اُسے دور دور مشعلیں دکھائی دے رہی تھیں۔ اُسے مایوسی یہ تھی کہ اُسے اٹھانے کوئی نہیں آ رہا اور وہ خود مرہم پٹی کے خیموں تک پہنچنے کے قابل نہیں۔ وہ سلطان محمود تک یا اپنے سپہ سالار تک پہنچنا چاہتا تھا۔ انہیں یہ بتا کر مرنے کی سوچ رہا تھا کہ اُس نے باپ کے گناہ کا کفارہ ادا کر دیا ہے۔

اس پر نیم غشی کی کیفیت طاری ہونے لگی تو اُسے دو مشعلوں کے بڑے بڑے شعلے اپنی طرف آتے نظر آئے۔ وہ اٹھ بیٹھا اور ان کا انتظار کرنے لگا۔ اُس نے اپنے آپ کو ہوش میں رکھنے کی کوشش کی۔ یہ اُس کی اپنی فوج کے آدمی ہو سکتے تھے۔ اُسے نسوانی پکار ایک بار پھر سنائی دی ۔۔۔ "قاسم ..... قاسم ..... زندہ ہو تو بولو" ۔۔۔ وہ بول نہ سکا۔

دو مشعلیں اُس کے قریب اس طرح آ رہی تھیں کہ رکتی تھیں، جھکتی تھیں، اوپر اُٹھتی تھیں اور آہستہ آہستہ آگے بڑھتی تھیں۔ پھر دو آدمی اُس کے قریب آ کر رک گئے۔ دونوں پہلو بہ پہلو کھڑے تھے۔ دونوں کے ہاتھوں میں مشعلیں تھیں۔

قاسم بن عمر کو ان میں سے ایک کی دبی دبی سی آواز سنائی دی ۔۔۔ "مسلمان ہے۔ تڑپ رہا ہے ..... ہماری نہیں سمجھتا"۔

"ہاں، میں مسلمان ہوں" ۔۔۔ قاسم نے نحیف آواز میں کہا ۔۔۔ "مجھے فتح کی خوشخبری سناؤ۔ تم اس شہر کے آدمی معلوم ہوتے ہو۔ تم میری زبان نہیں بول سکتے۔ میں تمہاری زبان بول اور سمجھ سکتا ہوں۔"

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ دونوں مسکرائے۔ ایک نے تلوار نکالی اور طنزیہ لہجے میں بولا ۔۔۔ "میں تمہیں تلوار کی زبان میں فتح کی خوشخبری سناؤں گا" ۔۔۔ اُس نے تلوار اُوپر اٹھائی۔ قاسم بن عمر نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا۔ اُس کی زندگی اور موت میں صرف ایک لمحے کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ تلوار اُس کی گردن کی طرف جانے لگی تھی کہ ایک مشعل کو

شعلہ تلوار والے کے چہرے پر آلگا۔ اُس نے چیخ ماری اور تلوار اُس کے ہاتھ سے گر پڑی۔ اُس کے ہاتھ سے مشعل بھی گر پڑی۔

یہ ایک تیسری مشعل تھی جو ان دونوں کے عقب سے آئی تھی۔ یہ دونوں قاسم کو قتل کرنے کی فکر میں تھے۔ وہ بارہ مسلمان زخمیوں کو قتل کر آئے تھے۔ قاسم بن عمر ان کا تیرھواں شکار تھا لیکن تیسری مشعل نے اُسے ایک تلوار سے بچا لیا۔ قاسم نے شعلوں کی روشنی میں دیکھا۔ وہ رابعہ تھی جو ملتان سے قاسم کے باپ عاصم عمر کے محافظوں کے ساتھ آئی تھی اور اُس نے سلطان محمود غزنوی کو بتایا تھا کہ عاصم عمر ملتان سے بڑا ہی خطرناک غدار بن کر آرہا ہے۔ عاصم عمر کی خودکشی کا باعث یہی لڑکی بنی تھی۔ وہ اب پشاور سے اتنی دور بھیرے کے میدان جنگ میں عاصم عمر کے بیٹے قاسم بن عمر کی زندگی کا ذریعہ بن گئی تھی۔

رابعہ نے ایک ہندو کو لوگرایا، دوسرا پیچھے ہٹ گیا اور اُس نے تلوار نکال لی۔ اُس نے دیکھ لیا تھا کہ اس جوان سال لڑکی کے ہاتھ میں صرف مشعل ہے، ہتھیار کوئی نہیں اور قاسم بن عمر اُٹھنے کے قابل نہیں تھا۔ یہ دو لو ہندو اپنے پنڈت کی اُس سکیم کے تحت آئے تھے جو اُس نے مندر میں ہندوؤں کو بتائی تھی۔ وہ اپنی فوج کے زخمیوں کو اُٹھانے کے بہانے مسلمان زخمیوں کو قتل کرتے پھر رہے تھے۔ دوسرے ہندو نے تلوار نکال کر رابعہ پر حملہ کیا۔ رابعہ تیغ زنی کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔ اُس نے مشعل اس ہندو کے آگے کر دی اور خود ایک طرف ہو گئی۔ جو ہندو رابعہ کی مشعل کے شعلے سے گرا تھا، اُس کی آنکھیں جھلس گئی تھیں۔ وہ ایک طرف بیٹھا درد سے کراہ رہا تھا۔

قاسم بن عمر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس کے پاس خنجر تھا، تلوار نہیں تھی اور وہ چلنے پھرنے کے قابل نہیں تھا۔ اُس نے خنجر نکال لیا۔ رابعہ مشعل کے شعلے سے اپنا دفاع کر رہی تھی۔ جونہی ہندو کی پیٹھ قاسم کی طرف ہوئی، قاسم نے خنجر اُس کی طرف پوری طاقت سے پھینکا۔ خنجر ہندو کی پیٹھ میں اُتر گیا۔ وہ پیچھے کو گھوما تو رابعہ نے مشعل سے اُس کے کپڑوں کو آگ لگا دی۔ ہندو اُس کی طرف گھوما تو لڑکی نے مشعل کا شعلہ اُس کے چہرے کے ساتھ لگا دیا۔ وہ اِدھر اُدھر دوڑنے لگا۔ آخر بیٹھ گیا۔ اُس کی پیٹھ میں خنجر بھی اُترا ہوا تھا۔

لاشیں اور زخمی اٹھانے والوں نے دور ایک آدمی کو جلتے دیکھا تو وہ دوڑتے

آئے۔ یہ غزنی کی فوج کے آدمی تھے۔ انہیں بتایا گیا کہ ان دو ... نے کیا کیا ہے۔ ان میں سے جس کا چہرہ جھلسا ہوا تھا، وہ بات کرنے کے قابل تھا۔ اُس کے پیٹ پر تلوار کی نوک رکھی گئی تو اُس نے بتایا کہ وہ قاسم کو قتل کرنے لگے تھے، اور انہیں پنڈت نے کہا تھا کہ مسلمان زخمیوں کو قتل کرو۔

اُسی وقت یہ آدمی میدانِ جنگ میں دوڑنے لگے۔ انہوں نے بہت سے ہندوؤں کو پکڑا جو مسلمان زخمیوں کو قتل کرتے پھر رہے تھے۔ پھر ہندو شہریوں کو میدانِ جنگ میں آنے سے روک دیا گیا۔ پنڈت کو بھی جا کر پکڑ لیا گیا۔

قاسم بن عمر کو وہاں سے اٹھا لے گئے اور اُسے مرہم پٹی والے خیمے میں جا ڈالا۔

سلطان محمود غزنوی کی فوج پشاور سے چلی تھی تو سالاروں اور بعض کمانداروں کی بیویاں بھی ساتھ آئی تھیں۔ ان کی پالکیاں رسد کے قافلے کے ساتھ تھیں۔ ان کے ساتھ اور بھی کئی عورتیں تھیں۔ یہ بڑے افسروں کی بیویوں کی دیکھ بھال کے لیے ساتھ تھیں اور ان کے ذمے یہ کام بھی تھا کہ مرہم پٹی کے بعد زخمیوں کی دیکھ بھال کریں۔ یہ کام بھی فوج کو کرنا پڑتا تھا۔ سلطان محمود نے یہ سوچ کر عورتوں کو ساتھ آنے کی اجازت دے دی تھی کہ فوج تھوڑی ہے اور مختلف لڑائیوں میں یہ اور کم ہو جائے گی، اس لیے زخمیوں کی دیکھ بھال کا کام عورتوں کے سپرد کر دیا گیا تھا۔

"مجھے تمہاری ماں نے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔" رابعہ قاسم بن عمر کو اُس کی مرہم پٹی کے بعد سنا رہی تھی۔ "جب تم میں کوچ کا حکم ملا تو مجھے تمہاری ماں نے بتایا کہ عورتیں بھی ساتھ جا رہی ہیں۔ میں نے اُسے کہا کہ مجھے بھی ان کے ساتھ بھجوا دے۔ میرے سینے میں جو آگ لگی ہوئی تھی وہ آج کچھ ٹھنڈی ہوئی ہے۔ یہ پوری طرح اُس روز ٹھنڈی ہوگی جس روز سلطان محمود ملتان فتح کرے گا اور میں اپنے باپ کو اپنے ہاتھوں قتل کروں گی۔ میں نے تمہاری ماں سے کہا تھا کہ مجھے اگر اس نیکی کا انعام دینا چاہتے ہو کہ میں نے اُس کے ایک سالار کی غداری بے نقاب کی اور اُس کی فوج کو بہت بڑی شکست

اور تباہی سے بچایا ہے تو ملتان کے والی داؤد بن نصر کو میرے سامنے گرفتار کر کے لاؤ اور اُس کے محل کو زمین سے ملا دو ....

"تمہاری ماں کے آنسو بہہ نکلے۔ اُس نے کہا کہ جانا تو میں بھی چاہتی ہوں لیکن کہتے ہیں کہ وہاں جا سکتی ہیں، کسی کی ماں ساتھ نہیں جا سکتی۔ وہ بہت رو رہی تھی۔ اُس نے معلوم نہیں کس کے ساتھ بات کر کے مجھے ان عورتوں کے ساتھ جانے کی اجازت لے دی جو فوج کے ساتھ آئی ہیں۔ تمہاری ماں نے مجھے کہا تھا۔ میرا بیٹا میدانِ جنگ میں انشاءاللہ سخت جان ہوگا۔ اُس کا جسم دو حصوں میں نہ کٹ گیا تو وہ گرے گا نہیں۔ میں نے اُسے کہا ہے کہ تمہاری لاش واپس آئے گی تو مجھے خوشی ہوگی، لیکن رابعہ میں ماں ہوں۔ جب سوچتی ہوں کہ میرا بیٹا پیاسا جان دے گا تو میرا دل ڈوب جاتا ہے۔ اپنے آپ کو سہارا دینے کے لیے میں قاسم کی ماں نہیں بلکہ کی ماں بن جاتی ہوں اور کہا کرتی ہوں کہ یہ اللہ کا سپاہی ہے جو میرے بطن سے پیدا ہوا ہے اور یہ اللہ کی امانت ہے جو مجھے واپس کرنی ہے، پھر مجھے تسکین سی ہو جاتی ہے ....

"اور قاسم! تمہاری ماں نے مجھے کہا تھا۔ مجھے خود غرض کہہ لو۔ کچھ کہہ لو۔ مجھ پر یہ احسان کرنا کہ جب زخمیوں کو اٹھانے کا وقت آئے تو تم سب سے پہلے میرے بیٹے کو تلاش کرنا۔ اُسے پانی پلا دینا۔ دل میں میرا خیال رکھ لینا اور اُس کی ماں بن جانا۔ میرا بیٹا پیاسا اس دنیا سے رخصت نہ ہو۔ رابعہ! تم ماں نہیں ہو۔ دل میں ماں کا پیار کر لینا۔ میں اپنے بیٹے کو خدا کے اور تمہارے سپرد کرتی ہوں ....

"اور قاسم! تمہاری ماں نے مجھے کہا تھا۔ میں تمہیں اس کی بھی اجازت دیتی ہوں کہ تمہیں پتہ چل جائے کہ میرے بیٹے نے پیٹھ دکھائی ہے یا کہیں چھپ گیا تھا تو اپنے ہاتھوں اسے تلوار سے، تیر کمان سے، برچھی سے ختم کر دینا۔ میں سمجھوں گی کہ خاوند غدار تھا اور اُس کا نطفہ بھی غدار نکلا۔ میں باقی زندگی کسی پیر فقیر کی درگاہ پر جھاڑو دیتے گزار دوں گی۔"

"تمہیں میرے متعلق کچھ پتہ چلا ہے؟" — قاسم بن عمر نے پوچھا۔

"بشارہ سے آتے جب دریا پار کرتے لڑائی ہو رہی تھی تو میں نے سپہ سالار ابوعبداللہ

سے پوچھا کہ قاسم کی کیا خبر ہے؟ سپہ سالار کو معلوم تھا کہ مجھے تمہاری ماں نے بھیجا ہے۔ اُس نے بتایا تھا کہ تم بہت بہادری سے لڑے ہو۔ میں نے سپہ سالار سے کہا تھا کہ قاسم کو پتہ نہ چلے کہ میں بھی ساتھ آئی ہوں۔ میں نے یہ اس لیے اُسے کہا تھا کہ تمہاری توجہ میری طرف نہ ہو جائے ....

"یہاں ہمیں میدانِ جنگ سے بہت دُور رکھا گیا تھا۔ تین دن لڑائی ہوتی رہی۔ ہمیں اس طرف نہ آنے دیا گیا۔ ہم سب اپنی فوج کے لیے دعائیں کرتی رہیں اور ہمیں خبریں ملتی رہیں اور ایک روز تو کسی نے یہ بھی کہہ دیا کہ اپنی فوج کو شاید پسپا ہونا پڑے .... تمہارے متعلق مجھے بتانے والا کوئی نہیں ملتا تھا۔ تمام عورتیں لڑنے کے لیے تیار ہو گئی تھیں۔ ہم میں سے کوئی بھی پسپائی کا نام سننے کے لیے تیار نہیں تھی ....

"آج دوپہر کو ہمیں اطلاع ملی کہ دشمن کو شکست دے دی گئی ہے لیکن دونوں فوجوں کا جانی نقصان اتنا زیادہ ہوا ہے کہ لاشوں کے اوپر لاشیں پڑی ہیں اور زخمیوں کو اٹھانا مشکل ہو گیا ہے۔ ہمیں شام سے ذرا پہلے یہاں لایا گیا لیکن ہمیں اُن خیموں میں بھیج دیا گیا جہاں زخمیوں کی مرہم پٹی ہو رہی تھی۔ طبیب زخموں کو صاف کرتے اور ان پر دوائیاں لگاتے تھے اور عورتیں پٹیاں باندھتی اور زخمیوں کو کھلاتی پلاتی تھیں۔ زخمیوں کی قطاریں چلی آ رہی تھیں۔ ان میں بہت سے بے ہوش تھے۔ کئی ہمارے ہاتھوں میں شہید ہو گئے۔ میں ہر ایک زخمی کو دیکھتی تھی۔ بعض کے چہرے خون میں ڈوبے ہوئے تھے۔ میں ان کے چہرے دھو کر انہیں دیکھتی تھی۔ میں ہر اُس زخمی سے جو ہوش میں تھا، پوچھتی تھی کہ قاسم بن عمر کو تم نے کہیں دیکھا ہے؟ تین نے مجھے ایک ہی جیسا جواب دیا — قاسم کا جیش جس طرف گیا تھا وہاں سے شاید ہی کوئی زندہ واپس آیا ہو ....

"سورج غروب ہونے کے بعد تمہارے جیش کا ایک زخمی سپاہی مل گیا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ قاسم بن عمر اگر ابھی تک نہیں آیا تو وہ مر چکا ہوگا۔ اُس نے بتایا کہ تم اُس کے سامنے زخمی ہوئے تھے۔ اُس نے یہ بھی کہا — میں اپنے جیش کا شاید ایک ہی آدمی زندہ بچا ہوں — تمہارے متعلق اُس نے کہا۔ قاسم بن عمر ہمارا کماندار تھا۔ صاف دکھائی دے رہا تھا کہ ہندوستانی ہمیں بھگا کر ہی دم لیں گے۔ جب آخری حملے کا حکم ملا تو ہمارے

جیش کو دشمن پر اُس جگہ حملہ کرنے کو بھیجا گیا جہاں بھیرہ کے راجہ کا جھنڈا تھا۔ سپہ سالار ابوعبداللہ نے اُسے کہا تھا کہ قاسم! ہندیوں کا جھنڈا گرا دو تو جو انعام مانگو گے دُوں گا۔ سپہ سالار نے ہمیں خدا حافظ کہا تھا'۔۔۔۔

"تمہارے جیش کے اس آدمی نے بتایا کہ قاسم پاگل ہو گیا تھا۔ اُسی نے ہمیں حکم دیا تھا کہ راجہ کا جھنڈا گرے گا یا ہم گریں گے۔ ہم ہندیوں کے دل میں اُتر گئے۔ جھنڈا گرا لیا گیا مگر ہم سے کوئی ایک بھی اپنے گھوڑے کی پیٹھ پر نہ رہ سکا اور کوئی اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل بھی نہ رہا۔ راجہ نکل گیا۔ ہندیوں پر یہ ضرب کاری لگی کہ اُن کے پاؤں اکھڑ گئے۔ اُس نے بتایا تھا کہ قاسم اگر یہاں نہیں لایا گیا تو وہ زندہ نہیں ہوگا۔۔۔۔

"میں اُسی وقت وہاں سے چل پڑی۔ ایک مشعل ہاتھ آگئی۔ اگر میرے ہاتھ میں مشعل نہ ہوتی تو میں ہر قدم پر لاشوں سے ٹھوکر کھا کر لاشوں پر گرتی۔ میں نے مرا ہوا آدمی کبھی نہیں دیکھا تھا مگر یہاں لاشیں اس طرح پڑی ہیں جیسے جنگل کاٹ کر لکڑیاں پھینکی ہوئی ہوں۔ میں نے شاید ہر ایک لاش کا چہرہ دیکھ ڈالا ہے۔ اُن کے زخم بھی نظر آتے ہیں۔ میں نے کٹے ہوئے چہرے بھی دیکھے ہیں۔ میں نے ہندوؤں کی لاشیں بھی دیکھی ہیں اور مجھے روحانی سکون ملا ہے مگر اپنی فوج کی ہر لاش کو دیکھ کر میرے آنسو نکل آتے تھے۔ میں نے کراہتے ہوئے زخمی بھی دیکھے ہیں۔ میں تمہیں ڈھونڈ رہی تھی۔ رات گزرتی جا رہی تھی۔ زخمیوں کو اُٹھا اُٹھا کر لے جا رہے تھے۔۔۔۔

"پھر میں نے تمہیں پکارنا شروع کر دیا۔ زخمیوں کو اُٹھانے والوں نے مجھے کہا بھی کہ یہاں تمہیں قاسم نہیں ملے گا مگر میں وہاں تک چلی گئی جہاں لاشوں کا یہ سمندر ختم ہو جاتا ہے۔ میرے اندر تمہاری ماں کی روح اُتر آئی تھی۔ تم یہاں نہ ملتے تو میں رات یہیں گزار دیتی اور دن کی روشنی میں تمہیں تلاش کرتی۔ میں اس طرف آگئی۔ دو مشعلیں دیکھیں۔ میں ان آدمیوں کے تعاقب میں تھی۔ میں آہستہ آہستہ ادھر آئی۔ مجھے ان سے بھی تمہارے متعلق پوچھنا تھا۔ قریب آئی تو مجھے تمہارا چہرہ نظر آیا۔ تم بیٹھے ہوئے تھے۔ دو مشعلوں کی روشنی میں میں نے تمہیں پہچان لیا۔ میں آگے بڑھی۔ معلوم نہیں تم مجھے کیوں نہیں دیکھ سکے۔۔۔۔

"ان دونوں کے لباس دیکھے تو خیال آیا کہ یہ فوجی نہیں اور یہ مسلمان بھی نہیں لگتے۔ مجھے

کوئی شک نہ ہوا۔ ان میں سے ایک اپنی تلوار نکال کر تم پر وار کرنے لگا تو میں نے دوڑ کر اپنی مشعل کا شعلہ اُس کے منہ کے ساتھ لگا دیا۔ قاسم! یہ خدا کا حکم تھا کہ تم زندہ رہو۔ تمہارا فرض ابھی پورا نہیں ہوا۔"

ملتان میں داؤد بن نصر قرامطی کے محل سے ذرا ہٹ کر محمد بن قاسم کے دور کی ایک حویلی ہوا کرتی تھی جس کی ساخت قلعے کی طرح تھی۔ اس کے اندر بے شمار کمرے تھے۔ غلام گردشیں اور رہداریاں تھیں۔ میدان جیسا صحن بھی تھا۔ اندر کنواں بھی تھا۔ اس قلعہ نما حویلی کے متعلق مشہور تھا کہ آسیب زدہ ہے۔ اندر جاؤ تو عورتوں کی سسکیاں سنائی دیتی ہیں۔ قدموں کی آہٹیں یوں سنائی دیتی ہیں جیسے بچے بھاگ دوڑ رہے ہوں۔ بچوں کے قہقہے بھی سنائی دیتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے حویلی آباد ہے۔ اس کے متعلق بڑی ہی ڈراؤنی کہانیاں مشہور تھیں۔ لوگ اس حویلی کے قریب سے گزرتے بھی ڈرتے تھے۔ بعض لوگ کہتے تھے کہ انہوں نے حویلی کی چھتوں کے اوپر مشعلوں کے شعلے ہوا میں تیرتے دیکھے ہیں۔ ایک روایت یہ مشہور تھی کہ محمد بن قاسم کے دور کے بعد جب یہ خطہ ہندوؤں کے ہاتھ آیا تو انہوں نے حویلی میں رہنے والے مسلمان خاندان کو قتل کر دیا تھا۔ مقتولین میں بچے بھی تھے اور چار کنواری لڑکیاں بھی تھیں۔ لڑکیوں کو بے آبرو کر کے قتل کیا گیا۔ اب چار کنواریوں اور بچوں کی بدروحیں حویلی میں رہتی ہیں۔ کوئی اندر چلا جائے تو اُسے بچوں اور کنواریوں کے رونے کی اور پھر ہنسنے کی آوازیں آتی ہیں۔ بچے بھاگتے دوڑتے ہیں اور لڑکیاں بین کرتی ہیں۔ کہتے تھے کہ صدیاں گزر جانے کے باوجود مقتولین کی ہڈیاں وہیں پڑی ہیں جہاں انہیں قتل کیا گیا تھا۔

جن دنوں سلطان محمود غزنوی نے بھیرہ فتح کیا اور وہ اپنی فوج کی کمی پوری کرنے میں مصروف تھا، ملتان کی آسیب زدہ حویلی میں راتوں کو میلے کا سماں ہوتا تھا۔ ملتان کا حاکم داؤد بن نصر قرامطی تھا۔ اس فرقے کے متعلق تفصیل سے بتایا جا چکا ہے کہ یہ لوگ اپنے آپ کو مسلمان کہلاتے تھے مگر ان کا عقیدہ یہ تھا کہ شراب، بدکاری اور بے حیائی جائز ہے۔ جی میں جو آئے کر دو، یہی اسلام ہے۔ ان کا پیرومرشد داؤد بن نصر تھا جو ملتان کا حاکم یعنی والی بھی تھا۔ آسیب زدہ

حویلی میں میلے کا اہتمام اسی نے کرایا تھا۔ اسی کی طرف سے شہر اور گرد و نواح کے دیہات میں اعلان ہوا تھا — "داؤد بن نصر حاکم ملتان ولی اللہ قرامطی نے ان بدروحوں اور جنات کو حاضر کر لیا ہے جو اجڑی ہوئی حویلی میں رہتے ہیں۔ یہ جنات ہر رات ایک آدمی یا ایک جانور کا خون پیتے ہیں۔ داؤد بن نصر نے مخلوق خدا کے سکون اور امان کی خاطر اپنی جان خطرے میں ڈال کر بدروحوں اور جنات کو اپنے تابع کر لیا ہے۔ رات کو لوگ آ کر انہیں قیدی حالت میں دیکھ سکتے ہیں۔"

لوگ شام کے بعد حویلی میں جاتے تھے۔ منڈیروں پر چراغاں ہوتی تھی۔ کمروں اور برآمدوں میں اتنی تیز خوشبو چھوڑی گئی تھی کہ جو اندر جاتا وہ باہر کی دنیا کو بھول جاتا تھا۔ کمروں کو صاف نہیں کیا گیا تھا۔ ان کی چھتوں سے لٹکتے ہوئے جالے جو میلے کچیلے کپڑوں کی صورت اختیار کر گئے تھے، اسی طرح رہنے دیئے گئے تھے۔ فرشوں پر جو کائی اگی ہوئی تھی اسے بھی صاف نہیں کیا گیا تھا۔ حویلی کی ہیبت جیسی تھی ویسی ہی رہنے دی گئی تھی — اور شام کے بعد لوگ ان کمروں اور برآمدوں میں گھومتے پھرتے اور حویلی کے صحن میں جمع ہو جاتے تھے جہاں ایک چبوترہ بنایا گیا تھا۔ اس پر خوشنما قالین بچھے ہوئے تھے اور ایک مسند رکھی تھی جس پر ہیرے جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ یہ روشنی میں جھلمل کرتے ستاروں کی طرح چمکتے اور ٹمٹماتے تھے۔ یہ چبوترہ برآمدے کے بالکل ساتھ تھا۔

دو چار دنوں میں ہی شہر اور دیہات میں صرف ایک ہی موضوع رہ گیا جس پر لوگ باتیں کرتے تھے۔ یہ موضوع تھا "چار کنواریوں کی حویلی" — لوگ حیرت زدہ ہو کر بھی اور اپنے اوپر وجد طاری کر کے بھی داؤد قرامطی کی کرامات کا ذکر کرتے تھے۔ ان سب کو چاروں کنواریاں جنہیں سینکڑوں سال پہلے قتل کیا گیا تھا، حویلی کے صحن میں رکھے ہوئے چبوترے پر داؤد بن نصر نے اس طرح دکھائی تھیں کہ وہ جیسے ہوا میں سے نمودار ہوئیں اور ہوا میں تحلیل ہو گئیں۔ ان لوگوں نے کنواریوں کی آوازیں سنی تھیں۔ بچوں کے قہقہے سنے اور بچوں کو چبوترے پر آتے اور غائب ہوتے دیکھا تھا۔

بعض مسجدوں میں بھی قرامطیوں کی کرامت کا ذکر ہونے لگا اور پھر ملتان کی ریاست میں یہ تغیر آیا کہ مسجدوں کے امام بھی داؤد قرامطی کا ذکر اپنے وعظ اور خطبے میں کرنے لگے —

اور پھر یہ انقلاب آیا کہ پنڈتوں نے بھی کہنا شروع کر دیا کہ داؤد بن نصر صرف حاکم یا والی نہیں، اس کے ہاتھ میں تو خدا کی قوت ہے اور وہ جو کچھ کہتا ہے وہ بالکل سچ ہے۔ پنڈتوں نے یہ بھی کہا کہ یہی اسلام ہے جسے مولویوں نے بے معنی پابندیاں عائد کر کے اور نیکی اور بدی کو الگ کر کے بگاڑ دیا ہے۔

ملتان میں ایک اور حویلی تھی۔ یہ ویسی ہی تھی جیسی گلی کوچوں میں حویلیاں اور مکان ہوتے ہیں۔ یہ آباد تھی۔ اس میں مسلمانوں کا ایک کنبہ رہتا تھا۔ ملتان میں مسلمانوں کی آبادی زیادہ تھی کیونکہ یہ مسلمان ریاست تھی۔ ہندو ریاستوں کے مسلمان بھی ملتان جا کر آباد ہو گئے تھے۔ ان میں زیادہ تر مسلمان غیر قرامطی تھے یعنی وہ صحیح معنوں میں مسلمان تھے، مگر ملتان کا سرکاری نظم و نسق اور تجارت قرامطیوں کے ہاتھ میں تھی۔ قرامطی اپنے باطل عقیدے کی تبلیغ بھی کرتے رہتے تھے۔

یہ حویلی شہر کے اندر ایک گنجان آباد محلے میں تھی۔ یہ کوئی آسیب زدہ اور پراسرار حویلی نہیں تھی مگر ایک رات اس کے ایک کمرے میں جو چند ایک آدمی بیٹھے تھے، وہ پراسرار طریقے سے راز و نیاز کی باتیں کر رہے تھے۔ ان میں ایک تو وہ درویش تھا جس نے عاصم عمر کے محافظوں کو اپنے ہاں بلایا اور انہیں بتایا تھا کہ تمہارا سالار عاصم عمر جو داؤد بن نصر کے پاس سلطان محمود کا ایلچی بن کر آیا ہے، وہ قرامطیوں کے طلسم میں گرفتار ہو گیا ہے۔ البتہ کو اسی درویش نے داؤد بن نصر کے محل سے نکالا اور اسے عاصم عمر کے ایک محافظ کے ساتھ پشاور روانہ کیا تھا۔

"حکومت کی گدی پر قرامطی بیٹھا ہے" — درویش معمولی سی حویلی کے کمرے میں بیٹھا کہہ رہا تھا۔ "ہم آزادی سے لوگوں کو نہیں بتا سکتے کہ قرامطی فرقے کے لوگوں کا اسلام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ اسلام انسان کو گناہوں سے بچاتا اور نیکی کی طرف لاتا ہے۔ اسلام کا تعلق روح سے ہے اور قرامطی عقیدہ جسم سے تعلق رکھتا ہے اس لیے جسمانی عیاشی، شر اور شراب کی کھلی اجازت دیتا ہے اور یہ اجازت بھی کہ خوبصورت عورت کسی ایک آدمی کی بیوی کو بن سکتی ہے لیکن وہ اپنے خاوند پر اور خاوند اس پر پابندی عائد نہیں کر سکتا کہ وہ جس کے ساتھ چاہیں عیش و عشرت کریں اور جسمانی لذت حاصل کریں کیونکہ خدا نے انسان کو عیش و عشرت کے لیے پیدا کیا ہے... آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس فرقے کی تعداد بڑھتی

"لوگ کہتے ہیں کہ ہر رات چار کنواریاں اور تین چار بچے حاضر کیے جاتے اور لوگوں کو دکھائے جاتے ہیں"۔ عالم نے کہا۔ "لوگ کہتے ہیں کہ یہ بدروحیں ایک دھوئیں میں سے نمودار ہوتی ہیں اور کچھ باتیں کر کے وہیں کہیں غائب ہو جاتی ہیں.... ہم میں سے کسی کو وہاں جا کر دیکھنا چاہیے کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ ہم اس لیے نہیں جاتے کہ یہ ہمارے عقیدے کے خلاف ہے"۔

"ہم آج اسی لیے یہاں جمع ہوئے ہیں"۔ جواں سال آدمی نے کہا۔ "اگر وہاں کوئی فریب کاری یا شعبدہ بازی ہو رہی ہے تو ہم اس حویلی کے قرامطیوں کے پردے چاک کر دیں گے"۔ اس نے وہاں بیٹھے ہوئے اپنے جیسے جوانوں اور نوجوانوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "ہم اسلام کے نام پر جانیں قربان کرنے کے لیے تیار ہیں۔ ہمیں وہاں نقب لگانی پڑی تو لگائیں گے۔ آپ عالم اور درویش ہیں۔ آپ کتابوں کی باتیں کرتے ہیں۔ ہمیں سیاہ و سفید سمجھا دیں۔ ہماری راہنمائی کریں۔ عمل ہم کریں گے جن کے جسموں میں جوانی کا خون اور سینے میں ایمان کی حرارت ہے"۔

"غور سے سنو ہمارے بیٹو!"۔ عالم نے کہا۔ "سیدھی سی بات ہے کہ قرامطی فرقہ کفار کی پیداوار ہے۔ ان کے مقاصد تم جانتے ہو۔ جاننے اور سمجھنے والی ایک بات یہ ہے کہ مذہب انسان کی کمزوری بن جاتا ہے۔ ہم مسلمان مذہب پر مرمٹتے ہیں۔ دشمن ہماری اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اپنے عزائم کے تکمیل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ داؤد حکومت کی گدی کا شیدائی ہے۔ وہ بھی مذہب کی آڑ اور سہارا لے کر اپنی گدی کو محفوظ اور مستحکم کر رہا ہے۔ ہماری قوم جب بھی دھوکہ کھاتی ہے مذہب کے نام پر کھاتی ہے۔ وہ خلفائے راشدین اس دنیا سے اٹھ گئے ہیں جنہوں نے صحیح اسلام کی پابندی کی بھی اور کرائی بھی تھی۔ اب وہ خلیفے آ گئے ہیں جو مذہب کو حربے اور جھانسے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ مذہب کے ان پڑھ اور پسماندہ ذہن شیدائی جذبات میں آ کر ان کے مرید بن جاتے ہیں۔ انہیں بہت دیر بعد احساس ہوتا ہے کہ وہ مرید نہیں بنے، ایک ہوس کار اور اقتدار پرست حکمران کا شکار ہو گئے ہیں۔ ایسے حکمرانوں کے خلاف بات کرو تو وہ کفر کا فتویٰ لگاتے اور سزا دیتے ہیں.... یہ ثابت ہو چکا ہے کہ داؤد بن نصر مسلمان نہیں البتہ یہ بھی کہ وہ اسلام کی روح کو مار رہے ہیں اور

جا رہی ہے"۔

"انسانی فطرت لذت پرستی کی طرف جلدی مائل ہوتی ہے"۔ اس کمرے میں بیٹھے ہوئے ایک سفید ریش عالم نے کہا۔ "نیکی میں جسمانی لذت سے دستبردار ہونا پڑتا ہے۔ اصل چیز روح ہے جو نظر نہیں آتی۔ روحانی لذت کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جنہوں نے دل میں بنی نوع انسان کی محبت پیدا کر کے اور اللہ کی عبادت کر کے روحانی لذت حاصل کی ہو۔ انسان یہ نہیں سمجھتے کہ روح علیل ہو تو جسم بھی علیل ہو جاتا ہے اور جب جسم کی ناجائز ضروریات پوری کی جائیں تو روح مرجھا جاتی ہے۔ پھر جسم وقت سے پہلے کمزور اور نحیف ہو کر قبر میں جا دفن ہوتا ہے اور روح خدا کے حضور چلی جاتی ہے"۔

"ہم سب جانتے ہیں آپ کیا کہ رہے ہیں"۔ ایک جواں سال آدمی نے کہا۔ "آپ اس مسئلے کے متعلق بات کریں جو ہم پر آ پڑا ہے۔ داؤد قرامطی نے جب سے ویران حویلی میں بدروحوں اور جنات کو حاضر کرنا شروع کیا ہے، لوگ جوق در جوق اس کے ہاتھ پر بیعت کر رہے ہیں۔ میں نے ایک مسجد میں امام کو وعظ کرتے سنا ہے جس میں وہ کہ رہا تھا کہ سچا اسلام قرامطی ہے۔ جب ایک باطل عقیدہ مسجد پر قبضہ کر لیتا ہے تو لوگ اسے باطل نہیں سچا سمجھنے لگتے ہیں"۔

"کیا آپ نے یہ بھی سنا ہے کہ ہندوؤں کے پنڈت بھی قرامطی عقیدے کو سچا اسلام کہ رہے ہیں؟" ایک اور نے کہا۔

"مگر کوئی ہندو اپنا مذہب چھوڑ کر قرامطی نہیں ہوگا"۔ درویش نے کہا۔ "لوگوں کو ہم کس طرح بتائیں کہ قرامطی فرقہ عیسائیوں کا پیدا کردہ فتنہ ہے اور ہندوستان میں ہندو راجے مہاراجے اس کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔ کفار کا ایک مقصد یہ ہے کہ اسلام کا چہرہ گناہوں اور عیش و عشرت سے گندہ کر دیا جائے اور دوسرا مقصد یہ کہ ملتان کی گدی کو مسلمان گدی کہہ کر مسلمانوں کو دھوکہ دیا جائے اور ملتان کی فوج استعمال کی جائے.... اسلام کے خلاف بہت بڑی سازش ہو رہی ہے۔ چار کنواریوں کی حویلی نے ملتان کی آدھی مسلمان آبادی کو قرامطی بنا دیا ہے۔ یہ سوچیں کہ ہم اس کی روک تھام کیسے کریں۔ ہم میں سے کوئی بھی حویلی میں یہ دیکھنے کے لیے نہیں گیا کہ وہاں کیا ہو رہا ہے"۔

یہ بھی کردہ ہندوؤں اور عیسائیوں کا دوست ہے جو اسلام کے بدترین اور بہت خطرناک دشمن ہیں۔ ہم لوگ اُس کے خلاف نہ کچھ کہہ سکتے ہیں نہ کچھ کر سکتے ہیں"۔

"اس لیے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ ہم اس کے خلاف کوئی خفیہ کارروائی کریں"۔ ایک نوجوان نے کہا۔

"آج رات ہم سب چار کنواریوں کی حویلی میں جائیں گے، اور دیکھیں گے کہ وہاں کیا ہو رہا ہے"۔ درویش نے کہا۔

حویلی میں انہوں نے جو رونق دیکھی اس نے انہیں حیران کر دیا۔ لوگوں کی بیتابی اور بے قراری اور زیادہ حیران کن تھی۔ یہ وہی حویلی تھی جس کے قریب سے کوئی نہیں گزرتا تھا۔ لوگ کمروں اور برآمدوں میں گھوم پھر رہے تھے۔ ہر جگہ دیئے جل رہے تھے۔ درویش کے ساتھ چھ سات جواں سال آدمی تھے جن میں دو سترہ اٹھارہ سال عمر کے نوجوان تھے۔ وہ بھی لوگوں کی طرح حویلی کے اندر گھومتے پھرتے اُس جگہ تک چلے گئے جہاں تک کسی کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اس سے آگے بھی حویلی کے کمرے تھے اور ان سے آگے برآمدہ اور اس کے ساتھ چبوترہ تھا جس پر داؤد بن نصر بدروحوں اور جنات کو حاضر کرتا اور لوگوں کو دکھاتا تھا۔

وہاں ایک آدمی کھڑا تھا جو لوگوں کو وہاں سے واپس بھیج رہا تھا۔ درویش اور اس کے ساتھی بھی وہاں تک گئے۔ اُس آدمی نے انہیں روکا۔ درویش اس سے پوچھنے لگا کہ آگے کیا ہے۔ اُس آدمی نے کچھ بتانے کی بجائے غصے سے درویش کو وہاں سے واپس چلے جانے کو کہا۔ اس دوران اس آدمی کی توجہ کسی اور کی طرف ہو گئی۔ وہاں روشنی بہت کم تھی۔ وہ آدمی دوسری طرف ہوا تو درویش نظر بچا کر وہاں سے اس طرح آگے چلا گیا کہ وہیں سے راہداری مڑتی تھی جو اندھیری تھی۔ وہ آدمی واپس ہوا تو اُس نے سب کو پیچھے ہٹا دیا۔ درویش کے ساتھی باہر آ گئے اور اُس ہجوم میں شامل ہو گئے جو چبوترے کے سامنے جمع تھا۔

درویش اندھیری راہداری میں جاتے جاتے رُک گیا۔ ایک کمرے کے بند دروازے کی درزوں سے روشنی باہر آ رہی تھی۔ اُس نے ایک درز کے ساتھ آنکھ لگا کر دیکھا۔ کمرہ سجا ہوا تھا۔ فرش پر قالین بچھے ہوئے تھے۔ گاؤ تکیے بھی تھے اور رنگ برنگے فانوس جل رہے

تھے۔ پانچ چھ لڑکیاں نیم برہنہ حالت میں اچھل کود رہی تھیں۔ دو آدمی تکیوں سے لگے بیٹھے تھے۔ اُن کے آگے صراحی اور پیالے تھے جن میں شراب ہی ہو سکتی تھی۔ وہ لپک کر کسی لڑکی کو بازو سے پکڑتے اور گھسیٹ کر اپنے اوپر گرا لیتے تھے۔ لڑکی کو بالکل برہنہ کر کے چھیڑ چھاڑ کرتے اور قہقہے لگاتے تھے۔

درویش وہاں سے آگے چلا گیا۔ ایک کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور اندر روشنی بھی تھی۔ درویش وہاں جا رکا۔ اندر کوئی نہیں تھا صرف ایک دیا جل رہا تھا۔ وہ اندر چلا گیا۔ ایک کونے میں فرش کے نیچے سیڑھیاں جاتی تھیں۔ نیچے تہ خانہ ہو سکتا تھا یا یہ سرنگ کا دہانہ تھا۔ وہ سیڑھیاں اُترنے لگا۔ یہ چار پانچ سیڑھیاں تھیں جو پرانے زمانے کی نہیں تھیں، نئی بنائی گئی تھیں۔ سرنگ اتنی کھلی تھی کہ اس میں اچھے قد کا آدمی چل سکتا تھا۔ وہ چلتا گیا۔ کہیں کہیں ایک دیا رکھا تھا۔

وہ آگے دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ اُسے معلوم نہ ہو سکا کہ ایک آدمی خنجر ہاتھ میں لیے اُس کے پیچھے تین چار قدم دُور رہ گیا ہے۔ خنجر والا دبے پاؤں اُس کے پیچھے جا رہا تھا۔ اُس نے درویش پر وار کرنے کے لیے خنجر والا ہاتھ دائیں کو زور سے کیا۔ وہ درویش کے پہلو میں خنجر گھونپنا چاہتا تھا مگر اُسے خیال نہ رہا کہ سرنگ اتنی چوڑی نہیں کہ بازو پورا گھما سکتا۔ اُس کا ہاتھ سرنگ کی دیوار سے ٹکرا گیا۔ آواز پیدا ہوئی تو درویش تیزی سے گھوما۔ خنجر والا خنجر پر گرفت مضبوط کر رہا تھا۔ درویش نے بجلی کی پھرتی سے اپنی نیام میں سے خنجر نکالا اور وار کیا۔ اُدھر وہ بھی وار کر چکا تھا۔ دونوں کے خنجروں والے بازو ٹکرائے۔ درویش نے اُس آدمی کے پیٹ میں بایاں گھونسہ مارا۔ وہ دوہرا ہو گیا۔ درویش نے نیچے سے وار کیا اور خنجر اس آدمی کے دل میں اُتار دیا۔ اس آدمی نے گرتے گرتے کسی کو پکارا۔

درویش وہاں سے دوڑ پڑا اور سرنگ کے دہانے پر آ گیا۔ سیڑھیاں چڑھ آیا۔ دوڑتا ہوا کمرے سے نکل رہا تھا کہ تین چار آدمی تیز دوڑتے آئے۔ انہوں نے مرنے والے کی پکار سن لی تھی۔ درویش اُن سے ٹکرا گیا لیکن حاضر دماغ تھا۔ گھبراہٹ کے لہجے میں بولا "نیچے جاؤ۔ دوڑ کر پہنچو، میں آتا ہوں"۔ وہ سب سرنگ کی طرف دوڑ پڑے اور درویش

باہر نکل گیا۔ اُس نے خون آلود خنجر ناف میں اڑس لیا تھا۔ باہر جا کر وہ لوگوں کے ہجوم میں شامل ہو گیا اور سر پر چادر ڈال لی۔

لوگوں کی نظریں چبوترے پر لگی ہوئی تھیں جہاں شاہانہ مسند پڑی تھی۔ روشنی کم تھی۔ درویش نے اپنے ساتھیوں کو تلاش کر کے انہیں بتایا کہ اُس نے اندر جا کر کیا دیکھا اور وہ کیا کر آیا ہے۔ ساتھیوں نے اُسے کہا کہ وہ وہاں نہ رُکے ورنہ پکڑا جائے گا۔ وہ چلا گیا۔ کچھ دیر بعد نقارے اور نفیریں بجنے لگے۔ یہ داؤد بن نصر کی آمد کا اعلان تھا۔ وہ حویلی کے کسی اور حصے میں چلا گیا۔ چبوترے پر ایک آدمی نے بلند آواز سے اعلان کیا — "والیٔ ملتان، قرامطی پیغمبر ابو الفتح داؤد بن نصر بن شیخ حمید قرامطی جن کے قبضے میں ارواح اور جنات ہیں، جو سچے اسلام کے علمبردار اور پیغمبر ہیں، تشریف لاتے ہیں۔ سب پر لازم ہے کہ سب سر جھکا لیں"۔

نقارے اور نفیریں بجتے رہے اور ایک وجیہہ آدمی جس کے سر پر تاج تھا، چبوترے پر آیا۔ تمام لوگوں نے سر اس طرح جھکا لیے جیسے سجدے میں چلے گئے ہوں۔ چوبدار نے اعلان کیا کہ صدیوں سے یہ حویلی بدروحوں اور جنات کا مسکن بنی رہی تھی۔ یہ ہر روز ایک انسان یا ایک جانور کا خون پیتے تھے۔ سچے مذہب کے پیغمبر نے اپنی خاص کرامات اور خدائی طاقت سے ارواح اور جنات کو اپنے تابع کر لیا ہے۔ قرامطی پیغمبر کا حکم ہے کہ تم لوگوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت نہ کی تو یہ ارواح اور جنات تم سب کو پریشان کرتے رہیں گے۔

یہ اعلان ایسے جذباتی اور سنسنی خیز انداز سے کیا گیا کہ لوگوں پر سناٹا طاری ہو گیا۔ اس کے بعد رباب کی قسم کے کسی ساز کی دھیمی دھیمی آواز آنے لگی۔ اس کے ساتھ چند اور سازوں کا ترنم سنائی دینے لگا۔ یہ سب تاروں والے ساز تھے۔ داؤد بن نصر مسند سے اُٹھا اور پیٹھ لوگوں کی طرف کر لی۔ اُس نے بازو پھیلا کر اُوپر کیے اور ترنم سے کچھ بڑبڑایا۔ برآمدے میں اندھیرا تھا۔ وہاں سے پیلے شعلہ اُٹھا، پھر دُھواں پھیلنے لگا۔ داؤد نے بلند آواز سے کہا — "خدائے ذوالجلال! جن و انس کے پیدا کرنے والے خدا! مجھے اپنی خدائی قوت عطا کر کہ تیری مخلوق کو ان بدروحوں اور جنات سے جو آزاد ہیں، اُسے محفوظ کر دوں" — اُس نے دھماکے کی سی آواز میں کہا — "آجاؤ میرے سامنے"۔

دُھواں چبوترے تک آ گیا تھا۔ دُھواں کم ہونے لگا اور اس میں سے چار نوجوان لڑکیاں نمودار ہوئیں۔ وہ بہت ہی خوبصورت اور گورے رنگ کی لڑکیاں تھیں۔ اُن کے لباس ریشمی اور چمکدار تھے۔ سازوں کا ترنم اور زیادہ پُرسوز اور بلند ہو گیا۔ اُن کے ساتھ گھنگھرو بج رہے تھے۔ لڑکیوں نے داؤد بن نصر کے آگے سجدہ کیا۔ داؤد نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ دُھواں چھٹا تو لڑکیاں غائب تھیں اور وہاں بونے سے پانچ چھ انسان کھڑے تھے۔ سر سے پاؤں تک اُن کے جسم سیاہ تھے۔ اُن کے دانت لمبے اور سر پر نئے چاند کی شکل کے سینگ تھے۔ وہ بے ہنگم سا ناچ ناچنے لگے۔ اعلان ہوا کہ یہ جنات ہیں۔ انہی کے رنگ کا ایک قوی ہیکل آدمی آیا جس کے ہاتھ میں کوڑا تھا۔ اُس نے ان بونوں کو جن کے قد تین ساڑھے تین فٹ سے زیادہ نہیں تھے، پیٹنا شروع کر دیا۔ بونوں نے ایسا واویلا بپا کیا کہ لوگوں پر دہشت طاری ہو گئی۔

داؤد بن نصر کے حکم سے کوڑا زنی روک دی گئی۔ جنات نے مل کر ایک آواز میں کہا۔

"ہم یہاں سے جا رہے ہیں۔ اب ہم داؤد بن نصر کے مرید ہیں اور ہم جو غیب کے بھید جانتے ہیں، حلفیہ کہتے ہیں کہ داؤد بن نصر خدا کا پیغمبر اور ایلچی ہے"۔

دُھواں پھر پھیلا اور جب دُھواں چھٹا تو وہاں نہ داؤد بن نصر تھا، نہ اُس کے جنات۔ چبوترہ خالی تھا۔ اعلان ہوا کہ قرامطی پیغمبر خدا کے حضور تشریف لے گئے ہیں۔ اب نئے چاند کی رات اسی جگہ نمودار ہوں گے۔

"یہ سب اس سرنگ کا کمال ہے جس کے اندر میں ایک آدمی کو قتل کر آیا ہوں" — درویش اپنے ساتھیوں سے اُسی حویلی کے ایک کمرے میں بیٹھا کہہ رہا تھا جس میں وہ دن کو بیٹھے سوچ رہے تھے کہ اس فتنے کو کس طرح ختم کیا جائے۔ اُس نے کہا — "جن لڑکیوں اور جنات کے متعلق تم بتا رہے ہو کہ دھوئیں میں سے نمودار ہوئے تھے، اُن لڑکیوں کو میں نے ایک بند کمرے کے دروازے کی درزوں سے دیکھا تھا۔ سرنگ تازہ کھودی ہوئی ہے۔ میں آخر تک نہ جا سکا۔ یہ باہر والے چبوترے کے

قریب جا نکلتی ہے۔ دُھواں سرنگ میں سے چھوڑا جاتا ہوگا اور لڑکیاں سرنگ میں یا چبوترے پر جاتی اور واپس آتی ہوں گی۔"

"ہمیں پہلے ہی شک تھا کہ بدروحوں اور جنات کا کم از کم اس حویلی میں کوئی وجود نہیں۔" عالم نے کہا۔ "اب آپ اتفاق سے دیکھ آئے ہیں کہ یہ سرنگ اور دھوئیں کا کمال ہے اور سیدھے سادے لوگوں کو قرامطی فرقے میں شامل کرنے کے لیے یہ ڈھونگ رچایا جا رہا ہے۔ لوگ اس باطل فرقے میں شامل ہو رہے ہیں۔ سوچنا یہ ہے کہ اس فرقے کو ختم کس طرح کیا جائے اور لوگوں کو کس طرح بتایا جائے کہ یہ ڈھونگ ہے۔"

وہ اس سوچ بچار میں اُلجھے ہوئے تھے کہ حویلی کے دروازے پر دستک ہوئی۔ حویلی کا مالک باہر گیا۔ باقی تمام آدمی وہاں سے بھاگ جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ خطرے کی صورت میں حویلی کے مالک کو دروازہ کھولتے ہی کھانسنا تھا۔ اُس کی کھانسی کی بجائے اُس کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ وہ کمرے میں آیا تو اُس کے ساتھ ایک اور آدمی تھا جسے یہ سب جانتے تھے۔ وہ بھی انہی کے گروہ کا جانباز تھا۔

"اگر یہ خبر صحیح ہے جو میں سن کر آیا ہوں تو خدا نے قرامطی فرقے کے خاتمے کا انتظام کر دیا ہے۔" اُس آدمی نے کہا۔ "بھیرہ سے کچھ لوگ آئے ہیں۔ انہوں نے بتلایا ہے کہ بھیرہ کی ریاست پر سلطان محمود نے قبضہ کر لیا ہے اور بھیرہ کے راجہ بجی رائے نے خودکشی کر لی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ تین دن تک اتنی خونریز لڑائی ہوئی ہے کہ نہ غزنی کی فوج کا کچھ بچا ہے، نہ بھیرہ کی فوج کا۔ غزنی کے سلطان محمود نے حکم دیا ہے کہ بھیرہ میں سے وہاں کا کوئی باشندہ کہیں باہر نہیں جا سکتا۔ یہ معلوم نہیں کہ محمود ملتان پر بھی حملہ کرے گا یا نہیں۔ اس وقت اُس کی فوج بہت کم ہے۔ کمک آتے بہت وقت لگے گا۔"

سب گہری سوچ میں کھو گئے۔ کچھ دیر بعد عالم نے کہا۔ "ہم بادشاہی سے ٹکر نہیں لے سکتے۔ ہم یہی کر سکتے ہیں جو ہمارے درویش دوست نے کیا ہے کہ قرامطیوں کے اندرونی حلقے کے آدمیوں کو ایسے طریقے سے قتل کرتے رہیں کہ کوئی ہمارا سراغ نہ پا سکے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ دو چار جانباز تیار کیے جائیں جو داؤد بن نصر کو قتل کر دیں۔ اگر یہ شخص قتل

ہو جائے تو یہ فرقہ مر سکتا ہے۔ تیسرا طریقہ یہ ہے کہ ہم دو چار آدمی بھیرہ چلیں اور اگر سلطان محمود واقعی وہاں آگیا ہے تو اُس کے حضور عرض کریں کہ اگر تم یہاں اسلام کے فروغ کے لیے آئے ہو تو پہلے ملتان آؤ اور اس فرقے کو ختم کرو جو اسلام کے لیے بہت بڑا خطرہ بنا ہوا ہے۔"

سب اس تجویز پر متفق ہو گئے اور انہوں نے طے کیا کہ عالم اور درویش دو آدمیوں کو ساتھ لے کر صبح بھیرہ کے لیے روانہ ہو جائیں۔

جس وقت ان لوگوں کو وہ آدمی بھیرہ میں سلطان محمود کی آمد اور لڑائی کی خبر سنا رہا تھا، اُس وقت داؤد بن نصر کو بھی یہی خبر سنائی جا رہی تھی۔ اُس وقت وہ اپنے ان آدمیوں کو جو چار کنواریوں کی حویلی میں کام اور شعبدہ بازی کرتے تھے، اپنے سامنے کھڑا کیے ہوئے تھا۔ وہ اس قدر غصے میں تھا کہ شراب کا نشہ بھی اُتر گیا تھا۔ وہ ان سے ایک ہی سوال کا جواب مانگ رہا تھا۔ "اُس آدمی کو کس نے قتل کیا ہے؟"

اُسے بتایا جا رہا تھا کہ ایک آدمی سرنگ والے کمرے میں سے دوڑتا باہر نکلا۔ وہ ان چار پانچ آدمیوں کے ساتھ ٹکرایا جو سرنگ میں سے مقتول کی پکار پر دوڑے آئے تھے۔ اس آدمی نے انہیں کہا۔ "پیچھے جاؤ، دوڑ کر پہنچو، میں آتا ہوں۔" اس آدمی کی داڑھی تھی۔ چہرہ کسی کو یاد نہیں تھا۔ داؤد بن نصر ان کی یہ بات مان نہیں رہا تھا۔ کہتا تھا کہ تم میں سے کسی نے کسی لڑکی کے چکر میں آ کر اپنے ساتھی کو قتل کر دیا ہے۔ یہ سب آدمی اُس کے پاؤں میں لیٹ لیٹ جاتے تھے، اور داؤد گرج رہا تھا۔

اس دوران اُس کے سالار نے اندر آ کر کہا کہ بھیرہ سے بڑی بُری خبر آئی ہے۔ ایک آدمی کو اندر لایا گیا۔ وہ بھیرہ سے آیا تھا۔ اُس نے داؤد بن نصر کو وہی خبر سنائی جو حویلی میں ایک آدمی عالم، درویش اور ان کے ساتھیوں کو سنا رہا تھا۔

"ان سب کو قید میں ڈال دو۔" داؤد بن نصر نے حکم دیا۔ "انہیں کھانے پینے کے لیے کچھ نہ دو۔ پھر بھی کچھ نہ بتائیں تو انہیں شکنجے میں ڈال دو۔"

انہیں لے گئے تو داؤد بن نصر نے اپنے سالار سے کہا۔ "اگر محمود بھیرہ پر قابض ہو

گیا ہے۔ تو بہت برا ہوا ہے۔ صبح فوج کے کچھ آدمی تاجروں کے بھیس میں بھیرہ روانہ کرو۔ وہ اچھی طرح دیکھ کر آئیں کہ محمود کے پاس کتنی فوج ہے۔ اگر اس کے پاس ملتان پر حملہ کرنے کے لیے فوج کم ہے تو ہم مہاراجہ آنند پال کو پیغام بھیجیں گے کہ بھیرہ پر حملہ کر دے۔"

صبح کے وقت چھوٹے چھوٹے دو قافلے ملتان سے نکلے۔ دونوں کا رخ بھیرہ کی طرف تھا۔ ایک قافلے میں عالم، درویش اور ان کے ساتھ تین آدمی تھے۔ دوسرے قافلے میں ملتان کی فوج کے چھ آدمی تاجروں کے بھیس میں تھے۔ ان کے کمانڈر نے دوسرے قافلے کو دیکھا تو بولا۔ "وہ لوگ بھی ادھر ہی جا رہے ہیں۔ چلو ان کے ساتھ مل جاتے ہیں۔"

حق جب باطل کے نرغے میں آیا

داؤد بن نصر نے اپنے سالار کو حکم دے کر فوج کے جو چھ آدمی ملتان سے بھیرہ یہ معلوم کرنے کے لیے روانہ کیے تھے کہ یہ اطلاع لائیں کہ سلطان محمود غزنوی کے پاس کتنی فوج ہے، اور کیا وہ فوری طور پر ملتان پر حملہ کرنے کے قابل ہے یا نہیں، وہ چھ آدمی معمولی قسم کے فوجی نہیں تھے۔ وہ سب کمانداری کے عہدے کے ذہین اور تجربہ کار فوجی تھے۔ جاسوسی اور سراغرسانی کی مہارت بھی رکھتے تھے۔ بھیرہ سے مطلوبہ اطلاع وہی لا سکتے تھے۔ وہ تھے تو مسلمان لیکن عقیدے کے کٹر قرامطی تھے۔

انہوں نے تاجروں کے بھیس میں بھیرہ کو جاتے ہوئے ملتان سے کچھ دور عالم، درویش اور ان کے تین ساتھیوں کو اسی سمت جاتے دیکھا جدھر وہ خود جا رہے تھے تو وہ ان سے جا ملے کہ دونوں قافلوں کا ایک قافلہ بن جائے اور ہو سکتا ہے ان لوگوں سے کام کی کوئی خبر مل جائے۔ ملتان کے ان فوجیوں کے پاس چھ گھوڑے تھے جن پر وہ سوار تھے اور تین اونٹ تھے جن پر سامان لدا ہوا تھا۔ عالم اور درویش کے پاس گھوڑے تھے اور ان کے تین ساتھی تین اونٹوں پر سوار تھے۔ یہ کٹر اہل سنت مسلمان تھے جو بھیرہ سلطان محمود غزنوی سے کہنے جا رہے تھے کہ وہ ملتان کو مسلمان ریاست نہ سمجھے اور فوراً حملہ کرے کیونکہ یہاں قرامطی فرقہ اسلام کا چہرہ مسخ کر رہا تھا۔

دونوں قافلوں میں سلام دعا ہوئی لیکن اپنے اپنے تعارف میں دونوں محتاط تھے۔ عالم نے اپنے اور اپنے ساتھیوں کے متعلق بتایا کہ ملتان کے دکاندار ہیں اور بھیرہ کچھ سامان لے جا رہے ہیں۔ اس کے بدلے وہ وہاں سے سامان لائیں گے۔ قرامطیوں نے اپنے متعلق بتایا کہ وہ لاہور کے تاجر ہیں، ملتان آئے تھے اور بھیرہ جا رہے ہیں۔ وہاں سے

"ہم ... چلے جائیں گے۔"

"اگر آپ لوگ ملتان کے رہنے والے ہیں تو آپ قرامطی مسلمان ہوں گے"۔۔۔ ایک قرامطی فوجی نے پوچھا۔

"نہیں"۔۔۔ درویش نے جواب دیا۔ "ہم پکے مسلمان ہیں۔ قرامطی فرقے کو ہم مسلمان نہیں سمجھتے ..... آپ لوگ یقیناً سنی مسلمان ہوں گے۔ قرامطی صرف ملتان میں ہیں۔"

"ہمارا اس فرقے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں"۔۔۔ قرامطی فوجیوں کے کمانڈر نے جھوٹ بولا۔ "ہم آپ کی طرح سنی مسلمان ہیں ... کیا یہ صحیح ہے کہ غزنی کے سلطان محمود نے بھیرہ پر قبضہ کر لیا ہے اور وہاں کے راجہ بجی رائے نے خودکشی کر لی ہے؟"۔۔۔ ان فوجیوں کو سب کچھ معلوم تھا۔

"سنا تو یہی ہے"۔۔۔ عالم نے کہا۔ "اگر یہ خبر صحیح ہے تو ہم اور آپ کو خوش ہونا چاہیئے کہ محمد بن قاسم کے بعد کسی مسلمان سلطان نے ہندوستان کا رُخ کیا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس ملک میں کس تیزی سے ہندو مذہب اسلام پر غالب آ رہا ہے۔"

"ہم بہت خوش ہیں"۔۔۔ قرامطی کمانڈر نے کہا۔ "ہم کو چاہتے ہیں کہ لاہور پر بھی سلطان محمود قبضہ کرے۔ اس ملک کو اسلامی ملک بننا چاہیئے۔"

"لاہور سے پہلے سلطان محمود ملتان پر قبضہ کرے تو زیادہ بہتر ہو گا"۔۔۔ درویش نے کہا۔ "سب سے زیادہ خطرناک فتنہ وہ ہوتا ہے جو اپنے اندر سے اٹھتا ہے۔ آپ کو شاید معلوم ہو گا کہ ملتان کا حاکم داؤد بن نصر عیسائیوں اور ہندوؤں کا آلۂ کار ہے اور وہ اسلام کا نقاب چڑھا کر اسلام کی بیخ کنی کر رہا ہے۔"

"معلوم نہیں سلطان محمود کو داؤد بن نصر کی اصلیت کا علم ہے یا نہیں"۔۔۔ قرامطی کمانڈر نے کہا۔ "سلطان دھوکے میں نہ ہو۔"

"سلطان کو حقیقت کا علم ہونا چاہیئے"۔۔۔ عالم نے کہا۔

"کیا یہ ہمارا فرض نہیں کہ ہم اتفاق سے بھیرہ جا رہے ہیں، ہم سلطان محمود کو بتائیں کہ وہ داؤد بن نصر کو اپنا دوست نہ سمجھے؟"۔۔۔ قرامطی کمانڈر نے کہا۔

"کیوں نہیں!"۔۔۔ درویش نے کہا۔ "ہمیں یہ فرض ادا کرنا چاہیئے۔"

وہ چلے جا رہے تھے۔ عالم اور درویش یہ نہیں بتانا چاہتے تھے کہ وہ سلطان محمود کے پاس ہی جا رہے ہیں۔ قرامطیوں کو ان پر ایسا شک بھی نہیں تھا۔ قرامطی زیادہ ذہین اور چالاک تھے۔ وہ بھی اپنی اصلیت بے نقاب نہیں کر سکتے تھے لیکن انہوں نے عالم اور درویش کے ساتھ ایسی باتیں شروع کر دی تھیں جو عالم اور اس کے ساتھیوں کا ایمان تھا۔ وہ ان قرامطیوں کو فی الواقع تاجر اور اپنا ہم خیال سمجھ بیٹھے۔ وہ تمام راہ اسی موضوع پر باتیں کرتے رہے۔

سورج غروب ہونے سے پہلے انہوں نے دریائے راوی پار کر لیا۔ یہ مقام ملتان سے بہت دُور تھا جہاں دریا کا پاٹ چوڑا اور پانی کم گہرا تھا۔ پار جا کر انہوں نے پڑاؤ کیا۔ دونوں قافلوں کے پاس کھانے کے لیے جو کچھ تھا، وہ انہوں نے سامنے رکھ دیا۔ قرامطی کمانڈر گھوڑے کی زین اُتار رہا تھا۔ اس کے ساتھ اس کا ایک ساتھی تھا۔ کمانڈر نے ساتھی سے کہا۔۔۔ "یہ لوگ گھٹے تو دو کا ندار ہی ہیں لیکن ان کی بعض باتوں سے مجھے شک ہوتا ہے کہ یہ ہمارے خلاف کوئی فتنہ پیدا کرنے بھیرہ جا رہے ہیں۔ ہمیں کوشش کرنی چاہیئے کہ ان کے دلوں پر پوری طرح قبضہ کر لیں۔ یہ دو آدمی جو ہمارے ساتھ باتیں کرتے رہے ہیں علم و فضل والے معلوم ہوتے ہیں۔ اگر یہ ہمارے خلاف یعنی ملتان کی قرامطی ریاست کے خلاف کوئی کاروائی کرنے نہیں جا رہے تو بھی ہمیں چاہیئے کہ انہیں اپنے ساتھ رکھیں۔ یہ دو آدمی عالم ہیں۔ ان کے ساتھ رہ کر بھیرہ کے لوگ ہمارا بھی احترام کریں گے۔"

"پھر آج رات ہم شراب نہیں نکالیں گے"۔۔۔ قرامطی کمانڈر کے ساتھی نے کہا۔۔۔ "تا کہ یہ لوگ ہمیں مومن قسم کے مسلمان سمجھتے رہیں۔ یہ بوڑھا عالم بہت اچھی باتیں کرتا ہے۔ اسے ہم اکسائیں گے کہ سلطان محمود سے ملے۔ ہم میں سے کوئی اس کے ساتھ چلا جائے گا۔ سلطان کی نیت اور ارادے کا علم ہو جائے گا۔"

کھانے کے دوران قرامطی کمانڈر نے اسی موضوع کو جاری رکھا جس پر وہ سارا دن تبادلۂ خیالات کرتے آئے تھے۔ عالم اور درویش تربیت یافتہ جاسوس نہیں تھے۔ یہ تو اُن کا جذبہ تھا جو انہیں اسلام کی پاسبانی کے لیے اُکساتا رہتا تھا۔ وہ قرامطیوں کو اپنی طرح

اسلام اور سلطان محمود کے بہی خواہ سمجھ بیٹھے۔ بات سے بات نکلی تو قرامطی فرقے کے متعلق باتیں ہونے لگیں۔

"ہم اس فرقے کو جھوٹا مانتے ہیں" — قرامطی کمانڈر نے کہا — "لیکن ملتان میں رہ کر ہم جیسے بھی ملے وہ داؤد بن نصر کا پیروکار نکلا۔ وہاں چار کنواریوں کی حویلی کے چرچے سے تو کل ہی ہم بھی لوگوں کے ساتھ اُس حویلی میں چلے گئے۔ ہم نے جنات کو دیکھا جنہیں داؤد نے حاضر کیا تھا، پھر ہم نے چار کنواریوں کو بھی دھوئیں میں سے نمودار ہوتے اور دھوئیں میں ہی غائب ہوتے دیکھا۔ ہم تو اسے معجزہ سمجھتے ہیں۔ داؤد کے ہاتھ میں کوئی طاقت ضرور ہے"۔

"جہاں سے یہ جنات اور چار کنواریاں نکلی تھیں، وہاں سے آپ نے ایک لاش نکلتی نہیں دیکھی"۔ درویش نے قرامطیوں کی باتوں سے متاثر ہو کر راز اُگل دیا۔

"لاش؟" — قرامطی کمانڈر نے حیران ہو کر پوچھا — "کس کی لاش؟"

"داؤد کے ایک خاص آدمی کی لاش" — درویش نے کہا — "دھوئیں میں سے نمودار ہونے والے جنات اور چار کنواریوں کی اصل حقیقت کو میں نے قریب سے دیکھا ہے"۔

"خدا کے لیے ہمیں بتاؤ یہ راز کیا ہے؟" — قرامطی کمانڈر نے اشتیاق اور حیرت سے پوچھا — "ہم میں سے کوئی بھی تسلیم نہیں کر سکتا کہ ایک باطل فرقے کے کسی آدمی میں اتنی طاقت ہو سکتی ہے کہ وہ جنات اور ارواح کو حاضر کر سکے۔ ہم تو داؤد کا یہ کمال دیکھ کر اس کے ہاتھ پر بیعت کرنے لگے تھے۔ ہمارے دلوں کو شکوک سے پاک کرو۔ یہ آپ کی نیکی ہوگی"۔

درویش نے من و عن سنا دیا کہ وہ کس طرح حویلی کے اندر اُس سرنگ میں داخل ہو گیا تھا جس میں سے چار لڑکیاں گزر کر دھوئیں میں جاتی اور لوگ انہیں دھوئیں میں سے نمودار ہوتا دیکھتے تھے۔ درویش نے بتایا کہ اُس نے یہ لڑکیاں ایک کمرے میں دیکھی تھیں۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ کس طرح سرنگ میں ایک آدمی کو دیکھا۔ اُس سے بچنے کے لیے درویش نے اُسے قتل کر دیا اور سرنگ سے نکل آیا۔

قرامطی کمانڈر اور اُس کے ساتھیوں نے درویش کو دل کھول کر خراج تحسین پیش کیا۔ ان قرامطیوں کو معلوم تھا کہ داؤد بن نصر اُس آدمی کے قاتل کو ڈھونڈ رہا ہے اور

اُس نے حویلی میں کام کرنے والے آدمیوں کو قید خانے کی اذیتوں میں ڈال رکھا ہے۔

کچھ دیر اور باتیں کر کے وہ سونے کی تیاری کرنے لگے۔ قرامطی کمانڈر اب درویش میں بہت دلچسپی لے رہا تھا۔ سونے کی جگہیں دیکھنے لگے تو قرامطی کمانڈر نے درویش سے کہا کہ وہ اُس کے قریب سوئے۔ وہ عقیدت کا اظہار کر رہا تھا۔ اُس نے سب سے الگ ایک جگہ دیکھی اور وہاں اپنا اور درویش کا بستر بچھا دیا۔ دن بھر کی مسافت کے تھکے ہوئے لیٹتے ہی سب سو گئے۔

آدھی رات کے قریب درویش کی آنکھ کھل گئی۔ اُس نے بولنا چاہا مگر بول نہ سکا۔ اس کے منہ پر کپڑا بندھا ہوا تھا۔ دو آدمی اس کے پاؤں رسیوں سے جکڑ رہے تھے۔ وہ اٹھا تو دو آدمیوں نے اُس کے دونوں ہاتھ پیٹھ پیچھے باندھ دیئے۔ اُسے اُٹھا کر ایک اونٹ پر ڈال دیا گیا اور اُسے اونٹ کے ساتھ باندھ دیا گیا۔ اونٹ اٹھا۔ اس کی مہار ایک گھوڑے کے پیچھے باندھ دی گئی۔ گھوڑا چل پڑا۔ اس کے ساتھ ایک اور گھوڑا چلا۔

درویش کے ساتھی اُس سے دُور گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ اونٹ اور دو گھوڑ سوار واپس ملتان کو چلے جا رہے تھے۔ قرامطیوں کو اپنے خاص آدمی کا قاتل مل گیا تھا۔ انہیں داؤد سے انعام کی توقع تھی۔

صبح سب سے پہلے عالم کی آنکھ کھلی۔ اذان کا وقت ہو رہا تھا۔ وہ درویش کو جگانے گیا تو اُس کا بستر خالی تھا۔ قرامطی جاگ اٹھا۔ عالم کا خیال تھا کہ درویش وضو کرنے دریا پر چلا گیا ہوگا۔ قرامطی کمانڈر گھوڑوں اور اونٹوں کی طرف گیا اور تھوڑی ہی دیر بعد قرامطیوں نے واویلا بپا کر دیا کہ ان کا ایک اونٹ اور دو گھوڑے اور ان کے دو ساتھی غائب ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ان کا قیمتی سامان بھی چوری ہو گیا ہے۔

"چلو... اِدھر اُدھر دیکھو... وہ دور نہیں گئے ہوں گے"۔ گھوڑوں پر زینیں ڈالی جانے لگیں۔ اونٹوں پر سامان رکھا جانے لگا۔ تب عالم نے کہا — "ہمارا درویش ساتھی بھی غیر حاضر ہے"۔

"یہ اُسی کی کارستانی ہے" — قرامطی کمانڈر نے کہا — "اُس نے بڑی دلیری سے سرنگ کے

اندر جاکر ایک آدمی کو قتل کیا ہے۔ میں اسے درویش سمجھتا رہا لیکن وہ پیشہ ور ڈاکو اور قاتل ہے۔ وہ ہمارے آدمیوں کو ورغلا کر لے گیا ہے۔"

"ان کا تعاقب بیکار ہے" — ایک قراملی نے کہا — "معلوم نہیں وہ کس طرف گئے ہیں اور یہاں سے کس وقت بھاگے ہیں۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو" — قراملی کمانڈر نے کہا — "ہمیں اس بیابان میں مارے مارے نہیں پھرنا چاہیے۔ اب وہ ہمارے ہاتھ نہیں آئیں گے۔"

عالم چپ چاپ کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ تین آدمی بھی حیران و پریشان کھڑے دیکھ رہے تھے کہ یہ کیا ہو گیا ہے اور کیا ہو رہا ہے۔ درویش کو وہ اچھی طرح جانتے تھے۔ وہ صحیح معنوں میں درویش اور مردِ مومن تھا۔ اس کی فطرت میں یہ تھا ہی نہیں کہ قیمتی مال کے لالچ میں آجاتا۔ اس کی جوانی اسلام کی پاسبانی اور زمین دوز جہاد میں گزر گئی تھی۔ جب سے اس نے سنا تھا کہ سلطان محمود غزنوی ہندوستان میں آگیا ہے، اس کے چہرے پر رونق آگئی تھی اور اس نے کہا تھا کہ ہماری منزل خود چل کر ہمارے پاس آگئی ہے۔

"مجھے تم لوگ بھی رہزن لگتے ہو" — قراملی کمانڈر نے عالم سے کہا۔

"اگر ہم رہزن ہوتے تو ہم میں سے کوئی بھی یہاں نہ ہوتا" — عالم نے کہا — "اور یہاں تمہاری لاشیں پڑی ہوئی ہوتیں۔"

"پھر یہ سب کیا ہے؟"

"آدمی تمہارے غائب ہوئے ہیں" — عالم نے کہا — "اگر تم لوگ میری بات پر غور کرو تو میں بتاتا ہوں... تمہارے آدمی جو لاپتہ ہوئے ہیں، وہ رات سامان چرا کر جانے کے لیے باندھ رہے ہوں گے۔ درویش نے انہیں دیکھ لیا ہوگا اور ان کے پاس جا کر پوچھا ہوگا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ تمہارے آدمیوں نے اس ڈر سے کہ پکڑے جائیں گے، درویش کو سر پر چوٹ لگا کر یا کسی طرح بے ہوش کیا اور اسے اونٹ یا گھوڑے پر ڈال کر ساتھ ہی لے گئے ہوں گے۔ وہ ان کے ہاتھوں قتل ہو چکا ہوگا اور اس کی لاش دریا میں بہا دی گئی ہوگی۔"

قراملیوں کو تو معلوم تھا کہ ان کے دو ساتھی اور درویش کہاں گئے ہیں۔ عالم اور اس

کے ساتھی پریشان ہو رہے تھے۔ قراملی اب یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ درویش کے یہ جو ساتھی ہیں اس کی زمین دوز سرگرمیوں میں شریک ہیں؟ قراملی کمانڈر نے بہتر سمجھا کہ عالم اور اس کے ساتھیوں کو ناراض نہ کیا جائے ورنہ ان سے کوئی راز نہیں لیا جا سکے گا۔

دونوں قافلے پہلے کی طرح بھیرہ کی سمت اکٹھے چلے جا رہے تھے۔ قراملی آگے اور عالم اپنے ساتھیوں کے ساتھ پیچھے تھا۔

"مجھے یہ لوگ مشکوک نظر آتے ہیں" — عالم نے اپنے ساتھیوں سے دھیمی آواز میں کہا — "میں صبح سے انہیں بڑی ہی گہری نظروں سے دیکھ رہا ہوں۔ یہ تاجر معلوم نہیں ہوتے۔ ان کی باتوں کا انداز اور چال ڈھال بتاتی ہے کہ یہ اور کچھ ہو سکتے ہیں، تاجر نہیں ہو سکتے۔ درویش کو انہوں نے خود غائب کیا ہے۔ درویش نے جذبات میں آکر انہیں بتا دیا تھا کہ اس نے سرنگ میں داؤد بن نصر کے ایک آدمی کو قتل کیا تھا۔ انہوں نے درویش کو اغوا کر کے ملتان بھیج دیا ہے۔ مجھے تو یہ جاسوس لگتے ہیں جو بھیرہ یہ دیکھنے جا رہے ہوں گے کہ سلطان محمود کی فوج کتنی ہے اور اس کا ارادہ کیا ہے۔"

"ہمیں محتاط رہنا چاہیے" — عالم کے ایک جوان سال ساتھی نے کہا — "ہمیں یہ ظاہر کرنا چاہیے کہ درویش کے ساتھ ہمارا کوئی گہرا تعلق نہیں۔"

"اگر یہ واقعی جاسوس ہیں تو میں انہیں بھیرہ میں پکڑوا دوں گا" — عالم نے کہا — "ہمیں ان کے ساتھ دوستی اور زیادہ گہری کرنی چاہیے۔"

"یہ تو پتہ چل گیا ہے کہ یہ سب قراملی فرقے اور ہمارے حاکم اور پیرومرشد داؤد بن نصر کے دشمن ہیں" — قراملی کمانڈر اپنے ساتھیوں سے کہہ رہا تھا — "اب ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ ان کی در پردہ سرگرمیاں کیا ہیں۔ انہیں ہم دوست بنائے رکھتے ہیں۔"

سورج جب سر پر آگیا تو قراملی کمانڈر نے جانوروں کو پانی اور چارے کے لیے اور خود بھی کھانا کھانے اور ذرا آرام کے لیے قافلے کو روک لیا۔ کھانے کے دوران قراملی کمانڈر نے عالم سے پوچھا کہ وہ درویش کو کب سے جانتے ہیں۔ عالم نے بتایا کہ وہ اسے اتنا ہی جانتے

ہیں کہ ملتان میں اس کی کمان ہے۔ اُسے پتہ چلا کہ ہم بھیرہ جا رہے ہیں تو وہ ساتھ چل پڑا۔
"کیا آپ لوگوں کو معلوم تھا کہ اُس نے حویلی میں ایک آدمی کو قتل کیا ہے؟"
"اگر پتہ ہوتا تو ہم اسے ساتھ نہ لاتے" عالم نے جواب دیا "اگر اس نے یہ قتل مذہبی جنون کے تحت کیا تھا تو بھی میں اسے پسند نہیں کرتا۔ قتل بہرحال قتل ہے۔ مذہب قتل جیسا جرم بخشا نہیں کرتا۔"

قرامطی کمانڈر نے بہت کوشش کی کہ عالم کے سینے سے کوئی راز نکال سکے۔ اُسے کوئی راز نہ ملا۔ قرامطی کمانڈر اپنے اور اپنے ساتھیوں کے متعلق یہی ظاہر کرتا رہا کہ وہ قرامطی نہیں پکا مسلمان ہے۔

راجوں، مہاراجوں اور سلطانوں کی دُنیا سے دُور جنگل بیابان میں یہ دو قافلے ایک قافلے کی صورت میں چلے جا رہے تھے۔ وہ حق و باطل کے میدانِ جنگ سے بہت دُور تھے لیکن اس جنگ سے لاتعلق نہیں تھے۔ دونوں قافلے بظاہر اکٹھے جا رہے تھے لیکن ان کے درمیان درپردہ حق و باطل کی جنگ جاری تھی۔ دونوں اپنے اپنے عقیدے اور نظریے کے پکے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو شکست دینے کی سوچ رہے تھے۔ عالم کو یقین ہوتا چلا جا رہا تھا کہ اس کے ساتھ کے قافلے والے تاجر نہیں اور یہ قرامطی ہیں۔ عالم کے تین ساتھی جواں سال آدمی تھے اور قرامطی بھی چار تھے۔ عالم سوچ رہا تھا کہ یہ تربیت یافتہ فوجی ہوئے تو ان سے لڑائی ہو جانے کی صورت میں اُس کے تین ساتھی مقابلہ کر سکیں گے یا نہیں۔ عالم خود بوڑھا تھا۔

عالم کو اپنے اللہ پر بھروسہ تھا۔ اُس کے سینے میں اللہ کا ایمان تھا۔ کسی انسان کا ڈر اور خوف نہیں تھا۔ وہ اللہ سے مدد مانگ رہا تھا۔ اُس نے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ یہ لوگ اس کے ساتھ بھیرہ پہنچ جائیں تو انہیں پکڑوا دے گا۔ درویش کے متعلق وہ بہت پریشان تھا۔ اسے یہ ڈر تھا کہ درویش کو اگر واقعی ملتان بھیج دیا گیا ہے تو اُسے بڑی اذیتیں دی جائیں گی۔ درویش کب تک برداشت کرے گا۔ وہ سب کی نشاندہی کر دیگا۔ ان سب کے بیوی بچے اور عزیز و اقارب ملتان میں تھے۔ نشاندہی ہو جانے کی صورت میں وہ جانتے

تھے کہ ان کے بچوں کو بھی غیر انسانی اذیتیں دی جائیں گی۔
اسلام کی پاسبانی ان سے بہت بڑی قربانی مانگ رہی تھی۔ عالم نے اپنے ساتھیوں سے کہا "عزیز بیٹو! ہم جس راستے پر جا رہے ہیں، اس میں ایسے خطرے ہیں جن سے گھبرا کر تم بھاگ جاؤ گے۔ لیکن یاد رکھو کہ جس قوم اور جس مذہب میں بھاگ جانے والے وجود ہوں وہ قوم اپنے مذہب سمیت تاریخ کے اندھیرے میں گم ہو جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے تمہیں اپنی بہنیں اور اپنے چھوٹے چھوٹے بھائی قربان کرنے پڑیں۔ اگر تم نے یہ قربانی خندہ پیشانی سے دے دی تو خدا کی خوشنودی حاصل کر لو گے اور اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤ گے۔
اگر تمہارے دلوں میں کوئی شک ہے تو یہیں سے واپس چلے جاؤ۔"
ان میں سے کوئی بھی واپس نہ گیا۔ تینوں نے یقین دلایا کہ وہ اس کے ساتھ رہیں گے۔
عالم کے پاس علم تھا۔ اس کی نظر قوموں کی تاریخ پر تھی۔ وہ جانتا تھا کہ قوموں کے عروج اور بادشاہوں کی فتح کے پیچھے چند ایک گمنام لوگوں کی قربانیاں کارفرما ہوتی ہیں۔ تاریخ ان لوگوں کو نہیں جانتی کیونکہ تاریخ میدانِ جنگ میں نہیں جاتی اور تاریخ زمین دوز محاذ پر بھی نہیں جایا کرتی۔ ان مجاہدین کو خدا کے سوا کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ یہ عالم بھی خدا کے سامنے جوابدہ تھا۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔ قرامطی کمانڈر رات کے پڑاؤ کے لیے اچھی سی جگہ دیکھ رہا تھا۔ یہ علاقہ سرسبز تھا، چٹانیں تھیں۔ درختوں کا جنگل اور سبزہ تھا۔ ایک جگہ ایک خاندان بیٹھا نظر آیا۔ ایک ادھیڑ عمر آدمی تھا اور دو جوان لڑکیاں تھیں جو بہت خوبصورت تھیں۔ ان کے ساتھ ایک بوڑھی عورت تھی۔ ان کے لباس بتاتے تھے کہ یہ ہندو ہیں۔ لڑکیاں شہزادیاں لگتی تھیں۔ وہاں دو مشعلیں جل رہی تھیں۔
قرامطی کمانڈر نے عالم سے کہا "آپ آگے چلیں۔ کوئی اچھی جگہ نظر آئی تو ہمیں بلا لینا۔ میں بھی کوئی جگہ دیکھتا ہوں۔"
عالم اپنے ساتھیوں کو لے کر آگے نکل گیا۔ اُسے ایک بڑی سرسبز جگہ نظر آئی۔ گھوڑوں اور اونٹوں کے لیے چارہ بھی تھا اور پانی بھی۔ اُس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ یہیں

ڈیرے ڈال دیں۔ قزاملکی کہیں پیچھے رہ گئے تھے۔ عالم نے ان کی پروا نہ کی۔ اسے خیال تھا کہ وہ خود ہی آجائیں گے۔

رات گہری ہوگئی۔ قزاملکی نہ آئے۔ عالم نے ایک مشعل جلا کر اس کا ڈنڈہ زمین میں گاڑ دیا۔ اُسے تھوڑی ہی دُور شور شرابہ سنائی دیا اور دوڑتے قدموں کی آہٹ بھی سنائی دی۔ عالم اور اس کے ساتھیوں نے تلواریں نکال لیں۔ مشعل کی روشنی میں عالم کو دو بوڑھا اور ایک جوان آدمی اپنی طرف آتے نظر آئے جنہیں انہوں نے تھوڑی دور پیچھے ایک جگہ بیٹھے دیکھا تھا۔ ان کے ساتھ ایک عورت اور دو خوبصورت لڑکیاں بھی بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ اب ان کے ساتھ نہیں تھیں۔

عالم اور اس کے ساتھی تلواریں ہاتھوں میں لیے ان کی طرف بڑھے تو وہ آدمی دوسری سمت دوڑ پڑے۔ عالم نے انہیں للکار کر کہا۔ "مت بھاگو۔ ہم تمہاری مدد کریں گے۔ نہیں رکو گے تو گھوڑوں سے تمہارا تعاقب کریں گے اور تمہیں جان سے مار ڈالیں گے۔"

وہ ڈر کے مارے رُک گئے۔ جب عالم اور اس کے ساتھی ان کے قریب گئے تو انہوں نے ہاتھ جوڑ دیئے اور التجا کی کہ ان کی جان بخشی کی جائے۔ عالم نے انہیں بڑی مشکل سے یقین دلایا کہ وہ ان کی مدد کرے گا۔ وہ بتائیں کہ وہ کیوں بھاگے جا رہے ہیں۔

"تمہارے ساتھیوں نے ہم سے دونوں لڑکیاں چھین لی ہیں۔" بوڑھے نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "ہمارے پاس سونے کی ڈلیاں اور بہت سی رقم تھی۔ انہوں نے وہ بھی چھین لی ہے۔"

"لڑکیاں تمہاری کیا لگتی ہیں؟"

"میری بیٹیاں ہیں۔" بوڑھے نے جواب دیا۔ "اور یہ میرا بیٹا ہے۔ ان کی ماں بھی ساتھ ہے۔ ہم بھیرہ سے بھاگ کر آرہے ہیں۔ شہر پر غزنی کے مسلمانوں نے قبضہ کر لیا ہے۔ ہم ہندو ہیں۔"

"کیا غزنی کے مسلمانوں نے تمہارے گھر لوٹے ہیں؟ قتلِ عام کیا ہے؟ تمہاری عورتوں کو بے آبرو کر رہے ہیں؟"

"نہیں۔" بوڑھے نے جواب دیا۔ "ان کے سلطان نے حکم دیا ہے کہ ہندوؤں

کے گھروں کی اور ان کی عزت کی حفاظت کرو۔ لیکن آپ نے ہمارے قریب سے گزرتے میری بیٹیاں دیکھی ہیں۔ وہ بہت خوبصورت ہیں۔ انہیں مسلمان فوجیوں سے بچانے کے لیے ہم بھیرہ سے بھاگ آئے ہیں۔ اب پتہ چلا ہے کہ بھیرہ میں رہتے تو ہماری عزت محفوظ رہتی۔ آپ کے ساتھیوں سے ہمیں کوئی نہیں بچا سکتا۔ آپ بزرگ انسان ہیں۔ وہ چار آدمی ہیں یہ تین آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ میری بیٹیوں پر رحم کریں۔ وہ مر جائیں گی۔ ہمارے پاس جو سونا اور رقم ہے وہ لے لیں ہمیں جانے دیں۔ میری بیٹیوں کو چھوڑ دیں۔"

عالم کو یقین ہو گیا کہ اُس کے ساتھ آنے والے چھ سوار ملتان کے فوجی ہیں اور وہ قزاملکی ہیں۔ ان میں سے دو تو درویش کو ساتھ لے کر جا چکے تھے۔ لڑکیوں کو دیکھ کر قزملکیوں کی نیت بدل گئی اور ان کے سامنے ان کے فرقے کا یہ اصول آ گیا کہ انسان عیش و عشرت کے لیے پیدا ہوا ہے اور گناہ کا کوئی وجود نہیں۔

"کیا تم دونوں خالی ہاتھ ہو؟" عالم نے ہندوؤں سے پوچھا۔

"ہماری تلواریں سامان کے ساتھ پڑی تھیں۔" بوڑھے نے جواب دیا۔ "تمہارے ساتھی ہم پر ٹوٹ پڑے۔ ہمیں تلواریں اٹھانے کا موقع نہ ملا۔ ہم ان کے قدموں میں گر پڑے اور کہا کہ ہمیں قتل نہ کرو۔ انہوں نے ہمیں بہت مارا پیٹا اور بھگا دیا۔ ہم واپس بھیرہ کو بھاگے جا رہے تھے۔"

عالم نے اپنے تین جواں سال ساتھیوں سے کہا۔ "ہمیں ان ہندوؤں پر ثابت کرنا ہے کہ بیٹی اپنے مذہب کی ہو یا کسی کے مذہب کی، اس کی عزت بچانا مسلمان کا فرض ہے.... اور میں یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ اسلام تلوار کے زور سے نہیں پھیلا۔ ہمارے سامنے دو لڑکیوں کی آبرو ریزی ہو رہی ہے ہمیں عملاً ثابت کرنا ہے کہ اس صورتِ حال میں اسلام کا حکم کیا ہے.... میں تم تینوں سے یہ توقع رکھتا ہوں کہ تم ان لڑکیوں کی خاطر اپنی جانیں قربان کر دو گے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

عالم چل پڑا۔ اُس نے اپنے تین ساتھیوں سے کہا کہ جذبات میں آ کر جلد بازی

نہ کریں۔ پہلے دیکھیں گے کہ وہ لوگ کیا کر رہے ہیں۔ وہ تربیت یافتہ فوجی معلوم ہوتے تھے ...... وہ دبے پاؤں بڑھتے گئے۔ وہ جگہ کچھ دُور تھی۔ آگے چٹان آ گئی۔ یہاں زیادہ احتیاط کی ضرورت تھی۔ چٹان سے گھوم کر عالم نے اوٹ سے دیکھا۔ دو مشعلیں جل رہی تھیں جو قرامطیوں نے طرح سیاکر رکھا تھا۔ وہ گھاس پر بیٹھے قہقہے لگا رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں پیالے تھے۔ دونوں لڑکیاں بالکل برہنہ تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں صراحیاں تھیں۔ یہ صراحیاں اور شراب قرامطی اپنے ساتھ لائے تھے۔

لڑکیاں ان کے پیالوں میں شراب ڈالتی تھیں۔ کبھی ایک قرامطی ایک لڑکی کو اپنے اوپر گرا لیتا کبھی دوسرا۔ وہ لڑکیوں کے ساتھ انتہائی بیہودہ چھیڑ خانی کر رہے تھے۔ عالم اور اس کے ساتھی اوٹ سے دیکھتے رہے۔ قرامطی ہنسی مذاق اور چھیڑ خانی میں زیادہ بڑھ گئے تھے۔ قرامطی کمانڈر اٹھا اور اس نے کپڑے اتار دیئے۔ وہ اتنی زیادہ پیئے ہوئے تھا کہ پاؤں پر کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے ایک لڑکی کو بازوؤں میں لیا اور اسے گھاس پر گرا دیا۔

"ٹوٹ پڑو" — عالم نے کہا۔

عالم کے ساتھی اتنی تیزی سے جھپٹے کہ قرامطیوں کو سنبھلنے کا موقعہ نہ ملا۔ شراب نے بھی انہیں مقابلے کے قابل نہیں رہنے دیا تھا۔ قرامطی کمانڈر کی گردن تو عالم کی تلوار کے ایک ہی وار سے الگ جا پڑی۔ جس لڑکی کو اس قرامطی نے نیچے گرا رکھا تھا، وہ چیخ مار کر بیہوش ہو گئی۔ قرامطی کے خون نے اسے نہلا دیا۔ باقی تین کو بھی ختم کر دیا گیا۔

بے ہوش لڑکی کے اوپر پانی پھینکا گیا، تب ہوش میں آئی۔ دونوں سے کہا گیا کہ وہ کپڑے پہن لیں۔ خود فرگی کا یہ عالم تھا کہ ان کے منہ سے بات نہیں نکلتی تھی۔ انہیں ڈر تھا کہ چار وحشیوں سے بچ کر وہ دوسرے چار وحشیوں کے قبضے میں آ گئی ہیں لیکن تھوڑی ہی دیر بعد انہیں پتہ چل گیا کہ یہ وحشی نہیں ہیں۔ عالم نے دونوں ہندوؤں سے کہا کہ وہ ان مرے ہوئے آدمیوں کے سامان پر قبضہ کر لیں اور اسے اپنا سامان سمجھیں۔ ان کے گھوڑے اور اونٹ بھی لے لیں اور ان سے اپنا سونا اور رقم بھی برآمد کر لیں۔

ہندوؤں نے لاشوں کی تلاشی لی تو انہیں اپنا سونا اور رقم مل گئی۔ عالم نے ان سے پوچھا کہ اتنی دولت پاس ہوتے ہوئے وہ پیدل کیوں آئے ہیں۔ کیا وہ گھوڑے یا اونٹ یا بگھیاں خرید نہیں سکتے تھے؟ ہندوؤں نے بتایا کہ بھیرہ سے کسی کو باہر نہیں آنے دے رہے تھے۔ وہ سارا کنبہ ایک ایک فرد چھپ چھپا کر باہر نکلے اور شہر سے دُور آ کر اکٹھے ہوئے تھے۔

"تم ہماری حفاظت میں ہو" — عالم نے انہیں کہا — "کہو تو ہم تمہیں واپس بھیرہ لے چلتے ہیں کہو تو ملتان تک تمہیں اپنی حفاظت میں پہنچا دیتے ہیں"

بوڑھے ہندو نے کچھ سونا اور کچھ رقم عالم کے آگے رکھ کر کہا — "ہم خود ملتان چلے جائیں گے ہمیں گھوڑے اور اونٹ مل گئے ہیں۔ آپ یہ نذرانہ قبول کر لیں"

"کیا تم نے ہمیں کرائے کے قاتل سمجھ لیا ہے؟" — عالم نے غصے سے گرج کر کہا — "اٹھا لو۔ اگر ہم اس کے لالچ میں ہوتے تو تم سنتے کہ ارکی لوگ یہ دولت لے سکتے تھے ...... آج رات آرام کرو ہم تمہاری حفاظت کریں گے۔ اس لڑکی کو چشمے پر لے جاؤ۔ اس کا جسم خون میں ڈوبا ہوا ہے"

ہندوؤں کو ایسے سلوک کی توقع نہیں تھی۔ دونوں لڑکیاں اپنے بھائی کے ساتھ چشمے پر چلی گئیں۔ عالم نے بوڑھے سے پوچھا کہ بھیرہ کے حالات کیسے ہیں۔ بوڑھے نے بتایا کہ بھیرہ کے باہر بڑی خونریز جنگ ہوئی ہے۔ راجہ بجے رائے نے خودکشی کر لی ہے اور دونوں فوجوں کا نقصان اتنا زیادہ ہوا ہے کہ آدھی آدھی لشکری ماری گئی ہے۔ بوڑھے نے یہ بھی بتایا کہ مسلمانوں کی فوج اتنی تھوڑی رہ گئی ہے کہ اگر کسی طرف سے بھیرہ پر حملہ ہو جائے تو سلطان محمود بھیرہ کو اپنے قبضے میں نہیں رکھ سکے گا۔

"حملہ کون کر سکتا ہے؟" — عالم نے پوچھا۔

"راجہ انند پال" — بوڑھے نے کہا — "لیکن سنا ہے کہ انند پال لاہور میں نہیں ہے۔ اس نے پشاور کے قریب کہیں سلطان محمود کو روکنے کی کوشش کی تھی لیکن مسلمانوں نے دریا پار کر کے انند پال کو ایسا گھیرے میں لیا کہ وہ بڑی مشکل سے اپنی جان بچا کر نکل

بھاگا۔ ہم نے سنا ہے کہ لاہور میں راجہ انند پال کا نوجوان بیٹا سکھ پال ہے۔ وہ شاید بھیرہ پر حملہ کر دے"۔ بوڑھے نے ذرا سا خاموش رہ کر عالم سے پوچھا۔ "آپ لوگ کہاں سے آرہے ہیں؟"

"ملتان سے..... ہم ملتان کے رہنے والے ہیں"۔

"پھر آپ قرامطی مسلمان ہوں گے"۔ بوڑھے ہندو نے کہا۔ "آپ ہمارے دوست ہیں"۔

"ہم ایک دوسرے کے دشمن ہیں"۔ عالم نے کہا۔ "ہم قرامطی نہیں۔ تم بات کرو اور ہم سے ڈرو مت"۔

عالم نے اس ہندو کو غور سے دیکھا، پھر اس عورت کو دیکھا جسے وہ اپنی بیوی کہہ رہا تھا۔ اتنے میں دونوں لڑکیاں نہا کر آ گئیں۔ عالم نے انہیں گہری نظروں سے دیکھا۔ ان کا حسن دھل کر نکھر آیا تھا۔ عالم نے اس جوان آدمی کو دیکھا جو اپنے آپ کو ان لڑکیوں کا بھائی کہتا تھا۔ ان سب میں ذرہ بھر مشابہت نہیں تھی۔ لڑکیاں شہزادیاں لگتی تھیں اور ان کی ماں ان کی خادمہ۔ بوڑھا اور جوان آدمی گہرے سانولے رنگ کے تھے اور لڑکیوں کے رنگ گورے تھے۔

"یہ جو چار آدمی مرے پڑے ہیں، انہوں نے تم دونوں کو بھاگ جانے کی اجازت دے دی تھی"۔ عالم نے دونوں ہندوؤں سے کہا۔ "ہم تمہیں بھاگنے نہیں دیں گے۔ ان عورتوں کے سامنے تمہیں قتل کریں گے، پھر ان لڑکیوں کو اٹھا کر لے جائیں گے اور اس عورت کو اس جنگل بیابان میں کسی درندے کا شکار ہونے کے لیے چھوڑ جائیں گے۔ ہمیں دھوکہ دینے کی نہ سوچو۔ سچ بتا دو تمہارا آپس میں کیا رشتہ ہے۔ یہ آدمی ان لڑکیوں کا بھائی نہیں۔ یہ عورت ان کی ماں نہیں اور تم ان کے باپ نہیں۔ ہندوؤں والی ذہنیت کو الگ رکھ دو۔ ہم نے تم پر جو احسان کیا ہے، اسے مت بھولو۔ ہم نے تمہیں مدد اور منزل تک حفاظت کی پیش کش کی ہے اور تم جھوٹ بول رہے ہو"۔

دونوں ہندو خاموشی سے سنتے رہے۔

"کیا تم نے انہیں بتایا نہیں تھا کہ تم قرامطیوں کو دوست سمجھ کر ملتان جا رہے ہو؟" عالم نے پوچھا۔

"بتایا تھا"۔ بوڑھے ہندو کے منہ سے نکل گیا۔ "اسی لیے انہوں نے ہماری جان بخشی کر دی تھی۔ کہتے تھے تم ملتان پہنچو"۔

"اگر تم صحیح بات بتا دو گے تو بھی ہم تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے"۔ عالم نے کہا۔ "ہمارا بادشاہوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ ہم تاجر ہیں"۔

"آپ لوگوں نے ہم پر واقعی احسان کیا ہے"۔ بوڑھے ہندو نے کہا۔ "آپ ہمیں قتل کر سکتے تھے مگر آپ نے ہماری مدد کی۔ آپ نے ہمارا انعام بھی قبول نہیں کیا۔ اگر آپ ہمارے منہ سے سچ سن کر خوش ہو سکتے ہیں تو مجھے خوشی ہو گی کہ میں نے آپ کو احسان کے بدلے میں کچھ دیا۔ میں ان میں سے کسی کا بھی باپ نہیں۔ یہ آدمی ان لڑکیوں کا بھائی نہیں۔ یہ عورت ان لڑکیوں کی نوکرانی ہے جو ان کے ساتھ ملتان جا رہی ہے"۔

"اور تم کسی خاص مقصد کے لیے ملتان جا رہے ہو؟" عالم نے کہا۔ "ہم مکمل اور سچی بات سننا چاہتے ہیں"۔

"ہاں!" ہندو نے کہا۔ "ہم ملتان کے والی داؤد بن نصر قرامطی کے پاس یہ پیغام لے کر جا رہے ہیں کہ محمود غزنوی کے پاس فوج کی کمی ہے اور داؤد بن نصر فوراً آ کر بھیرہ کو محاصرے میں لے لے۔ محمود بھیرہ کو نہیں بچا سکے گا۔ اس کے پاس راجہ بجی رائے کی فوج کے کم و بیش تین ہزار جنگی قیدی ہیں جنہیں وہ غلاموں کی طرح استعمال کر رہا ہے۔ ان قیدیوں سے بہت سے کام لیے جا رہے ہیں۔ اگر داؤد بن نصر بھیرہ کو محاصرے میں لے لے تو یہ ہندو جنگی قیدی شہر کے اندر باغی ہو کر مسلمان فوج کے لیے مصیبت بن جائیں گے"۔

"تمہیں کس نے بھیجا ہے؟"

"جس طرح تمہاری فوج کے سالار ہوتے ہیں، اسی طرح ہماری فوج کے سالار ہوتے ہیں"۔ بوڑھے نے کہا۔ "مہاراجہ بجی رائے کی زیادہ تر فوج ماری گئی ہے۔ باقی مسلمانوں کی قید میں ہے اور کچھ ادھر ادھر بھاگ گئی ہے۔ چند ایک اعلیٰ عہدیدار زندہ بچ گئے ہیں

ان میں سے کچھ لاہور چلے گئے ہیں اور دو تین بھیرہ کے مندر میں چھپے ہوئے ہیں۔ میں بھی راجے کے راج دربار کا عہدیدار ہوں۔ میں بھی شکست کے بعد مندر میں جا چھپا تھا۔ سلطان محمود نے حکم دیا کہ کسی ہندو کو پریشان نہ کیا جائے اور کسی ہندو گھرانے میں کوئی مسلمان داخل نہ ہو۔ اس حکم کی وجہ سے ہم محفوظ ہو گئے۔ ...

"مندر میں ہماری فوج کے جو اعلیٰ حکام چھپے ہوئے تھے، انہوں نے غور سے اور فیصلہ کیا کہ داؤد قرامطی تک اطلاع بھجوائی جائے کہ وہ بھیرہ پر فوراً حملہ کر دے۔ ایسا ہی پیغام لاہور راجہ انندپال کے لیے بھی بھیجا گیا ہے لیکن اُدھر سے حملے کی توقع نہیں کیونکہ راجہ انندپال وہاں نہیں۔ داؤد بن نصر کو سب راجے جانتے ہیں کہ عیاش آدمی ہے۔ اس کے ساتھ ہندو راجے حسین لڑکیوں اور زر و جواہرات کی زبان میں بات کرتے ہیں۔ اس پر سلطانی فوجی حاکموں نے ان دو لڑکیوں کا انتظام کیا۔ یہ دونوں راج محل کی لڑکیاں ہیں۔ یہ بھی ایک ہندو گھر میں چھپی ہوئی تھیں۔ انہیں بلا کر سمجھایا گیا کہ انہیں داؤد کے ہاں تحفے کے طور پر بھیجا جا رہا ہے اور داؤد کو بھیرہ پر حملے کے لیے تیار کرنا ہے۔ ان کے علاوہ یہ سونا اور رقم بھی داؤد کے لیے جا رہی تھی۔ ہمارے پاس اور بھی سونا ہے جو ان مرے ہوئے آدمیوں کو نظر نہیں آیا... میں آپ سے ایک بار پھر کہتا ہوں کہ میں آپ کو جو سونا اور رقم پیش کر رہا ہوں، یہ آپ لے لیں۔"

"اور میں تمہیں ایک بار پھر کہتا ہوں کہ میرے سامنے سونے اور رقم کا بار بار نام نہ لو"۔ "تم سمجھ لو کہ ہم میں سے کسی کو ان چیزوں کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں"۔ عالم نے اُس کے سینے سے پوری بات نکلوانے کے لیے کہا۔ "اور جو بات تم ہمیں سنا رہے ہو ہمیں اس کے ساتھ بھی کوئی دلچسپی نہیں۔ دلچسپی صرف یہ ہے کہ ہم نے تم سب کو اپنی پناہ میں لیا ہے تو تمہیں حفاظت سے ملتان پہنچا دیں۔... تمہارے فوجی سپاہیوں نے راجہ کے مارے جانے کے بعد اور بھیرہ پر سلطان محمود کا قبضہ ہو جانے کے بعد بھی شکست تسلیم نہیں کی۔"

"ہندوؤں نے اسے مذہبی مسئلہ بنا رکھا ہے"۔ اُس نے کہا۔ "وہ کہتے ہیں کہ محمود غزنوی کے پاؤں یہاں جم گئے تو سندھ دھرم ختم ہو جائے گا اور اس ملک میں ایک بار پھر اسی طرح

اسلام پھیل جائے گا جس طرح محمد بن قاسم کے دور میں پھیلا تھا۔ پنڈت ہر ہندو کے ذہن میں یہی ڈالتے ہیں کہ مسلمان کا قتل صرف جائز نہیں بلکہ ہر ہندو کا فرض ہے، اور اسلام کا خاتمہ مذہبی فریضہ ہے.... آپ مسلمان ہیں، آپ کو میری باتیں اچھی نہیں لگی ہوں گی لیکن آپ نے مجھے یہی باتیں اگلنے کو کہا ہے۔ اب ہم آپ کے رحم و کرم پر ہیں۔ آپ چاہیں تو ہمیں قتل کر دیں، چاہیں تو جانے کی اجازت دے دیں۔"

یہ دونوں ہندو فوجی نہیں تھے۔ مذہبی جنون میں لڑکیوں اور زر و دولت کے ساتھ بھیرہ سے نکل آئے تھے۔ انہوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ راستے میں کیسے کیسے خطرے ہیں۔ اگر تربیت یافتہ فوجی ہوتے تو اتنا نہ ڈرتے کہ اپنا قیمتی راز دے دیتے۔ عالم نے انہیں تسلی دی اور کہا کہ وہ بے خوف ہو کر سو جائیں۔ عالم کے آدمی پہرہ دیتے رہیں گے۔

ایک آدمی کو پہرے پر کھڑا کر کے عالم اپنے دو ساتھیوں کو پرے لے گیا اور وہ اس مسئلے پر بحث مباحثہ کرنے لگے کہ ان ہندوؤں کو ملتان جانے دیا جائے یا انہیں واپس بھیرہ لے چلیں۔ اس پر بھی انہوں نے غور کیا کہ انہیں ملتان جانے دیں اور عالم اور اس کے ساتھی فوراً بھیرہ پہنچیں اور سلطان محمود کو خبردار کر دیں اور یہ بھی اُسے بتائیں کہ مندروں اور گھروں کی تلاشی لے کر راجے کے چھپے ہوئے فوجیوں کو پکڑ لیا جائے۔

گزشتہ رات دو قرامطی درویش کو باندھ کر ملتان لے گئے تھے۔ وہ اس قدر تیز گئے تھے کہ دن کے پچھلے پہر ملتان پہنچ گئے اور انہوں نے درویش کو داؤد کے سامنے لے جا کر بتایا کہ یہ ہے وہ قاتل جس نے سرنگ میں ایک آدمی کو قتل کیا تھا۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ اس نے یہ راز کس طرح منہ سے نکالا تھا اور اسے کس طرح یہاں تک لائے ہیں۔ داؤد بن نصر کو جب یہ بتایا گیا کہ اس کے ساتھ بوڑھا عالم اور تین جوان آدمی بھی تھے اور یہ سب بھیرہ جا رہے تھے تو داؤد بن نصر نے غصے سے گرج کر کہا۔ "تو انہیں بھی کیوں نہیں لائے؟"

"کمانڈر کا یہی حکم تھا"۔ ایک نے کہا۔ "اُس کے ساتھی ہمارے آدمیوں کے ساتھ بھیرہ جا رہے ہیں۔"

داؤد بن نصر نے حکم دیا کہ دس بارہ سوار فوراً ان کے ساتھ دوڑا دو اور اس آدمی کے ساتھیوں کو پکڑ لاؤ... حکم کی تعمیل بلا تاخیر ہوئی۔ بارہ تیز رفتار سوار ان دو آدمیوں کے ساتھ

دوڑا دیئے گئے جو درویش کو لائے تھے۔ یہ فوج کے گھوڑے تھے۔ وہ حیران کن رفتار سے شہر سے نکلے اور نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

رات آدھی گزر چکی تھی۔ عالم اور اُس کے دو ساتھی سو گئے تھے۔ تیسرا آدمی ہندوؤں پر پہرہ دے رہا تھا۔ اُسے گھوڑوں کے ٹاپ سنائی دیئے۔ آواز بتاتی تھی کہ گھوڑے بہت سے ہیں۔ اُس نے عالم اور اپنے ساتھیوں کو اور ہندوؤں کو بھی جگا لیا۔ عورت اور لڑکیاں بھی جاگ اٹھیں۔ عالم نے کہا کہ سب چٹان کی اوٹ میں ہو جائیں۔

گھوڑے بہت تیز آرہے تھے اور سیدھے ادھر ہی آرہے تھے۔ اگلے سواروں کے پاس جلتی ہوئی مشعلیں تھیں۔ وہ اسی رفتار سے اس جگہ سے گزرنے لگے جہاں چار آدمیوں کی لاشیں پڑی تھیں تو شعلوں کی روشنی میں انہیں لاشیں نظر آگئیں۔ گھوڑے اور اونٹ قریب ہی بندھے تھے۔ سوار رک گئے اور ادھر اُدھر دیکھنے لگے۔ انہوں نے لاشیں بھی دیکھیں اور للکارنے لگے۔ "سامنے آجاؤ، ورنہ کسی ایک کو بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

گھوڑوں اور اونٹوں سے معلوم ہو رہا تھا کہ ان کے مالک یہیں ہیں۔ کوئی جواب نہ ملا تو سوار اِدھر اُدھر پھیل گئے۔ انہیں لڑکیاں نظر آگئیں۔ وہ پکڑی گئیں تو دونوں ہندو سامنے آگئے۔ سواروں نے انہیں بتایا کہ وہ داؤد بن نصر کے فوجی ہیں اور انہیں ملتان لے جانے آئے ہیں۔ اُن دو آدمیوں نے جو درویش کو پکڑ کر لے گئے تھے، سواروں کو بتایا کہ یہ کوئی اور ہیں، ہم جنہیں پکڑنے آئے ہیں اُن کے ساتھ کوئی لڑکی نہیں تھی۔

"انہیں کس نے قتل کیا ہے؟" ایک سوار نے ہندوؤں سے پوچھا۔

"ہمیں معلوم نہیں"۔ بوڑھے ہندو نے جواب دیا۔ "ہم بھیرہ سے آرہے ہیں اور داؤد بن نصر کے لیے ایک ضروری پیغام لے کے جارہے ہیں۔ ہم یہاں پڑاؤ کے لیے رُکے۔ لاشیں پہلے ہی یہاں پڑی ہوئی تھیں۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو"۔ سواروں کے کمانڈر نے کہا۔ "کیا پیغام لے کر جارہے ہو؟"

"ہمیں ملتان لے چلو"۔ بوڑھے ہندو نے کہا۔ "پیغام ایسا ہے جو صرف تمہارے حاکم کو دیا جائے گا۔"

سواروں نے بستر دیکھے اور ایک سوار بولا۔ "بستر زیادہ ہیں اور ان کی تعداد کم ہے۔ ان کے ساتھ کوئی اور بھی ہے۔"

"ان لڑکیوں کو برہنہ کر دو"۔ کمانڈر نے حکم دیا۔ "اور اس عورت کے بھی کپڑے اتار دو۔ ان آدمیوں کو گھوڑوں کے پیچھے باندھ کر گھوڑے دوڑا دو۔ ملتان پہنچنے تک ان کی صرف ہڈیاں رہ جائیں گی۔ لڑکیوں کو ذرا پرے لے جاؤ، ان کے ہوش ٹھکانے آجائیں گے۔"

لڑکیوں نے چودہ سواروں کو دیکھا۔ تین چار سوار انہیں برہنہ کرنے کو بڑھے۔ لڑکیوں کی چیخیں نکل گئیں۔ دونوں ہندو مردوں نے عالم اور اس کے ساتھیوں کے متعلق کچھ بھی نہ بتایا۔ وہ احسان کا بدلہ چکا رہے تھے۔ جب سوار لڑکیوں کی طرف لپکے تو بھی وہ خاموش رہے۔

ایک طرف سے آواز آئی۔ "لڑکیوں کو ہاتھ نہ لگانا۔ ہمیں پکڑ لو۔ ان چاروں کے قاتل ہم ہیں۔"

یہ عالم کی آواز تھی۔ وہ سامنے آگیا۔ اس کے ساتھ اُس کے تین ساتھی تھے۔ اُس نے کہا۔ "ان لڑکیوں کو پریشان نہ کرنا۔ ہمیں اپنے حاکم کے پاس لے چلو۔ ہمیں جو کچھ کہنا ہے ملتان کے دربار میں کہیں گے۔"

ملتان کے دربار میں درویش موت کے منہ میں کھڑا تھا۔ داؤد بن نصر خود اُس سے پوچھ رہا تھا کہ وہ سُرنگ میں کس طرح داخل ہوا تھا اور اُس نے اس آدمی کو کیوں قتل کیا تھا۔

"یہ ثابت کرنے کے لیے کہ حاکم ملتان داؤد بن نصر کے پاس کوئی ایسی طاقت نہیں کہ وہ جنات اور مرے ہوؤں کی ارواح کو حاضر کر سکے"۔ درویش نے پوری دلیری سے کہا۔ "اور میں نے سُرنگ میں اُس آدمی کو قتل کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس حویلی میں جنات بھی نہیں، ارواح بھی نہیں اور تو اسلی فرقہ باطل کا علمبردار ہے۔"

داؤد بن نصر نے اُس کے منہ پر پوری طاقت سے تھپڑ مارا اور کہا۔ "تم ہماری کرامات کو جھٹلاتے ہو؟ ... تم دیکھ نہیں رہے کہ تمہاری زندگی ہمارے ہاتھ میں ہے؟ تمہیں ہم سے کون بچا سکتا ہے؟"

۳۰۲

"خدا سے ڈرو اکلال" ــ درویش نے کہا۔ "داؤد! فرعونوں نے خدائی کا دعویٰ کیا تھا۔ ان کا انجام دیکھ۔ تیرا انجام اس سے بھی برا ہوگا۔ تیرا سورج غروب ہو رہا ہے۔"

داؤد بن نصر نے درویش کے منہ پر ایک اور تھپڑ مارا اور بولا۔ "ہمارے پاؤں کے نیچے تمہاری حیثیت ایک چیونٹی کی سی ہے۔ ہم اتنے بڑے آدمی نہیں کہ ہم تم سے منہ لگائیں۔ ہمیں یہ بتادو کہ تمہارے ساتھ اور کون ہے اور یہ بھی بتا دو کہ تم کہاں جا رہے تھے۔"

"میں اکیلا ہوں" ــ درویش نے کہا۔ "خدا کے سوا میرا کوئی ساتھی نہیں۔ تمہارے دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ میں بھیرہ جا رہا تھا لیکن یہ نہیں بتاؤں گا کہ کیوں جا رہا تھا۔"

"تم سلطان محمود غزنوی سے یہ کہنے جا رہے تھے کہ وہ ملتان کو محاصرے میں لے کر قرامطی گدی کو ختم کرے" ـ داؤد نے کہا۔ "تم نے ہماری کرامات نہیں دیکھی کہ تم نے جنگل میں ایک بات کہی اور ہم نے یہاں سن لی۔ اگر تم ہمارے سوالوں کے جواب نہیں دو گے تو بہت پچھتاؤ گے۔ تمہاری ہڈیوں سے گوشت آہستہ آہستہ الگ کیا جائے گا، پھر تم چیخ چیخ کر ہمیں ہمارے سوالوں کے جواب دو گے مگر ہم نہیں سنیں گے۔ ہم تمہیں آج رات سوچنے کی مہلت دیتے ہیں۔ قید خانے میں بیٹھ کر اطمینان سے سوچو اور کل ہمیں بتا دینا کہ تمہارے ساتھی کون کون ہیں؟ تم شہر میں کس طرح داخل ہوئے تھے اور کیا سلطان محمود کے جاسوس ملتان میں موجود ہیں؟ اور وہ کہاں ہیں؟"

"ان سوالوں کے جواب تو میں کل دوں گا" درویش نے کہا۔ "آج یہ سن لو اور رات کو میری اس بات پر غور کرتے رہنا کہ تخت و تاج نے کبھی کسی کا ساتھ نہیں دیا۔ حکومت کی مسند کے لالچ نے قوموں کو ڈبو دیا ہے۔ انسان تخت پر بیٹھ کر جب سر پر تاج سجاتا ہے تو وہ اپنی ہی قوم کو فریب دینے لگتا ہے اور بھول جاتا ہے کہ خدا کی ذات بھی موجود ہے۔ تم جیسے حکمران اپنے تخت کی مضبوطی کے لیے رعایا کو نئے جھانسے دیتے ہیں لیکن خدا کو کوئی جھانسہ نہیں دیا جا سکتا۔ خدا ظالم کی نہیں مظلوم کی سنتا ہے اور خدا فریب کار کا نہیں فریب خوردہ کا ساتھ دیتا ہے۔ تم نے خدا کے سچے مذہب کو بگاڑ کر پیغمبری کا دعویٰ کیا ہے۔ تم نے خدا کے بندوں کو اپنا غلام بنائے رکھنے کے لیے خدا کے مذہب کو حربہ بنا رکھا ہے۔ میں نے تمہارا فریب اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ خدا تمہیں اتنا بڑا گناہ بخشنے کا نہیں۔"

داؤد بن نصر اچانک گرجا۔ "لے جاؤ اسے ... قید خانے میں بند کر دو۔"

درویش کو گھسیٹ کر لے گئے۔ درویش جوں جوں دور ہٹتا جا رہا تھا، اس کی آواز داؤد کے قریب آتی جا رہی تھی۔

"داؤد! تیری پیغمبری پر بجلی گرنے والی ہے ... داؤد! تم خدا کی آواز کو قید نہیں کر سکتے۔"

"اگر عالی جاہ مجھے اجازت دیں تو میں اس بدبخت کی آواز کو ہمیشہ کے لیے خاموش کر دوں" ــــ ایک درباری نے داؤد بن نصر کو خاموش کھڑے دیکھ کر کہا۔ "میں حیران ہوں کہ آپ قرامطی مسند کی توہین کس طرح برداشت کر رہے ہیں۔"

"ملتان کی آستینوں میں سانپ پل رہے ہیں" ـ داؤد نے کہا۔ "اس سے معلوم کرنا ہے گروہ کے اور کون کون ہیں۔ اسے ہم یہیں اپنے ہاتھوں ختم کر سکتے تھے لیکن اس کی یہاں ضرورت ہے۔"

"اس کے ساتھ جو لوگ تھے، وہ شاید پکڑے جائیں گے" ــ درباری نے کہا۔

"کہیں غائب نہ ہو گئے ہوں" ــ داؤد بن نصر نے کہا۔ "مجھے ان سے زیادہ محمود غزنوی کا خیال آرہا ہے۔ بھیرہ سے جلدی اطلاع آنی چاہیے کہ محمود کا ارادہ کیا ہے۔ ہم نے اُسے اُس کے ایک سالار کے ذریعے دھوکہ دینے کی کوشش کی تھی لیکن اطلاع ملی ہے کہ یہ سالار اپنی تلوار سے مارا گیا ہے اور ہمارا دھوکہ ناکام ہو گیا ہے۔ راجہ بجی رائے دھوکے میں مارا گیا ہے۔ محمود غزنوی کو خدا نے اگر فوج تھوڑی دی ہے تو دماغ بہت زیادہ دیا ہے۔ ہندوستان میں فوج کی کمی نہیں، دماغ کی کمی ہے۔"

سلطان محمود غزنوی اپنی فوج کی کمی کو بُری طرح محسوس کر رہا تھا۔ اُس کا کام بھیرہ فتح کرنے پر ختم نہیں ہو گیا تھا بلکہ اصل مہم یہیں سے شروع ہوئی تھی۔ اُسے ملک گیری کی ہوس نہیں تھی۔ اُس کا مقصد زر و جواہرات اکٹھے کر کے غزنی لے جانا بھی نہیں تھا۔ ہندوستان کا یہ پہلا شہر تھا جو اُس نے فتح کیا تھا اور اُس نے پہلے شہر میں ہی سارے

ہندوستان کی جھلک دیکھ لی تھی۔ اُس نے مسجدوں پر مندروں کے گنبدوں نے سلے پڑے ہوئے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ بھیرہ میں مسلمانوں کی آبادی کچھ کم تو نہیں تھی لیکن اسلام کا کہیں نشان نظر نہیں آتا تھا۔

اُس کے پاس سب سے پہلے پنڈتوں کا وفد آیا تھا۔ پنڈتوں نے اُس کے آگے پہلے گھٹنے ٹیکے پھر ماتھے زمین پر رگڑے تھے۔ پشاور کے پنڈتوں نے بھی اُس کے آگے اسی طرح سجدے کیے تھے۔ اب بھیرہ کے پنڈتوں نے بھی اُس کے آگے ماتھے رگڑے تو سلطان محمود غزنوی اُٹھ کھڑا ہوا۔

"کھڑے ہو جاؤ" — اُس نے غصے سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں خدا نہیں۔ میں نے اس شہر پر قبضہ کیا ہے شہر کے انسانوں پر نہیں۔ ہمارے مذہب میں سجدہ صرف خدا کے آگے کیا جاتا ہے۔ تم لوگ مجھے گناہگار کر رہے ہو.... اپنا مطلب بیان کرو۔"

"ہم جان کی سلامتی اور مندروں کی حرمت مانگنے آئے ہیں" — پنڈت نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"کیا تم اپنے مندروں کی ویسی ہی عزت چاہتے ہو جیسی تم مسجدوں کی کرتے رہے ہو؟" — سلطان محمود نے کہا۔ "کیا یہاں کے ہندوؤں کی ویسی ہی عزت چاہتے ہو جیسی تم مسلمانوں کی کرتے رہے ہو؟ تمہارے راجہ کے اس محل میں اتنی ہندو لڑکیاں نہیں تھیں جتنی مسلمان لڑکیاں تھیں۔ انہیں زبردستی راج محل میں رکھا گیا تھا۔ اگر تم پنڈت لوگ مذہب کے پابند ہوتے تو اس شہر کی بیٹیوں کی عزت کی حفاظت کرتے۔"

"ہم مجبور تھے سلطان مہاراج!" — بڑے پنڈت نے کہا۔ "ہمارے دیس میں مہاراجہ کا حکم مذہب کے حکم کی حیثیت رکھتا ہے۔"

"تمہارے دیس میں مذہب مہاراجہ کا غلام ہے" — سلطان محمود نے کہا۔ "اور تم جو اپنے مذہب کے پیشوا اور پاسبان ہو، اپنا مذہب مہاراجہ کے قدموں میں رکھ دیتے ہو" — سلطان محمود نے اپنے ترجمان سے توجہ ہٹا کر اپنے پاس بیٹھے ہوئے ایک فوجی مشیر سے کہا۔ "ہمارے مسلمان بادشاہوں اور مذہبی پیشواؤں میں بھی یہی خرابی پیدا ہو گئی ہے۔

ہمارے مذہبی پیشوا اپنے بادشاہوں اور اُمرا کی بدکرداری پر مذہب کا پردہ ڈالے رکھتے ہیں اور بادشاہ اپنا حکم منوانے کے لیے اس پر خدا کے حکم کی مہر ثبت کر دیتے ہیں۔"

"ملتان کا بادشاہ داؤد بھی اسی مرض کا مریض ہے" — مشیر نے کہا۔

یہ باتیں فارسی زبان میں ہو رہی تھیں اس لیے پنڈت سمجھ نہ سکے۔ سلطان محمود نے اپنے ترجمان سے کہا۔ "ان پنڈتوں سے کہو کہ تمہارے بُت اگر سچے ہیں تو انہیں کہو کہ تمہاری جان و عزت اور اپنے مذہب کی حفاظت کریں۔ اپنے بتوں سے کہو کہ اپنی حفاظت کریں۔ میں ایک گناہگار آدمی سے کہتا ہوں کہ تمہارے خدا کو اُٹھا کر باہر پھینک دے۔ تم کھڑے دیکھتے رہنا کہ مٹی اور پتھر کا خدا اپنے آپ کو ایک گناہگار انسان سے بچا سکتا ہے؟ اور اس انسان کو اس کے گناہوں کی سزا دے سکتا ہے؟"

ترجمان نے جب سلطان محمود غزنوی کی یہ بات پنڈتوں کو اُن کی زبان میں کہی تو وہ خاموش کھڑے رہے۔ اُن کے چہروں پر کھسیانا سا تاثر تھا۔

"اور میں جانتا ہوں کہ تم لوگ مندروں میں کیسے کیسے گناہ کرتے ہو" — سلطان محمود نے کہا۔ "تمہارے ہاتھوں تمہارے اپنے مذہب کی کسی عورت کی عزت محفوظ نہیں۔ تم نے اسی لیے پتھر کے خدا تراش رکھے ہیں کہ یہ تمہیں کسی گناہ سے روک نہیں سکتے۔ تم اگر میرے پاس جان و مال اور عزت و آبرو کی التجا لے کر نہ آتے تو بھی میں کسی بے گناہ کو قتل اور کسی عورت کو بے آبرو نہ ہونے دیتا کیونکہ یہ میرے خدا کا حکم ہے اور خدا نے میرا ہاتھ روک رکھا ہے۔ میں خدا کے حکم سے آیا ہوں اور میرا ہر فعل خدا کے حکم کا پابند ہے۔"

سلطان محمود نے سر کو جھٹک کر اپنے ترجمان کی طرف دیکھا اور پنڈتوں کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ "ان سے پوچھو کہ انہوں نے مندروں میں لڑائی سے بچے اور بھاگے ہوئے فوجی ہمدیاروں کو چھپا کے نہیں رکھا ہوا؟ ان سے کہو کہ یہ مجھے یقین دلا سکتے ہیں کہ مندروں میں ہماری فتح کو شکست میں بدلنے کی سازشیں نہیں ہو رہیں؟"

"نہیں سلطان مہاراج!" — بڑے پنڈت نے ترجمان کی بات سن کر کہا۔ "ہم آپ کے غلام ہیں۔ مندروں میں کوئی سازش نہیں ہو رہی۔"

"وہ کہاں ہیں؟" — سلطان محمود نے اِدھر اُدھر دیکھ کر پوچھا۔ "انہیں لے آؤ جنہیں

لاہور کے راستے سے پکڑا گیا ہے۔"

تھوڑی دیر بعد دو آدمی اندر لائے گئے جن کے ہاتھ رسیوں سے بندھے ہوئے تھے۔

"انہیں پہچانتے ہو؟" — سلطان محمود نے پنڈتوں سے پوچھا اور دونوں قیدیوں سے کہا — "انہیں بتاؤ کہ تم کہاں سے آئے ہو اور کیوں پکڑے گئے ہو؟"

"ہمیں ان پنڈتوں نے لاہور جانے کو کہا تھا" — ایک قیدی نے اپنے جرم کا اعتراف کرتے ہوئے کہا۔ "انہوں نے مہاراجہ انند پال کے لیے پیغام دیا تھا کہ بھیرہ میں مسلمانوں کی فوج بہت تھوڑی ہے۔ فوراً حملہ کرو اور راجہ بجی رائے کی شکست کا انتقام لو۔

انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ ہماری فوج کے جو ہزاروں قیدی سلطان محمود کے پاس ہیں بدہ حملے کی صورت میں باغی ہو کر لاہور کی فوج سے مل جائیں گے۔" دوسرے قیدی نے کہا۔

"اور انہیں میری فوج نے راستے میں مشکوک حالت میں پکڑ لیا" — سلطان محمود نے کہا — "ان دونوں قیدیوں سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ تم لوگوں نے اسی قسم کا پیغام ملتان داؤد بن نصر کو بھیجا ہے۔ تم میرے پاس جان بخشی کے لیے آئے ہو... غور سے سنو! جن کو خدا مانتے ہو اور یہاں کے انسان میری فوج کے طوفان کو نہیں روک سکے۔ اپنے بتوں سے کہو کہ میری فتح کو شکست میں بدل دیں۔ لیکن جس طرح تم عیار اور جھوٹے ہو، اسی طرح تمہارے بنائے ہوئے خدا جھوٹے ہیں۔ میں تمہیں صرف یہ رعایت دیتا ہوں کہ اپنے بت اٹھاؤ اور اس شہر سے نکل جاؤ۔ اگر رکے رہو گے تو میں یہ بت ہندو قیدیوں کے ہاتھوں تڑواؤں گا۔ اگر تم وہ مذہب قبول کر لو جو میں اپنے ساتھ لایا ہوں تو باقی زندگی سکون سے گزار سکو گے۔ تم جسمانی لذت کے عادی رہے ہو، روحانی لذت کا ذائقہ بھی چکھ لو۔ اپنے آپ کو سچے خدا کی نعمتوں سے مالا مال کر لو۔ سونے اور جواہرات میں وہ بات نہیں جو اللہ کی نعمتوں میں ہے... جاؤ اور سوچو اور مجھے جواب دو۔"

وہ چلے گئے تو سلطان محمود کے ایک عالم نے کہا۔ "سلطان! یہ ہندو ہیں، یہ اسلام قبول کرنے نہیں، دھوکہ دینے آئے تھے۔ یہ جسمانی لذتوں کے شیدائی ہیں۔ حکومت اور مذہب

کی پیشوائی کو یہ صرف اپنا حق اور ورثہ بنائے بیٹھے ہیں کیونکہ یہ برہمن ہیں۔ ان کے دلوں میں اسلام کی نفرت بھری ہوئی ہے، اور یہ نفرت صرف اس لیے ہے کہ یہ جانتے ہیں کہ اسلام اونچی نیچی ذاتوں کا قائل نہیں۔ امیر کو غریب پر اس لیے برتری حاصل نہیں کہ وہ امیر ہے۔ اسلام بالادستی کا حق اسے دیتا ہے جو قوم کی برتری اور اپنے اوپر اللہ کی حکمرانی کو تسلیم کرے۔"

یہ عالم سعید اللہ قاسمی تھے جنہوں نے اپنے نام کے ساتھ قاسمی کا اضافہ محمد بن قاسم کی عقیدت مندی کے اظہار کے لیے رکھا تھا۔ اس وقت کی بعض کہیں کہیں تحریروں میں ایک مولوی سعید کا ذکر آتا ہے۔ ایک تحریر میں سعید اللہ ہی لکھا ہے۔ یہ پنجاب کے رہنے والے تھے۔ سلطان محمود علمائے دین کا قدر دان تھا۔ اس نے بھیرہ فتح کیا تو سعید اللہ قاسمی اس سے ملنے بھیرہ آئے تھے۔

"ہم نے اس خطے میں قاسمی مسلمانوں کا ایک گروہ بنا رکھا ہے" — مولوی سعید قاسمی نے کہا۔ "ہم کسی ایسے سلطان یا ایسے مسلمان حملہ آور کی راہ دیکھ رہے تھے جو یہاں محمد بن قاسم کے دور حکومت کو بحال کر دے۔ ہندو پنڈتوں اور دیگر برہمنوں نے ہم پر نظر رکھی۔ ہم نے ان سے دوستی بھی کی۔ ان کا صرف یہ مطالبہ تھا کہ ہم ان کے مذہب کو قبول کریں۔ آپ ان کے بت توڑ سکتے ہیں، انہیں اپنے مذہب سے نہیں ہٹا سکتے۔ ان کے دلوں میں اسلام کی جو نفرت ہے، وہ اس وقت تک نہیں نکلے گی جب تک یہاں ایک بھی مسلمان موجود ہے۔ آپ نے دیکھ لیا ہے کہ ان پنڈتوں نے آپ پر حملہ کرانے کا اہتمام بھی کیا ہے اور آپ کے سامنے آ کر انہوں نے سجدہ بھی کیا ہے۔ اس ملک میں آپ نے کسی بھی خطے میں اسلامی ریاست بنا لی تو یہ ہندو اس کی جڑیں کھوکھلی کرنے میں لگے رہیں گے۔"

"اسلامی ریاست کی جڑیں تو ہمارے اپنے بھائی کھوکھلی کر رہے ہیں" — سلطان محمود نے کہا۔ "میں یہاں آ گیا ہوں لیکن میرا دھیان پیچھے غزنی اور بلخ بخارا پر لگا ہوا ہے۔ اسلامی سلطنت چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ہر ریاست کا حکمران اپنے آپ کو ساری دنیا کا بادشاہ سمجھتا ہے۔ ہم خانہ جنگی لڑ چکے ہیں۔ جس فوج کو باطل کے بت توڑنے تھے، وہ ایک دوسرے کا سر توڑنے میں لگی رہی اور کمزور ہو گئی ہے۔ اگر ان ریاستوں کی فوجیں متحد ہو جائیں

تو ہم سارے ہندوستان کو اسلامی سلطنت بنا سکتے ہیں۔ مگر ہر لمحہ میں اس اطلاع کا منتظر رہتا ہوں کہ میرے کسی مسلمان پڑوسی نے غزنی پر حملہ کر دیا ہے۔ یہ لوگ اپنا ایمان نیلام کر چکے ہیں جنہیں ہمارے رسول صلعم نے سرفروش بننے کو کہا تھا وہ ایمان فروش ہو گئے ہیں۔"

"آپ یہاں رہیں یا نہ رہیں، ہم یہ ہم جاری رکھیں گے کہ یہاں ہندو کسی مسلمان کا ایمان نہ خرید سکیں۔" — مولوی عبداللہ نے کہا۔

"سب سے بڑا ایمان فروش تو ملتان کی گدی پر بیٹھا ہے۔" — سلطان محمود نے کہا — "اُس نے اپنی قوم کے ایمان کی منڈی لگا رکھی ہے۔"

"ہم نے سنا ہے کہ وہاں ہندو اور قرامطی مل کر شعبدہ بازی کر رہے ہیں۔" — مولوی عبداللہ نے کہا — "اور لوگ متاثر اور مسحور ہو کر قرامطی بنتے جا رہے ہیں۔"

"میں اُس عیسائی کے دماغ کی تعریف کرتا ہوں جس نے یہ فرقہ بنایا ہے۔" — سلطان محمود نے کہا — "انسانی فطرت گناہ کی طرف جلدی مائل ہوتی ہے۔ ذہنی اور جسمانی لذت کو انسان جلدی قبول کرتا ہے۔ اس فرقے نے ہر گناہ کو جائز قرار دے رکھا ہے۔ ہندو پنڈتوں نے اپنا مذہب نہیں چھوڑا لیکن اس فرقے کی پشت پناہی کر رہے ہیں اور اس کی شعبدہ بازیوں میں پوری طرح شریک ہیں، تاکہ مسلمان اس فرقے کے پیروکار بن کر اسلام کے خاتمے کا باعث بنیں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ہندو اپنی لڑکیوں کو اسلام کی بیخ کنی اور مسلمانوں کی گمراہی کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ داؤد قرامطی کو نہ اسلام کے ساتھ دلچسپی ہے نہ وہ اپنے فرقے کا وفادار ہے۔ وہ اپنی گدی کے ساتھ دلچسپی رکھتا ہے۔"

یہ اسی دلچسپی کا مظاہرہ تھا کہ داؤد بن نصر پر درویش کی باتوں کا کچھ اثر نہ ہوا۔ اُس کے دل میں خوفِ خدا پیدا نہ ہوا۔ اُس پر درویش کی اس للکار کا بھی اثر نہ ہوا — "داؤد! تمہاری پیغمبری پر بجلی گرے گی ... تم خدا کی آواز کو قید نہیں کر سکتے۔" — حکومت کے نشے نے اُسے بدمست کر رکھا تھا اور وہ اس زعم میں مبتلا تھا کہ اس نے خدا کی آواز کو قید کر رکھا ہے۔

ملتان میں ایک قافلہ داخل ہوا جس میں فوج کے بارہ چودہ سوار تھے۔ ایک بوڑھا اور ایک جوان ہندو، ایک ادھیڑ عمر عورت اور دو بڑی خوبصورت لڑکیاں تھیں، اور اس قافلے میں چار

قیدی بھی تھے جن کے ہاتھ زنجیروں سے بندھے ہوئے تھے۔ ان میں ایک بوڑھا تھا جسے ملتان کے لوگ جانتے تھے کہ عالم فاضل ہے۔ تین قیدی جوان سال تھے۔ ملتان کے بعض لوگ انہیں بھی پہچانتے تھے۔ ان چاروں کو جاننے پہچاننے والے حیران و پریشان ہو گئے کہ انہیں کس جرم میں اور کہاں سے گرفتار کیا گیا ہے۔ عالم کوئی جرم نہیں کر سکتا۔ عالم ہونے کی وجہ سے بعض قرامطی بھی اس کا احترام کرتے تھے۔

"انہوں نے کیا کیا ہے؟" — کسی تماشائی نے گھوڑ سواروں سے بلند آواز میں پوچھا۔

"قتل .... یہ قاتل ہیں۔"

"انہوں نے کسے قتل کیا ہے؟"

"فوج کے سواروں کو۔"

"ہم نے اسلام کے غداروں اور ڈاکوؤں کو قتل کیا ہے۔" — عالم نے بڑی ہی بلند آواز میں کہا۔

"ہم نے ان لڑکیوں کی عصمت پر حملہ کرنے والے چار قرامطیوں کو قتل کیا ہے۔" — ایک جوان سال قیدی نے کہا۔

"زبانیں بند رکھو۔" — ایک سوار نے گرج کر کہا۔

"تم خدا کی آواز کو خاموش نہیں کر سکتے۔" — ایک اور جوان سال قیدی نے نعرہ لگانے کے انداز سے کہا۔

گھوڑ سواروں نے انہیں گھسیٹنا شروع کر دیا۔

داؤد بن نصر کو دو اطلاعیں دی گئیں۔ ایک یہ کہ درویش کے ساتھیوں کو گرفتار کر کے لے آئے ہیں اور دوسری اطلاع یہ کہ اپنے جو چار سوار بھیرہ جا رہے تھے، وہ درویش کے ساتھیوں کے ہاتھوں قتل ہو گئے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اُسے یہ بھی بتایا گیا کہ بھیرہ سے دو ہندو لڑکیاں پیغام لے کر آئے ہیں۔ داؤد نے سب سے پہلے ہندوؤں کو بلایا۔

ہندوؤں نے دو لڑکیاں داؤد کو پیش کیں، پھر چمڑے کی ایک خوشنما تھیلی اُس کے قدموں میں خالی کی۔ داؤد کبھی لڑکیوں کو دیکھتا تھا اور کبھی اپنے قدموں میں رکھے ہوئے

سونے کے ڈھیر کو۔ لڑکیاں خوبصورت تو تھیں لیکن اُن کے چہروں پر جو تبسم تھا اور اُن کا جو انداز تھا، اُس نے داؤد پر نشہ طاری کر دیا۔ وہ تربیت یافتہ لڑکیاں تھیں۔ انہیں بتا دیا گیا تھا کہ انہیں کس کے پاس اور کیوں بھیجا جا رہا ہے۔

بوڑھے ہندو نے داؤد کو بتایا کہ وہ فوج میں کماندار تھا۔ اُس نے بجے راؤ کی شکست کی تفصیل سنائی اور بتایا کہ کس طرح چند ایک فوجی عہدیدار مندروں میں چھپ گئے تھے۔ خزانے پر تو مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا تھا لیکن بہت سی دولت مندروں اور لوگوں کے گھروں میں پہنچا دی گئی تھی۔

"سلطان محمود نے یہ حکم جاری کر دیا کہ کوئی مسلمان فوجی کسی ہندو کے گھر میں داخل نہیں ہو گا"۔ بوڑھے ہندو نے کہا۔ "اُس نے یہ اعلان بھی کر دیا کہ ہندو اپنے فوجیوں کی لاشیں اُٹھا کر جلا سکتے ہیں اور زخمیوں کو مرہم پٹی کے خیموں تک پہنچا سکتے ہیں۔ بھیرہ کے ہندوؤں کو پنڈتوں نے اور ہم نے در پردہ کہا کہ میدانِ جنگ میں اپنے زخمی اُٹھائیں اور مسلمان زخمیوں کو قتل کریں۔ انہوں نے بہت سے مسلمان زخمیوں کو قتل کیا لیکن مسلمانوں کو پتہ چل گیا اور انہوں نے ہندوؤں کو شہر سے باہر جانے سے روک دیا......

"ہم نے دیکھا کہ ہندوؤں کے گھر مسلمانوں سے واقعی محفوظ ہیں تو ہم نے جو رقم اور سونا ہاتھ لگا، چند ایک گھروں میں چھپا دیا۔ بڑے مندر میں یہ فیصلہ ہوا ہے کہ آپ کو یہ اطلاع دی جائے کہ آپ فوراً بھیرہ پر چڑھائی کر دیں تو آپ نہ صرف بھیرہ کو مسلمانوں سے آزاد کرا لیں گے بلکہ آپ سلطان محمود کو قید اور اس کی فوج کو تباہ کر سکتے ہیں۔ وہ تین ہزار ہندو جنگی قیدی جو مسلمانوں کی بیگار میں لگے ہوئے ہیں، آپ کی مدد کو آ جائیں گے اور محاصرے کی صورت میں شہر میں تباہی بپا کر دیں گے....

"لاہور اور بٹھنڈہ بھی پیغام بھیج دیئے گئے ہیں۔ وہاں کی فوجیں بھی آ جائیں گی۔ آپ کا کام اور زیادہ آسان ہو جائے گا۔ اگر آپ اپنی ریاست کی خیریت چاہتے ہیں تو آپ کو بھیرہ پر فوج کشی کرنی ہو گی۔ آپ کو بھیرہ سے مالی امداد بھی مل جائے گی"۔

داؤد بن نصر انہماک سے سُن رہا تھا۔ اُس نے ابھی کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ یہ ہندو بوڑھا

جانتا تھا کہ داؤد کے خاندان کی تاریخ میں جنگ و جدل کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ یہ سازش پسند خاندان ہے جسے عیسائیوں نے گدی پر بٹھایا اور ہندو راجے مہاراجے اسے آلۂ کار بنائے ہوئے ہیں۔ بوڑھا ہندو داؤد کی کمزور رگوں سے واقف تھا۔ بھیرہ سے اُسے سب کچھ بتا کر بھیجا گیا تھا۔

"حاکمِ ملتان!" بوڑھے ہندو نے ذرا آگے جھک کر کہا۔ "بٹھنڈہ اور لاہور کی فوجوں کو آپ کی فوج کے تعاون اور اتحاد کی ضرورت ہے۔ آپ کو یہ تو احساس ہو گا ہی کہ آپ کی گدی ہمارے تعاون کی بدولت محفوظ ہے۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہو گا کہ آپ ہندو راجوں اور مہاراجوں کے گھیرے میں ہیں۔ آپ پر کوئی حملہ نہ کرے اور صرف مالی اور فوجی امداد بند کر دی جائے تو آپ ملتان کو ہمارے قدموں میں پھینک کر بھاگ جائیں گے۔ اگر آپ نے بھیرہ پر فوج کشی نہ کی تو ہم یہ سمجھیں گے کہ آپ ہمارے نہیں غزنی والوں کے دوست ہیں۔ ہم آپ کی دوستی سے دستبردار ہو جائیں گے اور پورے قرامطی فرقے کو بتا دیں گے کہ آپ کی پیغمبری محض شعبدہ بازی ہے"۔

"آپ خود فوجی عہدیدار رہیں ہیں"۔ داؤد نے گھبرائے ہوئے سے لہجے میں کہا۔ "میں آپ کو اپنی فوج دکھاؤں گا۔ آپ خود دیکھیں گے کہ یہ فوج محاصرے میں لڑ سکتی ہے، ایک سو میل دُور جا کر کسی قلعہ بند شہر کو محاصرے میں لینے کے قابل نہیں کیونکہ تعداد کم ہے"۔

"آپ کو اپنی فوج شہر سے ایک سو میل دُور لے جانی پڑے گی۔ ہم آپ کی فوج کو اسی لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں کہ تھوڑی ہے۔ آپ کی فوج سے ہم سلطان محمود کو دھوکہ دیں گے۔ وہ آپ کی فوج کو دیکھ کر اپنی فوج باہر لے آئے گا۔ آپ کو محاصرہ نہیں کرنے دے گا کیونکہ اُسے یہ توقع ہو گی کہ وہ آپ کو آسانی سے شکست دے دے گا۔ وہ جونہی باہر آئے گا، لاہور سے آئی ہوئی مہاراج انندپال کی فوج جو دریا کے پار چھپی ہوئی ہو گی، شہر پر ہلّہ بول دے گی۔ آپ کا کوئی نقصان نہیں ہو گا۔ سلطان محمود آپ کی اور انندپال کی فوجوں کے درمیان پس جائے گا۔ ہم آپ سے وعدہ کرتے ہیں کہ محمود کو گرفتار کر کے ہم آپ کے حوالے کر دیں گے"۔

داؤد بن نصر گہری سوچ میں کھو گیا۔ اُس کی نظر قدموں میں رکھے ہوئے سونے

پر پڑی۔ اُس نے سر اُٹھا کر دونوں لڑکیوں کو دیکھا۔ اُس کے چہرے کا تاثر بدل گیا۔ یہ تاثر صاف بتا رہا تھا جیسے وہ چاہتا ہو کہ یہ بوڑھا ہندو اور اس کا جوان ساتھی ان لڑکیوں کو اُس کے پاس چھوڑ کر نکل جائیں۔

"میری فوج کو بھیرہ کے لیے کب کوچ کرنا ہوگا؟" داؤد نے پوچھا۔

"آپ تیاری شروع کر دیں"۔ بوڑھے نے کہا۔ "میں واپس بھیرہ جا رہا ہوں وہاں ہمیں لاہور اور بٹھنڈہ کی فوجوں کی پیشقدمی کی اطلاع ملے گی تو میں آپ کو اطلاع دوں گا۔ اس اطلاع کے بعد آپ کو تیاری کی مہلت نہیں ملے گی۔ آپ کی فوج تیاری کی حالت میں رہے۔ رسد بیل گاڑیوں پر لدی رہے"۔

داؤد بن نصر نے مہمانوں کی خاطر تواضع کے لیے شراب و کباب لانے کا حکم دیا تو اُسے کسی درباری نے یاد دلایا کہ قیدی باہر کھڑے ہیں۔ داؤد نے کہا کہ قیدیوں کو پیش کرو۔ قیدی لائے گئے۔

"میں تمہیں زیادہ بولنے کی مہلت نہیں دوں گا"۔ داؤد نے عالم اور اُس کے ساتھیوں سے کہا۔ "تمہارا ایک ساتھی گرفتار ہو کر ہمارے پاس آ چکا ہے۔ اُس نے ایک آدمی کو چار کنواریوں کی حویلی میں قتل کیا تھا۔ تم اس کے ساتھی ہو۔ تم نے ہمارے چار بڑے ہی تجربہ کار فوجیوں کو قتل کیا ہے۔ کیا یہ صحیح ہے؟ اور تم نے انہیں کیوں قتل کیا ہے؟"

"اس کا جواب ہم سے سنو"۔ بوڑھا ہندو بول پڑا۔ "اگر یہ اُن چار آدمیوں کو قتل نہ کرتے تو نہ یہ سونا آپ کے پاس پہنچتا نہ یہ لڑکیاں۔ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ وہ آپ کی فوج کے آدمی ہیں"۔

بوڑھے نے داؤد کو پوری تفصیل سے سنایا کہ اُن چار آدمیوں نے کس طرح انہیں لوٹا اور ان لڑکیوں کو برہنہ کر کے ان کے ہاتھوں شراب پیتے رہے، پھر اُن میں سے ایک نے ایک لڑکی کو زمین پر گرا لیا۔ اچانک یہ بزرگ اور یہ آدمی اندھیرے میں سے نکلے اور اِن چاروں کو قتل کر دیا۔

"ہمیں ڈر تھا کہ ہم اُن چاروں سے بچ کر ان چار وحشیوں کے جنگل میں آ گئے ہیں"۔ بوڑھے نے کہا۔ "لیکن انہوں نے لڑکیوں کو کپڑے پہننے کو کہا۔ ہم نے انعام پیش کیا جو انہوں نے لینے سے انکار کر دیا اور ہماری حفاظت کے لیے ہم پر پہرہ کھڑا کر دیا۔ آدھی رات کو بہت سے سوار آئے اور انہیں باندھ کر لے آئے"۔

داؤد نے قیدیوں کی طرف دیکھا تو عالم نے کہا۔ "ہمیں معلوم نہیں تھا کہ وہ آپ کے سوار ہیں۔ ہم نے انہیں ان کی لڑکیوں کی عزت بچانے کے لیے قتل کیا ہے"۔

"اور وہ جو قیدی پہلے لایا گیا ہے، اُس کے ساتھ تمہارا کیا تعلق ہے؟"۔ داؤد بن نصر نے پوچھا۔ "ہمیں بتایا گیا ہے کہ تم بھیرہ سلطان محمود کے پاس جا رہے تھے"۔

"اُس کے ساتھ ہمارا کوئی تعلق نہیں"۔ عالم نے جواب دیا۔ "ہم بھیرہ ضرور جا رہے تھے لیکن کسی سلطان سے ملنے نہیں بلکہ اپنے کاروبار کے لیے جا رہے تھے۔ ہمیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ سلطان محمود کون ہے اور وہ کہاں ہے"۔

"انہوں نے ہماری جانیں اور ہماری عزت بچائی ہے"۔ بوڑھے ہندو نے کہا۔ "انہوں نے آپ کی امانت کی حفاظت کی ہے۔ انہوں نے ہمارا انعام قبول نہیں کیا تھا۔ ہم آپ سے انہیں یہ انعام دلانا چاہتے ہیں کہ انہیں چھوڑ دیا جائے"۔

داؤد بن نصر نے لڑکیوں کی طرف دیکھا۔ دونوں نے باری باری کہا۔ "ہاں! انہیں چھوڑ دیا جائے۔ اگر یہ اُن درندوں کو قتل نہ کرتے تو ..."

"انہیں رہا کر دو"۔ داؤد نے مسکرا کر حکم دیا۔

عالم اور اُس کے ساتھیوں کو چھوڑ دیا گیا۔

دو تین روز بعد۔ وہی حویلی تھی جس میں عالم اور درویش اور اُن کے زمین دوز گروہ کے آدمی رات کو اکٹھے ہوا کرتے تھے۔ رات ابھی ابھی گہری ہوئی تھی۔ عالم اس حویلی میں آ چکا تھا۔ اُس کے ساتھ جو تین آدمی گرفتار ہوئے تھے، وہ بھی باری باری آ گئے تھے، پھر دو آدمی اور آ گئے۔ ان کا موضوع اور مسئلہ یہ تھا کہ درویش کو کس طرح رہا کرایا جائے۔ کسی کو کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ قید خانے سے وہ واقف نہیں تھے۔ گزشتہ دو تین دنوں

میں انہوں نے کئی طریقے سوچ لیے تھے۔ قید خانے کی دیوار بھی دیکھی اور کمند پھینک کر اوپر چڑھنے اور قید خانے میں داخل ہونے کا بھی ارادہ کیا تھا۔ اس گروہ کے جوان اور نوجوان رکن جانوں کی بازی لگانے کے لیے تیار تھے لیکن عالم جانیں ضائع کرنے کے حق میں نہیں تھا۔ کہتا تھا کہ پہلے طریقہ سوچو۔

"کیا آپ لوگوں کو یہ احساس نہیں کہ ہمارا یہ بزرگ ساتھی (درویش) جلاد کی تلوار کے نیچے کھڑا ہے؟" — ایک نوجوان نے کہا۔ "ہم میں سے کسی کی جان چلی بھی گئی تو آپ اسے ضائع ہونا نہ کہیں۔"

"اگر تم لوگ ناکام ہو گئے تو درویش کو اُسی وقت جلاد کے حوالے کر دیا جائے گا۔ ہم جو کچھ کر رہے ہیں۔ اللہ کے نام پر کر رہے ہیں۔"

دروازے پر دستک ہوئی۔ سب اُٹھے اور صحن میں چلے گئے تاکہ خطرے کی صورت میں کھلے دروازے سے نکل جائیں۔ انہیں ہر لمحہ یہ خطرہ نظر آتا تھا کہ درویش اذیتوں سے گھبرا کر سب کی نشان دہی کر دے گا اور اس حویلی پر چھاپہ پڑے گا۔ دو آدمی دروازہ کھولنے گئے۔ دونوں کے ہاتھوں میں خنجر تھے۔ ایک نے دروازے کی زنجیر اُتاری اور کواڑ کے پیچھے ہو گیا۔ دوسرا دوسرے کواڑ کے پیچھے ہو گیا۔ ایک آدمی اندر آیا اور اُس نے کواڑ بند کر دیے۔ وہ اُن کا اپنا آدمی تھا۔

"یہاں کتنے آدمی ہیں؟" — اُس نے پوچھا

"آٹھ ہیں۔"

وہ سب اُس کمرے میں چلے گئے۔ باقی سب صحن سے کمرے میں آ گئے۔

"ذرا باہر آؤ۔" آنے والے نے کہا۔ "درویش کو چار فوجی لا رہے ہیں۔ وہ زنجیروں میں بندھا ہوا ہے۔ گلیاں اور بازار خالی ہیں۔ ہم اُسے چھڑا سکتے ہیں۔"

قید خانے میں درویش سے ایک ہی سوال پوچھا جا رہا تھا کہ اُس کے ساتھی کون کون ہیں اور کہاں کہاں رہتے ہیں۔ درویش نے اپنی ہڈی پسلی ایک کرا لی تھی، کسی کی نشاندہی نہیں کی تھی۔ اُس رات یہ فیصلہ کیا گیا کہ اُسے اُس کے گھر لے جایا جائے اور گھر کی تلاشی لی جائے۔ پھر اس کے گھر کی عورتوں کو دہشت زدہ کر کے پوچھا جائے کہ اس کے تعلقات

کس کس کے ساتھ ہیں۔

اس مقصد کے لیے رات کا وقت بہتر سمجھا گیا تھا۔ درویش کا گھر اس حویلی سے بہت آگے تھا جہاں یہ گروہ بیٹھا کرتا تھا۔ ان میں سے پانچ چھ آدمی ڈنڈے لے کر باہر نکل گئے۔ گلیاں اور بازار سنسان پڑے تھے۔ تھوڑی ہی دور گئے ہوں گے کہ انہیں چار پانچ آدمی نظر آئے۔ پانچ چھ آدمی اِدھر اُدھر چھپ گئے۔ درویش اور فوجی اُن کے قریب سے گزر گئے۔ گروہ کے تمام آدمی اُٹھے اور دبے پاؤں فوجیوں کے سروں پر پوری طاقت سے ڈنڈے مارے۔ بے ہوش کرنے کے لیے سر پر ایک ہی ضرب کافی ہوتی ہے۔ اُن کے سروں پر دو دو تین تین ضربیں لگائی گئیں۔ وہ سنبھلے بغیر بے ہوش ہو کر گر پڑے۔

درویش آزاد تھا لیکن زنجیر میں — سب اُسے ساتھ لے کر اندھیرے میں اندھیری گلیوں میں غائب ہو گئے۔

جس روز عالم رہا ہوا تھا، اُس نے اُسی روز ایک آدمی کو یہ پیغام دے کر بھیرہ روانہ کر دیا تھا کہ ملتان میں بھیرہ پر چڑھائی کی تیاری ہو رہی ہے اور بھیرہ سے ملتان پیغام اور تحفے آ رہے ہیں۔ یہ آدمی بھیرہ چلا گیا اور سلطان محمود کو پیغام دیا۔ سلطان کے لیے یہ پیغام کوئی نیا نہیں تھا۔ اُس کے جاسوسوں نے دو ہندوؤں کو لاہور کی طرف جاتے ہوئے پکڑا تھا۔ انہوں نے بتایا تھا کہ وہ راجہ انند پال کے لیے پیغام لے کے جا رہے ہیں کہ بھیرہ کو محاصرے میں لے لو۔ انہوں نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ ایسے ہی پیغام ملتان اور بٹھنڈہ بھی بھیجے گئے ہیں۔

سلطان محمود نے یہ کارروائیاں کیں۔ ایک یہ کہ بھیرہ کے دونوں مندروں کی تلاشی لی۔ دونوں میں بھی راجے کی فوج کے چند ایک عہدیدار پکڑے گئے۔ سلطان نے پنڈتوں کو بھی پکڑ لیا۔ پھر شہر کے تمام ہندوؤں کو باہر میدان میں اکٹھا کر کے دونوں مندروں کے بُت اور مورتیاں اُن کے سامنے رکھ دیں۔

"میں نے تم لوگوں کو یہ دکھانے کے لیے بلایا ہے کہ یہ بُت اور یہ تصویریں خدا نہیں

— سلطان محمود غزنوی نے گھوڑے پر سوار ہو کر ہجوم سے کہا "اگر ان میں خدائی قوت ہے تو انہیں کہو کہ اپنے آپ کو بچائیں۔ ان کا انجام دیکھو اور اُس خدا کی عبادت کرو جس نے ہم سب کو پیدا کیا ہے اور جس کے ہاتھ میں ہماری زندگی اور ہماری موت ہے۔"

سلطان محمود کے حکم پر بُت توڑ دیئے گئے اور مندروں کو آگ لگا دی گئی۔

سلطان محمود نے بھیرہ فتح کرتے ہی تیز رفتار قاصد پشاور کو اس حکم سے ساتھ روانہ کیے تھے کہ جس قدر کمک ہو سکے بھیج دو، رسد کی ضرورت نہیں۔ سلطان اب ہر روز کمک کا انتظار کرتا تھا۔ وہ گھوڑوں اور اونٹوں کا زمانہ تھا۔ فاصلے طے کرتے دن اور راتیں گذر جاتی تھیں۔ دریاؤں میں سے گذرنا پڑتا تھا۔ کمک کو جس علاقے سے گذر کر آنا تھا وہ دشمن کا علاقہ تھا۔ راستے میں دشمن سے تصادم کا خطرہ تھا۔ سلطان محمود نے یہ پیغام بھی دیا تھا کہ دشمن سے بچنے کی کوشش کی جائے۔ جو گائیڈ قاصد کے ساتھ بھیجے گئے تھے، انہیں کہا گیا تھا کہ وہ کمک کو عام راستوں سے دُور ہٹا کر لائیں۔

سلطان کی فوجی طاقت آدھی رہ گئی تھی۔ اُسے جانوروں کی ضرورت نہیں تھی راجہ بجی راے کی فوج کے گھوڑے، اونٹ، ہاتھی اور بیل (رسد کی گاڑیاں کھینچنے والے) خاصی تعداد میں موجود تھے۔ ضرورت گھوڑ سواروں کی تھی۔ بھیرہ سے تھوڑے سے مسلمان مل گئے تھے جو گھوڑ سواری اور تیغ زنی کی سوجھ بوجھ رکھتے تھے، مگر دشواری یہ بھی کہ ہندوستان میں مسلمان تھوڑے سے تھے اور یہ ہندوؤں کی رعایا تھے۔ ان پر نظر رکھی جاتی تھی کہ تیغ زنی اور تیر اندازی کو اپنا مشغلہ نہ بنائیں۔ مسلمانوں کو فوج میں بھی کم ہی لیا جاتا تھا۔ ہندو راجے مہاراجے اور پنڈت ان کی عسکری روح مار رہے تھے۔ مسلمانوں کی یہ کیفیت سلطان محمود کے لیے دشواری پیدا کر رہی تھی۔ وہ یہاں سے فوج کی کمی پوری نہیں کر سکتا تھا۔

بھیرہ میں سلطان محمود کی حالت ایسی تھی جیسے ایک شیر زخموں سے چُور شکاریوں کے نرغے میں آیا ہوا ہو اور شیر ان سب کو چیر پھاڑ دینے کو بے تاب ہو۔ سلطان اپنے

مستقر سے بہت دُور تھا اور دشمن کے نرغے میں بیٹھا تھا۔ صورت ایسی پیدا ہو گئی تھی جس میں نہ صرف اُس کی فوج کی تباہی یقینی تھی بلکہ اُس کی اپنی جان بھی بچتی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس کے سالاروں پر ایسی سنجیدگی طاری تھی جو تذبذب کی صورت بھی اختیار کر جاتی تھی۔

"میں جوا نہیں کھیل رہا" سلطان محمود نے ایک روز اپنے سالاروں اور اُن کے نائبوں کو بلا کر کہا۔ "مجھے اچھی طرح احساس ہے کہ ہمیں کیسی کیفیت اور کتنی خطرناک صورتِ حال کا سامنا ہے، مگر ہم بھاگیں گے نہیں۔ خدا ہمارے ساتھ ہے۔ بہت سے زخمی لڑنے کے قابل ہو گئے ہیں۔ کمک آ جائے گی۔ ہمیں ملتان پر فوج کشی کرنی ہے۔ جاسوسوں کی اطلاعیں تمہارے سامنے ہیں۔ ملتان کی فوج کو لڑنے کا تجربہ نہیں۔ اگر ہم نے وقت ضائع کیا تو ملتان کی فوج ہمیں محاصرے میں لے لے گی اور انند پال اور دوسرے چھوٹے چھوٹے راجاؤں کی فوجیں بھی آ جائیں گی۔ اگر ہم نے ملتان پر قبضہ کر لیا تو وہاں کی فوج ہمارے کام آ سکتی ہے۔ وہ آخر مسلمان ہیں۔"

سلطان محمود نے ایک حکم یہ دیا کہ تمام جنگی قیدیوں کو اس طرح بیڑیاں ڈال دی جائیں کہ وہ کام کر سکیں لیکن پورا قدم نہ اٹھا سکیں تاکہ وہ جنگ کی صورت میں آہستہ آہستہ چلنے کے قابل رہیں، تیز نہ چل سکیں۔

جس وقت سلطان محمود کمک کا انتظار کر رہا تھا، اُس وقت بھیرہ کی مسجدیں جو ویران پڑی تھیں اور چھوٹی مسجدیں جو کھنڈر بن چکی تھیں، صاف کر دی گئی تھیں۔ سلطان محمود نے مسلمانوں سے کہا تھا کہ وہ مسجدوں میں اور عورتیں گھروں میں قرآن ختم کریں اور ہر کوئی نفل پڑھتا رہے۔

انہی دنوں لاہور میں مہاراجہ انند پال کے راج دربار اور راج محل میں زلزلے جیسے جھٹکے محسوس کیے جا رہے تھے۔ پشاور کے راستے میں انند پال نے سلطان محمود کی فوج کو روکنے کی کوشش کی اور وہ منہ کی کھا کر بھاگ گیا تھا۔ مسلمان سواروں نے سوہدرہ اور وزیرآباد تک اُس کا تعاقب کیا تھا۔ اُسے ماہی گیروں نے دریا پار کرا دیا۔ مورخ

لکھتے ہیں کہ وہ لاہور جانے کی بجائے کشمیر چلا گیا۔ وجہ بیان نہیں کی گئی کہ وہ کشمیر کیوں چلا گیا تھا۔ شاید اُسے ڈر تھا کہ مسلمان لاہور تک اُس کا تعاقب کریں گے اور اس کی فوج تتر بتر ہو گئی تھی۔

لاہور میں اُس کا نوجوان بیٹا سکھ پال تھا۔ وہاں جو فوج تھی اُس کی کمان سکھ پال کے ہاتھ میں تھی۔ یہ فوج تازہ دم تھی لیکن اُس کا لڑنے کا جذبہ یوں گرتا جا رہا تھا کہ اٹک کے قریب سلطان محمود سے شکست کھا کر انند پال تو غائب ہو گیا تھا اور اُس کی فوج کے سوار اور پیادے بڑی بُری حالت میں اکیلے اکیلے اور چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں لاہور پہنچ رہے تھے۔ شکست میں اپنے آپ کو بے قصور ثابت کرنے کے لیے وہ سلطان محمود کی فوج کے متعلق دہشت انگیز خبریں سناتے تھے۔ اُن کی مبالغہ آمیز باتوں سے یہ تاثر ملتا تھا کہ غزنی کی فوج میں انسان نہیں، جن اور بھوت ہیں۔ اس مبالغہ آرائی سے لاہور کی تازہ دم فوج کا حوصلہ پست ہو رہا تھا۔

انند پال کا بیٹا سکھ پال اور اس نوجوان کی ماں پریم دیوی اس صورتِ حال سے پریشان ہوئی جا رہی تھی۔ ماں بیٹا انند پال کا انتظار کر رہے تھے لیکن اُس کی کوئی مصدقہ اطلاع نہیں مل رہی تھی۔ پریم دیوی کی شادی چودہ سال کی عمر میں ہوئی تھی اور پندرہ سال کی عمر میں اُس نے سکھ پال کو جنم دیا تھا۔ تین اور عورتوں کے بطن سے انند پال کے بیٹے پیدا ہوئے تھے۔ پریم دیوی کی کوشش یہ تھی کہ باپ کی گدی پر اُس کا بیٹا بیٹھے۔ اُسے اپنے خاوند مہاراجہ انند پال کے مر جانے یا لاپتہ ہو جانے کا کوئی غم نہیں تھا۔

ایک روز سکھ پال کو اطلاع ملی کہ بھیرہ سے دو آدمی کوئی بڑی ضروری اطلاع لے کر آئے ہیں۔ ان آدمیوں کو فوراً اندر بلا لیا گیا۔ یہ وہ آدمی تھے جنہیں بھیرہ کے پنڈتوں اور مندروں میں چھپے ہوئے فوجی عہدیداروں نے بھٹنڈہ اس پیغام کے ساتھ بھیجا تھا کہ بھیرہ کو فوراً محاصرہ میں لے لیں۔ یہ دونوں بھٹنڈہ گئے۔ یہ شہر مہاراجہ انند پال کا دوسرا دار الحکومت تھا۔ وہاں سے ان آدمیوں کو تازہ دم گھوڑے دے کر لاہور بھیج دیا گیا کیونکہ حکم

دینے والے لاہور میں تھے۔

ان آدمیوں نے سکھ پال کو بھیرہ اور سلطان محمود غزنوی کے متعلق وہی خبر سنائی جو بوڑھے پنڈت نے داؤد بن نصر کو سنائی تھی۔ پیغام میں وہی ہدایت تھی جو داؤد بن نصر کو دی گئی تھی کہ بھیرہ کو محاصرے میں لے لو، محمود غزنوی لڑنے کی حالت میں نہیں۔

سکھ پال نے یہ خبر اپنی ماں کو سنائی تو ماں نے اُسی وقت اپنی فوج کے کمانڈر کو بلایا جسے سیناپتی کہا کرتے تھے۔ اس کا نام راج گوپال تھا۔ اُس نے بھیرہ پر فوج کشی سے انکار کر دیا اور وجہ یہ بیان کی کہ مسلمانوں کی جس فوج نے راستے میں مہاراج انند پال کو شکست دی اور اپنی کمی پوری کیے بغیر بھیرہ تک پہنچی اور راجہ بجی رائے کی فوج کو شکست دی ہے، اس فوج کو شکست دینے کے لیے ہمارے پاس اس سے تین گنا فوج ہونی چاہیے۔ ہماری آدھی سے زیادہ فوج جو مہاراج کے ساتھ تھی بیکار ہو چکی ہے۔ یہاں جو دستے ہیں وہ بھی اچھی ذہنی حالت میں نہیں۔ بھیرہ تک ہمیں دو دن کوچ کرنے ہوں گے۔ راج گوپال نے یہ بھی کہا کہ مہاراج کو واپس آ لینے دیں۔ سکھ پال ابھی بچہ ہے۔

"میں اس موقع سے پورا فائدہ اٹھانا چاہتی ہوں"۔۔۔ رانی پریم دیوی نے کہا۔۔۔ "بھیرہ میں مسلمانوں کی فوجی طاقت اتنی تھوڑی ہے کہ وہ ہمارا ہلہ برداشت نہیں کر سکیں گے۔ اگر یہ فتح میرے بیٹے کے نام لکھ دی گئی ہے تو یہ باپ کی گدی کا حق دار ہو جائیگا"۔

"اور اگر شکست ہوئی تو یہ میرے کھاتے میں لکھی جائے گی، کیونکہ فوج کی کمان میرے ہاتھ میں ہوگی"۔ راج گوپال نے کہا۔۔۔ "سکھ پال ساتھ تو ہوگا لیکن ذرا پیچھے یا وسط میں ہوگا جہاں اُس کی حفاظت کا پورا انتظام ہوگا"۔

"راج گوپال!" پریم دیوی نے کہا۔۔۔ "اگر ہم سے پہلے ملتان کے داؤد نے بھیرہ لے لیا تو اس کا نتیجہ جانتے ہو کیا ہوگا؟ داؤد آخر مسلمان ہے۔ وہ سلطان محمود کے ساتھ ساز باز کر کے بھیرہ کو خالص مسلمان ریاست بنا سکتا ہے۔ اس طرح غزنی والوں کو یہاں مستقل اڈے مل جائیں گے"۔

"میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ داؤد فوج کشی کی جرأت کرے گا"۔ راج گوپال نے کہا۔۔۔

"عورت، شراب اور زر و جواہرات میں ڈوبا ہوا مسلمان جسے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ اُس کا مذہب کیا ہے، جنگجو نہیں ہو سکتا۔ غزنی کی فوج ایمان کی طاقت سے لڑتی ہے جسے ہم دھرم کہتے ہیں۔ داؤد اپنا ایمان ہمارے ہاتھ فروخت کر چکا ہے۔"

پریم دیوی راج گوپال کو دوسرے کمرے میں لے گئی۔ اُس کی عمر اُس وقت تیس سال کے قریب تھی لیکن چہرے کے حسن اور جسم کی جاذبیت سے پچیس سال کی لگتی تھی۔ اُس نے راج گوپال کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا ـــ "راج گوپال! بھول گئے ہو کہ سکھ پال تمہارا اپنا بیٹا ہے اور لوگ انند پال کو اس لیے سکھ پال کا باپ کہتے ہیں کہ وہ میرا خاوند ہے۔ میں نے مہاراج کی بیوی ہوتے ہوئے تمہیں اپنا خاوند بنائے رکھا۔ مہاراج تمہیں بھی اپنے ساتھ پشاور کی اُس لڑائی میں لے جانا چاہتے تھے جس میں وہ شکست کھا کر بھاگے ہیں۔ یہ میں تھی جس نے انہیں یہ کہہ کر تمہیں لاہور میں رکوا لیا کہ یہاں تجربہ کار سینا پتی کی ضرورت ہے ... اپنے بیٹے کو راج کا وارث بنا دو۔ میں چاہتی ہوں کہ میرا اور تمہارا بیٹا محمود غزنوی کو قیدی بنا کر لاہور لائے۔ تمہیں میری محبت کی قسم!"

سلطان محمود کو معلوم تھا کہ پشاور سے کمک اتنی جلدی نہیں پہنچے گی، پھر بھی وہ بے تاب ہو کر شہر کی دیوار پر چڑھ جاتا اور اُس کی نگاہیں شمال مغرب کے اُفق پر گھومنے لگتی تھیں۔ کہیں بگولا اُٹھتا تو اُس کی گرد کو دیکھ کر سلطان محمود کا چہرہ دمکنے لگتا کہ کمک کی گرد ہے۔

ملتان کا داؤد بن نصر بھیرہ سے تحفے میں آئی ہوئی دو نو لڑکیوں میں گم تھا۔ یہ لڑکیاں اُسے شراب پلا پلا کر مدہوش رکھتیں اور اُسے بھیرہ پر حملہ کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار کرتی رہتی تھیں۔ اُسے جب اطلاع دی گئی تھی کہ قیدی (درویش) کو اُس کے گھر کی تلاشی کے لیے جایا جا رہا تھا تو بہت سے آدمیوں نے سپاہیوں پر حملہ کیا اور قیدی کو چھڑا لے گئے ہیں، تو داؤد نے بدمستی کی کیفیت میں کہا تھا ـــ "اُن تمام سپاہیوں کو اور اُن کے کماندار کو تہہ خانے میں بند کر دو۔ انہوں نے قیدی کو خود بھگایا ہے۔ اس کے عوض انہوں نے قیدی سے دولت بٹوری ہو گی ... اور

قیدی کے گھر کا اتا پتا معلوم کر کے اُس کے گھر کے تمام افراد کو، بچوں اور عورتوں کو بھی قید خانے میں ڈال دو۔"

درویش کے گھر گئے تو وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔

ایک صبح سلطان محمود نے شمال مغرب کی بجائے شمال مشرق کی طرف گرد اُٹھتی دیکھی۔ اس گرد کو وہ پہچانتا تھا۔ یہ فوج کی گرد تھی، اور یہ کمک کے سوا اور کسی کی نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ دوڑتا ہوا نیچے آیا۔ وہ وقت ضائع کیے بغیر ملتان کو کوچ کرنا چاہتا تھا۔ وہ ترکستان ہی جا رہا تھا لیکن راجہ بجی رائے نے اُسے راستے میں روک لیا اور اُسے بڑی ہی خونریز جنگ لڑنی پڑی۔

اُس نے اپنے سالاروں کو بلایا اور انہیں بتانے لگا کہ کمک آ رہی ہے اور وہ کس طرح اور کب کوچ کرے گا۔ اسی دوران ایک سوار آیا۔ یہ دیکھ بھال والی ٹولیوں کا سوار تھا جنہیں شہر سے دُور دُور گشت پر رکھا جاتا تھا۔ سوار نے کہا کہ دشمن کی فوج آ رہی ہے۔ اس کے ساتھ ہاتھی بھی ہیں اور زیادہ نفری سواروں کی ہے۔ پیادے بھی ہیں اور یہ فوج بلاشبہ ہندوؤں کی ہے لیکن یہ بتانا مشکل ہے کہ یہ کون سے راجے مہاراجے کی ہے۔

سلطان محمود یہ کہہ کر باہر نکلا "میں خود دیکھوں گا" ـــ اور کچھ دیر بعد وہ درختوں میں ڈھکی ہوئی ایک چٹان پر کھڑا اس فوج کا جائزہ لے رہا تھا جو بھیرہ کی طرف آ رہی تھی۔ اُس نے کئی جگہوں پر جا کر اور چھپ چھپ کر دیکھا اور اس فوج کی نفری کا اندازہ کیا۔

"ہم محاصرے میں نہیں لڑیں گے" ـــ اُس نے اپنے سالار سے کہا جو اُس کے ساتھ تھا۔ دشمن کی فوج کو دیکھتے ہوئے بولا "ہم نے دشمن کو محاصرے کی مہلت دے دی تو ملتان سے بھی فوج آ کر محاصرہ مضبوط اور طویل کر سکتی ہے ... کسانوں اور مسافروں کے بھیس میں دو تین آدمی بھیج دو جو اس فوج کی نقل و حرکت دیکھتے رہیں اور یہ بھی معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ یہ کس کی فوج ہے اور کہاں سے آئی ہے۔"

سلطان محمود واپس شہر میں آیا اور اس کے پاس جو فوج تھی اُسے مقابلے کے لیے تقسیم کرنے لگا۔ اتنے میں اُسے اطلاع ملی کہ شمال مغرب کے اُفق پر کسی فوج کی گرد اُٹھ رہی ہے۔ وہ دوڑتا ہوا شہر کی دیوار پر چڑھ گیا۔ یہ گھوڑوں کی گرد تھی یہ بھی وہ پہچانتا تھا۔ یہ سوال اُسے پریشان کرنے لگا کہ یہ پشاور سے کمک آئی ہے یا راجہ انند پال کی فوج ہے۔ اُس کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمودار ہوئے۔

وہ کبھی اس گرد کو دیکھتا تھا کبھی شمال مشرق کی طرف سے اُٹھنے والی گرد کو۔ شمال مغرب کی طرف سے آنے والی فوج کے آگے دریا تھا۔ سلطان محمود کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔

دریا کی طرف سے ایک گھوڑ سوار سرپٹ گھوڑا دوڑاتا شہر کی طرف آتا دکھائی دیا۔ وہ قریب آیا تو اُسے اشارے سے سلطان کی طرف بلا لیا گیا۔

سوار نے دیوار کے قریب گھوڑا روکا اور بولا "سلطانِ غزنی! کمک آ گئی ہے۔"

سلطان محمود نے معاً کہا "اُسے دریا کے پار روک لو۔ فوراً ایک سوار کو دوڑاؤ۔ اس سوار کو واپس نہ بھیجنا۔ گھوڑا بہت تھکا ہوا ہے۔"

رات کو سلطان محمود نہ خود سویا نہ اس نے کسی کو سونے دیا۔ اُسے شمال مشرق کی طرف سے آنے والی فوج کے متعلق مصدقہ اطلاع ملی کہ لاہور سے آئی ہے لیکن راجہ انند پال ساتھ نہیں۔ اس کا بیٹا سکھ پال ساتھ ہے۔ اس فوج کی تعداد بھی معلوم ہو گئی۔ اس اطلاع کے تین گھنٹے بعد یہ اطلاع آئی کہ سکھ پال کی فوج نے تقریباً تین میل دور پڑاؤ کیا ہے لیکن خیمے نہیں لگائے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تیاری کی حالت میں ہے اور صبح تک شہر کو محاصرے میں لے لے گی۔

اس اطلاع کے فوراً بعد سلطان محمود اپنے دو سالاروں کو ساتھ لے کر دریا کے پار چلا گیا جہاں اُس نے کمک کو روکنے کا حکم بھیجا تھا۔ کمک اور سکھ پال کی فوج کے درمیان کم و بیش پانچ میل کا فاصلہ تھا۔ ان کے درمیان دریائے جہلم اور جنگل حائل تھا۔

سلطان محمود نے کمک کے سالار کو گلے لگا کر اور اُس کے گال چوم کر کہا۔۔۔

"تم میرے لیے آسمان سے اللہ کی غیبی مدد بن کر اُترے ہو۔ اگر تم کل آتے تو میں تمہیں بتا نہیں سکتا کہ ہم اس زمین پر کس حال میں پڑے ہوتے۔۔۔ میری بات غور سے سُن لو سلمان! تم سے پانچ میل دُور مشرق میں لاہور کے راجہ کی فوج پڑاؤ کیے ہوئے ہے۔ وہ صبح یا اس سے کچھ پہلے شہر کا محاصرہ کرے گی یا یلغار۔ تم صبح طلوع ہونے سے پہلے تمام دستوں کو دریا پار کرا دینا لیکن شور نہ ہو، خاموشی رہے۔ دستے یہیں جنگلوں میں رہیں اور صرف دیدبان کہیں چھپ کر رہیں۔ میں ہندوؤں کو محاصرہ کرنے کی مہلت نہیں دوں گا۔ ایک پیادہ دستہ آگے بھیجوں گا جو دشمن سے ٹکرا کر پیچھے ہٹے گا۔ دشمن آگے آئے گا۔ تم ذرا بلندی پر آ کر دیکھتے رہنا۔ سب کچھ سمجھتے ہو۔ دشمن کا پہلو تمہارے سامنے ہو گا اور تم اس کے عقب میں آسانی سے جا سکو گے۔ دشمن کے سامنے اور بائیں پہلو کو میں سنبھال لوں گا۔"

سکھ پال اور اُس کے سیناپتی راج گوپال نے صبح طلوع ہونے دی۔ سلطان محمود نماز سے فارغ ہوا ہی تھا کہ اُسے اطلاع ملی کہ ہندوؤں نے پیش قدمی شروع کر دی ہے اور دشمن کی ترتیب محاصرے کی ہے یعنی فوج پھیلی ہوئی آ رہی ہے۔ شہر کے قریب آ کر اس فوج کو اور زیادہ پھیلنا اور محاصرہ مکمل کرنا تھا۔ سلطان محمود کی چال بیکار گئی کہ وہ ایک دستہ آگے بھیج کر دشمن کو آگے لائے گا۔

اُس نے دیوار پر چڑھ کر دیکھا۔ کوئی ایک میل دُور اُسے سکھ پال کی فوج کا پھیلاؤ نظر آ رہا تھا۔ سلطان نے اپنے سالار سے کہا کہ سوار دستے کے دو حصے کر دو اور دونوں دستے بیک وقت دشمن کے دائیں بائیں پہلو پر حملہ کریں اور اُسے کو دبانے کی کوشش کریں۔۔۔ شہر میں فوج تیار کھڑی تھی۔ تھوڑی دیر میں شہر سے پانچ سو سواروں کا ایک دستہ نکلا۔ نعرۂ تکبیر کی گرج سنائی دی۔ سواروں نے ایڑ لگائی اور دستہ ذرا آگے جا کر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ اُن کے رُخ دشمن کے پھیلاؤ کے سروں کی طرف تھے۔

راج گوپال نے یہ چال جل دی۔ بڑی تیزی سے پھیلاؤ کو سکیڑ لیا کہ سواروں کو لپیٹ میں لے کر واپس نہ جانے دیا جائے۔ ہر سوار دستے نے پہلوؤں پر حملہ کیا۔ سلطان دیوار پر کھڑا تھا۔ اُس نے شہر سے ایک پیادہ دستہ نکالا اور اسے دشمن کے بائیں پہلو پر بھیجا۔

ہدایت کے مطابق سوار اور پیادے پیچھے ہٹنے لگے اور دشمن کی زیادہ تر توجہ اپنے بائیں پہلو پر ہو گئی جہاں پیادوں نے حملہ کیا تھا۔ اس طرح دشمن کی محاصرے کی ترتیب ٹوٹ گئی۔ اور دشمن کی پیٹھ اُدھر کو ہو گئی جدھر سلطان محمود نے کمک روک رکھی تھی۔ نعمان تجربہ کار سالار تھا۔ اُس نے عقب سے حملہ بول دیا۔ اُس کے دستوں نے صبح طلوع ہونے سے بہت پہلے دریا پار کر لیا تھا۔ ہندوؤں کو بالکل توقع نہیں تھی کہ شہر سے باہر اُن کے عقب میں بھی فوج ہے۔ کمک میں زیادہ تر سوار تھے۔ ادھر سے سلطان محمود نے کم سے کم نفری کے دستے شہر سے نکال دیئے۔ نعمان کے عقبی حملے نے ہندوؤں کے اوسان خطا کر دیئے۔ شہر کے دستوں نے الگ قیامت بپا کر دی۔ دشمن کا نکل بھاگنا ناممکن ہو گیا۔ اُس کے زخمی ہاتھیوں کی بھگدڑ نے اُسے اور زیادہ نقصان دیا۔

سورج نکل آیا تھا۔ ہندوؤں کے بجے کارسے، نقارے، نعرے اور مسلمانوں کے تکبیر کے نعروں کی گرج، ہاتھیوں کی چنگھاڑ، گھوڑوں کے فلک شگاف شور میں دب گئے تھے۔ سلطان محمود دیوار پر کھڑا دیکھ رہا تھا۔ اُس کی نظر سکھ پال کے جھنڈے پر تھی جو ابھی گرا نہیں تھا۔ جھنڈا پیچھے یا دائیں بائیں جانے کی بجائے شہر کی طرف آ رہا تھا۔ صاف نظر آ رہا تھا۔ نقصان دشمن کا ہو رہا ہے اور مسلمان غالب ہیں۔

سکھ پال کا جھنڈا جو ایک ہاتھی پر تھا، شہر کے دروازے پر آ گیا۔ سلطان محمود کو ہاتھی پر ایک جوان سال چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ بلاشک و شبہ راجہ آنند پال کا بیٹا سکھ پال تھا۔ وہ خود ہاتھی کو شہر میں نہیں لا رہا تھا بلکہ ہاتھی اُسے ادھر لے آیا تھا۔ ہاتھی اپنے راج کمار کی طرح خوف زدہ تھا۔ جب ہاتھی شہر کے دروازے پر پہنچا تو مہاوت ہاتھی سے کود کر بھاگ گیا۔ ہاتھی کے ساتھ سکھ پال کا کوئی محافظ نہیں تھا۔ ہودے میں دو محافظ تھے جو جھنڈا اٹھائے ہوئے تھے۔

ہاتھی کی پیشانی میں بیک وقت تین تیر اُتر گئے۔ ہاتھی بڑی بھیانک آواز سے چنگھاڑا۔ اِس کے ساتھ ہی اُوپر سے سلطان محمود غزنوی کی گرجدار آواز آئی "زندہ پکڑ لو اِس

ہاتھی کو" سکھ پال ہاتھی سے کود آیا اور شہر کی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ کانپ رہا تھا۔ سلطان محمود کے حکم پر اُسے پکڑ لیا گیا اور اُسے اُوپر دیوار پر لے گئے۔

"گھبراؤ نہیں لڑکے!" سلطان محمود نے اُس کے ساتھ ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ "ہم تمہاری جرأت کی تعریف کرتے ہیں لیکن کوچ سے پہلے اپنے باپ سے پوچھ لیا ہوتا کہ غزنی کی فوج سے ٹکر لینے کی کتنی قیمت دینی پڑتی ہے۔ یہاں سے اپنی جنگی قوت کا انجام دیکھو۔"

سکھ پال نے دیکھا۔ دور دور تک اُس کی بکھری ہوئی فوج کا کشت و خون ہو رہا تھا۔ ہر طرف مسلمان دندناتے اور نعرے لگاتے پھر رہے تھے جن ہاتھیوں پر ہندوؤں کو ناز تھا، وہ منہ زور اور بے لگام اِدھر اُدھر چیختے چنگھاڑتے اور بھاگتے پھر رہے تھے۔ اور سکھ پال کانپ رہا تھا۔ اُسے اپنا سینا پتی راج گوپال کہیں بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

"میرے ساتھ کیا سلوک ہو گا؟" سکھ پال نے پوچھا۔

"اپنی قسمت کا فیصلہ خود کرو" سلطان محمود نے کہا۔ "فیصلہ کرنے سے پہلے اپنے آپ کو یقین دلاؤ کہ بت اور مورتیاں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتیں۔ حقیقی خدا کو مانو اور اسی کی عبادت کرو۔ مجھے اسی خدا نے صرف اس مہم میں یہ تیسری فتح دی ہے۔"

"میں اپنے مذہب سے بیزار ہوں" سکھ پال نے کہا۔

سلطان محمود نے مولوی سعید اللہ قاضی کو بلایا اور انہیں کہا کہ اس لڑکے کو لے جائیے۔ یہ قیدی نہیں لیکن یہ آزاد بھی نہیں۔ یہ اپنے مذہب سے بیزار ہے۔ مولوی سعید اُسے اپنے ساتھ لے گئے۔ سلطان محمود نے حکم دیا کہ اس نوجوان کی خوب خاطر تواضع کرو۔

تیسرے روز سلطان محمود نے ملتان کی طرف کوچ کا حکم دے دیا۔ اُس کے سامنے دو سو میل طویل مسافت تھی اور اُسے دو دریا چناب اور راوی عبور کرنے تھے۔ اُس کی رفتار بہت تیز تھی۔ بیل گاڑیاں سست جاتی تھیں۔ سلطان محمود نے جنگی تدبیر

کی بیڑیاں کھلوا کر لوہے کے کڑے اُن کے گلوں میں ڈال دیئے تھے تا کہ بھاگ نہ جائیں جہاں بیل گاڑیاں دلدل، ریت یا چڑھائی کی وجہ سے سست ہو جاتی تھیں، جنگی قیدی گاڑیوں کو دھکیلتے تھے۔ اس سے رفتار سست نہ ہوئی۔

داؤد بن نصر بھیرہ سے اس اطلاع کا منتظر تھا کہ لاہور اور بھٹنڈہ کی فوج تیار ہے اور وہ بھیرہ کو محاصرے میں لینے کے لیے کوچ کرے۔ اُسے یہ اطلاع دینے والے بھیرہ میں قید ہو چکے تھے۔ داؤد کوچ کرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ وہ تو ہندوؤں کا نمک حلال کرنے کے لیے فوج کو تیار رکھے ہوئے تھا۔

اُسے بھیرہ سے تو کوئی اطلاع نہ ملی، ملتان کے گرد و نواح سے اُسے یہ اطلاع دی گئی کہ ایک فوج بڑی تیز رفتاری سے بڑھی آ رہی ہے۔ داؤد بن نصر دوڑا ہوا شہر کی دیوار پر چڑھ گیا اور ایک برج میں کھڑے ہو کر دیکھا۔ فوج قریب آ گئی تھی۔ داؤد نے شہر کے دروازے بند کرنے کا حکم دے دیا اور فوج کو محاصرے میں لڑنے کے لیے دیوار پر بلا لیا۔ اُس کے دیکھتے ہی دیکھتے باہر فوج نے شہر کو محاصرے میں لے لیا۔

سلطان محمود غزنوی کے حکم سے داؤد بن نصر کو للکارا گیا کہ وہ شہر کے دروازے کھول دے اور صلح کے لیے باہر آ جائے، ورنہ شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے گی۔

اس للکار کا جواب دیوار سے آیا۔ قرامطی مرنے سے پہلے شہر نہیں دیں گے۔ ہمت ہے تو آؤ اور دروازے کھول لو۔

سلطان محمود کو قرامطیوں کے متعلق غلط اطلاعیں ملی تھیں۔ اُس کا خیال تھا کہ گناہوں میں ڈوبے ہوئے قرامطی لڑنے سے گریز کریں گے اور وہ جنگجو نہیں ہوں گے۔ انہوں نے جب مقابلہ شروع کیا تو سلطان محمود کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ غزنی کے مجاہد دیوار تک پہنچنے کی کوشش کرتے تھے تو اوپر سے تیروں کی اتنی بوچھاڑیں آتی تھیں کہ ان میں بمشکل آدھے زندہ واپس آتے تھے۔

سات دن محاصرہ رہا۔ سلطان محمود نے حکم دیا کہ محاصرہ طویل نہیں ہو گا۔ آٹھویں روز اُس نے تمام شہر کے گرد گھوم کر اپنی فوج سے کہا کہ ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ محاصرہ کر کے بیٹھے رہیں۔ خدا نے تمہیں ہر میدان میں فتح دی ہے۔ تم اس دیوار کو بھی توڑ لو گے۔ اپنے اللہ کے نام پر قربان ہو جاؤ۔ یہ وہ دشمن ہے جس نے اسلام میں باطل کی آمیزش کر رکھی ہے۔

سلطان نے اپنی فوج کو جوش دلایا اور محاصرہ اُٹھا کر فوج کو شہر کے دروازوں کے سامنے کھڑا کر دیا۔ اُس نے درخت کٹوائے اور ان کے سیدھے اور مضبوط تنے کاٹ کر دو دو ہاتھیوں کے درمیان سیدھے باندھ دیئے۔ ہاتھی دوڑتے ہوئے دروازے تک جاتے تھے تو شہتیر دروازے سے ٹکراتے تھے۔ بیلوں کو بھی استعمال کیا گیا۔ انسانوں نے بھی دروازے توڑنے کی کوشش کی اور جانیں قربان کرتے گئے۔

یہ سلسلہ تین روز چلتا رہا۔ ہر دروازے کے اوپر تیروں کا مینہ برسایا گیا۔ تکبیر کے نعروں میں دروازوں کے ساتھ ہاتھی ٹکراتے اور زخمی ہو کر بھاگتے رہے۔ اندر کی فوج کی توجہ دروازوں کی طرف کر کے دیوار میں شگاف ڈالنے کی بھی کوشش ہوتی رہی۔ شہر کے اندر شہریوں نے قیامت بپا کر رکھی تھی۔ وہ نعروں اور دروازوں کے دھماکوں سے خوف زدہ ہوئے جا رہے تھے۔

دو مؤرخ عتبی اور عنصری لکھتے ہیں کہ اندر مسلمانوں (غیر قرامطیوں) کو جب پتہ چلا کہ حملہ آور غزنی کے مسلمان ہیں تو انہوں نے اندر سے دروازے کھولنے کیلئے ہلہ بول دیا لیکن سب کو قتل کر دیا گیا۔

آخر چوتھے روز داؤد بن نصر نے گھبرا کر سلطان محمود کو پیشکش کی وہ بیس ہزار درہم سالانہ ادا کرتا رہے گا اور اُس کی اطاعت قبول کر لے گا۔ بعض مؤرخوں نے یہ رقم بیس لاکھ لکھی ہے۔ سلطان محمود نے یہ پیشکش قبول نہ کی۔ اُس نے دروازوں پر ایک ہلہ بولا اور دو تین دروازے توڑ لیے۔ قرامطیوں نے اپنے عقیدے کے تحفظ کے لیے خون کی بے دریغ قربانی دی۔ انہوں نے ملتان کی گلیوں میں مسلمانوں کے ساتھ

زندگی کا آخری معرکہ لڑا۔ اُن کی عورتیں اور بچے بھی لڑے، لیکن مسلمانوں کے قہر کے آگے فنا ہوتے گئے۔

عتبی اور عنصری لکھتے ہیں: "سلطان محمود کو جب پتہ چلا کر مسلمانوں نے اندر سے دروازہ کھولنے کی کوشش کی، اور قرامطیوں کے ہاتھوں مارے گئے ہیں، تو اُس نے تلوار نکال لی اور قرامطیوں کے قتلِ عام کا حکم دے دیا۔ شہر کے مغربی طرف کے دروازے سے قرامطیوں کا خون ندی کی طرح بہ نکلا۔ سلطان محمود نے اتنے قرامطی قتل کیے کہ اس کے بعد اُس کا ہاتھ تلوار کے دستے پر اکڑ گیا۔ انگلیاں کھلتی نہیں تھیں۔ ہاتھ خون سے دستے کے ساتھ چپک بھی گیا تھا۔ اُس کا ہاتھ دستے سمیت گرم پانی میں رکھا گیا تو اُس کی انگلیاں کھلیں۔"

داؤد بن نصر لاپتہ ہو گیا۔ بہت تلاش کے باوجود نہ مل سکا۔ اس کے ساتھ ہی وہ تاریخ سے ہی لاپتہ ہو گیا اور قرامطی فرقہ ایک بھولی بسری کہانی بن کے رہ گیا۔ سلطان محمود نے قرامطیوں کی عبادت گاہ کو زمین سے ملا دیا تھا۔

عالم، درویش اور اُن کے گروہ کا کوئی آدمی زندہ نہ رہا۔

ملتان میں قرامطیوں کے نشان اور یادگاریں مٹا کر سلطان محمود نے ملتان کو اپنا مستقل اڈہ بنانے کا منصوبہ بنایا مگر غزنی سے ایک قاصد آیا جسے ہرات کے گورنر ارسلان جاذب نے بھیجا تھا۔ پیغام یہ تھا کہ کاشغر کے بادشاہ ایلک خان نے غزنی کی سلطنت پر حملہ کر دیا ہے۔ سلطان محمود دسرکچڑ کے بیٹھ گیا۔

اُس نے ابو علی سنجوری کو ملتان کا امیر یا گورنر مقرر کیا اور بھیرہ پہنچا۔ وہاں اُسے پتہ چلا کہ سکھ پال نے اسلام قبول کر لیا ہے اور وہ اب سلطان محمود کا مرید اور غلام بنا رہے گا۔ سلطان محمود کا دماغ اب غزنی پہنچ گیا تھا۔ اُس نے سکھ پال کو بھیرہ کا امیر مقرر کر دیا۔ سلطان کو کہا گیا کہ سانپ کے بچے پر بھروسہ نہ کرے لیکن وہ نہ مانا اور غزنی کے لیے روانہ ہو گیا۔

سکھ پال آستین کا سانپ ثابت ہوا۔

جب دشمن پر اعتبار کیا

سلطان محمود غزنوی نے راجہ انند پال کو شکست دی اور اپنی راجدھانی میں جانے کی بجائے کشمیر کے کسی مقام پر چلا گیا۔ پھر محمود غزنوی نے بھیرہ کے راجہ بجی رائے کو ایسی شرمناک شکست دی کہ اس ہندو راجے نے خودکشی کر لی۔ اس کے بعد سلطان نے قرامطی فرقے کو ختم کر کے اسلام کے چہرے سے یہ بدنما داغ دھو ڈالا اور ملتان کی ریاست کو بھی اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ محمود غزنوی اپنی جس کامیابی پر بہت خوش تھا، وہ انند پال کے بیٹے سکھ پال کا قبولِ اسلام تھا۔ سکھ پال تو لاہور سے بڑے طمطراق سے بھیرہ پر حملہ آور ہوا تھا۔ اُس کی ماں نے اس امید پر اُسے بھیرہ بھیجا تھا کہ وہ محمود غزنوی کو قیدی بنا کر لائے گا اور اپنے باپ کا جانشین بنے گا، لیکن اُسے سلطان محمود غزنوی کے آگے نہ صرف ہتھیار ڈالنے پڑے بلکہ اُس نے اپنا مذہب بھی سلطان کے قدموں میں رکھ دیا۔

سکھ پال نے مولوی سید اللہ قاسمی کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا اور اس عالم نے سکھ پال کا نام نواسا شاہ رکھا۔ سلطان محمود غزنوی نے اپنے مشیروں کے منع کرنے کے باوجود اس نومسلم کو بھیرہ کا امیر مقرر کر دیا۔ امیر کی حیثیت آج کے گورنر کی ہوا کرتی تھی۔

راجہ انند پال اور اُس کے بیٹے سکھ پال کو ہندوستان میں یہ اہمیت حاصل تھی کہ یہ خاندان پنجاب کا حکمران تھا اور پنجاب ہندوستان کا دروازہ تھا۔ پنجاب کی اہمیت سے سلطان محمود واقف تھا۔ اُس نے بھیرہ اور ملتان کو اپنی سلطنت میں شامل کر کے ہندوستان کا دروازہ توڑ لیا تھا مگر اُسے اس دروازے میں داخل ہوتے ہی غزنی واپس جانا پڑا کیونکہ

اُسے اطلاع ملی تھی کہ کاشغر کے حکمران ایلک خان نے غزنی پر حملہ کر دیا ہے۔

اس نے ملتان سے روانہ ہوتے ہی تیز رفتار قاصد کو اس حکم کے ساتھ بھیرہ بھیجا کہ وہاں کا امیر نواسا شاہ (سابق سکھ پال) اور فوج کے سالار اور نائب سالار اُسے بھیرہ سے پار دریائے چناب پر ملیں۔ ملتان کے امیر ابو علی بخوری اور ملتان میں رہنے والی فوج کے سالاروں اور نائب سالاروں کو وہ ساتھ لے آیا تھا۔

سلطان محمود جب بھیرہ کے قریب سے گزر کر دریائے چناب کے کنارے پہنچا، جن لوگوں کو اُس نے بلایا تھا، وہ وہاں موجود تھے۔ سب کو توقع تھی کہ سلطان وہاں کھانے کے لیے رکے گا۔ انہوں نے دریا کے کنارے کھانے کا انتظام کر رکھا تھا لیکن سلطان نے کھانے کی طرف دیکھا تک نہیں، گھوڑے سے اُترا اور سب کو اپنے سامنے کھڑا کر لیا۔

"میں ہندوستان سے اتنی جلدی واپس جانے کے لیے نہیں آیا تھا" اُس نے کہا "آپ سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں کیوں آیا تھا، پھر بھی آپ کو یاد دلا دیتا ہوں، کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے چلے جانے کے بعد آپ میں سے کوئی ہندوستان کے طلسم میں گرفتار ہو جائے۔ ہم یہاں اسلام کے سوکھے پیڑ کو ہرا بھرا کرنے آئے ہیں۔ ہم یہاں اُس خدا کا پیغام لے کر آئے ہیں جو وحدہٗ لاشریک ہے۔ ہم یہاں کے لوگوں کو بتانے آئے ہیں کہ خدا پتھر کے نہیں ہوا کرتے۔ ہم اپنے رسولِ مقبول صلعم کا پیغام لے کر آئے ہیں۔ آپ سب جانتے ہیں کہ جب یہ پیغام مسلمانوں کے لیے مشعلِ راہ بنا رہا، اسلام پھلتا پھولتا رہا، مگر بادشاہت کا نشہ جب طاری ہوا تو یہ مشعل ٹمٹمانے لگی اور اس کے نیچے اندھیرا ہو گیا۔۔۔۔

"ہندوستان میں بھی یہ مشعل آئی تھی۔ محمد بن قاسم نے اس سرزمین کو خدا کے نور سے منور کر دیا تھا مگر یہاں کے آسمان نے وہ وقت بھی دیکھا کہ یہاں مسجدیں ویران اور اذانیں خاموش ہو گئیں۔ بت پرستوں نے مسلمانوں کو تلوار کی نوک پر ہندو بنانا شروع کر دیا۔ مسلمانوں کے لیے یہ زمین تنگ ہو گئی۔ مسجدوں کی جگہ بت خانے اُبھر آئے۔ تلوار تک، مال و دولت اور عورت کو بھی اسلام کو نیست و نابود کرنے کے لیے استعمال کیا گیا۔ یہی

وہ چیزیں ہیں جو ایمان خرید لیا کرتی ہیں اور انہی دو چیزوں نے ہندوستان میں ایمان فروش پیدا کیے ہیں۔۔۔۔

"اور بادشاہی کی ہوس نے ہمارے بھائیوں کو اندھا کر دیا ہے۔ کاشغر کے ایلک خان نے غزنی پر حملہ کر دیا ہے۔ میں جانتا ہوں اُس کے دوست کون ہیں۔ وہ سب ہمارے دشمن نہیں اسلام کے دشمن ہیں۔ وہ میرے عزم اور میرے نظریات سے اچھی طرح آگاہ ہیں لیکن وہ اُن دھتکارے ہوئے لوگوں میں سے ہیں جن کے دماغوں، آنکھوں اور کانوں پر خدا نے مہریں لگا دی ہیں اور اُن کے لیے بخشش کے دروازے بند کر دیے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے ہیں اور اپنی رعایا کو بتاتے ہیں کہ یہی اسلام ہے جس کے وہ پیروکار ہیں اور مذہب کے پردے میں اپنے تخت و تاج کی سلامتی کے لیے لوگوں کو خانہ جنگی پر اُکساتے اور بھائی کو بھائی کا دشمن بناتے ہیں۔۔۔۔۔

"وہ اگر سچے اسلام کے شیدائی ہوتے تو میرا ساتھ دیتے اور ہندوستان کی طرف توجہ کرتے جہاں مسلمانوں پر عرصۂ حیات صرف اس لیے تنگ کیا جا رہا ہے کہ وہ مسلمان ہیں۔ میری نظریں مستقبل میں بہت دور تک دیکھ رہی ہیں۔ اگر ہم نے اس خطے میں اسلام کو زندہ نہ کیا تو یہاں ہندوؤں کے ہاتھوں ہمیشہ اللہ کا نام لینے والوں کا قتلِ عام ہوتا رہے گا۔ انہیں مورتیاں اور بت پوجنے والوں سے بچانے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ انہیں ہم اپنے ملک میں لے چلیں لیکن یہ شکست اور پسپائی ہو گی اور اس اقدام سے اسلام کی سلطنت سکڑتی جائے گی۔ ہر ملک خدا کی سرزمین ہے، اور جو سرزمین خدا کی ہے وہاں اُس کی ذاتِ باری کے پرستاروں کا وجود لازمی ہے۔ اسلامی سلطنت کی کوئی سرحد نہیں۔ ہم ہندوستان کو اسلامی سلطنت میں شامل کریں گے یا اس کے کچھ حصے میں اپنی حکومت قائم کر کے اسے اسلام کا مستقر اور قلعہ بنائیں گے۔ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو ہم روزِ محشر خدا کے حضور سرخرو نہیں ہوں گے۔۔۔۔

"آپ دیکھ رہے ہیں کہ میرے اپنے بھائی میرے راستے [illegible]

ہو گئے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ میں غزنی سے زندہ واپس آسکوں گا یا نہیں۔ اگر میں نہ آسکا تو یہ آپ کا فرض ہو گا کہ میں نے جس مہم کا آغاز کیا ہے اُسے آپ سر کریں.... اگر آپ دنیاوی جاہ و حشمت میں پڑ گئے تو سوائے تباہی اور بربادی کے اور کچھ بھی حاصل نہیں ہو گا.... بتوں کے آگے اپنے خدا کو شرمسار نہ کرنا۔ تم دیکھ رہے ہو کہ اس خطے میں صدیوں بعد اذانیں گونجنے لگی ہیں۔ ان اذانوں کو خاموش نہ ہونے دینا۔"

سلطان محمود غزنوی کی آواز آخر میں آکر رقت میں دب گئی۔ اُس نے کھانا نہ کھایا۔ گھوڑے پر سوار ہوا اور گھوڑا دریا میں ڈال دیا۔ اُس نے فوج کو کوچ سے روکا نہیں تھا۔ فوج دریا پار کر رہی تھی۔ اُسے بہت جلدی غزنی پہنچنا تھا۔

محمود غزنوی جن فوجی حکام اور اُمرا کو پیچھے چھوڑ گیا تھا، اُن میں نو مسلم نواسا شاہ بھی تھا۔ محمود غزنوی فارسی زبان میں بول رہا تھا، اس لیے ایک ترجمان نواسا شاہ کے پاس کھڑا کر دیا گیا تھا تاکہ وہ اُسے اُس کی زبان میں بتاتا جائے کہ سلطان کیا کہہ رہا ہے۔ جب سلطان چلا گیا تو سب وہاں سے شہر کی طرف چل پڑے۔ نواسا شاہ پر خاموشی طاری تھی۔ اُس کے ساتھ کسی نے بات کرنے کی کوشش کی بھی تو اُس نے مسکرانے کے سوا کوئی جواب نہ دیا۔

لاہور میں اُس کی ماں، رانی پریم دیوی اپنے محل کے ایک کمرے میں اُداس بیٹھی تھی۔ اُس کے خواب بھیرہ کے میدانِ جنگ میں ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گئے تھے۔ اُس کا بیٹا بھیرہ میں جنگی قیدی ہو گیا تھا۔ وہ تو راجکمار تھا۔ پریم دیوی کے آنسو بہنے لگے۔ اُس کا خاوند انند پال کشمیر بھاگ گیا تھا۔ وہ شاید اس لیے واپس نہیں آرہا تھا کہ محمود غزنوی لاہور پر حملہ کر کے قابض ہو چکا ہو گا۔ رانی پریم دیوی کو یہ غم کھا رہا تھا کہ اُس کی سوکن کا بیٹا ترلوچن پال باپ کی گدی کا جانشین ہو گا.... کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھلا۔ رانی نے دیکھا اُس کا سینا پتی راج گوپال آیا تھا۔

"... کیا خبر آئی ہے؟" رانی پریم دیوی نے پوچھا۔ "[illegible]

یہ مسلمان نہ جانے کیسے کیسے ظلم کر رہے ہوں گے۔ اُسے اندر ہی اندر قید خانے میں ڈال رکھا ہو گا۔ اُسے جانوروں جیسی خوراک دیتے ہوں گے۔"

اُس کے آنسو بہنے لگے۔ رندھیائی ہوئی آواز میں بولی۔ "وہ میرے بیٹے کو قتل کر چکے ہوں گے۔"

راج گوپال سر جھکائے کھڑا رہا۔ وہ شکست خوردہ سینا پتی (سپہ سالار) تھا۔ بھیرہ کی لڑائی سے بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگا اور لاہور پہنچا تھا۔

"تم بولتے کیوں نہیں راج گوپال؟" رانی نے اُسے غصے سے کہا۔ "تم میرے بیٹے کو قید سے چھڑا نہیں سکتے؟ کیا تم اپنی فوج کے ایک سو آدمی ایک راجکمار کے لیے قربان نہیں کر سکتے؟ کیا ہماری فوج میں راج دربار کی عزت پر قربان ہونے والے سپاہی نہیں ہیں؟ کیا وہ مسلمانوں کے بھیس میں وہاں تک نہیں پہنچ سکتے جہاں میرا راجکمار قید ہے؟" اُس نے ذرا اونچی زبان میں کہا۔ "کیا تم بھول گئے ہو کہ وہ مہاراج انند پال کا نہیں، تمہارا بیٹا ہے؟"

"میں کچھ بھی نہیں بھولا رانی!" راج گوپال نے کہا۔ "میں سب کچھ سوچ چکا ہوں۔ میں نے راجکمار کو بھیرہ سے اغوا کر لانے کے لیے آدمی تیار کر لیے تھے لیکن بہت بری خبر آئی ہے۔"

"کیا خبر آئی ہے؟" رانی پریم دیوی اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"سکھ پال اب سکھ پال نہیں رہا" راج گوپال نے کہا۔ "وہ نواسا شاہ بن چکا ہے۔"

"کیا اُسے زبردستی...؟"

"ہاں رانی!" راج گوپال نے کہا۔ "اُسے مسلمان بنا لیا گیا ہے اور محمود نے اُسے یہ انعام دیا ہے کہ اُسے بھیرہ کا امیر مقرر کر دیا ہے۔ وہ لاہور کی گدی کا جانشین نہیں بن سکا، بھیرہ کا حاکم بن گیا ہے۔"

"وہ مر جاتا تو زیادہ اچھا ہوتا" رانی نے آہ بھر کر کہا۔ "اُسے مر جانا چاہیے تھا۔ وہ اپنا مذہب نہ چھوڑتا.... کیا یہ پتہ نہیں چلا کہ اُس نے اپنی مرضی سے اپنا

مذہب چھوڑا ہے یا زبردستی اُسے مسلمان بنایا گیا ہے؟"

"اگر اُس پر زبردستی کی جاتی تو اُسے بھیرہ کا امیر نہ بنایا جاتا۔" راج گوپال نے کہا۔ "وہ نوجوان ہے، مسلمانوں کے جھانسے میں آگیا ہے۔"

"یہ تمہارا پاپ ہے۔" رانی پریم دیوی نے کہا۔ "تم اُسے قید میں چھوڑ کر خود بھاگ آئے تھے۔"

"کیا تم ساتھ نہیں تھیں؟" راج گوپال نے کہا۔ "تم نے اپنی آنکھوں میدانِ جنگ دیکھا ہے۔ ہم پر دریا کی طرف سے جو حملہ ہوا تھا، اس کی مجھے بالکل توقع نہیں تھی۔ رانی! میں نے تمہیں کہا تھا کہ ہمیں بھیرہ پر حملہ نہیں کرنا چاہیے۔ تمہارا خیال تھا کہ مسلمانوں کی آدھی فوج کٹ چکی ہے اس لیے مقابلہ نہیں کر سکے گی۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ ہماری فوج پر مسلمانوں کی دہشت طاری ہے اور یہ پشاور سے بھاگی ہوئی فوج ہے۔ اِس فوج کو یہ بھی معلوم تھا کہ ہمارا راجہ بھگوڑا ہے۔ وہ ابھی تک اپنی راجدھانی میں واپس نہیں آیا۔"

"مجھے اس مہاراجہ کی رانی کہلاتے ہوئے شرم آتی ہے۔" رانی نے کہا۔ "اگر وہ مر گیا تو میں چتا نہیں چڑھوں گی۔ میں ایک بھگوڑے خاوند کی چتا پر اپنے آپ کو نہیں جلاؤں گی۔"

"یہ میں پہلے ہی سوچ چکا ہوں۔" راج گوپال نے کہا۔ "اگر مہاراج کے خاندان نے تمہیں زبردستی چتا پر چڑھایا تو میں تمہیں بچا کر اتنی دُور لے جاؤں گا جہاں ہم تک کوئی نہیں پہنچ سکے گا۔"

"تم بھی اتنے بہادر نہیں رہے کہ میں تمہارے بھروسے کوئی بات کر دوں۔" — رانی پریم دیوی نے آہ لی۔ "تم نے میری محبت کی بھی پرواہ نہ کی۔ میں اپنے مہاراجہ خاوند کو تمہاری خاطر دھوکہ دے رہی ہوں۔ کیا راج دربار کا کوئی آدمی خواہ وہ کتنے ہی اونچے رتبے کا ہو، ایک رانی کے کمرے میں اس طرح آسکتا ہے جس طرح تم آتے ہو؟ سپاہی کو ہم اتنا بڑا آدمی نہیں سمجھا کرتے۔"

"کیا تم احسان جتا رہی ہو رانی؟" — راج گوپال نے کہا۔ "تم بھی بہت کچھ بھول

رہی ہو۔ میں نے تمہاری محبت کی خاطر یہ خطرہ مول لیا تھا کہ بھیرہ پر جا حملہ کیا اور ذلیل و خوار ہوا۔ تمہارے حکم سے فوج کو شہر سے باہر نہیں نکالا جا سکتا تھا۔ مہاراج آ گئے تو میں انہیں کیا جواب دوں گا؟ وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

"میں زندہ رہی تو تم بھی زندہ رہو گے۔" رانی نے کہا۔ "مہاراج کو میں جواب دوں گی۔ تم راجکمار سکھ پال کو بھیرہ سے نکال لینے کی کوشش کرو۔"

"مجھے جس آدمی نے خبر دی ہے کہ سکھ پال مسلمان ہو گیا ہے، اُس نے بتایا ہے کہ اُس نے اپنی مرضی سے اور خوشی سے اسلام قبول کیا ہے۔" راج گوپال نے کہا۔ "اسی لیے اُسے بھیرہ کا امیر بنایا گیا ہے۔"

"اُسے اغوا کراؤ۔" رانی نے کہا۔ "اُسے یہاں تک لے آؤ۔ اُس نے میرا دودھ پیا ہے۔ میرے دودھ میں ملاوٹ نہیں تھی۔ اُسے ہندو ماں کا دودھ مسلمان نہیں رہنے دے گا۔ اُسے لانا اس لیے بھی ضروری ہے کہ مہاراج مجھے اور تمہیں شکست معاف کر دیں گے۔ وہ یہ بھی برداشت نہیں کریں گے کہ راجکمار مسلمانوں کے آگے ہتھیار ڈال دے اور اُن کا مذہب قبول کر کے انہی کا ہو کے رہ جائے۔ اگر میری اور اپنی خیر چاہتے ہو تو سکھ پال کو بہلا پھسلا کر لاؤ یا اسے اغوا کر کے لاؤ۔ خود جاؤ۔ جان پر کھیل جانے والے فوجی تیار کرو۔ یہ کام کرنا ہے۔ وہ تمہارا خون ہے۔ وہ اُس عورت کا بیٹا ہے جس نے تمہاری خاطر اپنے خاوند کو دھوکہ دیا ہے.... میں محسوس کر رہی ہوں کہ مجھے میرے گناہ کی سزا مل رہی ہے۔ خاوند شکست کھا کر بھاگ گیا ہے اور بیٹا مسلمانوں کے قبضے میں چلا گیا ہے۔ میں پاپی ہوں۔"

وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس نے پُرعزم لہجے میں کہا۔ "اپنے راجکمار کو میں خود لاؤں گی۔ نہ لا سکی تو وہیں مر جاؤں گی۔"

"یہ میرا کام ہے۔" راج گوپال نے کہا۔ "اتنا مت تڑپو۔ میں انتظام کرتا ہوں۔ میں اُسے لے آؤں گا۔"

بھیرہ میں ایک سالار کے گھر میں محمود غزنوی کی فوج اور شہری انتظامیہ کے

چار پانچ حکام بیٹھے تھے۔

"ہم پر سلطان بہت نازک ذمہ داری ڈال گئے ہیں"۔ سالار نے کہا۔ "میں نے اپنے جاسوسوں کے ساتھ رابطہ قائم کر لیا ہے۔ راجہ انند پال ابھی تک سامنے نہیں آیا۔ وہ ہمارے ساتھ ٹکر لینے کی تیاریاں کر رہا ہوگا۔"

"سب سے زیادہ نازک ذمہ داری تو یہ ہے کہ سلطان ایک نومسلم کو یہاں کا امیر مقرر کر گئے ہیں"۔ نائب سالار نے کہا۔ "کیا ہمیں اس امیر پر اعتماد کرنا چاہیئے؟"

"اگر آپ سانپ کی کینچلی بدل دیں تو وہ سانپ ہی رہے گا، اس کی فطرت نہیں بدلے گی"۔ شہری انتظامیہ کے ایک حاکم نے کہا۔ "آپ لوگ غزنی سے آتے ہیں۔ میں یہاں کا رہنے والا ہوں۔ آپ ہندو کو مسلمان بنا سکتے ہیں لیکن اسے مسلمانوں کا دوست نہیں بنا سکتے۔ بھیرہ میں کئی ہندوؤں نے اسلام قبول کر لیا ہے لیکن وہ عام اور بے ضرر لوگ ہیں۔ وہ اسلام کے سانچے میں ڈھل جائیں گے۔ میں تسلیم نہیں کر سکتا کہ ایک راجکمار جس کے دادا کو آپ نے شکست دی اور اس نے خودکشی کر لی اور جس کے باپ کو آپ نے شکست دی اور وہ ابھی تک روپوش ہے، اس راجکمار کے دل سے آپ انتقام کی آگ کس طرح سرد کر سکتے ہیں۔ مجھے سمجھ نہیں آئی کہ محمود جیسے دانشمند سلطان نے کیا سوچ کر ایک ایسے نومسلم کو اتنا بڑا اعزاز دے دیا ہے۔"

"یہ نومسلم اپنی عادتیں کس طرح بدل سکے گا"۔ ایک اور نے کہا۔ "یہ شراب کا عادی ہوگا۔ ان کے ہاں ہر رات ناچ گانے ہوتے ہیں۔ ۱۰۰ جوان لڑکیاں ان کی خدمت میں موجود رہتی ہیں۔ کیا یہ اتنی جلدی مومن بن گیا ہوگا؟"

"ہم اس کے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکتے"۔ سالار نے کہا۔ "سلطان کا حکم ہے کہ امیر کی اطاعت کرو۔"

"لیکن اسلام کا حکم یہ ہے کہ امیر گناہ کرے یا غدار ثابت ہو تو اسے اٹھا کر باہر پھینک دو"۔ ایک اور حاکم نے کہا۔ "اور اس کی جگہ اسے دو جو مذہبی اور معاشرتی لحاظ سے اس رتبے اور ذمہ داری کے اہل ہو۔"

"تو ہمیں نظر رکھنی پڑے گی کہ امیر نواسا شاہ ہمیں دھوکہ تو نہیں دے رہا"۔ سالار نے کہا۔ "اس کے حکم سے راجہ بجی رائے کی فوج کے تمام ہندو جنگی قیدیوں کو باقاعدہ فوج میں شامل کر لیا گیا ہے۔ انہوں نے میری موجودگی میں سلطان محمود کی وفاداری کا حلف اٹھایا ہے۔"

"ہندو سپاہی کیسے ہیں؟"۔ ایک شہری حاکم نے پوچھا۔

"اچھے ہیں"۔ سالار نے جواب دیا۔ "ہمارے سپاہیوں کے ساتھ مل کر اور اچھے ہو جائیں گے۔ ہمیں ان کی ضرورت ہے۔ کچھ فوج سلطان اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔ اگر انند پال نے حملہ کر دیا تو ہماری فوج اتنی تھوڑی ہے کہ مقابلہ نہیں کر سکے گی۔ سلطان اجازت دے گئے ہیں کہ ہندوؤں کو فوج میں شامل کر لیا جائے اور ان کی تنخواہیں زیادہ مقرر کی جائیں اور انہیں مراعات بھی زیادہ دی جائیں۔"

یہ محفل کسی نتیجے پر پہنچے بغیر برخاست ہو گئی۔

نواسا شاہ نے اپنی عادتیں بدل لی تھیں۔ اس نے کبھی شراب کا نام بھی نہیں لیا تھا۔ مولوی سعید اللہ قاسمی اسے قرآن پڑھاتے اور معنی بھی سمجھاتے تھے۔ اس نے نماز پڑھنی شروع کر دی تھی۔ وہ اسلام کی تعلیمات سے متاثر ہو چکا تھا۔ ایک روز اس نے ان پانچ ہزار ہندوؤں کو ایک میدان میں لانے کا حکم دیا جو اس وقت تک سلطان محمود کی فوج کا اہم حصہ بن چکے تھے۔

"میں تم میں سے کسی کو بھی نہیں کہوں گا کہ وہ اپنا مذہب بدل لے اور مسلمان ہو جائے"۔ اس نے ہندوؤں کے دستوں سے خطاب کیا۔ "مذہب تمہارا اپنا معاملہ ہے۔ میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے اسلام قبول کر کے جو سکون پایا ہے وہ مجھے ہندو مت میں نہیں ملا تھا۔ تم نے دیکھ لیا ہے کہ تم لوگوں نے مسلمانوں سے کس طرح شکست کھائی ہے۔ تم قلعہ بند ہو کر بھی نہ لڑ سکے اور تم کھلے میدان میں بھی نہ لڑ سکے، حالانکہ مسلمان بہت دور سے آئے تھے اور ان کے پاس نفری بھی کم تھی اور ساز و سامان بھی کم تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ انہیں یہاں سے کوئی

مدد نہیں ملے گی مگر انہوں نے فتح حاصل کر لی۔ یہ ایمان کی قوت ہے جو ہم میں سے کسی میں بھی نہیں تھی ....

”میں نے وہ قوت حاصل کر لی ہے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہیں اپنا مذہب بدلنے کے لیے کوئی نہیں کہے گا۔ یہ فیصلہ تم خود کرو۔ میں تمہیں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جس کا نمک کھایا ہو اُس کے ساتھ غداری نہ کرنا۔ میں نے تمہیں بہت بڑی غلامی سے بچایا ہے۔ تم جنگی قیدی ہنے پھر غلام بنا لیے گئے۔ سلطان تمہیں غلاموں کی حیثیت سے غزنی لے جانا چاہتے تھے۔ بھیرہ سے ملتان تک کا سفر یاد کرو جب تم گھوڑوں اور بیلوں کی طرح رسد کی گاڑیاں دھکیلتے اور گھسیٹتے گئے تھے۔ تمہاری گردنوں میں لوہے کے کڑے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے وہ کڑے کٹوا کر تمہیں مویشی سے انسان بنا دیا ہے۔ تم سپاہی ہو جنگجو ہو۔ تمہاری عزت اسی میں ہے کہ تمہاری تلواریں تمہارے پاس ہوں۔ اپنی عزت کو قائم رکھنا تمہارا کام ہے۔ تمہیں کوئی تکلیف ہو، کسی مسلمان کے خلاف کوئی شکایت ہو تو مجھے بتاؤ۔ اگر تم سچے ہندو ہو تو سچے بن کر دکھاؤ۔ میرا باپ مہاراجہ انند پال ہم پر حملہ کرے گا۔ تم دیکھنا کہ میں اپنے باپ کے خلاف کس طرح لڑوں گا۔“

اُس کے بولنے کا انداز ایسا تھا کہ کئی آوازیں سنائی دیں — ”ہم غداری نہیں کریں گے۔ ہم مسلمانوں پر ثابت کریں گے کہ ہندو دھوکہ نہیں دیا کرتے۔“

نواسا شاہ کے حکم سے ہر ہندو فوجی کو چاندی کے دس دس درہم انعام دیا گیا۔

یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ سُکھ پال نے اسلام قبول کرنے سے پہلے یہ شرط عائد کی تھی کہ بھیرہ کا مندر ہندوؤں کی عبادت کے لیے محفوظ رہنے دیا جائے یا سلطان محمود نے ہندوؤں کو خوش کرنے کے لیے مندر کو نہیں چھیڑا تھا۔ اُسے شاید اپنی فوج کی کمی کا احساس تھا اس لیے اُس نے ہندوؤں کے مذہبی جذبات کا احترام کیا تھا۔ بہرحال بھیرہ کا مندر محفوظ تھا۔

اُس رات مندر میں چھ اجنبی پنڈت کے کمرے میں بیٹھے تھے۔ پنڈت انہیں کہہ رہا تھا ”قتل کرنا آسان ہے۔ وہ کبھی کبھی شہر سے باہر بھی جایا کرتا ہے۔ ایک تیر کافی ہے۔ اگر قاتل پکڑا گیا تو ہم اس ایک آدمی کی قربانی دے سکتے ہیں۔“

”ہم اُسے قتل کرنے نہیں آئے“۔ ایک اجنبی نے کہا۔ ”اُسے اغوا کر کے لاہور لے جانا ہے۔ اس کی ماں اسے زندہ اپنے پاس دیکھنا چاہتی ہے۔“

”میں بھی اُسے زندہ ہی دیکھنا چاہتا ہوں“۔ پنڈت نے کہا۔ ”لیکن ہندو کے روپ میں۔ میں اسے نواسا شاہ سے پھر سُکھ پال بنانے کے لیے پریشان ہو رہا ہوں۔ اُس نے اپنی فوج کی ہی توہین نہیں کی، اپنے مذہب کو ناپاک کر دیا ہے۔ ہم نے ہزاروں مسلمانوں کو ہندو بنایا ہے۔ اگر ہندو راجے مہاراجے مسلمان ہونے لگے تو یہ مندر کھنڈر بن جائیں گے اور دیوی دیوتاؤں کا ہم پر قہر نازل ہوگا۔“

”آپ ہماری رہنمائی کریں“۔ ایک اجنبی نے کہا۔ ”ہمیں بتائیں کہ سُکھ پال کب شہر سے باہر نکلے گا یا اُسے شہر سے باہر نکالنے کا کوئی ذریعہ پیدا کریں ... کیا آپ اسے کسی جال میں لا سکتے ہیں؟“

پنڈت گہری سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا۔ ”ہاں میں ایک جال تیار کر سکتا ہوں۔ تم مندر میں ہی ٹھہرے رہو۔ یہاں تم پر کوئی شک نہیں کر سکتا۔ ایک دو دن انتظار کرو.. میں حیران ہوں کہ وہ اتنی جلدی اتنا پکا مسلمان کس طرح بن گیا ہے۔“

”پکے ذہن کا جوان آدمی ہے“۔ ایک آدمی نے کہا۔ ”مسلمانوں کے جھانسے میں آگیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ محمود اسے یہاں کے ہندوؤں کو گمراہ کرنے کے لیے استعمال کرے گا ورنہ غزنی کا سلطان ایسی حماقت نہیں کر سکتا کہ کل جس نے اُس سے لڑ کر ہتھیار

WWW.PAKSOCIETY.COM

ڈالے ہوں اور اپنا مذہب بھی تبدیل کر لیا ہو، اُسے محمود اتنے بڑے علاقے کا حکمران بنا دے۔ اپنے مذہب اور ملک کے لیے سکھ پال کو یہاں سے غائب کرنا لازمی ہے خواہ ہماری جانیں چلی جائیں۔

ان چھ آدمیوں کو راج گوپال اور راجہ انند پال کی رانی پریم دیوی نے سکھ پال کے اغوا کے لیے بھیجا تھا۔ یہ لاہور کی فوج کے چنے ہوئے بہادر اور ذہین آدمی تھے۔ رانی نے انہیں سونے کی صورت میں انعام دینے کا وعدہ کیا تھا اور یہ بھی کہ کامیابی کی صورت میں انہیں دو راتیں راج محل میں رکھا جائے گا جہاں وہ ویسی ہی عیش وعشرت کریں گے جیسی ہمارا جے کرتے ہیں۔ انعام کے لالچ کے علاوہ ان چھ آدمیوں میں مذہب کا جنون پیدا کیا گیا تھا۔ انہیں بتایا گیا تھا کہ وہ ہندو راجکمار کو مسلمانوں کے قبضے سے نہ چھڑا سکے تو دیوتاؤں کا قہر انہیں بھسم کر ڈالے گا۔

یہ چھ آدمی خالی ہاتھ واپس جانے کے لیے نہیں آئے تھے۔ وہ درویشوں کے لباس میں بھیرہ میں داخل ہوئے اور رات کے اندھیرے میں مندر میں چلے گئے تھے۔ انہوں نے پنڈت کو بتایا تھا کہ وہ یہاں کیوں آئے ہیں۔ انہوں نے یہاں تک کہا تھا کہ وہ نواسا شاہ کی خواب گاہ میں داخل ہو کر اُسے اٹھا لے جانے کو تیار ہیں۔ پنڈت نے انہیں روک دیا تھا کیونکہ اس طریقے سے کامیابی کا کم اور مارے جانے کا خطرہ زیادہ تھا۔ پنڈت نواسا شاہ کو کسی پھندے میں لانے کی سوچ رہا تھا۔

دو تین روز بعد پنڈت کو پتہ چلا کہ امیر بھیرہ کہیں سے واپس آتے ہوئے مندر کے سامنے سے گزر رہا ہے۔ پنڈت مندر سے نکلا اور راستے میں کھڑا ہو گیا۔ نواسا شاہ گھوڑے پر سوار آ رہا تھا۔ دو گھوڑ سوار جو محافظ تھے، اُس کے آگے آگے تھے اور چار گھوڑ سوار اُس کے پیچھے تھے۔ پنڈت اور آگے ہو گیا۔ آگے والے محافظوں نے اُسے پیچھے ہٹ جانے کو کہا لیکن وہ نہ ہٹا۔ اس نے نواسا شاہ کی طرف دیکھ کر ہاتھ جوڑے پھر تعظیم میں جھک کر دوہرا ہو گیا۔ نواسا شاہ نے گھوڑا روک لیا۔ پنڈت کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ نواسا شاہ کو سلطان محمود غزنوی نے خاص طور

پر کہا تھا کہ وہ چونکہ ہندوستانی ہے اور ہندو بھی رہا ہے اس لیے وہ یہاں کے لوگوں، خصوصاً ہندوؤں کی فطرت اور عادات سے اچھی طرح آگاہ ہے۔ وہ بھیرہ اور گرد و نواح کے لوگوں سے ملتا ملاتا رہے اور ان کی شکایتیں سُنے اور انہیں ہر لحاظ سے مطمئن اور خوش رکھے تاکہ یہاں کے لوگ اپنے آپ کو غلام رعایا نہ سمجھیں۔

اسی ہدایت کے تحت نواسا شاہ باہر نکلا تھا۔ وہ وہاں کے کسانوں سے مل کر آ رہا تھا۔ پنڈت کو اُس نے راستے میں ہاتھ جوڑے کھڑا دیکھا تو وہ گھوڑے سے اتر آیا اور پنڈت سے پوچھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے؟

پنڈت نے اُسے دعائیں دے کر کہا۔ ”ہمیں خوشی ہے کہ آپ نے جو بہتر سمجھا وہ کیا ہے۔ ہم سلطان محمود غزنوی کے اس اقدام کی تعریف کرتے ہیں کہ انہوں نے آپ کی قدر کی اور آپ کو یہاں کی حکمرانی عطا کر دی۔“

”اس کے علاوہ آپ کو کچھ کہنا ہے؟“۔ نواسا شاہ نے کہا۔ ”اپنی اور سلطان کی تعریفیں سننے کے لیے میرے پاس وقت نہیں ہے۔ کوئی شکایت، کوئی تکلیف، کوئی مسئلہ بیان کریں۔“

”کوئی شکایت نہیں“۔ پنڈت نے کہا۔ ”ایک عرض ہے۔ حضور ہر جگہ جاتے ہیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ یہاں کی مسجدوں میں بھی گئے ہیں لیکن آپ مندر کو بھول گئے ہیں۔ کبھی وہاں بھی آئیں۔“

”مندر کی مرمت کی یا کسی اور چیز کی ضرورت ہے؟“

”نہیں حضور!“۔ پنڈت نے کہا۔ ”کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ اسے شکایت کہیں، جو کچھ بھی کہیں، بات یہ ہے کہ شہر کے سرکردہ ہندو کہتے ہیں کہ امیر ہر جگہ جا کر لوگوں کی شکایتیں سنتے ہیں، مندر میں نہیں آتے۔ شاید ہمیں پسند نہیں کرتے۔“

”میں کسی روز آؤں گا“۔ نواسا شاہ نے کہا۔

”دن اور وقت بتا دیں“۔ پنڈت نے کہا۔ ”ہم آپ کے رتبے کے مطابق کوئی انتظام کر لیں گے۔ دست بستہ حاضر رہیں گے۔“

نواساشاہ نے سوچ کر تین روز بعد کا دن اور وقت بتا دیا اور گھوڑے پر سوار ہو کر چلا گیا۔ پنڈت مندر میں گیا۔ لاہور سے آئے ہوئے چھ آدمی اس کے انتظار میں تھے۔ پنڈت نے انہیں بتایا کہ سکھ پال فلاں دن مندر میں آ رہا ہے اور وہ اس کے لیے جال تیار کرے گا۔

"لیکن تم لوگوں کو انتظار کرنا پڑے گا۔" پنڈت نے کہا۔ "ہو سکتا ہے میں نے جو سوچا ہے، وہ میری امید کے مطابق پورا نہ ہو۔ میری ایک کوشش ہے۔ سکھ پال جوان آدمی ہے۔ میں ان مہاراجوں اور راجکماروں کی کمزوریوں اور عادتوں سے واقف ہوں، اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ مسلمانوں کے ہاں مہاراجوں والی عیش و عشرت حرام ہے۔"

وہ دن آ گیا جس دن نواساشاہ کو مندر میں جانا تھا۔ مندر کے دروازے پر پنڈت نے پھولوں کے لمبے لمبے ہار لٹکا رکھے تھے۔ مندر کے ایک بڑے کمرے کو عروسی کے کمرے کی طرح سجایا گیا تھا۔ اندر ایسی خوشبو تھی جو نشے کی کیفیت طاری کرتی تھی۔ پھل اور میوے قرینے سے رکھے ہوئے تھے۔ چار نوعمر لڑکیاں کمرے میں کھڑی تھیں۔ نواساشاہ اس کمرے میں داخل ہوا تو لڑکیوں نے خوشنما ٹوکریاں اٹھا لیں اور نواساشاہ کے قدموں میں پھولوں کی پتیاں ٹوکریوں میں سے نکال کر پھینکنے لگیں۔ ان لڑکیوں کے بال کھلے ہوئے اور ان کے عریاں کندھوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ جب ذرا سا جھک کر پھول نچھاور کرتی تھیں تو ان کے جسم پھولدار پودوں کی طرح لہلہاتے تھے۔ ان کے لباس عام ہندو لڑکیوں سے بہت مختلف تھے۔ وہ کسی اور ہی دیس کی معلوم ہوتی تھیں۔ ان کے لبوں پر تبسم تھا۔

نواساشاہ کی نظریں ان لڑکیوں میں الجھ کر رہ گئیں۔ پنڈت نے ٹھیک کہا تھا کہ وہ مہاراجوں اور راجکماروں کی کمزوریوں سے واقف تھا۔ اس نے اس راجکمار کی دکھتی رگ اپنے ہاتھ میں لینے کا اہتمام کر رکھا تھا اور یہ اہتمام اثر دکھا رہا تھا....

فرشی دری بچھی ہوئی تھی اور اس پر مخمل کی چادریں بچھی تھیں۔ گول تکیے رکھے تھے ان کے غلاف بھی مخمل کے تھے۔ مختصر یہ کہ اس کمرے میں وہی سج دھج تھی جو مہاراجوں کے خاص کمروں کی ہوا کرتی تھی۔

نواساشاہ ایک تکیے کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ایک لڑکی نے جھک کر اس کے پاؤں پر عطر چھڑکا۔ اس نے نواساشاہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور لڑکی کے لبوں کا تبسم حجاب سے زیادہ نکھر آیا۔ اس شرمیلے تبسم نے نواساشاہ کو ہلا کے رکھ دیا۔ اس نے اپنے جذبات کی دنیا میں زلزلے کا شدید جھٹکا محسوس کیا۔ دوسری لڑکیوں نے اس کے آگے پھلوں کی طشتریاں رکھیں۔

"حضور کو تو معلوم ہے کہ مندر میں ماس نہیں آ سکتا۔" پنڈت نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "آپ کے لیے گوشت کا انتظام کر بھی دیتے تو آپ اسے ہاتھ نہ لگاتے کیونکہ یہ مسلمانوں کی طرح ذبح کیا ہوا نہ ہوتا۔ آپ ہمارے ہاتھ کا پکا ہوا قبول بھی نہ کرتے۔ یہ پھل حاضر ہیں۔"

"آپ نے جو حاضر کیا ہے، مجھے اس کی توقع نہیں تھی۔" نواساشاہ نے کہا اور اس نے مسکرا کر اس لڑکی کی طرف دیکھا جس نے اس کے پاؤں پر عطر چھڑکا تھا۔

میزبانوں میں ایک تو پنڈت تھا اور چھ وہ آدمی جو اس کے اغوا کے لیے لاہور سے آئے تھے۔ وہ معزز اور رئیس ہندوؤں کے لباس میں تھے۔ ان کے علاوہ دو اور ہندو تھے جو بھیرہ کے بہت بڑے تاجر تھے۔ یہ سب نواساشاہ کے آگے بچھے جا رہے تھے۔

کمرے میں تاروں کا ترنم نہایت آہستہ آہستہ ابھرنے لگا۔ نواساشاہ نے چونک کر دیکھا۔ ایک لڑکی بربط پر انگلیاں پھیر رہی تھی۔ اس نے اپنی زبان کا ایک نغمہ چھیڑ لیا۔ اس کی آواز میں سوز تھا۔ وہ گنگنا رہی تھی جیسے وہ ندی کنارے تنہا بیٹھی ہو اور اسے یہ احساس ہو کہ اردگرد کوئی بھی نہیں۔ نواساشاہ کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اس پر سحر طاری ہوا جا رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں خمار نظر آنے لگا تھا۔

لڑکی کی آواز جس طرح آہستہ آہستہ ابھری تھی اسی طرح آہستہ آہستہ خاموش ہو گئی۔ نواساشاہ کی نظریں لڑکی سے ہٹ نہ سکیں۔

"ہم نے آپ کو اس لیے نہیں مدعو کیا تھا کہ کوئی شکایت یا کوئی اپنی ضرورت آپ کی خدمت میں پیش کریں گے"۔ پنڈت نے کہا۔"ہم اپنے انداز سے آپ سے اپنی عقیدت اور اعتماد کا اظہار کرنا چاہتے تھے۔ ہمیں اپنا وفادار سمجھیں۔"

"آپ کا انداز بہت حسین ہے"۔ نواساشاہ نے کہا۔ اس کا لہجہ اب مسلمانوں کے امیر کا نہیں، ایک راجکمار کا تھا۔ اُس نے کہا۔ "کیا یہ لڑکی اسی قسم کا ایک اور گانا سنا سکتی ہے؟"

وہ لڑکی ایک پیشہ ور گانے والی کی بیٹی تھی لیکن نواساشاہ کو بتایا گیا کہ ایک شریف گھرانے کی بیٹی تھی، اور مندر کی داسی ہے۔ زیادہ تر بھجن گاتی ہے۔

لڑکی نے ستار کو چھیڑ کر ایک اور نغمہ شروع کیا۔ لڑکی کے گانے میں کوئی غیر معمولی کمال نہیں تھا۔ پنڈت نے ماحول ایسا طلسماتی بنا رکھا تھا کہ بھدی سی آواز بھی سریلی لگتی تھی۔ نواساشاہ ایسا مسحور ہوا کہ اُسے پتہ ہی نہ چلا کہ پنڈت کے سوا تمام میزبان کمرے سے نکل گئے ہیں۔

لڑکی کی آواز خاموش ہوگئی تو نواساشاہ تصوروں کی مترنم گونج میں کھویا سا اچانک بیدار ہوا اور بولا۔ "باقی سب کہاں گئے ہیں؟"

"وہ آپ کی اس کیفیت میں مخل نہیں ہونا چاہتے تھے"۔ پنڈت نے کہا۔"میں نے انہیں اشارہ کرکے اُٹھا دیا ہے۔"

پنڈت نے ایک لڑکی کو اشارہ کیا اور چاروں لڑکیاں جھک کر اُلٹے قدموں دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ نواساشاہ ٹھٹھک کر رہ گیا۔

"یہ چلی کیوں گئی ہیں؟" اُس نے تشنہ سی آواز میں پوچھا۔

"مسلمانوں کے ہاں یہ راگ رنگ حرام ہے"۔ پنڈت نے کہا۔"میں نے انہیں کمرے سے نکل جانے کا اشارہ کیا تھا۔ اگر آپ چاہیں تو بلا لیتا ہوں"۔

"نہیں"۔ نواساشاہ نے کہا۔"یہ راگ رنگ حرام ہے"۔

"حضور!"۔ پنڈت نے کہا۔"ایک بات کہوں۔ بری لگے تو معاف کر دینا...... آپ نے دل سے نہیں کہا کہ یہ سب حرام ہے۔ اپنے دل پر جبر نہ کریں۔ میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ انسانوں کے دلوں کی بات اُن کی آنکھوں میں پڑھ لیا کرتا ہوں۔ آپ نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ اچھا کیا ہے۔ آپ کو اسلام کے اصولوں کی پابندی کرنی چاہیئے لیکن آپ جوان ہیں۔ اپنے دل پر پتھر نہ رکھیں، ورنہ آپ کا دل ان پابندیوں سے باغی ہو جائے گا اور آپ کی زندگی جہنم بن جائے گی۔ اپنی عادتیں اور اپنی فطرت آہستہ آہستہ بدلیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ یکلخت شراب بھی ترک کر دیں اور وہ عیش و عشرت بھی جس میں آپ جنے پلے اور جوان ہوئے ہیں۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ اس ماحول کو اور ان لڑکیوں کو دیکھ کر آپ دوراہے پر آ رکے ہیں۔ آپ کے اندر مسلمان اور ہندو کا تصادم ہو رہا ہے۔ یہ ہوتا رہے گا اور آہستہ آہستہ ختم ہو گا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ مسلمان کو ہندو پر غالب آنے دیں لیکن ہندو کو راضی رکھ کر اس سے نجات حاصل کریں"۔

نواساشاہ پنڈت کی باتوں کے حسین جال میں آ گیا تھا۔ اُس کا چہرہ کھل اُٹھا تھا۔ اُس نے بے ساختہ کہا۔"آپ کی باتیں میرے دل میں اُتر رہی ہیں۔ صاف بتائیں آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"میں یہ کہہ رہا ہوں کہ میں نے آپ کے لیے یہ اہتمام صرف اس لیے کیا ہے کہ آپ کو اس کی ضرورت ہے"۔ پنڈت نے کہا۔"آپ کی یہ ضرورت پوری ہونی چاہیئے لیکن چوری چھپے۔ میں نہیں چاہتا کہ کسی کو پتہ چلے کہ آپ نے مندر میں اپنے محل کی راتوں کو تازہ کیا ہے۔ آپ کو سلطان نے جو رتبہ دیا ہے اس پر مجھے فخر ہے۔ میں آپ کی پردہ پوشی کروں گا۔ آپ کی مدد بھی کروں گا کہ آپ کی جذباتی ضروریات بھی پوری ہوتی رہیں اور آپ کو مسلمانوں کی طرف سے جو نازک ذمہ داری سونپی گئی ہے، اس سے بھی آپ کوتاہی اور چشم پوشی نہ کر سکیں۔ پھر آپ آہستہ آہستہ ذہن سے عیش و عشرت کو نکالتے چلے جائیں"۔

نواساشاہ جوان تھا۔ چار پانچ ماہ پہلے تک وہ محلات کی ان عیاشیوں میں رہا تھا جنہیں جائز سمجھا جاتا تھا۔ اُس نے مسلمان ہو کر اپنا دل مار لیا تھا۔ مولوی عبداللہ قاسمی اور امارت کے حکام نے اُسے اسلامی سانچے میں ڈھالنا شروع کر دیا تھا۔ وہ نئی زندگی اور نئے مذہب کو خوشی قبول کر چکا تھا اور اُس نے فرائض سرانجام دینے شروع کر دیئے تھے مگر پنڈت نے اُس کے اس اقدام کو سراہتے ہوئے نہایت آہستگی سے [illegible]

کے اندر ہندو راجکمار کو بیدار کر دیا۔ نواسا شاہ نے اتنی حسین لڑکیوں کو، اُن کے تبسم اور اُن کے طلسماتی انداز کو دیکھا تو وہ ڈگمگانے لگا۔

"اگر میرے ماتحت حاکموں کو پتہ چل گیا تو میرا اعتماد ختم ہو جائے گا"۔ نواسا شاہ نے کہا۔ "وہ مجھ پر الزام عائد کریں گے کہ میں ہندوؤں کے ساتھ مل گیا ہوں"۔

"کسی کو پتہ نہیں چلنے دیا جائے گا"۔ پنڈت نے اُسے اپنی زنجیروں میں اور زیادہ مضبوطی سے جکڑنے کے لیے کہا۔ "میں آپ کو ذمہ داریوں سے بھی نہیں ہٹنے دوں گا اور میں آپ کو اسلام سے بھی منحرف نہیں ہونے دوں گا، لیکن میں آپ کو یہ بتا دوں کہ مسلمان اُمراء بھی چوری چھپے عیاشی کرتے ہیں۔ ان میں کوئی بھی ایسا نہیں جس کی صرف ایک بیوی ہو۔ انہوں نے تین تین چار چار بیویاں رکھی ہوئی ہیں۔ وہ بیویاں بدلتے رہتے ہیں۔ جو پرانی ہو جاتی ہے اُس کی جگہ نئی لے آتے ہیں"۔

نواسا شاہ کے چہرے پر رونق آتی جا رہی تھی۔ پنڈت نے زہر میں بجھا ہوا ایک اور تیر چلایا۔ اُس نے کہا۔ "آپ اپنے جن ماتحت حاکموں کی بات کر رہے ہیں کبھی اُن کے گھروں میں جھانکیں۔ وہ اپنی بیویوں کو ساتھ نہیں لائے۔ یہاں اُن کی راتیں ہندو لڑکیوں کے ساتھ بسر ہو رہی ہیں۔ وہ شراب بھی پیتے ہیں، اور صبح جب آپ کے سامنے آتے ہیں تو پکے مسلمان ہوتے ہیں"۔

"میں انہیں روک سکتا ہوں"۔ نواسا شاہ نے کہا۔ "مجھے سلطان نے کہا تھا کہ کسی کو عیش و عشرت میں نہ پڑنے دینا، کسی حاکم کا گناہ معاف نہ کرنا"۔

"اگر آپ ایسا کریں گے تو آپ سازش کا شکار ہو جائیں گے"۔ پنڈت نے کہا۔ "یہ لوگ آپ پر ایسے الزام عائد کریں گے کہ سلطان محمود بھی چکرا جائے گا اور آپ کو اس جرم میں جلاد کے حوالے کر دیا جائے گا کہ آپ نے دل سے اسلام قبول نہیں کیا تھا اور آپ اندر سے ہندو رہ کر سلطنت کو نقصان پہنچا رہے ہیں ... آپ نوعمر ہیں۔ انسانی فطرت کو آپ نہیں سمجھ سکتے۔ انسان اپنے نفس کا غلام ہے۔ اس کی نفسیاتی ضروریات پوری نہ ہوں تو وہ اپنے روزمرہ فرائض خوش اسلوبی سے سرانجام نہیں دے سکتا۔ آپ اپنے

اوپر جبر نہ کریں۔ کبھی کبھار یہاں آ جایا کریں۔ مجھے آپ اپنا مخلص دوست پائیں گے"۔

"میں آیا ہوا تو ہوں"۔ نواسا شاہ نے کہا۔

"نہیں"۔ پنڈت نے کہا۔ "باہر آپ کے محافظ کھڑے ہیں۔ آپ کے عملے کو معلوم ہے کہ آپ یہاں آئے ہوئے ہیں۔ ہو سکتا ہے ایک دو جاسوس بھی موجود ہوں۔ میں آپ کے خلاف کوئی بات نہیں ہونے دوں گا۔ اب آپ چلے جائیں۔ رات کو اس طرح یہاں آئیں کہ کوئی آپ کو باہر نکلتے اور یہاں آتے نہ دیکھ سکے۔ آپ کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ یہاں سے آپ کو خیریت سے واپس لے جانا میرا کام ہے"۔

"یہ لڑکیاں موجود ہوں گی؟" نواسا شاہ نے کہا۔ "میں یہ گانا سننا چاہتا ہوں"۔

"آپ آئیں گے تو انہیں حاضر کر لیا جائے گا"۔ پنڈت نے کہا۔ "اور شراب وہ پیش کروں گا جس کی بو نہیں ہو گی۔ یہ شراب راجہ بجی رائے کے لیے قنوج سے آیا کرتی تھی"۔

"میں کل رات آؤں گا"۔ نواسا شاہ نے کہا۔ "میں ضرور آؤں گا"۔

"وہ آئے گا"۔ پنڈت نے نواسا شاہ کو اغوا کرنے والے چھ آدمیوں سے کہا۔ "مجھے پورا یقین تھا کہ وہ اس جال سے نہیں نکل سکے گا۔ میں نے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے۔ کچھ پڑھا، کچھ دیکھا ہے۔ نیکی اور گناہ کے درمیان باریک سی ایک لکیر ہے۔ انسان اس پر چلتا رہتا ہے۔ اُسے گناہ کی دعوت اور انگیخت نہ ملے تو اس لکیر سے اُس کا پاؤں نہیں پھسلتا۔ اگر پھسلے گا تو نیکی کی طرف گرے گا، اور اگر حسین اشتعال یا انگیخت مل جائے تو اسے گناہوں کی طرف گرا لینا بہت آسان ہوتا ہے۔ مسلمانوں کو ہم اسی حربے سے گرا سکتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ انہیں جیتی جاگتی عورت دے دی جائے، عورت کے صرف حسین تصور سے انہیں گمراہ کیا جا سکتا ہے اور ہم ایسا کریں گے۔

"میں اُن والدین کی پوجا کرتا ہوں جنہوں نے اپنی بیٹیاں آج مندر میں بھیج دی

تھیں۔ اپنے دھرم اور اپنے ملک کے لیے اور مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے کے لیے یہ بہت بڑی قربانی ہے جو کام ایک خوبصورت اور جوان لڑکی کر سکتی ہے، وہ پورا لشکر نہیں کر سکتا۔۔۔ سکھ پال جوان ہے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اس جادو سے بچ نہیں سکے گا جو میں نے اس کے لیے پیدا کیا تھا۔ آپ میں سے کسی کو بھی معلوم نہیں کہ میں نے کمرے میں جو خوشبو چھوڑی تھی اس میں ایسا اثر ہے جو انسان کے نفس کو بیدار کر دیتا ہے۔ لڑکیوں نے اپنا اثر پیدا کیا اور اس اثر کو میری باتوں نے مکمل کیا۔ میں نے اُسے کہا کہ تمہارے تمام حاکم چوری چھپے عیش کر رہے ہیں اور اُن کی راتیں ہندو لڑکیوں کے ساتھ گذرتی ہیں۔ یہ بالکل غلط ہے۔ امارت میں میرے جاسوس موجود ہیں جو وہاں معمولی معمولی نوکریاں کرتے ہیں۔ انہوں نے بتایا ہے کہ سلطان محمود نے عیاشی کے مرتکب حاکم کے لیے ساری عمر کی سزائے قید مقرر کر رکھی ہے اور اُس نے ایسا انتظام کر رکھا ہے کہ جہاں کوئی گناہ ہو رہا ہو، اُسے اطلاع مل جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت مسلمان حاکموں پر مذہبی جذبات کا غلبہ ہے۔ انہوں نے بہت بڑی فتح حاصل کی ہے۔ انہوں نے ملتان میں قرامطیوں کو ختم کر کے ہندوستان میں اسلام کو پاک کر دیا ہے۔ انہوں نے راجہ بجی رائے جیسے کٹر ہندو اور جابر جنگجو کو ایسی شکست دی ہے کہ اُس نے اپنی تلوار اپنے پیٹ میں گھونپ لی۔ اسے مسلمان خدائی معجزہ کہتے ہیں، اور یہ ہے بھی صحیح کہ جسے ہم دھرم اور مسلمان ایمان کہتے ہیں، اگر مضبوط ہو تو معجزے رونما ہوتے ہیں۔ مسلمانوں کا ایمان مضبوط ہے۔ اُن کے حاکم جو یہاں ہیں، وہ کوئی عیش و عشرت نہیں کرتے لیکن میں نے سکھ پال کو اُن کی جو تصویر دکھائی ہے، اس سے یہ جوان راجکمار پوری طرح میرے جال میں آگیا ہے۔"

"آپ مسلمان حاکموں کو بھی ایسے ہی جال میں لا سکتے ہیں ـــ" ایک ہندو نے کہا۔

"میں یہ جال پھیلاؤں گا"۔ پنڈت نے کہا۔ "ہماری بیٹیوں کو پرماتما نے حسن بھی دیا ہے اور یہ جذبہ بھی کہ مسلمان کو اس حسن سے گمراہ کیا جا سکتا ہے۔ میری بوڑھی آنکھیں آنے والے وقت کو دیکھ رہی ہیں۔ مسلمان اس ملک پر غالب آجائیں گے۔ محمود

اگر سارے ہندوستان کو فتح نہ کر سکا تو یہاں تک کسی نہ کسی خطے میں اسلامی سلطنت قائم کر دے گا۔ مسلمانوں کو جنگ کے ذریعے شکست دینا اور انہیں ہندوستان سے نکالنا آسان نہیں ہوگا۔ اگر ہمارے آئندہ راجوں مہاراجوں اور پنڈتوں نے عقل سے کام لیا تو وہ مسلمانوں کی سلطنت کو اس حربے سے کمزور کر لیں گے جو میں نے سکھ پال پر استعمال کیا ہے۔ ہمیں مسلمانوں کے ذہنوں اور اُن کے ایمان پر ایسا حملہ کرنا ہوگا جسے وہ حملہ نہ سمجھیں، پیار اور محبت کا پیغام سمجھیں۔"

"ہمیں سکھ پال کی بات کرنی ہے"۔ لاہور سے آئے ہوئے ایک ہندو نے کہا۔ "آنے والے وقت میں کیا ہوگا، وہ آنے والی نسلوں کا کام ہے۔ ہمارے سامنے مسئلہ یہ ہے کہ سکھ پال کو اغوا کر کے بھیرہ سے نکالنا ہے۔"

"وہ کل رات چوری چھپے آرہا ہے"۔ پنڈت نے کہا۔ "میری یہی کوشش تھی جو کامیاب ہوگئی ہے۔ آپ لوگ یہاں موجود ہوں گے۔"

اور پنڈت نے انہیں اچھی طرح سمجھا دیا کہ وہ کس طرح اُسے دبوچ لیں۔ رات کے وقت اُسے شہر سے نکالنا مشکل تھا۔ یہ کام دن کو کرنا تھا۔ کچھ بحث و مباحثے کے بعد انہوں نے سکیم تیار کر لی۔

رات گہری ہو چکی تھی۔ بھیرہ شہر پر نیند کا غلبہ ہوتا جا رہا تھا۔ قصرِ امارت پر بھی خاموشی طاری تھی۔ اس عمارت میں جب راجہ بجی رائے کی گدی تھی تو یہاں کا دن سورج غروب ہونے کے بعد طلوع ہوا کرتا تھا۔ ساز و آواز اور تھرکتے ہوئے نسوانی جسموں سے جادو جاگ اُٹھتے تھے۔ شراب کا دور چلتا اور یہاں ساقی کی حکمرانی ہوتی تھی۔ اب یہ عمارت خاموش تھی۔ اس خاموشی میں ایک محافظ نواسا شاہ کی رہائش گاہ کے دروازے پر کھڑا تھا اور دو محافظ ارد گرد گشت کر رہے تھے۔ محافظ دستہ رات بھر مستعد رہتا تھا۔

نواسا شاہ اُٹھا۔ اُس نے دریچے میں سے جھانکا۔ گشت کرنے والے دو محافظ ذرا آگے چلے گئے تھے۔ نواسا شاہ نے محسوس کیا کہ وہ ان سے نظر بچا کر نکل نہیں

سکے گا۔ دن بھر وہ امارت کے کاموں اور مسئلوں میں اس قدر مصروف رہا تھا کہ وہ سوچ بھی نہ سکا کہ وہ رات چوری چھپے کس طرح نکل کر مندر میں جائے گا۔ رات کو نکلنے کا وقت آیا تو اسے خیال آیا کہ اس کی رہائش گاہ کے اردگرد محافظوں کا کھڑا پہرہ بھی ہے اور گشتی بھی۔

وہ مایوس ہو کر بیٹھ گیا۔ اُسے کمرے کی تنہائی میں وحشت محسوس ہونے لگی۔ اس کے دماغ پر چار لڑکیاں اور وہ شراب سوار تھی جو دی تھی جس کی بو نہیں ہوتی۔ وہ خوش تھا کہ شراب پی کر آئے گا تو کسی کو شراب کی بو نہیں آئے گی، مگر مندر تک پہنچنا ٹیڑھا مسئلہ بن گیا تھا۔

اُسے مایوسی کی تاریکی میں ایک چمک سی دکھائی دی۔ اُسے مولوی سعید اللہ قاسمی کے یہ الفاظ یاد آ گئے "اسلام میں خلیفہ اور اُس کے ماتحت چھوٹے چھوٹے علاقوں کے امرا کی ذمہ داریاں بڑی ہی نازک اور صبر آزما ہوتی ہیں۔ وہ راتوں کو بھیس بدل کر گلی کوچوں میں پھرتے اور دیواروں سے کان لگا کر سنتے ہیں کہ قوم میں کوئی گھرانہ یا کوئی فرد کسی مصیبت میں تو مبتلا نہیں، اور کیا پوری قوم خلافت اور امارت سے مطمئن ہے؟"

نواسا شاہ اُٹھا اور اُس نے بھیس بدل لیا۔ وہ باہر نکلا، اور دروازے پر کھڑے محافظ سے کہا کہ محافظ دستے کے کماندار کو بلاؤ۔ کماندار دوڑا آیا۔

"ہم شہر کی گشت کو جا رہے ہیں"۔ نواسا شاہ نے کماندار سے کہا۔

کماندار کے لیے امیر کا یہ اقدام حیران کن نہیں تھا۔ یہ تو مسلمانوں کی روایت تھی۔ یہ الگ بات تھی کہ کتنے امرا اس روایت پر عمل کرتے تھے۔ کماندار نے گشتی محافظوں کو بتا دیا کہ امیر محترم گشت کے لیے جا رہے ہیں۔

نواسا شاہ معمولی سا ایک چغہ پہن کر اور سر پر کپڑا لپیٹ کر چل پڑا اور قصرِ امارت کے صدر دروازے سے نکل گیا۔

وہ مندر کے دروازے پر جا رکا۔ اِدھر اُدھر دیکھا، اور دروازے میں داخل ہو گیا۔ اُسے معلوم تھا کہ کس کمرے میں جانا ہے۔ ڈیوڑھی میں اس کے استقبال کے لیے کوئی بھی نہیں تھا۔

اس نے تالی بجائی۔ اچانک پیچھے سے ایک آدمی نے اُسے دبوچ لیا۔ ایک اور آدمی نے اس کی ٹانگیں بازوؤں میں جکڑ لیں۔ نواسا شاہ جوان اور تنومند آدمی تھا۔ اُس نے جسم کی پوری طاقت صرف کر کے اپنے آپ کو پیچھے کو دھکا دیا اور پچھلے آدمی کے سہارے اگلے آدمی کو پاؤں سے دھکیلا۔ اس داؤ سے وہ آدمی جس نے اُسے پیچھے سے دبوچا تھا، پیچھے کو گرا اور جس نے اس کی ٹانگیں پکڑی تھیں وہ دوسری طرف گرا۔

دو اور آدمی اس پر جھپٹے۔ نواسا شاہ دروازے سے باہر آ گیا اور اُس نے پھرتی سے تلوار نما خنجر نکال لیا۔ ڈیوڑھی تاریک تھی۔ باہر سائے نظر آتے۔ ننھے ستاروں کی روشنی کافی تھی۔ نواسا شاہ نے خنجر کا وار کیا اور ایک آدمی کی کرب میں ڈوبی ہوئی چیخ سنائی دی۔ پھر کسی کی آواز آئی "زندہ پکڑنا"۔

اور قریب سے ہی آواز آئی "مشعل جلاؤ"۔

چقماق کا شرارہ چمکا اور تیل میں ڈوبی ہوئی مشعل کا شعلہ بھڑکا۔ پھر آواز سنائی دی۔ "کاٹ دو، نہیں"۔

ایک آدمی زخمی ہو کر گر پڑا تھا۔ باقی تین پر چار آدمی تلواروں سے ٹوٹ پڑے۔ نواسا شاہ حیران و پریشان ہو کر ایک طرف کھڑا تھا۔ مشعل کے رقص کرتے شعلے میں اُسے خون بہتا نظر آ رہا تھا۔ اُس پر حملہ کرنے والوں پر کس نے حملہ کیا تھا؟

"امیر محترم!"۔ ایک آدمی نے کہا "آپ ٹھیک ہیں؟ زخمی تو نہیں؟"

تب اُس نے پہچانا کہ یہ تو اُس کے اپنے محافظ دستے کے جوان ہیں۔ اندر سے پنڈت دوڑا آیا۔ سخت گھبرایا ہوا تھا۔ ہڑبڑا کر پوچھنے لگا کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔ چار ہندو زمین پر خون میں ڈوبے پڑے تھے۔

"آپ انہیں پہچانتے ہیں؟"۔ ایک محافظ نے پنڈت سے پوچھا۔ "انہوں نے امیر محترم پر حملہ کیا ہے"۔

"اوہ!"۔ پنڈت نے حیرت زدہ ہو کر نواسا شاہ کو دیکھا اور بولا۔ "امیر بھیرہ!

"... حضور! ادھر اور اس وقت کیسے آ نکلے؟"

"میں گشت پر آیا تھا"۔ نواساشاہ نے کہا۔ "مندر کے اندر چلا گیا۔ ڈیوڑھی کے دروازے میں داخل ہوا ہی تھا کہ انہوں نے مجھ پر حملہ کر دیا۔"

"پاپی"۔ پنڈت نے حقارت سے کہا۔ "ملیچھ۔ اچھا ہوا مارے گئے۔ امیر مندر میں آئیں تو ہم ان کے قدموں میں پھول نچھاور کریں۔ ان اچھوتوں نے امیر پر حملہ کیا ہے؟"۔ اس نے مشعل کی روشنی میں چاروں کے چہرے دیکھ کر کہا۔ "میں انہیں نہیں پہچان سکتا۔ یہ بھیرہ کے معلوم نہیں ہوتے۔"

نواساشاہ نہیں چاہتا تھا کہ محافظ مندر کے اندر جائیں کیونکہ اسے خیال تھا کہ اندر لڑکیاں اور شراب ہوگی مگر محافظوں کے کمانڈر کو اپنے فرائض کا احساس تھا۔ وہ نواساشاہ کو بتلائے بغیر اندر چلا گیا۔ نواساشاہ بھی گیا۔ کمروں میں کچھ بھی نہیں تھا۔ ایک کمرے میں دو آدمی تھے جو باہر مارے جانے والوں کے ساتھی تھے۔ پنڈت نے بتلایا کہ یہ پجاری ہیں۔

نواساشاہ کا خیال تھا کہ وہ اکیلا مندر میں آیا ہے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ گشت پر نکلا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کا محافظ دستہ اس سے غافل نہیں ہو سکتا تھا۔ کمانڈر عقلمند تھا۔ اسے احساس تھا کہ امیر نومسلم ہے اور ہندو اس پر قاتلانہ حملہ کریں گے چنانچہ نواساشاہ رہائش گاہ سے نکلا تو کمانڈر چار محافظوں کو عام کپڑوں میں ساتھ لے کر نواساشاہ کے پیچھے خاصا فاصلہ رکھ کر چلا گیا۔ یہ پانچوں دبے پاؤں چل رہے تھے تاکہ ان کے امیر کو بھی پتہ نہ چلے کہ اس کے پیچھے کوئی آ رہا ہے۔ آخر وہی ہوا جس کا کمانڈر کو خدشہ تھا۔ وہ بروقت مندر کے دروازے پر پہنچ گئے اور نواساشاہ کی جان بچ گئی۔

دوسرے دن اس واقعہ کی تحقیقات ہوئی۔ پنڈت نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ وہ بہت پریشان نظر آتا تھا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔

لاہور کے راج محل میں رانی پریم دیوی سخت غصے کے عالم میں اپنے کمرے میں تیز تیز ادھر ادھر چل رہی تھی۔ کمرے میں وہ دو آدمی کھڑے تھے جو اپنے چار ساتھیوں

کو بھیرہ کے مندر میں مروا کر وہاں سے آ گئے تھے۔ انہوں نے رانی کو تفصیل سے سنایا تھا کہ پنڈت نے سکھ پال کو پھانسنے کا کیا انتظام کیا تھا لیکن عین آخری لمحے ناکامی ہوئی۔

سیناپتی راج گوپال بھی وہاں موجود تھا۔ وہ کچھ بھی نہیں کہہ رہا تھا۔

"اس سے ظاہر ہوا کہ میرا بیٹا بھیرہ کا امیر ہوتے ہوئے بھی مسلمانوں کا قیدی ہے"۔ رانی پریم دیوی نے کہا۔ "میں اسے رہا کراؤں گی۔ اگر وہ وہاں رہنا چاہے گا تو بھی اسے لے آؤں گی"۔ وہ اچانک گرج اٹھی۔ "نکل جاؤ یہاں سے .... دفع ہو جاؤ بزدلو!"

وہ دونوں آدمی باہر نکل گئے۔ راج گوپال وہیں کھڑا رہا۔ رانی نے اسے دیکھا اور بولی۔ "تم میری محبت کا دعویٰ کرتے ہو۔ میرا ساتھ دو گے؟"

"تم کرنا کیا چاہتی ہو؟"۔ راج گوپال نے کہا۔ "اگر تم مجھے سزائے موت کی دھمکی دے کر کہو کہ میں بھیرہ پر حملہ کر دوں تو بھی میں صاف انکار کر دوں گا۔"

"سنو گوپال!"۔ رانی نے کہا۔ "غور سے سنو میں کیا کرنا چاہتی ہوں۔"

اس کے دماغ میں جو آئی تھی، وہ اس نے راج گوپال کو سنا دی،

دس پندرہ دن گزرے ہوں گے کہ نواساشاہ دن کے وقت فوج کا معائنہ کر کے واپس آ رہا تھا۔ اس کا راستہ ایک سیاہ کالے رنگ کے بوڑھے نے روک لیا۔ اس کے ساتھ اسی رنگ اور اسی عمر کی ایک عورت تھی۔ ان کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ سر اور منہ پر گرد کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ دونوں کی کمریں جھکی ہوئی تھیں۔ وہ دونوں بہت لمبی مسافت طے کر کے آئے لگتے تھے۔ نواساشاہ نے گھوڑا روکا اور اتر کر ان کے قریب چلا گیا۔

"بہت دور سے فریاد لے کر آئے ہیں"۔ بوڑھے نے تھکی ہوئی اور رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ "ہماری کہانی لمبی ہے۔ اپنے گھر میں آنے کی اجازت دیں۔ تنہائی میں عرض کریں گے۔"

نواساشاہ نے اپنے محافظوں سے کہا کہ دونوں کو ساتھ لے چلو، ہم ان کی فریاد سنیں گے۔

نواساشاہ اپنے کمرے میں اکیلا بیٹھا تھا۔ بڑھیا کو اس کے کمرے میں داخل کیا گیا۔ نواساشاہ نے کہا۔ "کہو کیا کہنا ہے؟"

بڑھیا اُس کے قریب چلی گئی اور اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ "کیا تو نہیں جانتا کہ ماں کو اپنے گمراہ بیٹے سے کیا کہنا ہوتا ہے؟" نواساشاہ چونک اُٹھا۔ وہ رانی پریم دیوی تھی۔ اُس نے کہا۔ "مت نگاہیں پھیر، مت حیران ہو، میری آنکھوں میں دیکھ۔ ماستا کی ماری ہوئی ماں کی آنکھوں میں دیکھ۔"

نواساشاہ کی نظریں ماں کی آنکھوں میں گرفتار ہو گئیں۔

"ماں نے تجھے کیوں جنا تھا؟" رانی نے کہا۔ "اس لیے کہ اپنے دلوا کے خون کا انتقام لے گا۔ اُن بتوں اور مورتیوں کی توہین کا انتقام لے گا جن کی بے حرمتی مسلمانوں نے کی تھی۔ تیرا باپ بھاگ کر کشمیر چلا گیا ہے، اور تو نے شکست کھا کر ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ تو نے اپنے دادا کی طرح اور راجہ بجی رائے کی طرح خودکشی نہ کی۔ تو نے اپنے مذہب کے دشمن کا مذہب قبول کر لیا۔ تو نے یہ بھی نہ سوچا کہ تیری ماں کا رکھوالا کون ہے۔ اگر مسلمان لاہور پر حملہ کر دیں تو وہ مجھے بھی قیدی بنا لیں گے۔ ایک رانی مسلمانوں کی اس لیے قیدی اور باندی ہو گی کہ اُس کا بیٹا بے غیرت اور بزدل ہے۔ لالچی ہے۔ اُس نے اپنا دھرم عہدے اور رتبے کے عوض بیچ ڈالا ہے۔"

نواساشاہ کے منہ سے کئی بار نکل چکا تھا۔ "ماں.... ماتاجی.... آپ ــــ" لیکن ماں کی زبان بے قابو ہو گئی تھی۔ وہ بولتی جا رہی تھی اور نواساشاہ اُس کے سامنے کھڑا تھا۔ ماں نے اس کے پاؤں تلے سے زمین نکال دی تھی۔ پنڈت اُسے پہلے ہی گمراہ کر چکا تھا۔ اُس رات کے بعد جس رات اُس پر حملہ ہوا تھا، وہ مندر میں دوبارہ جانے کی سوچ بھی نہیں سکا تھا۔ یہ ایک کانٹا تھا جو اُس کے دل میں اُتر گیا تھا۔ پنڈت کی اس بات کو اُس نے صحیح مان لیا تھا کہ مسلمان حاکم اور سالار وغیرہ چوری چھپے عیش و عشرت کرتے ہیں اور اُسے کہتے ہیں کہ اسلام میں یہ حرام ہے۔

اب ماں نے اس حلیے میں آ کر اُس کے جذبات کو ایسا ہلایا کہ اُسے چکر آنے لگے۔ ماں نے اُسے نواساشاہ سے سکھ پال بنا دیا تھا۔ ماں کہہ رہی تھی۔ "دیکھ، تیری رانی ماں کیا حال اور کیا صورت بنائے کھڑی ہے۔ پکڑی جائے تو یہاں تیری کوئی نہیں سنے گا.... اور سوچ کہ تجھے محمود یہاں کا حاکم کیوں بنا گیا ہے.... وہ تجھ سے ڈرتا ہے۔ اُسے معلوم ہے کہ سکھ پال اتنا بہادر اور دانشمند ہے کہ غزنی کی فوج کو ملیامیٹ کر دے گا۔ تجھ سے بچنے کے لیے اُس نے تجھے سونے کے پنجرے میں بند کر دیا ہے۔ تیری شکست تیرے کسی گناہ کی سزا ہے۔ ہوش میں آ سکھ پال! اپنے دیوتاؤں کے قہر سے ڈر۔"

"تمہارے ساتھ کون ہے ماں؟"

"سیناپتی راج گوپال" — رانی نے جواب دیا۔ "اسے بھی اندر بلا لو۔"

نواساشاہ نے دربان کو بلا کر کہا۔ "اس بڑھیا کے ساتھ جو بوڑھا ہے، اُسے اندر بھیجو۔"

راج گوپال جھکا ہوا، کھانستا ہوا، اندر آیا اور نواساشاہ کو فرشی سلام کیا۔ دربان باہر نکل گیا تو نواساشاہ نے راج گوپال سے کہا۔ "اب سیدھے کھڑے ہو جاؤ.... ماں مجھے ہوش میں لے آئی ہے۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔ میں رات کو یہاں سے نکل جاؤں گا۔ آپ دونوں واپس چلے جائیں۔"

"یہاں سے چوروں کی طرح نکل بھاگنا کوئی کمال نہیں" — سیناپتی راج گوپال نے کہا۔ "آپ راجپوت ہیں، راجکمار ہیں۔ اگر آپ ہمت کریں تو بھیرہ آپ کا ہو سکتا ہے.... مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کے حکم سے راجہ بجی رائے کی فوج کو سلطان کی فوج میں شامل کر لیا گیا ہے۔ اگر یہ درست ہے تو میں آپ کو بتاتا ہوں کہ آپ کیا کر سکتے ہیں۔"

رانی پریم دیوی اور راج گوپال بہت دیر بعد نواساشاہ کے کمرے سے نکلے۔ دربان اور محافظوں کو وہ پہلے سے زیادہ بوڑھے اور تھکے ہوئے نظر آئے۔ کسی کو شک نہ ہوا کہ انہوں نے چہروں، گردن اور ہاتھوں پر ایسا محلول مل رکھا ہے جس سے اُن کے رنگ گہرے سانولے اور جلد بوڑھی نظر آتی ہے۔ وہ قصرِ امارت سے نکلے اور مندر میں چلے گئے۔ وہ رات انہوں نے پنڈت کے ساتھ گزاری اور اگلے روز لاہور کو روانہ ہو گئے۔

دو روز تک بھیرہ کی فضا میں پُراسرار سا ٹھہراؤ طاری رہا۔ تیسرے روز امیر بھیرہ نواسا شاہ نے فوج کے اعلیٰ حکام کو بلایا اور کہا کہ اپنی فوج میں جو چار ساڑھے چار ہزار ہندو ہیں، انہیں محاصرے میں لڑنے کا وہ تجربہ نہیں جو غزنی کی فوج کو ہے۔ کل تمام مسلمان فوج شہر سے باہر چلی جائے گی اور ہندو کماندار اور سپاہی شہر کے اندر رہیں گے۔ آپ لوگ باہر سے قلعہ توڑنے کی کوشش کریں گے اور ہم ہندوؤں کو سمجھائیں گے کہ قلعے کا دفاع کس طرح کیا جاتا ہے۔

اُسی رات نواسا شاہ نے سپہ سالار اور اُس کے نائب سالاروں کو اپنے ہاں بلایا۔ انہوں نے آکر دیکھا کہ محافظ دستہ جو مسلمان ہُوا کرتا تھا اس میں اب ہندو سپاہی ہیں۔ نواسا شاہ نے چند ایک محافظوں کو اندر بلا کر سالاروں اور اُس کے دونوں نائبوں کو گرفتار کرا لیا اور حکم دیا کہ انہیں قید خانے کی الگ الگ کوٹھڑیوں میں بند کر دو۔

اگلی صبح حکم کے مطابق فوج کی تمام تر مسلمان نفری باہر چلی گئی۔ نواسا شاہ کے حکم سے شہر کے دروازے بند کر دیئے گئے، اور ہندو نفری نے دیواروں پر جا کر مورچے سنبھال لیے۔ مسلمان اسے مشق اور تربیت سمجھ رہے تھے۔ انہوں نے حکم کے مطابق قلعہ توڑنے کی جھوٹ موٹ کی نقل و حرکت کی۔ اوپر سے ہندو فوجیوں نے ان پر تیر برسانے شروع کر دیئے۔ اس کے ساتھ ہی نواسا شاہ نے دیوار سے بلند آواز سے بار بار اعلان کیا ۔۔

”غزنی والو! زندہ رہنا چاہتے ہو تو غزنی واپس چلے جاؤ۔ میں نواسا شاہ نہیں سکھ پال ہوں۔ میں مسلمان نہیں ہندو ہوں۔ تمہارے تینوں سالار قید میں پڑے ہیں۔“

مسلمان فوج کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ مشہور مؤرخین، البرونی، فرشتہ، گردیزی، عنصری اور عطبی کی تحریروں کے مطابق غزنی کے مسلمان فوجیوں نے بھاگ نکلنے کی بجائے لڑ کر مرنے کو ترجیح دی۔ کسی بھی مؤرخ نے یہ نہیں بتایا کہ سپہ سالار اور اُس کے نائبین کی غیر حاضری میں کمان کس نے سنبھالی۔ ہُوا یوں کہ مسلمانوں نے ایک قاصد ملتان کو دوڑا دیا۔ ان کے پاس رسد اور سامان کی کمی تھی، لیکن ان کے باوجود انہوں نے سکھ پال کا چیلنج قبول کر لیا، اور للکار کر سکھ پال کے اعلان کا جواب دیا۔ ”اے مکار

رہے! تو اپنی فوج سمیت ہمارا قیدی ہے۔ اگر شہر میں کسی مسلمان باشندے پر ہاتھ اٹھایا گیا تو بھیرہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے اور ایک بھی ہندو زندہ نہیں رہے گا۔“

انہوں نے شہر کا محاصرہ کر لیا اور دروازے توڑنے اور کہیں نقب لگانے کی کوشش شروع کر دیں۔

غزنی کی طرف جانے والا قاصد بہت تیز تھا۔ پشاور تک اُس نے دو گھوڑے مسافروں سے چھینے۔ تھکے ہوئے گھوڑوں کو وہ چھوڑتا گیا۔ اُس نے آرام اور کھانے پینے کی پرواہ نہ کی۔ ملتان والا قاصد جلدی منزل پر پہنچ گیا اور وہاں سے کمک چل پڑی۔

غزنی میں حالت یہ ہو گئی تھی کہ ایلک خان نے اس خوش فہمی میں غزنی پر فوج کشی کی تھی کہ سلطان محمود ہندوستان میں ہے اور غزنی میں فوج نہ ہونے کے برابر ہے۔ وہ بڑے تحمل سے بڑھا چلا آ رہا تھا۔ اُسے گمان تک نہ تھا کہ سلطان محمود کا پیغام رسانی کا نظام اور اُس کی فوج کے کوچ کی رفتار اتنی تیز ہے کہ وہ جیسے اُڑ کر آ گیا ہو۔ محمد قاسم فرشتہ لکھتا ہے کہ سلطان محمود جب غزنی پہنچا تو ایلک خان نے یقین نہ کیا۔ محمود نے فوج کو آرام نہ کرنے دیا۔ سیدھا حملہ کر دیا۔

فرشتہ لکھتا ہے ”ایلک خان نے ترک امراء اور حکمرانوں کو مدد کے لیے بلا لیا۔ یہ محمود غزنوی کے خلاف متحدہ محاذ تھا۔ محمود غزنوی نے اپنی فوج کے ایک حصے کی کمان اپنے بھائی نصیر الدین یوسف کو دی اور اپنے مشہور سپہ سالار ابو عبداللہ الطائی کو اس کے ساتھ رکھا۔ دائیں بازو کی کمان آلتونتاش حاجب کے پاس اور بائیں بازو کی ارسلان جاذب کے پاس تھی۔ اس بازو میں افغان اور خلجی تھے۔۔۔۔

”محمود کے دشمن کا متحدہ محاذ کمزور نہیں تھا۔ ایلک خان نے اپنی قیادت میں سلطان محمود کی فوج کے قلب پر حملہ کیا۔ محمود گھوڑے سے کود کر اُترا اور سجدہ ریز ہو گیا۔ اُٹھ کر ہاتھ دُعا کے لیے پھیلائے اور گھوڑے پر سوار ہونے کی بجائے ایک ہاتھی پر جا چڑھا۔

اس نے اپنی فوج کو اللہ کے نام پر للکارا۔ اُس نے پیادوں کے آگے ہاتھیوں کی دیوار کھڑی کر رکھی تھی۔ اس نے حملہ روکنے کے لیے ہلہ بولنے کا حکم دے دیا۔ ہاتھیوں کے ساتھ گھوڑ سوار تھے۔ ایلک خان کی فوج اس ہلے کے آگے ٹھہر نہ سکی۔"

فرشتہ نے لکھا ہے "محمود کے ایک ہاتھی نے ایلک خان کے اُس محافظ کو جس نے اُس کا پرچم اٹھا رکھا تھا، سونڈ میں پکڑا اور دُور اوپر کو اچھال دیا۔ محمود کے ہاتھیوں نے دشمن کو اس طرح کچلا جیسے پاؤں تلے ٹڈی دل کو مسل رہے ہوں۔"

دشمن کو گھبرا کر پسپا ہوا۔ محمود غزنوی نے اس کا تعاقب کیا اور چیدہ چیدہ امراء اور سالاروں کو پکڑ کر ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔

یہ اُس کے سجدے کا کرشمہ تھا کہ دشمن ختم ہو چکا تو بھیرہ کا قاصد اُس کے پاس یہ پیغام لے کر پہنچا کہ سکھ پال نے دھوکہ دے کر بھیرہ پر قبضہ کر لیا ہے۔ سلطان محمود نے کوئی وقت ضائع نہ کیا اور بھیرہ کو کوچ کا حکم دے دیا۔

اُس کے پہنچنے تک مسلمان بھیرہ کا ایک دروازہ توڑ کر شہر میں داخل ہو چکے تھے ملتان سے کمک آ گئی تھی۔ انہوں نے ہندو نفری پر جلدی قابو پا لیا اور سکھ پال کو بھی انہوں نے گرفتار کر لیا۔ سلطان محمود دل پر بڑا ہی ناگوار بوجھ لے کر آیا تھا، لیکن بھیرہ کی کیفیت دیکھ کر عش عش کر اُٹھا۔ اُس نے سکھ پال کو بلایا اور اُسے اتنا ہی کہا۔ "میں تمہیں تمام عمر کے لیے قید میں ڈالتا ہوں۔ تمام عمر اپنے کیے کی سزا بھگتتے رہو۔"

....اور ایک بُت شکن پیدا ہوا

دوسرا حصہ

سلطان محمود غزنوی کے جہاد اور جاسوسوں کی جذباتی اور واقعاتی کہانیاں

عنایت اللہ

علم و عرفان پبلشرز
34۔ اردو بازار، لاہور، فون: 7232336۔ 7352332
www.ilmoirfanpublishers.com. E-mail: ilmoirfanpublishers@hotmail.com

....اور ایک بُت شکنؒ پیدا ہوا

(حصہ اوّل۔ حصہ دوم)

(سلطان محمود غزنوی کے جہاد اور جاسوسوں کی جذباتی اور واقعاتی داستان)
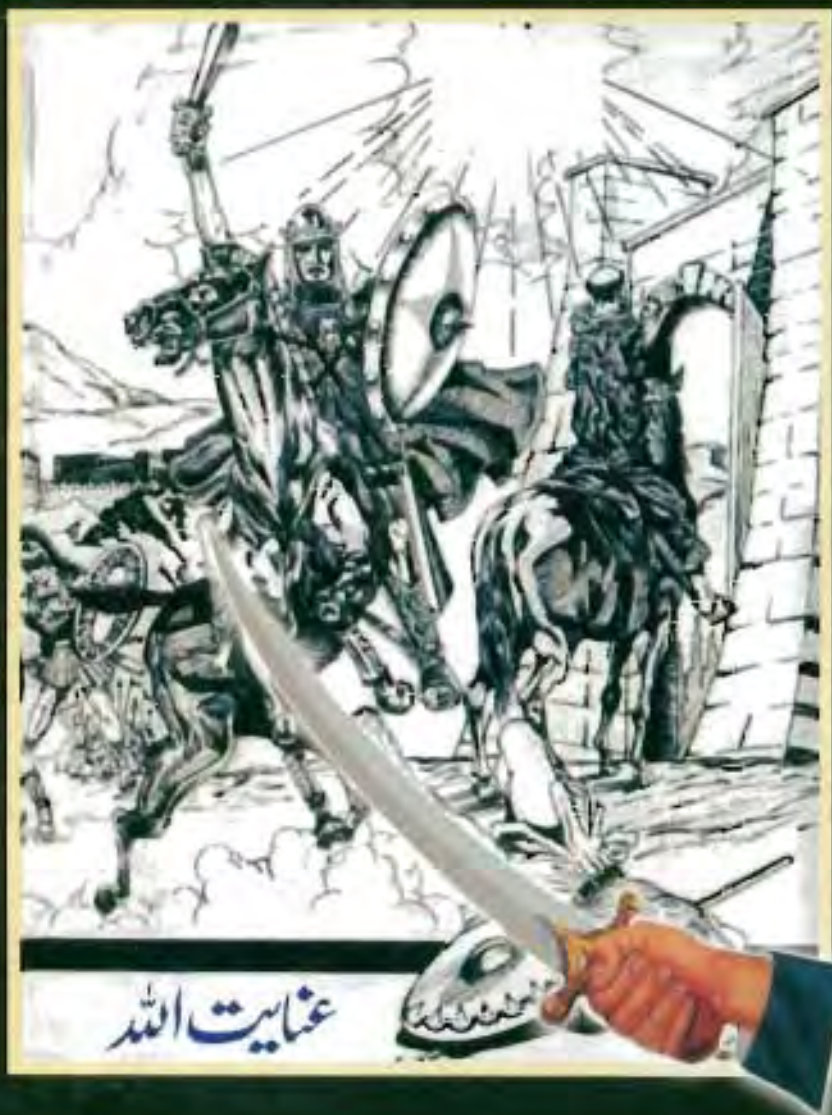
عنایت اللہ

....اور ایک بُت شکن پیدا ہوا

دوسرا حصہ

سلطان محمود غزنوی کے جہاد اور جاسوسوں کی جذباتی اور واقعاتی کہانیاں

عنایت اللہ

علم و عرفان پبلشرز
34۔ اردو بازار، لاہور، فون :7232336 فیکس:7352332
www.ilmoirfanpublishers.com. E-mail: ilmoirfanpublishers@hotmail.com

فہرست

نگرکوٹ کی ڑنگی	۷
معرکہ انسان اور ابلیس کا	۸۸
سانپ سونا اور انسان	۱۲۵
قلعہ جو سر نہ ہوا	۱۶۵
طمع تخت کی اور تاج کی	۲۰۴
طوفان جو غزنی سے آیا	۲۵۸

پیش لفظ

عالمِ اسلام خصوصاً پاکستان بڑے ہی پُرخطر دور سے گزر رہا ہے۔ یہود اور ہنود نے ایسا حملہ کیا ہے جس کے آگے ہماری نوجوان نسل بلکہ اس نسل کے ماں باپ بھی ہتھیار ڈالتے جا رہے ہیں۔ یہ حملہ ہمارے تفریح کے ذرائع پر کیا گیا ہے۔

تفریح کے ذرائع کیا ہیں؟ ___ رسالے فلمیں اور ناول ___ تفریح انسانی فطرت کی ایک ضرورت ہے جس سے انسان کو محروم نہیں کیا جا سکتا محروم کرنا بھی نہیں چاہیئے کیونکہ مسلسل کام کاج اور سنجیدہ سوچوں سے اعصاب ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں۔ تھکے ماندے اعصاب، دل اور دماغ کو سکون دینے کے لیے تفریح لازمی ہے۔

ہمارے دو سب سے بڑے دشمنوں ___ یہودیوں اور ہندوؤں ___ نے انسانی فطرت کی اس ضرورت کو سمجھتے ہوئے خفیہ طریقوں سے ہمارے لٹریچر میں فحاشی اور جنسی لذّت کے جراثیم چھوڑ دیئے ہیں۔ چونکہ ہر کس و ناکس کہانی پڑھنا اور فلم دیکھنا چاہتا ہے اس لیے ان اخلاق سوز کہانیوں کو مقبولیّت حاصل ہو گئی ہے اور اس کے نتائج اس صورت میں سامنے آئے ہیں کہ ہمارے بچّے اخلاقی لحاظ سے تباہ ہوتے جا رہے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیئے کہ دشمن اپنے مقصد میں کامیاب ہو رہا ہے۔

مکتبہ داستان لیمٹڈ اس محاذ پر دشمن کا مقابلہ کر کے اور اپنے نوجوانوں کو جسمانی اور نفسیاتی تباہی سے بچانے کے لیے ایسا لٹریچر پیش کر رہا ہے جو آپ کے اور نوجوانوں کے اس فطری مطالبے کو پورا کرتا ہے کہ کہانی کا انداز ناصحانہ نہ ہو تفریحی ہو اور اس میں سنسنی خیزی اور سسپنس ہو اور جذبات میں ہیجل مچا دے۔

"ایک اور بت شکن پیدا ہوا" ہماری تاریخ کی روئیداد ہے جس کا ہیرو سلطان محمود غزنوی ہے لیکن ہر کہانی میں آپ کو کچھ دوسرے ہیرو بھی ملیں گے۔ یہ کہانیاں تفریح مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ ایمان افروز بھی ہیں اور یہ ہماری اُن روایات کا عکس پیش کرتی ہیں جو اسلام اور ہمارے قومی تشخص کی ضامن ہیں۔

عنایتُ اللہ

مدیر "حکایت" لاہور

نگر کوٹ کی ترکی

نگر کوٹ ہندوستان کا ایک مشہور قلعہ ہُوا کرتا تھا۔ وہ وہ قلعوں کا ہی تھا۔ ان کے کھنڈرات آج بھی موجود ہیں۔ ایک سے ایک وسیع اور مضبوط قلعہ تھا لیکن نگر کوٹ کے قلعے کو خصوصی شہرت اس لیے حاصل تھی کہ اس کے اندر بہت بڑا مندر تھا۔ مندر بجائے خود ایک قلعہ تھا۔ اس کے کمرے بھول بھلیوں جیسے تھے۔ اس کا تہ خانہ بھی تھا۔ اس کے مندر میں گھوڑے اور ہاتھی گم ہو جاتے تھے۔ مندر کی حفاظت کے لیے اس کے اردگرد قلعہ تعمیر کر دیا گیا تھا۔

یہ قلعہ اور اس کے اندر کا مندر بھارت کے مشہور شہر کانگڑہ کے قریب ایک پہاڑی پر تعمیر کیا گیا تھا۔ اس سے یہ ناقابلِ تسخیر ہو گیا تھا۔ قلعے پر یلغار کرنے کے لیے پہاڑی پر چڑھنا پڑتا تھا لیکن قلعے والوں کے تیر اور بڑے بڑے پتھر جو اوپر سے پھینکے جاتے تھے حملہ آوروں کو قلعے تک نہیں پہنچنے دیتے تھے۔ اُس وقت جب سُلطان محمود غزنوی نے پشاور، بھیرہ اور ملتان پر قبضہ کر کے ایسی پوزیشن حاصل کر لی تھی جیسے خنجر بھارت ماتا کے دل میں اُتر گیا ہو، نگر کوٹ کا قلعہ ہندوستان کے راجوں مہاراجوں کے لیے غیر معمولی اہمیت کا مقام بن گیا ...

اس اہمیت کی وجہ اس مندر کا بڑا پنڈت رادھا کشن تھا جو کٹر برہمن اور اپنے کردار کا آدمی تھا۔ مندروں کے اندر کی دنیا کی جو باتیں مشہور تھیں، ان سے یہ مندر پاک تھا۔ پنڈت رادھا کشن نے ایسا ماحول بنا رکھا تھا کہ وہاں عبادت کا مطلب صرف عبادت تھا۔ وہاں عورتیں بھی جایا کرتی تھیں لیکن پنڈت نے حکم جاری کر رکھا تھا کہ کوئی عورت کسی پنڈت کے پاس نہیں بیٹھ سکتی اور مرد اور عورتیں اکٹھے عبادت

نہیں کرسکتے۔ عورتیں اس کی عقیدت مند تھیں اور ہندوؤں کے رواج کے مطابق عورتیں اس کے پاؤں چھو کر ہاتھ اپنے ماتھے کو لگانے کی کوشش کرتی تھیں لیکن وہ کسی عورت کو، وہ کچی ہو خواہ بوڑھی اپنے قریب نہیں آنے دیتا تھا۔

مندر میں چند اور پنڈت اور چیلے چانٹے بھی تھے۔ عورت کے معاملے میں وہ ان پر بہت سختی کرتا اور ان پر نظر رکھتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ عورت فساد کی جڑ ہے اور عورت میں ایسا جادو ہے جو مرد پر سوار ہوتا ہے تو وہ کسی کام کا نہیں رہتا اور وہ بدی کے سوا کچھ اور سوچ ہی نہیں سکتا۔ اسی نظریے کے تحت وہ نوجوانی میں تارک الدنیا ہو گیا اور ہمالیہ کی یخ بستہ وادیوں میں چلا گیا تھا جہاں سے ہندوؤں کا مقدس دریا گنگا نکلتا ہے۔ پندرہ برس میں اس کا من مر گیا۔ اس کے نفسانی جذبات سرد پڑ گئے اور وہ گنگا کے ساتھ ساتھ پاپیادہ اتر آیا تھا۔ کانگڑہ کے قریب نگرکوٹ کی ایک پہاڑی پر اس نے یہ مندر دیکھا تو وہ اس میں چلا آیا۔

اب اس کی عمر پچاس اور ساٹھ کے درمیان تھی لیکن اس کے چہرے پر اور ڈیل ڈول میں بڑھاپے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ اس کی آنکھوں میں جوانی کی چمک ابھی موجود تھی۔ داڑھی بالوں کی طرح سفید، چال میں جنگجو سپاہی کا جلال تھا۔ وہ اپنی مثال دے کر کہا کرتا تھا کہ میرا جسم دنیا کے لہو و لعب سے اور عورت کے لمس سے پاک رہا ہے اس لیے یہ ایک سو سال تک بھی ایسا ہی صحت مند اور تنومند رہے گا اور وہ کہا کرتا تھا کہ جس نے اپنی روح کو پاک رکھا اس کا جسم سدا جوان رہے گا۔

مذہب کے معاملے میں وہ کٹر تھا۔ رامائن اور مہابھارت اسے زبانی یاد تھیں۔ اس کی زبان میں جادو تھا۔ لوگ اسے اوتار (پیغمبر) بھی کہا کرتے تھے۔ اُسے ہندومت کا ستون بھی اور قلعہ دار بھی کہا کرتے تھے۔ راجوں مہاراجوں پر وہ اپنا حکم چلایا کرتا تھا۔ اور راجے مہاراجے اس کے قدموں میں بیٹھ کر بھول جایا کرتے تھے کہ وہ حکمران ہیں اور ان کی رعایا ان کے آگے سجدے کیا کرتی ہے۔

نگرکوٹ کے مندر میں دولت اور زر و جواہرات کے انبار لگے ہوئے تھے۔ تمام راجے مہاراجے مندر کو باقاعدگی سے دل کھول کر نقدی اور سونے چاندی کی صورت میں

تحفے بھیجا کرتے تھے۔ کانگڑہ کے تمام کسان اور زمیندار مندر کو مالیہ ادا کرتے تھے۔ بعض مؤرخوں نے لکھا ہے کہ اس علاقے کی کھیتیاں مندر کی ملکیت تھیں اور کسان مندر کے مزارعے تھے۔ اس دولت کو پنڈت رادھا کشن نہ خود اپنے استعمال میں لاتا تھا نہ کسی دوسرے پنڈت کو ہاتھ لگانے دیتا تھا۔ کہا کرتا تھا کہ یہ ملک اور ہندومت کے دفاع کے لیے وقف ہے۔ اس کا کچھ حصہ غریبوں اور یتیموں کی امداد اور تعلیم پر خرچ ہوتا تھا۔

یہ ۱۰۰۷ء (۳۹۸ھ) کا واقعہ ہے جب سلطان محمود غزنوی نے پہلے اٹک کے گرد و نواح میں لاہور کے مہاراجہ انند پال کو شکست دے کر ایسا بھگایا کہ وہ کشمیر چلا گیا اور اپنی راجدھانی سے لمبا عرصہ غیر حاضر رہا۔ پھر سلطان نے بھیرہ کے راجہ بجی رائے کو شکست دی اور فوراً بعد ملتان پر حملہ کر کے ہندوؤں اور عیسائیوں کے آلۂ کار قرامطیوں کی گدی اکھاڑی اور ملتان کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا اور پھر انند پال کے بیٹے سکھپال نے سلطان محمود سے بھیرہ کے میدان میں شکست کھا کر ہتھیار ڈالے اور اسلام قبول کر لیا۔ اس نے سلطان کی غیر حاضری میں غزنی کی فوج کو دھوکہ دے کر بھیرہ پر قبضہ کرنے کی کوشش کی مگر بری طرح ناکام رہا اور سلطان محمود نے غزنی کی خانہ جنگی سے فارغ ہو کر بھیرہ میں آ کے سکھپال کو عمر بھر کے لیے قید میں ڈال دیا۔

۱۰۰۷ء میں اسلام کا کانٹا مہابھارت کے دل میں اتر گیا تو نگرکوٹ میں پنڈت رادھا کشن کی نیندیں حرام ہو گئیں۔ اُسے مسلمانوں کی فتوحات کی اطلاعیں بھیرہ، پشاور اور لاہور سے ملی تھیں اور اسے یہ بھی بتایا گیا تھا کہ مہاراجہ انند پال راجدھانی سے غیر حاضر ہے۔ پنڈت رادھا کشن نے ہندوستان کی ریاستوں اجین، قنوج، گوالیار، کالنجر (موجودہ کوٹلی آزاد کشمیر) اور اجمیر کے راجوں مہاراجوں کو نگرکوٹ بلایا۔ سب نے حکم کی تعمیل کی۔

"کیا تم سب نے عیش و عشرت کا پھل پا لیا ہے یا کچھ اور مانگتے ہو؟" — پنڈت رادھا کشن نے مندر میں بیٹھے حکمران مہاراجوں سے کہا۔ "تمہاری شکست کی وجہ صرف یہ ہے کہ تم نے اپنے محل سورگ کی طرح بنا رکھے ہیں۔ تمہیں سلاتی ہیں تو عورتیں، تمہیں جگاتی ہیں تو عورتیں، تمہیں نہلاتی ہیں تو عورتیں اور عورتیں بھی وہ جو حسن میں بے مثال اور بے حیائی میں لاجواب ہیں۔ تم پیاس میٹھی شراب

سے بچھاتے ہو۔"

"شکست راجہ انندپال نے کھائی ہے" — ایک مہاراجہ نے کہا "مسلمان جب میرے مقابلے میں آئیں گے تو ...."

"اس دیس کے ہر ہندو نے شکست کھائی ہے" پنڈت رادھاکشن نے گرج کر کہا۔ "کیا تم ہندو نہیں ہو؟ غزنی کے ایک مسلمان سلطان نے ہندو دھرم کو شکست دی ہے۔ یہ تمہاری شکست ہے، یہ میری شکست ہے۔ کیا بھیرہ اور ملتان کے مندر تمہارے لیے مقدس نہیں؟ مسلمانوں نے دیوی دیوتاؤں کے جو بت اور اوتاروں کی جو مورتیاں توڑ پھوڑ کر باہر پھینکیں اور مسلمانوں نے جنہیں اپنے اور اپنے گھوڑوں کے قدموں میں روندا، ان کا تمہارے دھرم کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا؟ جہاں سنکھ اور گھڑیال بجتے تھے، جہاں کے پر لوٹے اور جہاں کی ہوائیں بھجن اور اشلوک سنا کرتی تھیں وہاں اب اذانیں سنائی دیتی ہیں۔"

راجوں مہاراجوں پر سناٹا طاری ہو گیا۔ پنڈت کہہ رہا تھا "وہاں کی اذانیں مجھے یہاں سنائی دے رہی ہیں۔ میں راتوں کو سوتا نہیں۔ مجھے ہری کرشن اور ہری رام کی بجائے اذانیں سنائی دے رہی ہیں۔ میں مندر کے اندر جانے سے ڈرتا ہوں۔ مجھے بت غصے سے گھورتے ہیں۔ میں نے مورتیوں کے چہروں پر قہر دیکھا ہے۔ مجھے یہ سارا مندر، یہ قلعہ اور یہ پہاڑ جس پر یہ کھڑے ہیں، سب ہلتے اور لرزتے ہوئے لگتے ہیں۔ کیا تم برداشت کر لو گے کہ مسلمان یہیں بھی آ کر توڑ دیں اور اس مندر میں بھی اذانیں گونجیں؟"

"ایسا نہیں ہو گا مہاراج!" — سب کی پرعزم آوازیں اٹھیں — "ہم اپنا سب کچھ قربان کر دیں گے۔ اس دیس میں جو مسلمان آ گئے ہیں، ان میں سے کوئی بھی زندہ واپس نہیں جائے گا۔"

"وہ واپس نہیں جائیں گے" — پنڈت رادھاکشن نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "وہ یہاں تک آئیں گے۔ میں اپنی روح کی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں، اپنی عقل کی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ وہ آئیں گے۔ وہ اس لیے آئیں گے کہ تم یہاں نہیں ہو۔ تم عورت اور شراب کے نشے میں گم ہو گئے ہو۔ کیا مسلمان حسین اور جوان ناچنے گانے والیوں کو اپنے ساتھ رکھتے ہیں جس طرح تم اس اونچے مندر میں آئے ہو اور اپنے ساتھ پاپ

کا سارا سامان لائے ہو.... میں کیوں پریشان ہو رہا ہوں؟ مجھے نیند کیوں نہیں آتی؟ میں راتوں کو گنگا ماتا کی آغوش میں ڈوب کر کیوں رویا کرتا ہوں؟ میری کوئی راجدھانی نہیں، میری کوئی ریاست نہیں جس کا مجھے غم ہو لیکن میری آنکھوں سے دیکھو، میری عقل سے سوچو۔ یہ سارا دیش میرا دیش ہے۔ یہ لڑائی کسی زمین کے لیے نہیں لڑی جا رہی، یہ ہندو دھرم اور اسلام کی لڑائی ہے۔ محمد بن قاسم کے بعد ہمارے دادا پردادا نے بڑی مشکل سے اسلام کو اس دیش سے نکالا تھا مگر آج اسلام ایک بار پھر طوفان کی طرح آیا ہے اور تم عیش و عشرت میں بدمست ہو....

"تم مذہب کو بھول جاؤ۔ اپنے آپ کی سوچو۔ تم شکست کھا گئے تو کہاں جاؤ گے؟.... تمہاری لاشوں کو کریا کرم نصیب نہ ہو گا۔ زندہ رہو گے تو مسلمانوں کے قید خانے میں پڑے گلتے سڑتے رہو گے اور تمہاری بیٹیوں کے ساتھ مسلمان وہی سلوک کریں گے جو تم ان ناچنے گانے والیوں کے ساتھ کر رہے ہو جنہیں تم یہاں بھی اپنے ساتھ لائے ہو۔"

پنڈت کی آواز میں اور اس کے الفاظ میں ایسا تاثر پیدا ہوتا چلا گیا کہ راجوں مہاراجوں کا خون کھولنے لگا۔ وہ بھڑک بھڑک کر سلطان محمود پر جوابی حملے کی باتیں کرنے لگے۔ وہ غزنی کی فوج کو اپنی متحدہ فوج سے بھیرہ اور ملتان میں محصور کر کے ختم کرنے کی باتیں کر رہے تھے۔

"عقل سے کام لو" پنڈت نے کہا۔ "اپنی تمام فوجوں کو اکٹھا کر کے پشاور کی طرف کوچ کرو اور مسلمانوں کے سلطان کو وہاں کہیں پہاڑی علاقے میں گھسیٹ کر ادھر ادھر کی وادیوں میں گھما گھما کر مارو اور غزنی پر چڑھائی کر دو۔ بھیرہ اور ملتان خود ہی تمہاری جھولی میں آ گریں گے۔ اگر تم پشاور کے قریب لڑو گے تو تمہارے مقابلے میں غزنی کی فوج کا تیسرا حصہ ہو گا۔ بھیرہ اور ملتان سے جانے والی کمک کو تم راستے میں روک سکو گے۔"

کچھ دیر جنگ کی تکنیک پر بحث ہوتی رہی۔ سب مہاراجہ انندپال کی کمی محسوس کر رہے تھے۔ پنڈت نے کہا کہ معلوم ہوا ہے کہ وہ کشمیر میں ہے۔ اسے واپس بلایا جائے "....اور اپنی اپنی ریاست میں منادی کرا دو کہ مسلمانوں کو یہاں سے نکالنے کے لیے

فوجوں کو ہتھیاروں، جانوروں، اناج، کپڑوں، خیموں اور سامان کی ضرورت ہے" ـــ پنڈت نے کہا۔ "اس کے لیے رقم چاہیے۔ ہر وہ آدمی جو لڑ سکتا ہے، فوج میں شامل ہو جائے۔"

"ہم لاہور میں دو بار ایک ایک جوان لڑکی کی جان کی قربانی بھی دے چکے ہیں" ـــ ایک راجہ نے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے بھگوان ہم پر اتنے ناراض ہیں کہ دونوں قربانیاں قبول نہیں ہوئیں۔"

"اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ لڑکیاں پاک نہیں تھیں۔" پنڈت رادھا کشن نے کہا۔ "میں پنڈتوں کو جانتا ہوں۔ وہ لڑکیوں کو بہت دن اپنے پاس رکھتے ہیں اور دیوتاؤں کی امانت میں خیانت کرتے ہیں۔ ایسے بدکار پنڈتوں کے ہاتھوں دلائی ہوئی قربانی قبول نہیں ہو سکتی ... میں یہ سوچ چکا ہوں۔ دیوی ایک انسان کی قربانی مانگتی ہے۔ یہ قربانی تم میں سے کسی ایک کی رقاصہ کی دی جائے گی۔ رقاصہ ایسی ہونی چاہیے جو بہت ہی خوبصورت ہو، جوان ہو اور جو اپنے راجہ کو بہت عزیز ہو اور اس کا مسلمان ہونا ضروری ہے۔"

"مگر رقاصہ پاک نہیں ہو سکتی مہاراج!" ایک راجے نے کہا۔ "اور آپ کہہ رہے ہیں کہ مسلمان بھی ہو۔"

"اسے کوئی پنڈت بری نیت سے اپنے پاس نہ رکھے۔" پنڈت نے کہا۔ "میں اسے پاک کہتا ہوں ... اسے میں اس مندر میں رکھوں گا۔ تم دیکھنا اس کی جان قبول ہوتی ہے یا نہیں۔ رقاصہ کا انتخاب میں خود کروں گا۔"

ان تمام ریاستوں میں جو آدھے ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھیں، مندروں میں، گلیوں میں، بازاروں میں، گھروں میں ہندوؤں کی زبان پر یہی الفاظ چڑھ گئے۔ "مسلمان فتح پہ فتح حاصل کرتے آ رہے ہیں۔ انہوں نے پشاور سے لے کر ملتان تک تمام جوان ہندو لڑکیاں اپنی فوج میں تقسیم کر دی ہیں۔ مندروں میں گھوڑے اور بیل بندھے ہوتے ہیں۔ ہتھیار ڈالنے والے فوجی زندہ ہیں مگر کوڑھی ہو گئے ہیں۔ دیوتاؤں کا قہر ہے یہ سب پر گرے گا۔"

ہر کسی پر خوف طاری ہوا جا رہا تھا۔ مندروں میں پنڈت مذہب کی باتیں کم کرتے اور مسلمانوں کے خلاف نفرت زیادہ پھیلاتے تھے۔ انہوں نے سب سے زیادہ عورتوں کو ڈرایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ (گردیزی اور عتبی کے الفاظ میں) "ہندو عورتوں نے اپنے زیورات بیچ کر رقمیں اپنے راجاؤں کے حوالے کر دیں جن عورتوں کے پاس زیورات نہیں تھے، انہوں نے سوت کات کر بیچا اور پیسے خزانے میں جمع کرا دیئے۔ غریب عورتوں نے مزدوری کر کر کے بھی خزانے کو پیسے دیئے۔ جسے دیکھو، وہ پیسہ کمانے اور خزانے کو دینے کی فکر میں تھا۔ جوان آدمی فوج میں شامل ہونے لگے۔ وہ اپنے گھوڑے بھی ساتھ لے گئے۔"

ایک جنون تھا جو ہندو قوم پر طاری ہو گیا تھا۔ آتش فشاں پہاڑ کے اندر لاوا ابل رہا تھا اور اندر سے پہاڑ پھٹتا جا رہا تھا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ پہاڑ کا دہانہ پھٹے گا تو لاوا ساری دنیا کو نیست و نابود کر دے گا۔

سلطان محمود غزنوی اس پہاڑ کے دامن میں بیٹھا تھا۔ وہ اپنے اُن بھائیوں کے خلاف لڑ کر آیا تھا جو اُس کے ارادوں اور اُس کے ایمان سے بے پرواہ، اُس کی سلطنت غزنی پر ہاتھ صاف کرنے کے لیے جتن کر رہے تھے۔ ان ایمان فروشوں کے عزائم کو کچلنے کے لیے غزنی کی سرحدوں پر کافی فوج رکھنے کی ضرورت تھی۔ اگر وہاں یہ صورت حال نہ ہوتی تو وہ فوج ہندوستان میں کام آ سکتی تھی۔ بھیرہ اور ملتان کی لڑائیوں میں اُس کی فوج کی بہت سی نفری ماری گئی تھی۔ اُس نے اس کمی کو نئی بھرتی سے کسی حد تک پورا کر لیا تھا لیکن یہ کافی نہیں تھی۔

سلطان اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں تھا کہ ہندو راجے اُس سے شکست دب گئے۔ اُن کا جوابی حملہ لازمی تھا۔ سلطان وقت حاصل کرنے کی خواہش لیے ہوئے تھا۔ اسے راجہ انند پال کی طرف سے زیادہ خطرہ تھا، اور اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ تمام راجے مہاراجے متحد ہو کر بھی آ سکتے ہیں۔ مورخوں نے لکھا ہے کہ اُس نے اپنی فوج کو آرام سے نہ بیٹھنے دیا۔ ٹریننگ میں زیادہ وقت صرف کرتا اور فوج میں ڈسپلن پر زیادہ زور دیتا تھا۔ یہ کام

فوج کے امام کرتے تھے جو فوج کو اس جنگ کی غرض و غایت بتاتے رہتے تھے۔
سلطان محمود نے اپنی فوج کو مالِ غنیمت سے کبھی محروم نہیں رکھا تھا لیکن انہیں مفتوحہ علاقے میں لوٹ مار کی کبھی اجازت نہیں دی تھی۔

اُس نے تمام ہندو ریاستوں کی راجدھانیوں میں اپنے جاسوس پھیلا رکھے تھے۔ ان جگہوں کے مقامی مسلمان ان جاسوسوں کی بہت مدد کرتے تھے۔ ان میں ایمان فروش بھی تھے جو سلطان کے جاسوسوں کو پکڑوا بھی دیا کرتے تھے۔ بہرحال سلطان کو اطلاعیں ملتی رہتی تھیں کہ دشمن کیا کر رہا ہے۔

راجہ انند پال کشمیر سے لاہور واپس آگیا تھا۔ اُس نے وہاں سے کچھ فوج اکٹھی کر لی تھی۔ وہ شکست کھا کر گیا تھا۔ اُس نے سلطان محمود سے صلح اور امن کا معاہدہ کرنے کی ایک کوشش کی تھی۔ مؤرخوں میں اس کا ذکر صرف البیرونی نے کیا ہے جس کی تحریریں مستند مانی جاتی ہیں۔ البیرونی سلطان محمود غزنوی کے ساتھ تھا۔ وہ بہت سے اہم واقعات کا عینی شاہد ہے۔ سلطان محمود غزنوی جب بھیرہ اور ملتان کی فتح کے بعد غزنی اس اطلاع پر گیا تھا کہ کاشغر کی فوج نے اُس کی سلطنت پر حملہ کر دیا ہے تو اُسے وہاں زندگی اور موت کا معرکہ لڑنا پڑا تھا۔ بعض اوقات اُس کی کامیابی مخدوش نظر آنے لگتی تھی۔ سلطان کی اس کیفیت کی اطلاع کسی طرح راجہ انند پال تک پہنچ گئی۔ البیرونی لکھتا ہے کہ انند پال نے اپنے ایک قاصد کے ہاتھ سلطان محمود کو یہ تحریری پیغام بھیجا۔

"مجھے پتہ چلا ہے کہ ترکوں نے آپ کے خلاف بغاوت کر دی ہے اور وہ خراسان تک پھیل گئے ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو میں پانچ ہزار سواروں، دس ہزار پیادوں اور ایک سو ہاتھیوں کے ساتھ آپ کی مدد کو آسکتا ہوں، اور اگر آپ پسند کریں تو میں اپنی جگہ اپنے بیٹے کو بھیج دوں گا اور اُس کے ساتھ فوج اِس سے دُگنی بھیجوں گا۔ اس اقدام اور پیش کش سے آپ جو بھی تاثر لیں گے، میں اِسے نظر انداز کرتا ہوں۔ آپ نے مجھ پر فتح پائی ہے، میں نہیں چاہتا کہ کوئی آپ پر فتح پائے۔"

اس پیغام اور اس پیش کش سے اندازہ ہوتا ہے کہ راجہ انند پال سلطان محمود سے کس قدر خائف تھا اور اُس میں اب لڑنے کی جرأت نہیں رہی تھی لیکن محمود جس قدر قابل جرنیل تھا، اتنا ہی قابل سیاست دان تھا۔ اُسے معاہدوں کے سلسلے میں ہندوؤں کی ذہنیت کا پتہ چل چکا تھا۔ اُسے مدد کی ضرورت تھی لیکن وہ ہندو راجے کی مدد کا خواہشمند نہیں تھا۔ اُس نے یہ خطرہ بھی دیکھا کہ راجہ انند پال اُسے فوجی مدد کا جھانسہ دے کر یہ مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے کہ سلطان غزنی میں ہی لڑتا مرتا رہے۔ یہ خطرہ بھی تھا کہ راجہ فوج لے آئے اور سلطان کو کسی خطرناک صورتِ حال میں چھوڑ کر دشمن سے جا ملے۔

"کیا انند پال تاریخ کو اور ہمارے آنے والی نسلوں کو یہ بتانا چاہتا ہے کہ میں ہندوؤں کی مدد سے جیتا تھا؟" ــ سلطان محمود نے انند پال کا پیغام اپنے سالاروں اور مشیروں کو پڑھ کر کہا۔ "اس میں کوئی اور خطرہ نہ بھی ہو تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ دو ایسے مذہبوں کے حکمران جو ایک دوسرے کی ضد ہیں، دوست بن جائیں۔ میں ایسی پیش کش قبول نہیں کر سکتا۔ اپنے مذہب کے دشمن کو دوست نہیں بنایا جا سکتا۔"

اُس نے انند پال کے قاصد کو زبانی جواب دیا کہ اپنے راجہ سے کہنا کہ ہمارا اور آپ کا سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔ ہمارے درمیان امن ناممکن ہے۔

اس جواب کے بعد راجہ انند پال لاہور آگیا۔ صلح کی پیش کش مسترد ہو جانے کے بعد اُس کے لیے اب یہی راستہ رہ گیا تھا کہ سلطان محمود سے فیصلہ کن معرکہ لڑے۔ اُس کے پاس فوج کی کمی نہیں تھی۔ اُس نے آتے ہی اپنے وزیر، اپنے جرنیلوں اور اپنے مشیروں کی کانفرنس بلائی اور ان سب کو بتایا کہ وہ بہت تھوڑے سے وقت میں تیاری کر کے بھیرہ پر حملہ کرنا چاہتا ہے۔ اس پر بحث کے دوران یہ مسئلہ بھی زیرِ بحث آیا کہ سلطان محمود نسبتاً کم فوج سے اتنی بڑی فوج کو کس طرح شکست دے دیتا ہے۔

"اُسے آج تک ہم اور مہر گپاشی مہاراجہ جے پال بے خبری میں نہیں دبوچ سکے۔" ایک جرنیل نے کہا۔ "اُسے اتنی قبل از وقت ہماری پیشقدمی کی اطلاع مل جاتی ہے کہ وہ اپنی فوج کو نہایت اچھی ترتیب میں تقسیم کر لیتا ہے۔ ہم ہر بار اُس کی گھات میں آئے ہیں۔ اس

سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اُس کے جاسوس بہت ہوشیار ہیں۔ یہ جاسوس ہمارے درمیان گھومتے پھرتے رہتے ہیں۔"

"یہاں مسلمانوں کی جو تھوڑی سی آبادی ہے، ان میں اُس کے جاسوس ہیں" — راجہ انند پال نے کہا۔ "کیوں نہ اس پوری آبادی کو صاف کر دیا جائے۔"

"یہ اقدام ہمیں کوئی فائدہ نہیں دے گا" — وزیر نے کہا۔ "یہ لوگ یہاں سے بھاگ جائیں گے۔ جاسوس فوراً نکل جائیں گے۔ ایسی کارروائی کریں کہ ہمیں جاسوس مل جائیں۔ یہاں کے مسلمانوں کو اپنا دشمن نہ بنائیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ کتنے ہی مسلمان ہمارے لیے مخبری اور جاسوسی کرتے ہیں۔ مسلمان کی مخبری مسلمان ہی کر سکتا ہے۔ ہم ایسا انتظام کریں گے کہ مسلمان گھرانوں پر نظر رکھیں اور خفیہ طریقے سے پتہ چلائیں کہ کون جاسوس ہے۔ اگر ایک پکڑا گیا تو ہم طریقے جانتے ہیں کہ اُس سے معلوم کیا جائے کہ یہاں کون کون جاسوس ہے۔"

"یہ کام آج ہی شروع کر دو" — راجہ نے کہا۔ "اور فوج کو تیار کر دو۔"

"لوگ بہت مدد کر رہے ہیں" — وزیر نے کہا۔ "مندروں میں پنڈتوں نے لوگوں کو جنگی تیاری اور فوج کی ضروریات کے متعلق بتلایا ہے۔" — وزیر نے بتایا کہ لوگوں کو کیا کچھ بتایا جا رہا ہے اور لوگ کس طرح مدد دے رہے ہیں۔

راجہ انند پال کے راج محل میں گھوڑوں کی دیکھ بھال کرنے والوں کا انچارج شعیب ارمغانی نام کا ایک مسلمان تھا جو گھوڑوں کو سدھانے کا ماہر اور شہسوار تھا۔ وہ پشاور کے علاقے کا رہنے والا تھا۔ راجہ جے پال کے آخری دور میں یہاں آیا تھا۔ اُس وقت وہ نوجوان تھا اور اب پختہ کار جوان بن چکا تھا۔ اُس نے بڑے خودسر اور عادی بے لگام گھوڑوں کو بھی رام کر لیا تھا۔ راجہ جے پال کے بعد اُس کا بیٹا راجہ انند پال بھی اسے بہت چاہتا تھا۔

گھوڑوں کی مہارت کے علاوہ اُس میں کچھ اور خوبیاں بھی تھیں جن کی بدولت وہ محل کی رانیوں اور راجکماریوں کو بھی اچھا لگتا تھا۔ ایک تو وہ خوبرو تھا۔ اُس کا رنگ گورا اور آنکھیں سبز تھیں۔ دوسرے یہ کہ اُس کی زبان میں چاشنی تھی اور اُس کے ہونٹوں پر

تبسم رہتا تھا۔ وہ دراز قد اور گٹھے ہوئے جسم کا جوان تھا۔ گھوڑے بھی جیسے اُس سے محبت کرتے تھے۔ اُس کی وفاداری میں کسی کو شک نہیں تھا۔ اُس کی وفاداری بھی ایسی کہ اُس کے متعلق راج محل میں کہتے تھے کہ یہ نام کا مسلمان ہے۔

محل کے عملے میں چند ایک مسلمان ملازم بھی تھے جو چھوٹے چھوٹے کام کرتے تھے۔ راجہ انند پال کے نئے حکم کے مطابق خفیہ طریقے سے ان سب کی نگرانی ہونے لگی۔ ہندو فوجی مسلمانوں کے بہروپ میں انہیں جا ملتے اور پرکھنے لگے۔ ہندوؤں کی ذہین اور چالاک لڑکیاں مسلمان لڑکیوں کے بھیس میں مسلمانوں کے گھروں میں جاتیں، محمود غزنوی کے حق میں اور ہندوؤں کے خلاف باتیں کرتیں اور مسلمان عورتوں سے اُن کے مردوں کے خیالات اور خفیہ سرگرمیوں سے متعلق پتہ چلانے کی کوشش کرتیں۔ ہندو مرد آج کی پولیس کی طرح مسلمان مردوں سے ملتے۔ رازونیاز کی باتیں کرتے۔ اپنے آپ کو سلطان محمود کے جاسوس کہتے۔ اس خفیہ مہم میں کئی ایک مسلمان پکڑے گئے۔ جس کسی پر ذرا سا شک ہوتا تھا، اُسے بھی پکڑ لیتے اور یہ سب تشدد کی چکی میں پسنے لگے۔

شعیب ارمغانی پر شک کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ اُس کی سرگرمیاں گھوڑوں تک محدود تھیں۔ اُس پر صرف اس بنا پر شک کیا جا سکتا تھا کہ وہ اکیلا رہتا تھا۔ اُس وقت تک اُسے دو تین بچوں کا باپ بن جانا چاہیے تھا لیکن وہ اکیلا تھا۔ اگر اس کی بیوی پشاور میں تھی تو اُسے کبھی بھی لاہور نہیں لایا تھا۔ اگر اُس نے شادی نہیں کی تھی تو اب تک کر لینی چاہیے تھی۔ یہی ایک پہلو تھا جو اُس کے خلاف کچھ شک پیدا کر سکتا تھا لیکن ہندو اُسے اپنی خفیہ مہم سے محفوظ رکھے ہوئے تھے۔ ہر کوئی جانتا تھا کہ اُس نے کئی بار سلطان محمود کے خلاف باتیں کی تھیں۔ اُسے کبھی مسجد میں جاتے نہیں دیکھا گیا تھا۔ وہ نماز روزے سے بھی فارغ تھا۔ اُس کے متعلق معلوم کر لیا گیا تھا کہ وہ کسی مسلمان سے نہیں ملتا۔

ایک شام وہ اپنے گھر میں اکیلا تھا۔ اُس کے دروازے پر دستک ہوئی۔ اُس نے دروازہ کھولا۔ باہر ایک سیاہ ریش اجنبی کھڑا تھا۔ اُس کے ساتھ ایک عورت تھی جس نے چہرہ نقاب میں چھپا رکھا تھا۔ اس اجنبی نے اپنا تعارف یوں کرایا کہ وہ پشاور

کا تاجر ہے اور سامان لے کر آیا ہے، اور اُس کے ساتھ اس کی جواں سال بیٹی ہے جسے وہ اس لیے ساتھ لایا ہے کہ اس کی بیوی مر چکی ہے اور گھر میں اور کوئی نہیں جس کے پاس وہ بیٹی کو چھوڑ کر آتا۔ بیٹی کی خواہش سیر کی بھی تھی، اس لیے وہ اسے ساتھ لے آیا ہے۔ وہ پشاور کی زبان بول رہا تھا۔

"سرائے میں رہائش کا انتظام اچھا ہے"۔ اجنبی نے کہا "لیکن اتنی جوان اور ایسی خوبصورت بیٹی کو سرائے میں رکھنا ٹھیک نہیں رہتا۔ ہندو فوج چھاپے مارتی رہتی ہے اور مسلمانوں کو شک میں پکڑ لیتے ہیں۔ کسی نے آپ کے متعلق بتایا ہے کہ آپ اکیلے رہتے ہیں اور لوگ آپ کی شرافت اور نیت کی تعریف کرتے ہیں۔ مجھے آپ کے گھر کا راستہ دکھایا گیا ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ آپ ہمارے ہی وطن کے رہنے والے ہیں"۔

"ایک مسلمان کسی مسافر پر اپنے گھر کا دروازہ بند نہیں کر سکتا"۔ ارمغانی نے کہا۔ "اور جہاں ایک مسلمان خاتون کی عزت کا معاملہ ہو وہاں میں ساری رات پہرہ بھی دے سکتا ہوں۔ مسلمان ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہیں ہوا کرتے۔ آؤ، اپنی بیٹی کو لے آؤ۔ میرے گھر میں بہت کمرے ہیں"۔

وہ دونوں اُس کے ساتھ اُسی کے کمرے میں آ گئے۔ خاتون نے دیئے کی روشنی میں چہرے سے نقاب ہٹایا تو ارمغانی کو دھچکہ سا لگا۔ وہ عورت نہیں، جوان لڑکی تھی اور اُس کے حسن میں کوئی ایسی کشش تھی کہ ارمغانی سُن ہو کے رہ گیا۔ اُس کے منہ سے بے ساختہ نکلا — "آپ نے اچھا کیا ہے کہ سرائے میں نہیں ٹھہرے۔ چھپا کر رکھنے والی چیزوں کو ایک نہیں سات پردوں میں چھپا کر رکھنا چاہیئے"۔

انہیں بٹھا کر وہ دوڑتا ہوا باہر نکلا اور بازار سے مہمانوں کے لیے کھانا لے آیا۔ لڑکی نے برقعہ تو نہ اتارا مگر نقاب اتار دی تھی۔ اُس کا قد اور سراپا اس قدر دلنشیں تھا کہ ارمغانی اُس سے نظریں نہ ہٹا سکا۔ راج محل کی نوکری میں کئی لڑکیوں نے ارمغانی پر ڈورے ڈالے تھے لیکن اُس نے اپنے دامن کو ہر کسی سے پاک رکھا تھا۔ راجہ انند پال کی دو راجکماریاں

اُس سے گھوڑسواری سیکھنے آتی تھیں۔ دونوں کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ وہ خود گھوڑے پر نہ بیٹھیں، ارمغانی انہیں اٹھا کر گھوڑے پر بٹھائے۔ وہ گھوڑسواری سیکھ چکیں تو بھی کہتی تھیں کہ نہیں، وہ ابھی طاق نہیں ہوئیں۔

یہ دونوں خوبصورت لڑکیاں تھیں لیکن ارمغانی اِن کے اتنے واضح اشاروں کو بھی یوں نظر انداز کر دیتا تھا جیسے وہ بدھو اور جاہل ہو یا اس کے سینے میں مرد کا دل ہی نہ ہو۔ ایک بار ایک راجکماری گھوڑا سرپٹ دوڑانے کے بہانے اُسے دریا کے کنارے جنگل میں لے گئی تھی اور وہاں جا کر ارمغانی سے کہا کہ میرے گھوڑے پر میرے پیچھے سوار ہو جاؤ، مجھے ڈر آتا ہے۔ ارمغانی نے انکار کر دیا تھا۔ راجکماری نے پہلے التجا کی کہ آ جاؤ میرے پیچھے اور مجھے اپنے بازوؤں میں پکڑ لو۔ وہ نہ مانا تو راجکماری نے اُسے حکم دیا کہ میرے پیچھے بیٹھو۔ ارمغانی نے مسکرا کر انکار کر دیا تھا۔ راجکماری غصے سے گھوڑا واپس لے آئی تھی۔

اس معاملے میں وہ پتھر تھا لیکن اپنے مہمان کی بیٹی کو دیکھ کر اُس نے اپنے آپ میں ایسی ہلچل محسوس کی جس سے وہ آشنا نہیں تھا۔ وہ اِس لڑکی کے ساتھ باتیں کرنا چاہتا تھا۔ اُسے اپنے آپ پر اتنا بھروسہ تھا کہ اُس کی نیت بد نہیں ہو سکتی تھی، پھر بھی اُس کے دل میں یہ خواہش تڑپ رہی کہ اُس کا مہمان ذرا باہر چلا جائے اور وہ اس لڑکی کے ساتھ باتیں کرے۔ لڑکی اُسے دیکھتی تھی تو اُس کے ہونٹوں پر شرمیلا سا تبسم آ جاتا تھا۔ یہ تبسم ارمغانی کے پاؤں اکھاڑ دیتا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد ارمغانی نے مہمانوں کو اُن کا کمرہ دکھایا۔ لڑکی اُسی کمرے میں رہ گئی اور لیٹ گئی اور اُس کا باپ ارمغانی کے کمرے میں آن بیٹھا۔ گپ شپ چلی تو مسلمان ہونے کی وجہ سے سلطان محمود غزنوی کی فتوحات کی باتیں ہونے لگیں۔ دونوں نے خوشی کا اظہار کیا۔ مہمان کی باتوں سے پتہ چلتا تھا کہ سلطان محمود کا شیدائی ہے اور وہ صرف تاجر ہی نہیں، علم و فضل پر بھی دسترس رکھتا ہے۔ اُس نے محمد بن قاسم کی بھی باتیں کیں اور کہنے لگا کہ اُس کا بس چلے تو سارے ہندوستان کو مسلمان کر دے۔ اُس نے اس پریشانی کا بھی اظہار

کیا کہ سلطان محمود کے پاس فوج کی کمی ہے اور اگر تمام راجوں نے اُس پر حملہ کر دیا تو مسلمانوں کی فوج مقابلہ نہیں کر سکے گی۔ ارمغانی نے کہا کہ مسلمان کو اپنے اللہ پر بھروسہ کرنا چاہیے۔

"لیکن مسلمان کو بھی کچھ کرنا چاہیے" — مہمان نے کہا۔ "ہم دو مسلمان یہاں بیٹھے ہیں۔ ہم اُس سلطان کی کیا مدد کر رہے ہیں جو کافروں کے دیس میں اللہ اور رسول ﷺ کا پیغام لے کر آیا ہے اور کفر کی ساری طاقتیں اس کے خلاف ہیں... میں تجارت کر رہا ہوں اور تم ہندوؤں کی نوکری کر رہے ہو؟"

"ضرورت پڑی تو میں نوکری چھوڑ دوں گا۔" ارمغانی نے کہا۔

"نہیں" — مہمان تاجر نے کہا۔ "میں نے تمہارے ساتھ یہ باتیں اس لیے کی تھیں کہ دیکھوں کہ تم کیسے مسلمان ہو اور اسلام کے ساتھ تمہارا رشتہ کیسا ہے.... میں نے دیکھ لیا ہے کہ تم اپنے رسول ﷺ کے نام پر مرمٹنے والے مسلمان ہو۔ میں تمہارے ساتھ دل کی بات کر سکتا ہوں۔ تم نے نوکری چھوڑ دینے کی بات کی ہے۔ یہ غلط ارادہ ہے۔ تم اس نوکری کو سلطان محمود کے فائدے کے لیے استعمال کر سکتے ہو۔ تم راج محل میں کام کرتے ہو۔ تمہارے گھر کا راستہ دکھانے والوں نے مجھے بتلایا ہے کہ گھوڑوں کا استاد ہونے کی وجہ سے ہندوؤں کی فوج کے بڑے بڑے حاکم اور محل کی شہزادیاں بھی تمہیں جانتی ہیں.... تمہیں کرنا کچھ بھی نہیں۔ یہ معلوم کرتے رہو کہ راجہ کے ارادے کیا ہیں۔ یہاں کی فوج کی تیاریاں دیکھتے رہو اور یہ اطلاعیں سلطان تک پہنچاتے رہو۔"

"کیا تم یہ کام کرتے ہو؟" — ارمغانی نے پوچھا۔

مہمان عجیب سی ہنسی ہنس کر بولا۔ "بے شک میں تاجر ہوں لیکن تجارت کے سلسلے میں مجھے لاہور آنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی.... میں اونٹوں پر سامان لاد کر اس لیے یہاں آیا ہوں کہ دیکھوں کہ راجہ انند پال کیا کر رہا ہے اور وہ کب تک مسلمانوں پر حملے کے لیے تیار ہو جائے گا۔ دراصل سلطان کو بھی وقت چاہیے۔ اُس کی فوج کا جانی نقصان بہت ہوا ہے۔ اس کمی کو پورا کرنا ہے۔"

"تمہیں کس نے بھیجا ہے؟" ارمغانی نے پوچھا۔ "یا یہ کام اپنے جذبے کے تحت کر رہے

"میرا تعلق براہِ راست سلطان محمود غزنوی سے اور اس کے سالار ابو عبداللہ الطائی سے ہے" — مہمان نے جواب دیا۔ "یہاں مجھے کسی ایسے آدمی کی مدد کی ضرورت ہے جو راج محل اور راج دربار کے اندر کے حالات جانتا ہو۔ وہ آدمی تم ہو۔ مجھے تمہارے گھر کا راستہ دکھانے والے آدمی میرے اپنے ہیں۔ انہوں نے مجھے تمہارے پاس کچھ سوچ سمجھ کر بھیجا ہے۔"

"وہ کون ہیں؟"

"مجھے اس سوال کا جواب نہیں دینا چاہیے" — مہمان نے کہا۔ "یہ نہ سمجھنا کہ مجھے تم پر اعتبار نہیں۔ میں صرف احتیاط کر رہا ہوں۔ سب کچھ بتا دوں گا۔ تم یہ بتاؤ کہ میرا ساتھ دو گے؟ اگر دھوکہ دو گے تو پچھتاؤ گے۔"

ارمغانی کا سر جھک گیا۔

"میرے جذبے کا اندازہ اس سے کرو کہ میں اپنی بیٹی کو سلطان محمود کی فتح کے لیے استعمال کرنے کو تیار ہوں" — مہمان نے جذبات سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "ایسی خوبصورت لڑکی پتھروں کے بھی دل چیر کر راز لے آئے گی۔ ہو سکتا ہے ہمیں یہیں کوئی تباہ کاری کرنی پڑے۔"

"میری دو باتیں دھیان سے سنو میرے تاجر دوست!" — ارمغانی نے کہا۔ "ایک یہ کہ بیٹی کو اس کام میں استعمال نہ کرنا۔ مسلمان کی بیٹی میدانِ جنگ میں لڑ سکتی ہے اور ہماری بہنیں لڑی بھی ہیں لیکن انہیں جاسوس بنا کر کفار کے حوالے کرنا کفر ہے۔ یہ گناہ کفار کیا کرتے ہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ میں نے راجہ کا نمک کھایا ہے۔ میں نے راجہ کی خدمت کی ہے اور راجہ نے مجھے اتنی اُجرت دی ہے جس کا میں حقدار نہ تھا۔"

"ایک طرف تم اسلام اور اسلامی غیرت کی باتیں کرتے ہو، دوسری طرف تم ا- کے دشمن کا نمک حلالی کر رہے ہو" — مہمان نے کہا۔ "میں نے سنا تھا تم بہت جرأت والے اور ایمان والے ہو۔"

"مجھ میں دونوں چیزیں ہیں" — ارمغانی نے کہا۔ "جرأت بھی، ایمان بھی، لیکن میں یہ نہیں کہلاؤں گا کہ مسلمان نمک حرام ہوتے ہیں۔"

"پھر تو مجھے لاہور سے جلدی نکل جانا چاہیے" مہمان تاجر نے کہا۔ "ورنہ تم مجھے اور میری بیٹی کو پکڑوا دو گے۔ میرے یہاں کے آدمیوں نے مجھے بتایا ہے کہ مسلمانوں کو شک اور شبے میں پکڑ رہے ہیں۔"

ارمغانی اٹھا اور طاق سے قرآن اٹھا کر دونوں ہاتھوں میں لیا اور مہمان کے آگے کر کے کہا۔ "اس پر ہاتھ رکھو۔" مہمان نے ہاتھ رکھا تو ارمغانی نے کہا۔ "میں خدا اور رسولؐ کے اس پاک کلام کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تمہیں اور تمہاری بیٹی کو دھوکہ نہیں دوں گا..... اب تم قسم کھاؤ کہ تم بیٹی کو اس کام میں استعمال نہیں کرو گے اور تم سلطان محمود غزنوی کو دھوکہ نہیں دو گے۔"

مہمان نے قسم کھائی۔ کچھ دیر سوچ میں پڑا رہا پھر کہنے لگا۔ "تم نے بیٹی کے متعلق قسم لے کر مجھ پر ظلم کیا ہے۔ تم نہیں جانتے کہ میں کتنا خطرناک کام کر رہا ہوں۔ میں پکڑا گیا تو میری بیٹی کا انجام بہت برا ہوگا۔ کیا تم میری بیٹی کی ذمہ داری قبول کر سکتے ہو؟ فی الحال اسے کچھ دن اپنے پاس رکھو۔ میں اپنے کاروبار کے سلسلے میں شاید باہر چلا جاؤں۔"

"کسی کی جوان بیٹی کو اپنے پاس رکھنا بڑی ہی نازک ذمہ داری ہے۔" ارمغانی نے کہا۔ "میں انکار بھی نہیں کر سکتا اور میں اقرار سے بھی گھبراتا ہوں۔"

مہمان تاجر اٹھ کھڑا ہوا اور سر جھکا کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ کچھ دیر بعد رک کر بولا۔ "اگر میں اپنی بیٹی تمہیں پیش کر دوں تو اسے بیوی بنا لو گے؟ میں اپنے ہاتھوں شادی کرا دوں گا۔"

"آپ نے مجھ میں ایسی کونسی خوبی دیکھی ہے کہ اپنی اتنی خوبصورت بیٹی کی شادی مجھ جیسے عام آدمی کے ساتھ کر رہے ہیں؟" ارمغانی نے کہا۔ "میں اپنے آپ کو اس قابل نہیں سمجھتا۔"

"تم میں یہ خوبی دیکھی ہے کہ تم جاسوس نہیں ہو۔" مہمان نے کہا۔ "میں اسی لیے تم سے پوچھ رہا تھا کہ تم جاسوسی کر سکتے ہو یا نہیں۔ تم وفادار ملازم ہو، اس لیے میری بیٹی کا مستقبل محفوظ رہے گا۔ جاسوس کی زندگی کا کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ وہ اپنی بیویوں کو اپنے ساتھ بھی نہیں رکھ سکتے۔ میری بیٹی کے لیے دولت مندوں کے رشتے مل رہے ہیں۔ پشاور میں غزنی کی فوج کے ایک نائب سالار نے مجھ سے رشتہ مانگا تھا۔ میں نے انکار

کر دیا۔ میں کسی امیر کبیر کو رشتہ نہیں دوں گا کیونکہ وہ ایک بیوی سے مطمئن نہیں ہوا کرتے۔"

شعیب ارمغانی کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ تو اس لڑکی کو دیکھتے ہی اس کے حسن سے مسحور ہو گیا تھا۔ اس کے لیے مزید بحث کی گنجائش نہیں تھی۔

اگلی صبح ارمغانی کا مہمان یہ کہہ کر چلا گیا کہ وہ شام کو واپس آئے گا۔ ارمغانی لڑکی کے ساتھ اکیلا رہ گیا۔ اس نے لڑکی کے لیے ناشتے کا انتظام کیا اور اس کے آگے ناشتہ رکھ کر اس سے نام پوچھا۔ اس نے بتایا۔ "زرفہ!"

"کیا باپ نے تمہیں بتایا ہے کہ وہ تمہاری شادی میرے ساتھ کر رہا ہے؟" شعیب ارمغانی نے پوچھا۔

لڑکی نے نگاہیں نیچی کر کے سر اتنا جھکا لیا جیسے زمین میں دھنس جانا چاہتی ہو۔

"مجھے جواب دو زرفہ!" اس نے لڑکی کا سر اوپر اٹھاتے ہوئے پوچھا۔ "مجھے اچھی طرح دیکھ لو۔ اگر مجھے اپنے قابل سمجھو تو بتا دو۔ میں تمہیں تمہاری مرضی کے بغیر ساری عمر کے لیے اپنی زنجیروں میں نہیں باندھوں گا۔ میں انکار کر دوں گا۔"

زرفہ نے زبان سے کچھ بھی نہ کہا۔ ارمغانی کا ایک ہاتھ اپنے دونوں میں تھام کر پہلے اپنے ہونٹوں سے پھر اپنی آنکھوں سے لگایا اور پھر اس کا ہاتھ اپنے سینے پر رکھ کر دبایا۔ تب اس نے ارمغانی کو نظر بھر کر دیکھا۔ ارمغانی کے ہاتھ گھوڑوں کے جسموں کے لمس کے عادی تھے۔ وہ گھوڑوں کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے جوانی گزار رہا تھا۔ وہ اتنے نازک ہاتھوں اور اتنے نرم اور ملائم بالوں کے لمس سے ناآشنا تھا جو اس لڑکی کے تھے۔ اس نے ایسی نیلی آنکھیں اتنی قریب سے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ اس پر خمار طاری ہو گیا۔

شام کو زرفہ کا باپ آیا تو اس کے ساتھ دو آدمی تھے۔ انہوں نے زرفہ کی شادی شعیب ارمغانی کے ساتھ کر دی۔ باپ نے زرفہ کو نقد رقم دی، کپڑے دیئے اور سونے کے زیورات دیئے اور وہ اسی شام چلا گیا۔ اس کے جانے کا انداز ایسا تھا جیسے ارمغانی کو اپنی بیٹی دینے ہی آیا ہو۔

اس رات ارمغانی کو کئی بار شک ہوا جیسے وہ خواب دیکھ رہا ہو۔ ذرا سی دیر میں زردہ اُس کے ساتھ یوں کھل گئی جیسے وہ ایک مدت سے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ لڑکی ارمغانی پر طلسم کی طرح طاری ہو گئی۔ ارمغانی کی جذباتی حالت ایسی ہو گئی جیسے چشمے پر آ کر اسے پتہ چلا ہو کہ وہ پیاس سے مر رہا ہے۔

"تمہارا باپ سلطان محمود کے متعلق بہت جذباتی ہے"۔ ارمغانی نے زردہ سے کہا۔ "تم جانتی ہو کہ اُس کے ارادے کیا ہیں؟"

"اگر میں آپ سے کہوں کہ وہی ارادے میرے ہیں جو میرے باپ کے ہیں تو آپ کیا کریں گے؟"۔ زردہ نے کہا۔ "میرے باپ نے آپ کے ساتھ جو باتیں کی تھیں، وہ سب مجھے بتا گئے ہیں"

"اور یہ بھی کہہ گئے ہوں گے کہ تم مجھے جاسوسی کے سلسلے میں اُس کی مدد پر آمادہ کرو"۔ ارمغانی نے کہا۔

"ہاں!" — زردہ نے کہا۔ "میں آپ سے کچھ بھی نہیں چھپاؤں گی۔ وہ مجھے کہہ گئے ہیں کہ میں آپ کو اسلام کی خاطر کام کرنے کے لیے تیار کروں کیونکہ آپ کو راجہ نے ایسی جگہ دے رکھی ہے جہاں سے آپ بڑے قیمتی راز حاصل کر سکتے ہیں"

"کیا تم نے اسی مقصد کے لیے میرے ساتھ شادی کی ہے؟"۔ ارمغانی نے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے تم مجھے انعام کے طور پر دی گئی ہو"

"نہیں" — زردہ نے جذباتی لہجے میں جواب دیا۔ "خدا نے آپ کو مجھے انعام کے طور پر دیا ہے۔ آپ میری زندگی کے ساتھی ہی نہیں، میرے دل اور میری روح کے مالک ہیں۔ میں نے آپ کو کل ہی دیکھا ہے نا، مگر ایسے لگتا ہے جیسے ہر لمحہ میری آنکھوں کے سامنے رہے ہیں۔ میرے دل میں جو کچھ ہے وہ آپ کا ہے ... میرا ہر راز آپ کا ہے۔ آپ کسی وہم میں مبتلا نہ ہوں۔ ہم باپ بیٹی اسلام کی شمع کے پروانے ہیں۔ میرے والد پر یہ جنون طاری ہے کہ سارے ہند میں اسلام پھیلانا ہے۔ وہ جس مسلمان سے ملتے ہیں اُس سے پہلی بات یہ پوچھتے ہیں، "سلطان محمود غزنوی کی فتح کے لیے تم کیا کر رہے ہو؟" مسجد میں جاتے ہیں تو سلطان محمود کی فتح اور ہندوؤں کی شکست کے لیے دعائیں کرتے اور کراتے ہیں۔ وہ

مجھے تیغ زنی، گھوڑ سواری اور تیر اندازی کی بہت مشق کرا چکے ہیں۔ ایک بار انہوں نے مجھے کہا تھا کہ بیٹی! ہو سکتا ہے میں تمہاری شادی نہ کر سکوں۔ مجھے نظر آ رہا ہے کہ تم اسلام اور سلطان محمود کے نام پر قربان ہو گی"

ارمغانی نے محسوس کیا کہ لڑکی کے خیالات اپنے باپ جیسے ہیں اور اس میں باپ والا جوش و خروش ہے۔

"تمہیں یہ کس نے بتایا ہے کہ میں غزنی والوں کا جاسوس ہوں؟" ارمغانی نے پوچھا۔

زردہ نے اپنا ایک بازو اُس کی گردن کے گرد لپیٹ لیا اور اُس کے اتنا قریب ہو گئی کہ دونوں کے گال چھونے لگے۔

"مجھے معلوم نہیں کہ والد کو آپ کے متعلق کس نے بتایا تھا"۔ زردہ نے جواب دیا۔ "مجھے انہوں نے کہا تھا کہ ہم جس آدمی کے پاس جا رہے ہیں، وہ ہمارے کام کا آدمی ہے۔"

زردہ نے منہ اُس کے اور قریب کر کے رازداری سے کہا۔ "اگر آپ سچ کہہ رہے ہیں کہ آپ سلطان محمود کے خفیہ آدمی نہیں تو مجھے مایوسی ہوئی ہے"

"پھر تمہارے دل سے میری محبت نکل جائے گی؟"

"محبت تو روح میں اتر گئی ہے"۔ زردہ نے جواب دیا۔ "میرا مطلب یہ ہے کہ ہمیں غزنی کی فوج کی اتنی مدد کرنی چاہیے کہ وہ اگر سارے ہند پر نہیں تو آدھے ملک پر قابض ہو جائے اور یہاں کا بچہ بچہ مسلمان ہو"

"تمہیں یہ کس نے بتایا ہے کہ صرف جاسوسی سے ہی غزنی والوں کی مدد کی جا سکتی ہے؟" — ارمغانی نے پوچھا۔ "اور بھی کئی طریقے ہیں"

"میرے والد صرف جاسوسی کی باتیں کرتے ہیں"۔ زردہ نے کہا۔ "ایک عورت یہی کام کر سکتی ہے لیکن میرے والد مجھے بتا گئے ہیں کہ تم نے ان سے قرآن پر قسم لی ہے کہ وہ مجھے اس کام کے لیے استعمال نہیں کریں گے ... میں ایسا کام نہیں کروں گی جس میں میری عصمت کو خطرہ ہو لیکن میں صرف بیوی بن کر نہیں رہ سکتی۔ آپ وہ کام کریں جو آپ کو میرے والد بتا گئے ہیں۔ یہ میری روح کی آرزو ہے"

شعیب ارمغانی نے اُسے کوئی تسلی بخش جواب نہ دیا۔

اُس رات کے بعد ارمغانی کی یہ حالت ہو گئی کہ وہ کام سے وقت نکال کر گھر چلا جاتا اور زرفہ کے ساتھ چند منٹ گزار کر واپس چلا جاتا۔ زرفہ اُس کی بیوی تھی لیکن کبھی کبھی وہ اُسے اس طرح دیکھنے لگتا جیسے اُسے اُس سے کوئی چھین کر لے جائے گا۔ زرفہ اس کی محبت کا جواب دیوانہ وار محبت سے دیتی لیکن وہ ہر رات اُسے اکساتی کہ وہ ہند میں اسلام کی فتح کے لیے کچھ کرے۔ اس معاملے میں بھی وہ اتنی ہی جذباتی تھی جتنی ارمغانی کی محبت میں دیوانی۔

دس بارہ روز گزرے ہوں گے۔ آدھی رات تک وہ دونوں راز و نیاز اور پیار و محبت میں محو رہے۔ ارمغانی پر نیند کا غلبہ ہوا جا رہا تھا۔ زرفہ کے حسن و جوانی نے اُس پر اپنا خمار طاری کر دیا تھا۔ اس کیفیت میں زرفہ نے آہ بھر کر کہا "آپ کے جسم کی تپش اور آپ کی محبت کا سرور مجھے جنت میں پہنچا دیتا ہے۔ جنت اس سے زیادہ دلنشیں نہیں ہو سکتی، مگر اس نشے میں غزنی کے وہ جوان یاد آتے ہیں جو اتنی دُور آ کر شہید ہوئے ہیں تو میرا دل ڈوبنے لگتا ہے۔ شہیدوں کی روحیں مجھے لعنت ملامت کرتی ہیں کہ تم عیش و عشرت میں پڑی ہوئی ہو، اور تمہیں اپنی روح کی مسرت کا کوئی خیال نہیں۔"

اُس نے بے تاب ہو کر ارمغانی کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور بولی "میری روح کا گلا گھونٹ دو تاکہ میں صرف خوبصورت جسم رہ جاؤں اور تم اس کے ساتھ کھیلتے رہو۔ اگر ہم ان شہیدوں کے عزم کو جنہیں وہ ادھورا چھوڑ گئے ہیں، پورا نہیں کر سکتے تو ہمیں اپنا مذہب تبدیل کر لینا چاہیئے۔"

ارمغانی پر خمار طاری تھا۔ یہ خمار اُس کی عقل پر غالب آ گیا۔ اُس نے کہا "زرفہ! میں اپنی قسم توڑنے سے ڈرتا تھا۔ میں نے مسجد میں قرآن پر حلف اٹھایا تھا کہ جان دے دوں گا، اپنا اور اپنے کسی ساتھی کا راز کسی قیمت پر نہیں دوں گا۔ آج میں اپنی قسم اس لیے توڑ رہا ہوں کہ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تم میری بیوی ہی نہیں، میرے ان ساتھیوں کی طرح میری ساتھی بھی ہو جو میری طرح حلف اٹھا کر پشاور سے آئے تھے....

"میرا راز سن لو۔ میں غزنی کی فوج کا جاسوس ہوں۔ میں نے نوجوانی میں غزنی جا کر جاسوسی کی تربیت حاصل کی اور یہاں آیا تھا۔ مجھ میں ہنر یہ تھا کہ گھوڑا کتنا ہی اکھڑ اور منہ زور ہو، اُسے اپنا غلام بنا لیتا ہوں۔ خدا نے مجھے چند اور خوبیاں بھی دی ہیں۔ یہاں آیا تو مجھے ہندوؤں نے یہ ملازمت دے دی....

"میری قربانی کا اندازہ کرو زرفہ! میں نے اپنی جوانی کی اُمنگیں قربان کر دیں، شادی نہ کی۔ میں نے راتیں تنہا گزاری ہیں۔ تم جیسی حسین لڑکیوں نے مجھے محبت کے پیغام دیئے۔ راجکماریوں نے میرے جسم پر قبضہ کرنے کے لیے مجھے لالچ دیئے۔ میرے انکار پر مجھے مروا دینے کی دھمکیاں بھی دیں لیکن میں عورت کے لیے پتھر بنا رہا۔ لاہور اور بٹھنڈہ میں غزنی کے جو جاسوس ہیں، وہ میری کمان میں ہیں۔ وہ میرا گروہ تھا جس نے ہندوؤں کی ہر پیشقدمی کی اطلاع سلطان محمود تک اتنی قبل از وقت پہنچائی ہے کہ سلطان نے حملہ روکنے کی پیش بندی بھی کر لی اور گھات بھی لگائی....

"میں وہ آنکھ ہوں جس سے سلطان محمود غزنی سے دیکھ سکتا ہے کہ لاہور میں کیا ہو رہا ہے۔ میرا گروہ وہ کان ہیں جن سے سلطان محمود اُن گھوڑوں کے ٹاپ بھی سن سکتا ہے جو اُس کی طرف لاہور سے چلتے ہیں۔ میرے گروہ نے یہاں فوج کی رسد اور سامان کا ذخیرہ بھی جلایا ہے۔ اب راجہ انندپال سلطان پر جوابی حملے کی تیاری کر رہا ہے۔ ہم اس کی رسد ایک بار پھر جلانے کی کوشش کریں گے تاکہ سلطان کو تیاری کا وقت مل جائے....

"زرفہ! میں نہیں بتا سکتا کہ میں کتنے دن اور تمہیں نظر آتا رہوں گا۔ تم نے اُس آدمی کے ساتھ شادی کی ہے جو جلاد کی تلوار کے نیچے کھڑا ہے۔ میں تمہارے والد کو یہ راز نہیں دے سکتا تھا کیونکہ وہ میرے لیے اجنبی تھے۔"

زرفہ نے اُسے اپنے سینے سے لگا لیا اور بولی "آپ نے میری روح کو مسرتوں سے سرشار کر دیا ہے۔ مجھے آپ نے روحانی سکون دیا ہے۔ میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ مجھے آپ جہاں بھی استعمال کریں گے، میں ہر شکل میں آپ کے ساتھ ہوں گی۔ آگ لگانے اور آگ میں کود جانے سے بھی نہیں ڈروں گی۔"

"میں مر جانا پسند کروں گا، تمہیں کسی مشکل میں نہیں ڈالوں گا" ارمغانی نے کہا "اگر

پکڑا گیا یا مارا گیا تو تمہیں بہت دن پہلے بتا دوں گا کہ تمہیں کہاں جانا ہے۔"

"مجھے اپنے ایک دو ساتھیوں کے ٹھکانے بتا دیں۔" زرذ نے کہا "تاکہ آپ زیادہ دنوں کے لیے غیر حاضر ہو جائیں تو میں اُن سے معلوم کر لیا کروں۔"

"ہم نے یہ راز اپنی ماؤں کو بھی کبھی نہیں دیئے۔" ارمغانی نے کہا "تمہیں اگر میری غیر حاضری میں یہاں سے غائب کرنے کی ضرورت پڑی تو میرے ساتھی خود آ کر تمہیں لے جائیں گے۔ اُن کے پاس میری کوئی ایسی نشانی ہوگی جسے دیکھ کر تمہیں اعتبار آ جائے گا کہ تمہارے ساتھ دھوکہ نہیں ہو رہا۔"

زرذ نے جب ایک بار پھر کہا کہ اُسے اپنے ایک یا دو ساتھیوں کے نام اور ٹھکانے بتا دے تو ارمغانی نے غصے سے کہا "زرذ! اپنی زبان سے یہ سوال دھو ڈالو۔ میں اس راز پر تمہاری محبت کو بھی قربان کر سکتا ہوں۔"

دو چار دن اور گذر گئے۔ زرذ ارمغانی کی بیوی بن کر خوشی سے پھولی نہیں سماتی تھی لیکن ارمغانی نے اُس پر اپنا آپ ظاہر کر دیا تو وہ مسرت سے سرشار رہنے لگی...

ایک رات وہ بہت دیر عشق و محبت کے راز و نیاز میں محو رہے۔ ارمغانی دن بھر نئے گھوڑوں کے ساتھ بھاگ بھاگ کر تھکن سے چور تھا۔ زرذ کے ساتھ وہ زیادہ دیر جاگتا رہا اور سو گیا۔ زرذ کی آنکھ نہ لگی۔

وہ تھوڑی دیر ارمغانی کو دیکھتی رہی۔ اُس کی نیند جب بے ہوشی کی صورت اختیار کر گئی تو وہ اٹھی اور بے پاؤں صحن میں نکل گئی۔ بہر ذرا سی دیر کھڑی رہی پھر ڈیوڑھی میں چلی گئی۔ صدر دروازے کے ساتھ کان لگائے اور صحن میں چلی گئی۔ ذرا ٹہل کر کمرے میں گئی۔ ارمغانی کو دیکھا وہ خراٹے لے رہا تھا۔ زرذ پھر صحن میں چلی گئی۔ وہ بے چین تھی۔ دبے پاؤں چلتی تھی۔

اُسے بلی کی دھیمی سی "میاؤں" سنائی دی۔ بلی باہر بولی تھی یا چھت پر۔ زرذ دبے پاؤں ڈیوڑھی میں گئی اور صدر دروازے کی زنجیر کھول دی۔ کواڑ ذرا سا کھول کر دیکھا۔ باہر تین آدمی کھڑے تھے۔ ایک نے سرگوشی میں پوچھا "سو رہا ہے؟"

زرذ نے فوراً جواب نہ دیا۔ ذرا سوچ کر بولی "ابھی جاگ رہا تھا۔ شاید اب تک سو گیا ہو۔ میں ڈیوڑھی میں تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ تم باہر ہی ٹھہرو۔ میں دیکھتی ہوں سو گیا ہوا تو آکر دروازہ کھول دوں گی۔"

وہ زنجیر چڑھا کر تیزی سے اُس کمرے میں گئی جہاں ارمغانی گہری نیند سویا ہوا تھا۔ زرذ نے اُسے جھنجھوڑ کر جگایا۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھا۔ کمرے میں دیا جل رہا تھا۔ ارمغانی نے گھبرا کر پوچھا کیا بات ہے۔

"زیادہ باتیں کرنے کا وقت نہیں ارمغانی!" زرذ نے بڑی تیزی سے بولتے ہوئے کہا "بھاگ جاؤ۔ یہاں زیادہ دیر نہ رُکنا۔ میں نے تمہیں دھوکہ دیا ہے۔ میرا باپ مجھے دھوکے کا زیور بنا کر لایا تھا۔ میرا باپ تاجر نہیں۔ راجہ انند پال کا جاسوس ہے۔ ہم پشاور سے نہیں بھٹنڈہ سے آئے ہیں۔ ہم ملتان ہیں تمہارے متعلق کسی نے شک ظاہر کیا تھا کہ تم غزنی والوں کے جاسوس ہو مگر کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ تم سے ایک تو یہ معلوم کرنا تھا کہ تم جاسوس ہو یا نہیں، اور اگر ہو تو تمہارے ساتھی کون کون ہیں...

"میرا باپ بھٹنڈہ سے یہاں آیا تو اسے یہ کام دیا گیا کہ تم سے راز لے۔ وہ پشاور کا تاجر بن کر آیا اور مجھے ساتھ لے آیا۔ اُس نے تمہارا پردہ اٹھانے کی بہت کوشش کی لیکن تم نے راز نہ دیا۔ میرے باپ نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ مجھے تمہاری بیوی بنا دیا۔ یہ میرے حسن اور میری جوانی کا اثر تو ضرور تھا لیکن میں نے جس طرح تم پر اپنا نشہ طاری کیا، یہ میرا کمال تھا۔ تم مرد ہو اور عورت مرد کی خطرناک کمزوری ہوتی ہے۔ میرا تو کام ہی یہی ہے۔ میں نے تمہارے سینے سے راز نکال لیا۔"

شعیب ارمغانی مسحور کئے ہوئے آدمی کی طرح سن رہا تھا۔ باہر ایک بار پھر بلی کی میاؤں میاؤں سنائی دی۔ زرذ اور تیزی سے بولنے لگی۔

"تم جب اپنے کام پر چلے جاتے تھے تو ایک عورت میرے پاس آتی تھی۔ میں اُسے بتلایا کرتی تھی کہ راز لیا ہے یا نہیں۔ آخر ایک دن میں نے اُسے بتایا کہ یہ آدمی بڑا خطرناک جاسوس ہے۔ مجھے کہا گیا کہ تمہارے ساتھیوں کے نام اور ٹھکانے معلوم کروں۔ ہم نے

سے مجھے یہ راز نہ دیا ۔ میں نے اپنے باپ کو اطلاع بھیجی کہ یہ راز لینا ناممکن ہے۔ مجھے اطلاع دی کہ آج میں جاگتی رہوں۔ باہر بلی کی میاؤں سنائی دے گی تو میں دروازہ کھول دوں۔ تین آدمی آئیں گے ان میں میرا باپ بھی ہوگا۔ وہ تمہیں پکڑ لیں گے۔ اور تمہیں تمہارے سینے سے راز نکالنے کے لیے مجھے استعمال کریں گے یا تمہیں اذیتیں دیں گے.... مجھ سے تفصیل سے نہ پوچھنا وہ آ گئے ہیں۔"

"پھر دروازہ کیوں نہیں کھولا؟" ارمغانی نے پوچھا اور اچھل کر اٹھا۔ اس نے کمر سے بندھی ہوئی برچھی اٹھالی اور بولا۔ "جا بدکارا اپنی عصمت سے کھیلنے والی اجار اور تینوں کو اندر بلا لے.... میں خود جا کر دروازہ کھولتا ہوں۔ دیکھیں گے تمہارا کس طرح تین آدمیوں میں سے نکل کر غائب ہوتا ہے۔"

زرفہ اٹھ کر اس سے لپٹ گئی ۔ "ارمغانی میری بات سن لو۔ خدا کے لیے باہر نہ جانا۔ میری بات سن لو۔"

تینوں آدمی باہر کھڑے بے تاب ہوئے جا رہے تھے۔ ایک نے کہا۔ "اب تک دروازہ کھل جانا چاہیے تھا۔"

"لڑکی دھوکہ نہ دے جائے۔" ایک اور نے کہا۔ "اس نے اندر سے زنجیر کیوں چڑھا دی ہے؟"

"تمہاری بیٹی اس کی غلام ہو گئی ہے۔" ایک نے زرفہ کے باپ سے کہا۔ "تم ہو تو بڑے عقلمند لیکن عقل والے بیوقوفوں سے دھوکہ کھایا کرتے ہیں۔"

"ذرا سا اور انتظار کر لو۔" زرفہ کے باپ نے کہا۔

اندر زرفہ شعیب ارمغانی سے کہہ رہی تھی۔ "میرا فرض یہی تھا کہ تمہیں پکڑوا دیتی۔ میں نے اپنے باپ کا حکم مانا اور اسے تمہاری ڈھکی چھپی اصلیت بتا دی ہے۔ مگر میں جو سراپا دھوکہ بن کر آئی تھی، تمہارے مردانہ حسن اور تمہارے اسلامی جذبے کی زنجیر دل میں جکڑی گئی۔ مجھے تمہاری بیوی جو بنایا گیا تھا، یہ فریب تھا لیکن میرے دل نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں ہمیشہ کے لیے تمہاری ہو جاؤں۔ میں کوئی شریف لڑکی نہیں لیکن مجھے جو ملا جسم

کا شیدائی ملا۔ تم نے مجھے روحانی محبت سے سرشار کیا۔ تم نے محبت کا یہ ثبوت دیا کہ اپنا طلسم توڑا اور مجھے اپنا سمجھ کر راز دے دیا۔ میرے اندر اسلام کا جذبہ بیدار ہو گیا....

میں نے اپنے باپ کا حکم اس لیے مانا کہ بچپن میں میری ماں مر گئی تھی۔ باپ نے مجھے ماں کی طرح پالا۔ اس نے مجھے شہزادی بنایا۔ میں جوان ہوئی تو اس کا ہر ناجائز حکم بھی مانا۔ اس نے میرے ذریعے ہندو حاکموں اور ان کے ذریعے راجہ کی خوشنودی حاصل کی۔ اس نے اپنا ایمان بیچ ڈالا اور خوب دولت کمائی۔ اس نے مسلمان ہو کر مسلمانوں کو ہندوؤں کے ہاتھوں ذلیل و رسوا کرایا۔ میں اسی کو زندگی سمجھتی رہی۔ مگر تم نے مجھ پر جس دنیا کے دروازے کھولے ہیں، اس سے میں ہمیشہ ناآشنا رہی۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ خاوند کی محبت عورت کی جنت ہے....

"میں نے باپ کا حکم پورا کر دیا ہے۔ میں نے دروازہ کھولنے تک دل میں یہی ارادہ رکھا ہوا تھا کہ تمہیں پکڑوا دوں گی۔ لیکن دروازہ کھولا اور ان تین آدمیوں کو دیکھا تو مجھ پر ایسا خوف طاری ہو گیا جیسے یہ تینوں میرا سینہ چیر کر میرا دل نکال لے جانے کے لیے آئے ہوں۔ مجھے اپنے باپ سے کہیں زیادہ تم عزیز لگے۔ ان کے لیے میں تسم ہوں۔ میری روح کو تم نے جگایا ہے۔ میں نے جھوٹ بولا اور انہیں کہا کہ تم جاگ رہے ہو، ذرا انتظار کرو۔ وہ انتظار کر رہے ہیں۔ اوپر چلے جاؤ ارمغانی! پیچھے سے کود جاؤ۔"

"اور تم؟"

"شاید کبھی ملیں۔" زرفہ نے کہا۔ "زندہ رہے تو ملیں گے۔"

باہر تین آدمی پریشان ہونے لگے تھے۔ ایک نے کہا کہ میں پچھواڑے چلا جاتا ہوں۔ مجھے گڑبڑ نظر آ رہی ہے ۔ وہ ادھر کو چل پڑا۔

یہ آدمی جب پچھواڑے گیا تو ارمغانی منڈیر سے اتر چکا تھا اور دیوار کے ساتھ پاؤں جما رہا تھا۔ بلندی زیادہ نہیں تھی۔ اس آدمی نے ارمغانی کو للکارا۔ ارمغانی اوپر سے کودا اور دوسری طرف دوڑ پڑا۔ اسے دیکھنے والے نے شور مچایا لیکن ارمغانی گلی میں مڑ گیا۔ وہ گلیوں میں دوڑا جا رہا تھا اور اس کے تعاقب میں تین آدمی تھے۔ اسے رات کا اندھیرا فائدہ دے رہا تھا۔

وہ کھلے علاقے میں چلا گیا جہاں مکان ایک دوسرے سے الگ الگ تھے۔ ایک حویلی کے ارد گرد فصیل تھی اور فصیل کے ساتھ جھاڑیاں اور اونچی گھاس تھی۔ وہ فصیل کے ساتھ چھپ کر بیٹھ گیا۔ اُس کے تعاقب میں آنے والے وہاں رُک گئے اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ ارمغانی بیٹھے بیٹھے سرکتا گیا اور فصیل کے پھاٹک تک جا پہنچا۔ وہ پھاٹک کے اندر جا کر فصیل کے دوسری طرف چلا گیا۔ وہ اُٹھا نہیں۔ یہ حویلی کا باغیچہ تھا۔

اُسے تلاش کرنے والے پھاٹک تک آئے۔ کسی نے کہا کہ یہاں نہیں ہو سکتا۔ وہ نکل گیا ہے۔ وہ چلے گئے۔ کچھ دیر بعد ارمغانی اُٹھا۔ اُس نے دیکھا کہ حویلی کے ایک کمرے میں روشنی ہے۔ اُسے وہاں رُکنا نہیں چاہیے تھا لیکن خطرہ تھا کہ اُسے تلاش کرنے والے ابھی دور نہیں گئے ہوں گے۔ وہ بیٹھ گیا۔

اس حویلی سے وہ واقف تھا لیکن یہاں کبھی آیا نہیں تھا۔ یہ راجہ انند پال کی ایک رقاصہ اور مغنیہ کی حویلی تھی۔ مسلمان تھی لیکن سمرتی کہلاتی تھی۔ اپنے فن اور جسمانی حُسن میں یکتا تھی۔ اپنی قدر و قیمت جانتی تھی۔ اُس نے راجہ انند پال سے اپنی یہ شرط منوالی تھی کہ وہ محل میں نہیں رہے گی۔ چنانچہ وہ اس حویلی میں رہتی تھی جس کے آگے چھوٹا سا خوشنما باغیچہ تھا۔ سمرتی ہر رات اور ہر کسی کے لیے ناچنے والی رقاصہ نہیں تھی۔ اُسے اُس وقت راجہ بلایا کرتا تھا جب کوئی مخصوص مہمان آیا ہوتا تھا۔ وہ اُڑنے والی تتلی تھی۔ کسی کے ہاتھ نہیں آتی تھی۔

اُس رات جب ارمغانی اُس کے باغیچے میں چھپا بیٹھا تھا، وہ ذرا دیر پہلے راج محل سے آئی تھی۔ کسی دوسری ریاست کا راجہ آیا ہوا تھا۔ وہ آئینے کے سامنے بیٹھی کپڑے بدل رہی تھی۔ اُس کی جوانی کے چند دن ہی باقی تھے۔ اُس نے اپنی بوڑھی خادمہ سے کہا۔ ”آج تو تھک گئی ہوں۔“

”رقاصہ جب تھکن محسوس کرے، اُسے شادی کر لینی چاہیے۔“ خادمہ نے اُسے کہا۔ ”لیکن ناچنے گانے والیاں سمجھتی ہیں کہ وہ سدا حسین اور جوان رہیں گی اور اُن پر بھنورے منڈلاتے رہیں گے۔“

”میں تو ابھی جوان ہوں۔“ سمرتی نے مسکرا کر کہا۔

”میں بھی یہی کہا کرتی تھی۔“ خادمہ نے کہا۔ ”تم میرے متعلق جانتی ہو گی کہ میں بھی رقاصہ تھی۔ تم نے جو شہرہ پایا ہے، وہ میں نے بھی پایا تھا۔ تم جس طرح کسی انسان کو پلے نہیں باندھتی اس طرح میں بھی بڑے بڑے سرداروں کو دھتکار دیا کرتی تھی۔ مجھے میرے پیشے کی بوڑھی عورتیں کہا کرتی تھیں کہ کسی کے ساتھ اب شادی کر لو۔ اور یہ پیشہ چھوڑ دو۔ میں بھی تمہاری طرح کہا کرتی تھی کہ میں تو ابھی جوان ہوں ... دیکھ لو۔ آج تمہاری خادمہ ہوں۔ بہت خوار ہوئی ہوں۔ میں نے شادی کی اُس وقت سوچی تھی جب میرا جسم ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ میری دہلیز پر ماتھے رگڑنے والوں نے مجھے دھتکار دیا۔ کسی بوڑھے نے بھی مجھے قبول نہ کیا۔“

سمرتی نے پہلی بار محسوس کیا کہ جوانی ڈھلنے والی ہے۔ اُس کی خادمہ نے اُسے ایسا ہولناک خاکہ دکھایا کہ اُس پر سنجیدگی طاری ہو گئی۔

باہر کتے کے بھونکنے کی آواز آئی، پھر ایسی آوازیں آئیں جیسے کتے نے کسی کو پکڑ لیا ہو اور اُسے جھنجھوڑ رہا ہو۔ یہ سمرتی نے حویلی کی رکھوالی کے لیے کتا رکھا ہوا تھا۔ رات کو اسے کھول دیا کرتی تھی۔ اُس کی ایسی خوفناک آواز پر سمرتی اور خادمہ باہر کو دوڑی گئیں۔ اُس کا خونخوار کتا کسی آدمی پر جھپٹ رہا تھا۔ سمرتی نے دوڑ کر کتے کو پکڑا۔ کتے نے غصے میں اُس کے ہاتھ پر بھی پنجہ مار دیا۔

”کون ہو تم؟“ — اُس نے اس آدمی سے پوچھا جسے کتے نے پکڑ لیا تھا۔ وہ بیٹھ گیا تھا۔

”کوئی چور ڈاکو ہو؟“

”اگر چور ڈاکو ہوتا تو یہاں نہ کھڑا رہتا“ — اُس آدمی نے کہا۔ ”میرا نام شعیب ارمغانی ہے۔“

”گھوڑوں کا استاد؟“

”ہاں سمرتی جی!“ — ارمغانی نے کہا۔

”یہاں کیا لینے آئے تھے؟“ — سمرتی نے کہا۔ ”اندر چلو۔ اگر تم بھاگے تو جانتے ہو

کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟"

ارمغانی جب اندر روشنی میں گیا تو اُس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ اُس کے دونوں بازوؤں اور ایک ٹانگ سے خون بہہ رہا تھا۔ کتے نے اُس کی کھال ادھیڑ دی اور ٹانگ پر کاٹا بھی تھا۔

"میں نہیں مان سکتی کہ تم یہاں چوری کرنے آئے تھے"۔ سمرتی نے کہا ۔"تم ان لوگوں میں سے ہو جو میرے جسم کے شیدائی ہیں۔ تمہیں میری خوبصورتی اور جوانی یہاں لائی ہے۔ تم سمجھتے ہوگے کہ میں یہاں اکیلی رہتی ہوں۔ میرا کتا شیر اور چیتے کو بھی اس باغیچے میں نہیں ٹھہرنے دیتا"۔ سمرتی نے خادمہ سے کہا۔"اس کے زخم دھونے کے لیے پانی گرم کرو۔ صاف کپڑا اور شراب لے آؤ۔ اس کے زخموں پر باندھوں۔ شراب اور جلا ہوا سوت زخم کو بہت جلدی ٹھیک کر دیتا ہے"۔

خادمہ چلی گئی تو ارمغانی نے سمرتی سے کہا۔"تمہارے کتے نے مجھے تمہارے باغیچے میں پکڑا ہے نا، اس لیے تم مجھے چور کہہ سکتی ہو۔ مجھے بدکار بھی کہہ سکتی ہو جو تمہیں اکیلا جان کر آدھی رات کو آیا ہے ... غور سے سنو سمرتی! تمہیں اپنے جس حُسن اور جوانی پر اتنا زیادہ ناز ہے اسے اگر میری آنکھوں سے دیکھو تو اپنے آپ سے نفرت کرنے لگو"۔

"کیا تم مجھ سے نفرت کرنے چوروں کی طرح یہاں آئے ہو؟"

"جسے میں چاہتا ہوں اور جو مجھے چاہتی ہے، اگر اُسے دیکھ لو تو تم آئینے میں اپنی صورت دیکھنی چھوڑ دو"۔ ارمغانی نے کہا۔"دل سے یہ وہم کہ میں تمہاری خاطر آیا ہوں، اور غرور کہ تم بہت حسین ہو نکال دو۔ تم راجہ اننداپال کی راجکماریوں سے زیادہ خوبصورت نہیں ہو۔ میں انہیں دھتکار چکا ہوں"۔

"پھر یہاں کیوں آئے تھے؟"

سمرتی کے ایک ہاتھ کی اُلٹی طرف کتے نے پنجہ مار دیا تھا۔ وہاں سے خون کے دو تین قطرے فرش پر گرے۔ ارمغانی اُس کے سامنے کھڑا تھا، اُس کے خون کے قطرے پہلے ہی گر رہے تھے۔ ارمغانی نے نیچے دیکھا۔ سمرتی کا خون اُس کے خون کے ساتھ مل گیا تھا۔

"اپنے خون کو دیکھو"۔ ارمغانی نے سمرتی سے کہا۔"میرے خون کے ساتھ مل کر اس کا رنگ چمک آیا ہے۔ جانتی ہو کیوں؟ ... دونوں خون ایک ہیں۔ تم نے اپنے خون کو تکبر، غرور اور گناہ سے بدرنگ کر رکھا ہے۔ یہ اپنے خون سے ملا تو اپنے اصلی رنگ میں آگیا ہے۔ ... حیران ہو کے مجھے نہ دیکھو رقاصہ! اب میں تمہیں سمرتی نہیں کہوں گا۔ تمہارا اصل نام مجھے معلوم نہیں ... میں ہندوانہ نام سے ایک مسلمان لڑکی کی توہین نہیں کروں گا۔ میں کہہ رہا تھا کہ میرا اور تمہارا خون ایک ہے اور یہ اُن بابوں کا خون ہے جو ایک تھے اور ہو سکتا ہے کہ میرا اور تمہارا خون ایک ہی باپ کا ہو"۔

"تم کوئی پاگل معلوم ہوتے ہو"۔

"تم جانتی ہو میں کون ہوں؟"۔ ارمغانی نے کہا۔"میں تمہیں تمہارے خون کی اصلیت دکھا رہا ہوں۔ رقص اور موسیقی تمہارا مذہب نہیں۔ حسن اور جوانی اور تمہاری آواز کا جادو تمہاری ملکیت نہیں۔ کل پرسوں تم ان سب سے محروم ہو جاؤ گی۔ آج تم مجھے کہہ رہی ہو کہ میں چوروں کی طرح تمہارے گھر میں آیا ہوں۔ پھر تم دعا کیا کرو گی کہ مجھ جیسا کوئی جوان چوروں کی طرح تمہارے گھر میں آئے، مگر کوئی نہیں آئے گا۔ تم راتوں کو اس کتے کو باندھ کے رکھا کرو گی کہ کوئی تمہارے گھر آئے۔ تم دیکھنا کہ اس کتے کے سوا اس گھر میں کوئی نہیں آئے گا ... ایک نیکی کرو۔ مجھے پناہ دو"۔

"کیوں؟"۔ سمرتی نے پوچھا۔"کیا کر کے بھاگے ہو؟"

"تمہیں ایک لڑکی کے ایثار کی کہانی سناؤں گا"۔ ارمغانی نے کہا۔"وہ تم سے زیادہ جوان ہے، تم سے زیادہ حسین ہے، اُس کے حسن میں وہ جادو ہے جو بن برسے جو تم گنوا چکی ہو۔ وہ تم سے زیادہ گناہگار ہے لیکن اُس نے اپنا گھر جنت میں بنا لیا ہے ... مجھے پناہ دو۔ اپنی نوکرانی کو یہاں نہ آنے دینا۔ اپنے زخم میں خود صاف کر لوں گا۔ اسے کہو کہ کسی کو نہ بتائے کہ میں یہاں ہوں"۔

سمرتی کو خادمہ پہلے ہی کچھ ایسی باتیں کہہ چکی تھی جن سے اُس کے دل پر بوجھ تھا۔ اب ایک جوان اور دلکش مرد جو اُس کا قیدی اور زخمی تھا، اُسے کہہ رہا تھا کہ اُس کے

حسن و جوانی کا جادو ختم ہو چکا ہے۔ اُس کے دل کا بوجھ بڑھ گیا تھا۔ اُس نے خادم کو یہ کہہ کر کمرے سے نکال دیا تھا کہ کسی سے ذکر نہ کرے کہ یہاں کوئی آیا تھا۔ سمری نے شعیب ارسغانی کے زخم اپنے ہاتھوں شراب سے دھوئے۔ ان پر سفوف اور کورے سُوت کی راکھ باندھی۔ ٹانگ کے زخم گہرے تھے۔

ارسغانی نے سمری کے ہاتھ کا زخم صاف کیا۔ اور اس پر سفوف رکھ کر پٹی باندھی۔

اس دوران ارسغانی اسے زرفہ کی بات پوری تفصیل سے سُناتا رہا۔ اُس نے کچھ بھی نہ چھپایا۔ جھوٹ نہ بولا۔ یہ بھی بتا دیا کہ وہ سلطان محمود کے لیے جاسوسی کرتا ہے۔ اسلام کی عظمت اور ہندوؤں کی اسلام دشمنی کی باتیں کیں۔ اُس نے کہا کہ زرفہ کو باپ نے عیش اور گناہ میں ڈال کر اُسے شہزادی بنایا تھا۔ اُس کی فریب کاری کامیاب تھی لیکن روحانی محبت نے اس لڑکی کے سینے میں مسلمان لڑکی کو جگا دیا تو اُس نے ایسا کام کیا کہ خدا کا دل جیت لیا۔

"ٹھہرو"۔ سمری نے عجیب سے لہجے میں کہا "آج رات کالنجر کا راجہ آیا ہوا ہے۔ مجھے اسی کے لیے بلایا گیا تھا۔ راجہ انند پال نے اُسے میرے متعلق بتایا تھا کہ یہ مسلمان ہے اور میری بڑی ہی عزیز اور قیمتی رقاصہ۔ کالنجر کے راجہ نے کہا تھا کہ میں مسلمانوں کی جو خوبصورت لڑکی دیکھتا ہوں، اُسے اغوا کرا کے رقاصہ یا فاحشہ بنا دیتا ہوں مسلمانوں کی نسل ختم کرنے کا یا اِن میں بدی پیدا کرنے کا یہی طریقہ ہے، اور اگر آپ بھی یہی طریقہ اختیار کریں تو آپ دیکھیں گے کہ ہمارے ملک میں جو مسلمان رہ جائیں گے، اُن کا پیشہ ناچ گانا اور عصمت فروشی ہو گا۔"

سمری نے ارسغانی کو راجہ کالنجر کی یہ بات سنائی تو اُس کی آنکھیں ٹھہر گئیں۔ ارسغانی نے اُس کے اندر احساس بیدار کر دیا تھا۔ اُسے یاد آ گیا تھا کہ وہ مسلمان ہے۔ ارسغانی نے اُس کی یہ بات سُنی تو اُس نے ایسی باتیں کیں جنہوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔

"میں مسلمان بیٹیوں کی عصمت پر قربان ہو رہا ہوں"۔ ارسغانی نے کہا "غزنی سے اتنی دُور آ کر شہید ہونے والے تم جیسی بیٹیوں اور بہنوں کی عصمت کی خاطر شہید ہوئے ہیں۔ تم کھلونا ہو اور یہ کھلونا پرانا ہو رہا ہے۔ زرفہ بن جاؤ۔ اپنی رُوح کو پہچانو۔"

رقاصہ ایسی صورتِ حال سے کبھی دوچار نہیں ہوئی تھی۔ اُسے ایسی کڑوی

کھلی باتیں کسی نے کبھی نہیں کہی تھیں۔ اُسے اُس کے حسن و جوانی اور رقص کی تعریفیں کرنے والے ملا کرتے تھے۔ اب اُس کے اندر ایک انکشاف اُبھرنے لگا "تم بھی فریب ہو اور تمہارے چاہنے والے بھی فریب ہیں"۔

"زرفہ کو شاید میں نے دیکھا ہے" سمری نے کہا "اگر وہی ہے تو بہت خوبصورت لڑکی ہے..... تم اُسے چاہتے ہو؟"

"میری رُوح اُسے چاہتی ہے"۔ ارسغانی نے کہا "تم نے اس محبت کا ذائقہ نہیں چکھا"۔

"اگر میں تمہیں پناہ دوں تو..... تو مجھے اس محبت کے ذائقے سے سرشار کر سکتے ہو؟" سمری نے کہا "میرے اندر معلوم نہیں کیا ہونے لگا ہے جیسے زمین زلزلے سے ہل رہی ہو"۔

"مجھے بھائی بنا سکتی ہو؟"۔ ارسغانی نے کہا "رُوح کو سرشار کرنا ہے تو دل میں بہن کا رشتہ بیدار کر دو"۔

"تم میری پناہ میں رہو گے ارسغانی! لیکن"..... وہ کہتے کہتے رُک گئی۔ اچانک اُس نے ارسغانی کے گال اپنے ہاتھوں کے پیالے میں تھام لیے اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"... ذرا سے لرزتی ہوئی آواز میں بولی "میرے سامنے زرفہ کا نام نہ لینا..... ہاں تم ٹھیک کہتے ہو کہ وہ تمہاری بہن نہیں لیکن تم اُس کی خاطر سب کچھ دھوکہ دو گے"۔ اُس نے ارسغانی کے گال چھوڑ دیئے اور ان ہاتھوں سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔

"تم تو راجوں مہاراجوں اور بادشاہوں کے دلوں پر حکومت کرتی ہو، مجھ سے یہ ڈر کیوں؟"

"میں نہیں بتا سکتی"۔ سمری نے کہا "میں نہیں جانتی کیا جواب دوں..... تم میری پناہ میں ہو۔ میری ملکیت ہو..... ہم..... ہم اب..... میں نہیں سمجھ سکتی کہ کیا کہوں..... ہم ایک ہیں"۔ اُس نے فرش پر دیکھ کر کہا "ہمارا خون ایک ہے۔ تم نے میری آنکھوں میں وہ روشنی پیدا کر دی ہے جو اپنے خون کو پہچان لیتی ہے..... سو جاؤ..... ارسغانی! سو جاؤ۔ زخم ٹھیک ہونے تک تمہیں کمرے کوئی نہیں آنے گا"۔

شعیب ارمغانی کو تلاش کرنے والے مایوس ہو کر اُس کے گھر چلے گئے۔ دروازے پر دستک دی تو زرقہ نے دروازہ کھولا۔ اُس کے باپ نے اس سے پوچھا کہ وہ نکل کس طرح گیا ہے۔

"وہ جاگ رہا تھا" زرقہ نے کہا۔ "تم لوگ بار بار بلی کی آواز نکالتے تھے۔ میں تمہیں خاموش کرانے کو آئی تو اُس نے دیکھ لیا۔ وہ بہت چالاک اور عقلمند آدمی ہے۔ اُس نے مجھ سے کچھ بھی نہ کہا۔ دوڑ کر چھت پر چلا گیا۔ پھر مجھے تم میں سے کسی کا شور سنائی دیا۔ یہ سب تمہاری غلطی ہے۔ مجھے اتنے دن اُس کی بیوی بنائے رکھا اور حاصل کچھ بھی نہ ہوا۔"

پھر شہر میں اور گرد و نواح میں اُس کی تلاش شروع ہو گئی۔

چار پانچ دن گزر گئے۔ ہر مسلمان گھر کی تلاشی اس طرح لی گئی کہ جانوروں کی کھرلیوں میں سے چارہ بھی اُٹھا کر دیکھا گیا۔ ارمغانی کی انہیں مُشک بھی نہ ملی۔

نگرکوٹ کے پنڈت رادھاکشن کو اطلاع ملی کہ راجہ انندپال لاہور واپس آ گیا ہے تو اُس نے راجہ کو نگرکوٹ بلا بھیجا۔ قاصد کے آتے ہی انندپال نے تیاری اور فوری روانگی کا حکم دے دیا۔ دوسرے راجوں کی طرح وہ بھی نگرکوٹ کے مندر کا احترام کرتا اور وہاں کے ہر حکم کی تعمیل کرتا تھا لیکن اب اُس کی ضرورت مختلف تھی۔ وہ پنڈت کے حکم سے دوسرے راجوں سے بہت سی فوجی مدد لینا چاہتا تھا تا کہ سلطان محمود کو فیصلہ کن شکست دی جا سکے۔

وہ مہاراجوں والی شان و شوکت سے نگرکوٹ گیا۔ اُس کے ساتھ ایک قافلہ تھا جس میں اُس کا محافظ دستہ تھا۔ دس بارہ پالکیاں تھیں جن میں سے ایک میں اُس کی عزیز ترین رقاصہ سمرلی تھی اور باقی پالکیوں میں اُس کی اپنی اور سمرلی کی خادمائیں تھیں۔ سمرلی اپنی بوڑھی خادمہ کو اپنے گھر چھوڑ آئی تھی اور سختی سے کہہ آئی تھی کہ ارمغانی کو ایک راز کی طرح چھپائے رکھے۔ اُس کے ساتھ جو خادمائیں تھیں، وہ جوان لڑکیاں تھیں۔ قافلے میں دیگر ضروری سامان کے چھکڑوں کے علاوہ سازندے بھی تھے۔ راجہ نے نگرکوٹ میں مندر والی پہاڑی کے دامن میں ایک سرسبز اور خوشنما جگہ کیمپ لگایا۔ وہ چار پانچ دنوں کے سفر کے بعد وہاں پہنچا تھا۔ اس لیے تھکن نے اُسے اُسی وقت اوپر مندر میں نہ جانے دیا۔

پنڈت رادھاکشن کو اطلاع ملی تو اُس نے نیچے پیغام بھیجا کہ وہ راجہ کے استقبال کے لیے شام کے بعد نیچے آئے گا۔

وہ شام کے بعد نیچے آیا تو راجہ انندپال نے آگے بڑھ کر اُس کے پاؤں چھوئے اور ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگائے۔ پنڈت کو شک ہونے لگا جیسے یہ جنگل نہیں کسی مہاراجہ کا محل ہے۔ اوپر شامیانے اور اردگرد خوشنما کپڑے کی قناتیں تھیں۔ فانوس اور مشعلیں جل رہی تھیں۔ قالین بچھے ہوئے اور گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ پنڈت بیٹھا ہی تھا کہ پہلے چار لڑکیوں نے رقص شروع کیا۔

رقص کے دوران پنڈت نے راجہ سے کہا "آپ شاید وہ راجہ انندپال نہیں ہیں، جن کے باپ نے اور آپ نے بھی مسلمانوں سے پے بہ پے شکستیں کھائی ہیں۔ آپ کے باپ نے خودکشی کر لی تھی اور آپ شاید بھاگ گئے تھے! .... اگر آپ وہی ہیں تو آپ کی شکست کی وجہ یہ ہے جو آپ مجھے خوش کرنے کے لیے دکھا رہے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ ہمارے مہاراجے میدان جنگ میں بھی اسی شان و شوکت سے جایا کرتے ہیں۔"

"مہاراج!" راجہ انندپال نے کہا "مرنے سے پہلے ہم دل بہلاوے کا بندوبست ساتھ رکھتے ہیں۔"

"مگر آپ مرے نہیں" پنڈت نے کہا "اتنی بار شکست کھا کر بھی آپ زندہ ہیں، اور آپ صرف اس لیے زندہ ہیں کہ اپنی بہشت خود بنا کر اسی میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ میں نے آپ کو اسی لیے بلایا ہے کہ آپ کو بتاؤں کہ آپ کی شکست کی وجہ کیا ہے۔ جسم کی لذت اور سرور حاصل کرنے والوں کا انجام یہی ہوا کرتا ہے۔"

اتنے میں لڑکیاں رقص کرتی ہوئی یوں ایک طرف کو غائب ہو گئیں جیسے ہوا میں تیرتی ہوا میں تحلیل ہو گئی ہوں۔ سازندوں کی دھن بدل گئی۔ نئی دھن کا تاثر ایسا تھا کہ پنڈت بھی چونک اُٹھا۔ ایک طرف سے سمرلی یوں آئی جیسے جل پری پانی میں تیرتی آ رہی ہو۔ وہ پنڈت کے قریب آ گئی۔ اُس کے ہونٹوں پر مخمور سا تبسم تھا۔ اُس نے جسم کو ناگن کی طرح بل دے کر پنڈت کو جھک کر سلام کیا۔ فانوسوں کی روشنی میں سمرلی کا حسن سحر انگیز ہو گیا تھا۔ راجہ انندپال نے پنڈت رادھاکشن کے چہرے پر ایسا تاثر دیکھا جیسے پنڈت مسحور ہوا جا

رہا ہو۔

سمرتی کا جسم ہوا میں جھولتی، پھولوں سے لدی ہوئی ڈالی کی طرح سازندوں کی تھرکتی ہوئی پرسوز لَے پر جھومنے لگا تو پنڈت نے راجہ انندپال سے پوچھا "ہندو یا مسلمان؟"

"مسلمان!"— راجہ انندپال نے جواب دیا۔ "اس پیشے میں ہم صرف مسلمان لڑکیوں کو ڈالتے ہیں۔"

"اگر اس رقاصہ کو ہم اپنے مندر کی زینت بنالیں تو آپ اسے ہمارے حوالے کر دیں گے؟"

"اس کی بجائے مہاراج مجھ سے ایک سو لڑکیاں لے لیں"۔ راجہ انندپال نے کہا۔

"یہ رقاصہ مجھے اپنی جان سے زیادہ پیاری ہے"

"میں یہی سننا چاہتا تھا"— پنڈت نے کہا— "میں اسے اپنے لیے نہیں لے جارہا۔ میں مندر میں کسی داسی کو بھی نہیں رکھتا۔ رنگی (رقاصہ) کو کیوں رکھوں گا؟ .... اسے کرشن بھگوان کے چرنوں (قدموں) میں قربان کرنا ہے"

"قربان کرنا ہے!"— راجہ نے بدک کر پوچھا۔

"ہاں راجہ انندپال!"— پنڈت نے کہا— "یہ خواہش میری نہیں، یہ دیوتاؤں کا انتخاب ہے۔ یہ رقاصہ انہوں نے مانگی ہے"

"ہم لاہور میں دو لڑکیوں کی جان کی قربانی دے چکے ہیں"

"اور آپ نے دونوں بار شکست کھائی"— پنڈت نے کہا— "کیونکہ آپ کے پنڈتوں نے ان لڑکیوں کو ناپاک کر کے ذبح کیا تھا.... مجھے خواب میں کرشن مراری کا اشارہ ملا تھا کہ قربانی اس لڑکی کی ہو جو رقص میں بے مثال ہو، حسن میں بے مثال ہو، بوڑھی نہ ہو، نوجوان بھی نہ ہو، اور وہ جس کے پاس ہو اسے اتنی عزیز ہو کہ کسی قیمت پر کسی کو دینے پر رضامند نہ ہو سکے.... میں بہت عرصے سے ایسی رقاصہ کو ڈھونڈ رہا تھا۔ مجھے مل گئی ہے۔ میں ہندو دھرم کی فتح چاہتا ہوں۔ میں تمہیں دیوتاؤں کے قہر سے بچانے کی فکر میں ہوں"

راجہ انندپال نگرکوٹ کے پنڈت کی حکم عدولی نہیں کرسکتا تھا۔ پنڈت نے اس کے ساتھ سلطان محمود پر حملے کی اور ہندوستان سے مسلمانوں کو نکالنے کی وہی باتیں کیں جو وہ بہت دن پہلے دوسرے ہندو راجوں سے کر چکا تھا۔ اسے بھی پنڈت نے وہی مشورہ دیا کہ مسلمانوں

کو پشاور سے آگے جہاں راجہ جےپال نے شکست کھائی تھی، للکارو اور اُسے شکست دے کر لمغان کے سلسلۂ کوہ میں گھس جاؤ۔ آگے غزنی ہے۔ غزنی کی سلطنت کو ہمارے نوجوانوں سے بچانے والا کوئی نہ ہوگا۔

"بھیرہ اور ملتان کا کیا بنے گا؟"— راجہ انندپال نے پوچھا۔

"دونوں شہروں کی مسلمان فوج ہماری قیدی ہوگی"— پنڈت نے کہا— "آپ چلے جائیں۔ راگ رنگ کو بھول کر جنگی تیاری کریں۔ تمام ریاستوں کی فوجیں آپ کے پاس پہنچ رہی ہیں"

اگلے روز راجہ انندپال لاہور گیا اور مندر میں پوجا پاٹ کرکے واپس آگیا۔ سمرتی کو پنڈت رات کو ہی لے گیا تھا۔ راجہ انندپال اسے دیکھ بھی نہ سکا۔

پنڈت رادھاکشن سمرتی کو پہاڑی پر مندر میں لے گیا۔ وہ خاموشی سے اس کے پیچھے چلی جارہی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اسے ذبح کرکے اس کے خون سے کرشن مراری کے بت کے پاؤں دھوئے جائیں گے۔ اسے جب پنڈت مندر کے ایک کمرے میں لے گیا جہاں فرش پر قالین اور قالین پر بستر بچھا ہوا تھا تو سمرتی نے پنڈت سے پوچھا کہ اسے یہاں کیوں لایا گیا ہے۔

"کیا تمہیں ہمارے ساتھ آنا اچھا نہیں لگا؟"— پنڈت نے پوچھا اور کہا— "بیٹھو تو سہی"— پنڈت مسکرانے لگا۔

سمرتی نے بیٹھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور آہستہ سے کھینچا۔ پنڈت اس کے پاس بیٹھ گیا۔ سمرتی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اس کے ہونٹوں پر تبسم آگیا۔ پنڈت کے جسم نے جھرجھری لی۔ سمرتی نے کہا— "مہاراج نے میرے رقص کی قدر نہیں کی.... ابھی آپ نے میرا رقص دیکھا ہے، آواز نہیں سنی، مگر آپ کو میرا جسم اچھا لگا ہے"

"اوہ!"— پنڈت نے سنجیدہ سے لہجے میں کہا— "تم تو کچھ اور ہی سمجھ بیٹھی ہو۔ مجھے تمہارا جسم ضرور اچھا لگا ہے مگر تم غلط سمجھ رہی ہو۔ ہماری زندگی عورت سے ہمیشہ خالی رہی

ہے اور خالی ہی رہے گی۔"

"کیوں؟"

"ہم تو عورت کو قریب سے دیکھنا بھی گناہ سمجھتے ہیں"۔ پنڈت نے کہا۔

"پھر آج یہ گناہ کیسے کر بیٹھے؟"

"ابھی جواب نہیں دے سکتا"۔ پنڈت نے کہا۔ "دل سے وہ وہم نکال دو جو تم نے میرے ساتھ اس کمرے میں آکر پیدا کر لیا ہے۔ ہمیں تمہارے جسم کے ساتھ ذرا سی بھی دلچسپی نہیں۔ ہم سے ابھی کچھ نہ پوچھو۔ ہم تمہیں دیوی کا درجہ دیں گے۔ تمہیں گنگا جل میں نہلائیں گے۔ تمہارے سارے پاپ جھڑ جائیں گے۔"

سمرتی کی ہنسی نکل گئی۔ وہ کچھ دیر ہنستی ہی رہی اور پنڈت اُسے دیکھتا رہا۔ وہ کنول کی طرح ہنستے ہنستے اس طرح لڑھک گئی کہ اُس کا سر پنڈت کی گود میں جا گرا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے اور بہت ملائم تھے۔ بالوں میں ایسا عطر لگایا گیا تھا جو مہاراجوں کے لیے تیار کیا جاتا تھا اور مہارانیاں یہ اپنی خاص قسم کی عورتوں کو لگایا کرتے تھے۔ اس کی بُو میں مدہوشی کا اثر تھا۔ اس اثر کے ساتھ سمرتی کے ریشمی بالوں اور عریاں کندھوں کے لمس کا اثر شامل ہوا تو پنڈت کا جسم بڑی زور سے کانپا۔ اُس نے عورت کو اتنی قریب سے کبھی دیکھا بھی نہیں تھا مگر قدرت کا ایک شاہکار اس کی گود میں آن گرا تھا۔

"اُٹھو نرتکی!"۔ پنڈت نے اسے ہاتھ لگائے بغیر کہا۔ "اُٹھو اور بتاؤ کہ تم کیوں ہنس رہی ہو"۔

سمرتی کوئی شریف عورت نہیں تھی جسموں سے کھیلنا جانتی تھی۔ وہ اُٹھنے کی بجائے پیٹھ کے بل ہو گئی اور سر پنڈت کی گود میں رہنے دیا۔ اس نے اوپر دیکھا اور کنول کی شوخی سے بولی۔ "آپ مجھے گنگا جل میں نہلا کر میرے پاپ دھو ڈالیں گے؟ ... نہیں ... آپ نے غلط کہا ہے۔ کہنا یوں چاہیئے کہ میں گنگا میں اتروں گی تو گنگا کے پاپ دھل جائیں گے"۔

پنڈت نے اُسے اٹھانے کی کوشش نہ کی۔ سمرتی ناگن کی طرح بل کھا کر اٹھی اور پنڈت کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولی۔ "میں سمجھ گئی ہوں آپ مجھے یہاں کیوں لائے ہیں ... مجھے پاک کرنے"۔ وہ اچانک سنجیدہ ہو گئی اور بولی۔ "میرے

پاپ اُس روز دھلیں گے جس روز ان تمام پاپیوں کو آپ گنگا میں ڈبو دیں گے جنہوں نے میرے جسم کو کھلونا بنایا ہے۔ کیا آپ کا بھگوان ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا؟ ... اور پنڈت جی مہاراج! میرا کوئی مذہب نہیں۔ میرا کوئی مذہب رہنے نہیں دیا گیا۔ مجھے تھوڑے دن ہوئے پتہ چلا ہے کہ میرے اندر جو روح ہے وہ پاک ہے اور یہ روح اُس انسان کے انتظار میں میرے جسم کے پنجرے میں تڑپ رہی ہے جو اسے سچا پیار دے گا"۔

"تم یہ بھی جانتی ہو گی کہ وہ کون ہے؟"

"وہ آپ بھی ہو سکتے ہیں"۔ سمرتی نے کہا۔ "وہ کوئی آپ سے زیادہ بوڑھا بھی ہو سکتا ہے۔ وہ کوئی مجھ سے زیادہ جوان بھی ہو سکتا ہے۔ وہ کوئی رشی منی اور کوئی مولوی بھی ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ کسی کٹیا میں رہتا ہو۔ وہ کسی محل کا باسی بھی ہو سکتا ہے ... کیا آپ کے پاس گنگا جل میں دُھلا ہُوا پیار نہیں ہے؟"

پنڈت یوں چونکا جیسے اُسے کسی نے بڑے پیار سے خواب سے بیدار کر دیا ہو۔ وہ جو دعویٰ کرتا تھا کہ اُس کی زندگی عورت سے خالی رہی ہے اور خالی رہے گی سمرتی کے ریشمی بالوں میں اُلجھ گیا تھا، یا اُس کے تبسم، یا اس کے سحر آگیں پیکر میں، یا اس کی باتوں میں۔ وہ اپنے آپ میں نہیں تھا۔ وہ کھسیانی سی ہنسی ہنس پڑا اور قدرے ہکلا کر بولا۔ "کیوں نہیں ... ایک پجاری سے تمہیں پاپ نہیں پیار ملے گا"۔

"اگر آپ مجھے وہ پیار دے دیں جس کی میری روح پیاسی ہے تو میں آپ کے بتوں کے آگے وہ رقص کروں گی کہ یہ پتھر بھی تھرکنے لگیں گے اور آپ کے حسن بت کے ہونٹوں کے ساتھ بنسری لگی ہوئی ہے، اس بنسری سے وہ نغمہ پھوٹ اُٹھے گا جو آپ کو مدہوش کر دے گا۔ دُور دُور سے لوگ نگر کوٹ کی نرتکی کا رقص دیکھنے آیا کریں گے۔ لوگ کرشن بھگوان کی بجائے نگر کوٹ کی نرتکی کی پوجا کیا کریں گے"۔

پنڈت اُٹھا اور یوں کمرے میں ٹہلنے لگا کہ اُس کا سر جھکا ہُوا تھا۔ سمرتی اسے دیکھ رہی تھی۔ پنڈت رُکتا تھا۔ اسے دیکھتا تھا اور ٹہلنے لگتا تھا۔

"مہاراج کے پاس صبح جاؤں گی؟"۔ سمرتی نے پوچھا۔

"اگر میں تمہیں مہاراج انند پال سے ہمیشہ کے لیے مانگ لوں تو کیا کہو گی؟"

"یسی کہ پہلے میں ایک راجہ کی ملکیت تھی، اب نگرکوٹ کے پجاری کے پنجرے میں آگئی ہوں" سمرتی نے جواب دیا۔ "لیکن میری روح کی قیمت آپ کو ادا کرنی ہوگی جو زر و جواہرات کی صورت میں نہیں ہوگی"۔ اُس نے اپنے گلے میں پڑا ہوا بیش قیمت ہار گلے سے زور سے نوچا اور اسے ایک بیکار چیز کی طرح پنڈت کے پاؤں میں پھینک دیا۔ انگلیوں سے ہیروں والی انگوٹھیاں اتار پھینکیں اور بولی۔ "انہیں اپنی گنگا میں بہا دیں"۔

پنڈت نے جھک کر یہ چیزیں اٹھائیں اور آہستہ سے اس کے آگے رکھ کر کہا۔ "آرام سے سو جاؤ۔ ہم صبح آئیں گے اور گنگا کنارے چلیں گے"۔

راجہ آنند پال لاہور چلا گیا۔ اُس کے دل پر بوجھ سا تھا۔ سمرتی کے ساتھ اسے پیار تھا اور یہ پیار اُس کے فن کی بدولت تھا بلکہ یہ فن کا پیار تھا۔ وہ سمرتی کی بجائے ایک سو حسین کنواریاں قربان کرنے کو تیار تھا مگر پنڈت نے سمرتی کو ہی قربانی کے قابل سمجھا.... راجہ زیادہ دن پریشان نہ رہ سکا کیونکہ دوسری ریاستوں کی فوجیں لاہور میں آنے لگی تھیں۔ ان میں قنوج، گوالیار اور اجمیر کی فوجیں تھیں۔ کالنجر کی فوج کو لاہور بھیجنے کی بجائے پشاور کی طرف روانہ کر دیا گیا تھا۔ اس کے کمانڈروں کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ دریائے سندھ پار کریں۔ اپنی طرف کے کنارے سے دور خیمہ زن ہو جائیں۔

یہ ۱۰۰۸ کے ساون بھادوں کے دن تھے۔ دریا چڑھے ہوئے تھے۔ فوجوں کی نقل و حرکت میں خاصی دشواری پیش آتی تھی۔ دریا پار کرنے بہت مشکل تھے۔ کشتیوں کے پل بنتے تھے۔ سیلاب آجاتا اور پل بیکار ہو جاتے تھے لیکن اتنی بڑی فوج کو مجوزہ میدان جنگ کے قریب جمع گاہ تک پہنچانے کے لیے مہینوں جتنا وقت درکار تھا۔ رسد اور فالتو سامان پہنچانا بھی آسان نہیں تھا۔ ہند کے راجے سلطان محمود کو اتنی مہلت نہیں دینا چاہتے تھے کہ وہ اپنی فوج کی کمی کو پورا کر لے۔

مورخ لکھتے ہیں کہ لاہور فوجی کیمپ بن گیا تھا۔ فوج کی کیفیت یہ تھی کہ اُس کی نفری بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک تو ریاستوں کے دستے آ رہے تھے اور دوسرے یہ کہ غیر فوجی ہندو جوان جو تیغ زنی، تیر اندازی اور گھوڑ سواری کی سوجھ بوجھ رکھتے تھے، وہ جوق در

جوق فوج میں شامل ہو رہے تھے۔ انہیں باقاعدہ تربیت یافتہ فوج میں تقسیم کیا جا رہا تھا۔ ہندو مائیں اپنے بیٹوں کو فوج میں بھیج کر فخر محسوس کرتی تھیں۔ مندروں کے پنڈتوں نے مسلمانوں کے خلاف ایسا زہریلا اور حقارت آمیز پروپیگنڈہ کیا تھا کہ کوئی ماں اپنے بیٹے کو جنگ میں جانے سے نہیں روکتی تھی۔ لوگوں نے فوج کے لیے رسد کے انبار لگا دیئے تھے۔ رسد میدان جنگ تک لے جانے کے لیے لوگوں نے اپنے بیل، بھینسے اور اونٹ دے دیئے تھے۔

مندروں میں یہی ایک دعا سنائی دیتی تھی کہ ہندو دھرم کی فتح اور اسلام کی شکست۔

ہندوؤں کے دلوں میں جذبے اور کوئی خواہش تھی ہی نہیں۔ وہ جب لاہور کے ارد گرد فوجوں کا اجتماع دیکھتے تھے تو خوشی سے اُن کے چہرے لال ہو جاتے تھے۔ مورخوں خصوصاً فرشتہ اور البرونی نے لکھا ہے کہ ہندوستان نے اتنی فوج پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی جو ایک متحدہ کیمپ میں جمع ہوئی ہو۔

اس کے مقابلے میں سلطان غزنوی کو اللہ کا سہارا اور اپنی جنگی فہم و فراست پر بھروسہ تھا۔ وہ پشاور میں تھا اور اُسے لاہور سے اطلاعیں مل رہی تھیں کہ اُس کے خلاف انسانوں، گھوڑوں اور ہاتھیوں کا ایک سیلاب تیار ہو رہا ہے۔ اُسے ابھی یہ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ اس سیلاب کا رُخ کس طرف ہو گا۔ اُس نے بھیرہ اور ملتان میں اتنی رسد رکھوا دی تھی کہ محاصرے کی صورت میں محصورین کے لیے ایک سال تک خوراک کافی تھی۔ اُس نے سوچا تھا کہ ان شہروں کا محاصرہ ہوا تو وہ باہر سے محاصرہ توڑنے کی کوشش کرے گا۔

ایک روز اُسے دیدبانوں نے اطلاع دی کہ ہنڈ کے قریب کالنجر کی فوج خیمے گاڑ رہی ہے۔ اس سے اُسے اور زیادہ فکر پیدا ہوا۔ وہ سمجھا کہ ہندو تین محاذ کھولیں گے۔ بھیرہ اور ملتان کے محاصرے اور اُسے پشاور روکے رکھنے کے لیے ادھر بھی حملہ کریں گے۔ یہ سلطان کے بس کی بات نہیں تھی کہ تین محاذوں پر لڑتا اور فتح بھی حاصل کرتا۔

پھر ایک روز یوں ہوا کہ ہند کی متحدہ فوج سیلاب کی طرح چل پڑی۔ اس کا رُخ پشاور کی طرف تھا۔ لاہور اور گرد و نواح کے ہندوؤں نے فوجوں کو دریائے راوی

اس طرح پار کرایا جیسے ہر ایک سپاہی کو کندھوں پر اٹھا کر پار کر دیا ہو۔ دریا میں طغیانی تھی۔ کشتیوں کے دو پل بنائے گئے تھے۔ طغیانی کشتیوں کو اچھالتی تھی لیکن لوگوں نے رسے اپنے ہاتھوں اتنے موٹے اور اتنے مضبوط بنائے تھے کہ کشتیاں ایک دوسری سے الگ نہیں ہوتی تھیں۔ مسلسل تین دن اور تین راتیں فوج دریا پار کرتی رہی۔ رسد سے لدی ہوئی بیل گاڑیوں کو لوگ دھکیلتے تھے تاکہ بیل تھک نہ جائیں اور تیز چلیں۔

جب یہ اطلاع سلطان محمود غزنوی کو ملی کہ تمام فوج لاہور سے پشاور کی سمت نکل آئی ہے تو اُسے اس اطلاع پر یقین نہ آیا۔ اُس نے بھیرہ کو اپنے جاسوس مسافروں کے بھیس میں بھیجے۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ ہندو بھیرہ اور ملتان کو نظر انداز کیے رکھتے۔ بہت دنوں بعد اُس کے جاسوسوں نے تصدیق کر دی کہ بھیرہ اور ملتان کی طرف ہندوؤں کی کوئی توجہ نہیں اور تمام افواج پشاور کی سمت آ رہی ہیں۔

"دشمن کے لیے غزنی بھیرہ اور ملتان سے زیادہ اہم ہے" سلطان محمود نے اپنے سالاروں وغیرہ سے کہا۔ "میں یہ سمجھا ہوں کہ ہند کی متحدہ فوج پشاور کے اس میدان میں آ کر لڑے گی جس میں جے پال نے ہم سے شکست کھائی تھی۔ وہ اپنی تمام فوج اس لیے ادھر ہی لا رہے ہیں کہ ہمیں کچلتے ہوئے غزنی کی طرف نکل جائیں۔ اگر دشمن نے یہی سوچا ہے تو میں یہ منصوبہ بنانے والوں کی تعریف کرتا ہوں۔ اتنی بڑی فوج کے زور پر وہ اتنا اچھا منصوبہ بنا سکتے ہیں۔۔۔۔

"اللہ کے علاوہ ہماری مدد کرنے والا دریائے سندھ ہے۔ ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ دشمن دریا عبور نہ کر سکے۔ اس کے لیے ہمیں ایسے جانبازوں کی ضرورت ہے کہ اگر دشمن رات کو کشتیوں کا پل بنائے تو جانباز جا کر رسے کاٹ دیں۔ دور مار تیر اندازوں کی بھی ضرورت ہے۔ اگر پل سے گزرتے ہوئے کسی ایک ہاتھی کو دو تین تیر کاری لگ گئے تو وہ پل سے کسی کو گزرنے نہیں دے گا۔۔۔۔

"لیکن اتنی بڑی فوج کو ان طریقوں سے نہیں روکا جا سکے گا۔ دشمن کی فوج اُس وقت یہاں پہنچے گی جب سردیوں کا موسم شروع ہو چکا ہوگا اور دریا میں پانی کم ہوگا۔ ہم دشمن کو دریا کے پار روکیں گے۔ ہمیں زندگی اور موت کا معرکہ لڑنا پڑے گا۔"

سلطان نے اُسی وقت بھیرہ، ملتان اور غزنی کو قاصد اس پیغام کے ساتھ دوڑا دیئے کہ تھوڑے تھوڑے دستے ہر جگہ سے پشاور آ جائیں اور پیش قدمی بہت تیز ہو۔ سلطان محمود کی کیفیت یہ ہو گئی کہ نقشہ سامنے رکھ کر اس میں غرق ہو جاتا اور اُسے کھانے پینے اور سونے کی بھی ہوش نہیں رہتی تھی۔ اُس کی انگلی نقشے پر چلتی رہتی اور وہ نقشے بنانے میں مگن رہتا۔

شعیب ارمغانی ابھی سمرتی کے گھر میں تھا جب راجہ انند پال نگر کوٹ سے لاہور واپس آیا تھا۔ سمرتی کی خادمہ نے اُسے بتایا کہ راجہ تو آ گیا ہے، سمرتی نہیں آئی۔ دو تین روز بعد خادمہ نے بتایا کہ جو لڑکیاں راجہ کے ساتھ گئی تھیں، وہ بتاتی ہیں کہ پہلی رات ہی نگر کوٹ کا پنڈت سمرتی کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ وہ مندر سے واپس نہیں آئی تھی۔ دوسرے دن راجہ وہاں سے چل پڑا تھا۔

ارمغانی سوچنے لگا کہ سمرتی کیوں نہیں آئی۔ شاید نگر کوٹ کے پنڈت کو وہ اتنی اچھی لگی ہو کہ اُس نے اسے اپنے پاس رکھ لیا ہو۔ اس پنڈت کی فرمائش کو کوئی راجہ ٹال نہیں سکتا تھا۔

بوڑھی خادمہ کو سمرتی سے اتنا پیار تھا کہ دل و جان سے اُس کی وفادار تھی۔ اس نے سمرتی کی خواہش کے مطابق ارمغانی کو قیمتی راز کی طرح چھپا کر رکھا تھا اور ہر روز اُس کے زخموں کی مرہم پٹی کرتی تھی۔ زخم ٹھیک ہوتے جا رہے تھے۔ شعیب ارمغانی گرفتاری سے بچ گیا تھا۔ اُسے پناہ بھی مل گئی تھی۔ یہی اُس کا مسئلہ تھا۔ اُسے وہاں سے نکل جانا چاہیے تھا مگر اُس کے لیے زرینہ ایک جذباتی مسئلہ بن گئی تھی۔ اس نے شادی نہیں کی تھی۔ تو عورت کو وہ اپنے خفیہ فرائض کی راہ میں رکاوٹ سمجھتا تھا۔ زرینہ اُس کی زندگی میں آئی تو وہ اپنے جذبات کا غلام ہو گیا۔ وہ زرینہ کو حاصل کرنے کی سوچ رہا تھا۔

اُس نے اپنے آپ کو یہ فریب بھی دیا کہ زرینہ نے اُس کے ساتھ جو شادی کی تھی وہ دھوکہ تھا، مگر اُس کا دل اس جواز کو قبول نہیں کرتا تھا۔ اُسے یہ خیال آ جاتا کہ زرینہ نے اُسے دل و جان سے خاوند تسلیم کر لیا تھا اور یہ اُس کی محبت کا ثبوت ہے کہ اُس نے اُسے گرفتار ہونے سے بچا لیا تھا، مگر زرینہ اُسے کہاں مل سکتی تھی؟

سمرتی کی خادمہ اُس کے اس راز سے واقف نہیں تھی، اس لیے وہ اس بڑھیا سے

یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ زرفہ نام کی ایک لڑکی کو تلاش کرے۔

ایک روز ایک بگھی سمرتی کے گھر کے سامنے رکی۔ خادمہ دوڑی گئی کہ سمرتی آئی ہے لیکن اس میں سے دو لڑکیاں اتریں۔ ارمغانی اندر چھپ کر دیکھ رہا تھا۔ اُس نے زرفہ کو دیکھا تو اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ ان دونوں میں ایک زرفہ تھی۔ وہ سمرتی سے ملنے آئی تھیں۔ خادمہ انہیں اندر لے آئی۔ ارمغانی دوسری لڑکی کی موجودگی میں نہیں مل سکتا تھا۔ وہ خادمہ کو آواز بھی نہیں دے سکتا تھا۔ سوچ سوچ کر اس نے ایک پھولدان فرش پر پھینک دیا۔ خادمہ نے آواز سنی تو دوڑی گئی کہ برتن کون توڑ رہا ہے۔

"میں نے تمہیں بلانے کے لیے پھولدان پھینکا تھا"۔ اُس نے خادمہ سے کہا۔ "ان میں زرفہ نام کی ایک لڑکی ہے۔ اُسے اس طرح میرے پاس بھیجو کہ دوسری کو پتہ نہ چلے"۔

"یہ سمرتی سے ملنے آئی ہیں"۔ خادمہ نے کہا۔ "انہیں معلوم نہیں تھا کہ سمرتی یہاں نہیں ہے۔ وہ جا رہی ہیں"۔

ارمغانی کے اصرار پر خادمہ مان گئی۔ وہ تجربہ کار عورت تھی۔ وہ دوسری لڑکی کو بہلانے باہر لے گئی۔ ارمغانی زرفہ کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ زرفہ کی آنکھیں حیرت سے کھل گئیں۔ وہ دوڑ کر ارمغانی سے لپٹ گئی۔ بولی۔ "تم ابھی یہیں ہو؟ زخمی کیسے ہوئے ہو؟"

"اگر دھوکہ دینا ہے تو بتا دو"۔ ارمغانی نے کہا۔ "میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ تمہارے لیے رکا ہوا ہوں۔ کہاں مل سکتی ہو؟"

"میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ دھوکہ نہیں دوں گی"۔ زرفہ نے کہا۔ "جہاں کہو ملوں گی۔ یہاں آجاؤں؟"

"اندر نہیں باہر"۔ ارمغانی نے کہا۔ "میں اس باغیچے میں چھپا ہوا ہوں گا۔ ہو سکتا ہے تمہیں اندر لے آؤں ... اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کرنا کہ سمرتی نگرکوٹ میں کیوں رہ گئی ہے۔ اُس نے مجھ پر یہ احسان کیا ہے کہ مجھے پناہ دے رکھی ہے .... اب چلی جاؤ۔ وہ آ رہی ہے"۔

زرفہ سمرتی کے گھر سے نکلنا نہیں چاہتی تھی۔ شعیب ارمغانی اُسے بہت دنوں بعد نظر آیا تھا۔ یہ تو اُسے یقین تھا کہ ارمغانی پکڑا نہیں گیا اور وہ شہر سے نکل گیا ہے۔ لیکن اُسے یہ بھی یقین تھا کہ ارمغانی اب اُسے کبھی نہیں ملے گا۔

وہ سلطان محمود غزنوی کا جاسوس تھا۔ لاہور میں اُسے پہچان لیا گیا تھا۔ اب اُسے کبھی بھی اُدھر نہیں آنا تھا۔ زرفہ ارمغانی کی زندگی میں بڑا حسین دھوکہ بن کر آئی تھی اور یہ دھوکہ کامیاب تھا۔ اس دھوکے نے وہ قسم توڑ دی تھی جو ارمغانی نے قرآن پر ہاتھ رکھ کر کھائی تھی کہ وہ اپنا اور اپنے کسی جاسوس ساتھی کا راز فاش نہیں کرے گا۔

اُس نے زرفہ کے حسن کے طلسم میں آکر اپنا راز فاش کر دیا لیکن یہ قرآن کا ہی کرشمہ تھا کہ زرفہ ارمغانی کو پھانسنے کے لیے پھندہ بن کر آئی تھی جس میں وہ خود بھی پھنس گئی اور پھنسی بھی ایسی کہ ارمغانی کو اُس نے اس سے نکال دیا اور خود پھندے سے آزاد نہ ہو سکی۔ یہ اُس محبت کی سحر کاری تھی جو اُسے کہیں سے نہیں ملی تھی۔ جب اُسے ملی تو پتہ چلا کہ اُس کی رُوح کیسی ظالم پیاس سے جلتی رہی ہے

ارمغانی اُسے سمرتی کے گھر میں چھپا ہوا مل گیا۔ سمرتی کی خادمہ زرفہ کے ساتھ آئی ہوئی لڑکی کو دوسرے کمرے میں لے گئی۔ ارمغانی اور زرفہ ملے تو زرفہ کو خواب کا دھوکہ ہوا لیکن وہ زیادہ دیر تک اکیلے نہ رہ سکے کیونکہ سمرتی کی خادمہ زرفہ کی سہیلی کو زیادہ دیر تک دوسرے کمرے میں روک نہیں سکتی تھی۔

ارمغانی نے اُسے کہا کہ وہ اُسے کل رات اس گھر سے باہر ملے۔ وہ کمرے سے نکل گیا۔

زرفہ اور اُس کے ساتھ آئی ہوئی لڑکی چلی گئیں۔ خادمہ نے ارمغانی سے پوچھا کہ وہ زرفہ سے چوری چھپے کیوں ملا ہے۔ یہ ایک قدرتی سوال تھا جو خادمہ کے ذہن میں پیدا ہوا۔ وہ ارمغانی کی ہمراز تھی لیکن ارمغانی کے اصل راز سے وہ واقف نہیں تھی۔ اُسے سمرتی نے اتنا ہی بتایا تھا کہ ارمغانی کو چھپا کر رکھنا ہے اور اس کے زخموں کا علاج کرنا

ہے۔ خادمہ خود رقاصہ رہ چکی تھی۔ اُس کے جسم کی لچک ختم ہو گئی اور جب جوانی اُس کے سر میں وقت سے سفید بال اور چہرے پر ہونٹوں کے دائیں بائیں دو باریک سی لکیریں چھوڑ کر رخصت ہو گئی تو راج محل میں اُس کی ضرورت ختم ہو گئی۔ اُس کی اداؤں سے مسحور ہونے والوں اور اُس کے جسم کے ساتھ کھیلنے والوں کی نظریں پھر گئیں تو ایک احساس زہر کی طرح اُس کی رگ رگ میں بھر گیا — یہ احساس تنہائی کا تھا، کسمپرسی کا تھا۔ اُس کے دل میں سچی محبت جاگی تھی مگر جس نے محبت کو جگایا تھا، اُسے ساری عمر کے لیے مہاراجہ کے قید خانے میں بند کر دیا گیا تھا کیونکہ وہ مسلمان تھا مگر اُس نے اپنی قوم سے بھی غداری کی تھی اور مہاراجہ کو بھی دھوکہ دیا تھا۔ یہ تو کسی کو پتہ نہ چل سکا کہ رقاصہ بھی اسی کو چاہتی ہے۔ پتہ چل جاتا تو وہ بھی قید خانے میں گل سڑ رہی ہوتی۔

وہ کوئی ایسی بوڑھی تو نہیں ہوئی تھی۔ وہ چونکہ رقاصہ رہی تھی اس لیے اُس کے چہرے، جسم میں پھرتی اور حرکات میں مستعدی تھی۔ شاید اسی کا اثر تھا کہ وہ ذہنی لحاظ سے بھی پھرتیلی تھی۔ اُس نے جب دیکھا کہ اُس کا رقص اب بوڑھا ہو گیا ہے اور اُس کی جگہ سمرتی نے لے لی ہے تو وہ سمرتی کے گھر آ کر بیٹھ گئی۔ سمرتی کے معاملے میں اُس کے دل میں وہ رقابت نہیں تھی جو ناچنے گانے والیوں کے درمیان ہوا کرتی ہے۔ سمرتی اُسے بہت اچھی لگی تھی۔ سمرتی رقاصہ بھی تھی مغنیہ بھی۔ اُس کے جسم میں بھی جادو تھا، آواز میں بھی۔ خادمہ جوں جوں پرانی ہوتی گئی، اُس کے دل میں سمرتی کی محبت نکھرتی آئی، پھر وہ وقت آیا کہ سمرتی اس رقاصہ کو جو اُس کی خادمہ بنی، ماں سمجھنے لگی۔ وہ جب رقص کو خیرباد کہہ کر سمرتی کے گھر آئی تو سمرتی نے اُسے گلے لگا لیا اور ہمیشہ کے لیے اپنے پاس رکھ لیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس پرانی رقاصہ نے اپنے آپ کو سمرتی کی خادمہ کا درجہ دے لیا۔

جب شعیب ارمغانی مفرور جاسوس کی حیثیت سے سمرتی کے باغیچے میں آ چھپا تو سمرتی کے کُتّے نے ارمغانی کو بُری طرح زخمی کر دیا۔ سمرتی ارمغانی کو اندر لے گئی۔ اُس کے زخم دھوئے اور جب اُس نے خادمہ سے کہا کہ اس شخص کو ایک مقدّس راز کی طرح چھپا کر رکھنا ہے تو خادمہ نے اُس سے یہ بھی نہ پوچھا کہ یہ راز کیا ہے اور اس راز کا تقدّس کیا ہے۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ یہ زخمی سمرتی کے دل میں اُتر گیا ہے۔ اُسے اپنی محبت یاد آ گئی تھی۔ اُس نے جسے

جاتا تھا وہ قید خانے میں پڑا تھا اور اس رقاصہ نے محبت اور آزردہ دل کو اپنے سینے میں قید کر لیا تھا۔

یہ اُس کے مجروح جذبات کا درد تھا کہ اُس نے سمرتی کے کہنے پر ارمغانی کو ایک راز کی طرح اپنے سینے میں ڈال لیا۔ پھر سمرتی مہاراجہ انند پال کے ساتھ نگرکوٹ چلی گئی۔ اتنے دن گزر گئے تھے۔ اُس نے ارمغانی کو چھپا کر رکھا ہوا تھا۔ وہ دراصل اُس محبت کو اپنے پیار سے سینچ رہی تھی جو سمرتی کے دل میں پیدا ہو گئی تھی۔ یہ ارمغانی کی محبت تھی۔ اُس نے سمرتی کی غیر حاضری میں ارمغانی سے پوچھا تک نہیں تھا کہ وہ کون ہے، کہاں سے آیا ہے اور اُسے کہاں جانا ہے۔

اب زرفہ اپنی ایک سہیلی کے ساتھ آئی اور ارمغانی نے اُس کے ساتھ علیحدگی میں بات کی تو قدرتی طور پر خادمہ کے ذہن میں یہ سوال بیدار ہوا کہ وہ زرفہ کو کس طرح جانتا ہے اور ان کے درمیان کیا راز و نیاز ہے۔ ارمغانی کا دماغ تیزی سے سوچنے لگا کہ خادمہ کو بتا دے کہ وہ سلطان محمود غزنوی کا جاسوس اور مفرور ہے!

سوچ سوچ کر اُس نے جواب دیا — "زرفہ میری بیوی ہے"

"پھر یہ پردہ داری کیسی؟"... خادمہ نے پوچھا۔

"تم نے زرفہ کا حُسن دیکھا ہے؟" — ارمغانی کو ایک جھوٹ سُوجھ گیا — "اور تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ زرفہ کس باپ کی بیٹی ہے؟"

"زرفہ سانپ کی بیٹی ہے" — خادمہ نے کہا — "میں اس کے باپ کو جانتی ہوں۔ وہ بے اصول، بے ایمان، بے غیرت اور زہریلا مسلمان ہے۔ وہ بیٹی کی جوانی اور اس کے حُسن کے بل بوتے پر راج دربار کا خاص آدمی بنا ہوا ہے۔"

"اور اس باپ کی بیٹی نے چوری چھپے میرے ساتھ شادی کر لی تھی" — ارمغانی نے کہا — "وہ میرے گھر آ گئی۔ اُس کے باپ کو پتہ چل گیا۔ تمہیں معلوم ہے کہ جاسوسی کے شک میں یہاں مسلمانوں کی پکڑ دھکڑ کیسی بے دردی سے ہوئی تھی۔ لوگوں نے ذاتی دشمنیوں کی وجہ سے بھی ایک دوسرے کو پکڑوا دیا تھا۔ زرفہ کے باپ نے ایک اونچے رُتبے کے

آدمی کو یہ جھانسہ دے کر ساتھ لیا کہ وہ زرفہ کی شادی اُس کے ساتھ کر دے گا اور انہوں نے ایک رات فوج کے تین چار آدمیوں کو ساتھ لے کر انہیں یہ بتایا کہ میں جاسوس ہوں اور میرے گھر چھاپہ مارا۔ یہ زرفہ تھی جس نے مجھے بچایا اور فرار میں مدد دی۔ اُسے بروقت پتہ چل گیا تھا میں گہری نیند سویا ہوا تھا۔ اُس نے مجھے جگایا اور بتایا کہ میں کس خطرے میں آ گیا ہوں۔ اُس نے اپنے باپ اور اُس کے ساتھیوں کو دھوکہ دیا اور میرے لیے موقع پیدا کر دیا کہ میں نکل جاؤں۔ میں اوپر جا کر پچھواڑے سے کودا اور بھاگ نکلا۔ وہ میرے تعاقب میں تھے۔ یہاں باغیچے میں آ چھپا۔ وہ لوگ تو آگے نکل گئے، تمہارے کتے نے مجھے پکڑ لیا۔ تمہاری مالکن کو میں نے یہ کہانی سنائی تو اس کے دل میں رحم پیدا ہو گیا...... کیا میں تمہیں جاسوس نظر آتا ہوں؟"

"نہیں" — خادمہ نے کہا۔ "یہ زرفہ کے باپ کی انتقامی کارروائی ہے...... تم اب کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"میں اب لاہور میں نہیں رہ سکتا"۔ ارمغانی نے جواب دیا۔ "اگر زرفہ کے باپ کے سامنے آ گیا تو وہ مجھے گرفتار یا قتل کرا دے گا۔ میں زرفہ کو ساتھ لے کر پشاور چلا جاؤں گا"۔

"کیا وہ تمہارے ساتھ جانے کے لیے تیار ہے؟"

"بالکل تیار ہے" — شعیب ارمغانی نے جواب دیا۔ "میں تمہیں اس راز میں بھی شریک کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے تم پر بھروسہ ہے۔ زرفہ کل شام کے بعد چوری چھپے یہاں آ رہی ہے۔ میں نے باغیچے میں ایک جگہ ملنے کو کہا تھا لیکن اب میں نے تمہیں اس راز میں شریک کر لیا ہے تو کیا تم پسند کرو گی کہ زرفہ کو میں اندر لے آؤں؟ اس میں خطرہ یہ ہو گا کہ اُس کے تعاقب میں کوئی آ گیا تو میں پکڑا جاؤں گا"۔

"تم اسے اندر لے آنا" — خادمہ نے کہا۔ "میں کتا کھلا چھوڑ دوں گی۔ کوئی آ گیا تو کتا اُسے آگے نہیں آنے دے گا۔ اتنے میں تم اِدھر اُدھر ہو سکتے ہو۔ زرفہ کو چھپانے کی ضرورت نہیں۔ میں کہہ سکتی ہوں کہ سمرتی سے ملنے آئی تھی"۔

"کیا تم معلوم کر سکتی ہو کہ مہاراجہ واپس آ گیا ہے تو سمرتی کیوں نہیں آئی؟" — ارمغانی نے پوچھا۔

"کوشش کروں گی" — خادمہ نے کہا۔ "میرا تو ہو نہیں سکتا کہ مہاراجہ کسی کو سمرتی تحفے کے طور پر دے آیا ہو۔ اس رقاصہ سے وہ کسی قیمت پر دستبردار نہیں ہونا چاہتا"۔

"میں نے زرفہ سے کہا تھا کہ معلوم کرے"۔

زرفہ نے معلوم کر لیا تھا۔ وہ رات کو آ گئی۔ ارمغانی باغیچے کی فصیل کے باہر اُس جگہ انتظار کر رہا تھا جہاں وہ فرار کی رات آ کر چھپا تھا۔ بہت انتظار کے بعد زرفہ آئی۔ وہ اکیلی تھی۔ ارمغانی نے اُسے بتایا کہ اُس کے متعلق وہ خادمہ کو کیا بتا چکا ہے۔ وہ زرفہ کو اندر لے گیا۔ خادمہ نے کتا کھول کر باغیچے میں چھوڑ دیا۔

زرفہ نے ارمغانی کو پہلی یہ خبر سنائی کہ نگرکوٹ کے بڑے پنڈت نے سمرتی کو انسانی قربانی کے لیے وہیں رکھ لیا ہے۔ دوسری خبر یہ کہ مہاراجہ انند پال کی فوج اور نیم خود مختار ریاستوں کی فوجیں جو لاہور میں جمع ہوئی تھیں، پشاور کی طرف کوچ کر گئی ہیں۔ ان کی فتح کے لیے پنڈت نے سمرتی کو دیوتاؤں کے قدموں میں قربان کرنے کے لیے منتخب کیا ہے۔

"اس وقت تک اس کا خون بہایا جا چکا ہو گا" — زرفہ نے کہا۔

"شاید ابھی زندہ ہو" — خادمہ نے کہا۔ "جس لڑکی کو قربانی کے لیے منتخب کرتے ہیں اُسے فوراً ذبح نہیں کر دیتے۔ ایک مہینہ پنڈت اسے غسل اور عبادت سے پاک کرتے رہتے ہیں۔ اُسے نشہ آور دوائیاں کھلاتے ہیں حتیٰ کہ وہ خود کہنے لگتی ہے کہ مجھے دیوی کے قدموں میں قربان کر دو"۔

تینوں پر سناٹا طاری ہو گیا۔

"سمرتی نے مجھ پر جو احسان کیا ہے، یہ ایسا معمولی نہیں کہ میں اسے فراموش کر دوں" — ارمغانی نے کہا۔ "میں نگرکوٹ جاؤں گا اور معلوم کرنے کی کوشش کروں گا کہ وہ زندہ ہے یا ذبح کر دی گئی ہے۔ اگر زندہ ہوئی تو میں اسے نکالنے کی کوشش کروں گا"۔

"نگرکوٹ کا مندر اس مکان کی طرح نہیں کہ ایک کمرے سے آخری کمرے تک گھوم جاؤ گے" — خادمہ نے کہا۔ "میں اس مندر میں گئی ہوں [illegible]

راہداریوں کی بھول بھلیاں ہیں۔ اس کا تہہ خانہ بھی ہے۔ وہاں تو ہاتھی غائب ہو جاتے ہیں۔ مندر کے ارد گرد قلعہ ہے۔ لوگ وہاں عبادت کے لیے جاتے ہیں لیکن یہ معلوم کرنا کہ سمرتی کہاں ہے، آسان نہیں ہوگا۔"

شعیب ارمغانی کی رگوں میں جوانی کا خون دوڑ رہا تھا۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ سمرتی مسلمان ہے۔ اس کے لیے یہ قابلِ برداشت نہیں تھا کہ ایک مسلمان عورت کو ہندوؤں کی فتح کے لیے قربان کر دیا جائے۔ اُسے وہ وقت یاد آیا جب سمرتی نے اُسے اپنے خونخوار کتے سے چھڑایا اور اُسے اندر لے گئی تھی۔ اُس کے زخموں سے خون فرش پر گر رہا تھا۔ کتے نے سمرتی کا بھی ایک ہاتھ زخمی کر دیا تھا۔ اُس کے خون کے قطرے بھی فرش پر گر کر ارمغانی کے خون میں مل گئے تھے۔ ارمغانی نے اُسے کہا تھا کہ اپنا خون سنبھالو میرا اور تمہارا خون ایک ہے۔ سمرتی نے فرش پر دیکھ کر کہا تھا۔ "ہاں، ہمارا خون ایک ہے۔ تم نے میری آنکھوں میں وہ روشنی پیدا کر دی ہے جو اپنے خون کو پہچان لیا کرتی ہے۔"

ارمغانی کو اُس رات کا ایک ایک لمحہ یاد آ گیا۔ وہ کچھ دیر خلاؤں میں دیکھتا رہا۔ اچانک پھٹ کر بولا۔ "میں ایک مسلمان عورت کا خون پتھر کے بتوں کی بھینٹ نہیں چڑھنے دوں گا" — اُس نے خادمہ کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "تم کہا کرتی ہو کہ تمہارے دل میں سمرتی کی وہی محبت ہے جو ماں کے دل میں اپنے بچے کی ہوتی ہے..... اس محبت کا کوئی ثبوت دے سکو گی؟ میرا ساتھ دو گی؟ میں نگرکوٹ کا راستہ نہیں جانتا۔ مجھے وہاں تک لے چلو۔ مجھے مندر کے اندر کی دُنیا کے راستے اور تہہ خانے سمجھا دینا۔ شاید وہ ابھی زندہ ہو۔"

"کیا ہم راستے میں پکڑے نہیں جائیں گے؟" — خادمہ نے پوچھا۔

"نہیں" — ارمغانی نے کہا۔ "ہم بہروپ میں جائیں گے۔" اُس نے زرفہ سے کہا — "تم یہیں رہو۔ شاید ہم جیتے جی مل سکیں گے۔"

"میں تمہارے ساتھ جاؤں گی" — زرفہ نے کہا۔ "میں اب یہاں نہیں رہ سکتی۔ جہاں تم ہو گے وہاں میں ہوں گی۔"

خادمہ کو معلوم ہو چکا تھا کہ وہ میاں بیوی ہیں۔ وہ انہیں تنہا چھوڑ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ ارمغانی پر سمرتی کی قربانی کی خبر نے ایسی کیفیت طاری کر دی تھی جیسے اُسے

یاد ہی نہ رہا ہو کہ اُس کے پاس زرفہ بیٹھی ہے اور زرفہ خطرہ مول لے کر اُس کے پاس آئی ہے۔ اُسے اس کیفیت سے نکالنے کے لیے زرفہ نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ارمغانی نے بے خیالی میں اُس کی طرف دیکھا۔

"تم شاید ابھی تک مجھے ایک فریب سمجھ رہے ہو" — زرفہ نے کہا۔ "ایک رقاصہ کو تم مجھ سے زیادہ قیمتی اور بہتر سمجھتے ہو۔"

"اوہ زرفہ!" — اُس نے زرفہ کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "یوں نہ کہو۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔ سمرتی نہ ہوتی تو میں آج قید خانے میں زندہ لاش بن چکا ہوتا۔ وہ مسلمان ہے، تم بھی مسلمان ہو۔ میں تمہیں دھوکہ نہیں سمجھ رہا۔ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ تمہیں ساتھ لے جاؤں تو کبھی ٹھیک نہیں۔ یہاں چھوڑ جاؤں تو تم سے ملنا ناممکن ہو جائے گا کیونکہ میں دوبارہ آیا تو پکڑے جانے کا خطرہ ہوگا۔"

"تم جس بہروپ میں خادمہ کو ساتھ لے جاؤ گے اسی بہروپ میں مجھے بھی ساتھ لے چلو" — زرفہ نے کہا۔ "مجھے اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا ہے۔"

"یہ خیال رکھنا زرفہ!" — ارمغانی نے کہا۔ "میں نے سمرتی کی خادمہ کو تمہارے متعلق یہ تو بتا دیا ہے کہ تم میری بیوی ہو لیکن اپنے متعلق یہ نہیں بتایا کہ میں جاسوس ہوں۔" اُس نے خادمہ کو اپنے متعلق جو کچھ بتایا تھا، وہ زرفہ کو بتا دیا۔ پھر اُسے کہا۔ "مجھے اپنے دو دوستوں کو بھی ساتھ لینا ہے۔ میں آج رات انہیں ملوں گا اور انہیں نگرکوٹ چلنے پر آمادہ کروں گا۔ تم چلی جاؤ۔ کل صبح اگر ادھر آ سکو تو آ جانا۔ تمہیں بتا دوں گا کہ ہم نے کیا طے کیا ہے۔"

زرفہ نے اُسے یہ بھی بتایا تھا کہ اُس کی تلاش ترک کر دی گئی ہے۔ اب لاہور میں سکون تھا۔ فوجیں چلی گئی تھیں۔ پکڑ دھکڑ کا سلسلہ رک گیا تھا۔ ارمغانی کی داڑھی خاصی بڑھ آئی تھی۔ وہ اپنا روپ بدلنا جانتا تھا۔ وہ کسی سوداگر کا بھیس بھر سکتا تھا۔ اُس نے زرفہ کو یوں رخصت کیا کہ کچھ دور تک اُس کے ساتھ گیا اور اُسے رخصت کر کے اپنے ایک ساتھی کے گھر کی طرف چلا گیا۔ اُس کے ذہن پر سمرتی چھائی ہوئی تھی۔

نگرکوٹ میں پنڈت رادھا کشن کے ذہن پر بھی سمرتی چھانے لگی تھی۔ عورت کے

معاملے میں وہ پنڈت نہیں پتھر تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ عورت فساد کی جڑ ہے اور عورت ایسا جادو ہے جو مرد پر سوار ہوتا ہے تو وہ کسی کام کا نہیں رہتا اور وہ بدی کے سوا کچھ اور سوچ ہی نہیں سکتا۔ اسی نظریے کے تحت پنڈت رادھا کشن نوجوانی میں تارک الدنیا ہو گیا اور ہمالیہ کی اُن برف پوش وادیوں میں چلا گیا تھا جہاں سے گنگا نکلتا ہے۔ اُس نے وہاں پندرہ برس گزارے تھے اور اُس کا من مر گیا اور اُس کے جذبات ہمالیہ کی برف کی طرح سرد ہو گئے تو وہ نگرکوٹ کے مندر میں آ گیا تھا۔ اب اُس کی عمر پچاس ساٹھ کے درمیان تھی۔

پہلی رات وہ سمرتی کو قربانی کے لیے منتخب کر کے اپنے ساتھ نگرکوٹ کے مندر میں لے گیا تو سمرتی نے اُس کے ساتھ ایسی باتیں کیں جنہوں نے پنڈت کے وجود کا کوئی ایسا تار چھیڑ دیا جو پنڈت سمجھتا تھا کہ کبھی کا ٹوٹ چکا ہے۔ وہ سمرتی کو کمرے میں چھوڑ کر اور یہ کہہ کر نکل گیا تھا کہ آرام سے سو جاؤ، ہم صبح آئیں گے اور گنگا کے کنارے چلیں گے۔

پنڈت اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اُسے اپنے آپ پر اتنا زیادہ اختیار تھا کہ سونے کے لیے لیٹتا تھا تو لیٹتے ہی اُس کی آنکھ لگ جایا کرتی تھی۔ اُس کا ذہن کبھی بھٹکا نہیں تھا مگر اُس رات اُسے کوشش کے باوجود نیند نہیں آ رہی تھی۔ سمرتی کی ہنسی کا جل ترنگ اُس کے ذہن کے ہر گوشے میں بج رہا تھا۔ سمرتی نے بچوں کی طرح ہنستے ہنستے سر اُس کی گود میں پھینک دیا تھا۔ سمرتی کے ریشمی بالوں کے لمس کو وہ ابھی تک محسوس کر رہا تھا۔ اُس کا وجود عورت کے لمس سے ہمیشہ ناآشنا رہا تھا۔ وہ اس لمس سے اور عورت کے وجود کی لُوباس سے آزاد ہونے کی کوشش کر رہا تھا مگر اُسے آزادی ممکن نظر نہیں آ رہی تھی۔

اُسے سمرتی کے الفاظ یاد آ رہے تھے جو اس رقاصہ نے بڑے جذباتی لہجے میں کہے تھے ... ”اگر آپ مجھے وہ پیار دیں جس کی میری روح پیاسی ہے تو میں آپ کے بتوں کے آگے وہ رقص کروں گی کہ یہ پتھر بھی تھرکنے لگیں گے۔ لوگ دُور دُور سے نگرکوٹ کی رقاصہ کا رقص دیکھنے آیا کریں گے۔ لوگ کرشن بھگوان کی بجائے نگرکوٹ کی رقاصہ کی پرارتھنا کیا کریں گے۔“

پنڈت یوں بیدار ہو گیا جیسے وہ بڑا ہی سندر سپنا دیکھ رہا تھا کہ کسی نے سوئی چبھو کر اُسے جگا دیا ہو۔ وہ اس کا خون کھولنے لگا۔ غصے سے اس کی سانسیں دھونکنی کی مانند ہو گئیں۔ وہ بیٹھے بیٹھے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے اپنے آپ سے کہا۔ ”ایک رقاصہ ... مسلمان!

رقاصہ، ملیچھ، پاپن، جس کی آتما نے نہ جانے کتنے پاپی مردوں کا بوجھ اُٹھا رکھا ہے۔ کرشن بھگوان کا اپمان کر رہی ہے، وہ کرشن بھگوان کے کردھ سے واقف نہیں اُن بتوں کو پتھر کہتی ہے۔“

اُس نے ایک ہاتھ کا گھونسہ اپنے دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی میں مارا اور دانت پیس لیے ... ”اس ملیچھ نے ہمارا شریر ناپاک کر دیا ہے ... چھی چھی چھی .... ہم جھوٹ نہیں کہتے کہ عورت کا جادو انسان کو حیوان بنا دیتا ہے۔“ پنڈت بڑبڑانے لگا۔ وہ جو سوچ رہا تھا، وہ اس کی زبان پر آ گیا۔ وہ ذرا اونچی آواز سے بولنے لگا ... ”اُسے پاک کرنا ہے۔ بہت دن لگیں گے۔ پاک کر کے اس کے خون سے کرشن مراری کے پاؤں دھوئے جائیں گے۔“

پنڈت کے ذہن اور دل پر سمرتی کا جو طلسم طاری ہو گیا تھا وہ اتر گیا۔ وہ لیٹا اور اُس کی آنکھ لگ گئی۔

پنڈت رادھا کشن معمول کے مطابق اُس وقت جاگ اُٹھا جب سحر ابھی تاریک تھی۔ وہ مندر کی بلندی سے اترا اور بھجن گنگناتا ہوا پہاڑی کے قریب نیم دائرے میں بہتی ہوئی بن گنگا تک جا پہنچا۔ بن گنگا کو گنگا ندی بھی کہا کرتے تھے۔ وہ گھٹنوں گھٹنوں پانی میں جا کھڑا ہوا۔ ہاتھوں سے پانی کے چھینٹے اڑائے اور بھجن گنگناتے ہوئے پانی میں بیٹھ گیا۔ ہندوؤں کا آج بھی یہی عقیدہ ہے کہ گنگا پانی سارے پاپ دھو ڈالتا ہے۔ پنڈت پانی میں بیٹھ گیا۔ پانی بہت ٹھنڈا تھا۔ اُس کا جسم سرد ہوا تو اُس نے محسوس کیا کہ رات اُس کا جسم جلتا رہا ہے۔ یہ آگ سمرتی نے لگائی تھی۔ اُس نے تسلیم کر لیا کہ گذشتہ رات اُس کے وہ جذبات بیدار ہو گئے تھے جو وہ سمجھتا تھا کہ مر چکے ہیں۔

بھجن اور پانی اُسے ٹھکانے پر لے آئے اور وہ وہی پنڈت رادھا کشن بن گیا جس نے کسی معتقد عورت کو کبھی اپنے پاؤں کبھی چھونے نہیں دیئے تھے۔ رات اُسے سمرتی پر جو غصہ آیا تھا وہ بھی ٹھنڈا ہو گیا۔ اسے خیال آیا کہ سمرتی کو پاپن بنا یا گیا ہے۔ وہ سچے پیار کی پیاسی ہے۔ اُس نے کہا تھا ... ”مجھے گنگا جل سے دُھلا ہوا پیار دے سکتے ہو؟“

”ہاں، دے سکتا ہوں“ ... پنڈت نے اپنے آپ سے کہا ... ”میں اس رقاصہ کو گنگا

حل سے دھلا ہوا پیار دوں گا۔ پھر میں کشن مراری کے چرنوں میں اس کا خون بہا کر پرکرسکوں گا کہ میں نے ایسی عورت قربان کی ہے جسے میں نے پیار دیا تھا۔ یہ قربانی قبول ہوگی۔ ہوگی جلدی قبول ہوگی۔ غزنی، بلخ، بخارا اور سمرقند بھی مہا بھارت میں شامل ہو جائیں گے۔ ہر دوار کی گھنٹیاں محمود غزنوی کی مسجدوں میں بھی بجیں گی۔ ہندو دھرم کی فتح اور اسلام کی شکست ہوگی۔"

وہ واپس آیا تو مندر کے عبادت گاہ والے حصے میں چلا گیا جہاں ہندو مرد اور عورتیں عبادت میں مصروف تھیں۔ اُس نے گردی میں سے بن گنگا کا پانی ہاتھ پر ڈال کر بُت کے قدموں پر بکھیرا اور ہاتھ جوڑ کر بُت کے آگے سجدہ کیا۔

اس صبح وہ کچھ زیادہ ہی دیر عبادت میں مصروف رہا۔ کچھ زیادہ ہی مگن ہوگیا۔ وہ جب اس خود فراموشی سے بیدار ہوا تو دیکھا کہ وہ وہاں اکیلا تھا۔ لوگ پوجا پاٹ کر کے جا چکے تھے۔ سورج طلوع ہو چکا تھا۔ اُسے یاد آگیا کہ اسے سمرتی کو بھی دریا پر لے جانا اور نہلانا تھا۔ وہ اٹھا اور اُس کمرے میں چلا گیا جہاں وہ سمرتی کو چھوڑ آیا تھا۔ اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا۔ سمرتی گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔ پنڈت اندر چلا گیا اور سمرتی سے دو تین قدم دُور رُک گیا جیسے اُسے کسی نے اس کی مرضی کے بغیر روک دیا ہو۔

سمرتی بے فکری کی نیند سوئی ہوئی تھی۔ اُس کے ہونٹوں پر معصوم بچوں کا سا تبسم تھا جیسے وہ کوئی بڑا اچھا خواب دیکھ رہی ہو۔ اُس کے چند ایک بال بکھر کر اس کے چہرے پر آگئے تھے۔ سورج نکل آیا تھا اور وہ ابھی تک سوئی ہوئی تھی۔ پنڈت کو خیال آیا کہ گناہ انسان کو اطمینان نہیں دے سکتے۔ یہ عورت تو عبادت کی منکر ہے۔ کیا اس کی روح مطمئن ہے؟ کیا یہ روحانی سکون ہے کہ یہ ایسی بے فکری کی نیند سوئی ہوئی ہے؟

سمرتی کو دیکھتے دیکھتے پنڈت رادھا کرشن کو بے چینی سی محسوس ہونے لگی جو تشنگی کی صورت اختیار کر گئی۔ اُس کے سامنے سوئی ہوئی رقاصہ معصوم سی بچی بن گئی۔ آنکھیں کھلیں تو سمرتی اُسے اُس کے اپنے رُوپ میں نظر آئی جیسے اس عورت نے اُسی کی ماں کی کوکھ سے جنم لیا ہو اور ان کی رگوں میں ایک ہی باپ کا خون رواں دواں ہو۔ پنڈت اُسے دیکھتا رہا اور اُس کا ذہن دُور پیچھے چلا گیا جب وہ اسی طرح بچوں کی طرح سویا کرتا تھا۔ اسے اپنی ماں کا چہرہ یاد آنے لگا مگر یہ چہرہ دھند میں چھپا ہوا تھا۔ اس نے یادوں کی دھند کو ہٹانے

کی بہت کوشش کی مگر دھند نہ چھٹی، البتہ چہرہ نکھر آیا۔ اس نے غور سے دیکھا ــــ یہ چہرہ سمرتی کا تھا۔

بیٹی، بہن، ماں ـ پنڈت کے وجود میں سوئیاں چبھنے لگیں۔ اسے اپنا وجود کھنڈر کی طرح کھوکھلا اور ویران محسوس ہونے لگا۔ اُس نے عمر کے لمبے لمبے بے شمار سال اس خلا کو بتوں اور مورتیوں سے پُر کرنے میں گزار دیئے تھے مگر سمرتی نے تمام بُت اور مورتیاں اٹھا کر بن گنگا میں بہا دیں۔ پنڈت پھر کھوکھلا ہوگیا۔ اُسے رقاصہ کے رُوپ میں عورت کے سارے ہی رُوپ نظر آگئے۔ تشنگی بڑھنے لگی۔ وہ سمرتی کو ہاتھ لگانے کو بے تاب ہونے لگا۔

وہ ذرا آگے بڑھا تو سمرتی کی آنکھ کھل گئی۔ اُس نے پنڈت کو کھڑے دیکھا اور انگڑائی لی۔ پنڈت نے کسی عورت کو کبھی انگڑائی لیتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اُس کے جسم نے جھرجھری لی۔ اُس پر کچھ ایسی کیفیت طاری ہونے لگی جس سے وہ ناآشنا تھا۔ اسے سرور سا محسوس ہونے لگا اور اس پر خود فراموشی طاری ہوگئی۔

"دن بہت چڑھ آیا ہے" ــ سمرتی نے کہا "آپ رات مجھے اکیلا چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے؟"

"تمہیں اکیلے ڈر آتا تھا؟"

"ڈر؟" ــ سمرتی نے ہنس کر کہا ــ "ڈر کس کا؟ ڈر ایک احساس ہوتا ہے میرے تمام احساس مر چکے ہیں۔ عورت پرائے مرد سے ڈرا کرتی ہے مگر پرائے مردوں کے ہاتھوں میں کھیلنے والی عورت کے دل سے تمام ڈر نکل جایا کرتے ہیں۔ جو لُٹ جاتے ہیں وہ باقی سفر نڈر ہو کر طے کیا کرتے ہیں۔ مجھے اب کسی رہزن کا ڈر نہیں۔"

"لیکن اطمینان اور سکون کی ایسی نیند جیسی تمہاری ہے، وہی سو سکتا ہے جس کی روح مطمئن ہو" ــ پنڈت نے کہا۔ "ایک رقاصہ کی آتما اتنی شانت نہیں ہونی چاہیے"

"میرے پاس صرف روح رہ گئی ہے۔ جسے آپ آتما کہتے ہیں" ــــ سمرتی نے کہا ــــ "میرا جسم پرایا ہوگیا ہے روح میری ہے یہ شانت ہے، مطمئن ہے"۔

"لیکن کیسے؟"

"مذہب کے مارے ہوئے لوگ نہیں سمجھ سکتے"۔ سمرتی نے کہا۔ "وہ ایک ہی رٹ لگائے رکھتے ہیں، پرارتھنا کرو، آتما شانت ہو جائے گی۔ دنیا کا لوبھ نہ ہو تو آتما شانت ہو جاتی ہے۔ منش کے ہردے میں مراری کی اچھا ہو تو آتمہ شانت ہو جاتی ہے..... یہ سب باتیں ہیں پنڈت جی مہاراج! میں نے دوسروں کے گناہوں کا بوجھ اُٹھا لیا ہے تو میری آتما شانت ہو گئی ہے"۔

یہ سمرتی کے لب و لہجہ کی بے باکی تھی یا اس کے انداز میں خود اعتمادی تھی یا اس کے سراپا میں کوئی ایسا تاثر تھا کہ پنڈت کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ سمرتی اُس پر غالب آنے لگی۔ اُس کے ذہن میں نیکی اور بدی کا، پُن اور پاپ کا، جزا اور سزا کا فلسفہ گڈمڈ ہونے لگا۔ سمرتی اُس کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس کے کندھے عریاں تھے۔ لمبوتری گردن عریاں تھی۔ اُس کے بکھرے بکھرے بال اُس کے کندھے اور گردن کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ پنڈت نے تیاگ کی اتنی لمبی عمر میں پہلی بار محسوس کیا کہ یہ کہنا آسان ہے کہ عورت ایک فتنہ ہے لیکن اس فتنے سے بچنا آسان کام نہیں۔ پنڈت کے اندر ایک کشمکش شروع ہو گئی جو اُسے پریشان کرنے لگی۔ وہ اپنے آپ سے لڑنے جھگڑنے لگا۔

"آپ چپ کیوں بیٹھے ہیں؟"۔ سمرتی نے مسکرا کر پوچھا۔ "آپ نے مجھے سارا ج انند بال سے لے لیا ہے مگر یہاں لا کر مجھے تنہا چھوڑ دیا ہے۔ رات آپ نے کہا تھا کہ آپ مجھے پاک کرنا چاہتے ہیں۔ کیا اسی لیے آپ مجھے یہاں لائے ہیں، مجھے پاک کر کے آپ کیا کریں گے؟"

پنڈت چونک کر بیدار ہو گیا اور اس کے مُنہ سے نکل گیا۔ "ہم تمہیں دیوی کے چرنوں میں قربان کریں گے"۔

پنڈت نے ایسے لہجے میں کہا جیسے یہ ایسی سعادت ہو جو کسی کسی کو نصیب ہوتی ہے۔ سمرتی کے چہرے پر کوئی تبدیلی نہ آئی نہ وہ چونکی نہ بدکی۔ اُس کی مسکراہٹ بھی نہ غائب ہوئی۔ پنڈت خود چونک اُٹھا۔ اُسے یہ راز فاش نہیں کرنا چاہیے تھا۔ جسے قربان کیا

جاتا تھا، اُسے بتایا نہیں جاتا تھا۔ اُسے نشہ آور دوائیاں پلا پلا کر اُس کے ذہن کو ماؤف کر دیا جاتا تھا اور اُس کے ذہن میں اپنی باتیں ڈال دی جاتی تھیں۔ پنڈت رادھا کشن پر سمرتی کا سحر طاری ہو گیا تھا جس کے اثر سے اُسے اپنے اوپر قابو اور اختیار نہیں رہا تھا۔

"آپ میرے جسم کی قربانی دینا چاہتے ہیں؟"۔۔۔ سمرتی نے کہا۔۔۔ "لیکن یہ جسم میرا تو نہیں۔ اگر یہ میرا ہی ہے تو یہ کبھی کا قربان ہو چکا ہے۔ روح میری ہے۔ اِس کی قربانی دوں مگر یہ آپ کے ہاتھ آئے گی نہیں..... کیا آپ نے کسی کی روح پر کبھی قبضہ کیا ہے؟ آپ کی روح پر کسی کا کبھی قبضہ ہوا ہے؟"

پنڈت اُسے احمقوں کی طرح دیکھ رہا تھا جیسے اُس کے پلے کچھ بھی نہ پڑا ہو۔

"آپ مجھے پیار سے آشنا نہیں"۔ سمرتی نے کہا۔ "میں جانتی ہوں۔ میں مندروں کے اندر کی دنیا کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ یہاں اس چیز کو اچھا سمجھتے ہیں جو نظر آ سکے اور جسے چھپایا جا سکے اسی لیے آپ لوگ اُس خدا کو نہیں مانتے جو نظر نہیں آتا۔ آپ نے نظر آنے والے خدا اپنے ہاتھوں سے بنا لیے ہیں۔ آپ جسموں کی قربانی دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ آپ نے اِن بُتوں کو خوش کر لیا ہے۔ اور اب یہ بُت آپ کی ہر مراد پوری کریں گے"۔

"تم مسلمان ہو اس لیے ایسی باتیں کر رہی ہو؟"

"میں کچھ بھی نہیں"۔ سمرتی نے کہا۔ "میرا کوئی مذہب نہیں۔ میں ایک پیاسی روح ہوں۔ روح آپ کی بھی پیاسی ہے۔ آپ کی آنکھیں بتا رہی ہیں۔ میں مردوں کی آنکھوں میں جھانک کر معلوم کر لیا کرتی ہوں کہ ان کے دلوں میں کیا ہے"۔ اُس نے اپنا ایک ہاتھ آگے بڑھا کر کہا۔ "میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیں، جھجکیں نہیں میرے قریب آجائیں"۔

پنڈت بُت بنا رہا۔ سمرتی سرک کر اُس کے قریب ہو گئی۔ سمرتی نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام کر اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ پنڈت کا جسم کانپا۔ اُس نے اپنا چہرہ سمرتی کے ہاتھوں سے آزاد کر لیا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ جب بولنے لگا تو اُس کی

زبان ہکلا رہی تھی۔

"میں تمہارے لیے کپڑے بھیج رہا ہوں"۔ پنڈت نے کہا۔ "تم نہا لو۔ کھانا بھی آ جائے گا۔"
اور وہ کمرے سے نکل گیا۔

سمرتی کی ہنسی نکل گئی۔ اُسے شعیب ارمغانی یاد آ گیا۔ اُس نے شعیب ارمغانی کو بتایا تھا کہ کالنجر کے راجہ نے اُس کی موجودگی میں راجہ اننت پال سے کہا تھا کہ میں مسلمانوں کی جو خوبصورت لڑکی دیکھتا ہوں اُسے رقاصہ یا فاحشہ بنا دیتا ہوں۔ مسلمانوں کی نسل ختم کرنے کا اور ان میں بدی پیدا کرنے کا یہی طریقہ ہے۔ ایک وقت آئے گا کہ ہند میں جو مسلمان رہ جائیں گے، ان کا پیشہ ناچ گانا اور عصمت فروشی رہ جائے گا۔"

سمرتی کو یاد آیا کہ ارمغانی نے اُسے کہا تھا کہ میں مسلمان بیٹیوں کی عصمت پر قربان ہو رہا ہوں۔ غزنی سے اتنی دُور آ کر شہید ہونے والے تم جیسی بیٹیوں اور بہنوں کی عصمت کی خاطر شہید ہوئے ہیں۔ ارمغانی نے اسے کہا تھا۔ "زندہ ہو جاؤ، اپنی روح کو پہچانو"۔

سمرتی نے اپنی روح کو پہچان لیا۔ اُسے ارمغانی یاد آیا تو اُس کے جذبات کی دنیا میں ہلچل سی بپا ہو گئی۔ اُسے ارمغانی کی باتیں یاد آنے لگیں۔ اُسے جب یہ خیال آیا کہ ارمغانی زرغہ سے نکل چکا ہوگا تو اُس نے دل میں کسک سی محسوس کی۔ ارمغانی پہلا مرد تھا جس نے اس کی پناہ اور اس کی قید میں ہوتے ہوئے بھی اسے دھتکار دیا تھا۔

اس کے اندر ایک عزم بیدار ہو گیا۔ "میں ہندوؤں کے بتوں کے قدموں میں قربان نہیں ہوں گی"۔ ۔۔۔۔ وہ فرار کے راستے سوچنے لگی۔ ایسی صورتِ حال سے وہ کبھی دوچار نہیں ہوئی تھی۔ وہ سپاہی نہیں تھی، مجاہدہ نہیں تھی۔ وہ شہزادی تھی۔ راجہ کے دل پر اس نے راج کیا تھا۔ بڑے بڑے جابر مرد اس کے آگے جھک جاتے تھے۔ فرار اس کے لیے آسان نہیں تھا لیکن فرار کا ارادہ پختہ تھا۔

وہ اٹھنے ہی لگی تھی کہ دو لڑکیاں کمرے میں داخل ہوئیں۔ ایک نے کھانا اٹھا رکھا تھا اور دوسری کے ہاتھ میں کپڑے تھے۔ وہ نوجوان لڑکیاں تھیں، خوبصورت نہیں تھیں۔ کھاتے کے دوران اُس نے لڑکیوں سے پوچھا کہ وہ مندر کے صدر دروازے سے کتنی دور

ہے۔ لڑکیوں نے اُسے بتایا کہ انہیں حکم ملا ہے کہ وہ اُس کے ساتھ کوئی فالتو بات نہ کریں۔ اُلٹا انہوں نے سمرتی سے پوچھا کہ وہ کون ہے۔

"میں نگر کوٹ کی رہنے والی ہوں"۔ سمرتی نے کہا۔ "مجھے بڑے پنڈت جی مہاراج اس مندر کے لیے لائے ہیں۔ میں یہاں ناچا اور گایا کروں گی۔"

"مہاراج نے کہا تھا کہ تمہارا بہت خیال رکھیں"۔ ایک لڑکی نے کہا۔

"مہاراج نے کسی عورت کا اتنا خیال کبھی نہیں رکھا"۔ دوسری لڑکی نے کہا۔ "وہ عورتوں کے ساتھ بات نہیں کیا کرتے لیکن تمہارے متعلق وہ ایسی باتیں کرتے تھے جیسے تم ان کی اپنی بیٹی یا بہن ہو۔"

"یہ مہاراج کی نوازش ہے"۔ سمرتی نے کہا۔ "وہ مجھے خود سارے مندر کی سیر کرائیں گے۔ میں نے ایسے ہی پوچھا تھا کہ صدر دروازہ کہاں ہے؟"

وہ اسی دروازے سے مندر میں آئی تھی۔ لڑکیوں نے اسے صدر دروازے تک کا راستہ بتایا تو وہ کچھ بھی نہ سمجھ سکی سوائے اس کے کہ وہ کسی رہبر کے بغیر صدر دروازے تک نہیں پہنچ سکے گی۔ اگر وہ صدر دروازے سے نکل بھی جائے تو مندر کے اردگرد قلعہ تھا۔ اس نے لڑکیوں سے بہت کچھ پوچھا۔ انہوں نے کچھ اُسے بتایا، کچھ نہ بتایا۔ پنڈت کے متعلق اسے بتایا گیا کہ عورت کے نام سے بھی بدکتا ہے۔

لڑکیوں کو معلوم نہیں تھا کہ اس رقاصہ کو قربانی کے لیے تیار کیا جا رہا ہے۔ انہوں نے اسے نہلایا اور وہ کپڑے پہنائے جو وہ لائی تھیں۔ یہ ساڑھی کی طرح کی ایک سفید چادر تھی جو سر کی اوڑھنی کے طور پر بھی استعمال ہو سکتی تھی۔ سمرتی کے ماتھے پر تلک لگایا گیا اور لڑکیاں چلی گئیں۔

پنڈت رادھا کشن کے کمرے میں دو پنڈت اُس کے پاس بیٹھے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ سمرتی کو قربانی کے لیے لایا گیا ہے۔ اسے قربانی کے لیے تیار کرنا انہی کا کام تھا۔ وہ اپنا عمل شروع کرنا چاہتے تھے۔ کچھ عرصہ پہلے اس علاقے میں قحط آ گیا تھا۔ انوکھی بات تھی کیونکہ پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے یہاں بارش بہت ہوتی تھی مگر اُس سال بارش نہ ہوئی۔ مویشی اور انسان بھوک سے مرنے لگے۔ پنڈت رادھا کشن کے کہنے

WWW.PAKSOCIETY.COM

پر ایک لڑکی کی قربانی دی گئی تھی۔ پندرہ سولہ روز مندر کے اسی کمرے میں جہاں سمرتی کو رکھا گیا تھا، اس لڑکی کو بھی رکھ کر اُسے قربانی کے لیے تیار کیا گیا تھا۔

"وہ کنواری کنیا تھی" — پنڈت رادھاکشن نے سمرتی کے متعلق باتیں کرتے ہوئے پنڈتوں سے کہا "یہ کنواری نہیں راج دربار کی رنگی ہے۔ کنواری ہو تو بھی سمرتی کو پہلے پوتر کرنا پڑے گا۔ قربانی اسی کی دی جائے گی لیکن بہت دن انتظار کرنا پڑے گا۔ یہ مسلمان ہے۔ اسے ذہنی طور پر پوجا پاٹ پر آمادہ کرنا ہے۔ اس کے بعد اسے قربانی کے لیے تیار کیا جائے گا۔"

"آپ جانتے ہیں مہاراج، فوجیں کوچ کر گئی ہیں؟" — ایک پنڈت نے کہا — "قربانی لڑائی شروع ہونے سے پہلے ہو جانی چاہیے۔"

پنڈت رادھاکشن نے کہا — "فوجوں کو میدانِ جنگ تک پہنچتے بہت دن لگیں گے جتنی فوج گئی ہے اس کے مقابلے میں محمود غزنوی کی فوج ہاتھی کے مقابلے میں بلی جیسی ہے۔ اسے کچل کر ہماری فوجیں غزنی کی طرف نکل جائیں گی۔ ان دنوں میں مہینوں سے زیادہ عرصہ گزر جائے گا۔ وہ وقت ہوگا جب ہم قربانی دیں گے۔ اُس وقت تک یہ لڑکی اس قابل ہو جائے گی کہ خود دیوی کے چرنوں میں بیٹھ کر کہے گی کہ میری گردن کاٹ دو۔"

دونوں پنڈت قائل نہیں ہو رہے تھے لیکن پنڈت رادھاکشن قربانی کو ملتوی کرنے کا تہیہ کر چکا تھا۔ اُس نے آخر حکم کے لہجے میں فیصلہ دیا کہ اس عورت کی قربانی کے متعلق وہ کسی کی بات نہیں سنے گا چونکہ یہ انتخاب اس کا اپنا ہے اور چونکہ اس نے یہ انتخاب دیوتاؤں کے اشارے پر کیا ہے اس لیے وہی بہتر جانتا ہے کہ قربانی کب دی جائے گی۔

پنڈت جب اٹھ کر چلے گئے تو پنڈت رادھاکشن گہری سوچ میں کھو گیا۔

سمرتی حیران تھی کہ تین دن اور تین راتیں گزر گئی ہیں، اُس کے کمرے میں پنڈت رادھاکشن نہیں آیا۔ دو لڑکیاں اُس کے لیے کھانا لاتی رہیں اور اُس کی ہر ضرورت پوری کرتی رہیں۔ اُس نے انہیں کہا کہ وہ پنڈت جی مہاراج کو بھیجیں۔ پنڈت پھر بھی نہ آیا۔ سمرتی

کو جیسے کوئی غم ہی نہیں تھا کہ اُسے ذبح کر دیا جائے گا۔ اُسے افسوس صرف یہ ہو رہا تھا کہ اُسے ہندوؤں نے بے مذہب کیا اور رقاصہ بنایا اور وہ ہندوؤں کی ہی فتح کے لیے قربان کی جا رہی تھی۔ اُسے پورا یقین تھا کہ مٹی اور پتھر کے بُت خدا نہیں ہیں اور فتح اور شکست اِن کے ہاتھ میں ہو ہی نہیں سکتی — اور جو سچا اور واحد خدا ہے، اُس کے حکم کے مطابق انسانی جان کی قربانی بے گناہ کا قتل ہے۔ اور یہ جھوٹے مذہب کی رسم ہے۔

اُسے یاد تھا کہ چند سال پہلے لاہور میں راجہ جے پال کی فتح کے لئے ایک لڑکی کی قربانی دی گئی تھی۔ راجہ ایسی شرمناک شکست کھا کر واپس آیا تھا کہ اُس نے چتا پر کھڑے ہو کر اپنے ہاتھوں چتا کو آگ لگائی اور اپنے آپ کو جلا ڈالا تھا۔

سمرتی مرنے سے نہیں ڈرتی تھی لیکن وہ ہندوؤں کے بت کے قدموں میں نہیں مرنا چاہتی تھی۔ شعیب ارمغانی نے اُس کی روح کو بیدار کر دیا تھا، مگر وہاں سے فرار ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ وہ ہر لمحہ یہ خطرہ محسوس کرتی تھی کہ کوئی آئے گا اور اُسے گھسیٹ کر بت کے سامنے لے جائے گا اور اُس کی گردن پر چھری پھیر دی جائے گی۔ اُس نے سُن رکھا تھا کہ پنڈت لوگ عورت کے معاملے میں پاکباز نہیں ہوتے، لیکن لڑکیوں نے اُسے بتایا تھا کہ پنڈت رادھاکشن پاکباز ہے اور رشی ہے۔ ہر کسی کی زبان پر تھا کہ پنڈت رادھاکشن برہم چاری ہے۔

اُسے یاد آیا کہ پہلی رات جب اُسے یہاں لایا گیا تھا تو اُسے شک ہوا تھا کہ پنڈت اُسے اپنے لیے لایا ہے۔ اُس نے اس شک کا اظہار کیا تو پنڈت نے کہا تھا — "ہمیں تمہارا جسم ضرور اچھا لگا ہے مگر تم غلط سمجھ رہی ہو۔ ہماری زندگی عورت سے ہمیشہ خالی رہی ہے اور خالی ہی رہے گی۔ ہم تو عورت کو قریب سے دیکھنا بھی گناہ سمجھتے ہیں۔"

سمرتی کو یہ بھی خیال آیا تھا کہ اُس نے پنڈت کی آنکھوں میں بے چینی سی دیکھی ہے۔ وہ مردوں کی نظروں کو خوب پہچانتی تھی۔ اُسے اپنے حسن کے طلسم کا بھی احساس تھا۔ اُس نے سوچنا شروع کر دیا اور فرار کا ایک راستہ اُسے نظر آ گیا۔ اُس نے اپنے حسن اور

نسوانیت کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کا ارادہ کر لیا۔ یہی ایک ذریعہ تھا جس سے وہ پتھر کو موم کر سکتی تھی۔

چوتھی رات کا پہلا پہر تھا جب پنڈت رادھا کشن اُس کے کمرے میں آیا۔ کمرے میں دو دیئے جل رہے تھے۔ سمرتی کمرے میں ٹہل رہی تھی۔ پنڈت نے اُسے دیکھا تو ٹھٹھک کے رُک گیا۔ اُس نے سمرتی کو رقص کے لباس میں دیکھا تھا جو زرق برق تھا۔ اس میں سے اُس کے کندھے، گردن، سینے اور پیٹھ کے بالائی حصے عریاں تھے۔ اس کے چہرے پر مصنوعی رنگ اور آنکھوں میں کاجل تھی۔ اس کے بالوں کا سنگھار بھی کچھ اور تھا۔ اور اس حلیے میں بے حیائی تھی۔ مگر اب پنڈت اُسے سفید ساڑھی میں قدرتی رنگ میں دیکھ رہا تھا۔ اُس کا چہرہ اور کہنیوں تک بازو ننگے تھے۔ اُس کے چہرے سے مصنوعی رنگ اور کاجل دُھل گئی تھی۔ اُس کے بال دُھل کر نکھر آئے تھے اور اُس کے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ نیم عریانی میں اتنی حسین نہیں لگتی تھی جتنی مستور ہو کر لگی۔ اُس کے چہرے پر معصومیت تھی۔

''آپ مجھے بھول گئے تھے مہاراج!''___ سمرتی نے پنڈت کے قریب آ کر کہا___

کہتے ہیں جانور کو ذبح کرنے سے پہلے پانی پلایا کرتے ہیں۔ آپ مجھے پانی نہ پلائیں، ذبح کرنے سے پہلے میری روح کی پیاس بجھا دیں، ورنہ میری روح اِس مندر میں بھٹکتی رہے گی۔ نہ چین لے گی نہ آپ کو چین لینے دے گی۔''

اُس نے پنڈت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ بات کہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں خمار بھی تھا، وہ تاثر بھی تھا جو وہ کسی کو اپنے اثر میں لانے کے لیے اپنی آنکھوں میں اور اپنے چہرے پر پیدا کر لیا کرتی تھی۔ پنڈت نے محسوس کیا جیسے اُس کا جسم اندر سے لرزا ہو۔ اُسے اُس سمرتی سے نفرت ہو سکتی تھی جو رقاصہ کے لباس اور حلیے میں تھی۔ اُس حلیے میں اُس کے جسم سے گناہوں کی بو آتی تھی۔ اب اُس سادگی نے جبکہ اُس کے ماتھے پر تلک لگا ہوا تھا، وہ پاک لگ رہی تھی، اور پنڈت مسحور ہو گیا تھا۔

سمرتی نے اُسے بیٹھنے کو کہا مگر وہ سر جھکا کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ سمرتی خاموش تھی۔ پنڈت رُکا۔ اُس نے سمرتی کو دیکھا اور یوں سر جھکا لیا جیسے اُس کا سامنا کرنے

سے گھبرا گیا ہو۔ وہ چند قدم چل کر رُکا اور سمرتی کو اپنے قریب بلایا۔

''میں جانتا ہوں تم پیار کی پیاسی ہو''___ پنڈت نے کہا___ ''تمہیں کس کا پیار چاہئے؟...... باپ کا؟ بھائی کا؟...... بیٹے کا؟...... یا تم......؟''

''کیا آپ نہیں جانتے کہ روح کس کے پیار کی پیاسی ہے؟''___ سمرتی نے پوچھا___ ''آپ کے پاس کون سا پیار ہے؟''

پنڈت کے چہرے کا تاثر بدلنے لگا۔ اُس کی آنکھیں بے چین ہو گئیں۔ سمرتی نے ہاتھ اُس کے کندھے پر رکھ دیئے اور اُس کے اتنی قریب ہو گئی کہ اُس کا سینہ پنڈت کے سینے کو چھونے لگا۔ سمرتی کے بازو اُس کی گردن کے گرد لپٹ گئے۔ اُس نے مخمور سی سرگوشی کی ___ ''وہ پیار جس کا جسم کے ساتھ کوئی تعلق نہ ہو، جس میں گناہ کی بو نہ ہو...... ہے آپ کے پاس ایسا پیار؟''___ اُس کی سانسیں پنڈت کی سانسوں سے ٹکرانے لگیں۔ پنڈت اُس کے طلسم میں گرفتار ہو گیا۔

''گھبرائیں نہیں رشی!''___ سمرتی نے کہا___ ''آپ جس عورت سے بھاگتے ہیں وہ صرف جسم ہوتا ہے، وہ چلتا پھرتا بت ہوتا ہے۔ میں جسم نہیں ہوں۔ یہ جسم میرا نہیں۔ میں اسے تیاگ چکی ہوں۔ آپ کو اپنی روح دے رہی ہوں، اپنی آتما دے رہی ہوں۔ اس سے نہ ڈریں، اس سے نہ بھاگیں۔''

پنڈت پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ اُس کی آنکھوں کو جیسے سمرتی کی جادو بھری آنکھوں نے نظر نہ آنے والی زنجیروں میں جکڑ لیا تھا۔ سمرتی کے بازو اُس کے گرد لپٹ گئے تھے۔

"کیا آپ اپنے اندر کوئی تنگی سی محسوس نہیں کر رہے ؟"

"میں جل رہا ہوں لڑکی!"۔۔۔ پنڈت نے پریشان ہو کر کہا۔ "مجھے اور نہ جلاؤ۔"

سمرتی نے اُس کی باتوں میں یہ تبدیلی دیکھی کہ وہ پہلے اپنے آپ کو ہم کہتا تھا اب میں کہہ رہا تھا۔

"مجھے ذبح کرنے سے پہلے اس پیار کا ذائقہ چکھ لیں"۔۔۔ سمرتی نے کہا۔۔۔ "میرا جسم ذبح ہو جائے گا، آپ کی رُوح قتل ہو جائے گی"۔

پنڈت اُٹھ گیا تھا۔ سوچ میں کھو گیا تھا۔ کبھی سمرتی کو دیکھتا کبھی سر جُھکا کر ٹہلنے لگتا۔

"مجھے کس روز قربان کیا جائے گا؟"۔۔۔ سمرتی نے پوچھا۔

پنڈت چونک کر رُک گیا اور اس طرح بولا جیسے اُس کی زبان سے الفاظ پھسل گئے ہوں۔۔۔ "ابھی نہیں۔ ابھی نہیں"۔

"آج نہیں تو کل"۔۔۔ سمرتی نے کہا۔

پنڈت نے آہ لی اور سرگوشی میں بولا۔۔۔ "کل بہت دنوں بعد آئے گی۔ کون جانے کل کیا ہوگا"۔

وہ تیزی سے گھوما اور کمرے سے نکل گیا۔ سمرتی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ وہ دروازے کو دیکھتی رہی جس میں سے پنڈت نکل گیا تھا لیکن اُس کی نظریں اُس کمرے تک نہ پہنچ سکیں جس میں پنڈت رہتا تھا۔ وہ اُس کمرے میں چلا گیا تھا۔ اُس نے دروازہ بند کر لیا اور بہت سے ہاتھوں والی دیوی کی مورتی کے سامنے بیٹھ گیا۔

دیوی مسکرا رہی تھی۔ وہ جب سے بنی تھی مسکرا رہی تھی۔ پنڈت نے پہلی بار اُس کی مسکراہٹ کو غور سے دیکھا۔ اُس کے سینے میں ایسی بے قراری تھی جسے وہ سمجھ نہیں سکتا تھا۔ اُس کا آخری سہارا یہ مورتی اور بھجن تھے۔ وہ بھجنوں کی زبان میں اپنے دُکھ سُکھ اسی کے آگے بیان کیا کرتا تھا مگر آج اُسے پتہ نہیں چل رہا تھا کہ اُس کے جسم میں یہ بے قراری کیسے آ گئی ہے۔

اُس نے مورتی کی مسکراہٹ دیکھی اور وہ بھجن گنگناتے گنگناتے اس مسکراہٹ

میں کھو گیا۔ وہ تو اس دیوی کے آگے یہ پرارتھنا لے کے آن گرا تھا کہ اُس کی بے چینی کو قرار آ جائے مگر اس کی عبادت اور دُعا میں وہ یکسوئی نہیں تھی جو ہمیشہ ہُوا کرتی تھی۔ اُسے مورتی کی مسکراہٹ بڑی اچھی لگ رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ سمرتی کا چہرہ بن گیا اور مورتی کی مسکراہٹ سمرتی کا تبسم بن گیا۔ پنڈت اُسے دیکھتا رہا۔ اُس کی زبان سے بھجن عادت کے مطابق پھسلتے رہے جیسے ندی آہستہ آہستہ بہتی جا رہی ہو۔

ستمبر ۱۰۰۸ء (۳۹۹ ہجری) کے دن تھے ہندوؤں کی فوج سیلاب کی طرح پشاور کی طرف بڑھی جا رہی تھی۔ رفتار تیز نہیں کی جا سکتی تھی۔ یہ مختلف ریاستوں کی فوجیں تھیں۔ کالنجر کی فوج حضرو کے مقام پر خیمہ زن ہو چکی تھی۔ لاہور سے جو فوجیں چلی تھیں ان میں انند پال کی فوج کے علاوہ اوجین، گوالیار اور قنوج کی فوجیں تھیں۔ ان میں سے بعض کے دستے ابھی آ رہے تھے۔ جب کسی دستے کی آمد کی اطلاع ملتی تھی پوری فوج رُک جاتی تھی۔ ان تمام افواج کی کمان راجہ انند پال کے بیٹے برہمن پال کو دی گئی تھی۔ وہ پوری فوج کو یکجا کر کے آگے بڑھنا بہتر سمجھتا تھا۔

رفتار سست ہونے کی دوسری وجہ دریا تھے جو چڑھے ہوئے تھے۔ فوجیں تو دریا پار کر لیتی تھیں، رسد کی بیل گاڑیاں اور اُن کے مویشیوں کو دریا پار کرانا خاصا دشوار تھا۔ اس متحدہ فوج کی تعداد کسی بھی مورخ نے نہیں لکھی۔ اتنا ہی پتہ چلتا ہے کہ تعداد لاکھوں میں تھی۔ اس کے مقابلے میں پشاور میں سلطان محمود غزنوی کے پاس جو فوج تھی، وہ ہزاروں میں تھی۔ ایک لاکھ بھی نہیں بنتی تھی۔ ہندوؤں کی اتنی زیادہ فوج کو سیلابی دریا پار کرتے کئی دن لگ رہے تھے۔ چھوٹی بڑی ندیاں بھی تھیں۔

رفتار سست ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ سارے ملک میں مندروں کے ذریعے پروپیگنڈہ کیا گیا تھا کہ مسلمانوں کی فوج سارے ہند کو فتح کرنے کیلئے آ رہی ہے اور یہ فوج مندروں کو مسمار کر کے مسجدیں تعمیر کرے گی، جوان لڑکیوں کو اُٹھا لے جائے گی اور تمام ہندوؤں کو مسلمان کر لے گی۔ مسلمانوں کے خلاف ایسا خوفناک پروپیگنڈہ کیا گیا تھا کہ متحدہ فوج کے راستے میں لوگ آ جاتے اور فوج کو روک لیتے تھے۔ وہ نقدی اور زیورات

پیش کرتے اور اناج اور جانوروں کے لئے دانا چارہ بھی دیتے اور جو جوان آدمی تیغ زنی اور گھوڑ سواری کی سوجھ بوجھ رکھتے تھے، وہ فوج میں شامل ہو جاتے تھے۔ ہندوؤں پر مذہب کے حوالے سے اسلام دشمنی کا جنون طاری کر دیا گیا تھا۔

اس طرح یہ فوج تعداد اور رسد کے لحاظ سے بڑھتی اور پھولتی جا رہی تھی۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ ہندوستان نے ایک ہی محاذ پر اتنی زیادہ فوج نہ کبھی دیکھی تھی نہ تاریخ نے اس کے بعد کسی بھی دور میں دکھائی۔ تعداد، اتحاد اور ساز و سامان کے لحاظ سے یہ فوج تمام تر عالم اسلام کو تہ تیغ کرنے کا دعویٰ کر سکتی تھی۔ ہندوستان نے تو اس کے بعد اسلام کے خلاف اتنی بڑی فوج نہ دیکھی، البتہ صلیبی سلام کے خلاف اس سے بھی زیادہ فوج سلطان صلاح الدین ایوبی کے مقابلے میں لائے تھے۔ اس کے بعد سلطان ایوبی کے پوتے الکمال کو شکست دینے کے لئے صلیبی یورپ کے نو ملکوں کی افواج لائے تھے۔

ہندوؤں کی متحدہ افواج بڑھی چلی جا رہی تھیں۔ فوجیوں پر اور شہریوں پر یہی ایک دیوانگی طاری تھی "مسلمانوں کو کچل دو۔ اسلام کو ختم کر دو" — اور لوگ اپنا سب کچھ اپنی فوج پر نچھاور کر رہے تھے۔ سلطان محمود غزنوی کو پشاور میں اطلاعیں مل رہی تھیں کہ یہ لشکر کہاں تک پہنچا ہے اور وہاں تک اس کی تعداد میں کتنا اضافہ ہو چکا ہے۔ اس لئے اپنے سالاروں سے کہہ دیا تھا کہ دشمن کو دریا پار نہیں کرنے دیا جائے گا۔ اور لڑائی دریا کے پار لڑی جائے گی۔ سالاروں نے اس خطرے کا اظہار کیا تھا کہ دشمن کی تعداد خوفناک حد تک زیادہ ہے، اس لیے دریا کو اپنی پیٹھ پیچھے رکھ کر نہ لڑا جائے۔ ضرورت کے مطابق پسپائی بڑی تباہ کن ثابت ہوگی۔

سلطان محمود غزنوی نے انہیں بتایا تھا کہ انہیں گھوم پھر کر لڑنا پڑے گا۔ اس کے لیے کھلے میدان کی ضرورت ہے جو دریا کے پار ہے۔ دریا کے پشاور والے کنارے سے آگے علاقہ پہاڑی ہے جہاں چھاپہ مار جنگ نہیں لڑی جا سکے گی۔ دشمن کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ وہ کوئی ایک دستہ مروا کر بھی پشاور تک پہنچ جائے گا۔ اگر اس نے ہمیں پیچھے دھکیل دیا تو ہم محفوظہ سے اس کے لئے دریا پار کرنا محال کر دیں گے۔

سلطان محمود غزنوی کو اپنی فوج کے جذبے، اپنے ایمان اور اپنے خدا پر بھروسہ تھا۔ اُس نے اپنی فوج کے کچھ آدمی ماہی گیروں اور مزدوروں کے بھیس میں دریائے سندھ کے کناروں پر بھیج دیئے اور کچھ چھاپہ مار جعفر دیکھے۔ اُن کے ذمے یہ کام تھا کہ اس فوج کی نقل و حرکت پر نظر رکھیں اور اگر یہ فوج کوچ کر کے دریا کے قریب آ جائے اور کشتیوں کا پُل بنائے تو پُل کے رسّے کاٹ دیئے جائیں اور اگر ممکن ہو سکے تو کشتیوں میں سوراخ کر دیئے جائیں۔

سلطان محمود غزنوی نے اپنی فوج کو کوچ کا حکم دے دیا اور دریائے سندھ کے کنارے پر آ گیا۔ اُس نے فوج کو چار حصوں میں تقسیم کیا۔ دو حصوں کو دریا کے پار موجودہ اٹک کے شمال میں پہنچا دیا۔ دو حصوں کو دریا کے دوسرے کنارے پر رکھا۔ کشتیوں کا مضبوط پل بنا دیا گیا۔ دریا کے پشاور والے کنارے پر فوج کے جو دو حصے تھے، ان میں سے ایک سوار دستوں پر مشتمل تھا۔ اُسے دریا کے کنارے پر چوکس ہو کر گھومتے پھرتے رہنا تھا تاکہ دشمن کسی طرف سے دریا پار کرنے کی کوشش کرے تو اسے روک لیں۔ یہ گھوڑ سوار تیر انداز تھے۔ دوسرا حصہ محفوظہ کا تھا۔

اور پھر سلطان کو اطلاع ملی کہ دشمن دریا سے پندرہ میل دور رہ گیا ہے۔ یہ اس فوج کا آخری پڑاؤ تھا۔ سلطان تھوڑا سا وقت اور حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ اُسے کسی طرف سے کمک کی توقع تھی۔ اُس نے ترکستان اور نیمروز سے جو دستے منگوائے تھے، وہ اُس کے پاس آ گئے تھے۔ اُسے مزید وقت کی ضرورت اس لئے تھی کہ سردیوں کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ سلطان محمود کی خواہش یہ تھی کہ جنگ سردی کے عروج کے وقت شروع ہو۔ اس کی فوج کے سپاہی یخ خنکی میں لڑ سکتے تھے۔ اُسے معلوم تھا کہ قنوج اور گوالیار وغیرہ کی فوج سردی میں نہیں لڑ سکے گی۔

مہینے سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا۔ سمرتی کا کمرہ شہزادی کا کمرہ بن چکا تھا۔ پنڈت رادھا کشن اُس کے پاس آتا اور باتیں کرتا رہتا تھا۔ اگر کوئی اُسے اِس کمرے میں دیکھتا تو یقین نہ کرتا کہ یہ اُن کا پنڈت رادھا کشن ہے۔ وہ سمرتی کی عمر کا آدمی معلوم ہوتا

تھا۔ اُس نے سمرتی کے کمرے میں گدے رکھوا دیئے اور ان پر ریشمی پلنگ پوش بچھا دیئے تھے مٹی کے دیئے کی جگہ فانوس لگوا دیئے تھے اور لڑکیاں ہر صبح کمرے میں تازہ پھول رکھ جاتی تھیں۔

دوسرے پنڈتوں کا خیال تھا کہ اُن کا بڑا پنڈت سمرتی کو قربانی کے لیے تیار کر رہا ہے۔ پنڈت رادھا کشن انہیں بتایا بھی یہی کرتا تھا کہ سمرتی قربانی کے لیے تیار ہے لیکن سمرتی کے پاس جا کر وہ بھول جایا کرتا تھا کہ اُسے قربانی کے لیے پاک اور تیار کرتا ہے۔ صرف سمرتی تھی جسے یقین تھا کہ اُسے قربانی کے لیے تیار کیا جا رہا ہے۔ پنڈت نے اُس کے جسم کو کبھی ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ البتہ اُس کے ہونٹ جو ہمیشہ سے مسکراہٹ سے محروم تھے، اب مسکرانے لگے تھے۔ سمرتی کی بعض باتوں سے وہ ہنس بھی پڑتا تھا۔ سمرتی نے اُسے کئی بار کہا کہ وہ اُسے ابھی ذبح کر دے کیونکہ موت کا انتظار اذیّت ناک ہے۔ یہ سن کر ہر بار پنڈت کا چہرہ اداس ہو جایا کرتا تھا۔

وہ پنڈت جو سمجھتا تھا کہ اُس نے اپنے آپ کو عورت سے محروم کر کے دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل کر لی ہے، اب اُس کی حالت یہ تھی کہ وہ جیسے دیوتاؤں کو ناراض کر کے سمرتی کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس نے اپنی زندگی میں جو خلا پیدا کر لیا تھا، وہ سمرتی سے پُر ہونے لگا تھا۔ پیاسے کو پانی مل گیا تو اُسے محسوس ہُوا کہ وہ پیاس سے جل رہا تھا۔ اُس نے سمرتی کو کبھی بیٹی کے روپ میں دیکھا، کبھی بہن کے روپ میں اور کبھی اُسے اپنی ماں سمجھا۔ اس مندر میں سمرتی سے زیادہ خوبصورت لڑکیاں آیا کرتی تھیں۔ پنڈت نے ان کے ساتھ کبھی بات نہیں کی تھی۔ انہیں دیکھ کر وہ نگاہیں پھیر لیا کرتا تھا۔ سمرتی پہلی لڑکی تھی جس کی اُس نے باتیں سنیں اور جو اُس کی مرضی کے بغیر اُس کے سینے سے لگ گئی تھی۔ اس قرب نے اور اس لمس نے پنڈت کے اندر وہ تشنگی بیدار کر دی جسے وہ اپنی عظمت کی علامت سمجھا کرتا تھا۔

”کیا تمہاری آتما اب بھی اُس پیار کی پیاسی ہے جو تم نے مجھ سے مانگا تھا؟“ —— ایک روز اُس نے سمرتی سے پوچھا۔

”آپ پہلے مرد ہیں جس نے مجھے اتنی راتیں اپنے پاس رکھا لیکن اس طرح رکھا جیسے میں آپ کے پاس نہیں ہوں“ —— سمرتی نے کہا۔ ”آپ نے میرے جسم کے ساتھ کبھی کا اظہار نہیں کیا۔ میری آتما اسی میں شانت ہو گئی ہے ..... کیا میں اب دیوتاؤں کے چرنوں میں قربان ہونے کے لیے تیار ہو گئی ہوں؟“

”ابھی نہیں“ —— پنڈت رادھا کشن نے اداس سے لہجے میں کہا۔

”کیا میں ابھی تک ناپاک ہوں؟“

پنڈت اُسے دیکھتا رہا۔ دیکھتے دیکھتے اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ سمرتی آگے بڑھی اور اُس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ ساڑھی کے پلو سے اُس کے آنسو پونچھ ڈالے.. وہ اُس پر جھکی ہوئی تھی۔ اُس کے کھلے ہوئے نرم و ملائم بال پنڈت کے چہرے پر جا پڑے۔ پنڈت نے ایک ہاتھ اُٹھایا۔ ہاتھ کانپ رہا تھا۔ سمرتی کا ایک گال پنڈت کے سر پر تھا۔ پنڈت کا کانپتا ہوا ہاتھ سمرتی کے بکھرے بالوں تک گیا اور اس نے اپنی آنکھوں پر رکھ لیا۔

اچانک وہ اُٹھ کھڑا ہُوا۔ سمرتی گھبرا گئی۔ پنڈت نے اُسے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھا جیسے اُسے خواب سے بیدار کر دیا گیا ہو۔ وہ سمرتی کو جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا، جیسے وہ اُس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ میرا ہاتھ کس نے اُٹھا کر تمہارے بالوں پر رکھ دیا تھا؟

قلعے کے دروازے کا گھڑیال بجنے لگا۔ پنڈت رادھا کشن پوری طرح اپنے آپ میں آ گیا۔ یہ گھڑیال اُس وقت بجا کرتا تھا جب کوئی راجہ مہاراجہ آیا کرتا تھا۔ پنڈت قلعے کے دروازے پر جا کر اُس کا استقبال کیا کرتا تھا۔ اُس نے سمرتی سے کہا کہ کوئی مہمان آیا ہے، اور وہ کمرے سے نکل گیا۔

راجہ انند پال کی بیوی آئی تھی۔ یہ انند پال کے دوسرے بیٹے برہمن پال کی ماں تھی۔ متحدہ افواج کی کمان اسی برہمن پال کو دی گئی تھی، حالانکہ انند پال خود ساتھ تھا۔ اُس نے برہمن پال کی ماں کو بتایا تھا کہ راج محل کی سب سے اعلیٰ رقاصہ کو نگرکوٹ کے پنڈت نے انسانی قربانی کے منتخب کر لیا ہے اور اُس نے یقین دلایا ہے کہ

فتح برہمن پال کی ہوگی۔

اس سے پہلے راجا انندپال کی دوسری بیوی نے اپنے بیٹے سکھ پال کو جو مسلمان ہوگیا تھا، سلطان کے خلاف اس اُمید پر باغی کیا تھا کہ وہ بھیرہ کو فتح کرکے سلطان محمود غزنوی کو قیدی بنالائے گا اور باپ کی گدی کا جانشین بنے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سکھ پال بھیرہ میں سلطان کا قیدی بن گیا اور سلطان نے اُسے عمر بھر کے لیے قید میں ڈال دیا تھا۔ اب انندپال کی دوسری بیوی کو ایسی ہی توقع تھی کہ اُس کا بیٹا پشاور کو فتح کرکے غزنی کو بھی تہ تیغ کرے گا اور اپنے باپ کی جگہ راج کرے گا۔ وہ بیٹے کی فتح کے لیے بے تاب تھی۔ وہ نگرکوٹ یہ معلوم کرنے آئی تھی کہ سمرتی کی قربانی دی جاچکی ہے یا نہیں۔

پنڈت رادھاکشن نے اُسے بتایا کہ چونکہ سمرتی رقاصہ رہی ہے اور وہ مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوئی تھی، اس لیے اُسے پاک کرتے بہت دن لگ گئے ہیں۔ برہمن پال کی ماں نے اُسے کہا کہ اس سے پہلے بھی جوان لڑکیوں کی قربانی دی جاچکی ہے، کسی پر اتنا زیادہ عرصہ صرف نہیں کیا گیا۔ اُس نے اصرار شروع کردیا کہ سمرتی کی قربانی جلدی دی جائے کیونکہ فوجیں میدانِ جنگ کے قریب پہنچ گئی ہیں۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ اُسے بتایا گیا ہے کہ لڑکی کو ابھی بن گنگا تک بھی نہیں لے جایا گیا۔

پنڈت رادھاکشن کی حیثیت راجوں مہاراجوں سے بہت اونچی تھی اور اُسے بھگوان کا ایلچی سمجھا جاتا تھا لیکن انندپال کی بیوی نے ایسے شک کا اظہار کردیا جس سے پنڈت کی حیثیت ذرا چھوٹی رہ گئی۔ اُس نے کہا ”سمرتی کے حسن اور اُس کے جسم میں ایسی کشش ہے کہ جو اسے دیکھتا ہے دیکھتا ہی رہ جاتا ہے۔ مجھے شک ہو رہا ہے کہ اس کا یہی جادو نگرکوٹ کے مندر پر بھی چل گیا ہے۔ میں اس کی قربانی تک یہیں رہوں گی“۔

پنڈت رادھاکشن نے کچھ بھی نہ کہا۔ شک غلط نہیں تھا۔ اُس نے کہا کہ وہ کل صبح لڑکی کو بن گنگا لے جارہا ہے۔ یہیں ایک کام رہ گیا تھا جو کل ہوجائے گا اور اس سے اگلے

روز سمرتی کو قربان کردیا جائے گا۔

راجا انندپال کی بیوی شاہی مہمان خانے میں چلی گئی۔ پنڈت رادھاکشن سمرتی کے کمرے میں چلا گیا۔ سمرتی نے مسکرا کر اُس کا استقبال کیا۔ پنڈت کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ وہ سمرتی کو دیکھتا رہا۔ جب سمرتی نے اُس سے پریشانی اور خاموشی کی وجہ پوچھی تو پنڈت نے کہا۔ ”میں صبح اتنی جلدی آؤں گا جب ابھی اندھیرا ہوگا۔ ہم دونوں بن گنگا چلیں گے“۔ اور وہ کمرے سے نکل گیا۔

قافلے میں دو اونٹ تھے اور تین گھوڑے۔ ایک اونٹ پر ایک جوان لڑکی اور دوسرے پر ایک ادھیڑ عمر عورت سوار تھی۔ گھوڑوں پر مرد سوار تھے۔ وہ ہندو معلوم ہوتے تھے۔ اُن کا حلیہ اور اُن کا لباس ہندوؤں جیسا تھا۔ ایک کتا بھی اُن کے ساتھ تھا۔ اُس زمانے میں قافلوں کے ساتھ رکھوالی والے کتے لازمی سمجھے جاتے تھے۔ یہ قافلہ لاہور سے چلا تھا اور اُس کی منزل نگرکوٹ تھی۔ راستے میں ان سے جس کسی نے پوچھا انہوں نے یہی بتایا کہ وہ پوجاپاٹ کے لیے نگرکوٹ کے مندر میں جارہے ہیں۔ اب یہ قافلہ نگرکوٹ کے قریب پہنچ گیا تھا۔ اس علاقے میں آکر وہ لوگوں کو بتاتے تھے کہ وہ نگرکوٹ کے پجاری رادھاکشن کے درشن کرنے اور پاؤں چھونے جارہے ہیں۔ نگرکوٹ کے ارد گرد کے تمام لوگ پنڈت رادھاکشن کو اوتار مانتے تھے۔

اس قافلے نے نگرکوٹ سے تھوڑی ہی دور آخری پڑاؤ کیا۔ رات وہ آگ جلا کر اس کے ارد گرد بیٹھے تو ان میں سے ایک آدمی نے کہا کہ مندر میں داخل ہوگئے اور اگر کسی کو ہم پر شک نہ ہوا تو یہ بھی معلوم ہوجائے گا کہ سمرتی کہاں ہے۔ اگر وہ قربان ہوچکی ہے تو میں اس مندر کے تمام پنڈتوں کو قتل کرکے یہاں سے نکلوں گا۔

یہ شعیب ارسلانی تھا جو ہندوؤں کے مذہب سے، ان کے رسم و رواج اور ہندوؤں کی زبان اور اصطلاحوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ اُس نے لاہور سے اپنے دو ساتھی ساتھ لے لیے تھے۔ زہرہ سمرتی کے گھر میں آگئی تھی۔ سمرتی کی خادمہ ساتھ

چلنے کو پہلے ہی تیار تھی شعیب ارمغانی اور اُس کے ساتھیوں نے سر منڈوا کر ہندوؤں کی طرح سر کی چوٹیوں پر بودیاں رکھ لی تھیں۔ داڑھیاں صاف کرا کے مونچھیں اس طرح بڑھالی تھیں کہ ہونٹوں پر چھجوں کی طرح پڑی رہتی تھیں۔ خادمہ اور زروڈ کو بھی انہوں نے ہندوؤں کے حلیے میں چھپالیا تھا۔ اُن دونوں کے چہرے چھپانے کا نہایت آسان اور کامیاب طریقہ یہ تھا کہ دونوں نے گھونگھٹ لٹکا لیے تھے۔ یہ ہندوؤں کا رواج تھا۔

اونٹوں اور گھوڑوں کا انتظام شعیب کے ساتھیوں نے کیا تھا۔ خواہش خادمہ کی تھی کہ وہ کُتے کو ساتھ لے چلیں کیونکہ پیچھے اُس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ یہ سمرتی کا کتا تھا جو اُس سے بہت پیار کرتا تھا۔ رات کو گھر کی رکھوالی کرتا اور سمرتی گھر میں ہوتی تو اُس کے ساتھ کھیلتا رہتا تھا۔ راستے میں بھی کُتے کی ضرورت تھی۔

انہوں نے آخری پڑاؤ میں سمرتی کو مندر سے نکالنے کے اُن طریقوں پر غور کیا جو وہ سوچ کر آئے تھے۔ انہوں نے یہ بھی سوچ لیا تھا کہ اُن کا زندہ واپس آنا مخدوش ہے۔ خادمہ اور زروڈ نے اپنے ذمے یہ کام لیا تھا کہ سمرتی اگر زندہ ہوئی تو اُس کا سراغ لگالیں گی۔ مندر کے بیسیوں کمرے تھے، تہہ خانے میں بھی کمرے تھے اور راہداریاں اور سیڑھیاں تاریک تھیں اس لیے سمرتی کو ان بھول بھلیوں سے نکالنے کے لیے جان ہتھیلی پر رکھنے کی ضرورت تھی۔ خادمہ نے مردوں کو بتایا تھا کہ یہ بھول بھلیاں کیسی ہیں۔ سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ مندر کے قلعے میں فوج بھی رہتی تھی۔

ارمغانی اور اُس کے ساتھیوں نے خنجر اور خنجر نما تلواریں پہنے ہوئے کپڑوں کے اندر چھپالیں اور یہ قافلہ رات کے آخری پہر نگر کوٹ کی طرف روانہ ہوا۔ خادمہ رہبری کر رہی تھی۔ انہیں سحر کی تاریکی میں مندر کے دروازے میں پہنچ جانا تھا۔

یہ وہ سحر تھی جب پنڈت رادھا کشن نے سمرتی سے کہا تھا کہ اُسے بن گنگا میں اشنان کے لیے لے جانا ہے۔ پنڈت سمرتی کے کمرے میں گیا۔ سمرتی گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔ پنڈت نے اُسے جگایا اور کہا کہ وہ اُس کے ساتھ چلے۔ سمرتی خاموشی سے اُس کے ساتھ چل پڑی۔ وہ مندر سے نکلے۔ اُن کے لیے قلعے کا دروازہ کھل گیا۔ باہر آ کر وہ پہاڑی سے اترنے لگے۔ پنڈت تو کئی برسوں سے اس پہاڑی سے اُترا اور چڑھ رہا تھا

اس لیے اُسے کوئی دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔ دشواری سمرتی کے لیے تھی جو دو گھوڑوں والی بگھی کی سواری کی عادی تھی۔ اُسے جو چپل پہنائے گئے تھے، اُن سے وہ چل بھی نہیں سکتی تھی۔ پہاڑی سے اُترتے اس کے پاؤں بار بار پھسلتے تھے۔ پنڈت اُسے سہارا دیتا تھا اور وہ سنبھل جاتی تھی۔ پھر سمرتی نے ایک بازو پنڈت کی کمر کے گرد لپیٹ دیا اور اترنے لگی۔ پھر بھی اس سے اچھی طرح اترا نہیں جاتا تھا۔ پنڈت نے بھی بے قابو ہو کر اپنا بازو اُس کے گرد لپیٹ دیا اور اُسے تقریباً اپنے اوپر گرا کر پہاڑی اترنے لگا۔ یوں سمجھو تھا کہ سمرتی اُس کے ساتھ چپک گئی۔

وہ پہاڑی سے اُتر آئے اور دریا کی طرف چل پڑے۔ مندر دُور اوپر رہ گیا تھا۔ نیچے جنگل اور ویرانہ تھا۔ پنڈت نے سمرتی کو اپنے بازو سے آزاد نہ کیا۔ وہ اسی طرح ایک دوسرے کے ساتھ لگے ہوئے چلتے گئے۔ صبح کا اجالا نکھرنے میں ابھی بہت دیر باقی تھی۔ پنڈت سمرتی کو اس لیے اتنی جلدی لے آیا تھا کہ صبح کے وقت دریا پر لوگ آ جاتے تھے۔ سمرتی کو چُھپا کر رکھنا تھا۔

"کیا آپ مجھے آخری غسل کے لیے جا رہے ہیں؟" سمرتی نے پوچھا۔

پنڈت نے اس کے سوا کوئی جواب نہ دیا کہ اپنے بازو کا گھیرا تقاضے کے گرد اور زیادہ تنگ کر کے اُسے اس طرح اپنے ساتھ لگالیا جیسے اُسے اپنے جسم میں جذب کر لینا چاہتا ہو۔

"آپ بولتے کیوں نہیں؟" سمرتی نے کہا۔ "مجھ سے آپ کیوں ڈرتے ہیں؟ مجھے آج مرنا ہی ہے تو مجھے بتادیں۔"

"بتادوں گا سمرتی!" پنڈت نے اُسے اپنے آگے اس طرح کر لیا کہ دونوں کے سینے مل گئے۔ "میرا دل کہہ رہا ہے کہ ہم دونوں قربان ہو رہے ہیں۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے میں آج کا سورج نہیں دیکھ سکوں گا۔" اُس کی آواز تھرا گئی۔ وہ رندھیائی ہوئی آواز میں بولا۔ "زندگی کی آخری رات ہے۔ مجھے پیاسا نہ مرنے دو۔ میں سمجھا تھا کہ میں اپنا من مار چکا ہوں۔ میں نہیں مرا۔ میں نے تم پر ہر روپ چڑھایا ہے۔ بیٹی کا بھی، بہن کا بھی، ماں کا بھی، صرف ایک روپ کو چھپانے کے لیے میں نے اپنے آپ کو بہت دھوکے دیے ہیں۔ میں نے دیویوں کی مورتیوں میں تمہاری مسکراہٹیں دیکھی ہیں۔ پاپی من بالا نہیں میں نہیں سمجھ سکتا

کیسلی! میں عورت کے وجود سے بہت بھاگا ہوں مگر۔۔۔"

"آپ پتھر کے بھگوان کو مانتے ہیں"۔۔۔ سمرتی نے کہا۔ "میرے خدا کی عبادت کریں۔ من کے سب پاپ جھڑ جائیں گے۔"

"مجھے باتوں میں نہ لگاؤ سمرتی!"۔۔۔ پنڈت نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں نے تمہاری روح کو پیار دیا ہے۔ اس کے عوض مجھے جسم کا خمار دے دو۔ شاید یہ دن میری زندگی کا آخری دن ہو۔ پھر اس جسم کو جلا دیا جائے گا۔ میں جیتے جی جل رہا ہوں۔"

سمرتی نے قہقہہ لگایا اور اُچک کر اُس سے الگ ہو گئی۔ بولی۔ "تیرا کشن مراری سمجھتا تھا تو تیری پیاس برسوں کی پراتھنا کو یوں پاپ میں ڈوبنے نہ دیتا۔ میں آزاد ہوں۔ میں جانتی تھی تو مجھے ایک دن انہی نگاہوں سے دیکھے گا جن سے مجھے پاپیوں نے دیکھا تھا۔ میں نے تیرے اندر اس آگ کو اسی لیے بھڑکایا تھا کہ تو جلتا ہوا میرے قدموں میں آ گرے اور میں تجھے بھوکے کتے کی طرح اپنے پیچھے پیچھے جنگل میں لے جاؤں اور آزاد ہو جاؤں۔۔۔ میں آزاد ہوں۔۔۔ میں آزاد ہوں۔"

وہ ایک طرف دوڑ پڑی لیکن اونچی نیچی زمین پر وہ تیز دوڑ نہ سکی۔ پنڈت نے اُسے چند قدموں پر پکڑ لیا اور کہا۔ "پاگل نہ بنو سمرتی! مجھ سے بھاگ کر کہاں جاؤ گی! کہاں پناہ ڈھونڈو گی! میں تمہیں پکڑ لوں گا اور ذبح کر دوں گا۔ میں تم سے کوئی قیمتی چیز نہیں مانگ رہا۔"

سمرتی نے اُس کے منہ پر بڑی زور سے تھپڑ مارا اور بولی "میں دریا میں ڈوب جاؤں گی۔ تیرے بتوں کی بھینٹ نہیں چڑھوں گی۔"

"تجھے کوئی نہیں بچا سکتا سمرتی!"۔۔۔ پنڈت نے کہا۔ "بتوں کی توہین نہ کر۔"

"مجھے میرا خدا بچائے گا"۔۔۔ سمرتی نے کہا۔ "میرا خدا سچا ہوا تو تیرا ایک بھی بت سلامت نہیں رہے گا۔"

پنڈت بھوکا بھیڑیا بن گیا تھا۔ اُس کے وجود میں وہ مرد بیدار ہو گیا تھا جسے وہ سمجھتا تھا کہ ہمالیہ کے دامن میں مار آیا ہے۔

تب اُسے ایک کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز قریب آ رہی تھی۔

جس وقت مندر کی پہاڑی سے دُور جا کر پنڈت کشن نے رک کر سمرتی کو اپنے سینے سے لگایا تھا، اُس وقت شعیب ارغانی کا چھوٹا سا قافلہ پہاڑی کے دامن میں اُس جگہ پہنچا تھا جہاں سے مندر کا راستہ اوپر جاتا تھا۔ سمرتی کی خادمہ اس جگہ سے واقف تھی۔ انہیں گھوڑے اور اونٹ وہیں چھوڑ دینے تھے۔ سمرتی کا کتا کھلا ہوا تھا۔ وہ زمین کو سونگھ کر بے تابی سے غرایا، پھر دبی سی آواز میں بھونکا اور اُس طرف زمین کو سونگھتا چل پڑا جدھر پنڈت اور سمرتی گئے تھے۔ قافلے والوں نے اس کی طرف توجہ نہ دی۔ کتے تو ایسی حرکتیں کیا ہی کرتے ہیں۔

کتا دوڑنے لگا اور اُس کی بھونکنے کی آواز بلند اور دُور ہونے لگی۔ خادمہ نے کہا کہ کتے کو کسی گیدڑ یا بھیڑیے کی بُو آ گئی ہے۔ ان میں سے کوئی تصور میں نہیں لا سکتا تھا کہ کتا مالکن کی بُو پر جا رہا ہے۔ اُسے سمرتی سے جدا ہوئے اڑھائی تین مہینے ہی گزرے تھے۔ وہ سمرتی کے ساتھ بچوں کی طرح کھیلا کرتا تھا۔ اُس کے بستر میں گھس جایا کرتا تھا۔ سمرتی اُس کے ساتھ بچوں کی طرح پیار کیا کرتی تھی۔

پنڈت نے جب کتے کے بھونکنے کی آواز سنی تو اُس نے پروا نہ کی۔ وہ بھوکے بھیڑیے کی طرح سمرتی پر ٹوٹ پڑا تھا اور سمرتی اُس سے بچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ پنڈت نے اُسے گرا لیا اور اُس کی ساڑھی نوچنے لگا۔ اب سمرتی بے بس ہو گئی تھی۔ ایک کتا اُس کے گرد گھوم کر اپنا منہ اس کے منہ کے قریب لے گیا تو وہ سمجھی کہ یہ بھیڑیا ہے یا مندر کا کتا ہے۔ وہ کیسے یقین کر سکتی تھی کہ یہ اُس کا اپنا کتا ہے۔ کتا اُس کا منہ چاٹنے لگا تو اُسے کچھ شک ہوا۔ اُس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔۔۔ "شیری! پکڑ لو۔"

کتے نے اگلی ٹانگیں اٹھا کر پنجے پنڈت کے جسم میں اتار دیے اور اُس کا ایک کندھا منہ میں لے لیا۔ اُس نے پنڈت کو جھنجھوڑا تو پنڈت چیخ کر اُٹھا۔ سمرتی اُس کے نیچے سے نکل آئی۔ کتے نے کندھے سے منہ اکھاڑ کر پنڈت کی ران دانتوں کے شکنجے میں لے لی۔ پنڈت نے ایسا واویلا بپا کیا کہ دُور دُور تک سنائی دیا۔ پنڈت بھاگا تو کتے نے اُس کی

ٹانگ پھر پکڑ لی۔ سمرتی نے چلا کر پنڈت سے کہا ۔ "میں نے تجھے کہا تھا کہ مجھے میرا خدا بچائے گا۔ یہ میرا کتا ہے جو لاہور سے میری بو پا آیا ہے۔"

سمرتی نے کتے کو پکڑ لیا۔ پنڈت بھاگ گیا۔ سمرتی کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس کا کتا کہاں سے آ گیا ہے۔ کتا اس کے قدموں میں لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ سمرتی کو قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ وہ خوف سے کانپنے لگی کہ مندر کے فوجی پنڈت کی مدد کو آ رہے ہیں۔

اس نے چھپنے کی کوشش کی لیکن اسے ایک عورت کی آوازیں سنائی دیں "شیری ... شیری" وہ کتے کو بلا رہی تھی۔ آواز سمرتی کی خادمہ کی تھی۔ پنڈت کا واویلا اتنا بلند تھا کہ انہیں بھی سنائی دیا تھا۔ ارمغانی اور اس کے ساتھیوں نے اس کے ساتھ کتے کے بھونکنے اور جھنجھوڑنے کی آوازیں بھی سنی تھیں۔ ارمغانی کو یاد آ گیا تھا کہ اس کتے نے اسے بھی جھنجھوڑا اور بری طرح زخمی کر دیا تھا۔

وہ سب دوڑتے وہاں پہنچے تو سمرتی نیم تاریکی میں ادھر ادھر چھپنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسے پہچاننے میں ذرا دقت محسوس ہوئی۔ سمرتی نے جب ارمغانی اور اپنی خادمہ کو پہچان لیا تو اسے خواب کا دھوکہ ہوا۔ اس نے بڑی تیزی سے انہیں بتایا کہ وہ اس جگہ تک کس طرح پہنچی ہے۔ ارمغانی نے اسے بتایا کہ وہ کس طرح نگرکوٹ آئے ہیں۔ زیادہ رکنا خطرناک تھا۔ سب وہیں واپس چلے گئے جہاں اونٹ اور گھوڑے کھڑے تھے۔ زر فشاں و سمرتی کو ایک اونٹ پر بٹھایا گیا۔ خادمہ دوسرے اونٹ پر بیٹھی۔ مرد گھوڑوں پر سوار ہو گئے اور واپسی کا سفر شروع ہو گیا لیکن ان کی منزل لاہور نہیں بھیرہ تھی۔ اب ان میں کوئی بھی لاہور نہیں جا سکتا تھا، سوائے ارمغانی کے دو ساتھیوں کے۔ لاہور میں ان پر کسی کو شک نہیں تھا کہ وہ ارمغانی کے ساتھی ہیں۔

یہ قافلہ اب عام راستے سے ہٹ کر جنگلوں اور ویرانوں میں جا رہا تھا۔ سب سے بڑا خطرہ تعاقب کا تھا۔ انہوں نے حساب لگایا کہ پنڈت اوپر جائے گا۔ اطلاع دے گا کہ سمرتی بھاگ گئی ہے۔ تعاقب میں آنے والے پہاڑی سے اتریں گے اور جتنا وقت گزر جائے گا اتنے وقت میں اونٹ اور گھوڑے انہیں بہت دور لے جائیں گے۔ اب ان کی رفتار بہت تیز تھی۔

اس کا حلیہ بے خیال تھا۔ ان کے تعاقب میں کوئی نہیں آ رہا تھا۔ کتے نے پنڈت کے کندھے اور ٹانگوں سے گوشت اکھاڑ دیا تھا۔ خون چشمے کی طرح نکل رہا تھا۔ وہ مدد کے لیے چیختا چلاتا تو کوئی نہ کوئی اس کی مدد کو پہنچ سکتا تھا۔ ان زخموں سے وہ مر نہیں سکتا تھا مگر اس نے کسی کو مدد کے لیے نہ بلایا۔ اس نے یہ بھی نہ کیا کہ اس نے جو چادر اپنے اوپر لے رکھی تھی، اسے پھاڑ کر زخموں پر باندھ لیتا تاکہ خون رک جاتا اور وہ پہاڑی پر اپنے مندر میں جانے کی بجائے نگرکوٹ گاؤں میں چلا جاتا جو قریب ہی تھا۔

وہ کہیں بھی نہ گیا۔ اس نے کچھ بھی نہ کیا۔ اس نے زیر لب کہا ۔ "اچھا ہوا .... ایسے ہی ہونا تھا، ہو گیا .... اچھا ہوا" ۔ وہ اٹھا اور بن گنگا کی طرف چل پڑا۔ "گنگا ماتا میرا یہ پاپ نہیں دھو سکے گی .... اس ناپاک جسم کو آگ بھی پاک نہیں کر سکے گی .... من پاپی ہو جائے تو تن کو پاپ کرتے دیر نہیں لگتی .... میں پیاسا ہوں" ۔ وہ چلتا گیا اور اسے چکر آ گیا۔ لڑکھڑا کر سنبھل گیا۔ خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ وہ چند قدم اور چلا اور گر پڑا۔ اٹھا، چلا اور پھر گر پڑا ۔ "تھوڑا دور اور .... مجھے گنگا جل تک پہنچنے دے۔"

وہ اٹھتا تھا اور گرتا تھا۔ وہ پیٹ کے بل رینگنے لگا۔ صبح طلوع ہو رہی تھی مگر پنڈت کی آنکھوں کے آگے اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ اسے بن گنگا کی لہروں کی آواز سنائی دینے لگی تھی۔ وہ اور تیزی سے رینگنے لگا۔ اسے سمرتی کی آواز سنائی دی ۔ "مجھے میرا خدا بچائے گا۔ تیرے بت تباہ ہوں گے" ۔ اسے اپنی آواز سنائی دی ۔ "عورت ماں، بہن، بیٹی اور بیوی ہو سکتی ہے۔ اسے کوئی اور روپ دے کر اس کے قریب جاؤ گے تو جل جاؤ گے۔ انجام بہت برا ہو گا" ۔ وہ مندر میں یہی رٹ لگائے رکھتا تھا مگر اس نے خود ہی یہ پاپ کیا کہ سمرتی کو وہ روپ دیا جو نہ ماں کا تھا، نہ بہن کا، نہ بیٹی کا، نہ بیوی کا۔

اس کا خون بہہ رہا تھا۔ جسم خالی ہو رہا تھا اور گناہ اسے ڈس رہا تھا۔ وہ بن گنگا کے کنارے اس مقام تک رینگتا ہوا پہنچ گیا جہاں پاٹ تنگ تھا اور پانی باہر بھی آ جاتا تھا۔ اس پر غشی طاری ہو گئی۔ اس نے بے ہوش ہوتے ہوئے کہا ۔ "میں پیاسا ہوں ... میں پاپ کا پیاسا تھا" ۔ بن گنگا کی ایک لہر کنارہ پھلانگ کر آئی اور بے ہوش پنڈت کو اپنے ساتھ لے گئی۔

نگرکوٹ کے بُت اُس منزل کی راہ دیکھتے رہے جس کے خون سے اُن کے پاؤں دُھلنے تھے۔ سندرا اپنے مہارشی پنڈت رادھاکشن کی راہ دیکھتا رہا ___ برہمن پال کی ماں اُن کے انتظار میں پاگل ہوتی رہی۔ دن کے پچھلے پہر پنڈت اور سمرتی کی تلاش کو گئے ہوئے لوگ واپس آ گئے۔ انہوں نے اُس راستے پر خون ہی خون دیکھا جو راستہ بن گنگا کو جاتا تھا۔ اُس خون سے کئی کہانیاں بنیں۔ قیاس کے بہت گھوڑے دوڑائے گئے مگر کوئی گھوڑا پنڈت اور نگرکوٹ کی سمرتی تک نہ پہنچ سکا ___ ہندوؤں کی متحدہ افواج کے سینا پتی برہمن پال کی ماں دیوی دیوتاؤں کے قہر سے ڈرنے لگی۔

قہر تو سلطان محمود غزنوی پر نازل ہو رہا تھا۔ ہندوستان کی اتنی زیادہ فوج کو وہ تصور میں بھی نہیں لا سکتا تھا۔ یہ افواج جس انداز سے آئی تھیں۔ اس سے اُن کے کئی راز معلوم ہو گئے تھے۔ یہ راز سلطان محمود تک پہنچا دیئے گئے تھے۔ سلطان انہی سے فائدہ اٹھانے کے منصوبے بنا رہا تھا۔ مؤرخوں نے جن میں سے ایک انگریز سر دی۔ اے۔ سمتھ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، ہندوستان کے اس لشکر کی ان خامیوں کا جائزہ تفصیل سے لیا ہے۔ ایک یہ کہ اس کی متحدہ ہائی کمانڈ ایک آدمی کے تحت تھی اور یہ آدمی ہر ایک فوج کی فنی اور نفسیاتی کیفیت سے ناواقف تھا۔ دوسرے یہ کہ ہائی کمانڈ پر افواج کے کمانڈروں کو اعتراض تھا۔ اس لیے باہمی تعاون ناقص تھا۔ تیسرے یہ کہ فوج میں ہزارہا شہری صرف اس لیے شامل کر لیے گئے تھے کہ اُن میں لڑنے کا جذبہ تھا بلکہ وہ اسلام کے خلاف جذباتی تھے مگر انہوں نے میدانِ جنگ کبھی دیکھا نہیں تھا اور چوتھے یہ کہ ہندوؤں کو اپنی تعداد اور ساز و سامان پر بھروسہ تھا۔

ہندو لشکر کے مورال کو تقویت وہ بُت اور مورتیاں دیتی تھیں جنہیں پنڈت فوج کے ساتھ رکھتے اور عبادت اور دُعا میں مصروف رہتے تھے۔ مسلمانوں نے یہ مشاہدہ کیا تھا کہ شکست کی صورت میں سب سے پہلے یہ پنڈت بُتوں اور مورتیوں کو پھینک کر بھاگا کرتے تھے۔ اس کے مقابلے میں سلطان کو دو رکعت نفل پر بھروسہ تھا جو وہ ہر لڑائی سے

پہلے میدانِ جنگ میں پڑھا کرتا تھا۔ اُسے اپنی عسکری فہم و فراست پر بھروسہ تھا، اور اُسے اپنے اس عقیدے پر بھی بھروسہ تھا کہ وہ اللہ کی خوشنودی کے لیے اللہ کی راہ میں لڑتا ہے اور یہ جنگ اُس کے ذاتی مفاد کے لیے نہیں۔ اب بھی اُس نے اپنے سامنے ہندو لشکر کے پہاڑ دیکھے تو اُس نے اپنے سالاروں اور نائب سالاروں کو آخری ہدایات دے کر کہا۔ ”بدر میں رسولِ اکرم صلعم نے تین گنا قوی دشمن کو شکست دی تھی۔ ہمیں اس روایت کو زندہ کرنا ہے۔ میں اپنی فوج سے دو چار باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

تھوڑی دیر بعد وہ اپنے گھوڑے پر سوار اپنی فوج سے خطاب کر رہا تھا ___ ”میں تمہیں اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں کروں گا کہ فتح تمہاری ہے۔ صرف یہ کہوں گا کہ خدا تمہارا ہے بشرطیکہ تم خدا کے ساتھ رہو اور دل میں یہ ایمان تازہ رکھو کہ اسلام کی پاسبانی کریں گے اور اپنے سچے مذہب کے کسی دشمن کو زندہ نہیں رہنے دیں گے۔ تمہارے سامنے کفر کے پہاڑ کھڑے ہیں۔ اگر تم نے اپنے عقیدے کی بجائے اپنی جان کو عزیز سمجھا تو تمہارے لیے تباہی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ہمیں ان پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کرنا ہے۔ اپنی اور اپنے دشمن کی تعداد کو بھول جاؤ۔ جنگ جذبے سے لڑی جاتی ہے۔ خدا تمہارے ساتھ ہے۔ خدا اُسے فتح دیتا ہے جو اُس کا نام روشن کرنے کے لیے فتح کا عزم لے کر لڑتا ہے۔“

سلطان محمود غزنوی فوج کے دو حصوں کو اپنی کمان میں دریائے سندھ کے پنجاب والے کنارے پر لے گیا اور حضرو کے قریب خیمہ زن ہوا۔ اُس نے دیدبانوں کی آنکھوں سے بھی ہندو لشکر کو دیکھا اور اپنی آنکھوں سے بھی۔ اُس نے اپنے سالاروں سے کہا کہ اب ہندو لڑنے کا جذبہ اور فتح کا عزم لے کر آئے ہیں۔ ہمیں بہت محتاط ہو کر لڑنا پڑے گا۔ اُس نے اپنے پلان میں رد و بدل کیا اور چند ایک چھاپہ مار جیش دریا کے کنارے سے پرے دور دور پھیلا دیئے۔ وہ پشاور اور غزنی کے دفاع کے لیے دریا کا پورا پورا استعمال کرنے کی سوچ چکا تھا۔

اُس نے دوسرا اقدام یہ کیا کہ اپنی خیمہ گاہ کے ارد گرد خندق کھدوا دی۔ اُس نے مورچہ بند ہو کر لڑنا زیادہ موزوں کہا۔ وہ کچھ اور انتظام بھی سوچ رہا تھا لیکن مزید

تاخیر اُس کے لیے نقصان دہ ثابت ہو رہی تھی کیونکہ دشمن کے لشکر میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا ابھی کمک ہندوستان سے دستے آ رہے تھے۔

سلطان سمجھ گیا کہ دشمن کی افواج ابھی منظم نہیں ہوئیں۔ انہیں ابھی حملے کی ترتیب میں آنا تھا۔ سلطان نے اللہ کے بھروسے اپنی عقل سے کام لیتے ہوئے ایک روز علی الصبح، نماز کے فوراً بعد ایک ہزار گھوڑ سوار تیر انداز جو گھوم پھر کر تیر اندازی کرنے کا تجربہ رکھتے تھے، دشمن پر حملہ کرنے کے لیے بھیج دیئے۔ اس صورت حال میں اُس نے پہل کاری بہتر سمجھی اور جنگ کی ابتدا کر دی۔

تاریخ ۲۹ ربیع الثانی ۳۹۹ ہجری بمطابق ۳۱ دسمبر ۱۰۰۸ عیسوی تھی۔ مشہور مؤرخ گردیزی نے اس معرکے کا آنکھوں دیکھا حال یوں لکھا ہے کہ ایک ہزار تیر اندازوں سے حملہ کرا کے محمود غزنوی نے بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ دیا۔ اُس کے پلان کو دشمن نے یوں پرے پھینک دیا جیسے کوئی بے کار چیز کوڑے کرکٹ میں پھینک دی جاتی ہے۔ دشمن کی طرف سے تیس ہزار گکھڑوں نے ایک ہزار تیر اندازوں پر ہلہ بول دیا۔ گکھڑ ایک لادین قبیلہ تھا جو ہندوؤں کا حامی تھا بلکہ یہ قبیلہ اپنے آپ کو ہندوؤں کی نسل سے سمجھتا تھا۔ یہ لوگ جنگجو تھے۔ موسم کیسا ہی ہو، میدان جنگ پتھریلا ہو، ہموار ہو، ریگزار ہو، ہموار ہو یا اونچا نیچا، گکھڑ ننگے پاؤں اور ننگے سر لڑا کرتے تھے۔

انہوں نے تیر انداز سواروں پر ایسا شدید ہلہ بولا کہ ایک ہزار گھوڑوں اور ایک ہزار سواروں کا کچھ پتہ ہی نہ چلا کہ کہاں غائب ہو گئے ہیں۔ گکھڑ ان کا قتل عام کر رہے تھے۔ گکھڑوں نے اپنا بڑا رد کا نہیں، وہ نعرے لگاتے اور چیختے چنگھاڑتے سلطان محمود کے کیمپ میں داخل ہو گئے۔ کیمپ کے ارد گرد خندق تھی۔ دو طرف آنے جانے کا راستہ تھا۔ گکھڑ ان راستوں سے سیلاب کی طرح اندر چلے گئے۔ سلطان محمود اس صورت حال کے لیے تیار نہیں تھا۔ گکھڑوں کی یہ دلیرانہ یلغار غیر متوقع تھی لیکن احمقانہ بھی۔ بے شک اُن کی تعداد تیس ہزار تھی لیکن وہ ایسے کیمپ کے اندر آ گئے تھے جو خندق سے گھرا ہوا تھا۔

محمد قاسم فرشتہ لکھتا ہے کہ چند منٹوں میں گکھڑوں کے ہاتھوں پانچ ہزار مسلمان شہید ہو گئے۔

زخمی لاتعداد تھے۔ کیمپ میں خونریز معرکہ لڑا جا رہا تھا۔ خندق نے گکھڑوں کے لیے پسپائی ناممکن بنا دی تھی۔ خطرہ یہ تھا کہ دشمن مزید تعداد سے حملہ کر دے گا اور ایک گھنٹے کے اندر جنگ کا فیصلہ دشمن کے حق میں ہو جائے گا۔ سلطان کیمپ میں پھنس گیا تھا۔ اور وہ سپاہیوں کی طرح لڑ رہا تھا۔ اُس نے اپنے ٹروپس کو جس طرح ڈسپلن کر رکھا تھا، اُسے اس کا ثمر ملنے لگا۔ وہ اس طرح کہ مشہور سالار عبداللہ الطائی چھ ہزار عربی نسل کے گھوڑوں کو تیار رکھے ہوئے تھا جو اُس نے گکھڑوں کے خلاف استعمال نہ کیے۔

کچھ دیر بعد گکھڑوں کا صفایا شروع ہو گیا۔ وہ کم بھی رہ گئے اور تھک بھی گئے تھے۔ وہ خندق میں گرتے تو مسلمان تیر اندازوں اور برچھی بازوں کا شکار ہو جاتے۔ راجہ انند پال نے یہ صورت حال دیکھی تو اُس نے نہایت اعلیٰ فیصلہ کیا۔ مسلمانوں کو سنبھلنے کا موقع نہ دینے کے لیے اُس نے حملے کا حکم دے دیا۔ مسلمانوں کے کیمپ کی کیفیت کو وہ اچھی طرح نہیں سمجھ سکا تھا۔ وہاں اب گکھڑ کٹ رہے تھے اور مسلمان کاٹ رہے تھے۔ راجہ انند پال نے فتح یقینی سمجھ کر اپنے ہاتھی کو آگے رکھا۔ اپنا جھنڈا اور اونچا کیا اور ہلہ بولنے کے انداز سے حملہ کر دیا۔

سلطان کے سالار عبداللہ الطائی نے چھ ہزار گھوڑ سواروں سے اُس پر پہلو سے حملہ کر دیا۔ اتنے بڑے لشکر کے سامنے چھ ہزار گھوڑ سوار کچھ بھی نہیں تھے لیکن مؤرخ لکھتے ہیں کہ اس موقع پر ایک معجزہ رونما ہوا۔ وہ یوں کہ راجہ انند پال کے ہاتھی کی پیشانی میں دو تین تیر اُتر گئے اور ایک تیر آنکھ میں لگا۔ یہ شاہی ہاتھی بڑا ہی طاقتور اور بدمست تھا۔ اس نے اودھم بپا کر دیا اور ادھر اُدھر بھاگنے دوڑنے لگا۔ اس کی چنگھاڑ سے دوسرے ہاتھی بھی بدک گئے۔ راجہ انند پال کا پرچم گر پڑا اور اُس کے ہاتھی نے پیچھے مڑ کر حملے کی صفوں میں قیامت بپا کر دی۔ دوسرے ہاتھی بھی اس کی چنگھاڑ سے ڈر کر ادھر اُدھر بھاگنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ راجہ انند پال کی فوج یہ سمجھ کر کہ آگے سے مسلمانوں نے حملہ کر دیا ہے، پیچھے کو دوڑی اور اسے پیچھے کو بھاگتے دیکھ کر دوسری ریاستوں کی فوجیں حکم اور ڈسپلن کی زنجیر توڑ کر پسپا ہونے لگیں۔

متحدہ اتحاد کمان بیکار ہو گئی۔ ہندو لشکر کی بے دلی کی ایک وجہ موسم بھی تھا۔ یہ ۳۱ دسمبر

کا امکان تھا جب قریبی پہاڑیوں پر برفباری شروع ہو چکی تھی۔ سلطان محمود اسی موسم میں لڑنے کے لیے وقت حاصل کرتا رہا تھا۔ سلطان نے دشمن میں یہ بھگدڑ دیکھی تو اُس نے کھلے حملے اور تعاقب کا حکم دے دیا۔ عبداللہ الطائی نے اپنے چھ ہزار گھوڑ سواروں سے اور سپہ سالار ارسلان جاذب نے دس ہزار سواروں اور پیادوں سے جن میں ترک، افغان اور خلجی تھے مل کر حملہ کر دیا۔ دشمن اب لڑ نہیں رہا تھا، بھاگ رہا تھا۔

فرشتہ کے مطابق پسپائی میں دشمن کے بیس ہزار فوجی ہلاک ہو گئے جنہوں نے ہتھیار ڈال کر قید قبول کر لی، ان کی تعداد بے حساب تھی۔ اس سے پہلے سلطان محمود نے کبھی تعاقب نہیں کیا تھا۔ اُس نے دریائے سندھ کے دوسرے کنارے سے بھی فوج بُلا لی اور دشمن کا تعاقب نہ چھوڑا۔

راستے میں اسے بتلایا گیا کہ نگر کوٹ کا مندر ہندو راجوں مہاراجوں کا جنگی مرکز بنا ہُوا ہے جو ایک قلعے میں ہے۔ سلطان نے اُدھر کا رُخ کر لیا۔ نگر کوٹ کو راجا انند پال کی یا کالنجر کی فوج بچا سکتی تھی مگر دونوں فوجیں بُری طرح تتر بتر ہو گئی تھیں۔ سلطان نے نگر کوٹ کا محاصرہ کیا تو قلعے کی دیواروں سے تیر برسنے لگے۔ قلعہ پہاڑی پر تھا اس لیے حملہ آوروں کی کامیابی محال تھی۔ تاہم تین دنوں کے محاصرے اور دروازے پر تابڑ توڑ حملوں سے محصورین نے ہتھیار ڈال دیے۔

سلطان محمود مندر میں گیا تو اس نے پہلا کام یہ کیا کہ بُتوں اور مورتیوں کو پہاڑی کے اوپر سے نیچے گرا دیا۔ مندر سے بے بہا زر و جواہرات برآمد ہوئے۔ سات کروڑ سونے کے سکے تھے۔ سونا منوں کے حساب سے تھا۔ چاندی کئی سو من تھی۔ ہیرے جواہرات بھی منوں کے حساب سے تھے۔ یہ وہ خزانہ تھا جو ہندوؤں نے سلطان محمود غزنوی کو شکست دے کر غزنی کو مہا بھارت میں شامل کرنے کے لیے جمع کر رکھا تھا۔

سلطان نے حضرو سے نگر کوٹ تک کا علاقہ اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ راجا انند پال اس کے چند دن بعد مر گیا۔

سلطان محمود غزنوی ہندوستان میں رہ کر اسلامی سلطنت کو منظم اور مستحکم کرنا چاہتا

تھا مگر اُسے غزنی سے اطلاع ملی کہ غور کے علاقے میں محمد نام کے ایک افغان نے دس ہزار فوج کے ساتھ اپنا کیمپ بنا لیا ہے اور غوری اُس کے ساتھ شامل ہو رہے ہیں۔ یہ ایک اور خانہ جنگی کی ابتدا تھی۔ سلطان محمود کو ۱۰۰۹ء (۴۰۰ھ) میں غزنی جانا پڑا اور اُسے ایک اور خانہ جنگی لڑنی پڑی۔

معرکہ انسان اور ابلیس کا

نگرکوٹ

کے بُت توڑنے کے بعد سلطان محمود غزنوی غزنی کو جا رہا تھا کیونکہ اُس کی غیر حاضری میں غوریوں نے غزنی کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔ یہ سلطان محمود کی بہت بڑی بدنصیبی تھی کہ وہ ہندوستان میں آتا تھا تو پیچھے کوئی نہ کوئی مسلمان حکمران غزنی پر چڑھ دوڑتا تھا۔ اُسے غزنی کو بچانے کے لیے واپس جانا پڑتا تھا، اس لیے وہ ہندوستان میں کسی بھی وقت آرام سے بیٹھ کر یہاں کے امور کی طرف توجہ نہ دے سکا۔ متعصب تاریخ دانوں نے اُس کی اس مجبوری پر پردہ ڈال کر اُس پر یہ الزام عائد کیا ہے کہ وہ لُوٹ مار کے لیے آتا تھا اور وہ بُت اس لیے توڑتا تھا کہ بتوں کے اندر زروجواہرات بھرے ہوتے تھے اور وہ لُوٹ مار کر کے غزنی چلا جاتا تھا۔

اب کے وہ اس عزم کے ساتھ آیا تھا کہ ہندوستان کے راجوں مہاراجوں کے فوجی اتحاد کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دے گا اور کسی بڑے مندر میں کوئی بُت سلامت نہیں رہنے دے گا۔ چنانچہ اُس نے [illegible] مقام پر ہندوستان کی متحدہ فوجی طاقت کو بکھیرا اور نگرکوٹ تک جا پہنچا جہاں کا مندر سارے ملک میں مشہور تھا۔ اُس نے نگرکوٹ کو فتح کیا ہی تھا کہ اُسے غزنی سے بلاوا آ گیا کہ دس ہزار غوریوں نے غزنی کے قریب خیمے گاڑ کر اردگرد خندق کھود لی ہے۔

سلطان محمود غزنوی اپنے ساتھ دو ہزار ہندو قیدی لے جا رہا تھا لیکن یہ جنگی قیدی نہیں تھے۔ یہ اُس وقت کے رواج کے مطابق غلام تھے جو مہاراجہ انند پال نے سلطان محمود کو تحفے کے طور پر دیے تھے۔ کچھ ہاتھی تو سلطان نے ہندو فوج سے

چھینے تھے، پچاس ہاتھی ہندو مہاراجوں نے پیش کیے تھے۔

وہ جتنی فوج اپنے ساتھ لایا تھا اتنی واپس نہیں لے جا رہا تھا۔ کچھ نفری یہاں ضرورت کے تحت چھوڑ چلا تھا اور بہت سی نفری ماری گئی تھی۔ اُس کی فوج کا کوئی ایک بھی سپاہی جنگی قیدی نہیں تھا کیونکہ وہ فاتح تھا، مگر اُس کے دو کمانڈار اُس کے ساتھ نہیں تھے۔ یہ دونوں زندہ تھے اور اُس فوج کے ساتھ بھی نہیں تھے جسے سلطان محمود نگرکوٹ کے دفاع اور انتظام کے لیے پیچھے چھوڑ گیا تھا۔

ان میں ایک بُغرا خان تھا اور دوسرا التگین۔ وہ خوبرو اور تنومند جوان تھے۔ بُغرا خان پشاور اور لغمان کے درمیان کے علاقے کا رہنے والا تھا۔ پشاور آتا جاتا رہتا تھا اس لیے ہندوستان کی زبان سمجھ سکتا تھا اور کچھ کچھ بول بھی سکتا تھا۔ جب سلطان محمود کی فوج نے نگرکوٹ کا قلعہ سر کر لیا اور لڑائی تقریباً ختم ہو گئی تھی، اُس وقت بُغرا خان قلعے سے باہر ایسی جگہ تھا جو پہاڑی کی چوٹی پر تھی۔ قلعہ ٹوٹتے ہی اُس کے جیش کے سپاہی قلعے کے اندر جانے کو دوڑ پڑے۔ بُغرا خان نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ گھوڑا الٹی سمت دوڑ پڑا۔ بُغرا خان سنبھل نہ سکا۔ وہ پیچھے کو گرنے لگا اور گھوڑا اُس کے نیچے سے یوں نکل گیا جیسے بدک گیا ہو۔

بُغرا خان ایسا گرا کہ لڑھکتا ہُوا پہاڑی سے نیچے چلا گیا۔ وہ سنبھل تو گیا لیکن چوٹیں ایسی آئی تھیں کہ کوشش کے باوجود اوپر نہ جا سکا۔ وہ پیچھے چلا گیا۔ اُس کا سر چکرا رہا تھا اور دماغ ماؤف ہو گیا تھا۔ ہندو فوج کے سپاہی اِدھر اُدھر بھاگے جا رہے تھے۔ بُغرا خان اُن سے چھپتا پھر رہا تھا۔ ہندو اُسے دیکھ لیتے تو جان سے مار جاتے۔

وہ نیم غشی کی حالت میں کسی اور ہی سمت نکل گیا۔ اُسے سمت اور وقت کا کوئی احساس نہ رہا۔ وہ کبھی بیہوش ہُوا، کبھی ہوش میں آیا اور جب بھی ہوش میں آیا، وہ اُٹھ کر چل پڑا۔ علاقہ جنگلاتی اور چٹانی تھا۔ اُسے بالکل احساس نہیں تھا کہ کتنے دن گزر گئے ہیں یا کوئی دن گزرا بھی ہے یا نہیں۔ اُسے کسی نے جھنجھوڑا تو ہڑبڑا کر بیدار ہو گیا۔ اُس کا ہاتھ عادت کے مطابق اپنی تلوار کے دستے پر پڑا اور اُس نے

تلوار نیام سے نکال لی۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا تھا مگر گر پڑا۔ چوٹوں کے علاوہ وہ بھوکا اور پیاسا بھی تھا اور ایک زخم ایسا تھا جس سے خون نکل رہا تھا۔

"ہوش میں آؤ خان" ــــ اُسے اپنی زبان کی آواز سنائی دی۔ "میں التگین ہوں۔ یہاں کیسے آگئے ہو؟"

بُغرا خان نے بولنے کی کوشش کی تو اُسے پتہ چلا کہ وہ بول نہیں سکتا۔ اُس کا حلق خشک تھا اور زبان پیاس سے اکڑ گئی تھی۔ اُس نے منہ کھولا تو التگین سمجھ گیا کہ وہ پیاسا ہے۔ التگین نے اپنی پیٹھ کے ساتھ بندھی ہوئی پانی کی چھاگل کھولی اور اُس کے منہ سے لگا دی ــــ بُغرا خان اُس کا گہرا دوست تھا۔

التگین بھی بُغرا خان کی طرح ایک جیش کا کمانڈر تھا۔ وہ قلعے کے محاصرے میں شامل نہیں تھا۔ اُس کے جیش کو قلعے کی پہاڑی سے دُور اُس راستے پر بھیج دیا گیا تھا جس سے ہندو فوج کی کمک یا رسد کے آنے کی توقع تھی۔ التگین کے ذمے یہ کام تھا کہ کمک کو راستے میں ہی الجھا لے۔ اُس کا جیش تیر انداز تھا اور گھوم پھر کر تیر اندازی کا تربیت یافتہ تھا۔

اس جیش کو ایک ہدف مل گیا۔ یہ ہندوستانی فوج کا ایک سوار دستہ تھا جو نگرکوٹ کی طرف نہیں جا رہا تھا بلکہ اُدھر سے آ رہا تھا۔ التگین کے تیر اندازوں نے اس سوار دستے پر تیر برسانے شروع کر دیئے مگر کچھ اور ہندوستانی پیادہ سپاہی کسی اور طرف سے گزر رہے تھے۔ انہیں مسلمان تیر انداز نظر آ گئے۔ یہ ہندوستانی سوار اور پیادے دراصل نگرکوٹ سے بھاگے جا رہے تھے۔ راستے میں التگین کے جال میں آ گئے۔ سوار اور پیادے اپنی جانیں بچانے کے لیے لڑنے لگے۔ وہ اس علاقے سے واقف تھے۔ انہوں نے مسلمان تیر اندازوں کو گھیر لیا اور تیر اندازوں کے لیے مشکل پیدا ہو گئی۔

التگین کے پاس نفری بہت کم تھی۔ یہ نفری لڑی تو بے جگری سے لیکن کچھ ماری گئی کچھ بکھر گئی۔ ہندوستانی سوار اور پیادے جو بچ گئے تھے، وہ نکل گئے

اور التگین اکیلا رہ گیا۔ وہ اپنے جیش کو ڈھونڈنے لگا۔ اس تلاش میں جنگل اور چٹانوں میں بھٹک گیا۔

وہ بھٹکتا رہا۔ دن گزرا۔ رات گزری۔ اگلا دن اور رات بھی گزر گئی اور وہ اُس جگہ جا پہنچا جہاں بُغرا خان پڑا تھا۔ بُغرا خان کو اُس نے پانی پلایا تو وہ پوری طرح ہوش میں آ گیا۔ التگین نے اُس کے منہ میں کھانے کے لیے کچھ ڈالا۔

سورج غروب ہو گیا۔ بُغرا خان کے جسم میں کھانے اور پانی سے جان آ گئی تھی مگر وہ چلنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

صبح طلوع ہوئی تو التگین کہیں سے مدد لانے کے لیے یا نگرکوٹ کا راستہ اور سمت معلوم کرنے کے لیے کسی مقامی آدمی یا کسی گاؤں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ اُسے بُغرا خان نے بتا دیا تھا کہ قلعہ سر ہو چکا ہے۔ التگین کو اس خبر نے حوصلہ دیا۔ اُس کے دل سے یہ ڈر نکل گیا کہ وہ ہندوستانی فوج کے ہاتھ چڑھ جائے گا۔ چنانچہ وہ نڈر ہو کر چلا جا رہا تھا۔ بہت دیر کی تلاش کے بعد اُسے چھوٹا سا ایک گاؤں نظر آ گیا۔ وہ اُدھر کو چل پڑا۔

جب گاؤں کے قریب پہنچا تو عورتیں اور بچے اُسے دیکھ کر گھروں کو بھاگ گئے۔ اب یہ علاقہ مسلمانوں کا محکوم تھا۔ گاؤں والوں کو پتہ چل چکا تھا کہ نگرکوٹ کے قلعے پر مسلمانوں کا قبضہ ہو چکا ہے اور مسلمان بُت توڑ چکے ہیں۔ التگین کو دیکھ کر کچھ آدمی باہر آ گئے۔ وہ غریب سے دیہاتی تھے۔ یہ دیکھ کر کہ یہ مسلمان فوجی ہے، وہ غلاموں کی طرح دوڑے آئے اور ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ التگین نے چار آدمی ساتھ لیے اور بُغرا خان تک پہنچا۔ اُس کی حالت اچھی نہیں تھی۔ اُس نے ٹوٹی پھوٹی زبان میں ان آدمیوں سے پوچھا کہ نگرکوٹ کا قلعہ کتنی دُور ہے۔ انہوں نے بتایا کہ بہت دُور ہے اور پہاڑی پر ہونے کی وجہ سے فاصلہ زیادہ لمبا اور تکلیف دہ ہے۔

گاؤں کے ان آدمیوں میں سے ایک نے انہیں خوش کرنے کے لیے کہا کہ بغرا خان کو گاؤں میں لے چلیں اور ذرا بہتر ہو جائے تو اسے قلعے میں پہنچا دیں گے۔ بغرا خان نے التگین کو اپنی زبان میں بتایا کہ ان لوگوں نے کیا مشورہ دیا ہے۔

ان لوگوں نے یہ بھی کہا تھا کہ گاؤں میں زخموں اور چوٹوں کا علاج اور دودھ اور شہد بھی ہے۔ التگین ایسا خطرہ مول لینے کے حق میں نہیں تھا لیکن بغرا خان ناقابل برداشت تکلیف میں تھا۔ یہ جانتے ہوئے کہ گاؤں کے لوگ اُن کے محکوم تو ہو گئے ہیں لیکن وہ آخر دشمن ہیں اور ہلاک کر سکتے ہیں، اس نے التگین سے کہا کہ وہ پہلے گاؤں میں چلے۔ قلعے تک پہنچتے شاید وہ زندہ نہ رہے۔

التگین اپنے دشمن کو اچھی طرح جانتا تھا۔ ذہین آدمی تھا لیکن بغرا خان کے ساتھ اُس کی دوستی ایسی گہری اور جذباتی تھی کہ وہ خطروں کو بھول کر جذبات میں آ گیا۔ اُس نے گاؤں والوں سے کہا کہ بغرا خان کو اٹھا کر گاؤں میں لے چلیں۔

التگین جب ان آدمیوں کو گاؤں سے لے گیا تھا تو تین آدمیوں نے ایک درخت تلے کھڑے ہو کر کھسر پھسر شروع کر دی تھی۔ ان میں سے ایک پنڈت تھا اور دوسرے دو فوجی تھے لیکن سپاہی نہیں تھے۔ بڑے عہدے کے افسر معلوم ہوتے تھے۔ یہ تینوں نگرکوٹ سے بھاگے تھے۔ پنڈت اسی مندر میں ہوا کرتا تھا۔ فوجی عہدیداروں کو وہاں سے چلے جانا چاہیے تھا کیونکہ ان کی فوج کچھ ماری گئی اور کچھ کٹ گئی تھی اور ان کے راجہ نے بہت سے سپاہی سلطان محمود کو غلاموں کے طور دے دیئے تھے۔ یہ دونوں عہدیدار اکٹھے اس گاؤں میں آئے تھے۔ پنڈت پہلے ہی آ چکا تھا۔ ان تینوں کو گاؤں والوں نے چھپا لیا تھا۔ تینوں بھڑکے ہوئے تھے اور شکست نے انہیں جذباتی بنا دیا تھا۔ انہیں اس گاؤں سے بھی بھاگ جانا چاہیے تھا۔

"اگر میں تمہاری طرح سپاہی ہوتا تو یوں میدان سے بھاگ کر یہاں نہ آ چھپتا"۔۔۔ پنڈت نے اپنے فوجی عہدیداروں سے کہا۔۔۔ "تمہاری رگوں میں راجپوت باپ کا خون معلوم نہیں ہوتا۔۔۔ اگر تم دیکھ لیتے کہ ان ملیچھوں کے گھوڑے مندر میں کس طرح داخل ہوئے تھے، اگر تم دیکھ لیتے کہ کرشن مراری کو انہوں نے کس طرح گھسیٹا اور سیڑھی کے اوپر

سے نیچے پھینکا تھا۔ انہوں نے مورتیاں اور بھگوت گیتا باہر پھینکی اور میں نے مسلمانوں کو ان کے اوپر چلتے پھرتے دیکھا۔ تم نے اذان نہیں سنی جو ایک مسلمان سپاہی نے مندر کے اوپر کھڑے ہو کر دی تھی۔۔۔ تم نے سنی ہو گی۔ تم نے اپنے مذہب کو، اپنی مذہبی کتابوں کو مسلمانوں کے پاؤں تلے دیکھا ہو گا۔ تم راجپوت ہوتے تو وہیں مر جاتے۔ یہاں نہ آتے۔ تمہیں اپنی جانیں زیادہ پیاری ہیں"۔

"نہیں مہاراج!"۔۔۔ ایک عہدیدار نے ہاتھ پنڈت کے گھٹنے کی طرف لے جاتے ہوئے کہا۔۔۔ "ہم بزدل نہیں"۔

"ہاتھ پیچھے رکھو"۔۔۔ پنڈت نے نفرت سے کہا۔۔۔ "تم بھی ملیچھ ہو۔ جو سپاہی اپنے دھرم پر مرنا نہیں جانتا اُسے بستی میں رہنے کا کوئی حق نہیں۔ تمہارا حق صرف یہ ہے کہ جنگلوں میں دھکیل دیئے جاؤ اور جانوروں کی طرح زندگی بسر کرو۔ تم نہیں جانتے کہ میں آج تین کنواری کنیاؤں کو وہاں سے کس طرح نکال کر لایا ہوں۔ اُن کے چہروں اور ہاتھوں پر سیاہی ملی۔ انہیں مردوں کے کپڑے پہنائے اور نکال لایا۔۔۔ اور وہ جو مندر میں رہ گئی ہیں، اُن کے انجام سے تم واقف ہو گے"۔

"ہم انتقام لیں گے مہاراج!"۔۔۔ دوسرے عہدیدار نے کہا۔

"اگر تم میں اتنی غیرت ہوتی تو تمہاری لاشیں مندر سے اٹھائی جاتیں"۔۔۔ پنڈت نے کہا۔۔۔ "اور تمہاری آتمائیں آکاش پر ہوتیں مگر تم اپنے ملیچھ شریر چھپاتے پھر رہے ہو۔۔۔ اب غزنی کا یہ سلطان دیش کے دوسرے مندروں کا بھی یہی حال کرے گا۔ آج نگرکوٹ کی اینٹ سے اینٹ بجی، کل تھانیسر کی باری ہے۔ تم جانتے ہو تھانیسر ہمارے لیے اتنا ہی مقدس ہے جتنا مسلمانوں کے لیے مکہ اور مدینہ۔ کاش، آج میرے اس بوڑھے جسم میں جوانی آ جائے اور میں غزنی کے سلطان کو قتل کر دوں"۔

"اسی کام کے لیے ہم یہاں رُکے ہوئے ہیں مہاراج!"۔۔۔ ایک عہدیدار نے کہا۔۔۔ "ہم چھپے ہوئے نہیں، رُکے ہوئے ہیں۔ ہم سپاہی نہیں عہدیدار ہیں۔ جو تم سمجھتے ہیں وہ سپاہی نہیں سمجھ سکتے اور جو غیرت ہم میں ہے وہ کسی بھی راجے، کسی بھی مہاراجے اور کسی بھی راجے میں نہیں"۔

"جانتے ہو کیوں؟" — پنڈت نے کہا — "انہیں راج پیارا ہے۔ انہیں مندر سے نہیں محل سے پیار ہے۔ جس کے دل میں راج محل کا پیار ہو جاتا ہے، اُس کے دل سے مندر کی محبت نکل جاتی ہے ... سلطان محمود ایک آدمی ہے۔ ایک انسان ہے۔ اوتار نہیں، لیکن اس ایک انسان نے ہندو راشٹر کو اپنے پاؤں تلے دبا لیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس ایک انسان کو ختم کر دیا جائے تو اس کی ساری فوج ہمارے قدموں میں بیٹھ جائے گی۔"

"مگر اس ایک آدمی کو ختم کرنا آسان نہیں" — ایک عہدیدار نے کہا —
"آپ کو معلوم نہیں۔ میں درویشوں کے بھیس میں اُدھر گیا تھا۔ قلعے کے اندر بھی گیا تھا۔ مجھے کئی جگہ روکا گیا۔ مجھے اچھی طرح دیکھا گیا۔ میں نے ہر جگہ کہا کہ میں تارک الدنیا درویش ہوں۔ صوفی ہوں اور سلطان کو مبارک دینے آیا ہوں مگر مجھے بہت ہی منت سماجت کے بعد سلطان کے محافظوں کے کمانڈر تک جانے دیا گیا۔ کمانڈر نے میری تلاشی لی اور میرے چغے کے اندر کمر کے ساتھ بندھا ہوا خنجر نکال کر کہا کہ درویش کو ہتھیار سے کیا کام! میں نے کہا کہ جس مذہب کا سلطان اتنی دور سے بُت توڑنے کے لیے آیا ہے، اُس مذہب کے کسی پیروکار کو خالی ہاتھ نہیں رہنا چاہیے۔ میں مسلمان ہوں اور ہتھیار مسلمان کا زیور ہے .... اُس نے مجھ سے خنجر لے لیا اور مجھے دربان کے حوالے کر دیا۔ میں نے بڑی غور سے دیکھا کہ غزنی کے سلطان تک پہنچنا ہی آسان نہیں، اسے قتل کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ یہاں وہ ہر کسی کو شک کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ میں مایوس ہو کر واپس آ گیا۔"

"ہم ابھی یہیں رہیں گے" — دوسرے عہدیدار نے کہا — "ہم انتظار کر رہے ہیں کہ سلطان باہر نکلنا شروع کرے گا تو کیا اسے تیر سے یا قریب جا کر خنجر سے قتل کیا جا سکتا ہے؟ ہم اپنی جانیں نہیں بچائیں گے مہاراج! اگر ہم دو آدمی اپنی جانیں قربان کر دیں تو ......"

"تو تم اگلے جنم میں اس دیش کے مہاراجے ہو گے" — پنڈت نے کہا —
"برہمن اور راجپوت بھی تمہارے قدموں میں ماتھے رگڑیں گے" — پنڈت نے

رازداری سے کہا — "میں بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ اس ایک آدمی کو کس طرح ختم کیا جا سکتا ہے۔ میرے ساتھ یہ جو تین لڑکیاں ہیں، ان کا حسن دیکھو۔ میں سوچ رہا ہوں کہ یہ تحفے کے طور پر سلطان کو کس طرح پیش کی جا سکتی ہیں۔ یہ اُسے زہر دے سکتی ہیں۔"

"ناممکن ہے" — ایک عہدیدار نے کہا — "ہمیں بتایا گیا ہے کہ یہ سلطان پتھر دل ہے۔ عورت اور شراب کی بُو سے بھی نفرت کرتا ہے۔ اسی لیے اس کی فوج جس علاقے کو فتح کرتی ہے، وہاں کسی عورت کی بے عزتی نہیں ہوتی۔ عورت کے جال میں سلطان محمود کو لانا ممکن نہیں۔ کوئی اور طریقہ سوچیں۔"

"ہمارے سارے راجوں کو عورت اور شراب نے مارا ہے" — پنڈت نے کہا —
"مسلمانوں کی فتح کا سبب یہی ہے کہ ان دونوں سے دل نہیں لگاتے ... پھر بھی کچھ سوچنا پڑے گا، کچھ کرنا پڑے گا۔ میں راتوں کو سو نہیں سکتا۔ میں نے جس کرشن بھگوان کی دن رات پوجا پاٹ کی ہے، اس کی توہین میری آنکھوں کے سامنے ہوئی ہے۔ اس دیش پر قہر نہ پڑا تو مجھ پر پڑے گا، تم پر پڑے گا۔"

نگرکوٹ کو فتح ہوئے سات آٹھ دن گزر گئے تھے۔ یہ تینوں مندر کی پہاڑی سے دور نیچے ایک گاؤں میں چھپے ہوئے تھے۔ دونوں عہدیدار بھیس بدل کر دو دو بار اوپر گئے تھے مگر سلطان محمود کے قتل کی کوئی صورت نظر نہیں آئی تھی۔ پھر بھی وہ مایوس نہیں تھے۔ پنڈت کی باتیں انہیں مایوس نہیں ہونے دیتی تھیں۔ وہ اب اس امید پر بیٹھے تھے کہ سلطان محمود اس علاقے کی سیر کے لیے باہر نکلے گا۔ انہوں نے دو کمانیں اپنے پاس رکھ لی تھیں۔ یہ گھنا جنگل تھا اور درختوں میں ڈھکی ہوئی اونچی نیچی چٹانیں بھی تھیں۔ کہیں سے بھی چھپ کر تیر چلایا اور غائب ہوا جا سکتا تھا۔

اتنے میں التگین گاؤں میں چلا گیا اور وہاں سے چار آدمی لے آیا۔ دونوں عہدیداروں نے اسے دیکھا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ غزنی کا یہ فوجی ان آدمیوں کو کسی بیگار کے لیے لے گیا ہے۔

کچھ دیر بعد انہوں نے دیکھا کہ گاؤں کے آدمی واپس آرہے تھے۔ ان کے ساتھ التگین تھا اور گاؤں کے ایک آدمی نے کسی کو پیٹھ پر اٹھا رکھا تھا۔ عہدیداروں نے التگین کو پہچان لیا اور وہ چھپ گئے۔ التگین جب ان آدمیوں کے ساتھ گاؤں میں پہنچا تو گاؤں کے دوسرے لوگ بھی جمع ہو گئے۔ بغرا خان کو چارپائی پر ڈال دیا گیا اور دو بوڑھے اس کے زخم اور چوٹیں دیکھنے لگے۔ انہوں نے فوراً اس کا علاج شروع کر دیا۔

التگین کے کہنے پر بغرا خان نے ان بوڑھوں سے کہا۔"اگر گاؤں میں ہمارے ساتھ کسی نے کوئی گڑبڑ کی تو سارے گاؤں کو آگ لگا دی جائے گی اور بوڑھے سے بچے تک کو زندہ جلا دیا جائے گا۔"

"آپ ہمارے بادشاہ ہیں"—— ایک بوڑھے نے کہا۔"سارا گاؤں آپ کی حاضری میں کھڑا رہے گا۔ گڑبڑ کی جرأت کون کر سکتا ہے...... ہم نے اس سے زیادہ گہرے زخموں اور زیادہ خطرناک چوٹوں کا علاج چند دنوں میں کیا ہے۔ آپ پانچ چھ دنوں تک چلنے پھرنے کے قابل ہو جائیں گے۔"

التگین اور بغرا خان کے لیے ایک جھونپڑا خالی کر کے اسے صاف کیا گیا۔ ان لوگوں کے پاس جو صاف ستھرے بستر تھے، وہ انہوں نے بچھا دیئے۔ رات غزنی کے دونوں کمانڈر اس جھونپڑے میں سوئے ہوئے تھے۔ التگین نے بغرا خان سے کہا تھا کہ وہ ان لوگوں کی راہنمائی میں قلعے میں جا کر اپنی اور اس کی اطلاع کر آتا ہے لیکن بغرا خان نے اس خطرے کا اظہار کیا کہ وہ اکیلا رہ گیا تو یہ لوگ اسے غائب کر سکتے ہیں یا زخموں میں زہریلی دوائی ڈال کر خراب بھی کر سکتے ہیں۔

وہ دونوں تو سو گئے تھے۔ تھکن سے ان کے جسم ٹوٹے ہوئے تھے۔ ان سے تھوڑی ہی دور ایک اور جھونپڑے میں پنڈت، دونوں ہندو عہدیدار اور دونوں بوڑھے جنہوں نے بغرا خان کی مرہم پٹی کی تھی، اکٹھے بیٹھے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ پنڈت کہہ رہا تھا —— "انہیں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے پاس طریقے موجود ہیں جن سے ایک بزدل انسان کو درندہ اور درندے کو بزدل بنایا جا سکتا ہے۔"

"سلطان کو اس کے اپنے آدمیوں کے ہاتھوں سے قتل کرایا جائے تو زیادہ

بہتر ہے"—— ایک عہدیدار نے کہا۔"ہم دیکھ چکے ہیں کہ ہم میں سے کوئی بھی اس تک نہیں پہنچ سکتا۔"

"تم دونوں سن لو"—— پنڈت نے دونوں بوڑھوں سے کہا۔"اس مسلمان کے زخم اور چوٹیں اتنی جلدی ٹھیک نہ ہونے دینا۔ مجھے ابھی گھوڑا دو۔ میں تھانیسر جا رہا ہوں۔ گھوڑا ایسا دو جو مجھے بہت تیز لے جائے اور بہت تیز لائے۔"—— دونوں بوڑھے چلے گئے تو اس نے عہدیداروں سے کہا۔"میں تینوں لڑکیوں کو تمہارے سپرد کر چلا ہوں۔ میں انہیں اچھی طرح سمجھا دوں گا۔"

انہوں نے تینوں لڑکیوں کو وہیں بلا لیا اور پنڈت انہیں بتانے لگا کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ اتنے میں گھوڑا تیار ہو گیا۔ پنڈت گھوڑے پر سوار ہوا اور روانہ ہو گیا۔

صبح سویرے التگین کی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ بغرا خان درد سے آہستہ آہستہ کراہ رہا تھا۔ التگین بوڑھے کو بلانے کے لیے باہر نکلا تو دو جوان لڑکیاں دروازے پر کھڑی تھیں۔ التگین کو دیکھ کر مسکرائیں۔ التگین ان کے حسن اور ان کی مسکراہٹوں سے جیسے مسحور ہو گیا ہو۔ ایک لڑکی نے اسے کچھ کہا تو وہ خاموش کھڑا رہا۔ کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ اس نے مسکرا کر سر ہلایا۔ لڑکیاں اندر چلی گئیں جہاں بغرا خان پڑا کراہ رہا تھا۔

"بہت تکلیف ہے؟"—— ایک لڑکی نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

دوسری نے اس کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ بغرا خان کی تو جیسے زبان بند ہو گئی ہو۔ اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ وہ تکلیف سے کراہ رہا تھا۔

"یہ دونوں ہماری زبان نہیں سمجھتے"—— ایک لڑکی نے دوسری سے کہا۔

"میں سمجھتا ہوں"—— بغرا خان نے کہا۔"میں تمہیں دیکھ کر اس لیے چپ ہو گیا تھا کہ اس جنگل میں تم جیسی لڑکیاں کہاں سے آ گئی ہیں!...... تم اس گاؤں کی رہنے والی معلوم نہیں ہوتیں۔"

"ہم اسی جنگل میں پیدا ہوئی ہیں"—— ایک لڑکی نے کہا۔"یہاں کوئی روگی، کوئی دکھی انسان آ جائے تو ہم اس کا درد چوس لیا کرتی ہیں...... میں نے پوچھا تھا کہ بہت تکلیف میں ہو؟"

"درد زیادہ ہے" ___ بغراخان نے جواب دیا اور اُس نے اس لڑکی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا جس نے اُس کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔

"ٹھیک ہو جائے گا" ___ لڑکی نے کہا ___ "میں تمہارے کھانے کے لیے کچھ لاتی ہوں۔"

دونوں لڑکیاں باہر نکل گئیں۔

وہ واپس آئیں تو تین تھیں۔ ایک کے ہاتھ میں منہ ہاتھ دھلانے کے لیے پانی تھا اور باقی دو نے کھانے پینے کا سامان اُٹھا رکھا تھا۔ اس میں دودھ تھا جس میں شہد ملا ہوا تھا۔ لڑکی نے دونوں کے مُنہ ہاتھ دُھلائے۔ انہوں نے دودھ پی لیا اور میوے وغیرہ کھا لیے۔ لڑکیاں خالی برتن لے گئیں تو ذرا دیر بعد بغراخان نے قہقہہ لگایا۔ التگین نے پہلے تو اسے چونک کر دیکھا پھر وہ بھی ہنس پڑا۔ دونوں کو دل کھول کر جیسا کھل کے ہنسے بہت مدت گزر گئی تھی۔ وہ پہلے حضرو کے قریب بڑا ہی خونریز معرکہ لڑے تھے جس میں انہیں کامیابی کی توقع نہیں تھی لیکن راجہ انند پال کے ہاتھی کی آنکھ میں تیر لگا تو اس نے قیامت بپا کر دی۔ مہاراجہ کا جھنڈا اسی ہاتھی پر تھا۔ ہاتھی پیچھے کو بھاگا تو بھگدڑ مچ گئی۔ جھنڈا پیچھے کو آتا دیکھ کر ہندوستانی دستے گھبرا گئے اور اصل صورت حال معلوم کیے بغیر پسپا ہونے لگے۔

التگین اور بغراخان کے دستوں کو حکم ملا تھا کہ دشمن کا تعاقب کرو۔ چنانچہ وہ تعاقب میں گئے۔ ان کے کئی عزیز دوست حضرو کی جنگ میں مارے گئے تھے۔ وہ ہنسی اور مسکراہٹوں سے محروم رہے پھر انہیں نگرکوٹ تک پیش قدمی کرنی پڑی اور یہاں بھی لڑنا پڑا۔ جب موت ہنسا کرتی ہے تو انسان رویا کرتے ہیں۔ یہ دونوں کمانڈر رونے والے نہیں تھے۔ وہ غزنی سے ندیوں، دریاؤں اور چٹانوں اور دشمن کی صفوں کو چیرتے آئے تھے۔ اب جب اس جھونپڑے میں بغراخان نے قہقہہ لگایا اور التگین کی ہنسی نکل گئی تو دونوں نے محسوس کیا کہ جنگ کے جہنم نے ان کے جذبات اور ہنسی کو چوس لیا ہے اور وہ ہنسنا کھیلنا چاہتے ہیں۔

بغراخان نے کہا کہ اسے درد میں خاصا افاقہ ہوا ہے۔ التگین جھونپڑے کے دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بغراخان کو معلوم تھا کہ وہ کس کی راہ دیکھ رہا ہے مگر لڑکیوں کی بجائے دونوں بوڑھے اندر آئے۔ وہ تھے تو دیہاتی اور وہ جاہل سے لگتے تھے لیکن اُن کے انداز میں ایسی خود اعتمادی تھی جیسے وہ اپنے فن کے ماہر ہوں۔ دونوں نے بغراخان کی پٹیاں کھولیں۔ زخم دیکھے۔ چوٹیں دیکھیں اور دونوں نے متفقہ رائے دی کہ آٹھ دن اور لگیں گے۔

ایک اور جھونپڑے میں دونوں ہندو عہدیدار بیٹھے تھے۔ انہوں نے تینوں لڑکیوں کو اپنے پاس بٹھا رکھا تھا۔

"احتیاط سے" ___ ایک عہدیدار نے لڑکیوں سے کہا ___ "دو دن تک اس سے زیادہ مقدار نہ ملانا، ورنہ انہیں شک ہو جائے گا۔ دودھ خود چکھ لیا کرو۔ ذائقے میں ذرا سی بھی تبدیلی دیکھو تو اور دودھ ڈال دو اور اس میں شہد زیادہ ڈالو۔"

"نشہ تو تمہارا اپنا ہے" ___ دوسرے عہدیدار نے ہنس کر لڑکیوں سے کہا ___ "تم انہیں دودھ میں یہ چیز ملائے بغیر بھی ان پر نشہ طاری کر سکتی ہو۔"

"یہ خیال بھی رکھنا کہ تم پر ہی نشہ طاری نہ ہو جائے" ___ عہدیدار نے لڑکیوں سے کہا ___ "دونوں خوبصورت جوان ہیں۔"

"ایسا کبھی نہیں ہوگا" ___ ایک لڑکی نے کہا ___ "یہ تو آپ نے ہمیں فرض ہی ایسا سونپ دیا ہے کہ ہم ان کے پاس چلی گئی تھیں ورنہ ہم تینوں میں سے کوئی بھی ان مسلمانوں کے قریب نہ جائے۔"

"شاید تمہیں اس سے بھی زیادہ آزمائش میں ڈالا جائے" ___ دوسرے عہدیدار نے کہا ___ "اپنے دیس اور اپنے دھرم کی خاطر تمہیں قربانی دینی ہوگی۔ تمہارا فرض یہ ہے کہ انہیں پنڈت ہدا[illegible] کے آنے تک یہیں جال میں الجھائے رکھو۔ پنڈت جی ایک آدمی کو ساتھ [illegible] مسلمانوں کے دلوں اور دماغوں پر قبضہ کر لے گا، پھر ہم ان [illegible] گے۔"

کو آواز دی [illegible] ان نے لے کہا [illegible]

اُس نے پیالے کی طرف اشارہ کر کہا

سلطان محمود غزنوی کے دو کمانڈر ہندوؤں کے بڑے ہی حسین جال میں آ گئے۔
دوسرے تیسرے دن وہ اپنی فاتحانہ حیثیت، اپنے عہدوں اور اپنے فرائض کو بھول چکے تھے۔ انہیں پتہ نہ چل سکا کہ انہیں دودھ میں شہد اور شراب پلائی جا رہی ہے۔ انہوں نے چونکہ کبھی شراب نہیں پی تھی اس لیے دودھ میں ملی ہوئی تھوڑی سی شراب بھی انہیں اتنا سا مخمور کر دیتی تھی کہ وہ ہنسنے کھیلنے لگتے تھے۔ اتنی حسین لڑکیوں نے ان پر اپنا نشہ بھی طاری کر رکھا تھا۔

دو تین دن اور گزرے تو ایک لڑکی نے بغراخان کو اور دوسری نے التگین کو کہنا شروع کر دیا کہ وہ انہیں اپنے ساتھ غزنی لے جائیں۔ دونوں کمانڈروں نے یہ بھی پوچھنے یا دیکھنے کی ضرورت نہ سمجھی کہ اتنی خوبصورت لڑکیاں کون سے باپوں کی بیٹیاں ہیں۔ اس علاقے کے لوگوں کے رنگ تو نکھرے صاف اور بعض کے گورے تھے لیکن یہ لڑکیاں اس علاقے کی معلوم نہیں ہوتی تھیں۔

دونوں بوڑھے بغراخان کا علاج کر رہے تھے اور بغراخان چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا تھا لیکن وہ اس گاؤں سے جانا نہیں چاہتا تھا۔ التگین کا دل بھی اس جھونپڑے کی جنت کا قیدی ہو گیا تھا۔ دونوں دوست لڑکیوں سے کہنے لگے کہ وہ کبھی رات ان کے جھونپڑے میں گزاریں۔ لڑکیوں نے انہیں بتایا کہ ان کے ماں باپ انہیں جان سے مار دیں گے۔ وہ کہتی تھیں کہ والدین نے انہیں ان کی صرف تیمارداری کی اجازت دے رکھی ہے۔ یوں لڑکیاں ان کے جذبات کے ساتھ کھیل رہی تھیں۔ وہ میدانِ جنگ کے تھکے ماندے سپاہیوں کے لیے سراب بنی ہوئی تھیں۔ وہ جس والہانہ انداز سے اظہارِ محبت کرتی تھیں، وہ ان کمانڈروں کو دیوانہ بنا دیتا تھا۔ عریاں کندھوں پر بکھرے لہراتے ریشمی بالوں کو جب وہ چھوتے تھے تو ان کے جسموں پر کپکپی سی طاری ہو جاتی تھی۔

تھوڑی ہی دیر بعد بغراخان نے دونوں کا ایک بہت بڑا بُت خانہ اُجاڑ ڈالا تھا اور دیکھتے ہیں ... ان کے جذبات ... کے دو کمانڈر ہندوؤں سے ... جیسے جاگتے ہو

"تم نے مجھے بدبودار لاشوں اور خون کی بدبو سے اٹھا کر ایسی دنیا میں پہنچایا ہے جہاں مجھے یہ جھونپڑا بھی محل لگتا ہے"۔۔۔ ایک روز بغراخان نے اپنی لڑکی سے کہا۔
"کہو تو میں تمہیں اس سے بھی زیادہ حسین دنیا میں پہنچا سکتی ہوں"۔۔۔ لڑکی نے کہا۔۔۔ "لیکن میں جو کچھ بھی کروں، تم کوئی اعتراض نہ کرنا"۔۔۔ اور وہ چلی گئی۔ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں مٹی کا ایک پیالہ تھا۔ اس نے پیالہ بغرا کو دے کر کہا۔۔۔ "پیو۔ یہ اس جنگل کے ایک درخت کے پھل کا رس ہے۔ یہ صرف اس خطے میں ہوتا ہے"۔
بغراخان نے پیالہ منہ سے لگایا۔ تین چار گھونٹ پیے ہوں گے کہ لڑکی نے پیالہ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ بولی۔۔۔ "ایک ہی بار نہ پیو"۔
بغراخان نے اس ذائقے کی کوئی چیز پہلے کبھی نہیں پی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اسے سرور آنے لگا۔ اس نے لپک کر لڑکی کو اپنے بازوؤں میں دبوچ لیا اور مستانہ سی آواز میں بولا۔۔۔ "میں اب چل پھر سکتا ہوں لیکن تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ اگر سلطان مجھے تم سے جدا کرے گا تو اس کا بھی حکم نہیں مانوں گا"۔
"تم نے کبھی شراب پی ہے؟"۔۔۔ لڑکی نے کہا۔۔۔ "سنا ہے مسلمان شراب نہیں پیا کرتے"۔
"میں شراب پر لعنت بھیجتا ہوں"۔۔۔ بغراخان نے کہا۔۔۔ "تم ہو تو مجھے شراب کی کیا ضرورت ہے"۔
"میں تمہیں شراب پلا چکی ہوں"۔۔۔ لڑکی نے کہا۔۔۔ "سچ بتاؤ، کیا تم اس چیز کو حرام سمجھتے ہو؟"
وہ سنجیدہ ہو گیا اور کچھ سوچنے لگا۔ لڑکی کا چہرہ اس کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے لڑکی کا چہرہ پھیلتا چلا گیا اور پھر بغراخان بھول گیا کہ حرام کیا اور حلال کیا ہے۔
"التگین!"۔۔۔ اس نے اپنے دوست کو آواز دی۔ التگین اسی جھونپڑے کے دوسرے کمرے میں تھا۔ دوڑا آیا۔ بغراخان نے اسے کہا۔۔۔ "دیکھو یہ لڑکی کتنی اچھی چیز کو شراب کہتی ہے۔ لو، تم بھی پیو"۔۔۔ اس نے پیالے کی طرف اشارہ کیا۔ التگین نے

پیالہ اٹھایا اور منہ سے لگالیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ بھی اُنہی آسمانوں میں اڑنے لگا جن میں بغراخان اڑ رہا تھا۔

انہوں نے اپنے آپ پر شراب حلال کرلی لیکن اسے وہ شراب نہیں کہتے تھے۔

ایک روز دونوں لڑکیاں جھونپڑے میں آئیں تو انہوں نے دونوں کمانداروں کو اپنے پاس بٹھا لیا۔ ایک لڑکی نے بغراخان سے بات شروع کی۔

"تم نے ہم سے کبھی بھی نہیں پوچھا تھا کہ ہم کس کی بیٹیاں ہیں اور ہم کون ہیں" ــــ لڑکی نے کہا۔"ہم اس گاؤں کی رہنے والی نہیں۔ ہم دونوں کے باپ تاجر ہیں تمہاری فوج جب نگرکوٹ کی طرف آرہی تھی تو ہم اپنے باپوں کے ساتھ نگرکوٹ کے مندر میں پوجاپاٹ کے لیے آئی ہوئی تھیں۔ تمہاری فوج کی خبر سن کر ہمارے باپ ہمیں واپس اپنے گھروں کو لے جانے کی بجائے اس گاؤں میں لے آئے تیسری لڑکی میری قریبی رشتہ دار ہے۔ ہمارے باپوں نے اس گاؤں کے لوگوں سے کہا کہ مسلمانوں کی فوج آرہی ہے اور اتنی جوان اور خوبصورت لڑکیوں کو ساتھ لیے پھرنا ان کے لیے بہت خطرناک ہے۔ انہوں نے گاؤں والوں سے کہا کہ وہ ہم تینوں لڑکیوں کو یہاں چھپا لیں۔ جب خطرہ ٹل جائے گا تو وہ ہمیں لے جائیں گے۔ وہ اب آگئے ہیں اور ہمیں ساتھ لے جائیں گے۔ اپنے دوست کو اپنی زبان میں سمجھاؤ کہ تم دونوں ہمارے ساتھ چلو۔ ہمارے باپ تمہیں اپنے ساتھ لے جانے پر راضی ہو جائیں گے"

بغراخان نے التگین سے بات کی تو اُس نے کہا کہ ہم فوج کے آدمی ہیں۔ اگر ہم پکڑے گئے تو ہمیں غدار اور بھگوڑا کہا جائے گا اور ہمارے سر قلم کر دیئے جائیں گے۔ اگر یہ لڑکیاں ہمارے ساتھ رہنا چاہتی ہیں تو ہم انہیں ساتھ رکھنے کا کوئی اور طریقہ اختیار کریں گے۔ انہیں ہمارے ساتھ چلنا چاہیئے۔

لڑکیاں مایوس ہو کر چلی گئیں۔ تھوڑی دیر بعد دو آدمی آئے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ لڑکیوں کے باپ ہیں۔ انہوں نے لڑکیوں کو اس گاؤں میں لانے کی وہی وجہ بتائی جو لڑکیاں بتا چکی تھیں۔ انہوں نے اپنا مسئلہ یوں پیش کیا کہ وہ لڑکیوں کو لے جانے آئے ہیں لیکن راستے میں مسلمان فوجیوں کا خطرہ ہے۔ لڑکیاں اتنی خوبصورت

ہیں کہ جس کی نظر پڑ گئی وہ اٹھا لے جائے گا۔ اس خطرے سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ بغراخان اور التگین ان کے ساتھ چلیں اور منزل پر پہنچا کر واپس آجائیں۔ ان کو انہیں اتنا انعام ملے گا جو وہ اپنے تصور میں بھی نہیں لا سکتے

"ہم تمہیں منزل پر پہنچا دیں گے" ــــ بغراخان نے کہا۔"لیکن ہمارا انعام یہ لڑکیاں ہوں گی۔ اگر تمہیں منظور نہیں تو تم چلے جاؤ"

"انہی کی خاطر تو میں نے اتنا خطرہ مول لیا تھا" ــــ ایک لڑکی کے باپ نے کہا ــــ "میں اپنی لڑکی کو تمہارے حوالے نہیں کرسکتا"

"اور تم لڑکیوں کو یہاں سے نہیں لے جا سکتے" ــــ بغراخان نے کہا

اُسی رات کا ذکر ہے۔ دونوں لڑکیاں بغراخان اور التگین کے پاس آئیں اور انہیں شراب پلا رہی تھیں۔ دونوں کے ذہن اپنے قابو سے نکل گئے[illegible] جھونپڑے کا دروازہ کھلا اور ایک درویش صورت آدمی اندر آیا۔ اُس [illegible] سفید داڑھی تھی اور سر کے بال لمبے تھے۔ اُس نے چغہ پہن رکھا تھا۔ [illegible] میں لمبا عصا تھا جس کے سر پر لکڑی کا سانپ بنا ہوا تھا۔ لڑکیوں نے [illegible] کھا[illegible] تیزی سے اٹھیں اور درویش کے پاؤں چھوئے۔ انہوں نے بغراخان اور ا[illegible] کو بتایا کہ یہ ایک جوگی ہے جو کبھی کبھی ادھر سے گزرتا ہے۔ کسی کو معلوم نہیں کہ [illegible] رہتا ہے اور اس کا مذہب کیا ہے۔ آنے والے وقت کی با[illegible] بتاتا ہے۔ جنگل کے سانپ اس کے مرید ہیں۔ راجے اور مہاراجے بھی اس کے آگے سجدے کرتے ہیں، لیکن یہ خود جنگلوں میں کہیں رہتا ہے۔

"تم زندہ نہیں رہ سکتے تھے" ــــ جوگی نے بغراخان سے کہا ــــ "اتنی دور اوپر سے تم گرے اور بچ گئے۔ موت ابھی ٹلی نہیں۔ میرے قریب آؤ"

جوگی نے بغراخان کو اپنے سامنے بٹھا لیا اور چراغ دان قریب کر لیا۔ اُس نے ایک ہیرا سا نکالا اور اس طرح اپنے اور بغراخان کے درمیان کیا کہ دیئے کی روشنی

اس پر پڑتی اور اس سے رنگ برنگی کرنیں بغراخان کی آنکھوں میں پڑتی تھیں۔ یہ رنگ دلکش اور پر فریب تھے۔ جوگی نے بغراخان سے کہا کہ آنکھیں کھلی رکھو اور اس ہیرے کو دیکھتے رہو۔

"اس میں تمہیں ایک رنگ موت کا اور ایک زندگی کا نظر آئے گا۔" جوگی نے کہا ــــ "ہم دیکھیں گے کہ تمہارا رنگ کون سا ہے۔"

رنگ ایسے دلفریب تھے اور جوگی کی باتوں کا بھی اثر تھا کہ بغراخان مدہوش سا ہونے لگا۔ اُس نے شراب بھی پی رکھی تھی۔ اُس کا شعور پہلے ہی مدہوش تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ جوگی نے اپنی نظریں اُس کی آنکھوں میں جما رکھی ہیں۔ جوگی مخمور سی آواز میں کہہ رہا تھا ــــ "مجھے ایک بڑی حسین زندگی نظر آ رہی ہے۔ میں ہوں اور وہ لڑکی ہے جسے میں چاہتا ہوں۔ میں اس زندگی کا بادشاہ ہوں۔"

جوگی نے ہیرا شیشہ اوپر کیا۔ بغراخان کی نظریں اُس پر جمی رہیں۔ جوگی ہیرے کو اپنی آنکھوں کے سامنے لے گیا۔ پھر بغراخان کو محسوس ہی نہ ہوا کہ ہیرا درمیان سے ہٹ گیا ہے اور اُس کی نظریں جوگی کی آنکھوں میں جکڑی گئی ہیں اور جوگی کے الفاظ جن میں موسیقی سی تھی، آنکھوں کی راہ اُس کے ذہن میں اُترتے جا رہے ہیں۔ وہ ہپناٹائز ہو چکا تھا۔ وہ ایسے لہجے میں بولنے لگا جیسے خواب میں بول رہا ہو۔

"ہاں... یہی جنت ہے۔ مجھ سے یہ جنت کوئی نہیں چھین سکتا... میں غزنی کا بادشاہ ہوں... میں قتل کر دوں گا... میری تلوار پیاسی ہے۔"

التگین دیکھ رہا تھا مگر اسے ایک لفظ بھی پلے نہیں پڑ رہا تھا۔ جوگی نے اُسے اپنے سامنے بٹھا لیا اور اُس پر بھی وہی عمل کیا اور وہ بھی ذرا سے وقت بعد بغراخان کی طرح بولنے لگا۔

انسان جب اپنے کردار کو گناہوں کے دلفریب رنگوں میں رنگ لیتا ہے تو اسے ہپناٹائز ہوتے دیر نہیں لگتی۔ گناہوں کی محبت اور شراب کی یہی کرشمہ سازی ہے کہ انسان کی روحانی قوت ختم ہو جاتی ہے۔ اس کی شخصیت مر جاتی ہے اور وہ حسین بندھن کے فریب میں جلدی آ جاتا ہے۔ یہ عمل آج بھی ایسے ہی ہوتا ہے، صدیوں پہلے بھی ایسے ہی

ہوتا تھا۔ انسان اور شیطان کی چپقلش، نیکی اور بدی کی یہ کشمکش انسانی زندگی میں روزِ اوّل سے ہی شروع ہو گئی تھی۔ شیطان نے انسان کے آگے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ خدا نے انسان سے کہا تھا کہ شیطان کی بات نہ سننا مگر شیطان نے ایسے طلسماتی حربے استعمال کیے کہ انسان نے شیطان کے آگے سجدے شروع کر دیئے۔

اسلام ایک سچا مذہب ہے جس کی بنیاد اخلاقیات پر رکھی گئی ہے۔ مخالف قوتوں نے اسلام کو شکست دینے کے لیے بدی کی قوت استعمال کی۔ بدی میں وہ حسن اور کشش پیدا کی جو انسان کی کمزوریوں کو ابھارتی اور روحانی قوت کو کمزور کرتی ہے۔ اسلام کو آتش پرست اور بُت پرست سمجھے، یہود و ہنود سمجھے اور انہوں نے اسلام کی اخلاقی قدروں کا توڑ نکال لیا۔ یہودیوں نے اپنی بیٹیاں استعمال کیں۔ صلیبیوں نے اپنی بیٹیاں استعمال کیں۔ شراب اور زر و جواہرات کو ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔ نشہ آور اشیا کا سہارا لیا اور اخلاقیات کے علمبردار اس جال میں آ کر ہتھیار ڈالتے چلے گئے۔

بغراخان اور التگین کے ذہنوں پر دو بڑی ہی حسین لڑکیوں اور شراب کا پہلے ہی قبضہ ہو چکا تھا۔ روح پر نشہ طاری ہو چکا تھا۔ جسم پر قبضہ مشکل نہ تھا۔ یہ جوگی اُن شعبدہ بازوں میں سے تھا جو تاریخ کے ہر دور میں ساری دنیا میں مشہور رہے ہیں۔ رسّے کو بین بجا کر لاٹھی کی طرح کھڑا کر دینا ان کا کمال تھا۔ انسانوں کے ہجوم کو ہپناٹائز کرنے میں یہ لوگ ماہر تھے۔ ماں کے ہاتھوں اُس کے دودھ پیتے بچے کو مروا دینا ان کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔

پنڈت اسی کو بلا لانے کے لیے کہیں چلا گیا تھا۔ وہ دو تھے۔ پہلے انہوں نے یہ حربہ استعمال کیا تھا کہ یہ لڑکیوں کے باپ ہیں۔ لڑکیوں نے دونوں کمانداروں کو اپنے ساتھ چلنے کو کہا لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ اس کے بعد انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ انہیں شعبدہ بازی سے اپنا غلام بنا لیا جائے۔

شراب اور لذت پرستی نے پہلے ہی زمین ہموار کر رکھی تھی۔ جوگی نے ان کے ذہنوں کو اپنے قبضے میں لے لیا۔

صبح طلوع ہوئی تو یہ قافلہ نگرکوٹ سے بہت دور نکل گیا تھا۔ بغرلخان اور التگین گھوڑوں پر سوار تھے۔ ساتھ دس بارہ شتر تھے۔ ان کی پالکیوں میں لڑکیاں تھیں اور ایک میں پنڈت۔ وہ دونوں آدمی بھی ساتھ تھے جنہیں پنڈت ساتھ لے گیا تھا اور دونوں ہندو عہدیدار بھی ساتھ تھے۔ بغراخان اور التگین شہزادوں کی طرح گردنیں تانے ہوئے تھے۔ وہ ہنس رہے تھے اور جن کے وہ قیدی تھے انہیں وہ اپنا غلام سمجھے ہوئے تھے۔

قافلہ چلتا رہا، رکتا رہا، بغراخان اور التگین کو کھانے اور دودھ میں کوئی نشہ آور دوائی دی جاتی رہی اور وہ اپنے آپ سے، اپنے مذہب اور اپنے وطن سے بے خبر ہوتے چلے گئے۔

اور یہ قافلہ تھانیسر پہنچ گیا۔ تھانیسر اُس دور میں بہت بڑا مندر تھا۔ نگرکوٹ سے بھی بڑا۔ مورخوں نے لکھا ہے کہ ہندوؤں کے لیے اُس کی حیثیت وہی تھی جو مسلمانوں کے لیے مکہ معظمہ کی تھی۔ اس مندر کے تہہ خانے بھی تھے۔ اس میں غلام گردشیں اور اندرونی راستے بھول بھلیوں جیسے تھے۔ وہاں کے بڑے پنڈت کو معلوم تھا کہ غزنی کی فوج کے دو کمانداروں کو نشے کے زیرِ اثر لایا جا رہا ہے اور اُن کے ہاتھوں محمود غزنوی کو قتل کرایا جائے گا کیونکہ محمود تک اُس کی اپنی فوج کا ہی کوئی آدمی پہنچ سکتا ہے۔

ان دونوں کے لیے مندر کے تہ خانے میں دو کمرے تیار کیے گئے تھے۔ انہیں کسی محل کے کمرے بنا دیا گیا تھا۔ اندر ایسی خوشبو چھوڑ دی گئی تھی جو مدہوشی اور سرورطاری کر دیتی تھی۔ بستر نرم و گداز تھے اور چھتوں کے ساتھ رنگین فانوس لٹک رہے تھے۔ یہ دونوں کماندار جب وہاں پہنچے تو اُن کا استقبال کرنے والے اُن کے آگے جھک گئے اور انہیں اپنے اپنے کمرے میں لے گئے۔ اُن کی خدمت اور دیکھ بھال کے لیے عورتیں آ گئیں۔ وہ جوان نہیں تھیں۔

بڑے پنڈت نے انہیں لانے والوں کو الگ کر کے یہ خبر سنائی کہ سلطان محمود غزنی چلا گیا ہے اور اپنی تھوڑی سی فوج نگرکوٹ میں چھوڑ گیا ہے۔ یہ پتہ نہیں چل سکا

کہ وہ جلدی واپس آنے کے لیے گیا ہے یا کتنے عرصے بعد واپس آئے گا۔ اس صورت میں، ان دونوں آدمیوں کو یہاں رکھنا بڑے پنڈت کی نگاہ میں بیکار تھا۔

"وہ آئے گا" ۔۔۔ ہندو عہدیداروں نے کہا ۔۔۔ "وہ ضرور آئے گا۔ یہ آدمی ہمارے ہاتھ آ چکے ہیں۔ انہیں ہم تیار کر لیتے ہیں۔ یہ ہمارے کام آئیں گے۔ ہم انہیں مسلمانوں کی فوج کے سپہ سالاروں کے قتل کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔"

اُن کے متعلق فیصلہ کیا گیا کہ انہیں یہیں رکھا جائے، اور سلطان محمود کے قتل کے لیے تیار کیا جائے۔

سلطان محمود غزنوی غزنی چلا گیا تھا۔ غزنی کے مغرب میں غور کا پہاڑی علاقہ تھا جس کا حکمران محمد بن سوری تھا۔ اُس نے دیکھا کہ سلطان محمود ہندوستان میں برسرِ پیکار ہے تو اُس نے دس ہزار نفری کی فوج ساتھ لی، اور غزنی کے قریب خیمہ زن ہو گیا۔ اُس نے خیمہ گاہ کے اردگرد خندق کھود لی۔ اس دفاع کے علاوہ اس فوج کو قدرت نے بھی دفاع مہیا کر رکھا تھا۔ وہ اس طرح کہ محمد بن سوری نے ایسی جگہ کیمپ کیا تھا جس کے تین طرف پہاڑیاں تھیں۔ صرف ایک طرف تھوڑی سی جگہ خندق نہیں تھی اور اس طرف پہاڑی بھی نہیں تھی۔

اس طرح یہ کیمپ قلعے کی طرح ناقابلِ تسخیر ہو گیا تھا۔ اس سے سوریوں کی فوج یہ فائدہ اُٹھاتی تھی کہ اس کے جیش باہر آ کر غزنی کی فوجی چوکیوں پر شب خون مارتے اور اپنے کیمپ میں چلے جاتے تھے۔ دو مرتبہ غزنی کی فوج کے ایک دستے نے ایک جیش کا تعاقب کیا اور دشمن کے کیمپ تک جا پہنچا۔ آگے خندق تھی۔ اندر جانے کا جو کھلا راستہ تھا، وہاں سے تیراندازوں نے تیروں کا مینہ برسا دیا۔ کچھ دیر غزنویوں نے تیروں کا جواب تیروں سے دیا لیکن خندق آگے نہیں جانے دیتی تھی۔

دو بار ایسے ہی ہوا۔ غزنوی فوج پریشان ہو گئی۔ سوریوں کے شب خون بڑھنے لگے۔ وہ غزنوی فوج کی جنگی طاقت آہستہ آہستہ کمزور کر رہے تھے۔ موزوں وقت پر انہیں غزنی پر حملہ کرنا تھا۔ غزنی والوں نے سلطان محمود کو خبردار کر دینا مناسب سمجھا۔ یہ خطرہ بھی تھا کہ

سلطان محمود کے دوسرے سلمان دشمن سُوریوں کی مدد کے لیے آ سکتے تھے۔ سلطان محمود کو یہ اطلاع اُس وقت ملی جب وہ نگرکوٹ کا محاصرہ کئے ہوئے تھا۔ اس اطلاع پر وہ بھڑک گیا تھا۔ اسی غصے میں اُس نے نگرکوٹ پر یلغار کا حکم دے دیا۔ یہ یلغار اتنی دلیرانہ اور اتنی بہیت ناک تھی کہ قلعے والوں نے مقابلہ ترک کر دیا اور ہتھیار ڈال دیئے۔ مندر کا صفایا کر کے بُتوں کو اوپر سے نیچے پھینک کر اُس نے فوج کو یوں تقسیم کیا کہ ایک حصہ اپنے ساتھ غزنی لے جانے کے لیے الگ کیا اور دوسرا نگرکوٹ میں رہنے دیا۔

اُس کا کوچ بہت تیز ہوا کرتا تھا۔ اُس وقت کے وقائع نگار لکھتے ہیں کہ غزنی کو کوچ کے دوران سلطان محمود جتنا غصے میں تھا، اتنا غصے میں اسے کبھی نہیں دیکھا گیا تھا۔ اُس نے دشمن کے عوام کو کبھی پریشان نہیں کیا تھا۔ اُس کی لڑائی فوجوں کے ساتھ ہوتی تھی۔ اپنے حریفوں کے لیے وہ سراپا قہر تھا مگر اب کے غزنی کو جاتے ہوئے اُس نے اپنی فوج کو یہ حکم دیا کہ پڑاؤ بہت کم ہوں گے اس لیے سوار اپنے گھوڑوں کو کھیتوں میں سے گزاریں تاکہ گھوڑے چلتے چلتے فصل کھاتے چلیں۔ ہاتھیوں، اونٹوں اور بیل گاڑیوں کے بیلوں کے لیے بھی یہی حکم دیا گیا۔ پیادہ فوج کو حکم دیا گیا کہ راستے میں کوئی بھی بڑا گاؤں آئے، اُس کے لوگوں سے کہیں کہ تنور جلائیں، آٹا گوندھیں اور روٹیاں پکا دیں۔

مورخ لکھتے ہیں کہ محمود غزنوی کی فوج جس راستے سے گزری، فصلوں کا صفایا کرتی گئی۔ راستے میں آنے والے دیہات میں اناج نہ رہا۔ دودھ اور مکھن نہ رہا۔ بعض جگہوں پر فوج نے مویشی ذبح کئے اور کھا گئے۔ صرف عُتبی ایک مورخ ہے جس نے سلطان محمود کے ان احکام کی وضاحت کی ہے۔ اُس نے لکھا ہے کہ سلطان کو سُوریوں پر بھی غصہ تھا لیکن زیادہ تر غصہ پنجاب کے راجہ انند پال پر تھا کیونکہ وہ باجگزار ہوتے ہوئے ہندوستان کی ریاستوں کی فوجیں اکٹھی کر کے انہیں متحدہ کمان میں لے لیتا اور غزنی پر حملے کے منصوبے بناتا رہتا تھا۔ چنانچہ سلطان محمود نے انند پال کو ڈرانے کے لیے یہ حکم دیا تھا کہ پنجاب میں سے گزرتے ہوئے اس میں کچھ بھی نہ چھوڑا جائے۔

سُوریوں کی توقع کے خلاف سلطان محمود بہت جلدی غزنی پہنچ گیا۔ اُس نے اپنا ایلچی

محمد بن سُوری کے پاس اس پیغام کے ساتھ بھیجا کہ اپنی قوم سے بے وفائی کرنے والوں کا انجام اچھا نہیں ہُوا کرتا۔ سلطنتِ اسلامیہ کو ریاستوں میں تقسیم کر کے حکمران بننے والوں کے نیچے سے تخت ہی نہیں زمین بھی نکل جایا کرتی ہے۔ قوم کو دھوکے میں رکھ کر لوگوں کو قوم سے الگ کرنا اور لڑانا ایسا گناہ ہے جس کی سزا خدا دُنیا میں دیتا ہے۔ لوگوں کو دھوکہ دینے کے لیے ہاتھ میں قرآن لے کر تخت پر بیٹھنے والوں کے لیے اُن کے اپنے عمل جہنم بن جایا کرتے ہیں ..... اگر اپنی دنیا اور اپنی عاقبت سنوارنا چاہتے ہو تو میرا ساتھ دو۔ میرے ساتھ ہندوستان چلو۔ وہاں محمد بن قاسم کی سرزمین بُت خانہ بن گئی ہے۔ آؤ، وہاں چل کر مسجدوں کو آباد کرتے اور انسانوں کو صراطِ مستقیم دکھاتے ہیں۔

سلطان محمود نے پیغام میں لکھا کہ میں تمہارے آگے درخواست پیش نہیں کر رہا۔ ایمان فروشی تمہیں جس انجام تک پہنچائے گی، میں تمہیں وہ انجام دکھا رہا ہوں۔ گمراہی کا نشہ تمہیں اُس پستی میں پھینکے گا جہاں تاریخ رہتی دنیا تک تم پر لعنت بھیجتی رہے گی۔ میں تمہیں دو دنوں کی مہلت دیتا ہوں۔ میرے پاس آنا چاہو تو بھائیوں کی طرح آجاؤ۔ یہ پسند نہیں تو اپنی فوج واپس لے جاؤ۔

ایلچی جب محمد بن سُوری کے پاس پہنچا تو اُس نے رعونت سے پیغام ایلچی کے ہاتھ سے چھینا اور بولا "صلح کا پیغام لائے ہو؟" — ایلچی خاموش کھڑا رہا۔

محمد بن سُوری نے پیغام پڑھا اور قہقہہ لگا کر بولا — "کیا تمہارے سلطان نے مجھے بھی انند پال اور بجی رائے سمجھ لیا ہے؟ جاؤ، اُس بدصورت سے کہو کہ محمد بن سُوری تمہارے کہنے سے نہیں جائے گا۔ ہمت ہے تو خود آؤ۔ ہم جانے کے لیے نہیں آئے" — اُس نے گرج کر کہا "جاؤ، اور اُس غلام بن غلام سے کہو کہ آجاؤ اور غزنی کی سلطنت طشتری پر رکھ کر لانا۔"

سلطان محمود غزنوی کو ان لوگوں سے ایسے ہی جواب کی توقع تھی۔ غور کے یہ لوگ جنگجو کم اور لٹیرے زیادہ تھے۔ سلطان محمود غزنوی کے والد سلطان سبکتگین کے دور میں بھی وہ کسی بہانے پر غزنی کے علاقے میں لوٹ مار کرتے رہتے تھے۔ اب سلطان محمود انہیں فیصلہ کن

شکست دینے کا تہیہ کر چکا تھا۔ یہ پہلی بار تھی کہ سُوری دس ہزار فوج لے کر آیا اور غزنی کی سرحد کے اندر خیمہ زن ہو گیا تھا۔ سلطان محمود نے اپنے دو جرنیلوں التن تاش اور ارسلان جاذب سے کہا کہ وہ سُوری خاندان کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔

سلطان محمود نے بھیس بدلا اور سُوریوں کا کیمپ دیکھنے چلا گیا۔ اُس نے دل ہی دل میں سُوریوں کے دفاعی انتظامات کی تعریف کی اور سوچنے لگا کہ وہ ان کے اِس کیمپ کو ان کا قبرستان کس طرح بنا سکتا ہے لیکن اُسے یہ کام آسان نظر نہیں آتا تھا۔ حضرو کے مقام پر سلطان نے اپنے دستوں کو بالکل اسی طرح کے کیمپ میں رکھا اور ارد گرد خندق کھدوائی تھی۔ دشمن کی تیس ہزار نفری نے کیمپ پر ہلہ بولا تھا تو نقصان دشمن کا ہی ہوا تھا۔ سُوریوں کا اُسی قسم کا دفاع دیکھ کر سلطان محمود پریشان ہو گیا۔ واپس آکر اُس نے اپنے سالاروں کو تفصیل سے بتایا کہ دشمن خندق کے پیچھے ہے جہاں سے اُسے نکالنا آسان نہیں ہوگا۔

رات بھر سوچ بچار ہوتی رہی اور رات کو ہی سلطان محمود نے فوج کو پیشقدمی کا حکم دے دیا۔ فوج کو دشمن کے کیمپ سے کچھ دُور تیاری کی حالت میں رُکنے کو کہا گیا۔ صبح سلطان خود بھی روانہ ہو گیا اور جاتے ہی اُس نے حملے کا حکم دے دیا۔ سُوری تیر اندازوں نے غزنی کی فوج کو قریب نہ آنے دیا۔ سلطان محمود نے اُس جگہ پر ہلہ بولنے کا حکم دیا جہاں خندق نہیں تھی۔ یہ کیمپ کے اندر باہر آنے جانے کا فراخ راستہ تھا مگر سُوریوں نے باہر آکر آمنے سامنے کا معرکہ ایسے قہر سے لڑا کہ غزنویوں کے پاؤں اُکھڑنے لگے۔

سُوری آگے آتے، لڑتے اور پیچھے ہٹ کر کیمپ میں چلے جاتے۔ اُن پر کسی اور طرف سے حملہ نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ ہر طرف پہاڑیاں بھی تھیں اور خندق بھی۔ سہ پہر کے وقت سلطان محمود نے اپنے دونوں سالاروں کو ایک اور چال بتائی اور اس کے مطابق خود ہلہ بولا۔ محمد بن سُوری نے دیکھ لیا کہ سلطان خود آ رہا ہے۔ اُس وقت تک غزنی کی فوج کا بہت نقصان ہو چکا تھا جس سے سُوریوں کے حوصلے بلند ہو گئے تھے۔ محمد بن سوری نے سلطان محمود پر دھاک بٹھانے کے لیے اُس کا ہلہ روکنے کو زیادہ نفری کے دو دستے باہر بھیج دیے۔

تصادم خونریز تھا۔ سلطان محمود آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے ایسا حکم دیا جس نے اُس کے کو حیران کر دیا۔ سلطان نے چلّا کر کہا — "بھاگو ورنہ سُوری کسی کو زندہ نہیں چھ ے" — اور وہ پیچھے کو بھاگ اُٹھا۔

اُس کا مضمون ور آوازیں سنائی دیں — "بھاگو۔ سُوری آ رہے ہیں۔ بھاگو" —

یہ آوازیں سوریوں نے بھی سنیں۔ محمد بن سُوری دیکھ رہا تھا۔ اُس نے حکم دیا — "تعاقب کرو۔ انہیں غزنی تک نہ پہنچنے دو" — اور اُس نے یہ حکم بھی دیا — "سلطان محمود کو زندہ میرے سامنے لاؤ... غزنی کی اینٹ سے اینٹ بجا دو"

سُوری لشکر تعاقب میں نکل پڑا۔ کیمپ خالی ہو گیا۔ کم و بیش تین میل دُور جا کر سلطان محمود نے پسپائی روک دی اور دستوں کو جو پہلے دی ہوئی ہدایت کے مطابق ترتیب اور تنظیم سے بھاگ رہے تھے، پیچھے مُڑنے کا حکم دیا۔ کمانڈروں کو اس چال کا پہلے سے علم تھا۔ سلطان نے پیچھے مُڑ کر اپنے تعاقب میں آتے سوریوں کا آمنے سامنے کا مقابلہ کیا۔ سالار التن تاش اور سالار ارسلان جاذب اس چال کے منتظر تھے۔ ان میں سے ایک نے سُوریوں کے کیمپ کا راستہ روک لیا، اور دوسرے نے پہلو سے حملہ کر دیا۔ مؤرخ عُتبی نے لکھا ہے "یہ سیدھے سادے سُوری سلطان محمود جیسے شاطر جرنیل کے پھندے میں آگئے اور اب جو لڑائی ہو رہی تھی یہ غزنی کی فوج کے ہاتھوں سُوری فوج کا قتلِ عام تھا۔"

سورج غروب ہونے سے پہلے سُوریوں کا سورج ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔ محمد بن سُوری بھاگ نہ سکا۔ اُسے ایک کھڈ میں سے پکڑا گیا جہاں وہ اپنے دو درباریوں کے ساتھ چھپا بیٹھا تھا۔ ان تینوں کو سلطان محمود کے خیمے میں پیش کیا گیا۔

"محمد!" — سلطان محمود نے کہا — "میں نے پرسوں جو تمہیں لکھا تھا وہ آج ایک حقیقت بن کر تمہارے سامنے آگیا ہے۔ تمہیں شکست دے کر مجھے خوشی نہیں ہوئی۔ آج جن دونوں فوجوں کا نقصان ہوا ہے، انہیں کسی اور مقصد کے لیے لڑنا تھا۔ خدا کا یہ قانون میری سمجھ سے بالا ہے کہ گناہگار حکمرانوں کی سزا بے گناہ رعایا کو بھی ملتی ہے۔"

سلطان محمود بول رہا تھا کہ محمد بن سُوری کا پہلے سر ڈولا، پھر وہ گھٹنوں کے بل گرا

اور ڈھلک گیا۔ اسے سنبھالنے لگے تو دیکھا کہ اس کی آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں ـــــ وہ مر گیا تھا۔ اس کے ساتھ جو درباری تھے، انہوں نے بتایا کہ محمد بن سوری نے جو انگوٹھی پہن رکھی ہے، اس میں زہریلا ہیرا تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ فوج ماری گئی ہے اور اس کے اپنے نکل بھاگنے کی کوئی صورت نہیں رہی تو ہیں ساتھ لے کر یہ ایک کمرہ میں اتر گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے انگوٹھی سے ہیرا نکالا اور نگل لیا اور فوراً بعد اسے پکڑنے والے پہنچ گئے۔

یہ معرکہ ۱۰۱۰ء (۴۰۱ ہجری) کے موسم گرما میں لڑا گیا۔

سلطان محمود غزنوی کو ہندوستان سے آئے چھ سات مہینے گزر گئے تھے۔ اسے اطلاعیں مل چکی تھیں کہ دلی سے تیس چالیس میل مغرب کی طرف تھانیسر میں بہت بڑا مندر ہے جس میں بہت سے بت ہیں۔ ان میں ایک بت جگ سوما نام کا ہے جس کے متعلق ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ یہ انسان کی پیدائش کے ساتھ ہی وجود میں آیا تھا اور اولین انسانوں نے اسی کی پرستش کی تھی۔ بعض مؤرخوں نے اسے چکر سوامی کہا ہے اور یہ بھی کہ یہ وشنو دیوتا کا بت تھا۔ اسے اس قدر مقدس سمجھا جاتا تھا کہ دور دور سے ہندو اس کی پوجا کرنے کے لیے آتے اور وہی درجہ حاصل کرتے جو مسلمانوں میں حاجیوں کو حاصل ہوتا ہے۔

سلطان محمود ایک تو اپنے عقیدے کے زیر اثر تھانیسر کے مندر کو تباہ کرنا چاہتا تھا، دوسرے اس لیے اس نے فوراً کوچ کا حکم دے دیا تھا کہ اسے معلوم تھا کہ ہندوستان کے راجے مہاراجے ابھی حضرو کی جنگ اور نگرکوٹ کی لڑائی سے سنبھلے نہیں ہوں گے۔ اسے اپنے جاسوسوں نے بتایا تھا کہ ہندوستانی ریاستوں کی فوجوں پر غزنی کی فوج کی دہشت طاری ہے اور ان کے حوصلے پست ہیں۔ حوصلے پست ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کے خداؤں کے بت توڑ دیئے گئے تھے اور مسلمان فوجی ان کے سامنے گائے ذبح کر کے کھاتے رہتے تھے۔ گائے ہندوؤں کی گئو ماتا تھی۔

جاسوسوں نے یہ اطلاعیں غزنی پہنچا دی تھیں کہ ہندوستانی فوج کا ہی نہیں، پوری

قوم کا حوصلہ پست ہو چکا ہے۔ ہندوؤں کی یہ حالت ہے کہ گھٹائیں گرجتی اور چمکتی ہیں تو لوگ مندروں کو دوڑ پڑتے ہیں یا اپنے گھروں میں رکھے ہوئے بتوں اور مورتیوں کے آگے ہاتھ جوڑ کر بیٹھ جاتے اور رو رو کر ان سے رحم مانگتے اور گناہوں سے توبہ کرتے ہیں۔

یہ صورت حال سلطان محمود کے لیے موزوں تھی۔ اس نے پشاور پہنچ کر ہندوستان کو دو قاصد اور ایک ایلچی دوڑا دیا۔ ایک بھیرہ اور ملتان پیغام لے کر گیا اور دوسرا نگرکوٹ وہاں کے سالاروں کو (جن کے رتبے آج کے گورنروں جیسے تھے) یہ پیغام دیا گیا تھا کہ وہ فوج کا کچھ حصہ بالکل تیاری کی حالت میں رکھیں۔ پیغام میں انہیں یہ بھی بتا دیا گیا کہ تھانیسر پر حملہ کیا جا رہا ہے۔

ایلچی کو پنجاب کے راجہ انندپال کے پاس اس پیغام کے ساتھ بھیجا گیا کہ سلطان محمود کی فوج پنجاب میں سے گزرے گی۔ معاہدے کے مطابق راجہ انندپال کا یہ فرض ہے کہ وہ ایسا انتظام کرے کہ غزنی کی فوج بحفاظت گزر جائے اور اس کے راستے میں نہ کوئی رکاوٹ ہو نہ کوئی مزاحمت۔ اور یہ بھی کہ انندپال اب دوسری ریاستوں کی فوج کو اکٹھا کر کے متحدہ فوج نہ بنائے۔ اگر اس نے ایسا کیا تو یہ سمجھا جائے گا کہ راجہ نے معاہدہ توڑ دیا ہے اور پھر سلطان کو حق پہنچتا ہے کہ وہ پہلے لاہور پر اور پھر پنجاب کے دوسرے دارالحکومت بھٹنڈہ پر حملہ کر کے دونوں شہروں کی اینٹ سے اینٹ بجا دے۔

راجہ جے پال نے اپنے ایک بھائی (جس کا نام تاریخ میں نہیں ملتا) کی زیر کمان دو ہزار سوار سلطان محمود غزنوی کے استقبال کے لیے بھیجے اور ساتھ (ابوالقاسم فرشتہ کی تحریر کے مطابق) یہ پیغام بھیجا کہ یہ میرا بھائی ہے اور میرا سفیر بھی۔ اسے میں آپ کی خدمت میں اس درخواست کے ساتھ بھیج رہا ہوں کہ تھانیسر ہماری سب سے بڑی اور سب سے زیادہ مقدس عبادت گاہ ہے۔ اگر یہ فرض آپ پر آپ کے مذہب کی طرف سے عائد ہوتا ہے کہ دوسروں کے مذہب کو ختم کریں تو آپ نگرکوٹ کی تباہی سے اپنا یہ فرض پورا کر چکے ہیں۔ میں درخواست کرتا ہوں کہ آپ تھانیسر کے متعلق اپنے ارادے بدل دیں۔ میں اس کے عوض سالانہ خراج دیا کروں گا۔ یہاں تک آنے میں آپ کی فوج پر جو خرچ ہوا ہے اور واپس جانے کا جو خرچ ہوگا، وہ میں ادا کروں گا۔ اس کے علاوہ میں آپ کو پچاس ہاتھی

اور کچھ بیش قیمت ہیرے جواہرات بھی پیش کروں گا۔"

تاہم فرشتہ نے لکھا ہے کہ سلطان محمود نے اس پیغام کا یہ جواب دیا۔ "میرے لیے خدا اور رسول صلعم کا حکم ہے کہ جہاں کہیں بت پرستی ہو وہاں جاؤں اور بتوں کو تباہ کروں۔ میرے رسول صلعم کا نظریہ ہے کہ خدا اس کا اجر اگلے جہان میں دے گا۔ میں آپ سے بت نہ توڑنے کا انعام قبول نہیں کر سکتا۔ میرے پاس کوئی جواز نہیں کہ تھانیسر کا بت خانہ نہ توڑوں۔"

کسی مورخ نے یہ نہیں بتایا کہ راجہ انندپال کو کس طرح پتہ چلا تھا کہ سلطان محمود تھانیسر جا رہا ہے۔ البتہ ان واقعات پر سب متفق ہیں کہ راجہ انندپال کے جواب میں سلطان نے اس کی پیشکش اور درخواست قبول نہ کی اور راجہ انندپال نے دہلی، اجمیر، کالنجر اور قنوج کے مہاراجوں کی طرف قاصد بھیج دیے کہ غزنی کا سلطان محمود ہماری طرف سے کسی اشتعال کے بغیر ہندوستان میں داخل ہو گیا ہے اور اس کا ارادہ تھانیسر کے وشنو مندر کو تباہ کرنے کا ہے۔

تھانیسر میں سلطان محمود غزنوی کے قتل کا انتظام ہو چکا تھا۔

۱۰۱۱ء (۴۰۲ ہجری) کا سال تھا۔ سلطان کو نگرکوٹ سے گئے ابھی ایک سال نہیں گزرا تھا۔ اُس کے دو کمانڈر بغرا خان اور التگین جو لاپتہ ہو گئے تھے، ان کے گھروں کو یہ اطلاع دے دی گئی تھی کہ ان کے مارے جانے کی کوئی شہادت نہیں ملی اس لیے یہ یقین ہے کہ وہ ہندوستانی فوج کے قیدی ہیں۔

وہ قیدی نہیں شہزادے تھے۔ اس عرصے میں اُن کی توجیسے روحیں بھی بدلی جا چکی تھیں۔ انہیں جب کوئی نشہ آور چیز کھلا کر اور پہنا ناٹز کر کے تھانیسر لایا گیا تھا تو دونوں کو الگ الگ کر دیے گئے تھے اور ان کی خدمت کے لیے عورتیں مقرر کی گئی تھیں۔ وہ آئے اُن دو جوان اور بے حد خوبصورت لڑکیوں کے ساتھ تھے جو انہیں نگرکوٹ کے ایک گاؤں میں ملی تھیں۔ تھانیسر میں وہ اُن سے جدا کر دی گئی تھیں۔

بغرا خان کے زخم اور چوٹیں ٹھیک ہو گئیں اور وہ بھاگنے دوڑنے کے قابل ہو گیا۔ التگین اور وہ مل بیٹھتے اور گپ شپ لگاتے تھے۔ اپنے میزبانوں کے ساتھ صرف بغرا خان بات کرتا تھا کیونکہ یہاں کی زبان وہی سمجھتا تھا۔ دونوں نے تین چار دن خاموشی اختیار کیے رکھی۔ آخر التگین نے بغرا خان سے کہا کہ وہ لڑکیاں کہاں ہیں۔ اگر وہ مل جائیں تو وہ یہاں رہیں گے ورنہ اپنی فوج میں چلے جائیں گے۔

ایک روز بغرا خان نے اپنے ایک میزبان سے پوچھا کہ وہ لڑکیاں کہاں چلی گئی ہیں۔ یہ میزبان وہی تھا جو درویش یا جوگی کے بہروپ میں انہیں ہپناٹائز کر کے لایا تھا۔ یہاں وہ اصل روپ میں تھا۔ اُس کے چہرے پر داڑھی نہیں تھی اور اس کی آواز بھی بناوٹی نہیں تھی۔

"تم دیویوں کو اپنے پاس بلانا چاہتے ہو؟" اس آدمی نے کہا۔ "وہ انسان نہیں تھیں۔ تم چونکہ نگرکوٹ کے مندر کے بت توڑنے والوں میں نہیں تھے اور تم زخمی ہو گئے تھے، اس لیے یہ دیویاں انسانوں کے روپ میں تمہارے پاس پہنچ گئیں اور انہوں نے تمہاری تیمارداری کی۔ وہ تمہارے ساتھ انسانوں کی طرح باتیں کرتی رہیں....

"تم نے اُن سے پیار مانگا تو انہوں نے تم سے پیار بھی کیا لیکن انہوں نے تمہیں بدی کی طرف نہیں جانے دیا۔ تم نے بری نیت ظاہر کی تو انہوں نے ہنس کھیل کر تمہارے دل سے برے خیال نکال دیے۔ یہ اُن کا حکم تھا کہ تم دونوں کو فوج کی اتنی سخت زندگی سے، جنگ و جدل اور قتل و غارت سے نکال کر شاہانہ زندگی میں رکھا جائے۔"

"نہیں" ــــ بغرا خان نے کہا۔ "یہ غلط ہے۔ وہ ہر لحاظ سے انسان تھیں۔"

"وہ انسان نہیں تھیں" ــــ اس آدمی نے بغرا خان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور عجیب سے لہجے میں کہنے لگا۔ "وہ انسان نہیں تھیں۔ تم اُن کے پجاری ہو۔ تمہاری روح اُن کے قبضے میں ہے۔"

"ہاں" ــ بغرا خان نے خوابناک آواز میں کہا۔ "میں اُن کا پجاری ہوں.... میری روح اُن کے قبضے میں ہے۔"

بغراخان کے ذہن پر یہ شعبدہ باز قابض ہو چکا تھا۔ اب وہ عامل تھا اور بغراخان کا ذہن پہلے ہی اُس کے اپنے قبضے سے نکل چکا تھا۔ یہ شراب کا اثر تھا جو وہ اور التگین خود ہی پینے لگے تھے اور یہ اُس نشہ آور دوائی کا بھی اثر تھا جو ان دونوں کو شراب میں اور کھانے میں کھلائی جاتی تھی۔

التگین کو دوسرے شعبدہ باز نے اپنے زیرِ اثر لے رکھا تھا۔ اُن کی خدمت اور دیکھ بھال شہزادوں کی طرح ہوتی تھی۔ وہ جدھر سے گذرتے تھے، لوگ رُکتے اور اُن کے آگے جُھک جاتے تھے۔

دو تین مہینے ان پر یہی عمل جاری رہا۔ جب یقین ہو گیا کہ اُن کے ذہن اُن کے اپنے قبضے سے پوری طرح نکل گئے ہیں تو انہیں ایک رات کہا گیا کہ انہیں اُن کی دیویوں نے بلایا ہے۔ دونوں کو مندر کے باغ میں لے جایا گیا۔ رات کی تاریکی تھی۔ باغ خوشنما تھا۔ انہیں ایک مسند پر بٹھا دیا گیا۔ قندیلیں جل رہی تھیں۔ اُن کے سامنے پندرہ بیس قدم دور دو ٹوکرے رکھے تھے۔ ان پر چمکدار کپڑے لپٹے ہوئے تھے۔ قندیلوں کی روشنی میں یہ ستاروں کی طرح چمکتے تھے۔

ستار کے تار جھنجھنانے لگے اور دھیما دھیما اور وجد آفریں راگ الاپنے لگے۔ ماحول پُراسرار سا ہو گیا۔ بنسری کی لَے سنائی دینے لگی۔ بنسری اور ستار کی سنگت نے طلسم طاری کر دیا اور اس طلسم میں دونوں لڑکیاں نمودار ہوئیں۔ کوئی نہ دیکھ سکا کہ وہ پھولدار پودوں کے پیچھے سے نکلیں یا درختوں کے پیچھے سے۔ ان کے لباس اتنے باریک کپڑے کے تھے جن میں سے اُن کے جسم نظر آتے تھے۔ اُن کے سروں پر اوڑھنیاں نہیں تھیں۔ اوڑھنیاں اُن کے بال ہی تھے جو اُن کے شانوں پر اور کچھ آگے سینے پر بکھرے ہوئے تھے۔ ہوا سے اُن میں لہریں اٹھتی تھیں۔

وہ جونہی نمودار ہوئیں، سب نے ہاتھ جوڑ دیئے اور سجدے میں چلے گئے۔ بغراخان اور التگین نے نہ تو [illegible] سجدہ کیا۔ وہ مبہوت ہو کر دیکھتے رہے۔ لڑکیاں یوں

نہایت آہستہ آہستہ چل رہی تھیں کہ اُن کے قدم اٹھتے نظر نہیں آتے تھے۔ سب سجدے سے اُٹھے۔ لڑکیاں ٹوکروں کے پاس رُک گئیں۔ انہوں نے دونوں بازو آگے کر کے ہاتھ پھیلا دیئے اور ایک لڑکی ایک ٹوکرے میں اور دوسری دوسرے ٹوکرے میں کھڑی ہو گئی۔ وہ گھٹنوں تک ٹوکروں میں چھپ گئیں۔ پھر وہ آہستہ آہستہ اس میں بیٹھنے لگیں اور ٹوکروں میں غائب ہو گئیں۔

بڑے پنڈت نے بغراخان اور التگین سے کہا کہ جاؤ اور ٹوکروں میں دیکھو۔ دونوں آہستہ آہستہ آگے بڑھے۔ وہ مسحور تھے۔ ٹوکروں سے تین چار قدم دور تھے کہ ٹوکروں میں سے ایک ایک کبوتر اڑا اور رات کی تاریکی میں غائب ہو گیا۔ دونوں کمانداروں نے ٹوکروں میں جا کر دیکھا۔ ٹوکرے خالی تھے۔

”وہ دیویاں ہیں“۔۔۔ ایک پنڈت نے آگے بڑھ کر انہیں کہا۔۔۔ ”صرف تمہارے لیے زندہ روپ میں آئی تھیں۔ انہوں نے تم پر خاص کرم کیا ہے کہ آج ہم سب تمہارے غلام ہیں اور تم ہمارے بادشاہ ہو۔ یاد کرو تم کیا تھے، کہاں تھے، تمہاری زندگی کیا تھی۔ دیویوں نے ہمیں اشارہ دیا ہے کہ وہ تمہارے لیے اپنے جیسی دو لڑکیاں بھیج دیں گی۔“

”کیا یہ ہمیں پھر بھی نظر آئیں گی؟“۔۔۔ بغراخان نے پوچھا۔

”دیویاں دیوتا ہماری خواہشوں کے غلام نہیں ہوتے“۔۔۔ انہیں پنڈت نے کہا۔۔۔ ”تم پر یہ دونوں اس لیے خوش ہوئی تھیں کہ تم نے نگرکوٹ کے بتوں کی توہین نہیں کی تھی اور تم بتوں کی توہین کرنے والے سلطان کی فوج سے الگ ہو گئے تھے۔۔۔ یہ دیویاں بت ہیں۔ دیکھنے میں پتھر ہیں۔ ہم تمہیں اُن کا یہ روپ بھی دکھائیں گے۔“

وہ جب اپنے کمرے میں آئے تو التگین نے بغراخان سے کہا۔۔۔ ”ہمیں بتایا جاتا رہا ہے کہ ان لوگوں کا مذہب باطل ہے اور یہ بتوں کی عبادت کرتے ہیں۔ ان کا تعلق براہِ راست عالمِ غیب سے معلوم ہوتا ہے۔۔۔ ہم کس کی عبادت کرتے ہیں؟“

ان دونوں کے ذہنوں میں شکوک پیدا ہو گئے تھے۔ وہ ایسے معبود ڈھونڈنے لگے تھے جسے وہ دیکھ سکیں، جو انہیں مسحور کر دے اور جو اتنا حسین ہو کہ اُن کے جذبات میں ہلچل بپا کر دے۔ انسان [illegible] وہیں سے ہوتا ہے جہاں [illegible] رشتہ توڑ کر صرف جسم بن جاتا ہے اور وہ

اُسی چیز کو برحق سمجھتا ہے جو اُس کی جسمانی ضرورت پوری کرے اور اُسے جسمانی لذت مہیا کرے۔ ایسے ہی انسان شعبدہ بازی کو معجزہ کہتے اور جذباتی اور دلفریب باتوں سے مسحور ہو جاتے ہیں۔ انسان جس قدر مادیت پرست اور جس قدر کم فہم ہوتا ہے، اتنی ہی جلدی مسحور ہوتا ہے۔ جس دور میں انسان ہپناٹزم سے واقف نہیں تھا، وہ اُس وقت بھی ہپناٹائز ہوا کرتا تھا۔

"معلوم ہوتا ہے ان کے ملک میں جادوگری نہیں ہے" — پنڈت نے اپنے شعبدہ بازوں سے کہا — "ورنہ یہ دونوں اتنے حیران نہ ہوتے۔ ہمارے ہاں کسی کو ٹوکرے میں کھڑا کر کے غائب کر دینا معمولی سی قسم کی شعبدہ بازی ہے۔۔۔۔ انہیں کچھ اور کرتب دکھاؤ۔ میں اب قائل ہوتا جا رہا ہوں کہ انہیں ہم استعمال کر سکیں گے۔ اگر ان کے ہاتھوں سلطان محمود کو قتل نہ کرایا جا سکا تو نگرکوٹ کے سالار اور دوسرے اہم آدمیوں کو قتل کرایا جا سکتا ہے۔"

"شعبدہ بازی کے ساتھ بُوٹی نے بھی خوب اثر دکھایا ہے" — اس فن کے ماہر نے کہا — "انہیں اب یہ لڑکیاں بُتوں کے روپ میں دکھاؤ۔"

اور ایک رات انہیں یہ بُت بھی دکھا دیئے گئے۔ مندر کی عبادت گاہ میں دو چبوترے تھے جن پر پھولدار کپڑے بچھے ہوئے تھے۔ ان پر لوبان جل رہا تھا جس کا دھواں ٹیڑھی میڑھی لکیروں کی طرح اوپر اٹھ رہا تھا اور بُتوں کے گرد لپٹ لپٹ جاتا تھا۔ روشنی بُتوں کے پیچھے اور نیچے رکھی گئی تھی۔ بُت پہچانے جاتے تھے — یہ وہی دو لڑکیاں تھیں۔ مادر زاد برہنہ چبوتروں پر کھڑی تھیں۔ بے جان بُت لگتی تھیں۔ اُن کی آنکھیں بند تھیں۔ پنڈت نے سب سے کہا کہ ماتھے رگڑو۔ سب نے ماتھے فرش سے لگا دیئے۔ بُغراخان اور التگین بھی سجدے میں چلے گئے۔

اُس رات کے بعد اُن کی اصلیت اور اُن کی قومیت ختم ہو گئی۔ اُن کی ہر ایک جسمانی ضرورت پوری کرنے کا انتظام کر دیا گیا۔ سحر کا عمل بھی جاری رہا، شعبدہ بازی بھی ہوتی رہی اور جب اُن کے متعلق یقین ہو گیا کہ اب اصلیت اور حقیقت کی طرف اُن کی واپسی کا خطرہ ختم ہو گیا ہے تو مندر کے شعبدہ بازوں نے اُن کے دماغوں میں سلطان محمود کے خلاف زہر بھرنا

"وہ یہاں سے خوبصورت لڑکیاں اور زر و جواہرات لوٹنے آیا کرتا ہے" — اُن کے ذہن میں ڈالا جانے لگا — "کیا تم اُن بُتوں کی توہین کرو گے جو تم نے دیکھے ہیں؟ جن دیویوں نے تمہاری کایا پلٹ دی ہے، کیا تم انہیں توڑ پھوڑ سکو گے؟ اب تمہارے لیے یہ خطرہ پیدا ہو گیا ہے کہ سلطان محمود اگر یہاں آ گیا اور اُس نے ان بُتوں کو توڑا تو اس کے ساتھ ہی تم دونوں کے جسم اپنے آپ ہی کٹنے لگیں گے۔ بُتوں کا ایک بازو ٹوٹے گا تو تمہارے جسموں سے ایک ایک بازو الگ ہو جائے گا۔ دیویاں مرا نہیں کرتیں۔ تم بھی نہیں مرو گے مگر تمہارے جسم کوڑھی اور اپاہج ہو جائیں گے اور تم ویرانوں میں پڑے تڑپتے رہو گے۔"

"کیا سلطان محمود یہاں بھی آئے گا؟" — بُغراخان نے پوچھا۔

"شاید آ جائے۔"

"آنے دو" — بُغراخان نے کہا — "وہ زندہ واپس نہیں جائے گا۔"

چار پانچ مہینوں بعد اُن میں یہ تبدیلی آئی جیسے وہ کسی کرشمے یا کسی نشے کے زیرِ اثر نہیں بلکہ اُن کی باتیں اور ان کی حرکتیں شعوری معلوم ہوتی تھیں۔ وہ اب یوں نہیں چلتے تھے جیسے خواب میں چل رہے ہوں اور وہ یوں نہیں بولتے تھے جیسے نیند میں بول رہے ہوں۔ وہ اب مندر سے باہر بھی جاتے تھے اور نارمل انسانوں کی طرح گھومتے پھرتے تھے۔

ایک روز دونوں باہر ایک باغ میں سیر کو گئے۔ انہیں آواز سنائی دی — "التگین!" انہوں نے چونک کر دیکھا۔ ایک جوگی جو ہندو لگتا تھا، اُن کی طرف آ رہا تھا۔ اُس کے ماتھے پر رنگ سے "اوم" لکھا ہوا تھا۔ اُس کے سر پر ہندوؤں کی چُٹیا تھی۔ اس نے قریب آ کر غزنی کی زبان میں کہا — "تمہارے متعلق ہمیں بتایا نہیں گیا۔ کب آئے ہو؟ کہاں ہو؟"

"اوہ!" — التگین نے حیرت سے کہا — "تم بھید ہو؟"

وہ ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ کبھی ایک ہی دستے میں تھے۔ بھید کو جاسوسی کے لیے منتخب کر لیا گیا تھا۔ وہ ماہر اور ذہین چھاپہ مار تھا۔ وہ بُغراخان کو نہیں جانتا تھا۔ التگین نے اس کو بتایا کہ بُغراخان کون ہے مگر یہ نہ بتایا کہ وہ کس طرح یہاں آئے ہیں۔ بھید یہی سمجھتا

رہا کہ یہ دونوں جاسوسی کے لیے آئے ہیں۔

"سلطان بہت قریب آگیا ہے"۔ عبید نے کہا ـــ "تم نے کوئی خبر بھیجی ہے؟"

"تم نے کیا خبر بھیجی ہے؟" ـــ التگین نے پوچھا۔

"زیادہ خطرہ تو یہ ہے کہ پہلے کی طرح دوسرے مہاراجوں کی فوجیں بھی تھانیسر کو بچانے کے لیے جمع ہو جائیں گی"۔ عبید نے انہیں بتایا ـــ "مگر ابھی تک یہاں وہی فوج ہے جو پہلے سے یہاں موجود ہے"۔

التگین نے اُسے بتایا کہ اُس نے بغرا خان کے ساتھ مندر کے اندر تک رسائی حاصل کر لی ہے اور وہ ہندو بن کر پنڈتوں وغیرہ کو زیر اثر کیے ہوئے ہیں۔ انہوں نے عبید کو اندھیرے میں رکھا اور اُسے پھر ملنے کے لیے کہہ کر مندر میں آگئے۔ عبید جب واپس جا رہا تھا تو اُسے ایک آدمی نے روک کر پوچھا کہ وہ کون ہے۔ عبید نے اپنا کوئی ہندوانہ نام بتایا۔ یہ آدمی التگین اور بغرا خان کے ساتھ سائے کی طرح لگا رہتا تھا۔ وہ جہاں جاتے یہ انہیں پتہ چلے بغیر اُن سے کچھ دور رہ کر اُن پر نظر رکھتا تھا۔

عبید پر اُسے شک ہوا کہ وہ ہندو نہیں۔ عبید نے اُسے کہا کہ وہ لاہور سے آیا ہے اور اس کے ساتھ کچھ اور جوگی بھی ہیں اور انہوں نے جنگل میں ڈیرہ ڈال رکھا ہے۔ اس آدمی نے کہا کہ وہ اُن کا ڈیرہ دیکھنا چاہتا ہے۔ عبید اُسے ساتھ لے گیا۔ جنگل میں واقعی چار پانچ جوگی اور سنیاسی قسم کے آدمی موجود تھے مگر یہ آدمی جو شک پر انہیں دیکھنے گیا تھا، واپس نہ آسکا۔ عبید اور اس کے ساتھیوں نے اُسے پکڑ کر اُس کے ہاتھ پاؤں رسیوں سے باندھ دیئے۔ خنجر کی نوک اُس کی شہ رگ پر رکھ دی اور پوچھا کہ اُسے عبید پر کس طرح شک ہوا ہے۔

یہ ہندو پہلے تو کچھ بتانے سے گریز کر رہا تھا۔ اُسے ایک درخت کے ساتھ اُلٹا لٹکا کر نیچے آگ جلا دی گئی۔ تھوڑی سی دیر میں ہندو کا دماغ ٹھکانے آگیا اور اُس نے چلانا شروع کر دیا۔ اُسے اتار کر بٹھایا گیا۔ اُس نے التگین اور بغرا خان کے متعلق ساری کہانی بیان کر دی اور بتایا کہ چونکہ وہ غزنی کی فوج کے کماندار ہیں اس لیے وہ سلطان محمود تک آسانی سے رسائی حاصل کر سکیں گے۔ وہ سلطان کو بتائیں گے کہ وہ ہندوستان کی فوج کی قید سے فرار ہوئے ہیں اور اُن کے پاس بڑا قیمتی راز ہے جو صرف سلطان کو بتایا جائے گا۔ اس طرح وہ سلطان تک پہنچ کر

اُسے قتل کر دیں گے۔

اس آدمی کو انہوں نے رہا نہ کیا۔ جاسوسوں کا یہ گروہ جہاں ٹھہرا ہوا تھا، وہ گھنے جنگل میں ایک ڈھکی چھپی جگہ تھی۔

بغرا خان اور التگین جب مندر میں پہنچے تو وہاں کچھ گھبراہٹ اور بھگدڑ سی دیکھی۔ انہیں بتایا گیا کہ غزنی کی فوج آرہی ہے اور اس کا رُخ تھانیسر کی طرف ہے۔ مندر کے پنڈت اور دیگر لوگ مہاراجہ آنند پال اور دوسرے مہاراجوں کی فوجوں کا انتظار کر رہے تھے مگر کوئی فوج آتی نظر نہیں آتی تھی۔

ان لوگوں کو معلوم نہ تھا کہ تمام راجوں مہاراجوں کو اطلاع مل چکی ہے کہ سلطان محمود تھانیسر پر حملہ کرنے آگیا ہے اور وہ اپنی فوجوں کو تیاری کا حکم دے چکے ہیں لیکن سلطان محمود کی پیشقدمی سے یہ لوگ واقف نہیں تھے۔ وہ طوفان کی طرح آرہا تھا۔ مندر صرف عبادت گاہ نہیں تھی، یہ قلعہ نما تھا اور یہ فوجی ہیڈکوارٹر بھی تھا جس پر پنڈتوں کا سایہ تھا۔ ان کے بھی جاسوس تھے۔ انہوں نے اطلاع دی کہ سلطان محمود اگر اسی رفتار سے بڑھتا آیا تو وہ ایک دن اور رات میں پہنچ جائے گا۔

بغرا خان اور التگین نے مندر میں یہ خبر سنائی کہ انہیں سلطان محمود کا ایک جاسوس ملا ہے اور اس کے ساتھ چند اور آدمی ہیں۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ کل صبح اُن کی اُس سے پھر ملاقات ہوگی۔

مندر میں جو فوجی تھے، انہوں نے ان دونوں سے کہا کہ وہ اس جاسوس سے ملیں اور اپنے آپ کو جاسوس ظاہر کر کے اُن کا ٹھکانہ دیکھ آئیں تاکہ انہیں پکڑ کر ختم کیا جا سکے۔ اس کے علاوہ ان دونوں کمانداروں سے کہا گیا کہ وہ کل جاسوسوں کا ٹھکانہ معلوم کر کے اُدھر چلے جائیں جدھر سے سلطان محمود کی فوج آرہی ہے۔ یہ کہہ کر اُس تک پہنچیں کہ وہ قید سے فرار ہو کر آئے ہیں اور سلطان سے تنہائی میں ملنا ضروری سمجھتے ہیں۔

اب تقریباً ایک سال کے عرصے میں بغرا خان اور التگین بالکل ہی بدل گئے تھے اور یہ تبدیلی ہندوؤں کے عزائم کے مطابق تھی۔ دونوں سدھائے ہوئے جانور بن چکے تھے۔

ان کے ذہن اور ان کی روحیں ان کی اپنی نہیں رہی تھیں۔ عورت کے حسن، شراب اور حیوانی خیالات نے انہیں انسانیت کے درجے سے بھی گرا دیا تھا۔ انہیں کاؤں والی دونوں لڑکیوں کے دونوں بت کئی بار دکھائے گئے تھے اور وہ ان کے پجاری بن گئے تھے۔ وہ کسی بھی وقت محسوس نہ کر سکے کہ یہ لڑکیاں زندہ ہیں اور انہیں دکھانے کے لیے چبوتروں پر مجسموں کی طرح کھڑی کی جاتی ہیں۔ لوبان اور اگربتیاں ان کے قدموں میں اس طرح جلائی جاتی ہیں کہ ان کے دھوئیں میں پتہ نہیں چلتا تھا کہ لڑکیاں سانس لے رہی ہیں۔

اب انہیں بتایا گیا کہ سلطان محمود ان بتوں کو توڑنے آ گیا ہے تو دونوں آگ بگولہ ہو گئے۔

تھانیسر کی فوج میں ہلچل مچ گئی۔ مندر کے دفاعی مورچے مضبوط ہونے لگے۔ مندر کے اندر اور باہر فوج بھاگتی دوڑتی نظر آتی تھی۔ شہر کے لوگوں پر خوف و ہراس طاری تھا اور شہر کے لوگ تلواریں اور برچھے اٹھائے مندر کے دروازے پر جمع ہو رہے تھے اور فوجی انہیں بتا رہے تھے کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ انہیں لڑائی کے لیے ادھر ادھر تقسیم کیا جا رہا تھا۔

اس ہنگامے میں التگین اور تغرل خان اس باغ میں چلے گئے جہاں بلید ان کا منتظر تھا۔ ان دونوں نے بلید کو دو جھوٹ موٹ کی اہم خبریں سنائیں اور اسے کہا کہ اپنے ٹھکانے پر لے چلے۔ بلید ان کے کہنے کے بغیر بھی انہیں اپنے ساتھ لے جانے آیا تھا۔ اسے ان دونوں کی اصلیت کا پتہ چل چکا تھا ـــــ وہ انہیں جنگل میں ساتھ لے گیا۔

وہ جونہی اپنے چھپنے کی جگہ پہنچے، تین چار آدمیوں نے انہیں جکڑ لیا اور رسیوں سے باندھ دیا۔ خطرہ یہ تھا کہ ان دونوں کے ساتھ کوئی آدمی ہوگا جیسے کل تھا۔ یہ آدمی ان کے ٹھکانے کی نشاندہی کر سکتا تھا چنانچہ انہوں نے وہاں سے غائب ہو جانے میں عافیت سمجھی۔ کل والے ہندو کو انہوں نے قتل کر دیا اور دو کمانڈروں کے ہاتھ بندھے رہنے دیئے، پاؤں کھول دیئے اور انہیں ساتھ لے کر جنگل میں چلے گئے۔

انہیں بہت دور نہ جانا پڑا۔ چند میل گئے ہوں گے کہ انہیں اپنی فوج کا ہراول دستہ مل گیا۔ بلید نے اس کے کمانڈر کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ کمانڈر نے انہیں کہا کہ وہ

آگے جانے کی بجائے یہیں ٹھہریں سلطان تھوڑی دیر میں پہنچ جائے گا۔

سلطان محمود اپنے محافظ دستے کے ساتھ سیلاب کی طرح آ رہا تھا۔ بلید راستے میں کھڑا ہو گیا۔ محافظ دستے کا کمانڈر دوڑا آیا کہ اس فقیر کو راستے سے ہٹائے لیکن یہ فقیر ان کا اپنا آدمی تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ کیوں راستے میں کھڑا ہو گیا ہے۔ اتنے میں سلطان محمود پہنچ گیا اور رک گیا۔ بلید نے اسے ایک خبر تو یہ سنائی کہ تھانیسر کے دفاع میں باہر سے کوئی فوج نہیں آئی اور قلعے پر شہری بھی فوج کے ساتھ کھڑے ہو گئے ہیں۔

"اور یہ دو کمانڈر آپ کے قتل کے لیے تیار کیے گئے تھے"۔ بلید نے سلطان محمود کو بتایا اور انہیں جس عمل سے گزارا گیا تھا وہ تفصیل سے سنایا۔

"انہیں ساتھ رکھو"۔ سلطان محمود نے کہا۔ "انہیں نہ کچھ کھانے کے لیے دو نہ کچھ پینے کے لیے۔ بھوک سے بےہوش ہو جائیں تو بھی کچھ نہ دینا۔ اس طرح نشہ آور دوائی کا اثر اتر جائے گا۔ پھر میں انہیں حقیقت دکھاؤں گا۔"

وہ دونوں گم سم کھڑے رہے اور سلطان محمود غزنوی آگے بڑھ گیا۔

سلطان محمود نے دوڑ جیت لی۔ تھانیسر کے فوجی کمانڈر بھی دیکھ رہے تھے کہ غزنی کی فوج پہلے پہنچتی ہے یا راجوں مہاراجوں کی۔ مؤرخ لکھتے ہیں کہ سلطان محمود کی برق رفتاری نے سب کو حیران کر دیا۔ اس کی کوشش بھی یہی تھی کہ ہندوستان کی فوجوں سے پہلے ہدف پر پہنچے۔ وہ پہنچ گیا۔ اس نے دفاع کا جائزہ لیا اور محاصرے کی بجائے یلغار کا حکم دے دیا۔ دیواروں کے اوپر تیروں کی ایسی بوچھاڑیں ماریں کہ اوپر والے سر نہ اٹھا سکے۔ دروازہ توڑ لیا گیا۔ ہندوؤں کی فوج میں بھگدڑ مچانے کے لیے سلطان نے حکم دے دیا کہ شہر کو لوٹ لیا جائے ـــــ ایسی قیامت بپا ہوئی کہ دفاع ٹوٹ گیا۔

مندر میں جا کر سلطان محمود نے تمام بت باہر پھینک کر توڑ دینے کا حکم دیا لیکن سب سے زیادہ مقدس بت جس کی خاطر تھانیسر سارے ملک کی عبادت گاہ بنا ہوا تھا جگ سوما تھا۔ اسے وشنو دیو کہا جاتا تھا۔ سلطان نے حکم دیا کہ اس بت کو سالم غزنی

لے جایا جاتے۔ اس حملے کے بعد جب سلطان واپس گیا تو یہ بُت اُس کے ساتھ تھا۔ اُس وقت کے ایک واقعہ نگار ابو محمد قندھاری کی تحریر کے مطابق اُس بت کو غزنی میں گھوڑ دوڑ کے میدان میں توڑا گیا اور بہت عرصے تک اُس کے ٹکڑے گھوڑوں کے قدموں تلے روندے اور مسلے جاتے رہے اور انہیں اسی میدان کی مٹی میں مل گئے۔

مندر اور شہر کو پوری طرح اپنے قبضے میں لے کر سلطان محمود نے کہا کہ بغراخان اور التگین کو لایا جائے۔ انہیں اُس کے سامنے لے جایا گیا تو سلطان نے کہا کہ قیدیوں کو لاؤ۔ قیدیوں کی ایک قطار لائی گئی۔ اُس میں پنڈتوں، شعبدہ بازوں اور لڑکیوں کی کافی تعداد تھی۔ سلطان نے اپنے دونوں کمانداروں کو کہا کہ ان لڑکیوں کو دیکھو اور اپنی دیویوں کو الگ کر لو۔ دونوں نے دیکھا کہ وہ دونوں لڑکیاں وہاں موجود ہیں۔ سلطان نے شعبدہ بازوں سے کہا کہ ان لڑکیوں کو ٹوکروں میں غائب کر دو اور پھر انہیں حاضر کرو۔

ٹوکرے منگوائے گئے۔ ایک شعبدہ باز نے لڑکیوں کو ان میں بٹھایا اور اُس نے خالی ٹوکرے دکھا دیئے۔ اس کے بعد اُس نے انہی ٹوکروں میں سے لڑکیاں برآمد کر دیں۔

"یہ ہندوستان کا ایک عام شعبدہ ہے" سلطان محمود نے کہا۔ "اور ہندوؤں کا مذہب بہت بڑا شعبدہ ہے۔ یہ مذہب جسمانی ضرورت تک محدود ہے۔ رُوح تک اس کی رسائی نہیں۔ لذت پرستی اس کا اصول ہے۔ مَیں نے بُت توڑ دیئے ہیں۔ انہیں کہو کہ مجھ پر قہر نازل کریں۔"

بغراخان اور التگین سُن رہے تھے۔ اُن کے ذہنوں سے نشے کا اثر بھوک اور پیاس نے اُتار دیا تھا۔ سلطان بول رہا تھا۔۔۔ اور اُس وقت مندر کے اوپر سے اذان کی بڑی ہی مقدس، بڑی ہی پُرسوز اور وجد آفریں صدا بلند ہوئی۔ سلطان خاموش ہو گیا۔۔۔ بغراخان اور التگین کے جسم کانپنے اور اُن کے آنسو بہنے لگے۔

اذان ختم ہوئی تو سلطان نے ان دونوں سے کہا۔ "میں تمہیں سزا نہیں دوں گا۔ زندہ رہو۔ آزاد رہو اور سب کو بتاؤ کہ دشمن تمہیں صرف تلوار سے نہیں مار سکتا۔ اس کے پاس کچھ اور ہتھیار بھی ہیں جو تمہاری رُوح کو کاٹ دیتے ہیں۔"

سانپ سونا اور انسان

محمد قاسم

فرشتہ لکھتا ہے کہ ۴۰۲ھ (۱۰۱۱ء) کے آخر میں جب سلطان محمود غزنوی تھانیسر کی فتح کے بعد واپس غزنی آیا تو ہندوستانی شہر معلوم ہوتا تھا کیونکہ غزنی کی فوج کی نفری اتنی نہیں تھی جتنی تعداد جنگی قیدیوں کی تھی۔ اُس دور میں جنگی قیدیوں کو غلام کہا جاتا اور انہیں فوجیوں میں عہدوں کے مطابق تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ سلطان محمود جب بھی ہندوستان سے واپس آتا اُسے کے ساتھ دو تین ہزار غلام ہوا کرتے تھے مگر اب کے اس کے ساتھ دو لاکھ غلام تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب فوجی نہیں تھے۔

سلطان نے حکم دے رکھا تھا کہ ان غلاموں کے ساتھ ایسا سلوک نہ کیا جائے کہ یہ اپنے آپ کو مرتے دم تک غلام اور مویشی سمجھتے رہیں۔ انہیں اسلامی طرزِ بود و باش سے روشناس کرایا جائے اور ان کی قسمت اس طرح بدل دی جائے کہ یہ اپنے گھروں اور عزیز و اقارب کو ہی نہیں، اپنے مذہب کو بھی بھول جائیں اور خود کہیں کہ ہمیں مسلمان بنا لیا جائے۔ اب غلاموں کی تعداد دو لاکھ تھی اس لیے سلطان محمود نے اپنے اس حکم پر سختی سے عمل کرنے کو کہا کہ غلاموں کو انسان سمجھا جائے۔

متعدد مورخین نے لکھا ہے کہ محمود غزنوی کی فوج میں ایک پوری رجمنٹ ہندوؤں کی تھی جس کے افسر بھی ہندو تھے۔ ہندو افسروں کو مسلمان افسروں کی نسبت زیادہ مراعات دی گئی تھیں۔ اس رجمنٹ کو ہندوستان میں لا کر کبھی نہیں لڑایا گیا تھا۔ اسے اُن لڑائیوں میں استعمال کیا جاتا رہا جو سلطان محمود کو اپنے دشمن مسلمان حکمرانوں کے خلاف لڑنی پڑی تھیں۔

غزنی میں اُس رات چراغاں ہوا۔ لوگ ناچ رہے تھے۔ فوجی ناچ رہے تھے۔ غزنی میں جیسے رات آئی ہی نہیں تھی۔ تھانیسر کے مندر سے وشنو دیو کا جو بت لایا گیا تھا اُس کی نمائش سارے شہر میں کی گئی تھی۔ اُس بت کو گھوڑ دوڑ کے میدان میں لے جایا گیا۔ سارا شہر تماشا دیکھنے کو اُمڈ آیا تھا۔ ہندوستان کے جنگی قیدیوں کو بھی میدان میں لے گئے تھے تا کہ وہ اپنے دیوتا کی اصلیت اپنی آنکھوں میں دیکھیں۔ بت کو توڑا گیا اور اس کے ٹکڑے میدان میں بکھیر دیئے گئے۔ جنگی قیدیوں سے (جو سب ہندو تھے) کہا گیا کہ یہ اُن کا خدا نہیں تھا۔ یہ اُن کے مذہبی پیشواؤں کا فریب تھا۔ اگر یہ خدا ہوتا یا اس میں ذرا سی بھی خدائی طاقت ہوتی تو یہ ہم سب کو فنا کر دیتا۔

تکبیر کے نعرے بلند ہوئے۔ ہندو قیدی خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

رات غزنی میں جو رونق اور جو دھما چوکڑی رہی وہ اس شہر نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ سلطان کے محل میں بھی چراغاں تھا مگر سلطان محمود غزنوی واحد آدمی تھا جس کے چہرے پر اداسی تھی۔ وہ اس رونق اور خوشیوں سے تعلق توڑے ہوئے اپنے خاص کمرے میں بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے دو آدمی بیٹھے تھے۔ یہ دونوں اُس کے جاسوسی اور فوجی مخبری کے محکمے کے افسر تھے۔ وہ سلطان کو بتا رہے تھے کہ غزنی کے اردگرد کی مسلمان ریاستوں میں کیا ہو رہا ہے۔ سلطان کا سب سے بڑا دشمن ایلک خان تھا۔ وہ سلطان کی غیر حاضری سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے غزنی پر فوج کشی کر چکا تھا اور اُسے بڑی ہی شرمناک شکست سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ اُس کی نظر خراسان پر تھی۔

"ایلک خان وہ سانپ ہے جو جب تک زندہ ہے ڈسنے سے باز نہیں آئے گا" ——— سلطان محمود کو انٹیلی جنس رپورٹ دی جا رہی تھی۔ یہ اطلاعیں سلطان کے وہ جاسوس لائے تھے جو ایلک خان کے فوجی سٹاف میں موجود تھے ——— "آپ کی غیر حاضری میں ایلک خان نے اپنے بھائی طغان خان اور قادر خان والیٔ قشغر کو اکسایا کہ دونوں اس کے ساتھ اتحاد کر لیں اور مل کر خراسان پر حملہ کریں مگر دونوں نے آپ کے خوف سے اس کا اتحادی بننے سے انکار کر دیا۔ ایلک خان نے اپنی فوج کے ساتھ اپنے بھائی طغان خان کے علاقے

پر حملے کے لئے پیش قدمی کی لیکن وہ اُزگند تک ہی پہنچا تھا کہ برفباری کا طوفان آ گیا۔ ایلک خان کی فوج کو جان کے لالے پڑ گئے۔ اُس کے سپاہی بھی مرے اور جانور بھی اور اُسے مجبوراً واپس جانا پڑا"۔

"اور طغان خان کے ارادے کیا ہیں؟" ——— سلطان محمود نے پوچھا۔

"وہ آپ کی طرف مائل ہے" ——— دوسرے آدمی نے جواب دیا ——— "ہمارے جو آدمی طغان خان کے دربار میں ہیں، انہوں نے بتایا ہے کہ اُسے جب پتہ چلا کہ ایلک خان نے اُس کے علاقے پر فوج کشی کی کوشش کی تھی اور برفباری نے اُسے آگے نہیں آنے دیا تو طغان خان نے ایلک خان کو پیغام بھیجا کہ اُس نے دوبارہ ایسی کوشش کی تو وہ سلطان محمود کے ساتھ اتحاد کر لے گا"۔

"کیا مجھے طغان پر بھروسہ کرنا چاہیئے؟"

"سلطان عالی مقام!" ——— اُسے جواب ملا ——— "کسی کے دل کی بات خدا کے سوا کون جانتا ہے۔ ظاہر تو یہی ہوتا ہے کہ طغان خان آپ کا اتحادی بنے"۔

"اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایلک خان جیسے بدطینت انسان سے محفوظ رہنے کے لیے ہماری مدد چاہتا ہے" ——— سلطان نے کہا ——— "میں اُس کی مدد کرنے سے گریز نہیں کروں گا لیکن اُس کے ساتھ میری ملاقات ہونی چاہیئے۔ یہ لوگ میرے پاؤں کی زنجیریں بن گئے ہیں ...... طغان خان کو میرا پیغام خفیہ طریقے سے دو کہ میں اُسے ملنا چاہتا ہوں۔ نہ وہ میرے پاس آئے نہ میں اُس کے ہاں جاؤں گا۔ غزنی سے باہر جتنی دور اور جہاں بھی وہ ملنا چاہے مجھے بتا دے"۔

یہ وجہ تھی کہ سلطان محمود اداس تھا۔ خانہ جنگی کی تلوار اُس کے سر پر لٹک رہی تھی۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ ان سانپوں کے سر کچلنا لازمی ہو گیا ہے۔

طغان خان نے سلطان محمود سے ملنے میں پس و پیش نہ کی۔ وہ چار روز بعد غزنی کے مضافات میں ایک جگہ پہنچ گیا۔ وہ جگہ خوشنما تھی۔ ایک چشمہ تھا جس کے اردگرد گھنے پیڑ، خودرو پودے اور گھاس تھی۔ سلطان محمود طغان خان سے بغلگیر ہو کر ملا۔

"کیا یہ صحیح ہے کہ آپ میرے ساتھ اتحاد کرنا چاہتے ہیں؟" سلطان نے طوغان خان سے پوچھا۔

"میں نے آپ کے پاس اپنا سفیر بھیجنے کا ارادہ کر رکھا تھا" طوغان خان نے جواب دیا "اس سے پہلے آپ کا پیغام آگیا اور میں چلا آیا۔ میں آپ کے ساتھ اتحاد کرنا چاہتا ہوں۔"

"اپنی ریاست کی حفاظت کے لیے یا اس لیے کہ یہ خدا کا حکم ہے کہ مسلمانوں کو متحد ہونا چاہیئے؟" سلطان نے کہا "اگر آپ کو اپنی ریاست کی حفاظت درکار ہے تو میں اتحاد سے صاف انکار کر دوں گا۔ میں صرف خلافت بغداد کے نام پر اتحاد کروں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ مسلمان حکمران اپنی اپنی ریاستوں کو قائم رکھیں لیکن خلافت کو اپنا مرکز سمجھیں۔ اگر اسلام کو کفار سے بچائے رکھنا ہے تو خلافت کے تحت اتحاد ضروری ہے۔"

طوغان خان کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ آگئی جس میں مسرت کم، ملال زیادہ تھا۔

"سلطان محترم میں بہت دانشمند سمجھتا تھا" طوغان خان نے کہا "لیکن معلوم ہوتا ہے آپ میں صرف جنگی دانش اور حکمت ہے.... اور معلوم ہوتا ہے کہ آپ پر مذہب کا جنون طاری ہے، اور آپ جذبات کے غلبے میں ہیں۔"

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں طوغان خان؟" سلطان محمود نے پوچھا۔

"جس خلیفہ کو آپ اسلام کی مرکزیت اور عظمت کی علامت بنائے ہوئے ہیں وہ اقتدار کا اتنا ہی بھوکا ہے جتنا میرا بھائی ایلک خان اور دوسرے والی اور حکمران جو غزنی اور خراسان پر قابض ہونے کی خاطر آپ سے برسر پیکار رہتے ہیں۔"

"کیا آپ خلیفۂ بغداد القادر باللہ عباسی کی بات کر رہے ہیں؟" محمود غزنوی نے پوچھا۔

"میں جانتا ہوں آپ کو یقین نہیں آئے گا" طوغان خان نے کہا "میں کچھ عرصہ پہلے بھی آپ کو اس خطرے سے خبردار کرنا چاہتا تھا لیکن ایک تو اپنے بھائی ایلک خان کے ڈر سے خاموش رہا اور دوسرا خدشہ یہی تھا کہ آپ کو یقین نہیں آئے گا اور آپ میری نیت پر شک کریں گے۔ میں بھی آپ کی طرح خلافت کا معتقد ہوں لیکن اس خلیفہ

سا نہیں جو ایک علاقے کا حکمران بھی ہے اور وہ توسیع پسند ہے۔"

"طوغان خان!" سلطان محمود نے غصے سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "خلیفۂ وقت پر الزام لگانے سے پہلے سوچ لو کہ الزام غلط ہوا تو میں اپنی فوج سے تمہاری اس چھوٹی سی ریاست کو کچل ڈالوں گا۔"

طوغان خان ہنس پڑا۔ اُس کی ہنسی میں طنز تھی۔ بولا "جب انسان پر طاقت کا گھمنڈ سوار ہو جاتا ہے تو وہ اپنی لغزشوں کو بھی دانشمندانہ اقدام کہا کرتا ہے اور ان کے خلاف کچھ سننا گوارا نہیں کرتا سلطان! دماغ کو اس گھمنڈ سے آزاد کریں۔ میں خلیفہ کے خلاف بات کر کے آپ سے کیا حاصل کر سکتا ہوں!.... میری نیت کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ آپ کے خلاف یہاں کا کون سا حکمران نہیں لڑا؟ صرف میں ہوں یا والیٔ قصدار قادر خان۔ ہمارے نہ لڑنے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ہم کمزور تھے۔ ہم مل کر آپ کے خلاف ایک طاقت بن سکتے تھے مگر میں اور قادر خان ہمیشہ خانہ جنگی کے خلاف رہے اور ہندوستان پر آپ کے حملوں اور کامیابیوں کے حامی رہے۔ آپ کو معلوم نہیں کہ ایلک خان مجھے آپ کے خلاف اُکسا چکا ہے، اور میرے انکار پر ....."

"تمہارے علاقے پر فوج کشی کر چکا ہے" سلطان محمود نے اُس کی بات پوری کر دی جو اُسے اپنے جاسوس بتا چکے تھے۔ اور طوغان بردباری نے اُسے آگے نہیں بڑھنے دیا۔ اپنے دربار کی اور اپنی ذاتی زندگی کی بھی کوئی بات مجھ سے پوچھ لو۔"

"اگر آپ کے جاسوس میری زندگی میں بھی موجود ہیں تو آپ کو میری نیت پر شک نہیں ہونا چاہیئے" طوغان خان نے کہا "اگر آپ کو شک ہے تو آپ کے جاسوس اور مخبر یہاں کوئی کام نہیں کر رہے، صرف تنخواہ لے رہے ہیں۔"

"کہو کیا کہنا چاہتے ہو۔"

"خلیفۂ وقت القادر باللہ عباسی اقتدار پرست اور توسیع پسند ہے" طوغان خان نے کہا "کیا آپ دیکھ نہیں رہے کہ خراسان کا آدھا حصہ اُس کی ریاست ہے؟ اور باقی خراسان آپ کا ہے؟ .... خلیفہ آپ کے خراسان پر بھی قابض ہونا چاہتا ہے، اور اس مقصد کے لیے وہ ایلک خان کو استعمال کر رہا ہے۔ اُسے شہ دے رہا ہے۔ اُس

نے ایلک خان سے وعدہ کر رکھا ہے کہ وہ آپ کے خراسانی علاقے پر فوج کشی کرے تو خلیفہ اُسے در پردہ مالی اور جنگی سامان اور گھوڑوں کی مدد دے گا مگر فوج نہیں دے گا ورنہ آپ کو پتہ چل جائے گا۔ اگر خلیفہ کو قوم یا اُمت رسولؐ کے وقار اور وقار کا خیال ہے تو وہ خلافت کی طاقت اور اختیارات کو ایلک خان کے خلاف کیوں نہیں استعمال کرتا؟ وہ آپ کی پیٹھ ٹھونک رہا ہے کہ آپ ہندوستان پر حملے جاری رکھیں۔ اُس کا مقصد یہ ہے کہ آپ غزنی سے دور رہیں اور آپ کی جنگی طاقت ہندوستان میں گھٹتی رہے۔ خلیفہ اُس دن کے انتظار میں ہے جس دن اُسے اطلاع ملے گی کہ سلطان محمود ہندوستان میں مارا گیا ہے یا پکڑا گیا یا شکست کھا کر کہیں بھٹک رہا ہے۔ امیر عبدالملک، فائق بیگتوزن ابوالقاسم مجوری اور دارا بن قبوس آپ کے دشمن ہیں۔ ان سب کو آپ کے خلاف متحد کرنے والا خلیفہ القادر باللہ عباسی ہے۔ خانہ جنگیوں کے پیچھے خلیفہ کا ہاتھ ہے۔"

محمود غزنوی کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ جس گدی کو وہ مقدس سمجھتا تھا وہی اُس کی دشمن نکلی۔

"اگر آپ کو ثبوت چاہیے تو میں مہیا کر دوں گا"۔ طوغان خان نے کہا۔ "سب سے بڑا ثبوت تو یہ ہے کہ میں آپ کے ساتھ ہوں۔ میرا سفیر آپ کے ہاں پہنچ جائے گا۔ میری فوجی طاقت کچھ زیادہ نہیں، لیکن میرا ایمان مضبوط ہے۔ ایلک خان نے میرے علاقے پر فوج کشی کی تو خدا نے میری مدد کی۔ برفباری کے طوفان نے اُسے پسپا کر دیا۔ وہ ایمان فروش ہے۔"

"جس قوم کا خلیفہ ہی ایمان فروش ہو جائے، وہ قوم ڈاکوؤں اور لٹیروں کا گروہ بن جایا کرتی ہے"۔ سلطان محمود نے کہا۔

مشہور مؤرخ محمد قاسم فرشتہ اور البرونی لکھتے ہیں کہ سلطان محمود کو اتنا دل برداشتہ کبھی نہیں دیکھا گیا تھا۔ وہ جب طوغان خان سے مل کر واپس غزنی آیا تو اُس کا چہرہ اُترا ہوا اور اُس پر خاموشی طاری تھی۔ اُس کے ہاتھوں سے اُس کی بے چینی ظاہر ہو رہی تھی۔ وزیر کے پوچھنے پر بھی اُس نے نہ بتایا کہ طوغان خان کے ساتھ ایسی کیا بات ہوئی ہے جس کا ردعمل اتنا شدید ہے۔

وہ اُس دور کے ایک ولی ابوالحسن خرقانی کا مرید تھا۔ خرقانی دو روز کی مسافت جتنی دور رہتے تھے۔ سلطان محمود کبھی کبھی جایا کرتا اور کہا کرتا تھا کہ وہاں اُس کی روح کو روشنی ملتی ہے۔ اب وہ اس قدر پریشان تھا کہ اُس کی سوچنے کی صلاحیت ہی جیسے مفلوج ہو گئی ہو۔ مسئلہ ہی کچھ ایسا پیدا ہو گیا تھا۔ خلیفہ کو تو وہ اسلام کی عظمت کی مقدس علامت سمجھتا تھا مگر القادر باللہ عباسی خلافت کی سراپا توہین تھا۔ کبھی اُسے طوغان پر غصہ آتا کبھی خلیفہ پر۔ اُسے یقین آ گیا تھا کہ طوغان خان نے جھوٹ نہیں بولا۔ یہ اُس کے لئے روحانی اذیت تھی۔ اُسے رہ رہ کر پیر و مرشد کا خیال آ رہا تھا۔

وہ اُسی روز ابوالحسن خرقانی سے ملنے کو روانہ ہو گیا۔ علی الصبح کا چلا ہوا دوسرے دن سورج غروب ہونے کے بعد منزل پر پہنچا۔ اُس نے خرقانی کے ہاتھ تھام کر آنکھوں سے لگائے اور بولا۔ "روح عذاب میں ہے۔ کوئی راستہ دکھایئے۔"

"کیا ہندوستان سے شکست کھا کر آئے ہو؟" — ابوالحسن خرقانی نے پوچھا۔

"آپ کی دعا سے ہندوستان سے میں کبھی شکست کھا کر نہیں آؤں گا"۔ سلطان محمود نے کہا۔ "فاتح سلطان جب بھی شکست کھاتے ہیں، اپنے بھائیوں کے ہاتھوں کھاتے ہیں۔"

"میں اُن بھائیوں سے بے خبر نہیں سلطان محمود!" — ابوالحسن خرقانی نے کہا۔ "لیکن خدا تمہارے ساتھ ہے۔"

"آپ بے خبر نہیں ہوں گے"— سلطان محمود نے کہا۔ "لیکن آپ یہ سچ ماننے پر آمادہ نہیں ہو سکیں گے کہ خلیفہ القادر باللہ عباسی میرے خلاف خانہ جنگی کو ہوا دے رہا ہے۔ یہ بات مجھے ایلک خان کے بھائی طوغان خان نے بتائی ہے۔"

خرقانی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ کہنے لگے۔ "میں اِس سے بھی بے خبر نہیں۔ مجھے جب خلیفہ کی نیت کا پتہ چلا اُس وقت تم ہندوستان میں تھے۔ تم نہ آتے تو میں خود تمہیں بلا کر اِس خطرے سے آگاہ کرتا۔"

"تو کیا میں یقین کر لوں کہ طوغان خان نے خلیفہ کے متعلق جو انکشاف کیا ہے وہ غلط نہیں؟" — سلطان محمود نے کہا۔ "کیا میں دھوکے میں رہا ہوں کہ خلیفہ رسول مقبول صلعم کا خلیفہ

ہوتا ہے؟"

"وہ خلفا مدت گذری مرگئے ہیں جو صحیح معنوں میں خلفائے رسول ؐ تھے"۔۔۔ ابوالحسن خرقانی نے کہا۔ "اُن کے بعد جو آئے اور جو آئیں گے، وہ اپنے نفس کے خلیفہ تھے، اپنے نفس کے خلیفہ ہوں گے۔ موجودہ خلیفہ ایک ریاست کا حکمران بھی ہے۔ سمرقند کا والی بھی وہی ہے۔ اس کا سب سے پہلا اور اس کے لیے سب سے زیادہ اہم مفاد یہ ہے کہ اُس کی بادشاہی محفوظ رہے۔ موجودہ خلیفہ تو دو قدم آگے بڑھ گیا ہے۔ وہ اپنی ریاست کی توسیع کی کوشش میں ہے۔ وہ اُس حکمران کو اپنا دوست بناتا ہے جو سب سے زیادہ طاقتور ہو۔ کیا تم جانتے ہو کہ تمہارے باپ کے دور میں القادر باللہ عباسی نے قرامطیوں کے ساتھ درپردہ دوستانہ گانٹھ رکھا تھا؟ صرف اس لیے کہ قرامطی ایک طاقت بن گئے تھے۔ اس کے بعد جب تم اپنے ایمان اور اپنے عزم کے بل بوتے پر ایک بڑی جنگی طاقت بن گئے اور جب تو نے غزنی پر ہندوؤں کے دو حملے روک کر انہیں اُن کے ملک میں جا کر شکست دی، اور جب تم نے قرامطیوں کی حکومت ختم کر کے اُن کے باطل نظریے کو بھی ختم کر دیا تو اسی خلیفہ نے تمہیں امین السلطنت اور یمین الدولت کے خطاب عطا کر دیئے اور تمہیں اپنا مرید اور معتقد بنا لیا۔ اُسے اِس سے کوئی غرض نہیں کہ تم نے ہندوستان میں جا کر بت توڑے اور اسلام رائج کیا۔ اِسے دراصل تمہاری طاقت سے خطرہ ہے۔ اِس خطرے کا علاج وہ یہ کر رہا ہے۔ ظاہری طور پر تمہارا دوست بنا ہوا ہے۔ اور درپردہ تمہاری طاقت ختم کرنے کے لئے خانہ جنگی کو ہوا دے رہا ہے"۔

"کیا ایک خلیفہ کو ایسا کرنا چاہیئے؟"

"تم اسے خلیفہ کہہ رہے ہو"۔۔۔ ابوالحسن خرقانی نے کہا۔ "میں تو اسے خلیفہ سمجھتا ہی نہیں، نہ یہ شریعت کی رُو سے خلیفہ ہے۔ خلیفہ کے لیے زہد و تقویٰ بنیادی شرط ہے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ قوم میں وہ اپنے دوست اور دشمن بنانے والا نہ ہو۔ تیسری شرط یہ ہے کہ اُسے کوئی دنیاوی لالچ نہ ہو۔ اس شرط کی رُو سے وہ آدمی خلیفہ ہو ہی نہیں سکتا جس کی اپنی ریاست ہو۔ حکمران خلیفہ ذاتی دلچسپیوں اور تعصبات کے بغیر رہ نہیں سکتا"۔

"کیا ہم اس خلیفہ کو گدی سے ہٹا نہیں سکتے؟"

"نہیں"۔۔۔ ابوالحسن خرقانی نے جواب دیا۔ "خلافت ایک خاندان کی میراث بن گئی ہے، اور خلافت اب اسلام کی عظمت نہیں، ذاتی اقتدار کی گدی بن گئی ہے۔ اُمتِ رسول صلعم کا شیرازہ بکھرنے کا باعث یہی ہے کہ خلافت کا مطلب اقتدار بن گیا ہے۔ شخصی حکومت بن گئی ہے۔ اب ہر خلیفہ ایسا ہی ہوگا اور قوم کا اتحاد اور وقار ریزہ ریزہ ہوتا رہے گا۔ خلیفے ہاتھ میں قرآن لے کر آئیں گے۔ اپنے دوست اور اپنے دشمن بنائیں گے۔ قوم کے لئے مجسم دھوکہ بنے رہیں گے۔ قوم میں پھوٹ ڈالتے رہیں گے۔ اپنے خوشامدی اور مدح سرا پیدا کرتے رہیں گے، اور قوم عربی اور عجمی، غزنوی اور مصری بنتی جائے گی۔ مسلمان مذہب کو بھی شکی نگاہوں سے دیکھیں گے۔ خلیفہ جو بھی آئے گا وہ امر کل بھی ہوگا"۔

"پھر میرا لائحہ عمل کیا ہونا چاہیئے؟"۔۔۔ سلطان محمود نے کہا۔ "میں خلیفہ کا خوشامدی نہیں بنوں گا"۔

"خلیفہ کو جتا دو کہ تم اُس کی نیت سے واقف ہو چکے ہو"۔۔۔ ابوالحسن خرقانی نے کہا۔ "محمود! انسان جب ایمان فروشی پر اُتر آتا ہے تو اُسے ایمان والے احمق اور جھوٹے لگتے ہیں۔ تم ہندوستان میں اپنے امیر، حاکم اور سالار چھوڑ آئے ہو۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ اپنے نفس کے دھوکے میں آ جائیں گے۔ انسان میں دو کمزوریاں بہت ہی خطرناک ہیں۔ یہ کمزوریاں ابلیس کی طاقت ہیں۔ ایک جنسی لذت اور دوسری زر پرستی۔ ہندوستان شعبدہ بازوں اور توہم پرستوں کی سرزمین ہے۔ وہاں کا طلسم بڑا ہی خطرناک ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ تم ہندوستان کے مفتوحہ علاقوں کا انتظام جن حکام کے سپرد کر آئے ہو، وہ ایمان فروش نہ ہو جائیں۔ تمہارے لیے بہت خطرے ہیں۔ تمہارے لیے بڑی کڑی آزمائش ہے۔ گھبرا نہ جانا"۔

"تو میں خلیفہ کے کان کھول دوں؟"

"حق کی بات کہنے سے نہ ڈرو"۔۔۔ خرقانی نے کہا۔ "میں بھی اس کے ساتھ بات کرنے کی کوشش کروں گا"۔

واپس آ کر سلطان محمود غزنوی نے خلیفہ بغداد القادر باللہ عباسی کے نام پیغام لکھوایا،

"خراسان کے بیشتر علاقے پر آپ نے قبضہ کر رکھا ہے۔ اس میں بہت سا علاقہ سلطنتِ غزنی کا ہے۔ میں آپ کو نقشہ بنا کر بھیج رہا ہوں۔ میں نے جن علاقوں پر نشان لگائے ہیں، وہاں سے اپنے امرا اور اپنی فوج نکال لیں۔ خلیفہ کو تو کسی خطے کا حاکم ہونا ہی نہیں چاہئے مگر میں جانتا ہوں کہ آپ میری بات قبول نہیں کریں گے۔ میں احترام خلافت کی وجہ سے خاموش رہا۔ اب جبکہ میری آنکھوں سے پردے اٹھ چکے ہیں میں بہتر سمجھتا ہوں کہ آپ صلح و صفائی سے نشان زدہ علاقے مجھے دے دیں۔ میں امید رکھوں گا کہ اپنے رتبے کا خیال رکھتے ہوئے آپ پس و پیش نہیں کریں گے"۔

مورخین محمد قاسم فرشتہ، البیرونی اور گردیزی میں اس واقعہ کو تفصیل سے یوں بیان کیا ہے کہ خلیفہ عبدالقادر باللہ عباسی سلطان محمود کی جنگی طاقت سے اچھی طرح واقف تھا اور وہ سلطان کی فطرت سے بھی آگاہ تھا کہ سلطان جو کرنے پہ آتا ہے وہ کر گزرتا ہے۔ خلیفہ کو یہ بھی معلوم تھا کہ سلطنت غزنی کے لوگ سلطان محمود کے معتقد ہو گئے ہیں چنانچہ خلیفہ نے اس کے پیغام کے جواب میں خراسان کے وہ صوبے جن کا مطالبہ سلطان نے کیا تھا سلطان کو دے دیئے اور وہاں سے اپنے امرا اور فوج نکال لی۔

مورخین کے مطابق، سلطان محمود مطمئن ہونے کی بجائے طیش میں آ گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ خلیفہ نے اتنی جلدی ہتھیار ڈال دیئے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دیانتدار نہیں اور شاطر ہے۔ سلطان نے بغداد ایک اور قاصد اس پیغام کے ساتھ خلیفہ کو بھیجا: "سمرقند پر آپ کا قبضہ ہوا ہے۔ یہ شہر مجھے واپس کریں"۔ اس پیغام کے جواب میں خلیفہ نے اپنے ایلچی کو جس کا درجہ سفیر کا تھا سلطان کے پاس بھیجا۔ ایلچی نے سلطان کو یہ پیغام دیا کہ خلیفہ کسی قیمت پر سمرقند سے دستبردار نہیں ہو گا، اور خلیفہ نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر آپ اپنے اس مطالبے پر زور دیں گے تو خلیفہ آپ کو ساری قوم کے سامنے

ذلیل و رسوا کر دے گا۔

"خلیفہ سے جا کے کہو کہ تم یہ چاہتے ہو کہ میں ایک ہزار جنگی ہاتھیوں کے ساتھ دارالخلافہ بغداد میں آؤں؟" ___ سلطان محمود نے قہر آلود آواز میں کہا ___ "اگر خلیفہ کی یہی خواہش ہے تو اسے کہہ دینا کہ اس کے دارالخلافہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا اور ملبہ ہاتھیوں پر لاد کر غزنی لے آؤں گا"۔

ایک انگریز مورخ سر ایچ ایچ۔ ہوورتھ نے چند دوسرے مورخین کے حوالے سے لکھا ہے کہ خلیفہ سلطان محمود کی اس دھمکی سے بہت بھنایا۔ اس کا رتبہ اتنا بلند تھا کہ وہ سلطان محمود کو مجبور کر سکتا تھا کہ وہ قصرِ خلافت سے اس بدتمیزی کی معافی مانگے مگر خلیفہ کی کچھ کمزوریاں ایسی تھیں کہ اس نے دھمکی کا جواب دھمکی سے نہ دیا بلکہ کچھ ایسا ڈھیلا سا جواب دیا کہ سلطان محمود نے سمرقند شہر میں اپنی فوج داخل کر کے اسے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔

۱۰۱۲ء آدھا گزر چکا تھا۔ ہندوستان کی طرف سے سلطان محمود مطمئن تھا۔ پنجاب کا مہاراجہ انند پال ابھی زندہ تھا مگر اس کا ڈنک مارا جا چکا تھا۔ وہ سلطان کا باجگزار تھا۔ سلطان کو ہندوستان سے اطلاعیں مل رہی تھیں کہ وہاں کے راجوں مہاراجوں کی سرگرمیاں اور عزائم کیا ہیں۔ اسے اطلاع ملی کہ انند پال مر گیا ہے اور اس کی جگہ راج دربار کی گدی پر اس کا بیٹا ترلوچن پال بیٹھا ہے۔

تھانیسر کے بت وشنو دیو کی یہ توہین کہ سلطان محمود اسے غزنی اٹھا لے گیا تھا، ہندوؤں کے لئے نا صرف ناقابل برداشت تھی بلکہ دہشت ناک زیادہ تھی۔ ہندو دیوتاؤں کے قہر سے خطر تھے۔ پنڈت تھر تھر کانپ رہے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ یہ بت انسان کی پیدائش کے ساتھ ہی وجود میں آیا تھا اور اولین انسانوں نے اس کی پرستش کی تھی۔ یہ بت اب غزنی کے گھوڑ دوڑ کے میدان میں ٹوٹا پڑا تھا، اور اس کے ٹکڑوں کو گھوڑے اور دوڑ کے مقابلے کے رتھ پیس رہے تھے۔ سارے ہندوستان کے مندروں کی گھنٹیاں صبح و شام بجتی تھیں۔ بہت سے پنڈت گنگا کنارے

چلے گئے تھے اور پانی میں کھڑے ہو کر ہری کشن اور بھگوان سے بخشش مانگ رہے تھے۔ آندھی آتی یا بجلی چمکتی تو ہندو ہاتھ جوڑ کر دعائیں بڑبڑانے لگتے تھے۔ اپنے باپ جے پال کے بعد مہاراجہ انند پال اٹھا تو طمطراق سے تھا اور اُس نے سلطان محمود کو دو تین میدانوں میں للکارا بھی تھا مگر ہر بار اُس نے شکست کھائی اور پسپا ہوا۔ سلطان سے دوستی کا اعلان کیا اور اُسے دھوکہ بھی دیا۔ آخر دم چھوڑ گیا۔ بعض مورخ کہتے ہیں کہ اُس کی موت کا باعث پے در پے شکستوں کا غم تھا۔ تھانیسر کے مندر کی تباہی کے بعد وہ اس غم سے جانبر نہ ہوسکا اور اُس کے بیٹے ترلوچن پال نے گدی سنبھال لی۔

انند پال کی موت پر ہندوستان کے چھوٹے بڑے راجے، مہاراجے اور رائے لاہور میں آئے ہوئے تھے۔ اُس کی لاش چتا پر جل رہی تھی۔ قنوج کے راجہ نے بلند آواز سے کہا — "آج وہ شخص جل کر راکھ ہوگیا ہے جس کی ساری عمر مندروں کی حفاظت میں اسلام کے خلاف لڑتے گزری۔ یہ واحد شخص تھا جس نے اپنے علاقے سے باہر جا کر محمود غزنوی سے ٹکر لی۔ یہ ہم سب کی بزدلی اور اپنے مذہب سے غداری ہے کہ ہمارے مندروں میں مسلمان اذانیں دے رہے ہیں۔ آؤ انند پال کے جلتے ہوئے جسم کے شعلوں کی تپش میں عہد کریں کہ ہمیں اپنے مندروں کی آبرو بحال کرنی ہے اور یہاں مسجدوں کو مندر بنانا ہے۔"

"میں عہد کرتا ہوں" — کالنجر کے راجہ نے کہا "کہ وشنو دیوتا کی توہین کا انتقام غزنی کی اینٹ سے اینٹ بجا کر لوں گا۔"

ہر ایک راجہ اور مہاراجہ نے پنڈت اور رشی نے جلتی ہوئی چتا کے قریب ہو کر عہد کیا کہ وہ اسلام کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے آگے اپنی فوج کی لاشوں کا بند باندھے گا۔ یہ الفاظ ہر ایک نے کہے کہ وہ مسجدوں کو مندر اور مسلمانوں کو ہندو اور غزنی کو مہا بھارت کی راجدھانی بنائے گا۔ انند پال کا جانشین ترلوچن پال پیچھے کھڑا آنسو بہا رہا تھا۔

"راجکمار ترلوچن پال کو بھی جو اب مہاراج ہیں، کچھ کہنا چاہیئے" — ایک رشی نے کہا — "اب مہاراج کو غم کا بوجھ اتار پھینکنا چاہیئے۔ راجپوت آنسو نہیں خون بہایا

کرتے ہیں۔"

جواں سال ترلوچن پال آگے آیا۔ اپنے باپ کی چتا کے شعلوں کو دیکھا پھر سب کی طرف دیکھا۔

"آپ میں کتنے ایسے ہیں جنہوں نے اپنے عہد پورے کیے ہیں؟" — ترلوچن پال نے کہا۔ "آپ نے اسلام کے آگے لاشوں کا بند پہلے کیوں نہ باندھا؟ جب سلطان تھانیسر کی طرف بڑھ رہے تھے، اُس وقت آپ سب کہاں تھے؟ اس کی مسجدوں کو مندر اور یہاں کے مسلمانوں کو ہندو بنا لینا کوئی مشکل نہیں لیکن راجپوت جھوٹ برداشت نہیں کیا کرتے۔ آپ میرے باپ کی تعریفیں کر رہے ہیں لیکن ہر لڑائی میرے باپ کو اپنے علاقے میں لڑنی پڑی۔ آپ میں سے کون ہے جس نے ہمیں اپنی فوج کی کچھ نفری اس لئے دی تھی کہ ہم پشاور اور لمغان کے درمیان روکے رکھیں؟...... آپ کے پاس صرف الفاظ ہیں۔ آپ خطرے کے وقت اپنی فوجیں ہمیں اس لئے دے دیتے ہیں کہ سلطان محمود غزنوی کو ہم اپنے علاقے میں روکے رکھیں اور آپ کی راجدھانیاں محفوظ رہیں۔"

"مہاراج!" — ایک مہاراجہ نے پوچھا — "آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

"میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ میں اپنی ریاست کو محفوظ رکھنے کے لئے مسلمانوں کو اپنا دوست سمجھوں گا" — ترلوچن پال نے کہا — "محمود نے حملہ کیا تو مقابلہ کروں گا مگر یہاں کے مسلمانوں پر ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا۔"

"تو کیا آپ محمود کے باجگزار رہیں گے؟" — مہاراجہ قنوج نے پوچھا۔

"ہاں!" — ترلوچن پال نے جواب دیا — "میں باج دیتا رہوں گا۔"

"کیا آپ کو معلوم ہے کہ یہاں کے مسلمان غزنی کے سلطان کے وفادار اور جاسوس ہیں؟" — مہاراجہ کالنجر نے کہا۔

"کیا آپ کو معلوم نہیں کہ غزنی کی فوج میں ہزاروں ہندوؤں کا بھی دستہ ہے؟" — ترلوچن پال نے کہا۔ "ان میں سے کتنے ہیں جو وہاں سے فرار ہو آئے ہیں؟ ان کے پاس گھوڑے ہیں، ہتھیار اور ہاتھی ہیں۔ وہاں وہ آزاد ہیں۔ وہ وہاں سے بھاگ کیوں نہیں آتے؟...... یہاں کے بہت سے مسلمان ہمارے وفادار ہیں۔"

www.paksociety.com

ایک جواں سال خوبصورت عورت عورتوں کے ہجوم میں سے نکل کر ترلوچن پال کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ اُس نے ترلوچن پال کی نیام سے تلوار کھینچ لی اور تلوار بلند کر کے بولی "تم سب جانتے ہو کہ میں اس شخص کی بیوی ہوں جو مسلمانوں کو اپنا دوست کہہ رہا ہے۔ یہ مجھے اُٹھا کر اپنے باپ کی چتا میں پھینک دے۔ چاہے تم مجھے اِسی تلوار سے کاٹ دو۔ میں اعلان کرتی ہوں کہ میں راجپوت کی بیٹی ہوں۔ میرا باپ مسلمانوں کے خلاف لڑتا ہوا مارا گیا ہے۔ میں اپنے مذہب کی توہین کا اور اپنے باپ کے خون کا انتقام لوں گی۔ آج سے میں نے اپنے اس خاوند کے ساتھ اپنا جسمانی تعلق توڑ دیا ہے۔ یہ بزدل ہے جو غزنی کے سلطان کا باجگزار رہنے کا اعلان کر رہا ہے۔"

ترلوچن پال اُس کی طرف لپکا مگر ایک اور جواں سال آدمی تلوار سونت کر دونوں کے درمیان آ گیا۔ وہ بھیم پال تھا۔ ترلوچن پال کا چھوٹا بھائی۔ تمام تاریخ نویسوں نے اس کا نام بھیم پال نڈر لکھا ہے اور کہا ہے کہ وہ غیر معمولی طور پر نڈر یعنی بے خوف اور دلیر تھا۔

"خبردار ترلوچن پال!" ۔۔۔ اُس نے کہا ۔۔۔ "یہاں تمہیں کوئی ایک بھی آدمی ایسا نہیں ملے گا جو تمہارا ساتھ دے گا۔ اگر اِس عورت پر تم نے ہاتھ اٹھایا تو میں بھول جاؤں گا کہ تم اس کے خاوند اور میرے بھائی ہو۔ میں ہوں اپنے باپ کی گدی کا وارث۔ اس گدی پر وہ بیٹھ سکتا ہے جو اس کی توہین کا انتقام لینے کے قابل ہو گا" ۔۔۔ اُس نے سب کی طرف دیکھا اور تلوار بلند کر کے پوچھا ۔۔۔ "اگر میں غزنی کے سلطان کو باج نہ دینے کا اعلان کر دوں اور اگر میں وشنو دیوی کی توہین کا انتقام لینے کی قسم کھا لوں تو کیا آپ مجھے اپنے باپ کی گدی کا وارث تسلیم کریں گے؟"

"تم یقیناً مہاراج جے پال اور مہاراج انندپال کے جانشین ہو" ۔۔۔ ایک پنڈت نے کہا۔

پھر ایک شور اُٹھا ۔۔۔ "ترلوچن پال کو ہٹا دو .... ترلوچن پال سے تلوار لے لو۔ نڈر مہاراج کی جے ہو ..."

یہ شور بلند ہوتا چلا گیا۔ انندپال کی چتا کے شعلے اور زیادہ بلند ہو گئے۔ جلتی ہوئی

لکڑیوں کی تڑاخ تڑاخ ہیبت ناک ہو گئی۔ اور ترلوچن پال جو دراصل بزدل نہیں بلکہ امن پسند اور حقیقت بین تھا، اس شور اور شعلوں میں ڈوب گیا۔ اس کی حیثیت ایک راہگیر کی سی رہ گئی۔ بھیم پال نڈر اسی وقت سے پنجاب کا راجہ بن گیا۔

اُسی رات راج محل میں تمام راجوں، مہاراجوں اور پنڈتوں کی کانفرنس ہوئی۔ اس میں ترلوچن پال نہیں تھا۔ اس کا بھائی بھیم پال گفتگو کی قیادت کر رہا تھا۔ سب سے بڑے پنڈت نے تجویز پیش کی کہ تمام مسجدیں مسمار کر دی جائیں اور مسلمانوں کو مجبور کر دیا جائے کہ غزنی چلے جائیں یا ہندو بن جائیں۔

"یہاں میں اپنے بھائی ترلوچن پال کی اس بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ ہم نہتوں پر ہاتھ نہیں اٹھائیں گے" ۔۔۔ بھیم پال نے کہا ۔۔۔ "ہم دشمن نہیں دوست پیدا کریں گے۔ مسجدوں کو ہم نے گرا بھی دیا تو کیا ہو گا۔ مسلمان جہاں کھڑا ہو کر نماز پڑھتا ہے، وہی اس کی مسجد ہوتی ہے۔ ہمیں سلطان محمود جیسے طاقتور جنگجو سے لڑنا ہے۔ میں ہندوستان کی تاریخ میں اپنے نام کے ساتھ یہ یاد نہیں چھوڑنا چاہتا کہ بھیم پال نے غزنی کے سلطان سے شکست کھائی اور نہتے مسلمانوں سے انتقام لیا۔"

"ہمارے سامنے مسئلہ یہ ہے کہ جس طرح ہماری عبادت گاہیں تباہ ہوئی ہیں اس کا یہ اثر ضرور پڑے گا کہ ہندو اسلام کی طرف راغب ہونے لگیں گے" ۔۔۔ ایک پنڈت نے کہا ۔۔۔ "لوگ دیوتاؤں کے قہر سے ڈر رہے ہیں مگر ابھی تک قہر نہیں آیا۔ ہمیں خود قہر بن کر غزنی کی فوج پر گرنا ہے۔ یہی ایک طریقہ ہے جس سے ہم ثابت کر سکتے ہیں کہ جنہیں مسلمان بت کہتے ہیں، یہ ہمارے دیوتا ہیں اور ان کی توہین کرنے والا زندہ نہیں رہ سکتا۔"

کسی نے یہ بھی مشورہ دیا کہ جن قلعوں پر مسلمانوں کا قبضہ ہے، انہیں محاصرے میں لے لیا جائے، مگر نڈر مہاراج نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ محمود غزنوی اپنی پوری جنگی طاقت سے آ جائے گا۔ اس کے لیے ہمیں تیاری کی ضرورت ہے۔ ہمیں تیاری کے لیے وقت چاہیے۔ پھر ہم محمود کو ہندوستان میں گھسیٹ کر کسی بڑی ہی مشکل جگہ لائیں گے اور گھیر

گے ہم اپنے پھندے میں لائیں گے۔

"اس دوران کیا ہمیں یہ کوشش نہیں کرنی چاہیئے کہ ہم بھیرہ، ملتان اور تھانیسر کے مسلمان سالاروں اور حکام کو ہاتھ میں لیں تاکہ وہ سلطان محمود کے وفادار نہ رہیں" — بھیم پال کے وزیر نے کہا۔ وہ بڑا ہی دانشمند اور تجربہ کار وزیر تھا۔ اس نے کہا — "ہمارے پاس طریقے موجود ہیں جن سے ہم ان حکام کو بیکار کر سکتے ہیں۔"

"یہ مسلمان اپنے ایمان اور کردار کے بڑے پکے ہوتے ہیں" — بھیم پال نے کہا — "مجھے امید نہیں کہ آپ ان کے سالاروں اور حاکموں کو اپنے ہاتھ میں لے سکیں گے۔"

وزیر نے ہنس کر کہا — "مسلمان بھی انسان ہوتے ہیں۔ ہر انسان اوتار اور پیغمبر نہیں ہوتا۔ ہر انسان میں ایک سی کمزوریاں اور ایک سی خواہشیں ہوتی ہیں۔ جو انسان انہیں دبا لیتے ہیں، وہ رشی منی اور مولوی کہلاتے ہیں۔ ہم ان میں یہی کمزوریاں، خواہشیں اور نشے بیدار کر کے انہیں پستیوں میں گرا سکتے ہیں ... ہم یہ کام تھانیسر سے شروع کریں گے۔"

اس کانفرنس میں ایک فیصلہ یہ ہوا کہ محمود غزنوی کے خلاف جنگی تیاریاں شروع کر دی جائیں اور دوسرا یہ کہ اس کے سالاروں وغیرہ کو ہاتھ میں لینے کی مہم کا آغاز کر دیا جائے۔ ان تیاریوں کے بعد بھیم پال کو سلطان محمود غزنوی کو یہ پیغام بھیجنا تھا کہ وہ غزنی کا باجگزار نہیں اور انند پال نے سلطان کے ساتھ دوستی کا جو معاہدہ کیا تھا، وہ منسوخ کیا جاتا ہے۔

سلطان محمود غزنوی اپنے تجربہ کار سالاروں عبداللہ الطائی، التون تاش اور ارسلان جاذب کو اپنے ساتھ لے گیا تھا کیونکہ وہاں کی جنگیں اس کے لیے زیادہ خطرناک تھیں۔ ہندوستان میں وہ جن سالاروں کو چھوڑ گیا تھا، وہ تھے تو اچھے جرنیل لیکن ان تین سالاروں کے پائے کے نہیں تھے جنہیں سلطان اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ ان پر شہری انتظامیہ کے حاکم مقرر کر دیئے گئے تھے۔

تھانیسر میں بہرام غور سالار تھا اور شہری حاکم قطب گزک تھا۔ وہ پہلی بار ہندوستان میں آئے تھے۔ انہیں یہاں کی ہر چیز عجیب لگتی تھی۔ انہوں نے یہ شعبدہ بھی دیکھا تھا کہ دو لڑکیوں کو دو ٹوکروں میں بٹھایا گیا اور خالی ٹوکرے دکھا دیئے گئے۔ پھر لڑکیوں کو ان ٹوکروں میں سے برآمد کیا گیا۔ نسوانی حسن کے لحاظ سے غزنی بھی خوبصورت علاقہ تھا لیکن ہندوستان کا حسن انہیں زیادہ جاذب لگا۔ انہیں بتایا گیا کہ ہندوستان طلسماتی سرزمین ہے اور یہاں یہ بتانا مشکل ہے کہ شعبدہ کیا اور کرامات کون سی ہے۔ ان کے لیے سب سے زیادہ عجیب بات یہ تھی کہ یہاں لوگ سانپوں کی بھی پوجا کرتے تھے اور عورتیں سانپوں کو دودھ پلاتی تھیں۔

ایک روز تھانیسر قلعے میں سات آٹھ راہب آئے۔ ان کے ساتھ چار جوان لڑکیاں تھیں۔ ان سب کا لباس ایک ایک سفید چادر تھی، جو مردوں کے کندھوں سے ٹخنوں تک گئی ہوئی تھی۔ لڑکیوں کا لباس بھی یہی تھا اور ان کے سروں پر باریک کپڑے کی اوڑھنیاں تھیں۔ ان لڑکیوں کے رنگ گورے، آنکھیں شربتی اور بال گہرے بادامی تھے۔ ان کے نقش و نگار میں کشش تھی۔ مردوں کی داڑھیاں تھیں۔ ان میں ایک سفید ریش تھا۔

شام کے بعد کا وقت تھا جب یہ گروہ قلعے میں داخل ہوا۔ یہ لوگ راہب اور پراسرار لگتے تھے۔ انہوں نے قلعہ دار سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی اور وجہ یہ بتائی تھی کہ ان کے ساتھ جوان لڑکیاں ہیں اس لیے وہ سرائے میں ٹھہرنے سے ڈرتے ہیں۔ انہیں لڑکیوں کے لیے محفوظ رہائشی جگہ کی ضرورت تھی۔ انہیں قلعہ دار قطب گزک تک جانے اجازت دے دی گئی۔ انہیں قلعہ دار کی طرف جاتا دیکھ کر سالار بہرام اور اس کا نائب بھی اس عجیب مخلوق کو دیکھنے چلے گئے۔ یہ لوگ لباس سے عجیب بنے ہوئے تھے۔ عجوبہ ایک تو یہ تھا کہ مرد بھی خوبصورت تھے اور لڑکیاں ان سے زیادہ حسین تھیں۔ دوسرا عجوبہ یہ تھا کہ ان میں جو سفید ریش تھا اس کے گلے کے گرد گز سوا گز لمبا سانپ لپٹا ہوا تھا۔ یہ سیاہ پھن دار ناگ تھا۔ جو اپنا منہ سفید ریش کے چہرے پر اور کبھی سر پر پھیرتا تھا۔ مردوں کے پاس بڑے خوبصورت عصا تھے۔ ہر عصا کے اوپر سانپ کا پھن بنا ہوا تھا۔ لڑکیوں کی گردنوں سے رنگدار رسیاں لٹک رہی تھیں اور رسیوں کے سروں سے باریک گھنٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ لڑکیاں چلتی تھیں تو گھنٹیاں دھیمی آواز سے اس طرح بجتی تھیں جیسے ندی کا پانی پتھروں سے گزر رہا ہو۔

قطب گزک نے ان کا خیر مقدم کیا اور احترام سے بٹھایا کیونکہ وہ شکل و صورت

اور لباس سے قابلِ احترام لگتے تھے۔

"ہم شاید آپ کے دربار میں آنے کی جرأت نہ کرتے" سفید ریش نے کہا۔ "لیکن ہم آپ پر اعتماد کر سکتے ہیں کیونکہ آپ ایک باطل مذہب کے دشمن ہیں۔ ہمیں دلی خوشی ہے کہ آپ باطل کو کچل رہے ہیں۔ آپ یقیناً اونچے کردار کے لوگ ہیں۔"

"آپ کا مذہب کیا ہے؟" سالار بہرام نے پوچھا۔

"ہم سانپوں کے پجاری ہیں" سفید ریش نے کہا۔ "اور اس کے ساتھ ہی ہم ایک خدا کو مانتے ہیں۔ ہمارا حسب نسب اُن یونانیوں سے ملتا ہے جو سکندرِ اعظم کے ساتھ ہندوستان میں آئے تھے۔ وہ یونانیوں کا خاص فرد تھا جو سانپوں کا پجاری تھا۔ ان کے متعلق ایک روایت ہے کہ وہ ہمیشہ ایک شیش ناگ کی تلاش میں رہتے تھے جو انہیں یونان میں نہ مل سکا۔ یہاں ہندوستان میں انہیں مل گیا۔ وہ سکندرِ اعظم کی فوج سے الگ ہو گئے اور شیش ناگ کے پیچھے چل پڑے۔ روایت ہے کہ یہ ناگ اُن کے لیے خُدا نے بھیجا تھا۔ اُس کا رنگ لال اور سبزی تھا۔ اُس کے سر پر کلغی تھی اور وہ ایک سیاہ گھوڑے کی پیٹھ پر سوار تھا....

"شیش ناگ آگے آگے چل پڑا۔ ہمارے آباؤ اجداد کے چند آدمی اُس کے پیچھے گئے۔ وہ ایسے دشوار گذار علاقے میں چلا گیا جہاں عام انسان نہیں پہنچ سکتے۔ وہاں چٹانیں ہیں جو اوپر سے تلوار کی دھار کی طرح ہیں۔ دریائے جمنا کی ایک شاخ اس علاقے میں سے گذرتی ہے۔ اس کے اوپر قدرت کا بنایا ہوا پل ہے جو دریا کی چوڑائی جتنا لمبا پتھر ہے۔ چوڑائی میں لکڑی کے شہتیر کی طرح ہے۔ اس پر ایک انسان کا پاؤں آ سکتا ہے۔ گرنے کا خطرہ ہر قدم پر ہے۔ نیچے دریا تنگ ہے کیونکہ پہاڑوں کے درمیان سے گذرتا ہے۔ گہرائی بہت زیادہ اور بہاؤ بہت تیز ہے....

"شیش ناگ اس کے اوپر سے گذر گیا۔ چار آدمی اس کے پیچھے گئے۔ دو پھسل کر گر پڑے اور دریا انہیں اپنے ساتھ لے گیا۔ دو آدمی پار جا پہنچے۔ وہ ایک خوشنما جگہ تھی جو ناگوں کی بستی تھی۔ ہمارے آباؤ اجداد وہیں آباد ہو گئے۔ ہم وہیں سے آئے ہیں۔ ہم سانپوں میں رہتے ہیں۔"

"کیا آپ سانپ کو خدا مانتے ہیں؟"

"خدا تو ہم خُدا کو ہی مانتے ہیں" سفید ریش نے کہا۔ "لیکن سانپ کو ہم اس لیے لائقِ پرستش سمجھتے ہیں کہ یہ خدا اور انسان کے رابطے کا ذریعہ ہے۔ یہ شیطان بھی ہے فرشتہ بھی ہو ہے اور پتھر کو سونا بنانے کی طاقت اور کرامات کس کے پاس ہے؟ صرف سانپ کے پاس۔ یہ ایک خاص قسم کا سانپ ہوتا ہے۔ اگر اس کی عمر ایک سو سال پوری ہو جائے تو اس کے جسم میں ایک گولی پیدا ہو جاتی ہے جو چمکتی ہے۔ اسے کوئی منی کہتا ہے کوئی منکا۔ سانپ اسے ہر وقت منہ میں رکھتا ہے۔ کسی کسی وقت اس کے ساتھ کھیلتا ہے۔ گولی کو ہوا میں اچھالتا اور اسے پکڑ لیتا ہے۔ یہ گولی اگر لوہے کے ٹکڑے پر رگڑو تو لوہا سونا بن جائے۔ اسے اپنی تلوار پر رگڑیں تو تلوار سونا بن جائے مگر آج تک کوئی انسان یہ گولی حاصل نہیں کر سکا۔ رات کو سانپ سو نہیں سکتا۔ وہ گولی منہ سے نکال کر زمین پر رکھتا ہے اور اس پر کنڈلی مار لیتا ہے۔ تب اسے نیند آتی ہے....

"ایسا سانپ صدیوں بعد سننے میں آتا ہے، مگر صرف سننے میں آتا ہے۔ اسے دیکھا کسی نے نہیں۔ اس کا منکا آج تک کوئی حاصل نہیں کر سکا۔ اسے کوئی حاصل کر بھی نہیں سکتا۔ ہندوستان میں مشہور ہے کہ یہ منکا جس کے ہاتھ آ جائے گا۔ وہ سارے ہندوستان کا بادشاہ ہوگا۔ شیش ناگ بھی اس کا غلام ہوگا اور اُس کے محل، اس کی راجدھانی اور اُس کے قلعوں کی حفاظت سانپ کریں گے۔ وہ ساری دنیا کا سب سے زیادہ دولت مند بادشاہ ہوگا۔"

"کیا آپ نے یا آپ کے آباؤ اجداد میں سے کسی نے یہ سانپ اور اس کا منکا دیکھا ہے؟"

"نہیں" سفید ریش نے جواب دیا۔ "ہمارے خطے میں منکے والا سانپ موجود ہے لیکن وہاں تک ہم میں سے کسی کو جانے کی اجازت نہیں۔ کوئی وہاں جانے کی جرأت بھی نہیں کر سکتا۔ ہم وہ جگہ جانتے ہیں جہاں وہ سانپ ہے لیکن اُس تک پہنچنے کے لیے راستہ اس قدر خطرناک ہے کہ کوئی زندہ نہیں رہ سکتا۔ ہمیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہاں ہونا کھرا

ہُوا ہے اور وہاں ہیرے اور جواہرات ہیں اور ہمارے پروہت کہتے ہیں کہ وہاں جو لڑکیاں ہیں، انہیں دیکھ کر کوئی یقین سے کہہ نہیں سکتا کہ یہ اس دنیا کی لڑکیاں ہیں۔ باہر کی دنیا والوں کو اس خطے کے متعلق علم ہے لیکن سب کہتے ہیں کہ وہاں جو لڑکیاں ہیں انسان نہیں ناگنیں ہیں جنہوں نے اپنا روپ بدل رکھا ہے۔ یہ غلط ہے۔ وہ ہماری نسل کی لڑکیاں ہیں۔ وہ جس قدر حسین ہیں اتنی ہی بدنصیب ہیں۔ عمر کے ایک حصے تک وہ خوش رہتی ہیں مگر آگے چل کر وہ اداس رہنے لگتی ہیں کیونکہ انہیں مرد کی رفاقت میسر نہیں آتی۔"

سفید ریش ایسے انداز سے اس طلسم ہوشربا کی باتیں سنا رہا تھا کہ قلعہ دار قطب گزک اور سالار بہرام اور اس کے نائب سالار کی آنکھیں ٹھہر گئی تھیں اور ان کے رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے۔ اُن کے سامنے چار لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ ان سب کے ہونٹوں پر تبسم تھا۔ غزنی کے یہ حکام ان لڑکیوں کو دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہے تھے کہ ان سے زیادہ خوبصورت بھی کوئی لڑکی ہو سکتی ہے! انہوں نے مہمانوں کی خوب خاطر مدارت کی اور ان کی رہائش کا شاہانہ انتظام کر دیا۔

وہ سب سونے کے لیے چلے گئے تھے مگر سفید ریش کو قطب گزک نے اپنے پاس بٹھا رکھا تھا۔ وہ سفید ریش سے اُس خطے کے بھید لے رہا تھا اور سفید ریش اُسے کہہ رہا تھا کہ سارے ہندوستان کی بادشاہی کا راز ناگوں کے اس خطے میں ہے جہاں کوئی اجنبی نہیں جا سکتا، اور جانے کی جرأت بھی کوئی نہیں کرتا۔

"کیا وہاں تک پہنچا جا سکتا ہے؟"— قطب گزک نے پوچھا اور ذرا جھجک کر بولا — "مجھے دولت کی ضرورت نہیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ بڑھاپے کی بیماریوں نے حملے شروع کر دیئے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ ہندوستان کے پہاڑی علاقوں میں ایسی جڑی بوٹیاں ہیں ....؟"

"جو بڑھاپے کے عمل کو روک دیتی ہیں"— سفید ریش نے اس کی بات پوری کرتے ہوئے کہا۔ "میرے بال سفید ہو گئے ہیں، لیکن میرے جسم کو ہاتھ لگائیں، جوانوں جیسا مضبوط اور توانا ہے اور میری عمر ایک سو سال سے زیادہ ہو گئی ہے۔ آپ نے ٹھیک سنا ہے۔ ہمارے خطے میں ایسی بوٹی ہے جس میں سانپوں کا زہر ملا ہوا ہے۔ صرف ہم لوگ اس بوٹی سے آگاہ

ہیں۔ یہ صرف جوان ہی نہیں رکھتی بلکہ بڑی لمبی عمر دیتی ہے۔"

قطب گزک کا خیال تھا کہ ان لوگوں سے وہ اکیلا ہی راز لے رہا ہے، لیکن سالار بہرام جو مردانگی کا خوبصورت مجسمہ تھا، اس عجیب و غریب گروہ کے ایک آدمی اور ایک لڑکی کو اپنے کمرے میں بٹھائے ہوئے پوچھ رہا تھا کہ کیا وہ اُسے اپنے ساتھ اپنے خطے میں لے جا سکتے ہیں؟ وہ آدمی اسے بتا رہا تھا کہ وہ اپنے فرشتے اور عقیدے کے ساتھ غداری نہیں کر سکتا۔

وہ باتیں کرتے کرتے کسی بہانے باہر نکل گیا اور لڑکی اس کے پاس اکیلی رہ گئی۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ بہرام نے اس کے ساتھ باتیں شروع کر دیں۔ لڑکی نے اُسے کہا کہ اس نے اس سے زیادہ خوبصورت اور تنومند آدمی کبھی نہیں دیکھا۔

"تم تو جنت میں رہتی ہو"— بہرام نے کہا۔

"وہ جنت نہیں جہنم ہے جہاں اپنے جذبات کچلنے پڑیں"— لڑکی نے کہا۔ "ہماری زندگی ان راہبوں کے ساتھ گزر رہی ہے۔ یہ مُردہ دل لوگ ہیں۔ مجھے آپ کی عورتوں جیسی زندگی چاہیئے۔"

یہاں سے بات چلی تو اُس مقام تک جا پہنچی جہاں دل تو دو ہوتے ہیں لیکن دو جسموں کی جان ایک ہو جاتی ہے۔ لڑکی نے والہانہ محبت کا اظہار کیا تو بہرام نے اس سے پوچھا کہ سانپ کے منکے کا قصہ کہاں تک درست ہے؟ لڑکی نے اُسے بتایا کہ وہ ساتھ چل کر اُس کی راہنمائی نہیں کر سکتی، اُسے راستہ سمجھا سکتی ہے۔ چنانچہ اُس نے راستہ سمجھانا شروع کر دیا اور بہرام کاغذ پر لکیریں ڈالتا گیا۔

"آپ کے پاس تیروں کا ذخیرہ ہونا چاہیئے"— لڑکی نے کہا— "وہاں آپ کو قدم قدم پر سانپ نظر آئیں گے۔ آپ انہیں تیروں سے مار سکتے ہیں۔ میں نے آپ کو جو سرنگ بتائی ہے اس کے دہانے پر ایک اژدہا کُنڈلی مارے بیٹھا ہو گا۔ اس کے سر پر تیر لگے تو مر جائے گا۔ جسم پر کہیں بھی تیر لگا تو یہ آپ کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ یہ سرنگ بہت لمبی ہے۔ اس میں سے آپ گزر گئے تو آپ کو شفاف پانی کا ایک چشمہ نظر آئے گا۔ اس کے کنارے پر آپ کو وہ سانپ نظر آئے گا جس کے پاس وہ منکا ہے۔ وہ اس کے ساتھ کھیل رہا ہو گا۔ اسے بھی آپ تیر سے مار سکتے ہیں۔ پھر منکا آپ کا ہو گا۔"

"اور تم مجھے کہاں ملو گی؟"

"میں آپ کو مل جاؤں گی"۔ لڑکی نے جواب دیا۔

دوسرے دن ناگ پرستوں کا یہ گروہ روانہ ہو گیا اور اپنے پیچھے پُراسرار سا ہیجان چھوڑ گیا۔

قطب گزک نے اپنے محافظوں میں سے دو کو بلایا۔ یہ دونوں اُس کی نظر میں قابلِ اعتماد اور دلیر تھے۔ اس نے اُن سے کہا۔ "میں نے تمہیں قلعہ دار کی حیثیت سے نہیں، راز دار دوست کی حیثیت سے بلایا ہے۔ اگر میرا ایک کام کر دو تو میں تمہیں بڑے عہدے دے کر غزنی بھیج دوں گا۔ اگر تم فوج سے نکل جانا چاہو گے تو تمہیں نکال دوں گا۔ تم جب یہاں سے جاؤ گے تو تمہارے پاس اتنا سونا ہو گا کہ تمہاری سات پشتیں کوئی کام کیے بغیر عیش و عشرت کی زندگی بسر کریں گی۔ شرط یہ ہے کہ تم یہ راز کسی کو نہیں دو گے کہ تم کہاں جا رہے ہو۔ میں تمہیں ایک خاص لباس میں بھیجوں گا۔"

دونوں نے رضامندی ظاہر کر کے وعدہ کیا کہ وہ کسی کو پتہ نہیں چلنے دیں گے کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔ قطب گزک نے ان کے آگے ایک نقشہ رکھ دیا اور انہیں رستہ بتانے لگا۔ جوں جوں محافظ راستہ سنتے جا رہے تھے، ان کے رنگ اُڑتے جا رہے تھے۔

"تم نے کل رات وہ لوگ دیکھے ہوں گے جو سفید چادروں میں ملبوس یہاں آئے تھے"۔ قطب گزک نے کہا۔ "اگر تم اس مقام سے دریا پار کر گئے تو تمہیں وہ سفید پوش آدمی ملے گا جو رات یہاں آیا تھا۔ اس کے بعد تمہارا کام آسان ہو جائے گا۔ وہ تمہیں ایک بوٹی اور بہت سا سونا دے گا۔ یہ تم لے کے میرے پاس آ جاؤ گے۔ بوٹی مجھے دے دینا اور سونا تم اپنے پاس رکھ لینا۔"

"یہ بوٹی کیسی ہے؟" — ایک محافظ نے پوچھا۔

"ایک بار کھا لو تو انسان ایک سو سال سے زیادہ بھی زندہ رہ سکتا ہے"۔ قطب گزک نے کہا۔ "اور مرتے دم تک انسان جوان رہتا ہے۔"

دو محافظوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور مسکرا دیے جیسے انہیں سونے

سے زیادہ اس بوٹی کے ساتھ دلچسپی تھی۔

"دراصل جانا مجھے خود چاہیے تھا"۔ قطب گزک نے کہا۔ "سفید پوش ناگ پرست نے کہا تھا کہ میں خود جاؤں لیکن تم جانتے ہو کہ قلعہ دار اتنے عرصے کے لیے کس طرح غیر حاضر ہو سکتا ہے۔ مجھے اتنا اختیار ہے کہ تم دونوں کو جہاں چاہوں اور جتنے عرصے کے لیے چاہوں بھیج سکتا ہوں۔"

گذشتہ رات جب بہرام لڑکی سے راستہ سمجھ رہا تھا۔ اُس وقت سفید پوش قلعہ دار کو راستہ سمجھا رہا تھا اور اُس نے قلعہ دار سے کہا تھا کہ وہ خود آئے۔ اُس نے قلعہ دار سے یہ بھی کہا تھا کہ اُس نے ان لوگوں کی جس طرح خاطر مدارات کی ہے، اس کے بدلے میں وہ اسے ہمیشہ جوان رکھنے والی بوٹی اور کچھ سونا بھی دے گا۔

اور اب جب ناگ پرست چلے گئے تھے، بہرام اپنے نائب سے کہہ رہا تھا — "تم جاؤ یا میں چلا جاتا ہوں۔ ہم دونوں میں سے کوئی بھی گیا تو بہانہ یہی معقول ہو سکتا ہے کہ گرکوٹ تک کے علاقے میں جو کبوتروں کا انتظام دیکھنا اور اسے بہتر بنانا ہے۔ لڑکی نے مجھے راستہ سمجھا دیا ہے۔ اگر ہم وہاں پہنچ گئے تو تصور میں لاؤ کہ ہم کیا سے کیا بن جائیں گے۔ ہمیں ایک دوسرے کی مدد کی ضرورت ہے۔ میں جاؤں یا تم جاؤ۔ چار پانچ قابلِ اعتبار آدمی ساتھ ہونے چاہئیں۔"

"کیا آپ نے یقین کر لیا ہے کہ ان لوگوں نے جو کچھ کہا ہے وہ بالکل ٹھیک ہے؟" — نائب سالار نے کہا۔ "کیا آپ نے سوچا ہے کہ اس لڑکی نے اتنا نازک راز آپ کو کیوں دے دیا ہے؟"

"اس لیے کہ مجھے دیکھ کر وہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو گئی تھی"۔ بہرام نے جواب دیا۔ "وہ چاہتی ہے کہ میں اُس پُراسرار اور دنیا کی نظروں سے اوجھل خطے سے سونا سمیٹ لوں اور اُسے اپنے ساتھ لے آؤں۔"

"اور میں آپ کو خبردار کرتا ہوں کہ ان لوگوں نے اپنی لڑکیوں کی عزت بچانے کے لیے آپ کو اس لڑکی کے ذریعے دھوکہ دیا ہے"۔ نائب سالار نے کہا۔ "انہیں رات

یہاں قیام کرنا تھا۔ وہ دھوکہ دے کر اور اپنی لڑکیوں کی عزت بچا کر چلے گئے ہیں۔"

"تم میرا ساتھ نہیں دو گے؟" — بہرام نے کہا۔ "میں نے تمہیں اپنا ماتحت نہیں اپنا عزیز دوست سمجھ کر اپنے راز میں شریک کیا ہے۔ میں وہاں سے جو کچھ لاؤں گا اس میں تمہارا حصہ بھی ہوگا۔ ذرا سوچو کیا ہماری قسمت میں اپنے وطن اور اپنے عزیزوں سے دور پردیس میں لڑنا اور کٹ مرنا ہی لکھ دیا گیا ہے؟ یہ مہاراجوں اور سلطانوں کی جنگ ہے۔ خزانے بھرتے ہیں تو ان کے عیش و عشرت ان کے حصے میں آتی ہے۔ وہ ہمارے خون اور ہماری جانوں کو جنگ میں جھونک کر سلطان اور مہاراجے بنے ہوئے ہیں۔ کیا ہمیں حق حاصل نہیں کہ ہم موت کے سائے سے نکل کر باقی عمر عیش و آرام سے گزاریں؟"

بہرام نے جب لڑکیوں کے حسن کا ذکر چھیڑا تو نائب سالار کی آنکھوں میں چمک آنے لگی۔ بہرام نے کہا۔ "تم کیوں فکر کرتے ہو؟ تم نہ جاؤ۔ میں جاؤں گا۔ میں اپنی جان خطرے میں ڈال رہا ہوں۔ تمہیں صرف یہ کام کرنا ہے کہ میری غیر حاضری کو چھپائے رکھو اور یہی ظاہر کرو کہ میں دور دراز کی چوکیوں کو دیکھنے اور انہیں بہتر بنانے کے لیے چلا گیا ہوں۔ قلعہ دار مجھے اس کام سے نہیں روکے گا۔ تمہارا دوسرا کام یہ ہوگا کہ قلعے پر حملے کا خطرہ تو نہیں لیکن ہم دشمن کے پیٹ میں بیٹھے ہیں۔ دشمن پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔ اگر حملہ ہو جائے تو تم قلعے کو بچانے کے لیے جان لڑا دینا تاکہ کسی کو میری کمی محسوس نہ ہو۔"

نائب سالار بہرام کی باتوں میں آ گیا۔ اس نے راز چھپائے رکھنے کا وعدہ کیا اور ان کے سامنے اب مسئلہ یہ آ گیا کہ وہ کون سے چار آدمی ہو سکتے ہیں جن پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ سونے اور حسین عورت کے لالچ میں تو ہر کوئی اس خفیہ اور پُراسرار مہم کے لیے تیار ہو جاتا مگر انہیں خطرہ یہ نظر آ رہا تھا کہ اتنی زیادہ دولت دیکھ کر یہ آدمی بہرام کو قتل کر دیں گے اور سب کچھ خود لے اڑیں گے۔ ان کے آپس میں لڑ مرنے کا خطرہ بھی تھا، اس لیے چار آدمیوں کے انتخاب میں انہیں بہت محتاط ہونا تھا۔ انہوں نے اسی وقت اپنے چھاپہ ماروں میں سے چار آدمیوں کا انتخاب شروع کر دیا۔

ان کا خیال تھا کہ ان دونوں کے سوا اس پُراسرار خطے کا راستہ کسی اور کو معلوم نہیں۔ سفید ریش ناگ پرست قلعہ دار کو راستہ بتا گیا تھا اور وہ اپنے محافظوں کو وہاں بھیجنے

کے لیے تیار کر رہا تھا۔ قلعہ دار کے سامنے بھی یہی مسئلہ تھا کہ اسے اس مہم کو خفیہ رکھنا تھا۔ وہ بھی اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ جو راز اسے ملا ہے، وہ کسی اور کو نہیں ملا۔

سفید ریش اپنے گروہ کے ساتھ سورج نکلنے سے پہلے قلعے سے روانہ ہو گیا تھا۔ ان کے پاس پالکیوں والے اونٹ تھے جن پر لڑکیاں سوار تھیں اور مردوں کے لیے دو دو گھوڑوں والی گھوڑا گاڑیاں تھیں۔ جب یہ قافلہ تھانیسر شہر میں سے گزر رہا تھا تو لوگ انہیں دیکھنے کو اکٹھے ہو گئے تھے۔ قافلہ شہر سے نکل گیا اور جنگل میں داخل ہو گیا۔ سفید ریش نے اپنے ان دو آدمیوں کو جو گاڑی بان تھے، کہا۔ "واپسی پر بھی خیال رکھنا کہ کسی چوکی کے قریب سے نہ گزرنا۔ تمہیں معلوم ہے کہ ان لوگوں کی چوکیاں کہاں کہاں ہیں۔"

دن آدھا گزر گیا تھا جب قافلہ ویران اور سنسان علاقے میں داخل ہو گیا۔ وہاں کھنڈ نالے اور اونچے نیچے ٹیلے اور گھاٹیاں تھیں اور درخت بھی تھے لیکن یہ جنگل سرکنڈوں اور اونچی گھاس کا معلوم ہوتا تھا۔ سفید ریش نے قافلے کو آرام کے لیے روک لیا۔ لڑکیاں پالکیوں میں سے نکلیں۔ گھوڑوں سے زینیں اتار دی گئیں۔ دریاں زمین پر بچھا کر سب بیٹھ گئے۔ سب بہت خوش تھے۔ لڑکیاں اچھل کود رہی تھیں۔ سفید ریش اور دوسرے آدمی انہیں دیکھ دیکھ کر ہنس رہے تھے۔

"ہمیں کس طرح پتہ چلے گا کہ ہم نے شکار مار لیا ہے؟" — ایک لڑکی نے پوچھا۔

"تھانیسر میں ہمارے آدمی موجود ہیں۔" — سفید ریش نے جواب دیا۔ "قلعے کے اندر بھی ہمارے آدمی ہیں۔ اگر قلعہ دار اور سالار ہمارے بتائے ہوئے راستے پر چل پڑے تو ہمارے آدمی کچھ دور تک ان کا تعاقب کریں گے۔ جب انہیں یقین ہو جائے گا کہ وہ ہمارے گمراہ کیے ہوئے جا رہے ہیں تو انہیں معلوم ہے کہ کہاں کہاں اطلاع پہنچانی ہے۔ وہ جائیں گے ضرور۔"

"جس سالار کے پاس مجھے بھیجا گیا تھا، وہ تو اسی وقت ہوش اور عقل کھو بیٹھا تھا" — ایک لڑکی نے کہا۔

"یہ مت سوچو کہ یہ لوگ اب کیا کریں گے" — سفید ریش نے کہا۔ "وہ جو کچھ بھی کریں

گے۔ وہ ہمارے حق میں بہتر ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ تھانیسر ہمیں واپس مل جائے گا۔"

ان میں سے کسی نے چونک کر کہا۔ "میں نے گھوڑے کی آواز سنی ہے۔"

"اپنے گھوڑے کی ہوگی۔" ایک نے کہا۔

کسی نے توجہ نہ دی لیکن یہ آواز ان کے اپنے کسی گھوڑے کی نہیں تھی۔ یہ قافلہ جب تھانیسر سے دور جنگل میں چلا گیا تھا تو ایک نوعمر لڑکا جو ایک ٹیکری پر بیٹھا تھا قافلے کو دیکھ کر ایک جھاڑی کی اوٹ میں ہو گیا تھا۔ اس وقت اونٹوں کی پالکیوں کے پردے اُٹھے ہوئے تھے اور لڑکیاں نظر آ رہی تھیں گھوڑا گاڑیوں سے بھی پتہ چلتا تھا کہ قافلہ قیمتی ہے۔ لڑکا اوپر سے پرے کھسک کر دوسری طرف سے اُتر گیا اور بہت تیز دوڑتا ہوا کسی طرف غائب ہو گیا تھا۔

لڑکا جہاں رُکا، وہاں دس بارہ آدمی زمین پر لیٹے ہوئے تھے اور قریب ہی ان کے گھوڑے بندھے تھے۔ لڑکے نے انہیں بتایا کہ وہ کیا دیکھ آیا ہے، اور اس قافلے کا رُخ کدھر کو ہے۔ ان میں سے ایک آدمی اُٹھا اور لڑکے کے ساتھ چلا گیا۔ اس نے بھی ایک جگہ چھپ کر دیکھا اور لڑکے کی پیٹھ تھپک کر واپس آ گیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ موٹا شکار ہے۔ پہلے تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ قافلے کا تعاقب جاری رکھا جائے اور رات کو حملہ کیا جائے لیکن ایک نے کہا کہ دن اور رات کا خیال نہ کرو صرف یہ دیکھو کہ غزنی والوں کی کوئی فوجی چوکی قریب نہ ہو۔ کسی چوکی تک آواز پہنچ گئی تو وہاں سے سپاہی دوڑے آئیں گے اور ہم میں سے کوئی بھی نہیں بھاگ سکے گا۔

"ان بدبخت مسلمانوں نے ہمارا تو ناک میں دم کر دیا ہے۔" ان رہزنوں کے سردار نے کہا۔ "ہم مہاراجوں کو اسی لیے پسند کرتے ہیں کہ اپنی راجدھانیوں کے باہر کی وہ پرواہ ہی نہیں کرتے۔ ان غزنی والوں نے تو جنگل میں بھی اپنی حکومت قائم کر لی ہے۔ یہاں تو ہماری حکومت تھی.... بہتر ہے چل پڑو۔ جہاں تک مجھے یقین ہے، قریب کوئی چوکی نہیں۔"

قریب تو کوئی چوکی نہیں تھی اور نہ ہی کوئی سپاہی تھے لیکن غزنی کی فوج کے سات آٹھ سپاہی ایک چوکی میں سے واپس تھانیسر جا رہے تھے۔ وہ گھوڑوں پر سوار تھے اور گپ شپ لگاتے چلے جا رہے تھے۔

آگ پرستوں کا قافلہ کھانا کھا کر آرام کر رہا تھا۔ رہزنوں کا ایک گھوڑا ہنہنایا تھا جس کی آواز قافلے تک پہنچی تھی مگر انہوں نے توجہ نہیں دی تھی۔ انہیں معلوم نہ ہو سکا کہ رہزن اپنے گھوڑے ذرا دور چھوڑ آئے ہیں اور پیدل آ کر انہوں نے گھیرا ڈال لیا ہے۔

ایک تیر آیا جو قافلے کے ایک آدمی کے سینے میں اُتر گیا۔ سب گھبرائے ہوئے اُٹھے۔ انہیں آواز سنائی دی۔ "سب ایک طرف کھڑے ہو جاؤ۔ کسی کی آواز نہ نکلے اور کوئی حرکت نہ ہو۔" سب ایک طرف ہو گئے سوائے اُس کے جس کے سینے میں تیر اُتر گیا تھا۔ ارد گرد کے سرکنڈوں میں سے دس گیارہ آدمی باہر آئے۔ اُن کی صرف آنکھیں ننگی تھیں۔ سروں پر صافے اور چہروں پر سیاہ رومال لپٹے ہوئے تھے۔ اُن کے ہاتھوں میں تلواریں تھیں۔ وہ جونہی سامنے آئے، قافلے کے تمام آدمیوں نے اُن سفید چادروں کے اندر سے جو انہوں نے لباس کے طور پر اپنے جسموں پر لپیٹ رکھی تھیں، خنجروں سے بڑی اور بڑی تلواروں سے چھوٹی تلواریں نکال لیں۔

وہ جو لباس سے راہب اور بڑے ہی معصوم لگتے تھے، تیغ زن بن گئے۔ وہ لڑکیوں کو اپنے حصار میں رکھے ہوئے تھے اور رہزن اس حصار کو توڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔

رہزنوں کی یہ خوش فہمی جلدی رفع ہو گئی کہ وہ ان نہتے راہبوں کو زبانی دھمکی سے زیر کر لیں گے اور اُن کے پاس جو کچھ ہوگا وہ بھی اور ان کی چاروں لڑکیوں کو بھی اُٹھا لے جائیں گے، مگر اُن کی تلواریں لمبی تھیں۔ اس سے انہوں نے قافلے کے آدھے آدمی مار ڈالے۔ لڑکیوں نے دلیری کا یہ مظاہرہ کیا کہ اپنے مرے ہوئے آدمیوں کی تلواریں اُٹھا لیں۔ رہزنوں کو اب لڑکیوں کی یہ للکار سنائی دینے لگی۔ "راجپوتوں کی بیٹیوں کو تم ہاتھ نہیں لگا سکو گے۔" دو تین رہزن بھی مارے گئے تھے۔

غزنی کی فوج کے وہ سات آٹھ آدمی جو کسی چوکی سے تھانیسر کی طرف جا رہے تھے، قریب سے گزر رہے۔ انہیں شور اور للکار سنائی دی۔ وہ رُک گئے اور ادھر دیکھا۔ انہیں ایک جگہ دس گیارہ گھوڑے نظر آئے۔ انہیں بتایا گیا تھا کہ ہندوستان میں رہزن اور

ڈاکو جنگلوں میں موجود رہتے ہیں اور قافلوں کو لوٹ لیتے ہیں۔ وہ پیدل یا گھوڑوں وغیرہ پر سفر کرنے کا زمانہ تھا۔ تاجر بھی ان قافلوں کے ساتھ ادھر اُدھر آیا جایا کرتے تھے۔ اگر قافلہ چھوٹا ہوتا تو اس پر حملے کا زیادہ خطرہ ہوتا تھا۔ راجوں مہاراجوں نے رہزنی کا کوئی سدِباب نہیں کیا تھا۔ سلطان محمود غزنوی نے اپنی فوج کو جسے اس نے ہندوستان کے مفتوحہ علاقوں میں رکھا تھا، یہ حکم دیا تھا کہ قلعوں اور شہروں سے دُور جو فوجی چوکیاں ہیں، ان کے ذمے فوجی فرائض کے علاوہ یہ ذمہ داری بھی ہے کہ اپنے اپنے علاقے میں گشت کا انتظام کریں اور مسافروں کو حفاظت اور سلامتی مہیا کریں اور ڈاکوؤں اور رہزنوں کو اپنا بدترین دشمن سمجھ کر انہیں ختم کریں۔

ان فوجیوں نے اپنے گھوڑوں کے رُخ اُدھر کو موڑے اور گھوڑے دوڑا دیئے۔ وہاں انہیں لاشیں اور خون نظر آیا۔ تین چار نقاب پوش دو لڑکیوں کو اُٹھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ فوجیوں نے انہیں للکارا تو وہ لڑکیوں کو پھینک کر بھاگ اُٹھے۔ ان کے ایک دو اور ساتھی بھی زندہ تھے۔ وہ بھی بھاگے لیکن فوجیوں نے انہیں دُور نہ جانے دیا اور انہیں اُن کے گھوڑوں تک نہ پہنچنے دیا۔ سب کو زندہ پکڑ لیا۔

ادھر آ کر دیکھا تو صرف یہ دو لڑکیاں زندہ تھیں۔ باقی دو اور ان کے ساتھ سب آدمی مارے گئے تھے۔ لڑکیوں نے ان کی لاشیں دیکھیں تو سفید ریش کے متعلق فوجیوں کو بتایا کہ ابھی زندہ ہے۔ اُسے دیکھا۔ اُس کے جسم پر کئی زخم تھے اور وہ زندہ تھا۔ فوجیوں نے اُس کے منہ میں پانی ٹپکایا اور اُسے اُٹھا کر ایک گھوڑا گاڑی میں ڈال لیا۔ لڑکیوں کو دوسری گھوڑا گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔ رہزنوں کے ہاتھ باندھ کر ان کی رسیاں گھوڑوں کے ساتھ باندھ دی گئیں۔ اُن کے گھوڑے بھی ساتھ لے لیے گئے اور یہ قافلہ تھانیسر کی طرف چل پڑا۔ لاشیں وہیں رہنے دی گئیں۔

جب گھوڑا گاڑیاں، پالکیوں والے اونٹ، اتنے زیادہ گھوڑے اور چار پانچ قیدی گھوڑوں کے ساتھ بندھے ہوئے اور غزنی کے فوجی تھانیسر قلعے میں داخل ہوئے، اُس وقت سورج غروب ہو چکا تھا۔ قلعہ دار قطب گزک اور سالار بہرام غور کو اطلاع ملی تو دوڑے آئے۔ انہیں بتایا گیا کہ یہ رہزن ہیں جنہوں نے راہیوں کے

قافلے کو لوٹنے کی کوشش کی اور ان کے کئی آدمی اور دو لڑکیاں قتل کر دی ہیں۔ انہیں ساتھ لانے والے فوجیوں کو تو معلوم ہی نہیں تھا کہ یہ لوگ کہیں سے گئے تھے۔

قلعہ دار نے حکم دیا کہ سفید ریش کو بچانے کی پوری کوشش کی جائے۔ بظاہر یہ انسانی ہمدردی کا مظاہرہ تھا لیکن قلعہ دار قطب گزک اپنی گم گشتہ جوانی اور لمبی عمر کی خاطر سفید ریش کو بچانا چاہتا تھا۔ طبیب فوراً سرگرم ہو گئے۔ دونوں لڑکیوں پر ایسی دہشت طاری تھی کہ اُن کے منہ سے بات نہیں نکلتی تھی۔ انہیں الگ کمرے میں رکھا گیا اور اُن کی خدمت اور دیکھ بھال کے لیے دو عورتوں کو بلا لیا گیا۔ قلعہ دار اور سالار نے انہیں تسلی دلاسے دیئے اور کہا کہ انہیں فوج کی حفاظت میں ان کی منزل تک پہنچا دیا جائے گا۔

سفید ریش بے ہوش تھا۔ رات بھر طبیب اور جرّاح اُس کے زخموں کی مرہم پٹی اور خون روکنے میں لگے رہے اور اُس کے منہ میں دوائیاں ٹپکاتے رہے۔ قطب گزک ان کے سر پر سوار رہا۔ دوسرا دن آدھا گزر چکا تھا جب اُس نے آنکھیں کھولیں اور اُس نے سرگوشی میں پوچھا کہ وہ کہاں ہے۔ اُسے بتایا گیا کہ وہ تھانیسر قلعے میں ہے اور قلعہ دار نے اپنی ذاتی نگرانی میں اُس کی مرہم پٹی کرائی ہے۔

وہ شام کے بعد ذرا بولنے کے قابل ہوا۔ اُسے بتایا گیا کہ اُس کے گروہ کی دو لڑکیاں زندہ بھی ہیں۔ اُس نے دونوں سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو لڑکیوں کو اُس کے پاس لے گئے۔ اُن لڑکیوں نے بتایا کہ غزنی کے فوجیوں نے انہیں رہزنوں سے بچایا ہے اور انہی فوجیوں نے اُسے زندہ دیکھ کر اُسے تھانیسر تک پہنچایا ہے۔ لڑکیوں نے اُسے یہ بھی بتایا کہ قلعہ دار اور سالار نے ان کا بہت زیادہ خیال رکھا ہے اور ان کے لیے دو عورتیں مقرر کر دی گئی ہیں۔

بوڑھے کے آنسو نکل آئے۔ اُس پر جذباتیت غالب آ گئی۔ اُس نے لڑکیوں سے کہا۔ "میں ان لوگوں کو مزید دھوکے میں نہیں رکھوں گا۔ قلعہ دار کو میرے ساتھ اپنے فائدے کے لیے دلچسپی ہو سکتی ہے، اُن فوجیوں کو میرے ساتھ کیا دلچسپی تھی؟ یہ لوگ تم جیسی دلکش لڑکیوں کو احترام سے لائے اور تمہاری دیکھ بھال کی۔ انہوں نے مجھے

نئی زندگی دی .... میں انہیں دھوکے میں نہیں رکھوں گا۔"

اُس نے قلعہ دار قطب گزک سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو قلعہ دار کو اطلاع دی گئی۔ وہ فوراً آگیا اور لڑکیاں چلی گئیں۔

"میں آپ کی فوج کو اس احسان کا صلہ دینا چاہتا ہوں" ۔۔۔ سفید ریش نے نحیف آواز میں کہا۔

"آپ اسے احسان نہ سمجھیں" ۔۔۔ قطب گزک نے کہا ۔۔۔ "آپ پہلے صحت یاب ہو لیں۔ میں نے دو آدمی تیار کر لیے ہیں جو آپ کے ساتھ جائیں گے۔ آپ جانتے ہیں کہ مجھے کیا چاہیے۔ باقی رہا ان سپاہیوں کا معاملہ جو آپ کو وہاں سے اٹھا لائے ہیں، تو جب آپ صحت یاب ہو کر واپس جائیں گے، تو ان کے لیے کچھ سونا بھیج دینا۔"

"میرے پاس نہ آپ کے لیے کچھ ہے نہ ان سپاہیوں کے لیے" ۔۔۔ سفید ریش نے کہا ۔۔۔ "میں احسان کا صلہ آپ کو ہمیشہ جوان رکھنے والی بوٹی اور سپاہیوں کو سونا دے کر نہیں دینا چاہتا بلکہ اس احسان کا صلہ یہ ہے کہ آپ کو بتا دوں کہ نہ کوئی ایسی بوٹی ہے جو انسان کو ہمیشہ جوان رکھ سکتی ہے اور نہ کسی جگہ سونا بکھرا ہوا ہے جو میں کسی کو دے سکوں۔ اب آپ چاہیں تو مجھے اٹھا کر قلعے کی دیوار سے نیچے پھینک دیں اور جو دو لڑکیاں آپ کے پاس ہیں انہیں اپنے قبضے میں رکھ لیں۔ میں آپ کے ساتھ بہت بڑی نیکی کر رہا ہوں کہ آپ کو اپنا راز دے رہا ہوں۔ جیسا کہ آپ کہہ رہے ہیں کہ آپ نے بوٹی لانے کے لیے دو آدمی تیار کر لیے ہیں، اگر وہ آدمی چلے جاتے تو جنگلوں میں بھٹک بھٹک کر مر جاتے۔ آپ کے دو بڑے اہم آدمی میرے ساتھ کی لڑکیوں کے جھانسے میں آگئے تھے۔ وہ سونے اور ہر چیز کو سونا بنانے والے منکے کی تلاش میں نکل گئے ہوتے۔"

قلعہ دار کے چہرے نے کئی رنگ بدلے اور وہ کھسیانا سا ہو کر دانتوں سے اپنے ہونٹ کاٹنے لگا۔

"آپ اتنے پریشان نہ ہو جائیں" ۔۔۔ سفید ریش نے کہا ۔۔۔ "میں اب بھی آپ کو اسی دھوکے میں رکھ سکتا تھا جو آپ کو دے دیا گیا تھا اور میں آپ کے ہاتھوں صحت یاب

بھی ہو سکتا تھا مگر مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ کی فوج کا اخلاق اس قدر اونچا ہے۔ یہ آپ کے مذہب کا کرشمہ ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ ہم سب لاہور سے آئے ہیں۔ ہمیں بھیم پال نڈر کے وزیر نے بھیجا ہے۔ ہمارا منصوبہ یہ تھا کہ آپ کو اور آپ کے سالاروں کو سونے، زر و جواہرات اور حسین لڑکیوں کے خواب دکھا کر آپ کو گمراہ کر دیا جائے۔ آپ کو قلعہ سے غائب کرنا بھی مقصود تھا۔"

"آپ کو کیسے یقین تھا کہ ہم گمراہ ہو جائیں گے؟" ۔۔۔ قلعہ دار قطب گزک نے پوچھا۔

"آپ انسان ہیں، فرشتہ نہیں" ۔۔۔ سفید ریش نے کہا ۔۔۔ "انسان کتنا ہی نیک اور عبادت گزار کیوں نہ ہو، اس میں عیش و عشرت کی خواہش ضرور ہوتی ہے۔ آپ اس خواہش کو دبا سکتے ہیں، مار نہیں سکتے۔ دولت اور عورت کو عیش و عشرت کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ ہم انسان کی کمزوریوں سے آگاہ ہیں۔ ہر انسان میں ہمیشہ جوان رہنے کی بھی خواہش ہوتی ہے۔ میں نے آپ کے بڑھاپے کو دیکھ کر آپ کی اس کمزوری کو بیدار کر دیا تھا۔ آپ نے کہا کہ آپ کو سونے اور خزانے کی ضرورت نہیں، جوانی کی ضرورت ہے۔ میں نے کہا کہ وہ میں دوں گا۔"

قطب گزک کے چہرے پر ندامت کے آثار نمودار ہوئے۔

"آپ کو پریشان نہیں ہونا چاہیے" ۔۔۔ سفید ریش نے کہا ۔۔۔ "آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ بھی ہمارے جال میں اسی طرح آتا جس طرح آپ آگئے تھے۔ ہم ان لڑکیوں کو اسی لیے ساتھ لائے تھے کہ آپ کو اپنے بڑھاپے کا احساس ہو... میں نے دنیا دیکھی ہے۔ میں نے انسانوں کو اتنی قریب سے دیکھا ہے جیسے ان کے جسم اور ان کے دل اور روحیں بھی دیکھ لی ہوں۔ میں نے آپ پر اپنے اس علم اور تجربے کو آزمایا ہے۔ اپنے نفس کی خواہشات اور دنیا کے لالچ میں آ کر انسان اپنی عقل سے باغی ہو جاتا ہے۔ فرض کو انسان بے معنی سمجھنے لگتا ہے۔ وہ سمجھ ہی نہیں سکتا کہ وہ تباہی کی طرف جا رہا ہے۔ وہ تسلیم نہیں کرتا کہ جوانی کبھی واپس نہیں آتی اور روحانی مسرت سونے اور جواہرات سے اور جسمانی لذت سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ جو کوئی اس راز کو پا لیتا ہے، اُسے آپ مومن اور ہم رِشی کہتے ہیں۔ یہ آپ کا ایمان اور ہمارا دھرم ہوتا ہے۔ جس انسان کی اپنی ذات کا قلعہ کمزور ہوتا ہے، وہ بڑے مضبوط قلعے ہار جاتا اور دشمن

کو دے بیٹھا ہے۔ آپ اپنے فرض سے ہٹ گئے تھے۔ ہمیں اپنے منصوبے کو ابھی آگے چلانا تھا....

"میں آپ کو ایک نصیحت کرتا ہوں کہ یہ دو لڑکیاں رہزنوں سے بچ گئی ہیں، انہیں اپنے پاس نہ رکھ لینا، ورنہ یہ آپ کو آپ کے سالاروں اور کمانداروں سے اور انہیں آپس میں ٹکرا دیں گی۔ اگر شکست سے بچنا چاہتے ہیں تو اپنے نفس کو اپنے قبضے میں رکھیں۔"

سفید ریش کے زخم ایک مہینے میں ٹھیک ہو گئے۔ اس ایک مہینے میں سالار بہرام غور کو پتہ چل گیا کہ کوئی ایسا خطہ نہیں جہاں سانپ اور انسان اکٹھے رہتے ہوں، اور دونوں لڑکیوں نے اُسے یہ بھی بتایا کہ سانپ کے منکے کی کوئی حقیقت نہیں۔ اس انکشاف کے باوجود سفید ریش کا علاج ہوتا رہا اور قطب گزک اس کی تیمارداری میں دلچسپی لیتا رہا۔ دونوں لڑکیوں کو پوری عزت سے رکھا گیا۔ آخر ان کے جانے کا وقت آ گیا۔

"آپ جا رہے ہیں"۔ قطب گزک نے سفید ریش سے کہا۔ "آپ دشمن بن کر آئے تھے اور ہم آپ کو دوستوں کی طرح رخصت کر رہے ہیں۔ اگر آپ ہمارے سلوک کی قدر کرتے ہیں تو ہمیں اس کے عوض یہ بتاتے جائیں کہ آپ کے مہاراجہ کی نیت اور ارادہ کیا ہے۔ کیا وہ ہمارے سلطان کا باجگزار رہے گا یا اپنے باپ کی شکست کا انتقام لے گا؟"

"ہم نے آپ کے ایمان اور کردار پر جو حملہ کیا ہے، یہ اس کا ثبوت ہے کہ مہاراجہ بھیم پال آپ کے سلطان کو للکارے گا"۔ سفید ریش نے کہا۔ "وہ اگلی لڑائی کی تیاری کر رہا ہے۔ وہ باجگزار نہیں رہے گا۔ اُس نے آپ کے تمام قلعہ داروں اور سالاروں کو ذہنی اور جذباتی طور پر بیکار کرنے کے لیے یہ منصوبہ بنایا ہے جس پر عمل کرنے ہم آتے رہے تھے۔ اُسے یقین دلایا گیا ہے کہ اس طرح غزنی کی جو فوج یہاں ہے وہ بیکار ہو جائے گی، لیکن اصل منصوبہ یہ ہے کہ وہ کسی بہت ہی دشوار جگہ سلطان محمود کو لڑائے گا اور اس کے ساتھ یہ اعلان کر دے گا کہ وہ سلطان کا باجگزار نہیں"۔

بھیم پال نڈر کو تھانیسر سے اطلاع مل چکی تھی کہ اُس نے سفید ریش راہبوں

اور ناگ پرستوں کی صورت میں جو حملہ کیا تھا، ناکام ہو گیا ہے لیکن اُسے یہ نہ بتایا جا سکا کہ اُس کے بھیجے ہوئے آدمیوں نے راز بھی فاش کر دیا ہے۔ وہ دراصل اس سکیم کا قائل بھی نہیں تھا۔ اُسے اپنی دلیری اور جرأت اور جنگی امور کی سوجھ بوجھ پر بجا طور پر ناز تھا۔ اُس نے جنگی تیاریاں تیز کر دیں اور کسی بڑی ہی مشکل زمین کا انتخاب کرنے لگا۔

جہلم سے راولپنڈی کی طرف جائیں تو ایک پہاڑی سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اس میں سے سڑک بھی گزرتی ہے اور ریل کی پٹڑی بھی۔ ان راستوں کی صورت دروں کی سی ہے۔ یہاں ایک مقام ہے جسے ٹلہ جوگیاں کہتے ہیں اور اس پہاڑی کا نام بال ناتھ ہے۔ روایت مشہور ہے کہ رانجھے نے یہیں آ کر جوگیوں کا روپ دھارا اور کانوں میں جوگیوں والے کڑے ڈالے تھے۔

یہ مقام جوگیوں کا مرکز ہوا کرتا تھا۔ اس کے اردگرد کا علاقہ چٹانی ہے اور کھڈ نالے بھی ہیں۔ سلطان محمود غزنوی کے دور میں یہ نشیب اور زیادہ گہرے اور دشوار ہوں گے۔

بھیم پال نڈر نے سلطان محمود غزنوی سے ٹکر لینے کے لیے اسی علاقے کا انتخاب کیا اور اپنی فوج کو وہاں منتقل کرنا شروع کر دیا۔ سلطان کو للکارنے کی صورت میں غزنی کی فوج کو لاہور کی طرف بڑھنے کے لیے اسی علاقے سے گزرنا تھا۔ بھیم پال نڈر وسیع پیمانے پر گھات لگا رہا تھا۔ اُس نے اپنے فوجی کمانداروں سے کہا کہ وہ فوج کو پہاڑی علاقے سے روشناس کرائیں اور پہاڑی جنگ کی مشق کراتے رہیں۔ وہ زیادہ تر توجہ تیر اندازوں کی طرف دے رہا تھا اور یہ ہدایت کہ تیر انداز بلندیوں سے نیچے نہ آئیں۔ وادیوں میں بکھری ہوئی غزنوی فوج کو گھیرنے کے لیے وہ سوار دستے تیار کر رہا تھا۔ ہاتھیوں کو اُس نے تنگ راستوں اور میدانی علاقوں کے لیے رکھا تھا۔

ایک روز بھیم پال نڈر کو اطلاع ملی کہ تھانیسر سے غزنی کے قلعہ دار کا ایلچی آیا ہے اور اس کے ساتھ ایک سفید ریش بوڑھا اور دو لڑکیاں ہیں۔ بھیم پال نے انہیں

لندر بلالیا۔ ایلچی نائب سالار تھا جو بارہ محافظوں کے ساتھ آیا تھا۔

"مہاراج!" ایلچی نے کہا۔ "آپ کی امانت واپس کرنے آیا ہوں۔ ہمیں افسوس ہے کہ آپ کے بھیجے ہوئے باقی آدمی اور دو لڑکیاں رہزنوں کے ہاتھوں ماری گئی ہیں۔ یہ شخص زخموں سے چُور زندہ تھا۔ اسے ہمارے سپاہی اٹھا لائے اور ان دو لڑکیوں کو رہزنوں سے چھڑا لائے۔ ہم انہیں جلدی واپس کر دیتے لیکن اس بزرگ کا علاج ضروری تھا۔ وہ ہم نے کیا۔ آپ اس سے اور ان لڑکیوں سے پوچھ لیں کہ ہم نے امانت میں خیانت تو نہیں کی؟ ان سے پُوچھ لیں کہ ان کے گروہ کا کوئی فرد ہمارے ہاتھ سے تو نہیں مرا؟"

اُس وقت کے وقائع نگار لکھتے ہیں کہ بھیم پال نِڈر جیسا جابر اور جری جنگجو اتنا شرمسار ہُوا کہ وہ کچھ بھی نہ کر سکا۔ نائب سالار کی گردن تنی ہوئی تھی۔

"آپ ہمارے باجگزار ہیں" — نائب سالار نے کہا۔ "ہمارا اور آپ کا معاہدہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کے خلاف کوئی جنگی کارروائی نہیں کریں گے لیکن آپ نے ایسی جنگی کارروائی کی ہے جس سے ثابت ہو گیا ہے کہ ہندو راجپوت سانپ سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔"

بھیم پال نِڈر یکلخت بیدار ہو گیا اور اپنی ران پر بڑی زور سے ہاتھ مار کر بولا — "باجگزار ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ تمہارے منہ میں جو آئے وہ کہہ ڈالو۔"

درباریوں نے اپنی تلواروں کے دستوں پر ہاتھ رکھ لیے اور انہوں نے چہروں پر قہر بھرے غصے کے آثار پیدا کر لیے۔ نائب سالار نے نظریں گھما کر سب کو دیکھا اور مسکرا دیا۔

"ایک آدمی کے خلاف اتنے آدمی اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں؟" — نائب سالار نے کہا — "ہمارے سلطان کے دربار میں اگر اُس کا بیٹا بھی کسی مہمان کو گھور کر اپنی تلوار پر ہاتھ رکھے تو سلطان اُس کا ہاتھ کاٹ دیں۔ تلواریں میدان میں نکلا کرتی ہیں۔ اگر تم جنگجو ہوتے تو اس بوڑھے اور ان جوان لڑکیوں سے ہم پر حملہ نہ کرتے۔ یہ تمہاری بیٹیاں ہیں۔ ان کی عزت اور عصمت کو ہتھیار بناتے ہو؟"

ایک وقائع نگار لکھتا ہے کہ بھیم پال کے دربار میں جو آدمی ترجمان کا فرض ادا کر رہا تھا، اُس نے نائب سالار کے ان جملوں کا ترجمہ ذرا ڈھیلی سی زبان سے کیا کیونکہ الفاظ بڑے سخت اور توہین آمیز تھے۔ نائب سالار نے اُسے کہا "مجھے معلوم نہیں کہ تم میرے الفاظ کا صحیح ترجمہ کر کے اپنے مہاراج کو سنا رہے ہو یا نہیں لیکن میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ تم میرا جوش اور جذبہ مہاراج تک نہیں پہنچا رہے۔ میرے پُرجوش لہجے میں میری بات مہاراج تک پہنچاؤ۔"

ترجمان نے یہ بھی مہاراجہ بھیم پال نِڈر کو سنا دیا۔

"محترم مہمان!" بھیم پال نے کہا — "آپ کا باجگزار میرا باپ تھا۔ وہ مر گیا ہے۔ مجھے ابھی یہ فیصلہ کرنا ہے کہ میں باج ادا کروں گا یا نہیں۔ دوستی کا معاہدہ قائم رہے گا۔"

"میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ آپ کو دعوتِ اسلام دوں" — نائب سالار نے کہا — "آپ کے دادا نے ہم سے شکست کھائی، آپ کے باپ نے ہم سے شکست کھائی، اب آپ کی باری ہے۔ آپ نے نوجوان لڑکیوں کی قربانی دی۔ آپ پتھر کے بتوں کے آگے ہاتھ جوڑ کر گڑگڑاتے۔ آپ کو کیا ملا؟ — شکست، شرمناک شکست۔ کیا آپ ابھی تک نہیں سمجھے کہ آپ باطل کی پوجا کر رہے ہیں اور آپ کو وہ خدا سزا دے رہا ہے جو وحدہٗ لاشریک ہے، اور سزا بھی اور جزا بھی اسی کے ہاتھ میں ہے۔ آپ اسلام قبول کر لیں۔"

"ہم کسی ایلچی کو اتنی ڈھیل نہیں دیا کرتے کہ وہ کسی کے دربار میں اُس کے مذہب کی توہین کرے" — بھیم پال نِڈر نے کہا — "آپ میری اور میرے مذہب کی توہین کر کے مجھے مجبور کر رہے ہیں کہ میں دوستی کے معاہدے پر نظرِثانی کروں۔ آپ جا سکتے ہیں۔"

نائب سالار چلا گیا۔ سفید ریش اور دونوں لڑکیاں وہیں کھڑی رہیں۔

"لے جاؤ انہیں" — بھیم پال نے گرج کر کہا — "انہیں میری نظروں سے اوجھل کرو۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ حربہ استعمال کیا جائے۔ یہ بوڑھا اور یہ لڑکیاں میرے

لیے طعنہ بنی رہیں گی۔ میں کھلے میدان میں لڑوں گا اور سلطان محمود کو قیدی بنا کر اور مندر میں لے جا کر پوچھوں گا کہ اب بتاؤ خدا کس کا سچا ہے۔"

جہلم کے قریب کا کوہستانی علاقہ فوجی کیمپ بن گیا۔ وہاں اتنے درخت نہ ہوں گے جتنے فوجی تھے۔ ہندوؤں نے ایک بار پھر مندروں میں سلطان محمود غزنوی کے خلاف وہی پروپیگنڈہ شروع کر دیا جو وہ پہلے بھی کر چکے تھے۔ اب کے بھی اس کا اثر وہی ہوا جو پہلے بھی دیکھنے میں آیا تھا۔ وہ غیر فوجی لوگ لاہور میں جمع ہونے لگے جو تیغ زنی اور تیر اندازی کے ماہر تھے۔ لوگ مہاراجہ بھیم پال کا خزانہ بھرنے لگے۔ عورتوں نے اپنے زیورات خزانے میں جمع کرا دیئے۔ ہر کسی کے دماغ پر اسلام کا اور جنگ کا بھوت سوار تھا۔ دور دور سے ہندو جوان لاہور آنے لگے اور انہیں جہلم کی طرف روانہ کیا جانے لگا۔

محمود غزنوی کو اطلاعیں مل رہی تھیں لیکن ابھی یہ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ بھیم پال نڈر کا ارادہ حملہ کرنے کا ہے یا وہ حملے کی دعوت دینا چاہتا ہے۔ ۱۰۱۲ء کا سال گزر گیا۔ ۱۰۱۴ء (۴۰۴ھ) کا سال بھی گزرنے لگا۔ اکتوبر کے وسط میں اُسے مصدقہ اطلاع ملی کہ بھیم پال نے اعلان کر دیا ہے کہ وہ غزنی کا باجگزار نہیں اور اُس نے دوستی کا معاہدہ بھی توڑ دیا ہے۔ سلطان کو جاسوسوں نے یہ بھی بتایا کہ بھیم پال نے اپنی تمام فوج جہلم کے قریب پہاڑی سلسلے میں گھات کی صورت میں پھیلا دی ہے۔

مہاراجہ بھیم پال کو نڈر کا خطاب دیا گیا تھا اور سلطان محمود غزنوی بے صبر تھا۔ کفر کے خلاف ہمیشہ پابرکاب رہتا تھا۔ وہ غصے سے لال ہو گیا۔ اُس کی فوج نے آرام کر لیا تھا اور اُس نے فوج کی کمی بھی پوری کر لی تھی۔ بھیم پال کا خیال تھا کہ سلطان محمود کچھ دیر بعد غزنی سے چلے گا اور یہاں پہنچتے پہنچتے اُسے چھ مہینے لگ جائیں گے۔ اُس وقت تک موسم سرما گزر چکا ہو گا اور موسم بہار کا آغاز ہو گا اور یہ موسم لڑائی کے لیے موزوں ہو گا، مگر اس کے خواب تباہ ہو گئے۔

وہ گھات مکمل کر کے لاہور میں بیٹھا تھا کہ اُسے اطلاع ملی کہ غزنی کی فوج مارگلہ

کی پہاڑیوں میں سے نکل آئی ہے۔ مارگلہ کی پہاڑیاں راولپنڈی کے قریب ہیں۔ بھیم پال نڈر سلطان محمود کی تیز رفتاری سے واقف نہیں تھا۔ وہ لاہور سے عجلت میں روانہ ہوا۔ یہ دوڑ تھی کہ وہ بال ناتھ تک پہلے پہنچتا ہے یا سلطان محمود۔ ہوا یوں کہ سلطان محمود مارگلہ سے نکل کر رات بھر کے لیے رُک گیا۔ اُسے اپنی انٹیلی جنس سے معلوم کرنا تھا کہ دشمن کہاں ہے اور اُس کا ڈیپلائے کیسا ہے اور وہ لڑائی میں کیا انداز اختیار کرے گا۔ اتنی دیر میں بھیم پال نڈر بال ناتھ کے مقام پر پہنچ گیا۔ یہ جگہ پہاڑیوں اور چٹانوں میں گھری ہوئی ہے۔ بھیم پال نے اسے قلعے کے طور پر استعمال کرنے کا فیصلہ کیا اور وہاں قلعہ بند ہو گیا۔

ایک مؤرخ نے لکھا ہے کہ یہ لڑائی مارگلہ میں ہوئی تھی لیکن بیشتر مؤرخین نے بال ناتھ کا سلسلہ کوہ لکھا ہے۔ یورپی مؤرخوں نے اسے بال ناتھ لکھا ہے۔ بیہقی، عتبی اور گردیزی نے اس جگہ کا پرانا نام نندانہ بھی لکھا ہے اور مزدین بھی لیکن اس کا محل وقوع (عرض بلد اور طول بلد کے حساب سے) جو لکھا ہے وہ ٹلہ جوگیاں اور پہاڑی بال ناتھ ہے۔

سلطان محمود کو اگلے روز صبح اطلاعیں مل گئیں۔ اُسے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ بھیم پال نڈر کس مقام پر قلعہ بند ہے اور وہ زمین کیسی ہے۔ اُسے بتایا گیا کہ بلندیوں پر تیر انداز ہیں۔ ان اطلاعات کی روشنی میں سلطان محمود نے اپنے سالاروں سے کہا کہ وہ لاہور تک نہیں جائیں گے اور جہلم کے پہاڑی سلسلے میں سے جو راستہ گزرتا ہے، اُس راستے پر بھی نہیں جائیں گے۔ سلطان نے گائیڈوں کا انتظام کر لیا اور اپنے چھاپہ مار دستوں کو ضروری ہدایات دے کر آگے بھیج دیا۔

بھیم پال نڈر کی فوجی طاقت سلطان محمود کی نسبت خاصی زیادہ تھی اور وہ نہایت اچھی اور جنگی لحاظ سے برتر پوزیشن میں تھی۔ غزنی کی فوج حملہ آور ہو رہی تھی۔ مورچہ بند فوج پر حملہ کرنے والی فوج کی تعداد زیادہ ہونی چاہئے کیونکہ اس کا نقصان زیادہ ہوتا ہے۔ سلطان محمود کو یہ سہولت حاصل نہیں تھی۔ اسے چھاپہ ماروں کو [illegible]

اور ہوشمندی سے استعمال کرنا تھا۔ چھاپہ مار طریقہ جنگ کا انحصار ذاتی شجاعت اور انفرادی جذبے پر ہوتا ہے۔ چند ایک چھاپہ مار رات کی تاریکی میں اپنے ہدف سے دُور رہیں اور کچھ بھی نہ کریں تو انہیں دیکھنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ وہ واپس آ کر اپنی کارگزاری کے متعلق جھوٹ بول سکتے ہیں۔

سُلطان محمود غزنوی کے چھاپہ ماروں کا انتخاب صرف جسمانی اور ذہنی بھرتی اور مستعدی پر نہیں کیا جاتا تھا، بلکہ مذہب کے لحاظ سے جنونی افراد کو ترجیح دی جاتی تھی۔ اسی لیے یورپی مؤرخوں نے غزنی کے چھاپہ ماروں کو "کریک ٹروپس" لکھا ہے۔ سلطان محمود ان کے ساتھ دل پیار سے پیش آیا کرتا اور کہا کرتا تھا کہ یہ وہ جانباز ہیں جن کی نہ قبر بنتی ہے نہ انہیں جنازہ اور کفن نصیب ہوتا ہے۔

رات کے وقت سلطان محمود کی فوج اس پہاڑی سلسلے کے قریب پہنچ گئی جو راولپنڈی کی طرف سے سوہاوہ کے قریب سے شروع ہوتا ہے۔ رات کو ہی چھاپہ مار جیش آگے چلے گئے۔ ہر جیش میں دس سے بارہ افراد تھے اور ہر ایک کے ساتھ ایک مقامی گائیڈ تھا۔ ان کا ہدف وہ چٹانیں اور پہاڑیاں تھیں جن کے نرغے میں ٹلہ جوگیاں واقع تھا اور جہاں بھیم پال نندہ موجود تھا۔ یہ خاص طور پر پیش نظر رکھیے کہ دسمبر کا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ سردی عروج پر تھی۔ ہندو سمجھتے تھے کہ ایسی یخ بستہ راتوں کو کوئی جنگی کارروائی نہیں ہو سکتی، اس لیے وہ اپنی پوزیشنوں میں دبکے پڑے تھے۔

چھاپہ مار دبے پاؤں پہاڑیوں پر چڑھ گئے۔ ہندو تیر انداز سوئے ہوئے تھے۔ صرف ایک ایک سنتری کھڑا تھا۔ ان سنتریوں پر قابو پانا مشکل نہ تھا۔ سوئے ہوئے تیر اندازوں کو ختم کر دیا گیا۔ دو تین چوٹیوں پر لڑائی ہوئی کیونکہ وہاں کے تیر انداز بیدار ہو گئے تھے۔ شور شرابا بھیم پال کی خیمہ گاہ تک پہنچا۔ اُس نے معلوم کرانے کے لیے آدمی دوڑائے لیکن کوئی ایک بھی آدمی واپس نہ آیا۔

اگلی صبح سلطان محمود کو رات کے آپریشن کی کامیابی کی اطلاع ملی تو اُس نے اپنی فوج کے کچھ دستے آگے بھیج کر اس طرح پہاڑیوں پر چڑھا دیے کہ دشمن کو پتہ نہ چل سکا۔ بھیم پال نے جو کچھ سوچا تھا وہ سلطان محمود کے دماغ میں پہنچ چکا تھا۔ بھیم پال نندہ کو یہ

بھی توقع تھی کہ سلطان محمود دریائے جہلم سے گزرے گا اس لیے اس نے زیادہ تر فوج اس طرف پھیلائی تھی۔

دوپہر کے وقت (عطبی کے الفاظ میں) سلطان محمود کے دستے پہاڑیوں سے بھوکے بھیڑیوں کی طرح چیختے چنگھاڑتے گرجتے، نعرۂ تکبیر بلند کرتے بہت تیزی سے اترے۔ پیشتر اس کے کہ بھیم پال نندہ کا ہیڈ کوارٹر اور اس کے دفاعی دستے سنبھلتے، مسلمان ان پر جھپٹ پڑے۔ گھات لگانے والے خود گھات میں آ گئے۔ اپنے دادا جے پال کی طرح بھیم پال خوش قسمت تھا کہ بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا، پکڑا نہ جا سکا۔ محمد قاسم فرشتہ کے مطابق، بھاگنے سے پہلے اُس نے یہ حکم دیا کہ تمام فوج یہاں سے نکالو اور لاہور کے مضافات میں لگا دو۔ اس کے بعد وہ کسی کو نظر نہ آیا۔

مرکز ختم ہونے سے اور جھنڈا غائب ہو جانے سے اور مرکز سے احکام نہ ملنے کی وجہ سے بھیم پال کی فوج میں ابتری پھیل گئی۔ یہ دراصل قلیل تعداد چھاپہ ماروں کی کامیابی تھی۔ غزنی کی فوج جو ڈسپلن کی پابند اور رابطے اور نظم و نسق میں رہ کر لڑنے والی فوج تھی، سارے علاقے کو صاف کرتی گئی۔

جنگی قیدیوں نے بتایا کہ مہاراجہ بھیم پال نندہ کشمیر کی طرف نکل گیا ہے۔ سلطان محمود اس قدر غصے میں تھا کہ اُس نے ایک سوار دستہ ساتھ لیا اور بھیم پال کے تعاقب میں چلا گیا۔ کشمیر میں دریائے جہلم کے کنارے کشمیر کی فوج نے جس کا کمانڈر تُنگا نام کا جرنیل تھا، سلطان محمود کی ہر اول پارٹی کو گھیر کر مار ڈالا۔ تُنگا اس آسان فتح پر اتنا خوش ہوا کہ وہ سلطان محمود کے سوار دستے پر حملہ آور ہوا مگر اسے جلدی ہی احساس ہو گیا کہ اُس نے زندگی کی سب سے زیادہ بھیانک غلطی کی ہے۔ اُسے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ سلطان محمود نے اعلان کر دیا کہ یہاں تمام لوگ اسلام قبول کر لیں ورنہ کسی بستی کو آباد نہیں رہنے دیا جائے گا۔ لوگ جوق در جوق اسلام قبول کرنے لگے۔ عطبی اور گردیزی نے لکھا ہے کہ ٹلہ جوگیاں میں ایک مندر تھا جس میں ایک بُت ہوتا تھا۔ اس کے

متعلق ہندوؤں کا عقیدہ تھا کہ یہ چالیس ہزار سال پرانا ہے۔ سلطان محمود نے اس مندر کو بنیادوں سے ہی اکھاڑ پھینکا اور بت کو ریزہ ریزہ کر دیا تھا۔

سلطان محمود جولائی ۱۰۱۴ء میں واپس غزنی چلا گیا۔

قلعہ جو سر نہ ہوا

۱۰۱۴ عیسوی کی آخری سہ ماہی کا واقعہ ہے جہلم کے قریب کے سلسلۂ کوہ کی بال ناتھ ٹیکری پر معمولی سا ایک قلعہ تھا جس میں سلطان محمود غزنوی کی فوج کا ایک زیادہ نفری والا دستہ رہتا تھا پنجاب کے مہاراجہ بھیم پال نند کو اس مقام پر شکست دے کر سلطان محمود نے اسے اپنا باجگزار بنا لیا تھا سلطان یہاں اپنی حکومت قائم نہیں کر سکا تھا کیونکہ اس کی غیر حاضری میں غزنی کی سلطنت کے حالات بگڑنے لگے تھے معاہدے کے مطابق سلطان کو حق حاصل تھا کہ وہ پنجاب میں جہاں چاہے اپنے ایک دو دستے رکھے اور ان کے اخراجات مہاراجہ پنجاب ادا کرتا رہے۔

ان دستوں کو بال ناتھ میں رہتے کئی مہینے گزر گئے تھے۔ قلعہ دار سارنگ نام کا ایک سالار تھا جو (غالباً) کرمان کا رہنے والا تھا۔ ایک روز قلعے میں دو گھوڑ سوار آئے۔ ایک کا نام سعید تھا اور دوسرا غزنی کی فوج کا سپاہی تھا۔ وہ کشمیر سے آئے تھے۔ سفر لمبا تھا جس کے اثرات ان کے چہروں اور جسموں پر صاف نظر آرہے تھے۔ چہرے مرجھائے ہوئے اور ہونٹ پھٹے ہوئے تھے۔ ان پر گرد کی دبیز تہہ بتا رہی تھی کہ وہ بہت تیز آئے ہیں اور راستے میں بہت کم رکے ہیں۔ وہ آتے ہی قلعہ دار سارنگ کے پاس چلے گئے۔

"آپ لوگ بہت تھکے ہوئے ہیں" — سارنگ نے انہیں کہا — "آرام کر لیں پھر میں وہاں کی خبریں سنوں گا۔"

"ہمارے چہروں پر سفر کا اتنا اثر نہیں جتنا اس خبر کا ہے جو ہم سنانے آئے

[illegible]

"کیا ہوا؟" ــ سارونگ نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا "کیا ہندوؤں نے ہمارے آدمیوں کو قید میں ڈال دیا ہے؟ آپ لوگوں کو تبلیغ سے روک دیا ہے؟ سلطان کے احکام کی بجا آوری سے آپ کو کسی نے روکا ہے؟"

"نہیں" امام نے کہا "میں اس سپاہی کو ساتھ لایا ہوں۔ یہ عینی شاہد ہے... میں بھی سپاہی ہوں، صرف امام مسجد نہیں۔ یہ نہ سمجھنا کہ میں خوف سے بھاگ آیا ہوں۔ کالنجر (کوئی کشمیر) جادوگروں کا دیس ہے یا اُس غیر مرئی مخلوق کا جو انسانوں کو دھوکا دینے کے لیے کبھی کبھی انسانوں کے روپ میں نظر آتی ہے۔ یہ مخلوق جنات بھی ہو سکتے ہیں اور ارواح خبیثہ بھی"

"معلوم ہوتا ہے آپ ہندوؤں کی شعبدہ بازی کا شکار ہو گئے ہیں" ــ سارونگ نے کہا "آپ جو کچھ کہ رہے ہیں، اسے میں اتنی جلدی تسلیم نہیں کروں گا۔ سلطان مجھے ذاتی طور پر منتخب کر کے یہاں چھوڑ گئے ہیں۔ انہیں میرے متعلق بتایا گیا تھا کہ میں توہمات سے ڈرنے اور تصورات سے خوش ہونے والا آدمی نہیں ہوں۔ آپ ہندوستان میں پیدا ہوئے ہیں اور آپ نے ہندوؤں کے سائے میں پرورش پائی ہے۔ آپ امام ہیں۔ امام کو حقیقت بیں ہونا چاہیے۔ آپ قوم کے تاملہ میں"

"ہم جو اتنی دور سے آئے ہیں" ــ امام نے کہا "اور اتنا تیز آئے ہیں کہ نیند اور بھوک کا خیال نہیں کیا، کیا آپ اس سے اندازہ نہیں کر سکتے کہ معاملہ کتنا سنگین ہے؟ آپ نے میری بات سننے سے پہلے ہی کیوں کہ دیا ہے کہ میں حقیقت بیں نہیں ہوں؟"

"اس لیے کہ جب آپ وہاں کے واقعات سنانے لگیں تو ان میں مبالغہ نہ ہو" سارونگ نے کہا "اب سنائیے وہاں کیا ہو رہا ہے"

"کشمیر اس قدر حسین خطہ ہے کہ طلسمات لگتا ہے" ــ امام نے کہا "کبھی شک ہوتا ہے کہ یہ انسانوں کا نہیں پریوں کا دیس ہے، یا وہاں اُن انسانوں کی روحیں رہتی ہیں جو زندہ تھے تو نیک اور پاک رہے"

"روح خدا کی امانت ہوتی ہے" ــ سارونگ نے کہا "انسان مر جاتا ہے تو روح خدا کے پاس چلی جاتی ہے۔ کوئی روح زمین پر نہیں رہتی۔ خوابوں اور خیالوں

کی باتیں نہ کریں محترم امام!.... آپ نے کیا دیکھا ہے؟"

"ہم وہاں گئے اور لوگوں کو بتانے لگے کہ اسلام کیا ہے" ــ امام نے کہا "ہم انہیں نماز پڑھانے لگے اور بتانے لگے کہ مسلمان کے فرائض کیا ہیں اور خدا کے ساتھ مسلمان کا کیا تعلق ہے۔ وہاں کے لوگ سلطان کے حکم سے مسلمان تو ہو گئے تھے لیکن ہم انہیں اسلام کی تعلیم دینے لگے تو وہ دل و جان سے اسلام کو قبول کرنے لگے۔ تھوڑے ہی عرصے بعد وہاں راتوں کو بجلی چمکنے لگی۔ آسمان پر نہ بادل ہوتا ہے نہ گھٹا، بجلی چمکتی ہے۔ میں جس گاؤں میں تھا، وہاں میں نے بجلی چمکتے دیکھی ہے۔

"ایک رات گاؤں کے قریب گھوڑے دوڑنے کی آوازیں آئیں۔ گھوڑے دکھائی نہیں دیتے تھے۔ آوازیں دور سے آتی ہوں اور قریب سے گزر کر دور چلی گئی ہوں، ایک آوازیں اٹھیں اور خاموش ہو گئیں۔ یہ بلاشبہ دوڑتے گھوڑوں کی آوازیں تھیں۔ دن کے وقت گدڑیے جنگل کو نکلے تو ڈرے ہوئے اور دوڑتے ہوئے واپس آ گئے۔ انہوں نے کانپتے ہوئے سنایا کہ جنگل سے انہیں بچے عورتوں کے رونے کی آوازیں سنائی دیں۔ انہوں نے جا کر دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ رونے کی آوازیں بند ہوئیں تو بڑی گونجدار آواز آئی "دیوتاؤں کا قہر آ رہا ہے... پہاڑ پھٹ جائیں گے جنگل کو آگ لگ جائے گی۔ اپنے دیوتاؤں کو ناراض نہ کرو...."

"میں نے ان لوگوں کو بتایا کہ وہ ڈریں نہیں۔ دیوتاؤں کا کوئی وجود نہیں۔ وہ صرف اللہ کو یاد کریں مگر ان کی تسکین نہیں ہوئی۔ دو چار دنوں بعد دوسرے گاؤں کے چند ایک آدمی خوف سے بُری طرح کانپتے ہوئے ہمارے گاؤں میں آئے۔ انہوں نے سنایا کہ ان کے گاؤں کے قریب ایک پہاڑ پھٹ گیا ہے اور اس میں سے کبھی کبھی شعلے نکلتے ہیں اور کبھی کبھی پہاڑ گرج اٹھتا ہے جہاں سے پہاڑ پھٹا ہے وہاں سے عجیب و غریب ڈراؤنی شکلوں کے انسان نظر آتے ہیں ....

ان کی باتیں سن کر میرے گاؤں کے لوگ اس قدر دہشت زدہ ہو گئے کہ گاؤں سے بھاگ جانے کی تیاری کرنے لگے۔ میں نے انہیں روکا اور بہت سمجھایا مگر وہ خوف سے مرنے لگے۔ میں یہ سمجھا کہ یہ ہندو پنڈتوں کی کارستانی ہے۔ وہ لوگوں کو ڈرا

ہیں کہ وہ اسلام قبول نہ کریں مگر کچھ واقعات ایسے ہوتے ہیں کہ انہیں عقل سمجھ نہیں سکتی۔ مثلاً بجلی کی چمک کو میں نہیں سمجھ سکتا۔ اگر میں سمجھ بھی جاؤں تو میں لوگوں کو نہیں سمجھا سکتا۔ پھر ایک واقعہ ایسا ہوا ہے جو آپ کو یہ سپاہی سنائے گا۔"

"ہماری چوکی دریا کے کنارے ہے" — سپاہی نے کہا۔ "ہمیں ایک رات دو تین عورتوں کے رونے کی آوازیں سنائی دیں۔ چوکی کا کمانڈر زبیر جلالی مجھے اور ایک اور سپاہی کو ساتھ لے کر باہر نکلا۔ ہم آوازوں کی طرف گئے تو آوازیں خاموش ہو گئیں۔ ایک طرف سے دو آدمی آ گئے۔ زبیر جلالی نے اُن سے پوچھا کہ عورتیں کہاں رو رہی تھیں؟ انہوں نے کہا کہ انہوں نے ایسی کوئی آواز نہیں سُنی۔ اتنے میں عورتیں پھر رونے لگیں۔ زبیر نے ان آدمیوں سے کہا کہ یہ کس کی عورتیں رو رہی ہیں؟ انہوں نے کہا کہ انہیں تو کسی کے رونے کی آواز نہیں سنائی دے رہی۔ بہت حیران ہوئے کہ جو آواز ہم سُن رہے تھے، وہ اُن کے کانوں میں نہیں پڑ رہی تھی ....

"ان آدمیوں نے ہمیں بتایا کہ اس علاقے میں دو جوان لڑکیاں کبھی کبھی نظر آتی ہیں۔ جسے نظر آتی ہیں اُسے اپنے پاس بلاتی ہیں۔ ان کے قریب جاؤ تو غائب ہو جاتی ہیں۔ وہ کچھ کہنا چاہتی ہیں .... ہم چوکی میں واپس آ گئے۔ دوسرے دن زبیر جلالی نے مجھے اور ایک اور سپاہی کو ساتھ لیا۔ کہنے لگا کہ وہ رات کے رونے کا راز معلوم کرنا چاہتا ہے۔ وہاں قریب کوئی آبادی نہیں۔ علاقہ بہت خوبصورت ہے۔ ہم دو پہاڑیوں کے درمیان چلے جا رہے تھے۔ اچانک ہمیں سامنے پہاڑی کی ڈھلان پر دو لڑکیاں کھڑی نظر آئیں۔ ان کے کندھوں سے پاؤں تک آسمانی رنگ کا اتنا باریک کپڑا لپٹا ہوا تھا جس میں سے ان کے جسم نظر آ رہے تھے۔ اُن کے بال کھلے ہوئے تھے ....

"وہ جگہ کچھ اونچی تھی۔ ہمیں یاد ہے جہاں وہ کھڑی تھیں وہاں بڑی خوبصورت گھاس اور پھولدار جھاڑیاں تھیں۔ نیچے بھی گھاس اور جھاڑیاں تھیں۔ چیل کے لمبے لمبے درختوں کی اتنی بہتات تھی کہ وہ نیچے سے اوپر تک ایک دوسرے کے ساتھ

ملے کھڑے تھے اور انہوں نے سورج کی شعاعوں کو روک رکھا تھا۔ لڑکیاں اس حسین سبزہ زار کا حصہ معلوم ہوتی تھیں۔ ہم رک گئے۔ وہ وہیں کھڑی رہیں۔ زبیر جلالی نے کہا کہ وہ آگے جائے گا۔ ہم نے اسے روکا مگر وہ نہ رکا۔ ہم دونوں سپاہی آگے نہ گئے۔ ایک لڑکی نے ہاتھ سے اشارہ کر کے زبیر جلالی کو بلایا۔ ہمارے روکنے کے باوجود وہ بڑھتا گیا۔ جب لڑکیوں کے قریب گیا تو یکلخت غائب ہو گیا۔"

"کیا وہ ہوا میں تحلیل ہو گیا تھا؟" — ساروگ نے طنزیہ پوچھا۔

"نہیں" — سپاہی نے جواب دیا — "وہ بہت تیزی سے زمین میں دھنس گیا۔ ہم نے اُسے غائب ہوتا دیکھ کر جب لڑکیوں کی طرف دیکھا تو وہ وہاں نہیں تھیں۔ ہم دونوں سپاہی وہاں سے بھاگ آئے۔ یہ امام صاحب ہمارے علاقے کے ہیں۔ ہم نے انہیں بتایا۔ یہ پہلے ہی ڈرے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔"

"مجھے اپنی جان کا اتنا ڈر نہیں جتنا یہ خدشہ ہے کہ جن لوگوں نے اسلام قبول کر لیا تھا وہ اسلام سے ہٹتے جا رہے ہیں" — امام نے کہا — "انہیں یقین ہو گیا ہے کہ انہوں نے چونکہ اپنا مذہب چھوڑ دیا ہے اس لیے ان پر قہر نازل ہو رہا ہے اور آسمانوں کی مخلوق انہیں سزا دینے کے لیے زمین پر اُتر آئی ہے۔"

"چوکی میں اپنے سپاہی بھی اس وہم میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ سلطان نے یہاں کے لوگوں پر اپنا مذہب مسلط کیا ہے اس لیے یہاں مافوق الفطرت واقعات ہو رہے ہیں" — سپاہی نے کہا — "کمانڈر زبیر جلالی کا یوں زمین میں دھنس جانا ایک ایسا واقعہ ہے کہ جو سنتا ہے اُس کا رنگ پیلا پڑ جاتا ہے۔ خود اپنے سپاہیوں کے دلوں میں شکوک اور شبہے پیدا ہو گئے ہیں۔"

"کیا تم میں کوئی اتنا دلیر اور جرأت مند نہیں تھا جو وہاں جا کر دیکھتا کہ تمہارا کمانڈر زمین میں دھنس گیا ہے وہاں گڑھا تو نہیں" — ساروگ نے کہا — "پہاڑی علاقوں میں گھاس اور جھاڑیوں کے نیچے چھپے ہوئے گڑھے ہوتے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہاں گڑھا کھودا گیا ہو اور لڑکیاں محض شعبدہ ہوں .... محترم امام! کیا آپ ایمان کی قوت سے واقف نہیں؟ کیا آپ نہیں جانتے کہ ایمان مضبوط ہو تو کوئی شعبدہ کامیاب

نہیں ہو سکتا؟"

امام خاموش رہا۔ سپاہی بھی چپ رہا۔

"میں تمہارے ساتھ چلوں گا" ۔۔۔ سارنگ نے کہا۔ "سلطان مجھے یہاں اس ملک کی پاسبانی کے لیے نہیں بلکہ اسلام کے فروغ کے لیے اور اس عظیم مذہب کی پاسبانی کے لیے چھوڑ گئے ہیں۔"

یہ واقعات کالنجر کے علاقے کے ہیں۔ کالنجر جنوبی کشمیر کا علاقہ تھا جس میں کوٹلی، بھمبر اور پونچھ تک کا علاقہ شامل تھا۔ آگے چل کر کسی دور میں کالنجر کوٹلی بن گیا اور یہ آج بھی کوٹلی کہلاتا ہے۔ راجوری کے قریب لوہ کوٹ یا لوہا کوٹ کا ایک قلعہ ہوا کرتا تھا۔ اسے لوہا اس لیے کہا جاتا تھا کہ یہ ایک پہاڑی پر بنایا گیا تھا۔ بلندی کے علاوہ اس کی مضبوطی بھی مشہور تھی اور اسے ناقابلِ تسخیر کہا جاتا تھا۔ کالنجر کا مہاراجہ نندہ رائے تھا۔ پنجاب سے جب بھی کسی مہاراجے نے شکست کھائی وہ بھاگ کر کالنجر جا پہنچا کیونکہ وہ بڑا مضبوط گوشۂ عافیت تھا۔ جے پال سلطان محمود سے شکست کھا کر وہیں پناہ گزیں ہوا تھا۔ اس کے بیٹے انند پال نے سلطان سے شکست کھائی تو وہیں بھاگ گیا۔ اب بھیم پال نندر کو غزنی کی فوج نے نوجگیاں کے علاقے میں شکست دی تو وہ بھی کشمیر کی وادیوں میں جا چھپا۔

تفصیل سے پچھلی قسط میں بیان کیا جا چکا ہے کہ سلطان محمود غزنوی بھیم پال نندر کے تعاقب میں کشمیر تک جا پہنچا۔ راجہ نندہ رائے کے ایک ... ترنگا نے سلطان کے ہراول دستے کو گھیر کر بالکل ہی ختم کر دیا لیکن اس کی اُسے یہ قیمت ادا کرنی پڑی کہ اُسے سلطان محمود کے آگے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ ترنگا اپنے دوستوں کے ساتھ جنگی قیدی ہو گیا۔ سلطان محمود اس قدر غصے میں تھا کہ اُس نے ترنگا اور اس کے تمام کمانڈروں کو ہلاک کر کے لاشیں دریائے جہلم میں پھینک دیں اور اس کے سپاہیوں کو غلاموں کی حیثیت سے غزنی بھیج دیا تھا۔ اس کے بعد سلطان نے حکم جاری کر دیا کہ لوگ اسلام قبول کر لیں ورنہ بستیاں اجاڑ دی جائیں گی۔

مہاراجہ نندہ رائے کو جرأت نہ ہوئی کہ قلعے سے باہر آ کر سلطان محمود کا مقابلہ کرتا۔

اُس کی فوجی طاقت خاصی کمزور ہو گئی تھی۔ سلطان نے اُسے پیغام بھیجا کہ وہ راجہ بھیم پال کو اُس کے حوالے کر دے یا بھیم پال کی طرح باجگزار ہو جائے۔ راجہ نندہ رائے نے دوسری شرط قبول کر لی۔ بھیم پال نندر پہلے ہی باجگزار تھا۔ معاہدے کے مطابق کالنجر کے علاقے میں بھی سلطان محمود نے دو تین چوکیاں قائم کر دیں جن میں ایک کماندار کی کمان میں تھوڑی سی نفری رکھ دی اور خود غزنی چلا گیا۔ اُس نے وہاں کی تمام آبادی کو مسلمان ہو جانے کا حکم دے دیا تھا اور اُس نے یہ انتظام بھی کر دیا تھا کہ پشاور، لاہور، ملتان اور بھیرہ سے ایسے بہت سے مسلمانوں کو جو مذہبی سبق دے سکتے تھے، کشمیر بھجوا دیا تھا۔

"کسی پر کوئی مذہب ٹھونسا نہیں جا سکتا" ۔۔۔ سلطان محمود نے (متعدد مؤرخوں کے مطابق) کہا تھا۔ "میں نے بےشک حکم دیا ہے کہ یہاں کا ہر فرد و بشر مسلمان ہو جائے لیکن میں کفار کا یہ الزام صحیح ثابت نہیں کرنا چاہتا کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلایا گیا تھا۔ یہاں کے لوگ گنوار اور اجڈ ہیں۔ یہ لوگ حاکم کے حکم کو مذہب سمجھتے ہیں۔ ان کا مذہب وہی ہے جو اُن کے مہاراجہ کا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ انہیں بتایا جائے کہ مذہب کا تعلق خدا کے ساتھ ہے، کسی انسان کے ساتھ نہیں اور خدا مٹی اور پتھر کا بت نہیں .... اس علاقے میں مسجدیں کھڑی کر دو تاکہ یہ لوگ باجماعت نماز پڑھیں تو انہیں پتہ چلے کہ سب انسان برابر ہیں۔ کوئی امیر ہے یا غریب، راجہ ہے یا رعایا، ہر کسی کا ماتھا ایک ہی طرح ایک ہی زمین پر سجدے میں رگڑا جاتا ہے۔"

ایک مشہور تاریخ دان سر آرل سٹین کی تحریر کے مطابق سلطان محمود غزنوی نے کہا تھا۔ "چونکہ لوگوں کو اسلام کی عظمت اور برکت عملاً نہیں دکھائی جاتی اور سلطان کہتا کچھ اور کرتا وہ ہے جو اُس کی اپنی ذات کی عظمت کے لیے موزوں ہوتا ہے، اس لیے مسلمان اپنے ہی مذہب سے منحرف ہو جاتے ہیں۔ میں اپنی سلطنت میں یہ برداشت نہیں کروں گا۔ ان لوگوں کو ذہن نشین کرا دو کہ خدا کیا ہے۔ اس کا رسول کون ہے اور ان کے احکام کیا ہیں۔"

مہاراجہ نندہ رائے کی شکست خوردہ حکومت دو قلعوں کے اندر قید ہو گئی تھی۔ باہر سلطان محمود اللہ کی حکمرانی قائم کرنے کے احکام دے گیا تھا۔ پشاور، لاہور، ملتان اور بھیرہ

سے بہت سے ایسے مسلمان کو جو تبلیغ اور امامت کرا سکتے تھے، بلا کر علاقے میں پھیلا دیا گیا تھا۔ بعض جگہوں پر مسجدیں تعمیر ہونی شروع ہو گئی تھیں اور بیشتر گاؤں میں لکڑی کا ایک جھونپڑا کھڑا کر کے اسے مسجد بنا لیا گیا تھا۔

اس خطے کے رہنے والوں کا مذہب وہی تھا جو ان کے مہاراجہ کا تھا۔ ان کا مذہب پیٹ سے تعلق رکھتا تھا یا اپنی جان سے۔ اب انہوں نے مسلمان فوج کو فاتح دیکھا تو اس کا مذہب اختیار کر لیا۔ سلطان محمود اسلام کو ان کی روحوں میں اتار دینے کا اہتمام کر گیا تھا مگر ہندوستان کے راجوں مہاراجوں کے لیے یہ بہت بڑی شکست تھی۔ بھیم پال نندر کالنجر یا لوہ کوٹ کے قلعے میں پناہ لینے کی بجائے کشمیر کی کسی دور دراز وادی میں چھپا رہا۔ جب اسے بتایا گیا کہ سلطان محمود واپس چلا گیا ہے تو وہ کسی ویران راستے سے لاہور پہنچ گیا۔

بہت دنوں بعد لاہور میں دوسری ریاستوں کے راجے مہاراجے جمع ہو گئے۔ اس اجتماع میں بڑے بڑے مندروں کے پنڈت بھی شریک تھے اور ایک بار پھر تجویزیں اور منصوبے پیش ہو رہے تھے کہ اسلام کے سیلاب کو کس طرح روکا جائے۔ پنڈت حسب معمول فوجی حکام کو لعن طعن کر رہے تھے۔ بعض نے سلطان محمود کو قتل کرنے پر زور دیا۔ دبی دبی سی ایک آواز یہ بھی سنائی دی کہ سلطان محمود کو اب دریائے سندھ کے پار پشاور سے بھی دور روکا جائے اور اس کی فوج کو پہاڑیوں کے اندر گھیر کر بھوکا اور پیاسا مار دیا جائے، مگر اس اجتماع میں کسی بھی تجویز پر اتفاق نہیں ہو رہا تھا۔

"آپ سب میں اتفاق اور اتحاد صرف اس لیے پیدا نہیں ہو رہا کہ آپ کو اپنے اپنے راج کا فکر ہے" — بڑے پنڈت نے کہا۔ "آپ سب مسلمانوں سے ڈر گئے ہیں۔ تعداد میں مسلمانوں کی فوج ہمیشہ تھوڑی ہوتی ہے اور وہ اتنی دور سے آ کر لڑتی ہے۔ یہاں کا بچہ بچہ اس فوج کا دشمن ہے۔ یہاں کی زمین اس فوج کی دشمن ہے مگر فتح ہر بار مسلمانوں کی ہوتی ہے۔ ذرا غور کرو کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ کیا محمود دیو ہے؟ جن ہے؟ بھوت ہے؟ ... وہ آپ کی طرح کا انسان ہے لیکن وہ آپ سب پر اس لیے غالب آ گیا ہے کہ اس کا مذہب جو کچھ بھی ہے وہ اپنے مذہب کا شیدائی ہے۔ اسی

کو مسلمان ایمان کہتے ہیں یہی ان کی طاقت ہے۔ آپ میں سے کسی کو بھی اپنے مذہب کا کچھ خیال نہیں۔ آپ کے سامنے اپنا دھرم نہیں، بلکہ اپنا آپ، اپنا تخت اور اپنا تاج ہے۔"

سب خاموش تھے۔ پنڈت نے سب پر نگاہ دوڑائی۔

"ہندوستان ہندوؤں کا دیس ہے، ہندوستان دیویوں اور دیوتاؤں کا دیس ہے۔ یہ اللہ اکبر کا نہیں، ہری کرشن اور ہر ہر مہادیو کا دیس ہے مگر ہمارے مذہب کی جو توہین ہو رہی ہے، وہ آپ دیکھ رہے ہیں۔ یہ دھرتی پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ یہ کسی ایک بھی مسلمان کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتی۔ اگر آج آپ نے اس دھرتی کی پکار نہ سنی تو ہماری یہ نسل جو جوان ہو رہی ہے مسلمانوں کی غلام ہو گی اور کرشن مراری کی بنسری ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جائے گی۔ اپنی آنے والی نسلوں کو اس قہر سے بچاؤ۔ یاد کرو کہ ہمارے باپ دادا نے محمد بن قاسم کا لگایا ہوا اسلام کا پودا جو درخت بن گیا تھا، کس طرح اکھاڑا تھا۔ اس درخت کی جڑیں چندر گپت اور اشوک کے اس دیس کی دھرتی میں دور دور تک پھیل گئی تھیں۔ ہمارے پنڈتوں اور رشیوں نے دھرم کی لگن دل میں رکھ کر یہ جڑیں اکھاڑ پھینکی تھیں۔ انہوں نے اذانیں خاموش کر دی تھیں....

"جس پاپ کی آپ سب کو سزا مل رہی ہے، وہ یہ ہے کہ آپ نے اس جنگ کو اپنے راج پاٹ کی جنگ سمجھ لیا ہے۔ اپنے خیال بدل ڈالو۔ یہ دو مذہبوں کی جنگ ہے اور جو مذہب جیت رہا ہے وہ اسلام ہے۔ اسلام پھیل رہا ہے۔ شکست مہاراج بھیم پال نندر کو نہیں ہوئی، ہندو مت کو ہوئی ہے۔ کالنجر کے اتنے وسیع علاقے کے لوگوں کو ڈرا کر مسلمان بنا لیا گیا ہے اور وہاں مولویوں اور اماموں کی ایک فوج بھیج دی گئی ہے۔ اگر وہاں اسلام لوگوں کے دلوں میں اتر گیا تو آپ کبھی بھی اسلام کو اس دیس سے نہیں نکال سکیں گے۔"

"ہمارے لیے یہ باتیں نئی نہیں" — مہاراجہ بھیم پال نندر نے کہا۔ "اب سوچنا یہ ہے کہ کالنجر کے علاقے میں جس طرح اسلام کا بیج بویا جا رہا ہے، اس کا کیا علاج کیا جائے۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں نے محمود سے شکست کھائی ہے اور کالنجر کی فوج بھی محمود کا مقابلہ نہیں کر سکی۔ مجھے تمام مہاراجوں کی مدد کی ضرورت ہے۔ ہمیں ایک فیصلہ کن جنگ لڑنی ہے۔"

"آپ نے اپنی شکست تسلیم کر لی ہے تو یہ بھی تسلیم کریں کہ آپ آئندہ بھی شکست کھا سکتے ہیں" — پنڈت نے کہا — "تیاری میں وقت لگے گا اگر یہ جنگ فیصلہ کن نہ ہوئی تو جنگ کے لیے تیاری میں مزید وقت ضائع ہوگا۔ فوری ضرورت یہ ہے کہ کالنجر میں جس طرح تمام تر آبادی کو مسلمان بنا لیا گیا اور اسلام کو ان کے دلوں میں اتارنے کا جو اہتمام کیا گیا ہے، اس کا توڑ سوچا جائے۔"

"آپ وہاں اپنے مذہب کا پرچار نہیں کر سکتے" — کالنجر کے راجہ نندہ رائے نے کہا — "سلطان محمود وہاں اپنی چوکیاں قائم کر کے کچھ فوج وہاں چھوڑ گیا ہے۔ یہ فوج گشت پر رہتی ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس فوج کو سلطان محمود یہ اختیار دے گیا ہے کہ جو کوئی ہندو مت کا پرچار کرے اسے وہیں قتل کر دو۔ وہاں اگر ہندو مت رہ گیا ہے تو وہ میرے قلعے میں ہے۔ باہر اسلام کی باتیں اور چرچے ہیں اور جن مولویوں اور اماموں کا ذکر آپ نے کیا ہے، انہیں اپنی فوج کا تحفظ حاصل ہے۔"

"ہر کام تلوار سے نہیں کیا جا سکتا" — بھیم پال نندر کے وزیر نے کہا — "شعبدے دکھاؤ۔ اگر ان لوگوں کو اسلام قبول کرنے کا حکم دیا گیا ہے تو حکم چلائے بغیر انہیں ہم اسلام سے متنفر کر سکتے ہیں۔ ان کے دلوں میں اسلام کے خلاف شکوک پیدا کر سکتے ہیں۔ کہاں ہیں اس فن کے استاد؟ ..... انہیں استعمال کرو۔ کالنجر کے جنگل، پہاڑ اور وادیاں اس کام کے لیے موزوں ہیں۔ وہاں کے لوگوں کو ڈراؤ نے فریب دو اور خوبصورت چہرے بھی۔ محمود اپنی فوج کی جو تھوڑی سی نفری چھوڑ گیا ہے، اس پر خوف بھی طاری کرو اور انہیں حسین جال میں بھی پھانس کر بیکار کر دو۔ ان میں سے کچھ آدمیوں کو اپنے ہاتھ میں لو۔ اس دوران جنگی تیاری کرتے رہو۔ اگر ہم نے وہاں اپنی درپردہ کارروائیاں نہ کیں تو وہ علاقہ مسلمانوں کا گڑھ بن جائے گا اور ہمارے لیے بہت بڑا خطرہ پیدا ہو جائے گا۔"

"انسان کی کمزوریوں کو استعمال کرو" — بڑے پنڈت نے کہا — "پیار اور خوف ہر

کسی کی کمزوری ہے۔ پیار اور محبت کا پیغام خواہ جھوٹا ہی ہو، انسان اسے فوراً قبول کرتا ہے۔ مسلمان کو زہر پیار میں لپیٹ کر دو، اور ان لوگوں کے ذہنوں میں ایسے توہمات ڈال دو جو اُن پر خوف طاری کریں۔ افواہیں پھیلاؤ۔ جھوٹ پھیلاؤ۔ اسلام پھیلانے والے اور اسلام قبول کرنے والے آپ کے جال میں آ جائیں گے۔"

یہ ایسی تجویز تھی جو سب کو پسند آ گئی اور سب نے اس پر اتفاق کیا۔

۱۰۱۴ء کی آخری سہ ماہی میں آج کے جنوبی کشمیر میں ایسے واقعات رونما ہونے لگے تھے کہ وہاں توہمات اور خوف کی حکمرانی تھی۔ جن گاؤں میں کوئی مافوق الفطرت واقعہ نہیں ہوا تھا وہاں دوسری جگہوں سے افواہیں پہنچ جاتی تھیں۔ ان کے مطابق پہاڑ آگ اگلتے تھے۔ آسمان صاف ہوتا تھا مگر بجلی چمکتی تھی۔ بڑی خوبصورت چڑیلیں مسافروں کے راستے روکتی تھیں۔ لوگ سن کر ہی ڈر جاتے تھے اور یہ ڈر اس وقت دہشت بن جاتا تھا جب کوئی اجنبی خوف سے کانپتے ہوئے انہیں سناتا تھا کہ غزنی کے مسلمان لوگوں کے بچوں کو ذبح کر کے کھاتے ہیں۔

سلطان محمود کی فوج کی ایک چوکی کا کمانڈر زبیر جلالی زمین میں دھنس گیا تھا۔ یہ حادثہ بڑا سنگین تھا۔ اس کی اطلاع ساروگ تک پہنچانا ضروری تھا۔ تمام چوکیاں جو کالنجر میں قائم کی گئی تھیں، ان کا کمانڈر ساروگ تھا جس کا ہیڈ کوارٹر جبرگیاں کے مقام پر تھا۔ اُسے امام اور سپاہی نے آ کر اطلاع دی تو وہ کالنجر کو روانہ ہو گیا۔ اس کے قافلے میں اُس کے چند ایک محافظ تھے۔ قافلہ گھوڑوں پر سوار تھا اور ان کا سامان خچروں اور ٹٹوؤں پر لدا ہوا تھا۔ اُن سے کچھ دور دور دو گھوڑ سوار جا رہے تھے جو لباس اور چال چلن سے غریب اور بے ضرر مسافر لگتے تھے۔ وہ ساروگ کے قافلے کو دیکھ کر آگے نکل گئے۔

امام اور سپاہی جب کشمیر سے آ رہے تھے تو وہ دیکھ نہیں سکے تھے کہ یہی دونوں گھوڑ سوار اسی طرح اُن سے کچھ دور دور چلے آ رہے تھے۔ جب امام اور سپاہی بالناتھ میں داخل ہوئے تو گھوڑ سوار کہیں چلے گئے تھے۔ اب ساروگ امام اور سپاہی کے ساتھ روانہ ہوا تو دو سوار اُن سے دور دور چلے جا رہے تھے۔

سارو گ کو کسی گائیڈ کی ضرورت نہیں تھی۔ امام اور سپاہی راستے سے واقف تھے۔ وہ مسافت کی عام رفتار سے تیز چلے جا رہے تھے۔ اُن کے نیچے سے اونچی نیچی زمین، پتھریلے کھڈ نالے، گھاٹیاں اور ٹیلے پیچھے ہٹتے جا رہے تھے۔ انہیں کشمیر کے پہاڑوں کی برف پوش اسپید سپید چوٹیاں نظر آ رہی تھیں۔ امام سارو گ کو بتا رہا تھا کہ ان چوٹیوں کے دامن میں جو خطہ ہے وہ کس قدر حسین ہے اور وہاں کے لوگوں کا حسن اس خطے سے زیادہ دلکش ہے۔

سفر کی پہلی رات چٹانوں اور ٹیلوں کے علاقے میں آئی۔ قافلہ رات بھر کے لیے رک گیا۔ موسم سرد تھا۔ قافلہ جب منزل کو روانہ ہونے لگا تو ایک گھوڑا بڑی زور سے ہنہنایا اور بے لگام ہو کر دوڑ پڑا۔ یہ ایک محافظ کا گھوڑا تھا۔ ابھی سوار اس کی پیٹھ پر نہیں بیٹھا تھا۔ محافظ نے چلا کر کہا۔ "سانپ..... ناگ"۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور گھوڑا ڈر کر دوڑ پڑا۔ گھوڑے اور ٹٹو چلنے کو تیار تھے اس لیے کھلے پھر رہے تھے۔ دو گھوڑوں کی خوفزدہ آوازیں سن کر تمام گھوڑے، خچر اور ٹٹو ڈر کر بھاگ اُٹھے۔ کسی پر کوئی سوار نہیں تھا۔

سب نے دیکھا کہ ایک ڈیڑھ گز لمبا سانپ رینگ رہا تھا۔ وہ علاقہ سرسبز تھا۔ گھاس اونچی بھی تھی اور چھوٹی چھوٹی بھی خودرو پودے تھے اور درخت بھی۔ وہاں چٹانیں اور ٹیلے تھے۔ خچر اور ٹٹو سامان سمیت بھاگ گئے تھے۔ کسی کو سانپ کو مارنے کا ہوش نہ رہا۔ اصل مسئلہ گھوڑوں کو پکڑنے کا تھا۔ علاقہ ایسا تھا کہ پتہ بھی نہیں چلتا تھا کہ جانور کدھر نکل گئے ہیں۔ سب اُن کے پیچھے دوڑ پڑے۔ سانپ سے ڈرے ہوئے جانور کو پکڑنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

وہ سب چٹانوں اور ٹیلوں میں غائب ہو گئے تو ایک چٹان کی اوٹ سے دو آدمی سامنے آئے۔ سانپ آہستہ آہستہ رینگ رہا تھا۔ ان میں سے ایک آدمی نے سانپ کو گردن سے پکڑا اور پرے لے جا کر اپنے گھوڑے کی زین کے ساتھ بندھے ہوئے تھیلے میں ڈال کر تھیلے کا منہ بند کر دیا۔ وہاں ایک اور گھوڑا کھڑا تھا۔ وہ آدمی ایک گھوڑے پر سوار ہوا اور دوسرے کی لگام پکڑ کر ادھر آ گیا۔ اُس کا ساتھی گھوڑے پر سوار ہوا اور

دونوں وہاں سے غائب ہو گئے۔

"آج کا دن تو یہ اپنے گھوڑے ٹٹو پکڑتے رہیں گے" — ایک نے کہا۔ "آگے چلو۔ یہ واپس نہیں جائیں گے" — "ہو سکتا ہے واپس چلے جائیں" — دوسرے نے کہا۔ "ان پر نظر رکھو۔"

دن کا پچھلا پہر تھا جب سارو گ کا قافلہ اس حال میں کالنجر کی طرف چلا جا رہا تھا کہ نصف قافلہ پیدل تھا اور سامان والے صرف دو ٹٹو ساتھ تھے۔ انہوں نے بڑی مشکل سے ان دو چار گھوڑوں اور دو ٹٹوؤں کو پکڑا تھا۔ سارو گ عزم کا پکا تھا۔ میدانِ جنگ کا دھنی تھا۔ کسی دشواری اور کسی رکاوٹ کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ اُس نے قافلے سے کہا کہ جو پیدل چلتے تھک جائے وہ گھوڑے پر سوار ہو جائے۔ میں خود پیدل چلوں گا۔ ہندوستان کے ناگ ہمارا راستہ نہیں روک سکتے۔

اب راستہ پہاڑیوں کے اندر سے گزرتا تھا۔ ایک طرف پہاڑ اور دوسری طرف دُور نیچے کو گئی ہوئی ڈھلان تھی۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر راستہ مڑتا تھا۔ کبھی وہ پہاڑیوں کے درمیان چلا جاتا تھا۔ وہ جوں جوں آگے بڑھتے جا رہے تھے، سردی بڑھتی جا رہی تھی۔ ہوائیں یخ ہوتی جا رہی تھیں۔ اگر ان کے پاس کھانے پینے کا سامان نہیں تھا تو بھی بھوک اور پیاس سے مرنے کا کوئی خطرہ نہیں تھا..... وہاں پانی کی بہتات تھی اور پھلدار درخت بھی تھے۔ بچے کچھے گھوڑوں کے لیے گھاس ہی گھاس تھی۔

قافلے نے رات چٹانوں میں قدرتی گھپاؤں میں گزاری۔ گھوڑے باہر بندھے رہے۔ روانگی کے لیے گھوڑوں پر زینیں ڈالی گئیں اور قافلہ روانہ ہو گیا۔ سارو گ خود پیدل چلنے لگا۔ اُس نے امام کو ایک گھوڑے پر سوار کر دیا۔ چونکہ وہ خود پیدل چل رہا تھا اس لیے اُس کے محافظ بھی پیدل چلنے لگے — اور اچانک امام کا گھوڑا رک کر تھر تھر کانپنے لگا۔ گھوڑوں کی کیفیت کو وہی سمجھ سکتے ہیں جن کی زندگی گھوڑوں کے ساتھ گزری ہو۔ سارو گ نے گھبرا کر کہا۔ "گھوڑے سے کود آؤ" — اور امام گھوڑے سے کود آیا۔ گھوڑا خوف

سے ہنہنا کر بھاگ اُٹھا۔ اس کے ساتھ ہی دوسرے گھوڑے بھی بے قابو ہو کر ہنہنانے لگے۔

"سانپ۔ سانپ" — کسی نے چلا چلا کر کہا۔

اب ایک کی بجائے دو سانپ تھے۔ دونوں ایک ہی رنگ کے اور ایک ہی لمبائی کے تھے۔ گھوڑے لگامیں چھڑا کر اِدھر اُدھر بھاگ اُٹھے تھے اس لیے سب انہیں پکڑنے کو دوڑے، سانپوں کو مارنے کا کسی کو ہوش نہ رہا۔ دو گھوڑے ڈھلان سے پھسل کر لڑھک گئے۔ نیچے دریائے جہلم بہا چلا جا رہا تھا۔ ساروگ کے محافظ دُور اُوپر کھڑے گھوڑوں کو دریا میں بہتا دیکھتے رہے۔

قافلے کے تمام آدمی جب ہری بھری چٹانوں میں گھری ہوئی اس جگہ سے جہاں انہوں نے رات گزاری تھی، چلے گئے تو وہی دو آدمی سامنے آئے جو چھپ چھپ کر قافلے کے ساتھ ساتھ چلے جا رہے تھے۔ انہوں نے دونوں سانپوں کو پکڑ لیا اور تھیلے میں ڈال کر تھیلا ایک گھوڑے کی زین کے ساتھ باندھ دیا۔

ساروگ کے آدمیوں نے ایک دو گھوڑے اور ایک ٹٹو پکڑ لیا اور منزل کو روانہ ہو گئے۔

"ایسا ہو نہیں سکتا۔" امام نے ساروگ سے کہا۔ "یہ علاقہ سانپوں کا نہیں۔ اگر یہاں سانپ ہیں بھی تو باہر نہیں نکل سکتے کیونکہ سردی ان کے لیے قابلِ برداشت نہیں۔ میں اس سپاہی کے ساتھ اسی راستے گزرا تھا۔ رات کو اس جگہ قیام کیا تھا۔ ہمیں کوئی سانپ نظر نہیں آیا تھا۔"

"پھر سوچو" — ساروگ نے کہا۔ "آپ راستہ بھول گئے ہیں۔ کوئی آبادی دیکھتے ہیں۔ اس علاقے میں راستے سے بھٹک جانا کوئی بڑی بات نہیں۔"

ساروگ کا حوصلہ ابھی تک قائم تھا۔ وہ قافلے کو پیدل لے جا رہا تھا۔ سب کو حوصلہ دے رہا تھا اور وہ اس وہم میں مبتلا ہو گیا تھا کہ امام اُسے غلط راستے پر لیے جا رہا ہے۔ وہ چلتے گئے اور شام سے ذرا پہلے انہیں ایک موڑ مڑتے ہی دو گھوڑ سوار آتے نظر آئے۔

سوار اُن کے قریب آ کر رُک گئے۔ وہ کود کر گھوڑوں سے اُترے اور سڑک کے کنارے گھٹنے ٹیک کر اور ہاتھ جوڑ کر بیٹھ گئے۔ ساروگ اُن کے قریب جا رُکا۔ ان دونوں نے سر جھکا لیے۔ ساروگ نے امام سے کہا کہ آپ ان کی زبان جانتے ہیں۔ انہیں اٹھاؤ اور ان سے راستہ پوچھو۔

امام نے انہیں اٹھنے کو کہا — وہ اٹھے اور ایک نے ہاتھ جوڑے ہوئے بھکاریوں کے لہجے میں کہا۔ "ہم آپ کے غلام ہیں۔ آپ مسلمان ہیں۔ ہم نے آپ کا مذہب قبول کر لیا ہے۔"

امام نے انہیں اپنی منزل بتا کر پوچھا "کیا ہم ٹھیک راستے پر جا رہے ہیں؟"

"نہیں جی" — ایک نے کہا۔ "ہم آپ کو بہت دُور سے دیکھ کر آئے ہیں۔ ہم حیران ہیں کہ آپ اس علاقے سے زندہ کس طرح نکل آئے ہیں۔ اسے ہم موت کی وادی کہا کرتے ہیں۔ اس علاقے میں تو شیر بھی نہیں آتا۔ یہ سانپوں کا علاقہ ہے۔ آپ جدھر جا رہے ہیں۔ اُدھر ہر درخت کے ساتھ ایک سانپ لپٹا ہوا نظر آئے گا۔ آپ یہ راستہ چھوڑ دیں" — اور وہ راستہ بتانے لگا، پھر بولا "مگر آپ نہیں سمجھ سکیں گے۔ تین چار موڑ مڑ کر آپ بھول جائیں گے کہ کدھر جانا ہے۔ ہم دونوں آپ کے ساتھ چلے چلیں گے۔"

امام نے ساروگ کو بتایا تو ساروگ نے کہا کہ انہیں ساتھ لے چلو۔ ہم انہیں اُجرت دیں گے۔

دونوں سوار اس پیدل قافلے کے گائیڈ بن گئے۔ راستے میں ساروگ نے امام کی معرفت ان آدمیوں سے پوچھا کہ وہ ان عجیب و غریب واقعات سے واقف ہیں جو کالنجر کے علاقے میں رونما ہو رہے ہیں؟

"ہم اُدھر سے ہی بھاگ کر آئے ہیں" — ایک آدمی نے جواب دیا۔ "ہم اپنے بال بچوں کو اِدھر لے آئے ہیں۔"

"کیا تم نے پہاڑوں سے آگ نکلتی دیکھی ہے؟"

"ہم بہت دُور رہتے تھے" — اسی آدمی نے جواب دیا۔ "ہم نے دُور سے [illegible]

دیکھی تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے اُدھر سے آسمان جل رہا ہو۔ راتوں کو بجلی چمکتی دکھی ہے
.... اور آوازیں آتی ہیں کہ اپنا مذہب نہ چھوڑو۔"

"تم نے بھی اپنا مذہب چھوڑ کر اسلام قبول کیا ہے؟"

"ہاں!" ۔۔۔ اُس نے کہا۔ "ہم اسلام کو سچا مذہب سمجھتے ہیں اس لیے اُدھر سے بھاگ آئے ہیں۔ ہم آپ کا مذہب نہیں چھوڑیں گے۔"

دونوں باری باری سارو گ کو وہ واقعات سناتے رہے جو امام اور سپاہی نے سارو گ کے پاس آکر اُسے سنائے تھے۔ دونو آدمی ڈرے ہوئے تھے اور امام انہیں تسلی دے رہا تھا کہ انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا .... وہ آدمی غلاموں کے انداز سے آگے آگے چلے جا رہے تھے۔

دیوکوٹ جنوبی کشمیر میں ایک گاؤں ہوا کرتا تھا جو دیودار اور چیل کی لکڑی کے بنے ہوئے بیس پچیس گھروں سے مل کر بنا تھا۔ اس کی ساری آبادی ہندو تھی اور وہاں لکڑی کا مندر بھی تھا۔ اس سے تھوڑی دور غزنی کی فوج کی ایک چوکی تھی جس میں تیس کے لگ بھگ سپاہی رہتے تھے اور ان کا ایک کماندار ازمیر تھا جو ملتان کے علاقے کا رہنے والا تھا۔ کسی وقت وہ قرامطی ہوا کرتا تھا۔ سلطان محمود نے ملتان کو فتح کر کے قرامطیوں کی اصلیت بے نقاب کر دی تو قرامطیوں نے سنی عقیدہ قبول کر لیا۔ ان میں ازمیر بھی تھا۔

ایک روز وہ دو سپاہیوں کے ساتھ روزمرہ گشت پر گاؤں میں گیا۔ سلطان محمود کے حکم سے وہاں سے مندر ہٹا کر مسجد بنا دی گئی تھی اور وہاں ایک امام بھی مقرر کر دیا گیا تھا جو وہاں کے لوگوں کو اسلام کے سبق دیتا اور انہیں اسلامی عبادت سکھا رہا تھا۔

اس گاؤں کے لوگ بھی دہشت زدہ تھے۔ انہوں نے قریب کی پہاڑی پر بجلی چمکتی اور اس کی روشنی گاؤں پر پڑتی دیکھی تھی۔ امام نے ایک رات باہر جا کر ایسی ہی روشنی میں تین لڑکیاں بالکل برہنہ دیکھی تھیں۔ ہوا بہت تیز تھی جس سے اُن کے بال اُڑ اُڑ کر ان کے چہروں کو ڈھانپ رہے تھے۔ وہ چٹان کی ڈھلان پر چیل کے پیڑوں کے درمیان کھڑی تھیں۔ رات تاریک تھی۔ سامنے والے پہاڑ پر چمک ہوئی اس کی روشنی

اس چٹان پر پڑی۔ امام اتفاق سے باہر کھڑا تھا۔ اُسے اس روشنی میں جو بہت تیز نہیں مدھم سی تھی، یہ لڑکیاں نظر آئیں۔ روشنی بجھ گئی۔ ذرا دیر بعد پھر روشنی اسی جگہ پڑی تو وہاں کچھ بھی نہ تھا۔

امام نے احکام کے مطابق قریبی چوکی میں جا کر کماندار ازمیر کو بتایا تھا کہ رات اُس نے کیا دیکھا ہے۔ اُس نے ازمیر کو یہ بھی بتایا تھا کہ گاؤں کے لوگ اُس کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں کہ اگر اسلام خدا کا مذہب ہے تو امام انہیں اس کا معجزہ دکھائے۔ گاؤں کے لوگ کہتے تھے کہ انہیں اپنا مذہب تبدیل کرنے کی سزا مل رہی ہے اور بہت بڑی آفت آ رہی ہے۔

ازمیر گاؤں میں گیا۔ اُس نے لوگوں کا خوف دور کرنے کی کوشش لیکن وہ خود چکرایا ہوا تھا۔ وہ عالم فاضل نہیں تھا۔ ولی اللہ نہیں تھا، پیغمبر نہیں تھا۔ اُس کے پاس کوئی ٹھوس دلیل نہیں تھی جس کے زور پر وہ ڈرے ہوئے لوگوں کو قائل کرتا۔ اُس کے پاس ایک ہی دلیل تھی جو اُس نے ان الفاظ میں دی — "اگر کسی نے اسلام کے خلاف بات کی تو اُس کی گردن اُڑا دی جائے گی۔"

وہ امام کے ساتھ مسجد میں چلا گیا اور امام سے کہا — "میں فوجی ہوں۔ آپ امام ہیں، عالم ہیں۔ کیا آپ کا علم یہ نہیں بتا سکتا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ لوگوں کو کچھ بتائیں، ورنہ مسلمان سپاہی بھی اسلام سے دستبردار ہو جائیں گے۔ میں ہاتھوں سے لڑ سکتا ہوں اور لڑا ہوں۔ میں نے قلعوں کی دیواریں پھلانگی ہیں مگر مذہب کے معاملے میں اُجڈ اور بڑا ہی کمزور انسان ہوں۔ مجھے یہاں اس لیے رکھا گیا ہے کہ اسلام کی پاسبانی اور آپ کی حفاظت کروں۔ سلطان کا حکم ہے کہ لوگوں کے دلوں پر قبضہ کرو مگر یہاں ایسے واقعات ہو رہے ہیں کہ لوگوں کے دل شکوک اور خوف سے بھر گئے ہیں۔ مجھے کچھ بتائیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں بھی گمراہ ہو جاؤں۔"

امام کے پاس کوئی دلیل نہیں تھی۔ ازمیر وہاں کے لوگوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر واپس آ گیا۔ وہ پریشان اور مضطرب تھا۔ اُسے گاؤں کے لوگوں کی یہ آوازیں جیسے تنہائی میں بھی سنائی دے رہی تھیں — "اگر اسلام سچا مذہب ہے تو اس کا معجزہ دکھا

اُس کی چوکی ایک پہاڑی کی ڈھلان پر تھی۔ یہ بھی لکڑی کا ایک دو منزلہ مکان تھا۔ رات کو ازمیر بالائی منزل کی کھڑکی کھولے باہر دیکھ رہا تھا۔ رات اندھیری تھی اور سرد بھی تھی۔ اُسے باہر کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ کشمیر کے پھولوں کی مہک اُسے مسحور کر رہی تھی۔ وہ اسلام کا شیدائی تھا مگر یہاں آکر اسلام کے امتحان میں پڑ گیا تھا۔ ازمیر کو یقین تھا اور یہ اُس کا ایمان تھا کہ ہندوؤں کا مذہب باطل ہے اور بت پرستی کفر ہے مگر اُس کے لیے ثابت کرنا محال ہو گیا تھا کہ اُس کا مذہب برحق ہے۔

اُسے دُور کسی پہاڑی کی چوٹی پر یا ڈھلان پر روشنی سی نظر آئی۔ اچھی خاصی چمک تھی۔ یہ روشنی ایک دو بار چمکی اور بجھ گئی۔ ازمیر کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ سوچنے لگا کہ کل کسی گاؤں سے یہ خبر آئے گی کہ رات اُن کے گاؤں پر بجلی گری تھی یا یہ کہ رات ایک پہاڑی نے شعلے اُگلے تھے۔

کماندار ازمیر اتنا پریشان ہوا کہ قبلہ رُو ہو گیا اور اُس کے ہاتھ اپنے آپ دعا کے لیے اُٹھے۔ وہ گڑگڑایا — "خدائے ذوالجلال! اپنے نام کی لاج رکھ لو۔ اپنے مذہب کی لاج رکھ لو۔ مجھے اپنے نور کی چمک دکھاؤ کہ میں باطل کی ان روشنیوں کا راز پا کر انہیں بجھا سکوں۔"

اگلی صبح اُس کے دل پر یہی بوجھ تھا۔ وہ اپنا فرض سمجھتا تھا کہ اپنے مذہب کی عظمت ثابت کرے مگر اُس کے پاس اتنا علم نہیں تھا اور اتنی عقل بھی نہیں تھی۔ سورج اُوپر اُٹھ آیا تو وہ گھوڑے پر سوار ہوا اور اکیلا ہی باہر نکل گیا۔ وہ لوگوں کے جھونپڑوں میں جا کر اُن کی باتیں سننا چاہتا تھا۔

اُس زمانے میں اس علاقے کا جنگل گھنا تھا اور اس میں درندے بھی پائے جاتے تھے۔ ریچھ بھی کہیں کہیں نظر آتا تھا۔ ازمیر کے پاس برچھی تھی اور کمان بھی۔ وہ چوکی سے کچھ دُور جنگل میں چلا گیا۔ آگے ایک ندی تھی۔ اُسے عورتوں کے ہنسنے کی آوازیں سنائی دیں۔ اُس نے درختوں کی اوٹ میں جا کر دیکھا تین جوان لڑکیاں ندی میں نہا رہی تھیں اور

ایک دوسری پر پانی کے چھینٹے پھینک رہی تھیں۔ کمر کے اوپر سے وہ برہنہ تھیں۔ اس سے نیچے ہر لڑکی نے باریک سا کپڑا باندھ رکھا تھا۔

ازمیر لڑکیوں کے حُسن پر حیران نہ ہوا کیونکہ خدا نے اس خطے کو نسوانی حُسن سے نوازا تھا۔ حیران وہ اس پر ہوا کہ قریب کوئی آبادی نہیں تھی اور یہاں کوئی عورت نہانے یا کپڑے دھونے کے لیے نہیں آئی تھی۔ یہ لڑکیاں دیہاتی بھی معلوم نہیں ہوتی تھیں۔ اُسے شک ہونے لگا کہ یہ وہی لڑکیاں ہیں جن کے متعلق مشہور ہے کہ چڑیلیں یا بدروحیں ہیں اور وہ کہیں کہیں، آبادیوں سے دُور نظر آتی ہیں۔

وہ انہیں مبہوت ہو کر دیکھ ہی رہا تھا کہ ایک لڑکی نے ایک طرف دیکھتے ہوئے بڑی زور سے چیخ ماری اور دوڑ پڑی۔ ایک اور لڑکی اُس کے پیچھے دوڑی۔ تیسری جو ندی کے کنارے پر بیٹھی ہوئی تھی، اُٹھی اور جب دوڑنے لگی تو پانی میں گر پڑی۔ پانی گہرا نہیں تھا گھٹنوں سے بھی نیچے تھا۔ ازمیر درختوں سے آگے ہو گیا۔ تب اُس نے ایک بہت بڑا ریچھ دیکھا جو ندی میں اُتر رہا تھا اور بڑے غصے سے غرّا رہا تھا۔ لڑکی اُٹھی لیکن ریچھ کو اتنے قریب دیکھ کر اُس پر اتنی دہشت طاری ہو گئی تھی کہ وہ پھر گر پڑی۔ ریچھ اُسے پکڑنے کے لیے ندی میں اُتر گیا۔

ازمیر فوراً سمجھ گیا کہ یہ لڑکیاں انسان ہیں، چڑیلیں، یا بدروحیں نہیں۔ اُس نے لگام کو جھٹکا دے کر ایڑ لگائی۔ گھوڑا تیزی سے آگے بڑھا۔ ازمیر نے برچھی کو دائیں ہاتھ میں تول کر پوری طاقت سے برچھی پھینکی۔ برچھی تیر کی طرح گئی۔ ریچھ پانی میں اُچھلتا کودتا لڑکی تک پہنچ گیا لیکن اڑتی ہوئی برچھی اُس کے پہلو میں اُتر گئی۔ ریچھ بڑی زور سے غرّایا اور پانی میں گرا۔ وہ پھر اُٹھا اور ایک جگہ گھومنے لگا۔ آخر گر پڑا۔

ازمیر گھوڑے سے اُترا اور دوڑ کر ندی سے لڑکی کو اٹھا لیا۔ ریچھ پانی میں آہستہ آہستہ تڑپ رہا تھا۔ لڑکی بے ہوش ہو گئی تھی۔ اُس کے ساتھ کی لڑکیاں جانے کہاں بھاگ گئی تھیں۔ ازمیر نے لڑکی کو گھوڑے کی پیٹھ پر ڈالا۔ کنارے پر پڑے ہوئے لڑکی کے کپڑے اُٹھائے اور اُس پر ڈال دیئے اور واپس چوکی کی طرف چل پڑا۔ وہ لڑکی کو بچانے کی کوشش کر رہا

تھا اور وہ لڑکی سے یہ بھی معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہ کون ہے اور دوسری لڑکیاں کون ہیں اور کہاں رہتی ہیں۔

وہ چوکی میں پہنچا تو اُسے لڑکی کی آواز سنائی دی۔ وہ اُٹھنے کی کوشش کر رہی تھی ازمیر نے اُسے گھوڑے سے اتار لیا۔ وہ ہوش میں آ گئی تھی۔ اُس کے چہرے پر خوف اور زیادہ گہرا ہو گیا۔ پہلے وہ ریچھ سے ڈر کر بے ہوش ہوئی تھی، اب ازمیر کو اور اجنبی جگہ کو دیکھ کر اتنی ڈری کہ اُس کا سر ڈولنے لگا۔ ازمیر نے ہندوستانی زبان میں بات کی جو اُس نے سمجھ لی۔ ازمیر نے اُسے کپڑے پہننے اور چلنے کو کہا۔

"تم نے مجھے ریچھ سے بچایا ہے؟" — لڑکی نے پوچھا۔

"اگر میں نہ ہوتا یا میرے پاس برچھی نہ ہوتی تو تم زندہ نہ ہوتیں" — ازمیر نے کہا — "تمہارا جسم ریچھ کا پھاڑا ہوا ندی میں بہہ رہا ہوتا۔ میں نے ریچھ کو مار ڈالا ہے۔ مت ڈرو۔ جہاں کہو گی وہاں پہنچا دوں گا۔"

لڑکی کپڑے پہن کر اندر چلی گئی۔ ازمیر اُسے الگ کمرے میں لے گیا اور اُسے غور سے دیکھا۔ لڑکی اُس کے تصوروں سے زیادہ خوبصورت تھی۔

"میرے ساتھ کیا سلوک کرو گے؟" — لڑکی نے پوچھا۔

"جس سلوک کا تمہیں ڈر ہے، وہ میں جنگل میں ہی کر سکتا تھا۔" ازمیر نے کہا — "میں نے تمہارے ننگے جسم پر کپڑے ڈالے تھے۔ میں تمہیں بری نیت سے یہاں نہیں لایا۔ اب بتاؤ کہاں جاؤ گی۔ میں تمہیں وہاں چھوڑ آؤں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم یہاں کی رہنے والی نہیں۔ تمہاری زبان اس خطے کی نہیں۔ تمہاری ڈیل ڈول اور تمہارا چہرہ اس خطے کا نہیں۔ تم کسی غریب کسان یا گڈریئے کی بھی بیٹی نہیں۔"

"اگر میں تمہارے کسی بھی سوال کا جواب نہ دوں تو میرے ساتھ کیا سلوک کرو گے؟"

"پوچھے بغیر چھوڑوں گا نہیں" — ازمیر نے کہا — "ایک پاک امانت کی طرح یہیں رکھوں گا۔"

لڑکی ہنس پڑی اور اُس نے ایسی حرکتیں اور ایسی باتیں شروع کر دیں جیسے ازمیر

کو بچپن سے جانتی ہو۔ وہ ازمیر کو اپنا آپ پیش کر رہی تھی۔

"میں مسلمان ہوں لڑکی!" — ازمیر نے کہا — "میں اپنے مذہب اور اپنے سلطان سے غداری نہیں کروں گا۔ مجھے پتھر سمجھو۔"

لڑکی نے کچھ اور داؤ آزمائے۔ آخر اُسے یقین ہو گیا کہ یہ شخص واقعی پتھر ہے۔

"تم نے میری جان بچائی ہے" — لڑکی نے کہا — "اور تم ویسے نہیں جیسا میں سمجھتی تھی۔ تمہارا حق ہے کہ میں تمہیں اپنے راز سے آگاہ کر دوں، پھر میرے ساتھ جو بھی سلوک کرنا چاہو کرنا...... میں اُن چڑیلوں میں سے ایک ہوں جو لوگوں کو جوان اور خوبصورت لڑکیوں کے روپ میں نظر آتی ہیں، لیکن میں انسان ہوں۔ سب لڑکیاں انسان ہیں ہمارا مستقل ٹھکانہ قلعہ کالنجر میں ہے۔ عارضی ٹھکانہ وہاں سے تھوڑی ہی دور پہاڑ پر ہے جہاں سے تم مجھے اٹھا لائے ہو۔ آج رات ہم وہاں سے اُس گاؤں پر بجلی چمکانی تھی جو اُس پہاڑی کی دوسری طرف ہے۔"

"بجلی چمکانے کا راز کیا ہے؟"

"تم اُن لوگوں کو پکڑ سکتے ہو" — لڑکی نے کہا — "مگر اب مشکل ہو گیا ہے۔ وہ مجھے ڈھونڈ رہے ہوں گے۔ میں انہیں زندہ یا مُردہ نہیں ملوں گی تو وہ اپنا راز فاش ہونے کے خوف سے یہاں سے چلے جائیں گے۔ کیا تم کوئی طریقہ سوچ سکتے ہو؟"

"میں تمہیں وہیں لے جا کر چھوڑ دوں گا جہاں سے لایا ہوں" — ازمیر نے کہا — "اور خود چھپ جاؤں گا۔ ہو سکتا ہے وہ تمہیں ڈھونڈ رہے ہوں۔ میں انہیں پکڑ لوں گا...... اگر تم نے دھوکہ دیا تو یاد رکھو کہ میں جہاں بھی چھپوں گا، تم میرے تیر کی زد میں ہو گی۔"

"میں دھوکہ نہیں دوں گی" — لڑکی نے کہا — "تم نے میری جان بچائی ہے۔ میں تمہیں اس کا انعام دوں گی۔"

لڑکی اُسی جگہ پہنچ گئی جہاں ریچھ نے اُس پر حملہ کیا تھا۔ ریچھ ندی میں ہی پڑا تھا۔ پانی اتنا زیادہ نہیں تھا کہ اُسے بہا لے جاتا۔ لڑکی کنارے کنارے آگے چلی گئی اور اِدھر اُدھر دیکھتی رہی۔ خاصی دیر بعد ندی کے دوسرے کنارے پر دو آدمی نمودار ہوئے۔ انہوں

نے لڑکی کو بلایا۔ لڑکی نے انہیں اشارہ کیا کہ ادھر آ جاؤ۔ وہ دونوں ندی سے گزر کر لڑکی کے پاس آ گئے اور اس سے پوچھنے لگے کہ وہ کہاں رہتی ہے۔

اونچی گھاس میں سے ازمیر اور چار سپاہی اُٹھے۔ ازمیر کے ہاتھ میں کمان تھی۔ جونہی آدمیوں نے انہیں دیکھا تو وہ گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھنے لگے مگر ازمیر کی للکار نے انہیں بھاگنے نہ دیا۔ قریب جا کر انہیں گھیر لیا۔

"ہمیں اپنے ٹھکانے پر لے چلو" — ازمیر نے انہیں کہا۔

دونوں نے ٹالنے کی اور کچھ نہ سمجھنے کی اداکاری کی لیکن ازمیر نے انہیں مجبور کر دیا کہ وہ اسے اپنے ساتھ لے چلیں۔ دونوں نے لڑکی کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا کہ اُن کا راز اسی نے فاش کیا ہے۔ ازمیر نے تلوار نکال لی اور انہیں آگے آگے چلنے کو کہا۔ وہ چل پڑے اور گھنے جنگل میں داخل ہو گئے۔ ذرا آگے جا کر وہ پہاڑی پر چڑھنے لگے۔ درخت بہت زیادہ تھے۔ بیلیں زمین پر بھی پھیلی ہوئی اور درختوں پر بھی چڑھی ہوئی تھیں۔ یہ جگہ ایسی تھی کہ اُدھر سے کبھی کسی کا گزر نہیں ہوا تھا۔

خاصا اوپر گئے تو پہاڑی کی ابھی چوٹی نہیں آئی تھی۔ وہاں پہاڑی دیوار کی طرح سیدھی ہو گئی تھی۔ وہاں خشک لکڑیوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اس سے ذرا پرے ایک گف سی بنی ہوئی تھی۔ باہر کی آوازیں سن کر گف میں سے دو لڑکیاں نکلیں۔ ازمیر نے انہیں ندی میں نہاتے دیکھا تھا۔ وہ نوجیوں کو اپنے آدمیوں کے ساتھ دیکھ کر گھبرا گئیں۔ ازمیر نے گف میں جا کر دیکھا۔ وہاں پانچ چھ فٹ اونچا لکڑی کا ایک تختہ رکھا تھا جو قد آدم آئینہ معلوم ہوتا تھا۔ یہ آئینے کی طرح شفاف اور چمکدار تھا۔

"یہ سب کیا ہے؟" — ازمیر نے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں" — ایک آدمی نے کہا — "ہم تو ایسے ہی یہاں آ گئے ہیں۔"

ازمیر نے اُس لڑکی کی طرف دیکھا جسے اُس نے ریچھ سے بچایا تھا۔ یہ لڑکی ازمیر کی احسان مند تھی۔ اس کے عوض اُس نے ازمیر کو یہ راز بتلانے کا وعدہ کیا تھا۔ اُس نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ اب پردہ ڈالنا بیکار ہے کیونکہ وہ پردہ اُٹھا چکی ہے۔

ازمیر کو وہ اوپر لے گئے۔ وہاں سے اُس نے دیکھا۔ دور نیچے درختوں اور سبزہ زار

میں اپنی جوکی نظر آ رہی تھی اور اس سے دُور وہ گاؤں درختوں میں سے ذرا ذرا دکھائی دے رہا تھا جہاں ازمیر گیا تھا۔ اُسے بتایا گیا کہ پہاڑی جہاں سے عمودی ہو جاتی ہے، وہاں لکڑیوں کے ڈھیر کو آگ لگائی جائے گی۔ یہ آگ نیچے کے گاؤں والوں کو نظر نہیں آ سکتی۔ اس کے سامنے اور اوپر جہاں وہ کھڑے تھے، یہ آئینہ رکھا جائے گا۔ آگ پر تیل پھینکتے رہیں گے جس سے شعلہ اور زیادہ بھڑکے گا اور اوپر کو لپکے گا۔ اس کی چمک آئینے پر پڑے گی۔ آئینے کو جوکی اور پھر گاؤں کی سمت کر کے آہستہ آہستہ ایک دو بار ہلایا جائے گا۔ اس کی چمک دُور نیچے اس طرح پڑے گی جس طرح بجلی چمکتی ہے۔

ازمیر کے لیے یہ سمجھنا کوئی مشکل نہ تھا۔ اسے یہ بتایا گیا کہ اس رات اس کی جوکی اور گاؤں پر چمک ماری تھی۔ اس سے پہلے کسی اور جگہ سے گاؤں پر چمک ماری جا چکی تھی۔

"یہ عقل کا کھیل ہے" — ایک آدمی نے کہا — "رات کو پہاڑی سے آگ کا عکس اس چمکدار تختے پر لیا جاتا ہے تو دُور نیچے سے دیکھنے والوں کو یوں نظر آتا ہے جیسے یہ چمک آسمان کی ہو۔ ان پہاڑیوں کی بلندیوں سے جو لوگ واقف ہیں، رات کو بھی شک نہیں کر سکتے کہ یہ چمک پہاڑ سے آئی ہے۔ اگلے روز ہمارے آدمی گاؤں میں جا کر افواہیں پھیلاتے ہیں، اور لوگوں کے ذہنوں پر یہ غلط بات مسلط کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنا مذہب چھوڑ کر اسلام قبول کر لیا ہے اس لیے انہیں دیوتاؤں کے اشارے مل رہے ہیں کہ وہ اپنے مذہب میں واپس آ جائیں ورنہ اُن پر قہر نازل ہو گا ... خوبصورت برہنہ لڑکیوں کے روپ میں نظر آنے والی چڑیلیں یہی لڑکیاں ہوتی ہیں۔ یہ اس خطے کی رہنے والی نہیں۔ یہ لاہور اور بٹھنڈہ کے راج محل کی خاص لڑکیاں ہیں۔"

خُدا نے ازمیر کی دُعا قبول کر لی اور اپنے نور کی چمک دکھا دی تھی۔ یہ اسے اب لوگوں کو دکھانی تھی۔ اُس نے ان آدمیوں اور لڑکیوں کو اپنی جوکی میں لے جا کر پہرے میں بٹھا دیا اور اُن سے پوچھنے لگا کہ ان کے اور ساتھی کہاں ہیں۔

ساروگ کا قافلہ ابھی تک دو گائیڈوں کی راہنمائی میں چلا جا رہا تھا۔ امام نے کئی بار گائیڈوں سے کہا کہ اب تک انہیں اپنی منزل پہنچ جانا چاہیے تھا۔ گائیڈوں نے

انہیں بتایا کہ انہوں نے راستہ [illegible] اختیار کیا ہے لیکن یہ محفوظ اور آسان راستہ ہے۔

یہ راستہ آسان نہیں تھا۔ اُن کے گائیڈ انہیں منزل سے بہت دُور ویرانے میں لے گئے تھے۔ ایک شام قافلے نے ایک جگہ قیام کیا اور گائیڈوں نے انہیں بتایا کہ کل دن کے پچھلے پہر وہ منزل پر پہنچ جائیں گے۔ سب تھکے ہوئے تھے کھانا کھا کر فوراً سو گئے۔

صبح اُن کی آنکھ کھلی تو دونوں گائیڈ غائب تھے۔ وہ اپنے گھوڑوں پر چلے گئے تھے۔ انہیں ادھر اُدھر دیکھا لیکن بیکار تھا۔ وہ کہاں نظر آ سکتے تھے۔ ان کے اردگرد اونچے پہاڑ کھڑے تھے۔ نیچے سے اوپر تک چیل کے درختوں نے پہاڑوں کو ڈھانپ رکھا تھا۔ انہیں وہی راستہ معلوم تھا جس راستے سے وہ آئے تھے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں ہیں اور منزل کتنی دُور ہے۔

"ہندو ڈنک مار گیا ہے" — سارگ نے امام سے کہا — "ان دونوں آدمیوں کو معلوم تھا کہ آپ مجھے یہاں کے پُراسرار واقعات بتاتے جا رہے ہیں"

"ہم جب بالناتھ سے آ رہے تھے تو میں نے تین چار بار کچھ دور دو آدمی جاتے دیکھے تھے" — ایک محافظ نے کہا — "میں انہیں مسافر سمجھتا رہا۔ یہ وہی نہ ہوں"

"میں نے انہیں اس سے پہلے بھی دیکھا تھا جب ہم نے پہلا سانپ دیکھا تھا" — ایک اور محافظ نے کہا — "ان کے چہرے نظر نہیں آ سکے تھے"

"وہی تھے یا کوئی اور تھے، اب کیا فرق پڑتا ہے" سارگ نے کہا — "ہم بہت بڑے دھوکے کا شکار ہو چکے ہیں۔ اب یہاں سے نکلنے کا راستہ ڈھونڈو.... اور دیکھو تھیلوں میں کھانے کی جو بھی چیز باقی ہے وہ پھینک دو۔ ہو سکتا ہے وہ ان میں زہر ملا گئے ہوں"

ان کی بڑی کٹھن اور خطرناک مسافت شروع ہو گئی۔ دن بھٹکتے گزر گیا۔ رات آ گئی جو انہوں نے سو کر گزاری لیکن یہاں سردی زیادہ تھی۔ اگلا دن بھی سبز پوش وادیوں میں بھٹکتے گزر گیا۔

اگلی رات جب وہ سردی سے بچنے کے لیے کوئی جگہ دیکھ رہے تھے، اُن کے

گائیڈ جو انہیں اتنے حسین ویرانے اور اتنی پُرپیچ بھول بھلیوں میں چھوڑ گئے تھے قلعہ لوہ کوٹ میں ہندو قلعہ دار کے پاس بیٹھے اپنی کارگذاری سنا رہے تھے۔

"تم نے انہیں ہلاک کیوں نہ کر دیا؟" — قلعہ دار نے کہا — "سلطان محمود کا قلعہ دار معمولی آدمی نہیں ہوتا۔ میں خوش ہوں کہ تم نے بہت موٹا شکار پکڑا ہے لیکن اُسے زندہ نہیں رہنا چاہئے"

"کالنجر سے ہمیں حکم ملا تھا کہ کسی مسلمان فوجی کو قتل نہ کیا جائے" — ایک گائیڈ نے کہا — "ہم خود نہیں سمجھ سکے کہ ایسا حکم کیوں ملا تھا۔ ہم ان کے کھانے میں بڑی آسانی سے زہر ملا سکتے تھے"

"مہاراجہ کالنجر نے کچھ سوچ کر ہی کہا ہو گا کہ انہیں قتل نہ کیا جائے" — قلعہ دار نے کہا — "وہ شاید محمود پر یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ معاہدے کے مطابق اُن کے فوجیوں کی جانیں یہاں محفوظ ہیں۔ اگر وہ خود ہی کہیں بھٹک بھٹک کر مر جاتے ہیں تو ہم انہیں روک نہیں سکتے"

اور سارگ کو اپنے قافلے کے ساتھ بھٹکنے سے کوئی بھی نہ روک سکا۔ انہیں کہیں کوئی آبادی نظر نہیں آتی تھی نہ کوئی اکیلا دکیلا جھونپڑا یا کوئی انسان نظر آتا تھا۔ کبھی کبھی ہرنوں یا شیروں کا جوڑا نظر آ جاتا تھا یا بھیڑیوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ دنیا کا اتنا حسین اور جاذبِ نظر خطہ انہیں بڑا ہی ہولناک اور پُراسرار دکھائی دیتا تھا۔

ہندوؤں نے بڑی کامیاب چال چلی تھی۔ سلطان محمود فوج کی جو نفری یہاں چھوڑ گیا تھا، اس کا سب سے بڑا افسر سارگ تھا۔ سارگ کو غائب کر دینے سے ہندو یہ فائدہ اُٹھانا چاہتے تھے کہ انہوں نے اسلام کے خلاف جو شعبدہ بازی کی طرح کی مہم چلا رکھی تھی اسے بے خوف و خطر اور تیز کر دیں۔ ہندو عیارانہ چالوں میں ہمیشہ تیز اور دانشمند رہا ہے۔ ہندوؤں میں پنڈت بھجنوں کے ساتھ ہندوؤں کو بتاتے تھے کہ گئو ماتا جتنی مقدس ہے، مسلمان اتنا ہی ناپاک ہے اور اسلام کا خاتمہ دھرم کا فرض ہے۔ پنڈتوں نے مسلمان کے قتل کو ایک نیکی اور مذہبی فریضہ قرار دے رکھا تھا۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے ہندوستان

سے اسلام کے خلاف کو آج بھی مذہبی فریضہ سمجھا جاتا ہے۔ آج بھی ہندو اسلام کو نقصان پہنچانے کے لیے اپنی بیٹی کی عصمت قربان کر دیا کرتا ہے۔

مہاراجہ نندہ رائے کالنجر کے قلعے میں اپنے تخریب کاروں کے استاد ہدایت کار سے یہ رپورٹ سن رہا تھا کہ اُس نے لوگوں کو بجلی کی چمک اور حسین لڑکیوں کو چڑیلیں اور بدروحیں بنا کر دکھانے اور افواہ بازی کی جو مہم شروع کی تھی وہ بے نقاب ہو گئی ہے اور غزنی کے فوجیوں نے ہمارے دو آدمیوں اور تین لڑکیوں کو سامان سمیت پکڑ لیا ہے۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ مسلمان فوجی ان آدمیوں اور لڑکیوں کو ہر گاؤں میں لے جاتے اور لوگوں کو دکھاتے ہیں کہ یہ ہے بجلی کی چمک اور چڑیلوں کی حقیقت۔

ازمیر نے جن آدمیوں اور لڑکیوں کو گرفتار کیا تھا، اُن سے اس وعدے پر اُن کے ساتھیوں کے متعلق پوچھ لیا تھا کہ وہ اُن کی جان بخشی کر کے انہیں رہا بھی کر دے گا۔ اُس نے جس طرح انہیں پکڑا تھا، اسی طرح اُس نے اُن کی نشاندہی پر اُن کے ساتھیوں کو پکڑ لیا۔ اُن کے پاس بھی یہی سامان تھا لیکن اُن کے ساتھ کوئی لڑکی نہیں تھی۔ وہ زیادہ آدمی تھے۔ وہ گاؤں گاؤں جا کر افواہیں پھیلاتے اور لوگوں کو ڈراتے تھے۔

ایک روز ازمیر نے یہ انتظام کیا کہ دو تین گاؤں کے لوگوں کو ایک جگہ جمع کر لیا اور اُن کے سامنے ان افواہ بازوں کو کھڑا کر کے انہیں کہا کہ وہ لوگوں کو بتائیں کہ وہ جو کچھ کہتے رہے ہیں وہ سب جھوٹ اور دھوکہ تھا۔ بہت سے لوگوں نے ان آدمیوں کو پہچان لیا۔ ان آدمیوں نے لوگوں کو اپنی اصلیت بتا دی۔ پھر شام کے بعد ازمیر نے لوگوں کو بجلی کی چمک بھی دکھائی اور تینوں لڑکیوں کو نیم برہنہ کر کے ایک پہاڑی کی ڈھلان پر کھڑا کر کے دُور اوپر سے اُن پر آئینہ نما تختے سے روشنی ڈلوائی، پھر لڑکیوں کو اسی نیم برہنہ حالت میں نیچے بلا کر لوگوں کے سامنے کھڑا کر دیا۔

مہاراجہ نندہ کو جب پتہ چلا کہ اُن کی مہم ناکام اور بے نقاب ہو گئی ہے تو اُس نے یہ حکم دے دیا کہ اس علاقے میں جو مسلمان امام اور استاد لوگوں کو اسلامی طریقے اور عبادت سکھا رہے ہیں، انہیں اس طرح غائب کر کے قتل کر دیا جائے کہ کسی کو ان کا سراغ نہ ملے۔ غزنی کی فوجی چوکیوں میں جو فوجی ہیں، انہیں بھی اکیلے دکیلے غائب کرنا شروع کر دیا جائے۔

ازمیر ایک رات اپنی چوکی میں اپنے کمرے میں اکیلا تھا۔ ایک کمرے میں اُس نے ان ہندو مردوں اور لڑکیوں کو قید کر رکھا تھا جو لوگوں کو فریب دیتے اور نظریاتی تخریب کاری کرتے پھر رہے تھے۔ ان پر اُس نے پہرہ کھڑا کر رکھا تھا۔ اُس نے انہیں کہہ دیا تھا کہ کل وہ مردوں کو بالناتھ بھیج دے گا جہاں اُن کی قسمت کا فیصلہ ساروگ کرے گا اور لڑکیوں کو سپاہیوں کی حفاظت میں کالنجر بھیج دیا جائے گا۔

ایک سپاہی نے اُسے آ کر بتایا کہ ایک لڑکی اُس سے ملنا چاہتی ہے۔ اُس نے لڑکی کو بلایا۔ یہ وہی لڑکی تھی جسے اُس نے ریچھ سے بچایا تھا۔

"کیا تم آج رات بھی مجھے اپنے پاس نہیں بلاؤ گے؟" لڑکی نے اُس سے پوچھا — "یہ میری خواہش ہے۔"

ازمیر کی ہنسی نکل گئی۔ اُس نے کہا — "مجھے احساس ہے کہ تم غیر معمولی طور پر خوبصورت لڑکی ہو۔ شاید میں نے اتنی خوبصورت لڑکی کبھی نہیں دیکھی۔ میں تمہاری حیرت کو بھی سمجھتا ہوں کہ مجھ جیسا جوان فوجی جو اتنی مدت سے گھر سے دُور جنگلوں میں موت کے سائے میں پڑا ہے، تم جیسی حسین لڑکی کی طرف وہ توجہ کیوں نہیں دیتا جس کی تمہیں توقع ہے۔ اگر تم مسلمان ہوتیں، اگر تم پر یہ فرض عائد ہوتا جو مجھے سونپا گیا ہے اور اگر تم ایمان کا مطلب سمجھ سکتیں تو تمہیں حیرت نہ ہوتی۔ تمہاری نظر جسم پر ہے۔ یہ تمہارا مذہب ہے۔ میری نظر رُوح پر ہے۔ یہ میرا مذہب ہے۔"

"اگر میں تمہاری خاطر تمہارا مذہب قبول کر لوں تو؟"

"ناگن کا زہر نکال دو تو بھی وہ ناگن ہی رہے گی۔" ازمیر نے کہا — "اُسے شہد کھلاتے رہو تو بھی اُس میں زہر بنے گا اور ناگن ڈس لے گی۔ یہ اس کی فطرت ہے.... میں یہاں عشق بازی اور شادی کرنے نہیں آیا۔ مجھے تمہارے جسم کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں۔ یہ میری طاقت ہے کہ میری نگاہ نہ اپنے جسم پر پڑتی ہے نہ تم جیسی کسی حسینہ کے جسم پر.... اور لڑکی! میرے مذہب کا حکم ہے کہ دشمن کی عورت تمہاری قید میں ہو تو اُس کی مجبوری سے فائدہ اُٹھانا گناہ ہے۔ اُسے الگ رکھو۔"

لڑکی کے آنسو نکل آئے اور وہ ازمیر کی چارپائی پر اُس کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ اُس نے ایک بازو ازمیر کے گلے میں ڈال دیا اور اُس کے اتنی قریب ہو گئی کہ اُس کے بکھرے بکھرے ریشمی بال ازمیر کے گالوں سے مس کرنے لگے۔

"تم نے مجھے ریچھ سے بچایا ہے" لڑکی نے کہا۔ "اب تم مجھے رہا کر کے حفاظت سے واپس بھیج رہے ہو اور ہم تین لڑکیاں اتنے دنوں سے تمہارے پاس تمہارے رحم و کرم پر ہیں مگر تم ہمارے لیے پتھر بنے رہے ....."

لڑکی بولتے بولتے چپ ہو گئی۔ اُس نے ازمیر کا چہرہ اپنی طرف گھمایا۔ اُس کے چہرے پر درد کے آثار بڑے صاف تھے۔

"مجھے خون کی بُو آ رہی ہے" لڑکی نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تم مجھے تکلیف میں معلوم ہوتے ہو۔ ازمیر! کیا تم زخمی ہو؟"

ازمیر نے بایاں ہاتھ اوپر کیا۔ اس ہاتھ میں خنجر تھا خنجر کی نوک خون آلود تھی لڑکی اُس کے دائیں طرف بیٹھی تھی۔ وہ دیکھ نہیں سکی تھی کہ جب وہ اُس کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی تھی تو ازمیر نے اپنے سرہانے کے نیچے سے خنجر نکال کر اس کی نوک اپنے ننگے پاؤں کے اوپر والے حصے میں اُتار دی تھی اور نوک کو دبا رہا تھا۔ لڑکی نے خون آلود خنجر دیکھا تو جھک کر ازمیر کے سامنے آ گئی۔ اُسے ازمیر کا زخمی پاؤں نظر آ گیا جس سے خون نکل رہا تھا۔ لڑکی نے اُسے حیران ہو کر دیکھا۔

"حیران نہ ہو لڑکی!" ازمیر نے کہا۔ "میں فرشتہ نہیں، انسان ہوں اور جوان آدمی ہوں۔ تمہارے جسم کے لمس نے میرے ذہن سے میرا فرض اُتارنا شروع کر دیا تھا۔ میں سلطان کے آگے جوابدہ نہیں بلکہ خدا کے آگے جوابدہ ہوں۔ یہاں مسئلہ مہاراجوں اور سلطانوں کی فتح و شکست کا نہیں۔ یہاں تمہارے اور میرے مذہب کی ٹکر ہے۔ میں اپنے مذہبی اصولوں کو تمہارے حسن پر قربان نہیں کر سکتا اور میں اپنے اوپر جبر بھی نہیں کر سکتا۔ اپنی توجہ تم سے ہٹانے کے لیے خنجر کی نوک اپنے پاؤں میں اُتار لی تھی .... جاؤ، تم چلی جاؤ۔"

لڑکی نے اُس کا ایک ہاتھ تھاما اور اپنی آنکھوں سے لگایا پھر اُس کا ہاتھ چوم لیا۔ وہ کچھ دیر ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ لڑکی اچانک گھومی اور کمرے سے نکل گئی۔

اگلی صبح ازمیر نے تینوں لڑکیوں کو گھوڑوں پر بٹھایا۔ آٹھ دس سوار ساتھ لیے اور کالنجر کی طرف روانہ ہو گیا۔ لڑکی اپنا گھوڑا بار بار ازمیر کے گھوڑے کے قریب لے آتی تھی مگر ازمیر سوائے مسکرانے کے اُس کے ساتھ کوئی بات نہیں کرتا تھا۔

آدھی رات کے قریب وہ کالنجر کے دروازے پر پہنچے۔ ازمیر نے لڑکیوں کو گھوڑوں سے اُتارا اور واپس ہونے لگا۔

"میں تمہارے احسان کا صلہ نہیں دے سکی" لڑکی نے کہا۔ "مجھے ساری عمر افسوس رہے گا۔ اپنے آپ کے سوا میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔"

"صلہ خدا دے گا" ازمیر نے کہا۔ "اپنے راجہ سے کہنا کہ مردوں کی طرح میدان میں آئے۔ عورتیں جنگ نہیں جیت سکتیں۔"

وہ اپنے سپاہیوں کے ساتھ واپس آ رہا تھا تو اُس کی روح بھی مسرور تھی۔ خدا نے اُسے اپنا نور دکھایا تھا وہ خدا کے سامنے سرخرو تھا۔ اُس نے اپنا فرض خوش اسلوبی سے اور جنگجوؤں کی طرح ادا کر دیا تھا۔

نائب سالار سارونگ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ابھی تک وادیوں میں بھٹک رہا تھا۔ اگر وہاں پھلدار درخت اور پانی کی افراط نہ ہوتی تو وہ اب تک زندہ نہ رہتے۔

پہلے لوہ کوٹ کے قلعہ دار کو اطلاع دی گئی کہ بالناتھ کے قلعہ دار سارونگ کو اُس کے محافظوں اور ایک لام کے ساتھ فلاں علاقے میں چھوڑ دیا گیا ہے۔ قلعہ دار نے یہ اطلاع کالنجر کے راجہ نندا رائے کو دی۔ نندا رائے نے حکم دیا کہ انہیں گرفتار کر کے قلعے میں لایا جائے۔ اس سے پہلے اُس کا یہ حکم تھا کہ کسی مسلمان فوجی کو قتل نہ کیا جائے۔ اس کی بجائے انہیں غائب کیا جائے۔ اب جب اُسے یہ پتہ چلا کہ اسلام کے خلاف اُس نے جو مہم شروع کرائی تھی، وہ ناکام ہو گئی ہے اور تینوں لڑکیاں واپس آ گئی اور تمام آدمی سلطان محمود کے فوجیوں کی قید میں ہیں تو اُس نے حکم دیا کہ سارونگ اور اس کے ساتھیوں کو ڈھونڈو۔ وہ زندہ مل جائیں تو انہیں یہاں لے آؤ۔

بہت دنوں بعد ایک اور چوکی کا ایک سپاہی ازمیر کے پاس آیا اور اپنی چوکی کے

اور وہ دونوں گناہگار ہمیں لوٹ کر بھاگ گئے ہیں۔ ان کا انجام بھیانک ہوگا۔ ہمارے دلوں میں اللہ کی خوشنودی رہی تو یہ پتھر بھی ہمیں پانی دیں گے۔"

اور پتھروں نے انہیں پانی دیا۔ آدھی رات گزر گئی تھی۔ چاند اوپر آگیا تھا۔ گھوڑے اپنی چال چلے جا رہے تھے۔ دائیں طرف ایک وادی راستے سے آملتی تھی۔ وہاں جاکر دونوں گھوڑے رک گئے۔ لگامیں جھٹکنے پر بھی نہ چلے۔ عمران نے گھوڑوں کے منہ دیکھے۔ دونوں گھوڑے نتھنے پھلا رہے تھے اور دونوں وادی کی طرف دیکھتے تھے۔ دونوں آہستہ سے ہنہناتے اور وادی کی طرف چل پڑے۔

"اتر آؤ رشی" — عمران نے گھوڑے کے پہلو میں جاکر رشی کو اپنی باہوں میں سے کر اتارا اور کہا — "انہوں نے پانی کی مُشک لے لی ہے۔ پانی قریب ہی ہوگا۔"

دوسرے گھوڑے پر نظام اورزینی سوار تھا۔ وہ بھی اُتر آیا۔ دونوں گھوڑے وادی کے اندر دوڑ پڑے۔ قدرت نے جانوروں کو یہ وصف عطا کر رکھا ہے کہ پانی کی بُو دور سے سونگھ لیتے ہیں۔ بعض چھوٹے چھوٹے جانور اور پرندے بارش سے بہت پہلے محسوس کر لیتے ہیں کہ بارش برسے گی۔ ان دونوں گھوڑوں نے پانی کی مُشک لے لی تھی۔ عمران نے پہلے ہی اپنے ساتھیوں کو بتا رکھا تھا کہ اس خشک پہاڑی خطے میں کہیں کہیں پانی مل جاتا ہے۔

گھوڑے دوڑتے گئے۔ عمران بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ گھوڑوں کے پیچھے گیا۔ کچھ دور جاکر گھوڑے رک گئے۔ وہاں پہاڑ کا دامن ایک وسیع اور بلند غار کی طرح کٹا ہوا تھا۔ چاندنی میں وہاں پانی صاف نظر آرہا تھا۔ وہاں شاید چشمہ تھا۔ گھوڑے پانی پی رہے تھے۔ پانی کی وجہ سے وہاں تھوڑی سی گھاس بھی تھی۔ گھوڑے پانی پی کر گھاس کھانے لگے۔ ان کے سوار بیٹھ گئے تاکہ گھوڑے سیر ہو جائیں۔

اُس وقت قاسم بلخی اور ناظر غزنی کی سمت جا رہے تھے مگر وہ جا کہیں بھی نہیں رہے تھے۔ وادیوں میں بھٹک رہے تھے۔ بلخی غزنی کے عام راستے پر جاتے ڈرتا تھا۔ اُسے توقع تھی کہ پہاڑیوں کے اندر اندر سے وہ لمغان میں نکل جائے گا مگر یہ وادیاں ایسی تھیں

راج محل کے ناچنے گانے والیاں اور دیگر عورتیں رہتی تھیں۔ جب یہ خبر اُس لڑکی کے کانوں میں پڑی جسے ازمیر نے ریچھ سے بچایا تھا تو وہ باہر نکل آئی۔ وہ بھی مسلمان فوجیوں کی قید میں رہ چکی تھی، اس لیے اُسے ان قیدیوں میں دلچسپی پیدا ہوگئی۔ تینوں قیدیوں کو ایک درخت تلے بٹھا دیا گیا تھا۔ لڑکی نے قریب آکر دیکھا۔ ان میں ازمیر بھی تھا۔

لڑکی ہندو فوجیوں کے کمانڈر کو الگ لے گئی اور اُسے کہا کہ وہ ازمیر کو چھوڑ دے۔ اُس نے اپنے کمانڈر کو بتایا کہ اس آدمی نے اُس کی جان بچائی تھی اور اُس نے اس کا صلہ قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ہندو کمانڈر ازمیر کو رہا کرنے پر آمادہ نہ ہُوا۔ لڑکی نے اُسے کہا کہ وہ منہ مانگا انعام دے گی اور ازمیر کو اس طرح قلعے سے نکالے گی کہ کسی کو پتہ نہیں چل سکے گا۔

یہ لڑکی اپنا جادو چلانے کی ماہر تھی۔ ہندو کمانڈر کو اُس نے رام کر لیا۔ اس کے عوض لڑکی نے جو انعام پیش کیا، اُسے وہ تصور میں کبھی نہیں لاسکتا تھا۔

قیدیوں کو ابھی کسی کے سامنے پیش نہیں کیا گیا تھا۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ قیدیوں کو اب قیدخانے میں بند کرنا تھا۔ لڑکی ازمیر کو ایک ایسی جگہ لے گئی جہاں پودوں اور جھاڑیوں کی اوٹ تھی۔ اندھیرا ابھی گہرا ہو رہا تھا۔ لڑکی دوڑی گئی اور کچھ کپڑے اُٹھا لائی۔

"آج مجھے سکون نصیب ہُوا ہے" — لڑکی نے ازمیر سے کہا — "میں تمہارے احسان کا صلہ دے رہی ہوں۔ جاتے جاتے ایک اور خبر سُن لو۔ یہاں دو اور مہاراجوں کی فوج آرہی ہے۔ ایک فوج لاہور کی ہے۔ راجہ بھیم پال خود ساتھ آرہا ہے۔ ان کے آتے ہی مہاراجہ نندہ رائے سلطان محمود کو پیغام بھیجے گا کہ وہ اس کا باجگزار نہیں۔ اگر اس میں ہمت ہے تو خود آکر باج وصول کرے۔ میں تمہیں یہ اطلاع اس لیے دے رہی ہوں کہ اس کے فوراً بعد تمہاری چوکیوں پر حملے ہوں گے۔ مجھے صرف تمہاری ذات کے ساتھ دلچسپی ہے۔ تمہاری تعداد بہت تھوڑی ہے۔ تم مارے جاؤ گے یا پکڑے جاؤ گے۔ پھر میں تمہیں چھڑا نہیں سکوں گی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ تم اپنی چوکی سے چلے جاؤ؟"

ازمیر ہنس پڑا۔ اُس نے لڑکی کا شکریہ ادا کیا۔ وہ اُس کے لائے ہوئے کپڑے

پہنچ چکا تھا۔

قلعے کے دروازے بند ہو چکے تھے۔ اندر سے ایک گھوڑا دروازے پر آ کر رکا۔ گھوڑے پر بڑھے ہوئے پیٹ والا ایک پنڈت سوار تھا۔ اُس کے سر پر پھندنوں والی پگڑی تھی۔ اُس کے ساتھ لڑکی تھی۔ اُس نے قلعے کے دروازے کے انچارج سے کہا کہ پنڈت جی مہاراج ہمارے پاس آئے تھے۔ یہ اب ساتھ والے گاؤں میں جا رہے ہیں۔ وہاں کوئی آدمی مر گیا ہے۔ مجھے کہا گیا ہے کہ ان کے لیے دروازہ کھلوا دوں۔

وہ راج محل کی لڑکی تھی۔ سب جانتے تھے کہ اس لڑکی کی کیا اہمیت ہے۔ اُس کے کہنے پر دروازہ کھول دیا گیا اور پنڈت جی مہاراج نکل گئے۔ اُن کے پیچھے دروازہ بند ہو گیا۔ ازمیر نے گھوڑا دوڑایا نہیں۔ آہستہ آہستہ چلتا گیا۔ قلعے سے دُور جا کر اُس نے کُرتے کے اندر ٹھونسے ہوئے وہ کپڑے نکال کر پھینک دیئے جو اُس کا پیٹ بڑھا ہوا دکھانے کے لیے ٹھونسے گئے تھے۔ اُس نے پگڑی بھی اتار پھینکی اور گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔

اگلے دن کے پچھلے پہر وہ اپنی چوکی میں پہنچ گیا۔ نائب سالار سارنگ، امام اور دیگر تمام افراد جو جوگیاں بالناتھ سے چلے اور تخریب کار نے انہیں ویرانے میں گمراہ کر دیا تھا اب ازمیر کی چوکی میں پہنچ چکے تھے کیونکہ یہ چوکی اُس جگہ کے ذرا نزدیک تھی جہاں معرکہ لڑ کر انہیں چھڑایا گیا تھا۔

"تم کہاں تھے اور کس طرح آ گئے ہو؟" ـــ سارنگ نے ازمیر سے پوچھا۔

"جو بات سب سے زیادہ ضروری ہے پہلے وہ سُن لیں" ـــ ازمیر نے کہا۔ "یہاں کے حالات بہت خراب ہو گئے ہیں۔ میں کالنجر قلعے سے کسی کی مدد سے فرار ہو کر آ رہا ہوں۔ کالنجر کے مہاراجہ نے اس علاقے میں اسلام کے خلاف جو تخریب کاری کرائی ہے، وہ آپ نے دیکھ لی ہے۔ یہ اللہ کا بڑا کرم ہے کہ کفار کا وار خالی گیا ہے۔ آپ کو گرفتار کر کے کالنجر لے جانا اس امر کی دلیل ہے کہ مہاراجہ کالنجر اور یہاں کے چھوٹے چھوٹے راجے اور رائے ہمارے باجگزار نہیں رہنا چاہتے اور وہ ہمارے خلاف جنگی تیاریاں کر رہے ہیں۔ مجھے قلعے میں پتہ چلا ہے کہ کالنجر میں ان لوگوں کی فوجیں اکٹھی ہو رہی ہیں اور لاہور کا

مہاراجہ بھیم پال بھی آ رہا ہے۔ غالباً متحدہ افواج کی کمان وہ اپنے ہاتھ میں رکھے گا۔ یہ مہاراجے سب سے پہلے سلطان کو پیغام بھیجیں گے کہ وہ اُس کے باجگزار نہیں۔ اگر سلطان میں اتنی ہمت ہے تو خود آ کر باج وصول کرے۔ اس کے بعد ہماری چوکیوں کو صاف کیا جائے گا۔"

"ایسا ہونا ہی تھا" ـــ سارنگ نے کہا۔ "دشمن کو اپنی شکست کا انتقام لینا ہی چاہیے اور پھر ہندو ایسا دشمن ہے جو شکست کو اپنے سامنے دیکھتا ہے تو تلوار تمہارے قدموں میں رکھ کر بیٹھ جاتا ہے، مظلوم اور بھکاری بن جاتا ہے۔ اگر اسے کہو کہ اپنی تمام بیٹیاں اور بہنیں ہمارے حوالے کر دو تو فوراً حوالے کر دے گا مگر تمہاری تلوار کے نیچے سے نکلتے ہی سانپ بن جائے گا اور اُس کی ساری سوچیں اور ساری کوششیں اس پر مرکوز رہیں گی کہ وہ کس طرح اور کتنی جلدی تمہیں ڈنک مارے۔ ہندو کے ساتھ ہماری جنگ زمین کے لیے نہیں، یہ مذہبی جنگ ہے جو اُس وقت تک لڑی جاتی رہے گی جب تک ہندوستان میں ایک بھی مسلمان یا ایک بھی ہندو زندہ رہے گا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہندو ہم پر کب حملہ کرتا ہے۔"

"میں عرض کر رہا ہوں کہ ہمیں دیکھتے نہیں رہنا" ـــ ازمیر نے کہا۔ "ہمیں آج ہی ایک قاصد غزنی کو روانہ کرنا ہے۔ دشمن کے ارادوں اور اُس کی طاقت کے متعلق کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہنا چاہیے۔ آپ کے پاس اتنی نفری نہیں کہ آپ حملہ روک سکیں۔"

اُسی وقت دو قاصد تیار کر کے انہیں پیغام دیا گیا اور انہیں کہا گیا کہ وہ کم سے کم رکیں اور راستے کی چوکیوں سے گھوڑے بدلتے جائیں۔

قاصد توقع سے زیادہ تیز گئے۔ سلطان محمود نے اپنی فوج کو برق رفتاری کی بڑی سخت ٹریننگ دے رکھی تھی اور اپنے سپاہیوں کے ذہن میں یہ ڈال رکھا تھا کہ چند لمحوں کی تاخیر شکست کا باعث بن سکتی ہے۔ اس ٹریننگ کا نتیجہ تھا کہ قاصد متوقع وقت سے پہلے پہنچ گئے۔ وہ جب سلطان محمود کو کشمیر کے حالات اور دشمن کے ارادے سنا رہے تھے، اُن کے سر ڈول رہے تھے اور آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔

ایک انگریز تاریخ دان سر ہنری ہوورتھ نے اپنے ایک مقالے میں (۱۸۹۸ء میں)

سلطان محمود کے دور کے ایک وقائع نگار ابن اسفندیار کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ پہلا موقع تھا کہ سلطان نے اپنے سالاروں اور دیگر کمانڈروں کو مقصد اور پروگرام بتائے بغیر نہایت عجلت میں کوچ کا حکم دے دیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ اسلام کے معاملے میں جذباتی تھا۔ اُس نے جب سنا کہ وہ جنوبی کشمیر میں جو اسلام رائج کر آیا تھا مگر ہندوؤں نے اس کے خلاف پُراسرار اور زمین دوز تخریبی کارروائیاں کیں اور نائب سالار رسادگ اور اُس کے ہمسفروں کو گرفتار کیا تو سلطان ایسے غصے میں آگیا جس پر وہ قابو نہ پا سکا۔

سر سڑی ہوورتھ نے اپنے مقالے میں لکھا ہے کہ سلطان نے یہ بھی نہ سوچا کہ وہ کشمیر جا رہا ہے اور اُس کے وہاں پہنچنے تک برفباری شروع ہو چکی ہوگی جو شکست کا باعث بھی بن سکتی ہے۔

ایک اور وقائع نگار محمد حیدر گرگانی بن محمد حسین نے اپنی تصنیف "تاریخ راشدی" (انگریزی ترجمہ سر ای ڈینی سن راس) میں بھی ایسی ہی رائے کا اظہار کیا ہے اور لکھا ہے کہ سلطان نے غالباً پہلی فتوحات کے زعم میں پلاننگ کے بغیر ایسے میدانِ جنگ کی طرف کوچ کا حکم دے دیا جس کی دشواریوں، مستور خطروں اور موسمی حالات سے وہ پوری طرح واقف نہیں تھا۔

اُس نے کچھ فوج پشاور سے اپنے ساتھ لی اور حسبِ معمول اتنی تیزی سے کشمیر پہنچ گیا جس پر تاریخ دان بھی حیرت کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ جنوری ۱۰۲۱ء (۴۱۲ ہجری) کے پہلے ہفتے میں کشمیر پہنچا تھا۔ پہاڑوں پر اور وادیوں میں برف کی چادر بچھ چکی تھی جنگل کے پیڑ بھی برف سے لد گئے تھے۔ سلطان کو یہ انٹیلی جنس رپورٹ ملی کہ مہاراجہ نندہ رائے اور بھیم پال بجائے کالنجر کی بجائے قلعہ لوہ کوٹ میں ہیں۔ لہٰذا کالنجر پر وقت ضائع کرنے کی بجائے لوہ کوٹ کو محاصرے میں لیا جاتے۔ یہ قلعہ سر ہو گیا تو کالنجر بغیر محاصرے کے مل جائے گا۔

اُدھر لوہ کوٹ میں مہاراجوں کو اطلاع مل کہ سلطان محمود آ گیا ہے۔ مہاراجہ نندہ رائے نے اپنے جاسوسی اور تخریب کاری کے نظام کے سربراہ کو بلا کر کہا کہ ان آدمیوں کو لے آؤ۔ تھوڑی دیر میں اُس کے سامنے دس بارہ آدمی کھڑے کر دیئے گئے۔

"کیا انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ کرنا کیا ہے؟" — نندہ رائے نے ان سے پوچھا۔

سب نے بلند آواز سے کہا "معلوم ہے مہاراج!" — اور ان میں سے ایک نے کہا — "ہم اس علاقے کے رہنے والے مسلمان ہیں۔ ہم اس علاقے کے لباس میں سلطان محمود کے پاس جائیں گے۔ اُسے بتائیں گے کہ ہم مسلمان ہیں اور اُس کی رہنمائی کے لیے آئے ہیں کیونکہ برف نے راستے بند کر دیئے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ لوہ کوٹ تک کس راستے سے پہنچا جا سکتا ہے۔ ہم اسلام کے شیدائیوں کی طرح باتیں کریں گے۔ ہم نے نماز اور کلمے زبانی یاد کر لیے ہیں۔"

"شاباش!" — نندہ رائے نے کہا — "اُسے لوہ کوٹ تک لے آنا۔ ہمیں پوری اُمید ہے کہ اُسے یہاں سے پسپا ہونا پڑے گا۔ اُسے تم ہی واپس لے جاؤ گے۔ واپسی کے سفر میں تم اپنی اسواری رکھنا۔"

یہ دس بارہ آدمی ہندو تھے اور تربیت یافتہ تخریب کار۔ انہوں نے مسلمانوں کی طرح چھوٹی چھوٹی داڑھیاں رکھی تھیں اور لباس بھی بدل لیے تھے۔

سلطان محمود نے لوہ کوٹ کی طرف پیش قدمی کا حکم دے دیا۔ اُس دور میں یہ رواج تھا کہ حملہ آور کسی اجنبی علاقے میں جاتے تو وہاں کے گائیڈ اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ پہاڑی علاقوں میں گائیڈوں کی ضرورت زیادہ شدید ہوتی تھی۔ سلطان محمود کی فوج کی جو چوکیاں پہلے سے موجود تھیں، انہوں نے مخبروں اور گائیڈوں کا انتظام کر رکھا تھا۔ سلطان نے پیش قدمی کی تو راستے میں اُسے دس بارہ آدمی ملے جنہوں نے جوشیلے اور جذباتی انداز سے راہنمائی کی پیشکش کی۔ انہوں نے چونکہ کہا تھا کہ وہ اس علاقے کے مسلمان ہیں اور وہ یہاں کے مہاراجوں سے اُس سلوک کا انتقام لینا چاہتے ہیں جو انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ روا رکھا تھا، اس لیے سلطان نے انہیں اپنی فوج کے سالاروں میں تقسیم کر دیا۔

سلطان محمود نے لوہ کوٹ کے متعلق بہت کچھ سنا تھا لیکن اُسے جب قلعہ نظر آیا تو اُس نے محسوس کیا کہ اسے بہت کم بتایا گیا ہے۔ وہ قلعے سر کرنے کا ماہر تھا لیکن لوہ کوٹ کا قلعہ دیکھ کر اُس نے اپنے آپ میں دھچکہ سا محسوس کیا۔ اس قلعے کو بجا طور پر ناقابلِ تسخیر کہا جاتا تھا۔ تمام مؤرخوں نے اسے ناقابلِ تسخیر لکھا ہے۔ یہ پہاڑی پر تعمیر کیا گیا تھا لیکن

تو یہ بلندی اس کی تسخیر میں حائل تھی۔ اس کی دیواریں پتھروں اور مٹی کی تھیں اور بہت چوڑی اور اس کے کئی برج تھے جہاں سے محاصرہ کرنے والی فوج کو نہایت آسانی سے تیروں کی زد میں لیا جا سکتا تھا۔ دیواروں میں نقب لگانے والے ماہر اور بے حد دلیر نقب زن بھی یہاں بے بس تھے۔ قلعے کے دروازوں کے باہر ایسی ڈھلانیں تھیں کہ ہاتھیوں کی ٹکروں سے یا بڑے بڑے شہتیر بیلوں کے ساتھ باندھ کر ان سے بھی دروازے نہیں توڑے جا سکتے تھے۔

سلطان محمود نے قلعے کو دیکھا تو اپنی فوج کو روک کر کھڑا کر لیا۔ خود گھوڑے پر سوار ذرا بلندی پر چلا گیا اور بڑی بلند آواز سے اُس نے اپنی فوج کا حوصلہ بلند کرنے کے لیے کہا — "اللہ کے سپاہیو! آج تم سلطنتِ غزنی کی خاطر نہیں، اپنے اللہ اور رسولؐ کی خاطر لڑو گے۔ ہم نے یہاں کے بچے بچے کو مسلمان کر دیا تھا مگر یہاں کے کفار نے یہاں کی غریب اور مجبور مخلوق کو صرف اس لیے ظلم کا نشانہ بنائے رکھا کہ یہ مسلمان ہو گئی ہے۔ آج تمہیں یہاں انہی کفار کے خون سے اسلام کی قندیل روشن کرنی ہے .... وہ قلعہ نظر آ رہا ہے۔ برف میں ڈھکا ہوا یہ قلعہ تمہیں للکار رہا ہے۔ یہاں کا موسم تمہیں للکار رہا ہے۔ تم میدانوں اور ریگستانوں میں لڑے ہو۔ آج ثابت کر دو کہ زمین و آسمان جم جائیں مگر مسلمان کی رگوں میں خون گرم رہتا ہے اور ایمان کی حرارت برف کے پہاڑ پگھلا دیا کرتی ہے۔ ہم بہت دور سے آئے ہیں۔ ہم خدا کا پیغام لے کر آئے ہیں۔ قسمیں کھاؤ کہ اس قلعے پر اسلام کا پرچم لہراؤ گے ورنہ واپس نہیں جاؤ گے۔"

سلطان محمود نے ایسی تقریر کبھی نہیں کی تھی۔ وہ سپاہیوں تک جوشیلے پیغام اُن کے کمانڈروں کے ذریعے پہنچایا کرتا تھا۔ اُس نے فوج کو ٹریننگ دے رکھی تھی۔ اس کے سامنے جذباتی تقریریں کوئی معنی نہیں رکھتی تھیں لیکن اُسے لوہ کوٹ کا قلعہ اور موسم نظر آ رہا تھا۔ مورخ لکھتے ہیں کہ عزم کا اس قدر پکا سلطان خود اعتمادی سے دبنگ آواز میں بولنے والا جس کے چہرے پر خوف اور گھبراہٹ کبھی نہیں دیکھی گئی تھی، اُس وقت جانے کیسی ذہنی کیفیت میں تھا کہ اس کی آواز میں لرزہ تھا اور کبھی تو وہ چپ ہو جاتا تھا جیسے موزوں الفاظ ڈھونڈ رہا ہو۔

اور یہ پہلا موقع تھا کہ اُس نے گھوڑے سے اُتر کر دو رکعت نفل نہ پڑھے اور یہ بھی نہ کہا (جیسے وہ اکثر کہا کرتا تھا) کہ مجھے اللہ کا اشارہ مل گیا ہے۔ فتح ہماری ہو گی۔ اُس نے گھوڑے کی لگام کو جھٹکا دیا اور گھوڑا نیچے اُتار لیا۔

اللہ اکبر کے نعرے لوہ کوٹ کے اردگرد گرجنے لگے۔ قلعہ جس پہاڑی پر کھڑا تھا اس سے بہت کر ٹیکریاں اور اونچی نیچی چٹانیں تھیں۔ ان پر درخت تھے لیکن قلعے والی پہاڑی کی ڈھلان سے تمام درخت کٹوا دیئے گئے تھے۔ اس پہاڑی کے دامن اور اردگرد کی چٹانوں کے دامن میں کچھ فاصلہ تھا۔ سلطان محمود نے قلعے کے گرد گھوم کر جائزہ لیا۔ قلعے کی دیواروں اور برجوں سے ہندو اُسے للکار رہے تھے اور طعن بھی کر رہے تھے۔ ایک وقائع نگار نے لکھا ہے کہ فارسی کا ایک نعرہ بار بار سنائی دیتا تھا — "سلطان غزنی! تمہارے خدا نے تمہاری قسمت میں برف کی قبر لکھ دی ہے۔"

سلطان نے اردگرد کی چٹانوں پر تیر انداز چڑھا کر دیواروں پر تیر برسائے اور ان کے سائے میں نقب زنوں کو اس کام کے لیے آگے کیا کہ وہ قلعے والی پہاڑی میں سرنگ کھود دیں۔ اُسے معلوم تھا کہ کشمیر کی پہاڑیاں پتھریلی نہیں۔ ان میں مٹی زیادہ ہوتی ہے۔ لہٰذا کھدائی آسان تھی۔ سلطان نے یہ بھی سوچا تھا کہ سرنگ چند گز کھودی گئی تو کھودنے والے اس کے اندر تیروں سے محفوظ ہو جائیں گے اور کھودتے چلے جائیں گے۔

نقب زنوں نے سرنگیں کھودنے کے لیے ہلہ بولا لیکن ان میں سے ایک بھی زندہ نہ رہا۔ اُوپر سے تیر صحیح معنوں میں موسلادھار بارش کی طرح آئے اور تمام نقب زن وہیں ختم ہو گئے۔ اردگرد کی چٹانوں سے دیواروں پر جو تیر چلائے جاتے تھے وہ بلندی کی وجہ سے کوئی نقصان نہیں کرتے تھے۔

چند ایک سپاہیوں نے دلیری کا یہ بے مثال مظاہرہ بھی کیا کہ وہ دروازہ توڑنے کا سامان اور آگ لگانے والی اشیا کے ساتھ قلعے کے دروازے کی طرف دوڑے مگر دروازے کے نیچے ڈھلان پر برف پڑی ہوئی تھی۔ سپاہی اُوپر چڑھتے پھسلتے تھے۔ اوپر سے تیروں کی بوچھاڑیں آئیں اور سب کی لاشیں لڑھکتی ہوئی نیچے آئیں۔

دوسرے دروازوں پر بھی ایسے ہی حملے ہوتے گئے۔ صرف ایک دروازے تک چند ایک سپاہی پہنچ سکے اور انہوں نے کلہاڑوں سے دروازہ توڑنا شروع کیا مگر اوپر سے ان پر جلتی ہوئی لکڑیاں اور دہکتے ہوئے انگارے انڈیل دیئے گئے۔ سپاہیوں کے کپڑوں کو آگ لگ گئی۔ ان کے جسم جھلس گئے۔

علبی، گردیزی، ابن الاثیر اور دو یورپی مورخوں نے لکھا ہے کہ رات کو بھی سلطان کے نقب زن حیش قلعے کی پہاڑی کی ڈھلان میں سرنگیں کھودنے کی کوشش کرتے رہے۔ صبح سلطان نے دیکھا کہ پہاڑی کے دامن میں نقب زنوں کی لاشوں کے انبار لگ گئے تھے۔ سلطان کے منہ سے غصے سے جھاگ پھوٹنے لگی۔ وہ ہر طرف گھوڑا دوڑاتا اور سرنگیں کھودنے کے حکم دیتا پھر رہا تھا۔ اسلام کے نام پر سپاہی اور کماندار قربان ہوتے چلے جا رہے تھے۔

پھر ایک اور رات آ گئی اور اس رات کے ساتھ صرف برفباری نہیں بلکہ برفانی طوفان آ گیا۔ مورخ لکھتے ہیں کہ جھکڑ اتنے تیز اور برفباری اتنی زیادہ تھی کہ گھوڑے بھی برداشت نہ کر سکے۔ بیشتر گھوڑے ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ کوئی اوٹ نہیں تھی چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی چنانچہ برف تلے دبتی جا رہی تھیں۔ طوفان کا جدھر کا رخ تھا ادھر دریائے جہلم تھا۔ گھوڑوں کے ساتھ سوار بھی ادھر کو ہی ہٹتے جا رہے تھے اور اوپر سے لڑھکتے دریا میں گرتے جا رہے تھے۔ وہاں دریا بہت نیچے بہتا ہے۔ اس کا پاٹ تنگ ہے اس لیے گہرا بھی ہے اور بہاؤ بہت تیز۔

صبح طلوع ہوئی تو کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ کل والی جگہ ہے۔ طوفان تھم گیا تھا اور برف کئی کئی فٹ پڑ چکی تھی۔ اس برف میں غزنی کے ہزاروں فوجی دب گئے تھے۔ سالاروں نے سلطان سے کہا — "اللہ کو یہی منظور تھا۔ اتنی فتوحات کے بعد ایک شکست کو ہم خاطر میں نہیں لاتے۔ ہم پھر آئیں گے۔ باقی فوج کو بچا لیں۔"

سلطان محمود نے خود اعتمادی اور تحمل سے تسلیم کر لیا کہ وہ ہار گیا ہے۔ اس نے واپسی کا حکم دے دیا۔ اب تو واپسی بھی محال ہو گئی تھی۔ راستے بند ہو گئے تھے۔ اس مشکل وقت میں وہ گائیڈ آگے آئے جو دراصل ہندو تھے مگر اپنے آپ کو جوشیلے مسلمان ظاہر کرتے تھے۔

انہوں نے سلطان کو تسلی دی کہ واپسی کا ایک راستہ ابھی محفوظ ہے۔ فوج بکھری ہوئی تھی۔ تین حصوں میں بٹ گئی۔ گائیڈوں نے اپنے آپ کو ان تین حصوں میں تقسیم کر لیا۔ سلطان کے سینکڑوں سوار گھوڑوں سمیت دریا میں بہہ گئے تھے۔ باقی فوج لوہ کوٹ کے تیروں اور برف کے طوفان کی نذر ہو گئی تھی۔ اب بچی کھچی فوج تین حصوں میں تقسیم ہو کر گائیڈوں کے پیچھے چلی تو اس کا جو حشر ہوا اسے محمد قاسم فرشتہ یوں بیان کرتا ہے:

"سلطان محمود محاصرہ اٹھانے اور غزنی کو واپس چلے جانے پر مجبور ہو گیا۔ اس کی فوج کو منافق گائیڈوں نے ایسا گمراہ کیا کہ بہت دنوں تک اس کی فوج برف کی اس دنیا میں بھٹکتی رہی۔ برف کے نیچے کھائیاں اور کھڈ تھے۔ دریا کی ڈھلانیں بھی برف تلے چھپ گئی تھیں۔ گھوڑے اور پیادے پھسلتے اور سیدھے دریا میں جاتے اور غائب ہو جاتے تھے۔ بہت سے سپاہی اکڑ کر مر گئے۔ اگر کوئی رک گیا تو وہیں اکڑ گیا....

"یہ سلطان کی بہترین فوج تھی۔ وہ قلعہ تو سر نہیں کر سکا تھا لیکن گائیڈوں نے اسے گمراہ کیا اور خود غائب ہو گئے۔ سلطان محمود جب ٹلہ جوگیاں کے نائب سالار سارنگ کے کیمپ میں پہنچا، تو اس کے ساتھ اتنی تھوڑی سی فوج تھی جسے وہ بڑی آسانی سے گن سکتا تھا۔ چند دنوں بعد وہ غزنی چلا گیا۔"

طمع تخت کی اور تاج کی

۲ جولائی ۱۰۱۷ء (۵ صفر ۴۰۸ھ) کے روز سلطان محمود غزنوی کو اپنی تاریخ کی ایک بہت بڑی جنگ بہت برے اور بے حد خطرناک ایمان فروشوں کے خلاف لڑنی پڑی۔ اُس کی سلطنت اور اسلام کے خلاف یہ بڑی ہی خطرناک اور دُور رس نتائج کی حامل سازش تھی جس کے پیچھے یہودیوں اور عیسائیوں کا ہاتھ تھا۔ سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ محمود غزنوی ۱۰۱۵ء میں کشمیر سے شکست کھا کر واپس گیا تھا۔ اُسے کشمیر کی برفباری نے شکست دی تھی اور اُس کی شکست خوردہ فوج کو ہندو گائیڈوں نے مسلمانوں کے بھیس میں گمراہ کیا اور فوج برف سے اَٹی ہوئی وادیوں اور برف سے لدی ہوئی ڈھلانوں میں تباہ و برباد ہو گئی تھی۔

اتنے زیادہ نقصان کی تلافی کے لیے کئی سال درکار تھے۔ اس عرصے کے لیے سلطان محمود غزنوی فوجی لحاظ سے ختم ہو گیا تھا۔ وہ معمولی سا معرکہ لڑنے کے بھی قابل نہیں رہا تھا۔ غزنی میں اُس کی کچھ فوج موجود تھی اور کچھ سرحدوں پر خیمہ زن تھی۔ اس سے وہ حملہ روک سکتا تھا۔ جوابی حملہ کرنے کے لیے اُس کے پاس کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ اسے ہندوؤں کے حملے کا خطرہ بس تھا۔ اُس وقت تک وہ ہندوؤں پر دہشت طاری کر چکا تھا۔ وہ کشمیر سے شکست کھا کر ٹلہ جوگیاں (بال ناتھ) رکا تھا۔ راجہ بھیم پال نند تھوڑی سی فوج سے اُس پر حملہ کر دیتا تو اُسے زندہ پکڑ سکتا تھا مگر راجے مہاراجے اُسے زخمی شیر سمجھتے ہوئے اُس کے قریب نہیں جاتے تھے۔

سلطان محمود کو خطرہ اپنے بھائیوں سے تھا جن کی ریاستیں اُس کی سلطنت کے اردگرد تھیں۔ وہ سب مل کر بھی اور باری باری بھی اُس کے خلاف لڑ کر شکست کھا چکے

تھے اور اس سے خائف رہتے تھے۔ اب ان کے لیے بڑا اچھا موقع تھا کہ اُس پر ٹوٹ پڑتے۔

مئی ۱۰۱۵ء میں سلطان محمود جب ہندوستان سے واپس غزنی گیا تو اُس کی حالت کٹی ہوئی پتنگ جیسی تھی جو ہوا کے رحم و کرم پر ڈولتی زمین کی طرف آتی ہے اور اُسے پتہ نہیں ہوتا کہ زمین پر گرے گی یا کسی درخت کی ٹہنیوں میں اُلجھ کر پھٹ جائے گی۔ اُس کے ساتھ تھوڑی سی فوج تھی اور یہ فوج ماتمی جلوس کی طرح غزنی میں داخل ہوئی تھی۔ غزنی کے لوگ جو اس کے استقبال کے لیے راستے میں آن کھڑے ہوئے تھے، اُن کے ہونٹ سِل گئے تھے۔ اُن کے فاتحانہ نعرے اُن کے سینوں میں قید ہو گئے تھے۔ عورتیں جو دروازوں میں اور منڈیروں پر کھڑی تھیں، انگلیاں دانتوں تلے دبا کر رہ گئیں۔

سلطان محمود غزنوی نے اپنی قوم کو اس اُداس سکوت میں دیکھا تو اُس نے گھوڑا روک لیا اور اپنے سالار التونتاش کو بلایا۔

"التونتاش! یہ لوگ خاموش کیوں ہیں؟ اگر فوج ماری گئی ہے تو ان کے نعرے کیوں مر گئے ہیں؟ ..... انہیں کہو کہ فوج قوم کے لیے زندہ رہتی ہے۔ انہیں کہو کہ تم نہ مر جاؤ، نعرے لگاؤ۔ کہو اسلام زندہ باد۔ کہو سلطنت غزنی زندہ باد۔ اپنے زخمی سپاہیوں کے حوصلے بڑھاؤ۔ تمہارے نعرے ان زخمی شیروں کو اٹھا دیں گے اور جو شہید ہو گئے ہیں وہ اپنی زندگی قوم کو دے گئے ہیں۔"

التونتاش نے بلند آواز سے سلطان محمود کے الفاظ دہرائے تو غزنی کے در و دیوار اور غزنی کا آسمان اسلام زندہ باد، پاسبان اسلام زندہ باد اور بت شکن زندہ باد کے نعروں سے لرزنے لگے۔

"اور ان ماؤں اور بہنوں سے کہو کہ اسلام کی ناموس تم سے تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی مانگ رہی ہے۔"

التونتاش نے بلند آواز سے سلطان کے یہ الفاظ بھی دہرائے تو عورتوں نے اُن پھولوں کا جو انہوں نے سلطان کی حالت دیکھ کر چھپا لیے تھے، زخم خوردہ فوج پر مینہ برسا دیا۔ عورتوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں ـــ ہمارے بیٹوں کو لے جاؤ۔ ہمارے بھائی

کو رے جاؤ۔"

سلطان محمود غزنوی نے قوم کا حوصلہ بڑھایا تھا مگر اُس کے اپنے سینے میں جو خلش تھی، اُس نے بے چین کیے ہوئے تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اُس نے لوہ کوٹ (کشمیر) میں اپنی شکست کی تمام تر ذمہ داری اپنے اوپر ڈال لی تھی۔ اُس نے اپنے سالاروں اور غزنی میں مقیم اپنی فوج کے کمانڈروں کو بلا کر کہا کہ فتح و شکست خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن اس شکست کا ذمہ دار میں خود ہوں۔ میں نے وہاں کے موسم کی طرف توجہ نہ دی۔ میں نے اپنے مخبروں اور جاسوسوں سے وہاں کی کیفیت نہ پوچھی اور پھر میں ہندو راہنماؤں کے جھانسے میں آ گیا۔ اب یہ ہمارا فرض ہے کہ قوم کو یہ شکست فتح میں بدل کر دکھائیں۔ ہمارا کام صرف حکومت کرنا نہیں۔ میرا یہ حکم یاد رکھو اور اس کی تعمیل کرو کہ قوم کا کوئی فرد تمہیں شکست کا طعنہ دیتا ہے تو اس طعنے کو خندہ پیشانی سے قبول کرو اور اسے یقین دلاؤ کہ تمہاری فوج تمام شکوے دُور کر دے گی۔

ذمہ داری اپنے اوپر لینے کے باوجود اُسے چین نہ آیا اور وہ اپنے مرشد ابوالحسن خرقانی سے ملنے روانہ ہو گیا۔ خرقانی ایک دن اور آدھی رات کی مسافت جتنی دُور رہتے تھے۔ اُس نے اپنے محافظوں کے ساتھ تیز رفتاری سے یہ مسافت طے کی اور اپنے مرشد کے قدموں میں جا گرا۔

"سلطان کا انداز بتا رہا ہے کہ شکست کھا کر آیا ہے" — ابوالحسن خرقانی نے کہا — "مگر سلطان کی آنکھوں میں یہ آنسو کیسے؟"

"ندامت کے" — سلطان محمود نے کہا — "میرے مرشد میری روح بے چین ہے۔ جن کی لاشیں کشمیر کی برف تلے چھوڑ آیا ہوں، ان کی روحیں راتوں کو سونے نہیں دیتیں۔ میں کچھ سوچنے کی حالت میں نہیں رہا۔"

"وہم ہے سلطان!" — خرقانی نے کہا — "شہیدوں کی روحیں اُنہیں بے چین نہیں کیا کرتیں جو اُن کے لہو کے ایک ایک قطرے کا انتقام لینے کا عزم رکھتے ہیں۔ یہ بھی تمہاری فوج ہے۔ اسلام کے نام پر لڑنے کے لیے جس میدان میں جاؤ گے یہ روحیں تمہارے ساتھ ہوں گی۔ تم جیسے پُرعزم جنگجو کے راستے میں یہ جذبات رکاوٹ نہیں بن سکتے۔ ہمت

نہ ہارو سلطان! ہندوستان کی مسجدیں تمہاری راہ دیکھ رہی ہیں۔"

"میں بہت بڑے دھوکے میں آ گیا تھا" — سلطان محمود نے کہا — "ایک تو موسم نے دھوکہ دیا، دوسرے ہندو راہنماؤں نے مسلمان بن کر دھوکہ دیا۔"

"یہ کوئی نئی بات نہیں ہوئی" — خرقانی نے کہا — "کفر اسلام کو دھوکے دیتا چلا آیا ہے، دھوکے ہی دیتا چلا جائے گا۔ آئندہ ان دھوکوں سے بچو۔ ابھی تو آپ کو اپنی زمین پر جنگ لڑنی پڑے گی۔ یہودی اور عیسائی مسلمانوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کے لیے ہماری جڑوں میں اتر گئے ہیں۔ خلیفہ جو اُمتِ رسولؐ کے اتحاد کی علامت تھا، وہ خود اقتدار کی ہوس کا شکار ہو گیا ہے۔ ملت کی مرکزیت بکھر گئی ہے۔ اگر آپ اسلام کی خاطر جنگ و جدل کے شیدائی ہیں تو سلطانی کو دل سے نکال دیں۔ نظر دشمن پر رکھیں۔ فوجی طاقت سے دشمن کو مرعوب کریں، اپنی قوم کو نہیں۔ تاج اور تلوار ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔ محبت تاج سے ہوتی ہے یا تلوار سے۔ وہ تلوار قابلِ نفرت ہوتی ہے جو تاج کی حفاظت کے لیے چلے۔ ایک شکست سے دل برداشتہ نہ ہو سلطان! اُٹھتے وہی ہیں جو گرتے ہیں۔ گر کر اُسی شان سے اُٹھو جس شان سے آپ نے دشمن کو للکارا تھا۔ اپنی غلطی اپنے سر لو۔ قوم کو دھوکے میں نہ رکھنا۔"

"آپ نے فرمایا ہے کہ یہودی اور عیسائی ہماری جڑوں تک اتر گئے ہیں" — سلطان محمود نے پوچھا — "آپ کا یہ اشارہ کس طرف ہے؟"

"اسلام کا سب سے بڑا دشمن یہودی ہے" — شیخ ابوالحسن خرقانی نے کہا — "وہ مسجد اقصیٰ کو اپنی عبادت گاہ سمجھتا ہے۔ اس کی کوشش یہ ہے کہ فلسطین کو اپنا وطن بنا کر خانہ کعبہ پر بھی قبضہ کر لے اور ہمارے اس مقدس مقام کو مسمار کر دے۔ یہودی خود لڑنے والی قوم نہیں۔ اس کے پاس دولت ہے جسے وہ مسلمان کی جڑیں کاٹنے کے لیے استعمال کر رہا ہے۔ ہندوؤں کی طرح یہودی بھی اپنی بیٹیوں کو استعمال کرتے اور عیسائیوں کو مدد دے رہے ہیں۔ قرامطی فرقہ انہی کی پیداوار ہے۔ آپ کے خلاف لڑنے والے مسلمان ان سے در پردہ گٹھ جوڑ کیے ہوئے ہیں۔ آپ کو خانہ جنگی میں اُلجھانے

والے یہودی اور عیسائی ہیں۔۔۔ ہو سکتا ہے آپ کو اب ایک مرتبہ پھر اسی سرزمین پر لڑنا پڑے۔ اپنے حریفوں کو اپنا دوست بنانے کی کوشش کرو۔ اپنے اللہ پر بھروسہ رکھو ہوش میں رہو اور اپنی قوم کو اپنے ساتھ رکھو۔ فوراً اپنی فوج تیار کرو اور خوارزم کی طرف توجہ دو۔ میں نے سنا ہے کہ خوارزم میں یہودیوں کا جادو چل رہا ہے۔"

اس دور میں خوارزم ایک الگ ملک تھا جس کا دارالحکومت جرجانیہ تھا۔ بعد میں یہ گرگنج کہلایا۔ آج کل یہ ارگنج کہلاتا ہے۔ بخارا اسی ملک کا ایک صوبہ تھا۔ خوارزم میں مامونی خاندان کی بادشاہی تھی۔ بادشاہ خوارزم شاہ کہلاتا تھا۔ یہ پہلے بھی مسلمان ملک تھا۔ ۹۹۵ء میں ابوعلی مامون بن محمد بن علی نے خوارزم پر حملہ کر کے اس کے بادشاہ ابوعبداللہ کو قید میں ڈال دیا اور تمام تر ملک پر قبضہ کر لیا تھا۔ دو سال بعد ۹۹۷ء میں ابوعلی مامون قتل ہو گیا لیکن اس کے دشمن مامونی خاندان کا تختہ نہ الٹ سکے۔ ابوعلی کے بیٹے ابوالحسن علی مامون نے بادشاہی سنبھال لی۔ وہ بارہ سال بعد ۱۰۰۹ء میں بڑھاپے سے بہت پہلے مر گیا۔ وفات سے تین سال پہلے اس نے سلطان محمود غزنوی کے ساتھ دوستانہ تعلقات کے استحکام کے لیے سلطان کی چھوٹی بہن کے ساتھ جس کا نام کالجی تھا، شادی کر لی تھی۔ ابوعلی کی وفات کے بعد کاہ کالجی سلطان محمود کے پاس واپس آ گئی تھی۔

ابوالحسن علی مامون کی وفات کے بعد اس کا چھوٹا بھائی ابوالعباس مامون تخت نشین ہوا۔ اس کی عمر اس وقت پچیس سال تھی۔ اس کی دو بیویاں تھیں۔ خوارزم شاہ کا وزیر ابوالحارث بن محمد تھا۔ وہ ابوالعباس مامون کے باپ ابوعلی مامون کے وقتوں سے وزیر چلا آ رہا تھا۔ بوڑھا ہو چکا تھا۔ اسے مامونی خاندان کے ساتھ دلی محبت پیدا ہو گئی تھی اور اس کے سینے میں ایک سچے مسلمان کا جذبہ اور درد بھی تھا۔ ابوعلی مامون کے بیٹے اس کے ہاتھوں میں جنے پلے تھے۔ وہ انہیں سگے باپ کی طرح مشورے دیا کرتا اور انہیں ناروا حرکتوں سے روکا کرتا تھا۔ خوارزم کے صوبہ بخارا کا گورنر امیر الپتگین پختہ عمر کا تجربہ کار اور گھاگ آدمی تھا۔ اس کے متعلق وزیر ابوالحارث کی رائے اچھی نہیں تھی۔ بظاہر وہ خوارزم شاہ کا وفادار بلکہ خوشامدی تھا مگر اس کے مشورے اور اس کی رپورٹیں نیک نیتی پر مبنی نہیں

ہوتی تھیں۔

ابوالعباس جب تخت نشین ہوا تو اس نے اپنے وزیر ابوالحارث کو تنہائی میں بلایا اور اس کے ساتھ اپنے ملک کے دفاع اور رعایا کی خوشحالی کے لیے تبادلہ خیالات کرنے لگا۔

"میرا باپ قتل ہو گیا تھا اور میرا بڑا بھائی مر گیا ہے" — ابوالعباس نے کہا۔ "میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کر رہا ہوں۔ راز کی ایک بات ہے جو دل میں کانٹے کی طرح اتر گئی ہے۔ کیا آپ اس راز سے پردہ اٹھا سکتے ہیں؟"

"جن پردوں کو میری بوڑھی آنکھیں چاک کر سکتی ہیں، ان پردوں میں چھپے ہوئے راز مامونی خاندان سے کبھی نہیں چھپائے" — وزیر نے کہا۔ "مجھے اپنے دل کا کانٹا دکھائیں۔ شاید میں نکال سکوں۔"

"آپ جانتے ہیں کہ میرے بھائی کی وفات پر ہمارا امیر بخارا الپتگین آیا تھا" — ابوالعباس نے کہا۔ "اس نے مجھے کہا تھا کہ آپ کے بڑے بھائی کی وفات کے افسوس کے ساتھ میں آپ کو خوارزم شاہی کی مبارکباد پیش کرتا ہوں اور آپ پر یہ راز فاش کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ آپ کے والد مرحوم کو قتل کیا گیا تھا اور آپ قاتلوں کو جانتے ہیں مگر آپ کو یہ معلوم نہیں کہ آپ کے بھائی ابوالحسن مامون بھی قتل ہوئے ہیں، طبعی موت نہیں مرے ہیں۔ اس خبر پر حیران نہ ہوا کیونکہ میں اپنے دشمنوں کو جانتا ہوں۔ الپتگین نے بتایا کہ میرے بھائی کو ایسا زہر دیا گیا تھا جس کے اثرات پیٹ کی کسی بیماری سے ملتے جلتے تھے۔ یہ زہر آہستہ آہستہ اثر کرتا رہا اور طبیب اسے پیٹ کا مرض سمجھتے رہے۔"

"یہ ممکن ہے" — ابوالحارث نے کہا۔ "دشمن کیا کچھ نہیں کر سکتا۔ آپ کے دشمن آپ کی جنگی طاقت سے خائف ہیں وہ ایسے ہی اوچھے حربے استعمال کر رہے ہیں۔"

"لیکن محترم وزیر!" — ابوالعباس نے کہا۔ "الپتگین نے وثوق سے کہا ہے کہ میرے بھائی کو سلطان محمود نے زہر دلوایا ہے اور یہ زہر اسے سلطان محمود کی بہن کاہ کالجی نے جو اس کی بیوی تھی، پلایا تھا۔ اس نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ سلطان محمود نے میرے بھائی سے کہا تھا کہ اس کی اطاعت قبول کر لے۔ میرے بھائی نے انکار کر دیا تھا جس میں

یقین کر لوں کہ التگین نے سچ کہا ہے؟"

"نہیں" — وزیر ابوالحارث نے جواب دیا۔ "میں اس انکشاف کو اس لیے صحیح نہیں مان سکتا کہ یہ التگین نے کیا ہے، اور اس لیے بھی نہیں مانوں گا کہ سلطان محمود مردِ میدان ہے۔ اُسے زہر دیا جا سکتا ہے، وہ زہر دے نہیں سکتا۔ میں اُس کے ذاتی کردار سے واقف ہوں۔ وہ سلطانی کا اور اپنی سلطنت کی توسیع کا خواہشمند ہوتا تو زندہ رہنے کی کوشش کرتا مگر تم دیکھ رہے ہو کہ وہ کتنی بار ہندوستان کے دور اندر جا کر جنگیں لڑ چکا ہے اور اب پھر ہندوستان گیا ہوا ہے۔ وہ اسلام کا شیدائی اور مبلغ ہے۔ وہ بت شکن ہے۔"

ان کے درمیان یہ باتیں اُس وقت ہو رہی تھیں جب سلطان محمود غزنوی کشمیر میں لوہ کوٹ کے قلعے کا محاصرہ کیے ہوئے تھا اور اُس کی فوج برف باری میں تباہ ہو رہی تھی۔

"آپ دیکھ رہے ہیں کہ سلطان محمود کتنی بار مرنے کی کوشش کر چکا ہے" — وزیر ابوالحارث نے کہا۔ "ہندوستان کے راجوں مہاراجوں کی جنگی طاقت معمولی نہیں۔ اس طاقت سے صرف محمود ٹکر لے سکتا ہے اور وہ لے رہا ہے۔ ایسے جنونی اور جنگجو کسی کو زہر نہیں دیا کرتے۔"

"میں قتل نہیں ہونا چاہتا" — ابوالعباس نے کہا۔ "میں دوست بنانا چاہتا ہوں جو زندہ رہیں اور زندہ رہنے دیں۔ مجھے مشورہ دیں کہ میں ترکستان کے خوانین کو دوست بناؤں یا سلطان محمود کو۔ مجھے سلطان محمود سب سے زیادہ طاقتور نظر آتا ہے۔ آپ کی رائے اس کے متعلق جو کچھ بھی ہے، میں محسوس کرتا ہوں کہ وہ جس طرح اپنے دشمنوں کو زیر کر کے اُن کے علاقے سلطنتِ غزنی میں شامل کر چکا ہے، اسی طرح وہ مجھے بھی کسی وقت کہہ دے گا کہ میری اطاعت قبول کرو۔ اس کے علاوہ مجھے اپنے دشمنوں سے محفوظ رہنے کے لیے ایک مخلص اور طاقتور دوست کی ضرورت ہے۔"

"اور وہ صرف سلطان محمود ہے" — وزیر نے کہا۔

"میرے دل میں جو بات آئی ہے وہ میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں" — ابوالعباس نے کہا۔ "دوستی کے رشتے باتوں اور وعدوں سے پکے نہیں ہو سکتے۔ میں نے ایک طریقہ سوچا ہے۔ وہ یہ ہے کہ میں سلطان محمود سے اُس کی بہن کالجی کا رشتہ مانگ لوں۔ وہ میرے بڑے بھائی کی بیوہ ہے۔ مجھے اچھی لگتی تھی۔ عمر میں مجھ سے شاید ایک سال بڑی ہے۔ کیا سلطان محمود مجھے یہ رشتہ دے دے گا؟"

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا" — ابوالحارث نے کہا اور ہنس کر بولا — "کیا آپ نے یہ خطرہ محسوس نہیں کیا کہ اس عورت نے آپ کے بھائی کو زہر دیا ہے تو وہ آپ کو بھی زہر دے سکتی ہے؟"

"نہیں" — ابوالعباس نے کہا۔ "کالجی مجھے زہر نہیں دے سکتی۔" اُس نے وزیر سے نگاہیں پھیر کر خلا میں دیکھا اور جذباتی سی سرگوشی کی۔ "کالجی مجھے زہر نہیں دے سکتی" — وہ وزیر سے مخاطب ہو کر ذرا بلند آواز سے بولا — "وہ جان گئی تھی کہ مجھے اُس کے ساتھ روحانی لگاؤ پیدا ہو گیا ہے۔ میں اس کے خاوند کا چھوٹا بھائی تھا۔ وہ مجھ سے پیار کرتی تھی۔ مجھے پیار سے شہزادہ کہتی تھی...... سچ بتا دوں محترم وزیر! بھائی کے مرنے کے بعد میں محسوس کر رہا ہوں کہ بھائی کی جدائی کو میں نے برداشت کر لیا ہے، کالجی کی جدائی ناقابلِ برداشت ہے۔"

"کیا آپ محبت کی خاطر کالجی سے شادی کرنا چاہتے ہیں یا سلطان محمود کے ساتھ دوستی قائم کرنے کے لیے؟"

"دونوں باتیں میرے سامنے ہیں" — ابوالعباس نے جواب دیا — "لیکن غالب کالجی کی محبت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کالجی کو مجھ سے پیار تھا۔ وہ پاک محبت تھی جیسی ایک بہن یا اچھی بھابھی کی ہوتی ہے لیکن اب صورت بدل گئی ہے۔ میں کالجی میں اتنا کھو گیا تھا کہ میری چھوٹی بیوی الجوری مجھ سے ناراض ہو گئی تھی۔ الجوری کے باپ الوتاق کو آپ جانتے ہیں۔ ہماری فوج کا ایک سالار ہے۔ اُس نے مجھے کہا تھا کہ الجوری کو مجھ سے شکایت ہے۔ میں نے اپنے اس سسر سے کہا تھا کہ وہ مجھ پر اور میرے بھائی کی بیوی پر ایک بے ہودہ الزام عائد کر رہا ہے اور وہ آئندہ ایسی جرأت نہ کرے۔

ہیں نے اُس کے ماتھے پر جو شکن دیکھے تھے وہ اچھے نہیں تھے۔

"سلطان محمود کو ہندوستان سے واپس آنے دیں" — وزیر نے کہا — "آپ کی اس تجویز میں آپ کی محبت بھی شامل ہے اور سیاست بھی۔ آپ ابھی سوچیں، میں بھی سوچوں گا۔"

یہ باتیں اُس وقت ہو رہی تھیں جب سلطان محمود کو کشمیر کی برفانی شکست سے دوچار کر رہی تھی اور اُس کی وہ جنگی طاقت جس کی وجہ سے ابوالعباس اُسے اپنا برادرِ نسبتی اور اتحادی بنانا چاہتا تھا، وہ دریائے جہلم میں ڈوب رہی تھی اور برف کے نیچے دفن ہو رہی تھی۔

اس سے چھ ماہ بعد کا واقعہ ہے کہ وزیر ابوالحارث ایک روز ابوالعباس کے پاس گیا اور اُسے تنہائی میں لے جا کر کہا — "غزنی سے ایک عجیب خبر آئی ہے۔ سلطان محمود ہندوستان سے ایسی بری شکست کھا کر آیا ہے کہ اُس کے ساتھ فوج کا دسواں حصہ بھی نہیں اور جو فوج آئی ہے وہ زخمی ہے۔ اب کے گھوڑے کے ساتھ نہ سونے جواہرات سے لدے ہوئے ہاتھی ہیں نہ ہندوستان کے جنگی قیدی۔ وہ اپنی جنگی قوت تباہ کر آیا ہے۔"

"میں اس کے باوجود اُس کی بہن کاہ کا کجی کے ساتھ شادی کروں گا" — ابوالعباس نے کہا — "آپ کو زندگی کا جو تجربہ ہے وہ مجھے نہیں لیکن آپ میری تائید کریں گے کہ میں سلطان محمود کے مشکل وقت میں دوستی کا ہاتھ بڑھاؤں گا تو وہ میرا ممنون و مشکور ہوگا۔ پھر ہم پر کبھی مشکل وقت آن پڑا تو وہ ہماری مدد کو ضرور پہنچے گا..... آپ یہ بتائیں کہ اُس تک پیغام پہنچانے کا کون سا موقع موزوں ہوگا، اور کیا مجھے خود جانا چاہیے؟"

"موقع یہی موزوں ہے" — وزیر نے کہا — "شکست پر اظہارِ افسوس کرنا ضروری ہے اور رسمی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ آپ اُس کی مدد کرنے کو تیار ہیں۔ آپ کا جانا ضروری نہیں۔ میں جاؤں گا اور میں شادی کا پیغام بھی دوں گا۔"

چند دنوں بعد وزیر ابوالحارث دو ایلچیوں، دس بارہ محافظوں اور تحائف سے لدے ہوئے بیس اونٹوں کے ساتھ غزنی پہنچا۔ سلطان محمود کو اطلاع ہوئی کہ خوارزم شاہ ابوالعباس کا وزیر آیا ہے تو سلطان نے اُسے اُسی وقت بلا لیا۔

"خوارزم شاہ ابوالعباس مامون نے سلطانِ عالی مقام کی خدمت میں برادرانہ سلام اور کچھ تحائف بھیجے ہیں" — وزیر نے کہا — "اور دلی رنج کا اظہار کیا ہے کہ سلطانِ عالی مقام کو ہندوستان کی مہم میں بہت نقصان اٹھانا پڑا اور ناکامی ہوئی۔ خوارزم شاہ نے فرمایا ہے کہ خدائے ذوالجلال نے سلطان کو جہاں اتنی فتوحات عطا فرمائی ہیں وہاں ایک شکست بھی اُسی کا دین ہے۔ سلطانِ غزنی کو اللہ تعالیٰ نے جو حوصلہ عطا فرمایا ہے، اس کے سامنے یہ شکست کوئی معنی نہیں رکھتی۔ خوارزم شاہ ابوالعباس مامون نے فرمایا ہے کہ میری طرف سے کسی بھی قسم کی مدد اور کسی بھی قسم کے تعاون کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔ بھائی مشکل کے وقت کام آتے ہیں۔"

"یہ میرے دربار کے آداب کے خلاف ہے کہ ایک بادشاہ کا وزیر میرے سامنے کھڑا ہو کر بات کرے" — سلطان محمود نے کہا — "آپ میرے برابر بیٹھ جائیں" —

وزیر سلطان محمود کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا تو سلطان نے کہا "میں خوارزم شاہ ابوالعباس مامون کا مشکور ہوں کہ انہوں نے اُس وقت دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے جب مجھے یہ خطرہ ہے کہ میرے حریف میری کمزوری سے فائدہ اٹھائیں گے۔ اُن کی خدمت میں میرا سلام پیش کر دینا اور کہنا کہ مجھے دوستوں کی ضرورت ہے لیکن میں مدد صرف اللہ سے مانگا کرتا ہوں ..... مجھے خوارزم کے اندرونی حالات کے ساتھ دلچسپی ہے۔ ابوالعباس ابھی نوجوان ہے۔ کیا وہ سمجھنے کی اہلیت رکھتا ہے کہ دریائے زرافشاں کے کنارے بخارا میں کیا ہو رہا ہے؟ کیا وہ اپنے امیر البتگین کی نیت کو سمجھتا ہے؟"

"اگر وہ نہیں سمجھتا تو میں جو ہوں" — ابوالحارث نے کہا — "امیر البتگین کی نیت پر مجھے بھی شک ہے لیکن ہمیں اپنی فوج پر بھروسہ ہے۔"

"جہاں تک میں جانتا ہوں، آپ کو اپنی فوج پر اتنا بھروسہ نہیں کرنا چاہیے" — سلطان محمود نے کہا — "فوج کیا ہوتی ہے؟..... سالاروں اور نائب سالاروں کو فوج کہتے ہیں۔ فیصلے اُن چند ایک آدمیوں کے ہوتے ہیں اور فوج کو آلۂ کار کی طرح استعمال کیا جاتا ہے۔ حکومت کا نشہ سالاروں پر طاری ہوتا ہے لیکن قوم کی نفرت فوج کے حصے میں آتی ہے۔ سالاروں کی بداعمالیوں کی سزا سپاہیوں کو ملتی ہے۔ آپ

کو نظر سالاروں پر رکھنی چاہیے۔"

کچھ دیر اُن کا تبادلۂ خیالات ہوتا رہا۔ وزیر تجربہ کار اور دانشمند تھا۔ اُس نے شادی کا پیغام دینے کا موقع پیدا کر لیا۔

"سلطانِ غزنی!" — وزیر نے کہا — "ابوالعباس مامون نے مدد کی پیش کش تو آپ کو کی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ خود مدد کے طلبگار ہیں۔ انہیں فوری طور پر کسی مدد کی ضرورت نہیں۔ وہ دوستی کے خواہاں ہیں۔ انہیں ایسا دوست چاہیے جو انہیں وقت پر دھوکہ نہ دے۔ ایسا دوست آپ کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اس دوستی کے دائم استحکام کے لیے انہوں نے خواہش ظاہر کی ہے کہ وہ آپ کی بہن کاہ کاجی کے ساتھ شادی کریں جو اُن کے بڑے بھائی کی بیوہ بھی ہے۔ انہوں نے پوچھا ہے کہ سلطانِ عالی مقام اُن کی عرضداشت کو قبول فرمائیں گے؟"

"اس کا فیصلہ کاجی خود کرے گی" — سلطان محمود نے کہا — "میں کسی کی دوستی کو پکا کرنے کے لیے اپنی بہن کو اس طرح استعمال نہیں کروں گا۔ میں اُسے مشورہ دے سکتا ہوں، خوارزم اور غزنی کی دوستی کی اہمیت بتا سکتا ہوں، لیکن اُس پر اپنا فیصلہ نہیں ٹھونسوں گا۔ کچھ دنوں بعد آپ مجھ سے جواب لے سکتے ہیں۔"

"ابوالعباس اُس وقت اچھا لڑکا تھا جب وہ خوارزم کا بادشاہ نہیں تھا" — سلطان محمود کو اُس کی بہن کاہ کاجی نے جواب دیا — "اب وہ جوان ہے اور بادشاہ بھی۔ اب دیکھنا پڑے گا کہ اُس میں کیا تبدیلی آئی ہے۔"

"اُس کے پیغام کا جواب تم دو گی" — سلطان محمود نے کہا — "فیصلہ میرا نہیں ہو گا۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں نے ابوالعباس کے وزیر کو یہ کہہ کر رخصت کر دیا تھا کہ میں اپنی بہن پر اپنا فیصلہ نہیں ٹھونسوں گا۔"

"لیکن مجھے آپ کے مشورے کی ضرورت تو ہے" — بہن نے کہا — "اگر آپ سمجھتے ہیں کہ مجھے خوارزم شاہ کے ساتھ شادی کر کے غزنی کو کوئی فائدہ پہنچے گا تو میں اُس کے ساتھ شادی کر سکتی ہوں۔ میرے دل میں کسی بادشاہ کے ساتھ شادی کرنے

کی خواہش نہیں۔ میں کسی کے حرم کی زینت نہیں بننا چاہتی۔ میں ملکہ بھی نہیں بننا چاہتی۔ جس کے بھائی کے شب و روز جہاد میں گزر رہے ہوں، وہ بہن ملکہ نہیں بنے گی۔ مجھے یہ بتائیں کہ ابوالعباس خوارزم شاہ کی تیسری بیوی بن کر اسلام اور سلطنتِ غزنی کو کوئی فائدہ پہنچے گا تو میں اُس کی زوجیت کو قبول کر لوں گی۔"

"خوارزم ایک ایسا ملک ہے جس کی فوج جہاد میں استعمال کی جا سکتی ہے" — سلطان محمود نے کہا — "مسلمان بادشاہیاں اور چھوٹی چھوٹی ریاستیں آپس میں ٹکرا رہی ہیں۔ ان میں سے دو تین کے حکمران متحد ہوتے ہیں تو صرف اس لیے کہ انہیں کسی طاقتور حریف سے خطرہ ہوتا ہے۔ اُن کا اتحاد اسلام کی خاطر نہیں ہوتا۔ یہ لوگ مسلسل خانہ جنگی میں الجھے ہوئے ہیں۔ اور یہودی اور عیسائی جلتی پر تیل ڈال رہے ہیں۔ میں انہیں کفر کے خلاف متحد کرنا چاہتا ہوں۔ خوارزم ایک طاقتور ملک ہے لیکن مجھے اطلاعیں ملی ہیں کہ اس ملک میں کوئی فتنہ سر اُٹھا رہا ہے۔ شاید ابوالعباس کو اس کا علم نہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایلک خان اُسے میرے خلاف کر دے۔ خوارزم کی فوج اِن حالات میں غزنی پر چڑھ دوڑے گی جب میں فوج کی کمی پوری کر رہا ہوں۔ میں اُن کا مقابلہ اب بھی کر سکتا ہوں لیکن یہ خانہ جنگی ہو گی۔ یہ دو مسلمان ملکوں کی جنگ ہو گی جس میں اسلام کی طاقت ضائع ہو گی اور اس کا فائدہ کفار کو پہنچے گا اور اس کا فائدہ ہندوستان کے ہندوؤں کو بلکہ ہندوؤں کے باطل مذہب کو پہنچے گا۔"

"اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں ابوالعباس کی زوجیت میں جا کر اُسے ایلک خان کی فتنہ پردازیوں سے بچا سکتی ہوں تو مجھے اُس کی زوجیت قبول ہے" — کاجی نے کہا۔

"یہ تم بہتر سمجھتی ہو کہ جب تم اُس کے بھائی کی بیوی تھیں تو ابوالعباس پر تمہارا کتنا کچھ اثر تھا" — سلطان محمود نے کہا — "اور تمہارا اُس کے ساتھ کوئی رابطہ تھا یا نہیں۔"

"اُس وقت وہ میرے زیرِ اثر تھا" — کاہ کاجی نے کہا — "میرے دل میں اُس کا پیار تھا اور وہ میرے پیار کی ضرورت محسوس کرتا تھا۔ زیادہ وقت میرے پاس گزارتا تھا۔ اُس کا باپ قتل ہو گیا تھا اور اُس کی ماں مر گئی تھی۔ وہ تھا تو شہزادہ مگر شاہانہ جاہ و

جلال سے جذبات کی پیاس نہیں بجھ سکتی۔ وہ مجھے اپنی ماں بھی اور اپنی بہن بھی سمجھا کرتا تھا۔ اس کی شادی ہوئی، پھر اس کی دو بیویاں ہو گئیں مگر وہ روحانی تسکین مجھ سے حاصل کیا کرتا تھا۔ اس کا بھائی مر گیا اور میں تین ماہ بعد اس کے گھر سے رخصت ہوئی تو آپ تصور میں نہیں لا سکتے کہ وہ کس طرح رویا تھا۔ اپنے بھائی کی موت پر وہ اتنا نہیں رویا تھا۔"

"پھر تم اسے اپنے سانچے میں ڈھال سکتی ہو" — سلطان محمود نے کہا — "اس کے دل میں صرف غزنی کی نہیں، اسلام کی محبت پیدا کرنی ہے۔ مجھے اپنی سلطنت کو خطروں سے بچانے کی ضرورت نہیں۔"

"اگر اس کا دماغ پھر نہیں گیا تو میں اسے اپنے سانچے میں ڈھال سکتی ہوں" — کالجی نے کہا — "میں آپ کے عزم اور اسلام کی ناموس کے لیے اپنے جذبات اور اپنی زندگی وقف کر دینا چاہتی ہوں۔ میں خوارزم کی فوجی طاقت کا دھارا کفار کی طرف موڑ دوں گی۔ میں آپ کے ساتھ جہاد میں شریک نہیں ہو سکتی لیکن میں آپ کے جہاد میں جان ڈال سکتی ہوں۔ آپ کو طاقت دے سکتی ہوں۔"

سلطان محمود نے اسی روز تحائف کے ساتھ ابوالعباس مامون کو پیغام بھیج دیا کہ وہ سلطان کی بہن کے ساتھ شادی کر سکتا ہے۔

ایک مہینے کے اندر اندر شادی ہو گئی۔

اور یہ شادی اتنے بڑے طوفان کا باعث بن گئی جس نے عالم اسلام کو ہلا ڈالا۔ صرف زمین پر ہی لڑائی نہ ہوئی، سلطان محمود غزنوی [illegible] جس میں دونوں طرف کے ہزار آدمیوں نے حصہ لیا۔ اس ہولناک جنگ سے پہلے ایک ڈرامہ کھیلا گیا جس کی ابتدا ان کی ضیافت پر ہی کر دی گئی۔

یہ بہت بڑی ضیافت تھی۔ خوارزم کے دارالحکومت جرجانیہ میں چراغاں نے دن کا منظر بنا دیا۔ میلا لگا ہوا تھا۔ پیسے والوں نے اپنے تمام مکانوں سے جرجانیہ کے قلعے کی دیواروں اور شہر کی منڈیروں پر تکبیریں پڑھنے کا ... دوسری ریاستوں کے ساتھ ... حکمران یا ان کے نمائندے موجود تھے اور

وہ اپنے ساتھ بھی سلطان محمود کی زندگی کے دو مشہور سالار — ابو محمد عبداللہ محمد الطائی اور التونتاش کو ساتھ لے گئی تھی۔ ان دونوں کے ساتھ محافظوں کے علاوہ دو اور فوجی کمانڈر تھے جو سلطان محمود کے محکمہ جاسوسی اور سراغرسانی کے اہل حاکم تھے۔

ضیافت میں خوارزم کے صوبہ بخارا کا گورنر الپتگین بھی تھا۔ ابوالعباس مامون کی فوج کا سالار خمارتاش بھی تھا جو خوارزم کے ایک بڑے شہر ہزار اسپ کا حاکم تھا اور وہ سالار ابواسحاق بھی تھا جو ابوالعباس مامون کا سسر تھا۔ ان تینوں کے چہروں پر ... کا ہلکا سا تاثر بھی نہ تھا۔ وہ تینوں اکٹھے بیٹھے تھے۔ وہ سلطان محمود کے ... سالاروں سے ذرا ہٹ کے بیٹھے تھے، ان سے دور بیٹھے تھے۔ ان کے پیچھے غزنی کے وہ دو فوجی کمانڈر بیٹھے تھے جو جاسوسی اور سراغرسانی کے سربراہ تھے۔ ان دونوں کو سلطان محمود نے خاص مقصد کے لیے بھیجا تھا۔

"بادشاہ کو مجبور کر کے میری بہن کے ساتھ شادی کر کے ابوالعباس مامون ... بن گیا ہے" — سلطان محمود نے انہیں کہا تھا — "ہو سکتا ہے ابوالعباس ... راستے پر آ جائے لیکن میں نے اپنے ذرائع سے وہاں کے اندرونی حالات معلوم کر کے مجھے بتایا ہے کہ خوارزم کے ایران امیر اور ... سالاروں کی ... کہاں سازش سر ابھار رہی ہے ... تم جا کر ... پتہ نہیں کیا جائے گا کہ تم الطائی اور التونتاش کے ساتھ ... تم شہری لباس میں ہو گے اور اپنے آپ کو سمرقند کے تاجر ظاہر کرو گے۔ وہاں تم دونوں مہمان ہوں گے ... جو وہاں در پردہ کھیلا جا رہا ہے۔ تم وہاں کے تین آدمیوں کے ساتھ ... کی طرف ... ان کی آپس میں ... ان کے انداز اور ان کی حرکتیں دیکھنا اور یہ جاننے کی کوشش کرنا کہ ان کے ارادے کیا ہیں۔ ان میں ایک الپتگین امیر بخارا ہے، دوسرا ابواسحاق اور تیسرا خمارتاش۔ یہ دونوں سالار ہیں۔"

ان دونوں کو اس سے زیادہ کچھ بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ خود ہی اپنے جاسوسوں سے معلوم کر چکے تھے کہ خوارزم میں کوئی بہت بڑا خطرہ پرورش پا رہا ہے چنانچہ جرجانیہ کی ضیافت میں ... کسی کو شک نہیں ہوا تھا کہ یہ دونوں فوجی ہیں اور ایسے

سراغرساں کرانُ کی نظریں زمین کی تہوں میں بھی اور انسانوں کے سینوں کے اندر بھی چل جاتی ہیں۔ وہ ڈھیلے ڈھالے جسموں والے احمق سے تاجر لگتے تھے۔ دونوں التگین، ابواسحاق اور خمرطاش کے پیچھے بیٹھے تھے۔ مشعلوں کی روشنی میں گھوڑ دوڑ شروع ہونے والی تھی۔ گھوڑ سواری کے کرتب دکھائے جانے تھے۔ تیغ زنی کے مظاہرے اور کشتیوں کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔

ابوالعباس مامون کی آمد کا اعلان ہنگامہ خیز موسیقی سے ہوا۔ ابوالعباس کاہ کاکی کے ساتھ آرہا تھا۔ کاکی دراز قد، خوبصورت اور جوان تھی۔ اُس کی چال میں شاہانہ جلال اور انداز میں وقار تھا۔ ابوالعباس بھی خوبرو تھا۔ ان دونوں کے پیچھے ابوالعباس کی پہلی دو بیویاں آرہی تھیں۔

"سلطان محمود نے اپنی بہن کے عوض خوارزم شاہ کو نہیں پورے خوارزم کو خریدنے کی کوشش کی ہے" — خوارزم کے سالار ابواسحاق نے جو ابوالعباس کا سسر بھی تھا، طنزیہ کہا۔

التگین نے پیچھے دیکھا۔ پیچھے دو اجنبی بیٹھے ہوئے تھے جو سلطان محمود کی جاسوسی کے نظام کے اعلیٰ حاکم تھے۔

"آپ کہاں سے آئے ہیں؟" — التگین نے مسکرا کر اُن سے فارسی زبان میں پوچھا۔

دونوں مسکرائے اور سر ہلا دیئے۔ یہ اشارہ تھا کہ ہم آپ کی زبان نہیں سمجھتے، حالانکہ ان دونوں کی مادری زبان فارسی تھی۔ التگین، خمرطاش اور ابواسحاق نے باری باری اُن سے اشاروں میں پوچھنے کی کوشش کی تو ایک نے کہا — "کرک تاغ" — یہ شرق میں بہت دور ایک پہاڑی علاقہ تھا جہاں کی زبان کچھ اور تھی۔

"یہ ہماری زبان نہیں سمجھتے" — التگین نے اپنے ساتھیوں سے کہا — "میں یہی معلوم کرنا چاہتا تھا..... ہاں، ابواسحاق! آپ کیا کہہ رہے تھے؟"

"میں کہہ رہا تھا کہ یہ شادی غزنی اور خوارزم کی ہوئی ہے" — ابواسحاق نے کہا — "سلطان محمود اور اُس کی بہن اس نوجوان مامون کو انگلیوں پر نچائیں گے اور اسے پتہ ہی نہیں چلے گا کہ خوارزم پر غزنی کا قبضہ ہو گیا ہے۔ کیا آپ اس صورت کو برداشت کر

لیں گے التگین؟"

"وقت آنے دو" — التگین نے کہا — "خوارزم میں غزنوی آئے تو ان کی لاشیں بھی نہیں ملیں گی۔"

"اس کا انتظام پہلے سے ہونا چاہئے" — سالار خمرطاش نے کہا۔

"فوج آپ کی کمان میں ہے" — امیر التگین نے کہا — "اسے اپنے اثر میں لے لیں۔"

"کیا ہمیں یہ باتیں یہاں کرنی چاہئیں؟" — ابواسحاق نے کہا۔

"گھبرائیں نہیں" — خمرطاش نے کہا — "پیچھے والے دونوں ہماری زبان نہیں سمجھتے۔"

"دائیں بائیں آواز جا سکتی ہے" — التگین نے کہا — "احتیاط ضروری ہے... ابواسحاق! کیا آپ کی بیٹی کا ابوالعباس پر کوئی اثر نہیں؟"

"ہے تو سہی" — ابواسحاق نے کہا — "لیکن اب کیسے رہے گا۔ محمود کی بہن بہت چالاک عورت ہے۔ اب میری بیٹی کا اثر ختم ہو جائے گا۔"

پیچھے بیٹھے ہوئے دونوں آدمی ان کی باتیں غور سے سن رہے تھے۔ التگین اور اُس کے ساتھیوں نے جب بھی پیچھے دیکھا، اُن دونوں کو گھوڑوں کے کھیل تماشے میں محو پایا۔ گھوڑوں کے دوڑنے کا اور مہمانوں کی چیخ و پکار کا شور بہت زیادہ تھا۔ سلطان محمود کے یہ دو حاکم التگین اور دونوں سالاروں کی باتیں سننے کی کوشش کرتے رہے مگر انہوں نے موضوع بدل لیا تھا۔ ان کی باتوں سے یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ وہ اس شادی سے خوش نہیں اور وہ اس کے خلاف کوئی کارروائی کریں گے۔

جشن کا ہنگامہ آدھی رات کو ختم ہوا۔

امیر بخارا التگین، سالار ابواسحاق اور خمرطاش ایک کمرے میں بیٹھے تھے۔ دروازہ آہستہ سے کھلا اور ایک عورت اندر آئی جس کا چہرہ نقاب میں تھا۔ اندر آتے ہی اُس نے چہرے سے نقاب ہٹا دیا۔ وہ ابوالعباس کی بیوی اور ابواسحاق کی بیٹی انگوری تھی۔

"مگر ان کی باتیں معلوم ہو گئی ہیں" — انگوری نے بیٹھتے ہوئے کہا — "کاہ کاکی

کی جو خادمہ رات کے لیے مقرر کی گئی تھی، میں نے اُسے پیسے دے کر ہاتھ میں لے لیا تھا۔ رات اُس نے حجلۂ عروسی کے دروازے کے ساتھ کان لگائے رکھے تھے۔ اُسے کوئی وہاں سے ہٹا نہیں سکتا تھا کیونکہ اُسے دروازے پر ہی موجود رہنا تھا۔ اُس نے دروازے کا ایک کواڑ ذرا سا کھلا رکھا تھا۔ کچھ دیر بعد اُسے اندر بلا لیا گیا تھا۔ اُس کی موجودگی میں بھی ابوالعباس اور کاکی باتیں کرتے رہے تھے۔ سب سے پہلے میں آپ کو یہ بتا دیتی ہوں کہ کاہ کاکی صرف بیوی بن کر نہیں آئی۔ وہ ایک پیغام اور ایک پھندہ بن کر آئی ہے۔ ابوالعباس بھی اُسے صرف بیوی نہیں سمجھتا۔ اُسے اپنے دل کی ملکہ اور سراپا عشق کہتا ہے۔ خادمہ نے جو باتیں سنائی ہیں وہ میں آپ کو سنا دیتی ہوں۔"

کسی بادشاہ اور ملکہ کی رات کی خادمہ کے ایسے رات کی باتیں معلوم کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ خادمہ نے اکبری کو جو باتیں سنائیں وہ کچھ اس طرح تھیں۔

"ابوالعباس!" — کاہ کاکی نے کہا — "اگر تم نے میرے ساتھ صرف اس لیے شادی کی ہے کہ تمہیں تیسری بیوی کی ضرورت تھی تو مجھے بتا دو۔ میں تمہاری محبت کو سینے میں دفن کر کے اس پر آنسو بہا لوں گی۔"

"مجھے تمہاری ضرورت تھی" — ابوالعباس نے کہا — "میرے لیے بیویوں کی تو کمی نہیں... کیا تم جب میرے بھائی کی بیوی تھیں تو بھی مجھے اسی طرح چاہتی رہی ہو؟"

"وہ محبت کچھ اور تھی ابوالعباس!" — کاکی نے جواب دیا — "ایک بُت شکن سلطان کی بہن اپنے خاوند کو دھوکہ نہیں دے سکتی۔ تم مجھے اچھے لگتے تھے۔ تمہاری عادتیں اچھی لگتی تھیں۔"

"تو میں یہ سمجھوں کہ تم نے میری زوجیت اس لیے قبول کی ہے کہ میں تمہیں اچھا لگتا تھا؟"

"صرف اس لیے نہیں" — کاہ کاکی نے کہا — "جس طرح تمہارے لیے بیویوں کی کمی نہیں اسی طرح میرے لیے بھی خاوندوں کی کمی نہیں تھی۔ سلطنتِ غزنی میں ایک سے ایک خوبصورت اور بہادر جوان تھا لیکن تمہاری زوجیت قبول کرنے کی ایک وجہ اور بھی ہے۔ میں تمہارے لیے صرف محبت نہیں لائی، ایک پیغام بھی لائی ہوں۔ یہ پیغام

میرے باپ کا نہیں، خدا کا ہے... کیا تم اس سے انکار تو نہیں کرو گے کہ غزنی کو آنے والی نسلیں بُت شکنوں کا اور باطل کو روندنے والوں کا شہر کہا کریں گی؟ اور کیا تم اس سے انکار کرو گے کہ غزنی اپنے اردگرد کی تمام مسلمان امارتوں اور ریاستوں کے حکمرانوں کے دلوں میں کانٹا بن کر اٹکا ہوا ہے اور وہ اسلام کی تاریخ کے اس درخشاں باب پر سیاہی انڈیلنا چاہتے ہیں؟"

"مجھے انکار نہیں" — ابوالعباس نے کہا — "تم جو کہہ رہی ہو یہ بالکل سچ ہے لیکن تم نے ان باتوں کے لیے آج کی رات کیوں منتخب کی ہے؟ کیا تم میرے رومانوں اور میرے اتنے پیارے خوابوں کو آج ہی رات میدانِ جنگ میں لے جانا چاہتی ہو؟"

"ہاں... آج ہی رات" — کاہ کاکی نے کہا — "ازدواجی زندگی کی پہلی رات بڑی مقدس ہوتی ہے ابوالعباس! یہ رات تمہارے لیے نئی نہیں، اور یہ رات میرے لیے بھی نئی نہیں۔ میں تمہیں رومانوں اور خوابوں سے محروم نہیں کروں گی۔ اگر تمہارے خواب میرے وجود سے حسین ہیں تو میں اُن کا حسن پامال نہیں ہونے دوں گی۔ مجھے دل کی بات کہہ لینے دو اور مجھے اپنے دل کی بات کہہ لینے دو۔ ابھی ساری رات باقی ہے۔ ابھی ساری عمر کی راتیں باقی ہیں۔ ذرا سی دیر کے لیے میری سُن لو...

"آج کی رات جو ہم دونوں کے لیے مسرتوں اور رومانوں کی رات ہے، غزنی کی ہزاروں ماؤں اور ہزاروں بہنوں کے لیے بڑی ہی اُداس اور غمناک رات ہے۔ وہ اُن بیٹوں اور اُن بھائیوں کے انتظار میں جاگ رہی ہیں جو کبھی نہیں آئیں گے۔ وہ اللہ اکبر کے نعرے لگاتے ہندوستان گئے تھے اور حق اور باطل کے خونریز تصادم میں پس گئے۔ وہ خدا کے حضور سرفرو ہوئے کہ وہ جدھر گئے مسجدیں آباد رکھیں اور بُت خانے زمین سے ملا دیئے۔ وہ اللہ کے عظیم پیغام پر قربان ہو گئے۔ میں آج رات کی مسرتیں اُن کی نذر کرتی ہوں...

"اور پھر انہیں یاد کرو جو تخت و تاج کے ہوس کاروں کی ہوس کی بھینٹ چڑھ گئے۔ ہماری سرزمین خانہ جنگی کے خون سے لال ہو گئی تھی، اور اگر آج رات تم میری باتیں غور سے نہیں سنو گے تو یہاں بھائی کی تلوار ہم گردن کاٹتی رہے گی بھائیوں کی

کمانوں سے نکلے ہوئے تیر بھائیوں کے سینوں میں اترتے رہیں گے۔ آج کی رات مجھے اُن کی بھی باتیں اور نہیں یاد آرہی ہیں جو اپنے بادشاہوں کی خواہشوں پر کٹ مرتے تھے۔ تم ابھی جوان ہو ابوالعباس! میں بھی ابھی جوان ہوں۔ آؤ، تھوڑی سی دیر جوانی کے اُبال کو اور عروسی کے جذبات کو الگ رکھ کر دو چار باتیں کرلیں ....

"خوارزم نے ابھی تک غزنی پر حملے کی کیوں نہیں سوچی؟ تمہارا باپ کیوں قتل ہو گیا تھا؟ کیونکہ اُس نے غزنی پر قبضہ کرنے کی نہیں سوچی تھی۔ اُسے کہا گیا تھا۔ وہ نہ مانا اور قتل کر دیا گیا۔ تمہارے بڑے بھائی کا دماغ خراب ہو چلا تھا لیکن اُس نے میرے ساتھ شادی کرلی۔ میں نے پہلی رات اُس کے ساتھ بھی باتیں کی تھیں۔ یہ باتیں اُس کے دل میں اتر گئیں"!

"کیا تم نے بھی سنا تھا کہ میرے بھائی کو تمہارے بھائی سلطان محمود نے زہر دلوایا تھا؟" ابوالعباس نے کہا۔ "اور زہر دلوانے کی وجہ یہ تھی کہ اُس نے سلطان محمود کی اطاعت قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔"

"کیا تمہیں اس جھوٹ پر یقین آگیا تھا؟" کاہ کاکجی نے پوچھا۔

"مجھے شک تھا۔"

"شک بھی نہیں ہونا چاہیے تھا" ـــ کاہ کاکجی نے کہا۔ "اپنی فوج سے چار پانچ گنا زیادہ فوج پر ٹوٹ پڑنے والا سلطان کسی کو زہر نہیں دیا کرتا۔ اُسے تمہارے بھائی کی موت کی ضرورت ہوتی تو وہ یہاں خود آتا، جرجانیہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتا اور تمہارا بھائی اُس کے قید خانے میں پڑا ہوا ہوتا۔ میں تمہیں یہ کہہ رہی تھی کہ تمہارے بھائی نے میری باتوں کا اثر لیا اور اُس نے غزنی کے ساتھ دشمنی مول لے لی۔ یہ شک مجھے بھی ہے کہ تمہارے بھائی کو ایسا زہر دیا گیا تھا جو آہستہ آہستہ بیماری کی صورت میں ظاہر ہوا اور وہ مجھے بیوہ کر گیا۔ اگر اُسے زہر ہی دیا گیا تھا تو اُن لوگوں نے دیا تھا جو غزنی اور خوارزم کو لڑانا چاہتے تھے۔"

"وہ کون ہو سکتے ہیں؟" ـــ ابوالعباس نے پوچھا۔

"وہ ہیں تو مسلمان لیکن ان سازشوں اور خانہ جنگی کے پیچھے فرنگیوں کا ہاتھ ہے" ـــ کاہ کاکجی نے کہا۔ "یہ یہودیوں اور عیسائیوں کا خفیہ ہاتھ ہے اور اس میں قرامطی بھی شامل ہیں جن کے مرکز اور سرغنہ کو میرا بھائی ختم کر چکا ہے۔"

"کاکجی!" ـــ ابوالعباس نے گھبرا کر کہا۔ "میں اسی عمر میں قتل نہیں ہونا چاہتا۔"

"کہو، میں قتل ہونا چاہتا ہوں لیکن اللہ کی راہ میں" ـــ کاکجی نے کہا۔ "میرا بھائی ہندوستان میں جا کر قتل ہونے کی مسلسل کوشش کر رہا ہے۔ میں جانتی ہوں، بلکہ خدا جانتا ہے کہ تم میرے بھائی کے دوش بدوش چلو۔ میں اپنا سہاگ قربان کرنے کے لیے تیار ہوں۔ تم اتنا کرو کہ سلطنتِ غزنی کے ساتھ اتحاد کرلو۔"

"آج کل سلطان کو ایک طاقتور اتحادی کی ضرورت ہے" ـــ ابوالعباس نے کہا۔ "اس کی جنگی طاقت بہت کمزور ہو گئی ہے۔"

"یہ غلط ہے" ـــ کاہ کاکجی نے کہا۔ "غزنی کی جنگی طاقت اتنی کمزور نہیں ہوئی جتنی تم سمجھتے ہو۔ غزنی میں خاصی فوج موجود ہے۔ ہندوستانیوں کے دستے بھی ہیں جنہیں ہندوستان میں نہیں لے جایا جاتا۔ انہیں یہاں لڑانے کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ وہ ہمارے پاس بہت خوش ہیں اور اسلام قبول کرتے جا رہے ہیں۔ سلطنتِ غزنی سے ہزار ہا رضاکار عارضی طور پر فوج میں شامل ہو گئے ہیں، اور جو کمی ہے وہ جذبے سے پوری کی جاتی ہے۔ لہٰذا دل سے یہ خیال نکال دو کہ سلطان محمود کو اپنی سلطنت کے دفاع کے لیے کسی طاقتور اتحادی کی ضرورت ہے۔ البتہ تمہیں ایک مخلص اور طاقتور اتحادی کی ضرورت ہے۔"

ابوالعباس کمرے میں ٹہلنے لگا۔ کچھ دیر سوچ کر بولا ـــ "میں تمہارے بھائی سے اتحاد کرلوں گا لیکن اُس کی اطاعت قبول نہیں کروں گا۔ اگر اُس نے کہا کہ خطبے میں اُس کا نام لیا جائے تو اس کی اجازت نہیں دوں گا.... کاکجی! میں اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہوں کہ تمہاری محبت کے علاوہ تمہارے ساتھ شادی کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میں اندرونی اور بیرونی خطرات میں اتنا گھر چکا ہوں کہ مجھے تمہارے بھائی کی دوستی کی ضرورت ہے اور مجھے امید ہے کہ وہ دوستی کا حق ادا کرے گا۔"

"میں اس کی ذمہ داری لیتی ہوں کہ وہ دوستی کا حق ادا کرے گا" — کامی نے کہا — "لیکن اصل ضرورت یہ ہے کہ اگر تمام مسلمان امارتیں کفر کے خلاف متحد نہ ہوں تو خوارزم اور غزنی اس محاذ پر دوش بدوش لڑیں۔"

"ایسا ہی ہوگا" — ابوالعباس نے کہا۔

اور ابوالعباس نے رومانی اور جذباتی باتیں شروع کر دیں۔ خادمہ نے انگوری کو بتایا کہ وہ دیکھ تو نہیں سکتی تھی، اُن کی باتیں سُن سکتی تھی۔ خادمہ کا خیال تھا کہ اتنی خشک باتیں کرنے والی اور جہاد کا وعظ دینے والی عورت رومانی باتوں اور حرکتوں میں کوری ہوگی مگر اُس کی ہنسی بھی رومان انگیز تھی اور باتیں ایسی کہ ابوالعباس پر نشہ طاری ہوگیا ہوگا۔ کامی کھلنڈری لڑکی بن گئی۔ خادمہ نے بتایا کہ اُس کی باتیں تو بہ شکن تھیں۔

التگین نے خادمہ کو دینے کے لیے انگوری کو سونے کے دو دینار دیئے اور اُسے کہا کہ وہ ان دونوں کی ہر ایک بات خادمہ سے پوچھتی رہے خواہ کوئی بات کتنی ہی غیر اہم کیوں نہ ہو۔

انگوری چلی گئی تو التگین نے ابواسحاق اور خمرطاش سے کہا — "ہمارا خیال صحیح نکلا۔ یہ شادی بلامقصد نہیں ہوئی۔"

"یہ اتحاد نہیں ہوگا" — ابواسحاق نے کہا — "خوارزم شاہ ابوالعباس کو جوانی اور رومانوں نے اندھا کر رکھا ہے۔ ہم اس کے وزیر ابوالحارث کو ہاتھ میں لے گئے ہیں۔"

"ابوالحارث بہت خطرناک آدمی ہے" — التگین نے کہا — "اس کے ساتھ کوئی بات نہ کرنا۔ وہ مامونی خاندان کا پروردہ اور وفادار ہے۔ جو کچھ کرنا ہے ہمیں خود کرنا ہے۔ اگر ابوالعباس زن مرید بن گیا تو اسے زیادہ دن زندہ نہیں رہنے دیا جائے گا۔ ابوالعباس بچہ ہے۔ وہ سمجھ نہیں سکا کہ محمود نے بہن دے کر خوارزم کا سودا کیا ہے۔"

"ہمیں فوج کو ہاتھ میں لینے کی ضرورت ہے" — سالار خمرطاش نے کہا — "فوج خوارزم شاہ کی وفادار ہے۔"

"دارالحکومت (جرجانیہ) میں فوج تھوڑی سی ہے" — التگین نے کہا — "فوج

کا زیادہ تر حصہ ہزار اسپ میں اور میرے پاس بخارا میں ہے۔ اس فوج کو اپنے اثر میں لانا ہے .... مجھے سوچنے دو۔ میں شاید کوئی انتظام کر لوں گا۔ خانہ جنگی کے لیے فوج کو کوئی گھاگ استاد ہی تیار کر سکتا ہے۔"

خوارزم کے دارالحکومت جرجانیہ سے پچاس میل دور جنوب میں دریا کے کنارے ہزار اسپ بہت بڑی چھاؤنی تھی۔ وہاں فوج ایک مدت سے فارغ پڑی تھی۔ وہ جنگ وجدل کا زمانہ تھا مگر خوارزم کی اس فوج نے برسوں سے کوئی لڑائی نہیں لڑی تھی۔ کمانداروں اور سپاہیوں کے دماغ فارغ تھے۔ اُن کے شب و روز ہنسی مذاق، گپ بازی اور بیکار مشاغل میں گزر رہے تھے۔ فوج کا رجحان مذہب کی طرف کم ہی تھا۔

ایک روز ایک فقیر جس کی داڑھی سیاہ و سفید تھی، اور جو کندھوں سے پاؤں تک لمبے کرتے میں ملبوس تھا جس کا رنگ سبز تھا، فوجیوں کی بارکوں کے قریب سے گزرا۔ اُس نے سر پر سبز رنگ کا صافہ لپیٹ رکھا تھا۔ صافے پر موٹے دانوں کی تسبیحاں لپٹی ہوئی تھیں۔ صافے کے علاوہ ایسی ہی تسبیحاں جن کے دانوں کے کئی رنگ تھے، اس کے گلے میں پڑی ہوئی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں لمبا عصا اور دوسرے ہاتھ میں ایک کتاب تھی۔ وہ دھماکہ نما بلند آواز سے بولتا جا رہا تھا — "لا الہ الا اللہ۔ لا الہ الا اللہ" — اس کے ساتھ ہی وہ عصا زور سے زمین پر ٹھونکتا تھا۔

فوجیوں نے اس قسم کا فقیر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ سپاہیوں کے ایک ہجوم نے اسے گھیر لیا۔ وہ رک گیا اور آسمان کی طرف منہ کر کے بلند آواز سے بولا — "دریا کے کنارے ڈوب جائیں گے۔ پہاڑ پھٹ جائیں گے۔ آسمان آگ برسائے گا .... لا الہ الا اللہ۔ لا الہ الا اللہ۔"

اُس نے اپنے گرد کھڑے سپاہیوں کی طرف نہ دیکھا اور ایک طرف چل پڑا۔ اُس نے لا الہ الا اللہ کے دھماکوں کے ساتھ عصا زمین پر مارا تو سپاہیوں نے اُسے راستہ دے دیا۔ بعض سپاہی اس کے پیچھے چل پڑے۔ ایک سپاہی نے اس کے ہاتھ میں چاندی کا ایک درہم دے دیا۔ چند اور سپاہیوں نے اسے دینے کے لیے جیبوں سے

درہم نکالنے۔ وہ اسے بھکاری فقیر سمجھ رہے تھے لیکن فقیر کے ہاتھ میں جو درہم تھا وہ اُس نے دانتوں میں لے کر دوہرا کر دیا اور اسے ہوا میں اچھال کر دُور پھینک دیا۔ باقی سپاہیوں نے جیبوں سے نکالے ہوئے درہم اپنی جیبوں میں ڈال لیے۔ اُس کی اس بے نیازی سے سب مرعوب ہو گئے۔

دو آدمی تیز تیز چلے آ رہے تھے۔ انہوں نے سپاہیوں کے ہجوم کو روک لیا۔ ان میں سے ایک نے سپاہیوں سے کہا — "اسے پریشان نہ کرنا۔ ایسے پیسے بھی نہ دینا۔ اس کے منہ سے جو بات نکل جائے وہ پوری ہو کے رہتی ہے۔ یہ غیب کا کوئی پیغام دے رہا ہے۔ یہ پندرہ سولہ سال بعد نظر آیا ہے۔ تمہیں یاد ہو گا کہ پندرہ سولہ سال پہلے سمرقند میں زلزلہ آیا تھا۔ زلزلے سے ایک دو دن پہلے یہ فقیر سمرقند کی گلیوں میں نظر آیا تھا۔ یہ اسی طرح لا الٰہ الا اللہ پڑھتا، عصا زمین پر ٹھونکتا اور بلند آواز سے کہتا پھرتا تھا — 'سمرقند کی زمین گناہگاروں کے بوجھ سے تھک گئی ہے' — اس کی پکار کو کوئی بھی نہ سمجھ سکا۔ یہ وہاں سے غائب ہو گیا اور زمین اتنے زور سے ہلی کہ آدھا سمرقند تباہ ہو گیا۔ شراب خانے اور قحبہ خانے زمین سے مل گئے۔"

"اور اب یہ یہاں نظر آیا ہے" — دوسرے آدمی نے گھبراہٹ کے عالم میں کہا — "اب معلوم نہیں دریا میں سیلاب آئے گا یا کوئی پہاڑ پھٹے گا یا آسمان سے آگ کس طرح برسے گی۔ کچھ ہو گا ضرور۔ کچھ ہونے والا ہے۔"

سپاہیوں پر خوف طاری ہو گیا۔ اُن کے رنگ زرد ہو گئے۔ کسی نے پوچھا کہ اس سے کس طرح پوچھا جائے کہ کیسی تباہی آ رہی ہے؟ کیوں آ رہی ہے؟ کیا یہ ٹل سکتی ہے؟ اَن پڑھ اور توہم پرست سپاہیوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور وہ آپس میں کھسر پھسر کرتے بارکوں میں چلے گئے۔ تھوڑی سی دیر میں تمام تر فوج میں یہ دہشت ناک خبر پھیل گئی کہ ایک فقیر تباہی کا پیغام دیتا پھر رہا ہے۔ خبر جُوں جُوں پھیلتی گئی، زیادہ سے زیادہ دہشت ناک ہوتی گئی۔ بارکوں میں یہی فقیر موضوع بن گیا اور سب اس مسئلے کا حل سوچنے لگے کہ فقیر سے کس طرح پوچھا جائے کہ کیسی تباہی آ رہی ہے اور کیوں آ رہی ہے۔

دوسرے دن خبر پھیل گئی کہ فقیر کو دریا کے کنارے دیکھا گیا ہے جہاں اُس نے چھوٹا سا ایک خیمہ لگا رکھا ہے۔ چند ایک سپاہی دریا کو چل دیئے۔ اُنہوں نے وہاں چھوٹا سا ایک خیمہ دیکھا جس کے قریب تین چار آدمی بیٹھے تھے۔ سپاہی ان کے قریب چلے گئے۔ خیمے کے اندر سے دھمکے جیسی آوازیں آ رہی تھیں — "لا الٰہ الا اللہ۔ لا الٰہ الا اللہ۔۔۔ خون کا طوفان ہے۔ روک لو۔ روک لو۔"

باہر جو آدمی بیٹھے تھے، انہوں نے سپاہیوں کو بتایا کہ وہ رات بھر یہاں رہے ہیں اور فقیر اپنا عصا دریا میں ڈبو ڈبو کر اس کی گہرائی دیکھتا رہا ہے۔ ان آدمیوں نے فقیر کے پاؤں چھو کر پوچھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ فقیر نے آسمان کی طرف دیکھا تو تین ستارے اکٹھے ٹوٹے اور شرارے بکھیرتے بہت دُور دُور جا پھٹے۔ فقیر نے منہ اوپر کیے ہوئے کہا — "ابھی وقت ہے۔ باز آ جاؤ۔ خون کی طغیانی کو روک لو۔"

ان آدمیوں نے سپاہیوں کو بتایا کہ وہ اس فقیر کی کچھ خدمت کرنا چاہتے ہیں لیکن یہ ان کی طرف دیکھتا ہی نہیں۔ سپاہی وہاں کھڑے فقیر کی آوازیں سنتے رہے اور ان آدمیوں کو فقیر کے متعلق جو کچھ معلوم تھا، پوچھتے رہے اور فقیر ان کے لیے خدا کا ایلچی بن گیا۔ یہ سپاہی جب بارکوں میں گئے تو انہوں نے فقیر کے متعلق کچھ نئی باتیں بتا کر سنسنی پھیلا دی۔ اُس روز کے بعد فقیر کا چھوٹا سا خیمہ سپاہیوں اور شہر کے لوگوں کے لیے زیارت گاہ بن گیا۔ وہ وہاں جاتے اور خیمے کے سامنے کھڑے ہو جاتے۔ خیمے کے اندر فقیر قرآن کی آیات بلند آواز سے پڑھتا اور للکارنے لگتا — "خون کا طوفان آ رہا ہے۔ انسان انسان کو کھائے گا۔۔۔ بادشاہ عورت کا غلام ہو گیا ہے۔"

سُلطان محمود غزنوی کے وہ دو حاکم جو اُس کے نظام جاسوسی اور سراغرسانی کے سربراہ تھے، سلطان محمود کو بتا چکے تھے کہ انہوں نے ابوالعباس کی شادی کے جشن پر امیر التگین، سالار ابو اسحاق اور سالار خمرطاش کی باتیں سنی تھیں اور ان تینوں کی نیت ٹھیک نہیں۔ اس جشن کو اڑھائی تین مہینے گزر گئے تھے۔ سلطان محمود نے ان دونوں سے کہا تھا کہ وہ ابوالعباس کے محل میں اور جرجانیہ میں اپنے چند ایک تجربہ کار آدمی

بھیج دیں جو اس سازش کا سراغ لگاتے رہیں۔ اس حکم کے تحت تین چار آدمی جرجانیہ بھیج دیئے گئے تھے مگر وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ اُن کا رابطہ کاہ کا بجی کے ساتھ بھی ہو گیا تھا اور وہ انہیں یہی اطلاعیں دیتی رہی کہ ابوالعباس سُلطان محمود کے خلاف نہیں ہو سکتا۔

جو کچھ تھا وہ ہزار اسپ اور بخارا میں تھا۔ ہزار اسپ میں دریا کے کنارے فقیر لوگوں خصوصاً فوجیوں کے دلوں پر چھا گیا تھا۔ وہاں سے دو سو میل دور بخارا میں دریائے زرافشاں کے کنارے ایک اور فقیر مشہور ہو گیا جس نے وہاں ڈیرے ڈال دیئے تھے لیکن وہ اکیلا نہیں تھا۔ اُس کے ساتھ چار پانچ مرد اور اتنی ہی عورتیں تھیں۔ اس فقیر کی یہ کرامات مشہور ہو گئیں کہ وہ ایک دوائی اور ایک تعویذ دیتا ہے جن سے انسان ہمیشہ جوان رہتا ہے اور اس کی عمر بڑی لمبی ہو جاتی ہے۔ ہر انسان لمبی عمر اور بڑھاپے میں بھی جوانی کا طلبگار ہوتا ہے لیکن فوجی پر چونکہ ہر وقت موت منڈلاتی رہتی ہے اس لیے وہ ایسے تعویذ کی ضرورت زیادہ محسوس کرتا ہے جو موت کو ٹال سکے۔ چنانچہ بخارا کے فوجی جوق در جوق اس فقیر کے پاس جانے لگے۔

پھر دونوں فقیروں نے لوگوں کو وعظ سنانے شروع کر دیئے۔ دونوں کے وعظوں کا لُبِّ لُباب یہ ہوتا تھا کہ تم اللہ کے سپاہی ہو اور تمہارے پڑوس کی تمام ریاستیں اور امارتیں برائے نام مسلمان ہیں اور وہ تمہیں اپنا غلام بنانا چاہتی ہیں۔ اگر تم نے کسی پڑوسی پر اس لیے بھروسہ کیا کہ وہ مسلمان ہے تو تم پر ایسی تباہی آئے گی کہ تمہارا نام و نشان مٹ جائے گا۔

ان دونوں نے فقیری اور درویشی کا ایسا ... ایک لفظ سپاہیوں کے دل میں اتر جاتا تھا۔

التگین ایک رات اپنے خاص کمرے میں بیٹھا تھا۔ اُس کے سامنے دو آدمی بیٹھے تھے جو خوارزم کے رہنے والے نہیں تھے اور وہ مسلمان بھی نہیں تھے۔ دونوں فرنگی تھے۔

”آخر اس ڈھونگ سے آپ کیا نتائج حاصل کرنا چاہتے ہیں؟“ — التگین نے اُن سے پوچھا۔

”آپ نے ہماری مدد کیوں حاصل کی ہے؟“ — ایک نے جواب دیا — ”صرف اس لیے کہ آپ فوج کو اپنا حامی بنا کر خوارزم شاہ بننا چاہتے ہیں مگر خوارزم کی فوج آپ کا یہ حکم ماننے کے لیے تیار نہیں کہ آپ جرجانیہ یعنی اپنے دارالحکومت پر حملہ کر کے وہاں کی فوج کو شکست دیں اور ہزار اسپ اور بخارا میں جو فوج مقیم ہے وہ اپنے بھائیوں کے خلاف لڑے۔ ہم نے یہاں آ کر جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ خوارزم کی فوج ابھی تک آپس میں لڑنا تو درکنار، اپنے کسی مسلمان پڑوسی کے خلاف بھی نہیں لڑی اور اس فوج کو یہ تربیت دی گئی ہے کہ مسلمان مسلمان کے خلاف نہیں لڑا کرتا۔ ہمیں سب سے پہلے ہزار اسپ اور بخارا میں جو دستے مقیم ہیں ان کے دلوں سے اسلام کا رشتہ توڑنا ہے ....

”توہم پرستی واحد ذریعہ ہے جس سے کسی کے مذہب کو کمزور کیا جا سکتا ہے۔ یہ انسان کی کمزوری ہے کہ وہ آنے والے وقت کے حالات اور ہونے والے واقعات جاننا چاہتا ہے۔ انسان کی دوسری کمزوری جنسی اور جذباتیت ہے جو انسان جنسی خیز باتوں کو پسند کرنے لگتا اور عقل پر جذبات کو غالب کر لیتا ہے، اُسے نہایت آسانی سے اپنے سانچے میں ڈھالا جا سکتا ہے۔ انسان جتنا اَن پڑھ اور پسماندہ ہوتا ہے وہ اتنا ہی جذبات سے مغلوب ہوتا ہے۔ انسان کی تیسری کمزوری یہ ہے کہ وہ لمبی عمر چاہتا اور مرنے تک جوان رہنا چاہتا ہے ....

”ہم نے آپ کے کمانداروں اور سپاہیوں کی یہ خامیاں ان دو فقیروں کے ذریعے بیدار کر دی ہیں۔ یہ دونوں فقیر اس فن کے ماہر ہیں۔ انہوں نے مذہب کا نام لے لے کر سپاہیوں کے دلوں میں مذہب کی جگہ توہم پرستی بھر دی ہے۔ دونوں فقیر آپ کے قرآن سے آیات پڑھ کر بات کرتے ہیں اور ان کی ہر بات قرآن کے اُلٹ اور اسلام کے منافی ہوتی ہے۔ ہمارے اُستادوں نے آپ کی فوج کے دلوں میں اسلام کی محبت قائم رکھتے ہوئے پڑوسی مسلمانوں کے خلاف شکوک اور وسوسے پیدا کر دیئے ہیں ....

”ہم عیسائی مذہب سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ہمیں آپ کے مذہب کی ہر بات معلوم

ہے۔ ہم نے آپ کے سپاہیوں پر مذہبی جنون طاری کر دیا ہے۔ ہمارے بہت سے آدمی جو مسلمان ہی ہیں، آپ کی چھاؤنیوں میں گھومتے پھرتے رہتے ہیں۔ وہ افواہیں پھیلاتے ہیں اور وہ ہر محفل میں کہتے ہیں کہ خوارزم کو سلطان محمود سے صرف الپتگین بچا سکتا ہے۔ خوارزم شاہ ابوالعباس اور اس کی بیوی کاہ کالجی کے خلاف اتنا زہر پھیلا دیا گیا ہے کہ سپاہی انہیں ناپسند کرنے لگے ہیں۔ چند دنوں میں ہی آپ کی فوج بغاوت کے لیے تیار ہو جائے گی ....

"آپ کے دو نائب سالار جو ابوالعباس کے کٹر حامی تھے، انہیں ہم نے دو جوان اور بڑی ہی خوبصورت عورتوں کے ذریعے اپنے اثر میں لے لیا ہے۔ آپ کو شاید معلوم نہیں تھا کہ یہ دونوں آپ کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ اب وہ بھی آپ کو پسند کرنے لگے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کو اگر کوئی اور مدد چاہیے تو ہمیں بتا دیں۔ ہم آپ کو مالی مدد دے سکتے ہیں۔ اسلحہ دے سکتے ہیں۔ جانور دے سکتے ہیں۔"

"ابھی نہیں" ـــ الپتگین نے کہا ـــ "اگر آپ نے مجھے مدد دی تو خوارزم شاہ کو پتہ چل جائے گا۔ مجھے ایک بہانہ اور ایک موقع چاہیے تاکہ میں فوج کو اس کے خلاف بھڑکا سکوں اور اپنا حامی بنا لوں۔ میں نے خوارزم شاہ کا تختہ الٹ دیا تو آپ سے مدد لوں گا۔"

"اور میں ایک بار پھر کہہ دوں کہ ہمیں آپ سے کچھ نہیں لینا" ـــ دوسرے فرنگی نے کہا ـــ "ہمیں آپ کی صرف دوستی چاہیے۔ پھر ہم آپ پر ثابت کریں گے کہ کلیسا اور کعبہ میں کتنا پیار ہے۔ اس پیار میں سلطان محمود حائل ہے۔ محمود کا خاتمہ ضروری ہے۔"

"میں بھی یہی چاہتا ہوں" ـــ الپتگین نے کہا ـــ "محمود سلطنت غزنی کی توسیع چاہتا ہے۔"

"آپ کو شاید معلوم ہو گا کہ آپ کی فوج کسی مسلمان ملک کے خلاف تو نہیں لڑے گی، یہ غزنی کے خلاف بالکل ہی نہیں لڑے گی" ـــ فرنگی نے کہا ـــ "یہ سلطان محمود کی بہن کاہ کالجی کا اثر ہے۔ ہماری آنکھیں اس کمرے کے اندر تک دیکھ سکتی ہیں جس میں ابوالعباس اپنی پہلی دو بیویوں کو فراموش کر کے کاہ کالجی کے جادو میں اپنے ہوش کھو بیٹھتا ہے۔

ابوالعباس غزنی کو فوجی مدد دے گا۔ اس کے خلاف لڑے گا نہیں۔"

دو بڑی دلکش لڑکیاں ان تینوں کو شراب پلا رہی تھیں اور الپتگین پر شراب کا نشہ کم اور لڑکیوں کا خمار زیادہ طاری ہو رہا تھا۔ وہ بار بار ان لڑکیوں کو دیکھتا تھا۔ دونوں فرنگی اس پر خوارزم شاہی کا نشہ طاری کر رہے تھے۔

کاہ کالجی کے پاس غزنی سے ایک نیا ملازم آیا تھا۔ وہ جبیس نام کا ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ کالجی نے ابوالعباس کو بتایا تھا کہ یہ اس کا خاص ملازم تھا جسے اس کے بھائی سلطان محمود نے اس کے پاس بھیج دیا ہے۔ ابوالعباس کو بھی یہ ملازم بہت پسند آیا تھا۔ اس میں خاص قسم کی شائستگی، نفاست اور ذہانت تھی۔ وہ دوسرے ملازموں، خدمت گاروں اور خادماؤں پر نگرانی کی اور انہیں اپنے قابو میں رکھنے کی مہارت رکھتا تھا۔

ایک روز کالجی باغ میں بیٹھی تھی اور جبیس اس کے سامنے سر جھکائے اور ہاتھ نماز کی طرح باندھے کھڑا تھا۔ یہ انداز ایسا تھا جیسے وہ کالجی کی بات سن رہا ہو مگر وہ سن نہیں رہا بول رہا تھا اور کالجی سن رہی تھی۔

"کوئی گڑبڑ ضرور ہے" ـــ جبیس کہہ رہا تھا ـــ "بخارا اور ہزار اسپ سے جو اطلاعیں آئی ہیں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں کی فوج پر کوئی شیطانی اثر کام کر رہا ہے۔ ہزار اسپ میں دریا کے کنارے ایک فقیر نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں جو بڑی خوفناک پیشگوئیاں کرتا ہے۔ اس نے ایسا ڈھونگ رچا رکھا ہے کہ سپاہی اس سے متاثر ہو رہے ہیں۔ وہ قرآن پاک ہاتھ میں رکھتا اور سپاہیوں کو درس اور وعظ دیتا ہے۔"

"کیا یہ یقین کر لیا گیا ہے کہ وہ کوئی تارک الدنیا عالم نہیں ہے؟" ـــ کاہ کالجی نے پوچھا۔

"وہ عالم ہو سکتا ہے، تارک الدنیا نہیں، اور وہ علم نہیں ابلیسیت پھیلا رہا ہے" ـــ جبیس نے کہا ـــ "وہ غزنی کے خلاف زہر اگلتا ہے اور قرآن کی آیات پڑھ کر کہتا ہے کہ غزنی والے اور اردگرد کی تمام مسلمان ریاستیں اور امارتیں برائے نام مسلمان ہیں اور سچے مسلمان خوارزم کے لوگ ہیں۔"

"کیا وہ خوارزم شاہی کے خلاف بھی باتیں کرتا ہے؟"۔۔۔ کاکبی نے پوچھا۔

"نہیں"۔ جینس نے جواب دیا ۔۔۔ "لیکن سپاہیوں اور کمانداروں کے خیالات میں ایسی تبدیلی دیکھی گئی ہے جو خوارزم شاہی کے لیے بھی خطرناک ثابت ہو سکتی ہے ۔۔۔ بخارا میں بھی دریا کے کنارے ایک فقیر نے چند ایک مردوں اور بڑی خوبصورت عورتوں کے ساتھ خیمے گاڑ رکھے ہیں۔ اس کے متعلق مشہور ہے کہ ایک دوائی اور ایک تعویذ دیتا اور کہتا ہے کہ ان سے عمر بہت لمبی ہوگی اور جوانی سدا قائم رہے گی۔ اس کے ساتھ جو جوان عورتیں ہیں وہ راتوں کو دریا کے کنارے یا جنگل میں کمانداروں کے ساتھ دیکھی گئی ہیں۔ وہاں کی فوج کی باتوں میں بھی تبدیلی دیکھی گئی ہے۔ اس فقیر کے گرد میلہ لگا رہتا ہے۔ وہ بھی وعظ کرتا اور غزنی کے خلاف زہر افشانی کرتا ہے۔ مختصر یہ کہ غزنی اور خوارزم کے درمیان عداوت پیدا کی جا رہی ہے۔ ہمارے آدمیوں نے دونوں چھاؤنیوں میں سپاہیوں کے ساتھ اُٹھ بیٹھ کر اور ان فقیروں کے مرید بن کر ان کی باتیں سنی ہیں۔ وہی سپاہی جو فارغ رہ رہ کر غلیظ اور فحش باتیں یا حرکتیں کیا کرتے تھے، اب غزنی کی اینٹ سے اینٹ بجانے کی باتیں کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی پتہ چلا ہے کہ وہاں بہت سی بدکار عورتیں پہنچ گئی ہیں جو سپاہیوں کو خراب کر رہی ہیں۔ ہمارے ایک آدمی نے ایسی ایک عورت سے ملاقات کی ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ یہ عورتیں صرف عصمت فروش نہیں بلکہ غزنی کے خلاف اور خوارزم شاہ ابوالعباس کے خلاف زہر پھیلانے کا ایک ذریعہ ہیں۔ ان کا تعلق ان فقیروں کے ساتھ معلوم ہوتا ہے ۔۔۔

"ہمارے اس آدمی نے بتایا ہے کہ اس عورت نے اُسے دریا کے اندھیرے کنارے پر جا کر اتنے پیار سے باتیں کیں جیسے وہ لڑکپن سے جانتی ہو۔ اس نے ہمارے آدمی سے پوچھا کہ وہ کیا کرتا ہے۔ اُس نے بتایا کہ فوج کے ایک جیش کا کماندار ہے۔ یہ سنتے ہی عورت کا انداز پہلے سے زیادہ دلکش بلکہ مسحور کن ہو گیا جیسے وہ اس پر مرمٹی ہو۔ یہ عورتیں غیر معمولی طور پر حسین ہیں۔ ہمارا یہ آدمی کہتا ہے کہ اسے اپنے فرض کا احساس نہ ہوتا تو وہ ہمیشہ کے لیے اس عورت کا ہو جاتا۔ عورت نے اس پر نشہ

طاری کر کے کہا ۔۔۔ 'تمہارا خوارزم شاہ تو زن مرید ہو گیا ہے۔ غزنی کی کاہ کاکبی نے اس کی عقل پر قبضہ کر لیا ہے اور وہ اسے انگلیوں پر نچا رہی ہے' ۔۔۔۔

"ہمارے آدمی نے پوچھا کہ تم محل کے اندر کی باتیں کس طرح جانتی ہو؟ اُس نے کہا ۔۔۔ 'میں محل کے حرم کی لڑکی تھی مگر جب سے ابوالعباس نے سلطان محمود کی بہن سے شادی کی ہے غزنی سے ایک سے ایک حسین اور نوجوان لڑکی آتی ہے۔ یہ جو کاہ کاکبی ابوالعباس کو پلیش کرتی ہے۔ اس کے کہنے پر حرم کی پہلی تمام لڑکیوں اور عورتوں کو نکال دیا گیا ہے' ۔۔۔ یہ کہہ کر وہ رو پڑی اور بولی ۔۔۔ 'تم ہی بتاؤ ہم کدھر جائیں۔ ہمارے لیے زندہ رہنے کا یہی ایک ذریعہ رہ گیا ہے۔ کیا تم مجھے پناہ میں لے کر مجھے اس غلیظ زندگی سے بچا سکتے ہو؟' ۔۔۔ ہمارے آدمی نے اُسے تسلی دی اور مدد کا وعدہ کیا۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتی ہیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ امیر التگین کے ہاں دو اجنبی مہمان ٹھہرے ہوئے ہیں جو مسلمان نہیں لگتے۔ وہ فرنگی ہو سکتے ہیں۔ یہودی ہوں گے یا عیسائی۔ اب آپ ہمیں بتائیں کہ کیا کرنا چاہیے۔ کیا آپ خوارزم شاہ کو بتائیں گی کہ اُن کے خلاف کوئی سازش ہو رہی ہے؟"

"نہیں" ۔۔۔ کاکبی نے جواب دیا ۔ "انہیں بتایا تو میں ان کے اس سوال کا جواب نہیں دے سکوں گی کہ مجھے یہ باتیں کس طرح معلوم ہوئی ہیں۔ ابوالعباس میرے ہاتھ میں ہیں۔ میں انہیں کہہ سکتی ہوں کہ ہزار اسپ اور بخارا کے دستوں کو دارالحکومت میں بلا لیں اور اُن کی جگہ یہاں کے دستے بھیج دیں تا کہ دستے آپس میں جگہ بدلتے رہیں اور اکتاہٹ محسوس نہ کریں لیکن میں ایسا مشورہ اس لیے نہیں دوں گی کہ جس طرح وہاں کی فوج خراب ہو رہی ہے، اسی طرح یہ دستے بھی وہاں جا کر ان فقیروں کا اثر قبول کر لیں گے۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ ان دونوں فقیروں کو قتل کر دو۔ اگر یہ غزنی میں ہو رہا ہوتا تو انہیں گرفتار کر کے موت کے گھاٹ اُتار دیا جاتا۔ یہاں اس سازش کو قتل سے ختم کیا جا سکتا ہے۔ کیا ہمارے آدمی یہ کام کر سکتے ہیں؟"

"کر سکیں گے" ۔ جینس نے کہا ۔ "ہمیں صرف حکم اور ہدایت کی ضرورت ہے"۔

"اور ایک آدمی غزنی کو روانہ کر دو جو سلطان کو یہ ساری باتیں بتا آئے جو تم نے مجھے

سناتی ہیں" ــــ کالو کابی نے کہا ــــ "اور سلطان کو یہ بھی بتادیا جائے کہ میرے کہنے پر ان دونوں فقیروں کو قتل کیا جا رہا ہے۔"

اس سے اگلی رات ہزار اسپ سے باہر دریائے اوکسس کے کنارے فقیر کے خیمے کے باہر ہجوم چھٹ رہا تھا۔ رات بہت گزر گئی تھی۔ بعض آدمی عورتوں کے ساتھ دور چلے گئے تھے جہاں انہیں کوئی دیکھ نہیں سکتا تھا۔ دو آدمی سب کے چلے جانے کے انتظار میں اُدھر گھوم پھر رہے تھے۔ فقیر مشعل بجھا کر خیمے میں چلا گیا اور خیمے کے باہر صرف دو آدمی رہ گئے۔ وہ اس طرح بیٹھے رہے جیسے انہیں یہیں رہنا تھا۔ ان سے کچھ دور جو دو آدمی گھوم پھر رہے تھے، وہ ان دو آدمیوں کو دیکھتے رہے۔

"معلوم ہوتا ہے یہ فقیر کے ساتھی یا محافظ ہیں" ــــ دُور کے آدمیوں میں سے ایک نے کہا ــــ "یہ یہاں سے نہیں جائیں گے۔"

"یہ خیمے کے اندر چلے گئے تو ہم اپنا کام نہیں کرسکیں گے" ــــ دوسرے نے کہا۔

"ایک طریقہ آزماتے ہیں" ــــ پہلے نے کہا ــــ "تم ان کے پاس چلے جاؤ اور اپنے آپ کو کمانڈر ظاہر کرکے ان سے فقیر کی باتیں اس طرح پوچھو جیسے تم فقیر سے بہت متاثر اور مرعوب ہو۔ میں اپنا کام کرلوں گا۔"

دوسرا آدمی ان دو آدمیوں کے پاس جا کھڑا ہوا اور اپنے ساتھی کے کہنے کے مطابق ان کے ساتھ باتیں کرنے لگا۔ اُس نے جب کہا کہ وہ کمانڈر ہے تو دونوں آدمیوں نے اس کے ساتھ دلچسپی سے باتیں شروع کردیں۔ اس نے کہا کہ فقیر شاید سو رہا ہوگا، اس لیے ہمیں پرے چلے جانا چاہیئے۔ ہماری باتیں انہیں بےآرام کریں گی۔ وہ انہیں پرے لے گیا۔ فقیر نے خیمے کے دونوں طرف کے پردے گرا لیے تھے۔

اُس کا ساتھی جو اندھیرے میں کھڑا تھا آہستہ آہستہ خیمے کی پچھلی طرف چلا گیا اور بیٹھ گیا، پھر پیٹ کے بل لیٹ کر اُس نے پردے کے نیچے سے اندر دیکھا۔ دیئے کی روشنی میں اسے فقیر نظر آیا۔ وہ سجدے میں پڑا ہوا تھا اور اس آدمی کی طرف اُس کی پیٹھ تھی۔ اس آدمی نے کمر سے ایک رسی کھولی اور رسی ہاتھ میں لے کر پردے کے نیچے سے رینگتا ہوا

اندر چلا گیا۔ فقیر کو خبر نہ ہوئی۔ اس آدمی نے پاؤں پر بیٹھ کر رسی پیچھے سے فقیر کی گردن میں پھینکی۔ یہ پھندا تھا جو گردن میں پڑتے ہی تنگ ہو گیا۔ فقیر کی آواز بھی نہ نکلی۔ پھندا تیزی سے تنگ ہوتا گیا۔ فقیر بُری طرح تڑپا اور اُس کا جسم بےحس ہو گیا۔ وہ آدمی اس اطمینان سے کہ فقیر مر چکا ہے، خیمے سے نکلا اور کچھ دُور تک ہاتھوں کے بل چلتا گیا۔

اُس کا ساتھی فقیر کے دو آدمیوں کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ اُسے اُلّو کی آواز سنائی دی۔ وہ ان آدمیوں سے مصافحہ کرکے آ گیا اور اپنے ساتھی سے آن ملا، پھر دونوں اندھیرے میں غائب ہو گئے۔

بخارا وہاں سے بہت دُور تھا۔ یہ آدمی اُسی رات وہاں نہیں پہنچ سکتے تھے۔ وہاں کے فقیر کو قتل کرنا اتنا آسان نہیں تھا کیونکہ اُس کے ساتھ چند ایک آدمی بھی رہتے تھے۔

یہ دونوں آدمی اُسی وقت گھوڑوں پر بخارا کی سمت روانہ ہو گئے۔ اُن کی رفتار بہت تیز تھی۔ وہ دریا کے کنارے کنارے جا رہے تھے۔ ایک جگہ دریا کا پاٹ بہت چوڑا تھا جہاں دریا کی گہرائی کم ہونی چاہیئے تھی۔ انہوں نے وہیں گھوڑے دریا میں ڈال دیئے۔ بعض جگہوں پر گہرائی اتنی زیادہ تھی کہ گھوڑوں کو تیرنا پڑا ــــ اُن کے سامنے دو سو میل کی مسافت تھی۔

دوسرے دن ہزار اسپ میں اس خبر نے سنسنی پھیلا دی کہ فقیر مر گیا ہے۔ یہ خبر بھی پھیل گئی کہ وہ مرا نہیں اسے مارا گیا ہے۔ شہروں کے لوگ اور فوجی دریا کے کنارے جمع ہو گئے۔ وہاں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی کہ فقیر کو غزنی والوں نے قتل کیا ہے اور قاتلوں نے قرآن پاک کی بھی توہین کی ہے۔ اس خبر کو اس لیے سچ مان لیا گیا کہ فقیر غزنی کے خلاف باتیں کیا کرتا تھا۔ اس خبر نے چھاؤنی کو جیسے آگ لگا دی ہو۔ فرنگی تخریب کاروں اور شرپسندوں کے خفیہ گروہ نے دہشت ناک باتیں مشہور کردیں۔ ہر طرف خوف چھا گیا کہ فقیر جس تباہی کی پیشین گوئی کیا کرتا تھا وہ اب آئی کہ آئی۔ فوج کے کمانڈر بھی ڈرے ہوئے اور غزنی کے خلاف بھڑکے ہوئے تھے۔

فقیر کے قاتلوں نے دو سو میل کی مسافت گھوڑوں کو تھوڑی دیر آرام دے کر اور سرپٹ رفتار پر تقریباً روز میں۔ تب تک طے کر لی جب سورج غروب ہو رہا تھا۔ ان میں سے ایک شہر میں گیا اور اپنے ساتھیوں سے ملا جو کسی نہ کسی بہروپ میں شہر میں رہتے اور ایوانِ امارت کی سرگرمیوں کی اطلاعیں لیتے رہتے تھے۔ ان میں سے دو آ گئے۔ انہیں بتایا گیا کہ کیا کرنا ہے۔

"اکیلے فقیر کا قتل آسان تھا" ___ ایک نے کہا ___ "یہاں ایک گروہ ہے۔ فقیر کو ہم نے دیکھا ہے۔ رات خیمے میں اکیلا ہوتا ہے لیکن دوسروں کے خیمے اس کے ساتھ لگے ہوئے ہیں"۔

"مشکل یہی ہے نا کہ دوسرے جاگ اٹھے تو ہم پکڑے یا مارے جائیں گے" ___ ایک نے کہا ___ "اپنے حلف کو یاد کرو جو غزنی سے روانہ ہونے سے پہلے ہم سے لیا گیا تھا۔ ہمیں جانیں قربان کرنی ہیں۔ اگر ہم سلطان کو دھوکہ دینا چاہیں تو دے سکتے ہیں لیکن ہم خدا کو دھوکہ نہیں دے سکتے۔ یہ فقیر قرآن پاک ہاتھ میں لے کر مسلمانوں کو ایک دوسرے کا دشمن بنا رہا ہے۔ تم دیکھ چکے ہو کہ اس فتنے کے پیچھے فرنگیوں کا ہاتھ ہے اور جو کچھ ہو رہا ہے اسلام کے خلاف اور اسلام کی تباہی کے لیے ہو رہا ہے۔ یہاں امیر التونتگین خوارزم شاہی کے لالچ میں قرآن پاک کی توہین کرا رہا ہے۔ ہمیں اپنے مذہب اور مقدس کتاب کی عظمت اور ناموس پر قربان ہونا ہے"۔

چاروں نے گھوڑے دریا کے قریب جنگل میں باندھے اور رات اس وقت فقیر کے خیموں کی طرف گئے جب لوگ وہاں سے جا رہے تھے۔ وہ لوگوں میں گھومتے پھرتے رہے، حتیٰ کہ آخری آدمی بھی وہاں سے چلا گیا۔ اب وہاں تاریک گوشوں میں عورتوں کی سرگرمیاں شروع ہو گئی تھیں۔ آدھی رات کے بعد خیموں کے اندر خاموشی طاری ہو گئی۔ چاروں اس خیمے کی طرف بڑھے جس میں فقیر سوتا تھا۔ پردے گرے ہوئے تھے اور اندر روشنی تھی۔

ان میں سے ایک کی ٹھوکر کسی چیز سے لگی۔ یہ چھوٹا سا مٹکا تھا۔ اس آدمی نے بو سے پہچان لیا کہ اس میں مشعلوں اور دیوں کا تیل ہے۔ اس نے مٹکا اٹھا لیا۔ دو آدمی فقیر کے خیمے کے پردے کے ساتھ بیٹھ گئے۔ ان کے ہاتھوں میں بڑے خنجر تھے۔ پردہ ذرا سا ہٹا کر دیکھا۔ فقیر نیم برہنہ تھا اور اس کے پاس ایک نیم برہنہ جوان لڑکی تھی۔ فقیر شراب کے

نشے میں بدمست ہوا جا رہا تھا۔ دونوں آدمیوں نے پردے کی رسی کھینچی اور اندر چلے گئے۔ فقیر اور لڑکی نے ادھر دیکھا مگر ان کے منہ سے کوئی آواز نکلنے سے پہلے ہی ایک آدمی نے لڑکی کے منہ پر دوسرے نے فقیر کے منہ پر ہاتھ رکھ کر دونوں کو گرا دیا اور ہاتھ دبائے رکھے۔ لڑکی ایسے تنومند مردوں کے آگے کچھ بھی نہیں تھی اور فقیر کی طاقت شراب نے سلب کر رکھی تھی۔ خنجر دونوں کے دلوں میں اتر گئے۔ دو دو وار دل کے مقام پر کیے گئے اور دونوں جلدی ہی ختم ہو گئے۔

ان کے دو ساتھی باہر کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک کے پاس تیل کا چھوٹا سا مٹکا تھا۔ ان کا کام ہو چکا تھا۔ انہیں اب نکل جانا چاہیے تھا لیکن مٹکے والے آدمی نے انتقام سے بے قابو ہو کر فقیر کے خیمے کے اندر اور دوسرے خیموں کے پردوں پر تیل چھڑکنا شروع کر دیا۔ اندر والے اتنی گہری نیند سوئے ہوئے تھے کہ انہیں پتہ نہ چل سکا۔ فقیر کے خیمے کے دیئے سے ایک کپڑے کو آگ لگا کر تمام خیموں کو آگ لگا دی گئی۔ تیل کی وجہ سے خیمے فوراً ہی آگ کی لپیٹ میں آ گئے۔ اندر والوں کی چیخ و پکار بلند ہونے سے پہلے ہی چاروں آدمی گھوڑوں پر سوار ہو کر غائب ہو گئے۔

کاہ کاکی کو جلدی ہی اطلاع دے دی گئی کہ دونوں فقیروں کا کام تمام کر دیا گیا ہے۔ مگر بخارا میں جو دستے مقیم تھے، ان کا ردِعمل تخریبی تھا۔ وہاں بھی یہی پروپیگنڈہ کیا گیا کہ یہ غزنی والوں کی کارستانی ہے۔ فوج غزنی اور سلطان محمود کے خلاف بھڑک اٹھی۔

سلطان محمود کو اطلاعیں دو تین دنوں کے وقفے سے ملیں۔ پہلی اطلاع اسے وہی ملی جو کاہ کاکی کے ملازم نے اسے تفصیل سے سنائی تھی۔ اسی تفصیل سے سلطان محمود کو سنائی گئی۔ دوسری اطلاع یہ ملی کہ کاہ کاکی کے حکم سے دونوں فقیروں کو قتل کر دیا گیا ہے۔

سلطان سوچ ہی رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے کہ جرجانیہ سے کاکی کا بھیجا ہوا ایک اور آدمی غزنی پہنچا۔ اس نے سلطان محمود کو بتایا کہ ابوالعباس کے صوبہ بخارا کے امیر التونتگین نے فرنگیوں کی پشت پناہی سے بغاوت کی تیاری مکمل کر لی ہے اور دو سالاروں ابو اسحاق اور خمرتاش، نے بخارا اور ہزار اسپ کے دستوں کو ابوالعباس

کے خلاف متنفر کر دیا ہے۔ ابوالعباس کی حمایت میں دو، فوج ہے جو اُس کے دارالحکومت جرجانیہ میں ہے مگر ان چند ایک دستوں کا بھی کوئی بھروسہ نہیں۔

سلطان محمود نے اسی وقت ابوالعباس کے نام پیغام لکھوایا جس کے الفاظ مورخوں کے مطابق کچھ اس طرح تھے ــ "...میرا خیال ہے کہ آپ اپنے ملک کی اس صورتِ حال کو نہیں سنبھال سکیں گے۔ آپ نوعمر لہٰذا ناتجربہ کار ہیں۔ بیشتر اس کے کہ آپ کا تختہ اُلٹ دیا جائے یا آپ باغیوں کے ہاتھوں قتل ہو جائیں، مجھے آپ کی مدد کو پہنچ جانا چاہیے لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے کہ آپ خودمختار اور آزاد رہتے ہوئے سلطنتِ غزنی کی اطاعت قبول کر لیں اور خطبے میں میرا نام شامل کر دیں۔ میں آپ کی آزادی برقرار رکھوں گا۔ اس سے آپ کو یہ فائدہ پہنچے گا کہ آپ کو میری مدد حاصل ہوگی اور میں اپنی فوج کے بہترین دستے آپ کے دارالحکومت میں آپ کی خوارزم شاہی کی حفاظت کے لیے رکھ سکوں گا۔ میں آپ کو خبردار کرتا ہوں کہ آپ کو اگر مشورہ لینے کی ضرورت ہو تو اپنے وزیر ابوالحارث سے مشورہ لیجیے گا۔ اگر آپ نے اپنے امیر التگین سے اور اپنے سالاروں سے مشورہ لیا تو آپ کو گمراہ کیا جائے گا۔ آپ اس قدر ناتجربہ کار ہیں کہ آپ کو یہ بھی معلوم نہیں کہ آپ کے اردگرد کیا ہو رہا ہے اور مجھے سینکڑوں میل دور غزنی میں پتہ چل گیا ہے کہ آپ تنہا رہ گئے ہیں۔ میں اُمید رکھوں گا کہ آپ سوچنے میں زیادہ وقت صرف نہیں کریں گے۔"

مشہور مورخ بیہقی نے لکھا ہے کہ خوارزم شاہ ابوالعباس کو جب یہ پیغام ملا تو اُس نے اپنے وزیر اور مشیروں کا اجلاس بلایا جس میں التگین، سالار ابواسحاق اور سالار خمرطاش بھی تھے۔ ابوالعباس نے سلطان محمود کی اطاعت قبول کرنے کی حمایت کی۔ اُس نے پیغام کسی کو نہ دکھایا۔ اجلاس میں صرف یہ مسئلہ پیش کیا کہ سلطان محمود نے اُسے اس کی اطاعت قبول کرنے اور خطبے میں اُس کا نام شامل کرنے کو کہا ہے۔ اجلاس میں سب نے اس کی مخالفت کی۔ بیہقی نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس پیغام کی اطلاع فوج کو بھی مل گئی اور فوج نے اس کی مخالفت میں بغاوت کر دی۔ ابوالعباس نے سپاہیوں میں سونے

کے ٹکڑے تقسیم کر کے انہیں ٹھنڈا کیا۔ اجلاس ایک بار پھر بلایا گیا جس میں ابوالعباس نے سب کو بتایا کہ اُس نے فیصلہ کیا ہے کہ اگر سلطان محمود خوارزم پر حملہ کرے تو ترکستان کے خوانین سے مدد لی جائے۔ لہٰذا ان کے ساتھ دوستی اور تعاون کا معاہدہ کیا جائے اور اسے خفیہ رکھا جائے۔

بیہقی نے ہی لکھا ہے کہ سلطان محمود کو اپنے جاسوسوں سے اطلاع ملی کہ ابوالعباس ترکستان کے ساتھ فوجی نوعیت کا معاہدہ کر رہا ہے۔ سلطان محمود اپنی ایک لاکھ نفری کی فوج اور پانچ سو ہاتھی لے کر خوارزم کی سرحد کے قریب بلخ چلا گیا اور ابوالعباس کو پیغام بھیجا کہ وہ اس کی اطاعت قبول کرے ورنہ اُس کے ملک پر حملہ کر دیا جائے گا۔ ترکستان کے خوانین سلطان محمود کے مقابلے میں ابوالعباس کو فوجی مدد دینے سے گھبرا گئے۔ انہوں نے بلخ آ کر سلطان محمود سے درخواست کی کہ وہ خوارزم پر حملہ نہ کرے۔ سلطان محمود کسی کی سننے والا نہیں تھا۔ نہ مانا اور اس نے اپنا مطالبہ برقرار رکھا۔ ترکستان کے خوانین نے ابوالعباس خوارزم شاہ کو اس پر رضامند کر لیا کہ وہ سلطان کی اطاعت قبول کر لے اور خطبے میں اس کا نام شامل کر لیا جائے۔ سلطان محمود اپنا مطالبہ پورا ہونے پر اپنی فوج واپس لے گیا۔

دوسرے مورخین نے جن میں عطبی، ابن الاثیر اور گردیزی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں اس واقعہ کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ خیال رہے کہ عطبی جس کا پورا نام ابونصر محمد العطبی تھا، سلطان محمود کے دور کا وقائع نگار تھا اور سلطان محمود نے اُسے کئی بار اپنا سفیر اور ایلچی بنا کر دوسرے ملکوں میں بھیجا تھا۔ اس کی کتاب "الیمینی" اس کے ذاتی مشاہدات پر لکھی گئی ہے اور محمود غزنوی کے حالات و واقعات پر ایک مستند دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس کے مطابق ابوالعباس سلطان محمود کی اطاعت قبول کرنے سے ہچکچا گیا تھا کیونکہ اُسے اپنی آزادی سلب ہو جانے کا خطرہ تھا۔ اُس کے وزیر نے اُسے بتایا تھا کہ سلطان کی اطاعت قبول کرنے میں اتنا خطرہ نہیں جتنا اپنی فوج کی بغاوت میں ہے۔ ابوالعباس نے اطاعت قبول کرنے کا فیصلہ کاہ کاہی نے کر لیا تھا۔

"میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ میرا بھائی آپ کی آزادی سلب نہیں کرے گا"۔ کاکجی نے اُسے کہا — "وہ آپ کو اپنا اتحادی بنانا اور آپ کو بغاوت سے بچانا چاہتا ہے"۔

"میں سمجھ نہیں سکا کہ کون بغاوت کر رہا ہے" — ابوالعباس نے کہا — "مجھے اپنی فوج پر اعتماد ہے"۔

"مگر فوج میں آپ کا اعتماد ختم کر دیا گیا ہے" — کاکجی نے کہا۔

"کس نے ختم کیا ہے؟"

"آپ کے امیر التگین نے" — کاکجی نے کہا — "آپ کے سُسر ابواسحاق نے، خمرطاش نے اور ان کے درپردہ فرنگی دوستوں نے۔ آپ کی بادشاہی سلطان محمود کی مدد کے بغیر قائم نہیں رہ سکے گی۔ مجھ سے دھوکے فریب کی توقع نہ رکھو ابوالعباس! اپنی خوش فہمیوں کے دھوکے میں نہ رہو۔ سلطان کی اطاعت قبول کر لو"۔

ابوالعباس نے سلطان کی اطاعت قبول کر لی اور خطبے میں سلطان محمود کا نام شامل کرنے کا اعلان کر دیا۔

جب یہ شاہی حکم نامہ ہزاراسپ اور بخارا پہنچا تو وہاں جیسے جنگل کو آگ لگ گئی ہو۔

التگین نے بخارا کی فوج کے چھوٹے بڑے کمانڈروں کو بلا کر انہیں کہا کہ فقیر جس تباہی سے خبردار کرتے رہے ہیں وہ غزنی کی فوج کی صورت میں آ رہی ہے۔ ہم اس تباہی کو روک سکتے ہیں ورنہ ہم سب اور تمہاری مستورات غزنی کی درندہ صفت اور لٹیری فوج کی غلام ہو جائیں گی۔ ہندوستان سے زر و جواہرات لُوٹ کر لانے والا سلطان محمود اب خوارزم کو لُوٹنے اور یہاں کی بیٹیوں کو لونڈیاں بنا کر غزنی لے جانے آ رہا ہے۔ اُسے خوارزم شاہ ابوالعباس خود بلا رہا ہے۔ ہمیں سب سے پہلے خوارزم شاہی ختم کر کے فوج کی حکومت قائم کرنی ہے۔ اپنے سپاہیوں سے کہہ دو کہ جو فقیر تمہیں غیب کی باتیں بتانے آئے تھے اور جنہوں نے تمہاری قسمت بدل دینے کا وعدہ کیا تھا، اُن کے قاتل تمہاری قسمت کو تباہ کرنے آ رہے ہیں۔

ہزاراسپ میں ابواسحاق اور خمرطاش نے بھی اپنے دستوں کو اسی طرح بھڑکا دیا۔

چند دنوں بعد شام کو ابوالعباس اپنے خاص کمرے میں بیٹھا تھا کہ ایک قاصد نے آ کر اُسے پیغام دیا کہ ترکستان کے چار خوانین آئے ہیں۔ اُن کے ساتھ امیر التگین بھی ہے۔ انہوں نے چشمے والے باغ میں قیام کرنا پسند کیا ہے۔ امیر التگین نے اُن کی عزت افزائی کے لیے مشورہ بھیجا ہے کہ خوارزم شاہ یہاں آ کر ان کا استقبال کریں۔

ابوالعباس نے سواری تیار کرنے کا حکم دیا۔ کاہ کاکجی کو پتہ چلا کہ ابوالعباس کہیں جا رہا ہے تو دوڑی آئی اور پوچھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ ابوالعباس نے اُسے بتا دیا۔ کاکجی نے اُسے جانے سے روکا۔

"ترکستان کے مہمان آئے ہیں" — اُس نے کاکجی سے کہا — "میں ان کی عزت کرنا چاہتا ہوں۔ التگین اُن کے ساتھ آیا ہے"۔

"نہ جاؤ" — کاکجی نے گھبراہٹ کے عالم میں کہا — "التگین نے قاصد کیوں بھیجا ہے، خود کیوں نہیں آیا؟"

"تم گھبرا کیوں گئی ہو کاکجی؟"

"خدا کے لیے نہ جاؤ ابوالعباس! میرا دل ڈوب رہا ہے"۔ کاکجی نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "میں نے تمہیں جانے سے کبھی نہیں روکا۔ نہ جاؤ۔ مصروفیت کا بہانہ کر دو"۔

"کیا میں عورت ہوں؟"

"آج ایک عورت کی بات مان جاؤ" — کاکجی کے آنسو نکل آئے — "نہ جاؤ۔ مجھے کوئی خطرہ نظر آ رہا ہے"۔

ابوالعباس نے ہنس کر کہا — "محبت میں اتنا وہمی اور جذباتی نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے میری حیثیت سے نہ گراؤ کاکجی! وہ میرا انتظار کر رہے ہوں گے"۔

کاہ کاکجی بہت ہی جذباتی ہو گئی تھی، یہاں تک کہ ابوالعباس باہر نکلا تو وہ اُس کے پیچھے دوڑی مگر ابوالعباس کی بگھی محافظوں کے جلو میں جا چکی تھی۔ کاکجی کی جذباتی حالت ایسی کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اُس کا ملازم اور خادمائیں اُسے بہلانے لگے لیکن اس کی گھبراہٹ

اور بے چینی بڑھتی گئی۔

زیادہ دیر نہیں گذری تھی کہ محل کے اردگرد بہت سے گھوڑے دوڑنے کی آوازیں اور نعرے سنائی دینے لگے۔ کاہجی اس امید پر دوڑتی باہر گئی کہ ابوالعباس آگیا ہے مگر یہ فوجی سوار تھے جو محل کو گھیرے میں لے رہے تھے اور وہ نعرے لگا رہے تھے۔ "زن مرید خوارزم شاہ کو ختم کر دیا گیا ہے..... غزنی کا غلام جہنم واصل ہو گیا..... خوارزم شاہ الپتگین زندہ باد۔"

کاہ کاہجی کا دماغ چکرا گیا۔ وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ذرا سی دیر میں محل میں اندھم بپا ہو گیا۔ سب سے پہلے ابوالعباس کے وزیر ابوالحارث کو قتل کیا گیا۔ مشیروں کو باہر نکال کر ان کے سر تن سے جدا کر دیئے گئے۔ محل کے اندر اور باہر ہزار اسپ اور بخارا کے فوجی دستے پھیل گئے۔ الپتگین کے حکم سے لوٹ مار نہ ہوئی۔ ابوالعباس کے حامیوں کو پکڑا جا رہا تھا اور انہیں باہر لے جا کر قتل کیا جا رہا تھا۔ جرجانیہ میں جو دستے تھے، ان میں سے دو نے مزاحمت کی کوشش کی، لیکن اُن کی نفری اتنی تھوڑی تھی کہ ان سے فوراً ہی ہتھیار ڈلوا لیے گئے۔ انہیں مزاحمت کا حکم دینے والے ایک نائب سالار اور اُس کے ماتحت کمانڈروں کو قتل کر دیا گیا۔

الپتگین نے خوارزم شاہ کی حیثیت سے قصرِ شاہی میں داخل ہوا۔ وہ خود ساختہ بادشاہ تھا۔ اُس نے حکم دیا کہ تمام ملک میں اُس کی خوارزم شاہی اور ابوالعباس کی موت کا اعلان کر دیا جائے۔

ابوالعباس کو اس دھوکے سے باہر بلا کر کہ ترکستان کے خوانین آئے ہیں، قتل کر دیا گیا تھا۔ بغاوت بہت جلدی کامیاب ہو گئی۔ بیہقی اور گردیزی کے مطابق یہ واقعہ ۱۵ شوال ۴۰۷ھ (۱۷ مارچ ۱۰۱۷ء) کا ہے۔ فوج محل کی حدود میں داخل ہوئی تو کاہ کاہجی کے خاص ملازم نے جو دراصل غزنی کا جاسوس تھا، اس کو خطرے میں دیکھا اور دوڑتا ہوا اُس کے کمرے میں گیا۔ وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی ـــ "میں نے اُسے روکا تھا۔ اُسے موت لے گئی تھی"۔ ملازم نے اُسے تسلی دی، کہ وہ اُسے وہاں سے نکال لے جانے کی پوری کوشش کرے گا۔

کاہ کاہجی نے اپنا شاہانہ لباس اتار کر بالکل سادہ کپڑے پہن لیے اور سر پر اوڑھنی لے لی۔ ملازم نے اُسے اس لباس میں دیکھ کر کہا کہ وہ اسے ابھی نکال لے جائے گا، مگر وہ کمرے کے دروازے میں ہی پہنچے تھے کہ باغی سالار ابواسحاق کی بیٹی انگوری آ گئی۔ وہ ابوالعباس کی دوسری بیوی تھی۔

"تمہاری خوارزم شاہی ختم ہو چکی ہے کاہجی!" انگوری نے طنزیہ کہا ـــ "بھاگ کے کہاں جا رہی ہو؟ باہر نکلو گی تو قتل ہو جاؤ گی یا تمہیں فوجی گھسیٹ کر لے جائیں گے۔ اب حکومت تمہاری نہیں، فوج کی ہے۔ میں تمہاری حفاظت کا انتظام کر دیتی ہوں۔ میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں حرم میں داخل کر دوں گی۔ وہاں تمہیں قتل نہیں کیا جائے گا۔ اگر چاہو تو میرے باپ کے ساتھ شادی کر لو۔ تم غزنی نہیں جا سکو گی۔"

"انگوری!" ـــ کاہجی نے بے خوف آواز میں کہا ـــ "مجھے غزنی جانے کی کوئی جلدی نہیں۔ غزنی والے یہاں آ جائیں گے" ـــ وہ اچانک گرج کر بولی ـــ "نکل جاؤ یہاں سے..... میں اب بھی شہزادی ہوں۔ سلطان غزنی کی بہن ہوں، اور تم کس باپ کی بیٹی ہو؟..... نمک حرام سالار کی جسے بادشاہی کی ہوس نے اپنے انجام سے بے خبر کر دیا ہے۔ جاؤ، انہیں کہو مجھے قتل کر دیں۔ مجھے قید میں ڈال دیں، پھر اپنا، اپنے باپ کا اور خود ساختہ خوارزم شاہ کا انجام دیکھ لینا۔"

انگوری ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ لیے باہر نکل گئی۔ ملازم نے کاہ کاہجی سے کہا کہ آؤ، یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں۔

"نہیں حبیبی!" ـــ کاہجی نے کہا ـــ "میں فرار نہیں ہوں گی۔ میں اس فریب کار خوارزم شاہ کا سامنا کرنا چاہتی ہوں" ـــ وہ اُدھر کو چل پڑی، حبیبی کو اپنے پیچھے آتا دیکھ کر وہ رک گئی اور بولی ـــ "مجھے خدا کے سپرد کرو۔ تم معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ کوئی غزنی اطلاع دینے چلا گیا ہے یا نہیں۔ اگر کچھ پتہ نہ چلے تو تم چلے جاؤ۔ اصطبل سے گھوڑا لے لو۔"

التگین اُسی تخت نما مسند پر بیٹھا احکام دے رہا تھا جس پر تھوڑی دیر پہلے تک ابوالعباس بیٹھا رہا تھا۔ دربار میں کچھ لوگ دست بستہ کھڑے احکام سُن رہے تھے۔ سب فوجی تھے۔ شہری انتظامیہ کا کوئی ایک بھی آدمی نہیں تھا۔ وزیر ابوالحارث بھی نہیں تھا۔ دربار میں شور سا تھا۔ سب پر سناٹا طاری ہو گیا۔ التگین نے دیکھا۔ کاہ کاکی اُس کی طرف آ رہی تھی۔

"اوہ! کاہ کاکی!" ــــ التگین نے زیرِ لب کہا ــــ "اس کے متعلق تو میں نے کچھ سوچا ہی نہیں" ــــ اُس نے کاکی سے مخاطب ہو کر کہا ــــ "کاہ کاکی! میں جانتا ہوں تم جاں بخشی کے لیے آئی ہو۔ تمہیں شاید احساس نہیں کہ اپنے خاوند کو تم نے مروایا ہے۔ تم نے اُس پر جادو طاری کر کے اُسے غزنی کا غلام بنایا تھا۔ خوارزم کے لوگ اور خوارزم کی فوج کسی غیر ملکی کی غلامی برداشت نہیں کر سکتی۔ قوم اور فوج مجھے گھسیٹ کر اس مسند پر لائی ہے۔ میں اب اُنہی کے کہنے پر اس مسند سے اُٹھوں گا۔ قوم نے مجھے جو فرض سونپا ہے وہ مجھے ہر قیمت پر پورا کرنا ہے۔"

"میں جاں بخشی کے لیے نہیں جان دینے کے لیے آئی ہوں" ــــ کاہ کاکی نے کہا ــــ "میں نے جو کچھ کیا وہ اللہ کی خوشنودی کے لیے کیا۔ تم نے خود بھی قرآنِ پاک کی توہین کی ہے اور فرنگیوں سے بھی کرائی ہے۔ خدا تمہیں بخشے گا نہیں۔ اپنے گناہ کو چھپانے کے لیے تم یہ جھوٹ بول رہے ہو کہ تمہیں قوم اور فوج گھسیٹ کر لائی ہے۔ اگر تم قوم کے اتنے ہی محبوب اور خدا کے اتنے ہی برگزیدہ آدمی ہو تو تم نے گلی گلی میں اور شہر کے ہر دروازے پر پہرے کیوں کھڑے کر دیئے ہیں؟ انہیں باہر کیوں نہیں آنے دیتے؟ شہر میں خاموشی کیوں ہے؟ قوم تمہارے نام کے نعرے کیوں نہیں لگاتی؟ ہر طرف فوج ہی کیوں نظر آ رہی ہے؟"

کسی درباری کی آواز گرجی ــــ "تمیز سے بات کرو نادان! تم خوارزم شاہ سے مخاطب ہو۔"

"میرا خاوند مارا گیا ہے" ــــ کاکی کہتی چلی گئی ــــ "خدا تو نہیں مارا گیا۔ اگر تم یہ

اُمید لے کر آئے ہو کہ فوج کے چھاتے کے نیچے بیٹھ کر خوارزم شاہ بنے رہو گے تو میں تمہیں خبردار کرتی ہوں کہ وہ طوفان جلدی آئے گا جو تمہارے اس چھاتے کو اُڑا لے جائے گا۔ اس مسند پر وہی بیٹھ سکتا ہے جو اس کا اہل ہو۔ تم مامونی خاندان کے جوتے چاٹ چاٹ کر امارت کے رُتبے تک پہنچے تھے۔ اب تمہاری قسمت میں قید خانے کا تہہ خانہ لکھ دیا گیا ہے۔"

"لے جاؤ اسے" ــــ التگین نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا ــــ "اسے اسی کے کمرے میں رکھو اور باہر پہرہ کھڑا کر دو۔ اسے اُسی کمرے میں جس میں اس نے پورا ایک سال ازدواجی زندگی کی راتیں گزاری ہیں، نظر بند کر دو۔ میں سلطان محمود کو پیغام بھیجوں گا کہ اگر تم نے خوارزم پر حملہ کیا تو تمہیں اپنی بہن کی چھوڑی ہوئی لاش ملے گی۔ اسے یرغمال میں رکھو لیکن اسے تکلیف نہ ہو۔ میں یہ نہیں کہلوانا چاہتا کہ خوارزم شاہ التگین نے ایک بے بس عورت پر ظلم کیا تھا۔"

"آنے والی نسلیں تمہاری قبر پر بھی لعنت بھیجا کریں گی" ــــ کاکی نے کہا ــــ "جس فوج کو کفر کے خلاف حق کے معرکے لڑنے تھے اُس سے تم نے اپنے ہی ملک کو فتح کر لیا ہے اور اس فوج کو تم نے حکمران بنا دیا ہے۔ یہ فوج ایک دن بھی لڑنے کے قابل نہیں رہے گی۔"

کسی نے کاہ کاکی کو بازو سے پکڑا اور اُسے اُس کے کمرے میں لے گئے۔

اُس وقت کے ایک مشہور مؤرخ اور مبصر الفضلی نے اپنی کتاب "آثار الوزرا" میں لکھا ہے ــــ "چار ماہ تک التگین خوارزم کا انتہائی ظالم ڈکٹیٹر بنا رہا۔ تمام خوارزم پر اُس نے دہشت طاری کیے رکھی۔ اپنے آپ کو اسلام کا علمبردار اور پاسبان کہتا رہا لیکن جس کے منہ سے ذرا سی بھی مخالفانہ بات نکل جاتی تھی، اُسے قتل کرا دیتا تھا۔ فوج گلیوں میں گھومتی پھرتی رہتی۔ مخبر لوگوں کی باتیں سنتے رہتے۔ شک پر بھی لوگوں کو پکڑ کر قید میں ڈال دیا جاتا یا جلاد کے حوالے کر دیا جاتا تھا۔ اشیائے خورد و نوش اور آسودہ زندگی صرف فوج کے لیے رہ گئی تھی۔"

یہ چار مہینے سلطان محمود کیا کرتا رہا؟ ۔ اسے اس کامیاب بغاوت کی اطلاع آٹھویں روز مل گئی تھی۔ اُس کے سامنے دو مسئلے تھے۔ ایک یہ کہ وہ اتنی زیادہ فوج اور رسد سے حملہ کرنا چاہتا تھا کہ پورے خوارزم کو ایک ہی ہلے میں لے لے۔ کشمیر کی شکست کے زخم ابھی پوری طرح مٹے نہیں تھے۔ دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ وہ اپنی بہن کو فرار کرانا چاہتا تھا۔" آثارالوزراءؒ میں لکھا ہے کہ اُس نے اپنی بہن کا مسئلہ اپنی مشاورتی کونسل کے سامنے رکھا۔ سب مشیر اور سالار بھڑکے ہوئے تھے۔

"میرا سینہ انتقام کی آگ سے جل رہا ہے" ۔۔۔ سلطان محمود نے مشاورتی کونسل سے کہا ۔۔۔ "میرا بہنوئی قتل ہوگیا اور میری بہن بیوہ ہوگئی ہے۔ اگر میں نے انتقامی کاروائی کا فیصلہ خود کیا تو یہ میری ذاتی رنجش کا ردِعمل ہوگا۔ تاریخ یہ کہے گی کہ میں نے ذاتی انتقام لینے کی خاطر دو مسلمان فوجوں کا خون بہادیا ہے۔ آپ صورتِ حال سامنے رکھ کر مجھے مشورہ دیں۔ یہ بغاوت فرنگیوں نے کرائی ہے اور ایک اسلامی ملک کو تباہی کے راستے پر ڈال دیا ہے۔ کچھ عرصے بعد خوارزم پر فرنگی چھا جائیں گے اور آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس کے نتائج غزنی کے لیے اور اسلام کے لیے کیا ہونگے۔"

"کاہ کابکی غزنی کی آبرو ہے" ۔۔۔ وزیر نے کہا ۔۔۔ "اُسے وہاں سے نکالنا ہم سب کے لیے ضروری ہے۔ اگر ہم نے حملہ کیا تو کابکی قتل ہو جائے گی اور اس کے ساتھ نہ معلوم کیا سلوک ہو۔ التگین کو پیغام بھیجا جائے کہ وہ کاہ کابکی کو باعزت طریقے سے واپس کردے۔ اگر نہ کرے تو چھاپہ ماروں کے ذریعے اُسے فرار کرایا جائے اور اس کے بعد خوارزم پر فوج کشی کی جائے۔"

سب نے اس کی تائید کی۔ کچھ اور مشورے پیش ہوئے۔ پھر ایک پلان تیار ہوگیا۔ ایک ایلچی کو اس پیغام کے ساتھ جُرجانیہ بھیج دیا گیا کہ کاہ کابکی کو باعزت طور پر رہا کیا جائے۔

غزنی اور جُرجانیہ کے درمیان سات سو میل کا فاصلہ تھا جس میں آدھا علاقہ پہاڑی

تھا اور باقی ریگستان جو صحرائے غز کہلاتا ہے۔ قاصد کو جاتے اور واپس آتے ایک مہینہ لگ گیا۔ وہ کابکی کی رہائی کے پیغام کا یہ جواب لایا کہ التگین کو خوارزم شاہ تسلیم کیا جائے اور اُس کے ساتھ جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کیا جائے۔

التگین نے ایلچی کو وہ کمرہ دکھایا تھا جس میں کاہ کابکی کو رکھا گیا تھا۔ اُس کے حکم پر دروازہ کھول کر اُسے دکھایا گیا تھا کہ کابکی کو قید خانے میں نہیں بلکہ اس کے اپنے کمرے میں رکھا ہوا ہے۔ یہ اطلاع اُن چھاپہ ماروں کے کام آئی جنہیں یہ خطرناک کام سونپا گیا کہ وہ کابکی کو وہاں سے فرار کرائیں۔ کابکی کا ملازم جبیس غزنی آگیا تھا۔ وہ اس کمرے اور اس کے گردوپیش سے اچھی طرح واقف تھا۔ چار چھاپہ ماروں کو منتخب کیا گیا۔ پانچواں جبیس تھا۔

پانچوں غیر معمولی رفتار سے جُرجانیہ پہنچ گئے۔ اُن کے پاس ایک گھوڑا فالتو تھا۔ انہوں نے ایک سرائے میں قیام کیا۔ ان میں سے ایک کو جبیس نے ساتھ لیا اور اُسے محل کے باہر تک لے گیا۔ شہر میں انہوں نے فوجیوں کو گھومتے پھرتے دیکھا۔ اس سے اگلے روز وہ سرائے سے نکلے تو انہوں نے خوارزم کی فوج کا لباس پہن رکھا تھا اور ان کے ہاتھوں میں جو نیزے تھے اُن پر خوارزم کے جھنڈے کے رنگوں والے کپڑے کی جھنڈیاں بندھی ہوئی تھیں۔ یہ وہاں کے سوار دستوں کا امتیازی نشان تھا۔ وہ رسالے کے سواروں کی طرح گردنیں تانے اور سینے پھیلائے ہوتے جا رہے تھے۔ گھوڑوں کی چال بتاتی تھی کہ یہ فوج کے سدھائے ہوئے گھوڑے ہیں۔ شہر میں انہیں کئی جگہ فوجی ملے جن میں بعض سوار بھی تھے۔ ان پانچوں نے انہیں مسکرا کر انہی کی زبان اور انہی کے لہجے میں سلام کیا۔ شہری فوج سے اتنے ڈرے ہوئے تھے کہ انہیں دیکھ کر پرے ہٹ جاتے اور سلام کرتے تھے۔ وہ خوارزم کی فوج کا لباس اور نیزوں کی جھنڈیاں اپنے ساتھ لائے تھے اور ان کے گھوڑے فوج کے تھے۔ وہ خود بھی فوجی تھے اس لیے انہیں اداکاری نہ کرنی پڑی۔

جبیس کی راہنمائی میں وہ محل کے صدر دروازے تک پہنچے۔ وہ بہت بڑا خطرہ مول لے رہے تھے۔ پکڑے جانے کی صورت میں انہیں معلوم تھا انہیں کیسی سزا

ملے گی ــــ وہ خود اعتمادی سے دروازے میں داخل ہوگئے۔ وہاں کے پہرہ داروں نے انہیں اپنی فوج کے سوار سمجھتے ہوئے نہ روکا۔ جبیس انہیں ایک راستے سے اُدھر لے گیا جہاں کاہ کاہی کا کمرہ تھا۔ محل کی اندرونی دنیا میں بھی کئی جگہ فوجی نظر آئے۔ وہ اللہ کا نام لیتے بڑھتے گئے۔

جبیس نے ایک جگہ اپنے ساتھیوں کو روک لیا اور ایک سوار اور فالتو گھوڑے کے ساتھ محل کے کسی حصے میں غائب ہوگیا۔ وہ دونوں گھوڑوں سے اُترے اور کاہ کاہی کے کمرے والی غلام گردش میں چلے گئے۔ آگے سنتری کھڑا تھا۔ یہ کاہ کاہی کا کمرہ تھا۔ جبیس نے سنتری سے کہا دروازہ کھولو۔ خاتون کو خوارزم شاہ التگین کا پیغام دینا ہے۔ سنتری نے دروازہ کھول دیا۔ دونوں سنتری کو دھکیل کر اندر لے گئے اور تلواروں کی نوکیں اُس کے پہلو سے لگا کر اُس کی وردی اُتروائی، پھر اُس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اُس کے ہاتھ پاؤں رسیوں سے باندھ دیئے۔ کاہ کاہی سے کہا کہ وہ فوراً یہ وردی پہن لے۔

وہ جب باہر نکلے تو کاہ کاہی وردی میں ملبوس تھی۔ چھاپہ ماروں نے دروازہ بند کر کے چٹخنی چڑھا دی اور گھوڑوں پر سوار ہوگئے۔ فالتو گھوڑا کاہ کاہی کے لیے لے جایا گیا تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں سے جا ملے اور فوجی شان سے فوجی ترتیب میں محل کے صدر دروازے سے بھی نکل گئے۔ شہر سے گذرتے اُن کی چال وہی رہی۔ وہ اُسی باوقار چال سے شہر سے بھی نکل گئے۔ شہر جب درختوں [illegible] اوٹ میں ہوگیا تو انہوں نے گھوڑوں کو ایڑ لگا دی۔ کاہ کاہی گھوڑ سواری کی ماہر تھی۔ اُس نے چھاپہ ماروں کو احساس نہ ہونے دیا کہ وہ عورت ہے اور مردوں کی طرح اتنا لمبا اور اتنا کٹھن سفر نہیں کر سکے گی۔

سلطان محمود فوج کی کمی بہت حد تک پوری کر چکا تھا۔ اماموں سے مسجدوں میں کچھ عرصے سے اعلان کرائے جا رہے تھے کہ فوج کی کمی پوری کرنے کے لیے رضاکاروں کی ضرورت ہے۔ چنانچہ ہزارہا رضاکار فوج میں آگئے۔ وہ اپنے گھوڑے

یا اونٹ ساتھ لائے تھے۔ جو خود نہ آسکے انہوں نے اپنے گھوڑے دے دیئے۔ اُس نے جب کوُچ کا حکم دیا اُس وقت اُس کی فوج کی تعداد (مورخ بیہقی کے مطابق) ایک لاکھ (سوار اور پیادہ) تھی اور پانچ سو ہاتھی تھے۔

وہ فوج کو بلخ لے گیا۔ اس سے آگے بڑا ہی وسیع و عریض صحرا تھا۔ سلطان نے صحرا سے پہلے کا یہ اہتمام کر رکھا تھا کہ بیس ہزار بڑی کشتیاں تیار کر کے ترمز کے مقام پر دریا کے کنارے رکھ دی تھیں۔ دریائے اوکسس کا رُخ خوارزم کی طرف تھا۔ سلطان کی فوج، گھوڑے، ہاتھی، اونٹ وغیرہ کشتیوں میں سوار ہوگئے۔ سامان بھی لاد دیا گیا۔ یہ بیڑہ دریا کے بہاؤ کے ساتھ روانہ ہوگیا۔ یہ کشتیوں کا سب سے بڑا بیڑہ تھا جو کسی بادشاہ نے کبھی دریا میں ڈالا ہو۔

یہ بیڑہ ہزار اسپ سے آگے نکل گیا اور خوارزم کے دارالحکومت جرجانیہ سے تھوڑی دُور جا رکا۔ تمام فوج کشتیوں سے اُتر آئی اور عارضی طور پر خیمہ زن [illegible]۔ مورخین نے لکھا ہے کہ التگین کو جب سلطان محمود کی آمد اور اس کی جنگی طاقت کی اطلاع ملی تو اُس نے سلطان کے پاس اپنے ایلچی صلح نامے کی شرائط کے ساتھ بھیجے مگر سلطان محمود نے صلح کی جو شرائط بتائیں وہ اتنی سخت تھیں کہ التگین [illegible] گھبرا گیا۔ اُس نے خوارزم کی تمام تر فوج اکٹھی کی تو اس کی تعداد پچاس ہزار تھی۔ اُس نے تین چار بڑے ہی قابل اور تجربہ کار سالاروں کو صرف اس لیے مروا دیا تھا کہ وہ ابوالعباس کے حامی تھے۔ کچھ فوجی مشیر بھی اس کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔

جنگ کی ابتدا سلطان محمود کے لیے نقصان دہ اور بہت بُری ہوئی۔ اُس کی فوج کے ہراول دستے اس کے مشہور اور بڑے ہی تجربہ کار سالار ابوعبداللہ محمد الطائی کی زیرِ کمان فوج کے بڑے کیمپ سے دُور آگے خیمہ زن تھے۔ صبح کی نماز کا وقت تھا اور تمام تر نفری باجماعت نماز پڑھ رہی تھی۔ خوارزم کے سالار خمرطاش کے دستے قریب ہی تیار کھڑے تھے۔ شاید خمرطاش کو معلوم تھا کہ سلطان محمود کے حکم کے مطابق خیمہ گاہ میں فوج باجماعت نماز پڑھا کرتی ہے۔ اُس نے یہی موقع موزوں سمجھا اور سوار دستوں سے حملہ کر دیا۔

ابوعبداللہ محمد الطائی جس کا تاریخوں میں احترام اور اہمیت سے ذکر آیا ہے، انتہائی مشکل حالات میں معرکے لڑنے اور جیتنے والا سالار تھا۔ میدانِ جنگ میں جنگی چالوں اور اعلیٰ قیادت کے لحاظ سے سلطان محمود کا ہم پلہ تھا مگر اُس پر نا ر کی حالت میں حملہ ہوا۔ دستے بکھرے تھے اور ایک جگہ جمع تھے۔ انہیں ہتھیار اُٹھانے کی مہلت نہ ملی اور سلطان محمود کی فوج کے بہترین دستے مارے گئے۔ سالار الطائی اپنے چند ایک کمانداروں اور سپاہیوں کے ساتھ بچ نکلا۔

سلطان محمود کو اطلاع ملی تو اُس نے قلب کے باڈی گارڈز کو خمرطاش کے دستوں کے تعاقب میں بھیج دیا۔ اطلاع یہ ملی تھی کہ خمرطاش، محمد الطائی کے دستوں کو کچلتا ہوا نکل گیا ہے۔ باڈی گارڈز کا دستہ فوج کے چنے ہوئے سپاہیوں کا دستہ تھا۔ گھوڑے بھی چنے ہوئے تھے۔ خمرطاش دور نہیں گیا تھا۔ اُس کے اور اُس کے دستوں کے حوصلے بلند ہو گئے تھے۔ وہ پہلے حملے کی کامیابی پر خوش ہو رہے تھے اور ذرا آرام کے لیے رُک گئے تھے۔

یہ ریگستان تھا۔ انہیں گرد کے بادل اُٹھتے دکھائی دیئے۔ خمرطاش نے گرد سے اندازہ لگایا کہ غزنی کے بہت سے دستے جوابی حملے کے لیے آ رہے ہیں۔ اُس نے حملہ روکنے کی تیاری کا حکم دیا۔ سوار گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ سلطان کے باڈی گارڈ کا دستہ گھیرے میں لینے کی ترتیب میں ہو گیا۔ خمرطاش کے سواروں نے گھیرے سے نکلنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ دوڑتے گھوڑوں کی اڑائی ہوئی گرد سے انہیں سلطان محمود کے حملہ آور دستوں کی صحیح نفری کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔ وہ آگے بڑھ کر لڑنے کی بجائے پیچھے ہٹنے اور نکل بھاگنے کے لیے لڑ رہے تھے۔

اس معرکے کا فیصلہ بہت جلدی ہو گیا۔ خمرطاش پکڑا گیا اور اس کے دستے کو بہت بُری شکست ہوئی۔

سلطان محمود نے رات کو اپنی فوج کو نئے سرے سے منظم کیا۔ فوج کے ایک حصے کو دریا کے کنارے بھیج دیا۔ اس حصے کو وہاں جگہ کا انتظار کرنا تھا جو التنگیم انہیں

کشتیوں پر سوار ہو کر جرجانیہ کی سمت چلے جانا اور جرجانیہ کے قریب جا کر کشتیوں سے نکل کر شہر پر حملہ کرنا تھا۔ دوسرے دن سلطان محمود نے کوئی حرکت نہ کی۔ وہ تاثر یہ دینا چاہتا تھا کہ وہ ابھی حملے کے لیے تیار نہیں۔ التنگیم فنِ حرب و ضرب میں اناڑی تھا۔ اُس کا ایک سالار خمرطاش قید ہو چکا تھا۔ سالار ابواسحاق کو اُس نے دریا کے قریب کہیں ریزرو میں رکھا تھا۔ دوسرے قابل سالاروں اور نائب سالاروں کو وہ قتل کرا چکا تھا۔

وہ سلطان محمود کی چال نہ سمجھ سکا، نہ اُس نے سلطان کی فوج کی تقسیم دیکھی۔ اُس نے اپنے دشمن کی ترتیب اور تنظیم کا بھی جائزہ نہ لیا اور اس خوش فہمی میں حملہ کر دیا کہ غزنی کی فوج ابھی خیموں میں ہے۔ یہ ۵ صفر ۴۰۸ھ (۳ جولائی ۱۰۱۷ء) کا دن تھا۔ تاریخ الوزراء میں الفضل نے اس معرکے کی جو تفصیل لکھی ہے، اس کے مطابق التنگیم نے اپنی فوج کی قیادت خود کی۔ وہ سب سے آگے تھا۔ اُس نے دائیں بائیں کا خیال رکھے بغیر سامنے سے حملہ کیا۔

اُس وقت کی دیگر تحریروں کے مطابق التنگیم کے سپاہیوں نے بے جگری کے مظاہرے کیے اور بڑی بہادری سے لڑے۔ وہ غزنی کے خلاف نعرے لگا رہے تھے اور انہیں خدا کے بھیجے ہوئے اور غیب کی خبریں دینے والے فقیروں کا قاتل کہہ رہے تھے۔ ان کے دلوں میں سلطان محمود اور غزنی کی فوج کے خلاف بڑی کاوش سے نفرت پیدا کی گئی تھی۔ وہ نفرت میدانِ جنگ میں بے پناہ قوت بن گئی تھی۔ اگر فتح صرف بہادری سے لڑنے اور قہر و غضب سے کشت و خون کرنے سے حاصل ہو سکتی تو فتح التنگیم کی تھی، لیکن چالیں سلطان محمود کی چل رہی تھیں۔

ایک تو سلطان نے گھوڑے سے اتر کر دو رکعت نفل پڑھے اور خدا سے مدد مانگی، دوسرے اُس نے التنگیم کے دائیں پہلو پر ہاتھیوں سے حملے کا حکم دیا۔ ابھی تک ہاتھی میدانِ جنگ میں نظر نہیں آئے تھے۔ ہاتھی پہلو سے آئے۔ تمام ہاتھی چنگھاڑ رہے تھے۔ خوارزم کی فوج کبھی ہاتھیوں کے خلاف نہیں لڑی تھی۔ سپاہی گھبرا گئے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ ہاتھی جتنا ہیبت ناک لگتا ہے اتنا ہی کمزوریوں کا حامل ہے۔ ہاتھیوں

کے دائیں اور بائیں پیادہ دستے اور پیچھے گھوڑ سوار تھے۔ ہاتھی دوڑے آ رہے تھے اور زمین ہل رہی تھی۔ الپتگین نے اپنی فوج کو جوش دلایا مگر سپاہی بکھر گئے۔

وہ ہاتھی قلب میں جا پہنچے جہاں الپتگین تھا۔ قلب نے بہت مقابلہ کیا مگر الپتگین کے باڈی گارڈ دل چھوڑ گئے۔ شام تک معرکے کا فیصلہ ہو گیا۔ الپتگین بھاگ نکلا لیکن اُسے پکڑ لیا گیا۔

جُرجانیہ دارالحکومت تھا۔ اس پر قبضہ لازمی تھا۔ سلطان محمود نے فوج کے اُس حصے کو جسے اُس نے دریا کے کنارے بھیج رکھا تھا، کشتیوں میں سوار ہو کر جُرجانیہ کی طرف جانے کا حکم بھیج دیا۔ یہ فوج جن کشتیوں میں سوار ہوئی اس کی تعداد کم و بیش چار ہزار تھی۔ کشتیاں جب جُرجانیہ کے قریب پہنچیں تو سامنے سے تقریباً تین ہزار کشتیاں آ رہی تھیں۔ صبح طلوع ہو رہی تھی۔ یہ الپتگین کے سالار ابو اسحاق کی فوج تھی جسے الپتگین نے ریزرو میں رکھا ہوا تھا مگر اُسے آگے بلانے کی مہلت نہ ملی۔ ابو اسحاق نے اپنے طور پر دیکھ لیا تھا کہ غزنی کی کچھ فوج دریا کے کنارے سے حکم کا انتظار کر رہی ہے۔

وہ اس چال کو سمجھ گیا۔ اُس نے اپنی فوج کو کشتیوں میں سوار کیا اور جُرجانیہ سے آگے آ گیا۔

سلطان محمود کی کشتیاں آگے بڑھیں تو دیکھا کہ دشمن دریائی جنگ کے لیے تیار ہے۔ دونوں فوجیں دریا میں ٹکرا گئیں۔ کشتیاں قریب کر کے سپاہی ایک دوسرے کی کشتیوں میں کود کر دست بدست معرکہ لڑ رہے تھے۔ کشتیاں ایک دوسری سے ٹکرا رہی تھیں۔ الٹ بھی رہی تھیں۔ دریا سرخ ہوتا جا رہا تھا۔

سلطان محمود کو تیز رفتار قاصد نے اطلاع دی کہ دریا میں لڑائی ہو رہی ہے۔ فاصلہ میلوں کا تھا۔ پیادہ دستے اتنی جلدی نہیں پہنچ سکتے تھے۔ سلطان نے گھوڑ سوار اور شتر سوار دستوں کو بھیج دیا اور خود اُن کے پیچھے گیا۔ یہ دستے جب دریا کے کنارے پہنچے تو دریا میں دُور دُور تک دونوں فریقوں کی کشتیاں ایک دوسری میں گڈمڈ تھیں۔ شتر سواروں نے دریا کے کنارے سے کشتیاں پہچان پہچان کر تیر چلائے۔ بعض گھوڑ سواروں نے یہاں تک شجاعت کا مظاہرہ کیا کہ گھوڑے دریا میں ڈال

دیئے لیکن زیادہ گہرے پانی میں نہ گئے۔ سلطان محمود نے آ کر صورتِ حال دیکھی تو اُس نے گھوڑ سواروں کو دریا سے نکل آنے کا حکم دیا۔

اُس وقت کے ایک وقائع نگار ابن اسفندیار نے لکھا ہے کہ دارالحکومت جُرجانیہ کے لوگ چار مہینوں میں ہی الپتگین کی فوجی حکومت سے اس قدر بدحال ہو گئے تھے کہ ہر کسی پر گرفتاری کا خوف طاری رہتا تھا۔ بدنظمی ایسی کہ عدل و انصاف ناپید ہو گیا۔ سپاہی کی بات حکم کی حیثیت رکھتی تھی۔ ان لوگوں کو پتہ چلا کہ دریا میں غزنی اور خوارزم کی فوج کی لڑائی ہو رہی ہے اور پھر صحرا کی لڑائی سے بھاگے ہوئے سپاہیوں سے پتہ چلا کہ الپتگین اور خمرطاش پکڑے گئے ہیں تو شہر کے لوگ نیزے، بھالے، تلواریں، اور جو ہتھیار ہاتھ لگا اُٹھا کر گھروں سے نکل آئے اور اُس فوج پر ٹوٹ پڑے جو شہر اور محل کے دفاع کے لیے وہاں موجود تھی۔

دریا کی یہ سب سے بڑی لڑائی سورج غروب ہونے سے کچھ دیر پہلے اس طرح ختم ہوئی کہ خوارزم کے سالار ابو اسحاق کو جو دریا کے کنارے پر کہیں اپنے دستوں کو احکام دے رہا تھا، شہر کے لوگوں کی بغاوت کی اطلاع ملی تو وہاں سے فرار ہو گیا۔ بعد میں اس کے اپنے سپاہیوں نے اُسے پکڑ کر غزنی کی فوج کے حوالے کر دیا تھا۔ لوگ فوج کے خلاف اس قدر بھڑکے ہوئے تھے کہ ان میں سے بعض دریا پر جا پہنچے اور غزنی کی فوج کی مدد کی۔

سب سے زیادہ بھڑکا ہوا تو سلطان محمود تھا۔ ابنِ اسفندیار اور بیہقی لکھتے ہیں کہ سلطان دریا کے کنارے گھوڑا دوڑاتا اور تیر اندازوں کو احکام دیتا تھا۔ اُس کے منہ سے جھاگ پھوٹ رہی تھی۔ رات بھر غزنی کی فوج قیدیوں کو پکڑتی اور اپنی لاشوں اور زخمیوں کو سنبھالتی رہی۔ سلطان بھی رات بھر جاگتا رہا۔ اُس کے پاس خوارزم کے ایسے شہری اور فوجی حکام آ گئے تھے جنہوں نے اُن افراد کی نشاندہی کی جو ابو العباس کے قتل میں شامل تھے اور جنہوں نے اُس کا تختہ الٹنے میں کوئی نہ کوئی کردار ادا کیا تھا۔ رات سے ہی پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی۔

اگلے روز التگین، سالار ابو اسحاق اور سالار خمرطاش کو سلطان کے سامنے پیش کیا گیا۔ اُس دور کے تین مبصروں اور تاریخ نویسوں ___ بیہقی، عطبی اور گردیزی نے اُن سزاؤں کی جو ان تینوں کو اور ان کے معاونین اور مشیروں کو سلطان نے دیں، تفصیل لکھی ہے ___ وہ لکھتے ہیں کہ سلطان محمود کو اتنے قہر اور غضب میں کبھی نہیں دیکھا گیا تھا۔ اُس نے ان لوگوں کو جو سزائیں دیں، ان کے تصور سے سلطان خود بھی کانپ اٹھا ہوگا۔ وہ ظالم اور قہار سلطان نہیں تھا لیکن وہ اپنے قابو میں نہیں رہا تھا۔

"تم تینوں صرف ابو العباس کے قاتل نہیں ہو" ___ سلطان محمود نے ان تینوں سے کہا۔ وہ بولتا تھا تو اُس کے منہ سے تھوک کے چھینٹے اڑتے تھے۔ یہ غصے کی انتہا تھی۔ اُس کے ہاتھ بھی غصے سے کانپ رہے تھے۔ اُس نے کہا ___ "تم ان ہزاروں آدمیوں کے قاتل ہو جو دونوں کی لڑائی میں دونوں طرف سے مارے گئے ہیں۔ اپنی فوج کے جانی نقصان کا حساب کرو۔ یہ فوج نہ تمہاری ہے نہ میری۔ یہ اسلام کی فوج تھی۔ یہ اللہ کے سپاہی تھے جنہیں تم نے اپنے سروں پر سجانے کے لیے ایک دوسرے کا قاتل بنا دیا۔"

سلطان محمود غصے سے اُٹھ کھڑا ہوا اور گرج کر بولا ___ "تم نے وہ خون دیکھا ہے جو صحرا نے چوس لیا ہے؟ تم نے وہ خون دیکھا ہے جو دریا میں بہہ گیا ہے؟ تم نے [illegible] میں تڑپ تڑپ کر مرتے زخمیوں کو دیکھا ہے؟ فرنگیوں کی امداد سے تخت پر بیٹھنے والو! حق کی بات کرنے والوں کی گردنیں کاٹنے والو! ہاتھ میں قرآن لے کر لوگوں کو فریب دینے والو! اپنے آپ کو سچا مسلمان کہہ کر سچے مسلمانوں کا خون بہانے والو! تم خدا کی موجودگی کو بھول گئے تھے۔ تم بھول گئے تھے کہ خدا اپنے مظلوم بندوں کی فریادیں سنتا ہے۔ تم نے اپنی قوم کی قسمت یہودیوں اور عیسائیوں کے ہاتھوں میں دے دی۔ تمہاری عقل پر اور تمہارے ایمان پر فرنگی عورت، زر و جواہرات، شراب اور حکومت کا طلسم طاری ہو گیا تھا۔ تم نے اپنا ایمان بیچا۔ ایمان فروشو! میں بت شکن ہوں اور تم باطل کے بت ہو۔ میں تمہیں اُسی طرح توڑ کر ریزہ ریزہ کروں گا جس طرح میں نے ہندوستان کے بت توڑے ہیں

...تمہیں سرکاری خزانے سے اس لیے تنخواہیں اور روٹی ملتی رہی کہ اپنے ملک اور مذہب کے دفاع میں اپنی جانیں لڑا دو گے مگر تم نے اپنے فرائض کو نظر انداز کر کے اپنے ہی ملک پر قبضہ کر لیا اور اپنے مذہب کی آڑ میں قوم کا جینا حرام کر دیا... انہیں باہر لے جاؤ اور انہیں کوڑے لگاؤ۔"

شہر کی آبادی اُس میدان میں اُمڈ کر آ گئی جہاں التگین، ابو اسحاق اور خمرطاش کو کوڑے لگائے جانے تھے۔ اب یہ تین نہیں تھے۔ رات کو اور انہیں باہر میدان میں لانے تک اُن کے بہت سے ساتھی پکڑے گئے تھے۔ وہ بھی میدان میں اُن کے ساتھ کھڑے تھے ___ چار چار کو آگے لا کر تنومند سپاہیوں سے انہیں کوڑے لگوائے گئے۔ اُن کی چیخیں لوگوں کے نعروں میں دب گئی تھیں۔ سلطان خود بھی وہیں تھا۔ بیہقی، عطبی اور گردیزی لکھتے ہیں کہ سلطان محمود نے کوڑا زنی بند کرا دی۔ انہیں جب ہوش آیا تو انہیں ایک چبوترے پر کھڑا کر دیا گیا اور لوگوں سے کہا گیا کہ ان کے قریب سے گزر کر انہیں دیکھو۔ لوگوں نے انہیں قریب آ کر اس طرح دیکھا کہ ان پر تھوکا اور بعض نے زمین پر سے مٹی اُٹھا کر اُن پر پھینکی۔ انہیں گالیاں دیں، لعن طعن کی اور میدان کے اردگرد جا کھڑے ہوئے۔

اس کے بعد سلطان محمود نے ایسا حکم دیا کہ ہر طرف سناٹا طاری ہو گیا۔ کسی کو جیسے یقین نہیں آتا تھا کہ یہ سلطان محمود نے حکم دیا ہے۔ حکم یہ تھا کہ ان کے بازو کندھوں سے کاٹ دو۔ سپاہی تلواریں لیے آئے۔ مجرموں نے ادھر اُدھر بھاگنے کی کوشش کی، منتیں کیں، سلطان کو پکار پکار کر بخشش مانگی مگر سلطان کے اعصاب پر دونوں فوجوں کے وہ سپاہی چھائے ہوئے تھے جو ان کی طمع کے نتیجے میں مارے گئے تھے۔ تمام مجرموں کے بازو کاٹ دیئے گئے۔

سلطان نے اسی پر بس نہ کی۔ اُس نے پہلے ہی پندرہ بیس ہاتھی منگوا کر ایک طرف کھڑے کر رکھے تھے۔ اس نے حکم دیا کہ ان پر ہاتھی چھوڑ دو۔ ہر ہاتھی پر ایک مہاوت سوار تھا۔ ہاتھی دوڑتے آئے۔ مجرموں کے پاؤں میں بیڑیاں تھیں۔ ان سے

وہ آہستہ آہستہ صرف چل سکتے تھے۔ وہ ہاتھیوں سے بچنے کے لیے اِدھر اُدھر ہوئے لیکن مہاوتوں نے ہاتھیوں کو گھما پھرا کر سب کو کچل ڈالا۔ تین چار بار ہاتھی اِن کے اوپر سے گذارے گئے۔

اس کے بعد ان تمام کی کچلی مسلی ہوئی لاشیں اٹھوا کر ابوالعباس کی قبر تک لے جائی گئیں اور ان کی گردنوں میں رسے ڈال کر لکڑی کے اُن کھمبوں کے ساتھ لٹکا دیا جو اسی مقصد کے لیے وہاں پہلے ہی گاڑ دیئے گئے تھے۔

چند دن اور کوئی نہ کوئی پکڑا جاتا رہا۔ اُس کا جرم ثابت ہونے پر اُسے یہی سزا دی گئی، پھر پکڑ دھکڑ بند کر دی گئی۔ سلطان محمود نے التنطاش کو خوارزم کا خوارزم شاہ بنا دیا اور ارسلان جاذب کو اُس کا نائب مقرر کیا اور خوارزم کو سلطنت غزنی میں شامل کر لیا۔ ان دونوں نے جاسوسی اور مخبری کے نظام کو جسے "دیوان شغلِ اشرافِ مملوکات" کہا جاتا تھا خوب استعمال کیا۔

سلطان محمود کا یہ محکمہ آج کی انٹیلی جنس کا کام کرتا تھا۔ اس میں کام کرنے والوں کو مُشرف کہا جاتا تھا۔ دشمن کے ملک میں اُس ملک کے جس باشندے کو اپنا مخبر یا ایجنٹ بنایا جاتا، اُسے بھی مشرف کہتے تھے۔ بیہقی نے لکھا ہے کہ مشرفوں کو سلطان محمود بے دریغ تنخواہیں اور الاؤنس اور انعامات دیا کرتا تھا۔ ان کے اہل و عیال کو وہ الگ وظیفے دیتا تھا۔ اس مورخ کے مطابق سلطان محمود کے مُشرف اتنے ہوشیار تھے کہ اپنے دشمن ملک کے بادشاہ کی سانسیں بھی گِن لیا کرتے تھے۔

التنطاش اور ارسلان جاذب نے اس محکمے کے بڑے ہوشیار اور ذہین مُشرف غزنی سے بلائے، کچھ خوارزم سے لیے اور اُن زمین دوز تخریبی کارروائیوں کا سراغ لگا لیا جو یہودیوں اور عیسائیوں نے ابھی تک جاری رکھی ہوئی تھیں۔ انہیں اور ان کے مقامی ایجنٹوں کو گرفتار کر کے ویسی ہی سزائیں دی گئیں جیسی الپتگین وغیرہ کو دی گئی تھیں۔ شہریوں کے بنیادی حقوق بحال کر کے اُن میں خود اعتمادی پیدا کی گئی۔

سلطان محمود جب غزنی کو واپس جا رہا تھا تو صحرا میں اُس جگہ رُک گیا جہاں دونوں فوجوں کی لڑائی ہوئی تھی۔ وہ بہت دیر وہاں کھڑا اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ وہاں ابھی تک

گدھ، گیدڑ اور کتے لاشوں کی ہڈیاں نوچ رہے تھے۔ سلطان محمود کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اُس نے فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھائے اور جب اُس نے ہاتھ منہ پر پھیرے تو ہاتھ آنکھوں پر ہی رہنے دیئے ___ وہ سسکیاں لے رہا تھا۔

طوفان جو غزنی سے آیا

دِلّی کے جنوب مشرق میں تقریباً دو سو میل دور گنگا کے دائیں کنارے پر قنوج نام کا ایک شہر ہے۔ سلطان محمود غزنوی کے زمانے میں قنوج ایک طاقتور ہندو ریاست کی راجدھانی تھی۔ وہاں کے مہاراجہ کا نام راجیاپال تھا۔ مورخ لکھتے ہیں کہ شمالی ہند میں قنوج کے راجکماروں کو باعزت مقام حاصل تھا۔ دِلّی سے اسّی پچاسی میل جنوب میں جمنا کے کنارے متھرا کا شہر ہے جو ہندوؤں کے مطابق چار ہزار سال سے مقدس چلا آرہا ہے۔ ان کا کرشن مہاراج متھرا میں ہی پیدا ہوا تھا۔ آج بھی ہر سال دُور دور سے ہندو متھرا جاتے اور عبادت کرتے ہیں۔

متھرا میں ایک بڑے مندر کے علاوہ چند اور چھوٹے مندر تھے۔ یہ تراشے ہوئے پتھروں سے تعمیر کیے گئے تھے۔ ان کے کمرے، راہداریاں اور اندرونی راستے بھول بھلیوں جیسے تھے۔ شہر کے اردگرد مضبوط دیوار تھی اور ایک قلعہ بھی تھا۔ متھرا الگ ریاست نہیں تھی۔ اس کے دفاع کی ذمہ داری قنوج کے مہاراجہ راجیاپال اور پڑوس کی ایک اور چھوٹی سی ریاست مہابن کے حکمران رائے کول چند نے سنبھال رکھی تھی۔ کچھ اور رائے اور راجے بھی تھے جنہوں نے متھرا کے دفاع کے لیے اپنی اپنی فوجی نفری دے رکھی تھی۔

متھرا سے ملحق ریاست مہابن گھنے جنگلوں کا علاقہ تھا۔ راجدھانی کا نام مہابن تھا۔ یہ بھی جمنا کے دائیں کنارے پر واقع تھا اور متھرا سے تئیس میل کے لگ بھگ دُور تھا۔

سلطان محمود غزنوی کے زمانے میں ان ریاستوں کی بڑی آب و تاب تھی مگر سلطان ان پر آسیب کی طرح سوار ہو گیا تھا۔ وہ تھانیسر تک کے بت توڑ کر وہاں اپنی چوکیاں قائم کر گیا تھا۔ پنجاب کا مہاراجہ بھیم پال نندر بھی اُس کا باجگزار تھا۔ چھوٹے چھوٹے رائے اور راجے تو سلطان محمود کے نام سے بھی ڈرتے تھے۔

۱۰۱۷ء میں جب سلطان محمود نے خوارزم کو سلطنتِ غزنی میں شامل کر لیا، متھرا میں ہندوؤں کا سالانہ اجتماع تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے تمام تر ہندوستان کی آبادی متھرا میں آگئی ہو۔ شہر میں، بڑے مندر میں اور دریا کے کنارے مرد اور عورتیں چیونٹیوں کی طرح نظر آتی تھیں۔ کوئی جگہ خالی نہیں تھی۔ شہر کے باہر چھوٹے بڑے ہزاروں خیمے نصب تھے۔ شہر سے دو تین میل دور جنگل میں کہیں کہیں رنگا رنگ کپڑوں کے محل کھڑے نظر آتے تھے۔ یہ راجوں مہاراجوں کے شامیانے اور قناتیں تھیں۔ ان کے اردگرد ان کے محافظ دستوں کے خیمے تھے۔ ان کے ساتھ ہاتھی اور گھوڑے بھی تھے۔ راجے مہاراجے بھی متھرا کی پراتھنا اور جمنا کے اشنان کے لیے آئے تھے۔

زیادہ وسیع اور دلکش قیام گاہ مہاراجہ قنوج راجیاپال کی تھی اور اتنی ہی قیام گاہ پنجاب کے مہاراجہ بھیم پال نندر کی تھی۔ ان کے اندر جا کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ شامیانے اور قناتیں ہیں۔ رنگا رنگ فانوسوں، قندیلوں اور ریشمی پردوں نے محل کا سماں باندھ رکھا تھا۔ راجوں مہاراجوں کی بیویاں اور ناچنے گانے والیاں بھی ساتھ تھیں مگر متھرا کے پنڈتوں کے تیور دیکھ کر کسی کو رقص و سرود کی محفل گرم کرنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ یہاں تو ہر سال میلے کا سماں ہوا کرتا تھا۔ باہر سے آئے ہوئے لوگ بھی ناچا اور گایا کرتے تھے مگر اب چیونٹیوں جیسے اس ہجوم پر اداسی بھی طاری تھی اور دہشت بھی۔

اس اداسی اور دہشت کا باعث سلطان محمود غزنوی تھا۔ ہندوؤں کے لیے "محمود" خوف اور نفرت کا ایک نام بن گیا تھا۔ پنڈتوں کی زبان پر یہی الفاظ تھے ـــ "وِشنو دیوتا اور کرشن واسدیو کے قہر سے تم بچ نہیں سکو گے"۔ پجاری اور باہر سے آئے ہوئے لوگ بھی ایک آواز سنتے تھے ـــ "دیوی دیوتاؤں کی توہین کرا کے تم زندہ کس طرح ہو۔ تم راتوں کو سوتے اور پیٹ بھر کر کھاتے کس طرح ہو۔ جب تک تم غزنی کی اینٹ

سے اینٹ نہیں بجا دو گے اور محمود کے خون سے کرشن واسدیو کے پاؤں نہیں دھوؤ گے، دیوتاؤں کا قہر ٹلے گا نہیں۔ اب گنگا جل اور جمنا جل تمہیں پاک نہیں کر سکتا۔ کرشن، واسدیو (کرشن مہاراج) کے پاؤں پر ماتھے رگڑنے والے اب اس بُت کی آنکھوں میں دیکھنے سے ڈرتے تھے۔ وہ جب بُت کے پاؤں پر ماتھا رکھتے تو ان کے آنسو بہنے لگتے تھے۔ مندر کی گھنٹیوں میں بھی اداسی تھی۔ بچوں والی عورتیں اتنی ڈری ہوئی تھیں کہ اپنے بچوں کو دیوتاؤں کے قہر سے بچانے کے لیے ان کے قدموں میں اپنے زیورات اتار کر رکھ دیتی تھیں۔ مرد بُت کے آگے ہاتھ جوڑ کر قسمیں کھاتے تھے کہ وہ اپنے مندروں اور دیوتاؤں کی توہین کا انتقام لیں گے۔ بعض بلند آواز سے کہتے تھے کہ اب محمود آیا تو وہ اسے اور اس کی فوج کو زندہ واپس نہیں جانے دیں گے۔

راجیا پال مہاراجہ قنوج جب کرشن واسدیو کے بُت کی پوجا کرنے اندر گیا تو اس کا خاص محافظ جگن ناتھ بھی اُس کے ساتھ تھا۔ جگن ناتھ گٹھے ہوئے دلکش جسم کا دراز قد اور خوبرو آدمی تھا۔ اُس کے چہرے پر صحت اور جوانی کی سرخی تھی۔ اُس کی مسکراہٹ میں کشش اور اُس کی آنکھوں میں جادو کا سا اثر تھا۔ وہ شہسوار تھا۔ تیغ زنی اور تیر اندازی میں اُسے جو مہارت حاصل تھی، وہ کم ہی کسی میں تھی۔ اُسے مہاراجہ راجیا پال کے پاس آئے دو سال ہو گئے تھے۔ اُس نے پہلی ملاقات میں ہی مہاراجہ کا دل موہ لیا تھا۔

یہ ملاقات جنگل میں اُس وقت ہوئی تھی جب مہاراجہ شکار کھیل رہا تھا۔ مہاراجہ نے ایک ہرن پر تیر چلایا تو ہرن تیر کمان سے نکلتے ہی بھاگ اُٹھا اور تیر خطا گیا۔ اچانک جگن ناتھ سامنے آ گیا۔ مہاراجہ کے محافظوں نے اُسے وہاں سے ہٹانے کو بُرا بھلا کہا۔ اُس نے مسکرا کر مہاراجہ سے کہا کہ میں اُڑتے ہرن کو تیر سے نہ گرا سکوں، تو میرا گھوڑا لے لیا جائے اور مجھے دھکے دے کر یہاں سے چلتا کیا جائے۔

ہرن جب تیز دوڑتا ہے تو اتنی لمبی چوکڑیاں بھرتا ہے جیسے اُڑ رہا ہو۔ اس کی ایک ایک جست بیس تیس گز لمبی ہوتی ہے اور وہ زمین سے سات آٹھ گز اوپر اُٹھ جاتا ہے۔ مہاراجہ راجیا پال نے دلچسپی اور مذاق کی خاطر اُسے اپنی کمان اور صرف ایک تیر

دے کر کہا کہ ہمارے ساتھ رہو۔ کوئی ہرن نظر آیا تو اُسے بھگائیں گے۔ تم دوڑتے گھوڑے سے ہرن کو ایک تیر میں گرا لینا۔ اگر تیر خطا گیا تو گھوڑا ہم لے لیں گے۔

انہیں زیادہ دور نہ جانا پڑا۔ ایک جگہ چھ سات ہرن کھڑے تھے۔ مہاراجہ کے کہنے پر اُس کے آدمیوں نے شور مچایا تو ہرن بھاگ اُٹھے۔ جگن ناتھ نے ان کے پیچھے گھوڑا ڈال دیا۔ اُس کے پیچھے مہاراجہ نے بھی گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ ہرن ہوا میں اُچھلنے اور اُڑنے لگے۔ جگن ناتھ نے گھوڑے کی باگ اپنے دانتوں میں پکڑ لی۔ کمان آگے کر کے اس میں تیر ڈالا اور تیر چھوڑ دیا۔ ایک ہرن اڑان کی جست سے زمین پر آیا تو اوپر نہ اُٹھ سکا۔ گرا اور اُٹھ کر دوڑ پڑا۔ اس کے ساتھی آگے نکل گئے۔ اور جگن ناتھ کا گھوڑا اس تک پہنچ گیا۔ تیر ہرن کی ریڑھ کی ہڈی میں اُتر گیا تھا۔

"میں بھی رائے کی فوج کا کماندار ہوں"۔ مہاراجہ راجیا پال کو اُس نے بتایا۔ "مگر بھی رائے نے ایسی بُری شکست کھائی کہ اُس کی آدھی فوج ماری گئی اور آدھی غزنی والوں کی قیدی ہو گئی۔ میرا دل پھیکا پڑ گیا۔ میں لاہور کی فوج میں چلا گیا مگر یہ فوج بھی غزنی کے مسلمانوں سے شکست کھا گئی۔ اب لاہور کا راجہ محمود غزنوی کا باجگزار ہے۔ میں سپاہی ہوں۔ کمانداری کے عہدے پر تھا۔ میں کسی غیرت مند مہاراجے کی فوج میں شامل ہونا چاہتا ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ قنوج کے راجپوتوں میں غیرت ہے۔ میں اس جنگل میں آپ سے ہی ملنے آیا تھا۔"

مہاراجہ نے اس کے ساتھ کچھ باتیں کیں تو اُس نے محسوس کیا کہ یہ خوبرو جوان صرف تیر اور تلوار کا دھنی نہیں، اس میں عقل بھی ہے۔ مہاراجہ اس سے اتنا متاثر ہوا کہ اُسے اپنے محافظ دستے میں رکھ لیا۔ جگن ناتھ پر قومی اور مذہبی جذبات غالب تھے۔ وہ محمود غزنوی اور دوسرے مسلمانوں کے خلاف زہر آلود نفرت کا اظہار کیا کرتا تھا۔ اُس کی زبان میں کچھ ایسی چاشنی تھی کہ مہاراجہ راجیا پال نے اُسے اپنا ویسا ہی ذاتی محافظ بنا لیا جیسے آج کل ملکوں کے سربراہوں کے اے۔ ڈی۔ سی ہوتے ہیں۔ اس کے لیے زرق برق لباس سلوایا گیا۔ وہ جب دربار میں مہاراجہ کے پیچھے کھڑا ہوتا تھا تو اس کے پاس رنگدار برچھی رہتی تھی جس کے پھل پر سونے کا پانی چڑھا ہوا تھا۔ مہاراجہ جہاں جاتا

جگن ناتھ اس کے ساتھ ہوتا۔ وہ مہاراجہ کی شان و شوکت کا حصہ بن گیا تھا۔

راجیاپال کی تین رانیاں تھیں جگن ناتھ کے فرائض میں رانیوں کی حفاظت بھی شامل تھی۔ کوئی رانی کہیں جاتی تو جگن ناتھ بھی گھوڑے پر سوار گھوڑا گاڑی کے ساتھ ساتھ جاتا تھا۔ اس طرح جگن ناتھ سجاوٹ کی ایک چیز بن گیا تھا۔

مہاراجہ راجیاپال بڑے مندر میں مُبت کی پوجا کے لیے اندر گیا تو جگن ناتھ بھی اُس کے ساتھ تھا۔ مہاراجہ نے کرشن واسدیو کے پاؤں پر جو سنگِ مرمر کے تھے، ماتھا رگڑا۔ اپنے گناہوں کی معافی مانگی اور عہد کیا کہ وہ محمود غزنوی کا سر اس مندر میں اس بُت کے قدموں میں کاٹے گا۔

"اور میں عہد کرتا ہوں" ــــ جگن ناتھ نے ہاتھ جوڑ کر بُت سے کہا ــــ "اگر ہم سلطان محمود غزنوی کو یہاں نہ لا سکے تو میں اپنا سر اپنے ہاتھوں کاٹ کر تیرے قدموں میں رکھ دوں گا۔"

مہاراجہ نے چونک کر جگن ناتھ کو دیکھا۔ جگن ناتھ آنکھیں بند کیے، ہاتھ جوڑے ہوئے بھجن گنگنا رہا تھا۔ بڑے پنڈت نے دونوں کے آگے سلگتے ہوئے لوبان کی طشتری گھمائی۔ مہاراجہ نے لوبان کی راکھ اپنے ماتھے پر لگائی۔ جگن ناتھ نے بھی انگلی سے راکھ اپنے ماتھے پر لگائی۔ مہاراجہ نے اپنے گلے سے ہار اتارا جو بہت قیمتی تھا، اور یہ بُت کے پاؤں پر رکھ دیا۔

"مہاراج!" ــــ بڑے پنڈت نے راجیاپال سے کہا ــــ "ہری کرشن کو ان پھیکے موتیوں کی نہیں، موتیوں کی طرح چمکتے ہوئے خون کے قطروں کی ضرورت ہے۔ بھارت اپنے بیٹوں کا خون مانگ رہا ہے۔ بھارت ماتا کی بے عزتی کا انتقام نہ لینے والے مہاراجہ کو بن باسی ہو جانا چاہیے۔"

"ہم انتقام لیں گے" ــــ مہاراجہ قنوج نے بُت کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا ــــ "غزنی کے محمود کا سر اس مندر کے دروازے پر لٹکتا رہا کرے گا۔"

دن کے وقت دریا پر نہانے والوں کا اتنا ہجوم رہتا تھا کہ پانی میں کہیں کھڑا ہونے

کو جگہ نہیں ملتی تھی۔ عورتوں کو دور جا کر نہانا پڑتا تھا۔ دریا میں نہانا عبادت کا ایک لازمی حصہ تھا۔ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق گنگا اور جمنا کا پانی سارے گناہ دھو ڈالتا ہے۔ بعض ہندو پہروں پانی میں کھڑے عبادت کرتے رہتے ہیں۔ راجوں مہاراجوں کی رانیاں اور داشتائیں جو اُن کے ساتھ آئی ہوتی تھیں، وہ رعایا کی عورتوں کی موجودگی میں دریا میں نہانا پسند نہیں کرتی تھیں۔ وہ رات کو جایا کرتی تھیں۔

ایک شام مہاراجہ قنوج راجیاپال کی سب سے چھوٹی رانی چمپا کلی نے مہاراجہ سے کہا کہ وہ جمنا اشنان کے لیے جا رہی ہے۔ مہاراجہ اسے روک نہیں سکتا تھا۔ اُس نے جگن ناتھ سے کہا کہ وہ شام گہری ہونے کے بعد چمپا رانی کو دریا پر لے جائے۔ وہ بڑی دونوں رانیوں کو ایک رات پہلے دریا پر لے جا چکا تھا۔ خود اندھیرے میں دور کھڑا رہا تھا۔ رانیاں نہا کے آئیں تو انہیں واپس لے آیا تھا۔ چمپا ان کے ساتھ نہیں گئی تھی۔ وہ نوجوان تھی اور بہت خوبصورت۔ دوسری دونوں رانیاں پرانی ہو چکی تھیں۔ مہاراجہ انہیں اس لیے ساتھ رکھتا تھا کہ وہ اُس کے بیٹوں کی مائیں تھیں۔ مہاراجہ پر چمپا غالب تھی۔ پرانی رانیاں اس سے کچھ کھنچی کھنچی رہتی تھیں۔

یہ چمپا کوئی دو سال پہلے جب اُس کی عمر سولہ سترہ سال تھی مہاراجہ کے پاس تحفے کے طور پر آئی تھی۔ اس کا باپ کوئی امیر کبیر آدمی نہیں تھا۔ اس کے خاندان میں حسن کی دولت تھی اور چمپا اس حسن کا نمونہ تھی۔ مہاراجہ راجیاپال کے ایک جاگیردار کی نظر چمپا پر پڑی تو اس نے اُس کے باپ کو بہت سی رقم دے کر لڑکی بیوی کے طور پر لے لی تھی۔ شادی کی رسم ادا کی گئی تھی۔ جاگیردار چمپا کو قنوج لے گیا اور مہاراجہ کو پیش کر دی۔ مہاراجہ نے اسے حرم میں رکھنے کی بجائے اس کے ساتھ باقاعدہ شادی کر لی۔ مہاراجہ کی عمر پچاس سال سے اوپر ہو گئی تھی۔ چمپا اُس کی رگوں پر سوار ہو گئی اور پہلی دونوں رانیاں محل کی پرانی چیزوں میں شمار ہونے لگیں۔

شام کا اندھیرا گہرا ہوا تو چمپا اپنے محل نما خیمے سے نکلی۔ اس کے ساتھ ایک خادمہ بھی تھی۔ جگن ناتھ باہر انتظار کر رہا تھا۔ چمپا اپنی خادمہ کے ساتھ آگے آگے چل پڑی۔ جگن ناتھ ان کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا۔ وہ باہر سے آئے ہوئے لوگوں کے خیموں اور خرخیموں

کے ڈیروں سے دور نکل گئے تو دریا کا وہ کنارہ قریب آ گیا جہاں چمپا کو نہانا تھا۔ یہ جگہ خاصی دور تھی۔ اُدھر رعایا کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ چمپا رانی نے اپنی خادمہ سے کہا کہ وہ اُدھر چلی جائے جہاں لوگوں کی عورتیں نہا رہی تھیں۔ جگن ناتھ دریا سے کچھ دور رک گیا۔

خادمہ اندھیرے میں غائب ہو گئی۔ چمپا دریا کے قریب چلی گئی، اور ذرا دیر بعد واپس آ گئی۔

"اِدھر آ جاؤ جگن!" ــــ اُس نے کہا۔ "وہ چلی گئی ہے۔ میں نے اُسے کہہ دیا ہے کہ جلدی واپس نہ آئے۔"

جگن ناتھ اُس کے قریب چلا گیا۔ اندھیرا تھا اور جھاڑیوں اور درختوں کی اوٹ بھی تھی۔ دور دریا کے کنارے شعلے اُٹھ رہے تھے۔ مرے ہوئے دو تین ہندوؤں کو جلایا جا رہا تھا۔ دریا میں دو کشتیاں سی جا رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے جلتی ہوئی دو شعلیں تیرتی جا رہی ہوں۔ چمپا نے جگن ناتھ کو اپنے قریب بٹھا لیا اور سر اُس کے زانوؤں پر رکھ کر زمین پر لیٹ گئی۔

"تم نہ ہوتے تو میں اس بدھے کو زہر دے دیتی یا خود زہر کھا لیتی"۔ چمپا نے جگن ناتھ کی انگلیوں میں اپنی انگلیاں الجھاتے ہوئے کہا۔ "مگر تمہیں مہاراجہ کے ساتھ اتنا پیار ہے کہ اسے تم چھوڑنا نہیں چاہتے۔ تمہیں یہ محل اور اس کی نوکری اچھی لگتی ہے۔ مجھے اس سے نفرت ہے۔ میں رانی ہوں لیکن تم ساتھ دو تو میں تمہاری خاطر بن باسی بن کے دکھا دوں گی۔ جنگل میں کٹیا میں رہوں گی۔ یہاں سے کیوں نہیں نکلتے؟ مجھے یہاں سے نکالتے کیوں نہیں؟ ہم کب تک چوروں کی طرح ملتے رہیں گے؟"

"یہ بات تم مجھے ایک سو مرتبہ کہہ چکی ہو" ــــ جگن ناتھ نے کہا۔ "اور میں تمہیں ہر بار یہی کہتا ہوں کہ ذرا صبر سے کام لو۔ میں تمہیں یہاں سے نکال لے جاؤں گا..... اور میں پھر کہتا ہوں کہ میرے ساتھ نکل چلو گی تو یہ محل تمہیں بہت یاد آئے گا۔ میں وہ گز زمین کا بھی مالک نہیں۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں۔ ہماری حیثیت مفروروں کی سی ہو گی۔ ہم جہاں پکڑے گئے وہاں قتل کر دیئے جائیں گے۔"

"تم بھیرہ سے آئے ہو جہاں مسلمانوں کی حکومت ہے"۔ چمپا نے کہا۔ "اگر ہم بھاگ کر وہاں چلے جائیں اور مسلمان ہو جائیں تو کیا مسلمان ہمیں اپنی حفاظت میں نہیں رکھیں گے؟" ــــ چمپا رانی نے دانت پیس کر کہا۔ "مجھے اپنے مذہب سے بھی نفرت ہو رہی جا رہی ہے" ــــ وہ اُٹھ بیٹھی اور بولی ــــ "میں مہاراجہ کو آسانی سے زہر پلا سکتی ہوں۔ پھر تم مجھے اپنے ساتھ لے چلو گے؟ وہ مر گیا تو ہمیں کون پکڑے گا؟"

"وہ چتائیں جلتی دیکھ رہی ہو؟" ــــ جگن ناتھ نے اُن شعلوں کی طرف اشارہ کیا جو مرے ہوئے ہندوؤں کو چاٹ رہے تھے۔ "مہاراجہ مر گیا تو تمہیں ستی ہونا پڑے گا۔ تمہیں زندہ اپنے خاوند کی جلتی چتا پر کھڑا کر دیا جائے گا..... مجھ پر بھروسہ کرو چمپا! میں تمہیں دھوکہ نہیں دوں گا۔"

"تم نے بھیرہ میں غزنی کی فوج کے خلاف لڑائی لڑی ہے"۔ چمپا نے کہا۔ "کیا وہ فوج بہت زبردست ہے؟ ہمارے دیس کے راجپوت مسلمانوں کو شکست نہیں دے سکتے؟"

"غزنی کی فوج بہت زبردست ہے" ــــ جگن ناتھ نے جواب دیا۔ "مسلمان فوج کی تعداد جتنی کم ہوتی ہے، وہ اتنی ہی زبردست ہوتی ہے۔ اگر بھیم پال ٹھاکر کو بھی مسلمانوں نے گھٹنوں بٹھا دیا ہے اور اُس سے باج وصول کر رہے ہیں۔ سلطان محمود کشمیر سے شکست کھا کر واپس جا رہا تھا تو اُس کے پاس بہت تھوڑی فوج تھی اور وہ سب زخمی تھی۔ یہ فوج مہاراجہ بھیم پال کے علاقے سے گزری تو مہاراجے کو جرأت نہ ہوئی کہ اس مری ماری ہوئی فوج پر حملہ کر کے سلطان سمیت اسے قید کر لیتا۔"

"جگن ناتھ!" ــــ چمپا رانی نے کہا۔ "تم مذہب کے عاشق ہو۔ بُرا نہ جانو تو کہوں۔ ہمیں پنڈت ڈراتے ہیں کہ ہمارے جن دیوی دیوتاؤں کے بُت مسلمانوں نے توڑ دیئے اور جو مندر جلا دیئے ہیں وہ قہر نازل کریں گے..... اتنا عرصہ گزر گیا ہے، میں نے تو دیوتاؤں کا قہر کہیں گرتا نہیں دیکھا۔ ابھی تو غزنی کی فوج قہر کی طرح ہم پر ٹوٹ رہی ہے۔ میں نے سُنا ہے کہ مسلمان ایسے خدا کی عبادت کرتے ہیں جو کسی کو نظر نہیں آتا۔ میرا خیال ہے کہ وہی خدا سچا ہے۔ ہم نے تھانیسر کے دشنو دیو کی بہت باتیں سنی تھیں۔ ہم نے

سنا تھا کہ وشنو دیو کے پجاری کسی میدان میں شکست نہیں کھا سکتے مگر اس دیو کو غزنی کے سلطان سے نہ پجاری بچا سکے نہ دیو نے اپنے آپ کو بچایا.... کیا تم ان دیوتاؤں کی پوجا کرتے ہو؟"

"تم اپنی زندگی سے اس قدر اکتائی ہوئی ہو کہ اپنے مذہب سے نفرت کرنے لگی ہو" — جگن ناتھ نے اُس کے ریشم جیسے ملائم بالوں کو سہلاتے ہوئے کہا۔ "مذہب کے خلاف جو جی میں آئے کہو، میری محبت پر شک نہ کرنا۔"

"اپنی محبت کی خاطر تم مجھے کسی بھی امتحان میں ڈال دو، پوری اتروں گی۔" چمپا نے کہا — "مگر اس مذہب کے نام پر میں کوئی قربانی نہیں دے سکتی۔"

خادمہ کھانستی چلی آ رہی تھی۔ چمپا اٹھ کھڑی ہوئی اور چل پڑی۔ جگن ناتھ وہیں چھپا رہا۔ ذرا دیر بعد چمپا نے اُسے راہبوں کی طرح آواز دی اور خادمہ کے ساتھ آگے آگے چل پڑی۔

دوسرے دن مہاراجہ راجیپال نے جگن ناتھ سے کہا کہ وہ آج چھٹی کرے اور بازاروں کا گھوم پھر آئے۔ جگن ناتھ نے اپنے کپڑے پہنے اور کمر سے تلوار لٹکا کر سیر و تفریح کو نکل گیا۔ جگہ جگہ جوتشیوں، نجومیوں اور سیانا سیوؤں کے گرد مجمع لگے ہوئے تھے۔ لوگ جوتشیوں اور نجومیوں کو ہاتھ دکھا کر قسمت کا حال معلوم کر رہے تھے۔ بعض سادھوؤں نے مجمعے لگا رکھے تھے اور لوگوں کو تھوڑا تھوڑا کر کے پیسے اکٹھے کر رہے تھے۔ کہیں مداری اور کہیں بہروپئے اپنے کرتب دکھا رہے تھے۔

جگن ناتھ ہر مجمعے میں ذرا سا رکتا اور آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ ایک درخت کے نیچے دو سادھو بیٹھے تھے۔ ان کے صرف ستر ڈھانپے ہوئے تھے۔ ننگے جسموں پر راکھ ملی ہوئی تھی۔ سر کے بال لمبے اور راکھ سے اٹے ہوئے تھے۔ اُن کی داڑھیاں بھی تھیں۔ ان کے اردگرد مجمع زیادہ تھا۔

جب جگن ناتھ اس مجمع میں جا رکا تو ایک آدمی نے سادھوؤں سے کہا — "شری مہاراج جی! ہمیں ان ملیچھ مسلمانوں کے متعلق کچھ بتائیں جو سمندر پار سے آتے ہیں اور

ہمارے مندروں کا ستیاناس کر کے چلے جاتے ہیں۔"

"مسلمان ملیچھ ہیں" — ایک سادھو نے کہا۔ "لٹیرے ہیں۔ انہیں دھن کا لوبھ ادھر لاتا ہے۔ لوٹتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ وہ ہمارے کسی دیوی دیوتا سے نہیں ڈرتے۔ وہ نہیں جانتے کہ نارائن اور برہما بھارت نے وشنو اور واسدیو کے کرودھ کی جو خبر دی ہے وہ سچ ہے۔ دیوتا کا کرودھ مسلمانوں پر ضرور پڑے گا لیکن ابھی ہم پر پڑ رہا ہے۔ غزنی کا بادشاہ محمود بڑا ظالم اور زبردست ہے۔ وہ سیلاب کی طرح آتا ہے اور اُس کے سامنے کوئی فوج نہیں ٹھہر سکتی۔ ہاتھی بھی بھاگ جاتے ہیں۔ اُسے دریاؤں کی طغیانی بھی نہیں روک سکتی۔ اُسے پہاڑ بھی نہیں روک سکتے۔"

وہ مسلمانوں کو برا بھلا بھی کہہ رہا تھا اور اُن کی دہشت بھی طاری کرتا جا رہا تھا۔ اُس نے لوگوں کو غزنی کی فوج کی کچھ ایسی ہولناک باتیں سنائیں کہ سننے والوں کی آنکھیں خوف سے اُبل کر باہر آنے لگیں۔ جگن ناتھ سنتا رہا۔ سادھو نے بولتے بولتے اُسے دیکھا۔ ان کی نظریں ملیں۔ سادھو کی زبان ذرا سی رکی اور پھر رواں ہو گئی۔ اُس نے اب اپنے سامعین کو دیوتاؤں کے کرودھ (قہر) سے بچنے کے طریقے بتانے شروع کر دیئے۔ جگن ناتھ وہاں سے ہٹ گیا۔

وہ ٹہلتے ٹہلتے ایک پرانے مندر کی سیڑھیوں پر جا رکا۔ اُس نے دیکھا کہ وہی دو سادھو آ رہے تھے۔ جگن ناتھ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ یہ مندر خالی اور ویران تھا۔ اس کا کچھ حصہ کھنڈر بن چکا تھا۔ اُسے آواز سنائی دی — "تاشقین!"

وہ رکا نہیں۔ اُس نے پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ اُسے پھر آواز سنائی دی — "تاشقین!"

وہ سیڑھیاں چڑھتا گیا۔ دونوں سادھو تیزی سے سیڑھیاں چڑھتے اُس تک پہنچ گئے۔ ایک نے کہا — "امیر بن تاشقین!"

وہ رک گیا۔ اُس کے چہرے پر غصے کے آثار نظر آنے لگے — "کوئی بھی نہیں سن رہا۔ زبردست!" سادھو نے کہا۔

"ہشام سمرقندا!" — اُس نے سادھو کی طرف دیکھ کر سرگوشی کی۔ "اگر آس پاس کوئی نہیں، پھر بھی تمہیں میرا نام لے کر مجھے نہیں بلانا چاہیے تھا۔ تم اناڑی ہو گیا، یہیں بیٹھ جاؤ۔ میں اپنی ہتھیلی پھیلاتا ہوں۔ میرا ہاتھ پکڑ کر دیکھتے رہو اور باتیں کرتے رہو.... تم دونوں کے علاوہ اور کون ہے یہاں؟"

"دو آدمی اور ہیں" — ہشام نے جو سادھو کے بھیس میں غزنی کا جاسوس تھا جواب دیا۔ "قیس کی طرح دونوں مُشرف ہیں۔ وہ بھی سادھوؤں کے بھیس میں ہیں۔"

مُشرف انٹیلی جنس کے مقامی ایجنٹوں کو کہا کرتے تھے سلطان محمود غزنوی کا انٹیلی جنس کا جو نظام کام کر رہا تھا اس میں مقامی مسلمانوں کو مُشرف کے طور پر رکھ لیا جاتا تھا اور انہیں بڑی اچھی اُجرت دی جاتی تھی۔ یہ سادھو دراصل غزنی کا جاسوس ہشام سمرقندی تھا۔ اُسے ملتان سے متھرا اس مشن پر بھیجا گیا تھا کہ وہاں سارے ہندوستان کے ہندو جمع ہوں گے، لہٰذا وہ مقامی مُشرف ساتھ لے جا کر وہاں سادھوؤں کے بھیس میں لوگوں میں دہشت پھیلائیں۔ ہشام کے ساتھ دوسرا سادھو ملتان کے علاقے کا قیس نام کا ایک آدمی تھا۔ اُس کے ساتھ دو آدمی اور تھے جو متھرا کے ہجوم میں کہیں گم اپنا کام کر رہے تھے۔

ہشام نے جگن ناتھ کو جو دراصل امیر بن تاشقین تھا، پہچان لیا تھا۔ دونوں غزنی کے علاقے کے رہنے والے تھے۔ ہندوستان میں ان کی اب پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ قیس تاشقین کو نہیں جانتا تھا۔ تینوں اس علاقے کی زبان اور رسم و رواج سے بڑی اچھی طرح واقف تھے۔

"کہاں ٹھکانہ ہے؟" — ہشام نے تاشقین سے پوچھا۔ "کچھ ہاتھ لگا؟"

"میں جا رہا ہوں" — تاشقین نے کہا۔ "ہندو بن کر آیا تھا۔ اب جا رہا ہوں۔"

"آپ ہم سے چھپاتے ہیں؟" — قیس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "میں نے آپ کو مہاراجہ قنوج کے ساتھ دیکھا ہے۔ آپ شاید اُن کے محافظ بنے ہوئے ہیں۔ مجھے تو ذرا سا بھی شک نہیں ہوا تھا کہ آپ ہمارے آدمی ہیں۔ میں آپ کو سیر اُستاد مانتا ہوں۔"

"ہم تینوں کا یہاں بیٹھنا ٹھیک نہیں" — تاشقین نے کہا۔ "قیس! تم ذرا اِدھر ہو پھر رہو۔ ہم رات کو کہیں اکٹھے ہوں گے۔"

"ہشام!" — قیس کے چلے کے بعد امیر بن تاشقین نے ہشام سے کہا۔ "تم بہت بڑے بیوقوف ہو۔ کیا تم مقامی لوگوں پر اُس قدر اعتماد کرتے ہو کہ تم نے مجھ جیسے آدمی کو بے نقاب کر دیا ہے؟.... اس شخص کو تم نے کسی کام میں آزمایا ہے؟ اس نے کوئی بڑا کام کیا ہے؟"

"آدمی قابلِ اعتماد ہے" — ہشام نے کہا۔ "اسے ابھی کوئی نازک کام نہیں دیا گیا۔"

"خدا کرے یہ قابلِ اعتماد ثابت ہو" — تاشقین نے کہا۔ "لیکن ہمارا کام ہم سب کے لیے بہت خطرناک ہے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ اس کام میں کس طرح اپنی خواہشات اور اپنی کمزوریوں کو دبانا پڑتا ہے۔ یہ طاقت اُسی میں ہوتی ہے جس میں ایمان ہو اور جس میں وہ جذبہ ہو جو ہم میں ہے۔ ہندوستان کے ہر مسلمان پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ لوگ ایک زمانے سے ہندوؤں کے دبدبے میں رہ رہے ہیں۔ انہوں نے ہندوؤں کی تہذیب اور ان کی توہم پرستی کے اثرات قبول کر لیے ہیں۔ یہ لوگ اپنی مجبوریوں اور معذوریوں کے تحت ہندوؤں کو خوش کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اگر یہاں کے مسلمان قابلِ اعتماد ہوں بھی تو بھی انہیں میرے درجے کے آدمیوں سے واقف نہیں ہونا چاہیے۔ ہندو ذرا سی بات پر انہیں قتل کرتے اور ان کے گھر جلاتے اور ان کے گھروں میں گھس کر تلاشی لیتے ہیں۔"

"میں اسے بیکار کر دوں گا" — ہشام نے کہا۔

"اس نے مجھے مہاراجہ کے ساتھ دیکھ لیا ہے" — تاشقین نے کہا۔ "اسے کسی نے پکڑ لیا تو اذیت سے گھبرا کر یا لالچ میں آ کر مجھے پکڑوا دے گا۔ میں اس کے لیے بہت موٹا شکار ہوں۔ ذرا غور کرو کہ میں قنوج کے مہاراجہ کا ذاتی محافظ ہوں اور سب مجھے جگن ناتھ کہتے ہیں۔ مجھے جس نے پکڑوایا اُسے مہاراجہ ہیروں اور جواہرات کی صورت میں انعام دے گا۔"

"اگر تم اس شخص سے خطرہ محسوس کرتے ہو تو میں اسے آج ہی ختم کر کے اس کی لاش غائب کر دیتا ہوں" — ہشام نے کہا — "مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔"

"محض شک میں کسی کی جان نہ لو" — تاشقین نے کہا — "اس پر نظر رکھنا اور اسے پکا کر لینا۔"

"ہمارا کام تمہیں پسند آیا؟" — ہشام نے پوچھا — "لوگوں کو ان کے اپنے پنڈتوں نے ڈرا دیا ہے۔ اگر کوئی کسر رہ گئی تھی تو وہ ہم چار آدمیوں نے پوری کر دی ہے۔ یہ لوگ سادھوؤں، سنیاسیوں اور جوتشیوں کی جھوٹی باتوں کو بھی سچ مان لیتے ہیں۔ ہم نے ان کے دلوں میں ڈال دیا ہے کہ محمود غزنوی اپنے ساتھ جیسے جن بھوت لاتا ہے جو انسانوں کو کھا جاتے اور قلعوں کی دیواروں کو مسمار کر دیتے ہیں۔ یہاں کی مائیں اپنے بیٹوں کو فوج میں نہیں جانے دیں گی .... تم کیا کر رہے ہو؟"

"مہاراجہ قنوج کی نیت اور ارادے دیکھ رہا ہوں" — تاشقین نے جواب دیا — "نیت غصے میں ہے۔ جن راجوں اور مہاراجوں نے ہم سے شکست کھائی ہے انہیں برا بھلا کہتا رہتا ہے۔ یہاں سب آئے ہوئے ہیں۔ ان کا اجلاس ہو گا تب پتہ چلے گا کہ یہ لوگ کیا کرنا چاہتے ہیں۔"

"سلطان ابھی کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں" — ہشام نے کہا — "معلوم نہیں تمہیں اطلاع ملی ہے یا نہیں ...."

"کہ سلطان کو خوارزم میں بڑی خونریز لڑائی لڑنی پڑی ہے" — تاشقین نے ہشام کا جملہ پورا کرتے ہوئے کہا — "مجھے اطلاع مل چکی ہے۔ سلطان کو لاہور سے اطلاع ملی تھی کہ مہاراجہ بھیم پال نڈر قنوج کے مہاراجہ کو سلطان سے فیصلہ کن ٹکر لینے پر آمادہ کر رہا ہے۔ مجھے یہاں یہ دیکھنا ہے کہ قنوج کا مہاراجہ کیا فیصلہ کرتا ہے۔ کیا یہ سب لوگ غزنی پر حملہ کریں گے یا سلطان کو مشتعل کر کے اپنی فوجیں کسی اور جگہ اکٹھی کر لیں گے اور سلطان کو شکست دینے کی کوشش کریں گے۔ مجھے یہاں کے مہاراجوں کی فوجی طاقت دیکھنی ہے اور یہ بھی کہ وہ اس طاقت کو کس طریقے سے استعمال کریں گے۔"

"شاید اسی لیے ہمیں کہا گیا ہے کہ مندروں میں ہندو اکٹھے ہوں تو ان میں غزنی کی

فوج کی دہشت پھیلائی جائے" — ہشام نے کہا۔

"تم اب چلے جاؤ" — تاشقین نے کہا — "اور مقامی مخبروں کو اتنا زیادہ اعتماد میں نہ لو۔ انہیں استعمال کرنے کی کوشش کرو۔"

شام ہوتے ہی افق پر بادل جمع ہونے لگے تھے۔ اسی رات مہاراجوں اور راجوں کو مہاراجہ قنوج کی قیام گاہ میں اکٹھے ہونا تھا۔ ضیافت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ خوشنما قناتوں میں گھری ہوئی اور رنگارنگ شامیانوں سے ڈھکی ہوئی وہ جگہ خاصی وسیع تھی۔ ناچ گانے کا بھی انتظام تھا۔ کھانا اور شراب پیش کرنے کے لیے نیم عریاں جوان عورتیں تھیں۔ راجوں اور مہاراجوں کے ساتھ دو دو تین تین رانیاں بھی تھیں۔ بعض مہاراجوں کے ذاتی محافظ ان کے پیچھے کھڑے تھے۔ امیر بن تاشقین بھی مہاراجہ راجیہ پال کی نشست کے پیچھے جگن ناتھ کے بہروپ میں کھڑا تھا۔ کھانے کے دوران چمپا رانی اسے کبھی کبھی دیکھ لیتی تھی مگر تاشقین مندر کے بت کی طرح کھڑا تھا۔

کھانا ختم ہوا تو سازندوں کی آواز بلند ہوئی اور ایک رقاصہ ایک طرف سے تتلی کی طرح نمودار ہوئی۔

"بند کرو اس پاپ کو" — ایک آواز دھماکے کی طرح گرجی۔

ساز خاموش ہو گئے۔ رقاصہ وہیں سے لوٹ گئی۔ سب نے دیکھا۔ بڑے مندر کا پنڈت اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ یہ اسی کی آواز تھی۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ راجوں مہاراجوں اور ان کی رانیوں پر سناٹا طاری ہو گیا تھا۔

"کیا تم اس کی خوشی منانے اکٹھے ہوئے ہو کہ مہاراجہ بھیم پال جو اپنے آپ کو نڈر کہلاتا ہے، غزنی کے پاپی اور پلید سلطان کا باجگزار ہو گیا ہے؟" — پنڈت نے غصے سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا — "کیا تم اپنے دیوتاؤں کی توہین پر خوشی منا رہے ہو؟ کیا تم اس لیے ناچنے والیوں کو ساتھ لائے ہو کہ تمہارے مذہب پر مسلمانوں نے گھوڑے دوڑا دیئے ہیں یا اس لیے کہ راجپوتوں کا خون سرد ہو گیا ہے؟ تم خود ناچو۔ پاؤں سے گھنگھرو باندھ لو۔ چوڑیاں چڑھا لو ...."

"ہمیں معاف کر دو مہاراج!" — ایک راجہ نے اٹھ کر اور ہاتھ جوڑ کر کہا — "ہم آج یہ فیصلہ کرنے کے لیے اکٹھے ہوئے ہیں کہ غزنی کی فوج کو ہمیشہ کے لیے شکست دینی ہے۔"

"تم سب پر ہری کرشن واسدیو کا قہر آیا ہی چاہتا ہے" — پنڈت نے کہا — "تم نے ثابت کر دیا ہے کہ اسلام سچا اور ہندو مت جھوٹا مذہب ہے۔ تم نے مہا بھارت میں اسلام کا بیج پھر سے بو دیا ہے۔ تم نے محمد بن قاسم کو زندہ کر دیا ہے۔ تم دیوتاؤں کے قہر سے بچ نہیں سکتے۔"

بادل کی گرج سنائی دی۔ پنڈت انہیں لعنت ملامت کرتا رہا۔ بادل بار بار گرجنے لگے۔ پنڈت راجوں مہاراجوں کو دیوتاؤں کے قہر سے ڈرا رہا تھا۔ قناتیں بڑی زور سے ہلیں اور شامیانے اوپر کو اٹھے۔ اس کے بعد کپڑوں کے اس محل کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ طوفان فوراً ہی تند ہو گیا۔ جلتے ہوئے فانوس گر پڑے۔ تیل بکھر گیا اور اسے آگ لگ گئی۔ بجلی اتنی زور سے کڑکی جیسے زمین و آسمان پھٹ گئے ہوں۔ فانوسوں نے زمین پر بچھی ہوئی دری کو آگ لگا دی تھی۔ طوفان نے ایک طرف سے قنات گرا دی اور اسے بھی آگ لگ گئی۔

پنڈت کی آواز سنائی دی — "یہ وشنو دیو کا قہر ہے" — اور سب بھاگ اٹھے۔

پھر مینہ برسنے لگا۔ یہ طوفان باد و باراں تھا۔ بجلی بار بار کڑکتی اور بادل بڑی زور سے گرجتے تھے۔ طوفان کی چیخیں بڑی ہی ڈراؤنی تھیں۔ ہاتھی چنگھاڑنے اور گھوڑے خوف سے ہنہنانے لگے۔ بارش نے آگ بجھا دی اور طوفان شامیانے، قناتیں اور خیمے اڑانے لگا۔ راجوں مہاراجوں کے محافظ اپنے آقاؤں اور ان کی رانیوں کو کسی محفوظ جگہ لے جانے کے لیے دوڑے۔ مہاراجہ راجیپال کی پکار بار بار سنائی دیتی تھی — "جگن ناتھ! چمپا رانی کو مندر میں لے جاؤ۔"

مندر دور تھا۔ بھگدڑ اور افراتفری تھی۔ سب شہر کی طرف دوڑے جا رہے تھے۔ جنگل کے درخت چیخ اور چنگھاڑ رہے تھے۔ ٹہنیاں ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہی تھیں۔ تاشقین نے چمپا کو پہلے ہی اپنی پناہ میں لے لیا تھا اور اسے بازوؤں میں اٹھائے ہوئے شہر کی طرف لے جا رہا تھا۔

شہر کے ارد گرد باہر سے آئے ہوئے ہندوؤں کے ہزارہا خیمے نصب تھے۔ بعض ہندو خیموں کے بغیر آسمان تلے پڑے تھے۔ وہ اپنا سامان طوفان کے رحم و کرم پر چھوڑ کر شہر کو بھاگے جا رہے تھے۔ شہر والوں نے ان لوگوں کو پناہ میں لینے کے لیے اپنے گھروں کے دروازے کھول دیے تھے۔ طوفان کا زور ابھی بڑھ رہا تھا۔ بجلی چمک کر کڑکتی تھی تو انسانوں کی چیخیں سنائی دیتی تھیں۔ بچے چیخ رہے تھے، عورتیں چیخ چلا رہی تھیں اور طوفان کی چیخیں انسانی چیخوں کو جیسے ہڑپ کرتی جا رہی تھیں۔

یہ طوفان ایک قیامت تھی۔ اس قیامت خیز طوفان میں ہشام سمرقند کا ساتھی قیس دریا کی طرف سے شہر کو آ رہا تھا۔ وہ اکیلا تھا۔ اسے طوفان کے زناٹوں، بارش کی بوچھاڑ اور درختوں کی چیخوں میں ایک ایسی چیخ سنائی دی جو کسی بچے کی یا عورت کی معلوم ہوتی تھی۔ قیس رک گیا۔ بجلی چمکی اور کڑکی۔ اسے اس چمک میں قریب ہی ایک درخت کے تنے کے ساتھ کوئی انسان نظر آیا اور وہی چیخ پھر سنائی دی۔ وہ ادھر کو دوڑا۔ وہاں ایک عورت اکیلی بیٹھی کانپ رہی تھی۔

"مت ڈرو" — قیس نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا — "اب تم اکیلی نہیں ہو۔"

وہ ایک نوجوان لڑکی تھی۔ شام کے بعد دریا پر نہانے گئی اور طوفان نے آگھیرا۔ سب بھاگے تو وہ اپنی ساتھیوں سے بچھڑ گئی۔ قیس کو دیکھتے ہی اس کے ساتھ لپٹ گئی۔ بجلی اب کے اتنی زور سے کڑکی کہ قیس بھی جو ایک دلیر مرد تھا سن ہو کے رہ گیا۔ لڑکی کی چیخ بجلی کے دھماکے سے زیادہ بلند تھی۔ بجلی قریب ہی ایک درخت پر گری۔ لڑکی قیس کے ساتھ اس طرح اور زیادہ چپک گئی جیسے اس کے وجود میں سما جانے کی کوشش کر رہی ہو۔

ادھر بڑے مندر سے سنکھ اور گھڑیال بجنے لگے۔ سنکھ ایک نہیں بیسیوں تھے۔ ان

کی بے تُری آوازیں ایسی تھیں جیسے بھیڑیے رو رہے ہوں۔ پنڈت اور پجاری کرشن واسیدیو کے بُت کے آگے سجدہ ریز ہو گئے۔ "ہر ہر مہا دیو اور جے جگدیش ہرے" کا واویلا بپا ہو گیا۔ سب اسے دیوتاؤں کا قہر کہہ رہے تھے۔ گھروں میں جنہوں نے بُت اور مورتیاں رکھی ہوئی تھیں وہ ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر گڑگڑانے لگے کہ یہ دیوتاؤں کا قہر تھا یا خدا کا، یہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ سنکھوں کی آوازوں نے طوفان کی چیخوں کو زیادہ بھیانک بنا دیا۔

راجے، مہاراجے، اُن کے محافظ اور بڑے بڑے دلیر سورمے خوف سے تھر تھر کانپ رہے تھے۔ وہ اس کو طوفان نہیں، جنوں، بھوتوں، چڑیلوں اور بدروحوں کا خونریز رقص سمجھ رہے تھے۔ اس طوفان میں جو لگتا تھا دنیا کو ختم کرنے آیا ہے، قیس ایک ہندو لڑکی کو بازوؤں پر اٹھائے ایک پرانے ویران مندر کی طرف جا رہا تھا۔ لڑکی نے بازو اُس کے گلے میں ڈال رکھے تھے اور گال بچوں کی طرح اُس کے گالوں کے ساتھ دبائے ہوئے تھے۔ اُس پر نیم غشی طاری تھی۔ بجلی کے دھماکے سے وہ بدک کر ہوش میں آجاتی تھی۔

طوفان قیس کے پاؤں اکھاڑ رہا تھا۔ اوپر سے درختوں کے ٹہن لپک لپک کر اُسے پکڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ کیچڑ میں پھسلا، گرا مگر اُس نے لڑکی کو سنبھالے رکھا۔

ایک بار بادل بڑے قہر سے گرجے اور اس کے ساتھ ایسی بھیانک چنگھاڑ سنائی دی کہ قیس رُک گیا۔ اُس کی مردانگی جواب دے گئی۔ بجلی چمکی تو اُسے اپنے سامنے دو ہاتھی دکھائی دیئے جو سونڈیں اوپر کیے ہوئے چنگھاڑتے چلے آرہے تھے۔ یہ کسی مہاراجہ کے ہوں گے۔ وہ دُور نہیں تھے۔ بیس پچیس قدموں کا فاصلہ تھا۔ دونوں ہاتھی سخت ڈرے ہوئے پہلو بہ پہلو دوڑے آرہے تھے۔ قیس کے جسم سے کنکریوں کی بوچھاڑ جیسی بارش اور بے پناہ تند ہواؤں نے طاقت چوس لی تھی، پھر بھی وہ بائیں کو دوڑا اور پھسل کر گر پڑا۔ لڑکی اُس کے نیچے تھی۔ ہاتھی اوپر آگئے۔ قیس نے لڑکی کو دھکا دے کر دُور پھینک دیا اور خود کچلے جانے کے لیے تیار ہو گیا لیکن اُس نے زور دے کر لڑھکنی لی اور اتنا ایک طرف ہو گیا کہ ایک ہاتھی کا پاؤں اُس کے پہلو کے ساتھ پڑا اور ہاتھی آگے نکل گئے۔

لڑکی جو ڈر سے مری جا رہی تھی، دوڑی آئی اور قیس کے اوپر گر پڑی۔ اُس نے قیس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے کر ماں کی سی بیتابی سے پوچھا "تم ٹھیک ہو؟ بولو.... بولو نا" — اور قیس اُٹھ کھڑا ہوا۔

وہ ایک قدیم مندر کے کھنڈر تھے جو زمین سے خاصے بلند تھے۔ قیس اور ہشام امیر بن تاشفین سے یہیں ملے تھے۔ قیس سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ لڑکی اُس کے بازوؤں پر تھی۔ وہ اتر گئی۔ کہنے لگی کہ وہ خود اوپر جائے گی۔ طوفان کا زور ابھی ٹوٹا نہیں تھا لیکن قیس کو ہاتھیوں کے نیچے پڑا دیکھ کر لڑکی کی جرأت اور طاقت واپس آگئی تھی۔

وہ ایک دوسرے کی کمر میں بازو ڈالے سیڑھیاں چڑھ گئے اور تاریکی میں ایک کمرے میں داخل ہو گئے۔ وہ ایک دوسرے کو نظر نہیں آتے تھے۔ لڑکی نے ٹٹول کر اُس کے پاؤں پکڑ لیے اور اُس کے پاؤں پر سر رکھ کر اُس کا شکریہ ادا کیا۔

"مجھے گناہگار نہ کرو لڑکی!" — قیس نے اُس کا سر اُٹھاتے ہوئے کہا اور جذبات سے وہ اتنا مغلوب تھا کہ اُس کے منہ سے نکل گیا — "ہمارے مذہب میں یہ گناہ ہے کہ انسان کسی انسان کے آگے سجدہ کرے۔ سجدہ صرف خدا کے آگے کیا جاتا ہے۔"

"تم مسلمان ہو؟" — لڑکی نے چونک کر پوچھا۔

"اگر میں کہہ دوں کہ میں مسلمان ہوں تو مجھ سے ویسی ہی نفرت کرو گی جیسی ہندو مسلمانوں سے کرتے ہیں؟"

"نفرت؟" — لڑکی نے حیرت سے کہا — "تم نہ..... تم نہ ہوتے تو میں زندہ نہ ہوتی..... تم مسلمان ہو تو تم یہ تو نہیں مانو گے کہ یہ دیوتاؤں کا قہر ہے؟"

"میں تمہارے مذہب کی توہین نہیں کرنا چاہتا" — قیس نے کہا — "لیکن یہ میرے خدا کا قہر ہے جو پتھر کے دیوتاؤں اور اُن کی پوجا کرنے والوں پر گر رہا ہے۔ یہ خدا کا اشارہ ہے۔ مجھے اسی خدا نے طاقت دی ہے کہ تمہیں ایسے سخت طوفان میں سے اٹھا لایا ہوں۔"

قیس سادھوؤں کے بھیس میں دریا کے کنارے گیا تھا۔ اُس کا کُل لباس پھولوں والا ایک لنگوٹ تھا۔ بارش نے اس کے جسم سے راکھ، داڑھی اور سر کے بالوں میں ڈالی ہوئی مٹی اور راکھ دھو ڈالی تھی۔ (لڑکی) نے اس سے پوچھا کہ وہ ننگا کیوں ہے۔ اُس نے بتایا کہ وہ دریا میں نہانے گیا تھا۔ طوفان کپڑے اُڑا کر لے گیا اور وہ اسی طرح بھاگ آیا۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ وہ متھرا کا میلہ دیکھنے آیا تھا۔ اُس نے لڑکی سے پوچھا کہ وہ کہاں کی رہنے والی ہے۔ اُس نے بلند شہر کی کوئی جگہ بتائی۔ اُس کا پورا کنبہ آیا ہوا تھا۔ اس کا باپ بھی ساتھ تھا۔ انہوں نے اس شہر سے باہر اپنا خیمہ نصب کیا تھا۔ قیس نے اُسے بتایا کہ اب وہاں خیمہ ہوگا نہ اُس کا کنبہ اور رات اسی کھنڈر میں گزارنی ہوگی۔

"میں تمہیں ایک بات کہنا چاہتی ہوں"۔۔۔ (لڑکی) نے رُک رُک کر کہا۔ "تم مرد ہو اور میں نوجوان لڑکی ہوں۔ میری ابھی شادی نہیں ہوئی۔۔۔۔ ہمیں رات یہیں گزارنی ہے"۔
۔۔۔ لڑکی کے لہجے میں التجا تھی۔ قیس سمجھ گیا۔ اُس نے کہا۔۔۔ "میں تمہیں لینے کے لیے نہیں تمہارے ماں باپ کے لیے اُٹھا لایا ہوں۔۔۔۔ میں تم سے ایک وعدہ لیتا ہوں۔ کسی کو یہ پتہ نہ چلنے دینا کہ میں مسلمان ہوں، ورنہ ہندو میرے ساتھ بہت بُرا سلوک کریں گے۔ میں اپنا نام جگدیش بتا دوں گا"۔

لڑکی جس نے اپنا نام اُوشا بتایا، قیس کی ہر شرط ماننے کو تیار تھی۔ اُس نے بڑا پکا وعدہ کیا۔ پھر رات گزرنے لگی۔ اُوشا کی آنکھ بار بار کھلتی تھی۔ اُسے اب طوفان کا نہیں، اُس مرد کا ڈر تھا جس کے ساتھ وہ اس کھنڈر میں تنہا تھی۔

آخری بار اُوشا کی آنکھ کھلی تو کمرہ روشن تھا۔ کوئی کھڑکی اور روزن نہیں تھا۔ دروازے کے کواڑ نہیں تھے۔ دن کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ قیس دروازے میں بیٹھا اُسے دیکھ رہا تھا۔ رات کا طوفان رات کے ساتھ ہی رخصت ہو گیا تھا۔ قیس کے چہرے پر حیرت تھی اور ایسی ہی حیرت اُوشا کے چہرے پر بھی تھی۔ قیس اس لیے حیران تھا کہ اُس نے اس قدر خوبصورت اور اتنی دلکش لڑکی کبھی نہیں دیکھی تھی اور اُوشا اس لیے حیران

تھی کہ قیس جوان آدمی تھا جس کے جسم کے پٹھے گوشت سے بھرے ہوئے اور بہت اچھے لگ رہے تھے اور اس جوان مرد نے رات اتنی جوان لڑکی کی طرف توجہ نہیں کی تھی۔

"اب تمہارے ماں باپ کو تلاش کرنا ہوگا"۔۔۔ قیس نے کہا۔ "اُٹھو چلیں"۔

اُوشا اُسے ابھی تک حیرت زدہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ابھی اُٹھنا نہیں چاہتی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں تشکر کے علاوہ کوئی اور تاثر بھی تھا۔ قیس کے دوبارہ کہنے کے باوجود وہ نہ اُٹھی۔ قیس کھسکتا ہوا اُس کے قریب جا بیٹھا۔

"تم نے مجھے زندگی دی ہے"۔۔۔ اُوشا نے کہا۔ "کیا مجھے باقی زندگی کا سکھ دے سکتے ہو؟"

قیس نے کوئی جواب نہ دیا۔

"میرے لیے یہ واقعہ معمولی نہیں کہ رات تم نے مجھے طوفان سے بچایا ہے"۔۔۔ اُوشا نے کہا۔۔۔ "اور بات یہ بھی معمولی نہیں کہ تم نے میری عزت بھی بچائی ہے مگر تم مجھے اُس بوڑھے سے نہیں بچا سکو گے جس کے ساتھ میری شادی کی بات ہو رہی ہے۔ مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔۔۔ ہندو عورت کی زندگی مرد کے قدموں میں بسر ہوتی ہے۔ ماں باپ جس کے ساتھ چاہیں باندھ دیں اور خاوند مر جائے تو عورت اُس کے ساتھ زندہ جل جاتی ہے یا اسے ہردوار یا یہاں متھرا بھیج دیا جاتا ہے۔ میں اپنی ایک بیوہ سہیلی سے ملی ہوں۔ وہ دو سال سے یہاں ہے۔ کہنے کو وہ پاک زندگی بسر کر رہی ہے۔ زیادہ وقت عبادت میں گزارتی ہے مگر اُس کی راتیں کسی نہ کسی پنڈت کے کمرے میں گزرتی ہیں۔۔۔۔ مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔ تمہاری باندی بن کے رہوں گی"۔

قیس کیا تھا؟۔۔۔ ایک جوان آدمی تھا۔ اتنی حسین لڑکی اُسے اپنا آپ پیش کر رہی تھی۔ وہ بڑی مشکل سے اپنے اوپر جبر کیے ہوئے تھا۔ لڑکی نے اُس کی زنجیریں توڑ دیں۔

اُس نے کہا۔۔۔ "میں امانت میں خیانت نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن تمہاری خواہش کو بھی نہیں ٹال سکتا۔۔۔۔ اُوشا! میرے دل سے پوچھو تو میں تمہیں کسی کے بھی حوالے نہیں کرنا چاہتا۔ تم میرے دل میں اُتر گئی ہو۔۔۔۔ اُٹھو۔ چلو چلیں"۔

وہ جب باہر آئے تو مندر کی بلندی سے انہیں بڑا ہی بھیانک منظر دکھائی دیا۔ جہاں خیموں کی بستی تھی وہاں اب ویرانہ تھا۔ یہ لوگ ادھر اُدھر اپنا سامان ڈھونڈ رہے تھے۔ خیمے گرے ہوئے اور پھٹے ہوئے تھے۔ درختوں سے شِکن ٹوٹے ہوئے تھے اور پانی ہی پانی تھا۔ قیس اُدشا کو ساتھ لے کر سیڑھیاں اُتر گیا۔ وہ تھوڑی ہی دور گئے ہوں گے کہ انہیں بڑی ہی بلند آواز سنائی — "اُدشا"

دونوں رُک گئے۔ اُدشا نے کہا — "میرا باپ ہے۔ اب ہم بھاگ نہیں سکیں گے۔"

ایک دراز قد، چوڑے چکلے سینے والا آدمی جس کی گھنی مونچھیں اُس کے آدھے چہرے پر پھیلی ہوئی تھیں، دوڑتا آیا اور ادشا کو گلے لگا لیا۔ اُدشا نے اُسے قیس کے متعلق بتایا کہ اس کا نام جگدیش ہے اور اُسے اس نے بچایا ہے اور رات اُس نے اُسے اس مندر کے ایک کمرے میں رکھا اور اس پر پہرہ دیتا رہا ہے۔ ادشا نے رات کی ساری بات سنا دی۔

اُدشا کے باپ نے قیس کو گلے لگا لیا اور بولا — "مُنہ سے مانگو۔ کیا انعام دوں۔ سونا مانگو، میرا گھوڑا مانگو۔"

"میں نے اپنا فرض ادا کیا ہے" — قیس نے کہا۔ "انعام کا کوئی لالچ نہیں۔ اگر انعام دینا ہی ہے تو مجھے اپنا بیٹا بنا لیں۔ آپ نے اپنی بیٹی کسی کو تو دینی ہے۔ یہ کرم مجھ پر کریں۔ اپنی بیٹی سے پوچھ لیں کہ میں کیسا آدمی ہوں۔"

اُدشا کا باپ خاموش ہو گیا۔ کچھ سوچ کر بولا — "میں تم جیسے بہادروں کی قدر کرتا ہوں۔ تمہارا جسم بہت خوبصورت ہے۔ یہ مرد کا جسم ہے۔ میں فوجی عہدیدار ہوں۔ میں خاندانی سپاہی ہوں۔ میں اپنی بیٹی تمہیں دے کر تمہیں فوج میں لے جانا پسند کروں گا لیکن ایک فوجی عہدیدار سے بات چل رہی ہے۔ میں زبان سے پھر نہیں سکتا۔ کچھ اور مانگو۔"

"آپ کون سی فوج میں ہیں؟" — قیس نے پوچھا۔

"بلند شہر کے راجہ کی فوج میں" — اُدشا کے باپ نے جواب دیا۔

قیس نے کسی خیال سے اس کے ساتھ فوجوں کی باتیں شروع کر دیں۔ اُدشا کے باپ نے سلطان محمود کی بات چھیڑ دی اور اس عزم کا اظہار کیا کہ وہ اُسے شکست دینے کے لیے زندہ ہے۔ وہ چونکہ خاندانی اور پیدائشی فوجی تھا اس لیے وہ فوجوں اور لڑائیوں کی باتیں کرتا رہا، مگر قیس کے دل و دماغ پر ادشا سوار تھی۔ اس کے باپ نے جب لڑکی دینے سے انکار کر دیا تو قیس کو یوں لگا جیسے اُس کے سینے سے اُس کا دل نکالا جا رہا ہو، یا جیسے اُس سے اتنی حسین لڑکی چھینی جا رہی ہو۔ اس کی فطری کمزوریاں اور نفسانی خواہشات اُس کے جذبات اور اُس کی عقل پر غالب آ گئیں۔ اگر ادشا کا باپ اُسے دھتکار دیتا یا ادشا کو ساتھ لے کر وہاں سے چلا جاتا تو قیس اس کیفیت سے دوچار نہ ہوتا۔ یہ شخص اس کے ساتھ بڑے پیار سے انداز میں دوستانہ باتیں کر رہا تھا اور قیس سوچ رہا تھا کہ وہ اس شخص کو کس طرح راضی کرے۔

اُدشا کے باپ نے غزنی کے جاسوسوں کا ذکر کیا اور کہا — "یہ لوگ ہم میں گھومتے پھرتے رہتے ہیں۔ وہ محمود کو راز کی ایسی باتیں بتاتے ہیں کہ وہ ہم پر وہیں ضرب لگاتا ہے جو ہماری کمزور رگ ہوتی ہے۔ ہماری فوج میں غزنی کے جاسوسوں کو پکڑنے کا انعام مقرر کیا گیا ہے۔ اگر مجھے کوئی مسلمان جاسوس نظر آ جائے تو میں اُسے زندہ اپنے راجہ کے حوالے نہیں کروں گا۔ اُس کا سر کاٹ کر لے جاؤں گا۔"

قیس کا دماغ پھر گیا۔ اودشا باپ کے پیچھے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس مسکراہٹ نے قیس پر نشہ طاری کر دیا۔ کہنے لگا — "اگر میں آپ کو دو تین جاسوس پکڑوا دوں تو آپ مجھے وہ انعام دے دیں گے جو میں نے مانگا ہے؟"

"تم کیسے پکڑواؤ گے؟"

"مجھ سے اور کچھ نہ پوچھیں" — قیس نے کہا — "آپ انہیں پکڑیں اور انہیں زندہ رکھیں۔ ان کے ذریعے آپ غزنی کے بہت سے جاسوس پکڑ سکیں گے۔"

"کب؟" — اودشا کے باپ نے قیس کے کندھے پر ہاتھ مار کر پوچھا۔ "کہاں ہیں وہ؟"

"ابھی... آج ہی" — قیس نے جواب دیا — "وہ یہیں ہیں۔ اگر نہ ملیں تو آپ میری گردن کاٹ سکتے ہیں۔"

"اور اگر مل گئے اور وہ واقعی جاسوس نکلے تو اپنی بیٹی کا ہاتھ متھرا کے بڑے مندر میں تمہارے ہاتھ میں دے دوں گا لیکن راجہ سے انعام میں خود لوں گا۔ مجھے ترقی مل جائے گی۔ مجھے زیادہ آدمیوں کی کمان مل جائے گی۔"

"مجھے منظور ہے۔" قیس نے کہا۔ "میرے ساتھ چلو۔"

قیس تمام رات غائب رہا تھا۔ ہشام اور اس کے دو اور ساتھی اُسے صبح سے ڈھونڈ رہے تھے۔ انہوں نے سادھوؤں کے بھیس میں طوفانی رات ایک مندر میں گذاری تھی۔ قیس شام کو واپس نہیں آیا تھا۔ اب ساتھی اُسے ڈھونڈ رہے تھے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ وہ ایک ہندو فوجی عہدیدار کو ساتھ لیے اُنہیں ڈھونڈ رہا ہے۔ اب وہاں کسی کو ڈھونڈنا آسان نہیں تھا۔ لوگ شہر بھر میں معلوم نہیں کہاں کہاں جا چھپے تھے۔ ہر طرف کیچڑ اور پانی تھا۔

دوپہر کے وقت ہشام سمرقندی کو اپنا ایک ساتھی ملا۔ اُس نے بتایا کہ اُس نے قیس کو دیکھا ہے۔ وہ سادھوؤں کے بھیس میں نہیں بلکہ اُس نے ایسے کپڑے پہن رکھے ہیں جو اُس کے اپنے معلوم نہیں ہوتے۔ اس کے ساتھ ایک آدمی ہے جو شکل و صورت، قد بُت اور تلوار سے فوجی معلوم ہوتا ہے۔ اگر وہ فوجی نہیں تو بھی آدمی مشکوک ہے اور وہ ہندو لگتا ہے۔ ہشام نے اُسے کہا کہ اپنے دوسرے ساتھیوں سے کہہ دے کہ غائب ہو جائیں۔

اُن کے اس ساتھی نے قیس کو دیکھا اور خود اُسے نظر آئے بغیر وہاں کھسک آیا تھا۔ یہ لوگ ہر کسی کو شک کی نگاہ سے دیکھتے اور ضرورت سے زیادہ احتیاط کیا کرتے تھے۔ قیس کو اُوشا کا باپ اپنے ساتھ لے گیا تھا اور جہاں رات کو اُس نے اپنے کنبے کے ساتھ پناہ لی تھی، وہاں اُسے اپنے کپڑے پہنا دیے تھے اور اُسے اُس کے ساتھیوں کی تلاش میں لے گیا تھا۔

ہشام کو تاشقین کی باتیں آئیں۔ اُس نے کہا تھا کہ مقامی مُشیروں پر اتنا زیادہ اعتبار نہیں کرنا چاہیے کیونکہ ہندوؤں کے زیرِ سایہ رہتے ہوئے یہاں کے مسلمان ہندو

کا اثر جلدی قبول کرتے ہیں۔ ہشام نے اپنی جگہ جا کر اپنے جسم سے راکھ دھولی، سر اور داڑھی کے بال صاف کیے۔ کپڑے پہنے اور سر پر ہندوؤں کے طرز کی پگڑی باندھ لی۔ اُس نے کُرتے کے اندر خنجر چھپا لیا اور قیس کی تلاش میں نکل پڑا۔

بہت دیر بعد اُسے قیس نظر آ گیا۔ وہ اُوشا کے باپ کے ساتھ ایک قدیم عمارت کے بیرونی برآمدے میں ستون کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ہشام دوسری طرف سے اس کھنڈر میں داخل ہوا اور دبے پاؤں اُس کمرے تک چلا گیا جس کے برآمدے میں قیس بیٹھا تھا۔ کمرے کی ایک کھڑکی جس کے کواڑ نہیں تھے، ان دونوں کی پیٹھ پیچھے تھی۔ ہشام اس کھڑکی کے پیچھے بیٹھ گیا۔

"آپ مایوس نہ ہوں، وہ نظر آ جائیں گے۔" قیس اُوشا کے باپ سے کہہ رہا تھا۔ "وہ تین ہیں۔ تینوں کو پکڑوا دوں گا۔"

"لیکن چوتھے کے متعلق میں اب بھی نہیں مان رہا کہ وہ مہاراجہ سورج کا ذاتی محافظ ہے۔" اُوشا کے باپ نے کہا۔ "تم کہتے ہو کہ تم اُس کے سامنے نہیں جاؤ گے۔ اور میں سوچتا ہوں کہ میں مہاراجہ کے خاص آدمی پر کس طرح الزام عائد کر دوں کہ وہ غزنی کا جاسوس ہے... مہاراجہ تو بڑا ہی دانشمند آدمی ہے۔"

"میں اُسے پکڑوانے کا طریقہ بھی سوچ لوں گا۔" قیس نے کہا۔

ہشام نے اپنے کُرتے کے نیچے سے خنجر نکالا۔ اس کی نوک زہر میں بُجھی ہوئی تھی۔ جسم پر اس کی خراش ہی کافی تھی۔ اس کا زہر سارے جسم میں پھیل جاتا تھا۔ ہشام کھڑا ہو گیا۔ فاصلہ صرف پانچ چھ قدم تھا۔ اُس نے پوری طاقت سے خنجر پھینکا۔ خنجر قیس کی پیٹھ میں اتر گیا۔ وہ اُلٹا گر پڑا۔ ہشام اُس کمرے سے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

اُوشا کا باپ سمجھ گیا کہ خنجر کس طرف سے آیا ہے۔ وہ کھنڈر کے اندر دوڑا گیا۔ ہشام دوسری طرف جا نکلا۔ اُوشا کا باپ کھنڈر میں قاتل کو ڈھونڈ رہا تھا۔ ہشام برآمدے میں آیا اور قیس کی پیٹھ سے خنجر نکال کر اُسی طرف چلا گیا جدھر سے آیا تھا۔ اُوشا کا باپ اُسے کھنڈر کے اندر اور باہر ڈھونڈتا رہا۔ قیس مر چکا تھا۔

اُس رات بڑے مندر کے پنڈت نے تمام راجوں، مہاراجوں کو مندر میں بلایا۔

"میں نے آپ سب کو سونے اور چاندی کا یہ انبار دکھانے کے لیے بلایا ہے" — پنڈت نے انہیں سونے کے زیورات اور نقدی کے ڈھیر دکھاتے ہوئے کہا — "کل رات میں آپ کے پاس تھا جب طوفان آیا تھا۔ مجھے دوسرے پنڈتوں نے جو اُس وقت ہری کرشن کی پوجا کر رہے تھے، بتایا ہے کہ دیوتا کی آنکھیں پہلے سفید ہوئیں پھر سُرخ ہو گئیں، پھر ان آنکھوں سے شرارے نکلے اور فوراً بعد بادل کی ہیبت گرج سنائی دی۔ یہ گھنٹیاں اپنے آپ بجنے لگیں۔ دیوتا کی آنکھوں کا رنگ قرمزی ہو گیا اور بجلی کڑکنے لگی، پھر طوفان آ گیا ...

"یہ وہ وقت تھا جب مہاراجہ قنوج کے فانوس گر پڑے تھے اور آگ لگ گئی تھی۔ کیا آپ دیوتاؤں کے اس اشارے کو نہیں سمجھتے؟ رات کا طوفان دیوتاؤں کا قہر تھا۔ رات کو ہی لوگ مندر میں جمع ہو گئے تھے۔ یہ لوگ رات بھر یہاں ماتھے رگڑتے رہے ہیں۔ مجھے صاف اشارہ ملا ہے کہ جب تک غزنی کے سلطان کا سر کاٹ کر ہری کرشن واسدیو کے قدموں میں نہیں رکھا جائے گا، یہ قہر ہم پر پڑتا رہے گا۔ رات کو کئی لوگ مارے گئے ہیں۔ یہی انجام آپ کا ہو گا ...

"میں اپنے لوگوں کو بتا رہا ہوں کہ جب تک اسلام کے لیے ہندوستان کا راستہ کھلا ہے، دیوتاؤں کی آنکھیں آگ برساتی رہیں گی۔ میں نے لوگوں کو بتایا کہ مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے شکست دینے کے لیے بہت بڑی فوج کی اور مالی مدد کی ضرورت ہے۔ یہ دیکھو، عورتوں نے اپنے زیورات اور مردوں نے اپنی نقدی میرے آگے ڈھیر کر دی ہے۔ میں یہ دولت آپ کے حوالے نہیں کروں گا۔ آپ کی فوجیں جب غزنی کی فوج کے خلاف لڑ رہی ہوں گی اُس وقت میں آپ کو آپ کی فوجوں کے اخراجات سے آزاد کر دوں گا۔ تمام خرچ متھرا کے اس مندر سے پورا ہو گا۔ آپ کی شکست میری شکست ہے۔ دیوتا مجھ سے جواب مانگیں گے کہ میں نے آپ کے دلوں میں اپنے مذہب کی برتری اور محبت اور اسلام کی نفرت پیدا نہیں کی ...

"فتح وہ لوگ حاصل کر سکتے ہیں جن کے دلوں میں اپنے دشمن کی اور اُس کے مذہب کی نفرت ہو۔ نفرت ایک قوت بنتی ہے۔ مسلمان اتنی دور سے آ کر ہمیں اس لیے شکست

دے جاتے ہیں کہ اُن کے دلوں میں ہماری نفرت بھری ہوئی ہے۔ وہ ہمارے مذہب کو جھوٹا سمجھتے ہیں۔ اب آپ کو ثابت کرنا ہے کہ مذہب ہمارا سچا ہے۔ آپ کو غزنی کی فوج پر قہر بن کر گرنا ہے۔"

پنڈت نے راجوں مہاراجوں کو اسلام کے خلاف بھڑکا کر مژدہ سنایا کہ ہری کرشن واسدیو نے اُسے اشارہ دیا ہے کہ اب مسلمانوں کو فیصلہ کُن شکست ہو گی۔ پنڈت بیٹھ گیا تو لاہور کے مہاراجہ بھیم پال، قنوج کے مہاراجہ راجیا پال، اور ماجن کے راجہ کول چند کے علاوہ بلند شہر اور چند اور چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے راجوں کی وہ تاریخی کانفرنس ہوئی جس کے بعد سلطان محمود غزنوی کو ہندوستان پر تاریخی یلغار کرنی پڑی۔ اُس نے اپنی تاریخ کی ایک ایسی پیش قدمی کی جسے آج تک تاریخ دان اور فنِ حرب و ضرب کے یورپی مبصر خراجِ تحسین پیش کر رہے ہیں۔ ایک مورخ سر آرل سٹیلن نے لکھا ہے — "محمود غزنوی غزنی سے متھرا تک قلعے سر کرتا، تیز و تند طغیانی کی طرح آیا اور متھرا اور قنوج کو اُجاڑ گیا۔"

اُس وقت کی تحریروں سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ اُس کی ان فتوحات کے پیچھے اُس کی انٹیلی جنس (دیوانِ شغلِ اشراف مملوکات) کا ہاتھ تھا۔ اُس نے ان مہاراجوں کی تیاری کی اطلاع قبل از وقت اور مکمل معلومات مل جانے پر برق رفتار پیش قدمی کی اور انہیں آ دبوچا۔

لاہور کا مہاراجہ بھیم پال نڈر اور کالنجر (کوٹل کشمیر) کا راجہ جانکی بھی سلطان محمود کے باجگزار تھے اور ان میں یہ معاہدہ ہوا تھا کہ بھیم پال غزنی کے خلاف کوئی جنگی کارروائی نہیں کرے گا اور بوقتِ ضرورت غزنی کی فوج کو ہندوستان میں جس مدد کی ضرورت ہوئی، دے گا۔ یہی معاہدہ کالنجر کے راجہ نے کیا تھا۔

یہ دونوں مہاراجے ۱۰۱۷ء کے موسم برسات میں متھرا کے بڑے مندر میں بہت سے راجوں مہاراجوں کے ساتھ بیٹھے سلطان محمود کو فیصلہ کُن شکست دینے اور غزنی کی اینٹ سے اینٹ بجانے کا منصوبہ تیار کر رہے تھے۔ بھیم پال نڈر نے اس کانفرنس

میں صاف کہہ دیا کہ اس منصوبے میں وہ پیش پیش نہیں ہوگا، درپردہ ساتھ ہوگا۔

اُس نے وجہ یہ بیان کی کہ سلطان محمود کے خلاف جتنی لڑائیاں اُس کے خاندان نے لڑی ہیں، وہ اور کسی نے نہیں لڑیں اور ہر بار اُسے اپنا نقصان اپنے ذرائع سے پورا کرنا پڑا ہے اور اُس نے مجبور ہو کر سلطان محمود کے ساتھ صلح اور باج کا معاہدہ کیا ہے۔

اس منصوبے کی قیادت مہاراجہ قنوج راجیا پال کو دی گئی۔ مورخوں نے لکھا ہے کہ اتنی بڑی سکیم کی قیادت کا اہل مہاراجہ قنوج ہی تھا۔ اُس کے پاس جنگی فہم و فراست بھی تھی، جنگی طاقت بھی تھی اور شمالی ہند میں قنوج کی گدی احترام کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی، اللہذا مشترکہ کمان اسی کو دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ منصوبہ کچھ اس طرح بنا کہ تمام راجوں مہاراجوں کی آدھی آدھی فوجوں کی ایک مشترک فوج بنائی جائے اور باقی نصف متعلقہ قلعوں میں تقسیم کر دی جائے تاکہ سلطان محمود جوابی حملہ کرے یا کسی اور راستے سے آجائے تو قلعہ بند فوج اُسے روکے۔ مشترک فوج کے لیے طے پایا کہ پشاور کی طرف پیش قدمی کرے اور سلطان محمود کو پشاور کے قریب (درۂ خیبر کی سمت) میدان میں للکارا جائے اور اس سے پہلے فوج کا کچھ حصہ پہاڑیوں میں جگہ جگہ گھات میں بٹھایا جائے جو اُس کی جنگی طاقت کو پہاڑیوں میں ہی کمزور کر دے۔

اس منصوبے پر سب نے اتفاق کیا۔ سب نے کرشن واسدیو کے بت کے سامنے کھڑے ہو کر حلف اٹھایا کہ وہ اس منصوبے کی کامیابی کے لیے جان اور مال کی قربانی دیں گے۔

امیر بن تاشقین مہاراجہ قنوج کے ذاتی محافظ کی حیثیت سے وہاں موجود تھا۔ تین چار اور مہاراجوں کے ذاتی محافظ بھی اندر بتوں کی طرح کھڑے تھے۔

متھرا سے تقریباً ایک سو میل دور شمال مشرق میں دریائے گنگا میں گرنے والے ایک چھوٹے دریا رام گنگا کے کنارے بلند شہر واقع ہے۔ اُس دور میں یہ چھوٹی سی ایک راجدھانی تھی اور اس کا نام بارن یا برن ہوا کرتا تھا۔ اس کا راجہ ہردت بھی اس کانفرنس میں موجود تھا۔

"تم نے سلطان محمود کو شکست دینے کا بڑا اچھا منصوبہ بنا لیا ہے" ـــــ راجہ ہردت

نے کہا ـــــ "لیکن کسی نے بھی اس پہلو پر توجہ نہیں دی کہ مسلمان ہر بار کیوں فتح حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ بھی سوچیں کہ اُن کے پاس کونسا جادو ہے جو ہم میں نہیں..... میں ان کی ایک خوبی بیان کروں گا۔ غزنی کے جاسوس بہت تیز اور ہوشیار ہیں۔ وہ غزنی کی فوج کی سب سے بڑی طاقت ہیں.... اور میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ یہاں بھی غزنی کے جاسوس موجود ہیں اور ہماری باتیں سن رہے ہیں۔ رات طوفان میں کچھ جانیں ضائع ہوئی ہیں اور آج غزنی کا ایک جاسوس اپنے ساتھیوں کے ہاتھوں مارا گیا ہے۔ میری فوج کے ایک عہدیدار نے اتفاق سے ایک جاسوس سے اُس کا اصل روپ معلوم کر لیا تھا۔ اس جاسوس نے اپنے تین ساتھیوں کو پکڑوانا چاہا مگر معلوم نہیں کدھر سے ایک خنجر آیا اور یہ جاسوس ہلاک ہو گیا۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ مسلمانوں کے جاسوس کیسے ہیں اور ان کی نظر کہاں تک پہنچتی ہے۔"

راجہ ہردت نے اوشا کے باپ سے سنا ہوا تھا اور اوشا کا سارا واقعہ سنا دیا، پھر کہنے لگا ـــــ "مرنے والے نے ایک ایسے جاسوس کی نشاندہی کی تھی جس کا ابھی نام نہیں لیا جا سکتا کیونکہ اسے ایسی حیثیت حاصل ہے کہ الزام غلط ہوا تو ہم میں نفاق پیدا ہو جائے گا۔"

ہردت نے کنکھیوں امیر بن تاشقین کی طرف دیکھا جو بت بنا کھڑا تھا۔ وہ اندر سے لرز گیا مگر بت کی طرح کھڑا رہا۔ راجوں مہاراجوں نے ہردت سے کہا کہ وہ اُس جاسوس کا نام لے لیکن اس نے کہا کہ وہ پہلے اپنے طور پر سراغرسانی کرے گا، پھر اس جاسوس کو سب کے سامنے کھڑا کر دے گا۔

یہ محفل برخاست ہوئی تو مہاراجہ قنوج نے راجہ ہردت کو ساتھ لے لیا اور اُس سے پوچھنے لگا کہ چونکہ اُسے مشترکہ کمان دے دی گئی ہے، اس لیے اُسے معلوم ہونا چاہیے کہ وہ کسے جاسوس سمجھ رہا ہے جسے یہاں اتنی اونچی حیثیت حاصل ہے کہ وہ اُس پر الزام لگانے سے ڈرتا ہے۔ ہردت اُسے ٹال رہا کیونکہ تاشقین ساتھ ساتھ چلا آ رہا تھا۔ مہاراجوں کے خیمے اُڑ جانے کی وجہ سے اُن کے لیے مکان خالی کرا لیے گئے تھے۔ مہاراجہ

قنوج اپنی رہائش گاہ میں پہنچا تو اُس نے تاشقین کو جسے وہ جگن ناتھ سمجھتا تھا، چھٹی دے دی اور وہ ہردت کو ساتھ اندر لے گیا۔

چھپا مہاراجہ کی لاڈلی رانی تھی۔ وہ اُس کے انتظار میں تھی۔ اُس نے مہاراجہ اور راجہ ہردت کو شراب کے پیالے پیش کیے اور مہاراجہ کے ساتھ بیٹھ گئی۔ ہردت نے چھپا کی طرف دیکھا تو راجپال اشارہ سمجھ گیا۔ اُس نے چھپا سے کہا کہ ایک ضروری بات کرنی ہے اس لیے وہ کچھ دیر کے لیے دوسرے کمرے میں چلی جائے۔ چھپا چلی تو گئی لیکن تجسس نے اُسے دروازے کے ساتھ ہی روک لیا اور وہ باتیں سننے لگی۔

"میں جو بات کرنے لگا ہوں، وہ اُس قسم کے مطابق ہے جو ہم سب نے مندر میں کھائی ہے" — راجہ ہردت نے کہا۔ "مجھے میرے عہدیدار نے بتایا ہے کہ آپ کا یہ ذاتی محافظ جگن ناتھ نہیں امیرِ تاشقین ہے اور یہ غزنی کا بڑا ہی دانشمند اور ہر فن مولا جاسوس ہے۔ میرے عہدیدار کو یہ بات اُس جاسوس نے بتائی تھی جو قتل ہو گیا ہے... آپ کو میری بات اچھی نہیں لگی ہو گی۔"

"آپ کی بات مجھے بُری نہیں لگی" — مہاراجہ راجپال نے کہا۔ "لیکن میں مان نہیں سکتا کہ کوئی اجنبی مجھے اس طرح دھوکہ دے سکتا ہے۔ میں آپ کے الزام کو ٹالوں گا نہیں۔"

"اگر آپ سننے کی ہمت رکھتے ہیں تو میں ایک بات اور بھی کہنا چاہتا ہوں" — راجہ ہردت نے کہا۔ "آپ کے لیے حسین لڑکیوں کی کمی نہیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ چھپا رانی اور آپ کے ذاتی محافظ کا در پردہ دوستانہ ہے۔ اگر آپ چھوٹی رانی کی خادمہ سے پوچھیں جو اُس کے ساتھ پرسوں رات دریا پر گئی تھی تو آپ کو حقیقت معلوم ہو سکتی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ یہ لڑکی اس جاسوس کے ساتھ مل کر آپ کے لیے ایک حسین دھوکہ بنی ہوئی ہے۔"

"ذرا کھل کر بتائیں کہ آپ کو یہ باتیں کس طرح معلوم ہوئی ہیں" — مہاراجہ راجپال نے کہا۔ "میں خادمہ کو آپ کے سامنے بلاؤں گا اور صبح آپ میرے محافظ اور میری رانی کی لاشیں دیکھ لینا۔"

"اُس عہدیدار کو میں نے اپنے ساتھ رکھا ہوا ہے" راجہ ہردت نے کہا۔ "وہ باہر

کھڑا ہے۔ آپ اُس کی زبانی جاسوسوں کے متعلق سُن سکتے ہیں" — اور اُس نے چھپا اور تاشقین کی دوستی کی تفصیل سنانی شروع کر دی۔

چھپا وہاں سے دبے پاؤں باہر نکل گئی اور تاشقین کے کمرے میں جا پہنچی۔

"فوراً نکلو اور گھوڑا نکالو" چھپا نے اُسے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "ہم دونوں کا راز کھل گیا ہے۔"

"کیسا راز؟" تاشقین نے پُوچھا۔ "کیا کہہ رہی ہو؟"

"بلند شہر کا راجہ ہمارے مہاراجہ کو بتا رہا ہے کہ تم جگن ناتھ نہیں، غزنی کے مسلمان ہو۔ معلوم نہیں اُس نے تمہارا کیا نام بتایا ہے... اور اُس نے مہاراجہ کو یہ بھی بتا دیا ہے کہ میری اور تمہاری در پردہ دوستی ہے۔ وہ میری خادمہ کو بلا رہے ہیں.... کیا یہ صحیح ہے کہ تم مسلمان ہو؟"

"کیا تم مجھے پکڑوانے آئی ہو یا مجھے یہاں نکل جانے کو کہنے آئی ہو؟"

"مجھ سے کچھ بھی نہ چھپاؤ" چھپا نے کہا۔ "میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔ فوراً نکلو اور مجھے ایک چادر دو جو میں اپنے اوپر ڈال لوں۔ جلدی کرو۔"

"وہ ٹھیک کہتے ہیں چھپا!" — تاشقین نے کہا۔ "میں مسلمان ہوں۔ میرا نام تاشقین ہے۔ کیا اب بھی میرے ساتھ چلو گی؟ مسلمان ہو جاؤ گی؟"

"میں تمہارے ساتھ چلنے اور تمہارے ساتھ مرنے کے لیے آئی ہوں" چھپا نے کہا۔ "مجھے چادر دو۔"

تاشقین نے ایک چادر چھپا کو دی۔ تلوار کمر سے باندھی اور خنجر بھی کمر بند سے اُڑس لیا۔ دونوں اصطبل کی طرف چل پڑے۔ اُدھر مہاراجہ راجپال نے گرج کر حکم دیا کہ اُس کے محافظ اور چھپا رانی کو فوراً حاضر کیا جائے۔

تاشقین نے چھپا کو ایک جگہ اندھیرے میں کھڑا رہنے کو کہا اور خود اُس جگہ چلا گیا جہاں گھوڑے بندھے تھے۔ اُس کی حیثیت ایسی تھی کہ اُس کا حکم فوراً مانا جاتا تھا۔ اُسے کوئی روک نہیں سکتا تھا۔ اُس نے سائیس سے کہا کہ اس کے گھوڑے

کی زین وغیرہ جلدی لائے۔

اُدھر مہاراجہ کو بتایا گیا کہ چپا رانی معلوم نہیں کہاں ہے۔ مہاراجہ نے حکم دیا کہ دونوں کو فوراً تلاش کرو۔ اگر وہ بھاگنے کی کوشش کریں تو انہیں ہلاک کر دیا جائے۔

اس حکم پر دس بارہ محافظ جو مہاراجہ کے پہرے پر رہتے تھے، دوڑ اٹھے۔ ایک جلتی مشعل سے انہوں نے تین چار مشعلیں جلائیں اور ساتھ لے گئے تھے۔

تاشقین کا گھوڑا تیار ہو گیا۔ وہ اس پر سوار ہوا اور وہاں پہنچا جہاں چپا اُس کے انتظار میں کھڑی تھی۔ اُس نے چپا کو اپنے پیچھے سوار کرایا مگر گھوڑا موڑا تو آگے سے مشعلیں آرہی تھیں۔ شہر کا دروازہ کھلا تھا مگر اب اُدھر سے نکلنا مشکل تھا۔ اُس نے گھوڑا دوسری طرف موڑا۔ اسے محافظوں کی للکار سنائی دی کہ رک جاؤ ورنہ تیر آرہے ہیں۔

وہ نہ رکا۔ اُسے چپا کی چیخ سنائی دی۔ وہ اتنا ہی کہہ سکی کہ میری پیٹھ میں دو تیر اُتر گئے ہیں۔ یہ کہہ کر وہ گھوڑے سے گر پڑی۔

گھوڑا بڑی زور سے ہنہنایا اور رکنے لگا۔ تاشقین سمجھ گیا کہ گھوڑا بھی تیروں کا نشانہ بن گیا ہے۔ گھوڑا بے لگام ہونے لگا تو تاشقین دوڑتے گھوڑے سے کودا۔ اُس کے قریب سے تیر گزر گئے۔ وہ ایک گلی میں داخل ہو گیا۔ پیچھے تعاقب میں آنے والوں سے پہلے ہی وہ گلی کے دو تین موڑ مڑ گیا۔ اسے چپا کا کوئی غم نہیں تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ مر چکی ہو گی۔ اُسے اس لڑکی کے خون کا بدلہ نہیں لینا تھا۔ وہ جس فرض کے لیے یہاں آیا تھا، اُسے وہ پورا کرنا تھا۔ اُسے غزنی پہنچنا تھا۔

اُسے معلوم تھا کہ شہر کی دیوار کا ایک حصہ دریا کے بالکل ساتھ ہے اور رات کی بارش سے دریا میں اتنا پانی ہوگا کہ دیوار کو چھو رہا ہوگا۔ گلیوں میں اس کے تعاقب میں آنے والے شور مچاتے جا رہے تھے۔ تاشقین اُس چوڑی ڈھلان تک پہنچ گیا جو دیوار کے اوپر جاتی تھی۔ نیچے کے شور سے دو سنتری جو دیوار پر پہرہ دے رہے تھے، اُس کے راستے میں آ گئے۔ اُس نے ان کے قریب جا کر تلوار نکالی اور ایک کے پیٹ میں اتار دی۔ دوسرا بھاگ اٹھا۔ مشعل بردار محافظ ڈھلان تک آ گئے۔

تاشقین دیوار پر دریا کی طرف چلا گیا۔ وہاں سے دیوار بہت اونچی تھی۔ اُس نے

دریا میں چھلانگ لگا دی۔

متھرا سے غزنی تک کا ہوائی فاصلہ سات سو میل ہے۔ راستے میں سات بڑے دریا آتے ہیں۔ آدھے سے زیادہ راستہ پہاڑی علاقوں سے گزرتا ہے۔ تاریخ دان لکھتے ہیں کہ یہ تین مہینوں کی مسافت تھی۔

سلطان محمود غزنوی خوارزم کو اپنی سلطنت میں شامل کر چکا تھا۔ خوارزم کی فوج کو اُس نے غزنی کی فوج میں مدغم کر لیا تھا اور اُس نے بھرتی کی مہم تیز کر دی تھی۔ اس کی بہت سی فوج ضائع ہو چکی تھی۔ اُس نے مسجدوں میں اعلان کروائے تھے کہ ہندوستان جو محمد بن قاسم کے دور میں اسلامی ملک بنتا جا رہا تھا، ہندوؤں کا بت خانہ بن گیا ہے اور وہاں اسلام کے سرچشمے کو بند کرنے کے جنگی منصوبے بن رہے ہیں۔ ہم پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اسلام کا پیغام دور دور تک پہنچائیں اور ہندوستان سے بت خانوں کا خاتمہ کریں۔ یہ ایک ایسی شیطانی قوت ہے جسے وہیں نہ دبایا گیا تو یہ اسلام کی بقا کے لیے بہت بڑا خطرہ بن جائے گی۔

مسجدوں میں امام اسی موضوع پر وعظ دیتے اور لوگوں کو فوج میں شامل ہونے کے لیے تیار کرتے تھے۔ یہ وعظ قرآن اور احادیث کے حوالوں سے بھی ہوتے تھے اور جذباتی انداز سے بھی۔ سلطان محمود کا یہ پیغام مسجدوں اور مدرسوں میں اور سرکاری انتظامات کے تحت سلطنت کے گوشے گوشے میں پہنچایا گیا!

"سلطانی ایک بڑا نازک فرض ہے جو خدا نے مجھے سونپا ہے۔ سلطان کا کام صرف حکومت کرنا نہیں ہوتا۔ اس کے فرائض میں شامل ہے کہ قوم کو خوشحال اور باوقار رکھے اور اولیت اس کو ہے کہ جنگی طاقت اتنی تیار کرے کہ اپنے دین کے دشمنوں کے پاس خواہ کتنی ہی جنگی طاقت ہو، وہ سر نہ اٹھا سکیں اور اگر اُس کے پڑوس میں مسلمانوں پر کفار ظلم و تشدد کر رہے ہوں تو ان کی نجات کے لیے خود بھی جائے اور قوم کو بھی اس جہاد کے لیے تیار کرے .... مجھے قوم کے تعاون کی ضرورت ہے۔ غزنی کے شیر دلو آؤ ہم اپنی زندگی میں یہ فرض پورا کر جائیں۔"

سلطان محمود غزنوی جس قدر قابل جرنیل تھا، اتنا ہی قابل ناظم تھا۔ ہندوستان سے وہ جو زر و جواہرات لے جاتا تھا، انہیں وہ لوگوں کی فلاح و بہبود اور تعلیم و تربیت پر خرچ کیا کرتا تھا۔ اس کا کچھ حصہ وہ فوج کے سپاہیوں میں تقسیم کر دیا کرتا تھا۔ چونکہ لوگ خوشحال تھے اس لیے وہ سلطان کے اشاروں پر سرگرمِ عمل ہو جاتے تھے۔ اب ۱۰۱۷ء کے آخر میں اُس نے اپنی سلطنت میں فوجی بھرتی کا جنون طاری کر دیا۔ وہ اپنے سالاروں سے کہنے لگا تھا— "مجھے اپنے والدِ محترم کی یہ وصیت پوری کرنی ہے کہ ہندوستان کے بُت خانے ختم کر کے وہاں اسلام پھیلانا ہے۔ مجھے خواب میں بھی یہی اشارہ ملا تھا۔ میرے پیر و مرشد شیخ ابوالحسن خرقانیؒ نے بھی یہی حکم دیا ہے۔ میری عمر تھوڑی رہ گئی ہے اور مہم بڑی دُور کی ہے۔"

سلطان ہندوستان کی خبروں کا انتظار کرتا رہتا تھا۔ وہ یہ سننے کے لیے بیتاب رہتا تھا کہ ہندوستان کے راجے مہاراجے اُس کے خلاف جنگی تیاریاں کر رہے ہیں۔ ۱۰۱۷ء کا سال ختم ہو چکا تھا۔ ۱۰۱۸ء کے تین مہینے گزر گئے تھے۔ اسے کوئی اطلاع نہیں ملی تھی۔

ایک روز اُسے بتایا گیا کہ ہندوستان سے امیر بن تاشتقین نام کا ایک آدمی آیا ہے۔

"تاشتقین آگیا ہے؟"— سلطان نے اچھل کر اُٹھتے ہوئے کہا— "فوراً بلاؤ۔"

جب تاشتقین اندر آیا تو سلطان حیرت سے پیچھے ہٹ گیا۔ یہ زرد رُو، مریل چہرہ جس پر گرد کی تہ جمی ہوئی تھی، تاشتقین کا نہیں تھا۔ اس کی کمر دوہری ہوئی جا رہی تھی۔ اُس سے پاؤں پر کھڑا نہیں ہُوا جا رہا تھا۔ سلطان نے اُسے سہارا دے کر بٹھایا اور اُس کے لیے مشروب اور کھانا لانے کو کہا۔

"تین مہینوں کا سفر ڈیڑھ مہینے میں طے کیا ہے"— تاشتقین نے ہانپتی آواز میں کہا— "متھرا میں گرفتار ہو چلا تھا۔ خدا نکال لایا ہے۔ … ہندوستان کا نقشہ لائیے … گھوڑے سے چوری کرتے اور دوڑا دوڑا کر مارتے پہنچا ہوں۔ ایک آدمی کو گھوڑے کی خاطر قتل کرنا پڑا۔ ایک دریا بغیر گھوڑے کے تیر کر پار کیا۔ گھوڑے پر ہی سوتا رہا ہوں۔"

اس نے مشروب پیا اور سانسوں کو سنبھالتے ہوئے اُن … راجوں کے نام بتائے جنھوں نے مندر میں کانفرنس کی تھی۔ سلطان کو ان کا منصوبہ بتلایا اور نقشے پر اُسے دکھانے لگا کہ متھرا، قنوج، بلند شہر اور مہابن کہاں کہاں ہیں اور اس علاقے میں گھنے جنگل کے علاوہ گنگا اور جمنا بہت مشکل پیدا کریں گے۔ پھر اُس نے نقشے پر وہ چھوٹے چھوٹے قلعے دکھائے جن میں مہاراجوں نے مشترکہ فوج کی نصف نفری رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔

"وہ پشاور کے اُس میدان میں آ کر لڑنا چاہتے ہیں جہاں آپ بھیم پال نندر کے باپ جے پال کو شکست دے چکے ہیں"— امیر بن تاشتقین نے کہا— "وہ ملتان کی پہاڑیوں تک اپنے رستے ہمارے اندازے سے گھات میں بٹھائیں گے۔ اگر ہماری فوج آگے نکل گئی تو چھوٹے چھوٹے قلعوں کی فوج ہمارا راستہ روکے گی۔"

"لاہور کے بھیم پال کے کیا ارادے ہیں؟"— سلطان محمود غزنوی نے پوچھا۔

"وہ آپ سے ڈرتا بھی ہے اور اس منصوبے میں بھی پوری طرح شامل ہے۔"

"اُسے ایسا ہی کرنا چاہیے"— سلطان نے کہا— "اُسے اپنی شکست کو فتح میں بدلنا چاہیے۔ ہندوستان کے راجپوت دلیر لوگ ہیں۔ غیرت والے بھی ہیں … کیا تم بتا سکتے ہو کہ ان کی فوجیں کب تک اکٹھی ہو سکیں گی اور وہ پیش قدمی کب تک کریں گے؟"

"کم از کم ایک سال لگے گا"— تاشتقین نے کہا— "متھرا کے پنڈت انہیں جلدی کرنے کو کہہ رہے تھے۔"

"ہم ان کا انتظار ملتان اور پشاور میں نہیں کریں گے"— سلطان نے کہا— "ان سے ہماری ملاقات متھرا اور قنوج میں ہو گی … تاشتقین! پورا ایک مہینہ آرام کرو۔ تم بہت زیادہ انعام کے مستحق ہو۔ یہ تمہیں تھوڑی دیر میں مل جائے گا۔"

"دشمن کو تیاری کی حالت میں جا پکڑو"— سلطان محمود اپنے سالاروں اور نائب سالاروں کو اپنے فیصلے سے آگاہ کرتے ہوئے انہیں بتا رہا تھا— "دشمن کو حملہ کرنے کی مہلت نہ دو۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ ہند کے مہاراجے کس طرح اکٹھے ہو رہے ہیں اور وہ فوج کو کس طرح تقسیم کر رہے ہیں۔ ہم اُس وقت انہیں جا دبوچیں گے جب اُن کے رستے مشترکہ

فوج بنانے کے لیے سفر کی حالت میں ہوں گے۔ ہمارا سب سے بڑا شکار متھرا ہوگا۔ میں نے تاشقین نے مجھے بتایا ہے کہ متھرا کے بُت بہت مقدس سمجھے جاتے ہیں اور متھرا ہندوؤں کے کرشن مہاراج کا جائے پیدائش ہے۔ کرشن ان کا پیغمبر تھا۔ تاشقین نے بتایا ہے کہ اُس کا بت سنگِ مرمر کا ہے اور اس کی آنکھیں نہایت خوشنما اور بیش قیمت ہیروں کی ہیں۔ سارے ہند کے ہندو اس بُت کی زیارت کے لیے جاتے ہیں۔

"ہمیں فوراً کوچ کرنا ہے۔ ہم پنجاب میں سے نہیں گزریں گے۔ وہاں کا مہاراجہ بھیم پال ہمارا باجگزار ہے مگر اُس کی نیت ٹھیک نہیں۔ ہم کشمیر کی اُن پہاڑیوں کے ساتھ ساتھ جن کے دامن میں پنجاب واقع ہے، گزریں گے۔ ذہن میں رکھیں کہ ہمارے راستے میں سات دریا آئیں گے۔ پہاڑ اور جنگل آئیں گے۔ یہ بھی یاد رکھیں کہ ہم اپنے ملک سے بہت دور جا کر لڑیں گے۔ ہمیں نہ کمک ملے گی نہ رسد۔ رسد ہمیں راستے سے پوری کرنی ہے۔"

سلطان محمود نے ہندوستان کا نقشہ جو اُس نے اپنے ہاتھ سے چادر جتنے بڑے کپڑے پر بنا رکھا تھا، سب کے سامنے رکھتے ہوئے یہ بتایا کہ پیش قدمی کا راستہ یہ ہوگا اور متھرا پر براہِ راست حملہ نہیں ہوگا۔ پہلے ارد گرد کی ریاستوں کو ختم کیا جائیگا۔

"لیکن یہ مہم آسان نہیں ہوگی" — سلطان نے کہا۔ "ہم جان کی بازی لگا رہے ہیں۔ مہاراجہ قنوج مہاراجہ بھیم پال سے مختلف ہے۔ سنا ہے وہ لڑنا اور اپنی فوج کو لڑانا جانتا ہے۔ ہمارے آدمیوں نے متھرا میں جہاں لاکھوں ہندو جمع تھے غزنی کی فوج کی ایسی دہشت پھیلائی ہے کہ وہاں کے لوگ بھگدڑ مچا دیں گے مگر یہ نہ بھولنا کہ کسی کے مذہب پر اور مقدس مقام پر حملہ ہو تو وہ جان کی بازی بھی لگا دیا کرتا ہے۔"

سلطان محمود نے دیگر ہدایات دیں اور تیاری کے لیے صرف تین دن دے کر چوتھے روز کوچ کا حکم دے دیا۔

سلطان محمود نے بروز ہفتہ ۲۷ ستمبر ۱۰۱۹ء (۱۳ جمادی الاول ۴۰۹ھ) غزنی سے کوچ کیا۔ مؤرخوں میں اس کی جنگی طاقت کے متعلق کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔ عتبی نے [illegible] کی فوج کی تعداد گیارہ ہزار باقاعدہ فوج اور بیس ہزار رضا کار لکھی ہے جو صحیح معلوم نہیں ہوتی۔ فرشتہ نے تعداد ایک لاکھ سوار اور بیس ہزار پیادہ لکھی ہے۔ فرشتہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ سلطان نے یہ فوج ترکستان، خوارزم، خراسان اور چند اور پڑوسی علاقوں سے اکٹھی کی تھی۔ پروفیسر محمد حبیب نے مؤرخوں کے حوالے سے فوج کی تعداد ایک لاکھ سوار اور بیس ہزار پیادہ اور بیس ہزار رضا کار لکھی ہے۔

یہ فوج کئی میل لمبی تھی اور رفتار بہت تیز۔ یہ فوج دریائے سندھ اور جہلم اس حالت میں پار کر گئی کہ دونوں دریاؤں میں طغیانی تھی۔ مؤرخ لکھتے ہیں کہ بیل گاڑیوں اور گھوڑا گاڑیوں کے لیے کشتیوں کے پُل بنائے گئے مگر فوج نے انسانی پُل بنا کر دستے پار کر دیئے۔ دریائے راوی دور اُوپر سے اُس جگہ سے پار کیا گیا جہاں پاٹ بہت چوڑا ہو جاتا تھا اور دریا کئی شاخوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔

سلطان نے اس سے آگے کسی ذمہ دار گائیڈ کی ضرورت محسوس کی۔ اُس نے اپنا ایک ایلچی کالنجر (موجودہ کوٹلی) کے راجہ کے پاس اس پیغام کے ساتھ بھیجا کہ اُسے قنوج تک ایک رہبر کی ضرورت ہے۔ ایلچی کے ساتھ سلطان نے ایک محافظ دستہ بھیجا۔

"سلطان غزنی محمود نے سلام بھیجا ہے" — ایلچی نے راجہ کالنجر سے اُس کے دربار میں کہا — "سلطان نے وہ معاہدہ یاد دلایا ہے جس کے تحت آپ غزنی کی فوج کی مدد کرنے کے پابند ہیں۔ سلطان نے کہا ہے کہ میری منزل کہیں اور ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ میری فوج کو اپنے ہاں آنے پر مجبور نہیں کریں گے۔ اگر آپ آزاد اور خود مختار رہنا چاہتے ہیں تو میری ضرورت فوری طور پر پوری کر دیں۔ رہبر ایسا بھیجیں جو دھوکہ نہ دے۔ دھوکے کی صورت میں میں اسے اپنے خلاف اعلانِ جنگ سمجھوں گا۔"

راجہ سوچ میں پڑ گیا۔ ایلچی نے کہا — "سلطان کے ساتھ جو فوج ہے آپ اُس کی رہائش [illegible] کی [illegible]۔"

راجہ نے اُسی وقت اپنے بیٹے شاہی کو (جسے بعض مؤرخوں نے بھی لکھا ہے) ایلچی کے ساتھ روانہ کر دیا۔ سلطان نے اُسے ساتھ لے لیا اور اُسے قنوج تک چھوٹے سے چھوٹے راستے سے لے چلنے کو کہا۔ راستے میں کئی قلعے تھے۔ سلطان محمود نے ہر قلعے کا محاصرہ کر کے قلعہ داروں سے کہا کہ وہ ہتھیار ڈال دیں۔

بیشتر قلعہ داروں نے اوپر سے سلطان کی فوج دیکھی تو سفید جھنڈا لہرا دیا۔ سلطان نے ہر قلعے سے اپنی ضرورت کا سامان لے لیا اور بعض اہم قلعوں میں اپنی کچھ نفری چھوڑ دی اور قلعے کے ہندوستانی دستے کو گاڑیاں دھکیلنے اور سامان اٹھانے کے لیے ساتھ لے لیا۔

ابن اکوزی اور عنصری لکھتے ہیں کہ سلطان محمود کی اس قدر دہشت تھی کہ "اس کے آگے قلعے اور چھوٹے بڑے شہر اور قصبے جیسے اپنے آپ فتح ہوتے جا رہے تھے۔"

سر آرل سٹین نے لکھا ہے "جن گھنے جنگلوں میں ہوا بھی راستہ بھول جاتی ہے ان میں سے سلطان اپنی فوج گزار کر لے گیا۔ اس نے پنجاب کے پانچ دریا جیسے اڑ کر پار کیے ہوں، اور وہ بلند شہر تک سمندر کی موجوں کی مانند پہنچ گیا۔"

سلطان محمود نے متھرا کو اپنی سکیم کے مطابق نظر انداز کر دیا اور ۲ دسمبر ۱۰۱۸ء (۲۰ رجب ۴۰۹ھ) کو دریائے جمنا پار کیا۔ اس کے سامنے سرساوا (جو اس وقت شاردا کہلاتا تھا) کا قلعہ آگیا۔ اس نے قلعے کا محاصرہ کر لیا لیکن محاصرہ مکمل ہونے سے پہلے ہی وہاں کا راجہ اپنے کنبے کو ساتھ لے کر بھاگ گیا۔ اس کی فوج نے بغیر لڑے ہتھیار ڈال دیئے۔ سلطان کو قلعے سے تیس ہاتھی ملے۔ اسے اس علاقے میں ایک اڈے کی ضرورت تھی۔ اس نے اسی قلعے کو رسد گاہ بنا لیا۔ قلعے سے دس لاکھ درہم خزانہ ہاتھ آیا۔

سرساوا سے سلطان نے بلند شہر کا رخ کر لیا جو وہاں سے کم و بیش ایک سو میل دور تھا اور وہاں پہنچنے کے لیے ایک تو دریائے گنگا عبور کرنا تھا، دوسرے راستہ کٹھن تھا۔ چونکہ سلطان کو ایک اڈہ مل گیا تھا اس لیے اس نے رسد کے قافلے کو ساتھ گھسیٹنے کی بجائے صرف فوج ساتھ لی۔ قیدیوں سے کشتیوں کا پل بنوایا اور دونوں دریا پار کر کے بلند شہر کو محاصرہ میں لے لیا۔

بلند شہر کا حکمران راجہ ہردت تھا جس نے مہاراجہ قنوج کو بتایا تھا کہ اس کا ذاتی محافظ جگن ناتھ سلطانی جاسوس ہے اور جیپال ثانی کے ساتھ اس کی درپردہ دوستی ہے۔ دوسرے راجوں مہاراجوں کے ساتھ اس نے بھی متھرا کے مندر میں حلف اٹھایا تھا کہ مذہب اور مہابھارت کے لیے جان و مال کی قربانی دے گا مگر اس کے شہر میں لوگوں کو اطلاع ملی کہ

شہر کو غزنی کی فوج نے محاصرے میں لے لیا ہے تو لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ سارے شہر پر دہشت طاری ہو گئی۔ یہ غزنی کے جاسوسوں کی پھیلائی ہوئی دہشت تھی۔ سلطان نے قلعے کے دروازے پر اپنے آدمی بھیج کر اعلان کرایا کہ ہتھیار ڈال دو، ورنہ شہر کو ملبے میں بدل دیا جائے گا۔

ہاتھی دروازے کو ٹکریں مار کر توڑنے کے لیے سامنے کھڑے کر دیئے گئے۔ راجہ ہردت نے ایسی بزدلی کا مظاہرہ کیا کہ قلعے کا دروازہ کھلا اور وہ باہر آ گیا۔ اس کے پیچھے دس ہزار نفری کی فوج بھی ہتھیاروں کے بغیر باہر آ گئی۔ ہردت کو سلطان کے پاس لے گئے۔

"میں اپنی، اپنے کنبے اور اپنی فوج کی سلامتی چاہتا ہوں"۔ راجہ ہردت نے سلطان سے کہا ۔"میں اور یہ دس ہزار فوجی اسلام قبول کرنے پر آمادہ ہیں۔ ہمیں اپنے مذہب میں قبول کر لیں۔"

زیادہ تر مورخین نے لکھا ہے کہ یہ دس ہزار افراد صرف فوجی نہیں تھے۔ ان میں شہریوں کی تعداد زیادہ تھی۔ انہوں نے ہردت کو مجبور کیا تھا کہ وہ شہر کو تباہی سے بچانے کے لیے صلح کرے ورنہ وہ اپنے زیر اثر فوجیوں کے ساتھ دروازے کھول دیں گے۔ ایک مورخ گردیزی نے لکھا ہے کہ راجہ ہردت دھوکہ دے کر بھاگ گیا تھا۔

سلطان محمود نے ان دس ہزار افراد کو قلعے میں پابند کر دیا، اور رات کے وقت اس نے فوج سے دریائے گنگا عبور کرایا مگر اس نے متھرا کا رخ نہ کیا بلکہ متھرا کو نظر انداز کر کے مہابن کی طرف پیشقدمی کی۔ اسے اطلاع مل چکی تھی کہ مہابن کے راجہ کول چند نے اپنی فوج جنگل میں لڑائی کے لیے تیار رکھی ہوئی ہے۔ کول چند کو گھنے جنگل کا فائدہ حاصل تھا۔ اس کی فوج میں ہاتھی بھی تھے جنہیں اس نے حملے کے لیے تیار رکھا ہوا تھا۔

سلطان محمود نے اپنی فوج کا زیادہ تر حصہ جنگل کے دونوں پہلوؤں میں بھیج دیا اور صرف ہراول کے دستے جنگل کے اندر اس انداز سے بھیجے جیسے وہ دشمن سے بے خبر ہوں۔ یہ دستہ جنگل کے وسط میں پہنچا تو کول چند نے حملے کا حکم دے دیا۔ سلطان کا دستہ گھوڑسوار تھا، گھنے جنگل میں بکھر گیا۔ یہ گھنے جنگل کی لڑائی تھی جس میں تیر انداز زیادہ موثر ثابت

نہیں ہو رہے تھے۔ مسلمان گھوڑ سوار پھرتی سے اِدھر اُدھر ہو جاتے تھے۔

اچانک کوّل چند کی فوج پر دائیں بائیں اور عقب سے قیامت ٹوٹ پڑی۔ ہراول دستہ ایک طرف ہو گیا۔ ہندوؤں کی فوج کے لیے اب کٹ مرنے اور بھاگنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا۔ سر آرل سٹین نے اس لڑائی کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے — "اتنے گھنے جنگل میں غزنی کی فوج بالوں میں کنگھی کی طرح پھر گئی۔ آگے دریائے جمنا تھا جو اس فوج نے عبور کیا تھا۔ کوّل چند کی فوج دریا میں کود گئی اور بہت کم نفری زندہ رہی۔ ان میں سے جو کنارے پر آتا تھا اُسے سلطان کے تیر انداز ختم کر دیتے تھے۔"

راجہ کوّل چند کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ اُس کے خوبصورت محل میں گئے تو اُس کے چوبدار نے بتایا کہ راجہ کی ایک بیوی اور ایک بچہ تھا۔ اُس نے دونوں کو تلوار سے قتل کیا اور اپنا خنجر اپنے دل میں گھونپ لیا ہے۔ چوبدار نے اندر لے جا کر تینوں کی لاشیں دکھائیں — راجہ کوّل چند کے ایک سو پچاسی جنگی ہاتھی غزنی والوں کے ہاتھ لگے۔

متھرا کے متعلق امیر بن تاشتگین نے سلطان محمود کو بتایا تھا کہ اس کے اردگرد دیوار بہت مضبوط ہے لیکن اس کا دفاع مہاراجہ قنوج کی فوج کے ایک دو دستے کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ مہابن کی فوج کی ذمہ داری میں متھرا کا دفاع بھی تھا۔ مہر ساوا اور بلند شہر والے اس خوش فہمی میں مبتلا رہتے تھے کہ کسی بیرونی حملہ آور نے متھرا پر حملہ کیا تو وہ لٹیرے متھرا تک نہیں پہنچنے دیں گے۔ وہ جمنا کو متھرا کا قدرتی دفاع کہا کرتے تھے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ سلطان محمود نے نہایت دانشمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے متھرا کے اردگرد کے قلعے سر کر کے پھر مہابن کی فوج کو راستے سے ہٹایا اور اطمینان سے متھرا کی طرف بڑھا۔ اُس نے متھرا کو دُور سے دیکھا تو عش عش کر اُٹھا۔ بعد میں اُس نے غزنی کے گورنر کو متھرا کی خوبصورتی اور ہندوؤں کے قدیم فنِ تعمیر کے متعلق خط میں لکھا تھا — "یہاں کی عمارتیں یہاں کے عقیدت مندوں کے عقیدوں کی طرح مضبوط ہیں۔ زیادہ تر سنگِ مرمر کی ہیں۔ بہت سے مندر ہیں جو تھوڑے سے عرصے میں تعمیر نہیں ہوئے ہوں گے۔ ان کی تعمیر پر کروڑوں دینار صرف ہوئے ہوں گے اور ان کی تعمیر دو صدیوں میں مکمل ہوئی ہو گی ..... میں اس شہر کے حسن کو الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔"

سلطان محمود کی فوج کا نقصان بہت کم ہوا تھا۔ وہ خود اعتمادی سے متھرا کی طرف بڑھا جا رہا تھا۔ مہابن کی فوج کے بھگوڑے متھرا پہنچ گئے تھے اور انہوں نے لوگوں میں خوب دہشت پھیلائی تھی۔ اس سے پہلے ہشام اور اُس کے ساتھی دہشت پھیلا چکے تھے۔ مہابن کے شکست خوردہ سپاہیوں نے متھرا میں یہاں تک کہا کہ غزنی کی فوج کے آگے درخت اُکھڑ جاتے ہیں۔ ان افواہوں کا یہ اثر ہوا کہ شہر کی آبادی دفاع میں لڑنے کی بجائے مندروں میں اکٹھی ہو گئی۔ سنکھ اور گھنٹیاں بجنے لگیں۔

غزنی کی فوج نے شہر کا محاصرہ کیا تو نہایت معمولی مزاحمت ہوئی۔ شہر کے دروازے کھل گئے اور سلطان محمود شہر میں داخل ہو کر سب سے پہلے بڑے مندر میں گیا جہاں کرشن واسدیو کا بُت رکھا تھا۔ بہت خوبصورت بُت تھا۔ اس کی آنکھوں میں بیش قیمت ہیرے لگے ہوئے تھے۔ پانچ بُت سونے کے تھے۔ ان کی بھی آنکھیں ہیروں کی تھیں۔ ان سب ہیروں کی قیمت فرشتہ کے مطابق پچاس ہزار دینار تھی۔ ایک اور بُت سونے کا تھا۔ اس میں چار سو مثقال وزنی ہیرے جیسا پتھر جڑا ہوا تھا۔ اس بُت کو پگھلایا گیا تو ۹۸۳۰۰ مثقال خالص سونا نکلا۔ ایک مثقال ساڑھے چار ماشے کا ہوتا ہے۔ ایک سو بُت چاندی کے تھے۔

سلطان محمود نے پتھر کے بُت توڑ ڈالے اور سونے چاندی کے بُت پگھلا دیئے۔ ہندومت کے اس مرکز کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کے لیے سلطان محمود بیس روز متھرا میں رہا۔ شہر جلتا رہا اور خالی ہوتا رہا۔ حتیٰ کہ متھرا کھنڈروں کا شہر بن گیا۔

مہاراجہ قنوج نے اپنا دفاع مضبوط کرنا شروع کر دیا۔ اب اُس کی باری تھی۔

....اور ایک بُت شکن پیدا ہوا

(حصہ سوم، حصہ چہارم)

(سلطان محمود غزنوی کے جہاد اور جاسوسوں کی جذباتی اور واقعاتی داستان)

عنایت اللہ

....اور ایک بُت شکن پیدا ہوا

جلد دوئم

(تیسرا اور آخری حصہ)

سلطان محمود غزنوی کے جہاد اور جاسوسوں کی جذباتی اور واقعاتی کہانیاں

عنایت اللہ

علم و عرفان پبلشرز

34۔ اردو بازار، لاہور، فون :7232336 فیکس:7352332
www.ilmoirfanpublishers.com. E-mail: ilmoirfanpublishers@hotmail.com

نام کتاب .... اور ایک بُت شکن پیدا ہوا
(جلد سوئم، جلد چہارم)
مصنف .... عنایت اللہ
ناشر .... گلفراز احمد
علم وعرفان پبلشرز، لاہور
مطبع .... زاہدہ نوید پرنٹرز، لاہور
سرورق .... نفیل کیانی
سن اشاعت .... جون 2008ء
قیمت .... =/240 روپے

علم وعرفان پبلشرز
34۔ اردو بازار، لاہور فون: 7352332-7232336

سیونتھ سکائی پبلیکیشنز
غزنی سٹریٹ الحمد مارکیٹ 40۔ اردو بازار، لاہور
فون: 7223584، موبائل 0300-4125230

فہرست

قتلِ رقنوج اور ضربِ کلیم ۷
خدا جو دل میں اتر گیا ۴۰
بلاساغون کی کسن تلاش ۸۳
دیوتا نے پنڈت کو نگل لیا ۱۲۹
غزنی کی آبرو ۱۲۵

پیش لفظ

سلطان محمود غزنوی کے دور کی تاریخ ساز اور ولولہ انگیز کہانیوں کا تیسرا مجموعہ بعنوان "...اور ایک بت شکن پیدا ہوا" پیش کیا جا رہا ہے۔ اس میں پانچ کہانیاں شامل کی گئی ہیں جو آپ کو اس دور میں لے جائیں گی جب ہندوستان کے میدانوں، وادیوں اور دریاؤں میں حق اور باطل کی تلواریں ٹکرا رہی تھیں اور بت خانوں میں اذانیں گونج رہی تھیں۔ بتوں کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو غزنی کے گھوڑے روند رہے تھے۔

میں اس سلسلے کی پہلی جلد میں اس بے انصافی اور دھاندلی کا ذکر تفصیل سے کر چکا ہوں جو سلطان محمود غزنوی کے جہاد کی تاریخ کے ساتھ ہندو تاریخ نویسوں نے کی ہے۔ ایک دو مسلمان تاریخ نویسوں نے بھی ہندوؤں کا اثر قبول کر کے تاریخ اسلام کے اس بت شکن کو ڈاکو اور لٹیرا لکھا اور یہ ثابت کرنے کی مذموم کوشش کی ہے کہ ہندوستان پر سلطان محمود غزنوی کے حملے جہاد نہیں تھا۔ حقیقت ان کتابوں میں ملتی ہے جو غیر جانبدار تاریخ دانوں نے اس دور کے مورخوں کے حوالوں سے لکھی ہیں۔

یہودیوں اور نصرانیوں کی طرح ہندوؤں نے بھی غزنی سے آنے والے حق کے طوفانوں اور بگولوں کو روکنے اور ان کی شدت کو ختم کرنے کے لیے اپنی حسین و جمیل بیٹیوں کو استعمال کیا تھا مگر ہندوستان کا حسن اور عیاری بت شکنوں کے عزم کو متزلزل نہ کر سکی۔

ہندو لڑکیوں کے حسن و جوانی اور عیاری نے اور شکست خوردہ راجوں اور مہاراجوں کی درپردہ اسلام کش سرگرمیوں نے ان کہانیوں کو جنم دیا ہے جو میں آپ کو سنا رہا ہوں۔ ہندوؤں اور یہودیوں کی اسلام کش سرگرمیاں آج بھی نہ صرف جاری ہیں بلکہ پہلے سے زیادہ دلکش، طلسماتی اور تباہ کن ہو گئی ہیں۔ ہندوؤں نے سلطان محمود غزنوی کے جذبۂ حریت کو مسخ کرنے کی پوری کوشش اس لیے کی ہے کہ آج کے مسلمان نوجوانوں میں غزنوی کا جذبہ پیدا نہ ہو۔

میں نے پاکستانی نوجوانوں میں غزنی کے بت شکن کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے اس دور کی تاریخ کو چھان مارا اور یہ کہانیاں اخذ کی ہیں۔ ان کہانیوں میں آپ کو تفریح طبع کا خاصا سامان بھی ملے گا جو تفریح کے ساتھ ساتھ ایمان کو تر و تازہ کر دے گا۔

عنایت اللہ

مدیر "حکایت" لاہور

قتل، قنوج اور ضرب کلیم

غزنی

کا شہر آج روسیوں اور افغان وطن پرستوں کا میدانِ جنگ بنا ہوا ہے۔ افغانستان کی فوج کے افسر اور سپاہی فوج سے بھگوڑے ہو کر مجاہدین کے ساتھ مل رہے ہیں۔ روسی ٹینک افغانستان کے دیگر شہروں کی طرح غزنی میں بھی دندناتے پھرتے ہیں۔ فضا سے روسی گن شپ ہیلی کاپٹر آگ برساتے ہیں۔ اگر افغانیوں نے غزنی کی عظمت کو یاد رکھا تو وہ روسیوں کے قدم اکھاڑ کر ہی دم لیں گے۔

غزنی کی عظمت صرف اس سے نہیں تھی کہ وہاں ایک بت شکن پیدا اور دفن ہوا تھا بلکہ اس شہر کی عظمت کے کچھ اور نشان بھی ہیں جن میں ایک مسجد ہے۔ محمود غزنوی نے اس مسجد کا نام عروسِ فلک رکھا تھا۔ اس نے یہ مسجد متھرا کی فتح کی یادگار کے طور پر تعمیر کرائی تھی۔ غزنی والے اس فتح پر جتنا بھی ناز کرتے، کم تھا۔ متھرا ہندوؤں کا ویسا ہی مقدس شہر ہے جیسے ہمارے لیے مکہ اور مدینہ ہے۔ یہ سری کرشن مہاراج کی جائے پیدائش ہے اور یہاں بے شمار مندر اور بے حد قیمتی بت تھے۔ محمود غزنوی جب متھرا کا بت خانہ توڑ کر واپس گیا تو اس نے غزنی میں سنگِ مرمر کی ایسی مسجد تعمیر کرنے کا حکم دیا جو حسنِ تعمیر میں یکتا ہو۔

دور دور سے معمار بلائے گئے جنہوں نے محمود غزنوی کے تخیل اور تصور سے زیادہ حسین جامع مسجد تعمیر کر دی۔ محمود نے اس کی چھت اور دیواروں میں جو بیل بوٹے کھدوائے، ان میں سونا اور چاندی پگھلا کر ڈالا۔ مسجد کے اندر بیش قیمت قالین بچھائے۔

میناروں کے کلسوں پر سونا چڑھایا۔ پھر اس کے قریب ایک یونیورسٹی کا سنگِ بنیاد رکھا جس میں کتابوں کے انبار لگا دیئے۔ کتابیں مختلف زبانوں کی تھیں۔ یونیورسٹی کا عجائب گھر بھی بنایا جس میں نادر اشیاء رکھیں۔ یہ مسجد اور یونیورسٹی علم و فن کا مرکز بن گئی۔ محمود نے یونیورسٹی کے علما، اساتذہ اور طلباء کے لیے کثیر رقم الگ کر دی۔

امراء نے جب اپنے سلطان کا ذوق دیکھا تو انہوں نے اپنے لیے نہایت خوبصورت مکان اور دلکش مسجدیں تعمیر کرانی شروع کر دیں۔ تھوڑے ہی عرصے میں غزنی خوبصورت مکانوں، باغوں، مصنوعی چشموں اور حسین مسجدوں کا شہر بن گیا۔ آج غزنی اُن تعمیرات کے کھنڈروں کا شہر بن گیا ہے۔

جن فتوحات کی یاد میں محمود غزنوی نے ساڑھے نو سو سال پہلے یہ جامع مسجد اور یونیورسٹی تعمیر کی تھی، وہ فتوحات اُسے آسانی سے حاصل نہیں ہوئی تھیں۔ اس مسجد اور یونیورسٹی کی بنیادوں میں غزنی کے اُن ہزاروں مجاہدین کا خون شامل تھا جن کی لاشیں غزنی واپس نہیں لائی جا سکی تھیں۔ بلند شہر، متھرا، مہابن اور قنوج کے علاقے میں گنگا اور جمنا کے کنارے اُن شہیدوں کی قبروں کے نشان تو مٹ ہی گئے ہیں، ساڑھے نو سو برسوں میں اُن کی ہڈیاں بھی وہاں نہیں رہیں۔ انہوں نے جس طرح متھرا اور اس کے بعد قنوج فتح کیا تھا، اس کے پیچھے ایک ولولہ انگیز اور جذبات کو ہلا دینے والی داستان ہے۔

۱۰۱۸ء کے آخر میں محمود غزنوی بلند شہر سے متھرا تک بگولے کی طرح پھر گیا تھا۔ نقشے پر دیکھیں تو اُس کی پیش قدمی اور فتوحات کی شکل بگولے کی سی بنتی ہے۔ اُسے اس ایک ہی حملے میں کئی بار دریائے گنگا اور جمنا عبور کرنے پڑے۔ جنگ کے مبصر حیرت کا اظہار کرتے ہیں کہ اپنے وطن سے تین ماہ کی مسافت جتنی دور آ کر اتنی لڑائیاں لڑنا اور ہر لڑائی میں کامیابی حاصل کرنا معمولی دماغ اور جنگی فہم و فراست کے جرنیل کے بس کی بات نہیں تھی۔

متھرا بہت بڑا شکار تھا جسے وہ مار چکا تھا۔ ہندوستان کے اتنے بڑے بت خانے میں اذانیں گونج رہی تھیں۔ سلطان نے فوج کو متھرا میں آرام اور تنظیم میں رد و بدل کے لیے روک لیا۔ اُسے اب قنوج کی طرف پیش قدمی کرنی تھی۔ قنوج کے متعلق اُسے بتایا گیا

تھا کہ اس کی فتح آسان نہیں ہوگی۔ مہاراجہ قنوج کو دوسرے مہاراجوں کی نگاہ میں احترام حاصل تھا۔ وہ دانشمند تھا۔ یہی وجہ تھی کہ محمود غزنوی نے قنوج پر حملے سے پہلے فوج کو آرام دینے اور دستوں کو از سرِ نو منظم کرنے کی ضرورت محسوس کی تھی۔ اُس نے قنوج اور گرد و نواح میں اپنے جاسوس بھیج دیئے تھے۔ اُسے جو معلومات دی گئی تھیں، ان کے مطابق، قنوج کے راستے میں دو اور ریاستیں تھیں جن کے حکمران مہاراجے نہیں راجے تھے۔ ان میں ایک راجہ چندا تھا اور دوسرا چاندل بھور۔ چھوٹے چھوٹے اور راجے بھی تھے اور یہ سب مہاراجہ قنوج راجیا پال کے اتحادی تھے۔

جاسوسوں نے جن مقامی باشندوں کو مخبر (ایجنٹ) بنایا تھا، ان کی زبانی پتہ چلا تھا کہ لاہور کا مہاراجہ بھیم پال نڈر بھی اس خطے میں کہیں موجود ہے اور وہ یہاں کے مہاراجوں اور راجاؤں کو محمود غزنوی کے خلاف متحد کرتا پھر رہا ہے۔ وہ خود محمود غزنوی کے سامنے نہیں آ سکتا تھا کیونکہ وہ سلطان کا باجگزار تھا اور اُس نے سلطان کے ساتھ جنگ نہ کرنے اور غزنی کی فوج کو ہر طرح کی مدد دینے کا معاہدہ کر رکھا تھا۔ سلطان محمود نے اُسے ڈھونڈنے اور اگر ممکن ہو سکے تو پکڑ لانے کے لیے آدمی بھیج رکھے تھے مگر اُس کا کہیں سراغ نہیں مل رہا تھا۔

قنوج متھرا سے ڈیڑھ سو میل دور دریائے گنگا کے دائیں کنارے پر واقع ہے اور متھرا دریائے جمنا کے دائیں کنارے پر۔ اس طرح محمود غزنوی کو دو دریا عبور کرنے تھے مگر راستے میں جو راجے اور راجے قلعوں میں بیٹھے تھے، انہیں تہہ تیغ کرنا ضروری تھا، ورنہ قنوج کو محاصرے میں لینے کی صورت میں یہ سب سلطان پر عقب سے حملہ کر دیتے۔ سلطان پیش قدمی جلدی کرنا بہتر سمجھتا تھا تاکہ قنوج کا دفاع زیادہ مضبوط نہ ہونے پائے۔

راستے میں جمنا کے بائیں کنارے پر منج نام کا ایک مضبوط قلعہ اور چھوٹی سی ریاست تھی۔ اسے مہاون بھی کہتے ہیں۔ اُس زمانے میں یہ "برہمنوں کا قلعہ" کے نام سے مشہور تھا۔ قنوج اور منج کا درمیانی فاصلہ صرف ستائیس میل تھا۔ منج ہندو راجپوتوں کا گڑھ تھا۔ یہ لوگ غیر متشدد اور جنگ و جدل کے شیدائی تھے۔ ان کی عورتیں بھی بہادر اور

برقربانی دینے ڈال رکھی تھیں۔ مہاراجہ قنوج کو منج کے راجپوتوں پر اعتماد تھا۔ اُس نے ان کے ساتھ دوستی اور جنگی تعاون کا معاہدہ کر رکھا تھا۔

ایک روز منج کے لوگ دریائے جمنا میں نہا رہے تھے۔ مردوں سے دُور عورتیں بھی دریا میں اُتری ہوئی تھیں۔ ہندوؤں کے لیے صبح دریا میں نہانا مذہبی فریضہ ہے۔

منج کا قلعہ دریا کے عین کنارے پر واقع تھا۔ اچانک عورتوں کی چیخ و پکار بلند ہوئی اور عورتیں کنارے کی طرف بھاگیں۔ مرد دوڑے آئے۔ وہ سمجھے کہ دریا سے شاید مگرمچھ یا کوئی اور آفت نکلی ہے مگر وہاں کچھ اور ہی نظر آیا۔ دریا میں لاشیں بہتی آ رہی تھیں اور پانی کا رنگ بھی بدلا ہوا تھا۔ پہلے چند ایک لاشیں نظر آئیں پھر دریا جیسے لاشوں کا دریا بن گیا ہو۔ دریا پر جو پنڈت اور دیگر مذہب پرست لوگ تھے، وہ ہاتھ جوڑ کر دوزانو بیٹھ گئے اور بھجن الاپنے لگے۔ اُن کے جسم کانپ رہے تھے اور اُن کے بھجن بھی کانپ رہے تھے۔

قلعے کی دیواروں پر کھڑے سنتریوں نے دیکھا تو اُن کی بھی حالت غیر ہونے لگی۔ یہ راجپوت کسی سے ڈرنے والے نہیں تھے لیکن وہ زندہ لوگوں سے نہیں ڈرتے تھے۔ اتنی زیادہ لاشیں کسی غیبی آفت کا پتہ دیتی تھیں۔ دریا سے جو پنڈت بھاگ آئے تھے انہوں نے مندر کے گھڑیال اور سنکھ بجانے شروع کر دیئے۔ سارے شہر میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ رائے چند کو اطلاع ملی تو وہ دوڑتا قلعے کی دیوار پر جا چڑھا۔ اُس کے ساتھ اُس کے فوجی افسر اور درباری تھے۔

"جانتے ہو یہ کیا ہے؟" — اُس نے سب سے مخاطب ہو کر کہا — "یہ متھرا اور مہابن کی لاشیں ہیں۔ کیا تم نے یہ خبر نہیں سُنی تھی کہ غزنی کے مسلمانوں نے متھرا پر قبضہ کر کے وہاں کے تمام مندر اجاڑ ڈالے ہیں؟" — قلعے کی دیوار سے اُسے وہ لوگ شہر کی جانب دوڑتے نظر آ رہے تھے جو لاشوں کو دیکھ کر دریا سے بھاگے آ رہے تھے۔

رائے چند نے کہا — "دیکھو ان بزدلوں کو۔ لاشوں سے ڈر کر بھاگے آ رہے ہیں۔ انہیں معلوم نہیں کہ یوں بزدلی دکھائی تو ہم سب کی لاشیں اسی طرح دریا میں بہیں گی۔ اور ہماری عورتیں مسلمانوں کے قبضے میں ہوں گی۔"

مندر کی گھنٹیوں، گھڑیالوں اور سنکھوں کی آوازیں اور زیادہ بلند ہو گئی تھیں اور اب لوگ گلیوں میں بھی "ہرے رام، ہرے کرشن" کا بلند ورد کرنے لگے تھے۔ عورتیں بھی گلیوں میں نکل آئی تھیں۔ شہر کی یہ آوازیں بڑی ڈراؤنی تھیں۔ رائے چند کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ آخر وہ پھٹ کر بولا — "بند کرو یہ سنکھ اور گھڑیال۔ شہر میں یہ کیا ماتم ہو رہا ہے۔ راجپوت کس کی لاش پر رو رہے ہیں۔ پنڈتوں کو یہاں لے آؤ۔"

رائے چند کے محافظ اور سپاہی دوڑ پڑے اور کچھ دیر بعد شہر پر سناٹا طاری ہو گیا۔ رائے چند نیچے چلا گیا اور اپنے خاص کمرے میں جا بیٹھا۔ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ دو پنڈت آ گئے اور ان کے ساتھ ہی ایک اور آدمی کو اندر لایا گیا جس کے کپڑے بھیگے ہوئے تھے اور اُس کی سانسیں اُکھڑی ہوئی تھیں۔ رائے چند کو بتایا گیا کہ یہ آدمی دریا سے زندہ نکالا گیا ہے۔ لکڑی کے ایک شہتیر کے سہارے تیرتا آ رہا تھا۔ رائے چند نے اُسے کہا کہ وہ سب کو بتائے کہ جن لاشوں کے ساتھ وہ تیرتا آیا ہے وہ کن لوگوں کی ہیں اور کہاں سے آئی ہیں۔

"یہ مہابن کی فوج کی لاشیں ہیں" — اُس نے کہا — "اور میں مہابن کی فوج کا آدمی ہوں۔ ہمیں بتایا گیا کہ غزنی کی مسلمان فوج قلعوں پہ قلعے فتح کرتی آ رہی ہے اور اس کا رُخ متھرا کی طرف ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ مہابن کا جنگل کتنا گھنا اور کتنی دور دُور تک پھیلا ہوا ہے۔ ہمارے مہاراجہ گول چند نے تمام فوج اس جنگل میں پھیلا دی۔ تیر اندازوں کو درختوں پر چڑھا دیا۔ ہاتھیوں کو ایک طرف کھڑا کر دیا کہ حکم ملتے ہی مسلمانوں کو کچلنے کے لیے دوڑا دیئے جائیں گے۔ مسلمانوں کی فوج کو اسی جنگل سے گزرنا تھا۔ پھر میں آپ کو بتا نہیں سکتا کہ کیا ہوا۔ جنگل کے اندر مسلمانوں کی بہت تھوڑی سی فوج آئی۔ ہماری فوج نعرے لگانے لگی — 'ایک کو بھی نہ جانے دو.... ان کی لاشیں متھرا کے مندر کے سامنے جلائیں گے' — جنگل کی تین طرفوں سے جیسے طوفان آ گیا ہو۔ پیچھے سے، دائیں اور بائیں سے مسلمان ہم پر ٹوٹ پڑے۔ جن ہاتھیوں کو مسلمانوں پر چھوڑنا تھا، وہ چنگھاڑتے ادھر اُدھر دوڑ پڑے۔ درختوں پر ہمارے جو تیر انداز تھے وہ تیر کھا کھا کر گرنے لگے۔

اُن کے تیروں سے مسلمان بھی مرے لیکن وہ خود بھی زندہ نہ رہے۔ درختوں سے اُن کی لاشیں گر رہی تھیں.....

"ہماری فوج بھاگ اُٹھی۔ ہمارے پیچھے مسلمان جنگل کو صاف کرتے آ رہے تھے۔ ایسے لگتا تھا جیسے درخت جڑوں سے اُکھڑ رہے ہوں۔ آگے جمنا تھا۔ ہماری فوج جمنا میں کود گئی۔ زخمی بھی دریا میں اُتر گئے۔ مسلمان تیر انداز دریا کے کنارے سے ہم پر تیر برسانے لگے۔ وہ گھوڑے کنارے کے ساتھ ساتھ دوڑاتے اور ہم پر تیر چلاتے تھے۔ دریا میں چیخوں اور واویلے کے سوا کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔ تیروں سے بچنے کے لیے جو ڈبکی لگاتے تھے وہ ڈوب جاتے تھے۔ تیر اندازوں نے کسی کو دوسرے کنارے پر بھی نہ جانے دیا۔ میں ایک لکڑی کے تختے پر تیرتا آیا ہوں۔ بے شمار آدمی بہت دور آ کر بھی دریا سے نہ نکلے کہ مسلمان مار ڈالیں گے۔ یہاں آ کر میں نے باہر آنے کی جرأت کی۔ مجھے معلوم نہیں کہ مہابن میں ہمارے بعد کیا ہوا ہے۔"

"وہ میں بتاتا ہوں" ـــــ رائے چندا نے گرج کر کہا ـــــ "مجھے اطلاع مل چکی ہے۔ تمہارے راجہ کُول چند نے اپنی عورتوں اور بچوں کے ساتھ خودکشی کر لی ہے۔ اُس کے تمام ہاتھی مسلمانوں کے پاس ہیں، اور غزنی کے سلطان محمود نے متھرا کا بڑا مندر اور تمام چھوٹے مندر صاف کر دیئے ہیں۔ وہاں کے لوگ اب سنکھ اور گھڑیال نہیں اذانیں سنتے ہیں۔"

"ہرے رام۔ ہرے رام" ـــــ دونوں پنڈتوں نے کہا اور بڑا پنڈت بولا ـــــ "ان ملیچھ مسلمانوں پر ایسی آفت پڑے گی کہ ان کی بوٹیاں چیلیں، گدھ اور کتے کھائیں گے۔ کرشن واسدیو کا قہر ان کے بچوں کو بھی بھسم کر دے گا۔ مہاراج! ہر ہر مہادیو بہت بڑی قربانی مانگتے ہیں۔ اگر آپ قہر سے بچنا چاہتے ہیں تو ایک کنواری کی جان کی قربانی دینی پڑے گی۔ میں آپ کو حساب کر کے بتاؤں گا کہ اور کیا کچھ کرنا پڑے گا۔ آکاش پر ستاروں کی گردش کے راستے بدلے بدلے سے ہیں۔ یہ میں آپ کو ابھی بتا دیتا ہوں۔ یہ کچھ چندرماں کا ہے۔ مگھا، پوربا، پھالگنی، ہست، چترا، ستری نکھتر اس چندرماں جل بُرجوں سے گزر رہا ہے۔ یہ سمے راج پاٹھ کے لیے بہت بڑا

ہے۔ سُورگ کے دروازے کھل گئے ہیں۔ ملیچھ مکھیوں کی طرح مریں گے۔ آپ دیکھ رہے ہیں۔ اس میں ہری کرشن واسدیو کا کرودھ شامل ہو گیا ہے۔ یہ سمے پُن اور پراپتھا کا ہے.... ہم آپ کی جنم پتری پھر دیکھیں گے۔ اگر بلیدان میں دیر ہوئی تو ہندو دیویاں مسلمانوں کے بچے پیدا کریں گی۔ اپنی دیویوں کی کوکھ کو ملیچھوں کے بیج سے بچانے کے لیے اور انہیں پوتر رکھنے کے لیے ہمیں مہادیو کے چرنوں میں ایک سے زیادہ کنواریوں کا بلیدان دینا ہوگا۔"

رائے چندا کے چہرے کا رنگ بدلتا جا رہا تھا۔ اُس کی گھنی مونچھیں کانپنے لگی تھیں۔ وہ پنڈتوں کو قہر کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ پنڈت ابھی بول رہا تھا کہ رائے چندا پھٹ پڑا۔

"آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جو کچھ ہوگا مندر میں ہوگا" ـــــ رائے چندا نے گرج کر کہا ـــــ "دو تین کنواریاں آپ کے حوالے کر دی جائیں گی اور آپ انہیں دس پندرہ روز اپنے پاس رکھیں گے، پھر ان کی گردنیں کاٹ دیں گے۔ آپ یہ کیوں نہیں کہتے کہ بچہ بچہ باہر نکلے اور غزنی کے لٹیروں سے انتقام لے؟"

"چھی چھی چھی مہاراج!" پنڈت نے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ کر کہا ـــــ "یہ آپ کیا کہ رہے ہیں؟ دھرم کی یوں اپمان نہ کریں۔ یہ برہمنوں کا قلعہ ہے اور برہمن بھگوان کے بہت قریب ہوتے ہیں۔ جو ہم جانتے ہیں وہ آپ نہیں جانتے۔ آپ آکاش کے تاروں کے راستے نہیں روک سکتے۔ خون کا بلیدان...."

"بلیدان۔ بلیدان" ـــــ رائے چندا نے گرج کر کہا ـــــ "خون کی قربانی صرف دو تین کنواریاں نہیں دیں گی۔ راجپوتوں کا بچہ بچہ اپنے خون کی قربانی دے گا۔ راجپوتوں کی ہر ایک کنواری خون کی قربانی دے گی... اور یاد رکھو پنڈت جی مہاراج! اس قلعے کا نام برہمنوں کا قلعہ ہے لیکن یہ قلعہ راجپوتوں کا ہے۔ راجپوت ایک ہی بات سمجھتے ہیں... دشمن کی موت یا اپنی موت.... راجپوت اپنی فتح پر اپنے مذہب کو بھی قربان کر دیا کرتا ہے۔"

"مہاراج!" ـــــ پنڈت نے کہا ـــــ "اپنی رعایا پر رحم کریں۔ میں جو کہتا ہوں

سن لیں۔ مذہب کی قربانی کی بات نہ کریں۔"

"ہمیں مذہب کی زنجیریں نہ ڈالو" ___ رائے چندا نے کہا ___ "راجہ ھانی کی بے عزتی ہو رہی ہو، لوگ بھوکے مر رہے ہوں، دنیا فنا ہو رہی ہو۔ آپ جیسے مذہبی پیشوا اپنا ہی راگ الاپتے رہتے ہیں۔ آپ کو میدان میں جا کر لڑنا نہیں پڑتا۔ مندر میں بیٹھے آپ کی پیٹ پوجا ہوتی رہتی ہے۔ آپ کو مٹھی چاپی کے لیے کنواریاں بھی ملتی رہتی ہیں۔"

"مہاراج!" ___ پنڈت نے غصے سے کہا ___ "متھرا کی تباہی کی خبر سن کر اور دریا میں اتنی زیادہ لاشیں بہتی دیکھ کر آپ کا دماغ چل گیا ہے۔ آپ میری نہیں، اپنے دھرم کی بے عزتی کر رہے ہیں۔"

"کونسے دھرم کی بات کر رہے ہیں آپ؟" ___ رائے چندا نے طنزیہ کہا ___ "کیا آپ نے سُنا نہیں کہ بلند شہر کے دس ہزار ہندو اپنے راجہ ہردت سمیت دھرم پر لات مار کر مسلمان ہو گئے ہیں؟ کیا آپ جانتے ہیں انہوں نے اپنا دھرم کیوں چھوڑا ہے؟"

"اپنی جانیں بچانے کے لیے" ___ پنڈت نے کہا ___ "وہ بزدل تھے۔ مسلمانوں کی تلواروں سے اور قید سے ڈر گئے۔"

"نہیں" ___ رائے چندا نے کہا ___ "انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ دیوتاؤں کے بُت اور دیویوں کی مورتیاں نہ اپنے آپ کو بچا سکیں نہ کسی راجے کی پرجا کو۔"

وہاں رائے چندا کی جوان بہن شیلا کماری اور نوجوان بیٹی رادھا بھی موجود تھیں اور رادھا کی ماں بھی وہیں تھی۔ شیلا کماری نے پنڈت سے کہا ___ "کیا عورت مندر میں پنڈتوں کے ہاتھوں قربان ہونے کے لیے پیدا ہوئی ہے؟"

"اب کسی لڑکی کی جان کی قربانی نہیں دی جائے گی" ___ رائے چندا کی رانی لکشمی نے کہا ___ "اگر آپ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں نے جو تباہی مچائی ہے وہ دیوتاؤں کا قہر ہے تو ہم اس قہر کا مقابلہ کریں گے۔"

دونوں پنڈت غصے میں کچھ بڑبڑاتے چلے گئے۔

رائے چندا کی بہن شیلا نے اُسے کہا ___ "بھیا! کیا آپ نے کبھی سوچا ہے کہ غزنی کے سلطان محمود کو کسی طریقے سے قتل کر دیا جائے تو اس کے آئے دن کے حملے ختم ہو سکتے ہیں؟"

"ہمیں بہت کچھ سوچنا ہے میری بہن!" ___ رائے چندا نے کہا ___ "ہمارے امتحان کا وقت آ رہا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ محمود غزنوی کو جنگ میں قتل کرنا آسان نہیں اور اُسے دھوکے سے قتل کرنا بھی مشکل ہے۔ پھر بھی میں سوچوں گا۔ سب سے پہلے ہمیں مہاراج قنوج کے پاس چلنا ہے۔ غزنی کا یہ سلطان متھرا میں نہیں بیٹھا رہے گا نہ وہاں سے ہی واپس جائے گا۔"

اُس نے حکم دیا کہ قنوج کو روانگی کا انتظام کیا جائے۔

فاصلہ صرف ستائیس میل تھا۔ رائے چندا اپنی رانی لکشمی، بہن شیلا اور بیٹی رادھا کے ساتھ اُسی وقت روانہ ہو گیا۔ اُس کے ساتھ فوجی مشیر اور افسر بھی تھے اور وزیر بھی ساتھ تھا۔ یہ قافلہ شام تک قنوج پہنچ گیا۔

اُسی رات رائے چندا نے مہاراجہ قنوج راجیا پال سے صورتِ حال سے متعلق بات چیت کر لی۔ راجیا پال نے اُسے کہا ___ "ہم اکٹھے کھلے میدان میں نہیں لڑ سکتے۔ میرے پاس مہابن اور متھرا سے جو آدمی آئے ہیں، انہوں نے بتایا ہے کہ کھلے میدان میں غزنی والوں کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہمیں قلعہ بند ہو کے لڑنا پڑے گا۔ مجھے نظر یہ آ رہا ہے کہ محمود آپ کا محاصرہ کرے گا۔ اُس کی دراصل نظر قنوج پر ہے۔ اگر اس نے آپ کا محاصرہ کیا تو میں باہر سے محاصرے پر حملے کر کے اُسے کمزور کرنے کی کوشش کروں گا، اور اگر وہ سیدھا قنوج پر آیا تو میں آپ سے توقع رکھوں گا کہ آپ اُس کے عقب پر حملے کرتے رہیں گے۔"

منج کا رائے چندا بہت بھڑکا ہوا تھا۔ تقریباً تمام مؤرخوں نے لکھا ہے کہ منج کے راجپوت صحیح معنوں میں غیرت مند اور دلیر تھے۔ میدانِ جنگ میں ان پر قابو پانا آسان نہیں ہوتا تھا۔ ان کی عورتوں کے متعلق لکھا گیا ہے کہ بہت حسین اور غیر معمولی طور پر

جرأت مند تھیں اور یہ قوم برہمنوں سے بہت مختلف تھی۔ رائے چندرا کا پنڈتوں اور مذہب کو دھتکار دینا اُس کی حماقت نہیں بلکہ جرأت اور بے خوفی کی دلیل تھی۔

رائے چندرا کی بہن اور بیٹی کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ دونوں بہت ہی خوبصورت تھیں۔ اُن کے حسن کے چرچے دُور دُور تک ہوتے تھے۔ قنوج کے مہاراجہ راجیا پال کا بیٹا لکھمن پال رائے چندرا کی بہن شیلا کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا مگر رائے چندرا نے شیلا کی شادی لاہور کے مہاراجہ بھیم پال نڈر کے بھائی ترلوچن پال کے ساتھ کرنے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ اگر محمود غزنوی حملہ نہ کر دیتا تو یہ شادی ہو چکی ہوتی۔

رات کو جس وقت مہاراجہ راجیا پال اور رائے چندرا متھرا کی تباہی اور محمود غزنوی کے متوقع حملے کی باتیں کر رہے تھے اور اُن کے مشیر اور وزیر مقابلے کے منصوبے بنا رہے تھے، اُس وقت راجیا پال کا بیٹا لکھمن پال محل کے باغ کے اندھیرے کونے میں کھڑا کسی کا انتظار کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد دو عورتیں اس اندھیرے کونے کی طرف اس طرح جا رہی تھیں جیسے سائے چل رہے ہوں۔ ذرا آگے جا کر سائے رُک گئے۔ ایک عورت نے دوسری سے کہا۔ "آپ آگے چلی جائیں۔ راجکمار مل جائیں گے۔"

دوسری نے اُس کے ہاتھ میں سونے کا ایک سکہ دیتے ہوئے کہا۔ "کسی کو پتہ نہ چلے کہ میں یہاں آئی اور راجکمار لکھمن سے ملی تھی۔"

وہ رائے چندرا کی بہن شیلا تھی۔ لکھمن پال نے اپنی خاص ملازمہ کو بھیج کر شیلا کو ایک تاریک گوشے میں بلایا تھا۔

شیلا اپنی ماں اور بھتیجی رادھا کو بتلائے بغیر محل آئی تھی۔ یہ سب رائے چندرا کے ساتھ قنوج آئی تھیں۔

اُسے دیکھ کر لکھمن پال آگے بڑھا اور بولا۔ "مجھے اُمید نہیں تھی کہ تم آ جاؤ گی۔ میں یہاں سے تمہیں منج پیغام بھیجتا رہا ہوں اور تم ہر بار یہی جواب دیتی رہی ہو کہ تمہیں میری محبت قبول نہیں۔ مجھ میں کیا کمی ہے؟ کیا میں تمہارے قابل نہیں؟

میں جانتا ہوں تمہاری شادی مہاراجہ بھیم پال کے چھوٹے بھائی سے ہو رہی ہے۔ کیا تم یہ فیصلہ بدل نہیں سکتیں؟ کیا تمہیں وہی راجکمار پسند ہے؟"

"تم خوبصورت جوان ہو لکھمن!" ۔۔۔ شیلا نے کہا۔ "میرا اپنا کوئی فیصلہ نہیں لیکن اب میں سمجھنے لگی ہوں کہ تم میرے قابل نہیں۔ اُدھر غزنی کے مسلمان ہم پر طوفان کی طرح آ رہے ہیں، متھرا اور مہابن کی تباہی کو میں نے جمنا میں بہتی ہوئی ہزاروں لاشوں کی صورت میں دیکھا ہے۔ متھرا کے مندروں میں مسلمان اذانیں دے رہے ہیں، وہ ہری کرشن واسدیو کا بُت اُٹھا لے گئے ہیں، بلند شہر کے دس ہزار ہندو مسلمان ہو چکے ہیں اور تم مجھے حاصل کرنے کی فکر میں ہو۔ کیا تم میں غیرت نہیں! اب مسلمان قنوج اور منج کو فتح کرنے آ رہے ہیں۔"

"مجھ میں سب کچھ ہے۔" لکھمن پال نے کہا۔ "مگر تمہاری محبت نے مجھے پاگل کر رکھا ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم شادی کا فیصلہ بدل سکتی ہو اور میرے ساتھ شادی کر سکتی ہو۔"

"میں کسی کو نہیں چاہتی۔" ۔۔۔ شیلا نے کہا۔ "نہ مہاراجہ بھیم پال کے بھائی کو نہ تمہیں۔ میں اُسی کو چاہنے لگوں گی جس کے ساتھ میری شادی ہو جائے گی ..... لکھمن پال! میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ تمہیں میرے ساتھ محبت نہیں۔ تم میرا حسن اور میرا جسم چاہتے ہو۔ چند برسوں بعد جب میرے چہرے پر نوجوانی کے آثار مدھم پڑنے لگیں گے تو تم ایک اور نوجوان لڑکی لے آؤ گے۔ تمہارے باپ نے اس عمر میں میری عمر کی چمپا رانی سے شادی کی تھی۔ کہاں ہے چمپا رانی؟ متھرا کے قلعے میں غزنی کے ایک جاسوس کے ساتھ بھاگتے ہوئے ماری گئی۔ تم اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چلو گے۔ مجھے تم سے محبت نہیں۔"

"پھر میرے بلانے پر کیوں آ گئی ہو؟" لکھمن پال نے پوچھا۔

"ایک شرط لے کر آئی ہوں" ۔۔۔ شیلا نے کہا۔ "اگر پوری کر دو تو تمہاری بیوی بن جاؤں گی۔ اگر میرا بھائی نہیں مانے گا تو وعدہ کرتی ہوں کہ تمہارے پاس آ جاؤں گی۔"

"فوراً بتاؤ" بھیمن پال نے خوش ہو کر کہا۔ "جو کہو گی کر دکھاؤں گا۔"

"غزنی کے سلطان کو متھرا میں قتل کرنا ہے۔" شیلا نے کہا۔

"متھرا میں کیوں؟" بھیمن پال نے کہا۔ "میں اُسے میدان میں قتل کروں گا۔ اُس کا سر کاٹ کر تمہارے قدموں میں لا رکھوں گا۔"

"بھیمن!" شیلا نے سنجیدگی سے کہا۔ "تم متھرا کی ایک راجپوت لڑکی کے ساتھ باتیں کر رہے ہو۔ مجھے بھیا نے بتایا ہے کہ متھرا کے مندر میں تمام راجوں مہاراجوں نے واسدیو کے قدموں میں بیٹھ کر قسمیں کھائی تھیں کہ محمود کا سر اس بُت کے قدموں میں رکھیں گے اور اس کے خون سے کرشن مہاراج کے پاؤں دھوئیں گے۔ کہاں ہیں وہ راجے اور مہاراجے؟ سب بھاگ گئے اور بلند شہر کے راجے ہردت نے اپنی دس ہزار فوج کی تلواریں محمود کے قدموں میں رکھ کر اُس کا مذہب قبول کر لیا۔ ہمارے ہری کرشن واسدیو کے قدموں تلے سے وہ چبوترا نکل گیا ہے جس پر اُسے پنڈتوں نے کھڑا کیا تھا۔"

"یہ مسلمان لٹیرے ہیں۔" بھیمن پال نے کہا۔ "انہیں سونا مندروں سے ملتا ہے، اس لیے مندر اُجاڑ جاتے ہیں۔"

"بھیمن! ہوش میں آؤ" — شیلا نے کہا۔ "بھارت ماتا کی عزت کے محافظ صرف راجپوت ہیں اور میں ایک راجپوت کی بیٹی ہوں۔ میرے بھائی نے مجھے جس استاد کے حوالے کیا تھا وہ بہت دانشمند بزرگ ہے۔ میں نے پہلے پہل جب غزنی کے حملوں کے متعلق سنا تھا تو اپنے استاد سے کہا تھا کہ لوگ کہتے ہیں کہ مسلمان لٹیرے ہیں اور لوٹنے آتے ہیں۔ میں نے اب متھرا کی تباہی کی خبر سنی تو بھی اس سے پوچھا تھا کہ مسلمان صرف لوٹنے آئے ہیں یا ہمارے علاقوں پر قبضہ کر لیں گے؟ .... اُس نے مجھے بتایا ہے کہ محمود غزنوی لٹیرا نہیں۔ وہ ہمارے مذہب کو ختم کرنے اور اپنا مذہب پھیلانے آیا ہے۔ استاد نے کہا ہے کہ لٹیرے کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ اگر محمود کو مذہب کی بجائے دولت سے دلچسپی ہوتی تو راجہ ہردت اپنی فوج کے ساتھ اُس کا مذہب قبول نہ کرتا ....

"اور میں نے استاد سے پوچھا تھا کہ مسلمان عورتیں کیسی ہوتی ہیں؟ کیا وہ ہندو راجپوتوں کی عورتوں کی طرح دلیر ہوتی ہیں؟ استاد نے بتایا ہے کہ وطن سے اتنی دُور آ کر لڑنے اور فتح پانے والے سپاہیوں کی مائیں یقیناً دلیر ہوتی ہیں۔ مسلمان عورتیں غیر مسلموں کے خلاف جنگ میں اپنے بیٹوں کو بھیج کر فخر کرتی ہیں ..... بھیمن! تم جنہیں لٹیرا کہہ رہے ہو وہ کسی معمولی قوم کے لوگ نہیں۔ میں ان کا مقابلہ کرنا چاہتی ہوں۔ میں اپنی قوم کو بتانا چاہتی ہوں کہ ہندو راجپوت عورت مسلمان عورت سے زیادہ دلیر ہوتی ہے۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ تم نہیں مانو گے تو میں فوج کے کسی سپاہی کو ساتھ لے لوں گی اور محمود غزنوی کو قتل کروں گی۔ اگر میں زندہ رہی تو اپنا آپ ہمیشہ کے لیے اس سپاہی کے حوالے کر دوں گی ... کہو، تم محمود کو قتل کرو گے؟"

"تمہاری خاطر تمہاری شرط پوری کروں گا۔"

"میری خاطر نہیں" — شیلا نے کہا — "اپنے دھرم اور اپنے دیس کی خاطر .... اگر پیٹھ دکھا جاؤ گے تو میں، میری بھتیجی رادھا اور تمہاری بہنیں مسلمانوں کے خیموں میں ہوں گی اور وہ مسلمان بچوں کو جنم دیں گی۔"

"میں محمود کو قتل کروں گا۔"

"متھرا میں" — شیلا نے کہا — "وہ مر گیا تو اُس کی فوج بیکار ہو جائے گی۔ وہ متھرا سے آگے نہ آئے۔ تم برہمن ہو۔ برہمن کو اپنے مذہب کا زیادہ خیال ہوتا ہے۔ میری رگوں میں راجپوت کا خون ہے۔ میں تمہیں صاف بتا دیتی ہوں کہ میرے دل میں تمہاری وہ محبت نہیں جو تم اپنے دل میں بٹھائے ہوئے ہو لیکن میں وعدہ کرتی ہوں کہ محمود کو قتل کر دو تو ساری عمر تمہاری غلام رہوں گی۔"

"اور اگر میں مارا گیا؟"

"تو تمہاری چتا پر کھڑی ہو کر زندہ جل جاؤں گی۔"

بھیمن اور شیلا دربان کے روکنے کے باوجود اُس کمرے میں داخل ہو گئے جس میں قنوج کا راجیا پال اور متھرا کا راجہ چندا اپنے مشیروں، وزیروں اور فوج کے اعلیٰ افسروں کے ساتھ بیٹھے

محمود غزنوی کو ہندوستان سے نکالنے کے منصوبے تیار کر رہے تھے۔ راجپاپال نے دونوں کو دیکھ کر کہا کہ وہ چلے جائیں۔

"ہم اسی کام کے لیے آئے ہیں جس پر آپ غور کر رہے ہیں"۔ بھیمن پال نے کہا ——— "بدتمیزی کی معافی چاہتا ہوں۔ آپ نے جو کچھ بھی سوچا ہے اسے ذرا الگ رکھ دیں۔ ... کیا آپ نے یہ سوچا ہے کہ غزنی کے سلطان کو متھرا میں قتل کیا جا سکتا ہے؟ اس کے قتل سے اس کی ساری فوج آپ کی قیدی ہوگی"۔

سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ راجپاپال کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

"ہم نے ابھی یہ نہیں سوچا"۔ رائے چندا نے کہا ——— "اس کام کے لیے بہت دلیر اور بڑے ہی عقلمند آدمیوں کی ضرورت ہے"۔

"اور ایسے آدمیوں کی ضرورت ہے جو محمود غزنوی کو اپنا ذاتی دشمن سمجھیں"۔ ——— بھیمن پال نے کہا۔ "کرائے کے قاتل یہ کام نہیں کر سکیں گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کرائے کے قاتل وہاں جا کر مسلمانوں سے انعام و اکرام لے لیں اور انہی کے ہو کے رہ جائیں۔ یہ کام کوئی راجکمار کر سکتا ہے"۔

"ایسا راجکمار کون ہو سکتا ہے؟" راجپاپال نے پوچھا۔

"وہ آپ کے سامنے کھڑا ہے"۔ بھیمن پال نے کہا۔ "وہ میں ہوں ... بھیمن پال"۔

رائے چندا نے مہاراجہ راجپاپال کے کندھے پر ہاتھ مار کر بھیمن پال سے کہا۔ "راجکمار! تم نے اپنے باپ کا سر فخر سے اونچا کر دیا ہے۔ اگر میرا کوئی بیٹا ہوتا تو میں اسے تمہارے ساتھ بھیجتا"۔

"ہاں بھیمن!" ——— اس کے باپ راجپاپال نے کہا ——— "اگر تم یہ کام کر سکو تو غزنی کا سب کچھ مر جائے گا اور ہماری فوج کی لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے گی"۔

"کیا آپ اس کام کو آسان سمجھتے ہیں؟" ——— ایک بوڑھے فوجی مشیر نے کہا۔ "کیا آپ اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ یہ لڑکا متھرا جائے گا اور غزنی کے سلطان کے دل میں خنجر اتار کر اسی طرح واپس آ جائے گا جس طرح یہ اب کھڑا ہے؟"

"میں بھارت ماتا پر اپنی جان قربان کرنے کا عہد کر چکا ہوں"۔ ——— بھیمن پال نے کہا۔

"اور غزنی کا سلطان یہ عہد کر کے آیا ہے کہ یہاں کسی مندر کو اور کسی مہاراجے کی راجدھانی کو سلامت نہیں رہنے دے گا"۔ بوڑھے مشیر نے کہا۔ "ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ محمود غزنوی کے بازو بڑے لمبے ہیں۔ ہماری کوئی بات اور کوئی حرکت اس سے پوشیدہ نہیں۔ آپ نے دیکھ لیا ہے کہ جس محافظ کو ہم اپنا سب سے زیادہ قابلِ اعتماد سمجھتے رہے ہیں اور جو راج محل کے ان رازوں سے بھی واقف تھا جن سے راجکمار بھی واقف نہیں ہوتے، وہ غزنی کا جاسوس تھا"۔

"اس کے باوجود میں اسے قتل کرنے جاؤں گا"۔ بھیمن نے کہا۔ "مجھے ایسے کام کا کوئی تجربہ نہیں۔ مجھے بتا دیں کہ ایسے کام کس طرح کیے جاتے ہیں"۔

اس کے باپ مہاراجہ راجپاپال نے اس بوڑھے فوجی اور اپنے وزیر سے کہا کہ وہ بھیمن کو محمود غزنوی کے قتل کے لیے تیار کریں۔ اس نے کہا۔ "میں اپنے بیٹے کو اپنے دھرم اور دھرتی پر قربان کرتا ہوں"۔

"سب سے پہلے ذہن سے یہ خیال نکال دو کہ تمہارا مقابلہ ڈاکوؤں اور لٹیروں کے ساتھ ہے"۔ ——— دوسرے دن دو تجربہ کار بوڑھے بھیمن پال کو بتا رہے تھے۔ "محمود غزنوی صحیح معنوں میں جنگجو ہے اور اس کے سامنے جنگ کا ایک مقصد ہے۔ وہ اپنے ساتھ اپنا مذہب لایا ہے۔ اسے میدان میں شکست دینا آسان نہیں۔ اس کی عقل تک ہمارے مہاراجے نہیں پہنچ سکتے ... اور اس تک اس طرح نہیں پہنچ سکتے کہ اسے جا ملو اور قتل کر دو۔ صرف ایک بات یاد رکھو۔ مذہب کا کوئی کتنا ہی پابند کیوں نہ ہو، وہ ہوتا انسان ہے اور انسان کی سب سے بڑی کمزوری عورت ہے اور عورت کی سب سے بڑی کمزوری مرد ہے۔ تم ایک بہروپ میں متھرا جاؤ گے ...

"بہروپ یہ ہوگا کہ تم قنوج کے جنگلوں میں بسنے والے ایک قبیلے کے سردار ہو۔ قبیلہ جنگجو ہے اور اس کی تعداد پندرہ ہزار سے زیادہ ہے۔ تم کہو گے کہ مہاراجہ قنوج نے اس قبیلے کو غزنی کی فوج کے خلاف لڑنے کے لیے تیار کر لیا ہے مگر تم جو اس قبیلے کے سردار ہو، مسلمانوں کے خلاف نہیں لڑنا چاہتے۔ اس کی بجائے تم راجہ بردت کی طرح اپنے تمام قبیلے سمیت مسلمان ہونا چاہتے ہو۔ یاد رکھو راجکمار! تمہیں سلطان محمود تک کوئی

نہیں جانے دے گا۔ تم کہو گے کہ ایک دو راز کی باتیں ہیں جو تم صرف سلطان کو بتانا چاہتے ہو۔ اس کے باوجود تمہیں سلطان سے نہ ملنے دیں تو کہنا سلطان خفیہ طریقے سے قتل ہو جائے گا۔ مجھے اُمید ہے کہ وہ ملاقات کی اجازت دے دیں گے۔"

"آپ نے عورت کا ذکر کیا تھا" بھیمن پال نے کہا ۔۔۔ "اس سے آپ کا مطلب کیا ہے؟"

"تمہارے ساتھ کم از کم دو نہایت خوبصورت اور جوان عورتیں ہونی چاہئیں" ۔۔۔ استاد نے کہا ۔۔۔ "انہیں بیٹیاں ظاہر کرو گے" ۔۔۔ اُس نے رازداری سے کہا ۔۔۔ "اگر یہ عورتیں عقل مند ہوں تو سلطان کی فوج کے سالاروں کو ایک دوسرے کا دشمن بنا سکتی ہیں۔ مجھے یہ بھی توقع ہے کہ سلطان بھی ان عورتوں پر فریفتہ ہو جائے گا۔ اگر وہ انہیں اپنے ساتھ رکھنے کو کہے تو مان جانا۔ ان کے پاس زہر ہونا چاہیئے جو وہ اُسے شربت یا شراب میں پلا سکتی ہیں۔ ہم تمہیں ایسی دو جوان لڑکیاں دے دیں گے۔ تمہیں جنگلی قبیلے کے سرداروں جیسا لباس پہنائیں گے۔"

فوجی مشیر اور وزیر نے جو جاسوسی اور جنگ کا تجربہ رکھتا تھا بھیمن پال کو عملی تربیت دینی شروع کر دی کہ وہ محمود غزنوی کو کس طرح قتل کرے گا اور وہاں سے کس طرح نکلے گا۔

"ایک عورت میں خود ہوں گی اور دوسری میری بھتیجی رادھا ہو گی" ۔۔۔ راجے چندا کی بہن شیلا بھیمن پال سے کہہ رہی تھی۔ بھیمن پال اُسے رات کو ملا تھا اور اُسے بتایا تھا کہ اُس کے استادوں نے اُسے کس طرح تیار کیا ہے اور کہا ہے کہ دو جوان اور خوبصورت عورتوں کا ہونا لازمی ہے۔ شیلا نے رادھا کو بھی بلا لیا اور اُسے بتایا کہ وہ کیا فیصلہ کر چکی ہے اور بھیمن پال کس کام کے لیے جا رہا ہے۔ رادھا نے فوراً رضامندی کا اظہار کر دیا۔ تینوں راجے چندا کے پاس چلے گئے ۔۔۔۔ وہ کچھ ہچکچایا۔

"یہاں لڑکیوں کو مندروں میں قربان کر دیا جاتا ہے" ۔۔۔ رادھا نے کہا۔ "آپ

خود کہتے ہیں کہ انسانی قربانی سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔ ہم دونوں جو قربانی دینے جا رہی ہیں، اس سے آپ کو بہت کچھ حاصل ہو گا۔ اگر بھیمن پال کے ساتھ کوئی اور عورتیں گئیں تو وہ اسے دھوکہ دے سکتی ہیں۔"

شیلا اور رادھا کا حُسن اور ان کے جسموں کی دلکشی سارے علاقے میں مشہور تھی۔ ان کی بہادری پر بھی کسی کو شک نہیں تھا۔ ان میں عقل بھی تھی اور وہ محمود غزنوی کے قتل کو اپنا ذاتی فرض سمجھتی تھیں۔ دونوں نے اپنے باپ اور بھیمن پال کو مجبور کیا کہ وہ اُس کے ساتھ چلی جائیں۔

ان سب کے لیے ایسے جنگلی قبیلے کا لباس تیار کیا گیا جس کا کوئی وجود نہیں تھا۔ ان کے ساتھ دو قابلِ اعتماد اور دلیر فوجیوں کو ان کے نوکروں اور محافظوں کے لباس میں تیار کیا گیا۔ شیلا اور رادھا کو ایسا لباس پہنایا گیا جس میں اُن کی ٹانگیں گھٹنوں کے اوپر تک اور کندھے اور سینے اور پیٹ کا کچھ حصہ اور بازو ننگے تھے۔ اُن کے بال کھول دیئے گئے۔ اس لباس میں اُن کا جسمانی حسن اور دلکشی ایسی نکھری کے دیکھنے والے اُن سے نظریں نہیں ہٹا سکتے تھے۔ بھیمن پال بھی جنگلی لباس میں نیم عریاں تھا۔ اُس کا گورا جسم تنومند اور بہت خوبصورت لگتا تھا۔

انہیں محمود غزنوی کو دینے کے لیے جو تحفے دیئے گئے ان میں دو انسانی کھوپڑیاں، دو چیتوں کی کھالیں، اس علاقے کے دو زندہ ہرن اور سونے کا ایک چھوٹا سا بُت تھا جس کا اوپر کا دھڑ انسان کا اور باقی دھڑ گھوڑے کا تھا۔ اس کے متعلق انہیں سلطان محمود کو یہ بتانا تھا کہ وہ اس بُت کی پوجا کیا کرتے ہیں مگر اب مسلمان ہونا چاہتے ہیں۔

رات کو یہ قافلہ گھوڑوں پر سوار ہو کر قنوج سے نکلا۔ انہیں مہابن کے جنگل کے قریب جا کر دریائے جمنا پار کرنا تھا جو قنوج سے تقریباً ایک سو پچیس میل دور تھا۔ اُن کے کھانے پینے کا سامان دو خچروں پر لدا ہوا تھا۔ انہیں مہابن کے جنگل میں سے گذر کر متھرا تک پہنچنا تھا۔

سلطان محمود غزنوی ابھی متھرا میں تھا۔ یہ جگہ اُسے بہت ہی اچھی لگی تھی۔ متھرا مندروں کا شہر تھا۔ مسلمان سپاہی مندروں کو آگ لگا رہے تھے۔ بڑے مندر کے صحن میں جو ہندوؤں کے کرشن مہاراج کی جائے پیدائش تھا، فوجی نماز باجماعت پڑھتے تھے۔ وہاں کے ہندو ایسے گئے گذرے بھی نہیں تھے کہ اپنے مذہب اور دیوتاؤں کی توہین برداشت کر لیتے۔ انہوں نے غزنی کے چند ایک فوجیوں کو دھوکہ دے کر قتل کر دیا تھا اور تخریبی کاروائیاں بھی کی تھیں۔ سلطان محمود نے حکم دے دیا تھا کہ شہر کو کھنڈر بنا دیا جائے اور انسانی سانپوں کو زندہ رہنے کے قابل نہ رہنے دیا جائے۔ چنانچہ شہر جل رہا تھا اور محمود غزنوی اپنی فوج کو قنوج کی طرف پیشقدمی کے لیے تیار کر رہا تھا۔ اس کے سامنے فوج کا خطیب اور بڑے دستوں (ڈویژنوں) کے امام جو غزنی سے ہمیشہ فوج کے ساتھ آیا کرتے تھے، بیٹھے تھے اور ان کے ساتھ اُس کے سالار، نائب سالار اور کماندار بھی تھے۔

"ہم قنوج کی طرف پیشقدمی کرنے والے ہیں" — سلطان محمود غزنوی نے کہا —— "آپ کو اس علاقے کا نقشہ دکھانے اور اپنا منصوبہ بتانے سے پہلے کچھ اہم باتیں کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ میں اتنی بڑی فوج کو اکٹھا کر کے خطاب نہیں کر سکتا۔ آپ سب اپنے سپاہیوں تک میرا پیغام لفظ بلفظ پہنچا دیں۔ خطیب اور امام نماز کے بعد سب کو میرا پیغام سنائیں۔ انہیں بتائیں کہ یہ جنگ میری نہیں، ان کی ذاتی نہیں، یہ خدا اور رسولؐ کی جنگ ہے۔ ہم یہاں کفر کے اُس فتنے کو ختم کرنے آئے ہیں جس کے متعلق خدا کا حکم ہے کہ اُس وقت تک لڑو جب تک کفر کا فتنہ ختم نہیں ہو جاتا۔ اگر میں ہندوستان میں بار بار نہ آتا تو یہ ہندو غزنی کو فتح کر کے خانہ کعبہ کی طرف بڑھ رہے ہوتے۔ اُدھر یہودیوں اور عیسائیوں کا فتنہ ہے۔ ہم ایک طرف توجہ دے سکتے ہیں۔ میں نے ہندوستان کے بُت خانے کو ہمیشہ کے لیے ختم کر کے اسے دارالاسلام بنانے کا تہیہ کر رکھا ہے....

مجھے اپنی سلطنت کی توسیع کا کوئی لالچ نہیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ میں نے لاہور کے مہاراجوں کو کتنی بار شکست دی ہے مگر اس خطے کو اپنی سلطنت میں شامل نہیں کیا....

"ساری فوج سے کہہ دو کہ ہم وطن سے دُور صرف خدائے ذوالجلال کے بھروسے

پر آ سکتے ہیں اور خدا صرف اس لیے ہماری مدد کر رہا ہے کہ ہم اُس کا عظیم پیغام اور ایمان ساتھ لائے ہیں۔ اگر مجھے دولت اور زر و جواہرات کا لالچ ہوتا تو میں بار بار یہاں نہ آتا۔ ایک ہی بار لوٹ مار کر کے غزنی میں تخت پر بیٹھ کر عیش کرتا مگر میں ہر بار یہاں خودکشی کرنے آتا ہوں، ہر بار توقع ہوتی ہے کہ زندہ واپس نہیں جا سکوں گا لیکن خدا مجھے ہر بار نئی زندگی عطا کرتا ہے۔ یہ ثبوت ہے کہ خدا مجھ سے ہی اس عظیم مقصد کی تکمیل کرانا چاہتا ہے جس کے لیے ہم ہندوستان میں آتے ہیں۔ اب مجھے پتہ چلا ہے کہ قنوج میں مجھے قتل کرنے کے منصوبے بن رہے ہیں۔ میں کسی بھی وقت، کسی بھی جگہ، اس کمرے میں بیٹھے بیٹھے قتل ہو سکتا ہوں لیکن مجھے اپنے اللہ پر بھروسہ ہے۔ میرے اندر سے آواز آ رہی ہے کہ میں قتل نہیں ہوں گا۔ یہ آواز خدا کی ہے....

"ساری فوج کو ایک بار پھر بتا دو کہ جہاد نماز سے افضل ہے۔ اسلام کا یہ نظریہ یاد رکھو کہ تم نماز پڑھ رہے ہو اور تمہارے سامنے سانپ آ جائے تو نماز چھوڑ دو اور سانپ کو مار دو۔ میں آپ کو نماز چھوڑنے کا مشورہ نہیں دے رہا۔ میں کہہ رہا ہوں کہ کوئی مسلمان یہ سمجھتا ہے کہ وہ صرف نماز سے خدا کی خوشنودی حاصل کر لے گا تو وہ خوش فہمی میں مبتلا ہے۔ جب تک آپ اس سانپ کو نہیں ماریں گے جس کا نام ہندو ہے، آپ خدا کی خوشنودی حاصل نہیں کر سکیں گے۔ میں آپ کو آج بتا دیتا ہوں کہ اس ملک میں اگر ہندوؤں کو بالادستی حاصل رہی تو وہ مسلمانوں کے لیے زندگی جہنم بنائے رکھیں گے۔ یہ ملک مسلمانوں کی قتل گاہ بنا رہے گا۔ سپاہیوں کو بتائیں کہ تمہیں اپنے ان ساتھیوں کے خون کا خراج ادا کرنا ہے جو یہاں شہید ہوتے ہیں اور ان کی لاشیں اپنے وطن واپس نہیں جا سکیں گی....

"میں اپنی فوج کو خبردار کرنا چاہتا ہوں کہ ہندوستان کا یہ خطہ جہاں ہم بیٹھے ہیں بڑا ہی دلفریب ہے۔ یہاں کے لوگ بھی حسین اور دلفریب ہیں۔ میں خود اس علاقے سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ گنگا اور جمنا نے مل کر اس خطے کو جو حسن اور دلکشی بخشی ہے، یہ انسانوں کو مسحور کر لیتی ہے۔ تم نے یہاں کی عورتیں دیکھی ہیں۔ میں ان کے حسن میں خطرے دیکھ رہا ہوں کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمارا کوئی عسکری اس جادو کا شکار ہو جائے۔ اپنے

اور عورت کا سحر طاری کرنے والے کو کبھی فتح نصیب نہیں ہوتی۔ ہر فوجی کو، خواہ وہ سالار ہے یا سپاہی، خبردار کردو کہ کسی نے خدا کے احکام کی خلاف ورزی کی تو میں اُسے فوراً خدا کے پاس پہنچا دوں گا تاکہ وہ دوزخ کی آگ میں جلے۔ میرے پاس ایسے آدمی کے لیے سزائے موت سے کم کوئی سزا نہیں۔"

سلطان محمود نے خطیب اور اماموں کو رخصت کردیا اور سالاروں اور دیگر کمانداروں کے سامنے متھرا سے قنوج تک کا نقشہ پھیلا کر بتلانے لگا کہ پیشقدمی کا راستہ کون سا ہوگا۔ اُسے جاسوسوں نے مکمل معلومات دے دی تھیں۔ جاسوسوں کے علاوہ اُس کے اپنے کماندار بھیس بدل کر قنوج تک ہو آئے تھے۔

"راستے میں منج کا قلعہ آئے گا" سلطان محمود نے کہا۔ "یہ راجپوتوں کا شہر ہے اور یہ راجپوت بہت دلیر ہیں۔ لڑنے میں ہندوستان کی کوئی قوم ان کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ ہمیں سب سے پہلے انہیں ختم کرنا ہے، ورنہ یہ ہمیں اُس وقت پریشان کریں گے جب ہم قنوج کو محاصرے میں لے لیں گے۔ ... جاسوسوں نے تصدیق کردی ہے کہ لاہور کا مہاراجہ بھیم پال نڈر اسی علاقے میں کہیں موجود ہے اور وہ یہاں کے چھوٹے بڑے راجوں مہاراجوں کو میرے خلاف متحد کرتا پھر رہا ہے۔ اُس کے بھائی بھی اُس کے ساتھ ہیں۔ بھیم پال کو زندہ پکڑنا ہے۔ کچھ اس قسم کی اطلاع بھی ملی ہے کہ اُس کی فوج بھی ادھر آرہی ہے۔ ہمیں ہوشیار اور چوکنا رہنا پڑے گا۔"

سلطان محمود نے ساتویں روز متھرا سے کوچ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اُس نے کمک کے لیے کچھ دستے متھرا میں رہنے دیئے اور جنگ میں نام پیدا کرنے والے دستوں کو اپنے ساتھ چلنے کے لیے تیار رہنے کا حکم دیا۔

یہ طلوعِ آفتاب کا وقت تھا۔ سورج اُبھر آرہا تھا۔ مہاراجہ راجیاپال کا بیٹا لکھمن پال ایک خیالی جنگل قبیلے کے سردار کے بھیس میں، شیلا، رادھا اور دو مددگار نوجوانوں کے ساتھ جمنا کے جنگل کے سامنے والے کنارے تک پہنچ چکا تھا۔ وہ تیسری رات یہاں پہنچے اور رات یہاں ہی گزاری تھی۔ دسمبر جنوری کے دن تھے۔ سردی سخت تھی۔ ان

ان کی خوش قسمتی تھی کہ وہ رات کو یہاں پہنچے تھے اور دیکھ نہیں سکتے تھے کہ یہ دریا کا ایسا کنارہ ہے جو ایک جگہ سے اتنا اندر کو آگیا ہے کہ جھیل بنا ہوا ہے اور یہ جھیل مگرمچھوں کا مسکن ہے۔ اگر سردی اتنی زیادہ نہ ہوتی تو مگرمچھ انہیں زندہ نہ رہنے دیتے۔

یہاں قریب کہیں سے انہیں دریائے جمنا پار کرنا تھا۔ لکھمن پال اور شیلا جاگ اُٹھے۔ رادھا اور اُن کے دو ساتھی جو تجربہ کار اور دلیر فوجی تھے، ابھی گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ لکھمن پال نے شیلا سے کہا کہ وہ اکیلا کچھ دور آگے جائے گا۔ اُسے بتایا گیا تھا کہ دریا پر کشتی ران مل جاتے ہیں جو اُجرت پر دریا پار کرا دیتے ہیں۔ وہ چلا تو شیلا بھی کچھ دور تک اُس کے ساتھ چل پڑی۔ یہ علاقہ گھنا جنگل تھا۔ جھاڑیاں بھی تھیں۔ رات کو وہ یہ علاقہ نہیں دیکھ سکے تھے۔ اب سورج طلوع ہو چکا تھا۔ انہیں سوائے درختوں، جھاڑیوں اور کہیں کہیں ٹیلوں ٹیکریوں کے کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ دونوں چپ چاپ جا رہے تھے۔

"تم اتنے خاموش کیوں ہو لکھمن؟" — شیلا نے رُک کر پوچھا۔ "ایسی خاموشی خوف کی علامت ہوتی ہے۔"

"خوف نہیں شیلا!" — لکھمن بھی رُک گیا اور شیلا کو سر سے پاؤں تک دیکھ کر بولا — "میں کچھ سوچ رہا ہوں ... تم بہت ہی خوبصورت ہو۔ تمہیں احساس نہیں کہ اس جنگلی لباس میں تم کتنی زیادہ خوبصورت لگ رہی ہو۔ میرے استاد نے ایک بار مجھے کہا تھا کہ انسان اپنے قدرتی رنگ میں رہے تو اُس کی صحت اور اُس کے چہرے کی رونق بڑھاپے میں بھی ماند نہیں پڑتی۔ جی میں آتی ہے ہم اسی حلیے اور اسی بھیس میں خون خرابے کی دُنیا سے دور اسی جنگل میں رہیں ... میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ تمہارے بال اس قدر ریشمی اور اتنے دلکش ہیں۔ میں تمہاری کس کس چیز کی تعریف کروں۔"

شیلا پر جیسے کچھ اثر ہی نہ ہوا ہو۔ وہ اُسے چپ چاپ دیکھتی رہی۔ لکھمن پر جیسے نشہ طاری ہوگیا ہو۔ وہ شیلا کی طرف بڑھا اور بازو یوں پھیلا دیئے جیسے حسن کے اس شاہکار کو بازوؤں میں سمیٹ لینا چاہتا ہو مگر شیلا پیچھے ہٹ گئی۔

"ہوش میں آؤ لکھمن!" — شیلا نے دھیمی مگر پُرعزم آواز میں کہا — "جاگو۔ یاد کرو ہم ادھر کیوں آئے ہیں۔ اپنی مردانگی اور جرأت پر عورت کے حسن اور جسم کو غالب نہ آنے دو۔ یہ موت ہے

کھیلنے آئے ہیں۔"

"میں ہوش میں ہوں راجکماری!" لکھمن نے کہا۔ "جانتا ہوں کہ ہم موت سے کھیلنے آئے ہیں مگر ڈرتا ہوں کہ تمہارے جل پریوں جیسے اس جسم کے ساتھ سلطان کھیلیں گے۔" وہ اچانک بے تاب ہو گیا اور بولا ـــــ "تم یہیں رہو۔ میں اکیلا متھرا جاؤں گا۔ غزنی کے سلطان کے سامنے جا کر اُسے کوئی دھوکہ دیئے بغیر قتل کر دوں گا۔ تم اور رادھا واپس چلی جاؤ۔ میں تمہارے لیے مر جاؤں گا.... لیکن ایک بار شیلا! صرف ایک بار.... ذرا سی دیر کے لیے میرے بازوؤں میں آ جاؤ۔ میں ڈر رہا ہوں۔ اپنی موت سے نہیں، میں اُس وقت سے ڈر رہا ہوں جب وہ مجھے پکڑ کر قتل کر دیں گے اور تمہیں اور رادھا کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔"

"لکھمن!" شیلا نے گرج کر کہا۔ "چلے جاؤ۔ یہاں سے چلے جاؤ۔ میں اپنا آپ تم سے بچا نہیں رہی۔ میں تم سے دور نہیں ہٹ رہی۔ میں ہمیشہ کے لیے تمہاری ہوں مگر اب نہیں۔ اگر ایک بار میرے ننگے بازو تمہارے عریاں کندھوں سے چھو گئے تو تم بھول جاؤ گے کہ ہم یہاں کیوں آئے تھے۔ میرے چہرے میں غزنی کے سلطان کو دیکھو۔ میری آنکھوں میں اپنی عزت کو دیکھو.... جاؤ! چلے جاؤ۔ کوئی کشتی دیکھو۔ ہمیں جمنا پار جانا ہے۔"

لکھمن پال گٹھے ہوئے جسم کا جنگجو جوان تھا۔ اُس کا سراپا بتا رہا تھا کہ تلوار کا دھنی ہے۔ اُس نے شیلا کو نظر بھر کر دیکھا اور یہ کہہ کر چلا گیا۔ "میں تمہیں مایوس نہیں کروں گا۔ میں بھارت ماتا کو مایوس نہیں کروں گا.... میں کشتی کا بندوبست کر کے ابھی آیا" ـــــ اور وہ دوڑ پڑا۔ شیلا اُسے جاتا دیکھتی رہی۔ جنگل کی جھاڑیوں نے لکھمن کو اُس کی نظروں سے اوجھل کر دیا تو بھی وہ اُدھر ہی دیکھتی رہی۔

اپنے قریب شیلا کو کسی کے چلنے کی آواز سنائی دی۔ اُس نے اطمینان سے گھوم کر دیکھا۔ اس غیر آباد جنگل میں کون ہو سکتا تھا۔ غزنی کی فوج وہاں سے بیس پچیس میل دور متھرا میں تھی۔ یہاں کوئی اور انسان نہیں ہو سکتا تھا، مگر وہ ایک انسان تھا جو آنکھیں پھاڑے ہوئے اُسے دیکھتا آہستہ آہستہ اُس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر سیاہ داڑھی تھی۔

اُس کا لباس اس خطے کے لوگوں جیسا تھا۔ وہ سراپا ہندوستانی تھا۔ اُس کا چہرہ بھرا بھرا اور پُرشباب تھا۔ وہ شیلا کے قریب آ کر رکا۔

"شیلا؟" ـــــ اُس آدمی نے پوچھا ـــــ "مجھے دھوکہ تو نہیں ہو رہا؟ تم قنوج کے راجے چندا کی بہن نہیں ہو؟.... تم جنگل کی مٹی نہیں ہو۔ میں تمہیں کل سے چھپ چھپ کر دیکھتا آ رہا ہوں۔ یہ لکھمن ہے نا جو ابھی تمہارے پاس کھڑا تھا؟ مہاراجہ قنوج کا راجکمار؟"

"اور تم کون ہو؟" شیلا نے سرگوشی میں پوچھا۔

اُس آدمی نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرا تو داڑھی اُس کے ہاتھ میں آ گئی۔ شیلا کے سامنے ایک جوان چہرہ آ گیا جو لکھمن پال کی طرح خوبرو تھا اور شباب سے دمک رہا تھا۔ عمر لکھمن جیسی تھی۔

"اوہ!" شیلا نے مسکرا کر کہا۔ "ترلوچن پال! تم یہیں ہو ابھی؟.... تمہیں یہیں ہونا چاہیئے۔"

"مگر تمہیں یہاں نہیں ہونا چاہیئے" ـــــ ترلوچن پال نے کہا۔ "میں چند روز پہلے تمہارے بھائی سے ملنے گیا تھا تو تمہارے ساتھ بھی ملاقات ہوئی تھی۔ اس سے پہلے میں نے تمہیں اُس وقت دیکھا تھا جب تم اپنے بھائی کے ساتھ لاہور آئی تھیں۔ اگر میں چند روز پہلے تمہیں قنوج میں نہ دیکھتا تو میں اس حلیے میں تمہیں نہ پہچان سکتا۔ تمہارے گورے چٹے کندھوں پر بکھرے ہوئے یہ چمکیلے بھورے بال دیکھ کر اس بیابان میں تمہیں کوئی کسی بڑی خوبصورت لڑکی کی بھٹکتی ہوئی روح سمجھے گا اور کوئی تمہیں جنگل کی شہزادی کہے گا۔ میں کل سے چھپ چھپ کر تمہیں دیکھتا آ رہا ہوں۔ تم جانتی ہو میں یہاں کیا کر رہا ہوں۔ میں غزنی کی فوج کی اگلی پیشقدمی دیکھ رہا ہوں۔ مہاراج بھیم پال یہاں سے تھوڑی ہی دور ہیں.... تمہارے ساتھ راجکماری رادھا ہے.... لیکن یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟ تم لوگ کہیں بھاگے جا رہے ہو؟"

وہ لاہور کے مہاراجہ بھیم پال نڈر کا چھوٹا بھائی ترلوچن پال تھا۔ شیلا کی شادی اُس کے ساتھ ہو رہی تھی۔ سلطان محمود غزنوی کو صحیح اطلاع ملی تھی کہ بھیم پال نڈر بھی یہیں کہیں موجود ہے اور اُس کے بھائی بھی اس کے ساتھ ہیں اور وہ یہاں راجول

مہاراجوں کو سلطان کے خلاف متحد کرتا پھر رہا ہے۔ اس سلسلے میں اُس کا چھوٹا بھائی ترلوچن پال بہروپ میں مُنج بھی گیا تھا اور قنوج بھی۔ اس سلسلے میں گھومتے پھرتے اُسے شیلا کا یہ عجیب و غریب قافلہ نظر آگیا۔ وہ چھپ کر اُن کا تعاقب کرتا رہا۔ آخر صبح بھیمن اور شیلا کو یہاں دیکھا۔ بھیمن چلا گیا اور شیلا اکیلی رہ گئی۔

ترلوچن پال سے چھپانے کی ضرورت نہیں تھی کہ یہ قافلہ کہاں جا رہا ہے۔ شیلا نے اُسے بتا دیا کہ وہ سلطان محمود کو قتل کرنے جا رہے ہیں۔

"کیا تمہارا بھائی راجے چند اپنی بہن اور بیٹی سے لڑنا چاہتا ہے؟" ترلوچن نے کہا — "راجپوتوں کی غیرت کو کیا ہو گیا ہے؟ کیا وہ مسلمانوں سے ڈر گیا ہے؟ ہم اُسے یقین دلا چکے ہیں کہ اگر محمود نے اُسے شکست دے دی تو ہم اس کی شکست کا انتقام لیں گے۔ ہم ابھی اپنی فوج سامنے نہیں لائے۔ ہم نے یہ سوچا ہے کہ سلطان محمود یہاں لڑ لڑ کر اور قلعے فتح کر کر کے تھک جائے اور اس کی فوج کمزور ہو جائے تو ہم اس پر حملہ کر کے اُسے ختم کر دیں گے۔ بے شک ہم سلطان کے باجگزار ہیں لیکن ہم موقع کی تلاش میں ہیں۔ اُسے قتل کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر اُسے قتل کرنا ہی ہے تو بھیمن پال جائے۔ اس کے ساتھ دو آدمی ہیں۔ تم اور رادھا یہیں سے واپس چلو۔"

شیلا نے اُسے بتایا کہ وہ اپنی مرضی سے آئی ہیں۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ وہ اور رادھا کس طرح سلطان محمود اور اس کے سالاروں کو دھوکہ دیں گی۔ ترلوچن پال نے اُسے کہا کہ سلطان اتنی جلدی دھوکے میں نہیں آئیں گے البتہ وہ خود ہی دھوکے میں آکر غزنی پہنچا دی جائیں گی اور انہیں رقاصہ بنا دیا جائے گا یا سالاروں کی داشتائیں بنی رہیں گی۔ شیلا نے اُسے راجپوتی غیرت یاد دلائی۔ اپنا عزم بتایا مگر ترلوچن پال کی غیرت گوارا نہیں کر رہی تھی کہ جس لڑکی کے ساتھ اُس کی شادی ہونی ہے وہ اتنے بڑے خطرے میں جائے۔

"پھر میری جگہ تم جاؤ" — شیلا نے اُسے غصے سے کہا — "تم بزدل ہو اور چوہوں کی طرح جنگلوں میں بھیس بدل کر مارے مارے پھر رہے ہو۔ تم غزنی کے باجگزار ہو تو یہ

بھی تمہاری بزدلی کا ثبوت ہے۔ تم مسلمانوں سے ڈرتے ہو۔ سلطان نے تمہارے پاؤں میں بیڑیاں نہیں ڈال رکھیں۔ اپنی فوج کو یہاں لاؤ اور سلطان کو للکار کر کہو کہ تم اُسے باج نہیں دو گے۔ یہاں متھرا کے مندر تباہ ہو گئے۔ تم وہاں مسلمانوں کی اذانیں سن رہے ہو مگر تمہاری غیرت سو رہی ہے اور تم دوسروں کو بھڑکاتے پھر رہے ہو۔ میری غیرت مجھے گھر سے نکال لائی ہے۔"

"تم میری ہونے والی بیوی ہو" — ترلوچن پال نے غصے سے کہا — "میری منگیتر ہو۔ میں تمہیں آگے نہیں جانے دوں گا۔"

"میں کسی کی ہونے والی بیوی نہیں" — شیلا نے کہا — "میں اُس کی بیوی بنوں گی جو سلطان محمود کو قتل کرے گا، اور وہ بھیمن پال ہوگا۔ وہ مارا گیا تو محمود میرے ہاتھوں قتل ہوگا۔ رادھا کے ہاتھوں قتل ہوگا۔ اس مسلمان کی جان اب میری مٹھی میں ہے" — اُس نے مٹھی بند کر کے اور دانت پیس کر کہا — "میرے یہ ہاتھ مہندی سے نہیں محمود کے خون سے لال ہوں گے۔ منج کی کوئی راجپوت لڑکی کسی مسلمان کے ہاتھ نہیں آئے گی۔ یہ تمہارے باپ دادا تھے جنہوں نے غزنی والوں سے شکست پہ شکست کھائی اور تم خزانہ باج میں لٹا رہے ہو۔ یہ میرے بھائی کا فیصلہ تھا کہ میری شادی تمہارے ساتھ ہوگی۔ میرا فیصلہ سن لو ترلوچن! مجھے تم جیسے بزدلوں سے نفرت ہے۔ عورت راجپوت کی ہو یا راج مزدور کی، وہ بھڑک اٹھے تو دریاؤں کو آگ لگا دیتی ہے... میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔ میرا ساتھ بھیمن سے ہے۔ یہاں نہیں تو آکاش پر ہماری شادی ہوگی اور تم ان جنگلوں میں بھٹکتے پھرو گے۔"

"تم یہ سمجھتی ہو کہ میں تمہیں اٹھا کر نہیں لے جا سکتا؟" — ترلوچن پال قہر سے اُس کی طرف لپکا۔

شیلا پیچھے کو دوڑی۔ ترلوچن اُس کی طرف دوڑا۔ شیلا ایک ٹیکری کی اوٹ میں چلی گئی۔ ترلوچن پال اُس طرف گیا تو اُسے شیلا ایک درخت کے ساتھ کھڑی نظر آئی۔ وہاں درخت زیادہ تھے اور دریا باہر کو آیا ہوا تھا۔ یہ جھیل سی بنی ہوئی تھی۔ ترلوچن پال نے شیلا کو ایک بار پھر کہا کہ وہ اُس کے پاس آجائے۔ شیلا نے للکار کر کہا — "ہمت ہے تو مجھے پکڑ لو۔ میں تمہارے پاس اس لیے نہیں آؤں گی کہ تم مرد ہو اور میں عورت ہوں۔ سلطان محمود سے

پہلے میں تمہیں قتل کردوں گی۔"

وہ اُلٹے پاؤں پیچھے ہٹنے لگی۔ ترلوچن پال وہیں کھڑا اسے کہہ رہا تھا — "تم کسی کو قتل نہیں کر سکو گی۔ میں تمہیں بھاگنے نہیں دوں گا۔"

وہ اور پیچھے ہٹ گئی۔ ترلوچن پال نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا — "آگے کو بھاگ آؤ شیلا! پیچھے نہ جانا۔"

"میں تمہارے ہاتھ نہیں آؤں گی" — شیلا نے کہا۔

وہ سمجھ نہ سکی کہ ترلوچن اُسے کتنے بڑے خطرے سے خبردار کر رہا ہے۔ ترلوچن پال ایک بار پھر چلایا مگر بے سود۔ ایک مگرمچھ جو قریب ہی کہیں چھپا ہوا تھا، شیلا کے بالکل پیچھے پہنچ چکا تھا۔ اُدھر مگرمچھ آگے بڑھا۔ اِدھر سے شیلا نے بے خبری میں ایک اور قدم پیچھے ہٹایا تو مگرمچھ نے اُسے کمر سے دانتوں کے شکنجے میں جکڑ لیا۔ شیلا کی چیخیں اس قدر بلند اور ہولناک تھیں کہ رادھا جو اُس سے دُور سوئی ہوئی تھی جاگ اُٹھی۔ اُس نے دیکھا کہ لچھمن پال بھی نہیں، شیلا بھی نہیں۔ اُس نے دونوں فوجیوں کو جگایا اور اُن کے ساتھ اُدھر کو دوڑی جدھر سے چیخیں سنائی دی تھیں۔

ترلوچن پال ایک جھاڑی کے پیچھے ہو گیا۔ لچھمن پال کے دونوں فوجی وہاں پہنچے تو ایک سیٹی سنائی دی جو ترلوچن نے منہ میں انگلی رکھ کر بجائی تھی۔ کہیں سے دو تیر آئے، لچھمن پال کے دونوں ساتھی ایک ایک تیر سے اوندھے ہو گئے۔ یہ ترلوچن پال کے اُن دو محافظوں کے تیر تھے جو کہیں چھپے ہوئے تھے۔ رادھا نے نہ دیکھا۔ اُسے ندی کے کنارے ایک مگرمچھ نظر آیا جس کے منہ میں شیلا چیخ چلا رہی تھی اور مگرمچھ بیسے گز گز لمبے جبڑے اچھال اچھال کر اُسے نگل رہا تھا۔ رادھا کو چکر آنے لگا۔ اُس نے دیکھا کہ شیلا کا صرف ایک بازو مگرمچھ کے منہ سے باہر رہ گیا تھا اور اُس کے ریشم جیسے بال بھی نظر آ رہے تھے۔ رادھا کی آنکھوں کے آگے اندھیرا آ گیا اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

ترلوچن پال رادھا کی طرف بڑھا تو اُسے اپنے ایک محافظ کی آواز سنائی دی — "بھاگ جاؤ! مسلمان فوجی آ رہے ہیں۔"

ترلوچن پال وہاں سے پیچھے ہٹا اور غائب ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد غزنی کے چار گھوڑ سوار وہاں آ گئے جہاں سے ترلوچن پال بھاگا تھا۔ انہیں دُور گھوڑے دوڑنے کی آواز آئی۔ یہ ترلوچن پال اور اُس کے ساتھیوں کے گھوڑے تھے جنہیں وہ دُور کہیں چھوڑ آئے تھے۔ اگر ترلوچن پال کے محافظ غزنی کے فوجیوں کو نہ دیکھ لیتے تو انہیں بہت بڑا شکار مل جاتا۔ ترلوچن پکڑا جاتا تو اس سے معلوم کیا جا سکتا تھا کہ بھیم پال نڈر کہاں ہے۔

لچھمن پال کشتی کی تلاش میں نکل گیا تھا۔

غزنی کے ان فوجیوں میں ایک نائب سالار تھا اور باقی تین اُس کے دستوں کے کماندار تھے۔ وہ متھرا سے آئے تھے اور انہوں نے گھوڑوں پر دریا پار کیا تھا۔ چونکہ کچھ روز بعد پیش قدمی ہونے والی تھی اس لیے نائب سالار دریا اور اس سے آگے کا جائزہ لے رہا تھا اور اس علاقے میں متھرا کے دفاع کے لیے دو تین چوکیاں بھی قائم کرلی تھیں۔ وہ جب دریا کی بنائی ہوئی جھیل کے قریب آئے تو انہیں ایک لڑکی بے ہوش پڑی نظر آئی۔ ذرا پرے انہیں ایک مگرمچھ دکھائی دیا جو آدھا پانی میں تھا۔ اُس کے منہ سے لٹکتا ہوا ایک بازو نظر آ رہا تھا اور منہ سے لمبے لمبے بال بھی لٹک رہے تھے۔ نائب سالار نے ایک اور مگرمچھ دیکھا جو بے ہوش رادھا کی طرف آ رہا تھا۔

نائب سالار نے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ اُس کے کمانداروں نے بھی گھوڑے دوڑائے۔ دونوں مگرمچھ پانی میں غائب ہو گئے۔ نائب سالار نے کمانداروں سے کہا کہ یہ کوئی بہت خوبصورت جنگلی لڑکی معلوم ہوتی ہے۔ اسے اُٹھا لے چلو۔ رادھا کو ایک گھوڑے پر ڈال لیا گیا۔ وہاں سے ہٹ کر وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگے کہ شاید اس کے ساتھ کے کوئی لوگ کہیں ٹھہرے ہوئے ہوں۔ انہیں دو لاشیں دکھائی دیں۔ دونوں میں ایک ایک تیر اُترا ہوا تھا۔ انہیں ایک جگہ پانچ گھوڑے، دو خچر اور دو ہرن کھڑے نظر آئے۔ زمین پر بستر بچھے ہوئے تھے۔ سامان کی تلاشی لی گئی۔ اس میں سے ہتھیار اور سونے کے بے شمار سکے برآمد ہوئے۔ کچھ ایسی چیزیں بھی برآمد ہوئیں جو شک پیدا کرتی تھیں۔

نائب سالار پرانا تجربہ کار آدمی تھا۔ اُس نے رادھا کو جو ابھی تک بے ہوش تھی، غور سے دیکھا اور کہا کہ یہ لڑکی جنگلی نہیں ہو سکتی۔ اُس نے رادھا کو گھوڑے سے اُتروا کر منہ

میں پانی ٹپکایا اور منہ پر پانی کے چھینٹے مارے تو اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ فوراً ہی وہ اُٹھ بیٹھی اور یہ دیکھے بغیر کہ اُس کے پاس کون کھڑا ہے، اُس نے اُٹھ کر چلانا شروع کر دیا۔

"شیلا! بھیم پال!" — وہ دوڑ پڑی — "راجکمار! کہاں ہو؟"

نائب سالار نے اُسے پکڑ لیا اور پوچھا کہ وہ کون سے راجکمار کو بلا رہی ہے۔ رادھا اس قدر حواس باختہ تھی کہ اُس کے منہ سے نکل گیا "قنوج کا راجکمار بھیم پال! تم نے اُسے دیکھا ہے؟" — وہ چونک پڑی اور اُس نے لب و لہجہ بدل کر اداکاری شروع کر دی — "میں قنوج کے قریب کے ایک جنگل کے قبیلے کی لڑکی ہوں۔ ہم غزنی کے سلطان کے پاس مسلمان ہونے کے لیے جا رہے ہیں۔"

"قبیلے کا نام کیا ہے؟" — نائب سالار نے پوچھا — "اور وہ جنگل قنوج سے کتنی دور ہے؟"

لڑکی گھبرا گئی۔ اُسے کسی نے یہ نہیں بتایا تھا کہ ہر قبیلے کا نام بھی ہوتا ہے۔ اُس نے جنگل کے متعلق بتایا تو نائب سالار نے کہا — "دیکھو لڑکی! میں غزنی کا رہنے والا ہوں اور تمہاری زبان بول رہا ہوں۔ اس سے سمجھ لو کہ میں تمہارے علاقے سے واقف ہوں۔ میں قنوج کے ارد گرد کا علاقہ دیکھ آیا ہوں۔ وہاں کوئی ایسا جنگل نہیں ہے جس میں اتنا خوبصورت قبیلہ رہتا ہو جتنی خوبصورت تم ہو۔"

لڑکی کا راجپوتی خون جوش میں آ گیا۔ اُس نے نائب سالار اور کمانداروں کو للکارنا شروع کر دیا — "خبردار میرے قریب نہ آنا۔ میں زندہ تمہارے ہاتھ نہیں آؤں گی۔"

نائب سالار نے اُسے بازو سے پکڑ کر کہا — "تم خوش قسمت ہو کہ میرے ہاتھ آئی ہو۔ تم اتنی زیادہ خوبصورت ہو اور تم نے لباس ایسا عریاں پہن رکھا ہے کہ اس جنگل میں جس کسی کے ہاتھ آ جاتیں وہ تمہیں اپنی بیٹی اور بہن نہیں کہے گا۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میری نیت میں فتور نہیں آئے گا، اور اگر تم مجھے جھانسے دیتی رہو گی تو میں تمہیں ان تینوں کے حوالے کر کے خود چلا جاؤں گا۔ انہیں اچھی طرح دیکھ لو۔ اگر اپنے آپ کو بچانا چاہتی ہو تو بتا دو کہ تم لوگ کون ہو اور راجکمار بھیم پال کہاں ہے اور یہاں کیوں آیا ہے۔"

رادھا اپنے قافلے کے سامان کی طرف دوڑی۔ سب اُسے دیکھتے رہے۔ اُس نے

سامان سے چھوٹی سی ایک ڈبیہ نکالی۔ وہ اُٹھ کر تیزی سے ڈبیہ کھولنے اور دوسری طرف دوڑنے لگی۔ اُسے پکڑ لیا گیا۔ اُس کے ہاتھ سے ڈبیہ چھین کر نائب سالار نے اُس سے پوچھا — "یہ زہر ہے نا؟ ... سنو لڑکی! تمہارا زہر پینا اور بھاگنا بیکار ہے۔ تم ہماری قیدی ہو۔ تمہیں سب کچھ بتانا پڑے گا۔" — نائب سالار کے حکم سے اُسے ایک گھوڑے پر بٹھا دیا گیا جس کی لگام ایک کماندار کے ہاتھ میں تھی۔

بھیم پال مایوس واپس آ رہا تھا۔ اُسے اگلے گھاٹ کوئی کشتی نہ ملی۔ وہاں بڑی کشتیاں تھیں جو بہت سے مسافروں کو پار لے جاتی تھیں۔ وہ گھوڑوں اور مجرموں کو بھی پار لے جانا چاہتا تھا۔ ان کے لیے کشتی نہیں مل رہی تھی۔ وہ جھیل سے ذرا ہٹ کر گزرا تو اُسے خشکی پر ایک مگرمچھ نظر آیا جو ایک انسان کو نگل رہا تھا۔ مگرمچھ شکار کو کھانے کا یہ طریقہ اختیار کرتا ہے کہ پہلے اسے نگل کر جان سے مار دیتا ہے پھر اسے خشکی پر اُگل کر اس کے گلنے سڑنے کا انتظار کرتا ہے۔ جب لاش یا کسی جانور کا مُردار گل کر نرم ہو جاتا ہے تو اُسے نگل لیتا ہے۔

شیلا کو نگلنے کے بعد مگرمچھ خشکی پر آ کر اُسے اگل رہا تھا۔ بھیم پال نے دیکھا کہ لاش کے لمبے لمبے بال تھے اور لباس! ... اُس کا جسم کانپنے لگا۔ وہ یقین نہیں کرنا چاہتا تھا کہ یہ شیلا کی لاش ہے۔ اُس نے ٹیکری پر چڑھ کر دیکھا تو اُسے لاش کا چہرہ صاف نظر آنے لگا۔ اتنے میں ایک اور مگرمچھ دوڑتا آیا اور لاش کو منہ میں لینے لگا۔ لاش کا مالک مگرمچھ اُس پر ٹوٹ پڑا۔ پھر ان میں لڑائی شروع ہو گئی۔ آخر ایک نے شیلا کی ایک ٹانگ منہ میں لے لی اور دوسری ٹانگ دوسرے نے منہ میں جکڑ لی۔ انہوں نے زور لگایا تو لاش سیدھی کھڑی ہو گئی۔ اُس کا چہرہ بھیم پال کی طرف تھا۔ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اُس میں تو اب اُدھر دیکھنے کی بھی ہمت نہیں رہی تھی۔ دو مگرمچھوں نے لاش کی ٹانگوں کو اپنی اپنی طرف کھینچا تو لاش کے دو حصے ہو گئے۔

بھیم پال آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر ٹیکری کی دوسری طرف اُترا تو اُسے اپنے دو ساتھیوں کی لاشیں نظر آئیں۔ وہ انہیں دیکھ ہی رہا تھا کہ اُسے رادھا کی چیخ نما آواز سنائی دی — "بھیم پال!" — اُس نے اُدھر دیکھا تو سن ہو کے رہ گیا۔ رادھا غزنی کے فوجیوں کے قبضے

میں تھی۔ بھیم پال نے بھاگ اُٹھنے کے لیے اِدھر اُدھر دیکھا تو اُسے نائب سالار کی آواز سنائی دی۔

"گھوڑے سے تیز نہیں بھاگ سکو گے لڑکے! اِدھر آؤ۔ زندہ رہو گے۔"

اُسے ایک گھوڑے پر بٹھا کر نائب سالار نے کمانداروں سے کہا کہ واپس چلو۔ وہ بھیم پال کو اپنے ساتھ لے کر سب سے پیچھے رہا۔ اُس نے کہا — "اس لڑکی نے سب کچھ بتا دیا ہے اس لیے ہم اسے پوری عزت کے ساتھ متھرا لے جا رہے ہیں۔ تم اس کے ساتھ رہنا اور دیکھنا کوئی مرد اس کے جسم کو ہاتھ نہیں لگائے گا لیکن اس کی عزت تمہارے ہاتھ میں ہے۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم کتنا کچھ سچ بولو گے۔ اگر تم نے جھوٹ بولا تو تم شاید تصور میں نہیں لا سکو گے کہ اس کے ساتھ کیا سلوک ہوگا۔ دیکھو یہ لڑکی کتنی خوبصورت ہے۔ اگر میں نہ ہوتا تو یہ تین فوجی اس لڑکی کو اس طرح عزت سے متھرا نہ لے جاتے۔ پورا اِحکار! مجھے بتاؤ کہ قنوج کا راجکمار اِس عجیب سے حلیے میں یہاں کیوں آیا ہے؟"

"اگر آپ ہم دونوں کو چھوڑ دیں تو میں آپ کو اتنا معاوضہ دوں گا جتنا آپ کہیں گے" — بھیم پال نے کہا — "آپ چاروں میرے ساتھ قنوج چلیں۔ میں آپ کے گھوڑے سونے سے لاد دوں گا۔"

"اگر ہمیں انعام کا خیال ہوتا تو یہ اتنی حسین لڑکی بہت بڑا انعام ہے جو ہم نے لیا ہے" — نائب سالار نے کہا — "اور تمہارے سامان سے سونے کے بے شمار سکے بھی ملے ہیں جو ہم چاروں آپس میں بانٹ سکتے ہیں۔ تم مجھے قنوج لے جانا چاہتے ہو۔ ہم وہاں سے آ رہے ہیں۔ وہاں سے ہم خود اپنے گھوڑے سونے سے لاد لیں گے۔ میں تمہیں انعام دینا چاہتا ہوں۔ سچ بولو اور انعام میں اپنی جان اور یہ لڑکی لے جاؤ۔"

وہ چلتے گئے اور انہوں نے گھوڑوں پر دریا پار کیا۔ وہ جنگلوں میں سے گزرے۔ ویرانوں میں سے گزرے۔ سورج غروب ہو گیا تو تاریکی میں چلتے رہے۔ راستے میں ذرا آرام کے لیے رُکے۔ کسی نے بھی رادھا کے ساتھ بات نہ کی۔ رات خاصی گزر چکی تھی جب یہ قافلہ متھرا کے قریب پہنچ گیا۔

بھیم پال کے ساتھ تمام راہ نائب سالار نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ اُس نے بھیم سے ایک ہی بار کہا تھا کہ وہ سچ سچ بتا دے کہ یہاں کیوں آیا ہے۔ بھیم پال نے انعام پیش کرنے کے سوا کوئی جواب نہیں دیا تھا لیکن جب یہ ٹولہ متھرا میں داخل ہونے لگا تو بھیم پال نے لپک کر نائب سالار کے بازو پر ہاتھ رکھ دیا۔

"میں سچ بولوں گا" — اُس نے کہا — "یہیں سُن لیں.... میں آپ کے سلطان کو قتل کرنے آیا تھا" — اور اُس نے اپنا تمام تر منصوبہ سنا دیا، مگر یہ نہ بتا سکا کہ شیلا گر کچھ کے پیٹ میں کیسے پہنچی اور اس کے دو ساتھیوں کو تیروں سے کس نے ہلاک کیا ہے۔ اُس نے کہا — "میں نے آپ کی سزا سے ڈر کر اعتراف نہیں کیا۔ میں آپ چاروں کے اخلاق سے متاثر ہو کر مجبور ہو گیا ہوں کہ آپ کے سامنے سچ بولوں۔ آپ نے میرا اتنا بڑا انعام ٹھکرا دیا۔ ہم نے سارا دن اجاڑ بیابان میں سفر کیا ہے۔ رات کے اندھیرے میں بھی سفر کیا ہے۔ مجھے یہ خطرہ پریشان کرتا رہا کہ آپ اس لڑکی کو خراب کریں گے مگر آپ کو جیسے احساس ہی نہیں تھا کہ آپ کے قبضے میں اتنی حسین لڑکی ہے جو غزنی نے بھی پیدا نہ کی ہو گی۔ آپ نے تمام راستے ہمارے ساتھ کوئی بات نہیں کی۔ میں سمجھ گیا ہوں کہ آپ کی فتح کا راز کیا ہے۔ اب مجھے سچ بولنے کا انعام دیں.... انعام صرف اتنا ہے کہ مجھے بے شک جلاد کے حوالے کر دیں لیکن اس لڑکی کو اس کے ماں باپ کو واپس کر دیں۔ اس کی دلیری اور جرأت دیکھیں۔ اگر آپ واقعی جنگجو ہیں تو ایک جنگجو باپ کی غیرت مند بیٹی کو اس کی دلیری کا خراج دیں۔ یہ کنواری لڑکی ہے۔"

"اس کا فیصلہ سلطان محمود کریں گے" — نائب سالار نے کہا — "میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ یہ لڑکی کنواری رہے گی اور مجھے اُمید ہے کہ تمہیں جلاد کے حوالے نہیں کیا جائے گا۔"

"تم نے کوئی جرم نہیں کیا۔ ہم تمہیں جلاد کے حوالے نہیں کریں گے" — سلطان محمود نے بھیم پال کی زبانی وہی کہانی جو اُس نے نائب سالار کو سنائی تھی، سن کر اُسے کہا — "ہم تم جیسے بیٹوں اور اس لڑکی جیسی بیٹیوں کی دل سے قدر کرتے ہیں۔ سزائے موت تو بہت بڑی بات ہے، ہم تمہیں طعنہ بھی نہیں دیں گے کہ تم اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ہم غیرت مند

دشمن کی عزت کیا کرتے ہیں۔ مجھے قتل کرنے کی تمہیں ضرور کوشش کرنی چاہیے تھی۔ کامیابی اور ناکامی تمہارے کرشن واسدیو اور ہر ہر مہادیو کے اختیار میں نہیں، ہمارے خدا کے اختیار میں ہے۔ یہ ہے خدا کا وہ پیغام جو میں ہندوستان میں لایا ہوں۔"

محمود غزنوی نے اپنے ترجمان سے کہا ۔۔۔ "اس شہزادے سے کہو کہ لڑکی کے باپ سے کہے کہ میں نے منج کے راجپوتوں کی عزت اور جرأت کی بہت باتیں سنی ہیں لیکن غیرت والوں کی بیٹیاں یوں ننگی ہو کر اپنے دشمن کے لیے حسین دھوکہ بن کے اُس کے پاس نہیں جایا کرتیں .... اور اس شہزادے سے کہو کہ اپنے باپ سے کہہ دے کہ ہم آ رہے ہیں اور وہ ہمیں قتل کرنے کے لیے سامنے آئے .... اور اس شہزادے سے کہو کہ ہم تمہیں یرغمال کے طور پر رکھ سکتے تھے مگر ہم اوچھے نہیں۔ ہم اپنی شرطیں میدان جنگ میں منوایا کرتے ہیں۔"

ترجمان نے بھیم پال کو بتایا کہ سلطان کیا کہہ رہے ہیں۔

"اور ہم اس شہزادے سے کوئی فوجی راز بھی نہیں لیں گے۔" سلطان محمود نے کہا ۔۔۔ "اسے کہو کہ ہم قنوج کے اندر اور باہر سے واقف ہیں۔ ہماری آنکھیں قنوج کے قلعے کے اندر ہیں۔"

بھیم پال سلطان محمود کے چہرے پر نظریں گاڑھے ہوئے تھا۔ وہ حیرت کے عالم میں تھا۔ رادھا بھی حیران تھی کہ سلطان محمود اُن کی قسمت کا کیا فیصلہ کر رہا ہے۔

"تم دونوں اپنے اپنے باپ سے کہنا کہ لڑے بغیر قلعے ہمارے حوالے کر دیں۔" سلطان محمود نے کہا اور ترجمان نے اس کا ہندوستانی زبان میں ترجمہ کیا ۔۔۔ "اگر ہم نے قلعے لڑ کر لیے تو تم دونوں کے باپوں کا انجام بہت بُرا ہو گا۔"

سلطان محمود غزنوی نے حکم دیا ۔۔۔ "ان دونوں کو ان کے شہروں کے قریب چھوڑ آؤ۔ انہیں عزت سے لے جاؤ۔ ان کے گھوڑے اور ان کے خنجر انہیں دے دو۔"

بھیم پال اور رادھا کچھ دیر محمود غزنوی کے چہرے پر ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہے۔ انہیں جب وہاں سے چلنے کو کہا گیا تو بھیم پال نے سلطان کے پاس جا کر اُس کا ہاتھ پکڑا اور چوم لیا۔ رادھا سلطان کو حیرت سے دیکھتی رہی۔

دونوں کو فوج کے دس بارہ سپاہیوں کے ساتھ رخصت کر دیا گیا۔ ان کا ایک کمانڈر

بھی ساتھ گیا۔ بڑی لمبی مسافت کے بعد وہ رادھا کو منج کے قلعے سے کچھ دور اور بھیم پال کو قنوج کے قریب چھوڑ کر واپس آ گئے۔

بھیم پال مایوسی اور شکست خوردگی کے عالم میں اپنے باپ مہاراجہ راجیا پال کے سامنے جا کھڑا ہوا اور اُسے بتایا کہ اُس پر کیا گذری ہے۔

"میں آپ کو صاف بتا دیتا ہوں کہ غزنی کے سلطان سے آپ شکست کھائیں گے" ۔۔۔ بھیم پال نے اپنے باپ سے کہا ۔۔۔ "آپ اسے شکست نہیں دے سکتے پتا مہاراج! میں نے غزنی کے اس سلطان کی آنکھوں میں جادو کا اثر دیکھا ہے۔ اس کی فوج کے حاکم کسی اور ہی مٹی کے بنے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اُن کی فتح کا راز کچھ اور ہے۔ کون رادھا جیسی نوجوان اور خوبصورت لڑکی کو اور اپنے دشمن کے بیٹے کو اس طرح رہا کرتا ہے؟"

بھیم پال نے اپنے باپ کو سارا واقعہ سنایا۔ مؤرخوں نے لکھا ہے کہ قنوج کے مہاراجہ راجیا پال پر ایسا تاثر طاری ہو گیا کہ اس نے خفیہ طور پر اپنا تمام خزانہ قنوج سے دور پہاڑی علاقے میں منتقل کرنے کا حکم دے دیا۔ اسی رات خزانہ ایسے طریقے سے قلعے سے نکلنے لگا کہ کسی کو ذرا سا بھی شک نہیں ہوتا تھا۔

رادھا جب اپنے باپ رائے چند کو بتا چکی تھی کہ اُسے اور بھیم پال کو سلطان نے کس طرح رہا کیا ہے تو اُسے یقین نہ آیا۔ اُس نے کہا کہ راجپوت اپنی بے عزتی کا انتقام لیں گے۔

سلطان محمود غزنوی نے کچھ دستے متھرا میں رہنے دیئے اور باقی فوج کو کوچ کا حکم دے دیا۔ اُس نے متھرا کے قریب سے دریائے جمنا پار کیا اور دریا کے ساتھ ساتھ منج کا رُخ کر لیا جہاں راجپوت زندگی اور موت کا آخری معرکہ لڑنے کے لیے تیار تھے۔ سلطان کو جاسوسوں نے بتایا تھا کہ غزنی کی فوج کا صحیح مقابلہ منج میں ہو گا۔ وہاں عورتیں ہو سکتے بھی لڑنے اور مرنے کے لیے تیار تھے۔

خدا جو دل میں اُتر گیا

قنوج

قنوج دریائے گنگا کے کنارے پر واقع تھا۔ قلعہ اس طرح تعمیر کیا گیا تھا کہ اس کی ایک طرف دریا تھا جس کا پانی (مؤرخوں کے الفاظ میں) قلعے کی ایک دیوار کو دھوتا رہتا تھا یہ اپنے زمانے کا مشہور قلعہ تھا، مضبوط بھی تھا اور دور دور تک احترام کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ کے گرد و نواح میں جنگل تھا جو کہیں کہیں بہت گھنا ہو جاتا تھا۔ کہیں کہیں پہاڑیاں اور چٹانیں بھی تھیں۔

۱۰۱۸ء میں سلطان محمود غزنوی متھرا سے کوچ کر کے منج کی طرف پیشقدمی کر رہا تھا۔ قنوج وہاں سے ایک سو چالیس میل دور تھا۔ قنوج سے چار پانچ میل دور جنگل میں جہاں آبادی کا دور دور تک نام و نشان نہ تھا، دو آدمی گڈریوں کے لباس میں ایک چٹان پر بیٹھے ہوئے تھے۔ سورج غروب ہونے کو تھا۔ ایک نے دوسرے سے کہا کہ رات یہیں گذار لیتے ہیں۔

"آج تیسرا دن ہے ہم قنوج کے قریب سے ہو آئے ہیں" ــــ ایک نے کہا ــــ "ہمیں قنوج کی یا کسی اور ہندو مہاراجے کی فوج نظر نہیں آئی۔ کیا قنوج کی فوج اُس وقت باہر آئے گی جب ہماری فوج قریب آجائے گی؟"

"ہمیں اپنی فوج کے آنے تک اسی علاقے میں رہنا ہے طلال بھائی!" ــــ دوسرے نے کہا ــــ "یا ہم اُس وقت واپس جائیں گے جب ہمیں قنوج کی فوج نظر آجائے گی۔ سلطان کو بتایا گیا ہے کہ وہ جب منج کا محاصرہ کرے گا تو قنوج کی فوج عقب سے حملہ کرے گی۔ سلطان کو یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ہماری فوج کا مقابلہ منج اور قنوج کے درمیان ہو گا۔ ہمیں معلوم کرنا ہے کہ قنوج کی وہ فوج کہاں ہے جسے ہماری فوج پر عقب سے حملہ کرنا ہے... معلوم ہوتا ہے تم تنگ آگئے ہو۔"

"نہیں صالح!" ــــ طلال نے کہا ــــ "میں اتنی جلدی تنگ آنے والا نہیں۔ میرا خیال ہے مہاراجہ قنوج باہر آکر لڑنے کی جرأت نہیں کرے گا۔"

"یہی تو ہمیں معلوم کرنا ہے کہ وہ ایسی جرأت کرے گا یا نہیں" ــــ صالح نے کہا ــــ "ہم دونوں غزنی کی فوج کی وہ آنکھیں ہیں جنہیں سلطان محمود کو بتانا ہے کہ جنگل صاف ہے یا یہاں کوئی خطرہ ہے۔"

"آؤ پھر یہیں سو جائیں" ــــ طلال نے کہا ــــ "سردی تو بہت ہے لیکن رات گذر جائے گی۔"

طلال ابراہیم اور صالح بروک ہندوستانی مسلمان تھے۔ صالح بروک اُن عربوں کی نسل سے تھا جو محمد بن قاسم کے ساتھ ہندوستان میں آئے اور یہیں آباد ہو گئے تھے اور طلال ابراہیم کے آباؤ اجداد کا مذہب کچھ اور تھا۔ وہ محمد بن قاسم کے دورِ حکومت میں مسلمان ہوئے تھے۔ اب ہندوستان میں محمود غزنوی کی جنگی مہمات اور بت شکنی کا سلسلہ شروع ہوا تو غزنی کی فوج کو انٹیلی جنس کے لیے ہندوستان کے مسلمان باشندوں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ یہ عام قسم کی فوجی بھرتی نہیں تھی کہ ہر اُس جوان کو بھرتی کر لیا جاتا جو تیغ زنی اور گھوڑ سواری کی سوجھ بوجھ رکھتا تھا۔ جاسوسی کے لیے ایسے افراد کی ضرورت تھی جو دماغی لحاظ سے غیر معمولی طور پر تیز اور ذہین تھے اور جو اداکاری کی مہارت رکھتے تھے اور جو کئی کئی روز تک ہر قسم کے موسمی حالات میں جنگلوں، پہاڑوں، صحراؤں اور میدانوں میں تندرست رہنے کی اہلیت رکھتے تھے۔ سب سے بڑی خوبی یہ دیکھی جاتی تھی کہ ان کا کردار پختہ ہو اور لالچ کتنا ہی دلکش کیوں نہ ہو، اسے قبول نہ کریں۔ ان میں بندروں کی پھرتی، گھوڑے کی طاقت، عقاب کی نظر اور چیتے کی جھپٹ کا ہونا بھی لازمی تھا۔ بنیادی ضرورت ایمان کی تھی۔

ہندوستان کے مسلمانوں میں جذبہ موجود تھا۔ ہندوستان بے شمار راجوں مہاراجوں میں بٹا ہوا تھا۔ وہ سب ہندو تھے، اور وہ مسلمانوں پر بھروسہ نہیں کرتے تھے۔

جب سے سلطان محمود غزنوی کے حملے شروع ہوئے تھے، ہندوؤں نے ہر مسلمان کو غزنی کا جاسوس سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے باوجود یہاں کے مسلمان غزنی کی فوج کی مدد اور راہنمائی کرتے تھے اور کئی ایک باقاعدہ مشرف (انٹیلی جنس ایجنٹ) بن گئے تھے مگر ان میں کوئی ایسا بھی نکل آتا تھا جو اپنے نفس کے دھوکے میں یا ہندوستان کے بچھائے ہوئے دلکش جال میں آ جاتا تھا۔

طلال ابراہیم اور صالح بردک سلطان محمود کی انٹیلی جنس کے مشرف تھے۔ سلطان محمود کو متھرا میں بتایا گیا تھا کہ اس نے جس آسانی سے متھرا فتح کر لیا ہے، اتنی آسانی سے قنوج کا قلعہ سر نہیں کر سکے گا اور جب دریائے جمنا کے کنارے پر واقع منج نام کے قلعے کا محاصرہ کرے گا تو قنوج کی فوج اس پر عقب سے حملہ کرے گی اور اسے دریائے گنگا اور جمنا کے درمیانی علاقے میں لڑنا پڑے گا جس میں اس کی شکست کا امکان زیادہ ہے۔ ایک خطرہ یہ بھی تھا کہ لاہور کا مہاراجہ بھیم پال نڈر اس علاقے کے ہر راجے اور مہاراجے کو سلطان محمود کے خلاف اتحاد پر قائل کر رہا تھا۔ خطرہ یہ تھا کہ وہ اپنی فوج بھی لے آیا ہو گا۔

سلطان محمود کی فوج مسلسل لڑ لڑ کر تھک چکی تھی۔ فوج کی نفری زخمی اور شہید بھی ہوئی تھی اور یہ فوج اپنے مستقر غزنی سے تین ماہ کی مسافت جتنی دور تھی۔ وہ بہت بڑے خطرے میں آ گیا تھا۔ جاسوسوں کی رپورٹوں کے مطابق اسے دریائے گنگا اور جمنا کے درمیان ہندوؤں کی کثیر تعداد اور تازہ دم فوج کے خلاف لڑنا تھا۔ اس نے متھرا سے کوچ کیا تو طلال ابراہیم اور صالح بردک کو چند روز پہلے قنوج کے گرد و نواح میں بھیج دیا گیا تھا کہ وہ ہندوؤں کی فوجوں، خصوصاً قنوج کی فوج کی نقل و حرکت دیکھ کر فوراً اطلاع دیں۔

دونوں کو اس علاقے میں غریب اور خانہ بدوش گڈریوں کے بھیس میں گھومتے پھرتے تین دن ہو گئے تھے۔ انہوں نے بلند درختوں اور پہاڑیوں پر بھی چڑھ کر دیکھا تھا۔ انہیں کسی فوج کا نام و نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔ انہوں نے دریائے گنگا کو بھی دیکھا تھا۔ انہیں فوج کی کوئی کشتی نظر نہیں آئی تھی۔ ان دونوں میں طلال ابراہیم

کچھ اکتایا سا لگ رہا تھا۔ عربی نسل کا صالح بردک پہلے روز کی طرح تر و تازہ تھا۔ وہ اپنے فرض سے کوتاہی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ نومبر کا مہینہ تھا اور اس علاقے میں سردی خاصی زیادہ ہو گئی تھی۔ وہ چٹان پر ایسی جگہ لیٹ گئے جہاں سرد ہواؤں سے بچنے کے لیے اوٹ موجود تھی۔

رات کا پہلا پہر گزر چکا تھا جب صالح بردک کی آنکھ کھل گئی۔ وہ کچھ آوازوں سے جاگ اٹھا تھا۔ وہ جس چٹان پر سوئے ہوئے تھے اس کے نیچے ان کے قریب ہی سے کچھ لوگ گزر رہے تھے۔ گھوڑوں کے ٹاپ بھی سنائی دے رہے تھے۔ صالح کو روشنی بھی نظر آئی۔ وہ کروٹ بدل کر پیٹ کے بل ہو گیا اور چند گز آہستہ آہستہ رینگ کر آگے ہو گیا جہاں سے اسے اپنے نیچے ایک عجیب قافلہ گزرتا دکھائی دیا۔ سب سے آگے دو آدمی مشعلیں اٹھائے چلے جا رہے تھے۔ ان کے درمیان ایک تنومند آدمی تھا۔ اس کے لباس سے پتہ چلتا تھا کہ پنڈت ہے۔ اس کے پیچھے پانچ خچریں جا رہی تھیں جو ایک دوسری کے پیچھے بندھی ہوئی تھیں۔ اگلی خچر کی لگام پنڈت کے ہاتھ میں تھی۔ سب سے آخری خچر کے ساتھ ایک لمبی رسی بندھی ہوئی تھی۔ خچروں کے پیچھے سات آٹھ آدمی تھے۔ ہر ایک نے یہ رسی پکڑ رکھی تھی اور ایک ہاتھ اپنے سے اگلے آدمی کے کندھے پر رکھا ہوا تھا۔ عجوبہ یہ تھا کہ پنڈت کے سوا ہر آدمی کی آنکھوں پر سیاہ پٹی بندھی ہوئی تھی اور وہ اندھوں کی طرح آہستہ آہستہ چلے جا رہے تھے۔ مشعلوں والے آدمیوں کی بھی آنکھوں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔

پنڈت تھوڑے تھوڑے وقفے سے کہتا جا رہا تھا — "چلے چلو، میں دیکھ رہا ہوں۔ راستہ صاف ہے" — یہ عجیب و غریب قافلہ آہستہ آہستہ جا رہا تھا۔ خچروں پر لکڑی کے بکس لدے ہوئے تھے۔ صالح بردک رینگ کر اپنے ساتھی طلال ابراہیم تک آیا۔ اسے جگایا اور اس کے کان میں سرگوشی کی کہ رینگ کر اس کے ساتھ آئے۔ اب دونوں نے اندھوں کا یہ قافلہ دیکھا۔ انہیں کچھ پتہ نہ چلا کہ یہ کیا ہے۔

چالیس پچاس گز آگے جا کر قافلہ رک گیا۔ وہاں ایک اور چٹان دیوار کی طرح سیدھی کھڑی تھی۔ طلال اور صالح چٹان کے اوپر اوپر دبے پاؤں چلتے وہاں تک چلے

گئے جہاں قافلہ رُکا تھا۔ دونوں وہاں چٹان پر ایک درخت کی اوٹ میں لیٹ گئے۔ قافلہ اس چٹان اور ساتھ والی عمودی چٹان کے درمیان رُکا ہُوا تھا۔ مشعلوں کے شعلے بہت بڑے تھے۔ طلال اور صالح کو وہاں دوسری چٹان میں ایک خلا نظر آیا جو نیچے سے اوپر تک چلا گیا تھا۔ خلا یا شگاف اتنا فراخ تھا کہ ایک خچر اس میں سے آسانی سے گذر سکتی تھی۔

پنڈت نے ایک مشعل بردار کے ہاتھ سے مشعل لے لی اور بولا "سب یہیں کھڑے رہو۔ میں واپس آکر تمہیں آگے لے جاؤں گا"۔ پنڈت شگاف میں چلا گیا اور بائیں کو چٹان کی اوٹ میں ہوگیا۔ کچھ دیر بعد نظر آیا۔ مشعل کی روشنی میں اس شگاف میں سے پیچھے چٹان کی دیوار نظر آئی۔ پنڈت وہاں کہیں غائب ہوگیا۔ مشعل کی روشنی بھی کہیں گم ہوگئی۔ تھوڑے سے وقت بعد اُس کی مشعل پھر نظر آئی۔ وہ شگاف سے باہر آگیا۔

"کوئی آدمی اپنی آنکھوں کی پٹی میں سے دیکھنے کی کوشش نہ کرے"۔ پنڈت نے کہا "کسی نے پٹی ہٹانے کی کوشش کی تو اس کی سزا موت ہوگی"۔

ان آدمیوں کی آنکھوں پر پٹیاں بندھی رہیں۔ پنڈت ان کے ہاتھ پکڑ پکڑ کر ان سے خچروں سے بکس اُتروانے لگا۔

ایک مشعل اُس نے اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔ دوسرے مشعل برداروں کو اُس نے اپنی ضرورت کے مطابق کھڑا کر دیا تھا۔ یہ اندھے بکس اُٹھا کر چلتے تھے۔ بعض گر بھی پڑتے تھے اور غائب ہوتے جا رہے تھے۔ کرتے کرتے خچروں سے بکس اُتر کر چٹان کے اندر چلے گئے۔ خچریں باہر کھڑی رہیں اور تمام آدمی اندر چلے گئے۔ انہیں کوئی شک نہیں تھا کہ یہ مال و دولت تھا جو یہاں چھپایا جا رہا تھا، مگر ان آدمیوں کی آنکھوں پر پٹیاں کیوں بندھی ہوئی تھیں؟

"یہ آدمی ڈاکوؤں کا سردار ہے" ـــــ طلال ابراہیم نے کہا "اور یہ باقی آدمی بیگار میں پکڑے ہوئے ہیں"۔

"شاید اس کا گروہ مزید لوٹ مار کے لیے چلا گیا ہوگا"۔

"صالح!" ـــــ طلال نے کہا "اگر یہ لوگ یہاں پہرہ نہ بٹھائیں تو اس مال سے ہم کچھ حصہ جو ہم اٹھا سکتے ہیں، اُڑا کر لے جا سکتے ہیں۔ کیا ارادہ ہے؟"

"ہوش میں آؤ طلال!" ـــــ صالح بردک نے کہا "ان خزانوں سے ہمارا کوئی واسطہ نہیں۔ ہمیں وہ فرض ادا کرنا ہے جس کے لیے ہمیں یہاں بھیجا گیا ہے"۔

"میں فرض کو نہیں بھول رہا" ـــــ طلال نے کہا "رات تو یہیں گذارنی ہے۔ ہم کوئی کام نہیں کر رہے۔ جو کام ہوگا صبح ہوگا۔ رات کو یہ کام کرتے ہیں کہ یہ لوگ اگر چلے جائیں تو ہم غار کے اندر چلے جائیں گے۔ اندر کوئی نہیں ہوگا۔ کوئی ہوتا تو وہ بھی بکس اندر لے جانے کے لیے باہر آتا"۔

"ہم اندر نہیں جائیں گے" ـــــ صالح نے کہا "ٹوٹے ہوئے خزانوں کو دل سے اُتار دو۔ خزانے اور عورت کی کشش نے بادشاہوں کے تختے اُلٹے ہیں۔ دل سے طمع نکال دو"۔

"تم پتھر ہو" ـــــ طلال نے جھنجھلا کر کہا "تم پاگل ہو"۔

صالح بردک کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ مشعلیں باہر آگئیں اور اس کے ساتھ ہی وہ آدمی جو پنڈت لگتا تھا اور باقی سب آدمی اُس کے پیچھے پیچھے باہر آگئے۔ پنڈت ان کے ہاتھ پکڑ پکڑ کر خچروں تک لایا۔ اُس نے انہیں خچروں پر سوار کرا دیا۔ خچریں تھوڑی تھیں اور آدمی زیادہ۔ ایک ایک خچر پر پنڈت نے دو دو آدمی سوار کرا دیئے اور اُن کے لگام ایک دوسری خچر کے پیچھے باندھ کر خود اگلی خچر کی لگام پکڑ لی اور پیدل چل پڑا۔

وہ جب دُور نکل گئے تو طلال نے ایک بار پھر صالح سے کہا کہ چلو دیکھتے ہیں کیا ہے مگر صالح نے اُسے سختی سے منع کر دیا اور اُسے یہ بھی کہنا پڑا کہ طلال نے اگر یہ ضد جاری رکھی تو صالح اُسے قتل کر دے گا۔ طلال ابراہیم ہنس پڑا اور دونوں پھر سو گئے۔ رات تھوڑی رہ گئی تھی۔

ابھی صبح دُھندلی تھی جب یہ پنڈت مہاراجہ قنوج راجیا پال کی خواب گاہ کے دروازے پر جا کھڑا ہُوا۔ یہ مہاراجہ کے جاگنے کا وقت نہیں تھا مگر خواب گاہ کی خادمہ

جو باہر کھڑی تھی، پنڈت کو دیکھتے ہی اندر چلی گئی اور باہر آ کر پنڈت سے کہا کہ اندر چلا جائے۔ وہ دروازے میں داخل ہوا تو شکنتلا رانی اندر سے نکلی۔ شکنتلا تیس سال سے کم عمر کی چھوٹی رانی تھی۔ بڑی رانی لکشمی کی عمر چالیس سال سے خاصی اوپر ہو گئی تھی۔ شکنتلا بہت خوبصورت اور بڑے ہی دلکش جسم کی عورت تھی۔ وہ خواب گاہ سے نکلی تو یوں چل رہی تھی جیسے خواب میں چل رہی ہو۔ آنکھیں نیم وا تھیں اور قدم بے خیالی میں اٹھ رہے تھے۔ اس کے جسم سے جہاں مدہوش کر دینے والے عطر کی خوشبو آ رہی تھی وہاں شراب کی بو بھی تھی۔

مہاراجہ راجیا پال نے پنڈت سے کہا کہ دروازہ بند کر کے اُس کے قریب بیٹھ جائے۔

"رات خزانے کی آخری کھیپ وہاں پہنچا دی گئی ہے"۔ پنڈت نے کہا۔

"کیا اُن تمام آدمیوں کو قید میں ڈال دیا گیا ہے جنہوں نے کسی غار میں رکھے تھے؟"— مہاراجہ قنوج نے پوچھا۔

"انہیں قید میں ڈالنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کی آنکھوں پر سیاہ پٹیاں بندھی ہوئی تھیں"— پنڈت نے کہا۔ "پھر بھی آپ کے حکم کی تعمیل کی گئی ہے۔ ان سب کو قید میں ڈال دیا گیا ہے اور میں نے قید خانے والوں سے کہہ دیا ہے کہ ان سب کو نہایت اچھی خوراک دی جائے اور انہیں ہر طرح سے آرام اور عزت سے رکھا جائے"۔

"پنڈت جی مہاراج!"— مہاراجہ راجیا پال نے کہا— "اب صرف آپ ہیں جو خزانے کے راز سے واقف ہیں۔ آپ کو یہ احساس تو ہو گا کہ میں نے آپ کی کتنی عزت افزائی کی ہے۔ اپنی فوج کے سیناپتی کو اس راز میں شریک نہیں کیا اور آپ یہ بھی سوچیں کہ شکنتلا رانی سے مجھے کتنا پیار ہے مگر میں نے اسے بھی نہیں بتایا کہ میں تمام تر خزانہ قلعے سے کہیں اور منتقل کر چکا ہوں"۔

"مہاراج کو مجھ پر کسی قسم کا شک نہیں کرنا چاہیئے"— پنڈت نے کہا— "میں آپ کا خزانہ اُس روز سے اس غار میں لے جا رہا ہوں جس روز سے یہاں اطلاع پہنچی ہے کہ غزنی کے سلطان محمود نے متھرا پر بھی قبضہ کر لیا ہے اور اب اُس کا رُخ قنوج کی طرف ہے۔ آپ خود جا کر وہ جگہ دیکھ آئے ہیں جو میں نے اس پہاڑی

کے اندر بنوائی ہے۔ راج محل میں بھی کسی کو پتہ نہیں چل سکا کہ ایک رات آپ میرے ساتھ وہاں گئے تھے..... آج میں نے آپ کے زر و دولت کی آخری کھیپ بھی اُس جگہ پہنچا دی ہے"۔

"اُس کی حفاظت کا انتظام مکمل ہو گیا ہے؟"

"اتنا مکمل کہ اب آپ بھی وہاں اکیلے جائیں تو شاید وہاں سے زندہ نہیں نکل سکیں گے"۔ پنڈت نے کہا— "وہاں پہرے پر کوئی ایک بھی انسان نہیں۔ سانپ پہرہ دے رہے ہیں"۔

"مجھے ایک بات اور کہنی ہے"— مہاراجہ نے کہا— "اگر یہ راز فاش ہو گیا تو وہ دن آپ کی زندگی کا آخری دن ہو گا، اور اگر اس سے پہلے میری موت آ گئی تو آپ کو میرے ساتھ مرنا ہو گا"۔

پنڈت کے ہونٹوں پر طنز آلود مسکراہٹ آ گئی۔ بولا— "زر و جواہرات کا نشہ اتنا بُرا ہوتا ہے کہ انسان درندہ بن جاتا ہے۔ اپنے بیوی بچوں کو اور اپنے مذہبی پیشواؤں کو بھی اپنا دشمن سمجھنے لگتا ہے۔ جو دولت میرے پاس ہے، اس کے سامنے ہیروں اور سونے کی چمک کوئی معنی نہیں رکھتی۔ میرے بھگوان، میری پرارتھنا اور ہری کرشن کے چرنوں میں راتوں کو جاگنا وہ دولت ہے کہ آپ جیسے مہاراجے اور ان کی فوجیں مجھے چیونٹیوں کی طرح دکھائی دیتی ہیں"۔

"اسی لیے تو میں نے آپ کو اپنا راز دان بنایا ہے"— مہاراجہ راجیا پال نے کہا۔

تمام مؤرخین نے جن میں محمد قاسم فرشتہ اور البیرونی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، لکھا ہے کہ محمود غزنوی کو بتایا گیا تھا کہ اُس کا مقابلہ قنوج میں ہو گا۔ قنوج کے حکمران خاندان کے متعلق سلطان محمود نے ایسی باتیں سنی تھیں کہ اُس پر عجیب سی قسم کی سنجیدگی طاری ہو گئی تھی۔ غزنی سے اُسے کمک ملنے کی توقع نہیں تھی۔ وہ ایسی چالیں سوچتا رہتا تھا جن سے قنوج کی فوج کو شکست دے سکے۔ متھرا میں اُس نے اپنی فوج

کو بہت آرام دے لیا تھا مگر سالاروں اور نائب سالاروں کو اُس نے چین سے بیٹھنے نہیں دیا تھا۔ اپنی فوج کا مورال بلند کرنے کے لیے اُس نے اماموں کے ذریعے تمام فوج کو پیغام بھی دیا تھا۔

یہ اُس کے جذبے کا جنون اور عزم کی پختگی تھی کہ وہ کئے بعد دیگرے اتنے قلعے سر کر کے اور اتنے معرکے لڑ کر بھی آگے بڑھنے کا فیصلہ کر چکا تھا، مگر قنوج کے متعلق اُسے جو رپورٹ ملی تھی وہ صحیح نہیں تھی۔ مہاراجہ قنوج راجیا پال نے اپنا خزانہ قنوج سے کسی پہاڑی علاقے میں منتقل کرنا شروع کر دیا تھا۔ مورخین نے لکھا ہے کہ محمود غزنوی کی پے بہ پے فتوحات اور اس کی برق رفتار یلغار کو دیکھ کر راجیا پال حوصلہ چھوڑ بیٹھا تھا۔ قنوج کے بڑے مندر کا پنڈت اُسے لڑنے کے لیے تیار کر رہا تھا مگر اُس کے پاس نہ لڑنے کی ایک وجہ اور بھی تھی جو اُس نے پنڈت کو نومبر ۱۰۱۸ء کی اس صبح اپنی خواب گاہ میں بتائی۔

"مہاراج کا خزانہ محفوظ ہو گیا ہے" — پنڈت اسے کہہ رہا تھا — "اب آپ سلطان محمود کا مقابلہ جم کر کریں، ورنہ قنوج کا مندر بھی مسجد بن جائے گا۔ یہ نہ بھولیں کہ جنہیں مسلمان بُت کہتے ہیں وہ ہمارے بھگوان ہیں۔ ان کی جو توہین ہو چکی ہے وہ آپ نے دیکھ لی ہے۔ میں آپ کو خبردار کرتا ہوں کہ آپ دیوی دیوتاؤں کے قہر سے بچ نہیں سکیں گے۔"

مہاراجہ نے پنڈت کو طنزیہ نگاہوں سے دیکھا اور دھیمی سی آواز میں بولا — "جنہیں آپ دیوی دیوتا کہتے ہیں یہ دراصل بُت ہی ہیں۔ اگر ان میں قہر برسانے کی طاقت ہے تو اپنی بے عزتی کی سزا مسلمانوں کی فوج کو کیوں نہیں دیتے؟ وہ مسجدوں میں اذانیں دینے والوں پر بجلی بن کر کیوں نہیں گرتے؟"

"مسلمانوں کی فوج دراصل دیوتاؤں کا قہر ہے جو اس دیس کے اُن مہاراجوں پر پڑ رہا ہے جو اپنے مذہب کی توہین کرا رہے ہیں" — پنڈت نے کہا — "مگر آپ مذہب کی بجائے اپنے خزانوں کی حفاظت کر رہے ہیں۔"

"وہ اس لیے کہ غزنی کا سلطان خزانے لوٹ کر غزنی لے جانے کے لیے آیا ہے" —

مہاراجہ راجیا پال نے کہا — "وہ قنوج کا خزانہ نہیں لے جا سکے گا۔ وہ مجھے قید نہیں کر سکے گا۔ وہ یہاں پاگلوں کی طرح ہمارا خزانہ ڈھونڈتا رہے گا۔ اُسے کچھ بھی نہیں ملے گا۔ اُسے میں بھی نہیں ملوں گا۔ میں وہاں ہوں گا جہاں اُس کی پوری فوج سب مجھے نہیں ڈھونڈ سکے گی۔"

"اُسے مندر مل جائیں گے" — پنڈت نے کہا — "وہ مندروں کو اجاڑے گا اور ہم کھڑے دیکھتے رہیں گے۔ مہاراج! زر و جواہرات کے پیار نے آپ کو بزدل بنا دیا ہے۔ آپ غزنی کے سلطان کو دھوکہ دینے کی سوچ رہے ہیں مگر یہ بزدلی ہے۔ آپ اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ اپنی فوج کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ آپ نہیں سمجھتے کہ جب آپ یہاں سے چوری چھپے بھاگ کر کہیں چلے جائیں گے تو آپ کی فوج اور رعایا کے دل میں آپ کے خلاف نفرت پیدا ہو جائے گی۔۔۔۔ میں بھگوان کے نام پر آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ اپنا فیصلہ بدل دیں۔ قنوج کا بچہ بچہ لڑنے مرنے کے لیے تیار ہے۔ انہیں مسلمانوں کے خلاف آگ کے بگولے بنانا میرا کام ہے۔"

"مجھے سوچنے دیں" — مہاراجہ راجیا پال نے کہا — "مجھے سوچنے دیں" — وہ پریشان ہو گیا اور بے چینی کے عالم میں کہنے لگا — "میں نے کچھ سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے۔ آپ چلے جائیں۔ میں آپ کو ہر ایک بات نہیں بتا سکتا۔"

پنڈت کے جانے کے بعد مہاراجہ قنوج راجیا پال نے اپنی فوج کے سینیئر کمانڈروں کو بلایا اور انہیں اپنے فیصلے سے آگاہ کرتے ہوئے کہا — "یہ بظاہر بزدلی ہے کہ میں غزنی والوں کا مقابلہ نہیں کروں گا، لیکن میں نے سوچا ہے کہ میں غائب ہو جاؤں گا۔ یہ محمود کے لیے بہت بڑی چوٹ ہو گی۔ وہ قنوج میں پاگلوں کی طرح سر پٹختا پھرے گا۔ وہ ابھی یہاں سے جائے گا نہیں۔ اس کا مقابلہ ابھی کسی نے بھی نہیں کیا۔ اُسے ہر جگہ آسان فتح حاصل ہوئی ہے۔ میں نے سوچا ہے کہ لڑ لڑ کر اور پیش قدمی کرتے کرتے اُس کی طاقت بہت کم ہو جائے گی۔ میں اس عرصے میں دوسرے مہاراجوں

کو ساتھ ملا کر بڑی زبردست فوج بنا لوں گا۔ پھر بھی قنوج سلطان محمود اور اس کی فوج کا قبرستان بن جائے گا۔"

وہ سلطان محمود غزنوی کا مقابلہ نہ کرنے اور غائب ہو جانے کے حق میں جواز پیش کرتا رہا مگر اس کے فوجی کمانڈروں کے چہرے بتا رہے تھے کہ وہ اپنے مہاراجہ کے فیصلے کو پسند نہیں کر رہے۔ ان میں سے کوئی بھی نہ بولا۔ سب بُت بنے سنتے رہے۔

"کیا آپ سب کو میرا فیصلہ منظور ہے؟" ــــ اُس نے سب سے پوچھا۔

"ہم آپ کے حکم کی تعمیل کریں گے" ــــ اُس کے سیناپتی (کمانڈر انچیف) نے کہا ــــ "مگر ہم میں سے کوئی بھی اپنی زبان سے یہ نہیں کہے گا کہ وہ نہیں لڑے گا۔ مہاراج! یہاں سوال آپ کے یہاں رہنے یا غائب ہو جانے کا نہیں۔ یہاں مسئلہ مذہب کا ہے۔ اس جنگ کا تعلق براہِ راست مذہب سے ہے۔ اگر ہندو راجے یوں میدان چھوڑ کر بھاگنے لگے تو سارا ہندوستان مسلمان ہو جائے گا۔"

مہاراجہ راجیا پال نے ایک کاغذ کھول کر اپنے سیناپتی کو دے کر کہا ــــ "یہ سب کو پڑھ کر سناؤ۔"

یہ لاہور کے مہاراجہ بھیم پال نڈر کا خط تھا جو اُس نے منج کے رائے چندا کو لکھا تھا۔ رائے چندا نے یہ خط قنوج کے مہاراجہ راجیا پال کو بھیج دیا تھا۔ بہت سے مؤرخوں نے اس خط کا ذکر کیا ہے۔ ان کے مطابق مہاراجہ بھیم پال نڈر نے رائے چندا کو لکھا تھا:

"سلطان محمود ہندوستان کے حکمرانوں کی طرح نہیں۔ وہ سیاہ فام آدمیوں کا سردار نہیں۔ اُس کا نام سن کر ہی فوجیں اُس کے آگے بھاگ اٹھتی ہیں۔ اُس کے گھوڑے کی لگام آپ کے گھوڑے کی لگام سے زیادہ مضبوط ہے۔ وہ ہتھیار کے ایک ہی وار سے مطمئن نہیں ہوا کرتا اور وہ سلسلۂ کوہ میں سے صرف ایک پہاڑی نہیں لیا کرتا۔ اگر آپ اُس سے محفوظ رہنا چاہتے ہیں تو میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ کہیں چھپ جائیں۔"

رائے چندا نے یہ خط اس پیغام کے ساتھ مہاراجہ راجیا پال کو بھیج دیا تھا کہ وہ لڑ کر مرنے کو ترجیح دے گا۔ اُس نے یہ خط مہاراجہ راجیا پال کو اس لیے بھیجا تھا کہ وہ اپنی قسمت کا خود فیصلہ کر لے۔

"میں جانتا ہوں غزنی کا سلطان محمود قنوج کو کھنڈر بنا دے گا" ــــ مہاراجہ راجیا پال نے کہا ــــ "لیکن یہی کھنڈر اُس کی قبر بنیں گے اور ان کھنڈروں سے نیا قنوج ابھرے گا جو ہندو مت کا محافظ ہو گا.... میں آپ سب کو یہ بتانا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ فوج کو پتہ نہ چلے کہ میں نے کیا فیصلہ کیا ہے۔"

تمام کمانڈر سر جھکائے ہوئے باہر نکل گئے۔

آدھی رات سے کچھ دیر پہلے پنڈت عبادت میں مصروف تھا۔ یہ وقت اُس کی عبادت کا نہیں تھا لیکن مہاراجہ قنوج کے فیصلے نے اسے پریشان کر دیا تھا۔ اسے اب یہی نظر آ رہا تھا کہ سلطان محمود آئے گا اور اس مندر کو اجاڑ کر اُس کے دیوتاؤں کے بُت توڑ دے گا۔ پنڈت اُس وقت سے ڈر رہا تھا اور دیوتاؤں سے کہہ رہا تھا کہ وہ مسلمانوں کو قنوج سے دور ہی فنا کر دیں۔ وہ رو بھی رہا تھا اور بڑی درد ناک آواز میں بھجن گا رہا تھا۔ اُس کا دروازہ کھلا مگر وہ عبادت میں اتنا محو تھا کہ اُسے پتہ نہ چل سکا کہ اُس کے قریب کوئی آ کے بیٹھ گیا ہے۔ وہ اُس وقت چونکا جب اُس کے کندھے پر کسی نے ہاتھ رکھا۔ اُس نے دیکھا۔ اُس کے قریب مہاراجہ قنوج کی چھوٹی رانی شکنتلا بیٹھی تھی۔

"آپ؟" ــــ پنڈت نے حیران ہو کے پوچھا ــــ "اس وقت؟.... وہ سنبھل گیا اور بولا ــــ "پہلے دیوی کے چرنوں میں ماتھا رگڑیں۔"

رانی شکنتلا نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہ ہو۔ وہ اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے تھی۔ پنڈت نے اپنے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑتی محسوس کی۔ ایک اس لیے کہ وہ شکنتلا رانی تھی اور دوسرے اس لیے کہ شکنتلا کے حُسن میں جادو کا اثر تھا۔ پنڈت کا دل اس سوال سے بڑی زور زور سے دھڑکنے لگا کہ رانی اس وقت مندر میں کیوں آئی ہے؟ وہ عبادت کے لیے نہیں آئی تھی۔ اُس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ کسی خاص مقصد کے لیے آئی ہے۔

"آپ کے چہرے پر گھبراہٹ کیوں آ گئی ہے؟" ــــ رانی شکنتلا نے کہا ــــ "کیا مجھ

جیسی خوبصورت عورت پہلے نہیں دیکھی! ... کیا میں اُن کنواریوں کے مقابلے میں کچھ نہیں جنہیں آپ منتخب کر کے اپنے پاس رکھا کرتے ہیں اور لوگوں کو یہ بتایا کرتے ہیں کہ یہ کنواریاں اب پاک ہو گئی ہیں"!

"آپ اپنا مطلب بیان کر دیں تو زیادہ بہتر ہوگا" ــــ پنڈت نے کہا ــــ "آپ دیکھ رہی ہیں کہ میں عبادت میں مصروف ہوں"۔

"مہاراج!" ــــ شکنتلا نے کہا ــــ "اگر ہم ایک دوسرے کو دھوکہ نہ دیں تو دونوں کے لیے بہتر ہوگا۔ آپ کس کی عبادت کر رہے ہیں؟ ان دیوتاؤں کی جو دو دن کے مہمان ہیں؟ ہری کشن واسدیو نے مسلمانوں کا کیا بگاڑ لیا ہے؟ کنواریوں کی قربانی کہاں گئی؟ اُن معصوموں کا خون کس کھاتے میں گیا"؟

"کیا آپ مجھے مہاراج کی طرح مذہب سے گمراہ کرنے آئی ہیں؟"

"نہیں" ــــ رانی شکنتلا نے کہا ــــ "میں آپ کو مہاراجہ بنانے آئی ہوں .... مجھے صرف یہ بتا دیں کہ خزانہ کہاں ہے۔ مجھے وہاں لے چلیں۔ ہم دونوں، میں اور آپ خزانہ لے کے کہیں چلے جائیں گے۔ ہو سکتا ہے میں آپ کو قنوج کی گدی پر ہی بٹھا دوں"۔

"کیسا خزانہ؟" ــــ پنڈت نے کہا ــــ "میں خزانے کے متعلق کچھ نہیں جانتا"۔

"میں جانتی ہوں آپ اپنا عہد پورا کر رہے ہیں" ــــ رانی شکنتلا نے کہا ــــ "لیکن آپ کو مجھے اس راز میں شریک کرنا پڑے گا۔ مجھے مذہب سے اور دیوی دیوتاؤں کے قہر سے نہ ڈرانا۔ مذہب کو میں ایک فریب کے سوا کچھ نہیں سمجھتی۔ میں صرف خزانہ حاصل کرنے نہیں آئی۔ آپ کو بھی ساتھ لے جانے آئی ہوں"۔

"مذہب کوئی سا بھی ہو، مذہب کو فریب سمجھنے والے اس دنیا میں کبھی سکھی نہیں رہے" ــــ پنڈت نے کہا ــــ "غزنی کا سلطان کیوں فتح پہ فتح حاصل کرتا جا رہا ہے؟ صرف اس لیے کہ اُسے اپنے مذہب سے اتنا پیار ہے کہ وہ سارے ہندوستان کو مسلمان بنا دینا چاہتا ہے۔ اس کے دل میں ہمارے مذہب کے خلاف نفرت بھری ہوئی ہے"۔

"ہمارا مذہب نفرت کے قابل نہیں تو اور کیا ہے؟" ــــ رانی شکنتلا نے کہا ــــ "مہاراج! میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔ آپ مجھ سے کیسی راتوں سے خزانہ کہیں لے جا کر چھپا رہے ہیں۔ آپ سمجھتے ہیں کہ اس راز سے آپ اور مہاراجہ کے سوا کوئی واقف نہیں۔ آپ نہیں جانتے کہ مجھ سے کچھ بھی پوشیدہ نہیں۔ اگر آپ نے میری راہنمائی نہ کی تو آپ کو بہت بڑا نقصان ہوگا"۔

"کیا آپ اپنے خاوند کو دھوکہ دینا چاہتی ہیں؟"

"مہاراجہ کسی ایک عورت کا خاوند نہیں ہوتا" ــــ شکنتلا رانی نے کہا ــــ "آج رات وہ کسی اور کا خاوند ہے، اس لیے آپ کے پاس آنے کا موقع مل گیا ہے۔ مہاراجہ اُس وقت تک میرا خاوند ہے جس وقت تک میرا حسن و جوانی قائم ہے ....

مہاراج! انسان جب تخت پر بیٹھ کر سر پر سونے کا تاج سجا لیتا ہے تو اُس کے اندر انسانی جذبات مر جاتے ہیں۔ وہ محبت اور خلوص سے خالی ہو جاتا ہے۔ مہاراجہ کو صرف خزانے سے محبت ہے۔ اسے ایسا کوئی غم نہیں کہ غزنی کے فوجی مجھے اور مجھ جیسی تمام جوان اور خوبصورت عورتوں کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ وہ اپنے خزانے کو بچانا چاہتا ہے۔ اُسے آپ کا اور آپ کے دیوتاؤں کا کوئی خیال نہیں۔ آپ اپنا خیال کریں اور آپ میری طرف دیکھیں"۔

"میں اس کے باوجود آپ کو خزانے کا راز نہیں دوں گا" ــــ پنڈت نے کہا۔

"پھر آپ اغوا ہو جائیں گے" ــــ شکنتلا رانی نے کہا ــــ "آپ میری آنکھ کے اشارے پر قتل ہو جائیں گے، لیکن میں آپ کو قتل نہیں کراؤں گی۔ آپ کی دونوں آنکھیں نکلوا کر اور آپ کے جسم کی کھال کہیں کہیں سے کاٹ کر آپ کو جنگل میں پھینکوا دوں گی۔ اُس موت کو تصور میں لائیں جو آپ کو بڑی آہستہ آہستہ اس دنیا سے اٹھائے گی۔ اُس اذیت کا تصور کریں جو آپ کو آہستہ آہستہ تڑپا تڑپا کر پیاسا مارے گی۔ آپ کے زخموں پر مکھیاں بیٹھیں گی اور چیونٹیاں چڑھیں گی۔ ہو سکتا ہے گدھ آپ کو زندہ ہی نوچنے لگیں"۔

پنڈت اس طرح چپ چاپ سن رہا تھا جیسے اُس کی زبان گنگ اور اُس

کے جسم کی طاقت سلب ہو گئی ہو۔ شکنتلا رانی کی آنکھوں کی چمک جس میں حسن کا سحر تھا، اب ایک چڑیل کی آنکھیں بن گئی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ، دھیمے دھیمے بول رہی تھی۔

"اور اگر میں نے آپ پر رحم کیا تو میں دوسرا طریقہ اختیار کروں گی"۔ شکنتلا رانی نے کہا ۔۔۔ "میں مہاراجہ سے کہوں گی کہ آپ نے مندر میں بلا کر مجھ پر دست درازی کی ہے۔ میں گواہ بھی لے آؤں گی۔ میں اپنے جسم پر اپنے ہی ناخنوں سے خراشیں ڈال کر کہوں گی کہ یہ آپ کے ناخنوں کی خراشیں ہیں۔ مہاراجہ آپ کی نہیں سنیں گے۔ وہ جانتے ہیں کہ ان مندروں میں کیا ہوتا ہے۔ انہیں معلوم ہے کہ ہر پنڈت اور ہر سادھو عورتوں کا شکاری ہے ..... پھر آپ کو جلاد کے حوالے کر دیا جائے گا۔ یہ موت آپ کے لیے آسان ہو گی۔"

پنڈت کے جسم نے جھرجھری لی اور وہ بولا ۔۔۔ "میں تمہیں خزانے تک لے جاؤں گا ..... کب چلو گی؟"

"ابھی" ۔۔۔ شکنتلا رانی نے کہا ۔۔۔ "لیکن یاد رکھیں کہ مہاراجہ تک یہ اطلاع پہنچی تو آپ کا انجام وہی ہو گا جو میں آپ کو بتا چکی ہوں۔ میں دس آدمی اور دس عورتیں مہاراجہ کے سامنے کھڑی کر کے ان سے کہلواؤں گی کہ آپ نے خزانے کا لالچ دے کر مجھے اپنے ساتھ بھاگ چلنے کو کہا تھا اور میں آپ کو موقع پر گرفتار کرانے کے لیے خزانے تک ساتھ چل گئی تھی۔"

"خزانہ اٹھوانے کے لیے بہت سے آدمیوں کی ضرورت ہے" ۔۔۔ پنڈت نے کہا ۔۔۔ "یہ انتظام خفیہ طریقے سے کیسے ہو گا؟"

"میں آج رات صرف جگہ دیکھنا چاہتی ہوں" ۔۔۔ شکنتلا رانی نے کہا ۔۔۔ "سارا انتظام میرا ہو گا اور خفیہ ہو گا اور آپ کو میں اپنے ساتھ رکھوں گی۔ آپ کے ساتھ دھوکہ نہیں ہو گا۔"

پنڈت اٹھ کھڑا ہوا۔

طلال ابراہیم اور صالح برک نے رات چٹان پر گزاری تھی۔ صبح ہوئی تو طلال نے کہا کہ وہ اس شگاف کے اندر جانا چاہتا ہے۔ صالح نے اسے کہا کہ سب سے پہلے انہیں وہ کام کرنا چاہیے جس کے لیے وہ ادھر آئے ہیں مگر طلال کی ضد کام کر گئی۔ پنڈت ان آدمیوں کو جن کی آنکھوں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں جس شگاف میں لے گیا تھا، دن کی روشنی میں ڈراؤنا دکھائی دے رہا تھا۔ وہاں سے چٹان نے عجیب سی شکل اختیار کر لی تھی۔ عمودی اور خاصی اونچی دیوار سی تھی۔ اس میں شگاف ایسے تھا جیسے کنوئیں کی دیوار ایک طرف سے گرا دی گئی ہو۔ اس میں سے پیچھے کی چٹان جو کنوئیں کی تھی نظر آ رہی تھی۔

طلال اور صالح اس کے اندر چلے گئے۔ یہ ایک وسیع کنواں تھا جو قدرت نے زمین پر بنایا تھا۔ چٹان میں پتھر بھی تھے مٹی بھی۔ اوپر کے درخت جھک کر اس پر سایہ کیے ہوئے تھے۔ دیواروں میں بھی درخت تھے جو اوپر چلنے کی بجائے زمین کے ساتھ متوازی ہو گئے تھے۔ ان کے سائے نے اندھیرا سا کر رکھا تھا۔ اس کنوئیں میں جگہ جگہ پانی کھڑا تھا جو پانی کم اور دلدل زیادہ تھی۔ اس کے کناروں اور چٹان کے درمیان چلنے کے لیے تھوڑا سا خشک راستہ تھا۔ طلال اور صالح اس راستے پر چلتے چلتے آگے گئے تو سامنے والی چٹان کے دامن میں مٹی کی ایک ٹیکری تھی۔ پنڈت کے آدمی یہیں کہیں غائب ہوئے تھے۔

دونوں ٹیکری پر چڑھے تو انہیں چٹان میں ایک دہانہ نظر آیا جو جھکے ہوئے ایک درخت اور جھاڑی نما درختوں میں چھپا ہوا تھا۔ وہ دہانے میں چلے گئے۔ اندر کمرے کی طرح کا غار تھا جس میں آسانی سے کھڑا ہوا جا سکتا تھا۔ یہ گول سا کمرہ تھا۔ اندر اندھیرا اتنا تھا کہ کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ دونوں نے بہت ٹٹولا مگر وہاں مٹی اور پتھروں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ ایک جگہ ایک اور دہانہ کھلا ہوا تھا جو دراصل سرنگ تھی۔ یہ اس قدر اندھیری تھی کہ کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ اندر کیا ہے۔

"اگر تم اکیلے یہاں رہنا چاہو تو رہ سکتے ہو" ۔۔۔ صالح برک نے طلال ابراہیم سے کہا ۔۔۔ "میں جا رہا ہوں۔"

طلال بے دلی سے باہر کو چل پڑا۔ وہ بار بار پیچھے دیکھتا تھا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ اپنے فرض کو بھول چکا ہے۔ جنگل کا یہ گوشہ کچھ پراسرار اور خوفناک سا تھا۔ صالح برک طلال کو اپنے ساتھ لے گیا اور دونوں پانچ چھ میل دور ایک چٹان پر چڑھ گئے جہاں سے

انہیں قنوج کا قلعہ اور شہر نظر آرہا تھا۔ وہاں انہیں کوئی فوجی نقل و حرکت نظر نہیں آرہی تھی۔

"سلطان منبج کے قریب پہنچ چکا ہوگا"۔۔۔ صالح نے کہا۔ "اور ہمیں کچھ نظر نہیں آرہا۔"

"ہم دو آدمی پیدل کتنے علاقے کو دیکھ سکتے ہیں؟"۔۔۔ طلال نے کہا۔ "ہو سکتا ہے قنوج کی فوج رات کو کسی اور راستے سے منبج کے قریب چلی گئی ہو۔"

"ہر جگہ ہمارے آدمی موجود ہیں"۔۔۔ صالح نے کہا۔ "میں یقین سے کہتا ہوں کہ قنوج سے فوج باہر نہیں نکلی۔"

وہ سارا دن گھومتے پھرتے رہے اور رات اُسی جگہ چلے گئے جہاں گزشتہ رات سوئے تھے۔ صالح نے طلال سے کہا تھا کہ وہ ساری رات وہاں گزاریں گے۔ آدھی رات تک سوئیں گے۔ پھر قنوج کے قریب چلے جائیں گے کیونکہ فوج کی نقل و حرکت کی توقع رات کو ہی کی جا سکتی تھی۔

دونوں اُسی جگہ چٹان کے اُوپر لیٹ گئے۔ وہ اتنے تھکے ہوئے تھے کہ لیٹتے ہی سو گئے۔

آدھی رات سے ذرا پہلے صالح بردک کی آنکھ کھل گئی۔ اُسے گھوڑوں کے قدموں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اُس نے طلال ابراہیم کو جگایا۔ گھوڑے قریب آرہے تھے۔ ذرا دیر بعد روشنی نظر آنے لگی۔

"ہمارا کام ہوتا نظر آرہا ہے"۔۔۔ صالح نے کہا۔ "یہ آوازیں دو یا تین گھوڑوں کی ہیں۔ فوج آرہی ہوگی۔"

دونوں پیٹ کے بل رینگ کر آگے ہو گئے جہاں سے وہ کسی کو نظر آئے بغیر نیچے دیکھ سکتے تھے۔ انہیں دو گھوڑے آتے دکھائی دیئے۔ ایک سوار کے ہاتھ میں جلتی ہوئی مشعل تھی۔ وہ قریب آئے تو طلال نے کہا ۔۔۔ "یہ کل رات والا آدمی معلوم ہوتا ہے، اور دوسری عورت ہے۔"

"لعنت بھیجو"۔۔۔ صالح نے کہا۔ "ان کا فوج کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔"

وہ سوار کنواں نما چٹان کے شگاف میں آرُکے اور اِدھر اُدھر دیکھ کر گھوڑے اندر لے گئے ۔۔۔ ایک تو پنڈت تھا اور دوسری شکنتلا رانی تھی ۔۔۔ وہ اندر جا کر غار کے دہانے کے سامنے والی ٹیکری کے قریب رکے اور گھوڑوں سے اُتر کر ٹیکری پر جا چڑھے اور غائب ہو گئے۔

"میں تمہیں کہہ رہا ہوں کہ چل کے دیکھتے ہیں یہ ہے کیا"۔۔۔ طلال نے صالح سے کہا ۔۔۔ "یہ ایک مرد اور ایک عورت ہے۔ تم نے عورت دیکھی ہے۔ یہ کوئی معمولی سی قسم کی عورت نہیں۔ شہزادی معلوم ہوتی ہے۔"

صالح بردک کو نہ پنڈت کے ساتھ دلچسپی تھی نہ عورت کے ساتھ لیکن طلال ابراہیم اتنی تیزی سے چٹان سے اُتر گیا کہ صالح اُسے روک نہ سکا۔ وہ بھی اُس کے پیچھے پیچھے چلا گیا۔ دونوں نے کپڑوں کے اندر ایک ایک تلوار اور ایک ایک خنجر چھپا رکھا تھا۔ دونوں نے تلواریں نکال لیں اور اندھیرے میں دلدل کے کنارے کنارے غار کے دہانے تک پہنچ گئے۔ اندر سے روشنی آرہی تھی۔ پنڈت اور شکنتلا رانی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ اُن کے سوا یہاں کوئی اور انسان موجود ہے۔ ان کی باتیں باہر سنائی دے رہی تھیں۔

"رانی!"۔۔۔ پنڈت کہہ رہا تھا۔ "خزانہ یہاں ہے۔ میں تمہیں ایک بار پھر کہتا ہوں کہ واپس چلی جاؤ۔"

"یہاں تو کچھ بھی نہیں"۔۔۔ رانی نے کہا۔ "کیا خزانہ اس فرش کے نیچے ہے؟"

"اور اب میں تمہیں قتل کر سکتا ہوں"۔۔۔ پنڈت نے کہا۔ "تم نے مجھے دھمکیاں دی تھیں اور مجھے بھیانک انجام سے ڈرایا تھا۔ اب بتاؤ تمہیں مجھ سے کون بچا سکتا ہے۔ تمہاری لاش ایسی جگہ چھپاؤں گا کہ کسی کو ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گی۔"

"ہوش میں آؤ پنڈت!"۔۔۔ رانی شکنتلا نے کہا۔ "کیا اس تنہائی میں آپ مجھ جیسی عورت کو ٹھکرا سکیں گے؟ ...."

"پنڈت جی مہاراج! میں پھر کہتی ہوں کہ اپنے آپ کو فریب نہ دو۔"

"مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ رانی!"۔۔۔ پنڈت کی آواز سنائی دی ۔۔۔ کسی کر

مدد کے لیے بلانا چاہتی ہو تو پورے زور سے چیخو۔"

"نہیں مہاراج!" — شکنتلا کی التجا سنائی دی۔ "خنجر نہ نکالو۔ ایک بار پھر میری بات سن لو۔"

ایسی آوازیں آئیں جیسے پنڈت نے شکنتلا کو پکڑ لیا ہو۔ وہ اس طرح بول رہی تھی جیسے اپنے آپ کو اس سے بچانے کے لیے اس وسیع غار میں بھاگ رہی ہو۔

پنڈت اُسے پکڑنے کو دوڑ رہا تھا۔ مشعل کا ڈنڈا زمین میں گڑا ہوا تھا۔ کمرہ نما غار روشن تھا۔ پنڈت رانی کے پیچھے دوڑتے دوڑتے رک گیا اور غار کے دہانے کی طرف دیکھنے لگا۔ شکنتلا رانی نے بھی اُدھر دیکھا اور رُک گئی — غار کے دہانے میں دو آدمی جو لباس سے خانہ بدوش گڈریے لگتے تھے، ہاتھوں میں تلواریں لیے کھڑے تھے۔ پنڈت اور شکنتلا پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا ہو۔ طلال اور صالح بھی خاموشی سے کھڑے رہے۔

"تم یہاں کیا لینے آئے ہو؟" — پنڈت نے سنبھلتے ہوئے بڑے رعب سے کہا — "چلے جاؤ۔ یہاں ہمارے بہت سے آدمی ہیں۔ تمہاری بوٹی بھی نہیں ملے گی۔"

"خنجر پھینک دو" — طلال ابراہیم نے دھیمی سی آواز میں کہا — "اور دونوں آگے آؤ، اور ہمیں بتاؤ کہ یہاں کیا ہے اور یہاں کیا کر رہے ہو۔"

پنڈت کھسیانی سی ہنسی ہنس کر بولا — "ہم مسافر ہیں۔ قنوج جا رہے ہیں۔ یہ میری بیوی ہے۔ باہر ہمارے گھوڑے کھڑے ہیں۔ یہاں رات گزارنے کے لیے رک گئے ہیں۔"

صالح بردک ...وش کھڑا تھا۔ طلال نے آگے بڑھ کر پنڈت کے ہاتھ سے خنجر لے لیا اور اپنی تلوار کی نوک پنڈت کی شہ رگ پر رکھ کر پوچھا — "سچ بتاؤ یہاں کیا ہے۔ ہم خود بھی ڈھونڈ سکتے ہیں لیکن اس صورت میں تم زندہ نہیں رہو گے اور یہ عورت ہمارے قبضے میں ہو گی" — اُس نے شکنتلا کی طرف دیکھ کر کہا — "اپنا انجام سوچ لو۔"

"یہاں خزانہ ہے" — شکنتلا رانی نے کہا — "میں تمہیں منہ مانگا حصہ دوں گی۔ لے کر چلے جانا۔"

"ہاں!" — پنڈت نے کہا — "یہ ٹھیک کہتی ہے۔ یہاں خزانہ ہے۔"

"کہاں سے آیا ہے خزانہ؟" — طلال نے پوچھا — "اور تم دونوں کون ہو؟" ....

"میں قنوج کے بڑے مندر کا پنڈت ہوں اور یہ مہاراجہ قنوج کی رانی ہے" — پنڈت نے کہا — "اگر تم انعام وصول کرنا چاہتے ہو تو میں دے دوں گا مگر تمہیں یہاں سے جانا پڑے گا۔"

"یہ فیصلہ ہم خود کریں گے کہ ہم چلے جائیں گے یا یہیں رہیں گے" — طلال نے کہا — "تم یہ بتاؤ کہ خزانہ کہاں ہے؟"

"آؤ" — شکنتلا رانی نے مسکرا کر طلال کا بازو پکڑا اور اُسے غار کے دہانے کی طرف لے جاتے ہوئے بولی — "میں تمہیں بتاتی ہوں کہ خزانہ کہاں ہے۔"

طلال اس کے ساتھ چل پڑا۔ صالح بردک نے اُسے روکا مگر طلال نے اس کی ایک نہ سنی اور شکنتلا رانی کے ساتھ باہر نکل گیا۔ صالح فیصلہ نہ کر سکا کہ وہ کیا کرے۔ وہ پنڈت کو اکیلے چھوڑنے میں خطرہ محسوس کر رہا تھا کہ ہو سکتا ہے کہ اس کے کچھ آدمی قریب ہوں اور یہ انہیں بلا لے۔ وہ طلال کو شکنتلا جیسی حسین عورت کے ساتھ بھی نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ وہ شش و پنج میں پڑا ہوا پنڈت کے سامنے کھڑا رہا۔ اسے یہ احساس پریشان کر رہا تھا کہ اُس کا ساتھی اگر زندہ واپس آ گیا تو اُس پر اس عورت کا جادو سوار ہو چکا ہو گا۔

شکنتلا اور طلال کچھ دیر بعد واپس آئے۔ طلال کا چہرہ اور اُس کی چال ڈھال بتا رہی تھی کہ وہ بالکل بدل گیا ہے اور اپنے فرض کو وہ دل سے اتار چکا ہے۔ اس نے آتے ہی پنڈت سے کہا کہ وہ بتا دے کہ خزانہ کہاں ہے۔

صالح بردک نے گرج کر کہا — "طلال! باہر نکلو یہاں سے!"

طلال نے صالح کی طرف دیکھا پھر پنڈت اور شکنتلا رانی سے کہا — "تم دونوں وہاں دیوار کے ساتھ بیٹھ جاؤ" — اور وہ صالح کو ان سے دور لے گیا۔ کہنے لگا — "میری بات غور سے سنو صالح بردک! میں اپنے فرض سے کوتاہی نہیں کر رہا۔ میں تمہیں دھوکہ نہیں دے رہا۔ یہاں سے ہم دونوں کو کچھ وصول ہو جائے تو کیا برا ہے؟"

"طلال!" — صالح نے کہا — "تمہارے جسم سے مجھے اس ناپاک عورت کی بد

آرہی ہے۔ عورت میں صرف یہ طاقت ہوتی ہے کہ وہ عورت ہے اور مرد کا مرد ہونا اس کی کمزوری ہے۔ میں جانتا تھا وہ تمہیں باہر کیوں لے گئی تھی۔ تم کہتے ہو کہ تم مجھے دھوکہ نہیں دو گے؟ .... ہمارے درمیان ایک عورت اور سونے کے چند ایک ٹکڑے آ گئے تو ہم دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جائیں گے۔ سلطان محمود غزنوی کی فتح اور شکست کا انحصار ہم دونوں پر ہے۔"

"غور سے سنو صالح بھائی!" — طلال نے کہا۔ "ہم ہندوستان کے رہنے والے ہیں۔ غزنی والے ہمیں کیا دیتے ہیں؟ کیا اپنی جان کو خطرے میں ڈالنے کا اتنا سا ہی معاوضہ ہونا چاہئے جو ہمیں غزنی کی فوج سے ملتا ہے؟"

"ہم نے جو فرض اپنے ذمے لیا ہے اس کا معاوضہ خدا دے گا۔" صالح بول کر نے کہا۔ "تم اپنے آپ کو غزنی کی فوج کا ملازم نہ سمجھو۔ ہم اسلام کے مجاہدین ہیں۔"

"اتنا خزانہ نہ چھوڑو صالح!"

"اپنا حلف یاد کرو"— صالح نے کہا۔ "ہم نے قرآن مجید ہاتھ میں لے کر حلف اٹھایا تھا کہ جان پر کھیل کر فرض ادا کریں گے اور دھوکہ نہیں دیں گے اور ہمارے قدموں میں خزانے رکھ دیئے گئے تو بھی قبول نہیں کریں گے اور ایمان کے پکے رہیں گے .... طلال! موت کا کوئی بھروسہ نہیں کب آ جائے۔ یہ خزانے دنیا میں دھرے رہ جائیں گے۔"

"مجھے آزمالینا"— طلال نے کہا۔ "تم یہیں رہو۔ مجھے یہاں سے کچھ وصول کر لینے دو۔"

طلال نے پنڈت سے کہا— "اٹھو اور مجھے خزانے تک لے چلو۔"

"ہاں مہاراج!"— شکنتلا رانی نے بھی پنڈت سے کہا— "اب ہم زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتے۔"

پنڈت نے اٹھ کر غار کی دیوار پر ایک جگہ انگلی رکھی اور طلال اور صالح سے کہا — "دونوں تلواریں برچھیوں کی طرح یہاں مارو۔"

صالح کھڑا رہا۔ طلال نے آگے بڑھ کر اس جگہ تلوار ماری تو تلوار نصف سے زیادہ اندر چلی گئی۔ اُس نے صالح کو بلایا۔ صالح نے کہا— "مجھے تمہارے خزانے کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں۔"— اُس نے تلوار اُس کی طرف پھینک کر کہا— "یہ لو۔ اپنے ہاتھ سے کر دو جو کرنا ہے۔"

پنڈت نے تلوار اُٹھالی اور طلال کی تلوار کے قریب دیوار میں اتار دی اور بولا — "اب تلواروں کو دائیں طرف دباؤ۔"

دونوں نے تلواریں ایک طرف دبائیں تو مٹی کا ایک گول اور بہت بڑا تو دہ سا جو گول سِل کی شکل کا تھا، آہستہ آہستہ دیوار سے الگ ہونے لگا۔ اس سے پہلے بالکل پتہ نہیں چلتا تھا کہ یہ سِل نما تودہ یہاں ہے۔ زور لگانے سے یہ باہر کو گر پڑا اور ایک سرنگ کا دہانہ نظر آنے لگا۔

"رانی! اس سرنگ میں داخل ہو جاؤ"— پنڈت نے شکنتلا سے کہا اور طلال کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا— "تم بھی اندر چلے جاؤ۔ میں مشعل لے کر تمہارے پیچھے آؤں گا"— اُس نے صالح سے پوچھا— "اور تم؟"

صالح نے سر ہلا کر کہا "نہیں"— اور پنڈت کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

شکنتلا رانی جھک کر تیزی سے سرنگ میں داخل ہو گئی۔ اُس کے پیچھے طلال بھی اندر چلا گیا۔ پنڈت نے انہیں کہا کہ وہ اندھیرے سے نہ گھبرائیں۔ آگے بڑھتے جائیں۔ صالح کا خیال تھا کہ پنڈت مشعل اٹھا کر اُن کے پیچھے جائے گا مگر پنڈت نے مشعل کی طرف دیکھا تک نہیں۔ ذرا ہی دیر بعد سرنگ کے اندر بڑی زور کی سرسراہٹ پھر دھماکہ سنائی دی اور اس کے فوراً بعد شکنتلا رانی کی گھٹی گھٹی چیخیں سنائی دینے لگیں۔ پنڈت نے صالح کی طرف دیکھا اور اُس کی مسکراہٹ اور زیادہ پھیل گئی۔ اندر سے طلال کی آواز آئی— "صالح! نکالو یہاں سے مجھے!"

صالح دوڑ کر آگے بڑھا تو پنڈت نے راستے میں آ کر اُسے روک لیا۔ بولا — "تم نے کہا تھا کہ تمہیں خزانے کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں۔ تم یہیں رہو۔ تم جیسے آدمی کو زندہ رہنا چاہیے۔"

سرنگ کے دُور اندر سے شکنتلارانی اور طلال ابراہیم کی چیخ وپکار سنائی دے رہی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کنوئیں میں چیخ چلا رہے ہوں۔ صالح بروک حیرت زدہ تھا کہ یہ کیا ہے۔ وہ چُپ چاپ پنڈت کو دیکھے جا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اُس نے پنڈت سے پوچھا کہ وہ دونوں کیوں چلا رہے ہیں۔ پنڈت نے فرش میں گری ہوئی مشعل اٹھائی اور صالح سے کہا کہ وہ اُس کے پیچھے رہے۔ وہ خود مشعل آگے کر کے سرنگ میں چلا گیا۔ صالح اُس کے پیچھے گیا۔ پندرہ بیس قدم آگے جا کر پنڈت رُک گیا اور صالح سے کہا کہ وہ اُس کے پہلو میں آ جائے اور اس سے آگے ذرا سا بھی نہ بڑھے۔

پنڈت نے مشعل نیچے کر دی۔

صالح بروک نے آگے ہو کر دیکھا۔ وہاں ایک کنواں تھا جو دراصل بڑا گہرا گڑھا تھا۔ اس میں سے شکنتلارانی اور طلال کے کراہنے کی آوازیں آ رہی تھیں جو دبتی جا رہی تھیں۔

”چلو۔ اب یہاں سے نکل چلو“۔ پنڈت نے صالح سے کہا۔

وہ سرنگ سے نکلے تو پنڈت فرش پر بیٹھ گیا اور بولا ”میرے سامنے بیٹھ جاؤ اور دوستوں کی طرح باتیں کریں“۔

”پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ یہ سب کیا ہے؟“ صالح نے پوچھا ”تم نے تو انہیں خزانہ نکالنے کے لیے اندر بھیجا تھا؟“

”پہلے تم بتاؤ کہ تم کون ہو“۔ پنڈت نے صالح بروک سے پوچھا ”اگر تم نہیں بتانا چاہتے تو میں بتا دیتا ہوں کہ تم کون ہو۔ تم مسلمان ہو اور تم ہندوستان کے مسلمان ہو اور تم غزنی کی فوج کے جاسوس ہو.... کیا میں نے غلط کہا ہے؟“

”آپ نے ٹھیک کہا ہے“۔ صالح نے کہا ”اب آپ میرے سوال کا جواب دیں“۔

”جس گہرے گڑھے میں یہ دونوں گرے ہیں ان میں ہندوستان کے سب سے زیادہ زہریلے سانپ ہیں جو ان دونوں کو ختم کر چکے ہیں“۔ پنڈت نے کہا ”یہ گڑھا میں نے کھدوایا تھا اور اس میں سانپ بھی میں نے ہی چھوڑے تھے۔ اس گڑھے کے اُوپر میں نے سرکنڈے رکھوا کر اوپر مٹی ڈلوا دی تھی۔ اگر یہ دونوں مشعل لے کر جاتے تو بھی گڑھے میں گرتے کیونکہ مٹی انہیں پتہ نہ چلنے دیتی کہ نیچے سرکنڈے اور ان کے نیچے

زہریلی موت ہے“۔

”خزانہ کہاں ہے؟“

”اسی جگہ ہے“۔ پنڈت نے کہا ”اگر اسی سرنگ سے خزانے تک پہنچنا ہو تو گڑھے پر لکڑی کا تختہ رکھ کر اُس پر چل کے آگے جانا ہو گا۔ ایک راستہ محفوظ بھی ہے“۔

”مجھے راستہ نہ بتاؤ“۔ صالح نے کہا ”ورنہ میں اپنے راستے سے بھٹک جاؤں گا“۔

”غور سے سنو میرے دوست!“ پنڈت نے کہا ”میں تمہیں بڑے کام کی ایک بات بتانا چاہتا ہوں اور یہ بات اس لیے بتا رہا ہوں کہ تم میں طمع نہیں۔ کہتے ہیں کہ جہاں خزانہ دفن ہوتا ہے وہاں سانپ ضرور ہوتا ہے جو خزانے کی رکھوالی کرتا ہے.... یہ بالکل غلط ہے۔ کہنے والوں نے یوں کہا تھا کہ خزانہ زہریلے سانپ کی طرح زہریلا ہوتا ہے۔ جس نے خزانہ حاصل کر لیا وہ سانپ بن جاتا ہے۔ وہ اس ڈر سے کہ کوئی اُس سے خزانہ چھین نہ لے وہ ہر کسی کو ڈستا پھرتا ہے۔ میرے دوست! تم ابھی جوان ہو۔ تم نے دنیا نہیں دیکھی۔ میرا تجربہ ہے کہ جس کے دل میں زر و جواہرات کا پیار پیدا ہُوا وہ انسان نہیں رہا۔ اس گڑھے میں جو سانپ ہیں وہ انسان کے گناہ ہیں۔ ان میں ایک کا نام حرص ہے۔ دوسرے کو ہوس کہتے ہیں۔ تیسرے کو ریاکاری کہہ لو۔ ہر سانپ ایک گناہ ہے۔ یہ سارے سانپ انسان کے ارد گرد اور پاؤں کے نیچے رینگتے رہتے ہیں۔ انسان مذہب سے منحرف ہو کر جب یہ سوچ لیتا ہے کہ اُسے سونا اور ہیرے مل گئے تو وہ دنیا کو زیر کر لے گا تو وہ عقل کا اندھا ہو جاتا ہے۔ ذرا سا اشارہ ملنے پر وہ دوڑ پڑتا ہے اور اُس گڑھے میں جا گرتا ہے جہاں اُس کے گناہ اُسے ڈس لیتے ہیں۔ یہ خزانہ میں بھی نکال سکتا تھا۔ میرے سوا اس کا راز کسی کو معلوم نہیں۔ جس کا یہ خزانہ ہے اُسے بھی معلوم نہیں، لیکن جب سے یہ راز میرے سینے میں آیا ہے، میں رات رات بھر عبادت میں مصروف رہتا ہوں کہ میں گمراہ نہ ہو جاؤں“۔

”اگر تمہارا مذہب سچا ہوتا تو کبھی گمراہ نہ ہوتے“۔ صالح نے کہا ”مجھے دیکھو۔ تم نے بتا دیا ہے کہ سانپوں والے کنوئیں پر تختہ رکھ کر خزانے تک جا سکتے ہیں مگر مجھے اس خزانے

کا ذرا سا بھی خیال نہیں آرہا۔ میری نظر اپنے فرض پر ہے اور میری ایک بات غور سے سُن لو پنڈت! میں اپنا فرض تم سے پورا کرا دوں گا۔ میں نے قرآن پر ہاتھ رکھ کر اور خدا کو حاضر ناظر جان کر قسم کھا رکھی ہے کہ اپنے فرض پر فنا ہو جاؤں گا اور اپنی جان قربان کر دوں گا۔ تمہاری جان میری مٹھی میں ہے۔ اگر تم نے مجھے ان سوالوں کے جواب نہ دیئے جو میں پوچھوں گا تو میں تمہیں سانپوں کے کنوئیں میں پھینک دوں گا۔"

"کیا تم اپنے آپ کو اس قدر بہادر اور عقل مند سمجھتے ہو؟" — پنڈت نے کہا۔

صالح ہنس پڑا مگر اُس کی ہنسی فوراً بجھ گئی۔ پنڈت نے بجلی کی سی پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اُس نے ایک ہاتھ میں مشعل لے لی تھی اور اُس کے دوسرے ہاتھ میں تلوار تھی۔ مشعل کا ڈنڈا تلوار سے زیادہ لمبا تھا۔ پنڈت اتنی تیزی سے اُٹھا تھا کہ صالح کو ہلنے کی بھی مہلت نہیں ملی تھی۔

"تمہارے پاس تلوار ہے" — پنڈت نے اُسے للکارا — "آؤ۔ تم اپنا فرض ادا کرو۔ میں اپنا فرض ادا کرتا ہوں۔"

صالح برک تلوار سونت کر اُس کی طرف بڑھا اور اُس نے جب وار کیا تو پنڈت نے جلتی ہوئی مشعل اتنی آگے کر دی کہ صالح کا چہرہ جھلسنے لگا اور اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ پنڈت نے چلا کر کہا۔ "بچو میرے وار سے" — صالح اچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔ پنڈت نے کہا — "میں تمہیں لڑنے کا پورا موقع دوں گا۔ اپنا فرض ادا کرلو۔"

صالح برک نے پینترا بدل کر حملہ کیا مگر پنڈت اس کے ہر وار سے پہلے مشعل آگے کر دیتا تھا۔ صالح نے مشعل پر وار کرنے شروع کر دیئے مگر پنڈت نے ہر وار سے مشعل بچالی۔ وہ ابھی حملہ نہیں کر رہا تھا۔ صالح وار پہ وار کیے جا رہا تھا۔ اُس کے دو تین وار غار کی دیوار پر پڑے۔ اچانک پنڈت نے اُس پر تابڑ توڑ وار شروع کر دیئے۔ صالح نے ہر وار تلوار پر روکا مگر مشعل اُسے پیچھے ہٹا رہی تھی۔ پنڈت نے ایک وار ایسا کیا کہ صالح کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ گئی۔ وہ تلوار اُٹھانے لگا تو پنڈت کا ایک اور وار بچانے کے لیے بیٹھ گیا۔ پنڈت نے مشعل اُس کے چہرے کے قریب کی تو صالح پیچھے ہٹا۔ وہ بیٹھے بیٹھے پیچھے ہٹ رہا تھا۔ وہ دیکھ نہ سکا کہ وہ اُس سرنگ

میں چلا گیا ہے جو سانپوں والے کنوئیں تک جاتی ہے۔

"دیکھو تم کہاں ہو" — پنڈت نے کہا۔ "تمہارے پیچھے بھی موت ہے آگے بھی موت ہے۔ کہو زندگی چاہتے ہو یا موت؟"

"میں خزانے کے لیے نہیں مر رہا" — صالح برک نے کہا۔ "دشمن سے لڑتے ہوئے مر رہا ہوں۔ مجھے یہی موت چاہیئے۔ آگے آؤ پنڈت۔ نہتہ لڑوں گا۔"

پنڈت نے ہنس کر کہا — "باہر آجاؤ۔ تم نہیں مرو گے" — اور پنڈت سرنگ سے باہر نکل گیا۔

صالح برک شکست خوردہ سا ہو کے سرنگ سے باہر آیا۔ پنڈت نے مشعل کا ڈنڈا زمین میں گاڑ دیا اور تلوار پھینک کر بیٹھ گیا۔ اُسے جیسے خطرہ نہیں تھا کہ صالح اس پر حملہ کرے گا۔

"بیٹھ جاؤ" — اُس نے صالح سے کہا۔

"تم نے مجھے قتل کیوں نہیں کیا؟" — صالح نے باوقار لہجے میں پوچھا — "مجھے دھکیلتے ہوئے سانپوں کے کنوئیں میں کیوں نہ گرنے دیا؟"

"کیونکہ میرے دل نے تمہیں پسند کیا ہے" — پنڈت نے کہا — "تم میری طرح فرض شناس ہو اور تمہارے دل میں اپنے مذہب کا احترام ہے اور جواہرات کا لالچ نہیں۔ مجھے جنگ و جدل سے نفرت ہے۔ میں مذہب کا پرستار ہوں لیکن سپاہی ہوں۔ تم نے دیکھ لیا ہے ... تم نے جس طرح خزانے کو ٹھکرایا ہے اس کا میں تمہیں انعام دینا چاہتا ہوں۔"

"اگر تم مجھے انعام دینا چاہتے ہو تو وہ چیز دو جو میں مانگوں" — صالح نے کہا — "مجھے اس خزانے میں سے ذرا سا بھی انعام نہیں چاہیئے۔ جو تم نے یہاں چھپا رکھا ہے۔"

"بولو کیا مانگتے ہو" — پنڈت نے کہا۔

"قنوج کی فوج سلطان محمود سے کہاں لڑے گی؟" — صالح نے پوچھا — "قلعے میں محصور ہو کر یا باہر آکر؟"

"سنو میرے مسلمان دوست!" — پنڈت نے کہا — "ہم ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ مجھے تمہیں ایسی کوئی بات نہیں بتانی چاہیئے جو میرے ملک کے نقصان کا اور سلطان محمود کی فتح کا باعث بنے لیکن میں صرف اس لیے تمہیں کام کی ایک بات بتا دیتا ہوں کہ تم ایمان اور اخلاق کے پکے ہو اور تمہیں اپنے فرض کے ساتھ پیار ہے۔ میں تمہیں بہت بڑا انعام دے رہا ہوں۔ یہیں سے واپس چلے جاؤ اور اپنے سلطان سے کہنا کہ قنوج کا رُخ نہ کرے۔ ہمارا مہاراجہ عہد کر چکا ہے کہ وہ سلطان کو قنوج میں زندہ جلائے گا اور وہ گنگا اور جمنا کے درمیان کا یہ علاقہ غزنی کی فوج کا قبرستان بنا دے گا۔"

"کیا تمہارے مہاراجہ کے پاس اتنی طاقتور فوج ہے؟" صالح برودک نے پوچھا۔

"جب کوئی فوج اپنے دشمن کو فنا کرنے کا تہیہ کر لیتی ہے تو وہ اپنی طاقت اور تعداد کو نہیں دیکھا کرتی" — پنڈت نے کہا — "قنوج کی فوج کا ہر ایک سپاہی غزنی کے سلطان سے ہر اُس مندر کی توہین کا انتقام لینے کے لیے تیار ہو چکا ہے جو اُس نے یہاں آکر اجاڑا ہے ..... لیکن میرے دوست! مہاراجہ قنوج اکیلا نہیں۔ لاہور کے مہاراجہ بھیم پال نندر کی فوج بھی پہنچ گئی ہے۔"

"کہاں ہے؟"

"یہ نہیں بتاؤں گا" — پنڈت نے کہا — "میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ اپنے سلطان کو جا کر خبردار کر دو۔ وہ خوش ہو کر تمہیں انعام دے گا۔ اُسے بتاؤ کہ اس جنگل میں اُس کے لیے جال بچھایا جا چکا ہے۔ وہ اس جال سے نہیں نکل سکے گا۔ اُس کی فوج کا وہی انجام ہو گا جو مہابن کی فوج کا اُس کی فوج کے ہاتھوں ہوا تھا۔ مہابن کی فوج جمنا میں ڈوب گئی تھی۔ اب غزنی کی فوج کو اس دریا میں ڈوبنا ہے۔ بھیم پال نندر کی فوج کے علاوہ یہاں ایک فوج اور بھی ہے۔ یہ متھرا، بلند شہر، مہابن وغیرہ کی شکست خوردہ فوجوں کے بھاگے ہوئے سپاہی ہیں جو قنوج میں آئے تو ان کی ایک فوج بنا لی گئی۔ یہ لوگ انتقام کی آگ میں جل رہے ہیں۔ تمہارے سلطان کو قنوج کے محاصرے کا موقع ہی نہیں ملے گا ..... اور میرے دوست! حقیقت یہ ہے کہ غزنی کے سلطان محمود کا مقابلہ کبھی بھی نہیں ہوا اگر

اب اُس کی اپنی فوج مقابلے کے قابل نہیں رہی۔ ہمارے مہاراجوں نے اُسے موقع دیا ہے کہ وہ قنوج کے جال تک آ جائے۔ وہ آ رہا ہے۔ جاؤ اور اُسے روک دو۔ اُسے کہو کہ انسانوں کا ناحق خون بہانے اور پردیسی سپاہیوں کو یہاں لا کر مروانے سے باز آ جاؤ اور یہاں زندہ جلنے کی بجائے غزنی جا کر بادشاہوں کی طرح مرو۔"

وہ باہر نکل آئے۔ باہر دو گھوڑے کھڑے تھے۔ پنڈت نے صالح برودک سے کہا کہ ایک گھوڑا شکنتلا رانی کا ہے جو اندر مری پڑی ہے اس لیے یہ گھوڑا صالح لے جائے۔

اگلے روز پنڈت مہاراجہ قنوج راجیا پال کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اُس نے مہاراجہ کو بتایا کہ اُس کی چہیتی رانی شکنتلا کو غزانہ کھا گیا ہے۔ اُس نے پوری تفصیل سے اُس کی ہلاکی کی موت کا واقعہ سنایا۔ مہاراجہ پر جیسے اس کا کچھ اثر نہ ہوا ہو۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی اور اُس نے پنڈت کو خراجِ تحسین پیش کیا۔

"میں نے ایک اور کارنامہ کر دکھایا ہے" — پنڈت نے مہاراجہ سے کہا — "رانی کے ساتھ غزنی کے ایک جاسوس کو بھی سانپوں کے کنوئیں میں پھینک دیا ہے اور ایک اور جاسوس کو دھوکہ دے کر زندہ رکھا اور یہ بتا کر واپس جانے دیا ہے کہ اپنے سلطان سے کہہ دے کہ قنوج کا رُخ نہ کرے" — پنڈت نے صالح برودک کو جو کچھ بتایا تھا وہ مہاراجہ راجیا پال کو سنا دیا اور کہا — "میں نے آپ کی عزت کی خاطر، آپ کو فتح دلانے کی خاطر اور اس مندر کی عزت کی خاطر جھوٹ بولا ہے۔ میرے جھوٹ کو سچ ثابت کر دیں۔ غزنی والوں کو ذہن سے اُتار دیں۔ وہاں تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ میں یقین سے کہتا ہوں کہ میں نے سلطان محمود پر دہشت طاری کرنے کا انتظام کر دیا ہے۔ آپ اپنی کچھ فوج باہر بھیج دیں۔ لڑیں، مہاراج! لڑیں۔"

"مہاراج!" — مہاراجہ راجیا پال نے کہا — "آپ نے سلطان محمود کو اس کے ایک جاسوس کے ذریعے یہ غلط اطلاع دے کر بہت بڑی غلطی کی ہے" — اُس نے وہی خط جو بھیم پال نندر نے رائے چندرا کو لکھا اور رائے چندرا نے راجیا پال کو بھیج دیا تھا، پنڈت کے ہاتھ میں دے دیا۔ پنڈت خط پڑھ چکا تو مہاراجہ راجیا پال نے کہا — "یہ اُس

بھیم پال کا خط ہے جو اپنے آپ کو نندر کہلاتا ہے۔ وہ انہی علاقوں میں ہے۔ اُس کا بیٹا تروجن پال بھی یہیں ہے مگر وہ ہمیں فوجی مدد دینے کی بجائے غزنی کے سلطان کے خلاف اُکسا رہے ہیں اور ڈرا بھی رہے ہیں۔"

"اس خط سے نہ ڈریں مہاراج!" — پنڈت نے کہا۔

"اس خط میں جو کچھ لکھا ہے وہ بالکل صحیح ہے" مہاراجہ قنوج نے کہا — "تم نے محمود کو جھوٹی اطلاع بھجوا دی ہے کہ گنگا اور جمنا کے درمیان اُس کے لیے جال بچھایا جا چکا ہے۔ اب دیکھنا وہ اپنی فوج کو یہاں کس ترتیب سے لائے گا۔ وہ کوچ کی ترتیب میں نہیں آئے گا۔ اُس کی فوج کے بازو پھیلے ہوئے ہوں گے۔ اُس کی پوری فوج آگے نہیں آئے گی۔ آپ نہیں جانتے پنڈت جی مہاراج! سلطان محمود وہ چیتا ہے جس کی موجودگی کا آپ کو اُس وقت پتہ چلتا ہے جب آپ کی گردن اُس کے دانتوں میں آ چکی ہوتی ہے اور اُس کے پنجے آپ کے جسم میں اُتر چکے ہوتے ہیں۔ کسی کو پتہ نہیں چلتا کہ اُس نے درخت پر سے حملہ کیا ہے یا گھاس میں سے۔"

مہاراجہ کی بات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ اُسے بتایا گیا کہ قاصد آیا ہے۔ مہاراجہ نے اُسے فوراً بلا لیا۔ قاصد نے اطلاع دی کہ سلطان محمود مُنج کو محاصرے میں لے رہا ہے۔

"کیا ایسا امکان ہے کہ ہم پیچھے سے محاصرے پر حملہ کریں تو مسلمانوں کو نقصان پہنچا سکتے ہیں؟" — مہاراجہ نے پوچھا۔

"نہیں" — قاصد نے کہا — "مسلمانوں کی فوج کا ایک حصہ مُنج کو محاصرے میں لے رہا ہے اور اُس کے بہت سے گھوڑسوار دستے قنوج اور مُنج کے درمیانی علاقے میں اس حالت میں خیمہ زن ہو گئے ہیں کہ انہوں نے خیمے نہیں گاڑے وہ پڑاؤ کیے ہوئے ہیں لیکن تیاری کی حالت میں ہیں۔ ہر سوار رات کو اپنے گھوڑے کو اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ ہمارے آدمیوں نے جنگلی لوگوں کے بھیس میں دیکھا ہے کہ مسلمان فوج کے آدمی دُور دُور تک گشت کرتے رہتے ہیں۔ ہم نے اونچے درختوں اور اونچی چٹانوں پر بھی غزنی کے فوجی دیکھے ہیں۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اگر اپنی فوج مُنج کی مدد کے لیے بھیجیں تو غزنی والے

اسے راستے میں ہی روک لیں گے" مہاراجہ قنوج نے کہا۔

"مجھے بتلایا گیا ہے کہ میں آپ سے کہہ دوں کہ مُنج کی طرف اپنی فوج کو بھیجنے کی کوشش نہ کریں" قاصد نے کہا۔

"سُن لیا آپ نے پنڈت جی مہاراج!" — مہاراجہ نے کہا اور اپنی فوج کے کمانڈروں کو بُلا لیا۔ وہ آئے تو مہاراجہ نے انہیں صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہوئے کہا — "اگر آپ قنوج کو بچانا چاہتے ہیں تو دیکھیں کہ مُنج کے راجپوت لڑتے ہیں یا ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ اگر وہ محاصرے میں جم جائیں اور باہر آ کر لڑنے کی کوشش کریں تو انہیں مدد دو۔ اگر نہیں تو قنوج کو بچانے کی کوشش کرو۔"

دسمبر ۱۰۱۸ء میں سلطان محمود غزنوی نے مُنج کے قلعے کو محاصرے میں لے لیا۔ اُسے بتایا گیا تھا کہ مُنج کے راجپوت اپنی آن پر جان دینے والے جنگجو ہیں اور انہیں تہ تیغ کرنا آسان نہیں ہو گا۔ اُس نے جو محاصرہ کیا وہ سطحی نہ تھا۔ قلعے کے پیچھے دریائے جمنا تھا۔ سلطان کو یہ بھی بتایا گیا تھا کہ محاصرے پر قنوج کی فوج حملہ کرے گی۔ چنانچہ اُس نے اپنی فوج کے بہت سے سوار دستے قنوج اور مُنج کے درمیان پھیلا دیئے تھے۔

اُس نے جب سطحی محاصرہ مکمل کر لیا تو صابر بروک وہ غلط اطلاع لے کر پہنچ گیا جو اُسے قنوج کے پنڈت نے دی تھی۔ سلطان محمود کو بتایا گیا کہ ایک جاسوس یہ اطلاع لایا ہے۔ سلطان نے اُسی وقت متھرا کو ایک قاصد اس پیغام کے ساتھ دوڑا دیا کہ جو فوج وہ متھرا چھوڑ آیا ہے اُس کے آدھے دستے فوراً مُنج آ جائیں اور تمام ہاتھی ساتھ بھیجے جائیں۔ اُس وقت تک اُس کے پاس کم و بیش ساڑھے تین سو جنگی ہاتھی تھے۔

جب یہ کمک آ گئی تو سلطان محمود نے اُنہیں اُن دستوں سے بھی آگے قنوج کی طرف بھیج دیا جو قنوج اور مُنج کے درمیان تیاری کی حالت میں موجود تھے۔ ہندوستان پر محمود غزنوی کے سترہ حملوں میں مُنج کے محاصرے کا ذکر نہیں ملتا۔ تفصیلات میں جائیں تو تھوڑا سا ذکر آ جاتا ہے لیکن مُنج کے محاصرے اور معرکے میں سلطان محمود کو اس قدر زور صرف کرنا پڑا تھا جو متھرا، بلند شہر، مہابن اور آسی کی فتوحات کو ملا کر بھی صرف نہیں

ہوا تھا۔ منج کے راجپوتوں کا یہ عالم تھا کہ فوجی اور شہری میں کوئی فرق نہیں رہا تھا۔ نوعمر لڑکے بھی اپنے شہر کو بچانے کے لیے نکل آئے تھے۔۔

مشہور مورخ عطبی نے منج کے راجپوتوں کے متعلق لکھا ہے ــ "وہ بے مہار اور خودسر اونٹوں کی طرح اور ہار نہ ماننے والے شیطانوں کی طرح لڑے۔"

سلطان محمود محاصرے کی کمان خود کر رہا تھا۔ وہ جدھر سے اپنے جیش دروازے توڑنے کے لیے یا دیوار میں کہیں سرنگ لگانے کے لیے آگے بھیجتا تھا، اُن پر تیروں اور برچھیوں کی بوچھاڑیں آنے لگتی تھیں۔ غزنی کے تیراندازوں نے آگے بڑھ کر قلعے کی دیواروں سے تیر اور برچھیاں برسانے والوں پر اتنی ہی تعداد اور شدت سے تیر چلائے لیکن راجپوت تیر کھا کر زخمی ہوتے اور گرتے تھے اور اُن کی جگہ فوراً دوسرے آدمیوں سے پُر ہو جاتی تھی۔ قلعے کی دیواروں سے یہ للکار بار بار سنائی دیتی تھی "محمود! واپس چلے جاؤ۔ مسلمانو! تم اپنے قبرستان میں آئے ہو" ــ اور اس للکار کے ساتھ گالی گلوچ بھی سنائی دے رہی تھی۔

"یہ قلعہ آسانی سے نہیں ٹوٹے گا" ــ سلطان محمود نے کہا "ہمیں کوئی اور بندوبست کرنا پڑے گا۔"

محاصرے کا پہلا دن گذر گیا اور سلطان محمود کی فوج کو خاصا جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ قلعے کے اندر کا یہ عالم تھا کہ عورتیں اور بچے بھی تیر کمانوں، برچھیوں اور تلواروں سے مسلح تھے۔ شہری رائے چندا کے محل کے سامنے جمع ہو گئے تھے۔ وہ نعرے لگا رہے تھے کہ انہیں باہر جا کر مسلمان فوج پر حملے کی اجازت دی جائے۔ رائے چندا ایسا اناڑی نہیں تھا۔ وہ شہریوں کو نہ قلعے کی دیواروں پر جانے دے رہا تھا نہ انہیں باہر نکلنے کی اجازت دے رہا تھا۔

"لڑائی اس جوش سے نہیں لڑی جاتی جس میں عقل نہ ہو" رائے چندا نے اپنے ہزارہا شہریوں سے کہا ــ "منج کو آخر تم ہی بچاؤ گے۔ تم نہیں جانتے کہ غزنی کی فوج چوروں اور ڈاکوؤں کا گروہ نہیں۔ یہ ایسی فوج ہے جس کے آگے قلعے کانپ کانپ کر گرتے جاتے ہیں۔ تمہاری فوج قلعے کو بچا رہی ہے۔ اگر دشمن اندر آ گیا تو منج کی آبرو تمہارے ہاتھ میں

ہوگی۔ ہم منج اپنے دشمن کو اس طرح نہیں دیں گے جس طرح اُن بزدلوں نے متھرا اُسے دے دیا اور ہری کشن واسدیو کا بتیا چار کرایا ہے۔"

ہجوم گرجنے لگا "ہم انتقام لیں گے .... ہمیں باہر جانے دو۔"

رائے چندا نے ہجوم میں سے بہت سے جوان آدمی الگ کر لیے اور یہ بتا کر کہ انہیں جان کی بازی لگانی ہے، اپنے ساتھ رکھ لیا۔

رائے چندا کے محل کی عورتیں بھی مسلح ہو گئی تھیں اور وہ شہر کی عورتوں کو لڑنے مرنے کے لیے منظم کر رہی تھیں۔ صرف ایک عورت تھی جو خاک و خون کے اس ہنگامے سے لاتعلق تھی۔ وہ رائے چندا کی بیٹی رادھا تھی۔ پہلے سنایا جا چکا ہے کہ رادھا اور رائے چندا کی بہن شیلا مہاراجہ قنوج کے بیٹے لکھمن پال کے ساتھ سلطان محمود کو متھرا میں قتل کرنے کے لیے گئی تھیں۔ یہ دونوں لڑکیاں اپنے غیر معمولی حسن و جوانی کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے گئی تھیں۔ وہ ایک خیالی جنگل قبیلے کے لباس میں تھیں جس میں وہ نیم عریاں تھیں۔

اس طرح ان کے حسن کی دلکشی اور زیادہ طلسماتی اور خطرناک ہو گئی تھی مگر راستے میں ایک مگرمچھ نے شیلا کو نگل لیا۔ رادھا نے شیلا کو مگرمچھ کے منہ میں اس طرح دیکھا کہ شیلا کا ایک بازو، چہرے کا کچھ حصہ اور ریشم کے تاروں جیسے بال نظر آ رہے تھے۔

پھر یوں ہوا کہ متھرا میں مقیم غزنی کی فوج کا ایک نائب سالار دو کمانداروں کے ساتھ اس علاقے میں گشت پر آ نکلا۔ اُس نے لکھمن پال اور رادھا کو پکڑ لیا اور دونوں کو متھرا لے گیا۔ رادھا جیسی نوجوان، دلکش اور نیم عریاں لڑکی کیسے توقع رکھ سکتی تھی کہ نائب سالار اور دو کماندار اُسے بیٹی کا درجہ دیں گے۔ پھر وہ متھرا کے اس تلخ سچ میں پہنچی تھی کہ وہاں وہ نہ جانے کیسے وحشی آدمیوں کے ہاتھوں میں کھلونا بنے گی اور نہ جانے اس کا انجام کیسا بھیانک ہوگا۔ اُسے غزنی کے مسلمانوں کے متعلق بچپن سے یہی کچھ بتایا جاتا رہا تھا کہ مسلمان عورت کے لیے وحشی اور درندے کے لیے آدم خور ہوتے ہیں۔

رادھا نے کبھی مسلمان نہیں دیکھا تھا۔ اس خطے میں ایک بھی مسلمان نہیں تھا۔ اُسے جب پتہ چلا کہ سلطان محمود مندروں کے بت توڑ کر پھینک دیتا اور مندر جلا دیتا ہے تو رادھا کو یقین آ گیا تھا کہ مسلمان واقعی جنگلوں اور غاروں میں رہنے والی کوئی قوم ہے

جس کے ہاں مذہب کا وجود ہی نہیں وہ صرف ہندو مت کو مذہب سمجھتی تھی اور وہ عزت اور آبرو کو اپنی جان سے زیادہ قیمتی جانتی تھی لیکن اپنے دشمن کو زیر کرنے کے لیے وہ اپنی آبرو کو ایک جائز ذریعہ سمجھتی تھی اگر وہ جب مسلمانوں کے ہاتھ آئی تو کسی نے اسے اتنا بھی نہ کہا کہ تم بہت خوبصورت لڑکی ہو۔ نائب سالار اور کمانداروں نے متھرا تک کے ایک دن اور آدھی رات تک کے سفر میں اُسے ایک قیدی سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں دی۔ اُس کے ساتھی، قنوج کے راجکمار بھیم پال نے نائب سالار کو سونے کے وہ تمام سکے پیش کیے تھے جو اُس کے پاس تھے لیکن نائب سالار نے ان کی طرف دیکھا تک نہیں تھا۔

اور جب رادھا اور راجکمار کو سلطان محمود کے سامنے لے گئے تھے تو سلطان کا چہرہ دیکھ کر رادھا کے دل میں نفرت کا طوفان اُٹھ آیا تھا۔ اُسے کسی اور سلوک کی توقع تھی لیکن سلطان نے اُسے کہا تھا — "ہم اس لڑکی جیسی بیٹیوں کی دل سے قدر کرتے ہیں ہم غیرت مند دشمن کی عزت کیا کرتے ہیں" — اور رادھا کو سلطان کے یہ الفاظ آج جب اس نے منج کے قلعے کو محاصرے میں لے لیا تھا، بہت یاد آ رہے تھے۔ "مجھے قتل کرنے کی تمہیں ضرور کوشش کرنی چاہیے تھی۔ کامیابی اور ناکامی تمہارے دیوتا کرشن واسدیو اور ہر ہر مہادیو کے اختیار میں نہیں، ہمارے خدا کے اختیار میں ہے۔ یہ ہے خدا کا وہ پیغام جو میں ہندوستان میں لایا ہوں۔"

اس کے بعد سلطان محمود نے حکم دیا تھا — "ان دونوں (رادھا اور بھیم) کو ان کے شہروں کے قریب چھوڑ آؤ۔ انہیں عزت سے لے جاؤ۔ ان کے گھوڑے اور ان کے خنجر انہیں دے دو۔"

سلطان کے حکم کی تعمیل کی گئی اور ان دونوں کو شاہی مہمانوں کی طرح اُن کے شہروں کے مضافات میں چھوڑ آئے تھے۔

رادھا نے اپنے باپ رائے چندا کو کسی اور جذبے سے بتایا تھا کہ وہ سلطان محمود غزنوی کو قتل نہیں کر سکی اور پکڑی گئی تھی اور مسلمانوں نے اور اُن کے سلطان نے اُسے بیٹی کا درجہ دے کر عزت سے واپس کر دیا ہے۔ اُس نے باپ کو وہ تمام باتیں

بتائی تھیں جو سلطان محمود نے اُسے اور بھیم پال سے کہی تھیں مگر اُس کا باپ اُس کے تاثر کو نہیں سمجھ سکا تھا۔ اُس نے کہا تھا — "ہم اپنی بے عزتی کا انتقام لیں گے۔"

رادھا راجکماری تھی، معمولی لڑکی نہیں تھی مگر وہ ایسے محسوس کرنے لگی جیسے آسمان سے گر کر زمین پر آ پڑی ہو۔ وہ بہت شوخ اور بڑی ہی دلیر لڑکی تھی مگر اُس پر خاموشی طاری ہو گئی اور وہ کھوئی کھوئی رہنے لگی۔ راج محل میں، راج دربار میں اور فوجی حلقوں میں اب منج کے دفاع اور سلطان محمود کو شکست دینے کی تیاریاں ہونے لگی تھیں۔ غزنی کی فوج کسی بھی روز متوقع تھی۔ رائے چندا لڑائی کے سوا اور کوئی بات ہی نہیں کرتا تھا۔ مندروں میں بھی مسلمانوں کے خلاف نفرت پھیلائی جا رہی تھی اور لوگوں کو بڑی خونریز جنگ کے لیے تیار کیا جا رہا تھا۔ عورتوں میں جوش و خروش پیدا ہو گیا تھا۔ رائے چندا کی داشتاؤں نے بھی لڑنے کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ صرف رادھا تھی جو ان سرگرمیوں سے الگ تھلگ چپ چاپ لیٹی رہتی یا قلعے کی دیوار پر جا کر متھرا کی طرف دیکھنے لگتی تھی۔

ایک روز وہ دیوار پر کھڑی اُفق پر نظریں گاڑے ہوئے تھی کہ اُس نے اپنے آپ سے کہا — "وہ اُدھر سے آئیں گے۔ معلوم نہیں کب آئیں گے؟"

"کون آئیں گے؟" — اُس کے قریب سے کسی نے پوچھا۔

"مسلمان" — اُس نے کہا۔ "غزنی والے" — اور وہ چونک کر چپ ہو گئی۔ اُس نے دیکھا۔ اُس کے پاس ایک رشی کھڑا تھا۔ وہ تو اپنے آپ کو تنہا سمجھ رہی تھی۔ رشی کے رُتبے اور درجے سے واقف تھی۔ وہ بڑے مندر کے پنڈت کے درجے کا آدمی تھا۔ اپنے مذہب کا عالم ہونے کے علاوہ علیل روحوں کا علاج اپنے کسی خاص عمل سے کرتا تھا۔ آسیب اور بدروحوں سے نجات دلاتا تھا۔ پنڈت بھی اُسے جھک کر اور ہاتھ جوڑ کر سلام کرتے تھے مگر اُسے اپنے پاس کھڑے دیکھ کر رادھا کو غصہ آ گیا۔

"کیا راجکماری مسلمانوں کا انتظار کر رہی ہے؟" — رشی نے پوچھا۔

"میری تنہائی میں آپ نے کیوں آ دخل دیا ہے؟" — رادھا نے غصے کو دباتے

ہوئے پوچھا۔

"اس لیے کہ ہماری راجکماری کی روح پر ایسا آسیب سوار ہو گیا ہے جو ہمارے سوا کوئی نہیں نکال سکتا" — رشی نے کہا۔ "مجھے مہاراج (رائے چند) نے کہا ہے کہ جب سے آپ متھرا سے آئی ہیں، آپ کی حالت بگڑ رہی ہے۔ میں جانتا ہوں راجکماری! مسلمان بھیڑیئے ہیں۔ ماس کھانے کو یہاں آجاتے ہیں۔ آپ کتنا ہی پردہ کیوں نہ ڈالیں، میں جانتا ہوں کہ انہوں نے آپ کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ وہ سونے، ہیروں اور عورتوں کے بھوکے ہیں۔ انہی کی تلاش میں آتے ہیں"

"یہ جھوٹ ہے" — رادھا نے بھڑک کر کہا۔ "انہوں نے میرے ساتھ وہ سلوک نہیں کیا جو آپ بتا رہے ہیں۔ وہ عورتوں کے شکاری نہیں۔ میں نے غزنی کے سلطان کے دربار میں ایک بھی عورت نہیں دیکھی۔ عورتیں میرے باپ جیسے مہاراجوں کے درباروں میں ہوتی ہیں۔ ان کے پیچھے جوان اور خوبصورت لڑکیاں کھڑی مور چھل ہلاتی رہتی ہیں۔ ان کی خدمت گار جوان لڑکیاں ہوتی ہیں۔ انہیں لڑکیاں سُلاتی اور لڑکیاں جگاتی ہیں۔ مسلمان بھیڑیئے نہیں، انسان ہیں۔ انہوں نے ہمارا دیا ہوا سونا بھی ٹھکرا دیا تھا"

رشی دانشمند آدمی تھا۔ اُس نے رادھا کو روکنے ٹوکنے کی بجائے اُس کے ساتھ پیار سے ایسی باتیں کیں کہ اُس کا غصہ ٹھنڈا کر دیا اور اُس کے دل پر قبضہ کر لیا۔ اُس کی باتوں کا اثر تھا کہ وہ رشی کے ساتھ چل پڑی۔

رشی ہر روز رادھا کے پاس جانے لگا۔ بہت دیر اُس کے پاس بیٹھا اس کے ساتھ باتیں کرتا رہتا۔ اُس نے محسوس کر لیا کہ رادھا پر واقعی مسلمانوں کا آسیب سوار ہو گیا ہے اور اُس کے ساتھ ایک دہشت ہے جو اُس کے ذہن کو گرفت میں لیے ہوئے ہے۔ رادھا نے رشی کو یہ دہشت تفصیل سے بتائی۔ وہ ہر رات خواب میں ایک مگرمچھ دیکھتی تھی جس کے منہ میں شیلا ہوتی تھی اور مگرمچھ کے منہ سے خون ٹپک رہا ہوتا تھا۔ رادھا ڈر کر جاگ اٹھتی تھی اور اس کا جسم سردی کے باوجود پسینے میں نہا

جاتا تھا۔

رشی اُس کی یہ دہشت باتوں سے ہی دور کر سکتا تھا۔ وہ اس کوشش میں مصروف رہا مگر رادھا کی جسمانی حالت روز بروز خراب ہوتی جا رہی تھی۔ اُس کا باپ رائے چندا جنگ کی تیاری کی وجہ سے ذاتی طور پر اس کی طرف توجہ نہیں دے سکتا تھا۔ اُس نے راجکماری کے علاج کا حکم دے دیا تھا۔ رشی کے علاوہ نامی گرامی وید اُس کا علاج کر رہے تھے مگر اُس کی حالت بگڑتی جا رہی تھی۔ اُس نے دوائیاں کھانے سے انکار کر دیا اور رشی کو اُس نے ہمراز بنا لیا۔

"رشی جی!" — ایک روز رادھا نے اُسے کہا۔ "مسلمانوں کے سلطان نے مجھے کہا تھا کہ کامیابی اور ناکامی تمہارے دیوتا کرشن، رام دیو اور ہر ہر مہادیو کے اختیار میں نہیں، ہمارے خدا کے اختیار میں ہے... میں نے اُس کا ہر ایک لفظ سچا دیکھا ہے۔ کیا وہ مگرمچھ مسلمانوں کا خدا ہے جس نے راستے میں آکر شیلا کو کھا لیا تھا اور ہمارے دو آدمی معلوم نہیں کس کے تیروں سے مر گئے اور ہم پکڑے گئے؟... میں نے ہری کرشن کی جنم بھومی کو اُجڑا ہوا دیکھا ہے۔ بُت ٹوٹے ہوئے دیکھے ہیں۔ یہی ہیں نا ہمارے دیوتا اور ہمارے بھگوان؟ اگر ان میں کوئی طاقت ہوتی تو مسلمان فنا ہو چکے ہوتے"

رشی نے اُسے ہندو مت کی کرامات کا قائل کرنے کے لیے بہت کچھ کہا اور اپنے مذہب کی وہ روایتیں سنائیں جنہیں انسانی عقل تسلیم نہیں کر سکتی۔ ان کے مقابلے میں اُس نے مسلمانوں کو جھوٹا اور لٹیرا کہا اور اسلام کو بے بنیاد مذہب قرار دینے کی پوری کوشش کر ڈالی۔

"مگر میں نے جو دیکھا ہے اسے میں کس طرح جھٹلا سکتی ہوں؟" — رادھا نے کہا۔ "کھیم پال میرے ساتھ تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ اُسے مسلمانوں کی فوج کا راز معلوم ہو گیا ہے۔ اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ اُس نے ان میں عورت اور شراب نہیں دیکھی۔ ہم وہاں سے صبح کے وقت چلے تھے۔ مجھے اور کھیم پال کو انہوں نے بہت سویرے جگا دیا تھا۔ باہر ابھی دھندلکا گہرا تھا۔ کسی انسان کی بڑی ہی سُریلی آواز ابھری جس کا اثر میرے دل پر ہونے لگا۔ میں نے اپنے پہرہ دار سے پوچھا کہ یہ کونی غزنی کی زبان

میں گا رہا ہے؟ اُس نے بتایا کہ یہ اذان ہے۔ یہ ہمارے خدا کے الفاظ ہیں۔ میں ایک بھی لفظ نہ سمجھ سکی مگر اس آواز نے مجھ پر جادو کا سا اثر کیا۔ کچھ دیر بعد میں نے دیکھا کہ متھرا میں مسلمانوں کی جتنی فوج تھی ایک میدان میں صفوں میں کھڑی ہوگئی۔ ایک آدمی ان کے آگے کھڑا ہوگیا اور وہ کبھی جھکتے، کبھی ماتھے زمین سے لگا لیتے۔ پہرہ دار نے مجھے بتایا کہ یہ ان کی عبادت ہے۔ رشی جی! عبادت کا یہ طریقہ مجھے بہت اچھا لگا۔ میں نے پہرہ دار سے پوچھا کہ یہ کس کی عبادت کر رہے ہیں؟ ان کے سامنے کوئی بت نہیں، کوئی مورتی نہیں ...... پہرہ دار نے کہا کہ ہم جس کی عبادت کرتے ہیں وہ ہمارے دلوں میں ہے اور وہ ہر جگہ موجود ہے۔ وہ خدا ہے۔ اُس نے ہمیں فتح دی ہے۔ ہم جب اُس کی عبادت سے منہ پھیر لیں گے اور اُس کے احکام نہیں مانیں گے تو ہم ہر میدان میں شکست کھائیں گے۔"

رشی سُن سُن کر بے چین ہوتا جا رہا تھا اور رادھا بولے جا رہی تھی ۔۔۔ "میں نے پہرہ دار سے پوچھا کہ تمہارا سلطان تو عبادت نہیں کرتا ہوگا۔ وہ تو سلطان ہے۔ پہرہ دار نے کہا کہ سلطان عبادت میں موجود ہے۔ وہ سپاہیوں میں کہیں پیچھے ہوگا۔ وہ سپاہیوں کی طرح خدا کے آگے جھکتا اور سجدہ کرتا ہے۔ عبادت کے وقت وہ سلطان نہیں ہوتا...... رشی جی! ہمارے پتا جی مہاراج کبھی مندر میں جاتے ہیں تو مندر سے سب کو نکال دیا جاتا ہے...... سچا کون ہے رشی جی؟ کیا ہمارا خدا نہیں ہوتا؟"

رشی نے بتانا شروع کیا کہ ہندو مت میں خدا کا تصور کیا ہے لیکن رادھا نے اُسے روک دیا اور بولی۔ "کیا تم کچھ خدا ہے؟...... نہیں۔ مگر مجھے ہر رات ڈراتا ہے میرے دل میں خدا اُتر آیا ہے۔"

"مہاراج!" ۔۔۔ رشی نے رائے چندا سے کہا۔ "راجکماری پاگل ہو چکی ہے۔ معلوم ہوتا ہے متھرا میں مسلمانوں نے اسے کوئی ایسی چیز پلا دی ہے جس کا اثر ابھی تک نہیں اُترا۔ یہ بیماری میرے علم اور میرے عمل سے باہر ہے۔ وہ اپنے مذہب سے منحرف ہو چکی ہے۔ اب تو وہ کچھ نہ کچھ بولتی ہی رہتی ہے۔ بعض اوقات بولتے بولتے چپ ہو جاتی ہے اور بڑی زور سے چیخ مار کر اپنے چہرے کو ہاتھوں سے یا کپڑے سے ڈھانپ لیتی ہے۔ اکثر یہی رٹ لگائے رکھتی ہے۔ 'میرے دل میں خدا اُتر آیا ہے' ۔۔۔ یہ مسلمانوں کا اثر ہے۔"

"اسے اسی حال میں رہنے دو" ۔۔۔ رائے چندا نے کہا۔ "میں سلطان محمود کا سر کاٹ کر اس کے سامنے رکھوں گا تو اس کے دل سے مسلمانوں کا خدا نکل جائے گا۔ مجھے ابھی کوئی فرصت نہیں رشی جی! غزنی کی فوج بہت قریب آگئی ہے۔"

اگلے ہی روز غزنی کی فوج نے منج کو محاصرے میں لینا شروع کر دیا اور پھر راجکماری رادھا کی کسی کو ہوش اور فکر ہی نہ رہی مگر رادھا کے کان میں جب یہ خبر پڑی کہ اس کا قلعہ محاصرے میں آگیا ہے تو اس نے اٹھ کر بازو پھیلا دیئے اور بلند آواز سے بولی ۔۔۔ "وہ آگئے ہیں۔ سلطان آگیا ہے۔ دروازے کھول دو۔ میری عزت اور غیرت کے رکھوالے آگئے ہیں۔"

اس وقت ایک وید اور دو خدمت گار عورتیں وہاں موجود تھیں۔ سب نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیئے۔ رادھا باہر کو دوڑی تو اُسے پکڑ لیا گیا۔ رائے چندا وہاں موجود نہیں تھا۔ اُس کی ماں کو بلایا گیا۔ وہ بھی محاصرے کی وجہ سے گھبرائی ہوئی تھی۔ اُس نے اپنی بیٹی کی یہ حالت دیکھی تو وید سے کہا کہ اسے کوئی ایسی دوائی دے دو جو اسے بے ہوش کر دے، پھر جوں ہی ہوش میں آئے اسے پھر بے ہوش کر دیا جائے۔

رادھا کو جکڑ لیا گیا اور وید نے اُس کے منہ میں دوائی ڈال دی۔ تھوڑی دیر بعد رادھا کا جسم بے حس ہوگیا۔ کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا گیا۔

محاصرے کا پہلا دن گزر گیا۔ سلطان محمود نے رات کو بھی آرام نہ کیا۔ وہ قلعے کے پیچھے چلا گیا جدھر دریا تھا۔ پانی قلعے کی دیوار کے ساتھ لگ کر بہتا تھا۔ سلطان نے اپنے سالاروں سے کہا کہ ہر پیادہ دستے سے دو دو چار چار جانباز قسم کے سپاہی منتخب کریں اور ان کا ایک الگ جیش بنا کر اسے محفوظہ (ریزرو) میں بھیج دیا جائے۔

دوسرے دن غزنی کی فوج نے ایک بار پھر قلعے کے بڑے دروازے پر ہلہ بولا مگر اوپر سے راجپوتوں نے تیر اور برچھیاں پھینک کر غزنی والوں کو ...ت نقصان پہنچایا مگر

سلطان محمود نے حملے جاری رکھے۔ قلعہ ڈیڑھ میل لمبا تھا۔ سات روز تک غزنی کی فوج نے پورا زور صرف کر دیا مگر ذرا سی بھی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ آٹھویں روز کی شام گہری ہو چکی تھی۔ سلطان نے اس جانباز جیش کو ساتھ لیا جو اُس نے تیار کروایا تھا۔ اس کی نفری تین سو سے کچھ زیادہ تھی۔

"غزنی اور اسلام کی آبرو تم سے جان کی قربانی مانگ رہی ہے" — سلطان محمود نے رات کی تاریکی میں اس جیش کے جوانوں سے کہا — "اگر تم میں سے کوئی بھی قربانی دینے کے لیے تیار نہیں تو اُسے اجازت ہے کہ اپنے دستے میں واپس چلا جائے۔ مجھے تم میں سے کسی کا چہرہ نظر نہیں آرہا۔ مجھے بالکل پتہ نہیں چلے گا کہ کون چلا گیا ہے۔ میرے مجاہدو! خُدا کے سوا آج کی رات تمہیں کوئی نہیں پہچانتا۔ روزِ حشر بھی تمہیں صرف خُدا پہچانے گا" — سلطان خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے پوچھا — "کیا میں یہ سمجھوں کہ تم سب میرے ساتھ ہو؟"

کئی آوازیں سنائی دیں — "ہم سب آپ کے ساتھ ہیں .... ہم جانیں قربان کرنے کے لیے آپ کے ساتھ آئے ہیں .... ہم سلطان کے حکم کے منتظر ہیں۔"

"آج رات تم خدا کے حکم سے لڑو گے" — سُلطان محمود نے کہا — "آج تمہیں اس کفرستان میں خدا کا نام بلند کرنا ہے ..... اس قلعے کی ایک دیوار دریا میں ہے۔ تمہیں نقب لگانے اور سرنگ کھودنے والے اوزار دیئے جا رہے ہیں۔ تم میں سے پچاس آدمی دریا میں اتر کر دیوار کو نیچے سے توڑیں گے۔ پانی زیادہ گہرا نہیں۔ اس موسم میں پانی گہرا نہیں ہوا کرتا، ٹھنڈا ہوتا ہے، اور جو تیرنا نہیں جانتا وہ دریا میں نہ اُترے۔ خطرہ یہ ہے کہ دشمن نے تمہیں دیکھ لیا تو اُوپر سے تیروں اور برچھیوں کا مینہ برسا دے گا۔ تمہیں اچھی طرح اندازہ ہو گا کہ قلعے کی دیوار کتنی چوڑی ہو گی۔ اگر تم نے دیوار کی نصف چوڑائی میں سرنگ لگا لی تو باقی کام پانی کر لیگا۔"

سلطان محمود نے پچاس جانباز الگ کر لیے۔ لڑائی کا زور تھم گیا تھا۔ اندھیرے کی وجہ سے فضا تیروں سے خالی ہو گئی تھی۔ قلعے کی دیواروں پر اور برجوں میں کچھ سرگرمی تھی۔ سلطان محمود قلعے سے تقریباً پون میل دور تھا۔ اُس نے جانبازوں کو خدا حافظ کہا

اور انہیں ہدایات دے کر دریا کے کنارے کنارے قلعے کی طرف روانہ کر دیا۔

راجپوتوں کو دریا کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ غزنی کے پچاس جانباز بہت بڑا خطرہ بن کر دریا کی طرف سے سرنگ لگانے جا رہے تھے۔ وہ اونچی گھاس اور درختوں کی اوٹ میں چلتے چلتے دیوار سے کچھ دور سے ہی دریا میں اُتر گئے۔ ان کے پاس اوزاروں کے علاوہ ہتھیار بھی تھے۔ دریا کا پانی بہت ٹھنڈا تھا اور کنارے کے ساتھ ساتھ کمر تک گہرا تھا۔ ذرا پرے زیادہ گہرا ہو جاتا تھا۔ جانباز ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑے پانی میں چلتے جا رہے تھے۔

وہ دیوار کے قریب پہنچ گئے۔ یہ دیوار عمودی نہیں کچھ ڈھلانی تھی۔ اس سے راجپوتوں کو یہ فائدہ حاصل تھا کہ وہ نیچے دیکھ سکتے تھے کہ کیا ہو رہا ہے مگر اندھیرے میں انہیں کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ پچاس جانبازوں نے پانی میں کھڑے ہو کر اوزاروں سے دیوار کے پتھر نکالنے کی کوشش شروع کر دی۔ یہ کام خاموشی سے نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اوزاروں کی آواز اوپر دیوار تک جاتی تھی۔ سلطان محمود نے اس آواز کو دبانے کا اہتمام کر رکھا تھا۔ وہ اس طرح کہ دریا کی دیوار کے ساتھ والی دیوار کی طرف اس کے حکم سے دف اور نقارے بجائے جانے لگے۔ نفیریاں بجنے لگیں اور سپاہیوں نے نعرے لگانے اور غل غپاڑہ بپا کرنا شروع کر دیا۔ دیوار کے اوپر راجپوت اس طرف اکٹھے ہو گئے۔ یہ غل غپاڑہ حملے کا ہی ہو سکتا تھا۔

جانباز اطمینان سے پتھر نکالتے رہے۔ اُنہوں نے اتنے پتھر نکال لیے کہ آگے دیوار کی مٹی آگئی۔ اس کی کھدائی مشکل نہیں تھی۔ مشکل یہ پیدا ہو رہی تھی کہ دریا بھی سرنگ میں داخل ہو گیا تھا۔ سرنگ فراخ اور بلند تھی۔ پچاس آدمی کھدائی کر رہے تھے اس لیے کام تیزی سے ہو رہا تھا۔ آگے پھر پتھر آگئے۔ جانبازوں کے پاس بڑے مضبوط اور موزوں اوزار تھے۔ ان سے پتھر نکلتے آرہے تھے۔ سُرنگ کم و بیش پندرہ قدم لمبی ہو گئی تھی۔ آخر وہ پتھر دیوار سے ہٹا جس کے ہٹنے سے قلعے کے اندر کی روشنیاں نظر آنے لگیں۔ جانبازوں نے تیزی سے بہت سے پتھر نکال دیئے اور وہاں اتنا بڑا

دہانہ بن گیا جس میں سے ایک آدمی کھڑا ہو کر گزر سکتا تھا۔ دریا کا پانی قلعے کے اندر جانے لگا۔

قلعے میں کسی نے پانی دیکھ لیا اور اُس نے شور مچا دیا۔ جانباز اپنا کام کر چکے تھے۔ وہ پیچھے کو چل پڑے مگر راجپوت بھی جانباز تھے۔ وہ مشعلیں اٹھائے دوڑے آئے۔ بہت سے برچھیوں اور تلواروں کے ساتھ آئے۔ غزنی کے جانباز تیزی سے باہر نکل آئے۔ راجپوت ان کے پیچھے آئے۔ دریا میں خونریز معرکہ لڑا گیا۔ اندر سے کئی مشعلیں سرنگ کے راستے باہر آ گئی تھیں۔ ان کی روشنی میں دوست اور دشمن کا پتہ چل رہا تھا۔ سلطان محمود کی نظر انہی جانبازوں پر تھی۔ اُس نے ان کی خبر لینے کے لیے دو تین آدمی آگے بھیج دیئے تھے۔ ان آدمیوں نے آ کر اطلاع دی کہ دریا میں لڑائی ہو رہی ہے۔ سلطان نے آگے بڑھ کر دیکھا۔ دریا میں بے شمار مشعلیں نظر آ رہی تھیں جیسے دریا میں تیر رہی ہوں۔ اُس نے کم و بیش تین سو سپاہیوں کو دریا میں اتار دیا اور مشعل بردار بھی ساتھ بھیج دیئے۔

"معلوم ہوتا ہے میرے جانبازوں نے دیوار میں نقب لگا لی ہے"۔ سلطان محمود نے اپنے سالار سے کہا۔ "اندر سے اسی راستے دشمن باہر آیا ہو گا۔ جاؤ دیکھو اور مجھے بتاؤ"۔

دریا کا پانی قلعے کے اندر جا رہا تھا اور سرنگ میں سے راجپوت باہر آ رہے تھے۔ لاشیں اور زخمی دریا میں بہتے جا رہے تھے۔ مشعلوں کے شعلے دریا پر ناچ رہے تھے۔ سلطان محمود نے بہت سوچا کہ وہ اس سرنگ سے اپنا ایک دستہ قلعے میں داخل کر سکتا ہے یا نہیں۔ اُسے سرنگ کھودنے والے ایک زخمی نے جو دریا سے نکل آیا تھا، بتایا کہ سرنگ سے اندر جانے کی کوشش نہ کی جائے ورنہ بہت نقصان ہو گا۔ سلطان نے حکم دے دیا کہ دریا سے اپنے آدمی واپس بلا لیے جائیں۔

وقائع نگاروں نے محاصرے کا جو روز بروز کا آنکھوں دیکھا حال لکھا ہے، وہ بہت طویل ہے۔ مختصر یہ کہ غزنی کے مجاہدین نے خون کی بے دریغ قربانی دے کر دیواروں میں دو جگہ نقب لگا لی مگر منج کے راجپوتوں نے بہادری کے ایسے مظاہرے کیے کہ سلطان محمود غزنوی عش عش کر اٹھا۔ بجائے اس کے کہ غزنی کے دستے ٹوٹی ہوئی دیواروں سے

اندر جاتے، اندر سے راجپوت باہر آتے اور غزنی کی فوج پر حملے کرتے تھے۔ ان میں سے جو زندہ رہتے وہ پھر اندر چلے جاتے تھے۔ انہوں نے یہاں تک کیا کہ دروازہ کھول کر نکلے ہوئے سیلاب کی طرح آئے اور اس انداز سے لڑے کہ پھر واپس چلے جائیں۔

"یہ لوگ جتنے بہادر ہیں اتنے ہی احمق ہیں"۔ سلطان محمود نے اپنے سالاروں سے کہا ۔۔۔ "انہیں موقع دو کہ اسی طرح حملے کرتے رہیں۔ یہ اپنی طاقت تیزی سے ضائع کر رہے ہیں"۔

اس دوران رادھا کو مسلسل بے ہوشی میں رکھا گیا۔ وہ ہوش میں آتی تھی تو خفیف آواز میں کہتی تھی ۔۔۔ "خدا میرے دل میں اتر آیا ہے" ۔۔۔ اُسے وید بے ہوشی کی دوائی پلا دیتا تھا۔

مؤرخوں کے مطابق محاصرے کے پچیسویں روز سلطان محمود نے حکم دیا کہ قلعے کی دیواروں کے شگافوں پر شدید ہلہ بول کر اندر جانے کی کوشش کی جائے اور جونہی راجپوت باہر آنے کے لیے کوئی دروازہ کھولیں، حملہ کر کے دروازے کو کھلا رہنے دیا جائے۔

پچیسویں روز کی لڑائی فیصلہ کن تھی۔ راجپوت اپنی طاقت کم کر چکے تھے۔ جب غزنی کی فوج نے شگافوں پر اور ایک دروازے پر ہلہ بولا تو راجپوت گھبرا گئے۔ مسلمان قلعے میں داخل ہو گئے مگر نفری تھوڑی سی تھی۔ راجپوتوں نے لڑنے کی بجائے مرنے کو ترجیح دی۔ ان میں سے بعض نے اپنے کنبوں (عورتوں اور بچوں) کو اپنے گھروں میں بند کر کے گھروں کو آگ لگا دی اور بال بچوں سمیت زندہ جل گئے۔ جس راجپوت کو کہیں کوئی ہندو عورت نظر آئی اسے قتل کر دیا۔ منج کے کئی سپاہیوں نے قلعے کی اتنی اونچی دیواروں کے اوپر سے چھلانگیں لگا دیں اور مر گئے۔

جب سلطان محمود قلعے میں داخل ہوا اُس وقت منج جل رہا تھا اور اس آگ میں راجپوت جل رہے تھے۔ یہ اجتماعی خودکشی تھی۔ صرف محل محفوظ تھا۔ وہاں گئے تو جگہ جگہ عورتوں اور بچوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ انہیں راجپوتوں نے خود قتل کیا تھا۔ داشتاؤں اور ناچنے گانے والیوں کے سینوں میں بھی خنجر اور تلواریں اتری ہوئی تھیں۔ مرد بھی مرے پڑے تھے۔ راجے چندا اور رانی کی لاشیں خوابگاہ میں پلنگوں پر پڑی تھیں۔

غزنی کے آدمی محل کے ہر کمرے میں گئے۔ صرف ایک کمرہ باہر سے بند تھا۔ کھول کر اندر گئے تو پلنگ پر رادھا پڑی تھی۔ اُسے بھی مُردہ سمجھا گیا مگر اُس نے آنکھیں کھولیں اور مدھم سی آواز میں بولی "خدا میرے دل میں اتر آیا ہے"۔ قریب جا کر دیکھا تو پتہ چلا کہ وہ زخمی نہیں بیمار ہے۔ اُس نے مری ہوئی آواز میں پوچھا "تم مسلمان سپاہی ہو؟ ... تمہارا سلطان کہاں ہے؟ اُسے بلاؤ۔ میں اُسے بتانا چاہتی ہوں کہ میں اُس کے خدا کا نام لے کر مر رہی ہوں۔ میں اُس کے ہاتھ چوم کر مروں گی"۔

سب اُسے حیرت سے دیکھنے لگے۔ ایک لڑکی کے لیے سلطان محمود کو نہیں بلایا جا سکتا تھا۔ رادھا نے مایوسی سے سب کو دیکھا اور اُس کا سر ڈھلک گیا۔ وہ مر چکی تھی۔

منج کے بعد سلطان محمود کو قنوج کی طرف پیشقدمی کرنی تھی مگر اُسے ایسی اطلاعیں مل رہی تھیں جو دھوکہ معلوم ہوتی تھیں۔ صالح بروک نے اُسے بتایا تھا کہ اُس کا اصل مقابلہ قنوج کے گرد و نواح میں ہوگا مگر بعد کی اطلاعیں یہ تھیں کہ قنوج تک کے علاقے میں کسی فوج کا نام و نشان نہیں۔ منج میں سلطان بہت نقصان اُٹھا چکا تھا۔ وہ فوری طور پر پیشقدمی کے قابل نہیں تھا۔ ایک روز اُسے سالاروں نے مشورہ دیا کہ پیشقدمی کا حکم دے دیا جائے کہیں ایسا نہ ہو کہ بھیم پال نڈر اپنی فوج لے کر آجائے۔

سلطان محمود نے پیشقدمی کا حکم دے دیا۔ اُس نے فوج کو یوں تقسیم کیا کہ ایک حصہ دریائے جمنا کے کنارے اور دوسرا دریائے گنگا کے کنارے جا رہا تھا۔ ہراول بڑا مضبوط تھا۔ اس کے پیچھے سلطان محمود تھا اور یہی فوج کا بڑا حصہ تھا۔ ایک حصہ بہت پیچھے آ رہا تھا جس کی حیثیت محفوظ کی تھی۔ ترتیب کوچ کی نہیں جنگ کی تھی۔

سلطان محمود ۲۰ دسمبر ۱۰۱۸ء (۸ شعبان ۴۰۹ھ) قنوج پہنچا۔ اُس نے قلعے کا محاصرہ کر لیا مگر مزاحمت بڑی کمزور تھی۔ سلطان اسے دھوکہ سمجھا۔ اُس نے اپنے عقب کی حفاظت کا بندوبست کر لیا اور اُس نے دیکھ بھال کے لیے دور دور تک سوار بھیج دیئے۔ اُسے ہر لمحہ توقع تھی کہ عقب سے حملہ ہوگا مگر محاصرے کے دوسرے ہی دن قنوج والوں نے قلعے پر سفید جھنڈا لہرا دیا۔

سلطان محمود نے سب سے پہلے ایک سوار دستے کو اندر بھیجا۔ اس کے پیچھے دو اور دستے گئے اور جب دیکھا کہ اندر امن و امان ہے تو وہ خود اندر گیا۔ قنوج کی فوج کے کمانڈروں سے اُسے پتہ چلا کہ مہاراجہ راجیا پال اپنے خاندان سمیت محاصرے سے پہلے ہی کہیں بھاگ گیا تھا۔ سلطان محمود نے ہندو کمانڈروں سے پوچھا کہ خزانہ کہاں ہے۔ تلاش کے باوجود وہاں کچھ بھی نہ ملا۔ سلطان نے محل کو زمین سے ملا دیا اور مندروں میں جا کر تمام بُت توڑ کر باہر پھینک دینے کا حکم دے دیا۔

صالح بروک نے بڑے مندر کے پنڈت کو پکڑ لیا۔ پنڈت سے خزانے کے متعلق پوچھا گیا۔ اُس نے کہا "آپ کے اس آدمی کو معلوم ہے خزانہ کہاں ہے مگر اب وہاں کچھ نہیں ہوگا۔ مہاراجہ سب کچھ ساتھ لے گیا ہے"۔

محمد قاسم فرشتہ لکھتا ہے "سلطان محمود کی یہ فتح معمولی نہیں تھی کہ ہندوستان کے وسط میں اذانیں گونج اٹھیں"۔

بلاساغون کی سمن تاشس

سلطان محمود غزنوی ہندوستان میں متھرا سے قنوج

۱۰۱۹ء (۴۱۰ ہجری) تک کو تہہ تیغ کر کے غزنی میں داخل ہوا۔ اُس کی

سلطنت میں پہلے ہی اطلاع پہنچ چکی تھی کہ سلطان کئی ایک راجوں مہاراجوں سے ہتھیار ڈلوا کر واپس آ رہا ہے۔ لوگ اپنے فاتح سلطان کے راستے میں جمع ہو گئے تھے۔ وہ نعرے لگا رہے تھے۔ فوج نعرے لگا رہی تھی۔ عورتیں منڈیروں پر کھڑی اپنی فوج کی بلائیں لے رہی تھیں۔ لوگ جب اُن پچپن ہزار ہندو قیدیوں کو اور تین سو پچاس ہاتھیوں کو دیکھتے تھے جو سلطان محمود ہندوستان سے لایا تھا تو وہ خوشی سے ناچنے لگتے تھے۔ غزنی کا بچہ بچہ سلطان محمود کے راستے میں آن کھڑا ہوا تھا۔ داد و تحسین اور نعروں کا شور زمین و آسمان کو ہلا رہا تھا۔

متعصب مؤرخین اور بعد کے تاریخ نویسوں نے لکھا ہے کہ غزنی پہنچ کر سلطان محمود نے حکم دیا کہ وہ جو مال و دولت ہندوستان سے لایا ہے، وہ محل کے باہر کھول کر رکھا جائے۔ جب زر و جواہرات اور درہموں کے انبار اُس کے سامنے رکھے گئے تو غرور اور تکبر سے اُس کی گردن تن گئی۔

یہاں تک تو حقیقت ہے کہ اُس نے تمام تر مالِ غنیمت اپنے محل کے باہر رکھوا کر دیکھا تھا لیکن اُس دور کے مبصروں نے جن میں الزمخشاری اور ابو عبداللہ یاقوت خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، لکھا ہے کہ سلطان محمود نے جب اپنی سلطنت کے عوام کا اس قدر پرجوش خیر مقدم اور اُن کی بے تابیاں دیکھیں تو اُس نے حکم دیا کہ وہ تمام زر و جواہرات اور خزانے ان لوگوں کے سامنے رکھ دو جو ہم ہندوستان سے لائے ہیں اور انہیں بتا دو

کہ یہ مال تمہارا ہے، یہ تمہارے خزانے کا مال ہے جو تم پر خرچ کیا جائے گا۔

اور اُس نے یہ بے بہا خزانہ قوم کی بہبود اور ذہنی ترقی کے لیے وقف کر دیا۔

اُس نے سنگِ مرمر کی ایک جامع مسجد اور اس کے ساتھ ایک یونیورسٹی کی تعمیر کا حکم دیا۔ مسجد کا نام عروسِ فلک رکھا گیا۔ یہ تھی بھی دلہن۔ اس کی تعمیر کے لیے دور دور سے معمار بلائے گئے۔ دیواروں اور چھت میں جو بیل بوٹے کھدوائے گئے ان میں سونا اور چاندی پگھلا کر ڈالی گئی۔ میناروں کے کلسوں پر سونا چڑھایا گیا۔ مسجد کے اندر نہایت دلکش اور قیمتی قالین بچھائے گئے۔ یونیورسٹی کو سلطان محمود نے اپنی نگرانی میں مثالی دارالعلوم بنایا۔ اس میں اس نے مختلف زبانوں کی کتابیں جمع کر دیں۔ مکمل ہو کر جامع مسجد اور یونیورسٹی علم و فن کا ایسا مرکز بن گئی جس کی مثال کم از کم عالمِ اسلام میں نہیں ملتی تھی۔ دور دور سے علماء اور اساتذہ بلائے گئے جن کے لیے اُس نے کثیر رقم وقف کر دی۔ طلباء کے لیے بھی بے اندازہ رقم الگ کر دی گئی جو انہیں وظیفوں کی صورت میں ملتی تھی۔

محمد قاسم فرشتہ اور البیرونی لکھتے ہیں کہ جامع مسجد اور یونیورسٹی متھرا اور قنوج کی فتح کی یادگار کے طور پر تعمیر کی گئی تھیں۔ تاریخ نویسوں نے سومنات کو زیادہ اہمیت دی ہے لیکن سلطان محمود کی نگاہ میں متھرا زیادہ اہم تھا کیونکہ متھرا ہندوؤں کے ہری کرشن کی جائے پیدائش ہے اور ہندوؤں کے ہاں متھرا کو وہی درجہ حاصل ہے جو مسلمانوں کے ہاں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کو حاصل ہے۔

سلطان محمود جو مالِ غنیمت لایا تھا اس میں سونے اور چاندی کے تیس لاکھ درہم تھے۔ ہیرے جواہرات اور سونے کے ٹکڑوں کا کوئی حساب نہ تھا۔ پچپن ہزار ہندو قیدی اور ساڑھے تین سو ہاتھی تھے۔ گھوڑوں اور تلواروں کا بھی کوئی شمار نہ تھا۔ مشہور مؤرخ محمد قاسم فرشتہ نے لکھا ہے کہ سلطان محمود ہندوستان سے تین عجیب چیزیں لایا تھا۔ ان میں ایک ہاتھی تھا، ایک فاختہ اور ایک پتھر۔

یہ ہاتھی اُسے متھرا سے قنوج کی طرف پیشقدمی کے دوران اس طرح ملا تھا کہ جمنا کے دائیں کنارے پر اسانی نام کی ایک ریاست تھی جس کا حکمران چندر رائے تھا۔ سلطان کو اُس کے جاسوسوں نے بتایا تھا کہ چندر رائے کے پاس ایک ہاتھی ہے

بڑی جسامت کا ہے جو ہندوستان میں کبھی نہیں دیکھا گیا۔ اس ہاتھی کی خوبی صرف یہی نہیں تھی کہ اُس کی جسامت غیر معمولی تھی بلکہ وہ اِس لیے بھی ملک بھر میں مشہور تھا کہ میدانِ جنگ میں دشمن کی صفوں میں دہشت اور تباہی پھیلا دیتا تھا اور دوسرے ہاتھیوں کی طرح تیر یا برچھی کھا کر پیچھے کو نہیں بھاگتا تھا۔ نڈر ہاتھی تھا۔

سلطان محمود نے اسائی کو اسی ہاتھی کے لیے محاصرے میں لے لیا تھا۔ یہ چھوٹی سی ریاست تھی۔ سلطان محمود نے چندر رائے کو پیغام بھیجا کہ وہ اپنا ہاتھی دے دے تو بڑی آسان شرائط پر محاصرہ اُٹھا لیا جائے گا۔ چندر رائے نے جواب بھیجا کہ یہ ہاتھی مجھے اپنی راجدھانی اسائی سے زیادہ عزیز ہے۔ میں جب تک زندہ ہوں اس ہاتھی سے دستبردار نہیں ہوں گا۔ پھر یوں ہوا کہ دونوں فوجوں کا تصادم ہوا۔ اس دوران یہی ہاتھی شاہانہ چال چلتا سلطان محمود کے پاس آ گیا۔ اس کے ہودے میں اس کے جنگجو سواروں کی لاشیں پڑی تھیں جن کے جسموں میں تیر اُترے ہوئے تھے۔ ہاتھی کی راہنمائی کرنے والا کوئی نہ تھا۔

سلطان محمود کے حکم سے ہاتھی کو پکڑ لیا گیا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ ہاتھی اپنے آپ آ گیا۔ سلطان محمود نے بے ساختہ کہا — "یہ ہاتھی مجھے چندر رائے نے نہیں خدا نے دیا ہے" — چنانچہ سلطان نے اس کا نام خداداد رکھ دیا۔

فرشتہ کے مطابق، سلطان محمود ہندوستان سے ایک پرندہ لایا تھا جو فاختہ سے ملتا جلتا تھا۔ اسے قدرت نے یہ خوبی عطا کی تھی کہ اس کا پنجرہ جس مکان یا محل میں رکھا ہوتا وہاں کوئی کسی کو زہر نہیں دے سکتا تھا۔ مکان یا محل کے کسی بھی کمرے میں کتنا ہی چھپا کر کسی کو زہر دیا جاتا تو یہ پرندہ پنجرے میں بُری طرح پھڑپھڑاتا تھا جیسے پنجرہ توڑنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اسی دوران اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے تھے۔ لوگ فوراً چوکنے ہو کر ہر جگہ جا کر دیکھتے کہ کون کسے زہر دے رہا ہے۔ فرشتہ لکھتا ہے کہ سلطان محمود نے یہ پرندہ تحفے کے طور پر خلیفہ بغداد القادر باللہ کو بھیج دیا تھا۔

فرشتہ نے ہی متعدد مؤرخوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ سلطان محمود ہندوستان

سے ایک پتھر لایا تھا جس میں یہ خوبی تھی کہ اسے پانی میں ڈبو کر اس سے ٹپکتے قطرے زخم پر ڈالنے سے زخم بہت جلدی ٹھیک ہو جاتا تھا۔

سلطان محمود نے اپنا چھوٹا سا قافلہ شیخ ابوالحسن خرقانی کے آستانے سے کوئی ایک میل دُور روک لیا اور وہ گھوڑے سے اُترا۔ اُس نے معمولی سے کپڑے پہن رکھے تھے۔ اس قدر معمولی کہ اُسے نہ جاننے والوں کو شک تک نہ ہو سکتا تھا کہ وہ سلطان محمود ہے جس نے سارے ہندوستان پر لرزہ طاری کر رکھا ہے۔ اُس نے اپنے محافظوں کو وہیں رُکے رہنے کو کہا اور خود پیدل چل پڑا۔ اپنے پیرو مرشد کے سامنے وہ شاہانہ شان و شوکت سے کبھی نہیں گیا تھا۔ شیخ ابوالحسن خرقانی کے ہاں جا کر اُس نے اُن کے ہاتھ چومے اور سر جھکا کر بیٹھ گیا۔

"وہ وقت یاد کرو جب تم ہندوستان سے شکست کھا کر آئے تھے" شیخ خرقانی نے کہا — "تم دل برداشتہ تھے۔ تمہاری فوج کٹ گئی تھی۔ تمہاری ہمت ٹوٹ گئی تھی اور یہاں تمہارے دشمن تمہیں لاش سمجھ کر تمہارے اوپر گدھوں کی طرح منڈلانے لگے تھے۔ مجھے ڈر تھا کہ تم ہتھیار ڈال کر بیٹھ جاؤ گے۔ فتح اور شکست خدا کے اختیار میں ہے۔ ہارتے وہ ہیں جو شکست کو تسلیم کر لیتے ہیں اور شکست کو وہی تسلیم کرتا ہے جس کا ایمان کمزور ہوتا ہے ....

"تم شہیدوں کے خون کی قیمت ادا نہیں کر سکتے محمود! ان کی قدر کر سکتے ہو اور یہ تمہارا فرض ہے۔ یاد رکھو، تم اگر انہیں بھول گئے جو نعرے لگاتے اور سینہ تانے تمہارے ساتھ گئے تھے مگر واپس نہیں آ سکے تو اس کی سزا اس دنیا میں پاؤ گے۔ وہ تمہارے حکم سے نہیں خدا کے حکم سے لڑے تھے۔"

"میں نے اُن کی یاد میں ایک جامع مسجد اور ایک دارالعلوم کی تعمیر کا حکم دے دیا ہے" — سلطان محمود نے کہا — "اور اُن کی یادگار کے طور پر مینار بھی تعمیر کروا رہا ہوں۔ شہیدوں کے بچوں کو دارالعلوم میں مفت تعلیم اور وظیفہ ملا کرے گا۔"

"اور غور سے سنو محمود!" — شیخ ابوالحسن خرقانی نے کہا — "خدا کے برگزیدہ نے تمہارا

استقبال اس طرح کیا ہے جیسے تم آسمان سے اترے ہو۔ میں سن چکا ہوں کہ عورتوں نے تمہاری راہ میں اور تمہارے اوپر پھول پھینکے تھے۔ شاعروں نے تمہاری مدح میں شعر کہے اور گویوں نے گیت گائے ہیں۔ دربار میں لوگوں نے تمہارے ہاتھ چومے اور تمہیں ساری دنیا کا فاتح کہا ہے ... تم شاید نہیں سمجھ سکے کہ جنہیں تم نے پھول سمجھا ہے وہ کانٹے تھے جو تمہاری راہ میں بکھیرے گئے تھے، اور وہ مدح سرائی جو شاعروں اور گویوں نے کی، وہ شہد میں ملا ہوا زہر ہے جو تمہیں پلایا گیا۔ اگر آج تمہارا تختہ الٹ جائے تو یہی لوگ نعرے لگائیں گے کہ محمود اسی قابل تھا۔ اس میں سلطان بننے کی اہلیت نہیں تھی۔ وہ پھر اس کے گن گائیں گے جو تمہارے تخت پر بیٹھا ہوگا....

"خوشامدی درباری تخت و تاج کی دیمک ہوتے ہیں۔ وہ دشمن سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ تم نے غزنی کے اکابرین اور امراء اور رتبوں والوں کو جب ضیافت دی تھی تو تم بھول گئے تھے کہ تمہاری سلطنت میں اس رات لاکھوں انسان روکھی سوکھی کھا کر سو گئے تھے اور کچھ ایسے بھی تھے جن کے پیٹ میں اس شام ایک نوالہ بھی نہیں گیا تھا۔ خوشامدیوں نے تمہیں یہ تاثر دیا تھا کہ رعایا خوشحال ہے اور وہ تمہارے گیت گا رہی ہے... محمود! اپنے آپ کو اپنی روح کے آئینے میں اور اپنی رعایا کو اپنی آنکھوں سے دیکھو۔ اس آئینے میں نہ دیکھو جو تمہیں درباری ٹولہ دکھایا کرتا ہے۔ تم تنہا اپنی ذات میں کچھ بھی نہیں۔ تم قوم کا عکس ہو۔ اپنے آپ کو اس عکس میں گم کر دو۔ سلطانی اور عیاری ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ خوشامدی اور عہدوں کے بھوکے لوگ سلطان سے عیاری کرتے ہیں اور سلطان قوم سے عیاری کرتا ہے۔ یوں سمجھو کہ گناہ اور نیکی کندھے سے کندھا ملا کر چلتے ہیں، اور جو سلطان اپنی آنکھوں پر خوشامدیوں کی پٹی باندھ لیتا ہے اور کانوں میں مدح سرائی کا سیسہ پگھلا کر ڈال لیتا ہے وہ خدا کے نزدیک سب سے بڑا گنہگار ہے....

"آج تمہیں خدا نے جو طاقت اور جو جاہ و حشمت عطا کی ہے، یہ تم سے چھن بھی سکتی ہے۔ خوشامدیوں کے نعروں کی نسبت رعایا کی آہیں عرش تک جلدی پہنچتی ہیں۔ ہندوستان کی فتوحات نے تمہاری رعایا میں اضافہ کر دیا ہے۔ تمہاری ذمہ داریاں

بڑھ گئی ہیں.... کہیں ایسا نہ ہو کہ سونے چاندی کے انبار تمہیں اندھا کر دیں۔ جو کچھ ہے اللہ کا ہے۔ اللہ کی امانت ہے۔ خزانہ تمہاری ملکیت نہیں۔ مال غنیمت تمہاری ملکیت نہیں۔ محل کی سازشوں سے نکلو اور نظر دشمن پر رکھو۔ تمہیں فتح مبارک ہو۔ میں تصوروں میں وہ اذانیں سن رہا ہوں جو بت خانوں میں گونج رہی ہیں۔ تمہیں پھر وہاں جانا ہے۔ سانپ کا سر ابھی کچلا نہیں گیا۔ میں آنے والے وقت کو دیکھ رہا ہوں۔ اگر ہندومت کا سر کچلا نہ گیا تو یہ مذہب مسلمانوں کو ڈستا ہی رہے گا.... جاؤ محمود! اگلی جنگ کی تیاری کرو۔"

"پیر و مرشد!" سلطان نے سر اٹھا کر کہا۔ "میری روح کو اسی روشنی کی ضرورت تھی جو آپ نے عطا کر دی ہے۔ میرے دل میں کوئی وہم اور کوئی شک نہیں۔ میں نے اس حقیقت کو قبول کر لیا ہے کہ میری عمر کفر کے خلاف لڑتے گزرے گی۔ مجھے پریشانی صرف یہ ہے کہ میری اپنی قوم کے حکمران میرے دشمن ہیں۔ ہم خانہ جنگی میں بہت خون بہا چکے ہیں۔"

"ایک فرق دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کرو۔" شیخ ابوالحسن خرقانی نے کہا۔ "ایک دشمن تمہاری سلطنت کے ہیں۔ وہ تم سے تخت و تاج چھیننا چاہتے ہیں اور ایک دشمن وہ ہیں جو اسلام کو کمزور کر رہے ہیں۔ انہیں غدار کہتے ہیں۔ اپنے ذاتی دشمن اور اپنے مذہب کے دشمن میں تمیز کرو۔ کسی کو اس لیے قید میں نہ ڈال دو کہ وہ تمہارے جاہ و حشمت کا منکر ہے۔ اگر تمہارا اپنا بیٹا، اپنی بیٹی اور اگر تمہارا سگا بھائی بھی اسلام کو نقصان پہنچا رہا ہے تو اسے جینے کے حق سے محروم کر دو۔ کاشغر کا حکمران قدر خان اور اس کے پڑوسی ابو منصور ارسلان خان اور طوغان خان تمہاری سلطنت پر قبضہ کرنے کی سوچ رہے ہیں۔ وہ خانہ جنگی کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ وہ عالم اسلام کے اتحاد کو پارہ پارہ کر رہے ہیں۔ انہیں عیسائی مدد اور مواد دے رہے ہیں۔ اگر یہ سر اٹھائیں تو انہیں کچل دو لیکن کچلنے سے پہلے انہیں موقع دو کہ وہ سمجھ سکیں کہ وہ غلط راستے پر چل رہے ہیں۔"

سلطنتِ غزنی کے مسلمان دشمنوں کا مختصر سا پس منظر یہ ہے کہ ایلک خان ترکستانی اور گرد کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے حکمرانوں کو اپنے ساتھ ملا کر سلطان محمود غزنوی کی بڑھتی ہوئی طاقت کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ آپ اس سلسلے میں تفصیل سے پڑھ چکے ہیں کہ کئی بار سلطان محمود کو ان کے خلاف لڑنا پڑا۔ ایلک خان مر چکا تھا۔ اب اُس کا بھائی ابو منصور ارسلان خان الاصم تخت نشین تھا۔ اسے الاصم اس لیے کہا جاتا تھا کہ کانوں سے بہرہ تھا۔ کاشغر کا حکمران قادر خان تھا اور اس کے پڑوس میں تومان خان کی ریاست تھی۔ یہ دراصل ریاستیں نہیں امارتیں تھیں جو خلافتِ بغداد کے تحت تھیں مگر خلافت کی اہمیت ختم ہو چکی تھی۔ خلیفہ القادر باللہ عباسی تھا جو خود اقتدار پرست تھا۔ وہ ایک ریاست کا حکمران بھی تھا۔ وہ سلطان محمود کے خلاف خانہ جنگی کو درپردہ ہوا دیتا رہتا تھا۔

سلطان محمود متھرا سے قنوج تک فتح کر کے واپس آیا تو ایک رات قادر خان ابو منصور ارسلان خان کے محل میں بیٹھا تھا۔ قادر خان کی ایک جوان بیٹی اختی بھی اُس کے ساتھ آئی ہوئی تھی۔ رات کو جب قادر خان اور ابو منصور خاص کمرے میں بیٹھے رازو نیاز کی باتیں کر رہے تھے، قادر خان کی بیٹی اختی اور ابو منصور کی جوان بیٹی سمن تاش باغ میں ٹہل رہی تھیں۔ رات خاموش تھی۔ صرف ایک آواز تھی جو اس سکوت میں تیر رہی تھی۔ یہ تاروں کا ایک ساز تھا جس کے ساتھ کوئی دھیمے دھیمے گنگنا رہا تھا۔ ساز و آواز میں سوز تھا اور ایسا تاثر کہ جذبات پر وجد طاری ہوا جا رہا تھا۔

وہ نابینا موسیقار تھا۔ ابو منصور کے دربار کا مغنی تھا۔ سمن تاش نے اُسے باغ کے کسی گوشے میں بٹھا رکھا تھا اور وہ خود اختی کے ساتھ ٹہل رہی تھی۔ نابینا مغنی کی عمر بیس برس سے ذرا ہی زیادہ تھی۔ ڈیڑھ ایک سال سے ابو منصور کے دربار میں تھا۔ سمن تاش کو موسیقی سے دلی لگاؤ تھا۔ ایک روز یہ نابینا محل کے باغ کے قریب آگیا اور اس نے تاروں کو چھیڑ دیا۔ سمن تاش کے کانوں میں آواز پڑی تو اس نے اُسے اندر بلا لیا۔ ابو منصور نے اُس سے ایک ہی نغمہ سنا تو اُس نے مغنی کو ہمیشہ کے

لیے اپنے پاس رکھ لیا۔ ابو منصور کو اپنی بیٹی سمن تاش سے بہت پیار تھا۔ سمن تاش نابینا مغنی کو اپنے کمرے میں بھی بلا لیا کرتی تھی۔

"سمن!" ___ اختی نے جذباتی سی آواز میں کہا ___ "کتنی پیاری آواز ہے۔ خمار سا طاری ہونے لگا ہے۔"

"یہ موسیقار نابینا ہے" ___ سمن تاش نے کہا ___ "آنکھوں کے نور سے محروم پیدا ہوا تھا مگر خدا نے قدرت کی ساری نغمگی اس کی آواز میں سمو دی ہے۔ ابا اجازت نہیں دیں گے۔ میں اس مغنی کو سلطان محمود کے دربار میں لے جانا چاہتی ہوں۔"

"وہ کیوں؟" ___ اختی نے رک کر پوچھا ___ "سلطان محمود کے دربار میں کیوں؟ تمہارا اُس کے ساتھ کیا تعلق ہے؟"

"جو ایک مسلمان کا ایک مسلمان کے ساتھ ہوتا ہے" ___ سمن تاش نے کہا ___ "میں اس نابینا موسیقار کے ساز اور اس کی آواز سے سلطان محمود کی عقیدت کا اظہار کرنا چاہتی ہوں۔ تم نے سنا نہیں وہ ہندوستان میں کتنے بت خانے توڑ آیا اور کتنے مہاراجوں سے ہتھیار ڈلوا آیا ہے؟"

"اس کی تمہیں کیا خوشی ہے؟" ___ اختی نے پوچھا ___ "سلطان محمود ہمارے اور تمہارے خاندان کا دشمن ہے۔ وہ جو ہاتھی، گھوڑے، جنگی قیدی اور اسلحہ لایا ہے، وہ سب ہمارے خلاف استعمال ہوگا۔ تم شاید اپنے خاندان کی تاریخ سے واقف نہیں ہو۔"

"میں اپنے خاندان کی تاریخ سے واقف ہوں، اسی لیے سلطان محمود کی معتقد ہوں" سمن تاش نے کہا ___ "وہ ہمارا دشمن نہیں بلکہ ہم دونوں کے خاندان اُس کے دشمن ہیں۔ وہ اسلام کا علمبردار ہے۔ بت شکن ہے۔ تم شاید نہیں جانتیں کہ اُس نے ہندوستان میں کتنے مہاراجوں کو شکست دی ہے لیکن وہاں حکومت کرنے کے لیے تخت پر نہیں جا بیٹھا۔"

"اس کی وجہ یہ ہے سمن! کہ وہ زر و جواہرات اور مال و دولت کی خاطر ہندوستان جاتا ہے" اختی نے بڑے پیار سے کہا ___ "اب کے وہ دو مہینوں کے جواہرات اور سونا ہاتھی لاد کر لایا ہے۔ اُس نے بے پناہ مالِ غنیمت اپنی فوج میں تقسیم کیا ہے۔"

وہ ہمیں اپنا غلام بنانے کی تیاری کر رہا ہے۔"

"میں تو اُس کی لونڈی بننے کو تیار ہوں" ــــ سمن تاش نے کہا۔

"تم میں خاندانی غیرت نہیں رہی" ــــ انتشی نے کہا ــــ "تم ایلک خان کی بھتیجی ہو جو سلطان محمود کے خلاف لڑ رہا ہے۔ تمہیں ابا نے کچھ بتایا نہیں؟"

"چچا ایلک خان سلطان محمود کے خلاف لڑ رہا ہے اور ہر میدان میں شکست کھا کر بھاگتا رہا ہے" ــــ سمن تاش نے کہا ــــ "مجھے میرے ابا کیا بتا سکتے ہیں؟ .... وہ بہرے ہیں۔ ان کے کانوں میں حق کی آواز نہیں پہنچتی۔ وہ اُسی کو سچ سمجھتے ہیں جو اُن کے کانوں میں ڈالا جاتا ہے۔"

"کیا تم اپنے باپ کو احمق سمجھتی ہو سمن؟" ــــ انتشی نے کہا ــــ "معلوم ہوتا ہے خدا نے تمہیں عقل اور غیرت کی جگہ بھی حسن ہی دے دیا ہے۔ کم از کم غزنی اور خراسان میں تم جیسی خوبصورت لڑکی کوئی نہیں ہوگی لیکن تم عقل سے عاری ہو۔"

"مگر میرے اتالیق عقل سے عاری نہیں" ــــ سمن تاش نے کہا ــــ "تم نے میرے سفید ریش، عمر رسیدہ اتالیق کو دیکھا ہے۔ وہ علم اور تجربے کا سمندر ہیں۔ وہ مجھے میرے خاندان کی تاریخ سنا چکے ہیں۔ انہوں نے میرے ابا کے متعلق کہا تھا کہ ان میں تدبر نہیں۔ میں نے کہا تھا کہ ان کی مجبوری ہے کہ وہ بہرے ہیں سن نہیں سکتے۔ اتالیق نے کہا کہ جو کوئی تخت پر بیٹھ کر سر پر تاج رکھ لیتا ہے وہ بہرہ ہو جاتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ سن رہا ہے مگر سچ اور حق بات سننے کے لیے اُس کے کان بند ہو جاتے ہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہ دیکھ سکتا ہے مگر اُسے حقیقت نظر نہیں آتی۔ وہ سمجھتا ہے کہ اُس کا دماغ سوچ رہا ہے مگر دماغ پر کسی اور کا آسیب سوار ہوتا ہے....

"انتشی! میرے اتالیق نے کہا تھا کہ تمہارے باپ کا بڑا بھائی ایلک خان بہرہ نہیں تھا۔ خدا نے اُسے عقل و دانش سے نوازا تھا مگر اُس نے اپنے دماغ پر غزنی کو فتح کرنے اور سلطان محمود کو قید یا قتل کرنے کا بھوت سوار کر لیا۔ اُس کے جو کان سن سکتے تھے وہ بند ہو گئے۔ آنکھیں جو دیکھ سکتی تھیں اندھی ہو گئیں اور عقل پر سلطانی کی ہوس کا پردہ پڑ گیا۔ ایسے حکمران کو جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔ تمہارے چچا ایلک خان نے بھی اپنی

رعایا سے جھوٹ بولے۔ اپنے دوستوں سے جھوٹ بولے۔ مسجدوں میں جھوٹ بولے۔ قرآن ہاتھ میں لے کر جھوٹ بولے۔ اپنی فوج کو اور اپنی رعایا سے کہا کہ سلطان محمود لٹیرا ہے اور وہ اپنی سلطنت کو وسیع کر رہا ہے۔ ایلک خان نے جھوٹی غیرت کی قسمیں کھائیں اور اپنی فوج کو بھڑکا کر بھائی کو بھائی سے لڑا دیا۔ اسلام کی عسکری قوت کمزور ہو گئی اور کفار کے ہاتھ مضبوط ہو گئے....

"میرے اتالیق نے مجھے بتایا کہ سلطان محمود اگر سلطنت کی وسعت کی خواہش رکھتا تو اُس کے پاس اتنی فوج ہے کہ وہ ان چھوٹے چھوٹے حکمرانوں اور ترکستان کے خوانین کو اپنا مطیع بنا چکا ہوتا لیکن اُس کی نظر کچھ اور دیکھ رہی ہے۔ اُس کا جنون کچھ اور ہے۔ محمد بن قاسم نے ہندوستان میں جو اسلام پھیلایا تھا اُس پر ہندومت کے سائے پڑ گئے ہیں۔ سلطان محمود کو خواب میں بشارت ہوئی تھی کہ ہندوستان میں اسلام کی ٹمٹاتی ہوئی شمع کو روشن کرے۔ اُس کے پیر و مرشد شیخ ابوالحسن خرقانی ہیں جو غیب دان تو نہیں لیکن علم و فضل اور ایمان کی روشنی انہیں وہ سب کچھ دکھا دیتی ہے جو بے سمجھ اور کم عقل انسانوں کو نظر نہیں آتا۔ شیخ خرقانی نے سلطان محمود سے کہا ہے کہ کفر کا اور اپنی قوم میں غداروں کا خاتمہ کرو....

"میرے اتالیق نے کہا کہ جب بھائی بھائی سے لڑتا ہے تو ان کے خون کے قطروں سے زمین کانپ جاتی ہے۔ آسمان آنسو بہاتا اور فرشتے روتے ہیں۔"

"سمن تاش!" ــــ انتشی نے سامنے آ کر اپنے ہاتھوں میں اُس کے گال تھام لیے اور بولی ــــ "تم نے پہلے کبھی ایسی باتیں نہیں کی تھیں۔ اس عمر میں ایسی سنجیدہ باتیں تمہیں اچھی نہیں لگ رہیں، اور تمہارا اتالیق تمہیں کتنی غلط باتیں بتا رہا ہے۔ وہ تمہیں اسی عمر میں درویش بنا رہا ہے۔ ایسی خوبصورت رات، ایسا وجد آفریں نغمہ، تم کتنی بد ذوق ہوتی جا رہی ہو سمن!"

"روح کو جب روشنی مل جائے انتشی!" ــــ سمن تاش نے کہا ــــ "میں بد ذوق نہیں۔ یہ نابینا موسیقار میرے ذوق کی بدولت درباری رتبہ حاصل کیے ہوئے ہے۔ میں نے روح کی جس روشنی کی بات کی ہے وہ مجھے اپنے اتالیق اور اس موسیقار

کے نغموں سے مل رہے ہیں۔ میں محسوس کرتی ہوں کہ اس کے ساز کے تار کچھ کہہ رہے ہیں۔ ان کے ترنم میں مجھے ایک پیغام سنائی دیتا ہے۔"

"کیا ہے وہ پیغام؟"

"معلوم نہیں" ــــ سمن تاش نے کہا ــــ "میں ابھی سمجھی نہیں۔"

نابینا موسیقار تاروں پر آہستہ آہستہ مضراب چلا رہا تھا اور وہ خوابناک آواز میں گنگنا رہا تھا۔ گا رہے اُس کی آواز ساز کی آواز، لگتا ہے ساز کی آواز اُس کی آواز لگتی تھی۔ دونوں لڑکیاں ٹہلتے ٹہلتے اُس کے قریب آ گئیں۔ موسیقار پر بےخودی طاری تھی اور وہ جیسے کسی اور کی موجودگی سے بےخبر تھا۔

"کیا تم اپنے ابا حضور کو قائل کر سکتی ہو کہ سلطان محمود اپنی سلطنت کی توسیع نہیں چاہتا" ــــ اختی نے پوچھا ــــ "اور کیا تمہارے ابا مان جائیں گے کہ سلطان محمود کی جنگیں اسلام کی خاطر ہیں؟"

"انہیں منوانے کی مجھے کیا ضرورت ہے؟" ــــ سمن تاش نے کہا ــــ "وہ سلطان محمود کے خلاف ہو سکتے ہیں، اُس کے خلاف لڑیں گے نہیں۔ ان کے دل میں دشمنی موجود ہے۔ وہ سلطان کے خلاف لڑیں گے بھی نہیں اور اس کی مدد بھی نہیں کریں گے۔"

"میں تمہیں راز کی ایک بات بتاؤں؟" ــــ اختی نے کہا ــــ "تمہارے ابا حضور سلطان محمود کے خلاف لڑنے کی تیاری کر رہے ہیں۔"

"وہ ایسی جرأت نہیں کریں گے!"

"وہ ایسی جرأت کا اظہار کر چکے ہیں" ــــ قادر خان کی بیٹی اختی نے کہا ــــ "میرے ابا اسی مقصد کے لیے یہاں آئے ہیں۔ وہ تمہارے ابا کے ساتھ اسی سلسلے میں بات کر رہے ہیں۔"

"میں انہیں روک لوں گی" ــــ سمن تاش نے تڑپ کر کہا۔

"ہوش میں آؤ سمن!" ــــ اختی نے قدرے غصیلی آواز میں کہا ــــ "ترکستان کی بیٹیاں اتنی بےغیرت نہیں ہوا کرتیں۔ تم ذہنی طور پر غزنی والوں کی غلام بن گئی ہو۔"

نابینا موسیقار کے ساز کے تار اتنی زور سے جھنجھنائے جیسے اُس کا ہاتھ کانپ گیا ہو اور مضراب بےقابو ہو گیا ہو۔ تار خاموش ہو گئے۔ مغنی کی آواز رات کے سکوت میں تحلیل ہو گئی۔

"سلطان محمود بہت بڑی طاقت بن گیا ہے" ــــ اختی کہہ رہی تھی ــــ "اب وہ تمام ترکستان پر اسی طرح حملہ اور قبضہ کرے گا جس طرح اُس نے خوارزم پر کیا تھا۔ کیا تم بھول گئی ہو کہ اب خوارزم شاہ کون ہے؟.... التونتاش!.... اور اُس کا نائب سلطان محمود کا مشہور سالار ارسلان جاذب ہے۔ یہ دونوں غزنی کے قصاب ہیں۔ انہوں نے ہر اُس آدمی کو قتل کرا دیا ہے جن کے متعلق انہیں شک تھا کہ غزنی کے وفادار نہیں۔"

"ہم دونوں کے والد کیا کرنا چاہتے ہیں؟"

"خراسان پر حملہ" ــــ اختی نے کہا ــــ "پیشتر اس کے کہ سلطان محمود کو اطلاع ملے، خراسان ہمارے قبضے میں ہو گا۔"

"اور جب سلطان محمود جوابی حملہ کرے گا تو اس کا مقابلہ کون کرے گا؟"

"میرے ابا قادر خان، تمہارے ابا ابومنصور اور بخارا کے امیر الپتگین کا بھائی تُوغان خان" ــــ اختی نے جواب دیا ــــ "ترکستان کے تمام امراء کو ایک محاذ پر اکٹھا کیا جا رہا ہے۔"

سمن تاش ہنسنے لگی اور ہنستی ہی چلی گئی۔ اس کی ہنسی میں بچپن کا انداز تھا لیکن اس ہنسی میں طنز تھی۔ اس نے کہا ــــ "کیا چوہے اور چھپکلیاں مل کر ایک شیر کا مقابلہ کر سکتی ہیں؟"

"اگر شیر زندہ ہی نہ رہا تو؟" ــــ اختی نے کہا۔

"زندہ نہ رہا تو!" ــــ سمن تاش نے حیران سا ہو کے کہا۔

"اُسے خراسان پر حملے سے پہلے قتل کر دیا جائے گا" ــــ اختی نے کہا اور چونک کر بولی ــــ "تمہارا موسیقار سو گیا ہے یا چلا گیا ہے؟"

رات کی خاموشی میں ساز کی دھیمی دھیمی، لرزتی کانپتی آواز اُبھرنے لگی اور اس کے ساتھ نابینا مغنی کی آواز کی دبی دبی میٹھی میٹھی گونج سنائی دینے لگی۔

"یہ خاموش کیوں ہوگیا تھا؟" ــــ اختی نے پوچھا۔ "یہ ہماری باتیں سننے کے لیے چپ ہوگیا تھا۔"

"ایک اندھے موسیقار سے اتنا خوف؟" ــــ سمن تاش نے کہا۔ "اسے موسیقی کے سوا کسی اور چیز کے ساتھ ذرہ بھر دلچسپی نہیں۔"

اختی سمن تاش کو بازو سے پکڑ کر پرے لے گئی اور بولی۔ "تمہیں کچھ بھی معلوم نہیں۔ سلطان محمود کے جاسوس اور مخبر ہر جگہ موجود ہیں۔ میرے ابا اپنے ہاں غزنی کے دو جاسوسوں کو پکڑ کر جلاد کے حوالے کر چکے ہیں۔ جاسوس تمہارے ہاں بھی موجود ہیں۔"

"آنکھوں سے محروم، موسیقی میں ڈوبا ہوا انسان جاسوس نہیں ہوسکتا" ــــ سمن تاش نے کہا ــــ "تم مجھے بتاؤ کہ سلطان محمود کو کب اور کس طرح قتل کیا جائے گا؟"

"اس کا فیصلہ آج ہو جائے گا" ــــ اختی نے کہا۔ "سمن تاش! تمہارا اتالیق بھی غزنی کا جاسوس معلوم ہوتا ہے، ورنہ ترکستان کے اتنے بڑے دشمن کو وہ اسلام کا علمبردار نہ کہتا۔ اگر تم اپنے ابا کی زندگی چاہتی ہو تو اتالیق کی باتوں کو سچ ماننا چھوڑ دو۔ یہ خرانٹ بوڑھا تمہیں گمراہ کر رہا ہے۔"

سمن تاش کی زبان جیسے گنگ ہوگئی ہو۔ اختی بولتی رہی اور وہ سنتی رہی۔

"اختی!" ــــ سمن تاش اکتائے ہوئے اور کچھ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی ــــ "ہمیں چلنا چاہیے...... تم چلو۔ میں موسیقار کو اس کے ٹھکانے پر چھوڑنے جا رہی ہوں۔"

"کسی ملازم کو اس کے ساتھ بھیج دو" ــــ اختی نے کہا۔ "تم خود کیوں جاؤ گی؟"

سمن تاش نے کوئی جواب نہ دیا اور وہ موسیقار کی طرف چل پڑی۔

نابینا موسیقار کو محل کے قریب ہی مکان دیا گیا تھا۔ سمن تاش اُس کا ہاتھ پکڑے اُسے اُس کے کمرے میں لے گئی۔ راستے میں وہ کچھ بھی نہ بولی۔ موسیقار کے کمرے سے نکلنے لگی تو موسیقار نے اُسے رک جانے کو کہا۔

"آپ شہزادی ہیں، میں آپ کا خادم ہوں" ــــ موسیقار نے بڑے اداس لہجے میں کہا ــــ "ایک بات کہوں تو برا نہ ماننا شہزادی!...... مجھے یہاں سے چلے جانا چاہیے۔"

"کیوں؟"

"خان قادر خان کی شہزادی نے مجھے جاسوس کہا تھا" ــــ موسیقار نے کہا ــــ "کہتی تھی کہ میں آپ دونوں کی باتیں سننے کے لیے خاموش ہوگیا تھا...... سمن شہزادی! مجھے بادشاہوں اور سلطانوں کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں۔ میرے لیے دنیا کبھی ختم نہ ہونے والی تاریکی اور آوازیں ہیں۔ اسے میں اپنے نغموں سے روشن رکھتا ہوں۔"

"نہیں" ــــ سمن تاش نے کہا ــــ "اُس نے تمہیں جاسوس نہیں بلکہ یہ کہا تھا کہ دھیمے سُروں میں بجتے بجتے تمہارے ساز کے تار بڑی زور سے جھنجھنائے تھے اور تم خاموش ہوگئے تھے۔ اُسے شک ہوا تھا کہ تم ہماری باتیں سننے کے لیے چپ ہوگئے تھے۔"

"قادر خان کی شہزادی کے منہ سے سلطان محمود کے قتل کی بات نکلی تو میرا ہاتھ کانپ گیا۔ مضراب بے قابو ہو کر تاروں کو جا لگا" ــــ نابینا مغنی نے کہا ــــ "اور میری زبان کانپ کر خاموش ہوگئی۔"

"اگر سلطان محمود قتل ہو جائے تو کیا قیامت آ جائے گی؟" ــــ سمن تاش نے پوچھا۔

"سلطان ہو یا سپاہی، کسی کو قتل نہیں ہونا چاہیے" ــــ مغنی نے کہا۔ "اور میں جانتا ہوں کہ آپ سلطان محمود کو پسند کرتی ہیں۔ اگر وہ قتل ہو جائے تو تجھ پر وہی قیامت آئے گی جو آپ پر ٹوٹے گی۔ آپ کی طرح میں بھی سلطان محمود کو اسلام کا علمبردار اور پاسبان سمجھتا ہوں۔"

"لیکن یہاں کسی کے ساتھ اُس کے حق میں کوئی بات نہ کرنا" ــــ سمن تاش نے کہا۔

"اُسے کون قتل کرے گا؟" ــــ موسیقار نے پوچھا ــــ "اُسے کب قتل کیا جائے گا؟"

"میں ابھی ان سوالوں کے جواب نہیں دے سکتی" ــــ سمن تاش نے کہا ــــ "تم اب آرام کرو۔"

"ذرا رک جاؤ شہزادی!" ــــ موسیقار نے کہا ــــ "میں آرام نہیں کر سکوں گا۔ میں سو نہیں سکوں گا۔"

"تم کر بھی کیا سکتے ہو" — سمن تاش نے کہا۔ "تم خانہ جنگی نہیں روک سکتے۔ تم غزنی کے سلطان کو قاتلوں سے نہیں بچا سکتے۔"

"اگر آپ مجھے کچھ بتا سکیں تو میں غزنی جا کر سلطان محمود کو قبل از وقت خبردار کر سکتا ہوں۔"

سمن تاش نے ہنس کر کہا۔ "تم بہت جلد باز ہو۔ تم غزنی کیسے جاؤ گے؟"

"جو کرنا پڑا، چلا جاؤں گا"— مغنی نے کہا۔ "یہاں میرے کچھ شاگرد بھی ہیں۔ جسے کہوں گا وہ چلا جائے گا۔"

"کیا تم اس معاملے میں سنجیدہ ہو؟" — سمن تاش نے کہا۔ "جو کہہ رہے ہو وہ کر کے دکھا سکتے ہو؟"

"آپ راز کی بات بتا دیں۔ باقی کام میں کسی سے کرا لوں گا۔" موسیقار نے کہا "شہزادی سمن! میں نے سلطان محمود کے متعلق اپنی رائے آپ کی رائے سن کر دی ہے۔"

"کسی کو پتہ نہ چلے کہ ہمارے درمیان یہ باتیں ہوئی ہیں"— سمن تاش نے کہا۔

"ماں!" — سمن تاش نے اپنی ماں سے جا کر کہا۔ "کیا آپ حضور اپنے خاندان کی روایت کو مرنے نہیں دیں گے؟"

"کیسی روایت بیٹی؟"

"کیا آپ کو معلوم نہیں کہ کاشغر کا خان کیوں آیا ہے؟" — سمن تاش نے کہا — "خراسان پر حملے کی تیاری ہو رہی ہے۔ قادر خان ہمارے ابا کو بھی ایلک خان کے راستے پر لے جا رہا ہے۔ ہمارے خاندان کے ابھی پہلے زخم نہیں بھرے.... کیا آپ انہیں روک سکتی ہیں؟"

اتنے میں کمرے کا دروازہ کھلا اور سمن تاش کا باپ، ابو منصور ارسلان خان کمرے میں داخل ہوا۔ وہ بہت اونچی آواز میں سنتا تھا۔ اپنی بیوی اور بیٹی کو دیکھ کر رک گیا اور انہیں بڑی غور سے دیکھنے لگا۔ سمن تاش کی ماں نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔

"تم دونوں کے چہرے بتا رہے ہیں کہ کوئی خاص بات ہوئی ہے"— ابو منصور نے کہا۔

سمن تاش کی ماں نے ابو منصور کے کان کے ساتھ منہ لگا کر بلند آواز سے کہا۔ "آپ ہمارے چہرے دیکھ رہے ہیں۔ اگر آپ ہماری آنکھوں میں جھانکیں تو آپ کو اسلام کے سپاہیوں کی خون چکاں لاشیں تڑپتی نظر آئیں گی۔ آپ کو اسلام کا پرچم خاک و خون میں پڑا دکھائی دے گا.... میری آنکھوں میں دیکھیں۔ آپ کو ایک ہی مذہب کے ماننے، ایک ہی خدا اور ایک رسولؐ کا کلمہ پڑھنے والے ایک دوسرے کا خون بہاتے نظر آئیں گے۔"

"خاموش ہو جاؤ"— ابو منصور نے گرج کر کہا۔ "تمہیں میرے معاملات میں دخل دینے کی جرأت کیسے ہوئی ہے!"

"جیسے اس وقت جرأت ہوا کرتی تھی جب میں جوان تھی"— سمن تاش کی ماں نے کہا۔ "میرے جسم میں دل کشی تھی اور چہرے کا حسن تر و تازہ تھا۔ آج میری جگہ پانچ جوان لڑکیوں نے لے لی ہے۔ خدا نے آپ کے کان بند کر رکھے ہیں اور عقل پر پانچ لڑکیاں غالب ہو گئی ہیں۔ آپ سوچ نہیں سکتے، سمجھ نہیں سکتے کہ ان میں دو لڑکیاں جو تحفے کے طور پر آئی ہوئی ہیں وہ کس نے کس نیت سے بھیجی ہیں۔"

"لیکن جو اختیار تمہیں حاصل ہے وہ میں نے کسی اور کو نہیں دیا"— ابو منصور نے کہا۔ "تم نہیں جانتیں کہ ہم نے سلطان محمود پر یہ ظاہر نہ کیا کہ ہم زندہ ہیں اور ہم میں طاقت ہے تو وہ ہمیں خوارزم کی طرح نگل جائے گا۔ جانتی ہو وہ کتنا طاقتور ہو گیا ہے؟"

"آپ کو یہ کس نے بتایا ہے کہ وہ آپ کو نگلنے کے لیے طاقتور ہوا ہے؟" — سمن تاش نے اس کے دوسرے کان کے ساتھ منہ لگا کر بلند آواز سے کہا۔ "یہ وہم ترکستانیوں کو ہوا ہے۔ وہ آپ کو استعمال کر رہے ہیں۔"

"قادر خان پر مجھے بھروسہ ہے"— ابو منصور نے کہا۔ "میں اس کی بات رد نہیں کر سکتا۔"

"کیونکہ وہ اپنی جوان بیٹی کو ساتھ لایا ہے"— اس کی بیوی نے کہا۔ "اور یہ لڑکی جس طرح آپ کے ساتھ لگی بیٹھی تھی اور جس ناز و انداز سے آپ کے ساتھ باتیں کر رہی تھی وہ میں دیکھ رہی تھی۔ کیا آپ ایک لڑکی کی خاطر اپنی فوج کو غزنی والوں سے ذبح کرا دیں گے؟"

"خانہ جنگی سے آپ نے پہلے کیا حاصل کیا ہے؟" سمن تاش نے کہا۔
"آپ کا بھائی ایلک خان ایک ڈرپوک ہوتے اور مغرور حکمران کی زندگی بسر کرتا رہا" ـــ اُس کی بیوی نے کہا ـــ "اُسے شکست دے کر بھی سلطان محمود نے اُس کی ریاست پر قبضہ نہیں کیا تھا۔"

ابو منصور کے ایک بازو کے ساتھ اُس کی بیوی نے منہ لگا رکھا تھا اور دوسرے بازو کے ساتھ اُس کی بیٹی سمن تاش نے وہ اسے چلا چلا کر سمجھا رہی تھیں کہ وہ دوسروں کے کہنے میں نہ آئے۔ وہ بولنے لگتا تھا تو بیوی یا بیٹی اُسے ٹوک دیتی تھی۔

"خدا کے لیے میری سنو" ـــ اُس نے گرج کر کہا ـــ "میں مجبور ہو گیا ہوں۔ ایک طرف سلطان محمود ہے اور دوسری طرف قادر خان اور توغان خان۔ اگر میں ان کا ساتھ نہیں دیتا تو مجھے ان دونوں سے خطرہ ہے اور اگر میں ان کا ساتھ دیتا ہوں تو سلطان محمود سے دشمنی مول لیتا ہوں۔"

"تو سلطان محمود سے دوستی کر لیں" ـــ اُس کی بیوی نے کہا۔

"میں خاندانی دشمنی کو دوستی میں نہیں بدل سکتا" ابو منصور نے بھڑک کر کہا ـــ "میں سلطان محمود سے اپنے خاندان کی بے عزتی کا انتقام لوں گا .... اور اب میں کس طرح پیچھے ہٹ سکتا ہوں۔ ہم نے فیصلہ کر لیا ہے۔ منصوبہ طے ہو چکا ہے۔"

"جس میں سلطان محمود کا قتل بھی شامل ہے۔" سمن تاش نے طنزیہ کہا۔

ماں بیٹی نے ایک دوسری کی طرف دیکھا اور سمن تاش نے دھیمی سی آواز میں ماں سے کہا کہ اپنا رویہ بدل لو اور ان سے معلوم کرو کہ ان کا منصوبہ کیا ہے۔ ابو منصور غصے سے پھنکار رہا تھا۔

"اگر آپ نے منصوبہ بھی تیار کر لیا ہے تو ہم آپ سے یہی کہیں گی کہ آپ پیچھے نہ ہٹیں" ـــ سمن تاش کی ماں نے کہا ـــ "ہم آپ کی حوصلہ افزائی کریں گی .... آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے؟ ہمیں بھی بتا دیں تاکہ ہم بھی منصوبے کی کامیابی کے لیے کچھ کریں۔"

ابو منصور ارسلان کی باچھیں کھل گئیں اور اُس نے خراسان پر قادر خان اور توغان خان کی متحدہ فوج کے حملے اور سلطان محمود کے قتل کا منصوبہ پوری تفصیل سے سنا دیا۔

اگلی صبح قادر خان رخصت ہو رہا تھا۔ سمن تاش نے نابینا موسیقار کو اپنے کمرے میں بلا رکھا تھا۔

"تم نے کہا تھا کہ میں تمہیں راز کی بات بتا دوں تو تم غزنی تک پہنچا سکتے ہو" ـــ سمن تاش نے کہا ـــ "مجھے یہ بتاؤ کہ میں تم پر اعتبار کس طرح کر سکتی ہوں اور دوسرے یہ کہ غزنی پیغام لے کر کون جائے گا؟"

"میرے پاس ایسا کوئی طریقہ نہیں جس سے میں آپ کو یقین دلا سکوں کہ میں قابلِ اعتبار آدمی ہوں" ـــ نابینا مغنی نے کہا ـــ "اگر آپ کا ایمان وہی ہے جو میرا ہے تو آپ کو مجھ پر اعتبار کرنا چاہیے .... آپ مجھ سے یہ نہ پوچھیں کہ غزنی کون جائے گا۔ ایک گھوڑے کا انتظام کریں اور گھوڑے کی باگ میرے ہاتھ میں دے دیں۔ میں آپ کی نظروں سے اوجھل ہو جاؤں گا۔ میں بہت دن غائب رہوں گا پھر آپ کے پاس آ جاؤں گا۔"

سمن تاش نے قرآن پاک اٹھایا اور چوم کر موسیقار کے ہاتھوں پر رکھ دیا۔ موسیقار نے بھی قرآن کو چوما۔

"یہ قرآن پاک ہے" ـــ سمن تاش نے کہا ـــ "قسم کھاؤ کہ تم مجھے دھوکہ نہیں دو گے۔"

"نہیں شہزادی!" ـــ موسیقار نے کہا ـــ "میں قسم نہیں کھاؤں گا۔ قسم کھا لینے سے کسی کی روح کا آئینہ شفاف نہیں ہو جایا کرتا۔ سب سے زیادہ اور بڑی قسمیں بے ایمان اور بددیانت آدمی کھایا کرتے ہیں۔ یہ قرآن پاک میرے ساتھ رہے گا۔ مجھے اس کی مدد کی ضرورت ہے۔ واپس آؤں گا تو آپ کو لوٹا دوں گا .... آدمی کب بھیجا جائے؟"

"ابھی" ـــ سمن تاش نے کہا ـــ "تمہارا آدمی ابھی روانہ ہو سکتا ہے؟"

"ہو سکتا ہے" ـــ نابینا مغنی نے کہا ـــ "آپ گھوڑا لائیں اور بتائیں کہ پیغام کیا ہے؟"

"تمہارے آدمی کو سلطان محمود کے پاس جانا ہے" ـــ سمن تاش نے کہا ـــ "اُسے کہنا کہ قادر خان، توغان خان اور ابو منصور مل کر خراسان پر حملہ کرنے والے ہیں اور آپ کے قتل کا منصوبہ بھی تیار ہے۔ سلطان سے کہنا کہ آپ کو یقین نہیں آئے گا کہ ایک بیٹی اپنے

باپ کے خلاف محاذ میں شامل ہو سکتی ہے لیکن مجھے آپ پہلے اسلام کی بیٹی سمجھیں، اس کے بعد مجھے اپنی بیٹی سمجھیں اور اس کے بعد میں اس باپ کی بیٹی ہوں جسے اپنے مذہب کی بجائے اپنا تخت و تاج پیارا ہے۔ سلطان سے کہنا کہ میں جانتی ہوں کہ یہ تینوں مل کر آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ آپ انہیں ایک ہلے میں صاف کر دیں گے لیکن جو کشت و خون ہو گا، اسے تصور میں لائیں۔ غزنی، خراسان، خوارزم، بلخ اور بخارا کی وہ مائیں جن کے جوان بیٹے آپس میں لڑ کر مارے گئے تھے، آج بھی اُسی طرح روتی ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کی لاشیں دیکھ کر روئی تھیں۔ ان کی آہوں اور فریادوں سے زمین و آسمان کانپ رہے ہیں....

غزنی کے سلطان سے کہنا کہ میرا باپ قادر خان اور تو غان خان سے خائف ہے۔ آپ میرے باپ کو صلح اور دوستی کا پیغام بھیج کر اس کے دل سے یہ خوف نکال سکتے ہیں۔ مجھے اپنی بیٹی سمجھتے ہوئے نوجوانوں کو کٹ مرنے سے بچائیں۔ مجھے اپنے یتیم ہو جانے کا کوئی غم نہیں ہو گا۔ میری ماں کو بیوہ ہو جانے کا رنج نہیں ہو گا۔ غم اور رنج ہو گا تو یہ کہ جنہیں کفر کے خلاف جہاد میں شریک ہونا تھا وہ خانہ جنگی میں کٹ مرے اور کفر کے ہاتھ مضبوط ہوئے.... کیا تم یہ ساری باتیں یاد رکھ سکو گے؟ جس طرح میں بتا رہی ہوں اسی طرح اُس آدمی کو بتا سکو گے جو غزنی جا رہا ہے؟"

"اسی طرح بتاؤں گا" — نابینا موسیقار نے کہا — "اور وہ سلطان محمود کو اسی طرح سنائے گا۔"

"نہیں" — سمن تاش نے کہا — "تم موسیقی میں ڈوبے ہوئے انسان میرے جذبات کی ترجمانی نہیں کر سکو گے۔ تم اپنی دنیا میں گم رہنے والے انسان اس دنیا کو نہیں جانتے جس میں انسان اپنی بادشاہی کی خاطر بے گناہ انسانوں کا خون بہا دیتا اور رعایا پر مذہب کا جنون طاری کیے رکھتا ہے۔"

"سمن شہزادی!" — نابینا موسیقار نے کہا — "الفاظ کے بھنور سے باہر آؤ۔ مجھے بتاؤ کہ سلطان تک اور کیا پیغام پہنچانا ہے۔ میں سب کچھ سمجھتا ہوں اور میں سب کچھ سمجھا سکتا ہوں۔"

"تو چلے جاؤ" — سمن تاش نے کہا — "سلطان محمود سے کہنا کہ میرے باپ کو دوستی کا پیغام بھیجو اور اسے یقین دلاؤ کہ غزنی کی فوج اسے قادر خان اور تو غان خان سے بچائے رکھے گی۔"

ایک گھوڑا شہر میں سے گزر رہا تھا۔ اس کی باگیں پکڑے ہوئے ایک نابینا اور ہاتھ میں لاٹھی اٹھائے چلا جا رہا تھا۔ اُس کے گھوڑے کے ساتھ ساز بندھا ہوا تھا اور اُس نے اپنے کندھے سے کمان اور ترکش بھی لٹکا رکھا تھا۔ اُسے بہت کم لوگ جانتے تھے اور جو اُسے نابینا مغنی کے نام سے جانتے تھے وہ اسے دیکھ کر ہنس پڑتے تھے کہ اندھا ترکش اور کمان لیے جا رہا ہے۔

گھوڑا شہر کے دروازے سے نکل گیا۔ وہ نابینا موسیقار تھا۔ وہ گھوڑے کے آگے آگے پیدل چل رہا تھا۔ شہر سے کچھ دور جا کر گھوڑے پر سوار ہو گیا اور اُس نے لاٹھی پھینک دی اور ذرا آگے جا کر اُس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ گھوڑا دوڑ پڑا لیکن اُس نے گھوڑے کو سرپٹ نہ دوڑنے دیا۔ سوار اندھا تھا مگر وہ خود اعتمادی سے سواری کر رہا تھا اور گھوڑا صحیح راستے پر جا رہا تھا۔

پندرہ سولہ میل بعد وہ جنگل شروع ہو گیا جو امراء وزراء کی شکارگاہ تھی۔ وہاں اونچی نیچی ٹیکریاں اور کھڈ نالے بھی تھے۔ اس علاقے کے ہرن مشہور تھے۔ نابینا موسیقار کا گھوڑا چلا جا رہا تھا کہ ایک ہرن سامنے سے دوڑتا گزرا۔ ہرن کی رفتار کم ہوتی جا رہی تھی کیونکہ اُس کے پہلو میں دو تیر اترے ہوئے تھے۔ نابینا موسیقار نے اس کے پیچھے گھوڑا ڈال دیا۔ ہرن کے تعاقب میں کچھ گھوڑے دوڑے آ رہے تھے لیکن وہ دور تھے۔ نابینا موسیقار کا گھوڑا ہرن کے قریب پہنچ رہا تھا۔ موسیقار نے کندھے سے کمان اتاری اور ترکش سے تیر نکال کر ہرن پر تیر چلایا۔ تیر ہرن کی پچھلی ٹانگ میں اتر گیا اور ہرن کی رفتار بالکل ختم ہو گئی۔ وہ رکا اور بیٹھ گیا۔

موسیقار نے اس کے قریب جا گھوڑا روکا اور اُدھر دیکھنے لگا جدھر سے ہرن کے تعاقب میں گھوڑے دوڑے آ رہے تھے۔ وہ بہت سے سوار تھے۔ نابینا موسیقار

ہرن کو دیکھ رہا تھا۔ گھوڑے اُس کے قریب آ رکے۔ تب اُس نے سواروں کو دیکھا۔

"میں نے آپ کے ہرن کو گرا لیا ہے"۔ نابینا موسیقار نے سواروں سے کہا اور وہ گھبرا گیا۔ اُس نے سواروں کو پہچان لیا تھا۔

سوار بھی اُسے دیکھ کر حیران ہوئے۔ ان میں ایک قادر خان تھا اور اُس کے ساتھ دوسرے گھوڑے پر اُس کی بیٹی اخشی سوار تھی۔ باقی سب قادر خان کے مشیر اور محافظ تھے۔ قادر خان اُسی روز ابو منصور سے رخصت ہوا تھا اور راستے میں اس نے شکار کھیلنا شروع کر دیا تھا۔ اس ہرن کو ایک تیر اُس کا اور دوسرا اخشی کا لگا تھا۔ تیسرا تیر نابینا موسیقار نے چلا کر ہرن کو گرا دیا۔

"کیا تم نابینا مغنی نہیں ہو جس نے ہمیں ابو منصور ارسلان کے ہاں نغمے سنائے تھے؟" — قادر خان نے پوچھا۔

اُس کا ساز گھوڑے کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ اخشی نے اپنا گھوڑا موسیقار کے گھوڑے کے قریب کر کے اُس کی زین کے ساتھ ساز والا بندھا ہوا تھیلا کھول لیا۔ موسیقار بُت بن گیا۔ تھیلے میں سے ساز نکالا گیا۔ اس میں کوئی شک نہ رہا کہ یہ وہی نابینا موسیقار ہے۔

"مجھے پہلے ہی شک تھا کہ یہ جاسوس ہے"۔ قادر خان کی بیٹی اخشی نے کہا — "کیا کوئی اندھا تیر سے ہرن کو نشانہ بنا سکتا ہے؟"

قادر خان نے تلوار نکال کر کہا۔ "سچ بتا دو تمہاری اصلیت کیا ہے؟"

قادر خان کے محافظ ابھی اس کا گھیراؤ کرنے کے لیے ہلے ہی تھے کہ موسیقار نے گھوڑے کی لگام کو جھٹکا دیا اور ایڑ لگائی۔ گھوڑا شاہی اصطبل کا تھا۔ اشارہ ملتے ہی سرپٹ دوڑ پڑا۔ قادر خان نے حکم دیا "پکڑو اسے"۔ محافظوں نے اُس کے پیچھے گھوڑے ڈال دیئے، مگر موسیقار بہت فاصلہ لے گیا تھا اور وہ ایک ٹیکری کی اوٹ میں چلا گیا تھا۔ محافظ اُس پر تیر نہیں چلا سکتے تھے۔ وہ اُس کے تعاقب میں رہے۔

موسیقار بڑا اچھا سوار تھا۔ اُس نے گھوڑے کو سست نہ ہونے دیا۔ گھوڑا کھڈ پھلانگتا جا رہا تھا۔ بہت دُور جا کر موسیقار نے پیچھے دیکھا۔ اس کے تعاقب میں آنے

والے بہت دُور تھے۔ انہوں نے مایوس ہو کر تعاقب ترک کر دیا اور واپس چلے گئے۔

ابو منصور کو اطلاع ملی کہ قادر خان جو رخصت ہو گیا تھا، واپس آ گیا ہے۔ ابو منصور دوڑا باہر آیا۔ قادر خان نے اُسے بتایا کہ اس کے دربار کا نابینا مغنی نابینا نہیں اور وہ بھاگ گیا ہے۔

"وہ سلطان محمود کا جاسوس ہے"۔ قادر خان نے کہا۔ "ہماری رات کی باتیں سن گیا ہوگا"۔

"رات کو وہ اس کمرے کے قریب بھی نہیں تھا جس میں ہم باتیں کر رہے تھے" — ابو منصور نے کہا۔ "ہم معلوم کریں گے وہ رات کہاں تھا"۔

"مجھے آپ کی بیٹی پر شک ہے"۔ — قادر خان کی بیٹی اخشی نے کہا — "وہ سلطان محمود کی شیدائی ہے اور یہ موسیقار اُس کا منظورِ نظر تھا۔ مجھے آپ کی بیٹی کے بوڑھے اتالیق پر بھی شک ہے کہ وہ غدار ہے"۔

ابو منصور سوچ میں پڑ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ سمن تاش سلطان محمود کے خلاف لڑائی کے سخت خلاف ہے۔ اس کے اتالیق کے متعلق اُسے معلوم نہیں تھا۔ قادر خان اور اخشی ابو منصور کے پیچھے پڑ گئے کہ وہ اتالیق اور اپنی بیٹی کے خلاف کچھ کرے مگر ابو منصور اپنی بیٹی کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ پھر بھی دونوں کو بلا لیا گیا۔ جب سمن تاش سے یہ کہا گیا کہ نابینا موسیقار نابینا نہیں تھا تو وہ بہت حیران ہوئی۔ وہ مان نہیں رہی تھی۔

"سنو بوڑھے!" — قادر خان نے اتالیق سے کہا — "تم جس کا نمک کھاتے ہو اُسی کے خلاف غداری کرتے ہو۔ اگر بتا دو کہ وہ موسیقار یہاں سے کیا خبر لے گیا ہے تو ہم تمہیں بخش دیں گے ورنہ بہت بُری موت مرو گے"۔

"خبردار!" — سمن تاش اپنے اتالیق کے سامنے کھڑی ہو گئی اور قادر خان سے کہا — "اگر میرے اتالیق کی کسی نے توہین کی تو کوئی نہیں بتا سکتا کہ یہاں کیا ہوگا۔ ہم کاشغر کے غلام نہیں"۔

"ایک طرف ہو جاؤ سمن!" — اتالیق نے قادر خان سے کہا۔ "ایک ذرا سے

ملکی کی بادشاہی تمہیں خدا نہیں بنا سکتی۔ میں سلطان محمود کا حامی نہیں حق کا حامی ہوں۔ میں موسیقار کو اندھا سمجھتا رہا۔ میں تم سب کو اندھا سمجھتا ہوں۔ اگر وہ اندھا غزنی کا جاسوس تھا تو وہ آنکھوں کا اندھا تھا۔ روح کا اندھا نہیں تھا۔ اُس کے اندر ایمان کی روشنی تھی۔ مجھے کچھ خبر نہیں کہ وہ کیا خبر لے گیا ہے لیکن میں یہ کہنے سے بالکل نہیں ڈروں گا کہ وہ اگر جاسوس تھا تو پکا مسلمان تھا۔"

قادر خان نے ابو منصور کے کان کے ساتھ منہ لگا کر بلند آواز سے کہا۔ "اس بوڑھے کو قید خانے میں ڈال دیں۔ یہ ہماری جڑیں کاٹ رہا ہے۔"

ابو منصور نے اتالیق کی طرف دیکھا۔ اُسے شاید یاد آگیا ہو گا کہ یہ بزرگ صورت انسان جو عمر کی آخری منزل کے قریب پہنچ چکا تھا، اُس کے باپ کا بھی اتالیق تھا۔ اُس کا اتالیق بھی یہی تھا اور اب اس کی بیٹی بھی اس سے تعلیم و تربیت حاصل کر رہی تھی۔

"آپ اس کا حکم مانیں گے یا اپنے خدا کا؟" — بزرگ اتالیق نے کہا۔ "اگر آپ کو دنیا عزیز ہے تو میں آپ کو بتا دیتا ہوں کہ شکست آپ کے مقدر میں لکھ دی گئی ہے۔"

"اگر آپ رعایا کی بغاوت برداشت کر سکتے ہیں تو اتالیق کو قید میں ڈال دیں" — سمن تاش نے اپنے باپ کے کان کے ساتھ منہ لگا کر کہا اور وہ باہر نکل گئی۔

"قادر خان!" — ابو منصور نے کہا۔ "میں نے آپ کے ساتھ دوستی کا اور فوجیں اکٹھی استعمال کرنے کا معاہدہ کیا ہے آپ کی اطاعت قبول نہیں کی۔ مجھے اتنا کمزور نہ سمجھیں کہ میں آپ کے حکم کا پابند ہو جاؤں۔"

"معلوم ہوتا ہے آپ سلطان محمود سے ڈرتے ہیں" — قادر خان نے کہا۔ "کیا آپ کو یقین نہیں آیا کہ میں اور توغان خان آپ کے ساتھ ہیں؟"

"سلطان محمود کا نہیں" — ابو منصور نے کہا۔ "میرے دل میں خدا کا کچھ خوف ابھی باقی ہے۔ مجھ پر بادشاہی کا نشہ ابھی اتنا سوار نہیں ہوا کہ میں نے جس کے ہاتھوں میں تعلیم و تربیت پائی ہے اُسے قید میں ڈال دوں .... آپ چلے جائیں اور اس یقین کے ساتھ جائیں کہ میں سلطان محمود کے ساتھ جنگ میں آپ کے ساتھ ہوں۔"

اُس نے اتالیق کو چلے جانے کا اشارہ کیا۔ اتالیق باوقار چال چلتا باہر نکل گیا۔

"سلطان محمود کو اُس کے جاسوس کیا خبر دیں گے؟" — ابو منصور نے کہا — "یہی کہ ہم خراسان پر حملہ کریں گے۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ وہ جانتا ہے ہم اُس کے دشمن ہیں۔ اُس نے خراسان کے دفاع کا انتظام کر رکھا ہے۔ آپ گھبرائیں نہیں۔ تیاری میں زیادہ وقت نہ لگائیں۔"

قادر خان رخصت ہو گیا۔ اتالیق سمن تاش کے پاس چلا گیا اور اُس سے پوچھا کہ یہ کہاں تک درست ہے کہ موسیقار نابینا نہیں تھا۔ سمن تاش نے اُسے بتایا کہ وہ اُسے نابینا ہی سمجھتی رہی ہے اور سلطان محمود کو اُسی نے پیغام بھجوایا ہے لیکن موسیقار نے کہا تھا کہ وہ کسی اور کو بھیجے گا۔

"آنے والی تباہی کو خدا ہی روک سکتا ہے"۔ اتالیق نے کہا۔

"میں نے یہی پیغام بھجوایا ہے کہ تباہی کو روکو" — سمن تاش نے کہا۔ "اگر ضرورت پڑی تو میں خود غزنی چلی جاؤں گی، خواہ مجھے کیسی ہی سزا بھگتنی پڑے۔"

بزرگ اتالیق نے سمن تاش کو جو تعلیم دی تھی وہ رنگ دکھا رہی تھی۔ سمن تاش نڈر اور بے خوف ہوتی جا رہی تھی۔

وہ جوان آدمی جو ابو منصور کے محل میں چھکا چھکار مرا مرا، اُداس اُداس سا نابینا موسیقار بنا ہوا تھا وہ خراسان کے پہاڑوں، چٹانوں اور جنگلوں کو چیرتا جا رہا تھا۔ اس کی گردن تنی ہوئی اور سینہ پھیلا ہوا تھا۔ گھوڑے کو آرام دینے کے لیے وہ اس کی رفتار کم کر دیتا اور بڑی پُرسوز آواز میں گانے لگتا۔ گھوڑا یوں چلا جا رہا تھا جیسے اُس کی آواز سے مسحور ہو کر چلا جا رہا ہو۔ اُسے اب پکڑے جانے کا خطرہ نہیں تھا۔ وہ غزنی کی سلطنت میں داخل ہو چکا تھا غزنی ابھی دور تھا۔

اُس نے چوکیوں پر دو گھوڑے بدلے اور خود آرام نہ کیا۔ اسے وقت کا بھی احساس نہ تھا۔ دن تھا یا رات، وہ چلتا گیا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ کون سے دن کا سورج غروب ہو رہا تھا جب اُسے غزنی کی مسجدوں کے مینار دکھائی دینے لگے۔

اور وہ جب اپنے سالار کے پاس پہنچا اُس وقت رات تاریک ہو چکی تھی۔ اُس

نے سالار کو بتایا کہ وہ کیا خبر لایا ہے۔ سلطان محمود نے حکم دے رکھا تھا کہ باہر سے کوئی جاسوس خواہ آدھی رات کو واپس آئے، اُسے اُسی وقت جگا لیا جائے۔ موسیقار کو جس کا نام ابی ظفر تھا، دیکھتے ہی اور اس کی مختصر سی بات سن کر سالار اُسے سلطان محمود کے پاس لے گیا۔

ابی ظفر نے پہلے تو یہ بتایا کہ وہ نابینا موسیقار بن کر ابو منصور ارسلان خان کے محل میں درباری حیثیت پا رہا ہے۔ اس طرح اُسے ابو منصور کے دربار کے علاوہ اُس کے گھر تک بھی رسائی حاصل رہی ہے۔

اُس نے سلطان محمود کو پوری رپورٹ دی کہ کاشغر کا قادر خان اور بلخ کا تونمان خان ابو منصور کی فوج کو ساتھ ملا کر خراسان پر حملے کی تیاری کر رہے ہیں اور سلطان کے قتل کا منصوبہ بھی بن چکا ہے۔

"ابو منصور ارسلان خان غزنی کے ساتھ خاندانی دشمنی ختم کرنا چاہتا ہے"۔ ابی ظفر نے سلطان کو بتایا۔ "لیکن قادر خان اور تونمان خان نے اُسے اتنا خائف کر دیا ہے کہ وہ اُن کا ساتھ دینے پر مجبور ہے۔ اگر آپ اُسے فوجی تحفظ مہیا کر دیں تو وہ شاید اُن دونوں کے محاذ سے الگ ہو جائے گا۔"

"اُس کے سالاروں کے متعلق کچھ بتا سکتے ہو؟" ۔۔۔ سلطان محمود نے پوچھا۔

"سالار ترکستانی عورتوں کے طلسم میں گرفتار ہیں"۔ ابی ظفر نے بتایا۔ "قادر خان نے انہیں بڑی ہی حسین اور جوان عورتوں کے جال میں پھانس رکھا ہے۔ وہ ابو منصور کو یہ ایک مشورہ دیئے چلے جا رہے ہیں کہ سلطان محمود پر فوراً وار نہ کیا گیا تو وہ چھوٹی چھوٹی امارتوں اور ریاستوں کو نگل جائے گا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ سلطان محمود ہندوستان سے تو فاتح بن کر آیا ہے لیکن ان فتوحات نے اُسے فوجی لحاظ سے بہت کمزور کر دیا ہے، اس لیے چپکے سے بہت جلدی خراسان پر حملہ کر کے ایک مضبوط مستقر بنا لیا جائے اور وہاں سے چھوٹے پیمانے کے حملے جاری رکھے جائیں۔"

"ابو منصور کی فوجی طاقت میں کچھ اضافہ ہوا ہے یا ایلک خان کے وقت جتنی تعداد ہے؟"

"سلطان عزیز!" ۔۔۔ ابی ظفر نے جواب دیا۔ "ابو منصور نے اس نفری کی کمی پوری

کر لی ہے جو ایلک خان نے ہماری فوج کے ہاتھوں مروا دی تھی ..... میں ابو منصور کی بیٹی سمن تاش کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔ وہ، اُس کا بزرگ اتالیق اور اُس کی ماں آپ کی پرستار ہیں۔ ماں بیٹی ابو منصور کو مجبور کر رہی ہیں کہ وہ آپ کے خلاف میدان میں نہ آئے ..... سمن تاش بڑی خوبصورت لڑکی ہے۔ میں نے اس کی زبان سے یہ الفاظ سنے ہیں کہ میں سلطان محمود کی لونڈی بن کر اس کے پاس رہنے کو تیار ہوں۔"

"کیا اس لڑکی کی شادی ہو چکی ہے؟" ۔۔۔ سلطان محمود نے پوچھا۔

"نہیں" ۔۔۔ ابی ظفر نے جواب دیا اور سمن تاش نے اُسے جو پیغام دیا تھا وہ اُس نے سلطان محمود کو سنا دیا۔ سلطان محمود گہری سوچ میں کھو گیا۔

سلطان محمود نے ابی ظفر کو انعام و اکرام دے کر فارغ کر دیا اور اُسی وقت اپنے ایک جوان بیٹے مسعود کو بلایا اور اُسے کہا کہ اُسے ابو منصور ارسلان خان کے پاس جانا ہو گا اور اُسے قائل کرنا ہو گا کہ وہ غزنی کے خلاف ہتھیار نہ اٹھائے ورنہ وہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔ اُسے یقین دلانا ہے کہ اگر وہ دوستی کا معاہدہ کرتا ہے تو اُسے سلطنتِ غزنی کی طرف سے فوجی تحفظ ملے گا۔ سلطان محمود نے مسعود بن محمود کو بہت سی ہدایات دیں اور اسے بتلایا کہ اس کے ساتھ کون کون جا رہا ہے۔

مسعود دوسرے ہی دن روانہ ہو گیا۔ اُس کے ساتھ دو مشیر تھے۔ دونوں فوجی تھے اور بیس گھوڑ سواروں کا محافظ دستہ بھی اُس کے ساتھ تھا۔ بارہ تیرہ دنوں کی مسافت تھی۔ مسعود کے ساتھ تحفوں اور سامان کے لیے اونٹوں کا پورا قافلہ تھا۔ ابو منصور کی امارت میں پہنچ کر مسعود شہر سے کچھ دور خیمہ زن ہوا اور اُس نے ابو منصور کے ہاں اپنا ایک ایلچی اس پیغام کے ساتھ بھیجا کہ سلطان محمود کا بیٹا مسعود آپ سے ملنے اور کچھ ضروری امور طے کرنے آیا ہے۔

ابو منصور دوسرے دن شاہانہ شان و شوکت سے مسعود کے پاس آیا۔ تحائف کا تبادلہ ہوا اور مسعود نے اُسے سلطان محمود کا پیغام دیا۔

"میں آپ کے باپ کی تعریف کرتا ہوں کہ اُس کے مخبر بہت ہوشیار ہیں"۔ ابو منصور

نے کہا۔ "اُس کے اندھے بھی دیکھ سکتے ہیں۔"

"اگر کوئی بہرہ ہمارے ساتھ دوستی کر لے تو وہ سننے کے قابل ہو جاتا ہے" —— مسعود نے طنزیہ کہا۔ ابو منصور بہرہ تھا اور بہت اونچی آواز میں اُس کے کان میں بولتے تھے تو وہ سنتا تھا۔

"شہزادے!" —— ابو منصور نے بُرا مانتے ہوئے کہا۔ "تمہیں باپ نے تیغ زنی سکھا دی ہے، زبان کا استعمال نہیں سکھایا۔ میں اُس اندھے کی بات کر رہا ہوں جو اندھا نہیں تھا لیکن میرے دربار میں بڑی کامیابی سے نابینا موسیقار بنا رہا۔ اسی نے تمہارے باپ کو یہ خبر دی ہے کہ ہم سلطنتِ غزنی کے خلاف لڑنے کی تیاری کر رہے ہیں، اس لیے تم دوستی کا پیغام لے کر آئے ہو۔"

"محترم!" —— مسعود نے کہا۔ "میں پیغام لے کر آیا ہوں درخواست نہیں.... اور میں سمجھ نہیں سکا کہ آپ کون سے نابینا موسیقار کی بات کر رہے ہیں جو ہمارا مخبر تھا۔ میں آپ کے ساتھ سیدھی سی بات کرنے آیا ہوں کہ آپ اگر اپنی امارت کو زندہ و سلامت رکھنا چاہتے ہیں تو قادر خان اور توغان خان کی دوستی ترک کر دیں۔ آپ تینوں کی فوج چھ سو ہاتھیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اپنے بڑے بھائی ایلک خان کا انجام آپ کو یاد ہوگا۔"

"کیا آپ انہیں دھمکیاں دینے آئے ہیں؟" —— ابو منصور کے ساتھ آئے ہوئے ایک سالار نے کہا۔ "کیا آپ ہمیں اس قدر کمزور سمجھتے ہیں کہ ہم مرعوب ہو کر آپ کی اطاعت قبول کر لیں گے؟"

ابو منصور چونکہ بہرہ تھا، اس لیے وہ اپنے سالار کی بات نہ سن سکا۔ مسعود نے سالار سے بات کی تو ابو منصور وہ بھی نہ سن سکا۔ وہ دونوں کو باری باری دیکھتا اور سمجھتا تھا کہ یہ آپس میں کیا باتیں کر رہے ہیں۔

"کچھ مجھے بھی بتاؤ" —— ابو منصور نے اپنے سالار سے کہا۔ "تم لوگ کیا بات کر رہے ہو؟"

"یہ کہہ رہے ہیں کہ آپ کاشغر اور بلخ والوں کی دوستی سے باز نہ آئے تو ہم آپ

پر حملہ کر کے آپ کو تباہ و برباد کر دیں گے۔"

ابو منصور نے مسعود کو غصیلی نگاہوں سے دیکھا اور کہا۔ "دیکھو شہزادے! اگر تم ہمیں دھمکی دے کر ہمارے ساتھ دوستی کرنے آئے ہو تو واپس چلے جاؤ اور اپنی فوج کے ساتھ آنا۔"

مسعود نے ابو منصور کے کان میں بلند آواز سے کہا۔ "اگر حکمران بہرہ اور سالار جھوٹا ہو تو ملک اور رعایا کا خدا ہی حافظ ہے۔ محترم! آپ کا سالار جھوٹ بول رہا ہے۔ میں نے کچھ اور کہا تھا۔ اگر سالار حکومت کے کاروبار میں اسی طرح دخل اندازی کرنے لگیں تو حکومت زیادہ دیر نہیں چل سکتی۔"

کچھ دیر بحث مباحثہ ہوتا رہا۔ مسعود نے ابو منصور کو اس حد تک قائل کر لیا کہ اُس نے کہا۔ "آپ چند دن یہاں رہیں۔ ہم سوچ کر جواب دیں گے۔ اتنے دن آپ شکار کھیل سکتے ہیں۔ آپ کے آرام کا، کھانے اور دل بہلانے کا پورا انتظام کیا جائے گا۔"

محل کے باورچی اور ملازم آ گئے اور انہوں نے مسعود اور اس کے تمام آدمیوں کے کھانے وغیرہ کا انتظام سنبھال لیا۔ ایک روز مسعود خیمہ گاہ سے ذرا ہٹ کر اکیلا ہی ٹہل رہا تھا کہ محل کا ایک ملازم جو خیمہ گاہ کے انتظام کے لیے آیا تھا مسعود کے قریب آیا اور رازداری سے کہا۔ "کل شکار کے لیے جائیں۔ ابو منصور ارسلان خان کی بیٹی سمن تاش آپ کو جنگل میں ملے گی۔"

"مجھے جنگل میں قتل کیا جائے گا یا خیمے میں؟" مسعود نے پوچھا۔

"آپ کے محافظ آپ کے ساتھ ہوں گے" —— ملازم نے کہا۔ "آپ کو قتل نہیں کیا جائے گا۔"

ابی ظفر نے سلطان محمود کو بتایا تھا کہ سمن تاش اپنے باپ کے خلاف ہے۔ سلطان محمود نے مسعود کے ساتھ سمن تاش کا ذکر ویسے ہی کیا تھا۔ ایک شہزادی کا اپنے باپ کے خلاف ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ امارت کی فوج پر ایک شہزادی کا حکم

نہیں چل سکتا تھا۔ مسعود نے سمن تاش کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ اب ایک ملازم نے اُسے کہا کہ شہزادی سمن تاش اُسے جنگل میں ملے گی تو اُس نے اسے دھوکہ نہ سمجھا۔

دوسرے دن وہ شکار کو چلا گیا۔ وہ اپنے مشیروں کو ساتھ نہ لے گیا۔ پانچ چھ محافظوں کو اُس نے اس طرح ساتھ لیا کہ انہیں اپنے ارد گرد پھیلا دیا تاکہ کسی طرف سے بھی کوئی اس پر قاتلانہ حملہ نہ کر سکے۔ وہ گھوڑے پر سوار کمان میں تیر ڈالے اِدھر اُدھر دیکھتا جنگل میں بڑھتا گیا۔ جنگل گھنا ہوتا گیا اور ہری بھری سرسبز چٹانیں بھی آگئیں۔ اُسے اپنے محافظوں کے گھوڑوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

ایک جگہ تو بہت ہی خوشنما تھی۔ چوڑے پتوں والی بیلیں گھمر گھما ہو کر درختوں کے ساتھ لپٹی ہوئی تھیں۔ مسعود کو وہاں ایک جوان لڑکی کھڑی نظر آئی۔ اُس کے قریب ایک گھوڑا کھڑا تھا اور لڑکی کے کندھے کے ساتھ کمان لٹک رہی تھی۔ ترکش گھوڑے کی زین کے ساتھ بندھی تھی۔ لڑکی کا چہرہ جس قدر دلنشیں تھا اتنا ہی سنجیدہ تھا۔ وہ چپ چاپ کھڑی تھی۔ اُس کا یہ انداز پُر اسرار سا لگتا تھا۔ مسعود نے پندرہ بیس قدم دُور گھوڑا روک لیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

"اگر آپ مسعود بن محمود ہیں تو گھوڑے سے اُتر کر آگے آجائیں" — لڑکی نے کہا — "آپ کے لیے یہاں کوئی خطرہ نہیں۔ میں سمن تاش ہوں"۔

مسعود گھوڑے سے اُتر کر اُس کے قریب چلا گیا۔ سمن تاش نے اُسے گھاس پر بٹھا لیا۔

"مجھے ایک جوان لڑکی کے بلانے پر یہاں نہیں آنا چاہیئے تھا" — مسعود نے کہا — "لیکن مجھے معلوم ہُوا ہے کہ آپ سلطانِ غزنی کی حامی ہیں"۔

"آپ کو غلط بتایا گیا ہے" — سمن تاش نے کہا — "میں سلطانِ غزنی کی نہیں سلطانِ دو جہاں کی پرستار ہوں۔ میں اُس رسول ؐ کی غلام ہوں جو سلطانِ غزنی کا بھی رسول ؐ ہے۔ میں اس اصول کی حامی ہوں کہ ایک رسول ؐ کا کلمہ پڑھنے والوں کو ایک دوسرے کا خون نہیں بہانا چاہیئے"۔

"اور اگر ایک بھائی تخت و تاج کی طمع سے اپنے بھائی کا خون بہانے کے لیے تیار ہو جائے تو اُس کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟"

"اُسے جینے کا کوئی حق نہیں" — سمن تاش نے کہا — "اُس کے خلاف جہاد فرض ہو جاتا ہے"۔

"ان میں ایک تو تمہارا باپ ہے" — مسعود نے کہا — "میرا یہاں آنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ ان کے خلاف جہاد فرض ہو جانے تک نوبت نہ آئے ..... کیا تم اپنے باپ کو اس اصول کا پابند نہیں کر سکتیں جس کی تم قائل ہو؟"

"نہیں" — سمن تاش نے کہا — "میں نے آپ کو یہی بتانے کے لیے بلایا ہے کہ میرا باپ انہی ایمان فروشوں میں سے ہے جن کے خلاف جہاد فرض ہے۔ آپ شاید حیران ہوں گے کہ کوئی بیٹی اپنے باپ کے خلاف ہو سکتی ہے لیکن میں جس جذبے کے تحت اپنے باپ کے خلاف ہوں اسے سمجھنے کی کوشش کریں۔ میں آپ سے یہ کہنا چاہتی ہوں کہ پیشتر اس کے کہ قادر خان اور توغان خان کی فوجیں یہاں آجائیں اور ہماری فوج کے ساتھ مل کر ایک طاقتور فوج بن جائیں، آپ ہمارے شہر کو محاصرے میں لے کر اس پر قبضہ کر لیں۔ اس سے یہ ہو گا کہ خون خرابہ کم ہو گا۔ ہماری فوج آپ کی فوج کے مقابلے میں بہت کمزور ہے۔ اگر آپ کا مقابلہ تین فوجوں سے ہُوا تو دونوں طرف ایک ہی قوم کا اتنا ہی خون بہہ جائے گا جتنا پہلی خانہ جنگیوں میں بہہ چکا ہے"۔

"سلطان جو ہندوستان پر بڑھ چڑھ کر حملے کر رہے ہیں، ایسا کبھی نہیں کریں گے کہ کسی مسلمان امارت یا ریاست پر چڑھ دوڑیں" — مسعود نے کہا — "ہمارا مقصد قبضہ کرنا نہیں، عالمِ اسلام کو کفر کے خلاف ایک عسکری قوت بنانا ہے۔ اگر ہمیں آپ کی امارت پر قبضہ کرنا ہوتا تو سلطان مجھے دوستی کا پیغام دے کر نہ بھیجتے"۔

"میرے ابا دوستی نہیں کریں گے" — سمن تاش نے کہا — "انہوں نے آپ کو دوستی کرنے کے لیے کہا ہے لیکن وہ ان سالاروں اور مشیروں کے قبضے میں ہیں، جو قادر خان کے ہی دلکش جال میں آئے ہوئے ہیں۔ وہ کانوں سے بہرے ہیں۔

وہ وہی بات سن سکتے ہیں جو اُن کے کان میں کہی جائے۔"

سمن تاش چپ ہو گئی۔ اُس نے آنکھیں سکیڑ کر ایک طرف دیکھا جیسے کسی شکاری کو گھنی جھاڑیوں میں کسی شکار کی حرکت نظر آ رہی ہو۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے مسعود کو بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور درخت کے پیچھے کر دیا۔ وہاں بیلیں دیواروں کی طرح درختوں پر چڑھی ہوئی تھیں۔ سمن تاش نے مسعود سے کہا ——

"یہاں سے ہلنا نہیں۔ اِدھر اُدھر دیکھتے رہنا۔" اور وہ خود بیلوں میں غائب ہو گئی۔

مسعود حیران و پریشان وہاں کھڑا رہا۔ وہ کسی پھندے میں آ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اپنے قریب ہی اُسے کمان میں سے تیر نکلنے کی آواز سنائی دی۔ وہ چونکا۔ فوراً بعد اُسے کسی کی کراہ کی آہ سنائی دی۔ مسعود نے منہ سے سیٹی بجائی۔ اُس کے تین چار محافظ جو سیٹی سن سکے تلواریں سونتے اُس کے پاس آ گئے۔ اُس نے سامنے والی سرسبز چٹان پر ایک آدمی کو کھڑے دیکھا جس کے کندھے میں تیر اترا ہوا تھا۔ سمن تاش نے سامنے آ کر مسعود سے کہا "میرے ساتھ آؤ۔"

مسعود اپنے محافظوں کے ساتھ اُس چٹان پر گیا جہاں اُس نے وہ آدمی دیکھا تھا جس کے کندھے میں تیر اترا ہوا تھا۔ وہ آدمی بیٹھ گیا تھا اور کراہ رہا تھا۔ سمن تاش نے خنجر نکال کر اس کی نوک اُس زخمی کی شہ رگ پر رکھ دی۔

"سچ بتا دو تو تمہیں گھوڑے پر اٹھا لے جاؤں گی اور یہ تیر نکلوا کر زخم کا علاج کرا دوں گی" —— سمن تاش نے اُسے کہا۔ "جھوٹ بولو گے تو درخت کے ساتھ باندھ جاؤں گی۔ سوچو کہ تم کیسی موت مرو گے۔"

زخمی نے رحم طلب نگاہوں سے پہلے سمن تاش کو پھر مسعود کو دیکھا اور بولا —— "سلطان محمود کے بیٹے کو قتل کرنے آیا تھا۔"

"تمہیں کس نے بتایا تھا کہ سلطان محمود کا بیٹا یہی ہے؟" —— سمن تاش نے پوچھا۔

"مجھے دکھایا گیا تھا" —— زخمی نے کہا۔ "میرے ساتھ ایک اور آدمی تھا۔ وہ بھاگ گیا ہے۔"

"یہ کس کا انتظام ہے؟"

"خانِ کاشغر قادر خان کا" —— زخمی نے کہا۔ "اور اُس نے آپ کے والد امیر محترم ابو منصور ارسلان خان سے بات کر لی تھی۔"

"انہوں نے کیا کہا تھا؟" —— سمن تاش نے پوچھا۔

"آپ کے والد محترم نے کہا تھا کہ میں نے سلطان محمود کے بیٹے کو اپنے جواب کے انتظار کے لیے روک لیا ہے۔ تم لوگ اپنا کام کر سکتے ہو۔ وہ شکار کے لیے ضرور جائے گا۔ اسے ایک دو ایسے ملازم دو جو تمہیں قبل از وقت بتا سکیں کہ وہ شکار پر جا رہا ہے۔"

"اسے گھوڑے پر ڈالو اور لے چلو" —— سمن تاش نے مسعود کے ایک محافظ سے کہا اور مسعود سے کہا۔ "میں نے آپ کو یہی بات بتانے کے لیے یہاں بلایا تھا کہ آپ یہاں انتظار نہ کریں اور اپنی حفاظت کا انتظام بڑا سخت رکھیں۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ میں نے چٹان پر پودوں کی اوٹ میں اس آدمی کو ہلتا جلتا دیکھ لیا تھا۔ مجھے اس کی کمان بھی تھوڑی سی نظر آ گئی تھی۔ اس جگہ شاہی خاندان کے سوا کوئی بھی شکار کے لیے نہیں آ سکتا۔ میں نے بیلوں کے پیچھے چھپ کر اس پر تیر چلایا تھا۔"

"مجھے کیا کرنا چاہیے؟" —— مسعود نے پوچھا۔

"آپ واپس چلے جائیں" —— سمن تاش نے کہا —— "مجھے نظر آ رہا ہے کہ ہماری ملاقات میدانِ جنگ میں ہو گی۔"

"کیا تم مجھے میدانِ جنگ میں ملو گی؟"

"شاید" —— سمن تاش نے کہا اور اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"آنسو کیوں؟"

"میں پاگل ہوں" —— سمن تاش نے جذباتی سے لہجے میں کہا۔ ذرا سی خاموشی کے بعد اُس نے مسعود کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اور جھنجھلا کر کہا ——

"کیا میں پاگل نہیں ہوں مسعود؟ کیا میرا اتالیق پاگل ہے؟ فریب کاروں کی بستی میں سچی بات کہنے والوں کو پاگل کہا کرتے ہیں۔ میری شادی ایک ایسے شہزادے کے

ساتھ ہوگی جو تسراب بیتتا ہے اور جسے احساس ہی نہیں کہ قوم اور مذہب کی کیسا ذمہ داریاں ہیں جو اُس پر عائد ہوتی ہیں"۔ اُس کے ایک ہاتھ میں کمان تھی اور دوسرے ہاتھ میں خنجر۔ اُس نے دونوں ہتھیار آگے کر کے پُرجوش آواز میں کہا ۔۔۔ "میری شادی ان سے ہو چکی ہے ۔ یہ میرے سہاگ کی دو نشانیاں ہیں ۔ کمان اور خنجر۔ عورت مرد کی تفریح اور نمائش کی چیز نہیں ۔ کمان اور خنجر عورت کا زیور ہے"۔

"تم ایسی باتیں کیوں کر رہی ہو ؟" ۔۔۔ مسعود نے کہا" جس کے ہاتھ میں کمان اور کندھے کے ساتھ ترکش لٹک رہی ہو، اُس کی آنکھوں میں آنسو نہیں آیا کرتے ۔۔۔ سمن ! کیا ہمیں یہیں کھڑے رہنا چاہئیے ؟"

"نہیں" ۔۔ سمن تاش نے کہا ۔۔ "آپ چلے جائیں .... آپ غزنی چلے جائیں۔ آپ کو اُس جاسوس نے جو یہاں نابینا موسیقار بن کے آیا تھا، بہت کچھ بتادیا ہوگا۔ اُس نے آپ کے والدِ محترم تک میرا پیغام پہنچا دیا ہوگا"۔

"یہ تم اُسی سے پوچھ لو" ۔۔۔ مسعود نے اپنے ایک محافظ سے کہا ۔۔۔ "ابی ظفر کو بلا دو"۔

ایک گھوڑ سوار گھوڑا دوڑاتا چٹان پر آگیا۔ وہ بھرے بھرے چہرے والا تنومند جوان تھا۔ وہ گھوڑے سے اُتر کر مسعود تک گیا تو اُس کی چال سے جیسے چٹان ہل رہی تھی۔

"اسے نہیں پہچانتے ہو ظفر ؟" ۔۔۔ مسعود نے سمن تاش کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

ابی ظفر سمن تاش کو دیکھ کر مسکرایا۔ سمن تاش بھی مسکرا دی۔

"میں نے تمہیں مشکل سے پہچانا ہے" ۔۔ سمن تاش نے اُسے کہا ۔۔ "اپنے سلطان تک میرا پیغام پہنچا دیا تھا ؟"

"لفظ بہ لفظ" ۔۔۔ ابی ظفر نے جواب دیا۔

"یہ ہمارا بڑا ہی کامیاب جاسوس ہے" ۔۔۔ مسعود نے کہا ۔ "یہ محافظ دستے کا آدمی نہیں ۔ اسے میں اپنی راہنمائی کے لیے ساتھ لایا ہوں .... اور سمن ! اُس زخمی کو کہاں لے گئے ہیں ؟"

"میں فیصلہ نہیں کر سکی کہ اُسے اپنے باپ کے پاس لے جاؤں یا جراح کے

پاس" ۔۔۔ سمن تاش نے جواب دیا ۔۔ "میں جا رہی ہوں ۔ معلوم نہیں کہاں ملاقات ہوگی ۔ ہوگی یا نہیں ۔ آپ کو دوستی کے پیغام کا جواب مل گیا ہے ۔ آپ آج ہی روانہ ہو جائیں"۔

سمن تاش ہرن کی طرح کودتی پھلانگتی چٹان سے اُتر گئی۔ مسعود اُسے دیکھتا رہا۔ وہ گھوڑے پر سوار ہوئی اور شہسوار کی طرح ایڑ لگا کر جنگل میں غائب ہو گئی۔ جب تک اُس کے گھوڑے کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی رہی مسعود اُدھر ہی دیکھتا رہا۔

"آپ سمجھ نہیں سکتے کہ یہ لڑکی [illegible] کی اتحاد کے متعلق کس قدر جذباتی ہے" ۔۔۔ ابی ظفر نے کہا ۔ "میں نے اس کے ساتھ بہت وقت گذارا ہے ۔ اسے جتنا میں جانتا ہوں اتنا کوئی نہیں جانتا۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ لڑکی غزنی کی سلطنت کے لیے بہت بڑی قربانی دے گی"۔

مسعود کی ذہنی کیفیت بدل گئی ۔ اُس نے اپنے محافظوں سے کہا ۔۔۔ "میرے ساتھ چلو" ۔۔۔ اور وہ چٹان سے اُتر کر گھوڑے پر سوار ہوا ۔ اُس کے تمام محافظ اُس کے پاس آگئے تو اس نے شہر کا رُخ کر لیا۔ اُس نے گھوڑے کو ایڑ لگا دی ۔ تیر کے زخمی کو جس گھوڑے پر لے جایا جا رہا تھا وہ ابھی شہر میں داخل ہی ہُوا تھا۔ سمن تاش کا گھوڑا اس سے آگے نکل گیا تھا۔ زخمی کا خون بہہ رہا تھا۔ مسعود نے حکم دیا کہ اس زخمی کو محل میں لے چلو۔

ابو منصور ارسلان خان اپنے دربار میں بیٹھا تھا۔ مسعود بن محمود اطلاع دیے بغیر اندر چلا گیا۔ اُس کے پیچھے پیچھے مسعود کا ایک محافظ اندر داخل ہوا ۔ اُس نے کندھے پر ایک زخمی کو اٹھا رکھا تھا جس کے کندھے میں ایک تیر اُترا ہُوا تھا۔ مسعود کے اشارے پر محافظ نے زخمی کو فرش پر لٹا دیا۔ زخمی کا خون بہہ رہا تھا۔

"یہ کیا ہے مسعود بن محمود ؟" ۔۔۔ ابو منصور نے پوچھا۔

"یہ آپ کا وہ جواب ہے جو آپ نے میرے دوستی کے پیغام کا دیا ہے" ۔۔۔ مسعود نے کہا ۔۔۔ "میں آپ کا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں کہ آپ نے مجھے زیادہ دن

استفسار نہیں کر رہا۔"

ابو منصور اُٹھ کھڑا ہوا اور غصے میں بولا۔ "یہ سب کیا ماجرا ہے؟ کیا سلطان محمود نے اپنی اولاد کو دربار کے آداب نہیں سکھائے؟"

"نہیں" ـــــ مسعود نے ابو منصور کے قریب کھڑے ایک سالار سے کہا۔ "اپنے آقا کے کان میں کہیے کہ کفار اور ایمان فروشوں نے ہمارے باپ کو اتنی فرصت نہیں دی کہ دربار میں بیٹھتا اور اپنی اولاد کو دربار کے آداب سکھاتا۔ ہم میدانِ جنگ میں تیروں کی بوچھاڑوں میں پل کر جوان ہوئے ہیں۔"

ابو منصور نے اپنے سالار کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ سالار نے اُس کے کان میں مسعود کے الفاظ دہرائے۔ ابو منصور نے مسعود کو خشمگیں نگاہوں سے دیکھا اور بولا۔ "ہندوستان کے ہیروں اور زر و جواہرات نے اس لڑکے کا دماغ خراب کر دیا ہے۔ یہ ہمیں اپنے باپ کے جنگی ہاتھیوں سے ڈرانے آیا ہے۔"

"اپنے آقا کے کان میں کہیے" ـــــ مسعود نے کہا۔ "طاقت ہاتھیوں کی نہیں ایمان کی ہوتی ہے۔ ہم اپنے تمام ہاتھی آپ کو دے دیتے ہیں مگر آپ ہمیں شکست نہیں دے سکیں گے۔ اپنے مہمان کو چوری چھپے قتل کرانے والے میدان میں بڑی جلدی پیٹھ دکھا جاتے ہیں۔"

جب ابو منصور کے کان میں مسعود کے الفاظ پہنچے تو وہ بیٹھ گیا اور بڑبڑانے لگا۔ مسعود دربار سے نکل گیا۔

"حکومت کا نشہ ہی ایسا ہے کہ عقل پر سیاہ کالا پردہ پڑ جاتا ہے" ـــ سلطان محمود نے اپنے بیٹے مسعود سے ابو منصور کی ملاقات اور قاتلانہ حملے کی کوشش کی تفصیلات سن کر کہا ـــ "میں نے دوستی کا پیغام بھیج کر اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔ اب میرے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں ہو گا۔ البتہ میرے دل پر ایک بوجھ آ پڑا ہے۔ قنوج کا مہاراجہ راجیپال بھاگ گیا تھا۔ اُس نے اپنا خزانہ پہلے ہی کہیں غائب کر دیا تھا۔ مجھے خزانے کی ضرورت نہیں۔ قنوج کی ضرورت تھی۔ وہ مجھے مل گیا تھا۔ اب ہندوستان

سے اطلاع آئی ہے کہ راجیپال قنوج میں ہمارے حاکموں کو پیغام بھیج رہا ہے کہ اُس کی جان بخشی کی جائے اور وہ غزنی کا باجگزار رہے گا مگر لاہور کا مہاراجہ بھیم پال نڈر دوسرے شکست خوردہ مہاراجوں کو ساتھ ملا کر راجیپال کو خوفزدہ کر رہا ہے اور ہمارے خلاف فیصلہ کُن جنگ کے لیے فوجیں اکٹھی کر رہا ہے۔

"مجھے فوراً وہاں چلے جانا چاہیے مگر میں کاشغر اور بخارا کے سانپوں کا سر کچلنا بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ تم کہتے ہو کہ ابو منصور کی بیٹی نے تمہیں کہا ہے کہ ہم اُس کے باپ پر حملہ کریں۔ ہم قوم کی اس بیٹی کی خواہش پوری کر دیں گے اور ہمارے لیے یہ جنگی اقدام اس لیے بھی ضروری ہو گیا ہے کہ یہ لوگ عیسائیوں کے زیرِ اثر ہیں۔ مجھے ان لوگوں سے کوئی خطرہ نہیں۔ اگر انہوں نے خراسان پر حملہ کیا تو منہ کی کھائیں گے، لیکن خطرہ یہ ہے کہ عیسائی ان لوگوں کے ہاں اپنے اڈے بنا لیں گے۔ ہماری جنگ اسلام کی مخالف قوتوں کے ساتھ ہے .... میرا خیال ہے کہ ابو منصور اور قادر خان خراسان پر حملے کا منصوبہ تو بنا سکتے ہیں، حملے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ تاہم ہمیں تیار رہنا چاہیے۔"

سلطان محمود کا یہ خیال غلط نکلا۔ کوئی دو ماہ بعد اُسے اطلاع ملی کہ کاشغر، بخارا اور بلاساغون کی فوجیں بلخ کی سمت بڑھی آ رہی ہیں۔ بلاساغون ابو منصور ارسلان کا دارالحکومت تھا۔ سلطان محمود نے پہلے ان تینوں کے اتحاد کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی لیکن اُسے جب ان کی پیش قدمی کی اطلاع ملی تو وہ پریشان سا ہو گیا۔ کاشغر، بخارا اور بلاساغون خراسان کی سرحد سے بہت دُور پہاڑی علاقے میں واقع تھے اور ایک دوسرے سے بھی دور تھے۔ خراسان تک کی مسافت خاصی دشوار تھی۔ راستے میں ایک بڑا دریا بھی تھا۔

"اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تینوں فوجیں بہت عرصے سے جنگ کی تیاریاں کر رہی ہیں" ـــ سلطان محمود نے اپنے سالاروں اور مشیروں سے کہا ـــ "اتنی دشوار پیش قدمی تیاری کے بغیر نہیں کی جا سکتی۔"

سلطان غزنی نے شاید اس پہلو پر توجہ نہیں دی کہ قادر خان راستے میں پہلی

قبائل کو مالِ غنیمت کا لالچ دے کر اور اسلام کے خلاف نفرت پھیلا کر اپنے ساتھ ملاتا چلا آ رہا ہے۔ یہ قبائل وحشی، خونخوار اور جنگجو ہیں۔ ان کا اپنا ہی بنایا ہوا کوئی مذہب ہے۔"

"مجھے معلوم ہے" — سلطان محمود نے کہا — "اسی لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں انہیں بلخ سے کچھ دور میدانی علاقے میں لا کر لڑاؤں گا۔ ان قبائل سے میں واقف ہوں۔ وہ جنگجو اس لیے ہیں کہ آپس میں لڑتے رہتے ہیں اور وہ صرف پہاڑیوں میں لڑ سکتے ہیں۔ اُن کے گھوڑے بھی سنگلاخ وادیوں میں بھاگنے دوڑنے کے عادی ہیں۔"

غزنی سے بلخ تک کا فاصلہ بھی خاصا زیادہ تھا۔ سلطان محمود نے ابی ظفر (نابینا موسیقار) کی اطلاع پر پہلے ہی خراسان کی فوج کو بلخ سے کچھ دور جمع ہو کر تیاری کی حالت میں رہنے کا حکم بھیج دیا تھا۔ وہاں ہاتھیوں کی تعداد تھوڑی تھی۔ سلطان محمود نے غزنی سے تین سو ہاتھی اس حکم سے بلخ کو روانہ کر دیئے کہ بہت تیز رفتار سے جائیں۔

صرف دو مؤرخوں نے اس جنگ کا ذکر کیا ہے۔ ان میں ایک عطبی ہے اور دوسرا ابن الاثیر۔ انہوں نے لکھا ہے کہ اس لڑائی میں سلطان محمود اپنی جنگی طاقت کی نمائش پر زیادہ توجہ دے رہا تھا تاکہ اس کے دشمن اور پہاڑی قبائل مرعوب ہو جائیں اور آئندہ سر اٹھانے کی جرأت نہ کریں۔

قادر خان، تغان خان اور ابو منصور کی فوجیں ایک دوسری کے پیچھے تیزی سے چلی آ رہی تھیں۔ ان کے لیے رسد کی کمی نہیں تھی۔ پہاڑی قبائل ان کی بہت مدد کر رہے تھے۔ دونوں مؤرخ لکھتے ہیں کہ یہ قبائل سرپٹ دوڑتے گھوڑوں سے تیر اندازی کے ماہر تھے اور لڑائی میں بھی بھاگتے دوڑتے لڑا کرتے تھے۔ سلطان محمود کے دشمنوں کو ان کی اسی مہارت اور لڑنے کے انداز پر ناز تھا۔ تینوں فوجوں کی اپنی نفری بھی بہت تھی۔ مؤرخوں کے اندازے کے مطابق سلطان محمود کی فوج بھی اتنی ہی

تھی۔ اس کے پاس ہاتھی تھے جو اس کے دشمنوں کے پاس نہیں تھے۔ اس کے علاوہ سلطان کے پاس تقریباً چار سو رتھ تھے جو اس نے ہندوستان کی شکست خوردہ فوجوں سے حاصل کیے تھے۔ وہ ان کے استعمال کا قائل نہ تھا لیکن قبائلیوں سے لڑنے کے لیے اُس نے رتھوں کا استعمال ضروری سمجھا۔

یہ بگی قسم کے رتھ تھے۔ ہر رتھ کے آگے ایک گھوڑا جوتا جاتا اور اس میں دو آدمی ہوتے تھے۔ دونوں لڑاکے ہوتے تھے۔ ایک گھوڑے کو ہانکتا اور دوسرے کے پاس پھینکنے والی برچھیاں اور تیر و کمان ہوتے تھے۔ سلطان محمود نے رتھوں کے دو دستے تیار کر رکھے تھے اور اب اُس نے دونوں دستوں کو بلخ پہنچنے کا حکم دے دیا تھا۔

مؤرخوں اور اُس دور کے جنگی مبصروں نے لکھا ہے کہ سلطان محمود کی فوج ٹریننگ اور میدانِ جنگ میں ڈسپلن اور دستوں کے باہمی ملاپ کے لحاظ سے ایک عمدہ فوج تھی۔ نہایت دشوار صورتِ حال میں بھی دستوں میں بھگدڑ اور انتشار پیدا نہیں ہوتا تھا۔ البتہ اس معرکے میں سلطان کو اپنی یہ کمزوری پریشان کر رہی تھی کہ اُس کی فوج کی تقریباً نصف نفری ہندوستان میں شہید ہو گئی تھی۔ اس کی کمی کسی حد تک اُس نے اُن ہندو دستوں سے پوری کر لی تھی جنہیں وہ جنگی قیدی بنا کر لا رہا تھا۔ ان ہندوؤں کو اُس نے اپنی فوج کی بجائے بہتر اور زیادہ مراعات دے رکھی تھیں۔ ان میں سے ہندو اکثر اسلام قبول کرتے رہتے تھے۔ ان دستوں کو وہ ہندوستان نہیں لے جاتا تھا۔

جب سلطان محمود بلخ پہنچا تو اُس نے آرام کیے بغیر دستوں کی تقسیم کا کام شروع کر دیا مگر اُس سے یہ ضروری کام دلجمعی سے نہ ہو سکا کیونکہ اُسے اطلاع ملی کہ دشمن ترمز کے مقام پر دریائے آکسس پار کر رہا ہے۔ یہ مقام بلخ سے تقریباً پچاس میل دور تھا۔ سلطان محمود کو سالاروں نے مشورہ دیا کہ دریا پار کرنے کے دوران ہی حملہ کر دیا جائے لیکن سلطان نے کہا کہ انہیں اطمینان سے گذر

آنے دو۔ اس کے بعد دریا ہمارا دوست ہوگا۔ سلطان محمود کو اس اطلاع سے یہ اطمینان ہُوا کہ دشمن کا رخ بلخ کی طرف ہے۔

سلطان محمود نے ہاتھیوں کو دو حصوں میں تقسیم کرکے ایک حصے کو بلخ سے پانچ چھ میل دُور دائیں اور دوسرے حصے کو اتنی ہی دُور بائیں جاکر دریا کی طرف چلے جانے کو کہا۔ ان کے ساتھ اُس نے ایک ایک سو رتھ اور ایک ایک دستہ پیادوں کا بھیج دیا۔ انہیں سلطان کے حکم کا انتظار کرنا تھا اور ان کے لیے اہم حکم یہ تھا کہ وہ دشمن کو نظر نہ آئیں۔

چوتھے روز دشمن کا ہراول نظر آیا۔ سلطان محمود کو اطلاع ملی تو وہ اٹھا اور قبلہ رُو ہوگیا۔ اُس نے دو نفل ادا کیے اور دعا کے بعد پہلا حکم یہ دیا کہ دشمن کے ہراول پر ایک بھی تیر نہ چلے۔ وہ حکم دے ہی رہا تھا کہ اُسے اطلاع ملی کہ دشمن کا ایک جاسوس پکڑ لائے ہیں۔ اس کے حکم پر جاسوس کو اس کے سامنے لایا گیا۔

"ہاں سلطان!" — جاسوس نے کہا — "میں بلاساغون کا جاسوس ہوں لیکن میں ایک خبر دینے آیا ہوں، کچھ معلوم کرنے نہیں آیا۔"

"کیا خبر ہے؟" — سلطان محمود نے پوچھا۔

"جو کچھ بھی ہے وہ آپ کے فرزند مسعود کے لیے ہے" — جاسوس نے کہا — "آپ انہیں ذرا جلدی بلالیں۔"

مسعود کو بلایا گیا تو جاسوس نے سلطان محمود کی موجودگی میں بتایا کہ اُسے ابو منصور کی بیٹی سمن ... نے اس زبانی پیغام کے ساتھ بھیجا ہے — "میں نے تمہیں کہا تھا کہ میدانِ جنگ میں ملاقات ہوگی۔ میں اُن مستورات کے ساتھ آگئی ہوں جو میرے ابا اور اس کے سالاروں وغیرہ کی بیویاں اور داشتائیں ہیں۔ ہماری فوجوں کی ترتیب یہ ہے کہ ہماری فوج دائیں پہلو پر ہے۔ بخارا کی فوج بائیں پہلو پر اور درمیان میں قادر خان کی فوج ہے۔ قبائلیوں کو تینوں فوجوں کے ساتھ تقسیم کر دیا گیا ہے۔ میرے ابا اپنی فوج کی کمان خود کر رہے ہیں۔ آپ کے والدِ محترم بہتر سمجھتے ہیں

کہ وہ ہماری ترتیب جان کر اپنی فوج کی تقسیم کس طرح کریں گے۔ میں تمہیں مشورہ دوں گی کہ ہماری طرف تم آنا۔ میں کوشش کروں گی کہ تم تک زندہ پہنچ سکوں۔ زندہ نہ رہی تو خدا حافظ!"

جاسوس نے کہا — "آپ مجھے اپنے پاس رکھ سکتے ہیں۔ شہزادی نے کہا تھا کہ واپس نہ آنا۔"

"سنو مسعود!" — سلطان محمود نے جاسوس کو باہر نکال کر مسعود سے پوچھا — "کیا یہ کوئی جذباتی معاملہ ہے؟ اگر ایسا ہی ہے تو میں تمہیں اس طرف نہیں بھیجوں گا۔"

"معاملہ جذباتی ہے لیکن ذاتی یا سفلی جذبات کا نہیں" — مسعود نے جواب دیا — "آپ مجھے اُسی طرف بھیجیں۔ میں اس لڑکی کی بجائے اس کے باپ سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ آپ اس پیغام کو دھوکہ نہ سمجھیں۔ آپ کو اس لڑکی کے متعلق ابی ظفر بھی بتا چکا ہے اور میں نے بھی آپ کو بہت کچھ بتایا ہے۔"

پانچویں صبح کا سورج سرخ رنگ کی گرد میں اس طرح چھپا ہُوا تھا کہ چمکتے ہوئے گولے کی طرح نظر آتا تھا۔ الیاس بن اسحٰق کی تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ دونوں فوجیں اللہ اکبر کے نعرے لگا رہی تھیں اور ایک دوسرے کے خون کی پیاسی تھیں۔ دشمن اسی ترتیب میں آرہا تھا جو سمن تاش نے بتائی تھی۔ گھوڑسوار قاصدوں کی سرپٹ بھاگ دوڑ شروع ہوچکی تھی۔ اُن کی اطلاعوں سے دشمن کی ترتیب کا پتہ چل رہا تھا۔ سلطان محمود اس کے مطابق قاصدوں کو پیغام دے رہا تھا۔ قادر خان کی فوج درمیان میں اور خاصی پیچھے تھی۔ توغان خان اور ابو منصور دائیں اور بائیں رنج سے چند میل دُور چلے آرہے تھے۔ یہ گھیرے کی ترتیب تھی۔ وہ بلخ کو اور سلطان محمود کی فوج کو گھیرے میں لینا چاہتے تھے۔

سلطان محمود نے مسعود کو اُس طرف بھیج دیا تھا جدھر ابو منصور کی فوج تھی۔ جدھر سے توغان کی فوج آرہی تھی اُدھر سلطان نے ایک اور تجربہ کار سالار بھیج دیا تھا۔ دشمن کی تینوں فوجوں کے درمیان ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو میل کا فاصلہ

تھا۔ ان خالی جگہوں میں سلطان محمود کے دستے جا رہے تھے۔ ہاتھی، رتھ اور پیادہ دستے پہلے ہی اُس طرف نکل گئے تھے۔ اس سے سلطان نے دشمن کے لیے یہ صورت پیدا کر دی کہ تورغان خان اور ابو منصور کی فوجیں دائیں بائیں سے سلطان کے گھیرے میں آ گئیں۔

سلطان محمود نے اپنے پیغاموں کے ساتھ قاصد دوڑا دیئے۔ سورج اوپر اٹھ آیا تھا مگر گرد نے اس کی روشنی مدھم کر رکھی تھی۔ اچانک زمین و آسمان کانپنے لگے۔ سلطان محمود نے دشمن کے دائیں اور بائیں پہلوؤں پر حملے کا حکم دے دیا تھا۔ دونوں پہلوؤں پر دونوں اطراف سے حملہ ہوا۔ ایک طرف ہاتھی اور رتھ تھے۔ قبائلیوں نے اپنے مخصوص انداز سے گھوڑے دوڑانے اور تیر اندازی کی کوشش کی لیکن اتنے گھمسان کی جنگ میں انہیں اپنے پرائے کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔

قادر خان کو بھی پتہ نہیں چل رہا تھا کہ اس کے دائیں بائیں کیا ہو رہا ہے۔ اُسے پہلوؤں سے کوئی پیغام نہیں مل رہا تھا۔ اُسے بتانے والا کوئی نہ تھا کہ اُس کے پہلو کچلے اور ہاتھیوں تلے مسلے جا رہے ہیں۔

دائیں طرف ابو منصور کی حالت اچھی نہیں تھی۔ اُس کی فوج پر ایک طرف سے مسعود نے حملہ کیا اور جب اس کی فوج اس طرف متوجہ ہوئی تو پیچھے سے چنگھاڑتے ہاتھیوں، رتھ سواروں اور پیادہ دستوں نے حملہ کر دیا۔ رتھ سواروں کی توجہ قبائلیوں پر تھی۔ جونہی کوئی قبائلی اپنے گھوڑے کو باہر نکالتا اور اپنے انداز سے لڑنے کی کوشش کرتا، دو رتھ سوار اس کے دائیں بائیں دوڑ پڑتے اور اسے برچھی یا تیر سے گرا لیتے۔

شام سے کچھ پہلے مسعود ایک بلند جگہ کھڑا لڑائی کا منظر دیکھ رہا تھا۔ عقب سے تین گھوڑے سرپٹ دوڑتے آ رہے تھے۔ ایک سوار کے ہاتھ میں سفید جھنڈا تھا۔ مسعود کے محافظوں نے گھوڑے اُن کی طرف دوڑا دیئے کیونکہ یہ دھوکہ بھی ہو سکتا

تھا۔ وہ تینوں سواروں کو اپنے ساتھ مسعود کے سامنے لے آئے۔ ان میں ایک سوار سمن تاش تھی جس کے سر اور چہرے پر موٹا پردہ پڑا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ دو مرد گھوڑ سوار تھے۔ سمن تاش کود کر گھوڑے سے اُتری اور دوڑتی مسعود کے پاس آئی۔

"بڑی مشکل سے تمہارا پتہ چلا ہے"۔۔۔ وہ ہانپتی ہوئی سانسوں سے بول رہی تھی "میرے ابا بھاگنے کی فکر میں ہیں لیکن ان کا ایک سالار انہیں جھوٹی تسلیاں دے رہا ہے۔ وہ فوج کا قلب پیچھے لے گئے ہیں۔ انہیں یقین ہو گیا ہے کہ انہیں شکست ہو چکی ہے۔ اُن کے پاس قادر خان کا قاصد یہ پیغام لے کر آیا ہے کہ اُس نے بلخ کی طرف پیشقدمی روک دی ہے اور وہ اپنی فوج کو دائیں اور بائیں کمک کے طور پر تقسیم کر رہا ہے۔ اُس نے کہا کہ حوصلہ نہ ہارنا، سلطانی فوج کو ہم گھیرے میں لے رہے ہیں۔۔۔۔ میں نے تمہارا سراغ کس طرح لگایا اور یہاں تک کس طرح پہنچی، یہ پھر کبھی بتاؤں گی۔ میں اس لیے آئی ہوں کہ ہمارے قلب کو تم ذرا سی ہمت سے پکڑ سکتے ہو۔ مجھے معلوم نہیں کہ دوسری طرف لڑائی کی صورتِ حال کیا ہے۔ میں اپنی فوج کی بات کر رہی ہوں"۔

مسعود سوچ میں پڑ گیا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟"۔۔۔ سمن تاش نے کہا۔۔۔ "میرا گھوڑا لاشوں کو روندتا آیا ہے۔ مرنے والوں میں غزنوی بھی ہیں، ترکستانی اور بخاری بھی مگر سب ایک جیسے لگتے ہیں۔ وہ مسلمان تھے"۔ اُس نے چلا کر کہا۔۔۔ "اپنی قوم کا خون روکو مسعود! میں جو کہتی ہوں وہ کرو۔ قادر خان کی کمک آ گئی تو یہ قتل و غارت نہیں رکے گی۔ اس سے پہلے ہمارے قلب کو مٹھی میں لے لو"۔

"تم ساتھ چلو گی؟"

"نہیں!"۔۔۔ سمن تاش نے کہا۔۔۔ "میں جا رہی ہوں۔ تم آؤ"۔

وہ گھوڑے پر سوار ہوئی اور دو محافظوں کے ساتھ جو اُس کے زر خرید تھے ہو گئے تھے، میدانِ جنگ کے گرد و غبار میں غائب ہو گئی۔ وہ مسعود کو بتا گئی تھی کہ اس

کا باپ کہاں ہے۔

قادر خان کی پیش قدمی رک گئی تھی۔ وہ اپنی فوج کو دو حصوں میں تقسیم کر کے تغان خان اور ابو منصور کو کمک بھیج رہا تھا۔ سلطان محمود کو اُس کے اس اقدام کا پتہ اُس وقت چلا جب رات گہری ہو رہی تھی۔ اس وقت حملہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ سلطان نے اپنے پلان میں ردوبدل کر لیا اور اُسی وقت مسعود اور دوسرے سالار کی طرف پیغام بھیج دیا کہ تازہ صورتِ حال کیا ہے۔

مسعود اپنی جگہ نہیں تھا۔ وہاں ایک نائب سالار نے پیغام وصول کیا۔ مسعود کم و بیش ایک سو منتخب سپاہیوں اور چھاپہ مار کمانداروں کو ساتھ لے کر ابو منصور کے ہیڈ کوارٹر پر حملہ کرنے چلا گیا تھا۔ یہ ایک شب خون تھا۔ ابو منصور حوصلہ ہار بیٹھا تھا۔ اس کی فوج بُری طرح کچلی گئی تھی۔ سلطان محمود نے اُس پر حملہ ہی ایسے انداز سے کرایا تھا کہ وہ بچ نہیں سکتا تھا۔ وہ اپنی بیٹی کی نشاندہی کے مطابق دریا کے کنارے چلا گیا تھا۔ اُس کے ساتھ اس کا ایک سالار اشمیر تمین ہو یاں، چند ایک محافظ اور چند قاصد تھے۔ وہاں اس پر حملہ نہیں ہو سکتا تھا۔

مسعود دور کا چکر کاٹ کر وہاں تک پہنچا۔ اُسے دو تین مشعلیں جلتی نظر آئیں۔ اُس نے اپنے آدمیوں کو ہدایات دیں اور انہیں پھیلا کر آگے بڑھا۔ ابو منصور کے صرف دو محافظ جاگ رہے تھے۔ ایک نے دوسرے سے کہا کہ وہ گھوڑوں کی آوازیں سُن رہا ہے۔ دوسرے نے کہا کہ وہی ہوں گے۔ اُس نے ایک مشعل اٹھائی اور اوپر کر کے دو مرتبہ دائیں بائیں ہلائی اور دو مرتبہ اوپر نیچے کی۔ مشعل رکھ کر وہ ایک خیمے کے قریب جا کھڑا ہوا اور منہ سے دھیمی سی آواز نکالی۔ خیمے میں سمن تاش سوئی ہوئی تھی۔ وہ فوراً اُٹھ کر باہر آ گئی اور محافظ سے کہا کہ تم آگے چلے جاؤ۔

چونکہ راہنمائی موجود تھی اس لیے شب خون میں کوئی دشواری اور کوئی خطرہ نہ تھا۔ ابو منصور اور سالار اپنے اپنے خیموں میں سوئے ہوئے تھے۔ ان تک زخمیوں کی

کربناک آوازیں نہیں پہنچ رہی تھیں، نہ وہاں تک خون اور لاشوں کی بُو پہنچ رہی تھی۔ وہ اس خوش فہمی میں بھی مبتلا تھے کہ وہاں تک کوئی خطرہ نہیں پہنچ سکتا مگر ایمان فروش باپ کی دین دار بیٹی ایک بہت بڑا خطرہ بن کر اُس کے ساتھ موجود تھی۔

مسعود نے خیمہ گاہ میں داخل ہو کر ایک مشعل اٹھائی اور ابو منصور کے خیمے میں جا کر اُسے جگایا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا تو مسعود کو دیکھ کر پوری طرح ہوش میں آ گیا۔ باہر مسعود کے آدمیوں نے محافظوں کو جگا کر الگ کھڑا کر لیا اور سالار کو بھی پکڑ لیا تھا۔ ابو منصور نے مسعود سے کہا کہ وہ شکست تسلیم کرتا ہے لیکن اُس کی بیٹی کو گرفتار نہ کیا جائے۔ مسعود نے اس کے ساتھ کوئی بات نہ کی۔

نصف شب کا عمل ہو گا۔ سلطان محمود ابھی ابھی میدانِ جنگ کا چکر لگا کر آیا تھا۔ اُسے اطلاع دی گئی کہ مسعود ابو منصور کو پکڑ لایا ہے۔ سلطان دوڑتا باہر آیا۔ اُس کے لیے یہ خبر معمولی نہیں تھی۔ ابو منصور کے ساتھ سمن تاش بھی تھی۔ انہیں سلطان اپنے خیمے میں لے گیا۔

"کیا سلطان میری دوستی قبول کر لیں گے؟" — ابو منصور نے پوچھا۔

"میں نے دوستی کا ہی پیغام بھیجا تھا" — سلطان محمود نے کہا — "مگر تم نے میرے بیٹے کو قتل کرانے کی کوشش کی .... کیا میں تم پر بھروسہ کر سکتا ہوں؟ تم مجھے کس طرح یقین دلا سکتے ہو کہ تمہاری دوستی میں خلوص ہے؟ تمہارے پاس ہے کیا؟ تمہاری حیثیت کیا رہ گئی ہے؟ تم میرے قیدی ہو۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں" — ابو منصور نے کہا — "میرے پاس کچھ نہیں رہا پھر بھی آپ کی دوستی چاہتا ہوں۔ میں آپ کے خلاف لڑنا نہیں چاہتا تھا مگر ...."

اور اُس نے اقبالِ جرم کے انداز سے بتا دیا کہ وہ مجبور ہو کر اپنی فوج لے آیا ہے۔

سمن تاش کھڑی سن رہی تھی۔ وہ آگے بڑھ کر سلطان کے سامنے دو زانو ہو گئی اور سلطان کا ہاتھ چوم کر کہا — "کیا آپ کے دل میں میرے لیے کچھ جگہ ہے؟" — اُس نے مسعود کی طرف دیکھا اور سلطان محمود سے کہا — "میں یہ دوستی پکی کر سکتی ہوں۔"

سلطان محمود اشارہ سمجھ گیا۔ ابومنصور نے کہا۔" ہاں سلطان! میرے پاس یہی کچھ رہ گیا ہے۔۔۔ ایک بیٹی۔۔۔۔ اس نے مجھے آپ کے خلاف لڑنے سے روکا تھا۔ اسے اپنی بیٹی بنالیں۔"

سلطان محمود نے اُسی وقت یہ پیشکش قبول کر لی اور مسعود کی رضامندی سے سمن تاش کو اُس کی بیوی بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ لڑائی اور شادی ۱۰۲۰ء میں ہوئی تھی۔

دوسرے دن کی لڑائی فیصلہ کن تھی۔ ابومنصور نے اپنی فوج کو لڑائی سے الگ ہو جانے کا حکم بھیج دیا۔ سلطان محمود نے اُسے قیدی سے مہمان بنا لیا تھا۔ قادر خان اور توغان خان میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔ ڈیڑھ دو سال بعد ان دونوں نے بھی سلطان محمود کی اطاعت قبول کر لی تھی۔

دیوتا نے پنڈت کو نگل لیا

بھارت میں کالنجر، قنوج اور گوالیار ایک مثلث کی صورت میں واقع ہیں۔ اس مثلث میں سے ہندوؤں کے دو مقدس دریا، جمنا اور گنگا گذرتے ہیں۔ کئی اور ندی نالے بھی جسم کی رگوں کی طرح پھیلے ہوئے ہیں۔ سلطان محمود غزنوی کے دور میں اس علاقے میں گھنے جنگلات تھے۔ ٹیلے، ٹیکریاں اور پہاڑیاں بھی تھیں۔ یہ تینوں مقامات ایک دوسرے سے ڈیڑھ ڈیڑھ سو میل دور ہیں۔ اُس دور میں جب غزنی کا بت شکن ہندوستان پر دہشت بن کے چھا گیا تھا، یہ بڑی مشہور راجدھانیاں تھیں۔ قنوج کے متعلق سنایا جا چکا ہے کہ بلند شہر، متھرا، منج اور چھوٹے بڑے کئی ایک قلعوں کی فتح کے بعد محمود غزنوی نے قنوج کو تہ تیغ کر لیا تھا اور قنوج کا مہاراجہ راجیا پال جس کا یہ شہر تھا، محاصرے سے پہلے ہی بھاگ گیا تھا۔

کالنجر کے متعلق یہ وضاحت ضروری ہے کہ آپ پہلے بھی کشمیر کے حملے کی کہانی میں یہ نام پڑھ چکے ہیں۔ وہ دراصل کالانجر ہے جو آج کوٹلی کہلاتا ہے۔ اب جس جگہ کا ذکر ہو رہا ہے یہ کالنجر ہے۔

۱۰۱۸ء کے آخری دنوں میں قنوج کا مہاراجہ راجیا پال سلطان محمود غزنوی کے مقابلے سے پہلے ہی منہ موڑ گیا تھا تو وہ کالنجر، قنوج اور گوالیار کی مثلث سے نکل گیا تھا۔ راجیا پال نے اپنا تمام تر خزانہ شہر سے دور ایک ایسی پہاڑی اور جنگلاتی جگہ چھپایا تھا جہاں انسانوں کا گذر کم ہی ہوتا تھا۔ اس کا رازدان صرف ایک

پنڈت تھا اور بعد میں محمود غزنوی کا ایک جاسوس اس خزانے کے راز سے واقف ہُوا تھا۔ اُس نے قنوج کی فتح کے وقت اس پنڈت کو پکڑوا دیا تھا مگر پنڈت نے سُلطان کو بتایا تھا کہ وہ اُسے خزانے کی جگہ لے جاسکتا ہے لیکن وہاں خزانہ نہیں ہوگا۔ وہ راجیا پال اپنے ساتھ لے گیا ہے۔

"وہ گیا کہاں ہے؟" سُلطان محمود نے اُس سے پوچھا۔

"اگر مجھے معلوم ہوتا تو میں بھی اُس کے ساتھ چلا جاتا" ــــ پنڈت نے جواب دیا تھا ــــ "آپ کا قیدی نہ ہوتا"

"ہمیں بتایا گیا ہے کہ تم واحد آدمی تھے جو مہاراجہ کے خزانے کے راز سے واقف تھے" ــــ سلطان کے ایک سالار نے اُس سے پوچھا ــــ "یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ مہاراجہ تمہیں بتائے بغیر چلا گیا ہو"

"خزانے سے جسے پیار ہو وہ انسانوں کے پیار سے محروم ہو جاتا ہے" ــــ پنڈت نے کہا ــــ "جو مہاراجہ اپنے دیوتاؤں اور دیویوں کو اور اپنے مندروں کو توہین اتباہی و بربادی کے لیے چھوڑ گیا ہے، اُس کے لیے مندروں کا ایک پجاری کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ مجھے اُس کے خزانوں کے ساتھ دلچسپی ہوئی تو تمام تر خزانہ میری تحویل میں رہا ہے۔ میں اسے غائب کر سکتا تھا مگر میں نے اس کی خاطر آپ کا ایک آدمی سانپوں سے مروا دیا ہے۔ آپ میرے ساتھ چلیں۔ آپ کو وہ جگہ دکھاؤں گا۔ مندروں میں جو کچھ ہے وہ آپ کے حوالے کیا جا چکا ہے"

"کیا آپ اسلام قبول کریں گے؟"

"نہیں" ــــ پنڈت نے کہا تھا ــــ "جس طرح آپ کے آدمی میرے دیوتاؤں کو مٹی اور پتھر کے بُت سمجھ کر توڑ رہے ہیں اسی طرح میرے جسم کے بھی ٹکڑے کر دیں۔ اپنا مذہب نہیں چھوڑوں گا۔ اگر آپ اپنے مذہب کو سچا سمجھتے ہیں تو دوسرے مذہب کے پیشواؤں کا احترام کریں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کا مذہب بھی یہی کہتا ہے"

"میں نے تمہارے مذہب کے پیشواؤں کو اپنے قدموں میں سر گراتے دیکھا ہے"

ــــ سُلطان محمود نے پُرجوش آواز اور دادو تحسین کے لہجے میں کہا ــــ "مگر تم میں جو جرأت ہے میں اس کی تعریف کرتا ہوں۔ غدار کسی بھی قوم کا اور کسی بھی مذہب کا ہو وہ قابلِ نفرت ہے .... کہو پنڈت! کیا چاہتے ہو؟"

"اگر مجھ پر کرم کرنا چاہتے ہیں تو مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں" ــــ پنڈت نے کہا ــــ "میں اپنی آنکھوں اپنے مذہب کی توہین نہیں دیکھ سکتا۔ میں اپنے آپ کو گنگا ماتا کے حوالے کر دوں گا یا جنگل میں نکل جاؤں گا اور باقی عمر وہیں گزار دوں گا"

"جاؤ پنڈت!" ــــ سلطان محمود نے کہا ــــ "جلتے ہوئے قنوج کے دروازے کھلے ہیں چلے جاؤ۔ اگر اپنے مہاراجہ سے کہیں ملاقات ہو جائے تو اُسے کہنا کہ جنگجو بادشاہ اپنی قوم اور اپنے ملک کے ساتھ دھوکہ نہیں کیا کرتے"

پنڈت سر جھکائے ہوئے چلا گیا۔

وہ ۲۰ دسمبر ۱۰۱۸ء کا دن تھا جب سلطان محمود غزنوی نے قنوج کا محاصرہ کیا تھا۔ کوئی بھی نہ بتا سکا کہ راجیا پال کب قنوج سے نکل گیا تھا۔ اُس کے تعاقب کی ضرورت بھی محسوس نہ کی گئی۔ تھوڑا ہی عرصہ بعد سلطان محمود غزنی چلا گیا اور قنوج میں اپنے ایک سالار ابوالقدر سلجوقی کو چھوڑ گیا۔

پنڈت جو سلطان محمود کو یہ کہہ کر وہ گنگا میں ڈوب مرے گا یا باقی عمر جنگل میں گزار دے گا، گھوڑے پر سوار قنوج سے دور نکل گیا تھا۔ اُس نے اور دور جا کر گھوڑا دریا میں ڈال دیا۔ دریا گہرا تو تھا مگر خاموش تھا۔ وہ موسم سیلاب اور طغیانی کا نہیں تھا۔ گھوڑا اُسے آگے ہی آگے لے جاتا رہا لیکن پنڈت نے اپنے آپ کو گنگا ماتا کے حوالے نہ کیا اور گھوڑا اُسے پار لے گیا۔ آگے گھنا جنگل تھا۔ پنڈت نے گھوڑے کو آرام دیا اور اُسے چرنے چگنے کے لیے چھوڑ دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ گھوڑے پر سوار ہُوا اور جنگل میں داخل ہو گیا۔ جنگل گھنا بھی تھا، کم گھنا بھی اور کہیں کہیں درخت تھے ہی نہیں۔ راستے میں دو تین ندیاں بھی آئیں۔ چٹانوں کی بھول بھلیاں بھی آئیں۔ سورج غروب ہُوا۔ رات اندھیری ہوتی چلی گئی۔ اُس کا گھوڑا چلتا گیا۔ آخر وہ

رک گیا۔ علاقہ زیادہ دشوار گزار ہو گیا تھا۔ اُس نے گھوڑے سے اُتر کر اندھیرے میں گھاس پھونس اور خشک ٹہنیاں اکٹھی کر کے انہیں آگ لگا دی۔ سردی تھی اور درندوں کا خطرہ بھی تھا۔ اُس نے اپنے ارد گرد خشک جھاڑیاں اور ٹہنیاں اور گھاس پھونس جلاتے رات گزاری۔ صبح وہ پھر گھوڑے پر سوار ہُوا اور روانہ ہو گیا۔
اب وہاں کوئی راستہ نہیں تھا۔ بیلیں زمین پر پھیل کر درختوں پر چڑھی ہُوئی تھیں۔ کھڈ بھی تھے اور درخت اتنے زیادہ کہ ان کے جھکے ہوئے ٹہنوں کے نیچے سے گزرنا محال تھا۔

اُس کا گھوڑا چلتا گیا۔ کچھ دور گیا تو جنگل کم گھنا ہو گیا۔ آگے دو پہاڑیوں کے درمیان کھلی جگہ تھی۔ بکھرے بکھرے درخت اور اونچی گھاس تھی۔ وہ چلتا گیا اور دونوں پہاڑیوں کے درمیان گیا تو اُسے ایک پہاڑی میں سے راستہ نظر آ گیا۔ یہاں سے پہاڑی دو حصّوں میں کٹی ہُوئی تھی۔ وہ اس تنگ راستے میں سے گزر گیا۔ آگے ایک اور پہاڑی آ گئی جو کہیں سے دیوار کی طرح عمودی تھی اور کہیں سے اوپر جا کر آگے کو جھکی ہُوئی تھی۔

اس وادی میں کچھ دُور اُسے خیمے دکھائی دیئے۔ ان سے ہٹ کر دو خیمے خوشنما کپڑے کے تھے۔ ان سے ذرا پرے گھوڑے اور خچر بندھے ہُوئے تھے۔ پنڈت نے گھوڑے کی لگام کو جھٹکا دیا اور ایڑ لگائی۔ گھوڑا دوڑ پڑا۔ چند ایک آدمی ہاتھوں میں تیر و کمان اور برچھیاں اٹھائے سامنے آ گئے۔
"پنڈت جی مہاراج ہیں" — کسی نے بلند آواز سے کہا۔
قنوج کا مہاراجہ راجیا پال خیمے سے باہر آیا۔ اُس کے ساتھ اُس کی رانی اور اُس کا بیٹا لکھمن پال بھی آن کھڑا ہُوا۔ یہ تھی وہ جگہ جہاں مہاراجہ راجیا پال نے قنوج سے بھاگ کر پناہ لے رکھی تھی۔ اس کی رانی اور بیٹے لکھمن پال کے علاوہ تین ناچنے اور گانے والیاں بھی تھیں۔ کم و بیش پچاس وفادار سپاہی تھے جو مہاراجہ کے محافظ تھے۔ چند ایک ملازم بھی تھے۔ پنڈت کو یہ جگہ معلوم تھی، ورنہ وہ اس جگہ تک کبھی نہ پہنچ سکتا۔

پنڈت گھوڑے سے اُترا تو راجیا پال نے آگے بڑھ کر اُسے بازو سے پکڑا اور اپنے خیمے میں لے گیا۔ رانی اور اُس کے بیٹے لکھمن پال نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اُن کے چہروں پر اُداسی اور پریشانی تھی۔ وہ اپنے خیمے میں چلے گئے۔

"کیا آپ مجھ سے یہ پوچھنے کی جرأت کریں گے کہ آپ کی راجدھانی کس حال میں ہے؟" — پنڈت نے مہاراجہ قنوج سے پوچھا — "کیا آپ میں سننے کی ہمت ہے کہ مسلمانوں نے قنوج میں مندروں کو کس طرح اجاڑا ہے؟"
مہاراجہ راجیا پال نے اُسے ایسی نگاہوں سے دیکھا جو خشمگیں تھیں۔ ان میں شکست اور بے لبسی کا تاثر نہیں تھا۔
"میں جب وہاں سے رخصت ہُوا اُس وقت قنوج جل رہا تھا" — پنڈت نے کہا — "مندروں میں مسلمان سپاہی ہری کرشن مہاراج کے بُت گھسیٹ کر باہر لا رہے تھے اور انہیں توڑا جا رہا تھا۔ آپ کے محل میں ....."
"آپ میرے لیے کوئی نئی خبر نہیں لائے" — مہاراجہ راجیا پال نے اُس کی بات کاٹ کر کہا — "اس سلسلے میں آپ کے ساتھ بہت باتیں ہو چکی ہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ غزنی کا سلطان محمود لڑنے میں بہت ماہر ہے۔ میں جانتا تھا کہ قنوج میں جب اُس کے مقابلے میں لڑنے والا کوئی نہیں ہو گا اور میں بھی اُسے نہیں ملوں گا تو وہ بھڑک اُٹھے گا اور وہ اپنا غصہ قنوج کے در و دیوار پر ٹھنڈا کرے گا۔ وہ آسان فتح سے خوش ہونے والا نہیں۔ میں نے قنوج کو، اپنے محل کو اور مندروں کو کسی خاص مقصد کے لیے قربان کیا ہے۔"
"مگر آپ نے اپنا خزانہ قربان نہیں کیا" — پنڈت نے کہا۔
"پنڈت جی مہاراج!" — راجیا پال نے کہا — "آپ کے دماغ کی خرابی کا میرے پاس کوئی علاج نہیں۔ آپ ہر بات میں مذہب کو سامنے لے آتے ہیں۔ میں جانتا ہُوں آپ کہیں گے کہ مجھے خزانے کے ساتھ پیار ہے ..... ان باتوں

کو ذرا ذہن سے اتار دو مہاراج! مجھے یہ بتاؤ کہ میں جس مقصد کے لیے آپ کو وہاں چھوڑ آیا تھا وہ پورا ہوا یا نہیں؟

"نہیں" — پنڈت نے جواب دیا — "آپ میرے ساتھ بارہ آدمی چھوڑ آئے تھے۔ آپ نے مجھے بتایا تھا کہ یہ درندے ہیں کسی سے نہیں ڈرتے اور انہیں بھگوان نے انسانوں کو قتل کرنے کے لیے دنیا میں بھیجا ہے۔ آپ نے بتایا تھا کہ ان میں عقل اتنی زیادہ ہے کہ بڑا کامیاب فریب دیتے ہیں اور قتل کر کے غائب ہو جاتے ہیں۔ آپ نے کہا تھا کہ ان سے سلطان محمود کو قتل کرانا ہے، اور اگر یہ ممکن نہ ہو سکے تو اُس کے بڑے بڑے سالاروں کو قتل کر دیں آپ نے مجھ پر چھوڑا تھا کہ ان کے ہاتھوں اور کس کس کو قتل کرانا ہے"۔

"میں یہ سننے کے لیے بیتاب ہوں کہ آپ نے کس کس کو قتل کرایا ہے" — مہاراجہ راجیا پال نے پوچھا۔

"کسی ایک کو بھی نہیں" — پنڈت نے کہا — "میں نے آپ کے ان بارہ دلیر درندوں کو جو آپ کہتے تھے کہ موت سے نہیں ڈرتے، غریب مزدوروں کے لباس میں اپنے ساتھ رکھا مگر سلطان فوج شہر میں داخل ہوئی تو لوٹ مار شروع ہو گئی اور مکان جلنے لگے۔ میں نے دیکھا کہ بارہ میں سے دس غائب ہو گئے۔ مجھے اُمید تھی کہ وہ اپنا کام کرنے گئے ہیں مگر تھوڑی دیر بعد میں نے باقی دو کو ان کی تلاش کے لیے بھیجا تو پتہ چلا کہ وہ بھی لوٹ مار میں شامل ہو گئے ہیں اور ان میں سے بعض شہر سے چلے گئے ہیں۔ میں نے باقی دو سے پوچھا کہ وہ کسی کو قتل کر سکیں گے؟ انہوں نے جواب دیا کہ مہاراجہ خود تو خزانہ لے کر بھاگ گیا ہے، ہم کس کے لیے کسی کی جان لیں اور اپنی جان کو خطرے میں ڈالیں؟ .... اور وہ بھی میرا ساتھ چھوڑ گئے"۔

مہاراجہ قنوج نے سر جھکا لیا۔

"مہاراج!" — پنڈت نے کہا — "وہ نمک حرام نہیں تھے لیکن وہی وہاں نہ تھا جس کا انہوں نے نمک کھایا تھا تو انہوں نے اتنا بڑا خطرہ مول لینا بیکار سمجھا .... اور مہاراج! کسی بادشاہ کو قتل کر کے آپ اُس کی فوج کو شکست نہیں دے

سکتے، اور یہ غیرت مند جنگجوؤں کا شیوہ بھی نہیں۔ میں اب بھی آپ سے کہتا ہوں کہ اپنی جس فوج کو آپ نے قنوج سے باری چلے جانے کا حکم دیا تھا، اُسے تیار کریں۔ باری کو اپنی راجدھانی بنائیں اور سلطان محمود کو یہاں سے نکالیں۔ اُس کی فوج تھوڑی رہ گئی ہے۔ لاہور کا مہاراجہ بھیم پال نڈر، گوالیار کا راجہ ارجن اور کالنجر کا راجہ گنڈا آپ کا ساتھ دینے کو تیار ہیں۔ مسلمانوں کو آپ کچل سکتے ہیں۔ آپ کی گدی کو لوگ مقدس سمجھتے ہیں"۔

"سب سے پہلے خزانہ وہاں سے نکالنا ہے" — مہاراجہ راجیا پال نے کہا — "پھر سوچیں گے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ میں ساری عمر یہاں چھپ کر تو نہیں گزار سکتا"۔

ایک دن اور ایک رات کی مسافت کے بعد قافلہ اُس جگہ پہنچا جہاں پنڈت نے مہاراجہ قنوج کا خزانہ چھپایا تھا۔ یہ ایک پہاڑی تھی جس میں اوپر سے نیچے تک شگاف تھا جو اندر کو چلا گیا تھا۔ اس کی شکل کنوئیں جیسی تھی جس کی دیوار ایک طرف سے گرا دی گئی ہو۔ اوپر کے درختوں نے جھک کر اس پر سایہ کر رکھا تھا۔ دلدل والوں کے ساتھ بھی درخت تھے اور دیوار میں بھی تھے جو جھک کر زمین کے ساتھ متوازی ہو گئے تھے۔ اس کنواں نما میں پانی کھڑا تھا جو دراصل دلدل تھی۔ اس کے کناروں اور عمودی چٹان کے درمیان تنگ سا راستہ تھا۔ سامنے والی دیوار جیسی چٹان کے دامن کے ساتھ مٹی اور پتھروں کی ٹیکری تھی۔ ٹیکری اور چٹان کے دامن کے درمیان ایک دہانہ تھا جو جھاڑی نما درختوں میں چھپا ہوا تھا۔ یہ ایک غار کا دہانہ تھا۔ غار وسیع تھا۔ اس کے ایک طرف ایک سرنگ کا منہ کھلا ہوا تھا۔ یہ سرنگ ایک اور غار میں چلی جاتی تھی۔ وہاں قنوج کا خزانہ پڑا تھا مگر جہاں سرنگ ختم ہوتی تھی وہاں ایک گہرا گڑھا کھود دیا گیا تھا۔ اس میں سانپ پھینک دیئے گئے تھے۔ گڑھے کے اوپر سرکنڈے ڈال کر ان پر مٹی ڈال دی گئی تھی تاکہ کوئی آدمی خزانے کا سراغ پا لے اور وہ اندر جائے تو سرکنڈوں پر پاؤں رکھتے

ہی گڑھے میں جا پڑے جہاں زہریلے سانپ چھوڑ دیئے گئے تھے۔

اب جو قافلہ اس جگہ آیا، اس میں مہاراجہ قنوج تھا اور پنڈت بھی۔ بہت سے خچر اور گھوڑے تھے اور ان کے ساتھ دس بارہ ملازم تھے۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں قنوج کے محاصرے سے پہلے پنڈت چند آدمیوں کو اس حالت میں یہاں لایا تھا کہ ان کی آنکھوں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور وہ ایک رسّی پکڑے ہوئے آئے تھے۔ رسّی کا اگلا سرا پنڈت کے ہاتھ میں تھا۔ وہ خزانے کے کچھ بکس رکھنے آئے تھے۔ اس جگہ کو ملازموں سے بھی چھپا کر رکھا تھا۔

اب مہاراجہ اور پنڈت خزانہ نکالنے کے لیے آئے تو کسی بھی ملازم کی آنکھوں پر پٹی نہیں بندھی تھی۔ انہیں سرنگ میں داخل کرنے سے پہلے اُس گہرے گڑھے پر جس میں زہریلے سانپ چھوڑے ہوئے تھے، تختے رکھ دیئے گئے۔ پنڈت ان سے گزر کر اندرونی غار میں چلا گیا اور ملازموں کو بھی اندر بلا لیا گیا۔ وہ بکس باہر لا کر خچروں اور گھوڑوں پر لادنے لگے۔ یہ ایک ریاست کا خزانہ تھا جو مہاراجہ راجیا پال کے آباؤ اجداد سے جمع تھا اور بڑھتا ہی رہا تھا۔ منوں کے حساب سے سونا تھا، چاندی تھی، ہیرے جواہرات اور نقدی تھی۔ اسے باہر لانے کے لیے ملازموں کو کئی بار اندر جانا پڑا۔

جب آخری بکس بھی باہر آ گیا اور تمام بکس گھوڑوں اور خچروں پر لاد دیئے گئے تو پنڈت تمام آدمیوں کو غار میں لے گیا اور خود باہر آ گیا۔ وہ ابھی سرنگ ہی میں تھا۔ سانپوں والے گڑھے پر تین تختے رکھے گئے تھے۔ اُس نے بڑی تیزی سے تینوں تختے کھینچ لیے اور انہیں گھسیٹ کر باہر لے آیا۔

"چلو مہاراج!" پنڈت نے مہاراجہ راجیا پال سے کہا۔

"وہ سب کہاں ہیں؟" ___ راجیا پال نے پوچھا۔

"وہ اب کبھی باہر نہیں آ سکیں گے" ___ پنڈت نے جواب دیا ___ "انہیں اندر بھیج کر تختے کھینچ لایا ہوں۔ نکلنے والے آگے بڑھیں گے تو اُس گڑھے میں گریں گے جو میں نے زہریلے سانپوں سے بھر رکھا ہے۔ ایک دو گریں گے تو باقی آگے

نہیں آئیں گے۔ بھوکے پیاسے اندر ہی مر جائیں گے۔"

"کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ انہیں زیادہ انعام دے دیا جائے اور ان کی مرتے وقت کی بددعائیں نہ لی جائیں؟"

"مہاراج!" ___ پنڈت نے کہا ___ "جس طرح آپ نے اس خزانے کی خاطر اپنا مذہب، اپنا وقار اور اپنی قوم کو قربان کر دیا ہے اسی طرح ہر انسان اتنے زیادہ خزانے کی خاطر آپ کو، مجھے، آپ کی رانی اور بیٹے کو قتل کرنے کی سوچے گا۔ اتنے بڑے خزانے میں سے کوئی انسان تھوڑا سا نہیں لینا چاہتا۔ آپ نے اپنی رعایا کے ساتھ کونسی نیکی کی ہے؟ .... انسان جب تخت پر بیٹھتا اور سر پر تاج رکھتا ہے تو اُس کی نظریں رعایا سے ہٹ جاتی اور خزانے پر جم جاتی ہیں۔ وہ انسان سمجھتا نہیں، سوچتا نہیں کہ خزانے اور حکومت کا پیار اُسے اس حال تک پہنچا دیتا ہے جس میں آج آپ ہیں۔ آپ ڈرے ہوئے گیدڑ کی طرح چھپتے پھر رہے ہیں۔ اپنی رعایا کو جو آپ کی ہم مذہب ہے آپ نے اپنے دشمن کے حوالے کر دیا ہے۔"

"پنڈت جی مہاراج! آپ مجھے بار بار شرمسار نہ کریں" ___ مہاراجہ راجیا پال نے کہا ___ "میں کچھ کر کے دکھاؤں گا۔"

"میں اسی لیے آپ کے ساتھ ہوں کہ آپ کچھ کر کے دکھائیں" ___ پنڈت نے کہا ___ "آپ بھول گئے ہیں کہ قنوج کی گدی ہندو جاتی کی بہادری کی، علم و ہنر کی اور ہندوستان کے وقار کی علامت ہے۔ تمام راجے مہاراجے آپ کو اپنا سردار مانتے تھے۔ اب بھی مانتے ہیں۔ میں آپ کو اس جنگل سے نکالوں گا .... چلئے۔ یہاں رکنا بہت خطرناک ہے۔"

وہ چل پڑے۔ غار کے اندر سے آوازیں آ رہی تھیں جن آدمیوں کو اندر بند کر آئے تھے وہ پنڈت کو پکار رہے تھے۔ پنڈت اور راجیا پال دو گھوڑوں اور خچروں کو ایک دوسرے کے پیچھے باندھے دُور ہی دُور ہٹتے جا رہے تھے۔ آگے

ایسا جنگل اور ایسا دشوار گزار علاقہ تھا جہاں درندے اور جنگلی جانور ہو سکتے تھے، کسی انسان کا گزر ممکن نہیں تھا۔

"پنڈت جی!" — راجیا پال نے کہا — "آپ کی وفاداری نے میرا سر جھکا دیا ہے۔ میں آپ کو اتنا انعام دینا چاہتا ہوں جتنا آج تک کسی نے مجھ سے وصول نہیں کیا۔ اپنے منہ سے مانگو۔ کیا انعام دوں!"

"ایک انعام ہے جو آج تک کوئی مہاراجہ کسی وفادار کو نہیں دے سکا" — پنڈت نے کہا — "آپ دے سکتے ہیں۔"

"مانگو مہاراج! کہو کیا دوں؟"

"غزنی کے سلطان کا سر" — پنڈت نے کہا۔

مہاراجہ راجیا پال کی ہنسی نکل گئی۔

"یہ سر جسم سے الگ ہو جائے تو نہ صرف یہ کہ ہندوستان کو آئے دن کے حملوں سے نجات مل سکتی ہے، بلکہ اسلام کا پھیلاؤ ہمیشہ کے لیے رک سکتا ہے۔"

— پنڈت نے کہا — "یہ دھرتی ہمیشہ کے لیے پاک ہو سکتی ہے مگر مجھے نظر آ رہا ہے کہ ہماری آنے والی نسلیں بھی مسلمانوں کے خلاف لڑتی رہیں گی، کشت و خون ہوتا رہے گا لیکن اسلام اس ملک سے نہیں نکلے گا۔ ہمارے بعد آنے والوں میں عقل ہوئی تو وہ لڑنے مرنے کی بجائے مسلمانوں کو ختم کرنے کے کچھ اور طریقے اختیار کریں گے۔ اگر ہم مسلمانوں کو اپنی دھرتی ماتا سے نکال نہ سکیں تو یہی کافی ہو گا کہ ہم اسلام اور اس مذہب کے پیروکاروں کے خلاف اتنی نفرت پیدا کر دیں کہ کوئی ہندو اسلام قبول کرنا تو درکنار، مسلمان کے قریب سے گزرنے سے بھی سمجھے کہ ناپاک ہو گیا ہے۔"

"مہاراج!" — مہاراجہ راجیا پال نے کہا — "مجھے اپنے مذہب سے نفرت ہوتی جا رہی ہے۔ ہر ہر مہادیو اور ہری کرشن نے ہماری کیا مدد کی ہے؟ آپ ہمیں ہمیشہ دیوتاؤں کے قہر سے ڈراتے ہیں۔ کیا ان کے پاس صرف قہر ہے کرم نہیں؟ ہر بار اور ہر جگہ فتح مسلمانوں کی ہی کیوں ہوتی ہے؟ آپ کے مہادیو کا قہر مسلمانوں

پر کیوں نہیں گرتا؟"

"یہ دیوتاؤں کے بھید ہیں" — پنڈت نے کہا — "جب انسان دیوتاؤں کا حکم نہیں مانتا تو وہ اس کے دماغ میں خلل ڈال دیتے ہیں، پھر وہ ایسی ہی باتیں کرتا ہے جیسی آپ کر رہے ہیں۔"

گھوڑے چلے جا رہے تھے۔ دور بھیڑیوں کی چیخ و پکار اور لگڑ بگڑوں کی قہقہہ نما آوازیں اور کبھی کبھی کسی شیر کی دھاڑ سنائی دیتی تھی۔ گھوڑے دشوار گزار علاقے سے گزر رہے تھے۔

"میں نے مندروں کو ہیروں اور جواہرات سے سجایا ہے" — راجیا پال کہتا جا رہا تھا — "میں نے پنڈتوں، رشیوں اور سادھوؤں کی بہت خدمت کی ہے۔ آپ کے مندر کو اور اس میں رکھے ہوئے پتھر کے دیوتاؤں کو میں نے عطر سے نہلایا ہے ... میرا تخت کہاں ہے؟ میرا تاج کہاں ہے؟ قنوج کی وہ گدی کہاں ہے جس کے گن سارا ہندوستان گاتا تھا؟ مجھے کیا سوجھی کہ میں مسلمانوں کی فوج کے آنے سے پہلے ہی بھاگ اٹھا؟ مجھے کس نے اشارہ دیا تھا؟"

"خزانے کے پیار نے" — پنڈت نے کہا — "آپ خود دل چھوڑ بیٹھے۔"

سوال کا جواب نہیں دے سکتے ... میں خود اپنے سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔ پنڈت جی مہاراج! آپ مجھے آج تک نہیں سمجھا سکے کہ مذہب کیا ہے۔ میں یہی سمجھ سکا ہوں کہ کسی نگری کا راجہ مندر میں چلا جائے تو رعایا اسے اچھا سمجھنے لگتی ہے۔ آج تک یہی سمجھا ہوں کہ رعایا کو مذہب کے نام پر دھوکہ دیا جا سکتا ہے۔ اپنے دل میں مذہب کی محبت ہو یا نہ ہو، قنوج کی گدی کی سارا ہندوستان صرف اس لیے پوجا کرتا ہے کہ میرے باپ دادا آپ کے بتوں کو عطر سے نہلاتے رہے ہیں۔ میں نے اس رسم کو جاری رکھا لیکن میرے دل میں اپنے مذہب کی محبت کبھی بھی پیدا نہ ہو سکی۔"

"آپ گمراہ ہو گئے ہیں مہاراج!"

"ہاں!" — راجیا پال نے کہا — "میں گمراہ ہو گیا ہوں۔ کیا آپ کو یاد نہیں رہا کہ میں نے متھرا میں ہری کرشن کے قدموں میں بیٹھ کر کہا تھا کہ میرے سامنے

دیویوں دیوتاؤں کی بات نہ کرو! اتحاد پیدا کرو اور مل کر محمود کا مقابلہ کرو مگر ایسا نہ ہوا۔ سب نے شکست کھائی۔ میں نے سنا ہے کہ لاہور کے مہاراجوں نے انسانی جانوں کی قربانیاں بھی دی تھیں۔ نوجوان لڑکیوں کو قتل کر کے اُن کے خون سے دیوتاؤں کے پاؤں دھوئے تھے مگر انہیں شکست ہوئی۔

"میں آپ کو اپنے مذہب کا کرشمہ دکھاؤں گا"۔ پنڈت نے کہا۔

"میں نے کرشمے دیکھ لیے ہیں"۔ راجیا پال نے کہا۔ "مجھے یہ بتاؤ کہ مسلمانوں میں وہ کونسی طاقت ہے کہ اتنی دُور سے آتے ہیں۔ ان کی فوج تھوڑی ہوتی ہے۔ ان کو رسد نہیں مل سکتی مگر وہ ہمیں شکست دے جاتے ہیں .... آپ مجھے جواب نہیں دے سکتے۔ میں آپ کو بتاتا ہوں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ ایک بار ایک مسلمان جاسوس کو پکڑ لائے تھے۔ آپ بھی موجود تھے۔ ہم اُس سے پوچھتے تھے کہ اُس کے اور ساتھی کہاں کہاں ہیں اور یہ بھی کہ محمود کا اب ارادہ کیا ہے آپ کو یاد ہوگا کہ اُس نے کیا جواب دیا تھا"۔

"ہاں ہاں، یاد ہے"۔ پنڈت نے کہا۔ "اُس نے کہا تھا کہ میرے جسم کے ٹکڑے کر دو، میں کچھ نہیں بتاؤں گا"۔

"اور اُس نے کچھ نہیں بتایا تھا"۔ مہاراجہ راجیا پال نے کہا۔ "میں نے اُسے سونے کے ٹکڑے دکھائے تھے۔ وہ نہیں مانا تھا۔ میں نے راج محل کی سب سے زیادہ خوبصورت رقاصہ اُس کے حوالے کر دی تھی۔ وہ ہنس پڑا تھا اور اُس نے کہا تھا کہ میرے ایمان کو تم خرید نہیں سکتے۔ پھر آپ ایک پٹاری لے آئے تھے جس میں بڑا ہی زہریلا سانپ تھا۔ آپ نے اُسے کہا تھا کہ آپ اُسے اس سانپ کے ساتھ کال کوٹھڑی میں بند کر دیں گے۔ وہ اس سے بھی نہیں ڈرا تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ ایمان کو سانپ نہیں ڈس سکتا"۔

"ہاں مہاراج!"۔ پنڈت نے کہا۔ "مجھے یاد ہے۔ ہم نے اُسے تنگ سی کوٹھڑی میں بند کر کے اس میں سانپ چھوڑ دیا تھا مگر یہ آدمی سانپ کے زہر سے تڑپ تڑپ کر مر گیا تھا، اُس نے راز کی کوئی بات نہیں بتائی تھی"۔

"یہ ہے مسلمانوں کی قوت!"۔ مہاراجہ نے کہا۔ "یہ ایمان کیا ہے؟"

"اسے ہم دھرم کہتے ہیں"۔ پنڈت نے کہا۔ "یہ ہم میں بھی پیدا ہو سکتی ہے"۔

"باتیں۔ باتیں کھوکھلی اور بے جان باتیں"۔ مہاراجہ نے آہ لے کر کہا جیسے اُسے پنڈت کی باتوں کے ساتھ کوئی دلچسپی نہ ہو۔ "آپ کو مذہب سے ہٹ کر کوئی بات کرنی نہیں آتی یا آپ کو سانپوں کے ساتھ دلچسپی ہے۔ آپ سانپ پکڑنا اور پالنا جانتے ہیں"۔

جب یہ خزانہ اپنے پہلے ڈھکے چھپے ٹھکانے پر پہنچا تھا اُس وقت سلطان محمود بڑی احتیاط سے قنوج کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اُسے بتایا گیا تھا کہ اُس کا اصل اور بڑا ہی خونریز مقابلہ قنوج میں ہوگا۔ کوئی جاسوس اُسے یہ نہیں بتا سکا تھا کہ قنوج میں مقابلہ ہوگا ہی نہیں اور وہاں مہاراجہ برائے نام فوج چھوڑ کر اور اُس کے سالاروں کے خفیہ قتل کا انتظام کر کے غائب ہو چکا ہے۔ اس سلسلے کی ایک قسط میں سنایا جا چکا ہے کہ غزنی کے ایک جاسوس کی اسی پنڈت کے ساتھ اسی خزانے والے غار میں ملاقات ہو گئی تھی اور پنڈت نے یہ جان کر کہ یہ غزنی کا جاسوس ہے، اُسے یہ غلط اطلاع دے کر گمراہ کیا تھا کہ قنوج میں کئی فوجیں جمع ہیں جو غزنی کی فوج کو کچل کر رکھ دیں گی۔

جاسوس ضارع بردک نے اسی اطلاع کو مستند سمجھ کر سلطان محمود کو چوکنا کر دیا تھا۔ سلطان محتاط ہو کر اور قدم پھونک پھونک کر آگے بڑھتا رہا اور مہاراجہ راجیا پال قنوج سے نکل گیا۔ پنڈت دراصل وقت چاہتا تھا کہ وہ راجیا پال کو جم کر مقابلہ کرنے کے لیے روک لے لیکن راجیا پال منہ موڑ گیا۔ اگر سلطان محمود اپنی مخصوص رفتار سے پیشقدمی کرتا جسے صحیح معنوں میں برق رفتار پیشقدمی کہتے ہیں اور جس کے لیے غزنی کی فوج شہرت یافتہ تھی تو وہ راجیا پال کے فرار سے پہلے قنوج پہنچ جاتا مگر پنڈت کا دھوکہ کامیاب رہا۔

راجیا پال اور پنڈت نے خزانہ اپنے ٹھکانے پر پہنچا دیا۔ وہاں ایک قدرتی غار تھا جسے انہوں نے اور زیادہ لمبا کر لیا تھا۔ رات کو جب اتنے زیادہ جس

وہاں پہنچے تو محافظوں میں سے صرف چار پانچ کو اس اعتماد میں لیا گیا کہ اُن سے بکس اتروا کر غار میں رکھوائے جائیں۔

اس سے اگلی رات وہاں جشن منایا گیا۔ شراب کا ذخیرہ ساتھ تھا ناچنے اور گانے والیاں بھی تھیں۔ ان کے سازندے بھی تھے۔ رات کو مشعلیں جلا کر جنگل میں منگل بنا دیا گیا۔ مہاراجہ نے اپنے محافظوں کو خوب عیش کرائی اور انہیں نقد انعام بھی دیئے۔ اب اُس کی زندگی اور سلامتی کا دارومدار انہی چند ایک محافظوں پر تھا۔ انہیں وہ بہت بڑی قیمت دے کر بھی خوش رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس جشن میں دو افراد نہیں تھے۔ ایک تو پنڈت تھا اور دوسرے اُس کی رانی۔ مہاراجہ راجیاپال دونوں کی غیر حاضری کو محسوس نہیں کر رہا تھا۔ پنڈت اپنے خیمے میں عبادت میں مصروف تھا۔ اُس نے چھوٹے چھوٹے دو بُت اپنے ساتھ رکھے ہوئے تھے۔ عبادت کے بعد وہ کوئی مذہبی کتاب پڑھ رہا تھا کہ رانی خیمے میں آئی۔ وہ بوڑھی ہو گئی تھی۔ راجیاپال کو اس کے ساتھ اتنی سی دلچسپی رہ گئی تھی کہ وہ اُس کے جوان اور اپنے جانشین بیٹے کی ماں تھی۔ وہ پنڈت کے پاس بیٹھ گئی۔

"کیا آپ نے سمجھنے کی کوشش کی ہے کہ مہاراج کیا کر رہے ہیں اور ان کے ارادے کیا ہیں؟" — پنڈت نے رانی سے پوچھا "کیا یہ موقع خوشیاں منانے اور شراب پینے کا ہے؟"

"میں کچھ نہیں سمجھ سکی" — رانی نے جواب دیا "میری نگاہیں اب اپنے بیٹے پر لگی ہوئی ہیں۔ اس کا مستقبل تاریک ہو گیا ہے۔ ہمارے ہاتھ میں باری ہے جسے ہم قنوج کی طرح اپنی راجدھانی بنا سکتے ہیں۔ قنوج ہمیں واپس نہیں مل سکتا ... میرا خیال ہے کہ مہاراج پاگل ہو چکے ہیں۔ میں ان سے کوئی بات پوچھتی ہوں تو مجھے یوں ٹال دیتے ہیں جیسے راج کے ساتھ میرا کوئی تعلق ہی نہ ہو ... کیا آپ کچھ نہیں کر سکتے؟ کوئی ٹونہ، کوئی جادو کر دکھائیں۔ آپ کے ہاتھ میں بہت کچھ ہے۔"

"میں یہی سوچ رہا ہوں" — پنڈت نے کہا "مہاراج کے دماغ پر قابو پانے کی کوشش کروں گا .... میرا حساب بتا رہا ہے کہ ایک انسان کی قربانی دینی پڑے گی۔ ایک لڑکی کا خون بہانا پڑے گا۔"

"لڑکی کہاں سے آئے گی؟"

"میں نے دیکھ لی ہے" — پنڈت نے کہا "وہ ناچنے والی جو سب سے چھوٹی ہے ... سندیا!"

"کریں" — رانی نے کہا "آپ جب چاہیں اُسے قربانی کے لیے لے سکتے ہیں۔ وہ بہت خوبصورت ہے اور نوجوان بھی ہے۔ قربانی ایسی ہی لڑکی کی ہونی چاہیے۔"

باری دریائے گنگا سے دُور ایک قصبہ تھا جو قنوج سے تین دنوں کی مسافت پر تھا۔ یہ قنوج کی ریاست میں تھا۔ تمام مورخین نے لکھا ہے کہ مہاراجہ راجیاپال نے باری کو اپنا دارالحکومت بنا لیا تھا جہاں اُس نے اپنے بیٹے لچھمن پال کو بھیج دیا تھا۔ اُس نے باری کو قنوج کے پیمانے کا شہر بنانے کے لیے تعمیر شروع کرا دی تھی۔ اُس نے اپنی فوج قنوج کے محاصرے سے پہلے ہی باری بھیج دی تھی لیکن جنگل میں وہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ کیا کرے۔ سلطان محمود اُس پر آسیب کی طرح غالب آ گیا تھا۔ ایک مورخ سبطاکوزی نے یہاں تک لکھا ہے کہ مہاراجہ راجیاپال در پردہ اسلام قبول کرنے کا ارادہ کر چکا تھا۔

جنگل کی ایک رات تھی۔ مہاراجہ کو یہاں آئے ڈیڑھ دو مہینے گزر چکے تھے۔ پنڈت اپنے خیمے میں عبادت میں مصروف تھا۔ گھٹاؤں کی گرج سنائی دی اور ہوا تیز ہو گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد بجلی چمکی اور بڑی زور کا دھماکہ ہوا۔ اس کے بعد بجلی بار بار چمکنے اور کڑکنے لگی۔ جنگل دودھ کی مانند سفید روشنی سے روشن ہو جاتا تھا۔ اتنی زور کا مینہ برسنے لگا جیسے ژالہ باری ہو رہی ہو۔ اُس

وقت مہاراجہ راجپا پال اپنے خیمے میں نہیں بلکہ اُس غار میں تھا جس میں اُس نے ایک اور غار کھدوا کر خزانہ چھپا رکھا تھا۔ وہ اپنے خیمے کو جانے لگا تو بجلی اور بارش نے اُسے روک لیا۔

یہ ایک طوفانی بارش تھی۔ آسمان پھٹا جا رہا تھا۔ بجلی اتنی زور سے کڑکتی اور چمکتی تھی کہ دل دہل جاتے تھے۔ غار میں ایک مشعل جل رہی تھی۔ باہر گھوڑے ڈر کر ہنہنا رہے تھے۔ پنڈت غار کے منہ میں نمودار ہوا اور اندر چلا گیا۔ اُس نے مہاراجہ کو بتایا کہ وہ اُس کے خیمے میں گیا تھا۔ وہ اُسے نہ ملا تو اِدھر آ گیا۔ اُسے مہاراجہ کے متعلق فکر پیدا ہو گئی تھی۔ بارش اور تیز ہو گئی۔

ڈیڑھ ایک گھنٹے کے بعد باہر شور و غل بپا ہو گیا۔ گھوڑے بڑی زور سے ہنہنانے لگے۔ باہر بھگدڑ مچ گئی تھی۔ بارش کے شور کے ساتھ ایک اور شور سنائی دینے لگا اور اس کے ساتھ یہ گھبرائی ہوئی آوازیں — "پانی آ گیا .... سیلاب آ گیا .... خیمے اُکھاڑ دو۔"

مہاراجہ اور پنڈت نے غار کے دہانے میں سے دیکھا۔ بجلی چمکتی اور کڑکتی تھی تو انہیں سیلابی پانی غراتا دکھائی دیتا اور لوگ بھاگتے دوڑتے نظر آتے تھے۔ لکھمن پال دوڑتا غار میں آ گیا۔ یہ جگہ دو پہاڑیوں کے درمیان تھی۔ ان لوگوں کو معلوم نہیں تھا کہ یہاں سے اُوپر کے علاقے کا برساتی سیلاب گزرتا ہے۔ اب یہ سیلاب چڑھ رہا تھا۔ بارش اور تیز ہو گئی تھی۔ بجلی پہلے کی طرح کڑک رہی تھی اور اس کے ساتھ سیلاب غراتا ہوا گزر رہا تھا اور چڑھ بھی رہا تھا۔ مہاراجہ کے آدمی بلند جگہوں پر جا رہے تھے۔

پانی غار میں بھی آنے لگا۔ غار ذرا اونچا تھا اس لیے اندر تھوڑا پانی آ رہا تھا۔

"مہاراج!" — پنڈت نے راجپا پال سے کہا — "یہ ہر ہر مہادیو کا قہر ہے۔ سر جھکا لیں۔ معافی مانگیں۔ توبہ کریں۔ کیا آپ نے ایسی بارش کبھی دیکھی ہے؟"

مہاراجہ نے قہقہہ لگایا جیسے اُس کا دماغی توازن صحیح نہ رہا ہو۔ بولا —

"اب طوفان میرا کیا بگاڑ لیں گے۔ اب بجلیاں مجھے نہیں ڈرا سکتیں ... لے جاؤ میرا خزانہ۔"

پنڈت نے بارش اور سیلاب کے شور سے بلند آواز میں کہا — "مہاراج! آپ کو کیا ہو گیا ہے! باہر شیطان چیخ رہے ہیں۔ اس قہر کو سمجھیں۔ میں جو کہتا ہوں وہ کریں۔ ہاتھ جوڑیں۔ میں جو پڑھتا ہوں وہ آپ بھی پڑھتے جائیں۔"

مہاراجہ ایک بار پھر ہنسا۔ لکھمن پال جو جوان راجکمار اور جنگجو تھا، چہرے پر خوف کے آثار لیے اور ہاتھ جوڑے ہوئے کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ اُس کے منہ سے گھبرائی ہوئی آواز نکلی — "وہ دیکھو۔"

مہاراجہ اور پنڈت نے غار کے دہانے کی طرف دیکھا۔ ایک اژدہا جس کا سر انسان کے سر جتنا بڑا تھا، غار میں داخل ہو رہا تھا۔ لکھمن پال کے پاس تلوار تھی جو اُس نے نکال لی۔ اژدہا آہستہ آہستہ رینگتا آ رہا تھا۔ شاید سیلاب میں کہیں سے بہتا آیا تھا۔ ایسے اژدہا دلدل یا پانی میں رہتے ہیں۔ وہاں خوراک نہ ملے تو خشکی پر آ جاتے ہیں۔ یہ سالم انسان یا جانور کو نگل لیتے اور دو دو تین تین مہینے سوئے رہتے ہیں۔ ان کی لمبائی چھ سے بارہ فٹ تک ہوتی ہے۔ بعض اژدہا اس سے بھی لمبے ہو سکتے ہیں۔

یہ جو غار میں داخل ہو رہا تھا، نو دس فٹ لمبا تھا۔ لکھمن پال نے تلوار نکالی تو پنڈت نے اُسے آگے بڑھنے سے روک دیا۔ مہاراجہ اُٹھ کر پیچھے ہٹ گیا۔ پنڈت نے مشعل اُٹھائی اور آگے کر دی۔ اژدہا ابھی پورا غار میں نہیں آیا تھا۔ پنڈت کو معلوم تھا کہ اژدہا زہریلے نہیں ہوا کرتے نہ یہ ڈستے ہیں، بلکہ یہ شکار کو نگلا کرتے ہیں۔

"پنڈت جی مہاراج!" — مہاراجہ راجپا پال نے کہا — "آپ کو سانپوں کو پکڑ لینے اور قبضے میں رکھنے کی مہارت ہے۔ کیا آپ اس پر بھی قابو پا سکتے ہیں؟"

پنڈت نے نظریں اژدہا پر جمائے رکھیں اور مشعل کا شعلہ اُس کے اور

اپنے درمیان کیے رکھا۔ اُس نے کہا "اگر یہ دھرتی کا اژدہا ہُوا تو میں اسے قابو میں لے لوں گا لیکن مہاراج! یہ دیوتا ہے" — پنڈت نے انہیں کچھ بتا کر کہا "یہ پڑھتے رہیں۔ ہری کرشن آپ سے کوئی بہت بڑا کام کرانا چاہتے ہیں۔"

مہاراجہ اور اُس کے بیٹے لچھمن پال نے وہی پڑھنا شروع کر دیا جو پنڈت نے بتایا تھا۔ پنڈت نے مشعل کا ڈنڈہ پکڑے ہوئے شعلہ آگے کر رکھا تھا اس لیے اژدہا جو بہت آہستہ آہستہ اندر آرہا تھا کُنڈلی مارنے لگا اور رُک کر اکٹھا ہو گیا۔ وہ سر کو اٹھاتا اور اِدھر اُدھر دیکھتا تھا۔ پنڈت نے لچھمن پال سے کہا کہ اندر کے غار میں رسّہ ہوگا وہ لے آؤ۔

لچھمن پال نے تلاش کر کے رسّے کا ایک لمبا ٹکڑا پنڈت کے ہاتھ میں دے دیا۔ پنڈت نے مشعل لچھمن پال کو دے کر اُسے کہا کہ اژدہا کے آگے کیے رکھے۔ اُس نے رسّے کا پھندا بنا لیا۔ اژدہا اپنی آنکھوں کے آگے شعلے کی وجہ سے کچھ دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اُس نے ایک بار سر اُٹھایا تو پنڈت نے پھندا پھینکا جو اُس کے سر سے سرک کر گردن پر چلا گیا۔ پنڈت نے رسّہ کھینچا تو اژدھا کا مُنہ کھُل گیا اور اُس کا اتنا لمبا جسم تڑپنے لگا۔ پنڈت اُچھل کر اُس پر بیٹھ گیا اور رسّہ اس کے گرد اس طرح لپیٹ کر کس دیا کہ وہ بے بس ہو گیا۔

بارش کا زور گھٹنے لگا تھا۔ پنڈت نے مہاراجہ راجیا پال کو اژدہا سے بہت ڈرایا۔ مہاراجہ پر خاموشی طاری ہو گئی تھی۔ پنڈت نے اُسے کہا کہ وہ اب غار میں ہی آرام سے سو جائے۔

دوسرے دن مہاراجہ کی آنکھ اُس وقت کھُلی جب سورج بہت اُوپر آگیا تھا۔ اُس نے غار سے دیکھا۔ وہاں نہ پنڈت تھا نہ اژدھا۔ لچھمن پال بھی نہیں تھا۔ وہ باہر نکلا۔ باہر کی دنیا بدل ہُوئی تھی۔ سیلاب گزر گیا تھا۔ بچے کھڑے کیے

جا رہے تھے۔ مہاراجہ نے کسی سے کہا کہ پنڈت کو بُلا لائے۔

پنڈت آیا تو مہاراجہ نے اُس سے پوچھا "رات اژدہا کو مار دیا گیا تھا؟"

"وہ اژدہا نہیں دیوتا تھا" — پنڈت نے کہا "وہ آپ کو وہی بات کہنے آیا تھا جو میں ایک عرصے سے آپ کو کہہ رہا ہُوں۔ میں بھی اسے اژدہا ہی سمجھا تھا۔ کوئی انسان اتنے بڑے اژدہا پر قابو نہیں پا سکتا۔ مجھے اشارہ ملا تو میں نے اسے رسّے سے قابو کر لیا۔ آپ سو گئے پھر رات گہری ہو کر چلا گیا تو اژدہا نے مجھے اپنا آپ دکھایا۔ میں اس کے ساتھ باہر نکل گیا۔ اُس نے کہا کہ مندروں کی تباہی اور ہماری توہین کا انتقام لو۔ ہماری روحوں کو بہت تکلیف پہنچ رہی ہے۔ ہم جب آتے ہیں تو بجلیاں چمک چمک کر ہمارا راستہ روشن کرتی ہیں اور بارش ہمارا راستہ دھو ڈالتی ہے۔ ہم اپنی بجلیاں اِن پر بھی گرا سکتے ہیں جنہوں نے ہماری روحوں کو تکلیف دی ہے لیکن ہم انہیں باز آجانے کا موقع دے رہے ہیں ... دیوتا نے مجھے کہا کہ اپنے راجہ سے کہو کہ اپنی راجدھانی میں مسلمانوں کی اذانیں بند کردو۔ یہ آوازیں ہمیں چین نہیں لینے دیتیں۔"

"دیوتا کہاں چلے گئے ہیں؟" — مہاراجہ قنوج نے پوچھا "کہاں گئے ہیں؟"

"جہاں سے آئے تھے" — پنڈت نے کہا "میں نے ان کے قدموں میں سر رکھ کر معافی مانگی ہے۔ آپ کی طرف سے بھی ہاتھ جوڑے تھے مگر وہ سخت ناراض تھے۔ کہتے تھے کہ ان کی بجلیاں ان پہاڑوں کو جڑوں سے اکھاڑنے آئی تھیں۔ ہم سب کو جلا کر بھسم کرنے آئی تھیں۔ دیوتا کہتے تھے کہ مہاراجہ کا خزانہ دفن کر دیں گے ... میں نے بڑی مشکل سے انہیں راضی کیا۔ انہوں نے کہا ہے کہ ایک لڑکی (رقاصہ) کی قربانی دو۔ ان کے اشارے پر میں نے رقاصہ کا انتخاب کر لیا ہے۔"

"کون ہے وہ؟"

"نندیا۔"

"نہیں" — مہاراجہ راجیا پال نے کہا "پنڈت جی مہاراج! ہم نندیا کی

قربانی نہیں دوں گا۔"

"آپ غزنی کے سلطان کا مقابلہ نہیں کر سکے" ۔۔۔ رانی نے خشمگیں لہجے میں کہا ۔۔۔ "کیا آپ دیوتاؤں کا مقابلہ کر سکتے ہیں؟ .... نندیا کی قربانی دی جائے گی۔"

"تم چپ رہو" ۔۔۔ مہاراجہ نے گرج کر کہا۔

"پتی دیوتا نہیں ہو سکتا" ۔۔۔ رانی نے آنکھیں پھاڑ کر کہا ۔۔۔ "دیوتا پتی ہو سکتا ہے۔ مجھے دیوتاؤں کا حکم ماننا ہے، آپ کا نہیں۔"

"پتا مہاراج!" ۔۔۔ راجیاپال کے بیٹے نے جو قریب ہی کھڑا تھا، کہا ۔۔۔ "مجھے تلوار کا دھنی آپ ہی نے بنایا تھا۔ مجھے مجبور نہ کریں کہ ایک بیٹے کی تلوار اپنے باپ کا سر تن سے جدا کر دے۔ کوئی سپوت اپنا وطن اور اپنا مذہب اپنے باپ پر قربان نہیں کر سکتا۔ پنڈت جی مہاراج جو کہتے ہیں وہی ہوگا..... پتا مہاراج! مجھے معلوم ہے کہ آپ نے اپنا دھرم چھوڑ نہیں دیا لیکن آپ نے غزنی کے سلطان کو اپنے دماغ پر اور اپنے دل پر سوار کر لیا ہے۔"

مہاراجہ راجیاپال نے جب اپنی رانی اور اپنے بیٹے کا رویہ دیکھا تو وہ دب گیا۔ وہ کچھ بھی نہ بولا۔ اس نے پنڈت سے یہ پوچھنے کی بھی جرأت نہ کی کہ دیوتاؤں نے صرف اسی کو تباہ کرنے کا تہیہ کیوں کر رکھا ہے۔ متھرا قنوج سے زیادہ مقدس جگہ تھی۔ وہاں کرشن مہاراج نے جنم لیا تھا۔ تھانیسر کا مندر بھی ہندوؤں کی بہت بڑی عبادت گاہ تھی۔ وہاں گھنٹیوں، سنکھوں اور بھجنوں کی بجائے اذانیں گونج رہی ہیں۔ دیوتاؤں نے وہاں کے راجوں مہاراجوں کو اژدہا بن کر نہیں ڈرایا تھا۔

مہاراجہ نے دیکھا کہ اس کی رانی اور اس کے بیٹے پر دیوتاؤں کا خوف طاری ہو گیا ہے تو وہ کچھ کہے بغیر اس غار میں چلا گیا جس میں اس نے خزانہ رکھوایا تھا۔

"یہ ہے ہندوؤں کا مذہب" ۔۔۔ قنوج کے بڑے مندر کے سامنے ایک

آواز گرج رہی تھی۔

یہ آواز اس خطیب کی تھی جو غزنی سے سلطان محمود غزنوی کے ساتھ آیا تھا۔ غزنی کی فوج کے ساتھ چند ایک امام بھی ہوا کرتے تھے۔ جتنی فوج ایک جگہ اکٹھی ہو وہ نماز باجماعت پڑھا کرتی تھی۔ فرصت کے وقت امام اپنے اپنے دستوں کا ایمان اور حوصلہ برقرار رکھنے کے لیے وعظ سنایا کرتے تھے۔

غزنی کا خطیب قنوج کے بڑے مندر کے چبوترے پر کھڑا تھا۔ اس کے اردگرد ٹوٹے ہوئے بتوں کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے سامنے غزنی کی فوج کھڑی تھی۔ اس کے پیچھے قنوج کے جنگی قیدی کھڑے تھے۔

"یہ ہے ہندوؤں کا مذہب" ۔۔۔ وہ بلند آواز سے کہہ رہا تھا ۔۔۔ "دیکھ لو ان کے خداؤں کے ٹکڑے تمہارے قدموں میں پڑے ہیں۔ خدا ایک ہے۔ وحدہٗ لاشریک ہے۔ تم یہاں کوئی ملک فتح کرنے کے لیے اور یہاں لوٹ مار کرنے کے لیے نہیں آئے۔ تم یہاں ایک باطل مذہب کی بیخ کنی کے لیے آئے ہو۔ تم سوال پوچھنا چاہو گے کہ ہم نے ہندوستان کا انتخاب کیوں کیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ سرزمینِ عرب کا ایک مجاہد محمد بن قاسم ایک مسلمان لڑکی کی پکار پر یہاں آیا تھا۔ اس نے یہاں ایک بڑے جابر اور ظالم راجہ کو شکست دی لیکن یہ نوجوان قہر اور دہشت بن کر نہیں آیا تھا۔ اس نے ثابت کر دیا کہ مسلمان کی تلوار چٹانوں کو کاٹ سکتی ہے اور مسلمان کا حسنِ سلوک پتھر کو موم کر سکتا ہے.... محمد بن قاسم نے یہاں کے پتھروں کو موم کر دیا اور یہاں کے بت اپنے آپ ٹوٹنے لگے۔ ہندو جوق در جوق اسلام قبول کرنے لگے۔ شمال مغربی ہندوستان اللہ اور رسولؐ کے نور سے منور ہو گیا اور یہ مقدس روشنی سارے ہندوستان میں پھیلنے لگی مگر حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ مجاہد کو مجرم بنا دیا گیا۔ محمد بن قاسم ایک ناہنجار خلیفہ کے قہر کا نشانہ بن گیا۔ ہندوستان سے وہ گیا تو ہندوؤں کے باطل مذہب نے پھر سر اٹھایا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مسجدیں مندر بنتی چلی گئیں اور ہندو نے ریاکاری اور دہشت گردی سے مسلمانوں کا جینا حرام کر دیا....

"غزنی کے مجاہدو! تم صرف غزنی کے پرچم کے نہیں اسلام کے علمبردار ہو۔ یہ خطہ جو دارالاسلام بن گیا تھا بُت خانہ بن گیا۔ حق پر باطل غالب آنے لگا۔ اس باطل کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ یہ قوم جو ہندو کہلاتی ہے، سانپوں کی نسل سے ہے۔ اس کی خصلتیں زہریلے سانپوں سے ملتی ہیں اور یہ قوم سانپوں کی پجاری ہے۔ اس کے ہاں خدائے وحدہٗ لاشریک کا کوئی تصور نہیں جیسے دریائے گنگا اور جمنا کو تم نے روندا ہے اور اسے بارہا عبور کیا ہے، انہیں بھی ہندو اپنے دیوتا کہتے ہیں۔ ان دریاؤں کے غلیظ پانی کو مقدس سمجھتے ہیں اور اس کی عبادت کرتے ہیں۔ اس میں نہا کر کہتے ہیں کہ گناہ دُھل گئے ہیں۔ بجلی چمکتی اور کڑکتی ہے تو اسے دیوتاؤں کا قہر کہتے ہیں اور مندروں کی گھنٹیاں بجنے لگتی ہیں۔ اژدہا کو دیکھ لیں تو اسے دیوتا کہتے اور اس کی پوجا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ درندے معصوم بچوں اور نوجوان لڑکیوں کی قربانی دیتے اور ان کے خون سے ان بُتوں کے پاؤں دھوتے ہیں۔ کیا انسانی عقل اس درندگی کو نیکی کہہ سکتی ہے؟ اسے تم عبادت کہہ سکتے ہو؟ ....

"اسلام کے پاسبانو! تم یہاں پنڈتوں کی اس ریاکاری کا قلع قمع کرنے آئے ہو۔ اگر تم نے اس مذہب کو جڑوں سے نہ اکھاڑ پھینکا تو یہ زمین ہمیشہ کے لیے مسلمانوں کے خون کی پیاسی رہے گی۔ یہ قوم جو چند ایک توہمات کو اور اپنے بے بنیاد عقیدوں اور رسموں کو مذہب کہتی ہے مسلمانوں کی جڑیں کھوکھلی کرتی رہے گی۔ یہ کوئی مذہب نہیں۔ ان لوگوں کے پنڈتوں نے ان پر خوف طاری کر کے اپنی فریب کاری کو مذہب کا نام دے رکھا ہے۔ اگر ان کا مذہب سچا ہے تو ان کے ان خداؤں سے جو تمہارے قدموں میں پڑے ہیں، کہو کہ ہم سے اپنی توہین کا انتقام لیں۔ رات جو گزر گئی ہے بجلی کے دھماکوں سے کانپ رہی تھی کیا تم اطمینان کی نیند نہیں سوئے رہے! کیا گذشتہ رات کی طوفانی بارش نے تمہیں ذرا سا بھی پریشان کیا تھا؟ ... نہیں بجلیاں اور طوفان کسی مسلمان کو نہیں ڈرا سکے۔ مگر تم رات کو ہندوؤں کو دیکھتے۔ وہ ساری رات ہاتھ جوڑ کر خوف سے

کانپتے ہری رام ہری کرشن کا ورد کرتے رہے تھے .... حق و صداقت اور ایمان تمہاری قوت ہے۔ اس کے سامنے کوئی قلعہ کھڑا نہیں رہ سکتا۔ تمہارے خون کے جو قطرے اس زمین پر گریں گے وہ گُل و لالہ کی صورت میں کھلیں گے اور یہ زمین اللہ کے نور سے گلرنگ ہو جائے گی۔"

قنوج کی فتح کا دھماکہ ڈیڑھ سو میل دُور کالنجر میں اور اتنی ہی دور گوالیار میں بھی سنائی دیا۔ قنوج سے بھاگے ہوئے کچھ لوگ کالنجر جا پہنچے اور وہاں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ قنوج پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا ہے اور وہاں کا مہاراجہ لاپتہ ہے۔ کالنجر کا راجہ گنڈہ ایک مدت سے یہی ایک خبر سن رہا تھا کہ غزنی کے مسلمانوں نے حملہ کیا ہے اور فلاں راجہ بھاگ گیا ہے یا اس نے ہتھیار ڈال کر سلطان محمود کی اطاعت قبول کر لی ہے اور وہ غزنی کا باجگزار ہو گیا ہے۔ راجہ گنڈہ سلطان محمود کی پیشقدمی پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ اب سلطان اُس کے دروازے پر آن پہنچا تھا۔ ڈیڑھ سو میل کوئی فاصلہ نہیں تھا۔

راجہ گنڈہ نے اُسی وقت گوالیار کو روانگی کا حکم دے دیا۔

وہ جب گوالیار پہنچا تو اُسے پتہ چلا کہ راجہ ارجن کو قنوج کے سقوط کی اطلاع مل چکی ہے۔ وہ پریشان بھی تھا اور بھڑکا ہوا بھی مگر وہ یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھا کہ مہاراجہ قنوج بھاگ گیا ہے، حالانکہ بتانے والوں نے یہی بتایا تھا کہ جب قنوج کا محاصرہ ہوا تو قلعے میں فوج بہت تھوڑی تھی اور مہاراجے کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ کوئی مقابلہ بھی نہ ہوا مسلمان شہر میں داخل ہوئے اور شہر اور مندروں کی تباہی شروع ہو گئی۔

کالنجر اور گوالیار کے مہاراجوں نے مل کر مشترکہ منصوبہ بنایا کہ سلطان محمود پر جاسوسوں کے ذریعے نظر رکھی جائے کہ وہ آگے بڑھتا ہے یا قنوج میں رہتا ہے یا واپس چلا جاتا ہے۔ اگر وہ قنوج میں رُکتا ہے تو اُس پر دہیں حملہ کیا جائے اور اس حملے میں لاہور کے راجہ بھیم پال نڈر کی فوج کو بھی شامل کیا جائے۔

مہاراجہ کالنجر ابھی گوالیار میں ہی تھا کہ قنوج کے راج دربار کا ایک اعلیٰ رتبے کا آدمی کالنجر کے راستے گوالیار پہنچا۔ کالنجر میں اُسے بتایا گیا تھا کہ مہاراجہ گنڈہ گوالیار میں ہے۔ اس آدمی نے دونوں مہاراجوں کو بتایا کہ مہاراجہ قنوج محاصرے سے پہلے ہی کہیں غائب ہو گیا تھا۔ غزنی کا سلطان محمود آیا تو اُس نے خزانہ کھلوایا۔ خزانہ بالکل خالی تھا۔ مہاراجہ کے گھر کے ہیرے جواہرات اور زیورات وغیرہ بھی غائب تھے۔ قلعے میں فوج بھی پوری نہیں تھی۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ مہاراجہ راجیاپال دشمن کو دیکھے بغیر غائب ہو گیا تھا" — مہاراجہ گنڈہ نے کہا۔ "اور وہ فوج کو بھی ساتھ لے گیا تھا"

"کیا ہندو جاتی اس کا یہ گناہ معاف کر دے گی؟" — راجہ ارجن نے غضبناک آواز میں کہا۔ "کیا یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ گیا کہاں ہے؟"

"یہ معلوم نہیں ہو سکا" — اس آدمی نے جواب دیا۔ "اور دوسری خبر یہ ہے کہ سلطان محمود غزنی چلا گیا ہے"

"اور اُس کی فوج؟"

"کچھ ساتھ لے گیا ہے، کچھ قنوج میں چھوڑ گیا ہے"

"کہیں ایسا تو نہیں کہ مہاراجہ راجیاپال نے سلطان محمود کے ساتھ کوئی خفیہ معاہدہ کر لیا ہو؟" — راجہ ارجن نے پوچھا — "اور سلطان کو خوش کرنے کے لیے اپنی فوج جسے وہ اپنے ساتھ لے گیا ہے، ضرورت کے وقت سلطان کو دے دے؟"

"ہمیں سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا پڑے گا" — مہاراجہ گنڈہ نے کہا۔ "راجیاپال کو ہم سارے ہندوستان کی عزت کا رکھوالا سمجھتے تھے مگر وہ بزدل نکلا۔ متھرا، مہابن، بلند شہر اور منج کی فوجیں ختم ہو چکی ہیں۔ لاہور کے راجہ بھیم پال ندر پر نظر اٹھتی ہے مگر وہ غزنی والوں کا باجگزار ہے۔ وہ ہمارا ساتھ نہیں دے گا"

"مگر ہم یہاں بیٹھے تماشہ تو نہیں دیکھ سکتے" — راجہ ارجن نے کہا — "اپنے دیس اور اپنے مذہب کی خاطر ہمیں اپنا سب کچھ داؤ پر لگانا ہو گا۔ مسلمانوں کو ہم اتنی آسانی سے ہندوستان کی حکمرانی نہیں لینے دیں گے۔ مسلمانوں کی حکمرانی کا مطلب یہ ہو گا کہ صرف ہمیں ہی نہیں، ہمارے مذہب کو بھی ختم کر دیا جائے گا"

مؤرخین نے جن میں گردیزی، ابن الاثیر، سمتھ اور فرشتہ قابلِ ذکر ہیں، لکھا ہے کہ کالنجر اور گوالیار کے مہاراجوں نے سلطان محمود کے خلاف متحدہ محاذ بنا لیا اور ان کے درمیان طے پایا کہ معلوم کیا جائے کہ مہاراجہ قنوج کہاں ہے اور راجہ بھیم پال ندر کے ہاں ایلچی بھیجا جائے کہ وہ سلطان محمود کے خلاف لڑنے کے لیے تیار ہو جائے تاکہ اُسے فیصلہ کن شکست دی جا سکے۔

سلطان محمود غزنی چلا گیا اور قنوج کا قلعہ اپنے ایک سالار ابوالقدر کے حوالے کر گیا تھا۔ غزنی کی تاریخ میں دو سالاروں کو زیادہ شہرت ملی ہے۔ ایک ابوعبداللہ بن محمد الطائی تھا اور دوسرا ارسلان جاذب۔ ابوالقدر کا ذکر بہت کم آیا ہے لیکن قنوج میں اُس نے ایسے دفاعی انتظامات کئے اور انتظامیہ کا ایسا ڈھانچہ بنایا کہ قنوج کو اس نے محفوظ کر دیا تھا۔

مہاراجہ قنوج کا سراغ لگانا ممکن نہیں تھا۔ اُسے پنڈت نے ازدہا سے ڈرا دیا تھا اور اُس پر اس لیے بھی خاموشی طاری ہو گئی تھی کہ اُس کی پسندیدہ رقاصہ کو انسانی قربانی کے لیے منتخب کر لیا گیا تھا۔ اُس کا بیٹا لکھمن پال اُس کے پاس غار میں جا بیٹھا اور کہنے لگا کہ اُسے باری کو راجدھانی بنانے کی اجازت دی جائے۔ وہاں وہ تیاری کر کے سلطان محمود کو قنوج سے نکالے گا اور شکست کا انتقام لے گا۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ وہ لاہور، کالنجر اور گوالیار کے مہاراجوں کو بھی اپنے ساتھ ملا لے گا۔

"کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ سلطان محمود تمہیں نئی راجدھانی آباد کرنے دے گا؟" — راجیاپال نے کہا — "اُس کے جاسوس دُور دُور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اُسے جونہی پتہ چلا کہ ہم باری میں اپنی فوج تیار کر رہے ہیں، وہ ہم پر ٹوٹ پڑے گا"

"تو کیا ہم جنگلوں میں چھپے رہیں گے؟" — کھمن پال نے پوچھا۔

"میں نے ایک محفوظ طریقہ سوچا ہے" — راجیا پال نے کہا۔ "میں قنوج سلطان محمود کے پاس چلا جاتا ہوں۔ اُسے اس پر راضی کر لوں گا کہ مجھ سے تاوان لے لے اور میں اس کا باجگزار بھی رہوں گا اور وہ مجھے باری کو راجدھانی بنانے اور فوج تیار کرنے کی اجازت دے دے۔ میں اس کے ساتھ معاہدہ کروں گا کہ اس کے خلاف کبھی نہیں لڑوں گا اور اسے بوقتِ ضرورت فوج بھی دوں گا۔"

"نہیں" — کھمن پال نے کہا — "آپ کا جانا ٹھیک نہیں۔ آپ اس پہلو پر غور کریں کہ سلطان محمود آپ سے خزانہ مانگے گا۔ اگر آپ نہیں دیں گے تو آپ کو قتل کرا دے گا.... اگر ایسا نہ ہوا تو بھی میں آپ کو نہیں جانے دوں گا کیونکہ ہم میں سے کسی کو آپ پر بھروسہ نہیں۔ آپ کے دماغ پر غزنی کا سلطان اتنا زیادہ سوار ہو گیا ہے کہ آپ اپنے مذہب سے کلی منحرف ہو گئے ہیں۔"

"تو کیا میں تم سب کا قیدی ہو گیا ہوں؟" — مہاراجہ نے پوچھا۔

"پنڈت جی مہاراج کہتے ہیں کہ آپ پر کسی شیطانی روح کا سایہ پڑ گیا ہے" — اُس کے بیٹے کھمن پال نے کہا — "یہ سایہ کسی لڑکی کی جان کی قربانی سے ہٹ جائے گا۔ پنڈت جی مہاراج کہتے ہیں کہ بھگوان جب کسی پر قہر برسانے پر آتے ہیں تو اُسے سب سے پہلے اپنے مذہب سے گمراہ کرتے ہیں۔"

"مذہب.... مذہب.... مذہب" — راجیا پال نے طنزیہ کہا۔ "میں مذہب سے تنگ آ گیا ہوں۔ میں کسی کا قیدی نہیں۔ تم جاؤ۔ باری چلے جاؤ۔ راجدھانی آباد کرو۔ میں تمہارا باپ ہوں۔ تم میرے جانشین ہو۔ میں تمہاری حفاظت کے لیے جو بہتر سمجھوں گا کروں گا۔"

پنڈت نے اپنا خیمہ اب دُور نصب کرایا تھا۔ مہاراجہ کی طرح اس کا خیمہ تین خیموں پر مشتمل تھا۔ ایک کو اُس نے عبادت گاہ بنا رکھا تھا۔ اس کے خیمے میں کوئی نہیں جا سکتا تھا۔ اُس نے جب رقاصہ سُندیا کو اپنے ہاں بلایا تو وہ حیران

ہوئی کہ پنڈت نے اُسے کیوں بلایا ہے۔ وہ کسی رقاصہ کے ساتھ بات تک نہیں کیا کرتا تھا۔ سُندیا اُس کے خیمے میں چلی گئی۔

"سُندیا!" — پنڈت نے کہا۔ "تم پاپ کی جیتی جاگتی مورتی ہو۔ تم مر جاؤ گی تو لومڑی یا گیدڑی کے روپ میں دوسرا جنم لو گی۔ تمہارا وہ جنم دکھوں سے بھرا ہوگا۔ تمہاری روح بھٹکتی اور روتی رہے گی۔ تم پہلے جنم کو یاد کر کر کے بہت اذیت اٹھاؤ گی، لیکن ہر ہر مہادیو تم پر معلوم نہیں کیوں مہربان ہو گئے ہیں۔ انہوں نے تمہیں اپنی بیٹی بنانے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ دیوتا کی خواہش حکم ہوتا ہے سُندیا! تم اس جیون کو نہیں چھوڑنا چاہو گی لیکن تم خوش ہو جاؤ کہ تم آکاش کی رانی بنو گی۔"

"وہ کس طرح مہاراج؟"

"ہم تمہیں دیوتا کے قدموں میں قربان کر رہے ہیں" — پنڈت نے کہا — "چاند کی بارھویں رات دیوتا تمہیں لینے آئیں گے۔ تمہارا خون اس زمین پر بہہ جائے گا کیونکہ یہ خون پاک نہیں۔"

"میں سمجھ گئی ہوں مہاراج!" — سُندیا نے گھبرا کر کہا۔ "آپ میری گردن کاٹ دیں گے.... نہیں نہیں مہاراج! میں یہ موت نہیں مرنا چاہتی۔"

"تمہیں مرنا ہوگا سُندیا!" — پنڈت نے کہا — "اپنے مذہب اور اپنے مہاراجہ کی خاطر تمہیں جان دینی ہوگی۔"

نوجوان رقاصہ نے بھاگ جانے کے لیے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پنڈت نے اُسے تسلی دلاسہ دیا اور کہا — "تم دیوتاؤں کی خواہش کو ٹھکراؤ گی تو تمہارا یہ حسین چہرہ جھریوں سے بھر جائے گا۔ آنکھیں سفید ہو جائیں گی اور کمر جھک جائے گی۔ تم مہاراجہ کے قابل نہیں رہو گی۔ وہ تمہیں جنگل میں چھوڑ آئیں گے.... دیوتا آ گئے ہیں۔ آؤ تمہیں دکھاؤں۔"

وہ اُسے دوسرے کمرے میں لے گیا جو خیمہ ہی تھا۔ اُس نے ایک جگہ خشک گھاس ڈال رکھی تھی۔ لکڑی سے گھاس ہٹائی تو ایک گڑھا نظر آیا۔ پنڈت

نے نندیا کو آگے کر کے گڑھا دکھایا۔ اس میں ایک اژدہا کنڈلی مارے ہوئے تھا۔ اس پر ریشم لپٹا ہوا تھا۔ نندیا کی دبی دبی سی چیخ نکل گئی۔

"یہ ہیں دیوتا جو ہمارے مہمان ہیں"۔

"کیا آپ مجھے اس گڑھے میں پھینک دیں گے؟" — نندیا نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

پنڈت نے ایک پھول رقاصہ کی ناک سے لگا دیا اور کہا کہ اسے سونگھو۔ یہ مہادیو کا تحفہ ہے۔ رقاصہ نے پھول سونگھا اور اس پر غنودگی طاری ہو گئی۔ ذرا سی دیر بعد وہ ڈولنے لگی۔ پنڈت نے اسے تھام لیا اور دوسرے خیمے میں جا کر لٹا دیا، پھر اس نے جا کر اژدہا پر گھاس بکھیر کر اسے چھپا دیا۔

دو تین راتیں گذر گئیں۔ رات کے اندھیرے میں کوئی آدمی سایہ بن کر بے پاؤں خیموں کے ساتھ ساتھ چلتا اور رکتا تھا۔ ایک رات وہ پنڈت کے خیمے کے ساتھ جا کھڑا ہوا اور بیٹھ کر کان خیمے کے ساتھ لگا دیئے۔ وہ خیمے کے اردگرد رینگتا رہا اور رینگتا ہوا پرے چلا گیا۔ اگلی رات وہ مہاراجہ کے خیموں کے قریب چلا گیا۔ للکار سنائی دی — "کون ہے" — یہ سایہ سا وہیں سے غائب ہو گیا۔ اندھیرے میں سنسناتا ہوا ایک تیر آیا جو اس کے قریب سے گذر کر زمین میں جا لگا۔ وہ جنگلی بلوں کی طرح جھاڑیوں میں چلا گیا جہاں سے گیدڑ کی آوازیں سنائی دیں۔ محافظوں نے کہا — "گیدڑ ہے" — انہوں نے تلاش ترک کر دی۔

چند روز بعد مہاراجہ راجیا پال نے دو آدمی بلائے۔ دونوں اعلیٰ حکام تھے اور اس کے معتمد۔ انہوں نے ہر حال میں مہاراجہ کا ساتھ دیا تھا۔ اب بھی انہوں نے اسے یقین دلایا تھا کہ ہر مصیبت میں اور اس کے ہر فیصلے میں اس کا ساتھ دیں گے۔ اس نے انہیں کہا کہ وہ قنوج جا کر سلطان محمود کی اطاعت قبول کرنے کا فیصلہ کر چکا ہے کیونکہ اس کے بغیر وہ اپنا مستقبل نہیں بنا سکتا۔ مہاراجہ باجگزار بن کر باری کو آباد کرنا چاہتا تھا لیکن پنڈت اس کی رانی

اور اس کا بیٹا اس فیصلے کے سخت خلاف تھے۔

مہاراجہ نے اپنا شاہانہ لباس اتار کر بالکل معمولی سے کپڑے پہن لیے۔ ایسا ہی لباس اپنے دونوں ساتھیوں کو پہنایا۔ سر اور چہرے پر گرد ڈال لی۔ وہ تینوں جب یہ بھیس بدل رہے تھے، اس وقت پنڈت اس کے خیمے میں آیا لیکن اسے کوئی دیکھ نہ سکا۔ اس نے تینوں کو بھیس بدلتے دیکھا تو اسے شک ہوا۔ وہ وہیں سے واپس چلا گیا۔ مہاراجہ کا خیمہ سب سے الگ تھلگ اور دور ہٹا ہوا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اسے کسی نے نہیں دیکھا۔

وہ تینوں گھوڑوں پر سوار ہوئے اور دوسری طرف جدھر ویرانہ تھا، نکل گئے۔ قنوج کی طرف جانے کے لیے جنگل میں سے نکلنے کا ایک ہی راستہ تھا جو چٹانوں کے درمیان سے گذرتا تھا۔ وہاں گھنے پودے اور درخت تھے۔ تینوں سوار ایک چٹان کی اوٹ میں جا کر خیمہ گاہ سے اوجھل ہو گئے اور اطمینان سے چلنے لگے۔ وہ جب دو چٹانوں کے درمیان سے گذر رہے تھے تو مہاراجہ کا گھوڑا جو آگے جا رہا تھا، رک گیا اور آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا۔ اس کا جسم کانپ رہا تھا۔ مہاراجہ کے ایک ساتھی نے کہا کہ گھوڑے نے سانپ دیکھ لیا ہے۔ اتنے میں دوسرے دو گھوڑے بھی رک کر کانپنے لگے۔ گھوڑا اگر سانپ کو دیکھ لے تو بے لگام ہو کر بھاگ اٹھتا ہے یا ایک جگہ رک کر کانپنے لگتا ہے۔

جھاڑیوں میں سے ایک گرجدار اور بھاری سی آواز سنائی دی — "واپس جاؤ۔ دل کے ارادے دل میں مار دو۔ واپس جاؤ۔ جہاں جا رہے ہو وہاں ذلت کی موت ہے" — یہ آواز رک رک کر آتی تھی اور اس کے ساتھ دھیمی سی آواز میں گھنٹیاں بجتی تھیں۔ ان کے بجنے کا خاص انداز تھا جس سے ہر ہندو واقف تھا۔ ایسی گھنٹیاں مندروں میں بجا کرتی ہیں۔

"یہ آواز کسی انسان کی معلوم نہیں ہوتی" — مہاراجہ کے ایک ساتھی نے کہا۔

اچانک ایک گھنے پودے میں سے ایک اژدہا کا سر نظر آیا۔ اژدہا آہستہ آہستہ باہر آ رہا تھا۔ تینوں گھوڑے بدکے اور پیچھے کو بھاگ اٹھنے کی بجائے

دائیں بائیں ہو کر سرپٹ دوڑ پڑے اور بکھر گئے۔ گھوڑے بے لگام ہو گئے تھے۔ تینوں ماہر سوار تھے۔ انہوں نے دماغ حاضر رکھے اور گھوڑوں کو تھک جانے تک دوڑنے دیا۔

اُن کے چلے جانے کے بعد اژدہا ایک اور جھاڑی میں چلا گیا۔ ایک گڑھے میں سے جس پر ہری جھاڑیاں اور گھاس تھی، پنڈت نے سر نکالا۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر وہ اوپر آ گیا اور کھڑا ہو گیا۔ اُس نے ہاتھ اپنے ماتھے پر مارا جیسے اُسے تینوں سوار نکل جانے کا افسوس ہوا ہو۔ اُس نے آسمان کی طرف دیکھا اور وہیں کھڑا رہا۔

کہیں سے ایک آدمی اُس کے سامنے آ گیا۔ پنڈت اسے پہچانتا تھا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر محافظ تھا۔ اُس نے نیام سے تلوار نکال لی اور بولا۔ ”نندیا کہاں ہے؟“

”تم یہاں کیا لینے آئے ہو؟“ پنڈت نے اُسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ”چلے جاؤ یہاں سے ورنہ مہاراجہ سے کہہ کر قتل کرا دوں گا۔“

”تمہاری اور مہاراجہ کی جانیں ہمارے قبضے میں ہیں“۔ محافظ نے کہا۔ ”میں پوچھتا ہوں تم نے نندیا کو کہاں چھپا رکھا ہے؟ ..... میں اس کی قربانی نہیں دینے دوں گا۔ تم یہاں سے زندہ نہیں جا سکو گے پنڈت!“

پنڈت اُسے دیوتاؤں کے قہر سے ڈرانے لگا۔ قریب کی ایک گھنی جھاڑی سے جو پنڈت کے پیچھے تھی۔ اژدہا نے سر نکالا اور آہستہ آہستہ باہر آنے لگا۔ ادھیڑ عمر محافظ نے دیکھا مگر پنڈت کو خبردار نہ کیا۔ اژدہا نے جھپٹ کر پنڈت کی ران منہ میں لے لی۔ پنڈت نے چیخ ماری۔ اژدہا نے اُسے اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا۔ اژدہا مگرمچھ کی طرح شکار کو چباتا نہیں سالم نگلتا ہے اور اس میں بہت وقت لگتا ہے۔ پنڈت نے چیخ چیخ کر محافظ سے کہا ”اسے کاٹ دو۔ اسے تلوار سے کاٹ دو۔“

”یہ تمہارا دیوتا ہے پنڈت جی مہاراج!“ محافظ نے کہا۔ ”میں جانتا ہوں یہ کب سے تمہاری قید میں ہے۔ میں مہاراجہ کا وفادار ہوں، تمہارا نہیں۔ مجھے سب معلوم ہے تمہارا دیوتا ہمارے مہاراجہ کو روک نہیں سکا۔“

”مجھے اس سے چھڑاؤ..... آگے آؤ“۔ پنڈت چلا رہا تھا۔

”نندیا کہاں ہے؟“

”بتا دوں گا“۔ پنڈت نے درد سے کراہتے ہوئے کہا۔ ”اسے کاٹ دو۔“

”نندیا کہاں ہے؟“ محافظ نے کہا۔ ”وہ تمہارے لیے ناچنے والی ایک بے معنی لڑکی ہے لیکن میں اسے اپنی بیٹی سمجھتا ہوں۔ وہ یتیم لڑکی ہے جسے میرے ماں باپ نے پالا پوسا اور مہاراجہ کے ہاتھ بیچ دیا تھا۔ مجھے اس بچی کے ساتھ اتنا پیار تھا کہ میں اس کی خاطر مہاراجہ کے پاس آ گیا۔ میں نے مہاراجہ کو تیر اندازی اور تیغ زنی کے جوہر دکھائے تو اس نے مجھے اپنے پاس رکھ لیا۔ میں مہاراجہ کا کم اور نندیا کا محافظ زیادہ ہوں۔“

”میرے خیمے سے دو سو قدم پورب کی طرف چلے جانا“۔ پنڈت نے کہا۔ ”وہاں دو ٹیلوں کے درمیان جاؤ گے تو دائیں ٹیلے میں ایک شگاف دیکھو گے۔ اس میں چلے جانا۔ آگے گُف ہے۔ بہت بچی ہوئی جگہ ہے۔ تم بھی وہیں رہنا چاہو گے۔ تمہیں نندیا وہیں ملے گی..... آگے آؤ بدبخت! مجھے اس سے چھڑاؤ۔“

”تم اپنی ریاکاری کا شکار ہو رہے ہو“۔ محافظ نے کہا۔ ”تمہاری اپنی فریب کاریاں تمہیں نگل رہی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ یہ اژدہا ہے دیوتا نہیں ہے“۔ محافظ نے قہقہہ لگایا اور تلوار نیام میں ڈال کر وہاں سے اُس سمت دوڑ پڑا جو اُسے پنڈت نے بتائی تھی۔

اژدہا نے پنڈت کو زمین پر بار بار پٹخا اور اس کی ران چھوڑ کر اس کا سر اپنے منہ میں لے لیا۔ پنڈت بے ہوش ہو چکا تھا۔ اژدہا اُسے اچھال اچھال کر

نگلنے لگا۔

ادھیڑ عمر محافظ نے گھوڑا کہیں دُور کھڑا کر رکھا تھا۔ وہ گھوڑے پر سوار ہُوا اور اُس جگہ پہنچا جو اُسے پنڈت نے بتائی تھی۔ نشانیاں بڑی صاف تھیں۔ وہ ٹیلے کے شگاف میں داخل ہو گیا۔ آگے خاصی کھلی گُفا تھی جس کے فرش پر مخمل جیسا کپڑا بچھا تھا۔ کچھ مُورتیاں رکھی تھیں اور لوبان سلگ رہا تھا۔ نوجوان رقاصہ نے محافظ کو یوں دیکھا جیسے اُسے پہچانتی ہی نہ ہو۔ محافظ پرانی عمر کا تجربہ کار آدمی تھا۔ اُسے شک ہُوا کہ نندیا کسی دوائی کے اثر میں ہے ورنہ یہاں سے اکیلی کہیں نکل جاتی۔ محافظ نے نندیا کو بلایا تو وہ مسکرائی۔

محافظ نے وقت ضائع نہ کیا۔ وہ تنومند آدمی تھا۔ اُس نے نندیا کو اُٹھا کر کندھے پر ڈال لیا اور باہر لے جا کر گھوڑے پر سوار کیا۔ خود بھی سوار ہُوا اور جنگل کو نکل گیا۔

مہاراجہ راجیپال کا بیٹا لچھمن پال اپنے باپ کو ڈھونڈھ رہا تھا۔ وہ پنڈت کے خیمے میں گیا۔ پنڈت وہاں نہیں تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ پنڈت نے نندیا کو کہاں رکھا ہُوا ہے۔ وہاں گیا تو وہاں نندیا نہیں تھی۔ واپس خیمہ گاہ میں آیا تو ایک ملازم نے اُسے بتایا کہ پنڈت کو اُس نے فلاں طرف جاتے دیکھا تھا۔ وہ بہت بڑی گٹھڑی کو گھسیٹ کر لے جا رہا تھا۔ لچھمن پال اُدھر گیا۔ اُسے گٹھڑی گھسیٹنے کے نشان نظر آ رہے تھے۔ یہ نشان اُسے وہاں تک لے گئے جہاں اژدہا پنڈت کو آدھے سے زیادہ نگل چکا تھا۔ پنڈت کی ٹانگیں اژدہا کے منہ سے باہر تھیں۔

لچھمن پال نے تلوار نکالی اور اژدہا کو دو حصوں میں کاٹ دیا مگر پنڈت جس شکنجے میں آ چکا تھا اس سے نہ نکل سکا۔ وہ بے حس ہو چکا تھا۔ کبھی کا مر گیا تھا۔ لچھمن پال نے دیکھا کہ وہاں ایک موٹا کپڑا پڑا تھا اور ایک رسّہ بھی تھا۔ اُس نے رسّے کا یہ ٹکڑا پہچان لیا۔ جس رات اژدہا غار میں آیا تھا، لچھمن پال وہیں تھا۔ رسّے کا یہ ٹکڑا اُسی نے پنڈت کو دیا تھا۔ اُس نے اژدہا کو بھی

پہچان لیا لیکن سمجھ نہ سکا کہ یہ قصّہ کیا ہے اور ہُوا کیا ہے۔

مہاراجہ راجیپال بہت دُور جا کر اپنے ساتھیوں سے ملا۔ اُن کے گھوڑے بے لگام اور سرپٹ دوڑ دوڑ کر شل ہو گئے تھے۔ اس سے سواروں کو یہ فائدہ پہنچا کہ پورے دن کی مسافت آدھے دن میں طے ہو گئی۔ وہ قنوج کی طرف صحیح سمت پر جا رہے تھے۔

محافظ دن بھر نندیا کو لیے لیے پھرتا اور اُسے دوائی کے اثر سے نکالنے کی کوشش کرتا رہا۔ شام کے بعد نندیا اپنے آپ میں آنے لگی اور اُس نے اس طرح باتیں کیں جیسے خواب سے بیدار ہوئی ہو۔ پنڈت نے کسی دوائی کے ذریعے اس کے دماغ کو ماؤف کر رکھا تھا۔ اُسے اتنا ہی اچھی طرح یاد تھا کہ پنڈت نے اُسے کہا تھا کہ وہ دیوتاؤں کو راضی کرنے کے لیے اُس کی جان کی قربانی دے گا۔ باقی سب باتوں کو وہ خواب کی باتیں سمجھتی تھی۔

"پنڈت خود دیوتا کا نوالہ بن گیا ہے" — محافظ نے اُسے بتایا — "اُس نے ایک اژدہا پکڑ رکھا تھا۔ اُس سے وہ مہاراجہ کا راستہ روکنا چاہتا تھا مگر اژدہا نے اُسی کو کھا لیا۔"

"مہاراجہ کہاں ہیں؟"

"قنوج گئے ہیں" — محافظ نے جواب دیا — "مسلمانوں سے صلح کریں گے۔"

"مسلمانوں سے صلح کرنے گئے ہیں؟" — نندیا نے حیران ہو کے کہا۔

"ہاں!" — محافظ نے جواب دیا — "ان کی سلامتی اسی میں ہے۔ میری طرح وہ بھی سمجھ گئے ہیں کہ پنڈتوں کا یہ مذہب اُن کا اپنا فریب ہے اور میدانِ جنگ میں کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ مہاراجہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں نے مندروں کو تباہ و برباد کر دیا ہے تو ہمارے دیوتاؤں نے اُن کا کیا بگاڑ لیا ہے؟"

"تم بھی اپنے مذہب کے خلاف ہو گئے ہو؟" — نندیا نے پوچھا۔

"ہمارا مذہب کیا ہے نندیا؟" — اُس نے جواب دیا — "راجوں مہاراجوں

کو خوش کرنا اور اُن کی جان بچانے کے لیے اپنی جان دے دینا ہمارا مذہب ہے ..... مگر یہ باتیں ہمارے سوچنے کی نہیں۔ ہمیں اب یہ سوچنا ہے کہ جائیں کہاں ..... کالنجر قریب ہے۔ ڈیڑھ دن کا سفر رہ گیا ہے۔ وہاں کے دربار میں تمہیں اور اپنے آپ کو پیش کروں گا۔ کسی نے قبول کر لیا تو وہیں رہیں گے۔ نہیں تو کہیں اور چلے چلیں گے۔"

انہوں نے وہ رات سفر میں گزاری۔ اگلی صبح وہ کالنجر کے قریب پہنچ گئے تھے ___ اور اُس صبح مہاراجہ راجیا پال قنوج میں داخل ہُوا۔ اُس کے دونو ساتھی ساتھ تھے۔ تینوں کے حلیئے عام سی قسم کے مسافروں جیسے تھے۔ مہاراجہ نے اپنی راجدھانی دیکھی تو اسے دھچکہ سا لگا۔ شہر اُجڑا اُجڑا تھا اور بعض مکان جلے ہوئے تھے۔ مہاراجہ آگے بڑھتا گیا اور بڑے مندر کے سامنے گھوڑے سے اُترا۔ کسی نے اُس کی طرف آنکھ اٹھا کے بھی نہ دیکھا۔ وہ مندر کے چبوترے پر چڑھ گیا۔ مندر خاموش تھا۔ وہاں بدبُو سی تھی۔ یہاں تو خوشبو ہُوا کرتی تھی۔ اندر گیا تو مندر ویران تھا۔ نہ کوئی بُت نہ مُورتی۔ یہ تو اُجڑی ہوئی سرائے لگتی تھی۔ وہ اندرونی کمروں میں گیا۔

"میں کچھ نہیں سمجھ سکتا" ___ اُس نے جذبات سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا ___ "میں کچھ نہیں جانتا۔ کیا یہ دیوتاؤں کا قہر ہے کہ ہم اجڑے ہمارا شہر اُجڑا؟ ..... کیا یہ میرا جُرم ہے؟ ..... میں نہیں جانتا کون جھوٹا ہے اور کون سچا ہے۔ یہاں تو بھجنوں میں دیوتاؤں کے ساتھ میرا نام بھی لیا جاتا تھا۔"

"سچا وہ خدا ہے جو بھجنوں اور گھنٹیوں سے بے نیاز ہے" ___ اُس کے عقب سے آواز آئی۔

مہاراجہ نے گھُوم کے دیکھا۔ ایک آدمی اُس کی زبان بول رہا تھا۔ "کیا قنوج کا مہاراجہ اپنے جاہ و جلال کے اور اپنے باطل مذہب کے کھنڈرات دیکھ رہا ہے؟ ..... کیا مہاراجہ عبرت حاصل کرنے آیا ہے؟"

"اوہ، تم؟ سنگرام؟" ___ مہاراجہ نے اس آدمی کو پہچانتے ہوئے پوچھا

"تم یہیں ہو؟ کیا کر رہے ہو؟"

"جو لوگ بہروپ میں آئے ہیں انہیں اصل روپ میں لانے کا کام کرتا ہوں" ___ سنگرام نے کہا ___ "میں اب سنگرام نہیں عثمان ہوں۔ مسلمان ہو گیا ہوں۔ آپ مجھے غدّار کہہ سکتے ہیں مگر مہاراجہ خود ہی قوم سے غدّاری کر جائے تو ....."

"میں کسی کو غدّار کہنے نہیں آیا" ___ مہاراجہ نے کہا ___ "غزنی کے سلطان سے ملنے آیا ہوں۔"

"سلطان غزنی جا چکا ہے" ___ عثمان نے کہا ___ "یہاں سالار ابوالقدر سلجوقی ہے۔"

"اُس کے پاس لے چلو۔"

سالار ابوالقدر سلجوقی کو جب بتایا گیا کہ یہ شخص مہاراجہ قنوج ہے تو اُس نے یقین نہ کیا۔ اُسے یقین دلایا گیا تو اُس نے پوچھا کہ مہاراجہ کیوں آیا ہے؟

"سلطان کی اطاعت قبول کرنے آیا ہوں" ___ مہاراجہ نے کہا ___ "آپ چاہیں تو مجھے قید کر لیں، چاہیں تو قتل کر دیں۔"

"میں ایک مہاراجہ کو اس حلیئے میں نہیں دیکھ سکتا" ___ ابوالقدر سلجوقی نے کہا ___ "اگر آپ کے کپڑے خون آلود ہوتے تو میں اور زیادہ خوش ہوتا کہ آپ اپنے ملک کے لیے لڑے ہیں مگر آپ میرے پاس آ گئے ہیں۔ میں آپ کا احترام کرتا ہوں" ___ ابوالقدر نے حکم دیا ___ "مہاراجہ کو غزنی کے اُمراء کا لباس پہنا کر لایا جائے اور ان کے ساتھیوں کو عزت سے رکھا جائے۔"

کچھ دیر بعد مہاراجہ نہا دھو کر نہایت اچھی پوشاک میں ابوالقدر کے سامنے آیا۔ ابوالقدر نے اُس سے پوچھا کہ اس کے پاس ہے کیا جس کے بل بوتے پر وہ اپنے آپ کو قیدی نہیں سمجھتا اور اطاعت قبول کرے گا؟

"آپ کو یہاں خزانہ خالی ملا ہو گا" ___ مہاراجہ راجیا پال نے کہا ___ "وہ تمام

خزانہ میرے پاس ہے۔ میرے پاس باری نام کی اور جگہ ہے اور وہاں کچھ فوج بھی ہے۔ اگر آپ مجھے یقین دلا دیں کہ باری میں مجھے اپنی ریاست قائم کرنے دیں گے تو میں تاوان بھی ادا کر دوں گا اور باج بھی اور میں دوستی کا معاہدہ بھی کر دوں گا۔"

"آپ بھاگے کیوں تھے؟" ___ ابوالقدر نے پوچھا۔

"میں اس سوال کا جواب نہیں دوں گا" ___ مہاراجہ نے کہا۔ "کیونکہ یہ خوشامد ہوگی۔ میں نے اپنے دیوتاؤں کی بھی کبھی خوشامد نہیں کی۔"

"کیا آپ اسلام قبول کر سکیں گے؟"

"میں مذہب کے نام سے بیزار ہوں" ___ مہاراجہ نے جواب دیا۔ "میں آپ کے سلوک سے اس قدر متاثر ہوا ہوں کہ کسی دن میرا دل مجھے کہے گا کہ اسلام قبول کر لو، لیکن ابھی آپ میری درخواست پر غور کریں۔"

"میں سلطان غزنی کے نام پر آپ کی درخواست قبول کرتا ہوں" ___ ابوالقدر نے کہا ___ "آپ اپنی نئی ریاست قائم کر لیں۔ میرے کچھ عسکری حکام باری جا کر جائزہ لیں گے کہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ تحریری معاہدہ ابھی ہو جائے گا۔ تاوان اور باج سلطان غزنی مقرر کریں گے۔ قاصد آج ہی روانہ ہو جائے گا۔"

ادھر نندیا اپنے محافظ کے ساتھ کالنجر پہنچ گئی۔ محافظ نے مہاراجہ کالنجر کو یہ خبر سنائی کہ مہاراجہ راجیا پال غزنی کی اطاعت قبول کرنے کے لیے قنوج چلا گیا ہے۔ مہاراجہ کالنجر گنڈہ تڑپ اٹھا۔ اس نے اسی وقت راجہ ارجن (گوالیار) کے نام پیغام لکھوا کر بھیج دیا جس میں لکھا کہ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا کہ راجیا پال کے قتل کا انتظام کیا جائے اور راجہ بھیم پال ہندر سے مل کر سلطان محمود کو ہمیشہ کے لیے ختم کیا جائے۔

غزنی کی آبرو

۴۰۹ ہجری (۱۰۱۹-۲۰ عیسوی) کے حج میں چند مہینے باقی تھے۔ حج کو جانے والوں کے قافلے تیار ہو رہے تھے۔ ہر علاقے کے سینکڑوں لوگ اکٹھے ہو جاتے اور گھوڑوں، خچروں اور اونٹوں پر اور پیدل قافلے کی صورت میں حج کو چلا کرتے تھے۔ ان قافلوں میں تاجر بھی شامل ہو جایا کرتے تھے۔ بعض مسافر اپنے بیوی بچوں کو بھی ساتھ رکھتے تھے۔ قافلہ جتنا چھوٹا ہوتا تھا، اس پر ڈاکوؤں کے حملے کا اتنا ہی زیادہ خطرہ ہوتا تھا، اس لیے قافلے بہت بڑے ہوتے تھے۔ جوں جوں قافلے بڑھتے جاتے تھے ان میں مسافر شامل ہوتے جاتے تھے۔

اس کے مطابق ڈاکوؤں نے بھی اپنے گروہوں کی نفری بڑھا لی تھی۔ آگے چل کر سلطان صلاح الدین ایوبی کے دور میں صلیبیوں نے اپنے فوجی دستوں سے حاجیوں کے قافلوں کو لوٹنا شروع کر دیا تھا۔ معروف مؤرخ محمد قاسم فرشتہ نے بہت سے مؤرخوں کے حوالوں سے لکھا ہے کہ حماد بن علی نام کا ایک عرب سلطان محمود غزنوی کے دور کا طاقت ور رہزن تھا۔ اس نے عرب ممالک کے پسماندہ قبائل میں سے اپنا ایک گروہ بنا رکھا تھا جو قافلوں کو لوٹتا تھا۔ اس کا یہ گروہ ایک فوج بنتا جا رہا تھا۔ وہ عرب علاقوں میں حاجیوں کے قافلوں کو روکتا اور مال و دولت اور نوجوان لڑکیاں اڑا لے جاتا تھا۔ دو تین قافلے غزنی کے بھی لوٹے گئے تھے۔ محمود غزنوی کو اطلاع ملی تھی لیکن اسے

ہندوستان کی جنگیں اور اپنے ہاں کی خانہ جنگی مہلت نہیں دیتی تھی کہ ڈاکوؤں کے انسداد کے لیے کچھ کرتا۔ اس کے علاوہ غزنی کے قافلے عرب کے دُور دراز علاقوں میں لوٹے گئے تھے جو سلطان محمود کی دسترس سے باہر تھے۔

فرشتہ نے اُس دَور کی تحریروں کی شہادت پر لکھا ہے کہ سلطان محمود کے دَور میں القادر باللہ عباسی خلیفہ تھا اور خلافت کی گدّی بغداد میں تھی۔ خلافت اب اقتدار کی گدّی بن کر رہ گئی تھی۔ القادر باللہ ایک علاقے کا حکمران بھی تھا جس کے دفاع اور توسیع کے لیے وہ کوشاں رہتا تھا۔ اس کی یہ کوششیں درپردہ ہوتی تھیں۔ اقتدار پرستی اور شہنشاہیت کے لیے جھوٹ اور فریب ضروری ہوتا ہے، چنانچہ خلیفہ بعض سازشوں کا خالق تھا۔ سلطان محمود کے ساتھ بھی اُس کی ایک ٹکر ہو چکی تھی۔ مؤرخ لکھتے ہیں کہ خلیفہ القادر باللہ کو معلوم تھا کہ عرب کے بعض قبائل جو بدّو کہلاتے ہیں، حماد بن علی کی قیادت میں قافلوں کو لُوٹتے ہیں لیکن خلیفہ دانستہ نگاہیں پھیرے ہُوئے تھا۔

انہی دنوں جب ہر علاقے میں حاجیوں کے قافلے تیار ہو رہے تھے، بغداد میں حماد بن علی خلیفہ کے ایک سالار کے گھر میں بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ دو بڑی حسین لڑکیاں تھیں جو کچھ دیر وہاں خاموش بیٹھی رہیں۔ سالار انہیں دیکھتا اور مسکراتا رہا۔ ان لڑکیوں کے علاوہ حماد بن علی کچھ اور تحفے بھی لایا تھا۔ تھوڑی دیر بعد لڑکیاں اور تحفے کسی اور کمرے میں چلے گئے۔ سالار اور حماد اکیلے رہ گئے۔

”خلیفہ کے مزاج کیسے ہیں؟“ — حماد نے پُوچھا۔ ”حج کا موسم آ رہا ہے“۔

”خلیفہ کے مزاج پہلے کی طرح میرے ہی ہاتھ میں ہیں“ — سالار نے جواب دیا — ”مجھے معلوم تھا حج سے پہلے تم آؤ گے۔ ہمارا حصّہ ہمیں مل جائے۔ خلیفہ کی پرواہ نہ کرو۔ اُسے خلافت کی گدّی سے پیار ہے اور اُسے ایسے مشیروں اور درباریوں کی ضرورت ہے جو اسے یقین دلاتے رہیں کہ وہ ساری دنیا کا بادشاہ ہے اور اُس کی رعایا اُس سے بہت خوش ہے۔ یہ کام ہم

کر رہے ہیں۔ اس کی نظر میں تم بہت بڑے تاجر ہو جس کی تجارت غزنی سے ہندوستان اور مصر تک پھیلی ہُوئی ہے“۔

”اب میں اپنی تجارت غزنی تک پھیلانا چاہتا ہُوں“ — حماد بن علی نے کہا — ”وہاں سے مجھے خبر ملی ہے کہ سینکڑوں آدمیوں کا قافلہ حج کے لیے آ رہا ہے۔ اس کی تعداد بڑھتی جائے گی۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس قافلے میں ہندوستان کی دولت آ رہی ہے ... کیا یہ صحیح ہے کہ غزنی کا سلطان محمود ہندوستان کے خزانے خالی کر لایا ہے؟“

”اُس کے تحفے خلیفہ کے پاس بھی پہنچ چکے ہیں“ — خلیفہ کے سالار نے جواب دیا — ”یہ صحیح ہے کہ سلطان محمود ہندوستان سے اتنے زر و جواہرات اور درہم و دینار لایا ہے جو تمہارے اور میرے تصوروں میں بھی نہیں آ سکتے“۔

”اور مجھے بتایا گیا ہے کہ اُس نے اپنی فوج کو مالِ غنیمت سے مالا مال کر دیا ہے“ — حماد نے کہا — ”ان فوجیوں کے لواحقین حج کے لیے آ رہے ہیں۔ ہندوستان کا قیمتی سامان ان کے ساتھ آ رہا ہے جو ہماری منڈیوں میں فروخت ہوگا۔ قافلے کے ساتھ غزنی کے وہ تاجر بھی آ رہے ہیں جنہوں نے سُلطان کی فوج سے سامان خریدا ہے۔ ایسا قافلہ اس سے پہلے میرے ہاتھ کبھی نہیں آیا تھا۔ اب میری توجہ اسی قافلے پر مرکوز ہے۔ میں آپ کے پاس اس لیے آیا ہُوں کہ آپ مجھے یقین دلائیں کہ میں اس قافلے پر ہاتھ ڈالوں تو خلیفہ میری گردن نہیں پکڑے گا۔ میں جانتا ہوں کہ خلیفہ سلطان محمود سے ڈرتا ہے“۔

”کیا میں نے تمہیں بتایا نہیں کہ خلیفہ تمہیں تاجر سمجھتا ہے؟“ — سالار نے کہا — ”کون جان سکے گا کہ غزنی کے قافلے کا تم نے صفایا کیا ہے؟ ... ہاں، تمہیں ایک احتیاط کرنی پڑے گی۔ قافلہ بہت بڑا ہے اس لیے تمہارے ساتھ بہت سے آدمی ہو لے جائیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سلطان محمود قافلے کے ساتھ فوج کا ایک دستہ بھی بھیج دے۔ وہ پکا مسلمان

ہے اور سنا ہے کہ وہ حج کے لیے جانے والوں اور حج سے واپس آنے والوں کا بہت احترام کرتا ہے اور انہیں ہر طرح کی سہولت دیتا ہے۔"

"اب تو میں بھی فوج اکٹھی کر سکتا ہوں" ـــ حماد بن علی نے کہا ـــ "تمام قبیلے میرے زیرِ اثر ہیں۔ میں سات آٹھ سو لشکری بڑی آسانی سے لے آؤں گا۔ کیا آپ ان قبیلوں سے واقف نہیں؟ .... اور پھر میں آمنے سامنے آکر للکار کر تھوڑے سے ہی لڑوں گا۔ میں گھات لگاؤں گا۔"

"کسی پہاڑی علاقے میں؟" ـــ سالار نے جواب دیا۔

"نہیں۔ کید کے ریگستان میں" ـــ حماد نے جواب دیا ـــ "آپ کیسے سالار ہیں! کیا آپ ریگستان کی گھات نہیں جانتے؟ جب قافلے پر اچانک حملہ ہوگا تو قافلے والے ادھر اُدھر بھاگیں گے۔ انہیں چھپنے کی کوئی جگہ نہیں ملے گی۔ میں کید کے ریگستان سے واقف ہوں۔ ایک علاقہ ریتیلے ٹیلوں کا ہے۔ اس کی بھول بھلیوں سے صرف ہمارے قبیلے واقف ہیں۔ کوئی اجنبی ان میں پھنس جائے تو اُسے باہر نکلنے کا راستہ نہیں ملتا۔ اس [illegible] میں غزنی کی فوج بھی نہیں لڑ سکتی۔ میرے ساتھ جو قبائل ہیں وہ انسان نہیں جن ہیں .... آپ مجھے خلیفہ سے ملوا دیں۔ اس کی خدمت میں بھی کچھ پیش کر دوں۔"

خلیفہ القادر باللہ عباسی اپنے خاص کمرے میں بیٹھا تھا اور اُس کا سالار جو اُس کا منظورِ نظر تھا اُسے بتا رہا تھا کہ حماد بن علی اُس سے ملنے آیا ہے۔ وہ تحفے جو حماد لایا تھا خلیفہ کے سامنے پڑے تھے۔ سالار نے حماد کی بہت تعریف کی اور خلیفہ کو بتایا کہ حماد بن علی بڑے کام کا آدمی ہے۔ وہ تمام سرکش قبائل کو آپ کی خلافت کا غلام بنا رہا ہے اور آپ کے لیے وہ ان قبائل میں سے فوج تیار کر رہا ہے۔ جب کبھی ہمیں ضرورت پڑی، یہ قبائل ہمارے دوش بدوش لڑیں گے۔"

"یہ قبائل سرکش اور خود سر ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ قافلوں کو لوٹتے ہیں اور

لڑکیاں بھی اٹھالے جاتے جنہیں وہ بیچ ڈالتے ہیں۔"

"یہ اُن لوگوں کا بہتان ہے جو حماد کی مقبولیت اور طاقت سے خوفزدہ ہیں اور حسد کرتے ہیں" ـــ سالار نے چاپلوسی کا کمال دکھاتے ہوئے کہا ـــ "ہر وہ انسان جو لوگوں میں مقبول ہے وہ حاسدوں کے دل کا کانٹا سمجھا جاتا ہے۔ آپ کے بھی دشمن ہیں۔ وہ جب دیکھتے ہیں کہ آپ کی رعایا آپ کا نام سن کر سجدہ ریز ہو جاتی ہے تو وہ جلتے اور کڑھتے ہیں۔ حماد بن علی نے تمام سرکش قبائل کو اپنا مرید بنا رکھا ہے اور خود آپ کا مرید ہے۔ وہ تمام قبائل کو آپ کا مرید بنا چکا ہے۔"

"امیر المومنین!" ـــ ایک اور درباری حاکم جو سالار کا ہی آدمی تھا، بول پڑا ـــ "اس عمر میں بھی آپ کا چہرہ مبارک جوانی کے خون سے دمک رہا ہے۔ حماد بن علی آپ کے لیے جو تحفہ لایا ہے، وہ آپ رات کو اپنے حرم میں رکھ لیں گے۔"

"اور آپ اس تحفے کے قابل ہیں" ـــ سالار نے کہا ـــ "آپ حماد کو شرفِ باریابی بخشیں۔ وہ باہر انتظار کر رہا ہے۔"

"اسے انتظار میں باہر کیوں کھڑا رکھا گیا ہے" ـــ خلیفہ نے ساری دنیا کے بادشاہ کی طرح جلال سے لہجے میں کہا ـــ "ایسے آدمی کو ہم اپنے برابر بٹھائیں گے۔"

فوراً حماد بن علی کو حاضر کیا گیا۔ وہ وجیہہ عرب تھا۔ چہرہ لال اور آنکھیں شربتی رنگ کی تھیں۔ ادھیڑ عمر تھا لیکن لگتا جوان تھا۔ اُس کے چہرے پر اُن عربوں کا جلال تھا جنہوں نے رومیوں اور زرتشتوں کو گھٹنوں بٹھا دیا اور اسلام کا پرچم سمندر پار یورپ میں جا گاڑا تھا۔ حماد کے بازو لمبے اور کندھے سیدھے اور گوشت سے بھرے ہوئے تھے۔ وہ جب اندر آیا تھا تو اُس کے قدموں کے نیچے زمین ہلتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر تبسم تھا اور وہ مردانہ وقار کا شاہکار تھا۔ اُس کی آنکھوں کی چمک میں ایس

کے چہرے کی دمک میں اور اُس کے ظاہری جاہ وجلال میں شائبہ تک نہ ملتا تھا کہ یہ شخص لٹیرا اور قاتل ہے۔

خلیفہ اُٹھ کھڑا ہوا اور ہاتھ حماد کی طرف بڑھا کر بولا۔ "آ گے آؤ حماد بن علی! خدا کی قسم، ہمیں تمہارے چہرے پر لکھا نظر آتا ہے کہ تم قصرِ خلافت کے پاسبان ہو۔ لوٹ مار کرنے والے وحشی قبائل کو لگام ڈال کر تم نے خلافت پر اور اسلام پر عظیم احسان کیا ہے۔"

"میں آپ کی رعایا ہوں یا امیرالمومنین!"۔ حماد نے کہا۔ "رعایا میں کون ایسا فرد ہے جو آپ کی عبادت نہیں کرتا؟ آپ نے ٹھیک فرمایا ہے کہ میں قصرِ خلافت کا پاسبان ہوں۔ میں اپنی جان اور صحرائی قبیلوں کی وفاداری پیش کرنے آیا ہوں۔"

خلیفہ نے حماد کو یوں اپنے برابر بٹھا لیا جیسے کسی نے سانپ اپنی آستین میں ڈال لیا ہو۔

یہ ۲۰-۱۰۱۹ء کا دَور تھا جب سپین اُندلس کہلاتا تھا اور وہاں اسلامی پرچم لہرا رہا تھا مگر سرنگوں ہوتا جا رہا تھا۔ قرطبہ سازشوں کا اور اقتدار پرست پہلوانوں کا اکھاڑہ بن چکا تھا۔ طارق بن زیاد کی ہڈیاں خاک ہو چکی تھیں اور اُس کی روح اُس اُندلس کے لیے تڑپ رہی تھی جسے فتح کرنے کے لیے اُس نے سمندر پار کر کے کشتیاں جلا ڈالی تھیں تاکہ واپسی کا تصوّر ہی مِٹ جائے۔ وہ اُندلس، وہ طارق بن زیاد کا اُندلس ویسے ہی چاپلوس مشیروں اور درباری خوشامدیوں کی بھینٹ چڑھ رہا تھا جیسے بغداد کے قصرِ خلافت میں بھی موجود تھے۔ اُن دنوں جب بغداد میں ایک لٹیرا اور صحرائی قزاق خلیفہ کے دربار میں ایک معزز تاجر کے بہروپ میں پیش کیا گیا تھا، سپین کے حکمران حجا کا بھتیجا اُس کے خلاف لڑ رہا تھا۔ یہ خانہ جنگی تھی۔ وہاں خلافت دوڑ ہی کار بنی ہوئی تھی جو کوئی خلافت کی گدی پر بیٹھ جاتا وہ ہر اُس آدمی کو قتل کرانے کی در پردہ

کوشش کرتا تھا جس سے اُس کے اقتدار کو خطرہ ہوتا تھا۔ اس کے باوجود اُس کے خلاف سازشیں ہوتی تھیں۔

خوشامدیوں اور چاپلوسوں کا ایک ٹولہ تھا جو ہر خلیفہ کی مدح سرائی کرتا اور اُس پر غالب آ جاتا تھا۔ دشمن سلطنتِ اسلامیہ کی جڑوں میں اُتر کر اُسے چوہوں کی طرح کھا رہے تھے۔ غدّاروں کے وارے نیارے تھے۔ نااہل اور بددیانت لوگ عہدے اور رُتبے حاصل کرنے لگے اور جو عہدوں اور رتبوں کے اہل تھے وہ مشتبہ، تخریب کار اور شر پسند کہلانے لگے۔ اہلِ قلم بھی اپنا ایمان اور صداقت نیلام کر بیٹھے اور اندلس میں اسلام کا چراغ ٹمٹمانے لگا۔

اِدھر خلافتِ بغداد بھی شخصی حکومت کی صُورت اختیار کر چکی تھی۔ وزیر اور مشیر مفاد پرستی کے شکار ہو گئے، اور صحرائی قزاق معززین میں شمار ہونے لگے تھے۔ حماد بن علی ایسے ہی افراد میں سے تھا۔ ایک سُلطان محمود غزنوی تھا جو اسلام کی مشعل اٹھائے ہند کے بُت خانے میں جان کی بازی لگائے ہوئے تھا۔ اسی لیے وہ اقتدار کے بھوکے لوگوں کے دلوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا۔

حماد بن علی کے ساتھ چار محافظ تھے جن میں ایک وجیہہ تُرک ارتگین تھا۔ وہ کوئی ایک سال پہلے حماد کے گروہ میں شامل ہُوا تھا اور حماد کا قابلِ اعتماد محافظ بن گیا تھا۔

جس طرح ہر اسلامی مملکت میں حج پہ جانے والوں کے قافلے تیار ہو رہے تھے، ایسا ایک قافلہ غزنی میں بھی تیار ہو رہا تھا۔ تیاری یہ تھی کہ قافلے میں زیادہ سے زیادہ لوگ شامل ہو جائیں تاکہ قزاقوں اور رہزنوں سے محفوظ رہیں۔ قافلے میں تاجر بھی شامل ہو رہے تھے۔ گرد و نواح کے لوگ بھی غزنی میں جمع ہو رہے تھے۔ اونٹوں گھوڑوں اور بیلوں کی خرید و فروخت ہو رہی تھی۔ بیل اور گھوڑا گاڑیاں تیار ہو رہی تھیں۔ یہ میلے کا

منظر تھا۔ اِس میلے میں حماد بن علی کے آدمی بھی گھوم پھر رہے تھے۔ وہ جائزہ لے رہے تھے کہ قافلے کے ساتھ کتنا مال جا رہا ہے اور جو لوگ ساتھ جا رہے ہیں وہ مزاحمت کے قابل ہیں یا نہیں۔

قافلے کو ڈیڑھ ایک ماہ بعد روانہ ہونا تھا۔ عرب کے صحرا میں کہیں ایک نخلستان تھا ___ وسیع اور سرسبز ___ وہاں خیمے لگے ہوئے تھے۔ مشعلیں جل رہی تھیں۔ خیموں کا ایک شہر آباد ہو گیا تھا۔ خیموں سے ذرا پرے سو سوا سو آدمی گول دائرے میں زمین پر بیٹھے تھے۔ ایک جگہ قالین بچھے تھے۔ ان پر حماد بن علی بیٹھا تھا۔ وہاں بھی مشعلیں اور قندیلیں جل رہی تھیں۔ گول دائرے میں ایک رقاصہ ناچ رہی تھی۔ تین چار خوبصورت اور جوان عورتیں حماد کے ساتھ بیٹھے ہوئے آدمیوں کو شراب پیش کر رہی تھیں۔ ان کے کندھے، سینے اور نصف پیٹھیں ننگی تھیں۔ اُنہوں نے جو لمبے فراک پہن رکھے تھے ان پر ستارے سے چمک رہے تھے۔ ان عورتوں کی چال ایسی تھی جیسے ریت پر تیر رہی ہوں۔ مہمانوں کے آگے سالم بکرے روسٹ کر کے رکھے ہوئے تھے۔

رقاصہ کا رقص اور اس کے ساتھ صحرائی ساز وجد آفریں تھے۔ یہ الف لیلیٰ کی ایک بڑی ہی حسین اور پُراسرار رات تھی۔ صحرا کا یہ حصہ عام گزرگاہ سے بہت دُور تھا۔ یہ حماد بن علی کی دنیا تھی اور اس دنیا میں جو ریت کے سمندر میں جزیرے کی مانند تھی، اسی کی بادشاہی تھی۔ اُس کے پاس بیٹھے ہوئے لوگ عرب کے سرکش اور آزاد قبائل کے سردار اور سرکردہ لوگ تھے۔ ان کے انداز بتا رہے تھے کہ یہ کسی قانون کے پابند نہیں اور ان کے دلوں میں خدا کا خوف بھی نہیں۔ اس محفل میں اتنی حسین لڑکیاں کسی اور ہی جہان کی مخلوق لگتی تھیں۔

رات شراب اور عیاشی میں بہتی، ڈوبتی اور اُبھر اُبھر کر ڈوبتی گزر گئی۔ سورج اُبھرا تو یہ لوگ سو گئے، اور جب سورج صحرا کو جھلساتا ہوا ڈوب گیا تو یہ پُراسرار لوگ

جاگ اُٹھے اور اُسی کھلی جگہ جا بیٹھے جہاں رات رقص اور شراب کی محفل جمی تھی مگر آج رات وہاں کوئی رقاصہ نہیں تھی۔ شراب پلانے والی عورتیں موجود تھیں۔

"میرے عزیز دوستو!" ___ حماد بن علی نے سب سے مخاطب ہو کر کہا ___ "حاجیوں کے کئی قافلے چلنے والے ہیں اور دُور کے قافلے چل بھی پڑے ہوں گے مگر اب بہت بڑا شکار آ رہا ہے۔ یہ غزنی کا قافلہ ہے۔ اس کے ساتھ ہندوستان کا مالِ غنیمت آ رہا ہے۔ تم نے اس سے پہلے غزنی کے قافلے مارے ہیں مگر اتنا مال ہاتھ نہیں آیا تھا۔ مجھے اطلاع ملی ہے کہ اب جو قافلہ آ رہا ہے وہ کئی برسوں کے لیے مالا مال کر دے گا مگر اس قافلے پر ہاتھ ڈالنا آسان نہیں ہو گا۔ قافلے میں ڈیڑھ ہزار سے زیادہ لوگ ہوں گے۔ سب مسلح ہوں گے اور ان میں فوجی بھی ہوں گے۔ اس قافلے پر چند ایک آدمیوں کا گروہ ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ ہم سب کو مل کر ایک فوج کی طرح حملہ کرنا ہو گا... کیا تم لوگ مجھے بتا سکتے ہو کہ ہر ایک کتنے آدمی اپنے ساتھ لا سکتا ہے؟"

"ایک ہزار" ___ ایک نے ہاتھ اُٹھا کر کہا۔

"چھ سو" ___ ایک اور نے کہا۔

"چار سو"

ہر ایک نے بتایا کہ وہ کتنے آدمی لا سکتا ہے۔ یہ تعداد پانچ ہزار بن گئی۔

"یہ یاد رکھو کہ ہمیں پانچ ہزار قزاق نہیں سپاہی درکار ہیں" ___ حماد بن علی نے کہا۔ "ہو سکتا ہے ہمیں ایسی ضرورت پیش نہ آئے لیکن ہمیں باقاعدہ لڑائی کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ میں بغداد سے آ رہا ہوں۔ مجھے خلیفہ کے ایک سالار نے بتایا ہے کہ غزنی کا سلطان جس کا نام محمود ہے، حاجیوں کی بہت عزت کرتا ہے اور ان کا بہت خیال رکھتا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ اتنے بڑے قافلے کے ساتھ فوج کا ایک دستہ بھیج دے"

ہر سردار نے پُرجوش آواز میں حماد کو یقین دلایا کہ وہ اپنے ساتھ ایسے جنگجو لا رہا ہے جو غزنی کی فوج کو کاٹ کر رکھ دیں گے۔

"اگر تم واقعی سپاہی بن کر آؤ گے تو تمہیں ایک اور انعام ملے گا" ــــ حماد بن علی نے کہا۔ اُس کے پاس ایک بڑی ہی خوبصورت لڑکی بیٹھی تھی۔ یہ لڑکی ایک سال سے اُس کے پاس تھی۔ اُس نے لڑکی کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "یہ غزنی کے حسن کا نمونہ ہے۔ غزنی کے قافلے کے ساتھ ایسی بہت سی لڑکیاں آ رہی ہیں۔ پورے پورے کنبے آ رہے ہیں۔ یہ ایسا انعام ہے جو تمہیں اور کہیں سے نہیں ملے گا۔"

لڑکی جو مسکرا رہی تھی، سنجیدہ ہو گئی اور اُس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ حماد بن علی سب کو بتانے لگا کہ قافلے پر کس مقام پر حملہ کرنا ہے۔ حماد کے پیچھے اس کا باڈی گارڈ ارتگین کھڑا تھا۔ وہاں محافظ کو ساتھ رکھنے کی ضرورت نہیں تھی لیکن وہ ان قبائل کا بادشاہ تھا اور بادشاہ اپنے ساتھ محافظ رکھا کرتے تھے۔ جب حماد قبائل کے سرداروں سے مخاطب تھا، لڑکی نے نظر بچا کر ارتگین کی طرف دیکھا۔ ارتگین کا چہرہ بے تاثر تھا۔ لڑکی نے اُسے گھور کر دیکھا تو ارتگین کے چہرے کا رنگ بدل گیا جیسے اُس سے کوئی غلطی سرزد ہو گئی ہو۔

قبائلی سرداروں نے غزنی کے قافلے پر حملے کا منصوبہ طے کر لیا اور انہوں نے کید کے ریگستان کو حملے کے لیے موزوں سمجھا۔

اُسی رات کا واقعہ ہے کہ حماد بن علی گہری نیند سو گیا تھا۔ دوسرے خیمے میں غزنی کی یہ لڑکی جس کا نام سبیلہ تھا، جاگ رہی تھی۔ اس کی نیند اُڑ گئی تھی۔ خیمہ گاہ پر موت کا سکوت طاری تھا۔ ان لوگوں کو کوئی غم نہیں تھا۔ کوئی خطرہ نہیں تھا۔ انہیں پہرہ کھڑا کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ رہزنی اور قزاقی ان کا پیشہ تھا۔ وہ وحشی تھے۔ ان تک قانون کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا تھا۔

سبیلہ نے اُٹھ کر اپنے خیمے کا پردہ ذرا سا ہٹایا اور باہر دیکھا۔ باہر تاریکی تھی۔ وہ کسی کے انتظار میں تھی۔ وہ پھر لیٹ گئی۔ کچھ دیر بعد پھر اٹھی اور خیمے کا پردہ ہٹا کر دیکھا اور اُس کی نظریں ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے دو درختوں پر رک گئیں۔ ان کے پس منظر میں تاروں بھرا آسمان تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دونوں

درختوں کے درمیان ایک انسانی سایہ آن رکا۔ کوئی آدمی وہاں آن کھڑا ہوا تھا۔ سبیلہ نے ایک مردانہ چغہ اپنے اوپر ڈالا اور خیمے میں سے نکل کر دبے پاؤں کھجور کے اُن دو درختوں کی طرف چل پڑی۔

سایہ درختوں کے درمیان سے غائب ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد دو سائے کھجوروں کے سیاہ ستونوں میں تحلیل ہو گئے۔ وہ ارتگین تھا۔ رات جب محفل برخاست ہوئی تھی تو سبیلہ نے موقع دیکھ کر ارتگین سے کہہ دیا تھا کہ رات وہ کھجور کے ان دو درختوں کے درمیان آ جائے جو پانی کے کنارے الگ تھلگ کھڑے ہیں۔ ارتگین اور سبیلہ کی آپس میں کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ وہ یوں چوری چھپے ملتے۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا دیا کرتے تھے۔ دونوں کا ان قزاق قبائل کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا، نہ وہ ان میں سے تھے۔ دونوں کو ایک قافلے سے اغوا کیا گیا تھا۔

سبیلہ غزنی کی فوج کے ایک شتر سوار کی بیٹی تھی۔ اُس کا باپ صرف شتر سوار ہی نہیں تھا، وہ سلطان محمود کا معتقد اور مرید تھا۔ وہ ہندوستان بھی اپنی فوج کے ساتھ گیا تھا۔ اپنے بچوں کو وہ سنایا کرتا تھا کہ اسلام ایک سچا اور عظیم مذہب ہے، جسے ساری دنیا میں پھیلانا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ وہ انہیں اسلام کی عسکری کہانیاں بھی سنایا کرتا تھا۔ یہ کہانیاں سبیلہ کے خون میں شامل ہو گئی تھیں مگر وہ بارہ تیرہ سال کی تھی جب اُس کا باپ ایک لڑائی میں مارا گیا۔ سبیلہ کی ماں نے اپنے خاوند کے ایک دوست کے ساتھ شادی کر لی۔ اُس کے پہلے بھی بچے تھے جن کے ساتھ اسے بہت پیار تھا۔ وہ انہی میں مگن رہا۔ سبیلہ اور اس کے چھوٹے دو بھائیوں کو وہ پیار اور شفقت نہ دے سکا۔

سبیلہ کی عمر سولہ سترہ سال ہوئی تو سوتیلے باپ نے اُسے خاصی بڑی عمر کے ایک آدمی کے ساتھ بیاہ دیا۔ اس آدمی کی پہلے بھی دو بیویاں تھیں۔ سبیلہ کے سوتیلے باپ نے دراصل اس آدمی سے نقد رقم وصول کی تھی۔ سبیلہ کا خاوند رہنے والا دولتمند کوئی تھا۔ وہ شراب بھی پیتا تھا۔ ارتگین اس آدمی کا خاص ملازم تھا۔ وہ چونکہ

شہسوار تھا، تیرانداز اور تیغ زن بھی تھا اس لیے آقا نے اُسے اپنا محافظ بھی بنا رکھا تھا۔ ارتگین ترک غلام تھا۔ اس کا بچپن اور لڑکپن غلامی میں گزرا تھا۔ وہ جب جوانی میں داخل ہُوا تو اُس کا قد بت اور چہرے کا حسن نکھر آیا۔ اُس کے سابقہ مالک نے اُس کی وجاہت سے متاثر ہو کر اسے گھوڑ سواری، تیراندازی اور تیغ زنی سکھا کر اپنا محافظ بنا لیا تھا۔ اُس دور میں اپنے ساتھ ایک محافظ رکھنا بہت بڑا اعزاز سمجھا جاتا تھا۔

اس آقا کی موت کے بعد اسے ایک اور ایسے ہی دولتمند نے خرید لیا۔ اس آقا نے چند برسوں بعد ایک تاجر کی بیٹی کے ساتھ شادی کی اور اس کے عوض ارتگین اسے تحفے کے طور پر دے دیا۔ آخر میں وہ اس آدمی کے ہاتھ فروخت ہُوا جس کے ساتھ سبیلہ کی شادی ہوئی تھی۔ سبیلہ کا ارتگین کے ساتھ اتنا ہی تعلق تھا کہ وہ اس کے خاوند کا محافظ اور خاص ملازم تھا۔

ایک سال قبل سبیلہ کا خاوند ایک قافلے کے ساتھ کہیں جا رہا تھا کہ راستے میں ڈاکوؤں نے گھیر لیا۔ قافلے والوں نے مقابلہ کیا مگر انہوں نے ہتھیار ڈالنے میں دیر نہ کی۔ ارتگین ابھی تک مقابلے میں ڈٹا ہُوا تھا۔ وہ گھوڑے پر سوار تھا۔ گھوڑے کو سرپٹ دوڑا کر اور گھوم پھر کر لڑتا تھا۔ ڈاکوؤں کے سردار نے اعلان کیا کہ اس شخص کو زندہ پکڑو۔

قافلے والے دل چھوڑ بیٹھے تھے۔ ارتگین اکیلا لڑ رہا تھا۔ آخر ڈاکوؤں نے اس کے گھوڑے کو زخمی کر کے ارتگین کو گرا لیا اور اسے پکڑ لیا۔ ڈاکوؤں کے ہاتھ قافلے کا تمام تر مال لگا اور دو بڑے قیمتی انسان۔ ایک ارتگین تھا اور دوسری سبیلہ۔ سبیلہ کی بدنصیبی یہ تھی کہ وہ بہت خوبصورت تھی۔ وہ عورت تھی۔ روتی ہوئی ڈاکوؤں کے ساتھ چل پڑی، البتہ ارتگین کو ساتھ لے جانا مشکل ہو گیا۔ وہ ڈاکوؤں کو للکارتا تھا کہ دو دو آدمی باری باری اس کے مقابلے میں آئیں مگر اس کے ہاتھ پاؤں رسیوں سے باندھ کر اُسے ایک گھوڑے پر بٹھا دیا گیا۔ سبیلہ کا خاوند مارا گیا تھا۔

چند دنوں کی مسافت کے بعد ارتگین اور سبیلہ کو کسی جگہ حماد بن علی کے سامنے پیش کیا گیا۔ ڈاکوؤں کا یہ گروہ اُسی کا تھا۔ سبیلہ پر تو خاموشی طاری تھی، ارتگین حماد کو بھی للکار رہا تھا۔ حماد چرب زبان تھا۔ اُس نے ارتگین کو موم کر لیا اور جب ارتگین نے اُسے بتایا کہ وہ غلاموں کے خاندان کا فرد ہے اور تین آقاؤں کا محافظ رہا ہے تو حماد نے اسے اپنے پاس بٹھا لیا۔

"یہاں تم کسی کے غلام نہیں ہو" حماد بن علی نے کہا "یہاں تم بادشاہ ہو، سلطان ہو۔ تمہاری وجاہت دیکھ کر اور یہ سُن کر کہ تم میرے اتنے زیادہ آدمیوں کے ہاتھ نہیں آتے تھے، میں نے تمہیں اپنے ساتھ رکھنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ تمہاری قدر میرے سوا اور کوئی نہیں جانتا"

"کیا تم مجھے اپنے جیسا ڈاکو بنانا چاہتے ہو؟" — ارتگین نے خشمگیں لہجے میں پوچھا۔

"تو کیا تم غلام رہنا چاہتے ہو؟" — حماد نے کہا "کیا تم آزادی کی زندگی پسند نہیں کرو گے؟"

حماد نے اُسے قائل کر لیا کہ وہ اُس کے ساتھ رہے۔ حماد کو جب پتہ چلا کہ وہ اس لڑکی سبیلہ کے خاوند کا محافظ تھا جسے اُس کا گروہ اغوا کر لایا تھا تو اُس نے سبیلہ سے کہا "اگر تم یہاں ملکہ بن کے رہنا چاہتی ہو تو اپنے خاوند کے محافظ سے کہو کہ وہ تمہارے ساتھ رہے، ورنہ تم دونوں کا انجام بہت بُرا ہو گا"

سبیلہ نے ارتگین کو الگ لے جا کر کہا کہ وہ اُس کی خاطر اُس کے ساتھ رہے۔ سبیلہ نے اُسے بتایا کہ حماد نے اُسے کیا دھمکی دی ہے۔ ارتگین حماد کا قائل ہو ہی چکا تھا، سبیلہ کے مظلوم آنسوؤں نے اُس سے فیصلہ کروا لیا کہ وہ حماد کے ساتھ رہے گا۔ حماد نے اُسے بہترین گھوڑا دیا اور اُسے اپنا ذاتی محافظ بنا لیا اور سبیلہ حماد کی داشتہ بن گئی۔ دونوں ایک سال کے عرصے میں اس ماحول میں گھل مل گئے تھے۔ ارتگین رہزنی کی دو وارداتوں میں شریک ہُوا تھا۔ وہ چونکہ حماد کا محافظ تھا

اس لیے وہ قزاقی میں کم ہی شامل ہوتا تھا۔ بدوؤں کے یہ قبائل اتنے سرکش تھے
کہ اپنے اپنے سردار کے سوا کسی اور کا حکم نہیں مانتے تھے حماد بن علی کو سب
نے صرف اس لیے اپنا بے تاج بادشاہ تسلیم کر لیا تھا کہ اس نے خلیفۂ بغداد کو
اور ہر اس حاکم کو جو حماد کو گرفتار کر سکتا تھا، اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا خلیفہ
کو تو بتایا ہی نہیں گیا تھا کہ حماد رہزن اور قزاق ہے۔

اس ایک سال کے دوران ارتگین اور سبیلہ کی ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔
ارتگین اس کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ دونوں کو ایک دوسرے سے یہی لگاؤ تھا
کہ دونوں اغوا ہوئے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے دونوں نے اس زندگی
کو پسند کر لیا ہے۔ سبیلہ کو حماد نے ملکہ بنا دیا تھا اور ارتگین کے ساتھ حماد کا یہ وعدہ
پورا ہو گیا تھا کہ وہ یہاں غلام نہیں آزاد ہوگا۔ بدو اس کا احترام کرتے تھے۔

اس رات جب سبیلہ ارتگین سے ملنے گئی تو یہ پہلی خفیہ ملاقات تھی۔ ارتگین حیران
تھا کہ سبیلہ نے اسے یوں چوری چھپے کیوں بلایا ہے۔ کیا وہ اپنے آقا کے ساتھ
بے وفائی کرنا چاہتی ہے؟ کیا اس نے در پردہ تعلقات کے لیے ارتگین کو منتخب
کیا ہے؟

"کیوں سبیلہ!" — ارتگین نے ادھر ادھر دیکھ کر پوچھا — "ایسی کیا بات
ہے کہ تم نے مجھے دن کے وقت اپنے خیمے میں بلانے کی بجائے رات کے
اس وقت یہاں بلایا ہے؟"

"میں نے تمہیں اپنے مرے ہوئے خاوند کا غلام سمجھ کر نہیں بلایا" —
سبیلہ نے کہا — "اپنے آپ کو نہ میرا غلام سمجھو نہ حماد بن علی کا... میں تمہارے
سینے میں ایک انسان کو بیدار کرنا چاہتی ہوں: ایسا انسان جو کسی کا غلام نہیں
ہوتا۔ وہ اپنے خدا کا اور اپنے مذہب کا اور اپنے وطن کا غلام ہوتا ہے۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہو سبیلہ!" — ارتگین نے پھیکی سی ہنسی ہنستے ہوئے کہا
— "معلوم ہوتا ہے تم خواب دیکھ رہی ہو۔ نیند میں بول رہی ہو۔"

"یہی بتانے کے لیے تمہیں یہاں بلایا ہے کہ میں جاگ اٹھی ہوں" — سبیلہ نے
کہا — "وہ سبیلہ جاگ اٹھی ہے جو غزنی کی فوج کے ایک شتر سوار کی بیٹی تھی۔ یہ بیٹی
اس روز مر گئی تھی جس روز اس کی ماں نے اپنے مجاہد خاوند کی موت کے بعد
ایک ایسے آدمی کے ساتھ شادی کر لی تھی جو مجاہد نہیں تھا پھر یہ بیٹی بک گئی
— تمہارے آقا کے ہاتھ — میں نے اس بیٹی کا گلا گھونٹ دیا تھا۔"

"عورت اور غلام کی لوح تقدیر پر یہی لکھا ہوتا ہے" — ارتگین نے کہا —
"تم نے بھی اپنی قسمت دیکھ لی ہے۔ میں نے بھی اپنی تقدیر کا لکھا دیکھ لیا ہے
لیکن مجھے اس کا کوئی افسوس نہیں۔ میں غلام پیدا ہوا تھا۔ قبیلے کے ساتھ
خانہ بدوشی میں پل کر جوان ہوا اور ہاتھوں ہاتھ بکتا رہا۔ میں نے صرف ایک بار
سنا تھا کہ اسلام کسی انسان کو اجازت نہیں دیتا کہ وہ کسی انسان کو اپنا غلام
بنا لے۔ میں ہنس پڑا تھا کیونکہ انسانوں کو غلام رکھنے والے مسلمان ہی تھے۔"

"وہ گناہگار تھے" — سبیلہ نے کہا — "اسلام کی نگاہ میں کسی کو غلام رکھنا
گناہ ہے۔ میری شادی تمہارے آقا سے ہوئی تو یہ بھی گناہ تھا۔ یہ شادی
نہیں تھی، یہ سودا ہوا تھا۔ مجھے بیچا گیا تھا۔ میں شروع کے چند دن اداس رہی
پھر اپنے آپ کو سنبھال لیا کہ یہ تو عورت کی قسمت ہی ایسی لکھی گئی ہے۔ میں نے اپنے
آپ کو مار لیا اور میں خوش رہنے لگی۔ تم نے مجھے ہنستے بھی دیکھا تھا مگر یہ میرا
جسم تھا جو زیور اور ریشمی کپڑوں سے سجا ہوا تھا، اور یہ میرا حسن تھا جس نے مجھے
فروخت کرایا تھا۔ میری روح روتی تھی۔"

"تمہاری شادی کسی تم جیسے جوان اور خوبرو مرد کے ساتھ ہونی چاہیے تھی"
— ارتگین نے کہا۔

"میں اپنی شادی کا رونا نہیں رو رہی" — سبیلہ نے کہا — "جب میرا باپ زندہ
تھا تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میری شادی ہوگی۔ باپ نے میرے
ذہن میں یہ ڈال دیا تھا کہ میں مسلمان ہوں اور کفر کو جان اور مال کی قربانی دے
کر ختم کرنا میرا فرض ہے۔ کبھی کبھی مجھے یوں لگتا تھا جیسے ہندوستان کے بت خانے

مجھے للکار رہے ہیں۔ میرا باپ دو مرتبہ ہندوستان گیا تھا۔ وہ کفرستان کے قلعوں کی تسخیر میں شریک تھا۔ اُس نے دیوتاؤں کے بُت ٹوٹتے دیکھے تھے۔ اُس نے بُت خانوں میں اذانیں سنی تھیں۔ میرا باپ اُن مجاہدینِ اسلام میں سے تھا جن کی عمر میدانِ جہاد میں گزر جاتی ہے۔.. میری رگوں میں اس باپ کا خون ہے۔"

"سبیلہ!" — ارتگین نے کہا۔ "کیا تم بھول گئی ہو کہ ہم دونوں کہاں بیٹھے ہیں؟ کسی نے دیکھ لیا تو حماد ہم دونوں کو ہاتھ پاؤں باندھ کر صحرا میں پھینک دے گا۔ صحرا کی موت کو تصور میں لا سکتی ہو؟ ..... مجھے جلدی جلدی بتاؤ کہ آج رات تم اپنے ماضی کو کیوں یاد کر رہی ہو۔ اگر تم نے اپنا من مار لیا تھا تو اسے زندہ کیوں کر رہی ہو! یہ زنجیریں ٹوٹ نہیں سکتیں جن میں تم اب جکڑی گئی ہو۔ میں تو دیکھ رہا تھا کہ تم یہاں خوش ہو۔"

"ہاں ارتگین!" — سبیلہ نے کہا۔ "میں یہاں خوش تھی۔ اگر انسان صرف گوشت اور ہڈیوں کا مجسمہ ہے تو میں یہاں بہت خوش تھی مگر رات میرا مجسمہ مر گیا ہے اور روح زندہ ہو گئی ہے۔ قزاق کی داشتہ مر گئی ہے اور مجاہد کی بیٹی زندہ ہو گئی ہے..... اب میں تمہیں بیدار کرنے آئی ہوں۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔"

"کیا میں تمہیں یہاں سے بھگا لے جاؤں؟" — ارتگین نے پوچھا — "بڑا مشکل کام ہے۔"

"نہیں" — سبیلہ نے کہا۔ "میں یہاں سے نہیں بھاگوں گی۔ تم بھاگ جاؤ ... سنو ارتگین! جب تم میرے خاوند کے محافظ اور غلام تھے تو میرا تمہارے ساتھ کیسا سلوک تھا۔ تمہیں یاد ہے ایک بار میرا خاوند تمہیں کہیں بھیج رہا تھا اور تم بیمار تھے مگر میرا خاوند کہہ رہا تھا کہ تم خواہ راستے میں مر جاؤ، تمہیں جانا پڑے گا۔ اُس وقت میں نے تمہیں بچایا تھا۔ میں خاوند سے لڑ پڑی تھی کہ وہ تمہیں اس حالت میں اتنے لمبے سفر پر بھیج رہا تھا کہ تم اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل نہیں تھے۔ میں نے تمہیں رکوا لیا تھا اور میں طبیب کو تمہارے علاج

کے لیے لائی تھی۔ تم نہیں جانتے کہ اپنے خاوند سے مجھے کیسی کیسی بیہودہ باتیں سننا پڑی تھیں۔"

"مجھے یاد ہے سبیلہ" — ارتگین نے کہا۔ "آقا نے مجھے بھی بہت کچھ کہا تھا اور اُس نے یہاں تک کہا تھا کہ تمہاری اور سبیلہ کی ایک دوسرے میں یہ دلچسپی فوراً ختم ہو جانی چاہیئے، ورنہ تم جانتے ہو کہ غلاموں کی سزا کیا ہے ..... میں ان قزاقوں کے ساتھ خوش ہوں سبیلہ! یہاں مجھے کوئی غلام نہیں کہتا۔ اگر تم کسی تکلیف میں ہو تو تم نے میرے ساتھ جو نیکیاں کی ہیں، ان کا صلہ دینے کے لیے اپنی جان بھی قربان کر دوں گا۔"

سبیلہ کچھ دیر چپ چاپ رہی اور ارتگین کو دیکھتی رہی۔ صحرا کی وہ رات بھی چپ چاپ تھی۔ خیمہ گاہ میں جیسے لاشیں پڑی تھیں۔ صحرائی لومڑیاں بھی سو گئی تھیں مگر سبیلہ کے سینے سے بگولے اُٹھ رہے تھے۔

"کہو سبیلہ!" — ارتگین نے کہا۔ "چپ کیوں ہو گئی ہو۔ اپنے غلام کو آزما لو۔"

"سوچ رہی ہوں کہ تم میری بات سمجھ بھی سکو گے یا نہیں" — سبیلہ نے آہ لے کر کہا۔ "کہہ دیتی ہوں۔ سن لو ..... مجھے اپنی ذات کے لیے کچھ نہیں چاہیئے۔ کوئی صلہ نہیں چاہیئے۔ تم نے حماد بن علی کی باتیں غور سے سنی تھیں جو وہ بدوؤں کے سرداروں سے کہہ رہا تھا! وہ غزنی کے حاجیوں کے قافلے کو لوٹنا چاہتا ہے۔"

"کیا تم اسے روک سکتی ہو؟" — ارتگین نے کہا۔ "کیا تم نے ابھی تک غزنی کو دل سے اتارا نہیں؟"

"اتار دیا تھا" — سبیلہ نے کہا۔ "لیکن غزنی کی آبرو میرے خون میں موجود ہے۔ حماد جب غزنی کا قافلہ لوٹنے کی باتیں کر رہا تھا تو میں نے کچھ بھی محسوس نہ کیا مگر جب اُس نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ یہ غزنی کے حسن کا نمونہ ہے اور یہ

تمہارا انعام ہوگا اور غزنی کے قافلے کے ساتھ ایسی بہت سی لڑکیاں ہوں گی تو میرا جسم کانپ اٹھا جیسے ہوا کا بڑا ہی سرد جھونکا آیا ہو یا زمین ہل گئی ہو۔ میرا مجاہد باپ میری آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ اُس کی وہ باتیں مجھے سنائی دینے لگیں جو وہ بارہ تیرہ برس کی عمر تک مجھے سناتا رہا تھا۔ میں عورت تھی۔ حماد کی زبان کا تیر میرے دل میں اُتر گیا۔ میں اس پر جوابی حملہ نہ کر سکی۔"

"تم نے شاید اسی بات سے خفا ہو کر میری طرف دیکھا تھا؟" — ارتگین نے پوچھا۔

"ہاں!" — سبیلہ نے کہا — "میرے سینے میں انتقام کا شعلہ بھڑک اٹھا تھا اور اُس وقت خدا کے بعد صرف تم تھے جس کی طرف میں دیکھ سکتی تھی مگر تمہارا چہرہ بتا رہا تھا کہ تم نے کچھ بھی محسوس نہیں کیا۔ میں نے اُسی وقت سوچ لیا تھا کہ تمہیں تنہائی میں بلاؤں گی اور تمہارے دل میں بھی اُس مٹی کی آبرو کا احساس بیدار کروں گی جس نے تمہیں جنم دیا تھا.... میں نے یہ بھی سوچا تھا کہ میں بے بس اور مجبور ہوں اور قزاق قبیلوں کے اس بادشاہ کا میں کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتی۔ میں نے یہ چوٹ برداشت کرنے کا بھی ارادہ کیا تھا مگر حماد کے خیمے میں جا کر اس نے مجھے بدمست اور مخمور نگاہوں سے دیکھا اور جب میں نے اس کے جسم کی تپش محسوس کی تو میرے سینے کے شعلے پھر بھڑک اُٹھے۔"

ارتگین خاموش تھا جیسے وہ کچھ سن ہی نہ رہا ہو۔

"سن رہے ہو ارتگین؟"

"سن رہا ہوں" — ارتگین نے کہا — "تمہارے انتقام کے شعلے بے بس اور مجبور ہیں۔"

"حماد نے کہا — "سبیلہ! سنا ہے غزنی کا سلطان محمود اپنے آپ کو بت شکن کہلاتا ہے" — اُس نے قہقہہ لگا کر کہا — "محمود مجھ جیسا لٹیرا ہے۔ ڈاکہ زن ہے۔ میں کسی روز اس بت شکن کا بت توڑ دوں گا" — یہ سن کر میرا خون کھول اٹھا۔ وہ جب گہری نیند سو گیا تو میں نے اُس کا خنجر نکال لیا۔

میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ میں نے شمع کی روشنی میں اندازہ کر لیا کہ اس شخص کا دل کہاں ہے۔ میں اسے ایک ہی وار میں ٹھنڈا کر دینا چاہتی تھی۔ پھر میرے ہاتھ ساکن ہو گئے۔ مجھے اطمینان ہونے لگا کہ میں غزنی کی توہین کا اور غزنی کے سلطان کی توہین کا انتقام لے رہی ہوں۔ میرا ہاتھ اوپر اٹھا اور ایسے لگا کہ کسی غیبی ہاتھ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا ہو....

مجھے آواز سی سنائی دی — 'اس آدمی کو قتل کر کے نہ تم زندہ رہ سکتی ہو نہ ان بدوؤں سے غزنی کے قافلے میں آنے والی بیٹیوں کو بچا سکتی ہو۔ صبح یہ وحشی اور درندے اپنے بادشاہ کے خون کا جو انتقام تم سے لیں گے اسے تصور میں لاؤ' — میرا ہاتھ رک گیا۔ میں نے سوچا۔ بہت سوچا۔ میں کوئی جرم نہیں کر رہی تھی اس لیے عقل میرا ساتھ دے رہی تھی۔ مجھے یاد آ گیا کہ میں نے تمہیں بلا رکھا ہے۔ تم سے بات کر کے کچھ کرواں گی.... ارتگین! غزنی کی بیٹیاں قزاقوں کی داشتائیں نہیں بنیں گی۔ سلطان محمود قزاق اور لٹیرا نہیں۔ میں ان بیٹیوں کی آبرو بچانے کے لیے کفّارہ ادا کروں گی۔"

"کیا حماد بن علی کو میرے ہاتھوں قتل کرانا چاہتی ہو؟"

"نہیں" — سبیلہ نے جواب دیا — "اس ایک آدمی کے قتل سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ یہ مر گیا تو بھی یہ لوگ غزنی کے قافلے کو لوٹ لیں گے۔ میں نے یہ سوچا ہے کہ تم یہاں سے نکل جاؤ۔ میں یہیں رہوں گی۔ اگر میں بھی تمہارے ساتھ نکل بھاگی تو یہ لوگ ہمارا پیچھا کریں گے۔ تم مرد ہو۔ گھوڑا تیز دوڑا سکتے ہو۔ سفر کی سختیاں برداشت کر سکتے ہو۔ میں شاید نہ کر سکوں۔ میں تمہارے لیے بوجھ نہ بن جاؤں۔ رفتار سست ہوئی تو ہم پکڑے بھی جائیں گے۔"

"یہ لوگ میرا بھی پیچھا کر سکتے ہیں" — ارتگین نے کہا — "انہیں یہ خطرہ ہوگا کہ میں غزنی جا کر اطلاع دے دوں گا کہ راستے میں قافلے پر حملہ ہوگا اور سلطان محمود قافلے کے ساتھ فوج کے ایک دو دستے بھیج دے گا۔"

"اس کے باوجود تم چلے جاؤ" — سبیلہ نے کہا — "ہمیں خطرہ تو مول لینا ہی ہوگا.... تم ڈر رہے ہو۔ تمہارا ڈر بجا ہے۔ تمہاری کوئی بیٹی نہیں۔ تمہاری

کوئی بہن نہیں۔ میں تمہاری بہن ہوتی تو تم میری عزت پر مر مٹتے۔ ارتگین! غزنی کی مٹی تمہاری بیٹی ہے۔ تمہاری بہن اور تمہاری ماں ہے۔ میں جانتی ہوں کہ اس مٹی نے تمہیں کچھ نہیں دیا۔ تمہیں وہاں غلام سمجھا گیا۔ میں اچھی طرح سمجھتی ہوں کہ جس ملک کے حکمران اپنی رعایا کو بھوکا اور ننگا رکھتے ہیں اور اُسے ان حقوق سے محروم رکھتے ہیں جو انسان کو خدا نے دیئے ہیں تو ان انسانوں کے دلوں سے اپنے وطن اور اپنے مذہب کی محبت نکل جاتی ہے۔ وہاں بھائی بھائی کا دشمن ہو جاتا ہے.....

"میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ تم سلطان محمود کے پاس پہنچ گئے اور اُسے یہ بتایا کہ تم غلام تھے تو وہ تمہیں گلے لگا لے گا"۔۔۔ سبیلہ نے کہا۔ "پھر تم غلام نہیں رہو گے۔ تم سلطان کی نگاہ میں اور خُدا کی نگاہ میں بھی قابلِ احترام انسان بن جاؤ گے۔ اپنے آپ میں غیرت بیدار کرو ارتگین! اپنے وطن اور اپنے مذہب کی بیٹیاں وطن کی آبرو ہوتی ہیں۔ وہ قومیں ذلیل و خوار ہوتی ہیں جو اپنی بیٹیوں کی ناموس کو فراموش کر دیتی ہیں"۔

"میں تمہاری ایک بات بھی نہیں سمجھ سکا سبیلہ!"۔۔۔ ارتگین نے کہا۔۔۔ "میرے دل میں کسی نے وطن کی محبت پیدا ہی نہیں کی۔ مجھے نوکری کرنی ہے۔ اسی لیے ایک قزاق کے پاس بھی مطمئن ہوں لیکن تم جو کہو گی کروں گا۔ تم مظلوم ہو پھر بھی تمہارا ایمان محفوظ ہے۔ میں کہہ چکا ہوں کہ تمہاری نیکیوں کا صلہ ضرور دوں گا۔ کہو، مجھے کیا کرنا ہے"۔

"یہاں سے [illegible] طرح نکلو کہ کسی کو پتہ نہ چلے"۔۔۔ سبیلہ نے کہا۔ "تم راستے سے واقف ہو۔ [illegible] دنوں میں غزنی پہنچ جاؤ گے۔ اگر غزنی کے حاجیوں کا قافلہ وہاں سے چل پڑا ہو تو اُسے روک لینا اور میرِ کارواں کو بتا دینا کہ راستے میں کیا خطرہ ہے۔ اُسے کہنا کہ تم فوج کا انتظام کرنے جا رہے ہو۔ اگر قافلہ ابھی وہیں ہو تو سلطان محمود کے پاس چلے جانا اور اُسے بتانا کہ قافلے پر پانچ ہزار بدو حملہ کریں گے۔ سلطان سے یہ ضرور کہ دینا کہ قوم کی ایک بیٹی نے پیغام بھیجا ہے کہ حاجیوں کے قافلے

نہیں رک سکتے، قزاقوں کو روکا جا سکتا ہے۔ فوج کو ساتھ بھیجنا ورنہ غزنی کی بیٹیاں بابل اور بغداد کے بازاروں میں بک جائیں گی۔ سلطان سے کہنا کہ قافلے سے ایک بھی بیٹی اغوا ہو گئی تو خدا سلطان کو کبھی نہیں بخشے گا"۔

"میں کہہ دوں گا"۔۔۔ ارتگین نے کہا۔ "میں کہہ دوں گا۔ دعا کرو کہ میں زندہ وہاں پہنچ جاؤں، مگر تم یہاں سے نہیں نکلو گی! ..... میں تمہیں اس درندے کے پاس چھوڑ کر کس طرح جا سکوں گا؟"

"تم چلے جاؤ ارتگین! تم چلے جاؤ"۔۔۔ سبیلہ نے جذبات سے لرزتی آواز میں کہا۔ "اگر زندہ رہی تو باقی عمر تمہاری غلام رہوں گی۔ میرے جسم اور میری روح کے مالک صرف تم ہو گے، پھر تم نہیں میں غلام ہوں گی۔ تم غزنی پہنچ جاؤ گے۔ تم کوئی گناہ نہیں کر رہے۔ خدا تمہارے ساتھ ہے"۔

"کیا تم ان لوگوں کو کسی طرح میرے تعاقب سے روک سکتی ہو؟"

"کوشش کروں گی"۔۔۔ سبیلہ نے کہا۔ "میں نے ان لوگوں سے بہت کچھ سیکھ لیا ہے۔ تمہیں اپنا آقا یاد ہے نا جو میرا خاوند تھا۔ اس کی بیویوں کو تم بھی جانتے تھے اور تم یہ بھی جانتے تھے کہ میرے خاوند کی محل جیسی حویلی میں کیسی کیسی سازشیں ہوتی تھیں۔ جہاں دولت اور عورت ہو، وہاں سے خلوص اور شرافت رخصت ہو جاتی ہے۔ میں شیطان کی اس دنیا کا ایک حصہ بنی رہی ہوں۔ میں ہر شیطانی کام کر سکتی ہوں..... تم یہاں کے ایک سردار گوکیل کو جانتے ہو گے جس نے کہا تھا کہ وہ ایک ہزار آ[illegible]ی اپنے ساتھ لائے گا۔ مجھے اس شخص سے نفرت ہے۔ اس نے مجھے کہا تھا کہ میں حماد سے ہٹ کر اُس کے ساتھ چلی چلوں۔ میں نے اُسے کہا تھا کہ میں حماد کی بیوی نہیں پھر بھی اُسے دھوکہ نہیں دوں گی۔ اُس نے مجھے لالچ دیئے تھے اور پھر دھمکی دی تھی کہ وہ مجھے اغوا کر لے گا۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ میں نے اگر حماد کو بتا دیا تو وہ مجھے قتل کرا دے گا..... میں شاید اس سے انتقام لوں۔ تم یہاں کی باتیں چھوڑو ارتگین! اٹھو، تم کب یہاں سے نکلو گے"۔

"ابھی"۔۔۔ ارتگین نے کہا۔۔۔ "اب مجھ سے اور کچھ نہ پوچھو۔ تم چلی جاؤ"۔

رات کا آخری پہر گزر رہا ہے"۔۔ سبیلہ نے اُس کا ایک ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر آنکھوں سے لگایا پھر چُوما اور وہاں سے اپنے خیمے میں آ گئی۔

خیمہ گاہ میں وہی سکوت تھا جو پہلے تھا۔ ان لوگوں کو جاگنے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ ارتگین ان کے بے تاج بادشاہ کا خاص محافظ تھا۔ اُسے خیمہ گاہ میں گھومنے پھرنے، کوئی گھوڑا یا اونٹ کھولتے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ جس خیمے میں کھانے پینے کا سامان پڑا تھا وہاں سے کچھ اٹھاتے بھی اسے کوئی روک نہیں سکتا تھا۔ اُس نے جب دیکھا کہ سبیلہ اپنے خیمے میں پہنچ گئی ہوگی، وہ اپنے خیمے میں گیا۔ برچھی، تلوار، کمان اور ترکش اٹھائی، کچھ کپڑے لیے۔ سفری تھیلے اٹھائے اور رسد والے خیمے میں چلا گیا۔ وہاں سے پانی کے مشکیزے اور کھانے کا سامان اُٹھایا اور ایک اونٹ جا کھولا۔ سامان اس کے ساتھ باندھا اور اس پر سوار ہو کر اُسے اٹھایا۔

سبیلہ اپنے خیمے میں پردہ ذرا ہٹا کر دیکھ رہی تھی۔ اسے خیمے سیاہ ڈھیروں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ اُس کا دل دھڑک رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اُسے خیموں سے دور ایک اونٹ کا ہیولا اس طرح نظر آیا جیسے اونٹ اُفق کی لکیر پر چلا جا رہا ہو۔ سبیلہ کے ہونٹوں سے دعا سرگوشیاں بن کے نکلنے لگی اور اونٹ کا ہیولا چھوٹا ہوتا گیا، دور ہٹتا گیا پھر وہ اُس کے آنسوؤں کی دھند میں چھپ گیا۔۔۔ سبیلہ بستر پر جا گری اور اُس کی آنکھ لگ گئی۔

اُس کی جب آنکھ کھلی، آدھا دن گزر گیا تھا۔ وہ اُٹھ بیٹھی۔ اُسے رات کی بات یاد آئی تو اُسے خوف سا محسوس ہُوا جیسے ارتگین اُسے دھوکہ دے کر حماد کو بتا دے گا۔ وہ خیمے سے نکلی۔ ارتگین کے خیمے کا پردہ اٹھایا۔ وہ وہاں نہیں تھا۔ اُس کے ہتھیار اور اُس کے کپڑے بھی وہاں نہیں تھے۔ سبیلہ ارتگین کے خیمے سے نکل رہی تھی تو حماد اپنے خیمے سے باہر آیا۔ اُس نے سبیلہ کو اپنے پاس بلا کر پوچھا کہ وہ ارتگین کے خیمے میں کیا لینے گئی تھی۔

سبیلہ نے اپنے چہرے پر گھبراہٹ کا تاثر پیدا کر کے کہا۔ "میں ارتگین کو دیکھنے گئی تھی کہ وہ وہاں ہے یا نہیں .... مجھے ڈر ہے کہ وہ زندہ نہیں ہے۔ وہ قتل ہو چکا ہے"۔

"قتل؟"۔۔ حماد بن علی نے پوچھا۔ "تمہارا دماغ ٹھکانے معلوم نہیں ہوتا۔ یہاں کون کسی کو قتل کر سکتا ہے؟"

"گوگیل"۔۔ سبیلہ نے کہا۔ "گوگیل نے ارتگین کو غائب کر دیا ہے۔ اب میری باری ہے۔ میں نے آپ کو پہلے نہیں بتایا تھا۔ آپ جب مجھے یہاں لائے تھے تو گوگیل نے مجھے لالچ اور دھمکیاں دے کر منوانے کی کوشش کی تھی کہ میں آپ سے بھاگ کر اُس کے پاس چلی جاؤں۔ میں نے اسے کہا تھا کہ میں اپنے آقا کو دھوکہ نہیں دوں گی۔ اس کے بعد وہ اب آیا ہے۔ گزشتہ رات میں آپ کے ساتھ آپ کے خیمے میں گئی تھی۔ آپ سو گئے تو میں وہاں سے نکل کر اپنے خیمے میں جانے کی بجائے ٹہلتے ٹہلتے پانی تک چلی گئی۔ گوگیل شاید میرا پیچھا کر رہا تھا۔ وہ میرے پاس آ گیا اور مجھے ورغلانے لگا۔ میں نے اسے ٹالنا چاہا تو اس نے مجھ پر دست درازی کی۔ میں اپنے آپ کو اکیلی سمجھ رہی تھی لیکن اچانک ارتگین آ گیا۔ وہ مجھے بتائے بغیر میری حفاظت کے لیے مجھ سے کچھ دور موجود رہا۔

"گوگیل نے اُسے آپ کا غلام سمجھ کر گالیاں دیں اور وہاں سے چلے جانے کو کہا۔ ارتگین نے اُسے بڑی دلیری سے کہا کہ وہ اپنے آقا کی عزت پر جان قربان کر دے گا۔ گوگیل نے اُسے کہا کہ یہ رات تمہاری زندگی کی آخری رات ہے۔ جاؤ۔ اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو اپنے آقا کے خیمے میں سونا .... وہ چلا گیا۔ ارتگین مجھے میرے خیمے میں چھوڑ کر چلا گیا۔ میں جانتی ہوں کہ گوگیل درندہ ہے۔ اُس نے رات کو ارتگین کو غائب کروا دیا ہے"۔

حماد بن علی غصے سے پھنکارنے لگے اور اُس نے [illegible]

"میں جانتا ہوں کہ تم قبیلے کے سردار ہو" — حماد بن علی نے گوگیل سے کہا — "لیکن تم بھول گئے ہو کہ میں کون ہوں ... میں تمہیں بخش دوں گا۔ میرا آدمی مجھے واپس کردو"

"کون سا آدمی؟" — گوگیل نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ارتگین" — حماد نے کہا "میرا محافظ جو گذشتہ رات تمہارے اور سبیلہ کے درمیان آگیا تھا"

گوگیل حیران و پریشان ہو گیا۔ سبیلہ نے حماد سے کہا کہ یہ شخص اپنا جرم چھپانے کے لیے انجان بن رہا ہے۔

"گوگیل!" حماد بن علی نے اُسے کہا "کیا تم ایک غلام اور ایک داشتہ کی خاطر مجھ سے دشمنی مول لے رہے ہو؟ اس وقت ہمیں اتحاد اور اتفاق کی ضرورت ہے۔ میں تمہیں اس جیسی دس لڑکیاں لا دوں گا مگر تم نے میری داشتہ پرست درازی کرکے میرے محافظ کو غائب کر دیا ہے۔ کیا تم قبیلے کے سردار رہو گے؟ کیا تم مجھ سے ٹکر لے کر سردار رہ سکو گے؟ زندہ رہ سکو گے؟"

بات بڑھ گئی۔ چونکہ گوگیل نے ارتگین کو غائب نہیں کیا تھا اس لیے وہ آگ بگولہ ہو رہا تھا۔ حماد نے تمام سرداروں کو اکٹھا کر لیا اور سبیلہ سے کہا کہ وہ سب کو سنائے کہ گوگیل نے کیا کیا ہے۔ سبیلہ نے وہی بات سنا دی جو وہ حماد کو سنا چکی تھی۔ گوگیل غصے سے اُٹھا اور یہ کہہ کر چل پڑا — "میرا اور میرے قبیلے کا تمہارے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔"

اُس نے پیٹھ پھیری ہی تھی کہ حماد نے اپنے قریب کھڑے ایک آدمی کی کمان لی اور اُس کی ترکش سے تیر نکال کر کمان میں ڈالا۔ دوسرے لمحے تیر گوگیل کی پیٹھ میں اُترا ہوا تھا اور وہ ریت پر تڑپ رہا تھا۔ اسی روز حماد نے ایک خاص تقریب منعقد کرکے گوگیل کے قبیلے کا ایک اور سردار مقرر کر دیا۔ اس لیے سب سے کہا کہ میں جانتا تھا کہ مجھے میرا محافظ واپس نہیں ملے گا۔ گوگیل نے اسے یقیناً قتل کروا کے اس کی لاش کہیں دبا دی ہے۔۔

اُس وقت تک ارتگین بہت دور نکل گیا تھا۔ صبح طلوع ہونے تک وہ اونٹ کو دوڑاتا رہا تھا۔ سورج اُبھرا تو اُس نے اونٹ کی رفتار کم کر دی۔ اُس نے گھوم گھوم کے دیکھا۔ اُس کے تعاقب میں کوئی نہیں آرہا تھا۔

حماد بن علی نے قبائلی سرداروں کو آخری ہدایات دیں اور انہیں کید کے صحرا کے قریب ایک جگہ بتا کر کہا کہ وہ اپنے آدمیوں کو وہاں جمع کریں۔ اسی روز سب اپنے اپنے قبیلوں کو روانہ ہو گئے اور حماد بھی وہاں سے چلا گیا۔ وہ جب اپنے ٹھکانے پر پہنچا تو اُس کا ایک اور جاسوس غزنی سے آیا جس نے اُسے بتایا کہ غزنی کے قافلے کی نفری اور زیادہ بڑھ گئی ہے اور اس میں مالدار تاجروں کی خاصی تعداد ہے۔ اُس نے حماد کو یہ بھی بتایا کہ راستے میں لوگ اس قافلے کا انتظار کر رہے ہیں۔ اس طرح یہ قافلہ اور زیادہ بڑا ہو جائے گا۔ اس جاسوس کو کوئی ایسے آثار نہیں ملے تھے کہ قافلے کی حفاظت کے لیے فوج کا کوئی انتظام ہو گا یا نہیں۔

"میں حجاز تک فوج کا دستہ کیسے بھیج سکتا ہوں" — غزنی میں سلطان محمود غزنوی قافلے کے ایک وفد سے کہہ رہا تھا۔ "قوم کے ہر فرد کو سپاہی ہونا چاہیئے۔"

قافلے کا ایک وفد (محمد قاسم فرشتہ کی تحریر کے مطابق) سلطان محمود کے پاس یہ درخواست لے کر گیا تھا کہ قافلہ بہت بڑا ہے اور اس کے ساتھ خواتین اور بچے بھی ہیں اور تاجروں کا قیمتی مال بھی ساتھ جا رہا ہے اس لیے قافلے کی حفاظت کے لیے فوج کا ایک دستہ ساتھ ہونا چاہیئے۔

"میں بے خبر نہیں کہ حاجیوں کے قافلے رہزنوں اور قزاقوں کے ہاتھوں لٹتے رہتے ہیں" — سلطان محمود نے کہا "میں حج پر جانے والوں کو ہر سہولت اور مدد دیا کرتا ہوں مگر یہ ممکن نظر نہیں آتا کہ میں مکہ معظمہ تک فوج قافلے کے ساتھ بھیجوں۔ اتنے بڑے قافلے میں بے شمار آدمی ایسے ہوں گے جو لڑ سکتے ہیں اور شہسوار بھی ہیں۔ قافلے میں سپاہی بھی حج کو جا رہے ہیں۔ آپ لوگ پوری طرح مسلح ہو کر جائیں۔ تیر و کمان ساتھ رکھیں۔ مجھے اتنے

بڑے قافلے پر حملے کا کوئی خطرہ نظر نہیں آتا۔ قافلے وہ لٹتے ہیں جن میں مسافر بہت کم ہوتے ہیں۔ آپ لوگ بے خوف ہو کر جائیں"۔

جب وفد چلا گیا تو سلطان محمود نے اپنے مشیروں اور سالاروں کی ایک محفل میں کہا۔ "میں نے ان لوگوں کو مایوس کیا ہے۔ یہ فریضۂ حج ادا کرنے جا رہے ہیں۔ مجھے ان کی درخواست مان لینی چاہیئے تھی لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہمیں فوج کی کتنی زیادہ ضرورت ہے۔ یہاں کے حالات ٹھیک نہیں۔ سرحدوں پر ہر وقت خطرہ موجود رہتا ہے۔ ابھی دو تین دن گزرے ہندوستان سے تشویشناک خبریں آئی ہیں۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ قنوج کا مہاراجہ راجیا پال جو وہاں سے بھاگ گیا تھا، ہمارے قلعہ دار کے پاس گیا اور اُس نے ہماری شرائط تسلیم کرنے کا معاہدہ کیا اور قنوج سے کچھ دُور اپنی نئی راجدھانی بنانے کی اجازت مانگی ہے۔ میں اُس سے تاوان اور باج وصول کروں گا اور اُسے نئی راجدھانی بنانے کی اجازت دے دوں گا مگر وہاں کے تین مہاراجے اکالنجر، گوالیار اور لاہور، مہاراجہ راجیا پال کے دشمن بن گئے ہیں۔ قنوج سے پیغام آیا ہے کہ یہ مہاراجے مہاراجہ قنوج کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کر رہے ہیں اور انہوں نے ہمیں فیصلہ کن شکست دینے کے لیے متحدہ محاذ بنالیا ہے۔ معلوم نہیں کب ہمیں ہندوستان کو کوچ کرنا پڑے"۔

قافلہ روانہ ہونے والا تھا۔ سلطان محمود کے پاس جو وفد گیا تھا اس کے ارکان نے قافلے کے تمام مسافروں سے کہہ دیا تھا کہ وہ مسلح ہو کر چلیں۔ ہتھیار اکٹھے کرنے کے لیے قافلے کی روانگی ایک دو دنوں کے لیے ملتوی ہو گئی۔

اور اُس وقت سلطان محمود کو اطلاع دی گئی کہ ارتگین نام کا ایک آدمی بڑی بری حالت میں آیا ہے۔ کہتا ہے بہت دُور سے آیا ہوں اور یہ

بھی کہتا ہے کہ حاجیوں کے قافلے کو روک کے رکھو۔ سلطان محمود حاجیوں کے نام پر ضروری کام بھی چھوڑ دیا کرتا تھا۔ اُس نے ارتگین کو فوراً بلا لیا۔ وہ تو زندہ لاش بن چکا تھا۔ منہ کھلا ہوا اور آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ وہ کھڑا رہنے کے قابل نہیں تھا۔ اُسے سہارا دے کر بٹھایا گیا۔ مشروب پلائے گئے، کچھ کھلایا گیا تو وہ ہوش میں آنے لگا۔ وہ اچانک اُٹھ کھڑا ہوا اور کمرے میں تیز تیز ٹہلنے لگا۔

"سلطان غزنی و خراسان سے گستاخی کی معافی چاہتا ہوں"۔ ارتگین نے کہا۔ "ایک مہینہ ہو گیا ہے، میں پاؤں پر نہیں چلا۔ پہلے اونٹ پر سوار رہا اور جب پہاڑی علاقہ آیا تو ایک سوار سے گھوڑا چھین کر اونٹ اُسے دے دیا۔ راستے میں دو اور سواروں سے گھوڑے چھینے اور تھکن اور بھوک سے ادھ موئے گھوڑے اُن کے پاس چھوڑے۔ گھوڑے کی پیٹھ پر کھاتا پیتا رہا اور کم گھوڑے کو دُلکی نہ چلنے دیا ورنہ ڈیڑھ ماہ کی مسافت ایک ماہ میں طے نہ ہوتی"۔

"وہ بات کیا ہے جو تمہیں اس حال میں میرے پاس لائی ہے؟"۔ سلطان محمود نے پوچھا۔

"اگر آپ حجاز کے قافلے کے ساتھ فوج کے دو دستے نہیں بھیج سکتے تو قافلے کو غزنی سے باہر نہ نکلنے دینا"۔ ارتگین نے کہا۔ "کیدکے صحرا میں قافلے کو لوٹنے کے لیے قزاقوں کا وہ گروہ بلکہ وہ فوج خیمہ زن ہے جسے خلیفۂ بغداد کی پشت پناہی حاصل ہے"۔

"خلیفۂ بغداد کی پشت پناہی؟"

"اگر سلطانِ غزنی کو ایک غلام کی بات پسند نہیں آئی تو غلام جان بخشی چاہتا ہے"۔ ارتگین نے کہا۔ "اگر خلیفہ کی پشت پناہی نہیں تو اُس کے سالاروں اور حاکموں کی مدد حاصل ہوگی۔ اگر یہ بھی نہیں تو اسے جھوٹ نہ سمجھنا کہ تمام بدو قبیلے ایک شخص حماد علی کی قیادت میں غزنی کے قافلے

کوکید کے صحرا میں اُس جگہ جہاں ٹیلے زیادہ ہیں، لُوٹ لیں گے اور لڑکیوں
کو اٹھا لے جائیں گے۔ حماد بن علی بغداد گیا تھا۔ میں چونکہ اس کے ساتھ
تھا اس لیے میں یقین کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ وہ پہلے خلیفہ کے ایک
سالار اور دو بڑے حاکموں سے ملا تھا، پھر وہ اسے خلیفہ کے پاس
لے گئے تھے۔"

ارتگین نے سلطان محمود کو تفصیل سے بتایا کہ حماد بن علی نے کس طرح اور
کہاں بدو قبائل کے سرداروں کو اکٹھا کیا اور قافلے پر حملے کا منصوبہ طے
کیا ہے۔ قزاقوں کی تعداد پانچ ہزار ہوگی۔

"پانچ ہزار؟" سلطان محمود حیرت زدہ ہوگیا۔

"اتنی زیادہ تعداد کی وجہ یہ ہے کہ حماد بن علی کے جاسوسوں نے جو
یہاں آکر قافلے کی تیاری دیکھ گئے ہیں، وہاں جاکر بتایا ہے کہ قافلے میں ہندوستان
سے آیا ہوا مال جارہا ہے اور قافلے میں زیادہ تر لوگ فوجی ہیں یا لڑنے والے ہیں"
— ارتگین نے کہا۔ "قافلے کی نفری ڈیڑھ ہزار بتائی گئی ہے۔"

"قافلے میں کوئی فوجی نہیں ہے۔" سلطان محمود نے کہا۔ "اگر فوجیوں
کو حج کی فرصت ہوتی تو سب سے پہلے میں جاتا۔" وہ گہری سوچ میں
کھو گیا اور بولا۔ "میں حجاز کے قافلے کو نہیں روک سکتا۔ اگر میں خود حج پر
جا نہیں سکتا تو جانے والوں کے جان و مال کی حفاظت میرے فرائض میں
ہے۔ میں حاجیوں کی سلامتی کی خاطر سلطنتِ غزنی کی سلامتی خطرے میں ڈال
سکتا ہوں"۔ وہ بولتے بولتے رُک گیا اور اس نے ارتگین کو بڑی غور سے
دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "لیکن میں نے تم سے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ تم ہو کون
اور تم جو قزاقوں کے سرغنہ کے خاص آدمی ہو، دل میں ہمارے قافلے
کی ہمدردی کس طرح لے کر آئے ہو؟ کیا تم اللہ کے اس سپاہی کو دھوکہ
دے سکو گے جس کے نام سے ہندوستان کے دیوتاؤں کے بُت کانپ
جاتے ہیں؟"

"غزنی کی ایک بیٹی جو بہت بڑے دھوکے کا شکار ہے، غزنی کی بیٹیوں
کے لیے کفارہ ادا کرنا چاہتی ہے۔" ارتگین نے کہا۔ "وہ آبرو باختہ غزنی
کی آبرو کو بچانے کے لیے اپنے سلطان کو پکار رہی ہے۔ میں ایک غلام
ہوں، ابن غلام ہوں، ترک ہوں لیکن جسم غزنی کی مٹی میں لیا ہے۔ اس
لڑکی نے جس کا نام سبیلہ ہے اور جس کا باپ آپ کی فوج میں شتر سوار
تھا اور شہید ہوگیا ہے، مجھ جیسے غلام کے دل میں غزنی کی مٹی کی عظمت
پیدا کردی ہے۔ اگر سلطانِ عالی مقام کا دل بہت مضبوط ہے تو سنیں۔"

ارتگین نے اپنا ماضی اور پھر سبیلہ کی زندگی کی کہانی سلطان محمود کو سنا
دی اور اسے تفصیل سے سنایا کہ سبیلہ نے اسے کس طرح غزنی آنے کے
لیے تیار کیا تھا۔ سلطان محمود کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

"جس قوم کی بیٹیاں اس مجبوری کی حالت میں بھی اپنے ایمان اور کردار
کو مرنے نہ دیں اس قوم کو کوئی شکست نہیں دے سکتا۔" سلطان محمود نے
کہا اور اپنے سامنے بیٹھے ہوئے حاکموں وغیرہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "تم اپنی
اُبھرتی ہوئی نسل کو گناہوں میں ڈبو دو لیکن روایات جو خون میں شامل ہو گئی
ہیں وہ ایک نہ ایک دن رنگ لائیں گی.... اور تم" — سلطان نے ارتگین
کی طرف ہاتھ کرکے کہا۔ "تم غلام نہیں ہو۔ آگے آؤ" وہ آگے آیا تو سلطان
نے اُسے گلے لگالیا اور بولا۔ "ہم سب غلام ہیں.... اللہ کے رسولؐ کے
غلام اور یہی مسلمان کی عظمت ہے"۔ سلطان نے پُرجوش آواز میں کہا —
"قافلہ جائے گا اور اس کے ساتھ فوج بھی جائے گی۔ غزنی کی سرحدوں
پر ہمارا خدا نظر رکھے گا۔"

یہ تو جذبات کی بات تھی کہ سلطان محمود نے کہہ دیا کہ فوج جائے گی
لیکن اس نے فوج کو کبھی جذباتی کیفیت میں استعمال نہیں کیا تھا۔ اس
لیے دو سالاروں اور مشیروں کو بلایا۔ غزنی کی سرحدوں کی، اندرونی حالات

کی اور ہندوستان سے آنے والے پیغامات کی صورتِ حال پر بات چیت کی اور جائزہ لیا کہ قزاقوں کی تعداد اگر پانچ ہزار ہے تو فوج کی کتنی نفری ساتھ بھیجی جائے۔ سلطان محمود نے کہا کہ بدّو گھوڑے اور اونٹ دوڑاتے ہوئے لڑتے ہیں اور وہ بھاگنے کا راستہ بھی صاف رکھتے ہیں، اس لیے قافلے کے ساتھ چھاپہ مار دستہ اور ایک دستہ تیر اندازوں کا بھیجا جائے۔

اُس وقت کی کسی بھی تحریر سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ فیصلہ کیوں کیا گیا کہ جو دستے قافلے کے ساتھ بھیجے گئے ان کی قیادت کسی سالار کی بجائے قاضی القضاۃ ابو محمد کو دی گئی۔ محمد قاسم فرشتہ نے مختلف مؤرخوں اور اپنی تحقیق کے حوالوں سے یہ تین نام — حماد بن علی، ارتگین اور قاضی القضاۃ ابو محمد — وثوق سے لکھے ہیں۔ قاضی القضاۃ کی حیثیت آج کے چیف جسٹس کی ہوتی تھی۔ مذہبی امور کے فیصلے بھی وہی کرتا تھا۔ اُس دور میں قاضی فنِ حرب و ضرب کی مہارت بھی رکھتے تھے۔

فرشتہ لکھتا ہے "سلطان محمود نے قاضی القضاۃ ابو محمد کو خاصی فوج دے کر قافلے کے ساتھ بھیجا۔ سلطان محمود نے ابو محمد کو تیس ہزار درہم اس مقصد کے لیے دیئے کہ لڑائی کی بجائے یہ رقم قزاقوں کو دے کر اُن سے معاہدہ کر لیا جائے کہ قافلے کو خیریت سے جانے دیں... سلطان کا یہ انتظام دیکھ کر قافلے میں کئی ہزار لوگ شامل ہو گئے۔"

اور قافلہ روانہ ہو گیا۔ قافلے کو الوداع کہنے کے لیے سلطان محمود خود گھوڑے پر سوار دُور تک ساتھ گیا۔ وہ قافلہ کئی میل لمبا تھا۔ سلطان اِدھر اُدھر گھوڑا دوڑاتا اور مسکراتے ہوئے سب کو ہاتھ ہلاتا اور خیریت سے واپس آنے کی دعائیں دیتا جا رہا تھا۔ پھر وہ ایک بلند جگہ جا کھڑا ہوا اور اُس وقت وہاں سے اُترا جب قافلے کا آخری مسافر اُس کے سامنے سے گزر گیا۔ وہ بہت دیر تک جاتے ہوئے قافلے کو دیکھتا رہا۔ آخر اُس کی آہ نکل گئی اور اُس نے کہا "خوش نصیب ہیں جو حجاز کو جا رہے

ہیں.... اللہ ان کا محافظ ہو۔"

ارتگین قاضی القضاۃ کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا۔

کیدر کے صحرا میں ایک وسیع خطہ ایسا تھا جہاں صحرائی ٹیلے دیواروں اور عمارتوں کی طرح کھڑے تھے۔ ان میں بعض ٹیلے ستونوں کی شکل کے تھے اور بعض ڈراؤنے ڈراؤنے سے۔ ان میں سے راستہ گذرتا تھا۔ یہ جگہ بہت ہی خطرناک تھی۔ بھول بھلیاں تھیں۔

اس سے ذرا پرے حماد بن علی نے کیمپ لگا رکھا تھا۔ یہ کم و بیش چار ہزار بدّوؤں کی خیمہ گاہ تھی۔ وہ غزنی کے قافلے کو لُوٹنے کے لیے آ گئے تھے۔ وہ لڑاکے تھے، شہسوار تھے اور نڈر تھے۔ ان کا کوئی مذہب نہیں تھا۔ وہ اپنے قبیلے کے سردار کو ہی قابلِ عبادت سمجھتے تھے اور ان سے بڑا سرداروں کے سردار کو سمجھتے تھے جو اُس وقت حماد بن علی تھا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ سرداروں کے سردار پر نہ تیر اثر کرتا ہے نہ کوئی اور ہتھیار۔ قزاقی کو وہ جائز پیشہ سمجھتے تھے۔ ان کی نگاہ میں یہ کوئی مذموم حرکت نہیں تھی۔

حماد بن علی کے ساتھ سبیلہ بھی تھی۔ وہ بظاہر خوش تھی لیکن اندر سے کھوئی کھوئی رہتی تھی۔ وہ قافلے کے انتظار میں بے تاب تھی — اور اُس وقت تو وہ اندر سے کانپنے لگی جب رات کے وقت ایک بدّو نے آ کر حماد کو بتایا کہ قافلہ بہت بڑا ہے اور اس کے پیچھے پیچھے فوج بھی آ رہی ہے۔ بدّو نے یہ بھی بتایا کہ قافلہ کوئی ایک کوس دُور پڑاؤ کئے ہوئے ہے۔

حماد بن علی اس خطے کو جو دنیا کی نظروں سے اوجھل تھا، اپنی زمین سمجھتا تھا جیسے وہاں ہوائیں بھی اسی کے حکم سے چلتی ہوں۔ اُس نے دیکھ بھال کا کوئی انتظام نہ کیا۔ قاضی القضاۃ نے رات کو ہی کمانداروں سے صلاح مشورہ کر کے ٹیلوں کے علاقے میں موزوں بلندیوں پر تیر انداز

بٹھا سینے اور حماد کی خیمہ گاہ کا جائزہ بھی لے لیا لیکن اُس نے سلطان محمود کی ہدایات کے مطابق حملے میں پہل کرنے کی بجائے دوستانہ معاہدہ بہتر سمجھا۔ رات بھر فوج بیدار رہی۔

اُدھر بدو قبائل حملے کے لیے تیار ہو گئے۔ صبح طلوع ہوئی تو غزنی کی فوج کے دو آدمی حماد بن علی کے پاس گئے اور اُسے قاضی القضاۃ کا پیغام دیا کہ تم لوگ قافلے کو گذرنے دو۔ اس کے عوض تمہیں پانچ ہزار درہم ادا کئے جائیں گے۔

حماد بھڑک اُٹھا اور غصے سے تھوک اُڑاتے ہوئے بولا۔"پانچ ہزار درہم .... پانچ ہزار درہم سے تم میرے پاؤں کی خاک بھی نہیں خرید سکتے۔ تم میری توہین کرنے آئے ہو۔ میں بھکاری نہیں ہوں۔" اُس نے بدوؤں کے خیموں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔"اپنے قاضی سے جا کر کہو کہ میری طاقت دیکھے۔ کیا میں انہیں ایک ایک درہم دے کر واپس لے جاؤں؟ تمہارے قافلے کی ساری دولت میری ہے۔ تمام مال و دولت اور میری پسند کی تمام جوان عورتیں میرے حوالے کر دو اور قافلہ خیریت سے گذر جائے۔"

"حماد بن علی!" ایک پیغامبر نے کہا۔"طاقت پر اتنا غرور نہ کر۔ فرعون نہ بن۔ ہم درخواست لے کر نہیں آئے۔ دوستی کا ہاتھ بڑھانے آئے ہیں۔ قافلہ مال و دولت اور خواتین سمیت یہاں سے خیریت سے گزرے گا لیکن یہ ریت تیرے قزاقوں کے خون سے لال ہو جائے گی۔"

"چلے جاؤ یہاں سے"۔ حماد نے گرج کر کہا۔"میں اپنے خیمے میں آئے ہوئے مہمان کو قتل نہیں کیا کرتا۔ جاؤ۔"

پیغامبر واپس آ رہے تھے تو انہیں ارتگین مل گیا۔ اُس نے پوچھا کہ حماد نے کیا جواب دیا ہے۔ اُسے جب بتایا گیا تو وہ ہنس پڑا اور تیر و کمان کندھے سے لٹکائے ایک بلندی پر کھڑا رہا۔

قاضی القضاۃ کو سلطان محمود نے تیس ہزار درہم دیئے تھے لیکن اُس نے یہ رقم ضائع کرنی مناسب نہ سمجھی۔ اُس نے یہ جانتے ہوئے کہ اتنا بڑا قزاق پانچ ہزار درہم کی پیش کش کو اپنی توہین سمجھے گا، یہی پیشکش کی جو در اصل چیلنج تھا کہ حماد آؤ اور قافلے پر حملہ کرو۔ قاضی القضاۃ ابو محمد نے اپنی پیشکش کا جواب سنا تو اس نے فوج کو موزوں مقامات پر کر دیا۔ فوج کی نفری تھوڑی تھی۔

حماد بن علی نے غصے کی حالت میں بدوؤں کو اکٹھا کیا اور ٹیلوں کے باہر باہر سے انہیں پیشقدمی کر کے قافلے پر حملے کا حکم دیا۔ قافلہ ٹیلوں کے باہر تھا۔ حماد گھوڑے پر سوار ساتھ ساتھ تھا۔ اس کے ساتھ ایک علمدار تھا۔ علم سیاہ رنگ کا تھا۔ ساتھ دو محافظ تھے۔ اُدھر قافلے میں لٹنے والے کچھ لوگ تھے۔ وہ گھوڑوں اور اونٹوں پر سوار ہو گئے۔ عورتیں ہاتھ بلند کر کے دعائیں مانگنے لگیں۔ بدوؤں کے کالے اور کرخت چہرے بڑے ڈراؤنے تھے ___ اور وہ ایک ٹیلے پر سبیلہ کھڑی تھی۔

ارتگین بلندی سے اُتر کر ٹیلوں کے اندر چلا گیا اور ٹیلوں کی اوٹ میں اُس طرف نکل گیا جدھر سے بدوؤں کی فوج جا رہی تھی ___ ان کے گھوڑوں اور اونٹوں کی چال میں سستی تھی۔ ارتگین چھپ کر دیکھتا رہا۔ پھر اسے حماد بن علی نظر آیا۔ وہ بہت دور نہیں تھا۔ ارتگین نے اپنی کمان میں تیر ڈالا اور حماد کے چہرے کا نشانہ لے کر تیر چھوڑ دیا۔ تیر حماد کی کنپٹی میں اُتر گیا۔ وہ تیورا کر گھوڑے سے گرا۔ اُس کے محافظ ابھی دیکھ ہی رہے تھے کہ یہ کیا ہوا ہے کہ ایک تیر علمبردار کی گردن میں دائیں سے لگا اور بائیں کو نکل گیا۔ یہ تیر بھی ارتگین کا تھا۔ پرچم گر پڑا۔

ارتگین دوڑ کر ٹیلے پر چڑھا اور بڑی ہی بلند آواز سے چلانے لگا ___ "خدا کی قسم، میں نے حماد بن علی کو مار ڈالا ہے .... غزنی کی آبرو کی قسم، بدوؤں کا پرچم گر پڑا ہے۔"

اپنے سرداروں کے سردار کو اور اپنے عَلم کو گرتا دیکھ کر قبائلیوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ تب قاضی القضاۃ ابو محمد نے فوج کو حملے کا حکم دے دیا۔ ارتگین نے اُسے پہلے بتا دیا تھا کہ وہ حماد کو پہچانتا ہے اور وہ سب سے پہلے اُسے مارنے کی کوشش کرے گا۔ ابو محمد نے اُسے کہا تھا کہ اگر وہ اسے حملے سے پہلے مار لے تو للکار کر آواز دے۔ خدا نے ان کا یہ منصوبہ کامیاب کر دیا۔

اس کے بعد جو کچھ ہُوا وہ بدوؤں کا قتلِ عام تھا۔ وہ اب اپنے آپ کو بچانے کے لیے لڑ رہے تھے اور اس کوشش میں وہ ٹیلوں کے اندر آ گئے جہاں وہ سمجھتے تھے کہ چھپ سکیں گے مگر ابو محمد نے وہاں پہلے ہی ٹیلوں پر تیر انداز بٹھا رکھے تھے۔ ان میں سے جو بدو باہر کو بھاگے انہیں تعاقب کر کے ختم کیا گیا۔

اس خاک و خون میں ٹیلوں کے اندر گھوڑوں کے شور اور زخمیوں کی چیخ و پکار میں ایک نسوانی آواز سنائی دے رہی تھی — "ارتگین.... ارتگین" یہ سبیلہ کی پکار تھی۔ اسے غزنی کا ایک سوار اٹھا کر گھوڑے پر نہ ڈال لیتا تو وہ گھوڑوں تلے روندی جاتی۔

دوپہر تک کبید کا معرکہ ختم ہو چکا تھا۔ اس سے آگے قافلے کے ساتھ فوج کا چھوٹا سا ایک محافظ دستہ بھیجا گیا۔ قاضی القضاۃ باقی فوج کو واپس غزنی لے گیا۔ اس کے ساتھ بدوؤں کے بے شمار گھوڑے اور اونٹ تھے جن پر اُن کے خیمے اور دیگر سامان لدا ہُوا تھا۔

"ارتگین!" — ابو محمد نے راستے میں اسے کہا — "تم غلام نہیں ہو اور تم سبیلہ اعزنی کی نہیں اسلام کی آبرو ہو۔ اسلام زندہ رہے گا"

....اور ایک بُت شکن پیدا ہوا

(حصہ سوم، حصہ چہارم)

(سلطان محمود غزنوی کے جہاد اور جاسوسوں کی جذباتی اور واقعاتی داستان)
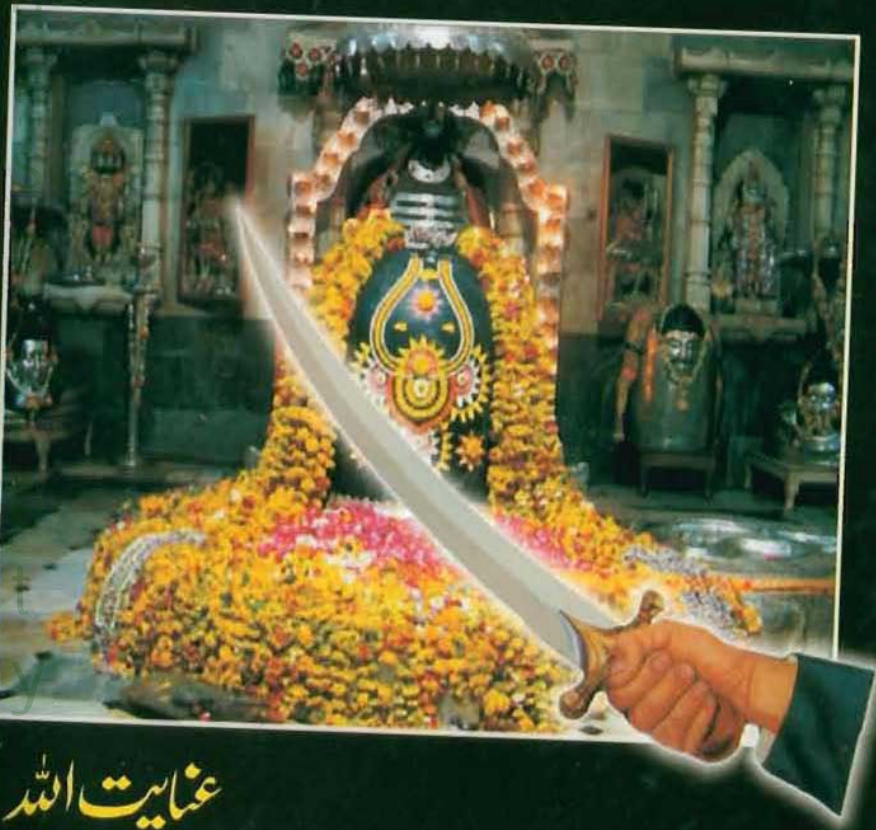
عنایت اللہ

فہرست

رتن کماری، رضیہ اور راجیا پال	۶
یہ معجزہ تھا	۳۶
قلعے جو نعروں نے سر کیے	۸۶
سومنات کے دروازے پر	۱۱۴
یہ ستارہ بھی ٹوٹ گیا	۱۵۶

رتن کماری، رضیہ اور راجیا پال

قنوج پر غزنی کی فوج کا قبضہ تھا اور وہاں سالار ابوالقدر سلجوقی قلعہ دار تھا۔ مہاراجہ راجیا پال جو محاصرے سے پہلے ہی فرار ہو گیا تھا بھیس بدل کر قنوج کے قلعے میں گیا تھا اور ابوالقدر سلجوقی سے درخواست کی تھی کہ وہ شکست تسلیم کر چکا ہے اور اس کے عوض اُسے ایک مقام میں جس کا نام باری تھا، راجدھانی قائم کرنے کی اجازت دے دی جائے۔ ابوالقدر سلجوقی نے اُسے اجازت دے دی تھی لیکن یہ بھی کہا تھا کہ معاہدے کی شرائط سلطان محمود طے کریں گے۔ اُسی روز ایک قاصد کو غزنی روانہ کر دیا گیا تھا۔

سلطان محمود نے شرائط مقرر کر دی تھیں جو راجیا پال نے قبول کر لی تھیں۔ ان میں اہم یہ تھیں کہ راجیا پال کسی بھی حالت میں غزنی کی فوج کے خلاف نہیں لڑے گا۔ اس کی نئی راجدھانی میں [illegible]نی کی فوج کے کچھ کماندار اور ان کا عملہ رہے گا جو نئی ریاست کی فوج اور دیگر شعبوں پر نظر رکھے گا۔ راجیا پال پر کسی نے حملہ کیا تو غزنی کی فوج اس کی مدد کو پہنچے گی۔ سلطان محمود نے اُس کی فوج کی حد مقرر کر دی تھی اور اس کی ریاست باری کا دفاع اپنے ذمے لے لیا تھا۔

چونکہ مہاراجہ راجیا پال نے خود کہہ دیا تھا کہ اُس نے تمام تر خزانہ قنوج سے نکال کر کہیں چھپا لیا تھا، اِس لیے سلطان محمود نے اُس سے تاوان وصول

کرنے کا بھی حکم دیا۔ اِس کے علاوہ اُسے باجگزار بھی بنا لیا گیا۔ سلطان محمود نے غزنی سے ابوالقدر سلجوقی کو یہ حکم بھی دیا کہ راجیا پال پر نظر رکھی جائے اور اس کے متعلق اطلاعات غزنی بھیجی جاتی رہیں۔ ان احکام سے پتہ چلتا ہے کہ سلطان محمود کو مہاراجہ قنوج کے ساتھ گہری دلچسپی تھی جس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ مہاراجہ قنوج کو مفلوج کیے رکھنا چاہتا تھا۔

مہاراجہ راجیا پال نے غزنی کے ساتھ تو دوستی کر لی مگر سارا ہندوستان اُس کا دشمن ہو گیا۔ تین بڑے ہی طاقتور مہاراجے اُس کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ ان میں ایک کالنجر کا مہاراجہ گنڈا تھا جسے بعض مؤرخوں نے نندہ رائے بھی لکھا ہے۔ دوسرا گوالیار کا راجہ ارجن تھا اور تیسرا لاہور کا مہاراجہ ترلوچن پال تھا جو سلطان محمود کے سامنے نہیں آتا تھا کیونکہ وہ سلطان کا باجگزار تھا لیکن اس نے اپنی فوج قنوج سے کچھ دور گھنے جنگلوں میں رکھی ہوئی تھی۔ بعض مؤرخوں نے لکھا ہے کہ وہ ترلوچن پال نہیں بلکہ اُس کا بڑا بھائی بھیم پال ندر تھا لیکن زیادہ تر نے اسے ترلوچن پال ہی کہا ہے۔ وہ دوسرے مہاراجوں کے لیے ایک دھوکہ بنا ہوا تھا۔ انہیں کہتا تھا کہ وہ ضرورت کے وقت اپنی فوج سامنے لائے گا۔

یہ تینوں مہاراجے اس کوشش میں تھے کہ راجیا پال سلطان محمود کی اطاعت ترک کر دے اور ان کے ساتھ مل جائے مگر راجیا پال ان سب سے قطع تعلق کیے رکھنا چاہتا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ غزنی کے فوجی حاکم اُس کے ساتھ تھے جو اُس پر نظر رکھتے تھے۔

*

ان میں ایک کماندار ذوالقرنین تھا جسے ہندوستان کی جنگوں کا تجربہ سب سے زیادہ تھا اور وہ بھیرہ اور ملتان میں بہت عرصہ رہا تھا۔ اِس عرصے میں اُس نے اُس وقت کی ہندوستانی زبان سیکھ لی تھی اور وہ ہندوؤں کو بڑی اچھی

طرح سمجھتا تھا۔ اسی لیے اُسے باری میں مہاراجہ راجیا پال کا مشیر بنایا گیا تھا۔ وہ دراز قد اور خوبرو جوان تھا۔ ہنس مکھ اور ملنسار۔ وہ ہندوؤں میں بھی ہر دلعزیز تھا۔

ذوالقرنین نے ایک ہندو لڑکی رتن کماری کے ساتھ شادی کر لی تھی جو رتن کماری نہیں رہی تھی بلکہ رضیہ بن گئی تھی۔ یہ لڑکی اُسے متھرا میں ملی تھی لیکن یہ ملاقات بڑے ہی خوفناک حالات میں ہوئی تھی۔ فضا میں خون کی بو رچی ہوئی تھی اور ارد گرد لاشیں گل سڑ رہی تھیں۔ غزنی کی فوج نے جب متھرا پر حملہ کیا تھا تو شہر سے باہر ایک خونریز معرکہ ہوا تھا۔ ایک دو روز پہلے طوفانِ بادوباراں نے تباہی مچائی تھی۔ ہندوستان کے کونے کونے سے ہندو متھرا کی پوجا کے لیے آئے تھے۔ بعض لوگ اپنے بال بچوں کو بھی ساتھ لائے تھے۔

متھرا کی فوج نے جلدی ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ شام کا وقت تھا۔ ذوالقرنین اپنے دو سواروں کے ساتھ متھرا کے اردگرد گشت کر رہا تھا۔ ماحول بھیانک تھا۔ طوفان سے درختوں کے ٹہن ٹوٹ کے گرے ہوئے تھے۔ باہر سے آئے ہوئے ہندوؤں کے خیمے اکھڑے پڑے تھے اور لاشیں بھی تھیں۔ لڑائی میں زائرین کی کچھ تعداد ماری بھی گئی تھی۔

ذوالقرنین کو شام کے گہرے دھندلکے میں کسی کے بھاگتے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اُس نے اُس کے پیچھے گھوڑا ڈال دیا۔ بھاگتے قدم رک گئے اور اُسے رونے اور سسکنے کی آوازیں سنائی دیں۔ ذوالقرنین نے گھوڑے سے اُتر کر دیکھا۔ اُسے ایک درخت کے گرے ہوئے ٹہن کی شاخوں میں ایک عورت یا لڑکی بیٹھی ہوئی نظر آئی۔ ذوالقرنین نے شاخوں میں سے ہاتھ بڑھا کر اُسے اٹھایا تو وہ اور زیادہ رونے لگی۔ اس کے رونے میں دہشت زدگی نمایاں تھی۔ اس کا قد پرکشش اور لمبا تھا۔ قریب ہو کے دیکھا۔ وہ جوان لڑکی

تھی۔

"مجھے قتل کر دو" — وہ کانپتی ہوئی آواز میں فریادیں کرنے لگی — "مجھے ہاتھ نہ لگاؤ۔ مجھے جان سے مار دو۔ اپنے ساتھ نہ لے جاؤ۔"

"ہم یہاں عورتوں کو قتل کرنے نہیں آئے لڑکی!" — ذوالقرنین نے کہا — "ہم عورتوں کی جان اور عزت کے محافظ ہیں۔ تم کہاں جانا چاہتی ہو۔ ہم تمہیں وہاں پہنچا دیں گے۔"

"میں مرنا چاہتی ہوں" — لڑکی نے روتے ہوئے کہا — "مجھے میرے ماں باپ کے پاس پہنچا دو۔"

"کیا وہ مر گئے ہیں؟"

"ہاں۔ وہ مر گئے ہیں" — لڑکی نے کہا — "میں جہاں سے اُٹھ کر دوڑی تھی وہاں ان کی لاشیں پڑی ہیں۔ میرا ایک جوان بھائی بھی مارا گیا ہے۔"

یہ لڑکی اپنے والدین اور بھائی کے ساتھ بڑی دُور سے آئی تھی۔ پہلے طوفانِ بادوباراں نے انہیں تباہ کیا پھر وہ دونوں فوجوں کی لڑائی میں کچلے گئے۔ لڑکی کہیں چھپ گئی تھی اس لیے بچ گئی۔ اب اپنے آپ کو غزنی کے فوجیوں کے قبضے میں دیکھ کر اُس کی رہی سہی جان بھی نکل گئی۔ ذوالقرنین اُسے اس حالت میں اکیلے نہیں چھوڑنا چاہتا تھا مگر لڑکی اُس کے قدموں میں گر پڑی اور فریادیں کرنے لگی — "میں کنواری ہوں۔ کسی غیر مرد کے ساتھ جانے سے پہلے مر جانا چاہتی ہوں۔"

ذوالقرنین کو اسے اپنے ساتھ لے جانے میں بڑی سخت مشکل پیش آئی۔ وہ چلتی نہیں تھی۔ اُسے گھسیٹنا بھی پڑا اور اُٹھانا بھی پڑا۔ ذوالقرنین اسے بار بار کہتا تھا کہ ہمارے لیے یہ گناہ ہے کہ ایک نوجوان اور بے آسرا لڑکی کو اس خوفناک ماحول میں اکیلا چھوڑ جائیں۔ وہ لڑکی کو ساتھ لے کر اپنے اعلیٰ کمانڈر کے پاس چلا گیا۔ وہ وقت لڑکیوں اور دکھوں کو سنبھالنے کا نہیں تھا۔ اُسے کہا گیا کہ اسے اپنے ساتھ رکھنا چاہتے ہو تو رکھ لو۔ کسی ہندو کے حوالے کرنا چاہو تو کر دو لیکن یہ دیکھ لینا کہ تمہارے فرائض کے

راستے میں نہ آئے۔

یہ ہندو لڑکی ذوالقرنین کے فرائض کے راستے میں تو نہ آئی، اس کی زندگی میں ہمیشہ کے لیے آگئی۔ وہ چونکہ کمانڈر تھا اس لیے اُس کا خیمہ الگ تھا۔ لڑکی تمام رات اُس کے خیمے میں رہی۔ کانپتی رہی۔ روتی رہی۔ ذوالقرنین کی منت سماجت کرتی رہی اور اُس کی آنکھ لگ گئی۔ اس کی آنکھ کھلی تو اُس نے ذوالقرنین میں کوئی تبدیلی نہ دیکھی، نہ اُس میں کوئی تبدیلی آئی۔ اس کی رات ویسے ہی گزر گئی جیسے وہ باپ اور بھائی کے قریب سویا کرتی تھی۔

"کیا میں تمہیں اچھی نہیں لگی؟" — لڑکی نے ذوالقرنین سے پوچھا۔

"اگر تم مجھے اچھی نہ لگتیں تو تمہارا وہ خطرہ پورا ہو جاتا جس کے ڈر سے تم میرے ساتھ نہیں آ رہی تھیں" — ذوالقرنین نے کہا۔ "تم نے کہا تھا کہ تم کنواری ہو۔ میں کہہ رہا ہوں کہ تم بہت خوبصورت ہو۔ میں تمہیں پاک لڑکی سمجھتا ہوں اور پاک رکھوں گا۔ اب کہو کہاں جانا چاہتی ہو۔ دل سے سب خوف اتار دو۔"

لڑکی اُسے کچھ دیر دیکھتی رہی، پھر اُس کے پاؤں پکڑ لیے۔ ذوالقرنین نے اپنے پاؤں پیچھے کر لیے اور کہا "ہمارے مذہب میں کسی انسان کو اجازت نہیں کہ کسی کو اپنے آگے سجدہ کرنے پر مجبور کرے۔ مجھے گناہگار نہ کرو.... کہو کہاں جانا ہے؟"

لڑکی نے آہ بھری اور بولی — "لڑکی کو ماں باپ کا گھر چھوڑ کر کہیں نہ کہیں تو جانا ہی ہوتا ہے۔ میرے ماں باپ مجھے چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ اب تم بتاؤ کہ کہاں جاؤں؟"

"اگر میرے ساتھ رہنا چاہتی ہو تو تمہیں اپنا مذہب چھوڑنا پڑے گا" — ذوالقرنین نے کہا۔ "تم تھوڑے ہی دنوں بعد محسوس کرو گی کہ تم نے اچھا کیا ہے کہ اپنا مذہب چھوڑ دیا ہے۔"

لڑکی خاموش ہو گئی پھر گہری سوچ میں کھو گئی۔ ذوالقرنین اُسے بتانا نہیں چاہتا تھا کہ وہ اُس کے دل میں اُتر گئی ہے۔ وہ بہت ہی خوبصورت لڑکی تھی۔ اُس نے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ اس لڑکی کو وہ اپنی بیوی بنا لے ورنہ یہ اُس کے فرائض کے راستے میں حائل ہو جائے گی۔ غزنی کا یہ کمانڈر کچھ دیر کے لیے تو اپنے فرائض کو بھول گیا تھا۔

"میں تم پر کوئی شرط عائد نہیں کر رہا" — ذوالقرنین نے کہا۔ "اور میں تمہیں مجبور سمجھ کر تم پر اپنا فیصلہ نہیں ٹھونس رہا۔ اگر جانا چاہو تو بتا دو۔"

"مجھے ہری کرشن کے قدموں میں بٹھا دو" — لڑکی نے کہا۔ "میں ساری عمر مندر میں گزار دوں گی۔"

ذوالقرنین کا خون اُبل پڑا۔ اُس کی آواز میں غصے کی جھلک آگئی — "اپنے آپ کو دھوکے نہ دو لڑکی! پتھر کے ہری کرشن کے سائے میں تم پنڈتوں کی داشتہ بنی رہو گی اور تمہاری ساری عمر اسی طرح گزر جائے گی۔ تم کمسن ہو۔ نادان ہو۔ اسی لیے مجھے تم سے ہمدردی ہے، ورنہ تم کیا ہو۔ ایک لڑکی ہو۔ ایک لڑکی سارا ہندوستان نہیں ہو سکتی۔ میں اتنی دُور سے صرف ایک خوبصورت لڑکی کی خاطر نہیں آیا۔ میں ان بتوں کو توڑنے آیا ہوں۔ باہر نکل کر اپنے خداؤں کے ٹکڑے بکھرے ہوئے دیکھو۔ انہیں انسان پاؤں تلے مسل رہے ہیں۔"

لیکن لڑکی مذہب میں ڈوبی ہوئی تھی۔ یہ مذہبی جنون ہی تھا کہ ماں باپ اُسے اتنی دُور سے متھرا لائے تھے۔ وہ مذہب کی تبدیلی سے جیسے کانپنے لگی تھی۔ ذوالقرنین نے اُسے دوسری صورت یہ بتائی کہ وہ جہاں جانا چاہے اُسے وہاں تک پہنچا دیا جائے گا لیکن مندر میں نہیں جانے دے گا۔ لڑکی پر طوفان، لڑائی، خون اور لاشوں کی اور اپنے ماں باپ کی موت کی اتنی دہشت طاری تھی کہ وہ ذوالقرنین کے خیمے سے باہر نکلنے سے بھی گھبرا رہی تھی اور

اسی شخص کو اپنا پاسبان سمجھنے لگی تھی۔

وہ تین چار دن خیمے سے نہ نکلی اور کوئی فیصلہ بھی نہ کر سکی۔ ذوالقرنین کو متھرا سے آگے جانے کا حکم مل گیا۔ جب لڑکی نے دیکھا کہ وہ اکیلی رہ گئی ہے تو اس نے ذوالقرنین سے بیتاب ہو کر کہا کہ وہ جہاں جا رہا ہے اُسے اپنے ساتھ لیتا چلے۔ ان تین چار دنوں میں لڑکی نے دیکھ لیا تھا کہ یہ گٹھا ہوا، دراز قد جوان بہت نیک آدمی ہے یا پتھر ہے۔ وہ جو کچھ بھی تھا اس کنواری لڑکی کے لیے فرشتہ تھا۔

اُسی روز لڑکی کو فوج کے امام کے پاس لے جا کر مسلمان کر لیا گیا۔ وہ رتن کماری سے رضیہ بن گئی اور سالار کی اجازت سے ذوالقرنین اور رضیہ کی شادی ہو گئی۔ غزنی کی فوج کے چند اور حاکموں کی بیویاں بھی ساتھ تھیں۔ رضیہ کو اُن کے حوالے کر دیا گیا۔ اِن عورتوں سے ذوالقرنین کو پتہ چلا کہ رضیہ اُسے فی الواقع فرشتہ سمجھتی ہے مگر اُسے یہ بھی بتایا گیا کہ وہ اسلام کے فرائض اور عبادات وغیرہ کو سمجھنے میں ہچکچاہٹ یا دشواری محسوس کرتی ہے یا اُس نے اسلام کو دل سے قبول نہیں کیا۔

*

ایک سال گزر گیا تھا۔ ذوالقرنین اب باری میں مہاراجہ راجیپال کے ساتھ تھا۔ راجیپال تو جیسے مر ہی گیا تھا۔ وہ اب جنگجو نہیں صرف مہاراجہ رہ گیا تھا۔ اُس کے پاس خزانے کی کمی نہیں تھی۔ وہ مہاراجوں کی شان و شوکت سے رہتا تھا۔ ناچنے اور گانے والیاں بھی موجود تھیں۔ اُس نے نئے سرے سے حرم بھی بنا لیا تھا۔ وہ غزنی کے فوجی افسروں کو جو باری میں رہتے تھے، راگ رنگ کی محفلوں میں مدعو کیا کرتا تھا لیکن ان میں سے کوئی بھی نہیں جاتا تھا۔

باری میں مندر بھی تھا۔ پنڈت اور رشی بھی آ گئے تھے۔ سلطان محمود کے حکم کے مطابق وہ راجیپال کے مذہب میں دخل نہیں دیا کرتے تھے۔ سلطان

نے حکم بھیجا تھا کہ اسلام کی تبلیغ کی جائے اور ان کے سامنے اسلامی کردار کا نمونہ پیش کیا جائے۔ یہ کام فوجی کر رہے تھے۔ دو چار دنوں بعد ایک دو ہندو اسلام قبول کر لیتے تھے۔ ذوالقرنین نے رضیہ سے بھی کہہ رکھا تھا کہ وہ ہندو عورتوں کو بتاتی رہا کرے کہ مسلمانوں کا کردار کس قدر بلند ہے اور یہ بھی کہ اسلام کے احکام ہی ایسے ہیں کہ مسلمانوں کو اپنا کردار پاک اور بلند رکھنا پڑتا ہے۔

رضیہ اسی کردار کی پرستار تھی۔ اس نے مسلمان مرد کا کردار اپنی آنکھوں دیکھا تھا۔ وہ ہندو عورتوں کے ساتھ اسی کا ذکر کرتی رہتی تھی۔

غزنی میں سلطان محمود غزنوی سلطنت کے اُلجھے ہوئے امور سلجھانے میں مصروف تھا اور اُن مسلمانوں کو اپنے محاذ پر لانے کی کوشش کرتا رہتا تھا جو اُس کے دشمن بنے ہوئے تھے مگر اُس کے کان ہندوستان کی طرف لگے رہتے تھے۔ وہ تھوڑی سی فوج کو ہندوستان کے دل میں بٹھا آیا تھا۔ متھرا ہندوستان کا دل تھا۔ اسلام کا خنجر اس دل میں اُتر ہوا تھا۔ کبھی ہو نہیں سکتا تھا کہ ہندو راجے مہاراجے خاموش بیٹھے رہتے۔

سلطان محمود کو یہ بھی احساس تھا کہ ہندو لڑنے والی قوم ہے ڈرنے والی نہیں۔ اُس نے دیکھا تھا کہ ہندو کس طرح جانیں قربان کرتے ہیں۔ ان میں خرابی یہ تھی کہ ان کے سالاروں کو لڑانے کا ڈھنگ نہیں آتا تھا۔ وہ ٹوٹ پڑنے اور کٹ مرنے کو لڑائی کہتے تھے۔ اس کے مقابلے میں سلطان محمود کا شمار تاریخ کے مانے ہوئے ذہین جرنیلوں میں ہوتا تھا۔ اُس کی جنگی چالیں ایسی تھیں جو دشمن کو جال میں پھانس لیتی تھیں۔ دشمن کے پاس دو ہی چالیں رہ جاتی تھیں۔ وہ ہتھیار ڈال دے، بھاگ اُٹھے یا دیواروں سے ٹکرانے کے انداز سے لڑے اور ختم ہو جائے۔

مذہب کے معاملے میں ہندو مسلمانوں سے کم نہیں تھے۔ ہندوؤں پر تو مذہب کا جنون طاری تھا۔ وہ مذہب کے نام پر لڑتے اور بے جگری

سے لڑتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ حق اور باطل کو نہیں سمجھتے تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ ان کی ٹکر حق سے ہے اور وہ سچے خُدا کے نام لیواؤں کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ انہیں کوئی بتاتا نہیں تھا کہ حق پرستوں کے ساتھ خُدا ہوتا ہے۔ یہ حق پرستی کا ہی کرشمہ تھا کہ خُدا نے سُلطان محمود کو وہ عسکری فہم وفراست، جرأت اور شجاعت عطا کی تھی جس کے آگے پہاڑوں کے سینے بھی چاک ہو جاتے تھے۔

سلطان محمود کہا کرتا تھا کہ سانپ کو آخر کار انسان کے ہاتھوں مرنا ہی ہوتا ہے لیکن انسان چوکنّا رہتا ہے کہ سانپ بے خبری میں ڈس نہ لے۔ وہ ہندوؤں کو سانپ اور بچھو کہا کرتا تھا جن کی فطرت صرف ڈنک مارنا تھا۔

”میں ہندوؤں سے غافل نہیں ہو سکتا“۔ اب بھی وہ اپنے سالاروں اور مشیروں وغیرہ سے کہہ رہا تھا۔ ”ان کے سر ابھی کچلے نہیں گئے۔ میں ان کے ہتھیار ڈالنے سے مطمئن نہیں ہو سکتا۔ سانپ بِل میں چلا جائے یا اِسے ٹوکری میں بند کر دو تو اس کی فطرت بدل نہیں جاتی۔ اس کا زہر ختم نہیں ہو جاتا۔ موقع ملتے ہی وہ ڈنک مارے گا“۔

وہ اکثر کہا کرتا تھا۔ ”مجھے خدا اتنی لمبی عمر نہیں دے گا کہ میں محمد بن قاسم کی سرزمین کو ہندوؤں سے پاک کر سکوں۔ معلوم نہیں میرے بعد آنے والے اِدھر توجہ دیں گے یا نہیں۔ اگر انہوں نے ہندو کے ساتھ دوستی کر لی تو یہ اسلام کے ساتھ دشمنی ہوگی۔ ہندو جب تک زندہ ہے اسلام کو ڈستا رہے گا اور ہندوستان کی زمین مسلمانوں کے خون سے تر رہے گی۔ اُن کی مدد کو کوئی نہیں پہنچے گا جنہیں مدد کو پہنچنا ہوگا اُن پر ہندو اپنی دوستی کا اور اپنے پیار کا فریب طاری کیے رکھے گا۔ ہندو اُس بیوی کی مانند ہے جو خاوند کے پاؤں دھوتی ہے اور اُس کے جسم کا حصہ بنی نظر آتی ہے مگر اُس کی در پردہ آشنائی کئی مردوں کے ساتھ ہوتی ہے۔ وہ خاوند کے لیے پیار میں لپٹا ہوا فریب بنی رہتی ہے“۔

سلطان محمود کے پیر و مُرشد شیخ ابوالحسن خرقانی نے اُسے کہا تھا ——

”دو قومیں ایک مٹی کی اور ایک سانچے کی بنی ہوئی ہیں۔ ایک یہودی، دوسرے ہندو۔ اسلام دشمنی ان کی فطرت کا حصہ اور مذہب کا فریضہ ہے۔ جس دَور میں مسلمان ان سے غافل ہوئے یا انہیں دوست بنا بیٹھے، وہ دَور اُمّتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے زوال کا دور ہوگا۔ یہ امت اپنی دھار کھو بیٹھے گی۔ سلطنتوں اور ریاستوں میں بٹ جائے گی۔ مسلمانوں کو غلام اور رعایا بنالیں گے۔ ان کی زبانیں بند کر دیں گے اور انہیں ہندو اور یہودی کے خلاف بات کرنے سے روک دیں گے کیونکہ انہیں اپنی حکمرانی اور بادشاہی کا تحفظ اسلام کے ان دشمنوں کی خوشنودی میں نظر آئے گا۔ وہ اسلام کی تاریخ کا سیاہ دَور ہوگا۔ خدا کی یہ زمین مسلمانوں کے خون سے لال ہوتی رہے گی“۔

سلطان محمود اپنے اس روحانی پیشوا کی بات بڑی غور سے سُن رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں ٹھہر گئی تھیں اور اُس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اُس کی رُوح کانپ رہی ہے۔

”اور تمہاری اس سلطنت پر یہ من مانی کریں گے“۔ ابوالحسن خرقانی کہہ رہے تھے۔ ”غزنی، کابل، قندھار گھر ویراں اُس قوم کے پاؤں تلے روندے جائیں گے جس کا کوئی دین نہیں اور جسے دین والے مسلمان اپنا ہمدرد سمجھیں گے“۔

”یا شیخ و مُرشد یا!“ سلطان محمود نے تڑپ کر کہا۔ ”قوم پر آنے والی بدبختیوں کو میں آج کیسے روک سکتا ہوں؟ میں کیا کروں؟“

”تمہارا مقبرہ اُن کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا“۔ شیخ خرقانی نے کہا۔ ”مستقبل کا خونی کھیل تمہارے اور میرے مقبروں کے اِرد گرد کھیلا جائے گا۔ ہم کچھ نہیں کر سکیں گے۔ کچھ کرنا ہے تو آج کر لو..... اور وہ تم کر رہے ہو۔ میں تمہیں یہ بتانا چاہوں گا کہ کیا نہ کرو۔ تم بار بار اُس طلسم میں جا رہے ہو

جسے ہندوستان کہتے ہیں۔ وہاں زروجواہرات ہیں۔ عورت کا حُسن ہے اور یہ حُسن بے حجاب ہے۔ وہاں کے پیڑ پودوں میں حُسن ہے۔ اگر تم اور تمہارے سالاروں اور تمہارے کمانداروں نے اپنے ذہن و دل اس طلسم سے آزاد رکھے تو تم وہ قلعہ تعمیر کر سکو گے جس کی دیواروں سے کفر ٹکرا ٹکرا کر اپنا سر پھوڑتا رہے گا۔"

"کبھی کبھار میری فوج کا کوئی فرد کسی ہندو لڑکی کے ساتھ شادی کر لیتا ہے" — سلطان محمودؒ نے کہا۔ "اُسے باقاعدہ مسلمان کیا جاتا ہے۔ کیا یہ سلسلہ چلتا رہنے دوں یا اسے روک دوں؟"

"ایک حکایت سنو گے محمودؒ!" — شیخ خرقانی نے کہا — "میری جوانی میں میرے والدِ بزرگوار مرحوم و مغفور کا ایک مرید ہُوا کرتا تھا۔ تاجر تھا اور دولتمند۔ وہ کسی ملک سے چیتے کا بچہ لے آیا۔ میں نے دیکھا تھا۔ بڑا پیارا تھا۔ بلی کا بچہ لگتا تھا۔ وہ شخص اُسے گود میں بٹھا کر دودھ پلایا کرتا تھا۔ اپنے بستر میں سُلایا کرتا تھا۔ بچہ بڑا ہُوا تو اُسے پرندوں اور غزال کا گوشت کھلایا کرتا تھا۔ وہ جدھر جاتا، چیتا اُس کے ساتھ ہوتا۔ چیتے کو اپنے مالک کی بُو کے ساتھ بھی پیار تھا۔ ایک روز یہ شخص میرے والدِ بزرگوار کے پاس آیا۔ اُس نے اپنا بازو کہنی سے کلائی تک پٹیوں میں باندھ رکھا تھا۔ کہنے لگا چیتے نے کاٹ کھایا ہے۔ میرے والد نے کہا وہ تو تم سے پیار کرتا تھا۔ وہ شخص بولا، اُس نے پیار سے ہی کاٹا ہے لیکن دانت گوشت میں اُتر گئے ہیں اور کھال اُتر گئی ہے۔ بڑی مشکل سے خون بند ہُوا۔ جسم سے آدھا خون بہ گیا ہے....

"وہ چلا گیا تو والد نے مجھے کہا — کچھ سمجھے ہو حسن!... درندوں کے پیار میں بھی درندگی ہوتی ہے اور چیتا اپنی فطرت سے مجبور ہے کہ انسان کو اپنا دشمن سمجھے" — محمود! ہندو اور یہودی وہ درندے ہیں جن کے پیار میں بھی درندگی ہے اور وہ اپنی فطرت سے مجبور ہیں کہ مسلمان کو اپنا دشمن سمجھیں۔ تم خود سوچ لو کہ مسلمان ہندو عورتوں کے ساتھ شادی کریں یا نہ

کریں۔ ایک دوسرے کے جسموں سے لذت حاصل کی جا سکتی ہے مگر فطرت اس لذت سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔"

*

سلطان محمودؒ نے ایسا حکم تو جاری نہیں کیا تھا کہ کوئی فوجی کسی ہندو عورت کے ساتھ شادی نہیں کر سکتا، البتہ اُس نے سالاروں اور فوج کے ساتھ جانے والے اماموں سے کہا تھا کہ وہ فوجیوں کو ہندو لڑکیوں میں دلچسپی نہ لینے دیں۔ اس کے باوجود بڑے ہی خاص حالات میں کوئی فوجی کسی ہندو عورت کے ساتھ شادی کر لیتا تھا۔ ان میں کماندار ذوالقرنین بھی تھا۔ اس لڑکی سے جو رتن کماری سے رضیہ بن گئی تھی، سالار ابوالقدر سلجوقی بھی متاثر ہو گیا تھا اور امام بھی۔ لڑکی کسمپرسی کی حالت میں تھی۔ یہ خبر سلطان محمودؒ تک پہنچ گئی تھی اور اُس نے کسی نمایاں ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔

ہندوستان سے قاصد باقاعدگی سے غزنی جا رہے تھے۔ ان کے ساتھ وہ رپورٹیں بھی سلطان کے پاس جاتی تھیں جو ہندوستان میں بکھرے ہوئے جاسوس فراہم کیا کرتے تھے۔ ان کے مطابق لاہور کا مہاراجہ اپنی فوج سمیت راجدھانی سے غائب تھا۔ وہ دریائے جمنا اور گنگا کے دوآبہ سے باہر شمالی جنگلات میں کہیں روپوش تھا۔ جاسوسوں کو اُس کے ارادوں کا ابھی پتہ نہیں چلا تھا۔

ارادوں کی تکمیل کا منصوبہ کالنجر میں بن رہا تھا۔ وہاں کے مہاراجہ گنڈا کے محل میں گوالیار کا راجہ ارجن اور لاہور کا مہاراجہ ترلوچن پال بیٹھے تھے۔ ان کے ساتھ گوبند نام کا ایک ہندو اور کالنجر کا بڑا پنڈت بھی موجود تھے۔ ان کے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ مہاراجہ قنوج راجیا پال دھوکہ دے گیا ہے اور اُس نے خود مختاری کے پردے میں سلطان محمود کی غلامی قبول کر لی ہے۔ وہ اس مسئلے پر بحث کر رہے تھے کہ راجیا پال کو کس طرح سلطان محمودؒ کے خلاف کیا جائے۔

بحث جب زیادہ گرم ہوئی اور یہ مہاراجے باتوں پر ہی زور دینے لگے تو اُن کے درمیان سونے کی چوڑیاں آپڑیں۔ سب نے ادھر اُدھر دیکھا۔ اُن کی نظریں ذرا اوپر اُٹھیں اور کمرے کے اندر کھلنے والی شاہ نشین کے باریک ریشمی پردے پر رک گئیں۔ یہ شاہ نشین بالاخانے پر تھی۔ وہاں دربارِ عام کے دوران رانیاں اور راجکماریاں بیٹھا کرتی تھیں۔ اس باریک پردے کے پیچھے ایک عورت کھڑی نظر آرہی تھی جو سرتاپا برہنہ تھی۔ سب کی نظریں جھک گئیں۔

"یہ چوڑیاں پہن لو"۔ پردے کے پیچھے سے عورت کی آواز آئی — "نظریں مت جھکاؤ۔ میں تمہاری عزت ہوں۔ میں بھارت ماتا ہوں۔ میں اندرا دیوی ہوں۔ دیکھ لو مجھے۔ میں ننگی ہوں۔ تم نے مجھے ننگا کیا ہے۔ تم میں شرم نہیں رہی۔ نظریں کیوں جھکالی ہیں؟"

وہ مہاراجہ گنڈا کی رانی تھی۔ گنڈا غصے سے اٹھا۔

"یہاں سے چلی جاؤ شکنت!" — اُس نے کہا۔ "میں اب تمہارے سامنے اُس وقت آؤں گا جب شیوجی اور ہری کرشن مہاراج کی توہین کا انتقام لے چکوں گا۔ جب تک غزنی کا ایک بھی سپاہی بھارت ماتا میں موجود ہے، مجھ پر تمہارا چہرہ اور جسم حرام ہے"۔

"تمہاری رگوں میں راجپوتی خون کی جگہ شراب دوڑ رہی ہے"— رانی نے کہا۔ "تم غیرت والے ہوتے تو اس محل میں بیٹھے شراب نہ پی رہے ہوتے۔ تم اُن جنگلوں میں کیوں نہیں چلے جاتے جہاں تم نے ماؤں کے سپوت مسلمانوں سے مروا دیئے ہیں۔ تم اُن مندروں کے ملبے تلے دب کر کیوں نہیں گئے جنہیں ناپاک مسلمانوں نے تباہ و برباد کردیا ہے"۔

"رانی شکنت!"— مہاراجہ گنڈا گرج کر بولا— "تم یہاں سے چلی کیوں نہیں جاتیں؟"

پنڈت اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس مندر میں پنڈت مہاراجوں اور اُن کے

فوجی افسروں پر چھائے رہتے تھے۔ بعض علاقوں میں اُن کا حکم چلتا تھا۔ اُس نے رانی کو ایسے پردے کے پیچھے برہنہ کھڑے دیکھا جہاں سے وہ نظر آرہی تھی، وہ آگ بگولے کی طرح اُٹھا اور مہاراجوں سے مخاطب ہوا:

"آپ کہتے ہیں کہ رانی کیوں نہیں جاتی؟"— اُس نے ایسی آواز میں کہا جس میں غصہ بھی تھا طنز بھی— "میں کہتا ہوں رانی اسی حالت میں ہمارے سامنے کیوں نہیں آجاتی تاکہ ہم اچھی طرح دیکھ سکیں کہ ایک ننگی، بے مذہب اور بے غیرت قوم کیسی ہوتی ہے۔ دو سال ہوگئے ہیں۔ تم نے باتوں کے سوا کیا کیا ہے؟ کیا یہ بہتر نہیں کہ تلواریں پنڈتوں اور عورتوں کو دے دو کہ وہ لڑیں اور تم یہاں شراب پیو اور ناچنے والیوں کے ساتھ رنگ رلیاں مناؤ؟ اب تو دیوتاؤں کو تمہاری قسموں کا بھی اعتبار نہیں رہا"— اُس نے اوپر دیکھا اور بولا— "چلی جاؤ رانی! میں ان مہاراجوں کے ماتھوں پر پسینے کے قطرے دیکھ رہا ہوں۔ شاید ندامت کے یہ قطرے ان کے خون کو گرما دیں گے"۔

رانی چلی گئی اور پیچھے ایسا سکوت طاری ہوگیا جس میں غزنی کی فوج کے لیے طوفان پرورش پا رہا تھا۔ تینوں مہاراجے ایک دوسرے سے آنکھ ملانے سے گھبرا رہے تھے۔

"قنوج کے قلعے میں غزنی کی فوج کی نفری پوری ایک ہزار بھی نہیں"— پنڈت نے کہا— "تم حملہ کرو تو لڑائی کے بغیر اس نفری سے ہتھیار ڈلوا سکتے ہو۔ ان کی مدد کو کون آئے گا؟"

"ان ایک ہزار کو مار لوگے تو کیا حاصل ہوگا؟"— گوالیار کے راجہ ارجن نے کہا— "محمود طوفان کی طرح آئے گا اور ایسا انتقام لے گا جسے ہندوستان کی تاریخ ہمیشہ یاد رکھے گی"۔

"لڑائیاں لڑنا اور لڑانا آپ کے بس کی بات نہیں پنڈت جی مہاراج!"

مہاراجہ گنڈہ نے کہا۔ "ہمیں سلطان محمود کی جنگی طاقت کو بیکار کرنا ہے۔ ہمیں یہ سوچنا ہے کہ ہم سب مل کر غزنی پر چڑھائی کر سکتے ہیں؟... ہمیں وہ منبع بند کرنا ہے جہاں سے یہ سیلاب آتا ہے۔"

"آپ کے لیے یہ ممکن نہیں" — پنڈت نے کہا۔ "لاہور کے مہاراجہ ترلوچن پال آپ کے ساتھ بیٹھے ہیں۔ ان کے دادا مہاراجہ جے پال نے غزنی پر کتنے حملے کیے تھے اور اُن کا کیا حشر ہوا تھا۔ یہی ناکہ چتا پر کھڑے ہو کر انہوں نے اپنے آپ کو زندہ جلا ڈالا تھا... میں مہاراجہ ترلوچن پال سے پوچھتا ہوں کہ مسلمان متھرا کو صاف کر گئے، بلند شہر اور منج کو تباہ کر گئے اور انہوں نے قنوج پر قبضہ کر لیا۔ مہاراجہ لاہور نے کیا کیا؟ اپنی فوج کو قریب ہی جنگل میں چھپائے رکھا اور دوسروں کو لڑنے کی شہ دیتے رہے۔"

"میں جو چال چلنا چاہتا تھا اس کا مجھے موقع نہیں ملا" — لاہور کے مہاراجہ ترلوچن پال نے کہا۔ "میں غزنی کی فوج پر عقب سے حملہ کرنا چاہتا ہوں مگر کسی بھی جگہ لمبا مقابلہ نہ ہوا۔ محمود ایک ایک دن میں ایک ایک قلعہ فتح کرتا گیا۔ قنوج سے راجیا پال پہلے ہی بھاگ گیا تھا۔ میں نے دشمن کی پیٹھ دیکھی ہی نہیں۔"

"ترلوچن مہاراج!" — مہاراجہ گنڈہ نے کہا۔ "مجھے آپ کی یہ چال پسند نہیں آئی۔ اگر آپ اپنی فوج غزنی کے سلطان کے راستے میں لے آتے تو وہ اتنی جلدی آگے نہ بڑھتا۔ حالات کچھ اور ہوتے۔"

"مہاراجہ ترلوچن پال کی چال کو میں سمجھتا ہوں" — پنڈت نے کہا۔ "یہ اپنی فوج گنگا جمنا کے دوآبے میں صرف اس لیے لیے پھرتے رہے کہ جنگ کو لاہور سے دور رکھیں اور دوسروں کو لڑاتے رہیں۔"

ترلوچن پال بھڑک اٹھا اور چلا چلا کر کہنے لگا کہ اُس کی توہین کی جا رہی ہے۔

"میں اس کی معافی مانگ لیتا ہوں" — پنڈت نے کہا۔ "لیکن ہمیں یقین دلا دیں کہ اب آپ اپنی فوج سامنے لے آئیں گے اور اعلان کر دیں گے کہ آپ غزنی کے باجگزار نہیں ہیں۔"

اس محفل کی صورت اجلاس کی تھی۔ اجلاس کی صورت ہنگامہ خیز ہو گئی۔ تب وہ آدمی بولا جو فوجی نہیں تھا۔ اُس کا نام گوبند تھا۔

"اگر آپ جیسے دس اور مہاراجے اپنی فوجیں لے کے آ جائیں تو بھی غزنی والوں کو شکست نہیں دے سکتے" — گوبند نے کہا۔ "جو میں جانتا ہوں وہ آپ نہیں جانتے۔ کیا آپ میری عقل اور ذہانت کی تعریف نہیں کریں گے کہ قنوج کے قلعہ دار سالار ابوالقدر سلجوقی کے ساتھ دوستی جتنی میری گہری ہے اتنی اُس کے اپنے کسی آدمی کے ساتھ نہیں؟ وہ مجھے اپنا جاسوس سمجھتا ہے، مگر میں اُس کے سینے میں سے راز نکال کر آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں۔ میں آپ کی آنکھیں اور کان ہوں۔ یہ میں اس لیے بتا رہا ہوں کہ آپس کی چپقلش کو بھول کر آپ میری باتیں غور سے سنیں۔"

سب خاموش ہو کر اُس کی طرف متوجہ ہوئے۔ وہ سب گوبند کی قابلیت کے مداح تھے۔ وہ اُن کا جاسوس تھا۔ انہیں صحیح اور بروقت خبریں دیتا رہتا تھا۔ اُس نے سالار ابوالقدر کا اعتماد حاصل کر لیا تھا۔ اُس نے اپنا مذہب تبدیل نہیں کیا تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ وہ مسلمان ہو گیا تو ہندو اسے اپنے قریب بھی نہیں بیٹھنے دیں گے۔ وہ دوہری یا دوغلی جاسوسی کر رہا تھا۔ اُس کے اس فریب سے نہ ہندو مہاراجے واقف تھے نہ غزنی کے فوجی حکام جو قنوج کے قلعے میں مقیم تھے۔ وہ دونوں سے دولت سمیٹ رہا تھا۔

*

اب وہ مہاراجوں کے اجلاس میں بیٹھا انہیں بتا رہا تھا۔ "آپ پہلے ہی یہ مشورہ رد کر چکے ہیں کہ قنوج پر حملہ کیا جائے کیونکہ وہاں غزنی کی فوج

صرف ایک ہزار ہے۔ آپ آئندہ اس اقدام کو ذہن میں نہ لانا۔ راجیاپال کی نئی راجدھانی باری کو بھی غزنی والوں نے اپنا فوجی اڈہ بنا لیا ہے۔ وہاں اتنا امن اور سکون ہے کہ قنوج سے جو ہندو خاندان بھاگ گئے تھے وہ باری میں آباد ہو گئے ہیں۔ راجیاپال کی فوج بھی وہیں ہے جسے غزنی کے فوجی تربیت دے رہے ہیں۔ غزنی والوں کا سلوک اتنا اچھا ہے کہ اب تک کئی ہندو فوجی مسلمان ہو چکے ہیں۔ ہندوؤں کی جوان لڑکیاں بھی اسلام قبول کر رہی ہیں...

"راجیاپال کا بیٹا بھیمن پال بھی وہیں ہے۔ وہ بہت پریشان ہے۔ اس کے دل میں مسلمانوں کی دشمنی جوش مار رہی ہے مگر وہ اپنے باپ کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔ اُس نے مجھے یہاں تک کہا ہے کہ وہ اپنے باپ کو قتل کرنا چاہتا ہے لیکن وہ غزنی والوں کے انتقام سے ڈرتا ہے۔ اس وقت مہاراجہ راجیاپال غزنی والوں کا دوست ہے۔ میں نے وہاں کے حالات کا جو جائزہ لیا ہے، ان کے پیش نظر مجھے ایک ہی صورت نظر آتی ہے کہ راجیاپال کو ایسے خفیہ طریقے سے قتل کرایا جائے کہ غزنی والوں کو شک تک نہ ہو کہ اسے آپ نے قتل کرایا ہے۔"

مہاراجہ گنڈہ نے اپنی ران پر زور سے ہاتھ مار کر کہا۔ "میں یہی سوچ رہا تھا۔ اگر راجیاپال مر جائے یا مارا جائے تو ہم اس کے بیٹے بھیمن پال کو اپنے ساتھ اس طرح ملا سکتے ہیں کہ وہ غزنی والوں کا دوست بنا رہے اور جب ہم سب اپنی فوجوں کی ایک متحدہ فوج بنا لیں تو بھیمن پال غزنی کے فوجی حاکموں کو قید میں ڈال کر اعلان کر دے کہ وہ غزنی کا باجگزار نہیں اور اُسے غزنی کی اطاعت قبول نہیں۔ سلطان محمود فوج کشی کرے گا۔ ہم اب قلعہ بند ہو کر نہیں لڑیں گے۔"

سب نے اپنی رائے دی اور طے ہوا کہ مہاراجہ راجیاپال کو قتل کر دیا جائے مگر اصل مسئلے کا حل کسی کے پاس نہ تھا کہ قتل کون کرے اور کس طرح

کرے۔ گوبند نے کہا کہ راجیاپال مسلمانوں کا قیدی ہے اور اس کے محافظ جیش میں تین چار غزنی کے فوجی ہیں۔ کسی نے مشورہ دیا کہ اُس کے دربار کی کسی ناچنے گانے والی سے اسے زہر دلایا جائے۔ یہ مشورہ اس لیے رد کر دیا گیا کہ راز فاش ہو جائے گا۔ کوئی پیشہ ور عورت یہ کام نہیں کرے گی۔

"ایک طریقہ میرے ذہن میں آیا ہے"۔ پنڈت نے کہا۔ "مجھے آپ اپنا ایلچی بنا کر مہاراجہ راجیاپال کے پاس بھیجیں۔ میرے ساتھ آپ کچھ اور آدمی بھی بھیجیں گے۔ میں باری سے باہر خیمہ زن ہو جاؤں گا اور راجیاپال کو پیغام بھیجوں گا کہ کالنجر کا ایلچی آیا ہے اور وہ اپنی خیمہ گاہ میں مہاراجہ کو مدعو کرنا چاہتا ہے۔ اگر وہ آ گیا تو میں اسے وہ زہر دوں گا جو آہستہ آہستہ اثر کرے گا۔ وہ دو تین روز بعد بیمار پڑ جائے گا۔ کسی کو شک تک نہ ہو گا کہ اسے زہر دیا گیا ہے۔ پندرہ دنوں تک وہ پیٹ کی بیماری سے مر جائے گا لیکن زہر دینے سے پہلے میں اُسے قائل کرنے کی کوشش کروں گا کہ وہ غزنی والوں کا دوست بنا رہے لیکن وقت پر انہیں ایسا دھوکہ دے جیسے پیٹھ میں خنجر مارا جاتا ہے۔ میں دیکھ لوں گا کہ وہ ہمیں دھوکہ دے گا یا سلطان محمود کو۔ میں اس کے مطابق فیصلہ کروں گا کہ اُسے زندہ رہنے دیا جائے یا ختم کر دیا جائے۔"

"غزنی والے اُسے باہر نہیں جانے دیں گے"۔ گوبند نے کہا۔ "آپ کوشش کر دیکھیں۔ میں سالار ابوالقدر کے اعتماد کا آدمی ہوں۔ مجھے بھی راجیاپال سے ملنے کی اجازت نہیں... ہاں ایک طریقہ ہے۔ مہاراجہ راجیاپال خوبصورت اور جوان لڑکیوں کا شیدائی ہے۔ اگر آپ دو تین لڑکیاں ساتھ لے جائیں اور کسی طرح اُس کے کان میں ڈال دیں کہ آپ جو تحفے لائے ہیں ان میں اس کی پسند کا مال بھی ہے تو وہ غزنی والوں کی منت سماجت کر کے بھی آپ کے پاس آ جائے گا۔"

"طریقہ کوئی بھی اختیار کیا جائے" — گوالیار کے راجہ ارجن نے کہا — "اور کوئی بھی راجیا پال کو قتل کرے، میں اُسے سونے سے اور جاگیر سے مالا مال کر دوں گا اور اُسے اتنی حسین لڑکی ہمیشہ کے لیے دے دوں گا جو اُس نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھی ہوگی"

اُس نے گوبند کی طرف دیکھا اور اُسے کہا — "تم یہ کام کر سکتے ہو۔ تم وہاں کے بھیدی ہو۔ کوئی راستہ، کوئی طریقہ نکال لو گے... پنڈت مہاراج بھی چلے جائیں۔ دونوں میں جو بھی کامیاب ہو گیا وہ میری ریاست کا سب سے زیادہ امیر اور سب سے بڑی جاگیر اور سب سے خوبصورت داشتہ کا مالک ہوگا۔ اس کے بعد ہم طے کریں گے کہ ہمیں کیا کرنا ہے"

چند دنوں بعد گوبند قنوج کے قلعے میں سالار ابوالقدر سلجوقی کے پاس بیٹھا ہوا تھا اور اُسے بتا رہا تھا کہ کالنجر میں کیا منصوبہ بنا ہے۔ وہاں جو باتیں ہوئی تھیں وہ سب سنا دیں اور یہ بھی بتایا کہ مہاراجہ راجیا پال کے حفاظتی انتظامات اور زیادہ سخت کر دیئے جائیں۔

"لاہور کے مہاراجہ ترلوچن پال کی فوج کہاں ہے؟" — سالار سلجوقی نے پوچھا۔

"یہاں سے زیادہ دُور نہیں" — گوبند نے جواب دیا — "ابھی یہ پتہ نہیں چلا کہ کس مقام پر ہے۔ ہو سکتا ہے وہ لاہور واپس چلا جائے لیکن سب سے زیادہ خطرناک آدمی وہی ہے.... میں آپ سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں۔ راجیا پال کو یہ تمام مہاراجے قتل کرنا چاہتے ہیں۔ آپ میں سے کوئی بھی ہر ملازم، محافظ یا دربار کے ہر آدمی کو نہیں پہچانتا۔ میں سب کو پہچانتا ہوں۔ مجھے اُس کے قریب کہیں رہنے دیا جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اُسے کوئی دھوکے میں قتل کر دے۔ اس کے بیٹے بھیمن پال کو اس سے دور رکھا جائے اور اُس پر کڑی نظر رکھی جائے"

گوبند کی اب کوشش یہ تھی کہ اُسے راجیا پال کے قتل کا موقع مل جائے کیونکہ اسے بہت بڑے انعام کی توقع تھی مگر سالار سلجوقی نے اُسے اتنی ہی اجازت دی کہ وہ راج محل کے اردگرد بلا روک ٹوک گھوم پھر سکتا ہے، تنہائی میں راجیا پال سے نہیں مل سکتا۔

سالار سلجوقی کے لیے گوبند کی لائی ہوئی اطلاعیں قیمتی تھیں۔ اُس نے گوبند کو انعام واکرام دے کر کہا کہ وہ باری چلا جائے اور راج محل کے قریب رہ کر مشکوک آدمیوں پر نظر رکھے۔ کماندار ذوالقرنین کو سالار سلجوقی نے پیغام بھیجا کہ راجیا پال سے کوئی ایلچی ملنے آئے تو اُسے ملاقات کی اجازت نہ دی جائے۔

تین چار روز بعد کالنجر کا پنڈت ایلچی بن کر پہنچ گیا اور اُس نے راجیا پال کو پیغام بھیجا کہ ایلچی اُسے باہر ملنا چاہتا ہے۔ ذوالقرنین نے پیغام لانے والے کو راجیا پال کے پاس جانے ہی نہ دیا۔ پنڈت مایوس ہو کر واپس جانے لگا تو گوبند اُس کے پاس پہنچ گیا اور اُسے بتایا کہ راجیا پال مسلمانوں کا قیدی ہے اور اُس پر پابندیاں زیادہ ہو گئی ہیں۔ پنڈت نے اُسے کہا کہ وہ راجیا پال کے قتل کا انتظام کرے۔

گوبند مہاراجوں کا بھی نمک خوار تھا۔ اُس نے ان پر مزید اعتماد پیدا کرنے کے لیے پنڈت سے کہا کہ وہ راجیا پال کے بیٹے بھیمن پال کو اپنے ساتھ لے جائیں ورنہ سالار ابوالقدر سلجوقی اُسے قید کر دے گا۔ گوبند نے پنڈت کو بتایا کہ بھیمن پال میں جوانی کا خون ہے۔ اُس نے کچھ ایسی حرکتیں کی ہیں جن سے غزنی والوں کو اُس کی نیت پر شک ہو گیا ہے اور وہ اُس کی نظر بندی کی باتیں کر رہے ہیں۔

وہاں سے گوبند بھیمن پال کے پاس گیا اور اُسے بھی یہی باتیں بتائیں۔

بھیمن پال چوری چھپے چلا گیا اور گوبند سے کہہ گیا کہ وہ اس کے باپ کو قتل کرا دے۔ اُس نے بھی گوبند کو ایسا انعام دینے کا وعدہ کیا جس سے گوبند کا دماغ

اور زیادہ روشن ہوگیا۔

سالار ابوالقدر سلجوقی نے ایک قاصد غزنی کو اس رپورٹ کے ساتھ روانہ کردیا جو اُسے گوبند نے دی تھی۔ اُس نے پیغام میں یہ بھی لکھوایا کہ یہاں کے مہاراجوں کا کوئی بھروسہ نہیں بہتر ہوگا کہ فوج کا ایک سوار دستہ بھیج دیا جائے تاکہ محاصرے یا حملے کی صورت میں مزید فوج آنے تک دشمن کو روکا جا سکے۔

ادھر گوبند نے راجیا پال کے راج محل میں آنے جانے کی اجازت حاصل کرلی تھی اور وہ اب اس سوچ میں رہنے لگا کہ راجیا پال کو کس طرح قتل کیا جائے۔ وہ چونکہ ہندو تھا اس لیے اُس کا اٹھنا بیٹھنا ہندوؤں کے ساتھ تھا۔ وہ مندر میں بھی جاتا تھا۔ وہ چونکہ جاسوس تھا اس لیے اُس نے مندر کے پنڈت کے ساتھ گہرے مراسم پیدا کرلیے تھے اور اُس کے ساتھ راجیا پال اور سُلطان محمود کی باتیں بھی کرلیتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو مذہب پرست ظاہر کرتا تھا۔

ایک روز پنڈت نے اُسے بتایا "ایک ہندو لڑکی ہے جو مسلمان ہو چکی ہے اور اب کمانڈر ذوالقرنین کی بیوی ہے۔ مجھے ہندو عورتوں نے بتایا ہے کہ وہ مسلمان تو ہوگئی ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ہندو مت اس کے دل سے پوری طرح نہیں نکلا۔ عورتیں بتاتی ہیں کہ اپنے خاوند کے ساتھ اُسے اتنی زیادہ محبت ہے کہ اُس کے مذہب کو اپنا مذہب سمجھتی ہے مگر جب وہ خاوند سے ہٹ کر ارد گرد دیکھتی ہے تو ہندو نظر آتی ہے۔ اُس نے عورتوں کو یہاں تک کہا ہے کہ اُس کے خاوند نے اُسے یہ کہ رکھا ہے کہ وہ ہندو عورتوں میں اسلام کی تبلیغ کرتی رہا کرے۔ اس بہانے وہ ہندو عورتوں میں اٹھتی بیٹھتی ہے لیکن اسلام کی کوئی بات نہیں کرتی .... میں سوچا کرتا ہوں کہ اسے کس طرح اس مسلمان سے نجات دلائی جائے۔ دراصل ہندو مت اس کے خون میں بچپن سے شامل کردیا گیا تھا۔ ذوالقرنین نے اس

بڑا ایسا احسان کیا ہے کہ وہ اُسی کی ہو کے رہ گئی ہے۔"

گوبند کے کان کھڑے ہوئے۔ اُس کا دماغ شیطانیت سے بھرا ہوا تھا اور وہ بڑا ذہین انسان تھا۔ وہ اس سوچ میں کھو گیا کہ کیا اس لڑکی کو راجیا پال کے قتل کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے!

سوچ سوچ کر اُس کے دماغ میں ایک ترکیب آگئی۔ اُس نے پنڈت سے کہا کہ اُسے وہ اُن عورتوں سے ملا دے جن کے ساتھ وہ دل کی باتیں کیا کرتی ہے۔ پنڈت نے اُسے بتایا کہ وہ دو عورتوں کے ساتھ دریا میں نہانے کے لیے بھی چلی جایا کرتی ہے اور ذوالقرنین کو اس پر پورا بھروسہ ہے۔

دو تین روز بعد رضیہ دو ہندو عورتوں کے ساتھ دریا کی طرف جا رہی تھی۔ راستے میں درختوں اور جھاڑیوں کا جنگل تھا۔ ایک درخت کے نیچے ایک آدمی سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اُس کی لمبی داڑھی تھی اور سر کے بال کندھوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ چہرے سے وہ مسلمان لگتا تھا مگر اُس کے لباس اور حلیے سے شک ہوتا تھا کہ وہ ہندو سادھو یا رشی ہے۔ اُس نے رضیہ اور اُس کے ساتھ دو عورتوں کو دیکھا تو سر اٹھایا۔ وہ انہیں بڑی غور سے دیکھ رہا تھا جب عورتیں اس کے قریب سے گزریں تو اُس نے انگلی اوپر اٹھا کر انہیں رُکنے کا اشارہ کیا۔ وہ رکیں تو اُس نے انہیں بٹھا لیا اور نظریں رضیہ کے چہرے پر گاڑ دیں۔

رضیہ کی نظریں جیسے اس شخص کی نظروں میں جکڑی گئی ہوں۔ وہ لڑکی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے تھا۔ اُس نے اپنے دونوں ہاتھ رضیہ کے سر پر رکھ دیئے اور دونوں انگوٹھوں سے اس کی پیشانی کو آہستہ آہستہ ملنے لگا۔ عورتوں نے دیکھا کہ رضیہ کی آنکھیں ٹھہر گئی تھیں اور وہ سادھو کی آنکھوں میں ٹکٹکی باندھے ہوئے تھی۔ اُس پر جیسے سکتہ طاری ہوگیا تھا۔

"روح بھٹک رہی ہے"۔ سادھو نے ایسی آواز میں کہا جو بلند سرگوشی تھی۔ "روح کہیں اور ہے جسم کہیں اور ہے۔ روح پاک جسم ناپاک ہے۔ ایک آنکھ میں کشن مراری دوسری آنکھ میں گھپ اندھیرا ہے۔ اگلا جنم بڑا کٹھن ہے۔ لومڑی کا روپ ملے گا۔ لوگ مکار لومڑی کہیں گے"۔

وہ اچانک جیسے بیدار ہو گیا ہو۔ اُس نے سر جھٹک کر کہا۔ "جاؤ..... چلی جاؤ..... ایسی روحیں بھی ہوتی ہیں"۔ وہ پریشان اور مضطرب ہو گیا اپنے آپ سے باتیں کرنے کے لہجے میں کہنے لگا۔ "میں نہیں دیکھ سکتا۔ تم نہیں دیکھ سکو گی۔ ایک آنکھ کے اندھیرے میں کیا ہے؟..... تم برداشت نہیں کر سکو گی..... جاؤ..... مندر اور مسجد کے درمیان اندھیرا ہے۔ اس میں ٹھوکریں کھاتی رہو۔ اپنا انجام مت پوچھو۔ سنو گی تو مر جاؤ گی۔ مرو گی نہیں تو پاگل ہو جاؤ گی"۔

اُس کی پریشانی، بے چینی اور اضطراب میں اور انداز میں پُراسرار تاثر تھا اور جس طرح اُس نے رضیہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سترنم سی سرگوشی میں بات کی تھی، اس میں کچھ ایسا اثر تھا جیسے رضیہ ہپناٹائز ہو گئی ہو۔ وہ فطرتاً ہندو تھی۔ اس کے ساتھ ہندو عورتیں تھیں۔ ہندو توہم پرست قوم ہے اور توہم پرستی ان کا مذہب ہے۔ ان پر ایسا تاثر طاری ہو گیا کہ وہ سادھو کے آگے سے اٹھتی ہی نہیں تھی۔ رضیہ کو نورالدین کی محبت نے مسلمان تو کر لیا تھا لیکن اُس کی فطرت سے ہندو مت نہیں نکلا تھا۔ سادھو کے اشارے واضح تھے۔ وہ سمجھ گئی کہ اُس نے مسلمان ہو کر گناہ کیا ہے اور اس کی سزا اُسے یہ ملے گی کہ اگلے جنم میں وہ لومڑی بنے گی۔ یہ بھی ہندوؤں کا عقیدہ ہے۔

ان عورتوں نے سادھو کی مٹھی چاپی شروع کر دی۔ وہ بولتا ہی نہیں تھا۔ بولا تو اُس نے بھجن گنگنانے شروع کر دیئے۔ بڑی مشکل سے اُس نے بات کی۔

*

"اس لڑکی (رضیہ) کو دریا پر مت لے جاؤ"۔ سادھو نے گمبھیر آواز میں کہا۔ "مستھرا کا مگرمچھ اسے سالم نگل لینے کے لیے آ گیا ہے۔ ہم نے ویسے ہی اس لڑکی کو نہیں دیکھا تھا۔ ہوا میں ایک بُو آئی تھی جسے دنیا کا کوئی انسان نہیں سمجھ سکتا۔ یہ اُن بدروحوں کی بُو ہوتی ہے جو اپنے گناہوں کی آگ میں جل رہی ہوتی ہیں۔ تم قریب آئیں تو یہ بُو ہمیں اس لڑکی کے جسم سے آئی۔ اس کی روح جو مرنے کے بعد بدروح بن جائے گی، زندگی میں ہی جل رہی ہے"۔

رضیہ نے گھبراہٹ اور خوف کے لہجے میں کہا۔ "ہاں رشی جی! میں گناہگار ہوں۔ میں بہت بے چین ہوں۔ ایک وہ انسان ہے جس نے میرے دل پر قبضہ کر لیا ہے، دوسرا قبضہ میرے مذہب کا ہے۔ میں نادان اور مجبور ہوں"۔

"مگر پاپ جو ہو چکا ہے اس کی سزا سے کیسے بچو گی؟"

"کیسے بچوں گی؟"۔ رضیہ نے پوچھا۔ "مجھے بتائیں۔ آپ ہی بتائیں روح کو سزا سے بچانے کے لیے میں اپنا جسم چتا پر جلا لوں گی۔ اگلے جنم کے عذاب سے بچنے کے لیے میں اپنی جان کی قربانی دے دوں گی"۔

"ہم بتاتے ڈرتے ہیں"۔ سادھو نے کہا۔ "ہمت ہے تو سنو۔ پانی سے دُور رہو۔ قربانی ایک جان کی دینی ہے لیکن وہ جان تمہاری نہیں ہو گی"۔ سادھو نے آنکھیں بند کر لیں اور اُس کے ہونٹ ہلتے رہے۔ کچھ دیر بعد بولا۔ "بہت بڑے آدمی کا خون کرنا ہے..... مہاراجہ کا خون۔ پاپی کا خون۔ ایسے مہاراجے کا خون جس نے اپنے بھگوان کو مسلمانوں کے حوالے کیا اور آج اُن کی نظر بندی میں خوش ہے..... سنو لڑکی! نجات چاہتی ہو تو اپنے مہاراجہ کو قتل کرو، پھر اپنے خاوند کو قتل کرو۔ پہلے مہاراجہ کے خون کا تلک اپنے ماتھے پر لگاؤ، پھر اس پر اپنے خاوند کے خون کا تلک لگاؤ، پھر مندر میں چلی جانا۔ تمہیں ایک اشارہ ملے گا۔ روشنی نظر آئے

گی۔ یہ تمہاری نجات کی نشانی ہوگی۔"

"قتل؟" — رضیہ کی آنکھیں ٹھہر گئیں۔ اُس نے سرگوشی کی — قتل؟... نہیں"۔

"راجپوت کی بیٹی پاپی کو قتل کرنے سے ڈرتی ہے؟" — سادھو نے کہا — "اگر ڈرتی ہے تو نہ کر۔ چل۔ مگر پھر کالو نالہ بن اور لومڑی بن کے واپس آ۔ اسی مہاراجہ کے کتے تمہارا شکار کریں گے۔ اسی مہاراجہ کے تیر سے تم زخمی ہوگی۔ مروگی نہیں۔ جسم میں تیر لیے ہوئے زندہ رہو گی۔ زخم میں پیپ پڑے گی۔ اس میں کیڑے پڑیں گے۔ تم جنگلوں میں یہ چیختی چلّاتی پھروگی۔"

"مہاراج!" — ایک عورت نے کہا — "دیوتاؤں کا حکم ٹالا نہیں جاسکتا۔ اسے قتل کا کوئی ایسا طریقہ بتا دیں جو آسان ہو اور یہ پکڑی بھی نہ جائے۔"

سادھو نے اپنے مخمور اور پُراسرار لہجے اور انداز میں رضیہ کو جو طریقہ بتایا وہ یہ تھا کہ راجیا پال عورتوں کا شکاری اور شیدائی تھا۔ رضیہ خوبصورت اور جوان لڑکی تھی۔ وہ مہاراجہ کے سامنے جائے اور اپنی نمائش کرے۔ چونکہ رضیہ مسلمان کماندار کی بیوی تھی اس لیے یہ امکان تھا کہ راجیا پال اس پر ہاتھ نہیں ڈالے گا۔ یہ کام رضیہ کا تھا کہ راجیا پال کو اپنا آپ پیش کرے اور اُس کی خواب گاہ میں اس طرح جائے کہ اُسے کوئی دیکھ نہ سکے۔ ہاتھ میں خنجر لے جائے اور اُسے ختم کر آئے۔ پھر اپنے خاوند کو اسی طرح قتل کر کے مندر میں چلی جائے۔ وہاں پنڈت اسے کہیں دور بھیج دے گا۔

"کیا میں اتنی جرأت کر سکوں گی؟" — رضیہ نے پوچھا۔

سادھو نے اپنے پاس رکھی ہوئی ایک ٹوکری میں سے ٹٹول کر ایک ڈبیہ نکالی اور کھولی۔ اس میں سفوف سا تھا۔ اُس نے ذرا سا سفوف ایک کپڑے میں باندھ کر رضیہ کو دیا اور کہا کہ جب قتل کرنے کے لیے روانہ ہوگی تو یہ سفوف ایک گھونٹ پانی میں ملا کر پی لینا۔ جرأت اور دلیری آجائے گی۔

اُسی شام مندر میں گوبندان دو عورتوں کے پاس بیٹھا تھا۔ وہ اُسے بتا رہی تھیں کہ رضیہ ان کے ساتھ دریا پر جانے کی بجائے واپس آگئی تھی۔

"اسے کچھ شک تو نہیں ہوا؟" — گوبند نے پوچھا۔

"شک تو ہم دونوں کو بھی نہیں ہوا تھا جو اچھی طرح جانتی تھیں کہ یہ تم ہو" — ایک عورت نے کہا — "تمہارا بہروپ پوری طرح کامیاب تھا۔ اس کے بعد ہم نے لڑکی کو کئی ایک کہانیاں سنا کر قائل کر لیا ہے کہ وہ کام کر دے۔"

رضیہ کو قائل کرنے کی اتنی زیادہ کوشش کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ سہارا اور تائید چاہتی تھی جو اُسے مل گئی۔ ذوالقرنین نے اُسے کہا تھا کہ وہ ہندو عورتوں میں اسلام کی تبلیغ کیا کرے مگر ہندو عورتوں نے اس سے اپنا پیدائشی اور آبائی رنگ اُترنے نہ دیا۔ اور اگلی ہی رات جب ذوالقرنین دن بھر کی گشت اور دیگر کاموں کا تھکا ہارا گہری نیند سویا ہوا تھا، رضیہ کے سینے میں رتن کماری جاگ اٹھی۔ اُس نے اُٹھ کر پانی میں وہ سفوف ملایا جو اُسے سادھو نے دیا تھا اور بڑی تیزی سے پانی پی لیا۔ اُس پر گھبراہٹ اور ہیجان کی کیفیت طاری تھی۔ وہ وہیں کھڑی چاندنی سے روشن خلا میں گھورتی رہی۔ آہستہ آہستہ گھبراہٹ اور ہیجان میں کمی آنے لگی۔ سرور طاری ہونے لگا اور پھر لڑکی اپنے اندر ایسی قوت محسوس کرنے لگی جیسے وہ غزنی پر حملہ کرنے کے لیے تیار ہو گئی ہو۔

ایک ہی روز پہلے اُس نے اپنے خاوند ذوالقرنین سے کہا تھا کہ وہ راج محل کی عورتوں کے پاس جانا چاہتی ہے اور وہ کوشش کرے گی کہ وہاں کی عورتوں کو مسلمان بنا سکے۔ ذوالقرنین خوش ہوا کہ رضیہ تبلیغ کا کام دلچسپی سے کر رہی ہے۔ وہ گئی۔ راج محل میں سب جانتے تھے کہ وہ مسلمان کماندار کی بیوی ہے۔ وہ عورتوں کے پاس جاتے جاتے مہاراجہ راجیا پال کے کمرے میں چلی گئی۔ راجیا پال اُسے دیکھ کر صرف اس لیے خوش نہ ہوا کہ وہ کماندار کی بیوی ہے بلکہ اس لیے زیادہ خوش ہوا کہ وہ خوبصورت لڑکی ہے۔ اُس نے لڑکی کو تپاک اور احترام سے بٹھایا۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ اس طرح باتیں کر رہے تھے جیسے وہ ایک مدت سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ اجنبیت لڑکی کے اس انکشاف نے دور کر دی تھی کہ وہ ہندو تھی اور مسلمان ہوگئی ہے مگر اس نے دل سے اسلام کو قبول نہیں کیا۔ اجنبیت کے ساتھ ساتھ شرم و حجاب بھی اٹھ گیا۔ لڑکی کا ارادہ چونکہ کچھ اور تھا اس لیے اس نے کہا کہ وہ رات کو آئے گی لیکن ایسے راستے سے کہ اسے کوئی آتے جاتے نہ دیکھ سکے۔

راجیا پال بھی یہی چاہتا تھا کہ لڑکی کو کوئی نہ دیکھ سکے۔ پکڑے جانے کی صورت میں راجیا پال کو معلوم تھا کہ ذوالقرنین دونوں کو قتل کر دے گا۔ چنانچہ راجیا پال نے اسے محفوظ راستہ اور ایک اور کمرہ دکھا دیا۔

اگلی ہی رات رضیہ اس راستے سے اس کمرے میں پہنچ گئی جو راجیا پال نے اسے دکھایا تھا۔ راجیا پال نے اسے کہا کہ وہ شراب تو نہیں پیئے گی کیونکہ اسے خاوند کے پاس جانا ہے۔ رضیہ نے اسے کہا کہ وہ خود ہی ڈالے اور خود ہی پیئے۔ راجیا پال کھڑا تھا۔ وہ جھک کر پیالے میں شراب ڈال رہا تھا۔ رضیہ سفوف کے اثر میں تھی۔ اس نے کپڑوں کے اندر سے خنجر نکالا اور ہاتھ اوپر کر کے خنجر راجیا پال کی پیٹھ میں اتار دیا۔ اس نے خنجر کھینچا۔ اس کے ساتھ ہی راجیا پال سیدھا ہوا۔ اس کے منہ سے ابھی آواز بھی نہیں نکلی تھی کہ رضیہ نے اس کے دل پر وار کیا۔ رضیہ نے خنجر کھینچا اور اس کے ساتھ ہی راجیا پال منہ کے بل گر پڑا۔

رضیہ نے اسے دیکھا۔ وہ ذرا سا ہلا پھر بے حس ہو گیا۔ رضیہ کو جیسے احساس ہی نہیں تھا کہ اس نے ایک انسان کو قتل کر دیا ہے۔ انسان بھی کوئی معمولی آدمی نہیں، مہاراجہ تھا اور وہ غزنی کے اس سلطان کا دوست تھا جس نے ہندوؤں کی جنگی طاقت کو اسی طرح توڑ پھوڑ ڈالا تھا جس طرح اس نے باطل کے بت توڑے تھے۔ رضیہ نے عجیب سا اطمینان محسوس کیا۔ یہاں تک کہ اس نے وہ پیالہ اٹھایا جس میں راجیا پال نے شراب ڈالی تھی۔ اس نے پیالہ اٹھایا اور منہ سے لگا لیا۔ اس سے پہلے اس نے کبھی شراب نہیں پی تھی۔

وہ جس راستے سے کمرے میں داخل ہوئی تھی، اسی راستے سے باہر نکل گئی اور بڑے اطمینان سے چلتی اپنے گھر پہنچ گئی۔ وہاں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں خون آلود خنجر تھا۔ اب اسے اپنے خاوند کو قتل کرنا تھا۔ کھلے ہوئے دریچے میں سے چاندنی ذوالقرنین کے چہرے اور سینے پر پڑ رہی تھی۔ وہ گہری نیند سویا ہوا تھا۔ اس کا سینہ ابھر رہا تھا۔ دل پر ایک ہی وار کافی تھا۔

رضیہ آہستہ آہستہ آگے بڑھی۔ اس نے خنجر والا ہاتھ ہوا میں بلند کیا۔ اس کی نظریں ذوالقرنین کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ ذوالقرنین جانے کیا خواب دیکھ رہا تھا کہ وہ مسکرایا۔ رضیہ کے اندر ایسی تبدیلی آئی جیسے وہ خواب سے بیدار ہوگئی ہو۔ ذوالقرنین کی محبت نے سفوف کا اثر زائل کر دیا اور اس اثر کو زائل کرنے میں شراب نے بھی کام کیا تھا۔ رضیہ کا ہاتھ کانپا اور ہاتھ سے خنجر چھوٹ کر ذوالقرنین کے پیٹ پر گرا۔ وہ جاگ اٹھا اور رضیہ اس کے اوپر گر پڑی۔ وہ رو رہی تھی۔

ذوالقرنین نے تیزی سے اٹھ کر دیا جلایا۔ وہ اپنے بستر پر خون آلود خنجر پڑا دیکھ کر حیران رہ گیا۔ رضیہ چہرہ ہاتھوں میں چھپائے ہوئے سسکیاں لے رہی تھی۔ ذوالقرنین نے اسے اٹھایا اور پوچھا کہ یہ سب کیا ہے۔

"میں تمہیں قتل نہیں کر سکتی"— اس نے روتے ہوئے کہا۔ "میں اپنے دل میں خنجر نہیں اتار سکتی۔"

اس نے ذوالقرنین کو بتایا کہ وہ مہاراجہ راجیا پال کو قتل کر آئی ہے اور اب اس کے ہاتھ سے ذوالقرنین کو قتل ہونا تھا۔ اس نے بتایا کہ کس طرح وہ عورتوں کے ساتھ دریا میں نہانے جا رہی تھی کہ اسے ایک سادھو ملا۔ اس نے سادھو کی باتیں سنائیں۔ ان عورتوں نے اسے جس طرح راجیا پال کے لیے تیار کیا تھا، وہ بھی بتایا۔ سفوف کا بھی ذکر کیا۔

"میں نے تمہاری محبت کو قبول کیا تھا، تمہارے مذہب کو نہیں"—

رضیہ نے کہا۔ "تم نے مجھے خدا کی عبادت سکھلائی اور پڑھائی تھی مگر میں تمہارے خدا کی بجائے تمہاری عبادت کرتی رہی۔ مجھے بچپن سے بتایا جاتا رہا ہے کہ مسلمان ناپاک ہوتے ہیں۔ ہمارے دلوں میں مسلمانوں اور اسلام کے خلاف نفرت پیدا کی جاتی ہے۔ میں تم سے نفرت نہ کرسکی"۔ اُس نے لپک کر خنجر اٹھایا اور ذوالقرنین کی طرف بڑھا کر کہا۔ "مجھے اپنے ہاتھوں قتل کر دو۔ میں زندہ نہیں رہنا چاہتی"۔

ذوالقرنین نے اس کے ہاتھ سے خنجر لے لیا اور اُسے کہا کہ وہ زندہ رہے گی اور اُس کا دل گواہی دے گا کہ اسلام سچا مذہب ہے اور مسلمان ناپاک نہیں ہوتے۔ اُس نے بڑی مشکل سے رضیہ کو سنبھالا۔

دوسرے دن ذوالقرنین نے ایک قاصد قنوج کو سالار ابوالقدر سلجوقی کے لیے اس پیغام کے ساتھ دوڑا دیا کہ راجیپال قتل ہوگیا ہے۔ رضیہ کی نشاندہی پر اُن دو عورتوں کو پکڑا گیا جو رضیہ کے ساتھ دریا کو گئی تھیں۔ انہیں ڈرایا دھمکایا گیا تو انہوں نے گوبند کو پکڑوا دیا۔ گوبند نے ان عورتوں اور رضیہ کے ساتھ لاتعلقی کا اظہار کیا۔ ذوالقرنین نے دو گھوڑے منگوائے۔ گوبند کے ٹخنوں سے الگ الگ رسّے باندھ کر گھوڑوں کے ساتھ باندھ دیئے گئے۔ سواروں سے کہا گیا کہ وہ گھوڑے چلا دیں۔ ایک گھوڑا دائیں کو چلا اور دوسرا بائیں کو۔ پیشتر اس کے کہ گوبند کی ٹانگیں جسم سے الگ ہو جاتیں، وہ درد سے بلبلا اٹھا۔ گھوڑے روک لیے گئے۔ اُس نے بتا دیا کہ راجیپال کو اسی نے قتل کرایا ہے اور گوالیار اور کالنجر کے مہاراجوں نے اسے انعام پیش کیا تھا۔ اس نے مہاراجوں کا تمام تر منصوبہ بھی بتا دیا، اور یہ بھی کہ وہ دو غلا جاسوس ہے۔

سالار ابوالقدر سلجوقی آ گیا۔ اس نے سارا واقعہ سن کر گوبند سے کہا کہ وہ بھاگ جائے۔ گوبند حیران سا ہو کے چلا تو سلجوقی نے اپنے ایک محافظ سے کمان لی۔ اس میں تیر ڈالا اور دوسرے لمحے تیر گوبند کی پیٹھ میں اترا ہوا تھا۔ سالار سلجوقی نے حکم دیا کہ اسے گھسیٹ کر دُور پھینک آؤ۔

ایک شکست خوردہ مہاراجے کا قتل اتنا اہم واقعہ نہیں تھا کہ سلطان محمود کو اس کی اطلاع دی جاتی مگر اہم اور فوری توجہ کا طالب اس واقعہ کا پس منظر تھا اور ہندوستان کے مہاراجوں کے ارادے بڑے خطرناک تھے۔ سلجوقی نے غزنی کو ایک تیز رفتار قاصد بھیج دیا۔

سلطان محمود نے جب اس قاصد کی زبانی پیغام سنا تو اُس نے اُسی وقت اپنی فوج کو ہندوستان کی طرف کوچ کی فوری تیاری کا حکم دے دیا۔

تین چار روز بعد غزنی کی فوج ایک تاریخی جنگ لڑنے کے لیے غزنی سے روانہ ہوئی۔ اِدھر گوالیار، کالنجر اور لاہور کی فوجیں فیصلہ کُن جنگ لڑنے کے لیے تیار ہونے لگیں۔

یہ معجزہ تھا

نو صدیاں

اور ستر سال گزرے سلطان محمود غزنوی کے مُرشد اور روحانی پیشوا شیخ ابوالحسن خرقانی نے اُسے کہا تھا "جس دور میں مسلمان، ہندو اور یہودی سے غافل ہو نے یا انہیں دوست بنا بیٹھے: وہ اُمّتِ رسولؐ کے زوال کا دور ہو گا .... وہ اسلام کی تاریخ کا سیاہ دور ہو گا۔ خدا کی یہ زمین مسلمانوں کے خون سے لال ہوتی رہے گی .... تمہاری اس سلطنت (غزنی) پر بے دین من مانی کریں گے۔ غزنی، کابل، قندھار، گردیز اُس قوم کے پاؤں تلے روندے جائیں گے جس کا کوئی دین نہیں اور جسے یہاں کے مسلمان اپنا ہمدرد سمجھیں گے .... تمہارا مقبرہ ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ مستقبل کا خونی کھیل تمہارے اور میرے مقبروں کے اردگرد کھیلا جائے گا۔ ہم کچھ نہیں کر سکیں گے۔ کچھ کرنا ہے تو آج کر لو۔"

سلطان محمود غزنوی نے اپنی ساری عمر باطل کے خلاف لڑتے میدان جنگ میں گزار دی۔ آخر میں وہ تپ دق کا مریض ہو گیا تو اُس نے اپنے طبیب کو سختی سے کہہ دیا تھا کہ کسی کو پتہ نہ چلے کہ سلطان کو دق تیزی سے کھا رہا ہے۔ اُس کے پیر و مرشد نے اُسے کہا تھا کہ کچھ کرنا ہے تو آج کر لو۔ اُس نے اپنے آج کا آرام اور سکون اور اپنا جسم ملّتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کل پر قربان کر دیا، مگر آج غزنی اور ہرات میں اُس کے اور اُس کے روحانی پیشوا کے مقبروں کے اردگرد ایک بے دین قوم خونی کھیل کھیل رہی ہے اور مسلمانوں کی دھجیاں اُڑ رہی ہیں۔ غزنی، کابل، قندھار اور گردیز

اُس قوم کے قدموں تلے روندے جا رہے ہیں جس کا کوئی دین نہیں اور جسے وہاں کے مسلمان حکمران اپنا ہمدرد سمجھتے ہیں۔

کیوں؟ ایسا کیوں ہوا؟ حرّیت کے چراغوں کی روشنی کہاں گئی؟

حرّیت کے چراغ ملّت کے لہو سے روشن رہا کرتے ہیں۔ وہ لہو بک گیا، وہ ایمان نیلام ہو گیا اور شہیدوں کا لہو جیسے زمین نے ہضم کر لیا ہو۔ تاریخ کے ساتھ ہم نے بے انصافی کی۔ تاریخ نے محمودؒ کے ساتھ بے انصافی کی۔ یہ ہمارے دین کے دشمن کا کمال ہے کہ اُس نے بُت شکن کو بُت فروش ثابت کر دیا۔ حق کے علمبردار کو لٹیرا کہا اور تاریخ کے منہ میں جھوٹ ڈال کر جھوٹ کو سچ کہلوایا۔ سبق جو ہم بھلا بیٹھے تھے، وہ ہمارے دشمن نے یاد رکھا اور دشمن نے یہ بھی یاد رکھا کہ کسی قوم کو وقار اور شجاعت سے محروم کرنا ہو تو اُس کی تاریخ سے درخشاں باب پھاڑ کر ان کی جگہ عیش و عشرت اور جسمانی لذّت پرستی کے افسانے رکھ دو۔

ہمارے دشمن نے ہمیں تاریخ سے بیگانہ رکھا۔ لہو کی تحریروں کو تیزاب سے دھو ڈالا۔ جذبوں پر جنسیت کا فسوں طاری کر دیا، پھر ہم بھول گئے کہ ہم کیا تھے اور ہمارے فرائض کیا تھے۔ ہم اُس دھرتی پر بدمست ہو کر چلنے لگے جس میں محمد بن قاسم کے سرفروشوں کا لہو ملا ہوا ہے اور جس کی مٹی میں غزنی کے شہیدوں کی بُو باس رچی بسی ہوئی ہے۔ یہی وہ بُو باس ہے جو قوم کو اور اُبھرتی ہوئی نسلوں کو طوفاں بگریباں اور باطل کے خلاف معرکہ آرا رکھتی ہے۔ قوم وہی پورے وقار سے زندہ و بیدار رہتی ہے جو اپنے شہیدوں کے لہو کی تحریروں کو بجھنے نہیں دیتی۔ انہیں اپنے لہو سے شوخ اور تر و تازہ رکھتی ہے۔ آباؤ اجداد کے نقوشِ پا کو مٹنے نہیں دیتی۔ ان پر اپنے نقش ثبت کر کے انہیں اپنے پیچھے آنے والوں کے لیے نمایاں رکھتی ہے۔

دشمن نے ہماری تاریخ سے وہ ورق پھاڑ ڈالے جن پر لکھا تھا کہ جہاں

آج مینارِ پاکستان کھڑا ہے، وہاں نو صدیاں پہلے جنگل ہُوا کرتا تھا۔ اس جنگل میں لاہور کے مہاراجوں نے مسلمان لڑکیوں کی انسانی قربانیاں دی تھیں۔ ان کے خُون سے اپنے پتھر کے دیوتاؤں کے پاؤں دھوئے تھے۔ اسی لاہور میں جسے اندرونِ لاہور کہتے ہیں مسلمان نوجوانوں نے غزنی کے جاسوسوں کو چھپا کے رکھا اور ان کی مدد اور رہنمائی کی تھی۔ ان جاسوسوں کو بچانے کے لیے مسلمان عورتوں نے اپنی جانیں اور عصمتیں لُٹا دی تھیں۔ وہ قید خانے بھی کہیں ہُوا کرتے تھے جن میں مسلمانوں کو اذیتیں دے دے کر ختم کیا جاتا تھا۔

ملتان کے ریگستان کو جس کی فضا میں محمد بن قاسمؒ کے مجاہدوں کے نعرے آج بھی ایک مقدس اور ولولہ انگیز گونج بن کر بھٹک رہے ہیں، غزنی کے شیروں نے اس ریت کو اپنے لہُو سے سیراب کیا تھا۔ وہ مُلتان کی گلیوں میں لڑے تھے۔ وہ جھلستے اور جھلساتے ریگستانوں میں لڑے تھے۔

سلطان محمود غزنوی باطل کی جنگی طاقت پر جس قہر سے ٹوٹا تھا، سب مورخ اس کی گواہی دیتے ہیں۔ ملتان اسلام کے نام پر قرامطی نام کے ایک باطل عقیدے کا مرکز بن گیا تھا۔ قرامطیوں کی فوج اور غیر فوجی قرامطی غزنی کی حق پرست فوج کے آگے چٹانوں کی طرح کھڑے ہو گئے تھے۔ ان چٹانوں کو ریزہ ریزہ کرنے کے لیے سلطان محمود سپاہیوں کی طرح لڑا تھا۔ ملتان کی گلیوں میں بھی لڑائی ہُوئی تھی۔ مورخ کہتے ہیں کہ سلطان محمودؒ نے اس قدر تلوار چلائی تھی کہ اُس کا دایاں ہاتھ تلوار کے دستے پر اکڑ گیا تھا اور اس پر دشمن کا اس قدر خون جم گیا تھا کہ لڑائی کے بعد اُس کی انگلیاں دستے سے اکھڑتی نہیں تھیں۔ تلوار اس کے بازو کا حصہ بن گئی تھی۔ بہت دیر تک اُس کے ہاتھ پر گرم پانی ڈالتے رہے تھے تو ہاتھ کھلا اور تلوار سے الگ ہُوا تھا۔ یہ وہ قہر تھا جو دشمن کی نفرت سے پیدا ہُوا کرتا ہے

— آج بھی ہمارا وہی دشمن ہے مگر ہمیں اس کی محبت کے سندیس دیئے جا رہے ہیں اور سلطان محمود غزنوی کا مقبرہ ایک بے دین قوم کے ٹینکوں اور طیاروں کی گرج سے لرز رہا ہے۔

ہمارے حصے میں سلطان محمودؒ کے سترہ حملے آئے۔ باقی تمام داستان بُت پرستوں کی دھرتی کی مٹی میں دب گئی ہے۔ ایک عظیم روایت کو سترہ حملوں کا نام دے کر اسے حریت سے خالی کر دیا گیا ہے۔ ہماری تاریخ کو ہندو نے ڈس لیا ہے۔ حق کے اس پیامبر اور بُت شکن کی زندگی کا ہر ایک لمحہ ہماری تاریخ ہے۔ اس تاریخ کی روح زندہ ہے، اسے زندہ کرنا ہے۔

۱۰۲۰ـ۲۱ عیسوی (۴۱۲ ہجری) کے موسم سرما کا آغاز تھا جب غزنی کی فوج سیلاب کی طرح غزنی سے ہندوستان کو آ رہی تھی۔ سیلاب سے مراد یہ نہیں کہ وہ کوئی بہت بڑا لشکر تھا۔ وہ اُس لشکر کے نصف سے بھی کم تھی جو گنگا جمنا کے دوآبہ میں اُس کے مقابلے اور اُسے ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کے لیے جمع ہو رہا تھا۔ تمام مورخ متفق ہیں کہ اب کے ہندو مہاراجوں نے جو متحدہ فوج اکٹھی کی تھی، اُس کی نفری یہ تھی۔ ایک لاکھ چالیس ہزار پیادہ، چھتیس ہزار گھوڑ سوار اور چھ سو چالیس جنگی ہاتھی۔ اُس دور کا ایک مورخ فرخی تھا۔ جس نے ہندو کی جنگی طاقت یہ لکھی ہے۔ ایک لاکھ تینتیس ہزار پیادہ، چھتیس ہزار گھوڑ سوار اور نو سو جنگی ہاتھی۔

اگر ہم ان دونوں میں سے کسی کو بھی صحیح مان لیں تو بھی یہ حقیقت قائم رہتی ہے کہ سلطان محمود جو فوج لے کے آ رہا تھا، اس کی تعداد اس سے نصف تھی۔ اس کے علاوہ سلطان محمودؒ کی سب سے زیادہ خطرناک کمزوری یہ تھی کہ وہ اپنے وطن سے ہزاروں میل دُور دشمن کے ایسے علاقے میں لڑنے کے لیے آ رہا تھا جو دشمنوں سے گھِرا ہُوا تھا۔ وہاں کے پیڑ پودے اور وہاں کے پتھر بھی اُس کے دشمن تھے۔

ہندوستان کی ریاست قنوج کا مہاراجہ راجیا پال قتل ہوگیا تھا۔ اس کی اطلاع ملتے ہی سلطان محمود نے فوج کو کوچ کا حکم دے دیا تھا۔ غزنی کی فوج کے لیے ایک ہندوستانی مہاراجہ کا قتل کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا لیکن راجیا پال سلطان محمود کے لیے اس لیے اہم تھا کہ وہ غزنی کا اتحادی بن گیا تھا۔ اس کا قتل سلطان کے لیے بڑا واضح اشارہ تھا کہ ہندوستان کے مہاراجے متحدہ ہو گئے ہیں اور ان کا دم خم ابھی ٹوٹا نہیں۔ قنوج سے قلعہ دار سالار ابوالقدر سلجوقی نے راجیا پال کے قتل کے پیغام کے ساتھ ہندوستان کے مہاراجوں کی سرگرمیوں کی اطلاع بھی دے دی تھی۔

شیخ ابوالحسن خرقانی کے علاوہ سلطان محمود ایک اور عالم ابوسعید عبدالملک بن عثمان کا بھی معتقد تھا۔ یہ عالم غزنی سے بہت دور رہتے تھے۔ سلطان کبھی کبھار ان سے ملنے اتنی لمبی مسافت طے کرکے جایا کرتا تھا۔ اب اس نے ہندوستان کو کوچ کیا تو دوسرے پڑاؤ کے اگلے روز جب فوج جا رہی تھی، آگے سے ایک سالار سرپٹ گھوڑا دوڑاتا فوج کے وسط میں آیا جہاں سلطان محمود تھا۔ اس نے سلطان کو بتایا کہ ابوسعید عبدالملک راستے میں کھڑے ہیں۔ سلطان نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور وہاں پہنچا جہاں ابوسعید کھڑے تھے۔ سلطان گھوڑے سے کود کر اترا اور ابوسعید کے گھٹنے چھو کر مصافحہ کیا۔

"مجھے کل پتہ چلا ہے کہ آپ ہندوستان جا رہے ہیں" —— ابوسعید عبدالملک نے کہا۔ "اللہ آپ کے ساتھ ہے۔ جنگی امور اور رموز کو آپ سمجھتے ہیں، میں کوئی پند و نصیحت نہیں کرسکتا۔ اتنا ہی کہوں گا کہ آپ تاریخ لکھنے جا رہے ہیں جو ہماری آنے والی نسلوں کے لیے مشعل راہ ہوگی۔ اس جنگ کو اپنی ذاتی جنگ نہ سمجھنا اور یاد رکھنا کہ سدا بادشاہی اللہ کی ہے۔ تخت و تاج کا نشہ دل و دماغ سے اتار دینا۔ یہ ایسا نشہ ہے جسے چڑھ جائے وہ دین کو بھول کر دنیا کا ہو رہتا ہے اور بھول جاتا ہے کہ ایک

لمحے کے بعد ہی اس کی موت آسکتی ہے۔ اس کے کان بند ہو جاتے ہیں کسی کی فریاد وہ سن نہیں سکتا۔ اس کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔ وہ دیکھ نہیں سکتا کہ اس کی رعایا بھوکی اور ننگی ہے۔ اسے وہی نظر آتا ہے جو اسے اس کے درباری دکھلاتے ہیں، اور درباری اسے وہی دکھاتے ہیں جس میں ان کا اپنا مفاد ہوتا ہے۔"

سلطان محمود سر جھکائے کھڑا سن رہا تھا۔

"میں آپ کو زیادہ دیر نہیں روکوں گا محمود!" — ابوسعید عبدالملک کہہ رہے تھے — "یہ نہ بھولنا کہ تمام دنیائے کفر کی نظریں آپ پر لگی ہوئی ہیں۔ سب آپ کی موت کے منتظر ہیں۔ آپ کے پڑوسی جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، وہ بھی آپ کی موت کے خواہش مند ہیں۔ عہد کرلیں کہ آپ مر جائیں تو بھی زندہ رہیں۔ اپنی قوم کے دل میں اور تاریخ میں زندہ رہیں۔ آنے والی نسلیں آپ کو ایک روایت بنا کر زندہ رکھیں۔ اگر آپ نے ہندوستان کے بت پرستوں کا سر نہ کچلا تو وہ اس وقت تک مسلمانوں کا سر کچلتے رہیں گے جب تک کہ وہاں ایک بھی مسلمان باقی ہے۔"

"دعا کریں اللہ مجھے کامیابی عطا فرمائے" — سلطان محمود نے کہا۔ "اب میں وہاں اپنی باقاعدہ حکومت قائم کرکے لوٹوں گا۔ وہاں اپنا امیر اور کافی فوج بھی رکھوں گا۔"

"الوداع محمود" — ابوسعید نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا — "اللہ آپ کا ہمسفر اور مددگار ہو۔"

سلطان محمود نے ان کا ہاتھ چوما اور گھوڑے پر سوار ہوگیا۔

سلطان محمود جانتا تھا کہ دشمن اس کے آگے بھی ہے اور پیچھے بھی۔ آگے ہندو اور پیچھے مسلمان، مگر اسے معلوم نہیں تھا کہ اب دشمن اس کے ساتھ بھی جا رہا ہے۔ یہ سلجوقی تھے جو سلطان محمود کی اطاعت قبول کرکے

اُس کی فوج میں شامل ہو گئے تھے۔ سلجوقی جنگجو تھے۔ یہ غز قبیلے کے لوگ تھے جو اپنے سردار لقمان سلجوقی کے ساتھ اس قبیلے سے الگ ہو گئے اور اپنے آپ کو سلجوقی کہلانے لگے تھے۔ وہ بخارا کے پہاڑی علاقے میں آباد ہو گئے۔ اُنہوں نے ترکستانیوں اور سمانیوں کی لڑائیوں میں سمانیوں کا ساتھ دیا، بلکہ سمانی اُن کے بل بوتے پر لڑا کرتے تھے۔ اس طرح وہ ایک جنگی طاقت بنتے گئے۔

لقمان سلجوق کے بیٹے اسرائیل سلجوق نے بخارا میں خاصا اثر ورسوخ حاصل کر لیا۔ اُس نے ایک حکمران الپتگین کی بہت مدد کی۔ اسرائیل اور الپتگین کی گہری دوستی ہو گئی۔ سلطان محمود نے اپنے ان دشمنوں کو کچلنے کے لیے حملہ کیا تو دونوں بخارا کے پہاڑی علاقوں میں بھاگ گئے تھے۔

ایلک خان ایک طاقتور حکمران تھا۔ وہ کسی نہ کسی کو ساتھ ملا کر سلطان محمود کے ساتھ بہت لڑا تھا مگر اُس نے ہر بار شکست کھائی۔ آخری شکست کے بعد جب وہ اپنے خاندان کے ساتھ کسی خوشنما پہاڑی علاقے میں چھپا ہوا تھا تو اسرائیل اسے ملنے گیا۔ اس لڑائی میں اسرائیل کے سلجوقی ایلک خان کے ساتھ نہیں تھے۔ اسرائیل اُسے تلاش کرتا اُس تک پہنچ گیا۔ ایک تو قدرت نے اُس جگہ کو اپنا حُسن دے رکھا تھا، دوسرے ایلک خان کی خیمہ گاہ نے وہاں محل جیسی رونق بنا رکھی تھی۔ وہ اپنی دنیا کا بادشاہ تھا۔ اپنی بادشاہی کو وہ سلطنتِ غزنی تک پھیلانے کے لیے لڑ رہا تھا مگر شکست کھا گیا۔

اُس کی خیمہ گاہ میں عورتیں بھی تھیں۔ ناچنے گانے والیاں بھی تھیں اور محل کے تمام لوازمات اور شان و شوکت وہاں موجود تھی۔ اسرائیل جب وہاں گیا تو ایلک خان اُسے اپنے خیمے میں ملا۔ یہ خیمہ محل کے کمرے جیسا خوشنما اور کشادہ تھا۔ اسرائیل کو وہ جانتا تھا۔ اسرائیل وجیہہ جوان تھا۔ خوبرو تھا۔ اُس کی آنکھیں سبز تھیں اور وہ سلجوقیوں کا سردار

تھا اور سلجوقی ایک جنگی طاقت تھے۔

”اب میرے پاس کیوں آئے ہو؟“ ایلک خان نے اُس سے پوچھا۔

”یہ دیکھنے کے لیے کہ میدانِ جنگ سے بھاگے ہوئے سردار کی حالت کیسی ہوتی ہے“۔ اسرائیل نے طنزیہ کہا۔ ”آپ کو مجھ سے یہ گلہ ہے کہ میں آپ کی مدد کو نہیں آیا، اور مجھے یہ شکایت ہے کہ آپ نے مجھے مدد کے لیے بلایا نہیں۔ کیا آپ اپنے آپ کو اتنا طاقتور سمجھ بیٹھے تھے کہ میرے بغیر غزنی کے محمود کو شکست دے سکیں گے؟“

”تمہیں خود آنا چاہیے تھا“۔ ایلک خان نے کہا۔

”نہیں“۔ اسرائیل بولا۔ ”آپ محمود کو شکست دے کر خود غزنی اور بخارا کے بادشاہ بننے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ سمانی میرے قبیلے کی مدد کے بغیر ترکستانیوں کو شکست نہیں دے سکتے تھے۔ سمانی اُس وقت ختم ہوئے جب سلجوقیوں نے اُن کا ساتھ چھوڑ دیا۔ ترکستانی آج بھی ہم سے ڈرتے ہیں“۔

”کیا تم مجھے طعنے دینے آئے ہو؟“ ایلک خان نے کہا۔ ”کیا تم یہ دیکھنے آئے ہو کہ میں کتنا کمزور ہو گیا ہوں؟“

”نہیں ایلک خان!“ اسرائیل نے کہا۔ ”شکست کا اتنا اثر قبول نہ کرو کہ دوست اور دشمن کو بھی پہچان نہ سکو۔ ہم دونوں کا دشمن ایک ہے.... غزنی کا سلطان محمود.... آپ اکیلے اُسے شکست نہیں دے سکتے۔ میں اکیلا اپنے سلجوقیوں کے ساتھ اُسے شکست دے سکتا ہوں اور دوں گا۔ میں یہ دیکھنے آیا ہوں کہ آپ میری کیا مدد کر سکتے ہیں۔ کیا مجھے کچھ فوج دے سکتے ہیں؟.... اگر نہ دے سکیں تو بھی میں سلطان محمود سے لڑوں گا۔ الپتگین میرے ساتھ ہے“۔

”ہوش کی بات کرو اسرائیل!“ ایلک خان نے کہا۔ ”تم نے دوسروں

کو مدد دی ہے اور مدد کے انداز سے لڑے ہو۔ تمہارا آمنا سامنا محمود کی
فوج سے نہیں ہوا۔ محمود اپنی جنگی چالوں سے اپنے سے دگنی اور طاقتور
فوج کو بھی شکست دے دیا کرتا ہے۔ اُس کی فوج بے لگام ہو کر نہیں
بلکہ سِدھائے ہوئے گھوڑوں کی طرح لڑتی ہے۔ اشاروں پر حرکت کرتی
ہے۔ ہم میں وہ بات نہیں"۔

"ایلک خان!"۔ اسرائیل نے کہا۔ "اس شکست نے آپ کے دماغ
پر گہرا اثر کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ مجھے آپ سے مدد لینی بھی نہیں چاہیئے۔
اگر خان پر یہ دہشت سوار ہے تو خان کے سپاہی تو کانپ رہے ہوں گے
مجھے سُلطان محمود سے لڑنا ہے۔ وہ بہت بڑی طاقت بنتا جا رہا ہے۔
ہندوستان کی دولت نے اُسے بہت زیادہ طاقتور بنا دیا ہے اور وہ
دن دُور نہیں جب بلخ، بخارا، سمرقند، تُرکستان اور خوارزم سلطنتِ غزنی
کے غلام ہوں گے اور ہم مجرموں کی طرح دور کہیں پہاڑیوں میں بھاگے
بھاگے پھریں گے"۔

"سنا ہے کچھ سلجوقی بھی اُس کی فوج میں شامل ہو گئے ہیں"۔۔۔
ایلک خان نے کہا۔

"اُس نے ہندوستان کے زر و جواہرات سے ان سلجوقیوں کو خریدا ہے"
۔۔۔ اسرائیل نے کہا۔ "اُس کا ایک سالار بھی سلجوقی ہے۔ ابوالقدر سلجوقی۔
وہ ہندوستان میں کہیں قلعہ دار ہے"۔

"کیا تم ان لوگوں کو واپس اپنے قبیلے میں نہیں لا سکتے؟"۔۔۔ ایلک خان
نے پوچھا۔

"یوں کہو ایلک خان! کیا تم ان لوگوں کے ہاتھوں سلطان محمود کو نہیں
مروا سکتے؟"۔۔۔ اسرائیل نے کہا۔ "لڑائی صرف میدان میں نہیں لڑی جاتی
خانِ محترم! میں محمود کو اُس کے سالار ابوالقدر سلجوقی سے مرواؤں گا، لیکن
ایک بار میدان میں لڑوں گا۔ اگر میں ہار گیا تو اُن سلجوقیوں کو استعمال کروں

گا جو محمود کی فوج میں ہیں"۔

شراب کا دَور چل رہا تھا۔ شراب بڑی خوبصورت عورتیں پیش کر رہی
تھیں۔ ایلک خان کے پاس تین چار جوان لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ وہ بخارا کے
قدرتی حُسن کا شاہکار تھیں۔ اسرائیل ان سے زیادہ نہیں تو انہی جیسا
خوبرو تھا اور مردانہ جاہ و جلال کا بڑا خوبصورت اور مضبوط مجسمہ۔

"میں اپنے آپ کو غزنی کے تخت پر بیٹھا ہوا دیکھا کرتا ہوں"۔۔۔
اسرائیل سلجوقی نے شراب کا جام لہرا کر کہا۔ اُس پر شراب کا نشہ بھی تھا،
طاقت کا بھی۔

ایلک خان نے اُسے دو چار روز کے لیے روک لیا۔

رات چاندنی اور فضا میں پھولوں کی بھینی بھینی مہک تھی۔ اسرائیل
اپنے خیمے سے دُور ٹہل رہا تھا۔ اُس نے محسوس کیا کہ وہ اکیلا نہیں۔
اُس نے اپنے خنجر پر ہاتھ رکھا اور رُک کر ادھر اُدھر دیکھا۔ ایک سایہ درختوں
کی چھاؤں میں سے بڑھا آ رہا تھا۔ سایہ مرد کا نہیں تھا۔

"کون ہے؟"

"مریم"۔۔۔ چاندنی میں آکر یہ سایہ نسوانی حسن کا متحرک مجسمہ بن گیا۔۔۔
اُس نے کہا۔۔۔ "ایلک خان کی بھتیجی ہوں"۔

اسرائیل نے اُسے قریب ہو کر غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "کل تم بھی
ایلک خان کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں.... یہاں کیوں آئی ہو؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے؟"۔۔۔ مریم نے کہا۔ "لیکن اس
سے پہلے کہ آپ کچھ اور سمجھ لیں، میں آپ کو بتا دوں کہ میں آپ کی وجاہت
اور مردانہ حسن اور جسم سے متاثر ہو کر نہیں آئی۔ مجھے آپ کے عزم نے
متاثر کیا ہے۔ خیال رکھیں، میں کنواری ہوں اور میں ایلک خان کی
عزت ہوں مگر یہ عزت مجھے خطرے میں نظر آ رہی ہے۔ چچا ایلک خان

دل چھوڑ بیٹھے ہیں۔ یہ میری غیرت کو گوارا نہیں۔ کیا غزنی کا سلطان محمود جن ہے؟ بھوت ہے؟ دیو ہے؟ میں اُس مرد پر اپنا سب کچھ قربان کردوں گی جو محمود کی سلطنت کو تباہ کر کے اُسے بھٹکنے کے لیے ان پہاڑوں میں چھوڑ دے گا!"

اسرائیل ہنس پڑا اور بولا ”شہزادی کو محمود کے ساتھ کیا دشمنی ہے؟"

”اسرائیل سلجوقی کو محمود سے کیا دشمنی ہے؟“ — مریم نے کہا —

”اِدھر آئیے۔ بیٹھ کے باتیں کریں.... دشمن دشمن ہوتا ہے۔ کیا اور کیوں کا فیصلہ دشمن کو شکست دے کر کیا جاتا ہے۔"

”مریم!“ — اسرائیل نے کہا — ”تمہارا جسم کنوارہ ہے۔ تمہارا دماغ کنوارہ نہیں لگتا۔ تم نے بڑی پختہ بات کی ہے۔"

وہ درختوں کے نیچے جا کے بیٹھ گئے اور تھوڑی ہی دیر بعد اُن کے ہاتھ ایک دوسرے کے ہاتھوں میں اُلجھ گئے، پھر وہ ایک سایہ بن گئے اور اسرائیل نے سرگوشی کی۔ ”ایلک خان سے بات کروں؟"

”وہ نہ مانے تو مَیں خود آجاؤں گی“ — مریم کی سرگوشی سُنائی دی — ”مَیں ہمیشہ کے لیے تمہاری ہوں اسرائیل! مَیں ایسے ہی ایک مرد کے انتظار میں تھی جس کے ارادوں کو میرا عزم گلے لگا سکے۔ سلطان محمود کو ختم کرنے کے لیے مجھے جس طرح بھی استعمال کرنا چاہو گے مجھے تیار پاؤ گے۔"

وہ چلی گئی۔

اسرائیل وہاں تین راتیں رہا۔ تینوں راتیں مریم اُسے وہاں ملی جہاں پہلی رات ملی تھی۔ آخری رات اُس کے خاندان کی ایک اور شہزادی عنبرین بھی جو اُس کی ہم عمر تھی، اُس کے ساتھ تھی۔ مریم اسرائیل کے پاس گئی تو عنبرین دُور کھڑی رہی تھی۔ پھر اسرائیل چلا گیا۔

”مریم!“ — وہ واپس آئی تو عنبرین نے اُسے کہا — ”تمہارا انتخاب اس سے بہتر نہیں ہو سکتا تھا۔ تمہارا خاوند اسرائیل ہی ہونا چاہیئے، مگر مریم! اسرائیل کے ساتھ شادی کر کے تم سلطان محمود کے ساتھ دشمنی پکی کرو گی۔ کیا تم نے سنا نہیں کہ چچا ایلک کہہ رہے تھے کہ وہ اپنے خاندان کی بیٹیاں محمود کے خاندان میں دے کر اُس کے ساتھ صُلح کر لیں گے؟"

”یہ اُن کی شکست کی دلیل ہے“ — مریم نے کہا — ”وہ سلطان محمود سے اس قدر خوفزدہ ہیں کہ اپنی بیٹیاں تک دینے کو تیار ہو گئے ہیں۔ اسرائیل سلطان محمود کے ساتھ کسی قیمت پر صلح نہیں کرے گا۔"

”اور شکست کھائے گا“ — عنبرین نے جھنجھلا کر کہا — ”اُس کا انجام وہی ہوگا جو چچا ایلک خان کا ہو رہا ہے، جو سلطان محمود کے ہاتھوں قادر خان کا ہوا تھا، جو خوارزم شاہوں کا ہوا اور جو قرامطیوں کا ہوا ہے۔"

”اسرائیل ان سب کا انتقام لے گا“ — مریم نے فخر سے کہا — ”عنبرین! تم ایسی باتیں کیوں کیا کرتی ہو جن سے غزنی والوں کی غلامی اور شکست کی بو آتی ہے؟"

”غزنی والوں کی غلامی نہیں اسلام کی غلامی کہو“ — عنبرین نے کہا — ”تم دنیا کی باتیں کرتی ہو، میں اُس دنیا کی باتیں کر رہی ہوں جس میں ہمیں مر کر جانا ہے۔ آپس میں لڑ کر ہم نے کیا پایا ہے؟ ہم نے وہ طاقت ضائع کر دی ہے جو اسلام کے دشمنوں کے خلاف استعمال ہونی چاہیئے تھی۔ اگر ہم سب نے مل جُل کر سلطان محمود کو شکست دے دی تو کامیاب ہم نہیں بلکہ اسلام کے دشمن ہوں گے۔"

مریم ہنس پڑی۔ اُس کی ہنسی میں طنز تھی۔ اُس نے کہا — ”تم اسلام اسلام کی رٹ لگاتی مر جاؤ گی اور میں سلطنتِ غزنی کی ملکہ ہوں گی۔ تم کسی بوڑھے سالار کی بیوی بنو گی.... لیکن نہیں میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ میں تمہاری شادی کسی تم جیسے خوبصورت مرد کے ساتھ کراؤں گی جس کے پاس دولت بھی

ہوگی اور جس کا حکم چلے گا۔"

"اور اسرائیل سلجوقی بادشاہ ہوگا۔" عنبرین نے طنزیہ کہا۔

"ہاں۔" مریم بولی۔ "وہ ہے ہی بادشاہ۔ اسے وہ تخت و تاج چاہیے جس پر سلطان محمود بیٹھا ہے۔"

"تم خواب دیکھ رہی ہو مریم!"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔" مریم نے کہا۔ "میں خواب دیکھ رہی ہوں۔ اسرائیل میرے خوابوں کی تعبیر بن کے آیا ہے۔ میں یہ خواب بچپن سے دیکھ رہی ہوں۔ مجھے ملکہ بننا ہے۔ سر پر تاج رکھنے کے لیے میں اپنا سب کچھ قربان کر دوں گی۔"

"ہاں اسرائیل!" ایلک خان نے اسرائیل کی درخواست سن کر کہا۔ "مریم کے باپ نے مجھے اجازت دے دی ہے کہ میں مریم کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دے دوں لیکن وعدہ کرو کہ تم سلطان محمود سے میری شکست کا انتقام لوگے۔ مجھے عمر نے اور اپنے دوستوں نے دھوکہ دیا ہے۔ میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ دوستوں نے میدانِ جنگ میں ہی ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ میں نے تو سوچا تھا کہ سلطان محمود کے ساتھ رشتے ناطے جوڑ کر باقی عمر آرام سے گزار دوں گا لیکن تم امید کی ایک کرن بن کر آئے ہو۔ تم میری خواہش پوری کر سکو گے... مریم کے ساتھ مجھے بہت پیار ہے۔ اکثر کہا کرتی ہے کہ وہ ملکہ بننے کے لیے پیدا ہوئی ہے۔ تم اُسے ملکہ بنا سکتے ہو۔"

"میں آپ کی یہ خواہش کہ سلطان محمود کو شکست دی جائے اور مریم کی یہ خواہش کہ وہ ملکہ بنے، پوری کر دوں گا۔" اسرائیل نے کہا۔ "میں ابھی سلطان محمود کے آمنے سامنے نہیں آیا۔ اگر میں پہلی بار اس کے سامنے جم نہ سکا تو پیچھے ہٹ آؤں گا۔ دوسری بار بھی اُسے شکست نہ دے سکا تو میں دوسرا حربہ استعمال کروں گا۔ آپ مطمئن رہیں۔ محمود آپ کی زندگی میں ختم

ہوگا۔ اُسے میرے ہاتھوں ختم ہونا ہے۔"

اسرائیل سلجوقی نے پُرعزم باتوں سے ایلک خان کے دل سے شکست کی چوٹ سہلا دی اور وہ مریم کو دلہن بنا کے لے گیا۔ اس کے قبیلے کو پہلے اطلاع مل چکی تھی کہ وہ دلہن لا رہا ہے اور دلہن کوئی عام قسم کی قبائلی لڑکی نہیں ایلک خان جیسے جنگجو کی بھتیجی ہے۔ ایلک خان گو شکست خوردہ تھا لیکن اُن دنوں سلطان محمود کے خلاف لڑنا بہت بڑا اعزاز سمجھا جاتا تھا۔ سلطان محمود کو کوئی دل گردے والا ہی للکار سکتا تھا۔ اس لحاظ سے ایلک خان کی بڑی دھوم تھی۔

سلجوقی ہزاروں کی تعداد میں اکٹھے ہو گئے تھے۔ بکرے اور اونٹ اتنے زیادہ ذبح ہوئے کہ کھالوں کی پہاڑی بن گئی اور خون ندی کی طرح بہہ نکلا۔ ساری رات جشن منایا گیا۔ دوسرے دن اسرائیل نے تمام قبیلے کو ایک جگہ اکٹھا کیا اور مریم کے ساتھ بلند جگہ کھڑے ہو کر قبیلے سے خطاب کیا:

"آج میں تمہیں وہ ملکہ دے رہا ہوں جو محمود کی سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجانے کا عہد کر کے آئی ہے۔ ملکہ مریم جتنی حسین ہے اتنی ہی عزم اور عہد کی پکی ہے۔ سلجوقی شیر دل! کیا تمہاری تلواریں غزنی والوں کے خون کی پیاسی نہیں!"

قبیلے نے اتنے گرجدار نعرے لگائے کہ پہاڑ کانپنے لگے۔ "ہندوستان کا لٹیرا آج ہمیں آنکھیں دکھا رہا ہے۔ عہد کرو کہ محمود کو ہمیشہ کی نیند سُلا کر سوئیں گے۔ اب ہماری منزل غزنی ہوگی۔ مت بھولو کہ ہمارا کوئی ملک نہیں۔ زمین کا کوئی ایسا ٹکڑا نہیں جسے سلجوقی اپنا وطن کہہ سکیں۔ ہم جنگلی جانوروں کی طرح پہاڑوں اور وادیوں میں بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ ہم کمزور نہیں۔ ہم ایک طاقت ہیں۔ ہم ایک فوج ہیں۔ ہم ایک قوم ہیں۔ ہماری طاقت دوسرے استعمال کر رہے ہیں۔ ہم بکھرنا شروع ہو گئے ہیں۔ کئی سلجوقی غزنی کی فوج میں شامل ہو گئے ہیں۔ سلطان محمود نے انہیں ہندوستان سے لوٹی ہوئی دولت سے خرید لیا ہے۔ وہ اسلام کے نام پر سب کو دھوکہ دے رہا ہے۔ اسلام

کے پاسبان ہم ہیں لیکن ہم پہلے سلجوقی، اس کے بعد مسلمان ہیں۔ محمود اسلام کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ وہ اپنے آپ کو بت شکن کہلاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُس نے اپنے آپ کو ایک بُت بنالیا ہے اور ہم سب سے اپنے آگے سجدے کرانا چاہتا ہے۔ ہم خدا کے سوا کسی کے آگے نہیں جھکیں گے۔ تلواریں تیز کرلو۔ ترکشیں تیروں سے بھر لو۔ تیار ہو جاؤ۔ ہمارا اگلا جشن فتح کا جشن ہوگا۔"

اُسی روز پہاڑی علاقے میں گہما گہمی شروع ہوگئی۔ پھینکنے والی برچھیاں تیار ہونے لگیں۔ کمانیں اور تیر تیار ہونے لگے۔ دور دور سے سلجوقیوں کو اکٹھا کیا جانے لگا ـــ اور ایک مہینے کے قلیل عرصے میں ایک لشکر تیار ہوگیا۔ اسرائیل سلجوقی نے ایلک خان کی بھی کچھ فوج لے لی اور اس فوج کے ساتھ ایلک خان کا بیٹا احمد توغان خان کمانڈر بن کے آیا۔

غزنی کی فوج میں ارباب خان سلجوقی ایک جیش کا عہدیدار تھا۔ ایک روز اُس کا باپ اُسے ملنے آیا۔ ملنے کا مقصد صرف باپ بیٹے کی ملاقات نہیں تھی، بلکہ باپ اپنے بیٹے کو بتانے آیا تھا کہ سلجوقی سلطان محمود کے خلاف لڑنے کی تیاریاں کر رہے ہیں اور سلجوقی درویشوں نے فتویٰ دیا ہے کہ جو سلجوقی غزنی کی فوج میں ہیں وہ واپس اپنے قبیلے میں آجائیں، ورنہ وہ کافروں کی موت مریں گے اور اُن کی لاشیں گدھ اور کتے کھائیں گے۔ ارباب خان نے اپنے باپ سے سلجوقیوں کی تیاریوں کی تفصیل سُنی اور باہر نکل گیا۔ وہ اپنے سالار کے پاس گیا اور اُسے بتایا کہ سلجوقی غزنی پر حملے کی تیاریاں کر رہے ہیں اور یہ اطلاع سلطان تک پہنچنی چاہیئے۔

تھوڑی دیر بعد باپ بیٹا سلطان محمود کے سامنے کھڑے تھے۔

"میں تمہارے بیٹے کی قدر کرتا ہوں کہ اس نے اپنے باپ کو مجرم بنا کر اپنے سلطان کے سامنے کھڑا کر دیا ہے" سلطان محمود نے کہا۔ "میں اسے کیا انعام دوں گا! اسے اصل انعام خدا دے گا۔"

بوڑھا خوف سے کانپنے لگا۔ اُسے بڑی ہی خوفناک سزا نظر آنے لگی تھی۔

"جسے روشنی نہ دکھائی گئی ہو اُس پر کوئی الزام نہیں کہ وہ راستے سے بھٹک گیا ہے" ـــ سلطان محمود نے کہا ـــ "اب تمہارا بیٹا تمہیں روشنی میں لے آیا ہے۔ مجھے بتاؤ کہ سلجوقی کیسی تیاریاں کر رہے ہیں اور اُن کے ارادے کیا ہیں۔ نہیں بتاؤ گے تو میں تمہیں قید نہیں کروں گا۔ تم ہمارے مہمان ہو اور مسلمان ہو۔ عزت سے رخصت کروں گا تاکہ تم جان سکو کہ سچا اسلام کہاں ہے اور خدا کس کے ساتھ ہے .... کیا تم خدا سے ٹکر لے سکتے ہو؟"

بیٹا بھڑک اُٹھا اور بولا "گستاخی کی معافی چاہتا ہوں سلطانِ عالی مقام! اگر میرے باپ نے سچ نہ بولا تو میں یہیں اس کا سر کاٹ کر آپ کے قدموں میں رکھ دوں گا۔"

"تم نے گستاخی میری نہیں کی، اپنے باپ کی کی ہے" سلطان محمود نے گرج کر کہا ـــ "اس نے صرف ایک رُخ دیکھا ہے۔ اسے دوسرا رُخ بھی دیکھنے دو۔"

بوڑھا اتنا متاثر ہوا کہ آگے بڑھ کر سلطان محمود کے آگے دو زانو ہوگیا۔ اُس نے اپنی کمر سے تلوار اتار کر سلطان کے قدموں میں رکھ دی اور اُس نے بتانا شروع کر دیا کہ اُن کے سردار اسرائیل نے ایلک خان کی بھتیجی کے ساتھ شادی کر لی ہے اور ایلک خان کی کچھ فوج کو اپنے ساتھ ملا کر غزنی پر حملے کی تیاری کر رہا ہے۔ سلطان محمود نے اُس سے اپنے مطلب کی بہت سی باتیں پوچھیں اور حکم دیا کہ اس بوڑھے کو شاہی مہمان کی حیثیت سے رکھا جائے۔ اسے بھیج کر سلطان نے ارباب خان سلجوقی کو کچھ انعام دیا اور اُسے کہا کہ وہ اپنے قبیلے میں اسرائیل کا وفادار بن کر چلا جائے اور وہاں کے حالات دیکھ کر چوری چھپے واپس آجائے۔

ارباب خان پندرہ سولہ دنوں بعد آگیا اور اُس نے سلطان محمود کو

سلجوقیوں کی تمام تر جنگی معلومات دے دیں۔ سلطان محمود کی فوج میں دو کمانڈر سلجوقی تھے۔ ان کے نائب سالار نے ان کی وفاداری کی بہت تعریف کی۔ سلطان نے دونوں سے کہا کہ وہ اسرائیل سلجوقی کے پاس چلے جائیں اور اُس کی راہنمائی کرتے اُسے لائیں۔ سلطان نے بہت سی ہدایات دے دیں اور اپنے سالاروں کو بلا کر فوج کو بخارا کے پہاڑی علاقے کی سمت کوچ کا حکم دے دیا۔

یہ ۱۸-۱۰۱۷ء کا واقعہ ہے۔ سلجوقی لشکر نے ترمز کے مقام سے دریائے آکسس عبور کیا۔ یہ جنگجوؤں کا لشکر تھا اور اپنے آگے سب کچھ بہا لے جانے والے سیلاب کی طرح آ رہا تھا۔ یہ چونکہ قبائلی لوگ تھے، ان کی کوئی باقاعدہ بادشاہی نہیں تھی، اس لیے وہ راستے میں آنے والی بستیوں کو لوٹتے آ رہے تھے۔ انہوں نے کھڑی فصلیں اپنے مویشیوں کو کھلا دیئے۔

ترمز سے تقریباً ساٹھ میل جنوب میں آہنگران کا پہاڑی علاقہ شروع ہوجاتا ہے۔ یہ لشکر اُن دو سلجوقی کمانداروں کی راہنمائی میں آ رہا تھا جنہیں سلطان محمود نے بھیجا تھا۔ انہوں نے اس پہاڑی علاقے میں ایک خاص مقام پر لشکر کو پڑاؤ کرایا۔ انہوں نے اسرائیل سے کہا تھا کہ وہ اُسے اُس طرف لے جا رہے ہیں جدھر غزنی کی فوج نہیں ہے۔ پڑاؤ کیا گیا۔ سفر کا تھکا ہوا لشکر گہری نیند سو گیا۔

آدھی رات کے قریب خیمہ گاہ میں سے ایک مشعل بلند ہوئی اور دائیں بائیں ہلی۔ اس اشارے کے ساتھ ہی یوں شور اُٹھا جیسے پہاڑیاں سرک کر آگے بڑھ رہی ہوں اور ان [illegible] پتھر اوپر سے لڑھکتے نیچے آ رہے ہوں۔ سلطان محمود کے بھیجے ہوئے دونوں سلجوقی کمانداروں نے سلجوقی لشکر کے سامان کے ڈھیر کو آگ لگا دی، اور اس روشنی میں سلجوقیوں پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ اُن خیموں سے شعلے اُٹھنے لگے جن میں سلجوقی گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ غزنی کی فوج کی نفری سلجوقیوں کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھی لیکن سوئی ہوئی فوج کو تباہ کرنے کے لیے یہی وہ سوار دستے کافی تھے۔ یہ کوئی لڑائی نہیں تھی، یہ

سلجوقیوں کا قتلِ عام تھا۔ ان کے لیے بھاگ نکلنے یا کٹ مرنے کے سوا کوئی راستہ نہیں رہ گیا تھا۔

دونوں سلجوقی کمانداروں نے اسرائیل سلجوقی اور احمد تونان خان کو پکڑنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ دونوں حملہ شروع ہوتے ہی نکل گئے تھے۔ صبح جلی اور سلگتی ہوئی خیمہ گاہ میں بکھری ہوئی سلجوقی لاشوں کو دیکھا گیا۔ اسرائیل اور تونان خان کی لاشیں کہیں نظر نہ آئیں۔

*

اسی جگہ جہاں اسرائیل نے اپنے قبیلے سے للکار کر کہا تھا کہ تلواریں تیز کر لو، ترکشیں تیروں سے بھر لو، ہمارا اگلا جشن فتح کا جشن ہوگا، وہیں اسرائیل اپنے خیمے میں لیٹا ہوا تھا۔ مریم نے اپنے ہاتھوں اُسے شراب کا جام پلایا تھا۔ اُن کے پاس ایک درویش صورت آدمی بیٹھا تھا۔

"پہلی شکست آخری شکست نہیں ہوا کرتی"۔ درویش کہہ رہا تھا ۔۔۔ "دل برداشتہ نہ ہو اسرائیل! تم بے خبری میں مارے گئے ہو۔ آخر فتح تمہاری ہوگی"۔

اسرائیل پر خاموشی طاری تھی۔ وہ جیسے کچھ سن ہی نہیں رہا تھا۔ مریم نے درویش کو اشارہ کیا تو وہ خیمے سے نکل گیا۔ مریم نے اسرائیل پر اپنے حُسن و جوانی کا جادو طاری کرنا شروع کر دیا اور اُسے وہ عہد یاد دلایا جو اس نے پہلی ملاقات میں کیا تھا۔ اسرائیل کے جسم میں [illegible] واپس آنے لگی۔

تین چار روز بعد جب اسرائیل اپنے قبیلے کو از سرِ نو منظم کر رہا تھا، اُسے اطلاع ملی کہ ایلک خان مر گیا ہے اور اُس نے مرتے وقت کہا ہے کہ اسرائیل سے کہنا کہ تم نے وعدہ کیا تھا کہ میری زندگی میں تم سلطان محمود کو ختم کر دو گے لیکن تمہاری پسپائی کی تفصیل سن کر مجھے اتنا صدمہ ہوا ہے جو میں اس عمر میں برداشت نہیں کر سکا۔ میں اپنے بیٹے احمد تونان خان کو اپنا جانشین مقرر کر کے اس دنیا سے نامراد جا رہا ہوں۔ تم اپنا عہد پورا کرنا ورنہ میری روح بدروح بن کر تمہیں راتوں کو چین سے سونے کبھی نہیں دے گی۔ تونان

خان سے دوستی قائم رکھنا۔ الپتگین کو بھی ساتھ رکھو۔ تم میں کوئی بھی محمود کو اکیلے شکست نہیں دے سکتا۔ میں الپتگین کو تمہارے پاس بھیج رہا ہوں۔

ایلک خان نے پیغام الپتگین کے ہاتھ بھیجا تھا۔ اُس نے کہا تھا "الپتگین کے ساتھ دو لڑکیاں تمہارے پاس آ رہی ہیں۔ مریم انہیں اچھی طرح جانتی ہے۔ مرنے سے پہلے تمہیں ایک طریقہ بتاتا ہوں۔

تم نے کہا تھا کہ تم سلطان محمود کو شکست نہ دے سکے تو اُسے کسی اور طریقے سے مارو گے۔ ان دو لڑکیوں کو استعمال کرو۔ بڑی تیز اور ہوشیار لڑکیاں ہیں۔ سلطان محمود کی فوج میں چند ایک کماندار سلجوقی ہیں۔ ان لڑکیوں کو انہیں پھانسنے کے لیے غزنی بھیجو۔ یہ سلجوقی کمانداروں کے ساتھ شادی کر لیں گی لیکن درپردہ دوسرے سلجوقیوں کو جو محمود کی فوج میں ہیں، اپنے جال میں پھانستی رہیں گی۔ انہیں باہر کے ایک آدمی نے تربیت دی ہے۔ تمہارا نام بھی اسرائیل ہے لیکن وہ آدمی بنی اسرائیل ہے۔ اس سے تمہیں شک نہ ہو کہ وہ یہودی ہے تو تمہیں نقصان پہنچائے گا۔ اُس کا ہدف سلطان محمود ہے۔ اُس نے وعدہ کیا ہے کہ سلطان کی فوج کے سلجوقیوں کو خریدنے کی ضرورت پڑی تو وہ نقد مدد بھی دے گا۔ اس مہم میں تم خرچ کرنے سے نہ ڈرنا۔ احمد توغان خان تمہیں مالی امداد دے گا۔"

اسرائیل نے دونوں لڑکیوں کو دیکھا تو اُس نے محسوس کیا کہ وہ مریم کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھیں لیکن خوبصورت تھیں۔ ان لڑکیوں نے جب اسرائیل کے ساتھ باتیں شروع کیں اور ناز و انداز دکھائے تو اس کے ذہن سے مریم اُترنے لگی۔ ان دونوں میں کچھ اور ہی کشش تھی۔ کوئی جادو سا تھا جس نے ان لڑکیوں کی شکل و صورت ہی بدل ڈالی تھی۔ اسرائیل یوں اٹھ بیٹھا جیسے اُسے نئی زندگی مل گئی ہو۔

*

ڈوبنے والے تنکوں کے سہارے ڈھونڈا کرتے ہیں۔ میدان میں شکست کھانے والے زیرِ زمین چلے جاتے اور سانپ بن جایا کرتے ہیں۔ بڑے بڑے

جری مرد جنہیں کوئی بھی زیر نہ کر سکا، کسی حسین و جمیل عورت یا سانپ کے ڈنک سے مرے ہیں۔ عورت نے بادشاہیوں کو ٹکرایا ہے اور عورت نے اپنا آپ قربان کر کے بادشاہی کی گرتی ہوئی عمارت کو تھاما اور استحکام بھی بخشا ہے۔

جہاں یہودیوں کی تربیت یافتہ یہ دو مسلمان لڑکیاں سلطان محمود کے قتل کے لیے آئی تھیں وہاں مریم بھی تھی جو بیداری میں ملکہ بننے کے خواب دیکھا کرتی تھی — اور وہاں ایک عنبرین بھی تھی جو ایلک خان کے خاندان کی ہی بیٹی تھی۔ وہ اسی ماحول کی پروردہ تھی جس میں سلطان محمود غزنوی کا نام حقارت سے لیا جاتا تھا اور جس میں غزنی کی سلطنت کی جڑیں کاٹنے کے منصوبے بنتے رہتے تھے مگر سلطان محمود کی نفرت اس کے لیے عقیدت بن گئی تھی۔ اس نے مریم سے بھی کہا تھا کہ وہ سلطان محمود سے نہیں اسلام سے نفرت کا اظہار کر رہی ہے۔

اب یہ دو لڑکیاں اُس کے سامنے اسرائیل سلجوقی کی طرف بھیجی گئی تھیں۔ وہ ان لڑکیوں کو اچھی طرح جانتی پہچانتی تھی لیکن اُسے معلوم نہ تھا کہ ایک اجنبی صورت آدمی انہیں کمرے میں لے جا کر کیا پڑھاتا اور بند کمرے میں کیا ہوتا ہے۔ عنبرین نے ان سے پوچھا تھا تو انہوں نے بتایا تھا کہ یہ اُن کا اتالیق ہے۔ عنبرین کو افسوس سا ہوا تھا کہ اُسے اتالیق کی شاگردی میں کیوں نہیں بٹھایا جاتا۔ اُسے وجہ معلوم تھی۔ اُس کے خیالات کچھ اور تھے، وہ بات کچھ اور کرتی تھی اور وہ اسلام اسلام کی رٹ لگائے رکھتی تھی۔ وہ اس شاہی خاندان کی دوسری لڑکیوں کی طرح شوخیوں اور کھلنڈرے پن میں شب و روز نہیں گزارتی تھی۔ سب کہتے تھے کہ مخبوط الحواس ہے۔

عنبرین کو صرف دو شوق تھے۔ گھوڑ سواری اور تیر اندازی۔ یہ تو اُس دَور کا دستور تھا کہ لڑکیاں گھوڑ سواری، شتر سواری اور تیر اندازی سے خوب واقف ہوتی تھیں لیکن عنبرین مردوں کے مقابلے میں گھوڑا دوڑاتی اور دوڑتے گھوڑے سے نشانے پر تیر چلاتی تھی۔ اُس کا نشانہ کبھی خطا نہیں ہوا تھا۔ وہ اکثر گھوڑا دوڑاتی جنگل میں دُور نکل جایا کرتی تھی۔

سلجوقی نقصان تو بہت اٹھا گئے تھے۔ اُن کے گھوڑے اور اونٹ بھی پیچھے رہ گئے تھے لیکن سلطان محمود کو معلوم تھا کہ اس قبیلے کی تعداد کم نہیں۔ ایلک خان کی فوج بھی سلجوقیوں کی اتحادی تھی۔ وہ کسی بھی روز سرحدوں پر چھیڑ چھاڑ کر سکتے تھے۔ اُن پر نظر رکھنا ضروری تھا۔ چنانچہ سلطان محمود نے حکم دے دیا تھا کہ اپنی فوج کی گشت سرحدوں سے باہر جتنی دُور تک جا سکے چلی جایا کرے۔

عمر یزدانی فوج میں کماندار تھا۔ اس کے ماتحت تین سرحدی چوکیاں تھیں۔ یہ سرحد اُس علاقے سے ملتی تھی جو ایلک خان کا تھا۔ یہ دریائے آکسس کے پار کا علاقہ تھا۔ سلطان محمود نے دو چوکیاں دریا کے پار بنا دی تھیں۔ ان کی نفری کے لیے دریا میں ہر وقت کشتیاں موجود رہتی تھیں۔ عمر یزدانی اسی چوکی میں رہتا تھا۔ ایک روز وہ گشتی سنتریوں کو دیکھنے کے لیے چلا گیا کہ وہ کہیں بیٹھ تو نہیں جاتے۔

اُس نے دُور سے دیکھا کہ گھوڑ سوار سنتری چلے جا رہے تھے۔ وہ انہیں دیکھتا رہا۔ وہ کہیں رُکے نہیں اور آگے جا کر جنگل میں غائب ہو گئے۔ اُدھر جانا عجیب نہیں تھا۔ عمر یزدانی دوسری طرف نکل گیا۔ وہ کماندار تھا۔ اُس کے پاس کمان اور ترکش نہیں ہونی چاہیے تھی لیکن گشت پر جاتے وہ کمان اور ترکش ساتھ لے جاتا تھا۔ دشمن کے علاوہ اُس علاقے میں ہرن اور خرگوش ہوتے تھے جن کا شکار دلچسپ تھا۔ اُس روز اُسے دُور ہرنوں کا ایک جوڑا نظر آیا۔ عمر یزدانی نے گھوڑے کا رُخ اُدھر کو کر لیا اور کمان میں تیر ڈال لیا۔ وہ چھپ چھپ کر ذرا چکر کاٹ کے جا رہا تھا کہ ہرنوں کو خبر نہ ہو لیکن ہرن وہاں سے چل پڑے اور دُور ہی دُور ہٹتے گئے۔ عمر یزدانی ہرنوں میں ایسا گم ہوا کہ دیکھ نہ سکا کہ وہ کتنی دُور نکل گیا ہے۔ آگے علاقہ چٹانی آ گیا تھا۔

ہرن سرپٹ دوڑ پڑے جیسے ڈر گئے ہوں۔ دُور سے دوڑتے گھوڑے کے ٹاپو سنائی دینے لگے جو قریب آ رہے تھے۔ عمر یزدانی رُک گیا۔ اُسے ایک

گھوڑ سوار دکھائی دیا جو سرپٹ دوڑتے گھوڑے سے دائیں اور بائیں تیر چلا رہا تھا۔ گھوڑا ایک طرف مُڑ گیا۔ تب عمر یزدانی نے دیکھا کہ گھوڑ سوار عورت ہے اور گھوڑے کے تعاقب میں چار بھیڑیئے ہیں۔ عورت گھوڑے کو دائیں کبھی بائیں کر کے بھیڑیوں پر تیر چلاتی تھی مگر بھیڑیئے اُس کی زد میں نہیں آتے تھے۔

اس علاقے کے بھیڑیئے بڑے ہی طاقتور اور خونخوار ہوا کرتے تھے۔ گھوڑا بھیڑیوں کے ڈر سے بہت تیز دوڑ رہا تھا۔ اُسے آخر تھکنا اور رُکنا تھا۔ عورت کے لیے بھیڑیوں کا مقابلہ اور اُن سے بچنا ناممکن تھا۔ عمر یزدانی نے کمان میں تیر ڈال رکھا تھا۔ اُس کا گھوڑا تازہ دم تھا۔ اُس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ اعلیٰ نسل کا فوجی گھوڑا ہوا ہو گیا۔ چاروں بھیڑیئے اس کے آگے آگے گھوڑ سوار عورت کے پیچھے دوڑے جا رہے تھے۔ وہ گھوڑے تک تقریباً پہنچ گئے تھے۔ ایک نے اُچھل کر گھوڑے کو پنجہ مار بھی دیا تھا اور ایک گھوڑے کے پہلو میں چلا گیا اور اُچھل رہا تھا۔

عمر یزدانی نے تیر نہ چلایا۔ وہ پہلو والے بھیڑیئے کے پیچھے گیا اور گھوڑا اس پر چڑھا دیا۔ یہ بھیڑیا گھوڑے تلے کچلا گیا۔ عمر یزدانی نے گھوڑے کو پیچھے کو موڑا اور دوڑتے گھوڑے سے ایک بھیڑیئے پر تیر چلایا۔ بھیڑیئے نے چیخ ماری اور گھوڑے سے توجہ ہٹا کر دوسری طرف بھاگ اٹھا لیکن دُور نہ جا سکا۔ گر کر تڑپنے لگا۔ باقی دو بھیڑیئے اپنے دو ساتھیوں کا انجام دیکھ کر بھاگ گئے مگر عورت کا گھوڑا ایسا ڈرا ہوا تھا کہ بے لگام ہو گیا تھا۔ رُکتا نہیں تھا۔ عمر یزدانی نے اپنا گھوڑا اس کے پہلو میں کر لیا۔ تب اُس نے دیکھا کہ سوار عورت نہیں بلکہ بڑی خوبصورت جوان لڑکی ہے اور وہ کوئی شہزادی معلوم ہوتی ہے۔

عمر یزدانی نے دوڑتے گھوڑے سے جُھک کر لڑکی کے بے لگام گھوڑے کے منہ کے قریب سے لگام پکڑ لی اور اُسے اپنے قابو میں لے لیا۔ لڑکی گھبرائی ہوئی نہیں، ہانپی ہوئی تھی۔ اُس نے جب شکریہ ادا کیا تو عمر یزدانی نے اس

کا لب و لہجہ سن کر پوچھا۔ "ایلک خانی ؟"

"ہاں .... اور آپ ؟"

"غزنوی"۔۔۔ عمر یزدانی نے کہا۔ "میں غزنی کی فوج میں کماندار ہوں۔ ایک ہرن کے پیچھے بہت دُور نکل آیا تھا۔ آپ کا گھوڑا اور اس کے تعاقب میں بھیڑیئے دیکھے ...."

"کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ اپنی سرحد سے کتنا باہر آ گئے ہیں ؟"۔۔۔ لڑکی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آپ ہماری سرحد میں ہیں اور ہم ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔"

"ایلک خان مر گیا ہے"۔ عمر یزدانی نے کہا۔ "زندہ تھا تو بھی مرا ہوا تھا۔ ہم اُس کی جان کبھی کی نکال چکے تھے۔ آپ کون ہیں ؟"

"میرا تعلق ایلک خان کے خاندان سے ہے"۔۔۔ لڑکی نے کہا۔ "میرا نام عنبرین ہے۔"

"تو آپ شہزادی ہیں"۔ عمر یزدانی نے کہا۔ "پھر آپ نے ٹھیک کہا ہے کہ ہم ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ اچھا نہیں لگتا کہ میں ایک عورت کے ساتھ طنزیہ یا دھمکی آمیز باتیں کروں .... شہزادی عنبرین! آپ ابھی اُس عمر کو نہیں پہنچیں جس میں انسان اچھے اور بُرے، دوست اور دشمن کو پہچان سکتا ہے۔ میں آپ کو ایک نصیحت کرنا چاہتا ہوں۔ اپنے دل سے سلطان محمود کی دشمنی نکال دیں اور اپنے بچوں کو بھی یہی بتائیں کہ ایک مذہب کے دو انسان آپس میں دشمن نہیں ہو سکتے۔"

"مجھے اپنا دشمن نہ سمجھیں"۔۔۔ عنبرین نے کہا۔ "مجھے آپ کی نصیحت کی ضرورت نہیں۔ میرا خاندان مجھے پاگل کہا کرتا ہے کیونکہ میں غزنی کی نفرت کی نہیں محبت کی باتیں کیا کرتی ہوں۔ آج خدا نے شاید اسی کا انعام دیا ہے کہ مجھے بھیڑیوں سے بچانے کے لیے ہمارے ایک دشمن کو ہماری سرحد کے اندر بھیج دیا ہے .... اوہ، میرے خدا! اگر آپ نہ آتے تو یہ بھیڑیئے مجھے چیر پھاڑ کر کھا جاتے۔"

"میرے لیے کیا حکم ہے ؟"۔ عمر یزدانی نے پوچھا۔ "میں آپ کا دشمن ہوں اور آپ کی سرحد کے اندر آ گیا ہوں۔ کیا میں آپ کا قیدی ہوں ؟"

"نہیں .... آپ مہمان ہیں"۔۔۔ عنبرین نے کہا۔ "اگر آپ جلدی میں ہیں تو آپ جا سکتے ہیں۔ مجھے جلدی ہے۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔ وہ مجھے ڈھونڈ نہ رہے ہوں۔"

انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ آنکھوں سے آنکھیں اور مسکراہٹ سے مسکراہٹ ٹکرائی۔ عمر یزدانی نے سرگوشی کی "خدا حافظ شہزادی!"۔۔۔ اور اُس نے گھوڑا موڑا۔ گھوڑا چلا ہی تھا کہ اُسے عنبرین کی آواز سنائی دی۔

"ٹھہریئے۔ کل پھر آ سکیں گے ؟"۔۔۔ عنبرین نے کہا۔ "میں یہیں آ جاؤں گی۔"

"مجھے گرفتار کرنے کتنے آدمی آئیں گے ؟"۔۔۔ عمر یزدانی نے پوچھا۔

عنبرین کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ اُس کا چہرہ بجھ گیا۔

"آپ مجھ پر ایسا شک کر سکتے ہیں"۔۔۔ عنبرین نے بڑے ہی اداس لہجے میں کہا۔ "میں آپ کو یقین نہیں دلا سکتی کہ میں آپ کو دھوکہ نہیں دوں گی۔ آپ کہیں تو میں آپ کی چوکی تک آ جاؤں گی۔"

"میں آؤں گا۔"

وہ چلا گیا تو عنبرین اُسے وہیں کھڑی دیکھتی رہی۔

عمر یزدانی نے خطرہ مول لیا اور اگلے روز وہیں چلا گیا جہاں اسے عنبرین ملی تھی۔ اس ملاقات میں ان میں بے تکلفی پیدا ہو گئی۔ پھر اُن کی ملاقاتیں ہر روز ہونے لگیں۔ پانچ چھ روز بعد کی ایک ملاقات میں عنبرین کچھ گھبرائی گھبرائی سی تھی۔

"مجھے تمہاری محبت لے آئی ہے مگر اب ہم خطرے میں ہیں"۔۔۔ عنبرین نے کہا۔ "اپنی ایک ملازمہ نے کل مجھے بتایا ہے کہ میرے ہر روز جنگل میں نکل جانے پر شک کیا جانے لگا ہے اور ہو سکتا ہے میرا تعاقب کیا جائے۔ مجھے اپنی پرواہ نہیں۔ میں مرنے کے لیے تیار ہوں۔ مجھے تمہارا فکر ہے۔ ذرا ہوشیار رہنا۔

اگر وہ آگئے تو میں واپس نہیں جاؤں گی۔ اگر نکل بھاگنے کا موقع مل گیا تو تمہارے ساتھ ہی جاؤں گی۔ کیا تم ساتھ لے چلنے کے لیے تیار ہو؟"

"تو کیا میں تمہارے ساتھ مذاق کر رہا ہوں جو ہر روز سرحد پھلانگ کر اتنی دور خطرے میں آجاتا ہوں"۔۔۔ عمر بزدانی نے کہا۔

انہیں کچھ اور کہنے اور سوچنے کا موقع نہ ملا۔ انہیں گھوڑوں کے ٹاپو سنائی دینے۔

"وہ آگئے ہیں"۔۔۔ عنبرین نے کہا۔

"دیکھو"۔۔۔ عمر بزدانی نے کہا۔۔۔ "وہ آرہے ہیں"۔

تین گھوڑسوار کچھ دور سے نظر آگئے تھے۔ عمر بزدانی اور عنبرین اپنے اپنے گھوڑوں پر تیزی سے سوار ہوئے۔ اُن تین گھوڑسواروں نے ایڑیں لگا دیں۔ عمر بزدانی اور عنبرین نے گھوڑے دوڑا دیئے۔ پیچھے سے تین چار تیر اکٹھے آئے جن میں سے دو عنبرین کے گھوڑے کی پیٹھ میں اُتر گئے۔ گھوڑا بڑی زور سے ہنہنایا۔ عمر بزدانی نے دیکھ لیا۔ اُس نے اپنا گھوڑا عنبرین کے گھوڑے کے پہلو میں کر لیا اور ایک بازو عنبرین کی کمر کے گرد لپیٹ کر کہا کہ وہ اُس کے گھوڑے پر آجائے۔ گھوڑوں کی رفتار بہت تیز تھی۔ عنبرین عمر بزدانی کے سہارے اس کے گھوڑے پر اس کے آگے آگئی۔ ان کے قریب سے تین تیر گذر گئے۔

عمر بزدانی نے گھوڑے کو دائیں بائیں کرنا شروع کر دیا تاکہ تیر انداز اُسے نشانے میں نہ لے سکیں۔ آگے چٹانیں آگئیں۔ عمر بزدانی نے گھوڑا ان میں داخل کر دیا اور وہ محفوظ فاصلے پر پہنچ گیا۔ پھر سرحد آگئی اور وہ اپنے علاقے میں داخل ہو گیا۔ تعاقب میں آنے والے جانے کہاں سے واپس چلے گئے تھے۔

یہ ایک سال پہلے کا واقعہ تھا۔ اب سلطان محمود ہندوستان کو جا رہا تھا۔ اب اُس نے اپنے سالاروں اور کمانداروں کو اجازت دے دی تھی کہ وہ اپنی بیویوں کو ساتھ لے جانا چاہیں تو لے جا سکتے ہیں۔ یہ اجازت اُس نے اس لیے دی تھی کہ اب وہ ہندوستان کے کسی علاقے میں اپنی باقاعدہ حکومت قائم کرنا چاہتا تھا اور وہاں فوج بھی رکھنی تھی۔ اُس کے پیشِ نظر لاہور تھا لیکن اس سے پہلے اُسے مہاراجوں کے سر کچلنے تھے۔ ان میں سب سے زیادہ خطرناک لاہور کا مہاراجہ ترلوچن پال تھا۔ اُسے اطلاع مل چکی تھی کہ ترلوچن پال اپنی فوج قنوج اور متھرا کے درمیان کہیں لے گیا ہے اور دوسرے مہاراجوں کو متحد کرتا پھر رہا ہے۔

سلطان محمود کی اجازت پر چند ایک سالار وغیرہ اپنی بیویاں ساتھ لے جا رہے تھے۔ عنبرین عمر بزدانی کی بیوی بن چکی تھی۔ عمر بزدانی اُسے ساتھ نہیں لے جانا چاہتا تھا لیکن عنبرین کی ضد اتنی شدید تھی کہ عمر بزدانی کو اسے ساتھ لے جانا پڑا۔ اس ضد میں محبت کا عمل دخل اتنا نہیں تھا جتنا جذبے کا تھا۔ عنبرین نے عمر بزدانی سے کہا تھا کہ مجھے خدا سے شکوہ ہے کہ مجھے عورت بنا کر پیدا کیا۔ میری روح کفر کے خلاف میدانِ جنگ میں بھٹکتی رہتی ہے۔

"کافر سے زیادہ خطرناک ایمان فروش ہوتا ہے"۔۔۔ عمر بزدانی نے اسے کہا تھا۔۔۔ "کافر کو سب جانتے ہیں کہ کافر ہے اور ہمارا دشمن لیکن ایمان فروش کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ بھائی بنا رہتا اور پیٹھ میں چھرا گھونپ کر بھی کہتا ہے کہ میں تمہارا بھائی ہوں۔۔۔ تم ایمان فروشوں کے خاندان کی لڑکی ہو۔ میں حیران ہوں کہ تمہاری روح کفر کے خلاف کیوں بھڑکتی رہتی ہے"۔

"میری ماں کا ایمان فروشوں کے خاندان سے کوئی تعلق نہیں تھا"۔۔۔ عنبرین نے کہا۔۔۔ "میرا باپ ایک خانی تھا۔ اُس نے میری ماں کو کہیں سے زبردستی اغوا کیا تھا۔ میں پیدا ہوئی اور جب سے میرا شعور بیدار ہوا ہے ماں مجھے بتا رہی ہے کہ یہ ایک خانی مسلمان ہو کر اسلام کے لیے سب سے بڑا خطرہ بنے ہوئے ہیں۔ ماں مجھے بچپن سے سلطان محمود کی باتیں سنا رہی ہے۔ میں تصور میں اس عظیم سلطان کو دیکھتی رہی ہوں۔ میں ماں باپ کی اکیلی اولاد ہوں۔

ماں کہا کرتی ہے کہ خدا اُسے صرف ایک بیٹا دے دے تو وہ اُس کے ہاتھوں قوم کے ان غداروں کو ختم کرائے۔ اُسے خدا نے بیٹا نہ دیا۔ اب یہ میرا فرض ہے کہ ان غداروں اور ایمان فروشوں کو ختم نہ کر سکوں تو حق پرستوں کا تو ساتھ دوں .... میں تمہارے ساتھ بیوی کی حیثیت سے نہیں، مجاہد کی حیثیت سے جا رہی ہوں۔ تم ساتھ نہیں لے چلو گے تو تم جانتے ہو کہ میں گھوڑ سوار ہوں، تیرانداز بھی ہوں، فوج کے پیچھے پیچھے آ جاؤں گی۔ مجھے کچھ کرنا ہے عمر! مجھے کچھ کرلے دو۔ عورت تمہارا ایک بازو ہے۔ اسے توڑ کر گھر میں نہ پھینکو۔"

وہ عمر کے ساتھ جا رہی تھی۔ یہ فوجی قافلہ کئی میل لمبا تھا۔ رسد کی گھوڑا گاڑیاں سینکڑوں تھیں۔ پالکیاں بھی ساتھ تھیں جن میں عورتیں تھیں۔ پالکیاں ایک دوسری سے بہت دور دور تھیں۔

*

اور اس فوج کے ساتھ اسی فوج کے دشمن بھی جا رہے تھے۔ یہ بچاس ساٹھ سلجوقی تھے جو بہت عرصے سے غزنی کی فوج میں تھے اور ان کی وفاداری پر کسی کو شک نہیں تھا مگر تھوڑے ہی عرصے سے ان کی وفاداری درپردہ مشکوک ہو گئی تھی۔ کسی کو ان کی بدلی ہوئی نیت کا علم نہ ہو سکا۔ ان میں ایک کماندار رجب بائیجان تھا جس نے ڈیڑھ ایک سال پہلے شادی کی تھی۔ ایک اور سلجوقی کی بھی شادی ہوئی تھی۔ ان دونوں کی شادیوں کے بعد غزنی کی فوج کے سلجوقیوں میں یہ تبدیلی آئی تھی کہ وہ اکٹھے رہنے لگے تھے۔

کسی کو معلوم نہیں تھا کہ ان دونوں کو یہ بیویاں انعام کے طور پر ملی تھیں۔ دونوں چند دنوں کی رخصت پر گئے تھے۔ وہاں ایک سفید ریش آدمی تھا اور کچھ اور سرکردہ لوگ بھی تھے۔ سفید ریش نے ایسے الفاظ اور ایسے انداز سے ان دونوں کے ساتھ باتیں کی تھیں کہ دونوں کے خون اُبل پڑے۔ پھر ان کے آنسو نکل آئے تھے۔ انہوں نے کہا تھا کہ وہ غزنی کی فوج میں واپس نہیں جائیں گے۔

"یہ بزدلی ہے" ۔۔۔ سفید ریش نے کہا تھا ۔۔۔ "تمہیں انتقام لینا ہے سلجوقیوں

کی ذلت کا انتقام تمہیں لینا ہے۔ اچھا ہے کہ تم غزنی کی فوج میں ہو۔"

"ہم سلطان محمود کو قتل کر دیں گے" ۔۔ رجب بائیجان نے کہا۔

"اس سے کچھ حاصل نہ ہوگا" ۔۔۔ وہاں بیٹھے ہوئے ایک اور آدمی نے کہا ۔۔۔ "وہ ہم تمہیں بتائیں گے کہ تمہیں کیا کرنا ہے .... پہلا کام یہ ہے کہ غزنی کی فوج میں جتنے سلجوقی ہیں انہیں درپردہ اپنے ساتھ ملا لو۔ ان پر جب تمہیں اعتماد پیدا ہو جائے تو انہیں بتانا کہ کیا کرنا ہے۔ تم کماندار ہو۔ جنگی امور کو سمجھتے ہو۔ سلطان محمود کو ہندوستان میں میدان جنگ میں دھوکہ دینا ہے۔ وہ خواہ زندہ رہے، اس کی فوج کو تباہ کرنا ہے۔ وہ کسی نہ کسی وقت ہندوستان پر فوج کشی کرے گا۔ تم ساتھ ہو گے۔ تم دشمن کے ساتھ مل کر اس کی فوج کے پہلو پر یا عقب سے حملہ کرا سکتے ہو۔"

"لیکن وہاں دشمن کے ساتھ رابطہ کیسے ہوگا" ۔۔ رجب بائیجان نے کہا ۔۔۔ "ہم وہاں کی زبان نہیں جانتے۔"

"تمہارے پاس ذریعہ موجود ہے" ۔۔۔ سفید ریش نے کہا ۔۔۔ "اور یہ ذریعہ غزنی میں جگہ جگہ موجود ہے۔ یہ وہ ہندو ہیں جنہیں غزنی کی فوج ہر حملے کے بعد جنگی قیدیوں کی حیثیت سے ساتھ لاتی رہی ہے۔ محمود نے ان میں سے وفادار منتخب کرکے ان کے دو دستے تیار کر لیے ہیں۔ باقی ہزاروں قیدی سرکاری ملازم ہیں اور ان میں سے زیادہ تعداد لوگوں نے خرید لی تھی۔ وہ اب ان کے ذاتی ملازم ہیں۔ ہم تمہیں ایسے چار پانچ ہندو دیں گے جو مسلمانوں کے بہروپ میں تمہارے ملازم ہوں گے یا گاڑی بان بن کر ساتھ جائیں گے۔ وہ ہندوستان میں تمہارے راہنما ہوں گے۔ دشمن سے تمہارے رابطے کا ذریعہ بنیں گے۔ ہم انہیں اتنی دولت دیں گے جو انہوں نے کبھی خواب میں نہیں دیکھی۔ انہیں سب سے بڑا انعام یہ ملے گا کہ انہیں آزادی مل جائے گی اور وہ ہندوستان میں رہ جائیں گے۔ میدان جنگ میں ایسے حالات تم پیدا کرو گے کہ غزنی کی فوج کے پورے پورے دستے دشمن کی زد میں آ جائیں۔"

"تم سلطان محمود کی جنگی چالوں کو اچھی طرح سمجھتے ہو"۔ ایک اور آدمی نے کہا — "وہ وسیع پیمانے پر گھات لگاتا ہے اور وہ تھوڑی سی نفری سے سامنے سے حملہ کرتا اور زیادہ تر نفری کو دائیں بائیں تقسیم کر کے پہلوؤں سے اور عقب سے حملہ کراتا ہے۔ وہ دشمن کو آگے گھسیٹ لاتا ہے۔ اس کے چھاپہ مار دشمن کو رات کو بھی چین نہیں لینے دیتے۔ تم دھیان رکھنا۔ اُس کی چال سے تم دشمن کو قبل از وقت خبردار کر دو۔ محمود کہیں گھات لگائے تو دشمن کو بتا دو۔ تم جانتے ہو کہ سالار جو ساتھ جائے گا وہ کتنا تجربہ کار اور گھاگھ ہے۔ ابوعبداللہ محمد الطائی سلطان محمود کا دایاں بازو ہے۔ اس سالار نے تاریخ میں اپنا نام لکھ دیا ہے۔ آنے والی نسلیں جہاں سلطان محمود کو یاد کیا کریں گی، وہاں وہ ابوعبداللہ محمد الطائی کا نام بھی لیا کریں گی۔ میدانِ جنگ میں اگر موقع دیکھو تو اُسے قتل کر دو۔ دُور سے تیر چلا سکتے ہو لیکن پکڑے نہ جانا۔ پکڑے جانے کی صُورت میں ہمارا سارا منصوبہ خاک میں مل جائے گا۔"

"اسی لیے ہم سلطان محمود کے قتل کی بات نہیں کرتے" — سفید ریش نے کہا — "اُسے ہم غزنی سے ہزاروں میل دُور ہندوستان کے وسط میں ہندوؤں کے ہاتھوں شکست دلانا چاہتے ہیں اور اس کی ایسی حالت کرانا چاہتے ہیں کہ غزنی کی فوج تباہ اور قید ہو جائے اور محمود پاگلوں کی سی حالت میں ہندوؤں کا قیدی ہو جائے" — سفید ریش نے جوشِ جذبات سے کہا — "پھر بادشاہی سلجوقی کی ہو گی۔ سلجوق ایک طاقت کا نام ہے۔ سلجوقی اسلام کی طاقت بنیں گے پھر سلطنتِ سلجوق وسیع ہوتی جائے گی۔"

"اور تم اُس کی فوج کے نائب سالار اور سالار ہو گے" — ایک اور آدمی نے کہا — "ہم تم دونوں کو وہ بیویاں دے رہے ہیں جو صرف بادشاہوں کے ہاں نظر آتی ہیں اور ایک خزانہ تمہارے لیے وقف کر دیا ہے۔"

ایک تو انہیں جذبات سے مغلوب کیا گیا، دوسرے انہیں جو حسین لڑکیاں دی گئیں، ان کے حسن نے ان کی عقل پر قبضہ کر لیا اور جو خزانہ ان کے

آگے رکھا گیا، اس نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ اس کے ساتھ آزاد سلطنتِ سلجوق کی سالاری کا وعدہ ایسا انعام تھا جو ان دونوں سلجوقیوں کے تصوروں کے احاطے سے باہر تھا۔ دونوں لڑکیوں کو الگ تربیت دی گئی تھی۔ انہیں ان دونوں کی لگامیں اپنے ہاتھ میں رکھنی تھیں اور انہیں ہندوستان جا کر غزنی کی فوج کے اہم کمانداروں اور نائب سالاروں کو اپنے جال میں پھانسنا اور دھوکے سے مروانا تھا۔

تھوڑے سے عرصے میں رجب بائیجان اور اس کے ساتھ فرید سمرقند نے غزنی کی فوج کے سلجوقیوں کو سلطان محمود کے خلاف بھڑکا لیا۔ انہیں کچھ نقد دیا، کچھ سبز باغ دکھائے اور ان دونوں سلجوقی کمانداروں کی بیویوں نے انہیں اپنی جھلک دکھائی اور اکیلے اکیلے سلجوقی کو اپنے گھر بلا کر سلجوقیوں کی مظلومیت اور اُن کو غزنی کی فوج کا ظلم و تشدد ایسے انداز سے بتایا کہ پتھر بھی جیسے اشکبار ہو گئے تھے۔ اگر کوئی عورت کسی مرد کو بھڑکائے تو وہ سمجھتا ہے کہ ایک عورت نے اُس کی مردانگی کو للکارا ہے۔ وہ فوراً بھڑک اٹھتا ہے۔ بھڑکانے والی دو بڑی خوبصورت لڑکیاں تھیں۔ انہوں نے اپنا جادو چلا لیا۔

*

اب ۲۱-۱۰۲۰ء کے موسمِ سرما کے آغاز میں جب سلطان محمود ہندوستان کی طرف آ رہا تھا تو اُس کی آستین میں بہت سے سانپ بھی ساتھ آ رہے تھے۔ آٹھ دس ہندو بھی گاڑی بانوں اور سائیسوں کے بہروپ میں ساتھ تھے۔ وہ گنگا اور جمنا کے درمیانی علاقے کے رہنے والے تھے۔ انہیں اچھی طرح سمجھا دیا گیا تھا کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ غزنی کی فوج جب ہندوستان میں داخل ہوئی تو ان ہندوؤں کے جسموں میں یوں جان آ گئی جیسے پانی سے نکالی ہوئی مچھلی کو پانی میں پھینک دیا جائے۔ اُن کے دماغ اور تیز ہو گئے۔

ہندوستان میں حالات تیزی سے سلطان کے خلاف ہو رہے تھے۔ باری میں مہاراجہ قنوج راجیا پال ایک لڑکے کے ہاتھوں قتل ہو گیا تھا جو ہندوستان

کے تین مہاراجوں کی سازش کا نتیجہ تھا۔ راجیا پال کا بیٹا کھیمن پال بھی باری میں تھا۔ باری قنوج سے دُور ایک قصبہ تھا جہاں راجیا پال نے قنوج کے غزنوی قلعہ دار سالار ابوالقدر سلجوقی کی منظوری سے اپنی نئی راجدھانی آباد کر لی تھی اور اُس نے کچھ فوج بھی رکھ لی تھی، لیکن اس فوج پر غزنی کی فوج کے افسروں کی نگرانی تھی۔ مہاراجہ راجیا پال کا بیٹا کھیمن پال پیچ و تاب کھاتا رہتا تھا مگر بے بس تھا۔

راجیا پال ایک سازش کے تحت قتل ہوگیا تو وہاں غزنی کی فوج کے جو افسر تھے، انہوں نے پکڑ دھکڑ شروع کر دی مگر یہی کارروائی بغاوت کا باعث بن گئی۔ غزنی کی فوج کی تو وہاں کوئی نفری نہیں تھی۔ چند ایک کماندار اور عہدیدار تھے۔ کھیمن پال نے درپردہ اپنی مختصر سی فوج کو تیار کر لیا اور اگلی بات اس فوج نے غزنی کے ان افسروں کو پکڑ لیا۔ ان میں سے صرف ایک کسی طرح بچ گیا۔ وہ قنوج کی طرف دوڑا۔ فوج کی کچھ نفری وہاں موجود تھی مگر وہ راستے میں پکڑا گیا۔ تب پتہ چلا کہ قنوج اور باری کے راستے میں ایک فوج موجود ہے جس نے قنوج اور باری کا رشتہ توڑ رکھا ہے۔

یہ ایک متحدہ فوج تھی جس میں تین ریاستوں کی فوج شامل تھی۔ ایک کالنجر کے مہاراجہ گنڈہ کی، دوسری گوالیار کے مہاراجہ ارجن کی اور تیسری لاہور کے مہاراجہ ترلوچن پال کی۔ ترلوچن پال نے اپنی فوج کہیں دُور رکھی ہوئی تھی۔ اس متحدہ فوج میں قنوج کی شکست خوردہ فوج کے بھگوڑے بھی شامل ہوگئے تھے اور اس میں باری کی فوج کی نفری بھی شامل تھی۔

اس کے علاوہ ایک فوج اور تھی جس کا ذکر تاریخ میں ملتا ہے لیکن اس کی تعداد کسی نے نہیں لکھی۔ یہ ہندوستان کے شہریوں کی فوج تھی یعنی رضاکار فوج۔ جس قوم کے دیوتاؤں کے بت توڑے گئے اور مورتیاں پھاڑ کر باہر پھینکی گئی تھیں اور جن کا کعبہ جیسا مقدس مقام متھرا مسلمانوں نے بتوں سمیت تباہ کر دیا تھا، وہ قوم چین سے نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ اس قوم کا بچہ بچہ بچھو کی طرح ڈنک مارنے

کو تیار تھا۔ ہندو عورتوں نے اپنے زیورات مندروں کے حوالے کر دیئے تھے۔ پنڈتوں نے دہشت پھیلا رکھی تھی کہ دیوتاؤں کا قہر پوری ہندو قوم کو بھسم کر دے گا۔ ہندو یہ نہیں دیکھتے تھے کہ اُن کے پنڈت اُس روز سے انہیں ڈرا رہے تھے جس روز محمود غزنوی نے ہندوستان کے پہلے مندر کے بُت توڑے اور ہندوؤں سے کہا تھا کہ یہ ہے تمہارا دیوتا۔ اسے کہو کہ اپنے ٹکڑے جوڑ کر مجھے اپنی توہین کی سزا دے۔

سلطان محمود نے ہندوستان میں پہلا بُت بیس سال پہلے ۱۰۰۱ء میں توڑا تھا، پھر اُس نے تھانیسر اور متھرا تک کے بُت توڑ کر باہر پھینکے اور ان کے ٹکڑوں پر اپنی فوج گزاری تھی۔ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق مہا بھارت کی سلامتی انہی بُتوں کی بدولت تھی۔ یہ نہ ہوتے تو ایک بھی ہندو زندہ نہیں رہے گا لیکن بیس برسوں میں کسی بھی ٹوٹے ہوئے دیوتا نے اور ہری کرشن نے اور ہر ہر مہادیو نے اور چار ہاتھوں والی دیوی نے کسی ردِعمل اور غصے کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن توہم پرست قوم کو فریب کار پنڈتوں نے ایسی زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا کہ تیز ہوا چلتی تھی تو وہ ہاتھ جوڑ کر بھجن گانے لگتے تھے کہ آیا دیوتا کا قہر۔ نقدی اور زیورات کی قربانی کو تو وہ معمولی سمجھتے تھے۔ وہ اپنی کنواری بیٹیوں کو پنڈتوں کے حوالے کر دیا کرتے تھے۔ اُن کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف جو کدورت، نفرت اور انتقام کی آگ بھری گئی تھی، وہ آج بھی اُسی شدت سے موجود ہے جیسی ایک صدی پہلے تھی۔

اب سلطان محمود غزنوی کی ایک اور پیشقدمی کی خبر پھیلی تو ہندوؤں نے اپنا تن، من، دھن قربان کر دیا۔ جوان آدمی جو گھوڑسواری، نیزہ بازی، تیغ زنی اور تیر اندازی کی سوجھ بوجھ رکھتے تھے، فوجوں میں چلے گئے۔ جوان لڑکیاں بھی لڑنے کو تیار ہو گئیں۔ مندروں کے سنکھ چیخنے لگے اور گھنٹیاں واویلا بپا کرنے لگیں۔ غزنی کی فوج ہندوؤں کے لیے دہشت بنی ہوئی تھی لیکن اُس دَور کے ہندو ایسے گئے گزرے نہیں تھے۔ اُن پر مذہب کا جنون طاری تھا۔ ہندو

راجپوت مرنے کے لیے لڑتے تھے۔ دلیری سے لڑتے تھے۔ جان کی قربانی کو وہ کوئی غیر معمولی قربانی نہیں سمجھتے تھے۔

یہ ایک الگ فوج تھی جو چٹانوں کی طرح غزنی والوں کے راستے میں کھڑی ہو گئی تھی۔ باقاعدہ فوج جو مہاراجوں نے اکٹھی کر لی تھی؛ اس کی تعداد ایک لاکھ پینتالیس ہزار پیادہ، چھتیس ہزار گھوڑسوار اور چھ سو چالیس جنگی ہاتھیوں پر مشتمل تھی۔ (فرخی نے ہاتھیوں کی تعداد نو سو لکھی ہے)۔

سلطان محمود کو پشاور سے آگے نکلتے ہی اطلاعیں ملنی شروع ہو گئی تھیں کہ دشمن کی فوج کتنی ہے اور کہاں کہاں ہے۔ وہ دریائے چناب عبور کر رہا تھا جب اُسے یہ اطلاع ملی کہ باری میں لکھمن پال کی فوج نے غزنی کے چند ایک کمانداروں اور عہدیداروں کو قید کر لیا ہے اور خطرہ ہے کہ قنوج کے قلعے کا محاصرہ ہو جائے گا۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک اور جاسوس آیا جس نے سلطان کو بتایا کہ قنوج کے محاصرے کا کوئی امکان نہیں کیونکہ مہاراجہ گنڈہ اور مہاراجہ ارجن اپنی جنگی قوت کی افراط سے کھلے میدان میں لڑنے کو تیار ہیں۔

اس جاسوس نے سلطان کے ساتھ غزنی کی فوج کا جائزہ لیا تو اُس نے کہا کہ ہندوؤں کی افواج کے مقابلے میں یہ فوج تھوڑی ہے۔

"لاہور کی فوج کہاں ہے؟" ـــــ سلطان محمود نے پوچھا۔

"جمنا کے کنارے کسی جنگل میں ہے" ـــــ جاسوس نے جواب دیا ـــــ "اُس کی صحیح خیمہ گاہ کا پتہ نہیں چلایا جا سکا۔ کوشش جاری ہے۔ خطرہ اسی کا زیادہ ہے۔"

"ہاں" ـــــ سلطان نے کہا ـــــ "میں اسی خطرے سے چوکنا رہنا چاہتا ہوں۔"

*

اُس دور کے کسی وقائع نگار کا حوالہ دیتے ہوئے انگریز تاریخ نویس سمتھ لکھتا ہے ـــــ "محمود غزنوی نے پانچ دریا اور دو عبور کیے اور باری کے مضافات میں پہنچ گیا۔"

سلطان محمود کی پیش قدمی صحیح معنوں میں برق رفتار ہُوا کرتی تھی۔ اب کے تو وہ اور زیادہ تیزی سے باری پہنچا کیونکہ باری میں اُس کے کماندار اور عہدیدار ہندوؤں کی قید میں تھے اور وہاں دشمن کی فوج جمع ہو رہی تھی۔ اُس کے ساتھ ہندو گائیڈ تھے۔ اُس نے آرام کیے بغیر باری پر حملہ بول دیا اور فوج کو حکم دیا کہ اس شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے۔ باری میں فوج کوئی ایسی زیادہ نہیں تھی۔ اس نے جلدی ہی ہتھیار ڈال دیئے۔ سلطان محمود باری کو شاید تباہ نہ کرتا لیکن اُسے اطلاع ملی کہ ہندوؤں نے غزنی کے قید کیے ہوئے افسروں کو قتل کر دیا ہے۔ سلطان نے حکم دیا کہ اس شہر کو صاف کر دو۔ چنانچہ باری کو اس طرح تباہ کیا گیا کہ کوئی مکان کھڑا نہ رہنے دیا گیا۔ مندر کا ملبہ بھی اُٹھا کر دریا میں پھینک دیا گیا۔

اصل مقابلہ تو مہاراجہ گنڈہ اور مہاراجہ ارجن کے ساتھ تھا۔ سلطان کو ان دونوں مہاراجوں کی افواج کی پوزیشنوں کی اطلاعیں مل رہی تھیں اور وہ سوچ رہا تھا کہ وہ کون سی چال چلے کہ دونو فوجوں کو الگ الگ کر دے یا دونو کا مقابلہ کرے۔

"لیکن سلطانِ محترم!" ـــــ اُس کے دستِ راست سالار ابو عبداللہ محمد الطائی نے اُسے کہا ـــــ "ابھی تک پتہ نہیں چلا کہ لاہور کی فوج کہاں ہے۔ خطرہ تو اُس سے ہے۔ ہم جب حملہ کریں گے تو لاہور کی فوج ہم پر عقب سے یا پہلوؤں سے آ جائے گی۔"

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ غزنی کی فوج میں شور سا بپا ہو گیا۔ سلطان محمود خیمے سے نکلا اور قاصد کو دوڑایا کہ جا کے معلوم کرے یہ شور کیسا ہے۔ قاصد نے واپس آ کر جو اطلاع دی اُس نے سلطان کو پریشان کر دیا۔ اطلاع یہ تھی کہ چار کماندار اور چار سپاہی مشکیزوں میں ہُوا بھر کر دریا میں اُتر گئے اور دریا پار کر گئے ہیں۔ سلطان اور سالار کو پریشانی یہ تھی کہ یہ آٹھ آدمی بھگوڑے ہو گئے ہیں اور وہ دشمن سے جا ملیں گے۔ ان کا تعاقب آسان نہیں تھا پھر بھی

چند ایک آدمیوں سے کہا گیا کہ وہ مشکیزوں پر دریا کے پار جائیں اور انہیں پکڑنے کی کوشش کریں اور اگر کوئی زیادہ گڑبڑ ہو تو وہیں سے آواز دیں تاکہ اُن کی مدد کو مزید آدمی بھیجے جائیں۔

ایک تو رات کا وقت تھا، دوسرے سردی کا موسم تھا۔ یخ پانی میں تیرنا بہت ہی مشکل تھا لیکن بارہ چودہ رضاکار مشکیزوں پر دریا میں اُتر گئے۔ صرف ایک سہولت تھی۔ موسم سرما کی وجہ سے دریا میں پانی کم تھا اور اس میں برسات کے موسم والا زور نہیں تھا۔ جب یہ کماندار اور سپاہی رضاکارانہ طور پر دریا میں اُترے تو دریا پار سے شور سنائی دینے لگا اور اُس طرف آسمان لال ہونے لگا جیسے کہیں آگ لگی ہو۔

"وہ کماندار کون کون تھے جو پہلے دریا کے پار گئے ہیں؟" — سالار محمد الطائی نے پوچھا۔

اُسے نام بتائے گئے۔

"سلطان!" — سالار نے سلطان محمود سے کہا۔ "یہ چاروں بھگوڑے نہیں ہو سکتے۔ معاملہ کچھ اور ہے۔ ان چاروں کو میں ذاتی طور پر جانتا ہوں۔ یہ چاروں خطرناک حد تک جوشیلے ہیں۔ انہوں نے دشمن کی کسی خیمہ گاہ پر شبخون مارا ہے۔ مجھے اجازت دیں کہ دو دستے لے کر پار چلا جاؤں"۔

"لیکن کچھ پتہ تو چلے کہ وہاں کون ہے، کیا ہے" — سلطان محمود نے کہا — "تم دستے تیار کر لو"۔

دریا پار کا شور بڑھتا جا رہا تھا۔ اندازے کے مطابق وہ جگہ کم و بیش تین میل دور تھی۔ رات کی خاموشی میں آوازیں بہت دبی دبی سی تھیں۔

خاصا وقت گزر جانے کے بعد ایک گھوڑسوار دریا سے نکلا۔ اُس نے گھوڑے کی پیٹھ پر دریا پار کیا تھا۔ اندھیرے میں وہ چلاتا آ رہا تھا — "سلطان کہاں ہیں! سالار کہاں ہیں؟ .... تیار ہو جاؤ۔ حملے کے لیے ... سلطان کہاں ہوں گے"۔

اُس کی پکار اور للکار میں ہیجان تھا۔ اُسے روک لیا گیا۔ سلطان اور سالار وہیں تھے۔ سوار اُن کے سامنے آیا تو معلوم ہوا کہ وہ اُن آٹھ آدمیوں میں سے تھا جو کسی کو بتائے بغیر دریا میں اُتر گئے تھے۔ وہ کمانداری کے عہدے کا آدمی تھا۔ اُس نے جو بات بتائی اُسے سلطان محمود تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا۔ ہوا یوں تھا کہ ان چار کمانداروں کو ایک جاسوس سے پتہ چلا کہ لاہور کی فوج دریا کے پار، کنارے سے اڑھائی تین میل کے فاصلے پر خیمہ زن ہے اور گہری نیند سوئی ہوئی ہے۔ اس کماندار نے اپنے تین ساتھی کمانداروں کو ساتھ لیا۔ چار سپاہی بھی ساتھ ہو گئے اور وہ جوش میں آ کر دریا پار کر گئے۔ انہوں نے جاسوس کو راہنمائی کے لیے ساتھ لے لیا تھا۔ انہوں نے دشمن کے کیمپ پر جا چھاپہ مارا۔

"کچھ نہ سوچیں سلطانِ عالی مقام!" — اُس نے کہا — "فوراً دریا پار کریں۔ دشمن آپ کے قدموں میں پڑا ہے"۔

سلطان محمود نے سالار محمد الطائی کو اجازت دے دی کہ وہ حملہ کرے۔ کماندار نے انہیں بتایا کہ دشمن کی نفری اور کیفیت کیا ہے اور کتنی نفری سے حملہ کیا جائے۔ فوراً تین چار گھوڑسوار دستے تیار کر کے دریا پار کیا گیا۔ کماندار راہنمائی کر رہا تھا۔ دریا پار کر کے یہ دستے آگے گئے۔ دشمن کی خیمہ گاہ سے شعلے اُٹھ رہے تھے۔ وہاں قیامت کی افراتفری مچی ہوئی تھی۔ گھوڑے شعلوں سے ڈر کر بے قابو ہو رہے تھے۔

اس کیفیت میں سالار ابوعبداللہ محمد الطائی نے سوار دستوں کو حملے کا حکم دے دیا۔ دشمن سوائے بھاگنے کے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا تعاقب کیا گیا لیکن ایک ایک آدمی کا تعاقب ممکن نہیں تھا۔ جو سامنے آیا وہ ہلاک ہوا۔ کچھ لیٹ یا بیٹھ گئے۔ صبح تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ صبح کے اجالے میں خیمہ گاہ کا منظر بڑا ہی بھیانک نظر آیا۔ جگہ جگہ سے دھواں اُٹھ رہا تھا اور لاشیں ہی لاشیں تھیں اور زخمی بُری طرح کراہ رہے تھے۔ بہت سے ہندو سپاہی ہار کر بیٹھ گئے تھے۔

ان سے پتہ چلا کہ یہ لاہور کی فوج تھی اور مہاراجہ ترلوچن پال یہیں تھا۔ سلطان محمود اسی سے پریشان تھا کہ وہ کہاں ہے۔ وہ شام کے وقت فوج کو کہیں سے لایا اور یہاں خیمہ زن ہوا تھا۔ یہ کسی کو بھی معلوم نہ تھا کہ اُس کا ارادہ اور منصوبہ کیا تھا۔ سلطان محمود کی فوج کے اتنی قریب آنے سے یہی کہا جا سکتا تھا کہ سلطان محمود سامنے کی فوج سے لڑ رہا ہوتا تو ترلوچن پال پیچھے سے حملہ کر دیتا۔

اب ترلوچن پال وہاں نہیں تھا۔ اس کے اعلیٰ کمانڈر بھی بھاگ گئے تھے اور وہ اپنا بیشتر خزانہ پیچھے چھوڑ گیا تھا۔ اُس کی فوج ختم ہو چکی تھی اور یہ خطرہ ختم ہو گیا تھا کہ غزنی کی فوج پر عقب سے حملہ ہو گا۔

یہ واقعہ تقریباً تمام مؤرخوں نے لکھا ہے۔ فرشتہ نے ان آٹھ آدمیوں کے متعلق لکھا ہے کہ وہ سلطان کے باڈی گارڈ تھے لیکن مؤرخوں کی اکثریت نے انہیں باڈی گارڈ نہیں کہا۔ انہیں آٹھ جوشیلے کمانڈر اور سپاہی کہا ہے۔ انگریز مؤرخ وی۔ اے سمتھ نے لکھا ہے "ترلوچن پال دریائے رام گنگا (جو چھوٹا دریا ہے) کے پار پیچھے ہٹ گیا۔ محمود کے آٹھ افسروں نے جوش اور عتاب کے زیرِ اثر، شمشیر زنوں پر سوار کر دریا پار کیا اور ترلوچن پال کی فوج کو ایسا بکھیرا کہ وہ فوراً اکٹھی ہو کر لڑنے کے قابل نہ رہی۔"

بے شک یہ بے مثال بہادری تھی کہ صرف آٹھ آدمیوں نے کم و بیش بیس ہزار فوج کی خیمہ گاہ پر ایسا شب خون مارا کہ اُسے تباہ و برباد کر دیا مگر سلطان محمود نے انہیں خراجِ تحسین پیش کر کے انہیں سرزنش کی کہ انہوں نے یہ کارروائی کسی کے حکم کے بغیر کی۔ ان چار کمانداروں نے جو بیان دیا وہ اُس دور کے کاغذات میں فارسی کے لکھے لکھائے الفاظ کی صورت میں محفوظ ہے۔

انہوں نے کہا کہ سلطان محمود بار بار لاہور کی فوج کے خطرے کا اظہار کرتا تھا۔ اس کے علاوہ ان میں اس حادثے نے قہر بھر دیا تھا کہ باری میں ہندوؤں نے غزنی کے چند ایک کمانداروں اور عہدیداروں کو قتل کر دیا ہے۔ انہیں ترلوچن پال کی فریب کاری پر زیادہ غصہ تھا۔ وہ غزنی کا باجگزار ہوتے ہوئے دوسرے مہاراجوں کو غزنی کے خلاف متحد کر رہا تھا اور خود غزنی کی فوج پر عقب سے حملہ کرنے کے لیے اپنی فوج کو جنگل میں چھپائے ہوئے تھا۔

اُس رات یوں ہوا کہ غزنی کے ایک جاسوس نے پتہ چلا لیا تھا ترلوچن پال کی فوج فلاں جگہ اسی شام پہنچی ہے۔ قیاس یہی تھا کہ وہ عقب سے غزنی کی فوج پر حملہ کرے گی۔ جاسوس نے دریا تیر کر پار کیا۔ اتفاق سے ایک کماندار جو اس جاسوس کو جانتا تھا، کنارے پر کھڑا تھا۔ جاسوس نے اُسے بڑی خوشی سے بتایا کہ وہ یہ کارنامہ کر کے آیا ہے کہ اُس نے لاہور کی فوج کا پتہ چلا لیا ہے۔ یہ کماندار جل اُٹھا۔ اُس نے اپنے تین ساتھی کمانداروں سے بات کی۔ وہ تیار ہو گئے اور چار سپاہی بھی تیار ہو گئے۔ انہوں نے جاسوس سے کہا کہ وہ اُن کے ساتھ چلے۔ جاسوس کو سلطان محمود کے پاس جانا اور رپورٹ دینی تھی لیکن یہ جوشیلے کماندار اُسے اپنے ساتھ لے گئے۔

چاروں کماندار شب خون مارنے کی مہارت رکھتے تھے۔ وہ ترلوچن پال کی خیمہ گاہ تک پہنچ گئے۔ پہلے انہوں نے دو سنتریوں کو ہلاک کیا، پھر ایک خیمے کو آگ لگائی۔ اس کے شعلوں سے انہوں نے کپڑے جلائے اور کئی خیموں پر پھینک دیئے۔ ان میں سے دو نے سکیم کے مطابق بہت سے گھوڑے کھول دیئے اور چند ایک گھوڑوں کو خنجر مارے۔ یہ گھوڑے بدک کر بھاگے تو دوسرے گھوڑے بھی ڈر کر ادھر اُدھر بھاگنے دوڑنے لگے۔

خیمہ گاہ گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔ فوج ہڑبڑا کر اُٹھی۔ ظاہر ہے فوج کو یہ سمجھنے میں خاصا وقت لگا ہو گا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد خیمہ گاہ میں آگ ہی آگ تھی۔ زیادہ مدد تیز ہوا نے کی۔ خیمے سے خیمہ جلتا گیا۔ خیمے اس لیے قریب قریب لگائے گئے تھے کہ دائیں بائیں چٹانیں تھیں۔ آٹھوں جانباز چٹانوں پر چڑھ گئے۔ اِس مقصد کے لیے وہ تیر کمانیں ساتھ لائے تھے۔ انہوں نے اُوپر سے اندھا دھند تیر برسانے شروع کر دیئے۔

ایک کمانڈر کو خیال آ گیا کہ اپنی فوج آ جانے تو ترلوچن پال کی فوج کو مکمل طور پر ختم کیا جا سکتا ہے۔ وہ اپنے ساتھیوں کو بتا کر چٹانوں سے اترا۔ وہاں بے شمار گھوڑے اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے۔ کچھ دُور جا کر کھڑے ہو گئے تھے۔ کمانڈر نے ایک گھوڑے کو پکڑا اور اس کی ننگی پیٹھ پر سوار ہو کر دریا کی طرف گھوڑے کو دوڑا دیا۔

لاہور کی فوج تو ختم ہو گئی لیکن ترلوچن پال نکل بھاگا۔

*

کالنجر کا مہاراجہ گنڈہ اپنی فوج لے کے کالنجر سے چل پڑا تھا۔ اس کی اطلاع سلطان محمود تک پہنچ گئی۔ اُس نے اپنی فوج کو کوچ کا حکم دے دیا۔ وہ قنوج سے چلا تھا اور اس کا رُخ کالنجر کی طرف تھا۔ راستے میں اُسے اطلاع ملی کہ گنڈہ کی فوج دریائے جمنا پار کر آئی ہے۔ سلطان محمود نے راستے میں دو پڑاؤ کیے اور تقریباً ایک سو میل فاصلہ طے کر گیا۔ اس سے بیس بائیس میل آگے الٰہ آباد ہے جہاں دریائے گنگا اور جمنا مل کر ایک دریا ہو جاتے ہیں۔ گنڈہ کی فوج بڑھی آ رہی تھی اور غزنی کی فوج سے تین چار میل دُور رُک گئی۔

یہاں آ کر سلطان محمود کا وہ دشمن بیدار ہونے لگا جو اُس کے ساتھ غزنی سے آیا تھا۔ یہ عورتیں تھیں جو فوج کے ساتھ تھیں۔ پہلے وہ اس طرح الگ الگ تھیں کہ کئی عورتیں ایک دوسری کو دیکھ بھی نہ سکیں کہ کون کون ساتھ آئی ہے۔

رات کا وقت تھا۔ عنبرین اپنے خیمے سے نکلی اور ٹہلتے ٹہلتے ذرا پرے نکل گئی۔ اُسے کھسر پھسر سنائی دی۔ رات چاندنی تھی۔ اُسے کچھ شک سا ہُوا۔ وہ دبے پاؤں چھُپ چھُپ کر آگے بڑھی۔ اُسے ایک عورت کی آواز سنائی دینے لگی جو بڑی صاف تھی۔

"... زیادہ انتظار نہیں کرنا چاہیئے" — عورت کہہ رہی تھی — "لاہور کی فوج تو دھوکے میں ... ہو گئی ہے۔ اب تم بتاتے ہو کہ ایک مہاراجہ کی فوج آ رہی ہے۔ ان گاڑی بانوں میں سے دو کو بھیج دو تاکہ مہاراجہ کی فوج کے ساتھ رابطہ ہو جائے۔ باقی کام لڑائی شروع ہوتے ہی کریں گے۔"

"میں نے سب کو خبردار کر دیا ہے" — ایک آدمی نے کہا۔

"میں ہمیشہ کے لیے تمہاری ہوں" — عورت نے کہا — "اُسے تو بڑے نام خاوند بنا رکھا ہے۔"

کوئی آ رہا تھا۔ اس عورت کے ساتھ جو آدمی تھا، وہ جلدی سے کھسک گیا۔ عنبرین بھی وہاں سے ہٹ آئی لیکن اُس نے نظر رکھی کہ وہ عورت کدھر جاتی ہے۔ وہ اِدھر ہی آ رہی تھی جہاں عورتوں کے خیمے تھے۔ عنبرین ایک جھاڑی کے پیچھے بیٹھ گئی۔ وہ عورت قریب آئی تو عنبرین اُٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ اس عورت کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔

"دوشین؟" — عنبرین نے اُسے چاندنی میں پہچانتے ہوئے کہا — "شاید مجھے غلطی لگ رہی ہے۔"

"عنبرین ہو تم!" — دوشین نے کہا — "تم یہاں؟ کس کے ساتھ آئی ہو؟ اُسی کے ساتھ آئی ہو گی جس کے ساتھ بھاگی تھیں۔"

"تم بھی تو بھاگ کے آئی ہو گی" — عنبرین نے کہا — "کسی ایک خاص لڑکی کا غزنی کی فوج کے ساتھ ہونا حیران کُن لگتا ہے۔ کون ہے تمہارا خاوند؟"

"رجب بائیمان!" — دوشین نے کہا — "کمانڈر ہے۔"

"رجب بھولی کھونا!" — عنبرین نے کہا — "میں اُسے جانتی ہوں۔ اُسی سے مل کے آ رہی ہو؟"

"میں کسی سے بھی مل کے نہیں آ رہی" — دوشین نے کہا۔

عنبرین ہنس پڑی اور بولی — "میں جانتی ہوں وہ رجب نہیں تھا۔ آج کوئی بھی کمانڈر اِدھر نہیں آ سکتا۔ میرا خاوند بھی کمانڈر ہے۔ وہ بھی نہیں آ سکتا ..... دوشین! ذرا ہوش سے اور اپنی نیت ٹھکانے رکھ کے یہاں رہو۔"

دوشیزہ نے لپک کر عنبرین کو گلے لگا لیا اور ہنسنے لگی۔ پھر بولی ــــ "تم ٹھیک کہتی ہو۔ وہ رجب نہیں تھا۔ وہ اُس کا دوست تھا۔ رجب کا پیغام لایا تھا...... تم مجھ پر کچھ شک کر رہی ہو۔ میں سلطنتِ غزنی کی وفادار ہوں۔ اگر نہ ہوتی تو یہاں کیوں آتی؟ مجھے تم اپنے جیسا سمجھو۔ تم غزنی کی فوج کی سلامتی اور فتح کی دعا کیا کرتی ہو؟ میں دن رات دعا کرتی ہوں" ــــ اور وہ ہنستی ہوئی چلی گئی۔

عنبرین وہیں کھڑی گہری سوچ میں کھو گئی۔

سلطان محمود مہاراجہ گنڈہ کی فوج کا جائزہ لینے کے لیے خود آگے گیا۔ اُس کے ساتھ سالار محمد الطائی تھا۔ وہ گھوڑے سے اُتر کر ایک اونچے درخت پر چڑھ گیا۔ اُس نے مہاراجہ گنڈہ کی فوج دیکھی تو اُس کی آنکھیں ٹھہر گئیں۔ مورخین جن میں گردیزی، ابن الاثیر اور فرخی قابلِ ذکر ہیں، لکھتے ہیں کہ سلطان محمود نے بلند جگہ سے سامنے دیکھا تو وہ اپنی گھبراہٹ کو چھپا نہ سکا۔ جہاں تک نظر جاتی تھی فوج کے خیمے، گھوڑے، ہاتھی اور ہندو فوجی نظر آتے تھے۔ دُور دُور تک زمین کھدی ہوئی تھی۔ یہ خندقیں تھیں۔ ابوالقاسم فرشتہ نے بھی سلطان محمود کے اسی ردِعمل کی گواہی دی ہے۔

انہی مورخوں میں سے بعض نے اُس وقت کی تحریروں کے حوالے سے لکھا ہے کہ محمود غزنوی نے اپنے سالار ابو عبداللہ محمد الطائی سے کہا کہ مجھے دشمن ملک کے اندر اتنی دُور تک نہیں آنا چاہیئے تھا۔ کمک کہاں سے آئے گی؟ پسپائی کی صورت میں ہم کہاں جائیں گے؟ دشمن ہمیں واپس قنوج کے قلعے تک نہیں پہنچنے دے گا۔ ہم قلعہ بند ہو کر ہی لڑ سکتے ہیں۔

"میں نے سلطان محمود کی زبان سے 'پسپائی' کا لفظ پہلی بار سنا ہے" ــــ سالار محمد الطائی نے سلطان محمود سے کہا ــــ "دشمن کی طاقت بہت زیادہ ہے۔ پھر بھی ہمیں پسپائی کی نہیں سوچنی چاہیئے"۔

"اتنی ہی فوج گوالیار کی ہے جو ابھی پہنچی نہیں" ــــ سلطان محمود نے کہا ــــ "وہ بھی آ گئی تو کیا ہو گا؟" ــــ وہ بولتے بولتے چپ ہو گیا اور سر کو ہلکا سا

جھٹکا دے کر بولا ــــ "اللہ مجھے معاف کرے...... اللہ مجھے معاف کرے...... میں اللہ کی ذات کو بھول گیا تھا"۔

وہ مشکل کے وقت جس طرح کیا کرتا تھا اسی طرح درخت سے اُترا۔ قبلہ رُو ہو کے دو رکعت نفل ادا کیے۔ اس کے ساتھ جو سالار اور دیگر افراد تھے، انہوں نے بھی نفل ادا کیے، اور سلطان واپس اپنے کیمپ میں آ گیا۔

مہاراجہ گنڈہ کی فوج کی نفری پچاس ہزار پیادہ چھتیس ہزار گھوڑسوار اور چھ سو چالیس جنگی ہاتھی تھے۔ اُسے سب سے بڑا یہ فائدہ حاصل تھا کہ وہ اپنے ملک میں تھا اور اُس کی ریاست ایک دن کی مسافت پر تھی۔ اس ملک کا بچہ بچہ اُس کے ساتھ تھا۔ سلطان محمود کو اپنے اللہ پر بھروسہ تھا۔

سلطان نے اپنے کیمپ میں جا کر تمام کمانڈروں اور ان سے بھی کم عہدیداروں کو اکٹھا کیا اور ان سے کہا ــــ "تم نے کسی بھی میدان میں مجھے مایوس نہیں کیا۔ تم نے انتہائی مشکل حالات میں بھی دشمن کو شکست دی ہے۔ تم نے دُگنی طاقت کے دشمن سے بھی ہتھیار ڈلوائے ہیں مگر آج ہمارے سامنے پہاڑ آن کھڑے ہوئے ہیں۔ میں ایسا حکم نہیں دے سکتا کہ ایک آدمی بارہ آدمیوں سے لڑے اور انسان ہاتھیوں سے ٹکرا جائیں۔ میں تمہیں یہ یاد دلانا چاہتا ہوں کہ تم یہاں کیا مقصد لے کر آئے ہو۔ میں تمہیں یہ بھی یاد دلانا چاہتا ہوں کہ ہم اگر ہار گئے تو ہم بھاگ کر کہیں بھی نہیں جا سکیں گے۔ ہم میں سے بعض مارے جائیں گے اور بعض ہندوؤں کے قیدی ہوں گے۔ ہندو غزنی کے قیدیوں سے اپنی ہر ایک شکست کا انتقام لے گا۔ اپنے بتوں کی توہین کا انتقام لے گا اور سب سے بڑا نقصان اسلام کو پہنچے گا۔ ہندو مہاراجے غزنی پر چڑھ دوڑیں گے۔ تم نہ ہوئے تو انہیں روکنے والا کوئی نہ ہو گا۔ ہمارا ملک ان کا ہو گا۔ ہماری بیٹیاں ان کی ہوں گی اور ہندو سلطنتِ غزنی کو جو اسلام کا مرکز ہے، بت خانہ بنا دیں گے۔ آگے یہودی اور نصرانی ہیں جو پہلے ہی ہمارے مسلمان امراء اور حکمرانوں کو درپردہ مدد دے کر ہماری جڑیں کھوکھلی کر رہے ہیں۔ اگر ہندو ہمارے

ملک میں پہنچ گئے تو تمام کفار متحد ہو کر خانہ کعبہ تک پہنچ جائیں گے۔ پھر ہم سب اللہ کے حضور رُوسیاہ پیش ہوں گے .... آج تمہیں اللہ کے حکم سے لڑنا ہے۔ اللہ کا نام زبان پر لے کر لڑنا ہے۔"

اس کے بعد سلطان محمود نے دستوں کی تقسیم بنائی اور انہیں بتایا کہ کون سا دستہ کہاں ہوگا اور اسے کیا کرنا ہے۔ اُسے فنِ حرب و ضرب اور جنگی چالوں کا کمال دکھانا تھا ورنہ وہ اتنے طاقتور دشمن کو شکست نہیں دے سکتا تھا۔

دائیں طرف دریائے جمنا اور بائیں طرف دریائے گنگا تھا۔ دونوں دریاؤں کے درمیان کہیں فاصلہ بیس میل تھا کہیں چالیس میل۔ سلطان محمود اس کوشش میں تھا کہ گنڈہ کی فوج کو دو حصوں میں کاٹ دے اور انہیں دریاؤں تک لے جائے لیکن یہ ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ اُس نے بہرحال دستوں کو تقسیم کر کے ضروری ہدایات دے دیں اور انہیں کہا کہ وہ سپاہیوں تک اُس کا پیغام پہنچا دیں۔

*

عنبرین نے دوشین کا خیمہ دیکھ لیا تھا۔ اُسے پختہ شک ہو گیا تھا کہ دوشین صرف اپنے خاوند کو دھوکہ نہیں دے رہی بلکہ سلطان محمود کے لیے دھوکہ بن کر آئی ہے۔ عنبرین کو اُسی روز اس کے خاوند نے بتایا تھا کہ سلطان محمود نے کمانداروں سے کیا کہا ہے اور یہ بھی کہ دشمن کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اُس نے عنبرین سے کہا تھا کہ وہ دعا کرے۔ یہ کہہ کر وہ چلا گیا تھا۔

عنبرین نے اپنے خاوند عمر یزدانی کو نہیں بتایا تھا کہ یہاں ایک ایلک خانی لڑکی ہے جو ایک سلجوقی کماندار کی بیوی بن کر آئی ہے۔ وہ دوشین کو اچھی طرح جانتی تھی۔ اُس کے خیالات سے بھی واقف تھی۔ وہ مان ہی نہیں سکتی تھی کہ دوشین اور اُس کا سلجوقی خاوند غزنی کے وفادار ہو سکتے ہیں۔ دوشین کو خدا نے جتنا حُسن دیا تھا، اُس نے اتنی ہی شیطانیت اپنی فطرت میں بھر لی تھی۔ چنانچہ عنبرین اسے چھپ چھپ کر دیکھتی رہتی تھی۔ اُس نے اپنے ملازم سے بھی کہہ دیا تھا کہ وہ اُس لڑکی پر نظر رکھے۔

رات کا وقت تھا۔ عنبرین خیمے میں اکیلی تھی۔ ملازم اندر آیا اور اسے بتایا کہ دوشین کو اُس نے جاتے دیکھا ہے اور اُسی طرف اُس نے دو گارڈی بالوں کو بھی جاتے دیکھا ہے۔ عنبرین خیمے سے نکل گئی اور اُس طرف چل پڑی جدھر ملازم نے بتایا تھا کہ دوشین گئی ہے۔ عنبرین چھپ چھپ کر اور ذرا راستہ بدل کر جا رہی تھی۔ اسے بڑی اچھی اوٹ مل گئی۔ اس سے ذرا پرے چار آدمی کھڑے تھے اور ان کے ساتھ نہ صرف دوشین تھی بلکہ ایک اور عورت بھی تھی۔ عنبرین پاؤں کے بل سرکتی اور آگے چلی گئی اور اسے باتیں سنائی دینے لگیں۔ ان کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ جو کچھ کرنا چاہتے ہیں اُس کی بات ہو چکی ہے۔ عنبرین کو آخری بات سنائی دی۔

"کشتی کنارے پر بندھی ہے" ۔۔۔ ایک آدمی کہہ رہا تھا۔ "آواز نکالے بغیر کشتی تک پہنچنا اور کشتی میں سوار ہو کر رسّہ کھول دینا۔ پانی کا بہاؤ اُدھر کو ہی ہے۔ چپّو دُور جا کر مارنا۔ سنتری اُدھر بھی چلے جایا کرتے ہیں۔ فاصلہ زیادہ نہیں۔ دو ساعت میں پہنچ جاؤ گے .... پھر سن لو۔ مہاراجہ سے کہنا کہ سوار دستہ ہمارے بائیں پہلو پر لائے۔ تم نے راستہ دیکھ لیا ہے۔ وہ اُسے سمجھا دینا۔ ہم اُدھر ہی ہوں گا۔ مہاراجہ سے کہنا کہ وہاں ہماری طرف سے کوئی مقابلہ نہیں ہوگا۔ تمہیں قلب تک راستہ مل جائے گا۔ اگر ہمیں موقعہ مل گیا تو سلطان ہمارے تیر سے مر چکا ہو گا۔ مہاراجہ کو ہمارے پہلو تک کا راستہ اچھی طرح سمجھا دینا اور اُسے بتانا کہ ہماری فوج اس کی فوج پر حملہ کر کے پیچھے ہٹے گی۔ تم لوگ اسے پسپائی نہ سمجھ لینا اور پیچھے نہ آ جانا ورنہ دائیں بائیں سے مارے جاؤ گے۔ ہمارا حملہ آور دستہ پیچھے ہٹے تو تم بھی پیچھے چلے جانا۔ کہیں ہمارے سلطان کے پھندے میں نہ آ جانا .... جاؤ نکل جاؤ۔ تمہارا انعام تمہیں معلوم ہے کیا ہے۔"

دو آدمی دریا کی طرف چلے گئے اور باقی دوشین اور دوسری عورت کو ساتھ لے کر کسی اور طرف چلے گئے۔ عنبرین اوٹ سے اٹھی اور تیز قدم اپنے خیمے تک آئی۔ کمان اور ترکش اٹھایا اور خنجر کمر میں اُڑسا۔ اُس نے ملازم

سے کہا کر وہ برچھی اور تلوار لے کر اُس کے ساتھ چلے۔

*

عنبرین ناتجربہ کار تھی۔ اُس پر جذبات کا غلبہ تھا۔ وہ یہ تو سمجھ گئی تھی کر سلطان محمود تاریخ کے بہت بڑے دھوکے کا شکار ہو رہا ہے لیکن اُسے صحیح طریقے سے کارروائی کرنے کی سوجھ بوجھ نہیں تھی۔ سلطان محمود سے اس کی عقیدت مندی کا یہ عالم تھا کر اُس پر دیوانگی طاری ہو گئی اور ملازم کو ساتھ لے کر دریا کی طرف دوڑ پڑی۔ دریا دُور نہیں تھا۔ وہ دیکھ نہ سکی کر اُس کے تعاقب میں کوئی آ رہا ہے۔ وہ کنارے سے کشتی ہٹنے سے پہلے دریا تک پہنچنے کی کوشش میں تھی۔

وہ پہنچ گئی۔ چاندنی شفاف تھی۔ کشتی کنارے سے ہٹ گئی تھی۔ وہ اور آگے چلی گئی اور ایک گھٹنہ زمین پر رکھ کر اُس نے ایک تیر چلایا۔ فوراً بعد دوسرا چلایا۔ اس کے ساتھ ہی اُسے اپنے پیچھے شور سا سنائی دیا۔ وہ اٹھی اور پیچھے دیکھا۔ اُس کے ملازم پر دو آدمیوں نے حملہ کر دیا تھا۔ ان میں سے ایک آدمی عنبرین کی طرف دوڑتا تو ملازم اسے برچھی سے روکتا تھا۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں تلواریں تھیں۔ ملازم لڑ تو رہا تھا لیکن اس کا مقابلہ دو فوجیوں کے ساتھ تھا۔ ملازم زخمی ہو گیا۔

ان دونوں آدمیوں نے عنبرین اور اُس کے ملازم کو دریا کی طرف جاتے دیکھ لیا تھا۔ وہ انہیں وہیں ختم کرنے کے لیے ان کے پیچھے چلے گئے تھے۔ اُن کے لیے یہ زندگی اور موت کا معرکہ تھا۔

ایک آدمی نے عنبرین پر حملہ کیا۔ وہ تلوار کا وار بچا گئی۔ اس آدمی نے دوسرا وار کیا۔ عنبرین نے یہ وار بھی خطا کر دیا اور اس کے ساتھ ہی اس نے چلانا شروع کر دیا — "آؤ، آؤ۔ دریا کی طرف آؤ" — اب اس پر حملہ کرنے والا بپھر کر اس پر آیا لیکن عنبرین پیچھے کو اُلٹے پاؤں دوڑی اور اس نے کمان میں تیر ڈال لیا۔ اس آدمی کو وہ زندہ پکڑوانا چاہتی تھی۔

"کمان سے تیر نکال لے لڑکی!" — اس کے حملہ آور نے کہا — "ہم تجھے چھوڑ دیں گے۔"

عنبرین تیر انداز تھی۔ اُس نے کمان اوپر کر کے کھینچی تو وہ آدمی بوکھلا کر دوڑ پڑا۔ عنبرین نے تیر چھوڑ دیا جو اس آدمی کی ران سے پار ہو گیا۔ فاصلہ بہت تھوڑا تھا۔ دوسرا آدمی زخمی ملازم کو مارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ عنبرین نے اس کی بھی ٹانگوں کا نشانہ لے کر تیر چھوڑ دیا۔ تیر اُس کے کولہے میں اُتر گیا۔

وہ دونوں دوڑے لیکن ٹانگوں میں تیر اُترے ہوئے تھے۔ وہ دُور نہ جا سکے۔ عنبرین کے مسلسل شور پر گشت کے سنتری دوڑے آئے۔ عنبرین نے انہیں کہا کہ دریا میں ایک کشتی جا رہی ہے اُسے پکڑو۔ ہندوؤں کے جاسوس جا رہے ہیں۔ سنتریوں نے بڑی ہی بلند آواز سے کسی کو پکارا۔ ذرا سی دیر میں چار پانچ فوجی آ گئے۔ عنبرین نے انہیں بتایا کہ کشتی میں دونوں آدمی اس کے تیروں سے زخمی ہیں۔

دو سنتری کنارے کنارے دوڑے۔ کشتی کنارے کے ساتھ ساتھ ہی جا رہی تھی۔ کشتی میں بیٹھے ہوئے دونوں آدمیوں کے جسموں میں تیر اُترے ہوئے تھے۔ وہ کشتی کو دُور لے جانے کے قابل نہیں تھے۔ سنتری دریا میں اُتر گئے اور کشتی کو کنارے پر لے آئے۔ کشتی میں دونوں آدمی زندہ تھے۔ باہر جو دو آدمی عنبرین کے تیروں سے زخمی ہوئے تھے، انہیں بھی پکڑ لیا گیا۔ سنتری یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہ دونوں ان کی اپنی فوج کے کماندار تھے۔

سب کو اسی وقت سالار محمد الطائی کے پاس لے گئے۔ کشتی میں جو جا رہے تھے وہ ہندو تھے جو اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کر کے سلجوقیوں کے ساتھ آ لے تھے۔ سالار محمد الطائی ان سب کو سلطان محمود کے سامنے لے گیا۔ ہندو ابھی زندہ تھے اور ہوش میں تھے۔ دونوں کمانداروں راجہ بالیجان اور فرید کرقند کی ٹانگوں میں تیر اُترے ہوئے تھے۔ سلطان محمود نے کہا کہ جب تک یہ سچ نہ بولیں ان کے جسموں سے تیر نہ نکالے جائیں۔

سب سے پہلے ہندو بولے اور انہوں نے بتا دیا کہ وہ ہندو ہیں اور سلجوقی کمانڈر انہیں مسلمانوں کے بہروپ میں ساتھ لائے تھے اور اب وہ مہاراجہ گنڈہ کے پاس جا رہے تھے۔ انہوں نے ساری بات بتا دی۔ دونوں سلجوقی کمانڈروں نے بھی جرم کا اعتراف کر لیا۔ جب انہوں نے بتایا کہ انہوں نے اسرائیل سلجوقی کے منصوبے پر عمل کیا ہے تو سلطان محمود کے چہرے پر قہر اُتر آیا۔

"اگر ہم خیریت سے واپس چلے گئے تو سب سے پہلے اسرائیل سلجوقی اور اس کے دستِ راست التگین کو ٹھکانے لگاؤں گا۔"۔۔۔ سلطان محمود نے کہا۔

سلطان نے دونوں اور اُس کی ساتھی لڑکی کو بھی گرفتار کرنے کا حکم دے دیا اور اُن تمام سلجوقیوں سے ہتھیار لے کر انہیں نہتہ کر دیا جو اس کی فوج میں تھے۔ ان سب کو الگ کر کے ان پر پہرہ کھڑا کر دیا گیا۔ اب سلطان کسی سلجوقی پر اعتماد کرنے کو تیار نہیں تھا۔

*

سلطان محمود مہاراجہ گنڈہ کی جنگی طاقت دیکھ کر پہلے ہی پریشان تھا اور سوچ سوچ کر اُس کا سر چکرانے لگا تھا۔ اب اُس پر اس سازش کا انکشاف ہُوا تو بہت ہی بے چین ہو گیا۔ وہ قبلہ رُو ہو کر نفل پڑھنے لگا اور خدا کے حضور بہت گڑگڑایا۔ مورخ لکھتے ہیں کہ اُسے قرآنِ پاک سے بہت پیار تھا۔ اُس رات وہ قرآنِ پاک ہاتھ میں لے کر گڑگڑا رہا تھا۔ اُسے اچانک ایک روشنی نظر آئی۔ اُس کا دماغ روشن ہو گیا۔ اُسے خیال آیا کہ گنڈہ کی رگوں پر حملہ کیا جائے۔ اُس نے اپنے ایک نائب سالار کو ایلچی کی حیثیت سے مہاراجہ گنڈہ کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا:

"آپ کی نجات اور سلامتی اس میں ہے کہ آپ اسلام قبول کر لیں۔ اگر آپ نے انکار کیا تو آپ تصور میں نہیں لا سکتے کہ آپ، آپ کی فوج اور آپ کی

راجدھانی پر کیسی بھیانک تباہی آئے گی۔ آپ کا جواب نفی میں آیا تو میں آپ پر حملہ کر دوں گا اور اُدھر آپ کی راجدھانی محاصرے میں آ جائے گی۔ میں کافی فوج بھیج چکا ہوں۔ امید ہے آپ میرے ہاتھوں اپنی فوج کا قتلِ عام نہیں ہونے دیں گے اور کالنجر اور اس کے مندروں کو جلتے ہوئے کھنڈر بننے سے بچا لیں گے۔"

مہاراجہ گنڈہ نے سلطان کے ایلچی کو عزت سے رخصت کیا لیکن اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اُس پر خوف طاری ہو گیا تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اُس نے غزنی کی فوج کی خیمہ گاہ کی طرف پیشقدمی شروع کر دی۔ اُس نے ہراول دستے روانہ کیے۔ سلطان محمود کے دیکھ بھال کے آدمیوں نے فوراً سلطان کو اطلاع دی۔ سلطان نے سالار محمد الطائی سے کہا کہ وہ ہندوؤں کے ہراول پر ایسا حملہ کرے کہ ان کی ساری فوج پر دہشت طاری ہو جائے۔

سالار محمد الطائی نے میدانِ جنگ میں عمر گزار دی تھی۔ قبل از وقت اطلاع ملنے سے اُس نے اپنے دو سوار دستے سامنے کی بجائے دائیں بائیں تقسیم کر دیئے اور کمان اپنے ہاتھ میں رکھی۔ جب مہاراجہ گنڈہ کا ہراول آگے آیا تو دونوں طرف سے گھوڑسواروں نے اُس پر حملہ کر دیا۔ سالار محمد الطائی نے بڑا ہی شدید حملہ کرایا۔ گنڈہ کے ہراول کا حال بہت بُرا کر دیا گیا۔ جو ہندو واپس زندہ پہنچ گئے انہوں نے ساری فوج میں دہشت پھیلا دی۔

اُس روز اور کوئی لڑائی نہ ہوئی۔ رات کو سلطان محمود پھر خدا کے حضور رکوع و سجود کرنے لگا۔ اُسے توقع تھی کہ مہاراجہ گنڈہ رات کو حملہ کر دے گا مگر کچھ بھی نہ ہُوا اور صبح ہو گئی۔ سلطان نماز سے فارغ ہُوا تو سالار محمد الطائی نے اُس کے خیمے میں آ کر یہ عجیب خبر سنائی کہ مہاراجہ گنڈہ کی فوج ابتری کی حالت میں رات کو جانے کہاں چلی گئی ہے۔ سالار کو دیکھ بھال کرنے والوں نے بتایا تھا۔

"یہ دھوکہ ہے"۔۔۔ سلطان محمود نے کہا۔۔۔ "اتنا طاقتور دشمن بغیر لڑے

بھاگ تو نہیں سکتا۔ مہاراجہ گنڈہ نے ہمیں آگے بڑھنے کا موقعہ دیا ہے اُسے توقع ہے کہ ہم آگے بڑھیں گے تو وہ میری فوج کو پھانس لے گا"۔

یہ دھوکہ نہیں تھا محمد قاسم فرشتہ اور دوسرے تمام مورخوں نے لکھا ہے کہ رات کو مہاراجہ گنڈہ کے دل پر خوف طاری ہو گیا اور وہ محسوس کرنے لگا کہ وہ تباہی کی طرف جا رہا ہے۔ یہ ایک معجزہ تھا اور یہ سلطان محمود کی دعاؤں کا کرشمہ تھا سلطان محمود نے کچھ دستے ساتھ لیے اور مہاراجہ گنڈہ کی خیمہ گاہ تک گیا۔ وہاں خیمے لگے ہوئے تھے اور فوج جا چکی تھی۔ سلطان اسے گھات سمجھتا رہا لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔

سلطان محمود کو اطلاع ملی کہ مہاراجہ گنڈہ کی فوج کالنجر کو جا رہی ہے۔ سلطان محمود نے تعاقب کا حکم دے دیا۔ یہ ایک دلیرانہ حکم تھا لیکن سلطان نے ہراول کو بہت آگے بھیج دیا تھا تاکہ یہ گھات ہو تو پتہ چل جائے مگر کہیں بھی گھات نہیں تھی۔ سلطان محمود دشمن کی فوج تک پہنچ گیا۔ سالار محمد الطائی نے دیکھا کہ سلطان بہت آگے چلا گیا ہے تو وہ تین چار سوار ہوتے اپنی کمان میں لے کر سلطان کے پیچھے چلا گیا۔

کسی بھی مورخ نے اس سوال کا جواب نہیں دیا کہ مہاراجہ گنڈہ کو کیا ہو گیا تھا اور وہ لڑائی سے کیوں منہ موڑ گیا تھا سلطان محمود کے تعاقب سے وہ بھاگ اُٹھا۔ یہاں تک کہ اُس کی فوج ساز و سامان پیچھے چھوڑ کر بھاگ گئی۔

ڈی ایسے متھ اور عطبی نے لکھا ہے کہ مہاراجہ گنڈہ پر غزنی کی فوج کا خوف اتنا زیادہ نہیں تھا۔ اُس پر کوئی پُر اسرار سا خوف طاری ہو گیا تھا جیسے اُس پر کسی غیبی قوت کا یا آسیب کا اثر ہو گیا ہو۔ بعض تحریروں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اُس پر ہذیانی کیفیت طاری ہو گئی تھی اور اُس نے ایسی باتیں کی تھیں کہ اُس کے افسر بھاگ اُٹھے۔

اِسے معجزہ ہی کہا جا سکتا ہے۔ مورخوں کے مطابق جب سلطان محمود واپس

آیا تو مہاراجہ گنڈہ کے چھ سو چالیس ہاتھیوں میں سے پانچ سو اسّی سلطان کے پاس تھے۔

خود سلطان محمود پر کچھ ایسی کیفیت طاری ہو گئی کہ اُس نے ہندوستان میں اپنی باقاعدہ حکومت قائم کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور غزنی کو واپسی کا حکم دے دیا۔ اُس کی واپسی کی وجہ یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ اُسے غزنی سے اطلاع ملی تھی کہ سلجوقی بہت بڑی طاقت بن گئے ہیں اور ہر لمحہ خطرہ ہے کہ وہ غزنی پر حملہ کر دیں گے۔

قلعے جو نعروں نے سر کئے

سُلطان محمود غزنوی

مہاراجہ گنڈا کو شکست دے کر جب غزنی پہنچا تو اُس کے ساتھ کم و بیش چھ سو ہاتھی اور ڈیڑھ سو گھوڑے تھے۔ مہاراجوں کی فوجوں کے قیدیوں کی تعداد سات سے دس ہزار تک تھی۔ غزنی کے لوگ اپنے فاتح سُلطان کے استقبال کے لیے شہر سے دُور نکل گئے تھے۔ اُن کے نعروں سے آسمان پھٹا جاتا تھا۔ تھکے ماندے سپاہیوں کے چہروں پر رونق آگئی تھی۔ جب قیدی لوگوں کے سامنے سے گزرے تو لوگوں نے فتح و نصرت کا وہ واویلا بپا کیا کہ فضا لرزنے لگی۔ لوگ اِن ہندو قیدیوں پر طعنوں کے تیر برسانے لگے۔ بعض اُن کے قریب جا کر کہتے تھے کہ غزنی میں تمہیں سچا خدا ملے گا۔ اس کے آگے سجدہ کرنا۔ تمہارے گناہ معاف ہو جائیں گے۔ مگر ہندو فارسی نہیں سمجھتے تھے۔ وہ خالی خالی نگاہوں سے تماشائیوں کو دیکھتے تھے۔ بعض کے ہونٹوں پر طاری ہوئی مسکراہٹ اور بعض کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

ان تماشائیوں میں چار آدمی الگ تھلگ کھڑے اپنے سامنے سے گزرتے ہوئے سلطان محمود کو دیکھ رہے تھے۔ وہ کوئی نعرہ نہیں لگا رہے تھے۔ اُن کے چہروں پر سنجیدگی طاری تھی۔ اُن کے سامنے سے سلطان محمود گزر گیا تو وہ فوج کو گہری نظروں سے دیکھنے لگے۔ اب کے چونکہ مہاراجے مقابلے سے مُنہ موڑ گئے تھے اس لیے سلطان محمود کی فوج کا جانی نقصان نہیں ہوا تھا۔ لگتا تھا جیسے

جتنی فوج ہندوستان کی تھی اس سے زیادہ واپس آئی ہو۔ حالانکہ سلطان محمود کچھ دستے قنوج کے گرد و نواح میں اور لاہور کے قریب بھی چھوڑ آیا تھا۔ یہ علاقے اُس کے باجگزار تھے۔

"سلطان بغیر لڑے واپس آگیا ہے۔ بہت لُوٹ مار کر لایا ہے۔"

"لڑائی ہوتا تو یہ جنگی قیدی کہاں سے لے آتا؟ اتنے زیادہ ہاتھی اور گھوڑے کہاں سے آتے؟"

"لوگوں کے اتنے زیادہ ہجوم میں سے اگر میں سلطان پر تیر چلا دوں اور کمان پھینک کر ہجوم میں غائب ہو جاؤں تو میں پکڑا نہیں جاؤں گا اور سلطان کا کام بھی تمام ہو جائے گا۔"

"اکیلے سلطان کو قتل کر دینے سے کیا حاصل ہوگا؟ اس کی سلطنت ہمارے قبضے میں نہیں آجائے گی۔ اس کے بیٹے جوان ہیں جو جنگی چالوں میں باپ کی طرح دانشمند ہیں۔"

"قتل کی باتیں چھوڑو۔ ہمیں یہ دیکھنے کے لیے بھیجا گیا ہے کہ سلطان محمود کی فوج کو دیکھ کر آؤ کتنی تعداد واپس آرہی ہے اور اس کی حالت کیا ہے۔"

"اسرائیل سلجوقی دھوکے میں شکست کھا گیا تھا۔ اب ایسا نہیں ہوگا۔"

"اپنے آپ کو دھوکے میں نہ رکھو۔ غزنی کی جنگی طاقت ہم سے زیادہ ہے۔"

"ایک سلجوقی غزنی کے پانچ فوجیوں پر بھاری ہے۔ میں اب بھی کہتا ہوں کہ اکیلے سلطان محمود کو قتل کر دیا جائے تو اُس کی فوج کا حوصلہ ٹوٹ جائے گا۔"

"اور غزنی والوں کی حالت اس فقیر جیسی ہو جائے گی۔" اس آدمی نے ایک فقیر کی طرف اشارہ کر کے ہنستے ہوئے کہا اور اُس نے فقیر سے کہا — "او بھکاری! اپنے سلطان سے کہہ کہ جو دولت ہندوستان سے لُوٹ کے لایا ہے، اُس میں سے کچھ تجھے دے دے۔"

فقیر پھٹے پُرانے کپڑے پہنے، داڑھی اور سر پر گرد ڈالے، ایک ہاتھ میں لاٹھی اور دوسرے میں کشکول اُٹھائے اِن چاروں کے پاس کھڑا تھا۔

"میں غزنوی نہیں سلجوقی ہوں" — بھکاری فقیر نے کہا — "غزنی والے سلجوقی فقیروں کو بھیک بھی نہیں دیتے۔"

"اگر تمہاری رگوں میں سلجوقی خون ہوتا تو دریا میں ڈوب کر مر جاتے بھیک نہ مانگتے" — ایک نے اُسے کہا — "فوراً یہاں سے نکلو اور وہاں پہنچو جہاں اسرائیل سلجوقی کی بادشاہی ہے۔ وہاں کوئی بھکاری نہیں۔ سب بادشاہ ہیں۔"

"میں جانتا تھا آپ چاروں سلجوقی ہیں" — فقیر نے کہا — "اسی لیے آپ کے پاس آن کھڑا ہوا تھا۔"

"لیکن ہم تمہیں بھیک نہیں دیں گے" — ایک سلجوقی نے کہا — "ہم تمہاری یہ عادت پکی نہیں کرنا چاہتے۔"

سلطان محمود غزنوی کھانے سے فارغ ہو چکا تھا۔ اُس نے کھانا فراغت سے نہیں کھایا تھا۔ کھانے کے دوران وہ اپنے وزیر سے اپنی غیر حاضری کے عرصے کی رپورٹیں لیتا رہا تھا۔

"سلجوقیوں کا خطرہ بڑھتا جا رہا ہے" — وزیر نے اُسے بتایا تھا — "سلجوقی ایک جنگی طاقت بن گئے ہیں۔ اسرائیل سلجوقی میں کوئی ایسی کشش ہے کہ بخارا اور کچھ اور علاقوں کے ایسے لوگ بھی اُس کے ساتھ مل گئے ہیں جو سلجوقی نہیں۔ اسرائیل سلجوقی نے اپنے قبیلے کو کرائے کی فوج بنا دیا ہے۔ ایلتگین کے ساتھ اب بھی اُس کا اتحاد اور جنگی معاہدہ ہے۔"

"یہ خطرہ میرے ساتھ ہندوستان میں بھی گیا تھا" — سلطان محمود نے کہا اور وزیر کو تفصیل سے سنایا کہ دو سلجوقی کمانداروں نے چند ایک ہندو گاڑی بانوں کے ذریعے مہاراجہ گنڈہ کو غزنی کی فوج کی نقل و حرکت سے آگاہ کرنے کی کوشش کی تھی مگر عنبرین نام کی ایک لڑکی نے جو کماندار عمر یزدانی کی بیوی ہے، بروقت ان ہندوؤں کو پکڑوا دیا تھا۔

"اور یہ خطرہ یہاں بھی آپ پر منڈلا رہا ہے" — وزیر نے کہا — "آج چار سلجوقی پکڑے گئے ہیں۔ وہ دیکھنے آئے تھے کہ آپ کے ساتھ جو فوج واپس

آئی ہے وہ کتنی ہے اور کس حال میں ہے۔ وہ آپ کے قتل کی باتیں بھی کر رہے تھے۔"

"کیا وہ مان گئے ہیں کہ وہ جاسوسی کرنے آئے تھے اور ان کا ارادہ مجھے قتل کرنے کا بھی تھا؟" — سلطان محمود نے پوچھا — "وہ کہاں ہیں؟"

"وہ یہیں ہیں" — وزیر نے کہا — "حکم فرمائیں تو انہیں آپ کے سامنے لایا جائے۔ اُن سے اگلوا لیا گیا ہے کہ وہ یہاں بہت بری نیت سے آئے تھے۔"

چار آدمیوں کو اندر لایا گیا جن کے پاؤں میں بیڑیاں تھیں۔ اُن کے سر ڈول رہے تھے اور اُن سے کھڑا نہیں ہوا جاتا تھا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ ان پر تشدد کیا گیا ہے۔ وزیر نے دربان کو کسی کا نام بتا کر کہا کہ اُسے اندر بھیج دو۔

ایک فقیر اندر آیا جس کے کپڑے پھٹے پرانے اور غلیظ تھے۔ اُس کی داڑھی اور سر کے لمبے لمبے بال پسینے اور مٹی سے جڑے ہوئے تھے۔ اُس کے ایک ہاتھ میں لاٹھی اور دوسرے میں کشکول تھا۔

"سلطان عالی مقام!" — وزیر نے کہا — "یہ ہے وہ بھکاری جس نے ان کی باتیں سنیں پھر ان پر نظر رکھی کہ کہاں جاتے ہیں اور جب یہ اپنے ٹھکانے پر پہنچے تو اس فقیر نے چھاپہ مروا کر انہیں پکڑوا دیا۔ یہ جس کے گھر ٹھہرے تھے وہاں کی تلاشی لی گئی ہے۔ ملزم بھی مشکوک نکلے۔ یہ فقیر محکمۂ جاسوسی کا عہدیدار ہے۔ ہم نے جب دیکھا کہ آپ کے استقبال کے لیے لوگ ہجوم در ہجوم باہر نکل آئے ہیں تو ہم نے ان لوگوں میں جاسوس پھیلا دیئے تھے۔ یہ عہدیدار آپ کو بتائے گا کہ اس نے ان پر کیوں شک کیا تھا۔"

"میں نے دیکھا کہ لوگ فتح و نصرت کے نعرے لگا رہے تھے" — فقیروں کے بھیس میں اس جاسوس عہدیدار نے بتایا — "ہر کوئی ناچنے اور کودنے کی کیفیت میں تھا لیکن یہ چاروں بڑی سنجیدہ رُخی سے آپ کو دیکھ رہے تھے جیسے انہیں افسوس ہو رہا ہو کہ لوگ فاتحانہ نعرے لگا رہے ہیں۔ میں نے

قریب ہو کر ان کی باتیں سُنیں"۔ اُس کی اِن کے ساتھ جو باتیں ہوئی تھیں وہ اُس نے سلطان کو بتائیں۔

"کیا تم اب اپنے ارادوں کے متعلق مجھے کچھ بتانا چاہو گے؟" سلطان محمود نے ان سلجوقیوں سے پوچھا۔ "میں نے سنا ہے کہ تم نے تسلیم کر لیا ہے کہ تم مجھے قتل کرنے آئے تھے"۔

"نہیں سلطان محمود!" — ایک سلجوقی نے کہا۔ "ہم میں ایک نے آپ کے قتل کی بات کی تھی لیکن قتل کا ارادہ نہ تھا۔ ہم جب پکڑے گئے تو سب کچھ بتا دیا تھا۔ ہم پر بہت تشدد کیا گیا ہے۔ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ ہمارے دلوں میں جو کچھ تھا وہ صاف بتا دیا تھا۔ ہم سلجوقی ہیں۔ ہم جھوٹ نہیں بولا کرتے۔ ہم آپ کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔ آپ نے ہمیں ایک بار شکست دی ہے۔ ہم اس شکست کا انتقام لیں گے۔ ہم ہندو نہیں مسلمان ہیں۔ ہمارا کوئی ملک نہیں۔ زمین کا کوئی ایسا خطہ نہیں جسے ہم اپنا وطن کہہ سکیں۔ ہم پہاڑیوں میں رہتے ہیں۔ ہم اپنا وطن حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں"۔

"لیکن تمہاری نظر صرف میری سلطنت پر کیوں جم گئی ہے؟" — سلطان محمود نے پوچھا — "تم کسی کمزور حکمران سے اُس کی زمین چھین سکتے ہو"۔

"کمزور سے کچھ چھیننا بہادروں کا شیوہ نہیں" — ایک سلجوقی نے کہا — "آپ ہم سے زیادہ طاقتور ہیں۔ ہم آپ کی سلطنت کے کسی حصے کو اپنا وطن بنائیں گے .... ہماری اس بات کو سچ مانیں کہ ہم آپ کو قتل نہیں کرنا چاہتے۔ ہم آپ کی جنگی طاقت کو کمزور کریں گے اور میدانِ جنگ میں آپ کو مارنے کی کوشش کریں گے"۔

"مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے کہ تم بہادر جنگجوؤں کی طرح وہی بات کر رہے ہو جو تمہارے دل میں ہے" — سلطان نے کہا — "میں بھی تمہارے ساتھ بہادر جنگجوؤں جیسا سلوک کروں گا۔ تم غزنی کے مہمان ہو" — اُس نے وزیر سے کہا — "ان کی بیڑیاں کھلوا دو"۔

ان کی بیڑیاں کھلنے لگیں سلطان محمود کہہ رہا تھا۔ "غزنی کی فوج کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟"

"بہت طاقتور فوج ہے" — ایک سلجوقی نے کہا — "ہمارا خیال تھا کہ یہ فوج ہندوستان سے کمزور ہو کر آئے گی لیکن ہاتھیوں اور گھوڑوں کے لحاظ سے یہ اور زیادہ طاقتور ہو کے آئی ہے"۔

"کیا تمہارا سردار اسرائیل سلجوقی ہمارے خلاف لڑے گا؟"

"اِس کا جواب وہی دے سکتا ہے" — سلجوقی نے کہا — "ہم سے صرف ہمارے متعلق پوچھیں"۔

"میں کچھ نہیں پوچھوں گا" — سلطان محمود نے کہا — "میں تمہیں کچھ بتاؤں گا۔ اپنے سردار اسرائیل سلجوقی کو میرا سلام کہنا اور اُسے کہنا کہ میں تمہیں یہاں سے نکال کر دریائے جیحون کے پار کا بہت سا علاقہ دے دوں گا۔ تم اپنے تمام قبیلے کو وہاں منتقل کر دو اور اسے اپنا وطن بنا لو۔ اُسے کہنا کہ ایک ہی مذہب کی دو فوجیں ایک دوسرے کا خون بہائیں گی تو فائدہ یہودیوں اور نصرانیوں کو پہنچے گا۔ وہ میرے بھی اتنے ہی دشمن ہیں جتنے تمہارے ہیں۔ انہیں موقع ملا تو ہم دونوں کو نیست و نابود کر دیں گے۔ اُسے یہ بھی کہنا کہ ہر کسی کی موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ فتح اور شکست اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ تم نے اپنے آدمی میرے ساتھ ہندوستان بھیجے کہ وہ ہندوستان کے ایک بہت بڑے طاقتور مہاراجہ کو میرے جنگی راز دے کر مجھے شکست دلائیں مگر وہ ایک ایسی عورت کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچے جو تمہارے دوست ایلک خان کے خاندان کی ہے۔ تم بہادر جنگجو ہوتے تو دو عورتوں سے وہ کام نہ کراتے جو مردوں کو کرنا چاہیے تھا۔ تم نے ہندوؤں کو ساتھ ملا کر مجھے دھوکہ دینا چاہا مگر تم نہیں جانتے کہ ہندو مسلمان کا دوست نہیں ہو سکتا .... اپنے سردار سے یہ بھی کہنا کہ جس کے ہاتھوں تم نے مجھے شکست دلانے کا انتظام کیا تھا، اُسے خدا نے ایسا مرعوب کیا کہ

وہ لڑے بغیر میدانِ جنگ سے غائب ہو گیا۔ یہ اللہ کی شان ہے۔ تم بھی اللہ کے آگے سر جھکا دو۔ اُسے کہنا کہ مجھے ملے۔ وہ میرے پاس نہ آنا چاہے تو میں اُس کے پاس چلا جاؤں گا۔ میرا پیغام اُس تک پہنچا دینا۔۔۔ جاؤ، میں تمہیں آزاد کرتا ہوں۔"

*

اس داستان کی پچھلی کڑی میں بتایا جا چکا ہے کہ غز نام کا ایک جنگجو قبیلہ تھا جس کا اپنا کوئی وطن نہیں تھا۔ وہ پہاڑیوں میں خانہ بدوش رہتا تھا۔ اس قبیلے کا ایک سردار لقمان تھا جو اپنے آپ کو سلجوق کہلاتا تھا۔ وہ قبیلے میں اتنا مقبول تھا کہ اس نے ایک الگ تھلگ سلجوقی قبیلہ بنا لیا۔ غز قبیلے کے بیشتر لوگ اس کی اطاعت میں آ گئے اور سلجوقی کہلانے لگے۔ یہ لوگ آزاد زندگی بسر کرتے تھے۔ اِدھر اُدھر سے مویشی چوری کرلاتے تھے۔ قافلوں کو بھی لُوٹ لیتے تھے۔ وہ پہاڑیوں میں بڑی خوشنما اور سرسبز جگہوں میں رہتے تھے۔ نوجوان لڑکیاں بھی اغوا کر لیتے تھے لیکن ظلم و تشدد نہیں کرتے تھے۔ ان میں آئی ہوئی باہر کی لڑکی خوش رہتی تھی۔

اُنہوں نے اپنے رہن سہن اور طور طریقوں میں ایسی دلکشی پیدا کر رکھی تھی کہ غیر سلجوقی خانہ بدوش بھی ان میں شامل ہو گئے اور سلجوقی کہلانے لگے۔ ساٹھ ستر برسوں میں ان کی تعداد باہر کے قبیلوں کی شمولیت اور دو تین نئی نسلیں پیدا ہونے سے کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ یہ چونکہ جنگجو قبیلہ تھا اس لیے اس کی حیثیت ایک فوج کی سی ہو گئی تھی۔ انہیں چھوٹے موٹے مسلمان حکمران ایک دوسرے کے خلاف لڑاتے تھے۔ ترکستانیوں اور سمانیوں کی لڑائیوں میں سلجوقیوں نے سمانیوں کا ساتھ دیا تھا۔ پھر ایک اور حکمران ایلگتگین نے سلجوقیوں کے ساتھ سلطان محمود کے خلاف جنگی معاہدہ کر لیا تھا اور دونوں نے سلطان محمود سے شکست کھائی تھی۔ شکست کھانے والا اسرائیل سلجوقی تھا جو لقمان سلجوق کا بیٹا تھا اور اُس کے مرنے کے بعد سلجوقی قبیلے کا سردار بنا تھا۔

اسرائیل سلجوقی کے متعلق بتایا جا چکا ہے کہ وہ بڑا خوبصورت جوان تھا۔ اُس کی شخصیت میں ایسا اثر تھا کہ اُس کے پیروکار اُس کا وہ حکم بھی فوراً مانتے تھے جس میں یقینی موت کا خطرہ ہوتا تھا۔ اُس نے لڑائیوں میں مختلف حکمرانوں کی مدد کر کے اپنا خزانہ بھر لیا تھا اور اُن کی کمزوریوں اور ہوس پرستی سے بھی وہ بہت فائدہ اٹھاتا تھا۔

سلطان محمود ہندوستان سے واپس آیا تو اُس کے وزیر نے اُسے بتایا کہ اسرائیل بہت بڑی طاقت بن گیا ہے اور سلطنتِ غزنی کے لیے ایک ایسا خطرہ جسے فوراً دبا لینا بہت ضروری ہو گیا ہے۔ سلطان کو چار سلجوقی جاسوسوں کی صورت میں اسی وقت ثبوت مل گیا تھا۔ سلطان نے تدبر سے کام لے کر ان سلجوقیوں کو رہا کر دیا اور ان کے سردار اسرائیل سلجوقی کو پیغام بھی بھیج دیا کہ وہ اُسے ملے۔

"جو شخص آپ کے قتل کے منصوبے بنا رہا ہے اور جو آپ کی سلطنت کے لیے خطرہ بنا ہوا ہے، اُس سے آپ دوستانہ ملاقات کریں گے؟" ——وزیر نے حیران سا ہو کے سلطان سے پوچھا۔

"ہاں، میں اُسے دوست بنانے کی کوشش کروں گا" سلطان نے کہا۔ "اسرائیل سلجوقی خواہ نام کا مسلمان ہے، مسلمان تو ہے۔ ہم ایک دوسرے کا بہت خون بہا چکے ہیں۔ ایک میری وہ جرأت ہے کہ میں اپنے ملک سے اتنی دور ہندوستان کے وسط تک چلا جاتا ہوں جہاں کی زمین اور جہاں کا آسمان بھی میرا دشمن ہوتا ہے۔۔۔۔ اور یہ بھی ایک جرأت ہوتی ہے کہ اپنے بھائی کی لغزشیں معاف کر دو اور اس کے آگے جھک جاؤ۔ یہ میری بدقسمتی ہے کہ مجھے دو مہمیں ایک ساتھ سر کرنی پڑ رہی ہیں۔ ایک طرف ہندوستان ہے۔ اس خطے کو میں محمد بن قاسم کی امانت سمجھتا ہوں۔ یہ دارالاسلام تھا جو بُت خانہ بن گیا ہے اور میں اسلام کو فروغ دینے کے علاوہ ہندوؤں کی اُس جنگی طاقت کو ختم کر رہا ہوں جو ختم نہ ہوئی تو صرف ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے نہیں بلکہ پورے عالمِ اسلام کے لیے بہت بڑا خطرہ بن جائے گی۔ ایک طرف یہودی اور نصرانی ہیں، دوسری طرف ہندو

ہیں۔ یہ وہ پہاڑ ہیں جو ہماری طرف سرک رہے ہیں۔ ہم نے یا جس دور میں بھی مسلمانوں نے ان سے توجہ ہٹالی یا ان کے جھانسے میں آگئے مسلمان آپس میں ٹکرا ٹکرا کر ختم ہو جائیں گے ....

”دوسری مہم یہ ہے کہ ہمارے مسلمان بھائی میرے دشمن ہو گئے ہیں۔ ہم ایک دوسرے کا بہت خون بہا چکے ہیں۔ بادشاہی اور سلطانی کی ہوس نے انہیں اندھا کر رکھا ہے۔ اسرائیل سلجوقی واقعی ایک جنگی طاقت بن گیا ہے۔ میں اس طاقت کو طاقت سے ختم کر سکتا ہوں۔ کفار کا یہی مقصد ہے میں کفار کا یہ مقصد پورا نہیں ہونے دوں گا۔ میں کوشش کروں گا کہ اسرائیل سلجوقی میری شرائط تسلیم کرلے۔ میں اسے ایک وطن دے دوں گا۔“

*

بیس بائیس روز بعد اسرائیل سلجوقی بخارا کے پہاڑی علاقے میں ایک بڑی ہی حسین اور ٹھنڈی جگہ بیٹھا تھا۔ اس کے پاس اُس کی بیوی مریم بیٹھی تھی اور ان دونوں کے پاس دو ادھیڑ عمر آدمی بیٹھے تھے۔ اسرائیل کے سامنے وہ چار سلجوقی بیٹھے ہوئے تھے جنہیں غزنی میں جاسوسی کے جرم میں پکڑا گیا تھا لیکن سلطان محمود نے انہیں رہا کر دیا تھا۔ وہ اسرائیل سلجوقی کو تفصیل سے سنا چکے تھے کہ وہ کس طرح پکڑے گئے، سلطان محمود نے ان کے ساتھ کیا باتیں کیں اور اسرائیل کے نام کیا پیغام دے کر رہا کر دیا ہے۔

”تم کہتے ہو کہ سلطان محمود نے کہا تھا کہ وہ ہمیں ایک خطہ دے گا جو ہمارا وطن ہوگا“ — اسرائیل سلجوقی نے کہا ”کیا اُس نے یہ بات سنجیدگی سے کہی تھی یا ہمیں طعنہ دیا تھا؟ کیا تم بتا سکتے ہو کہ اُس نے یہ بات گھمنڈ میں کہی تھی؟“

”نہیں“ — ایک سلجوقی نے جواب دیا ”وہ سنجیدہ معلوم ہوتا تھا۔ اگر اُس کے دل میں گھمنڈ ہوتا تو وہ یہ نہ کہتا کہ جہاں آپ اسے ملنا چاہیں گے وہ وہیں آ جائے گا!“

”اُسے پتہ چل گیا ہے کہ سلجوقی اب اتنے طاقتور ہو گئے ہیں کہ اپنی شرطیں

منوا سکتے ہیں“ — اسرائیل سلجوقی کی بیوی مریم نے کہا۔

مریم سلطان محمود کے ایک بدترین دشمن ایلک خان کی بھتیجی تھی۔ وہ بڑی ہی حسین اور جوان لڑکی تھی۔ اُس نے شادی سے پہلے اسرائیل سے کہا تھا — ”میں اُس مرد پر اپنا سب کچھ قربان کر دوں گی جو سلطان محمود کی سلطنت کو تباہ کر کے اسے بھٹکنے کے لیے ان پہاڑوں میں چھوڑ دے گا“ — اُس نے اسرائیل سلجوقی سے یہ بات اس لیے کہی تھی کہ اسرائیل نے ایلک خان سے کہا تھا کہ وہ سلطان محمود کو مروا دے گا۔ اسی وعدے پر مریم نے اسرائیل کے ساتھ شادی کی تھی مگر اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ اسرائیل سلطان محمود کی اس پیشکش پر غور کر رہا ہے کہ وہ سلجوقیوں کو ایک الگ وطن دے گا۔

اسرائیل سلجوقی نے ان چاروں آدمیوں کو اور اُن دو آدمیوں کو بھی جو اُس کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، اٹھا دیا۔ اس کے پاس مریم اکیلی رہ گئی۔

”میں ایسی بات نہیں سننا چاہتی کہ آپ نے سلطان محمود کی پیشکش قبول کر لی ہے“ — مریم نے اسرائیل سے کہا — ”وہ حالات کچھ اور تھے جو آپ کی شکست کا باعث بنے تھے۔ اب آپ کو کسی سے نہیں ڈرنا چاہیے۔ ہماری اپنی طاقت کے علاوہ التگین ہمارے ساتھ ہے۔ توغان خان ہمارے ساتھ ہے۔ اپنے دشمن کے لالچ میں نہ آئیں۔ ہم اب اپنا وطن دوسروں سے ملک چھین کر بنا سکتے ہیں“

”سنو مریم!“ — اسرائیل سلجوقی نے کہا ”میں جانتا ہوں کہ تمہارے دل میں سلطان محمود کی اتنی نفرت نہیں جتنی یہ خواہش تمہارے دل میں تڑپ رہی ہے کہ تم ایک ملک کی ملکہ بنو۔ میں تمہیں ملکہ بنا دوں گا لیکن ہمیں سب سے پہلے زمین کا ایک ٹکڑا چاہیے جسے ہم اپنا وطن کہہ سکیں۔ وہاں ہم اپنی فوج کو باقاعدہ تربیت دیں گے۔ وہاں ہمارے قلعے ہوں گے۔ اب ہماری یہ حالت ہے کہ فوج لڑتی ہے اور پیچھے ہٹتی ہے تو ہمیں کہیں پناہ نہیں ملتی۔ ہم قبائلی اور جنگلی کہلاتے ہیں۔ مجھے محمود سے کچھ وصول کر لینے دو“

بات مریم کی سمجھ میں آ گئی مگر وہ جو دو آدمی اسرائیل کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، وہ نہیں جانتے تھے کہ مریم اسرائیل کی یہ بات سمجھے۔ رات کو وہ ایک قدرتی اوٹ میں بیٹھے تھے۔ مریم ان کے ساتھ تھی اور انہیں کہہ رہی تھی — "میں نے اس شخص کے ساتھ صرف اس لیے شادی کی تھی کہ یہ سلطان محمود کا کام تمام کر دے گا مگر اس کی باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شخص غزنی کے اس سلطان کے جھانسے میں آ جائے گا۔ اس نے مجھے یہ تو کہا ہے کہ وہ محمود سے کچھ وصول کرنا چاہتا ہے مگر مجھے اس کی نیت پر شک ہے۔ یہ محمود کا طفیلی بن جائے گا۔"

"تمہاری نظر میں کوئی اور ہے جو سلجوقی قبیلے کی سربراہی کر سکے؟" — دونوں میں سے ایک نے پوچھا۔

"توغان خان!" — مریم نے کہا — "وہ میرا چچا زاد ہے۔ میں اس کے ساتھ شادی کر لوں گی۔ وہ مجھے ایسا بری طرح چاہتا ہے کہ میں نے جب اسرائیل کے ساتھ شادی کی تھی تو توغان خان زہر کھانے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ مجھے پتہ چل گیا۔ میں اسے ملی تو اس کی حالت پاگلوں جیسی ہو چکی تھی۔ میں اسے زندہ دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ اپنے باپ کا جانشین تھا، پھر اس کا باپ مر بھی گیا اور وہ باپ کا جانشین بنا لیکن ذہنی طور پر وہ اس قابل نہ تھا۔ میں نے اسے زندگی دی اور زندگی اس طرح دی کہ اسرائیل سے چوری چھپے اس کی بھی بیوی بنی رہی۔ یہ سلسلہ اب تک چل رہا ہے .... مجھے امید ہے کہ اسرائیل کا مر جانا ہمارے لیے بہتر ہو گا۔ توغان خان ہمارا مقصد پورا کر دے گا۔"

ایک سایہ سا ان جھاڑیوں کے عقب سے بے آواز گزر گیا جن کی اوٹ میں وہ تینوں بیٹھے تھے۔ دونوں آدمیوں نے اٹھ کر دیکھا۔ بادل کے ایک ٹکڑے کا سایہ رینگتا جا رہا تھا۔ یہ ٹکڑا چاند کے آگے سے گزر گیا تھا۔

"کون تھا؟" — مریم نے سرگوشی میں پوچھا۔

"میرا خیال ہے بادل کا ٹکڑا چاند کے آگے سے گزرا ہے۔"

صبح کا اجالا نکھر رہا تھا۔ ایک جگہ چٹانوں نے اوٹ بنا رکھی تھی۔ دائیں، بائیں اور پیچھے تین چٹانیں تھیں۔ ان کے درمیان تنگ سی جگہ خالی تھی۔ تین درخت ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ تھے۔ درمیان والے درخت کے ساتھ مریم یوں کھڑی تھی کہ اس کی پیٹھ تنے کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ ہاتھ پیٹھ پیچھے بندھے تھے اور ایک رسی اس کے ٹخنوں اور تنے کے گرد لپٹی ہوئی تھی۔ اسی طرح ساتھ والے درختوں کے ساتھ وہ دونوں آدمی بندھے ہوئے تھے جو رات مریم کے ساتھ تھے۔ ان کے سامنے اسرائیل سلجوقی ٹہل رہا تھا۔ تین تیر انداز کمانوں میں تیر ڈالے آٹھ دس قدم دور کھڑے تھے۔

"میں جانتا تھا تم دونوں یہودی ہو" — اسرائیل سلجوقی نے ان دونوں سے کہا — "اور تم مسلمانوں کو آپس میں لڑانے کے ماہر ہو۔ میں نے تمہارے سپرد یہ کام کیا تھا کہ دو چار لڑکیوں اور دو چار آدمیوں کو تیار کر دو جو سلطان محمود کی جڑیں کاٹیں مگر تم مجھے قتل کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ مجھے کسی نے بتایا تھا کہ یہودی سانپ ہیں جو اپنے مالک کو بھی ڈس لیتے ہیں .... اور اس ناگن کو دیکھو" اس نے اپنی بیوی مریم کی طرف اشارہ کر کے کہا — "بیک وقت دو آدمیوں کی بیوی بنی رہی۔ تم ملکہ بننا چاہتی تھیں نہ .... ایسی خواہش کہ تمہیں یہ بھی یاد نہ رہا کہ تمہارا خاوند کون ہے۔"

"میں تمہیں آخری بار کہہ رہی ہوں کہ سلطان محمود کے دھوکے میں نہ آنا" — مریم نے غصے سے چلا کر کہا۔

"آج تم جو کچھ بھی کہو گی آخری بار کہو گی" — اسرائیل نے کہا — "اور میں تمہیں آخری بار بتا دیتا ہوں کہ میں تمہارے دھوکے کے باوجود توغان خان کو اپنا دوست اور سلطان محمود کو اپنا دشمن سمجھوں گا اور ایک روز لوگ سلطنت غزنی کو بھول جائیں گے اور سلطنت سلجوق کو یاد کیا کریں گے" — اس نے گردن تان کر کہا — "میں سلطان محمود سے ایک خطہ لے لوں گا اور وہی خطہ غزنی کی فوج کا، سلطان محمود کا اور سلطنت غزنی کے عروج کا قبرستان بنے گا۔"

"تم جیسے جاہل اور گنوار قبائلی دو مردوں کے لیے قبر کھود کر اس میں خود دفن ہوا کرتے ہیں" ـــــ درخت سے بندھے ہوئے ایک یہودی نے کہا "سنو اسرائیل! تمہارا نام اسرائیل اس لیے ہے کہ تمہاری رگوں میں یہودی خون ہے۔ اس خون کی لاج رکھتے ہوئے میں تمہیں کام کی باتیں بتاتا ہوں تم نے ٹھیک کہا ہے کہ ہم دونوں یہودی ہیں اور ہم نے اپنے نام اور حلیے مسلمانوں جیسے رکھے ہوئے ہیں۔ ہم اسلام کے متعلق اتنا علم رکھتے ہیں جو تمہاری مسجدوں کے امام بھی نہیں رکھتے۔ ہم مسلمانوں کا ایمان خریدنے کے ماہر ہیں۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ ہماری باتیں تمہارے کسی آدمی نے سن لی تھیں اور ہم پکڑے گئے لیکن تم ہماری تعریف نہیں کرتے کہ ہم تمہیں تمہاری بیوی کے ہاتھوں قتل کرا رہے تھے ...... میں تمہیں صاف بتا دیتا ہوں کہ تمہارا انجام قریب آگیا ہے۔ تم سلطان محمود کو شکست نہیں دے سکتے۔ وہ ایمان کا پکا ہے۔ ہم وہیں کامیاب ہوتے ہیں جہاں ایمان کچا ہوتا ہے، اور جہاں ایمان کچا ہوتا ہے وہاں شکست لازمی ہوتی ہے۔ ہمیں مسلمانوں کے ایمان کی پختگی اور ناپختگی کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں۔ ہمارا کام ہے کہ جیسے ہو سکے کو آپس میں ٹکراتے رہیں۔ شکست سلجوقیوں کی ہوتی ہے مگر ہم انہیں یقین دلائے رکھتے ہیں کہ تم سب سے زیادہ پکے ہو"

"تم ذلیل یہودی ہو!" ـــــ اسرائیل نے دانت پیس کر کہا "مجھے طعنے دے رہے ہو؟" ـــــ اس نے ایک طرف ہٹ کر تیراندازوں کو اشارہ کیا۔

تین تیر بیک وقت کمانوں سے نکلے اور دونوں یہودیوں اور مریم کے سینوں میں اتر گئے۔

"اور تیر نہ چلانا" ـــــ اسرائیل سلجوقی نے کہا "انہیں یہیں بندھا رہنے دو۔ ان کی لاشیں گدھ اور بھیڑیے کھائیں گے"

دو چار مہینے ہی گزرے تھے کہ ہندوستان سے غزنی کی فوج کا ایک

آدمی آیا جو جاسوسی اور سراغ رسانی کے محکمے کا تھا۔ یہ سنایا جا چکا ہے کہ کالنجر کا مہاراجہ گنڈہ کسی پُراسرار خوف کے زیر اثر لڑے بغیر میدان چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ کسی بھی مورخ نے اُس کے بھاگ جانے کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں لکھی کہ اُس پر کوئی پُراسرار خوف طاری ہو گیا تھا۔ اس "پُراسرار خوف" کی وضاحت کسی بھی تحریر سے نہیں ملتی۔ بہرحال یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ سلطان محمود کو اتنی آسان فتح کبھی بھی حاصل نہیں ہوئی تھی۔

مہاراجہ گنڈہ کا اتحادی گوالیار کا مہاراجہ ارجن تھا۔ اُسے بھی بھاگنا پڑا تھا۔ سلطان محمود واپس غزنی چلا گیا تھا۔ اس کا ایک قلعہ دار ابوالقدر سلجوقی قنوج کے قلعے میں تھا۔ اُس نے اپنے جاسوس کالنجر اور گوالیار بھیج دیے تھے۔ انہوں نے ابوالقدر سلجوقی کو جو اطلاعات اور معلومات دی تھیں، وہ ایک جاسوس خود سلطان محمود کے پاس لایا تھا۔ یہ جاسوس اسی علاقے کا ایک مسلمان تھا۔ وہ ہندو رشی کے بہروپ میں کالنجر گیا تھا۔

"مہاراجہ گنڈہ کالنجر پہنچتے ہی ہوش میں آگیا تھا" ـــــ جاسوس نے سلطان محمود کو بتایا "وہ جب میدانِ جنگ سے بھاگا تھا تو میں فوراً ہی کالنجر چلا گیا تھا اور اُس بڑے مندر میں جا ڈیرے ڈالے تھے جس میں کبھی کبھی مہاراجہ گنڈہ عبادت کے لیے جایا کرتا ہے۔ اس کی راجدھانی بھی خوف سے کانپ رہی تھی۔ مندروں کے سنکھوں اور گھنٹوں نے ایسا واویلا بپا کیا تھا کہ سارا کالنجر ہراساں ہو گیا تھا۔ میں خود تو نہیں دیکھ سکا، مجھے بتایا گیا کہ مہاراجہ کو دو راتیں مندر میں رکھا گیا تھا ....

"میں نے ایک روز شہر کی ایک گلی میں ایک عورت کو اپنے مکان کی دہلیز پر بیٹھے بین کرتے دیکھا۔ میں چونکہ رشی کے بہروپ میں تھا، اس لیے میں نے اس عورت سے رونے کی وجہ پوچھی۔ اُس نے دانت پیس کر کہا کہ تم سنت سادھو ہو، میرا بچہ واپس لا دو۔ پتہ چلا کہ پنڈتوں نے اپنا حساب کتاب کر کے مہاراجہ گنڈہ کو بتایا تھا کہ تین ایسے بچوں کی قربانی دینی ہے جن کی عمریں چھ ماہ سے زیادہ نہ

ہوں۔ چنانچہ اُسی روز تین ماؤں کی گودیوں سے بچے اٹھا لیے گئے اور انہیں ذبح کرکے ان کا خون پانی میں ملا کر مہاراجہ گنڈہ کو اس میں نہلایا گیا۔ اس عورت نے مجھے کہا کہ میرے بچے کا خون کرنے والا اس دنیا میں سزا پائے گا....

"میں نے زیادہ وقت مندر میں گزارا۔ پنڈتوں کے ساتھ میرا دوستانہ ہو گیا۔ ان سے مجھے راج محل کی باتوں کا علم ہونے لگا... سلطان عزنیں دسم قند!"

"عابدین!" — سلطان محمود نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "یہ بھول جاؤ کہ میں کہاں کا سلطان ہوں، یا میں سلطان ہوں بھی یا نہیں۔ مجھے یوں ساری بات سناؤ جیسے اپنے کسی دوست کے ساتھ باتیں کیا کرتے ہو۔"

"میں کہہ رہا تھا کہ ہندوؤں کے مندروں کی دنیا کیسی پُراسرار ہے۔ ہم ایک سیدھے سادے مذہب کے لوگ وہاں جاکر گھبرا جاتے ہیں۔ عورت کا اس مذہب میں بہت دخل ہے۔ نوجوان لڑکیاں وہاں کی اندھیری غلام گردشوں میں یوں پھرتی ہیں جیسے ویرانوں میں چمگادڑ اڑتے پھرتے ہیں۔ میں مندر کی ایسی ہی ایک غلام گردش میں جا رہا تھا۔ کوئی میرے ساتھ ٹکرا گیا۔ وہ عورت تھی اور سسک رہی تھی۔ میرے ساتھ لپٹ گئی اور خوفزدگی سے کانپتی ہوئی سرگوشیاں کرنے لگی — 'مجھے بچا لو۔ میں مہاراجہ کے لیے نہیں مرنا چاہتی۔ مجھے اپنے گھر لے چلو۔ مجھے اپنے پاس رکھ لینا۔ میں مرنا نہیں چاہتی'....

"میں سمجھ گیا کہ یہ کسی کی نوجوان اور کنواری بیٹی ہے جسے پنڈت اس کی قربانی دینے کے لیے پکڑ لائے ہوں گے.... آپ مجھے مجرم کہیں گے لیکن سلطان عالی مقام! میں نے اپنا وہ فرض نظر انداز کر دیا جس کے لیے میں مندر میں ٹھہرا تھا۔ میں نے اسے اپنا فرض سمجھا کہ ایک انسانی جان کو ایک جھوٹے اور بے بنیاد مذہب پر قتل ہونے سے بچاؤں۔ یہ ایک نیکی تھی اور میرا عقیدہ ہے کہ نیکی کرو تو جزا ملتی ہے۔ میں نے اپنے اللہ کو پکارا اور عرض کی کہ خدائے ذوالجلال! زندگی اور موت تیرے اختیار میں ہے۔

یہاں انسان بُت بنا کر انسانوں کو ان کے لیے ذبح کر رہے ہیں۔ اگر میں یہ نیکی کر گزروں تو مجھے صرف یہ جزا عطا کر کہ جس مقصد کے لیے یہاں آیا ہوں وہ پورا ہو جائے....

"اُس تاریک غلام گردش میں مجھے امید کی کرن نظر آئی۔ لڑکی کہہ رہی تھی — 'مجھے لے چلو۔ جہاں جی چاہے لے چلو۔ یہاں سے لے چلو۔ یہاں سے نکال لو۔ میں بھاگ آئی ہوں۔ وہ مجھے ڈھونڈ رہے ہوں گے' — اُس کا جسم کانپ رہا تھا جیسے بے لباس ہو کر سرد پانی میں کھڑی ہو۔ مجھے تیز تیز قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے لڑکی سے کہا کہ وہ دل مضبوط کرے اور خاموش ہو جائے۔ اُسے اپنے بازو میں لے کر میں ایک طرف ہو گیا۔ وہاں سے دیوار کٹی ہوئی تھی جیسے غار بنا ہوا تھا۔ وہ ایک کمرہ سا تھا۔ باہر سے آواز آئی — 'یہاں دیکھ لو۔ جا کہاں سکتی ہے'....

"میں نے ریشیوں کا جو لباس پہن رکھا تھا اس کے اندر خنجر تھا جو میں نے نکال لیا۔ باہر شاید دو آدمی تھے۔ ایک وہیں اندر آ گیا جہاں میں لڑکی کو لے کر چھپا تھا۔ گُپ اندھیرا تھا۔ وہ مجھے دروازے میں جس کے کواڑ نہیں تھے، سیاہ بھوت کی طرح نظر آیا۔ بولا — 'اندر کون ہے' — وہ آگے آیا تو میں نے اُسے خنجر مارنے کی بجائے، پیچھے ہو کر اُس کی گردن دبوچ لی۔ باہر سے آواز آئی — 'ہے یا نہیں'؟ میں نے جواب دیا — 'نہیں ہے۔ تم باہر کو دوڑو' — مجھے باہر دوڑتے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ وہ جس کی گردن میرے ہاتھوں کے شکنجے میں آ گئی تھی، تھوڑی دیر تڑپ کر مر گیا....

"میں نے جلدی جلدی اُس کے کپڑے اتارے اور لڑکی کو پہنا دیئے۔ اُس کا چہرہ مسخ کرنا ضروری تھا۔ اُس کے بال کھلے ہوئے تھے۔ میں فرش کی مٹی پر ہاتھ پھیر پھیر کر اُس کے منہ اور بالوں پر ملتا رہا۔ ایک کپڑا اُس کے سر پر ڈال دیا۔ جسے میں نے مار دیا تھا، اُس کے گلے سے موٹے موتیوں کی مالا اتار کر لڑکی کے گلے میں ڈال دی اور اُسے باہر لے آیا۔ مجھے ان راستوں

کا علم تھا۔ میں اُسے روشن راستے میں لے گیا اور وہاں میں اُسے مندر کے ایسے ویران اور ہیبت ناک حصے میں لے گیا جہاں فرش پر نمی کی وجہ سے سبز کائی جمی ہوئی تھی۔ میں نے کائی پر ہاتھ پھیر کر لڑکی کے چہرے کا رنگ صدیوں پرانی دیواروں اور فرشوں جیسا کر دیا اور اُس کے بالوں میں مٹی ڈال کر اُسے سادھنی بنا دیا....

"وہ خوبصورت لڑکی تھی اور اس کی عمر چودہ پندرہ سال تھی۔ مندر کے اندر اور باہر اُس کی تلاش میں بھاگ دوڑ شروع ہو چکی تھی۔ پنڈت اور اُن کے چیلے گھبرائے گھبرائے اِدھر اُدھر دوڑتے پھر رہے تھے۔ وہ ہمارے قریب سے بھی گزرے۔ لڑکی کو کوئی بھی نہ پہچان سکا۔ میں اُسے مندر کے احاطے سے نکال کر شہر کے قریب ہی جنگل میں لے گیا۔ لڑکی نے بتایا کہ اُسے ایک دو روز بعد مندر میں ذبح کیا جانا تھا۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ اُس کے ماں باپ اُسے قربان دینے کے لیے بالکل تیار نہیں تھے۔ اس کا باپ گنڈہ کے دربار میں کسی اچھے رتبے پر تھا۔ اُسے ڈرا کر اور اُسے رتبے سے محروم کر دینے کی دھمکی دے کر لڑکی کو اُس سے لیا گیا تھا....

"میں نے شام کے بعد اُس کے گھر جا کر اُس کے باپ کو بتایا کہ اُس کی لڑکی جنگل میں ہے۔ وہ بہت ڈرا ہوا تھا۔ اُس نے بتایا کہ اُس کے گھر کی تلاشی ہو چکی ہے۔ باپ بہت پریشان تھا۔ کہتا تھا کہ وہ لڑکی کو اب اپنے گھر نہیں رکھ سکتا کیونکہ پکڑا جائے گا اور مہاراجہ اُسے بڑی اذیت ناک سزا دے گا۔ وہ اس پر حیران تھا کہ میں رشی تھا اور لڑکی کو قربانی سے بچا لایا تھا۔ میں نے اُسے بتا دیا کہ میں رشی نہیں ہوں۔ ابھی اُسے یہ نہیں بتایا تھا کہ میں کون ہوں۔ اُس نے رو کر کہا کہ اُس کی ایک بیٹی اور بھی ہے جس کی عمر سترہ سال ہے۔ اُس کے گھر کی تلاشی لینے والے اُسے کہہ گئے ہیں کہ تمہاری وہ بیٹی نہ ملی تو اس بیٹی کی قربانی دی جائے گی۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ پسند کرے تو

میں اُسے بھی محفوظ جگہ پہنچا سکتا ہوں....

"وہ سزا سے بھی ڈرتا تھا۔ بہرحال وہ تیار ہو گیا اور اُس نے پوچھا کہ اُسے کہاں پناہ مل سکتی ہے۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں اُسے قنوج کے قلعے میں لے جا سکتا ہوں۔ اُسے اپنی بیٹیوں سے بہت پیار تھا، حالانکہ ہندو اپنی جان بچانے کے لیے اپنی عورتوں کو چھوڑ کر بھاگ جایا کرتے ہیں۔ وہ مجھے انعام پیش کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ اپنا انعام بعد میں تم لوں گا....

"اُس کے خاندان کو میں نے چوری چھپے وہاں سے نکالا۔ وہ بہت بڑے رتبے کا آدمی تھا۔ اُس نے گھوڑا گاڑی کا انتظام کر لیا تھا۔ راستے میں ایک پڑاؤ کیا تو اُس نے بتایا کہ وہ بے شمار سونا اور نقدی ساتھ لایا ہے۔ میں نے اُسے کہا کہ مجھے ان چیزوں کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں۔ میں نے اُسے یہ بھی بتا دیا کہ میں مسلمان ہوں۔ تب اُسے بتایا کہ میرا مقصد کیا ہے۔ اُس نے خوش ہو کر کہا کہ وہ میرا مقصد پورا کر سکتا ہے، کیونکہ وہ مہاراجہ گنڈہ کے اندر کے راز جانتا ہے۔ اُس نے بتایا کہ مہاراجہ گنڈہ میدانِ جنگ سے ایک ایسا خوف لے کر بھاگ آیا تھا جس کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ تم چونکہ ہندوستان کے ہی رہنے والے ہو اس لیے تمہیں معلوم ہو گا کہ ہمارے بعض سادھو، سنیاسی، یوگی، جوگی اور پنڈت ایسا علم جانتے ہیں جس کا عمل کسی پر کیا جائے تو اُس کا دماغ کچھ عرصے کے لیے بے کار ہو جاتا ہے۔ یہ علم ہر کوئی حاصل نہیں کر سکتا۔ بعض یوگی ہمالیہ کی اُن بلندیوں پر چلے جاتے ہیں جہاں برف کبھی نہیں پگھلتی۔ یہ لوگ وہاں ننگے رہتے ہیں اور ایسی طاقت حاصل کر لیتے ہیں جو دُور بیٹھے دوسروں پر اثر کرتی ہے...

"مہاراجہ گنڈہ اتنا کمزور آدمی نہیں کہ اتنی زیادہ فوج کے ہوتے ہوئے بغیر لڑے بھاگ آتا۔ وہ جب بھاگ کر آیا تھا تو کالنجر کے لوگوں پر ایسی دہشت طاری ہو گئی تھی کہ لوگ گھروں سے بھاگ جانے کی تیاریاں

کرنے لگے تھے۔ افواہ پھیل گئی تھی کہ غزنی کی فوج کالنجر کی طرف آ رہی ہے۔ یک یوگی نے بتایا کہ مہاراجہ پر کسی نے عمل کر دیا ہے۔ اُس نے اس کا توڑ شروع کر دیا۔ اس کے لیے تین دودھ پیتے بچوں کو قربان کیا گیا۔ عمل کا اثر اُتر گیا۔ پھر یہ بھی پتہ چلا کہ یہ کس لے کیا تھا۔ یہ ایک رانی نے کرایا تھا جو اپنے بیٹے کو مہاراجہ کا جانشین بنانا چاہتی تھی لیکن مہاراجہ نے دوسری رانی کے بیٹے کو راجکمار بنا دیا۔ مہاراجہ نے اس رانی کو اور اُس کے بیٹے کو قتل کرا دیا ہے۔ رانی نے مہاراجہ سے کہا تھا کہ وہ اُسے قتل کر دے اُس کے بیٹے کو زندہ رہنے دے۔ مہاراجہ نے اُسے یہ شرط بتائی کہ وہ اُس یوگی کا سراغ دے دے جس نے اُس کے دماغ کو اور اُس کی فوج کو کیل دیا تھا....

”رانی نے بتا دیا۔ وہ یہی یوگی تھا جو اب اُس عمل کا توڑ کر رہا تھا۔ مہاراجہ وعدے سے پھر گیا۔ اُس نے رانی کو در پردہ قتل کرا کے اُس کے بیٹے کو بھی قتل کرا دیا ہے۔ جب یوگی نے عمل کا اثر ختم کر دیا تو مہاراجہ نے اُسے بھی قتل کرا دیا۔ پھر بڑے پنڈت مہارشی نے اُسے بتایا کہ اب ایک نوجوان کنواری کی قربانی ضروری ہے۔ اُس نے لڑکی کی کچھ نشانیاں بتائیں اور میری چھوٹی بیٹی کی نشاندہی کی کہ یہ ہے وہ لڑکی جو دیوتاؤں نے مانگی ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ اُس نے میری بیٹی کی نشاندہی کیوں کی ہے۔ اُس نے ایک بار مجھ سے بڑی بیٹی مانگی تھی۔ میں نے انکار کر دیا تھا۔ تم مسلمان ہو۔ تم نہیں جانتے کہ ہم دیوتاؤں کو ناراض کر دیں تو کچھ نہیں ہوتا۔ اگر پنڈت کو خفا کر دیں تو ہم پر آسمان ٹوٹ پڑتا ہے۔ ہمارا مذہب ہمارے پنڈت کا حکم اور خواہش ہے....

”پھر سلطانِ محترم! اُس نے مجھے بتایا کہ ہوش آتے ہی مہاراجہ گنڈہ نے اپنی فوج کو اکٹھا کیا اور بتایا کہ اُسے ایک یوگی نے کیل دیا تھا۔ اُس نے اپنی فوج سے کہا کہ مسلمان خوش ہوں گے کہ انہیں لڑے بغیر فتح ہوئی

ہے۔ اب میں انہیں پھر للکاروں گا اور وہ پہلے والی فتح کے نشے میں بدمست ہو کر آئیں گے اور تم انہیں ہلاک کرو گے، انہیں زندہ پکڑو گے اور یہاں ان گلیوں میں تم انہیں ٹٹوؤں اور گدھوں کی طرح اپنی گاڑیوں اور ہلوں کے آگے جوتو گے۔ ہر ہر مہادیو نے مجھے اشارہ دے دیا ہے کہ اب غزنی کے مسلمان یہاں تباہ ہونے کے لیے آئیں گے....

”اُس نے ایسے الفاظ کہے کہ فوج جوش سے بھر گئی۔ یہاں تک کہ جو جوان آدمی فوج میں نہیں تھے وہ بھی فوج میں شامل ہو گئے۔ پھر وہ گوالیار مہاراجہ ارجن کے پاس چلا گیا۔ بہت دنوں بعد واپس آیا تو اُس نے بتایا کہ گوالیار میں بھی وہ وہاں کی فوج اور وہاں کے لوگوں میں ایسی ہی آگ لگا آیا ہے۔ پھر وہ لاہور چلا گیا۔ وہاں سے اُسے یہ مایوسی ہوئی کہ مہاراجہ ترلوچن پال نے اُس کا اتحادی بن کر لڑنے سے انکار کر دیا لیکن اُسے اپنی بہت سی فوج اور سامان دے دیا ہے۔ مہاراجہ ترلوچن پال نے اسے مالی امداد دینے کا بھی وعدہ کیا ہے....

”سلطانِ عالی مقام! اس ہندو نے مجھے بتایا کہ لاہور کی فوج دوآبہ گنگا جمنا میں آ گئی ہے اور یہ کالنجر میں آ جائے گی۔ مہاراجہ گنڈہ نے کہا ہے کہ اب وہ غزنی کی فوج کو شکست دے کر سارے ہندوستان میں پھر جائے گا اور نہ کوئی مسجد کھڑی رہنے دے گا نہ کسی مسلمان کو زندہ چھوڑے گا....

”میں نے اُس سے پوچھا، کیا مہاراجہ گنڈہ بڑہانک رہا ہے یا وہ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ کر گزرنے کے قابل ہے؟ اُس نے جواب دیا کہ ہاں وہ اس قابل ہو گیا ہے۔ اُس نے یہاں تک ارادہ کر رکھا ہے کہ مہاراجہ ارجن کو ساتھ ملا کر لاہور پر بھی قبضہ کرے گا۔ غزنی کی فوج کے جو چند ایک دستے یہاں قنوج، باری، متھرا، نگرکوٹ، بھیرہ اور ملتان میں ہیں انہیں فوراً ختم کر دیا جائے گا۔ اب کے اُس کے ارادے بڑے خطرناک ہیں۔ اب تو عورتیں بھی لڑنے کی

تیاریاں کر رہی ہیں۔"

*

اس جاسوس نے جس کا نام عابدین تھا، سلطان کو بتایا کہ اس ہندو کو قنوج پہنچا دیا گیا اور اس کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا گیا۔ اُس نے سالار ابوالقدر سلجوقی کو سونا اور نقدی پیش کی اور کہا کہ اس کے عوض وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ اُس کی بیٹیوں کو پریشان نہ کیا جائے۔ اُس سے نہ کسی نے سونا لیا نہ نقدی، اور اس کی بیٹیوں کو باعزت طریقے سے رکھا گیا۔ اُس نے ایسا اثر قبول کیا کہ وہ اپنا مذہب چھوڑنے کے لیے تیار ہو گیا۔ قلعے کے امام نے اُسے اس کے تمام کنبے سمیت مسلمان کر لیا۔

"سلطانِ محترم!" — عابدین نے کہا — "ہم نے اُس کی ہر بات پر یقین نہ کیا، بلکہ اس کی بتائی ہوئی جگہوں پر جا کر دیکھا تو اس کی ہر بات صحیح نکلی۔ ہمارے جو آدمی گوالیار میں ہیں، انہوں نے بتایا کہ جنگی تیاریاں زوروں پر ہیں اور ہندوؤں کے ارادے یہ ہیں کہ سب سے پہلے غزنی کے اُن دستوں کو ختم کیا جائے گا جو مختلف جگہوں پر موجود ہیں۔ پھر سارے ملک میں مسلمانوں کے بچے بچے کو قتل کر دیا جائے گا۔ اگر کوئی مسلمان ہندو مت قبول کرے گا تو اُسے بھی زندہ نہیں چھوڑا جائے گا۔ اس کے بعد تمام ملک کی فوج غزنی کی طرف کوچ کرے گی۔ ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ لوگوں میں مسلمانوں کے خلاف نفرت پھیلائی جا رہی ہے۔ مندروں میں مسلمانوں کا ذکر پنڈتوں کی زبان سے یوں ہوتا ہے جیسے مسلمان کا قتل ثواب کا کام ہے۔"

"کیا تم بتا سکتے ہو کہ جنگی تیاریاں کس مرحلے میں ہیں؟" — سلطان محمود نے عابدین سے پوچھا — "کیا تم جنگی انداز سے بات کر سکتے ہو؟"

"یقیناً کر سکتا ہوں" — عابدین نے جواب دیا — "مہاراجوں کی تیاریاں تقریباً آخری مرحلے میں ہیں۔ جو نئے لوگ فوج میں شامل ہوئے ہیں وہ اچھے گھوڑ سوار ہیں، تیر اندازی اور تیغ زنی میں بھی اچھے ہیں لیکن ابھی کچے ہیں۔ ابھی وہ فوج کی شکل میں لڑنے کے قابل نہیں ہوئے۔ انہیں میدانِ جنگ کی سختیاں برداشت کرنے کی تربیت دی جا رہی ہے۔ سالار ابوالقدر سلجوقی اور دوسری جگہوں کے کمانداروں نے مجھے کہا تھا کہ میں آپ کو مشورہ دوں کہ آپ ذرا کوچ کر آئیں تو ہندوؤں کو سر اٹھانے سے پہلے دبوچا جا سکتا ہے۔ خطرہ یہ ہے کہ ہندو مسلمانوں کو فوراً ہی قتل کرنا شروع نہ کر دیں۔ ہم فوج کو مروا سکتے ہیں لیکن یہ ہماری برداشت سے باہر ہوگا کہ کسی نہتے مسلمان کا خون بہہ جائے۔ ہمیں یہاں مسجدوں اور مسلمانوں کی حفاظت کرنی ہے۔ اگر ہندوؤں نے مسلمانوں پر حملے شروع کر دیئے تو وہ مسلمان خواتین کو اُٹھا لے جائیں گے، پھر تاریخ تاقیامت ہم پر لعنت بھیجتی رہے گی۔"

"ہمیں اب لاہور میں اپنی حکومت قائم کرنی پڑے گی" — سلطان محمود نے کہا — "اور ہمیں بہت جلد کوچ کرنا پڑے گا۔"

*

سلطان محمود نے اپنے سالاروں کو کوچ کی وجہ بتائی اور فوری کوچ کے احکام دے کر کہا کہ کوچ بہت تیز ہوگا۔ پڑاؤ بہت کم ہوں گے۔ سوار اور سپاہی چلتے چلتے کچھ کھا لیا کریں گے اور منزل کا پنج ہوگی جہاں کے قلعے کا محاصرہ کر لیا جائے گا۔ محاصرے کے دوران فوج آرام کرے گی۔ سلطان محمود نے سب کو نقشے پر کوچ کا راستہ دکھایا اور وہ جگہیں بتائیں جہاں پڑاؤ کرنے تھے۔

ان سے فارغ ہوا ہی تھا کہ اسرائیل سلجوقی کا پیغام آ گیا۔ پیغام لانے والا کوئی ذمہ دار آدمی تھا۔ اُس نے اسرائیل کا پیغام زبانی دیا — "اگر سلطان میری طاقت سے خائف ہو کر سلجوقیوں کو وطن دے رہے ہیں تو میں ایسا وطن قبول کروں گا، اور اگر سلطان کو اپنی جنگی طاقت پر ناز ہے اور مجھے بھیک کے طور پر زمین کا خطہ دے رہے ہیں تو میں ایسا وطن قبول نہیں کروں گا۔ میں غزنی کی سلطنت کا طفیلی یا اتحادی بھی نہیں بنوں گا۔ میں اپنی قوم کے لیے خود ایک وطن حاصل کرنے کی طاقت رکھتا ہوں۔ مجھے سلطان کا جواب چاہیئے کہ آپ مجھ پر

کیوں مہربان ہو سئے ہیں۔ میں آپ کو پھر بتا دیتا ہوں کہ میرے پاس غزنی کی فوج کے ساتھ ٹکر لینے کے لیے کافی فوج ہے۔"

سلطان محمود کو ہنسی آگئی اور بولا۔ "اسرائیل سلجوقی میں جرأت بھی ہے اور طاقت بھی ہے لیکن اس میں عقل کی کمی ہے۔ اسے کہنا کہ نہ میں اسے کمزور سمجھتا ہوں نہ اپنے آپ کو۔ میں اس خطے میں امن قائم کرنا چاہتا ہوں ہماری آپس کی لڑائیوں سے کفار فائدہ اٹھا رہے ہیں ... اور اسرائیل سلجوقی کو میرا سلام دے کر کہنا کہ میں ہندوستان جا رہا ہوں۔ میری واپسی کا انتظار کرے۔ میں ان علاقوں میں اس کی حیثیت کو تسلیم کرتا ہوں۔ میری غیر حاضری میں کوئی الٹی حرکت نہ کرے۔"

مؤرخ لکھتے ہیں کہ سلطان محمود کو یہ خدشہ نظر آ رہا تھا کہ اس کی غیر حاضری میں اسرائیل سلجوقی غزنی پر حملہ کر دے گا۔ سلطان کو معلوم تھا کہ سلجوقیوں کی جنگی طاقت بہت زیادہ ہو گئی ہے اور وہ چھوٹے موٹے حکمرانوں سے تلوار کی نوک پر اپنی شرائط منوا سکتے ہیں چنانچہ سلطان محمود نے اسرائیل کے ایلچی کو سبز باغ دکھا کر بتایا کہ وہ سلجوقیوں کی ہر شرط مانے گا۔ ایلچی نے واپس جا کر اسرائیل کو یہی سبز باغ دکھائے۔ اسرائیل مطمئن ہو گیا اور اس نے کہا کہ وہ سلطان محمود کی واپسی کا انتظار کرے گا۔

*

یہ ۲۳-۱۰۲۲ عیسوی (۴۱۴ ہجری) کا واقعہ ہے کہ سلطان محمود غزنوی نے ایک بار پھر وہ برق رفتار پیش قدمی کی جس پر آج کے دور کے جنگی مبصر اور مؤرخ حیران ہیں۔ اگر وہ راستہ دیکھا جائے جس راستے سے وہ کالنجر پہنچا تھا تو یقین نہیں آتا کہ اس دور میں جب فوج گھوڑوں پر سوار ہوتی اور پیدل بھی چلتی تھی اتنی زیادہ رکاوٹیں عبور کر کے یہ فوج اتنی تیز رفتاری سے آئی تھی وہ کالنجر جانے کی بجائے پہلے گوالیار گیا جو مہاراجہ گنڈا کے ایک طاقتور اتحادی مہاراجہ ارجن کی راجدھانی تھی۔ غزنی سے گوالیار تک اسے کئی ایک

چھوٹے دریا عبور کرنے پڑے۔ صرف بڑے دریا گنے جائیں تو آٹھ بنتے ہیں۔ سندھ، جہلم، چناب، راوی، ستلج، گنگا، جمنا اور گمبل۔ دریائے گمبل گوالیار کے قریب سے گذرتا اور آگے جا کر جمنا میں شامل ہو جاتا ہے۔

گوالیار کا قلعہ آج بھی کھڑا ہے۔ یہ بڑی سخت چٹانوں پر تعمیر کیا گیا ہے اور اس دور میں اسے بجا طور پر ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا۔ مہاراجہ ارجن کو اس وقت پتہ چلا کہ غزنی کی فوج آگئی ہے جب یہ فوج قلعے کو محاصرے میں لے چکی تھی۔ سلطان محمود بڑے اچھے وقت پہنچا تھا۔ گوالیار اور کالنجر کی فوجوں کو اکٹھے ہو کر سلطان محمود کا مقابلہ کرنا تھا لیکن دونوں فوجیں ابھی اپنی اپنی راجدھانیوں میں تھیں اور لڑنے کے لیے تیار نہیں تھیں۔

سلطان محمود نے دیکھ لیا تھا کہ اس قلعے کو سر کرنا بہت ہی مشکل ہے۔ جن چٹانوں پر یہ قلعہ تھا ان پر پاؤں جما کر ٹھہرنا بہت مشکل تھا۔ اس کے باوجود سلطان محمود نے فوج کو حکم دیا کہ پوری بلند آواز سے نعرے لگائے جائیں اور قلعے پر ہلہ بول دیا جائے۔ قلعے کی دیواروں سے تیروں کا مینہ برس رہا تھا مگر غزنی کے سپاہی آگے بڑھ بڑھ کر دروازے توڑنے کی کوشش کرتے تھے۔ دو ہاتھیوں کو پہلو بہ پہلو جوت کر ان کے درمیان درختوں کے بہت بڑے بڑے تنے باندھے گئے۔ ہاتھی دوڑتے دروازے کی طرف جاتے اور تنوں کے اگلے سرے دروازے سے ٹکراتے مگر دروازے مضبوط تھے۔

تیر اندازوں نے آگے جا کر قلعے کی دیواروں کے اوپر تیر برسائے۔ تکبیر کے نعروں سے زمین و آسمان ہل رہے تھے۔ چار روز تک یہی کیفیت رہی پانچویں دن کا سورج طلوع ہوا تو قلعے پر سفید جھنڈا لہراتا نظر آیا۔ سلطان محمود نے حکم دے دیا کہ لڑائی بند کر دی جائے۔ قلعے کی دیواروں سے اب کوئی تیر نہیں آ رہا تھا۔ قلعے کا دروازہ کھلا اور ایک پالکی باہر آئی جسے چار آدمیوں نے کندھوں پر اٹھا رکھا تھا۔ یہ پالکی سلطان محمود کے سامنے اتاری گئی۔ اس میں سے ایک آدمی باہر آیا جو مہاراجہ کے دربار کا معلوم ہوتا تھا۔ وہ ایلچی تھا اور صلح کا پیغام

لایا تھا۔ وہ اپنے ساتھ تحفے کے طور پر تین سو ہاتھی لایا تھا۔ مہاراجہ ارجن کے اس ایلچی اور سلطان محمود کے درمیان ایک ترجمان کے ذریعے جو باتیں ہوئیں، وہ ایک دستاویز میں محفوظ ہیں۔ یہ شام کی قدیم زبان میں لکھی ہوئی ہے اور اس کا ترجمہ ڈاکٹر اے۔ ایس۔ ٹرائیٹون نے انگریزی میں کیا ہے۔ ڈاکٹر موصوف علی گڑھ یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر رہ چکے ہیں۔ اس کا ترجمہ یوں ہے:

"سلطان محمود غزنوی نے قلعے (گوالیار) پر ایسے طوفانی حملے بولے کہ چار روز بعد مہاراجہ (ارجن) کا ایک سفیر پالکی میں باہر آیا۔ پالکی چار آدمیوں نے اٹھا رکھی تھی۔ سفیر نے سلطان محمود سے پوچھا کہ آپ کیا چاہتے ہیں اور ہم پر حملے کا مقصد کیا ہے۔ سلطان نے کہا — 'میں مسلمان ہوں۔ میں آپ کو کافر سمجھ کر دعوت دیتا ہوں کہ بت پرستی ترک کر کے خدا کی عبادت کریں جس طرح ہم کرتے ہیں۔ آپ ہمارا شرعی قانون تسلیم کریں اور گائے کو پوجنے کی بجائے اس کا گوشت کھائیں'۔ — سفیر نے کہا — 'ہم گائے کا گوشت نہیں کھا سکتے۔ آپ اپنا کوئی عالم ہمارے پاس بھیجیں جو ہمیں بتائے کہ آپ کا مذہب کیسا ہے۔ اگر یہ ہمارے مذہب سے بہتر ہوا تو ہم اسے قبول کر لیں گے'۔ ....

"سلطان محمود نے فوج کے ایک امام کو قلعے میں بھیج دیا۔ شام کو امام مہاراجہ کا یہ جواب لے کر باہر آیا کہ ہم آپ کا مذہب قبول نہیں کر سکتے۔ ہم آپ کو تین سو ہاتھی اور کئی من چاندی پیش کرتے ہیں۔ آپ محاصرہ اٹھا لیں' — سلطان محمود نے پیغام بھیجا — 'مجھے منظور ہے لیکن اس شرط پر کہ آپ ہمارا لباس پہنیں اور ہماری طرح کمر کے ساتھ تلوار باندھیں اور ہندوستان کی رسم کے مطابق اپنے ایک ہاتھ کی سب سے چھوٹی انگلی کا اگلا سرا کاٹ کر میرے حوالے کر دیں تاکہ مجھے اعتبار آ جائے کہ آپ صلح چاہتے ہیں اور آئندہ میرے خلاف نہیں لڑیں گے'۔ ....

"سلطان محمود کا جو سفیر (نام نہیں لکھا) پیغام لے کر مہاراجہ ارجن کے پاس گیا، اُس کا بیان ہے — 'میں جب ہندوستان کے اس بادشاہ

(مہاراجہ ارجن) کے پاس گیا تو چاندی کے تخت پر ایک بڑا ہی خوبرو جوان بیٹھا تھا۔ اُس کے گہرے سانولے رنگ میں بھی حُسن تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ میں وہ لباس لایا ہوں جو آپ کو پہننا ہے اور اپنی انگلی کاٹنی ہے۔ اُس نے مجھے کہا کہ اپنے سلطان سے کہہ دینا کہ میں نے آپ کا بھیجا ہُوا لباس پہن کر انگلی کاٹی ہے۔ میں نے اُسے کہا کہ میں اپنے سلطان کو دھوکہ نہیں دوں گا۔ آپ کو ہمارا لباس پہننا پڑے گا ....

"اُس نے بادلِ نخواستہ ہمارا لباس پہن لیا اور کمر کے ساتھ ہماری تلوار باندھ لی۔ مجھے اُس کی بے بسی پر ترس آ گیا۔ میں اُسے کہنا نہیں چاہتا تھا کہ وہ اپنی انگلی کاٹے۔ اُس نے خود ہی ایک ملازم سے کہا کہ اُسترا لے آؤ۔ اُسترا آیا تو اُس نے اس سے اپنے بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی کے تین حصوں میں سے اُوپر والا حصہ بڑے اطمینان سے کاٹ دیا۔ میں نے اُس کے چہرے پر درد کا ہلکا سا تاثر بھی نہ دیکھا۔ اُس نے کٹی ہوئی انگلی ایک دوائی میں ڈال دی پھر اس پر ایک سفوف چھڑک کر پٹی باندھ دی۔ اُس نے انگلی کا کٹا ہُوا حصہ ایک کپڑے میں لپیٹ کر مجھے دے دیا اور رسم کے مطابق اُس نے مجھے بیش قیمت کپڑے، چاندی اور دو گھوڑے دیئے۔"

اُس وقت کے ایک اور مؤرخ سبطِ ابن الجوزی نے یہی واقعہ لکھا ہے اور اس نے یہ اضافہ کیا ہے کہ سلطان محمود کے پاس کٹی ہوئی انگلیوں کے بہت سے ٹکڑے تھے۔ یہ ہندو مہاراجوں کی رسم تھی کہ جس سے شکست کھاتے اُسے اپنی چھوٹی انگلی کا اُوپر والا حصہ کاٹ کر دے دیتے تھے۔

*

سلطان محمود نے مہاراجہ ارجن کو اپنے تابع کر کے کالنجر کا رُخ کیا۔ کالنجر کا قلعہ بہت وسیع و عریض تھا۔ اس کے اندر کی آبادی پانچ لاکھ سے زیادہ تھی۔ بیس ہزار مویشی اور پانچ سو ہاتھی تھے۔ سلطان محمود نے اس قلعے کا محاصرہ اس طرح کیا کہ قلعے کے اندر جانے والے تمام راستے بند کر دیئے۔

یہ دراصل مضبوط دیواروں کے اندر بہت بڑا شہر تھا۔ سلطان نے مہاراجہ گنڈہ کے لیے پیغام بھیجا جو قلعے کے صدر دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر قاصد نے بلند آواز سے دیا:

"ہم آپ کو خبردار کرتے ہیں کہ قلعے کے اندر ہم کسی کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ اپنی مخلوق کا قتلِ عام نہ کرائیں۔ ہم آپ کو دعوت دیتے ہیں کہ اسلام قبول کر لیں یا ہماری شرائط پر تاوان اور جزیہ ادا کریں۔"

پہلے چند دن مہاراجہ گنڈہ ڈٹا رہا مگر سلطان محمود کی فوج نے ہلہ بولا تو مہاراجہ نے صلح کی خواہش ظاہر کر دی لیکن اسلام قبول نہ کیا۔ وہ سالانہ رقم مقرر کر کے غزنی کا باجگزار ہو گیا اور اُس نے تین سو ہاتھی پیش کیے۔ سلطان محمود نے گنڈہ کو بھی غزنی کا لباس بھیجا کہ وہ پہن کر اپنی چھوٹی انگلی کاٹ دے۔ گنڈہ نے یہ شرط قبول کر لی اور اپنی انگلی کاٹ کر بھیج دی۔

یہاں مہاراجہ گنڈہ نے سلطان محمود کے ساتھ ایک مذاق کیا۔ مورخ لکھتے ہیں کہ گنڈہ نے تین سو ہاتھی مہاوتوں کے بغیر قلعے سے نکالے اور سلطان کو پیغام بھیجا کہ اگر آپ کی فوج اتنی بہادر ہے تو ان ہاتھیوں کو پکڑے۔ سلطان محمود مان گیا۔ ہاتھی باہر آئے تو وہ بدمستی میں چیختے چنگھاڑتے اِدھر اُدھر بھاگنے دوڑنے لگے۔ معلوم ہوا کہ ان ہاتھیوں کو کوئی نشہ پلایا گیا ہے جس سے یہ مستی میں آ گئے ہیں۔ ان تین سو ہاتھیوں نے غزنی کی فوج میں قیامت بپا کر دی۔ سلطان محمود نے حکم دیا کہ بہترین گھوڑسوار ان ہاتھیوں کو خیمہ گاہ سے نکالیں یا انہیں تیروں اور برچھیوں سے ہلاک کر دیں۔

سلطان محمود کی فوج میں ایک تاتاری دستہ بھی تھا (بعض مورخوں نے اسے ترک دستہ کہا ہے)۔ اُنہوں نے للکار کر کہا کہ ہم ہندوؤں پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتے کہ ہم ان کے ہاتھی پکڑ نہیں سکتے۔ چنانچہ بہت سے تاتاری (یا ترک) گھوڑوں پر سوار ہوئے اور بڑی ہی مشکل اور غیر معمولی دلیری سے انہوں نے تمام ہاتھیوں پر قابو پا لیا۔ قلعے کی دیواروں سے ہندوؤں نے داد و تحسین کے نعرے

بلند کیے۔

مہاراجہ گنڈہ سے ہتھیار ڈلوا کر سلطان لاہور پہنچا۔ وہاں کا مہاراجہ ترلوچن پال وہاں سے بھاگ کر اجمیر چلا گیا۔ سلطان محمود نے لاہور میں اپنی حکومت قائم کر دی اور لاہور میں اپنا پہلا گورنر مقرر کیا۔ یہ تھا ایاز جسے سلطان محمود اس لیے بہت چاہتا تھا کہ اُس میں غیر معمولی ذہانت تھی اور سلطان اس کے تدبر سے بہت متاثر تھا۔

سلطان محمود لاہور میں بہت سی فوج چھوڑ کر مارچ، اپریل ۱۰۲۳ء میں غزنی واپس چلا گیا جہاں اسرائیل سلجوقی اُس کی سلطنت کے لیے تشویشناک خطرہ بن چکا تھا۔

سومنات کے دروازے پر

لاہور میں سلطنتِ غزنی کا پہلا گورنر مقرر کر کے جب سلطان محمود غزنوی غزنی پہنچا تو وہ اُس طرح مسرور اور مطمئن نہیں تھا جس طرح وہ ہندوستان پر ہر حملے کے بعد ہُوا کرتا تھا، حالانکہ اب کے اُس نے ہندوستان کے وسط میں جا کر وہاں کے تین بڑے ہی طاقتور مہاراجوں کو شکست دی اور اُس نے اپنے بدترین دشمن مہاراجہ لاہور کی قسمت سربمہر کر کے وہاں اپنا گورنر مقرر کر دیا تھا۔ اس کی یہ کامیابی غیر معمولی تھی مگر وہ خوش نظر نہیں آتا تھا۔

اُس کے دستِ راست، تاریخ ساز سالار ابو عبداللہ محمد الطائیؒ نے اُسے چند دن دیکھا، آخر ایک روز پوچھا کہ وہ کیوں پریشان سا لگ رہا ہے۔ سلطان نے ہلکی سی مسکراہٹ سے وجہ بتائی۔ اُس کی عمر پچپن برس ہو چکی تھی جسے وہ بڑھاپے کی عمر نہیں سمجھتا تھا لیکن وہ جسم میں کمزوری سی محسوس کرنے لگا تھا۔ تھکن بھی جلدی ہو جاتی تھی۔

سالار ابو عبداللہ نے اُسی وقت سلطان کے ذاتی طبیب کو بُلایا۔ طبیب نے سلطان کی نبض دیکھی۔ کچھ پُوچھا۔ دل کی دھڑکن محسوس کی اور کہا کہ طویل آرام کی ضرورت ہے۔ اعصاب بہت تھک گئے ہیں۔ جسم میں بیماریوں کے خلاف مدافعت کی صلاحیت کمزور ہو گئی ہے۔ اگر سلطان نے اعصاب کو آرام نہ دیا تو کسی وقت کوئی معمولی سی بیماری بھی جاں لیوا ثابت ہو سکتی ہے۔

"میں آرام کی حالت میں نہیں مرنا چاہتا"۔ سلطان محمود نے کہا "موت سے میری ملاقات بستر پر نہیں ہونی چاہئے۔ میں اپنے جسم کو آرام نہیں دے سکتا۔ جسم کو خاک میں مل جانا ہے۔ اس کی طاقت کم ہوگئی تو میں رُوح کی قوّت سے وہ فرض ادا کروں گا جو خدائے ذوالجلال نے مجھے سونپا ہے۔ شیخ الاسفندرا مجھے یہ بتائیے کہ میری روح تو علیل نہیں؟"

"نہیں"۔ طبیب شیخ الاسفند نے جواب دیا۔ "میں آپ کو صحیح بات بتا دیتا ہوں۔ میں نے آپ کو آپ کی جسمانی کمزوری بہت کم بتائی ہے۔ آپ کا جسم کوچ، محاصروں اور جنگ کے قابل نہیں رہا۔ آپ روحانی قوّت سے لڑ رہے ہیں۔"

"میرے پیر و مُرشد شیخ ابوالحسن خرقانی اسے ایمان کی قوّت کہا کرتے ہیں"۔ سلطان محمود نے کہا۔ "جسم اتنا ہی کمزور ہوتا ہے جتنا انسان سمجھتا ہے۔ کمزوری اور درد ایک احساس کے دو نام ہیں۔ آپ درد کو جتنا شدید سمجھنا چاہتے ہیں درد اتنا ہی شدید ہوگا۔ محترم شیخ! میں آپ کو نہیں بلانا چاہتا تھا۔ ابو عبداللہ نے آپ کو میرے لیے بلایا ہے۔"

"آپ نے جسمانی کمزوری کا ذکر کیا تھا اس لیے میں نے انہیں بلانا ضروری سمجھا"۔ ابو عبداللہ نے کہا۔ "جسمانی کمزوری اچھی نہیں ہوتی"۔

"میں کچھ اور محسوس کر رہا ہوں"۔ سلطان محمود نے کہا۔ "مجھے ایک آخری مہم سَر کرنی ہے۔ مجھے اپنی روح سے اشارے مل رہے ہیں کہ مجھے جو کچھ کرنا ہے جلدی جلدی کر لوں۔ ہندوستان کے بُت مجھے راتوں کو للکارتے ہیں۔ ڈرتا ہوں کہ اپنا فرض مکمل کرنے سے پہلے دُنیا سے اُٹھ جاؤں گا۔ مجھے فوجی طاقت چاہئے۔ ہماری طاقت بکھری ہوئی ہے۔ مجھے ان سرداروں، امیروں اور حکمرانوں کو متحد کرنا ہے جو میری غیر حاضری میں غزنی کے لیے خطرہ بن جاتے ہیں۔ مجھے محسوس ہونے لگا ہے کہ میری عمر تھوڑی رہ گئی ہے اور میں اپنا فرض ادا نہیں کر سکا۔"

سالار ابو عبداللہ محمد الطائیؒ نے سلطان محمود کو جذبات سے نکال لیا اور دونوں

اس مسئلے پر بات چیت کرنے لگے کہ فوجی طاقت میں کس طرح اضافہ کیا جائے اور سلطنتِ غزنی جن مخالفین میں گھری ہوئی ہے، ان کی سرکوبی کس طرح کی جائے۔ آخر دونوں اس فیصلے پر متفق ہو گئے کہ فوجی طاقت کی نمائش کی جائے اور ان پڑوسیوں کو مجبور کیا جائے کہ وہ غزنی کی اطاعت قبول کریں۔ ... سب سے زیادہ خطرہ اسرائیل سلجوقی کی طرف سے تھا جو ایک جنگی طاقت بن چکا تھا۔

*

۱۰۲۴ء کے اوائل میں ایک روز سلطان محمود ایک ایسی فوج کے ساتھ بلخ کی طرف جا رہا تھا جس کے نیچے زمین کانپ رہی تھی۔ اس فوج میں کوئی ایک بھی سپاہی پیادہ نہیں تھا۔ سب گھوڑ سوار تھے اور ان کی تعداد ۵۴ ہزار تھی اور اس سوار فوج کے ساتھ ۱۳۰۰ جنگی ہاتھی تھے۔ یہ فوج خوبصورت لگتی تھی لیکن دشمن پر دہشت طاری کرتی تھی۔ یہ اُس فوج کے علاوہ تھی جو سلطنتِ غزنی کے بڑے بڑے شہروں، اہم چوکیوں اور سرحدوں پر موجود تھی۔

اس سوار فوج کے آگے آگے ایلچی جا رہے تھے۔ راستے میں جو چھوٹی چھوٹی ریاستیں آتی تھیں، سلطان کے ایلچی اُن کے امراء کے پاس جا کر سلطان محمود کا یہ پیغام دیتے تھے کہ سلطانِ غزنی چوّن ہزار گھوڑ سوار اور تیرہ سو جنگی ہاتھیوں کے ساتھ آ رہا ہے۔ اگر آپ اللہ کے نام پر کفار کے خلاف جدوجہد کی خاطر غزنی کی اطاعت قبول کر کے غزنی کے ساتھ دوستی کا معاہدہ کر لیں تو آپ کی ریاست اور جاگیر قائم رہے گی ورنہ آپ غزنی کے قیدی ہوں گے اور آپ کے ساتھ وہ سلوک کیا جائے گا جو سلطانِ غزنی مناسب سمجھے گا۔

تمام مورخین نے لکھا ہے کہ اتنی ہیبت ناک جنگی قوت دیکھ کر چھوٹے موٹے امرا اور والی بیش قیمت تحفے لے کر سلطان محمود کے استقبال کو آ گئے۔ اُس نے اُن کے تحفے اور دوستی کو قبول کر کے انہیں کہا کہ وہ انہیں دریائے جیحون کے پار کسی جگہ ایک ضیافت میں مدعو کرے گا اور وہاں بتلائے گا کہ اس کا ارادہ کیا ہے اور وہ کیا چاہتا ہے۔

سلطان دریا پار کر گیا۔ خوتون کا حکمران قدر خان مشہور جنگجو اور غزنی کا طاقتور دشمن تھا۔ اُس کے پاس جب سلطان محمود کے ایلچی پہنچے تو اُس نے بلا حیل و حجت سلطان کی اطاعت قبول کر لی اور تحفوں سے لدے ہوئے اونٹ لے کر سلطان کے استقبال کو آ گیا۔ سلطان نے وہیں جہاں اسے قدر خان ملا تھا، فوج کو خیمہ زن کر دیا۔ وہ سرسبز اور حسین خطہ تھا۔ سلطان نے اردگرد کے تمام اُمراء، والیان اور حکمرانوں کو وہاں مدعو کیا۔ سلطان کو جن کی طرف سے زیادہ خطرہ تھا وہ بلخ کا حکمران التگین تھا اور دوسرا اسرائیل سلجوقی۔ دونوں مل کر سلطان سے لڑ چکے تھے اور انہوں نے شکست کھائی تھی۔

اسرائیل سلجوقی کے متعلق پہلے بتایا جا چکا ہے کہ وہ سلجوقیوں کا بے تاج بادشاہ تھا۔ سلجوقیوں کا کوئی ملک نہیں تھا لیکن ہر حکمران ان سے خائف تھا کیونکہ سلجوقی زبردست جنگجو تھے۔ وہ پہاڑوں اور جنگلوں میں رہتے تھے۔ وہ ایک باقاعدہ جنگی طاقت بن گئے تھے۔ سلطان محمود ہندوستان کے مہاراجہ گنڈہ اور مہاراجہ ارجن کو شکست دینے اور انہیں اپنی اطاعت میں لانے کے لیے گیا تو اسرائیل اور التگین نے اُس کے خلاف جنگی تیاریاں مکمل کر لی تھیں۔ سلطان نے ان دونوں کی طرف ایلچی بھیجے اور انہیں ضیافت پر مدعو کیا۔

جب ایلچی نے التگین کو سلطان کا پیغام دیا تو اُس نے طنزیہ انداز میں پیغام سُنا۔ اس کے ساتھ اس کی ملکہ بیٹھی تھی۔

"کیا تمہارے سلطان نے درخواست کی ہے کہ ہم اُس کی دعوت قبول کریں؟" ——ملکہ نے پوچھا۔

"ملکہ عالیہ!" —— ایلچی نے کہا۔ "سلطانِ غزنی نے والیٔ بلخ و سمرقند التگین کو ضیافت میں مدعو کیا ہے۔ انہوں نے آپ کا ذکر نہیں کیا تھا۔"

"تمہارے سلطان کے ارادے کیا ہیں؟" —— التگین نے پوچھا۔

"جو سلطان چوّن ہزار بہترین گھوڑ سوار اور ایک ہزار تین سو جنگی ہاتھی جن کے ہودوں سے برچھیاں اور تیر برستے ہیں، اپنے ساتھ لایا ہے، اُس کے ارادے

سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہونی چاہیے“۔ ایلچی نے کہا۔ ”آپ کا عزیز دوست
قدر خان سلطان کی اطاعت قبول کر چکا ہے۔ میں یہ امید لے کر آیا ہوں کہ آپ
اپنی فوج کا قتلِ عام نہیں کرائیں گے۔“

”قدر خان بزدل ہے“۔ حسین ملکہ نے کہا۔ ”تمہارے سلطان کا مقابلہ ایک
طاقتور بادشاہ کے ساتھ ہے۔“

”ملکہ عالیہ!“۔ ایلچی نے کہا۔ ”یہ عورتوں کی لڑائی نہیں۔ میں بلخ و سمرقند کے
بادشاہ سے مخاطب ہوں۔ مجھے حکم ملا ہے کہ جواب لے کر آؤں کہ آپ سلطان کی دعوت
قبول کرتے ہیں یا نہیں۔“

”ہم آئیں گے“۔ ایلتگین نے دو ٹوک لہجے میں جواب دیا۔ ”لیکن ہم یہ
فیصلہ کر کے نہیں آئیں گے کہ ہم غزنی کی اطاعت قبول کرتے ہیں یا نہیں۔“

اور وہ سلطان محمود غزنوی کی ضیافت میں آ گیا۔ اس کے ساتھ اُس کی ملکہ نہیں
تھی۔ وہ چند ایک محافظوں کو اپنے ساتھ لایا تھا۔ محمود غزنوی نے نہایت خوبصورت
جنگل میں ضیافت کا انتظام کیا تھا۔ ضیافت کے بعد سلطان نے سب کو الگ بٹھا لیا۔
اُس کے ساتھ اُس کے سالار تھے اور اُس کے ساتھ اس کا ایک اور مشہور
سالار ارسلان جاذب بھی تھا جو اُس وقت خوارزم کا گورنر تھا۔ وہ دو ٹوک فیصلہ
کرنے والا اور دشمن کے خلاف انتہائی قدم اٹھانے والا سالار تھا۔ اُس کا
اصول تھا کہ دشمن پر رحم کرنا اپنے آپ کو شکست کے راستے پر ڈال لینے کے مترادف
ہوتا ہے۔

”میرے دوستو!“۔ دو مؤرخین، سبط ابن الجوزی اور ابن الاثیر کے مطابق
سلطان محمود نے ان سب سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ سب نے میری
جنگی طاقت دیکھ لی ہے۔ میں تیرہ سو ہاتھی لایا ہوں۔ بارہ سو غزنی میں ہیں۔
گھوڑ سواروں کا یہ لشکر اُس کا نصف ہے جو میں نے اپنی سلطنت میں جگہ جگہ رکھا
ہوا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ میں پیادہ فوج ساتھ نہیں لایا۔ کیا یہ فوج آپ سب
کو تہ تیغ کرنے کے لیے کافی نہیں؟ لیکن میں آپ کو اپنی جنگی طاقت سے نہیں

خدا سے ٹکرانے آیا ہوں۔ خدا نے مجھے یہ طاقت صرف اس لیے دی ہے کہ میں اُس کی
راہ میں جہاد کر رہا ہوں۔ آپ مجھے ہندوستان کا لٹیرا اور دولت کا پجاری کہتے ہیں۔
اگر میں ایسا ہی ہوتا تو میرے پاس اتنی دولت اور اس قدر سونا ہے کہ میں باقی عمر آرام
سے عیش و عشرت میں گزار سکتا ہوں اور میری تین نسلیں بھی عیش کر سکتی ہیں مگر میں دیکھ
رہا ہوں کہ میرا جہاد مکمل نہیں ہوا۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ میری ساری عمر کوچ اور
جنگ کرتے گزری ہے اور میں محل میں نہیں میدانِ جنگ میں مرنا چاہتا ہوں۔ میرے
خزانے یہیں رہ جائیں گے اور میری لاش ہندوستان کی مٹی میں مل جائے گی....

”آپ سب میرے خلاف ہیں لیکن آپ کا آپس میں بھی اتحاد نہیں۔ آپ حکمرانی
کے شیدائی ہیں۔ کیا آپ چین کی زندگی بسر کر رہے ہیں، اسی لیے آپ سب کے دلوں پر
خوف طاری رہتا ہے۔ آپ نے اللہ کے بندوں کو اپنی رعایا اور اپنا غلام بنا رکھا ہے۔
محترم ایلتگین والیٔ بلخ و سمرقند ہم میں موجود ہیں۔ میں سُن رہا ہوں کہ یہ اپنی رعایا پر
ظلم و تشدد کرتے ہیں اور کوئی ایک بھی انسان ان سے خوش نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ
حکمرانی دل کو تسکین اور دماغ کو نشہ دیتی ہے۔ آپ میں کچھ ایسے بھی ہیں جو مذہب کا
دھوکہ دے کر حکومت کر رہے ہیں۔ ایسے حکمران اپنی رعایا کے سامنے اپنے الفاظ
میں زاہد اور پارسا بنے رہتے ہیں لیکن وہ بھول رہے ہیں کہ اُن کے اوپر ایک
طاقت ہے جو صرف اُن کا نہیں، ساری دُنیا کا تختہ اُلٹ سکتی ہے۔ یہ دُنیا اُسی
طاقت کے حکم سے وجود میں آئی ہے۔ رعایا پر ظلم، رعایا کو انسان نہ سمجھنا، خدا کے
بندوں کو خدا کے سچے مذہب کا دھوکہ دینا ایسے گناہ ہیں جو خدا معاف نہیں کرتا
.... اور آج خدا نے مجھے آپ کے سر پر بھیج دیا ہے....

”میں آپ کو بڑے صاف الفاظ میں بتاتا ہوں کہ میں آپ کو اپنا غلام بنانے
نہیں آیا۔ میں آپ کی زمینوں پر قبضہ کرنے نہیں آیا۔ میں آپ کو یہ بتانے آیا
ہوں کہ یہ زمین اللہ کی ہے اور اس زمین پر ہر انسان کا خواہ وہ کتنا ہی ادنیٰ
ہے، اتنا ہی حق ہے جتنا ایک بادشاہ کا، ایک سلطان کا اور ایک امیر کا ہے۔ میں
آپ کو اسلام کے نام پر متحد کرنے آیا ہوں۔ میں آپ میں سے کسی کو بھی میدانِ جنگ

میں نہیں لے جاؤں گا۔ یہ فرض میں اپنے ذمے رکھتا ہوں۔ مجھے ہندوستان کو اسلامی سلطنت بنانا ہے۔ ہندوستان مسلمانوں کا ہے۔ ہندوستان اُن شہیدوں کا ہے جو محمد بن قاسم کے ساتھ نعرے لگاتے آئے تھے اور شہید ہو گئے۔ آج اُن کی ہڈیوں کی خاک پر بُت خانے تعمیر ہو گئے ہیں۔ وہاں مسجدیں ویران ہو گئی ہیں۔ وہاں اسلام کی بیٹیوں کی عصمتیں لُٹ رہی ہیں۔ وہاں اسلام کا چراغ ٹمٹما رہا ہے ...

"میرے بھائیو! میں ایک عقیدے کی جنگ لڑ رہا ہوں۔ ذرا دُور آگے مستقبل میں جھانکیں۔ اگر ہم نے ہندو کا ڈنک پوری طرح نہ مارا اور اس باطل مذہب کو جڑوں سے نہ اکھاڑا تو ہندوستان مسلمانوں کا مذبح خانہ بنا رہے گا۔ وہاں کی مسجدیں اصطبل بن جائیں گی ....

"آپ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ آج تک آپ نے اپنے کان، اپنی آنکھیں اور اپنے دماغ بند رکھے۔ آج میں انہیں کھولنے آیا ہوں۔ آپ کے سامنے دو راستے ہیں۔ ایک یہ کہ آپ سب اپنی اپنی فوج کا نصف حصہ مجھے دے دیں جو مجھے ہندوستان لے جانا ہے اور آپ سب ایک عہد نامہ کریں کہ آپ میری غیر حاضری میں غزنی کے خلاف ہتھیار نہیں اٹھائیں گے بلکہ غزنی کی پاسبانی کریں گے۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ میں آپ سب کو گرفتار کر لوں اور آپ کی ریاستوں اور جاگیروں کو اپنے قبضے میں لے لوں۔ خدائے ذوالجلال نے مجھے اتنی طاقت دی ہے کہ میں اپنا یہ ارادہ پورا کر سکتا ہوں۔"

سلطان محمود خاموش ہو گیا اور اُس کی نظریں سب پر گھومنے لگیں۔ "جس کسی کو میری شرط منظور نہیں وہ ہاتھ کھڑا کر دے" ــــ سلطان محمود نے کہا۔

کسی ایک نے بھی ہاتھ نہ اٹھایا۔ سلطان محمود نے سب کو خراجِ تحسین پیش کیا اور کہا کہ کل عہد نامہ تحریر ہو گا اور ہر ایک کی اس پر مہر لگوائی جائے گی۔

*

اگلی صبح سلطان محمود نے نماز سے فارغ ہوتے ہی عہد نامہ تحریر کرایا اور سب کو بلایا۔ اُسے اطلاع دی گئی کہ سمرقند و بلخ کا حکمران ایلگتگین غیر حاضر ہے۔ ذرا سا سراغ

یہ ملا کہ سحر کی تاریکی میں چند گھوڑسوار فلاں سمت جاتے دیکھے گئے تھے۔ سلطان کے حکم سے سوار دوڑا دیئے گئے جنہوں نے اُسے راستے میں جا لیا۔ اُس کے ساتھ محافظ تھے۔ اُس نے محافظوں کو مقابلے کا حکم دیا لیکن غزنی کے سواروں کی تعداد زیادہ تھی۔ ان کی للکار پر محافظوں نے مقابلے کی جرأت نہ کی۔ ایلگتگین کو واپس لے آئے اور سلطان کے سامنے لا کھڑا کیا۔

"کیا تم خدا کی گرفت سے بھاگ سکتے ہو؟" ــ سلطان محمود نے کہا۔ "میں اپنی اطاعت کا نہیں خدا کی اطاعت کا پیغام لے کر آیا تھا۔ تمہارے بھاگنے کا سبب کیا ہے؟"

"میں غزنی کی اطاعت قبول نہیں کروں گا" ــ ایلگتگین نے جواب دیا۔

سلطان محمود نے حکم دیا ــ "اسے اسی وقت زنجیروں میں باندھ کر ہندوستان بھیج دو اور ملتان کے قلعے میں قید کر دو۔ یہ باقی عمر وہیں گزارے گا۔"

اُس کی باقی عمر ملتان کے قلعے کی ایک کوٹھڑی میں گزری۔

باقی سب نے عہد نامے پر دستخط کر دیئے۔ سلطان محمود ابھی اِدھر سے فارغ ہوا ہی تھا کہ اُسے اطلاع دی گئی کہ اسرائیل سلجوقی آگیا ہے۔ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، وہ سلجوقیوں کا بے تاج بادشاہ تھا۔ اُس کا کوئی ملک نہیں تھا لیکن چھوٹی چھوٹی ریاستوں پر اُس کی دہشت طاری تھی۔ اُس کی فوج کرائے پر لی جاتی تھی۔ سلجوقیوں کے علاوہ کئی اور خانہ بدوش اور جنگلوں میں رہنے والے قبائل اُس کے ساتھ جا ملے تھے۔ اس طرح اُس کے لشکر کی تعداد لاکھوں ہو گئی تھی۔ یہ ساری تعداد جنگجو تھی اور بے حد دلیر۔

اسرائیل سلطان محمود کو اپنی وفاداری پیش کرنے آیا تھا۔ وہ ایک بار سلطان محمود سے شکست کھا چکا تھا اور اُس کی ایک بڑی ہی تباہ کن زمین دوز کارروائی ناکام ہو چکی تھی۔ اُس نے دیکھ لیا تھا کہ سلطان محمود اب جو جنگی طاقت لایا ہے، اس کا وہ مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ سلطان محمود کی جنگی چالوں اور اس کی فوج کے قہر سے وہ پہلے ہی واقف تھا۔ وہ آیا تو وفاداری پیش کرنے تھا لیکن اُس دَور کی کتاب "طبقاتِ ناصری" میں لکھا ہے:

"وہ (اسرائیل) ترکمانیوں کے ایک دستے کے آگے آگے آ رہا تھا۔ اُس نے اپنے سر پر ٹوپی ٹیڑھی رکھی ہوئی تھی جو اُس کی رعونت اور شجاعت کا اظہار کرتی تھی اور اُس کی گردن اکڑی ہوئی تھی جیسے وہ کسی سے ڈرنے والا نہیں۔"

اسی تحریر میں اُس کے متعلق لکھا ہے۔ "وہ جب کسی کے تعاقب میں ہوتا یا کسی کے خلاف لڑ رہا ہوتا تو وہ طوفانی بگولے اور کڑکتی ہوئی گھٹا کی مانند ہوتا تھا۔ اُس کے مقابلے میں جو آتا وہ ہمیشہ کے لیے مٹ جاتا تھا۔ فضا میں اُڑتا ہوا کوئی پرندہ اور جنگل میں دوڑتا کوئی ہرن اُس کے تیر سے بچ کر نہیں جا سکتا تھا۔"

وہ سلطان محمود سے ملا۔ سلطان محمود نے اُس کے ساتھ وہی باتیں کیں جو وہ دوسروں سے کر چکا تھا۔ اسرائیل نے سلطان کی اطاعت قبول کر لی۔ جب سلطان نے اُس سے پوچھا کہ وہ کتنی فوج دے سکتا ہے تو اُس نے جو جواب دیا، وہ لفظ بلفظ تاریخ میں محفوظ ہے۔ مشہور مؤرخ گبن نے لکھا ہے:

"اسرائیل نے اپنی ترکش سے ایک تیر نکال کر سلطان محمود کو دیا اور کہا۔ "اگر آپ یہ تیر شمال کی طرف چھوڑ دیں تو پچاس ہزار ترکمانی جنگجو آپ کے پاس آ جائیں گے۔ اگر آپ کو مزید فوج کی ضرورت ہو تو دوسرا تیر کوہ بلخان کی طرف چھوڑ دیں تو پچاس ہزار مزید لشکر گھوڑوں پر سوار ہو کر آپ کے پاس آ جائے گا۔" سلطان محمود نے اُسے کہا۔ "اگر مجھے آپ کی ساری فوج کی ضرورت پڑے تو؟" اسرائیل نے کہا۔ "میری کمان اپنے قاصد کے ہاتھ بھیج دیں جو وہ تمام علاقے میں دکھا کر واپس آ جائے۔ آپ کے پاس دو لاکھ فوج آ جائے گی۔" سلطان محمود کو اسرائیل کی نیّت پر کچھ شک ہُوا۔"

دوسرے مؤرخین جن میں گردیزی، گزیدہ، ابن الاثیر اور ایک کتاب "مجموعۃ الانصاب" قابلِ ذکر ہے، اس واقعہ پر متفق ہیں۔ ان سے شہادت ملتی ہے کہ سلطان محمود نے اسرائیل کو اُس کے خیمے میں بھیج دیا اور اُس کی خاطر تواضع کا حکم دیا۔ وہ چلا گیا تو سلطان نے اسرائیل کے متعلق مزید معلومات فراہم کیں۔ قدر خان نے بتایا کہ سلجوقی سب کے لیے مصیبت بنے ہوئے ہیں۔ ان سے وفاداری کی توقع نہیں رکھی جا

سکتی۔ سلطان کے اپنے سالار ارسلان جاذب نے بھی سلطان کو بتایا کہ سلجوقی کسی اخلاق اور ضابطے کے پابند نہیں۔

خود سلطان محمود اسرائیل کا انداز اور اُس کی ٹیڑھی ٹوپی دیکھ کر شک میں پڑ گیا تھا۔ اُس نے حکم دیا کہ اسرائیل کو گرفتار کر کے کشمیر کے قلعہ کالنجر (موجودہ کوٹلی) میں قید میں ڈال دیا جائے۔ اُسی وقت اسرائیل کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پاؤں میں زنجیریں ڈال کر کشمیر کو روانہ کر دیا گیا۔ مؤرخوں کے مطابق، وہ سات سال اس قلعے میں رہ کر وہیں مر گیا۔ اُس نے ایک بار فرار کی کوشش کی تھی۔ قلعے سے نکل بھی گیا تھا لیکن برفانی علاقے میں دُور نہ جا سکا اور پکڑا گیا۔

اُسے جب زنجیریں ڈال کر لے جایا جانے لگا تو اُس کے ساتھ ترکمانیوں کا جو دستہ آیا تھا وہ قریب ہی کھڑا تھا۔ اسرائیل سلجوقی نے بلند آواز سے اپنے دستے سے کہا۔ "تمہارا فرض ہے کہ غزنی کی اینٹ سے اینٹ بجا دو۔"

سلطان محمود نے کسی وقت سلجوقیوں سے وعدہ کیا تھا کہ وہ انہیں آزاد زمین دے گا۔ اب اُس نے حکم دیا کہ سلجوقیوں کو دریائے جیحوں اور دریائے زرافشان کے درمیان کا علاقہ دے دیا جائے اور انہیں فوراً یہاں لایا جائے۔ چنانچہ سلجوقیوں کے چار ہزار کنبے اس خطے میں آ گئے۔ ان کے آنے تک سلطان محمود وہیں رہا۔ اُس نے ترکمانیوں اور ترکستانیوں کو الگ کر لیا اور انہیں کہا کہ وہ غزنی کی فوج میں آ جائیں۔ مؤرخ لکھتے ہیں کہ یہ پہلا موقعہ تھا کہ ترکمان اور ترکستان کے لوگوں نے سلطان محمود کو دیکھا اور اس کی باتیں سُنیں۔ سلطان نے اپنی فوج کے بہت سے آدمیوں کو اس کام پر لگا دیا تھا کہ وہ ان لوگوں میں اُٹھیں بیٹھیں اور انہیں بتائیں کہ سلطان محمود کا عزم اور ایمان کیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ بہت سے ترکستانی اور ترکمانی غزنی کی فوج میں شامل ہو گئے۔

سلطان محمود کی یہ مہم کامیاب رہی۔ اب وہ سکون سے ہندوستان کے متعلق سوچ سکتا تھا۔

*

ہندوستان کے مغربی ساحل پر صوبہ گجرات واقع ہے۔ اس کا ایک مشہور شہر کاٹھیاواڑ بالکل ساحل پر ہے۔ اس کے ستر میل جنوب میں سومنات کا شہر ہے۔ وہاں بھارتی حکومت نے آزادی کے بعد ایک مندر تعمیر کیا ہے جو ایک بہت بڑے قدیم مندر کے کھنڈرات پر کھڑا ہے۔ سلطان محمود غزنوی کے زمانے میں اس ساحلی علاقے میں بہت سے مسلمان آباد تھے۔ اسی علاقے میں احمد آباد کا شہر ہے جسے آج بھی ہندو چھوٹا پاکستان کہتے ہیں۔ یہاں مسلمانوں کی قتل و غارت ہوتی ہی رہتی ہے۔ ۱۹۶۹ء میں یہاں ہزاروں مسلمانوں کو ہندوؤں نے شہید کر دیا تھا۔ ان کے بچوں کو زندہ جلایا اور مسلمان خواتین کی آبروریزی وسیع پیمانے پر کی تھی۔ احمد آباد مسجدوں کی بدولت زیادہ مشہور ہے۔

کراچی اور اس سے نیچے، تمام ساحلی علاقے میں مسلمان آبادی اکثریت میں رہی ہے۔ ابتدا میں یہ مسلمان عرب سے محمد بن قاسم کے ساتھ آئے تھے۔ ان میں کچھ یہیں آباد ہو گئے۔ سومنات اس زمانے میں اور بہت عرصہ بعد تک مشہور و مقبول بندرگاہ رہی ہے۔ عرب تاجروں کے بحری جہاز اسی بندرگاہ میں لنگر انداز ہوا کرتے تھے۔ ہندوستان سے ان کی تجارت یہیں سے ہوتی تھی۔ آہستہ آہستہ یہاں مسلمانوں کی آبادی بڑھتی گئی۔ سلطان محمود کے زمانے میں بھی یہاں مسلمان آبادی خاصی تھی۔

سومنات بہت بڑا مندر تھا۔ تمام ہندوستان سے ہندو یہاں آتے تھے۔ یہاں کا مہاراجہ کنور رائے تھا جو مسلمانوں پر بہت ظلم کرتا تھا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ ہر صبح ایک مسلمان کو سومنات کے مندر کے دروازے پر ذبح کیا جاتا تھا۔ دو مؤرخوں نے لکھا ہے کہ ہر روز نہیں بلکہ ہر چاند کی پہلی رات ایک مسلمان کو پکڑ کر سومنات کے دروازے پر قربان کیا جاتا اور اس کے خون سے بتوں کے پاؤں اور مندر کی دہلیز دھوئی جاتی تھی۔

یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سومنات کے متعلق جو تفصیلات مختلف کتابوں میں آئی ہیں، بیان کر دی جائیں۔ یہ دلچسپ بھی ہیں اور ان سے ہندومت کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے بلکہ ان معلومات سے ہندوؤں کا مذہب بے نقاب ہو کر اصل روپ

میں سامنے آ جاتا ہے۔ یہ سراغ کہیں سے بھی نہیں ملتا کہ سومنات کا مندر کب تعمیر ہوا اور کس نے تعمیر کیا تھا۔ ہندوؤں کی کتابوں میں یہ روایت ملتی ہے (اور اسے ہندو اپنے مذہب کا حصہ سمجھتے ہیں) کہ چاند دیوتا نے ایک برہمن پرجاپتی کی بیٹیوں کے ساتھ شادی کی۔ بیٹیوں کی تعداد کا کچھ پتہ نہیں۔ ان میں روہنی نام کی بیٹی سب سے زیادہ خوبصورت تھی۔ چاند دیوتا اسی کو زیادہ چاہتا اور اس کی نظرِ کرم اسی پر تھی۔ پرجاپتی نے چاند دیوتا سے کہا کہ وہ اس کی سب بیٹیوں کے ساتھ ایک جیسا سلوک کرے۔ چاند دیوتا نہ مانا۔ پرجاپتی نے اسے بددعا دی جس سے چاند دیوتا کوڑھی ہو گیا۔

اس روایت سے یہ ثابت کیا گیا کہ برہمن اتنی اونچی ذات ہے جو دیوتاؤں پر بھی حکم چلا سکتی ہے۔ بہرحال چاند بہت پچھتایا لیکن ایک برہمن کی بددعا واپس نہیں ہو سکتی تھی۔ البتہ پرجاپتی آدھے چاند دیوتا کو اس کی سزا سے آزاد کر سکتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ چاند دیوتا زمین پر ایک جگہ مہادیو کی نشانی کھڑی کرے۔

ہندوؤں کی مذہبی کتابوں میں یہ شرط جس طرح بیان کی گئی ہے وہ اتنی فحش اور اتنی ننگی ہے کہ ہم اسے اشاروں میں بھی بیان نہیں کر سکتے۔ تصوّر فرمائیے کہ یہ تفصیلات ہندوؤں کی مذہبی کتابوں میں لکھی ہیں اور اپنے مذہب کو ہندو "مقدّس" کہتے ہیں۔ یہ ہے اصلیّت ہندوؤں کے سب سے بڑے مندر کی جس کی تفصیل پڑھ کر آپ محسوس کریں گے کہ ہندو اسے کتنا مقدّس سمجھتے تھے۔

روایت کے مطابق چاند دیوتا نے سومنات کے مقام پر مہادیو کی نشانی ایک گول اور اونچی چٹان کی شکل میں کھڑی کر دی۔ اس پر ایک مندر تعمیر کیا گیا جسے سومنات (یا سوم ناتھ) کا نام دیا گیا۔ سوم کے معنی ہیں چاند اور نات (یا ناتھ) کے معنی ہیں آقا۔ یعنی سومنات کا مطلب ہے "چاند کا آقا"۔

معمولی پڑھے لکھے لوگ بھی جانتے ہیں کہ سمندر میں چاند کے مطابق مدوجزر پیدا ہوتا ہے۔ اس دوران سمندر ساحل کی طرف لپکتا ہے اور موجیں ساحل سے ٹکراتی ہیں۔ سومنات کا مندر چونکہ سمندر کے کنارے پر تھا اس لیے موجیں مندر کی دیوار سے ٹکراتی تھیں اور پانی اوپر کو اچھل کر دیوار کو جیسے دھوتا رہتا تھا۔ پنڈتوں نے اپنے

ہندوؤں کے دلوں میں یہ عقیدہ بٹھا دیا تھا کہ چاند اپنے گناہ کا کفارہ ادا کرنے کے لیے اپنے آقا یعنی سومنات کے پاؤں دھوتا رہتا ہے۔

بعض مسلمان وقائع نگاروں نے لکھا ہے کہ سومنات کا بُت کعبہ کا وہی مشہور بُت تھا جسے منات کہتے تھے۔ جب کعبہ سے بُت اٹھوائے گئے تو بُت پرستوں نے منات کو چھپا لیا کہ اسے کوئی توڑ نہ سکے۔ آخر بُت پرست اسے کاٹھیاواڑ (بھارت) لے آئے اور ایک عبادت گاہ تعمیر کر کے بُت اس میں رکھ دیا گیا۔ اسے سومنات اس لیے کہا جانے لگا کہ کوئی اسے کعبہ والا بُت نہ سمجھے۔ بہرحال یہ روایت بے بنیاد ہے۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ یہ بُت اتنا قدیم تھا کہ کہیں سے بھی سراغ نہیں ملتا کہ یہ کب تراشا گیا اور یہاں رکھا گیا تھا۔ ابنِ خلقان نے اس کی عمر تیس ہزار سال بتائی ہے جسے تمام مورخین نے مبالغہ کہا ہے۔

سومنات کا بُت باقاعدہ تراشا ہُوا بُت نہیں تھا۔ یہ ایک قدرتی طور پر گول اور لمبوتری چٹان تھی جسے مہادیر کا عضو تناسل کہتے ہیں اور مقدس سمجھتے ہیں۔ یہ تین گز زمین سے باہر اور دو گز زمین کے اندر تھا۔ اس کی موٹائی ڈیڑھ گز تھی۔ یہ بھی اس کے تقدس کی وجہ تھی کہ اسے قدرت نے بنایا تھا۔ اسے سب سے زیادہ طاقتور بُت سمجھا جاتا تھا۔ ہندوستان کے تمام بت اس کے غلام تھے۔ اس کے ساتھ یہ عقیدہ وابستہ تھا جسے آج بھی ہندو مانتے ہیں کہ جو کوئی مرتا تھا اس کی روح سومنات چلی جاتی تھی۔ چاند گرہن ہوتا تو دیوتا بعض روحوں کو جسموں میں ڈال کر انہیں نیا جنم دیتے تھے۔

سومنات کا مندر فنِ تعمیر کا شاہکار تھا۔ اس کی بنیادیں سمندری چٹانوں کو تراش کر اٹھائی گئی تھیں۔ اس کے ۵۶ ستون تھے جو ساگوان کی لکڑی کے بنے ہوئے تھے۔ یہ لکڑی افریقہ سے لائی گئی تھی۔ ان میں سکہ بھر کر ستون تیار کیے گئے تھے۔ بُت میں ہیرے اور جواہرات جڑے ہوتے تھے۔ اس کے اردگرد کئی چھوٹے بُت بنا کر رکھے گئے تھے جن میں سے بعض سونے کے اور بعض چاندی کے تھے۔ یہ سومنات کے بُت کے خدمت گار تھے۔ مندر کے جس کمرے میں بُت رکھا یا گاڑا ہُوا تھا، وہ تاریک کمرہ تھا جس میں شمع یا دیا نہیں جلایا جاتا تھا پھر بھی یہ کمرہ روشن

رہتا تھا۔ روشنی کا انتظام یہ تھا کہ کمرے کے اردگرد کے کمروں اور برآمدوں میں ہیرے لٹکا دیئے گئے تھے۔ ان پر قندیلوں کی روشنی پڑتی تو منعکس ہو کر بُت والے کمرے میں جاتی تھی۔ چونکہ اس روشنی میں ہلکے ہلکے رنگ ہوتے تھے جو ہیروں کے تھے، اس لیے اس روشنی میں طلسماتی سا تاثر تھا۔ اندر جو بھی آتا تھا اُس کے ذہن پر ایسا اثر ہوتا کہ وہ بُت کو دیوتا سمجھنے لگتا تھا۔

بُت کے کمرے میں سونے کی ایک زنجیر تھی جس کا وزن دو سو من تھا لیکن یہ من چالیس سیر کا نہیں بلکہ دو رتل کا تھا۔ دو رتل ایک سیر کے برابر ہوتے تھے۔ اس طرح زنجیر کا وزن دو سو سیر یعنی پانچ من خالص سونا تھا۔ اس کے ساتھ ایک بڑے سائز کی گھنٹی بندھی ہوئی تھی جو خاص خاص موقعوں پر بجائی جاتی تھی۔ بُت کے اردگرد کے کمرے میں بھی بُت رکھے گئے تھے جن میں ہیرے جڑے ہوئے تھے۔

دروازوں پر بیش قیمت پردے لٹکتے تھے جن کے ساتھ قیمتی موتی سِلے ہوئے تھے۔ چاند اور سورج گرہن کے موقع پر ایک لاکھ سے زیادہ ہندو یہاں جمع ہو جاتے تھے۔ مندر کی آمدنی کا ایک ذریعہ تو راجے مہاراجے تھے جو مندر کو بیش قیمت تحائف اور نقد رقم دیتے رہتے تھے۔ دوسرا ذریعہ ایک ہزار گاؤں کا مالیہ تھا جو سارے کا سارا مندر کو دیدیا جاتا تھا۔ دس ہزار پنڈت باری باری ہر لمحہ بُت کی پوجا کرتے رہتے تھے۔ ہر روز بُت کو گنگا کے پانی سے نہلایا جاتا تھا۔ وہاں سے دریائے گنگا قریب تر ساڑھے سات سو میل دُور تھا۔ ہر لمحہ گھوڑسوار آتے جاتے رہتے تھے اور ہر روز بُت کو نہلانے کے لیے گنگا کا پانی آتا رہتا تھا۔ سلطان محمود کے دَور کا وقائع نگار اور مبصر البرونی جو سلطان محمود کے ساتھ ہندوستان آیا تھا لکھتا ہے کہ ہر روز بُت کے لیے کشمیر سے پھول آیا کرتے تھے۔ یہ قابلِ یقین نہیں لگتا۔ سومنات سے کشمیر کا فاصلہ دیکھیے۔ سواری کا تیز ترین ذریعہ صرف گھوڑا تھا۔ گھوڑا اتنی تیز نہیں دوڑ سکتا تھا کہ کشمیر سے لائے ہوئے پھول سومنات تک پہنچتے تازہ رہتے۔

پانچ سو نہایت خوبصورت اور نوجوان گانے اور ناچنے والی لڑکیاں مندر میں

موجود رہتی تھیں۔ ہر لڑکی جوانی ڈھل جانے تک مندر کے لیے وقف رہتی تھی۔
ان کے لیے تین سو سازندے ہوتے تھے۔ ان کے علاوہ راجے مہاراجے اور امیر کبیر
لوگ جو سب سے بڑا اور پنڈتوں کے لیے قابلِ قبول تحفہ لاتے تھے وہ نوجوان رقاصہ
ہوتی تھی۔ رقاصہ نہ ہو تو نوجوان اور حسین لڑکی کو بھی بہترین تحفہ سمجھا جاتا تھا۔
تمام لڑکیاں پنڈتوں کی تحویل میں اور اُن کے رحم و کرم پر ہوتی تھیں اور اُن کی عیاشی
کا ذریعہ بنتی تھیں۔ چونکہ یہ بُت جنسیت کی علامت بنا کر رکھا گیا تھا اس لیے یہ مندر جائز بدکاری کا
اڈہ تھا۔ عورتیں اپنا آپ پنڈتوں کو پیش کر کے خواہش ظاہر کرتی تھیں کہ پنڈت سب کے سامنے
ان کے ساتھ جنسی اختلاط کریں۔ پنڈت اُن کی یہ خواہش پوری کرتے تھے۔
ہندوستان کے مختلف علاقوں سے جو ہندو یہاں آتے تھے ان کے لیے
سر اور داڑھی کا منڈوانا ضروری ہوتا تھا۔ اس کام کے لیے مندر میں تین سو حجام موجود
رہتے تھے۔

سلطان محمود کو ابھی سومنات کے متعلق تفصیل سے کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔
اُس نے سومنات تک پہنچنے کی سوچی بھی نہیں تھی۔ غزنی سے سومنات کا فضائی
فاصلہ نو سو میل ہے۔ وہاں سے سومنات تک کے سفر میں جو دریا آتے ہیں جو
پہاڑی علاقے آتے ہیں اور بیکانیر کا جو صحرا آتا ہے، ان سب کو تصور میں لائیے
اور یہ بھی ذہن میں رکھئے کہ اُس وقت فوجیں گھوڑوں پر اور پیدل کوچ کیا کرتی تھیں۔

*

جن دنوں سلطان محمود اردگرد کے سرداروں اور حکمرانوں سے اطاعت
قبول کرانے میں مصروف تھا، اُن دنوں گوالیار کا مہاراجہ ارجن پنڈتوں اور رشیوں
کے دروازوں پر گرا رہتا تھا۔ اُس نے سلطان محمود سے بہت بُری شکست
کھائی تھی۔ خود اپنی قوم اُس سے نفرت کرنے لگی تھی۔ ایک رشی نے اُسے کہا
کہ وہ کچھ تحفے لے کر سومنات جائے اور وہاں کے پنڈتوں کے پاؤں میں گر کر
اپنی کایا پلٹنے کی پرارتھنا کرے۔ پنڈتوں نے اُسے کہا کہ جو تحفہ وہاں کے پنڈتوں
کو پسند ہے وہ ہے ایک یا دو نوجوان لڑکیاں جو بہت خوبصورت ہوں۔ اس

کے علاوہ وہ کسی جوان سال مسلمان کو بھی ساتھ لے جائے اور اُسے سومنات
کے دروازے پر ذبح کرے۔
مہاراجہ ارجن نے مسلمان لڑکی اور مسلمان آدمی کی تلاش شروع کر دی۔ ایک
مہاراجہ کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا لیکن اب وہ مہاراجہ نہیں، خانہ بدوش
تھا۔ گوالیار اور اردگرد کے علاقوں میں مسلمان بہت ہی کم تھے۔ زیادہ تر مسلمان پشاور،
ملتان اور لاہور کے علاقوں میں تھے۔ شرط یہ بھی تھی کہ لڑکی خوبصورت ہو اور آدمی
بھی خوبرو اور جوان ہو۔
ایک روز اُس کی ملاقات ایک پنڈت سے ہو گئی جو گوالیار کے مندر میں ہوتا
تھا۔ اب وہاں مندر تو تھا لیکن وہ مسلمانوں کے قبضے میں تھا اور وہاں کوئی بُت
نہیں تھا، کوئی مورتی نہیں تھی۔ وہاں اب نہ سنکھ بجتے تھے نہ گھنٹیوں کی آوازیں آتی
تھیں۔ وہاں کے دیوتا خاموش تھے اور اس خاموشی سے دن میں پانچ وقت اذان
کی مقدس صدا اُبھرتی اور باطل پر لرزہ طاری کرتی تھی۔ مہاراجہ ارجن نے پنڈت سے
پوچھا کہ وہ اب کہاں ہوتا ہے۔
"جنگل میں" — پنڈت نے جواب دیا۔ "مندر اُجڑ جانے سے دیوتا کہیں بھاگ
تو نہیں جاتے۔ مندر نہ رہے تو پوجا پاٹھ سے تو کوئی نہیں روک سکتا۔ ہم نے جنگل میں
جا کر ایک گُفا میں مندر بنا لیا ہے۔ آپ دیکھ لینا ان مسلمانوں پر کیسی تباہی آئے گی۔
یہ پلید لوگ جنگی طاقت کے گھمنڈ میں ہری کرشن اور مہادیو اور وشنو دیو کو شکست دینے
آئے ہیں۔ یہ لوگ زندہ جل کر راکھ ہوں گے!"
"ابھی تو ہم راکھ ہو رہے ہیں پنڈت جی مہاراج!" — مہاراجہ ارجن نے کہا —
"کیا آپ ابھی تک نہیں سمجھے کہ ہری کرشن، مہادیو، اور وشنو دیو ہم سے ناراض ہیں!"
"یہ پاپ آپ کا ہے جن کے پاس فوج تھی" — پنڈت نے کہا۔
"مجھے گنڈا اور ترلوچن پال نے دھوکہ دیا" — مہاراجہ ارجن نے کہا — "ورنہ
غزنی کا ایک بھی سپاہی زندہ واپس نہ جاتا اور محمود ہمارا قیدی ہوتا۔ میں نے قسم کھائی
تھی کہ غزنی کے اس سلطان کو زندہ پکڑوں گا اور ہر روز اس سے مندر میں جھاڑو

دلوایا کروں گا اور وہ مندر میں پوجا کے لیے آنے والوں کی جوتیاں سیدھی کیا کرے گا..... لیکن اب ان باتوں سے کیا حاصل! مجھے بتایا گیا ہے کہ ایک خوبصورت مسلمان لڑکی اور ایک جوان مسلمان کو ساتھ لے کر سومنات جاؤ۔ لڑکی مندر کو پیش کر دو اور مسلمان کو مندر کے دروازے پر ذبح کر دو اور دو چاند شو دیو کے قدموں میں ماتھا رگڑو، بھگوان راج واپس کر دیں گے۔"

"آپ نے میرے دل کی بات کر دی ہے"۔ پنڈت نے کہا۔ "لیکن مجھ میں اتنی ہمت نہیں۔ آپ یہ کام کر سکتے ہیں۔"

"کر تو سکتا ہوں"۔ مہاراجہ ارجن نے کہا۔ "لیکن مسلمان لڑکی اور آدمی کہاں سے لاؤں؟"

"کیا آپ کنگال ہو گئے ہیں؟"۔ پنڈت نے کہا۔ "آپ کے پاس کچھ تو ہو گا، شکار مل جائے گا۔"

"بہت کچھ ہے"۔ مہاراجہ ارجن نے کہا۔ "میرا صرف راج نہیں رہا۔ آپ بتائیں شکار کہاں ہے اور وہ میرے قبضے میں کس طرح آ سکتا ہے؟"

"کیا آپ کی راجکماریاں دریا پر نہانے نہیں جایا کرتی تھیں؟"۔ پنڈت نے کہا۔ "اب کبھی کبھی غزنی کی شہزادیاں دریا پر جایا کرتی ہیں۔"

"غزنی کی شہزادیاں؟"۔ مہاراجہ ارجن نے پوچھا۔ "سلطان محمود تو غزنی میں ہے۔"

"میں غزنی کے ان فوجیوں کی بیویوں اور بہو بیٹیوں کی بات کر رہا ہوں جو قلعے میں ہیں"۔ پنڈت نے کہا۔ "کبھی کبھی تین چار بڑی خوبصورت لڑکیاں تین چار محافظوں کے ساتھ دریا پر آیا کرتی ہیں۔ آپ انعام نکالیں جو میں اپنے آدمیوں کو دے کر دو لڑکیاں اور ایک یا دو محافظ اغوا کرا لوں گا۔ دریا پندرہ کوس دور ہے جتنی دیر میں گوالیار کے قلعے تک خبر پہنچتی ہے ہم بہت دور نکل جائیں گے۔"

"کیا آپ سومنات کے راستے سے واقف ہیں؟"

"مہاراج! آپ کہاں حکومت کرتے رہے ہیں؟"۔ پنڈت نے کہا۔ "ہر روز یہاں قریب سے وہ سوار گزرتے ہیں جو سومنات کے غسل کے لیے گنگا ماتا کا پانی لے جاتے ہیں۔ وہ بہت تیز چلتے ہیں۔ آپ گھوڑوں کا انتظام تو کر سکتے ہیں نا.....

کم از کم چھ گھوڑے درکار ہوں گے۔"

"گھوڑے جتنے چاہو مل جائیں گے"۔ مہاراجہ ارجن نے کہا۔ "مجھے بر وقت اطلاع دے دینا۔"

غزنی کے وہ سالار، نائب سالار اور کماندار وغیرہ جو ہندوستان کے فتح کیے ہوئے قلعوں میں رہتے تھے، ان کی بیوی بچے بھی غزنی سے آ گئے تھے۔ گوالیار کے قلعے میں بھی فوجی سرداروں کے کنبے آ گئے تھے۔ گوالیار سے دریا پندرہ بیس میل دور تھا۔ کچھ لڑکیاں چند ایک محافظوں کو ساتھ لے کر دریا کی سیر اور کشتی رانی کے لیے کبھی کبھی جایا کرتی تھیں۔ ایک روز چار جوان عورتیں دریا پر گئیں۔ ان میں ایک نوجوان لڑکی تھی جو ایک بڑے کماندار کی بیٹی تھی۔ اس کا نام شگفتہ تھا۔ اس کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ ان کے ساتھ چار محافظ تھے۔ ان کے اور عورتوں کے گھوڑوں کی تعداد آٹھ تھی۔

ایک جگہ دریا کے کنارے جنگل گھنا، ہرے سرکنڈے اور جھاڑیاں بھی تھیں۔ عورتیں اس گھنی ہریالی کی اوٹ میں ہو گئیں۔ وہ نہانا چاہتی تھیں۔ چاروں محافظ گھوڑوں سے اتر کر کچھ دور جا کر بیٹھ گئے۔ ایک آدمی جو دیہاتی لگتا تھا، گھبراہٹ کے عالم میں محافظوں کے پاس دوڑتا آیا اور خوف سے کانپتی ہوئی آواز میں کہنے لگا کہ تین آدمی اس کی بیوی کو اس سے چھین کر لے گئے ہیں۔ انہوں نے مجھے مار پیٹ کر بھگا دیا ہے۔ وہ قریب ہی ہیں اور میری بیوی کو ننگا کر کے اسے زبردستی شراب پلا رہے ہیں۔

"آپ مسلمان ہیں مہاراج"۔ اس آدمی نے کانپتے ہوئے کہا۔ "ہماری عزت کے رکھوالے آپ ہیں۔"

چاروں محافظ اٹھ دوڑے۔ وہ ذرا دور چلے گئے تو پانچ چھ آدمی جن کے چہرے صافوں میں چھپے ہوئے تھے مسلمان عورتوں پر ٹوٹ پڑے۔ انہوں نے کماندار کی بیٹی کو اٹھا لیا۔ عورتوں نے چیخ پکار کی تو محافظ واپس دوڑے۔ جب وہ گھنے سرکنڈوں اور جھاڑیوں میں آئے تو گھات میں چھپے ہوئے ہندوؤں نے تین

کے پہلوؤں میں برچھیاں اتار دیں اور ایک کو دبوچ لیا۔

ذرا ہی دیر بعد آٹھ گھوڑے سرپٹ دوڑتے جنگل میں دور نکل گئے۔ ایک گھوڑے پر مہاراجہ ارجن شگفتہ کو آگے بٹھائے سوار تھا۔ ایک پر ایک جواں سال محافظ ناصر الدولہ بندھا ہوا تھا۔ ایک گھوڑے پر پنڈت سوار تھا اور باقی پانچ پر پنڈت اور مہاراجہ ارجن کے وہ آدمی سوار تھے جنہوں نے شگفتہ اور ناصر الدولہ کو اغوا کیا اور تین محافظوں کو قتل کیا تھا۔ ان پانچ آدمیوں کو نقد انعام پیش کیا گیا تھا لیکن انہوں نے یہ کہہ کر انعام قبول نہیں کیا تھا کہ وہ بھی سومنات کی پوجا کے لیے مہاراجہ ارجن کے خرچ پر جائیں گے۔

گوالیار قلعے میں باقی تین عورتیں پندرہ بیس میل پیدل چل کر پہنچیں۔ اس وقت تک مہاراجہ ارجن بہت دور نکل گیا تھا۔ قلعے میں کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ مہاراجہ ارجن اتنی سنگین واردات کر گیا ہے۔ اُس نے دو روز پہلے قلعے کے سالار قلعہ دار کو بتایا تھا کہ وہ سومنات کی پوجا کے لیے جا رہا ہے۔ سالار نے اُسے اجازت دے دی تھی۔ اس کے متعلق سب کو یہی معلوم تھا کہ دو روز ہوئے وہ سومنات کے سفر پر روانہ ہو چکا ہے۔

شام تک پنڈت کی راہنمائی میں وہ اُس راستے پر پہنچ گئے جس راستے سومنات کو گنگا کا پانی جایا کرتا تھا۔ انہیں پانی لے جانے والے سوار مل گئے۔ دوسرے دن شگفتہ اور ناصر کو کھول کر مہاراجہ ارجن نے بتایا کہ ان کا بھاگنا بیکار ہے اور وہ خاموشی اور اطمینان سے ان کے ساتھ رہیں۔ ان دونوں کے پوچھنے پر بھی انہیں نہ بتایا گیا کہ انہیں کہاں لے جایا جا رہا ہے۔

بیس روز بعد وہ سومنات پہنچ گئے۔ مہاراجہ ارجن اور پنڈت نے ناصر اور شگفتہ کو مندر کے بڑے پنڈت کے سامنے کھڑا کر کے اس کے پاؤں چھوئے اور اُسے بتایا کہ وہ اس لڑکی کو مندر کے لیے اور اس آدمی کو شیو دیو کی قربانی کے لیے لائے ہیں۔

ناصر ان لوگوں کی زبان سمجھتا تھا۔ شگفتہ نہیں سمجھتی تھی۔ اُس نے فارسی زبان میں ناصر سے پوچھا کہ یہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں۔ ناصر نے اُسے بتا دیا۔ شگفتہ خوفزدہ ہونے کی بجائے فارسی میں بڑے غصے میں بولنے لگی۔ بڑے پنڈت نے ناصر سے پوچھا کہ یہ لڑکی کیا کہہ رہی ہے۔

"یہ کہہ رہی ہے کہ میں تمہارے شیو دیو پر اللہ کی لعنت بھیجتی ہوں" — ناصر نے جواب دیا۔ "اور یہ کہہ رہی ہے کہ ہم نے تمہارے بہت سے دیوا اپنے پاؤں تلے مسل ڈالے ہیں اور یہ کہہ رہی ہے کہ تمہارے بہت سے دیوتاؤں کے بتوں کو ہم نے غزنی میں لے جا کر توڑا تھا اور ان کے ٹکڑے گھوڑ دوڑ کے میدان میں بکھیر دیئے تھے۔ یہ تمہارے مندر میں نہیں رہنا چاہتی۔"

"اسے کہو کہ ہمارے مذہب کی توہین نہ کرے" — بڑے پنڈت نے کہا — "ورنہ شیو دیو اپنی توہین کا انتقام غزنی کو تباہ کر کے لیں گے۔"

"تمہارے پتھر کے دیوتا ہمارے خدا کا مقابلہ کریں گے؟" — ناصر نے کہا — "ہم دونوں تمہارے قیدی ہیں۔ ہم بے بس ہیں۔ ہمارا خدا بے بس نہیں۔ وہ پتھر کا بت نہیں۔ اُس کے انتقام سے بچو پنڈت!"

شگفتہ بے تاب ہو کے ناصر سے پوچھتی تھی کہ کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ ناصر نے اُسے بتایا تو وہ اس قدر غصے سے بولنے لگی کہ اُس کے منہ سے تھوک اڑ اڑ کر پنڈت کے منہ پر پڑنے لگا۔ وہ اُن پر لعنت بھیج رہی تھی۔

"ارجن مہاراج!" — پنڈت نے مہاراجہ ارجن سے کہا — "یہ دونوں ڈرنے کی بجائے ہم پر برس رہے ہیں۔ کیا انہیں یہ امید ہے کہ ہم ان سے ڈر کر انہیں چھوڑ دیں گے؟"

"ہم صرف خدا سے ڈرتے ہیں پنڈت!" — ناصر نے کہا — "موت سے ہم ڈرنے والے ہوتے تو غزنی میں ہی بیٹھے رہتے۔ ہم اپنے اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام سنانے اور اس پیغام پر اپنی جان قربان کرنے کے لیے آئے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ہم یہاں بے بس ہیں۔ کچھ نہیں کر سکتے لیکن ہم خوش

ہیں کہ ہم اللہ کی راہ میں قربان ہو رہے ہیں۔ میری جان کی قربانی سے آپ کو کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ میری قربانی اللہ کے حضور جائیگی۔"

"انہیں بتا دو کہ اس مندر میں بھی وہی تباہی آئے گی جو ہندوستان کے بہت سے مندروں میں آئی ہے۔" شگفتہ نے ناصر سے کہا۔ "انہیں خبردار کر دو کہ میرے پاک جسم کی توہین کا انتقام میرا خدا ضرور لے گا۔"

ناصر نے پنڈت کو بتایا کہ شگفتہ نے کیا کہا ہے تو پنڈت نے عجیب سی ہنسی ہنس کر کہا۔ "تم اُسے پوجتے ہو جو تمہیں نظر نہیں آتا۔ تم اندھے ہو اور اندھیرے میں جی رہے ہو۔ تم نہیں جانتے یہ مندر کس کا ہے جسے تم پتھر کہہ رہے ہو، یہ شیو دیو ہے۔ یہاں تمہارے جسم سے جان نکالی بھی جا سکتی ہے اور مردہ جسم میں جان ڈالی بھی جا سکتی ہے۔"

"مجھے یقین ہے کہ تم پتھر کے دیوتا کا یہ کمال مجھے نہیں دکھا سکتے۔" ناصر نے کہا۔ "اور یہ میرا عقیدہ ہے کہ اس لڑکی نے اس مندر کی تباہی کی جو پیشین گوئی کی ہے وہ پوری ہو کے رہے گی۔"

"مہاراج!" گوالیار کے پنڈت نے سومنات کے پنڈت سے کہا۔ "کیا ان کے ساتھ اتنی باتیں کرنا ضروری ہے؟ نہ آپ ان کا مذہب بدل سکتے ہیں نہ یہ ہمارا مذہب بدل سکتے ہیں۔"

"ہاں"۔ پنڈت نے کہا۔ "ان کے ساتھ اتنی باتیں بیکار ہیں۔ انہیں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس آدمی کو نئے چاند کی پہلی رات قربان کیا جائے گا اور اس کا خون شیو دیو کے قدموں میں انڈیلا جائے گا۔ اسے بتانا اس لیے ضروری ہے کہ ہم کسی کو دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتے۔ اسے معلوم ہونا چاہیے کہ سومنات نے اسے قربانی کے لیے پسند کیا ہے۔ یہ خوش قسمت انسان ہے۔"

"آپ اپنے دیوتاؤں کو دھوکہ نہیں دینا چاہتے۔" ناصر نے کہا۔ "کیا تمہارے شیو دیو کو معلوم نہیں کہ ہم دونوں کو دھوکے میں اغوا کیا گیا ہے اور ہمارے تین ساتھیوں کو قتل کیا گیا ہے؟ کیا تمہارا مذہب اتنے بڑے جرم کی اجازت دیتا

ہے؟"

بڑے پنڈت نے اپنے بالکوں کو بلایا اور انہیں کہا کہ ان دونوں کو لے جاؤ۔

"سنو شگفتہ!" ناصر نے بڑی تیزی سے بولتے ہوئے کہا۔ "غزنی کی بیٹیوں کی طرح اپنی آبرو پر قربان ہو جانا۔ میں نکلنے کی کوشش کروں گا۔"

دونوں کو مندر کے ایک ایسے حصے میں لے گئے جو ایک فراخ صحن تھا۔ شگفتہ کو الگ کر لیا گیا اور ناصر کو دوسری طرف لے جانے لگے۔ ان کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے نہیں تھے۔ دونوں کے ساتھ دو دو آدمی تھے۔ اچانک ناصر کو شگفتہ کی بڑی بلند آواز سنائی دی۔ "ناصر خدا حافظ۔" اس کے ساتھ ہی شور اٹھا۔ "پکڑلو۔ پکڑلو۔"

ناصر نے اُدھر دیکھا۔ وہاں ایک کنواں تھا۔ اُسے شگفتہ کنوئیں کے چبوترہ نما منڈیر پر کھڑی نظر آئی اور وہ کنوئیں میں کود گئی۔ ناصر کے ساتھ جو دو آدمی تھے، وہ بھی کنوئیں کی طرف دوڑے۔ ان کے شور پر بہت سے آدمی آگئے۔ شام گہری ہو چکی تھی۔ صحن میں صرف ایک مشعل جل رہی تھی۔ سب آدمی شگفتہ کو کنوئیں سے نکالنے کے لیے بھاگ دوڑ رہے تھے۔ رسہ کنوئیں میں پھینکا گیا اور ایک آدمی رسّے سے اتر گیا۔ کچھ دیر بعد کنوئیں میں سے اُس کی آواز سنائی دی۔ "مر گئی ہے۔"

اس ہڑبونگ میں کسی کو ناصر کا خیال نہ رہا۔ اس کے ساتھ جو دو آدمی تھے، وہ گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ انہیں ناصر نظر نہ آیا۔

ناصر مندر سے دور نکل گیا تھا۔ یہ خدائی مدد تھی کہ اُسے ایک دریچہ سا نظر آ گیا تھا۔ اس میں سے وہ نکلا تو آگے کھلا میدان تھا اور تاریکی۔ اُسے ایک طرف سمندر نظر آیا۔ وہ دوسری سمت چل پڑا۔ اس علاقے میں وہ اجنبی تھا۔ چلتے چلتے آگے دریا آ گیا۔ یہ دریائے سرسوتی تھا جو سومنات سے تین میل کے فاصلے پر تھا۔ وہ دریا پار کر گیا۔ اُسے کسی مسلمان گھرانے میں پناہ مل گئی تھی لیکن اسے

معلوم نہیں تھا کہ اس علاقے میں مسلمان ہیں بھی یا نہیں۔ وہ چلتا گیا۔ وہ رات بھر چلنا چاہتا تھا۔

دو چار میل اور گیا ہو گا کہ اُسے روشنی دکھائی دی۔ یہ کوئی گاؤں تھا۔ وہ اُدھر چل پڑا۔ جب گاؤں کے قریب پہنچا تو اُسے ایک مکان نظر آیا جس پر مینار سے تھے۔ اُسے شک ہُوا جیسے یہ مسجد ہو لیکن اُسے یقین نہیں تھا کہ اس علاقے میں مسجد ہو سکتی ہے۔ پھر بھی وہ دروازے کی طرف چلا گیا۔ دروازہ کھلا تھا۔ آگے چھوٹا سا صحن اور آگے برآمدہ سا تھا۔ وہاں دیا جل رہا تھا جس کے پاس ایک سفید ریش آدمی بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ ناصر اندر جانے سے ڈر رہا تھا۔ وہ دروازے کے ساتھ لگا کھڑا رہا۔

"السلام علیکم" — اُسے اپنے قریب آواز سنائی دی۔

"وعلیکم السلام" — اُس نے جواب دیا۔

سلام کرنے والے نے ایسی زبان میں بات کی جو ناصر نہ سمجھ سکا لیکن اسلام کے رشتے نے سب خوف اور شک دُور کر دیئے تھے۔

"مسلمان" — ناصر نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "غزنی ... عساکرِ سلطان محمود"

اُس نے کچھ اشارے کئے تو وہ آدمی اُسے اندر لے گیا۔ وہ مسجد تھی اور پیش امام کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ یہ لوگ اِس علاقے کے رہنے والے تھے۔ ان کی زبان ہندوستانی سے مختلف تھی۔ ناصر نے اشاروں سے انہیں یہ سمجھا دیا کہ وہ سومنات سے بھاگا ہے اور اُسے پناہ کی ضرورت ہے۔ پیش امام نے ایک اور آدمی کو بلوایا۔ وہ ہندوستان کی وہ زبان جانتا تھا جو ناصر سمجھ اور بول سکتا تھا۔ اُن کی وساطت سے پیش امام کو پتہ چلا کہ ناصر کون ہے، اس پر کیا گزری ہے اور اب اسے یہاں سے نکالنا ہے۔

یہاں کے لوگوں کو سلطان محمود غزنوی سے کوئی واقفیت نہیں تھی۔ انہوں نے سُنا کہ انہوں نے اُڑتی اُڑتی سُنی ہے کہ شمال مغرب سے ایک بڑا ہی ظالم اور بادشاہ آتا ہے جو کہیں نہ کہیں مندر کے بُت توڑ کر وہاں سے زر و جواہرات اپنے ساتھ

لے جاتا ہے۔ یہ بات انہوں نے اُن ہندوؤں سے سُنی تھی جو ہندوستان سے سومنات کی پوجا کے لیے آتے رہتے تھے۔ ناصرالدولہ نے انہیں بتایا کہ وہ کوئی لٹیرا بادشاہ نہیں بلکہ مسلمان سلطان ہے جو ہندوستان میں محمد بن قاسم کے دَور کو زندہ کر رہا ہے اور وہ یہاں اسلام کو فروغ دینے کے لیے بُت توڑتا اور مندروں کو اجاڑتا ہے۔

"ہم عربی نسل کے لوگ ہیں" — پیش امام نے اُسے بتایا۔ "ہمارا شجرۂ نسب اُن مجاہدین سے ملتا ہے جو محمد بن قاسم کے ساتھ آئے تھے۔ ہمارے آباؤ اجداد نے دیبل سے دور نیچے پل آدم تک کے ساحلی علاقے میں اسلام پھیلا دیا تھا۔ اس سومنات کی اُس وقت کوئی اہمیت نہیں تھی۔ یہ محمد بن قاسم کے دَور کے بعد اتنا مقبول ہُوا ہے۔ برہمنوں نے اس کے ساتھ ایسی ایسی روایتیں وابستہ کر رکھی ہیں کہ راجے مہاراجے بھی یہاں آتے ہیں۔ اگر سلطان محمود واقعی بُت شکن ہے اور اسلام کا علمبردار ہے تو اُسے شاید معلوم نہیں کہ سومنات کا مندر بھی ہے جسے ہندو اتنا ہی مقدس سمجھتے ہیں جتنا ہمارے لیے خانہ کعبہ ہے۔"

"اگر آپ لوگ مجھے ایک گھوڑا دے دیں تو میں گوالیار واپس جانے کی بجائے سیدھا غزنی جاؤں گا" — ناصر نے کہا۔ "اور سلطان کو سومنات پر حملے کی ترغیب دوں گا۔"

"تم شاید اپنا انتقام لینا چاہتے ہو" — پیش امام نے کہا — "اور تم اس مسلمان لڑکی کے خون کا بدلہ لینا چاہتے ہو جو اپنی عصمت پر کنوئیں میں کود کر قربان ہو گئی ہے۔ ہم تمہیں بتاتے ہیں کہ یہاں کیا ہوتا ہے۔ ہم تمہیں گھوڑا دے کر یہاں سے نکال دیں گے اور ہم تمہیں غزنی تک کا چھوٹا راستہ بھی سمجھا دیں گے۔ اپنے سلطان کو بتانا کہ سومنات وہ مندر ہے جو اسلام کو للکار رہا ہے اور اسلام کا مُنہ چڑا رہا ہے۔ اس مندر میں نہ معلوم کتنی مسلمان لڑکیاں لائی جا چکی ہیں جنہیں بتوں کے آگے پنڈتوں کی موجودگی میں مادر زاد عُریاں کر کے نچایا جاتا ہے اور کبھی کبھی یہاں ایک مسلمان کو ذبح کیا جاتا ہے۔ ہمارے گھروں میں کوئی بچی خوب صورت نکلتی

ہے تو ہم اُسے کہیں دُور بھیج دیتے ہیں یا وہ پورا کُنبہ کہیں دُور چلا جاتا ہے۔ جس طرح تمہیں یہاں لایا گیا ہے، اسی طرح اکثر یہاں ہندوستان سے بڑے خوب صُورت نوجوان مسلمانوں کو لا کر ذبح کیا جاتا ہے۔ یہ مندر ایک جنسی عقیدے پر کھڑا ہے اور یہاں کے پنڈت دن رات ہوس کاری میں بدمست رہتے ہیں۔"

پیش امام نے ناصرالدّولہ کو پوری تفصیل سے سومنات کی تاریخ سنائی اور اُسے بتایا کہ اس کے ساتھ کون سی روایتیں وابستہ ہیں۔

"اپنے سلطان سے کہنا کہ ہندوستان کے ساحل سے اسلام آگ کے قریب رکھے ہوئے موم کی طرح پگھلتا اور غائب ہوتا جا رہا ہے۔" پیش امام نے کہا — "یہاں کے مُسلمان خوف و ہراس کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور آہستہ آہستہ یہاں سے ہندوستان کے اندرونی علاقوں کو ہجرت کر رہے ہیں یا واپس عرب جا رہے ہیں اور یہاں ہندوؤں کے باطل عقیدے پھیلتے جا رہے ہیں۔"

"سُلطان آئے گا" — ناصرالدّولہ نے کہا — "ہم آئیں گے اور انشاء اللّٰہ آپ دیکھیں گے کہ ہندوؤں کے اس سب سے زیادہ طاقتور دیوتا کے ٹکڑے کس طرح اُڑتے اور خاک ہوتے ہیں۔ آپ مجھے گھوڑا اور کچھ زادِ راہ دے دیں اور راستہ سمجھا دیں۔"

مندر کے اردگرد ناصر کو تلاش کیا جا رہا تھا لیکن مندر کے پنڈتوں کو اس کا کوئی علم نہیں تھا۔ علم صرف مہاراجہ ارجن اور اُس کے ساتھ آئے ہوئے پنڈت کو تھا۔ اُن کی دونوں قربانیاں ہاتھ سے نکل گئی تھیں۔

اُس وقت ناصر چند میل دُور ایک مسجد میں بیٹھا تھا۔ پیش امام نے اُسے پیٹ بھر کے کھانا کھلایا تھا اور گاؤں کے ایک بہت ہی بوڑھے آدمی کو بلا لیا تھا جو دور دراز علاقوں کے راستوں اور سمتوں سے واقف تھا۔

"گھوڑا نہیں اسے اونٹ دے دو" بوڑھے نے کہا۔ "راستے میں بڑا ہی وسیع صحرا ہے۔ گھوڑا بغیر پانی کے مر جائے گا اور ناصر بھی زندہ نہیں رہے گا" —

بوڑھے نے ناصر کو سمجھایا کہ وہ دوپہر تک سُورج کو دائیں ہاتھ اور دوپہر کے بعد بائیں

ہاتھ رکھے۔ رات کو قطبی ستارے کو اپنی ناک اور دائیں کندھے کے درمیان رکھے۔ علاقہ پہاڑی ہو تو اُسے گھومنا مڑنا پڑے گا۔ وہ کتنا ہی مڑے دن کو سورج اور رات کو قطبی ستارے کو اُسی زاویے پر رکھے جو اُسے بتایا گیا ہے۔

اگلی رات کے اندھیرے میں ناصرالدّولہ ایک بڑی اچھی نسل کے تنومند اونٹ پر سوار ایسے سفر پر روانہ ہو گیا جس میں دریا بھی تھے، بڑے ظالم صحرا بھی، پہاڑ اور جنگل بھی تھے۔ اُسے بہت جلدی غزنی پہنچنا تھا۔

*

یہاں ایک اور روایت کا بیان بھی ضروری ہے۔ راوی ایک شاعر شیخ دین ہے جس نے اپنی ایک کتاب میں سومنات پر سلطان محمُود غزنوی کے حملے کا منظوم ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب ۱۸۰۱ء میں لکھی گئی تھی اور اس کا ترجمہ ایک انگریز میجر جے۔ ڈبلیو۔ واٹسن نے کیا تھا۔ یہ روایت مختصراً یوں ہے کہ سومنات کے علاقے میں مسلمان خاصی تعداد میں آباد تھے۔ وہاں کا مہاراجہ کنور رائے انہیں اپنا غلام سمجھتا تھا۔ ہر روز ایک مُسلمان کو سومنات کے مندر کی دہلیز پر ذبح کیا جاتا تھا۔ وہاں کے مُسلمان اپنے خُدا سے آہ و زاری کرتے رہتے تھے۔ مکّہ معظّمہ میں ایک بزرگ حاجی محمد تھے۔ ایک رات انہیں خواب میں رسُول اکرم صلعم کی زیارت ہوئی۔ حضورؐ نے حاجی محمد سے فرمایا کہ ہندوستان کے علاقہ سومنات میں جاؤ اور مُسلمانوں کی نجات کا بندوبست کرو۔

حاجی محمد اپنی رُوحانی قوّت سے سومنات آئے اور اس قوّت سے مہاراجہ کنور رائے کی توجہ اپنی طرف کر لی۔ ایک روز حاجی محمد نے ایک بوڑھی عورت کو دیکھا جو آہ و زاری کر رہی تھی۔ اس سے آہ و زاری کا سبب پوچھا تو معلوم ہوا کہ اگلے روز بڑھیا کے جوان اور اکلوتے بیٹے کو مندر میں ذبح کیا جا رہا ہے۔ حاجی محمد نے مہاراجہ کنور رائے تک اپنا یہ پیغام پہنچایا کہ اس جوان آدمی کی جگہ اپنے آپ کو قربانی کے لیے پیش کرتے ہیں۔

مہاراجہ نے اسے اپنی توہین سمجھا۔ کسی طرح مہاراجہ کو پتہ چل گیا تھا کہ حاجی محمد

کے پاس کوئی ایسی طاقت ہے کہ انہیں سامنے آکر جان سے نہیں مارا جا سکے گا۔ مہاراجہ نے سوچا کہ انہیں بے خبری میں مارا جائے۔ مہاراجہ نے انہیں پیغام بھیجا کہ انہیں ذبح نہیں کیا جائے گا بلکہ مہاراجہ انہیں اپنے ساتھ معزز مہمان کی طرح مندر میں لے جا کر مندر کی شان و شوکت دکھائے گا چنانچہ مہاراجہ حاجی محمد کو مندر میں لے گیا۔ اُس کے ساتھ اپنے محافظ تھے جنہیں اُس نے سمجھا دیا تھا کہ انہیں کیا کرنا ہے۔

مندر میں گھماتے پھراتے مہاراجہ کنور رائے نے اپنے محافظوں کو اشارہ کیا کہ وہ پیچھے سے تلوار کے وار کر کے حاجی محمد کو قتل کر دیں، لیکن محافظ جہاں کھڑے تھے، وہاں سے ہل ہی نہ سکے، جیسے زمین نے انہیں جکڑ لیا ہو۔ مہاراجہ اتنا خوفزدہ ہُوا کہ حاجی محمد سے معافی مانگی اور انہیں عزت سے رخصت کیا۔

حاجی محمد غزنی چلے گئے اور سلطان محمود سے کہا کہ انہوں نے رسول اللہؐ کے حکم سے اُسے منتخب کیا ہے کہ سومنات کا بُت توڑے اور اس مندر کو تباہ و برباد کرے جو ہزاروں مسلمانوں کا خون پی چکا ہے۔ سلطان محمود فوج لے کر فوراً چل پڑا۔ اُس نے سومنات کے مہاراجہ کنور رائے کو شکست دی۔ مہاراجہ نے صُلح اور دوستی کی درخواست کی۔ سلطان محمود نے اُسے اسلام قبول کرنے کو کہا مگر مہاراجہ نے انکار کر دیا اور آخر دم تک لڑنے کے لیے قلعہ بند ہو گیا۔

اس دوران حاجی محمد فوت ہو گئے۔ وہ سلطان محمود کے ساتھ سومنات آئے تھے۔ سلطان محمود نے قلعے کا محاصرہ کیا مگر قلعہ سَر نہ ہو سکا۔ محاصرہ بارہ سال جاری رہا۔ قلعہ سَر نہ ہو سکا۔ وزیر نے سلطان محمود سے کہا کہ حاجی محمد اُس سے ناراض ہو کے فوت ہوئے ہیں کیونکہ وہ اُن کی بیمار پُرسی کے لیے نہیں گیا تھا۔ سلطان محمود اُسی وقت حاجی محمد کی قبر پر گیا اور کوتاہی کی معافی مانگی۔ سلطان کو ایک اشارہ مِلا اُس نے اِس پر عمل کیا اور دو دنوں میں قلعہ فتح ہو گیا۔

یہ روایت قارئین کی دلچسپی کے لیے سُنائی گئی ہے۔ یہ بالکل بے بنیاد روایت ہے۔ صحیح صرف یہ ہے کہ ۱۰۲۵ء تک سُلطان محمود کو سومنات کے متعلق کوئی زیادہ علم نہیں تھا۔

اونٹ ناصر کو پیٹھ پر اُٹھائے چلا جا رہا تھا۔ ناصر اُسے دوڑا رہا تھا۔ اونٹ رن کچھ اور حیدر آباد کا ریگستان پار کر گیا۔ ناصر اُس کی پیٹھ پر ہی اُونگھ لیتا تھا اور اونٹ کو بہت تھوڑا آرام دیتا تھا۔

سلطان محمود اپنے پڑوسیوں اور دُشمنوں کو ایک معاہدے کا پابند کر کے اور ہر ایک سے فوج کی کچھ نفری لے کر غزنی پہنچ گیا تھا۔ دو چار روز بعد اُسے اطلاع دی گئی کہ ہندوستان سے غزنی کی فوج کا ایک محافظ (باڈی گارڈ) ناصر الدولہ آیا ہے۔ سلطان نے اُسے فوراً پیش کرنے کو کہا۔

ناصر کو اندر لے جایا گیا۔ دو آدمیوں نے اُسے سہارا دے رکھا تھا۔ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ اُس کا سَر ڈول رہا تھا چہرہ لاش کی طرح ہو چکا تھا سلطان کے حکم سے اُسے سلطان کے پلنگ پر لٹا دیا گیا اور طبیب کو بلایا گیا طبیب نے اُس کے منہ میں کوئی دوائی ڈالی اور اُس نے کہا کہ اس پر غشی بھی طاری ہے اور نیند بھی۔ اسے جگایا نہ جائے۔ طبیب اپنے ہاتھ سے اُس کے منہ میں شہد ڈالتا رہا۔

کئی گھنٹوں بعد ناصر ہوش میں آیا اور بیدار ہُوا۔ اُسے کچھ کھلایا پلایا گیا تو وہ بولنے کے قابل ہُوا۔ اُس نے سُلطان کو بتایا کہ اُسے اور شگفتہ کو کس طرح اغوا کر کے سومنات تک لے جایا گیا اور وہ کس طرح وہاں سے فرار ہُوا اور اُونٹ پر یہاں پہنچا ہے۔ اُس نے سومنات کے متعلق سلطان کو تفصیلات سنائیں اور کہا کہ وہاں کے مسلمان اُس مجاہد کی راہ دیکھ رہے ہیں جو انہیں ہندوؤں کی درندگی سے نجات دلائے گا۔ ناصر نے سلطان کو چھوٹی سی مسجد کے پیش امام کا پیغام دیا۔

"یہ ہے وہ مہم جس کے اشارے مجھے میری رُوح دے رہی تھی" ـــــ سلطان محمود نے کہا اور اُس نے ہندوستان کا نقشہ اپنے سامنے رکھ لیا۔ دیبل کے مقام پر انگلی رکھ کر اُس نے

کہا۔ "محمد بن قاسم نے پہلا معرکہ یہاں لڑا تھا..... اور یہ ہے سومنات"۔ اس نے اُسی وقت اپنے سالار ابوعبداللہ محمد الطائی کو بلا لیا۔

"ابوعبداللہ!"۔ سلطان محمود نے کہا۔ "مجھے ایسے محسوس ہو رہا ہے جیسے یہ میری آخری جنگی مہم ہوگی۔ نقشہ دیکھو۔ بڑا ہی لمبا سفر ہے اور بڑا ہی دشوار لیکن ہمیں اس سفر پر روانہ ہونا ہے۔ اگر میں وہاں تک زندہ پہنچ گیا تو میں تاریخ میں ایسے باب کا اضافہ کر جاؤں گا جو میری تمام فتوحات پر غالب آئے گا اور آنے والی نسلیں میرے نام کے ساتھ سومنات کا نام ضرور لیا کریں گی"۔

ابوعبداللہ نقشے کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ پہاڑوں میں بھی لڑا تھا، جنگلوں، میدانوں اور صحراؤں میں بھی لڑا تھا۔ اس نے دریائی معرکے بھی لڑے تھے لیکن نقشے پر سومنات پر نظریں جما کر وہ گہری سوچ میں کھو گیا کہ وہ اپنی فوج وہاں تک پہنچا سکیں گے!"

"جانتے ہو محمد بن قاسم کہاں سے آیا تھا؟"۔ سلطان محمود نے کہا۔ "میں اس کی تاریخ اور روایت کو زندہ کرنا چاہتا ہوں"۔

"لاہور ہمارا اپنا ہے"۔ ابوعبداللہ نے کہا۔ "وہاں سے ہم رسد وغیرہ لے سکتے ہیں۔ اس سے آگے ملتان ہمارا اپنا ہے۔ وہاں سے اونٹ لینے پڑیں گے۔ آگے بڑا وسیع صحرا ہے"۔

"سب کچھ ہے میرے رفیق!"۔ سلطان محمود نے کہا۔ "آؤ۔ بیٹھو۔ ایمان اور ارادہ مضبوط ہو تو کٹھن سفر بھی سہل ہو جایا کرتے ہیں"۔

دونوں نقشے پر جھک گئے اور بہت دیر منصوبہ بناتے رہے۔

سلطان محمود کو شاید احساس نہیں تھا کہ وہ ایسی مہم سر کرنے جا رہا ہے جو سر ہو گئی تو یہ اسلام کی ہندومت پر سب سے بڑی فتح ہوگی اور خود ہندوؤں کو اپنے عقیدوں پر شک ہونے لگے گا۔

غزنی سے سلطان محمود کے کوچ کی تاریخ اور سال کے متعلق مؤرخوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اُس وقت کی تحریروں سے شہادت ملتی ہے کہ سلطان محمود نے ۱۸/اکتوبر ۱۰۲۵ء/ ۲۲ شعبان ۴۱۶ھ غزنی سے کوچ کیا تھا۔ کسی بھی مؤرخ نے نہیں لکھا کہ اُس کی فوج کی تعداد کیا تھی۔ ہر ایک نے تیس ہزار گھوڑ سوار لکھے ہیں۔ بعض نے تیس ہزار رضاکار لکھے ہیں جنہوں نے سلطان سے کہا تھا کہ وہ باقاعدہ فوج کی طرح تنخواہ نہیں لیں گے۔ یہ صحیح ہے کہ تیس ہزار رضاکار تھے اور وہ ترکستانی تھے۔

سلطان محمود جب ہندوستان کی سرحد میں داخل ہُوا تو اُس نے لاہور کو نظر سے نکال دیا۔ اُس نے ملتان کا رخ کر لیا۔ اتنی بڑی فوج دیکھ کر یہاں کے لوگوں میں تجسس کی لہر دوڑ گئی کہ سلطان اتنی زیادہ فوج لے کر کیوں آیا ہے۔

فوج ۱۵رمضان المبارک (۹ نومبر ۱۰۲۵ء) کے روز ملتان پہنچی۔ سلطان محمود نے سومنات کے متعلق ناصرالدولہ کی اطلاع پر فوراً کوچ کا حکم اس وجہ سے بھی دے دیا تھا کہ سردیوں کے موسم کا آغاز تھا اور یہی موسم برق رفتار پیش قدمی کے لیے موزوں تھا، ورنہ ملتان اور بہاول پور سے آگے جو ریگزار تھا وہ اُس کی فوج کا دم خم توڑ دیتا اور فوج جنگ کے لیے بے کار ہو جاتی۔

سلطان محمود کی ملتان میں آمد تیز و تند طوفان کی آمد تھی۔ اُس نے ملتان میں مقیم اپنے حکام کو اکٹھا کر کے کہا کہ فوراً اسے سومنات تک کے راستے کی دشواریوں اور دشمن کی رکاوٹوں کے متعلق مکمل معلومات دی جائیں اور یہ خاص انتظام کیا جائے کہ دشمن کے جاسوسوں کو یہ نہ پتہ چلے کہ غزنی کی فوج کا کیا ارادہ ہے۔

اتنی بڑی فوج کی اچانک آمد اور اس کے کوچ کو پوشیدہ رکھنا ممکن نہ تھا۔ ملتان میں جاسوس موجود تھے۔ وہاں ہندو بھی آباد تھے بلکہ ہندوؤں کی آبادی زیادہ تھی۔ ملتان میں غزنی کی جو فوج اور انتظامیہ موجود تھی، اس میں ایمان فروش بھی موجود تھے۔ ہندوؤں نے اپنی خوب صورت بیٹیوں اور زر و جواہرات کا جادو چلا رکھا تھا۔ انہیں ایک ہی دن میں معلوم ہو گیا کہ سلطان محمود سومنات جا رہا ہے۔ ہندوؤں

کا شودیو سومنات میں تھا۔ شودیو اُن کے دیوی دیوتاؤں کا دیوتا تھا۔ سومنات کی تباہی تو دُور کی بات ہے، اس کی صرف توہین کو ہی ہندو اپنی تباہی سمجھتے تھے۔ انہیں جب پتہ چلا کہ سلطان سومنات جا رہا ہے تو وہ کانپ اُٹھے۔ انہوں نے اپنی نوجوان بیٹیوں کی عصمت اور نقدی کی تھیلیوں کے عوض یہ راز حاصل کیا اور اسی وقت درپردہ قاصد دوڑا دیئے۔

اُن کے قاصد اُن چھوٹے چھوٹے راجوں اور اُن بڑے مہاراجوں تک پہنچے جن کے ساتھ ابھی سلطان محمود کی ٹکر نہیں ہوئی تھی۔ ہندوؤں نے سومنات کو بھی قاصد بھیج دیئے کہ مہاراجہ کنور رائے کو خبردار کر دیں اور وہ غزنی کی فوج کو سومنات سے دور ہی روک لے۔

اِدھر سلطان محمود اونٹوں اور پانی کا انتظام کر رہا تھا۔ اس دوران اُسے ملتان کے ایک صوفی بزرگ ملے جنہوں نے اُسے کہا کہ اے سلطان! سومنات کو اُن قلعوں جیسا قلعہ نہ سمجھنا جو تم نے اب تک سر کیے ہیں، اور سومنات کو اُن مندروں جیسا مندر نہ سمجھنا جو تم نے اب تک تباہ کیے ہیں۔ سومنات پر حملہ ایسے ہی ہے جیسے ہندو خانہ کعبہ پر حملہ کر دیں۔ کیا ساری دُنیا کے مسلمان نہیں تڑپیں گے؟ سومنات میں تمہارا مقابلہ بڑا ہی سخت ہوگا، اور ذہن میں رکھو کہ یہ ایک قلعے یا ایک مندر کی نہیں، یہ اسلام اور ہندو مذہب کی جنگ ہوگی۔ یہ دو عقیدوں کا تصادم ہوگا۔ یہ صحیح معنوں میں حق اور باطل کا مقابلہ ہوگا۔ اگر تم ہار گئے تو سمجھ لو کہ اسلام ہار گیا۔ ہندوؤں کا یہ عقیدہ جڑ پکڑ جائے گا کہ اُن کا شودیو سچا ہے اور اُس کی طاقت کے آگے کوئی ٹھہر نہیں سکتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ساحلی علاقوں کے مسلمان ہندو ہو جائیں گے یا انہیں ہندو بنا لیا جائے گا۔

”معلوم ہوتا ہے میں بہت بڑا خطرہ مول لے رہا ہوں۔“ سلطان محمود نے کہا۔

”زندگی کا اور اپنی جنگوں کی تاریخ کا سب سے بڑا خطرہ!“ بزرگ نے کہا۔ ”جنگی امور کو تم اچھی طرح سمجھتے ہو۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں صرف یہ بتا سکتا ہوں کہ دشمن تم سے بے خبر نہیں۔ اپنی چارپائی کے نیچے لاٹھی پھیرو۔ اپنی آستین میں جھانکو۔ تمہارے

چراغ کے نیچے اندھیرا ہے۔“

”کیا آپ مجھے کوئی ٹھوس بات بتا سکتے ہیں؟“ — سلطان محمود نے پوچھا۔

”میرے شاگردوں نے تمہارے ایک حاکم کے متعلق بتایا ہے کہ وہ اپنا ایمان ہندوؤں کے ہاتھوں فروخت کر چکا ہے۔“ — بزرگ نے کہا۔ ”یہ حاکم شمرورع سے ملتان میں ہے۔ آج رات یا کسی رات جب رات آدھی گزر جائے تو اُس کے گھر پر نظر رکھنا۔ اُس کے گھر کوئی آئے گا یا وہ کسی کے گھر جائے گا۔“

*

اُسی رات سلطان محمود کو اُس نائب سالار نے جسے سلطان نے اس حاکم کے گھر پر نظر رکھنے پر مامور کیا تھا اطلاع دی کہ وہ حاکم ایک لمبا چغہ پہن کر اور سر پر کپڑا ڈال کر گھر سے نکلا اور ایک ہندو کی حویلی میں چلا گیا ہے۔

سلطان محمود نے حکم دیا کہ اُس مکان کو محاصرے میں لے کر کسی طرح اُوپر چڑھا جائے اور اوپر سے کود کر اندر جایا جائے تاکہ اُس حاکم کو جرم کی حالت میں پکڑا جائے۔

حکم کی تعمیل بلاتاخیر ہوئی۔ حویلی کے دروازے پر اس لیے دستک نہ دی گئی کہ اندر کے لوگ اِدھر اُدھر ہو جائیں گے۔ حویلی کے آگے اور پیچھے آدمی کھڑے کر دیئے گئے۔ ساتھ والے مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ جونہی دروازہ کھلا غزنی کے فوجی اندر چلے گئے اور گھر کے مکینوں سے پوچھ کر کہ ساتھ والی حویلی میں کس طرح اترا جا سکتا ہے، اوپر چلے گئے۔ نیچے اُترنے کا راستہ بند تھا۔ منڈیر سے رسہ لٹکا کر ایک آدمی نیچے اُترا۔

اُسے کسی نے للکارا۔ اُسے شاید ڈاکو سمجھا گیا تھا۔ اوپر سے آواز آئی — ”تم جہاں ہو وہیں کھڑے رہو ورنہ تیر آتا ہے۔ ہم ڈاکو نہیں ہیں۔“

دس بارہ آدمی رسّے سے نیچے اُتر گئے اور للکارنے والے آدمی سے پوچھا کہ غزنی کا حاکم کون سے کمرے میں ہے۔ دو کمروں کے دروازے بیک وقت کھلے۔ گھبرائے ہوئے دو تین آدمی باہر آئے اور وہ پھر اندر چلے گئے۔ غزنی کے فوجی دوڑتے

اندر گئے۔ بزرگ نے جس حاکم کی نشاندھی کی تھی وہ ایک کمرے میں تھا۔ وہ ایک میز کی طرف لپکا۔ چھاپہ مارنے والے ایک آدمی نے تلوار کی نوک اُس کے پہلو کے ساتھ لگا کر کہا۔ ”ہاتھ پیچھے رکھو“۔ حاکم رُک گیا۔ میز پر ایک کاغذ پڑا تھا۔ دیکھا کہ اس پر پنسل سے ایک نقشہ بنا ہُوا تھا۔ وہ اُٹھا لیا گیا۔

کمرے میں تین لڑکیاں تھیں جن کے حُسن، چہرے اور بدن کی ساخت میں طلسماتی اثر تھا۔ فانوس کی روشنی کے کئی رنگ تھے۔ اس روشنی میں ان کا سراپا دیکھنے والوں کو مسحور کر رہا تھا۔ وہ نیم برہنہ تھیں۔ دوسرے کمرے سے چار ہندوؤں کو پکڑا گیا۔ سب نے شراب پی رکھی تھی۔ ہندوؤں نے چھاپہ مارنے والوں کے آگے سونے کی اشرفیوں سے بھری ہوئی تھیلیاں رکھ دیں اور اُنہیں لڑکیاں پیش کیں اور کہا کہ وہ اُن جیسی جتنی لڑکیاں چاہیں حاضر کی جائیں گی۔ ہندوؤں نے انہیں کہا کہ وہ واپس اپنے سلطان کے پاس نہ جائیں۔ اُنہیں ہمیشہ کے لیے ایک محل میں جو بڑی ہی خوبصورت جگہ ہے شہزادوں کی طرح رکھا جائے گا۔ یہ لڑکیاں اُن کے ساتھ رہیں گی۔

مسلمان حاکم پر سکتہ طاری تھا۔ شراب اور ہوس پرستی کا نشہ اُتر چکا تھا۔ ان سب کو گھسیٹ کر لے جایا گیا۔ سلطان محمود جاگ رہا تھا۔

*

سلطان محمود نے لڑکیوں کو، اشرفیوں کی تھیلیوں کو اور شراب کی صراحیوں کو دیکھا، اور اُس نے اپنے حاکم کو دیکھا جو چھ برس سے ملتان میں تھا۔ اُس کے منہ سے شراب کی بُو آ رہی تھی۔ سلطان کو وہ کاغذ دیا گیا جس پر نقشہ بنا ہُوا تھا۔

”اگر تم بچے ہوتے، کمسن اور نادان ہوتے تو میں تمہیں بتاتا کہ تم نے جو کچھ کیا یہ گناہ کبیرہ ہے“۔ سلطان محمود نے اپنے حاکم سے کہا۔ ”تم جانتے ہو تم کیا کر رہے تھے۔ اب میں تم سے توقع رکھوں گا کہ مجھے سب کچھ بتا دو۔ تمہارا جرم میرے سامنے کُھل چکا ہے کہ تم مجھے نہیں، سلطنتِ غزنی کو بھی نہیں، اسلام کو دھوکہ دے رہے تھے۔ اس کی سزا تم جانتے ہو۔ اب تم نے اپنا ایمان نیلام کر کے ان کفار کے لیے جو کچھ کیا ہے وہ بتا دو۔ خدا تمہیں بخش دے گا۔ اگر نہیں بتاؤ گے

تو تم جانتے ہو کہ تم جیسوں کی زبان کس طرح کھلوائی جاتی ہے۔ ان ہندوؤں میں اتنی طاقت نہیں کہ تمہیں مجھ سے اور اپنے جرم کی سزا سے بچا سکیں۔ ان پریوں جیسی دلکش لڑکیوں میں، اس شراب میں اور ان تھیلیوں میں اتنی طاقت نہیں کہ تمہیں خدا کے قہر سے بچا سکیں..... بولو“۔

حاکم سلطان کے قدموں میں گر پڑا اور سر اُس کے پاؤں میں رکھ دیا۔

”پیچھے رہو“۔ سلطان اُچھل کر پیچھے ہٹا اور گرجا۔ ”اپنا ناپاک ماتھا میرے پاؤں سے نہ لگانا۔ میں وضو سے ہوں۔ مجھے روزہ رکھنا ہے“۔ اُس نے ہندوؤں کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں عتاب تھا۔ اُس نے کہا۔ ”تم بولو اور فوراً بولنا شروع کر دو“۔ اُس نے لڑکیوں کی طرف دیکھا اور حکم دیا۔ ”ان تینوں کو ایک ہی کوٹھڑی میں بند کر دو اور انہیں تا مرگ اسی کوٹھڑی میں رکھو“۔

ایک ہندو ہاتھ جوڑ کر آگے ہو گیا اور سلطان سے التجا کی۔ ”سلطان مہاراج! ان میں ایک میری بیٹی ہے۔ دوسری دو بھی معزز گھرانوں کی ہیں۔ ان کا کوئی قصور نہیں“۔

سلطان نے لڑکیوں سے پوچھا۔ ”کیا تمہیں زبردستی اس کمرے میں لے جایا گیا تھا؟ کیا تمہیں معلوم نہیں تھا کہ تم سے کیا کام لیا جائے گا؟“

”معلوم تھا“۔ ایک لڑکی نے بڑی دلیری سے جواب دیا۔ ”ہمیں زبردستی نہیں لے جایا گیا تھا۔ آپ یہ نہ سمجھنا کہ جسم بیچنا ہمارا پیشہ ہے۔ ہم معزز خاندانوں کی لڑکیاں ہیں۔ ہم اپنے دھرم کی پاسبان ہیں۔ ہم نے جو کچھ کیا اپنا فرض سمجھ کر کیا۔ ہم اپنے اُن مندروں کا انتقام لے رہی ہیں جنہیں آپ نے ناپاک اور تباہ کیا ہے“۔

سلطان محمود کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔ اُس نے اپنے مجرم حاکم سے طنزیہ کہا۔ ”میں نے اس پوری قوم کو شکست دی ہے۔ میرے اللہ کے سپاہیوں نے اس قوم کے دیوتاؤں کو شکست دی ہے مگر تم سے ان لڑکیوں نے ہتھیار ڈلوا لیے ہیں اور تم اپنی پوری فوج کو شکست دلوانے کا اہتمام کر رہے تھے“۔

”ہم اُس قوم کی بیٹیاں ہیں“۔ دوسری ہندو لڑکی نے کہا۔ ”جس کی عورتیں اپنے مرے ہوئے خاوندوں کے ساتھ زندہ جل جایا کرتی ہیں۔ اپنے دھرم اور

دیس کے لیے ہم فخر سے اپنا جسم استعمال کرتی ہیں۔"

"اس دھرتی پر اسلام نہیں رہے گا۔" تیسری لڑکی نے کہا۔ "ہمیں ہمارے مذہبی پیشواؤں نے سبق دیا ہے کہ اپنے حُسن اور جسم کو میٹھا زہر سمجھو اور اس سے اپنے دھرم کے دشمن کو مارو ..... ہم آپ سے صرف یہ عرض کرتی ہیں کہ ہمیں فوراً ہلاک کر دیا جائے۔ اذیت دے کر نہ مارا جائے۔"

"میں تمہیں خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں۔" سلطان نے ترجمان کی وساطت سے لڑکیوں سے باتیں کر رہا تھا کہا۔ "جس دھرم کی بنیاد عورت اور ریاکاری پر رکھی گئی ہو اس کی عورتیں تمہاری طرح فخر سے بدی کا ارتکاب کیا کرتی ہیں۔ میں تمہاری خواہش پوری کروں گا۔ تمہیں فوراً ہلاک کر دیا جائے گا ..... لے جاؤ انہیں۔"

*

مجرم حاکم اور اس کے ہندو ساتھیوں نے بتا دیا کہ وہ کیا کر رہے تھے۔ اس حاکم کو ہندوؤں نے اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ اب اسی نے انہیں بتایا تھا کہ سلطان محمود سومنات کو تباہ کرنے کے لیے جا رہا ہے اور اس کے حکم سے آگے کے علاقے دیکھنے کے لیے آدمی چلے گئے ہیں۔ اس ٹولے نے پہلا کام یہ کیا کہ راجوں مہاراجوں کو اطلاع دینے کے لیے قاصد دوڑا دیئے اور سومنات والوں کو بھی خبردار کرنے کے لیے آدمی بھیج دیئے تھے۔ مسلمان حاکم نے ان قاصدوں سے یہ کہا تھا کہ وہ راجوں وغیرہ سے کہیں کہ جب غزنی کی فوج بہاول پور سے آگے بیکانیر کے صحراؤں سے گزر رہی ہو تو اس پر شب خون ماریں اور زیادہ تر تیر استعمال کریں۔ پانی اونٹوں پر ساتھ جا رہا تھا۔ اونٹوں پر لدے ہوئے مشکیزے تیروں سے چھلنی کرنے ہیں۔

ان کی سکیم یہ بھی تھی کہ تمام راستے غزنی کی فوج کو پریشان رکھا جائے اور اسے پانی سے محروم کیا جائے۔ زیادہ سے زیادہ اونٹ مارے جائیں اور دور آگے جا کر وہاں کے مقامی آدمیوں کے بھیس میں کچھ آدمی سلطان کو ملیں اور کہیں کہ وہ اس کی فوج کو قریبی اور آسان راستے سے کاٹھیاواڑ تک پہنچا دیں گے۔ یہ سلطان کو گمراہ کرنے

کا اہتمام تھا۔ جو نقشہ ہندوؤں کی حویلی سے برآمد ہوا تھا، اس میں وہ مقام اور علاقے بنے ہوئے تھے جہاں غزنی کی فوج پر شب خون مارنے تھے اور جہاں سے سلطان کو غلط راستے پر ڈالنا تھا۔

سلطان محمود نے ان سے سب کچھ اگلوا لیا تو اپنا فیصلہ سنایا۔ "ان ہندوؤں سے ان کے تمام ساتھیوں کی نشاندہی کراؤ اور ان سب کو گرفتار کر دو۔ میرے پاس لانے کی ضرورت نہیں۔ ان سب کو کوٹھڑیوں میں بند کر دو تا آنکہ یہ سب مر جائیں۔ سب کی لاشیں باہر پھینک دینا۔ ان کے جو مسلمان ساتھی ہیں، وہ کال کوٹھڑیوں میں مر جائیں تو ان کی لاشیں بھی ان کے ساتھ پھینک دینا۔ دفن نہ کرنا۔ یہ روزِ قیامت ان کافروں کے ساتھ اٹھائے جائیں گے۔" مجرم حاکم کے متعلق اس نے حکم دیا "جب فوج سومنات کو کوچ کرے، اس غدار کے پاؤں باندھ کر ایک گھوڑے سے پیچھے باندھ دیا جائے۔ جہاں یہ مر جائے اس کی لاش وہیں پھینک دی جائے۔"

فرخی سلطان محمود کا درباری شاعر تھا۔ اس نے سلطان کے سومنات پر حملے کی پیش قدمی، راستے کی دشواریوں اور سومنات کی فتح کی منظوم داستان لکھی تھی۔ اس کی صورت ایک قصیدے کی ہے۔ اس میں ایمان فروشوں کی غداری کا ذکر ہے۔ اس کا مختصر سا ذکر "تاریخ فخر الدین مبارک شاہ" میں بھی ملتا ہے اور اس میں یہ بھی تحریر ہے کہ جب غداری بے نقاب ہو گئی تو اس رات تراویح کے بعد سلطان محمود نادر شکرانے کے نوافل پڑھتا رہا۔ صبح اس نے اپنے رفیقوں سے کہا کہ میرے اللہ کو مجھ سے کوئی بڑا ہی عظیم فرض ادا کرانا ہے۔ اسی لیے اس ذاتِ باری نے مجھے تاریکی میں روشنی دکھائی ہے، ورنہ اندھیرے میں یہ سانپ مجھے ڈس لیتے۔

جو پارٹی آگے کے علاقے دیکھنے گئی تھی، اس نے بتایا کہ سب سے بڑی دشواری صحرا پیدا کرے گا۔ پانی کا دور دور تک نشان نہیں۔ سلطان محمود نے پانی کا یہ انتظام کرا لیا تھا کہ تیس ہزار اونٹ جمع کر لیے جن پر پانی کے مشکیزے لادے گئے تھے۔ گھوڑوں کو بھی پانی پلانا تھا۔ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ ہر گھوڑ سوار کو پانی سے لدے

ہوئے دو اونٹ دیئے گئے تھے۔ دو مؤرخین نے اونٹوں کی تعداد بیس ہزار لکھی ہے لیکن اکثریت نے تعداد تیس ہزار بتائی ہے جو صحیح معلوم ہوتی ہے۔ اونٹوں کے علاوہ ہر پیادہ سپاہی اور سوار کو حکم تھا کہ وہ جتنا پانی چھوٹے مشکیزوں میں اٹھا سکتا ہے، ساتھ رکھے۔

سلطان محمود نے خدا کا شکر اس لیے ادا کیا تھا کہ اُسے پہلے ہی پتہ چل گیا تھا کہ راجوں مہاراجوں نے اُسے راستے میں پریشان کرنے کا انتظام کر رکھا ہے۔ دشمن کے شبخونوں سے دوسرے نقصان کے علاوہ ایک نقصان یہ بھی متوقع تھا کہ کوچ کی رفتار بہت سست ہو جائے گی۔ اگر اُسے یہ اطلاع نہ ملتی تو اُس نے فوج کو قافلے کی صورت میں لے جانے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ اب اُس نے کوچ کی ترتیب بدل دی۔ سب سے پہلے اُس نے راستے کا تعین کیا۔

اُس نے ہراول کو یوں تقسیم کیا کہ دیکھ بھال کی پارٹیاں الگ کر دیں جنہیں بکھر کر بہت آگے آگے جانا تھا۔ دائیں اور بائیں کے لیے لڑاکا جیش الگ کیے جنہیں فوج اور دیکھ بھال پارٹی کے درمیان جانا تھا لیکن دائیں اور بائیں دور دور رہ کر، تاکہ دشمن کی چھاپہ مار پارٹیوں کو فوج سے دور ہی اُلجھا لیا جائے۔ پڑاؤ کی صورت میں اور رات کو کوچ کے دوران ان جیشوں کو باری باری ساری رات جاگنا اور چوکنا رہنا تھا۔ رسد اور پانی والے اونٹوں کی حفاظت کا یہ انتظام کیا گیا کہ سوار دستوں کو ان کے دائیں اور بائیں رہنا تھا۔

غزنی کی فوج کی ایک خوبی تو یہ تھی کہ اس کا کمانڈر سلطان محمود تھا جس نے جنگی چالوں میں تاریخ میں نام پیدا کیا ہے۔ دوسری خوبی یہ کہ اس کے چھاپہ مار جیش صحیح معنوں میں جانباز اور ذہین تھے۔ سلطان محمود ان کی تقسیم اور ان کا استعمال دانشمندی سے کرتا تھا۔ تیسری خوبی یہ کہ ہر سپاہی اپنے سلطان کے لیے نہیں بلکہ اپنے مذہبی عقیدے اور نظریے کے لیے لڑتا تھا۔ یہ سلطان محمود کی تربیت کا اثر تھا۔ سب سے بڑی خوبی تیز رفتاری تھی۔ جنگ کے دوران دستوں تک احکام اور ہدایات پہنچانے کا انتظام بہت تیز تھا اور جونہی کسی بڑے یا چھوٹے کمانڈر کو کوئی

حکم پہنچتا تھا، اس پر نہایت تیزی سے عمل ہوتا تھا۔ جنگ کے دوران دستوں کی نقل و حرکت اتنی تیز ہوتی تھی کہ دشمن بوکھلا جاتا تھا۔

۱۲ شوال ۴۱۶ھ (۲۶ نومبر ۱۰۲۵ء) عیدالفطر کے دو روز بعد سلطان محمود نے ملتان سے کوچ کا حکم دیا۔ عیدالفطر کے روز اُس نے خطبے سے پہلے تمام فوج سے خطاب کیا:

"آپ سب کو عید مبارک ہو۔ یہ خیال ذہن سے نکال دیں کہ ہم وطن سے دور عید منا رہے ہیں۔ جس زمین پر شہیدوں کا خون بہہ جاتا ہے، وہ مجاہدینِ اسلام کا وطن بن جاتا ہے۔ جہاں مردِ مجاہد کی اذان گونجتی ہے وہ اُس کا وطن ہے۔ ہندوستان تمہارا ہے .... یہ عید ہم میں سے کسی ایک کی آخری عید ہوگی۔ ہم ایک ایسی مہم پر جا رہے ہیں جو ہماری زندگی کا سب سے زیادہ کڑا امتحان ہے۔ ہندو کہتے ہیں کہ مسلمان تباہ ہونے کے لیے سومنات جا رہے ہیں۔ آپ کو اب جو بُت توڑنا ہے اُسے ہندو طاقت کا دیوتا کہتے ہیں۔ آپ کو یہ ثابت کرنا ہے کہ طاقت اللہ کے پاس ہے۔ پتھر کا بُت ٹوٹنے میں سخت ہو سکتا ہے، طاقتور نہیں ہو سکتا۔ آپ کو ہندوؤں کے اس عقیدے کو توڑنا ہے۔"

سلطان نے اپنی فوج کو بتایا کہ محمد بن قاسم کتنی دور سے کتنی مشکلات اور دشواریوں میں سے گزر کر ہندوستان میں آیا تھا۔ سلطان نے کہا کہ سومنات کے مندر میں آپ جیسے مسلمان جوان آدمیوں کو ذبح کیا جاتا ہے اور تمہاری بہنوں اور بیٹیوں جیسی مسلمان لڑکیوں کو ہندو اغوا کر کے مندر کے پنڈتوں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ انہیں عریاں کر کے نچایا جاتا ہے اور تم سمجھ سکتے ہو کہ ان کے ساتھ اور کیا سلوک ہوتا ہوگا۔ کیا تمہاری غیرت یہ گوارا کر سکتی ہے؟

سلطان نے فوج کو ناصر اور شگفتہ کا واقعہ سنایا اور کہا — "اس کنواری مسلمان بیٹی کی لاش کنوئیں سے نکال کر کہیں باہر پھینک دی گئی ہوگی۔ اُس نے اپنی عزت پر جان قربان کی ہے۔ اُس کی روح مجھے راتوں کو بے چین رکھتی ہے۔ ہمیں قوم کی اس بیٹی کا انتقام لینا ہے۔"

سلطان محمود کا یہ خطاب اس قدر جذباتی اور اشتعال انگیز تھا کہ فوج بے چین ہوگئی اور نعروں سے سپاہیوں کے سینے پھٹنے لگے۔ یہی سلطان کا مقصد تھا۔ اس نے فوج کو راستے کی دشواریوں اور خطروں سے آگاہ کیا اور انہیں جذباتی اور ذہنی طور پر ہر خطرے کے لیے تیار کر لیا۔

*

مؤرخوں نے لکھا ہے کہ فوج کو ایسی ترتیب سے کوچ کرایا گیا کہ سب سے آگے والے آدمی اور سب سے پیچھے والے آدمی کے درمیان ایک سو میل کا فاصلہ تھا۔ فوج ایسے صحرا میں داخل ہوگئی جس کے متعلق سلطان نے معلومات لے لی تھیں مگر صحرا میں اور آگے جا کر اسے احساس ہوا کہ اُسے کچھ بھی نہیں بتایا گیا تھا۔

یہاں ایک غلط فہمی دور کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ متعدد تاریخوں میں لکھا ہے کہ سلطان محمود ملتان سے اجمیر گیا جہاں مہاراجہ اجمیر سے اُس کی لڑائی ہوئی اور سلطان نے مہاراجہ کو شکست دی۔ یہ غلط ہے۔ اجمیر اس راستے سے بہت ہی دور ہے جس سے سلطان گیا تھا۔ دوسرے یہ کہ اُس وقت اجمیر کا وجود ہی نہیں تھا۔ اجمیر کا سنگِ بنیاد ۱۱۰۰ء میں یعنی سومنات کی تباہی کے ۷۵ برس بعد رکھا گیا تھا۔ ایک انگریز تاریخ دان مسٹر ڈبلیو ہیگ نے لکھا ہے کہ یہ اجمیر نہیں سانبھر نام کا ایک مقام تھا جو چوہان حکمران کا دارالحکومت تھا۔ اُس دور کا نقشہ دیکھیں تو آپ کو اجمیر کہیں بھی نظر نہیں آئے گا۔

فوج جب بیکانیر کے صحرا میں داخل ہوئی تو رسد اور پانی کے اونٹوں کے دائیں اور بائیں جو سوار دستے تھے، اُن پر رات کو حملہ ہوا جس کی صورت شب خون کی تھی لیکن ہندوؤں کو معلوم نہیں تھا کہ اونٹوں کی حفاظت کا انتظام موجود ہے۔ سواروں کے درمیان وسیع شگاف تھا۔ چھاپہ مار اس میں سے گذرے لیکن اونٹوں تک پہنچنے سے پہلے ہی سواروں کے گھیرے میں آگئے اور مارے گئے۔

دوسرا حملہ دن کے وقت ایسے علاقے میں ہوا جس میں صحرائی ٹیلے اور چٹانیں تھیں۔ ہندو تیر انداز ٹیلوں میں چھپے ہوئے تھے۔ اُن کے تیروں کی پہلی بوچھاڑ نے

کچھ نقصان کیا۔ چار یا پانچ اونٹوں کے جسموں میں تیر لگے۔ وہ بے مہار ہو کر بھاگ اٹھے۔ ہندو چھاپہ ماروں کو یہ خوش فہمی تھی کہ اُن کے عقب میں کچھ بھی نہیں لیکن عقب سے رسالے کا آدھا دستہ آگیا اور چھاپہ مار کچھ مارے گئے اور کچھ پکڑے گئے۔ جو پکڑے گئے ان سے معلوم کر لیا گیا کہ اُن کے باقی چھاپہ مار کہاں کہاں ہیں۔ اس کے مطابق سلطان نے پیش بندی کر لی۔

اگر صرف صحرا کا حساب کیا جائے جو سلطان محمود کی فوج کو عبور کرنا پڑا تو یہ کم و بیش پانچ سو میل تھا۔ آگے دریا بھی تھے۔ صحرا میں گھاس کی پتی بھی نظر نہیں آتی تھی۔ گھوڑوں کو خشک دانہ اور خشک گھاس کھلائی جاتی تھی جس سے انہیں پیاس زیادہ لگتی تھی۔ اونٹ تو صحرائی جانور تھے، آسانی سے چلتے تھے، گھوڑے جلدی تھک جاتے تھے۔ سب سے زیادہ مصیبت پیادہ فوج کے لیے تھی۔ سپاہیوں کے پاؤں ریت میں دھنستے تھے۔

سب سے پہلی بڑی لڑائی لُدراوہ (موجودہ لُدوروا) کے مقام پر ہوئی جہاں دشمن لڑائی کے لیے تیار تھا کیونکہ اُسے قبل از وقت اطلاع مل چکی تھی۔ یہ بارہ دروازوں کا خاصا بڑا شہر تھا۔ سلطان نے شہر کو محاصرے میں لے کر ایسے حملے کیے کہ دشمن گھبرا گیا اور شہر کے دروازے کھل گئے۔ سلطان نے شہر سے پانی اور رسد کا ذخیرہ پورا کیا اور آگے چل پڑا۔

صحرا میں اُسے دشمن سے کئی اور جگہوں پر جھڑپیں لڑنی پڑیں۔ اُس کی ترتیب اور فوج کا پھیلاؤ ایسا تھا کہ معمولی نقصان اٹھا کر دشمن کو بہت زیادہ نقصان پہنچایا گیا۔ دسمبر کے آخر میں یعنی ایک مہینہ صحرا میں گذار کر سلطان پٹن کے مقام پر پہنچا۔ وہاں ہندوؤں کی کم و بیش بیس ہزار فوج نے سلطان کا راستہ روک لیا۔ ہندوؤں کو سلطان کے ارادوں کا علم تھا اس لیے وہ سومنات کو بچانے کے لیے بے جگری سے لڑے مگر شکست کھا گئے۔ سلطان کو خاصا نقصان اٹھانا پڑا۔ اس سے پہلے اُودھے پور کے مقام پر بھی لڑائی ہوئی تھی۔

اب سلطان محمود کی فوج آج کے احمد آباد کے علاقے میں داخل ہو چکی تھی۔

سلطان کو اُس کے دیکھ بھال کے دستوں اور جاسوسوں نے بتایا کہ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے سومنات کے مہاراجہ کو اِدھر اُدھر سے کمک مل رہی ہے اور سومنات تک پہنچنا آسان نہیں ہوگا۔ غزنی کی فوج کا یہ عالم تھا کہ تھک کر چُور ہو چکی تھی۔ صحرا کی صعوبتوں کے علاوہ لڑائیاں بھی لڑنی پڑی تھیں۔ ہندوؤں کی فوج تازہ دم تھی اور دفاعی جنگ لڑنے کے لیے تیار۔ خود سلطان محمود اور اس کے سالارِ اعلیٰ ابوعبداللہ محمد الطائی کی جسمانی حالت دگرگوں ہوتی جا رہی تھی۔ وہ دونوں فوج کا دماغ تھے اس لیے اُن کے سر بھی سوچ سوچ کر دُکھ رہے تھے۔ فرخی نے منظوم داستان میں فوج کی حالت ان الفاظ میں بیان کی ہے:

"قوم کے بہادر تھک کر ایک دوسرے کا سہارا بنتے تھے۔ اُن کی رفتار کم ہو گئی مگر معرکے میں وہ بہت تیز تھے۔"

سلطان محمود کو جب اطلاع ملی کہ ہندوستان سے سومنات کے دفاع کے لیے کمک آ رہی ہے تو اُس نے گائیڈوں سے کمک کے متوقع راستے معلوم کر کے سوار دستے ان راستوں پر بھیج دیئے تاکہ وہ منزل کی طرف پیشقدمی بھی جاری رکھیں اور کمک کو بھی روک لیں۔ اب سواروں کا کام قدرے آسان ہو گیا تھا کیونکہ صحرا ختم ہو چکا تھا۔ موسم سرد تھا۔

*

سلطان محمود ۶ جنوری ۱۰۲۶ء (۱۴ ذی القعد ۴۱۶ھ) بروز جمعرات سومنات کے قریب اُس مقام پر پہنچ گیا جہاں اُسے اپنی فوج اکٹھی کر کے سومنات کو محاصرے میں لینا تھا مگر دشمن اسے سومنات کے باہر ہی روکنے کے لیے تیار تھا۔ سلطان محمود نے کچھ اپنی آنکھوں سے اور زیادہ تر جاسوسوں کے ذریعے دشمن کے متعلق معلومات حاصل کیں۔ سومنات کا شہر قلعے کے اندر تھا اور یہ بہت بڑا شہر تھا۔ اس کے تین طرف سمندر تھا اور سامنے ایک وسیع اور گہری خندق تھی۔

سلطان کو پتہ چلا کہ یہاں دو راجوں کی فوج پہنچی ہوئی ہے جو قلعے سے باہر

تیار ہے۔ شہر کی دیواروں پر فوج کے علاوہ ہندو شہری بھی تیر کمانیں سنبھالے کھڑے تھے۔ یہ شہری غزنی کی فوج کا مذاق اڑا رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ پنڈتوں نے یہ مشہور کر رکھا ہے کہ سلطان محمود ہندوستان میں اتنے مندر تباہ کرنے اور بڑے بڑے طاقتور مہاراجوں کو اس لیے شکست دینے میں کامیاب رہا ہے کہ سومنات کا بت شِودیوا اُن سے ناراض تھا۔ اب شِودیو مسلمانوں کو گھسیٹ کر اپنے گھر لے آیا ہے اور انہیں تباہ و برباد کر دے گا۔ جب شہر کا محاصرہ کیا گیا تو دیواروں سے ہندو کہتے تھے "مسلمانو! تم یہاں تباہ ہونے کے لیے آئے ہو۔ سومنات تم سے اپنی توہین کا انتقام لے گا۔"

مندر کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ دس ہزار پنڈت پوجا میں مسلسل مصروف تھے۔ نوجوان اور حسین داسیاں بھجن گا رہی تھیں اور ناچ بھی رہی تھیں۔ سارے شہر کی عورتیں مندر میں جمع ہو گئی تھیں۔ سومنات کا مہاراجہ کنور رائے قلعے کی دیواروں پر، گلیوں اور بازاروں میں گھوم پھر کر فوج اور شہریوں کو جوش دلا رہا تھا۔ کسی جگہ کا راجہ پرم دیوا اپنی فوج اور اپنا خزانہ لے کر آ گیا تھا۔

سلطان محمود نے ہندوؤں کا یہ جوش و خروش دیکھا تو وہ گہری سوچ میں کھو گیا۔ اُس نے اپنے آپ کو بہت بڑے امتحان میں ڈال دیا تھا۔ وہ شہر کو جلد از جلد فتح کرنے کی سکیم بنانے لگا۔

"ابوعبداللہ!" — اُس نے اپنے سالار سے کہا — "کل جمعۃ المبارک ہے میں کل علی الصبح حملہ کرنا چاہتا ہوں۔ فوج تیار رہے" — اور اُس نے سالارِ اعلیٰ کو اپنی سکیم تفصیل سے بتائی۔

ابوعبداللہ محمد الطائی کے چہرے پر ایسا تاثر تھا جیسے حالات اُن کے خلاف ہیں۔ اُس کا خدشہ غلط نہیں تھا۔

یہ ستارہ بھی ٹوٹ گیا

نوسوپچپن سال

پہلے سومنات کے قلعے کی دیواریں لرز رہی تھیں۔ اندر "ہر ہر مہادیو" کے جے کارے تھے، باہر اللہ اکبر کے نعرے تھے۔ سارا ہندوستان نعروں اور للکاروں کے تصادم سے ہل رہا تھا۔ سلطان محمود غزنوی نے شام کے بعد اپنے سالاروں کو جمع کر رکھا تھا۔ اس نے سب کے چہروں پر نظریں دوڑائیں۔

"آپ جو محسوس کر رہے ہیں وہ آپ کے چہروں پر لکھا ہے" — سلطان محمود نے کہا "میرا احساس آپ سے مختلف نہیں۔ کیا آپ نے یہ بھی محسوس کیا ہے کہ ہم ایسا کیوں محسوس کر رہے ہیں جیسے یہ ہماری زندگی کا شاید آخری معرکہ ہوگا؟ ... اس لیے کہ اس سے پہلے ہم قلعے فتح کرتے رہے ہیں۔ ہم مہاراجوں کے خلاف لڑتے رہے ہیں مگر سومنات نہ ان قلعوں جیسا قلعہ ہے جو آپ نے آج تک فتح کیے ہیں، نہ یہ ان مہاراجوں جیسے کسی مہاراجے کی جنگ ہے جنہیں آج تک آپ نے شکست دی ہے۔ آج آپ ایک مذہب اور ایک عقیدے کو سر کرنے آئے ہیں۔ مذہب باطل ہو تو بھی اس کے پیروکار اس کی آن پر مرمٹتے ہیں۔ سومنات ہندوؤں کا قبلہ و کعبہ ہے۔ آپ نے قلعے کی دیواروں پر ان کا ہجوم اور ان کا جوش و خروش دیکھ لیا ہے۔ وہ زندگی اور موت کا معرکہ لڑنے کے لیے تیار ہیں ....

"یہاں ہمیں کسی جاسوس کی راہنمائی حاصل نہیں۔ مجھے کچھ خبر نہیں کہ قلعے کے اندر کیا ہے اور جب ہم، اللہ کو منظور ہوا، قلعے کے اندر چلے گئے تو ہمیں بتلانے والا کوئی نہ ہوگا کہ ہمارا مقابلہ کرنے کتنا ہجوم آئے گا اور کدھر کدھر سے آئے گا۔ ہمیں صرف باہر

کی خبریں مل سکتی ہیں اور مل رہی ہیں۔ دو مہاراجوں کی فوجیں ہمارا محاصرہ توڑنے کے لیے آرہی ہیں۔ وہ ہم پر عقب سے حملہ کریں گی۔ میں آپ کو اپنی فوج کی تقسیم بتا چکا ہوں۔ میں آپ کو دوسرے خطروں اور دشواریوں سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ ناتجربہ کار نہیں ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ جو فوج اپنے وطن سے اتنی دور لڑنے جاتی ہے، اسے دشمن تیروں اور تلواروں سے مارنے کی بجائے بھوکا اور پیاسا مار سکتا ہے۔ یہاں کی ہوائیں بھی ہماری دشمن ہیں۔ ہمیں کہیں سے بھی رسد نہیں مل سکتی۔ تیر جو کمانوں سے نکل جائیں گے، وہ واپس نہیں آئیں گے ....

"ہمیں کہیں سے بھی کمک نہیں مل سکتی۔ اگر محاصرہ طول پکڑ گیا تو رسد اور فوج کی کمی ہمیں پسپا ہونے پر مجبور کر دے گی۔ میں آپ کو خبردار کرتا ہوں کہ ہم ناکام ہو کر پسپا ہوئے تو فوج بددل ہو جائے گی۔ دشمن ہمیں پسپا نہیں ہونے دے گا۔ ہم میں سے کوئی خوش قسمت ہی پسپائی کی صورت میں زندہ نکل کر جائے گا۔ اس صحرا کو ذہن میں لائیں جس سے گزرتے ہمیں اتنا عرصہ لگا ہے کہ ایک چاند ڈوبا اور ایک ابھرا۔ اس وقت فوج تازہ دم تھی۔ لمبے محاصرے اور ناکامی کے بعد فوج اس صحرا میں سے گزرنے کے قابل نہیں ہوگی۔ یہاں سے غزنی تک کا فاصلہ آپ کے سامنے ہے ....

"میں جانتا ہوں آپ سمجھ رہے ہیں کہ مجھے اپنے وطن سے اتنی دور ایسے شہر کو سر کرنے کے لیے نہیں آنا چاہیے تھا۔ مجھے آپ سے اتفاق ہے لیکن آپ کو میرے ساتھ اتفاق ہوگا کہ عمر طویل نہیں، کام ادھورا رہ گیا ہے۔ آپ میرے مقصد کو سمجھتے ہیں۔ میں سومنات کو تباہ کر کے اسے سمندر میں ڈبو دینے کی قسم کھا چکا ہوں۔"

ایک نائب سالار نے کہا "دخل اندازی کی معافی چاہتا ہوں۔ کیا میں یہ پوچھنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ ہم کیا سارے ہندوستان کے بت توڑ چکے ہیں کہ سومنات ہی رہ گیا تھا؟ اس ایک بت کو توڑ کر اور یہاں کے مندر کو تباہ کر کے کیا سارا ہندوستان مسلمان ہو جائے گا؟ میں کہنا چاہتا ہوں کہ ہمیں اتنی دور آنے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہیے تھا۔"

سالار ابو عبداللہ محمد الطائی بول پڑا۔ اس نائب سالار سے مخاطب ہو کر اس

نے کہا — "مجھے امید ہے کہ آپ یہ تو نہیں کہنا چاہتے کہ آپ دشمن کے خوف کے تحت بات کر رہے ہیں؟"

"بالکل نہیں" — نائب سالار نے جواب دیا — "اگر طارق بن زیاد نے سمندر پار کر کے ایک اجنبی اور دشمن ساحل پر اپنی کشتیاں جلا ڈالی تھیں تو ہم میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہ ہو گا کہ پسپائی کا خیال یا خوف دل میں لائے؟"

"مجھے بہت دیر بعد پتہ چلا ہے کہ سومنات کے بت کو ہندوؤں کے تمام بتوں کا آقا سمجھا جاتا ہے" — سلطان محمود نے کہا — "اگر مجھے اس روز معلوم ہو جاتا جس روز میں نے ہندوستان پر پہلی فوج کشی کی تھی تو میں بسم اللہ سومنات کے بت سے کرتا۔" سلطان محمود نے تفصیل سے بتایا کہ سومنات میں کیا ہے اور ہندوؤں نے یہاں کے بت کے ساتھ کیسی کیسی ناقابل یقین روایتیں اور حکایتیں منسوب کر رکھی ہیں۔ پھر اس نے کہا — "ہم اس مقام پر آ گئے ہیں جہاں سے واپسی ناممکن ہے۔ اگر ہم اپنے اس عظیم فرض کو بھول جائیں جو خدا نے ہمیں سونپا ہے تو ہمیں اپنی زندگی کے لیے لڑنا پڑے گا لیکن آپ سب سالار ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ جو سالار اپنی زندگی کے لیے لڑا کرتے ہیں وہ آگے نہیں پیچھے دیکھا کرتے ہیں اور وہ زندہ واپس نہیں جایا کرتے ....

"میں سومنات کو تباہ کر کے اپنے پیچھے یہ روایت چھوڑ جانا چاہتا ہوں کہ حق کی آواز پہنچانے کے لیے اور رسول عربی کا پیغام پہنچانے کے لیے دنیا کا کوئی خطہ دور نہیں اور کوئی راستہ اتنا دشوار گزار نہیں کہ اللہ کا سپاہی اس سے گزر نہ سکے۔ ہو سکتا ہے ہماری موت کے بعد کوئی اور محمود ہماری بجھی ہوئی مشعل کو اٹھا کر جلا لے اور ہندوستان کے بت خانے مسجدوں اور درس گاہوں میں تبدیل کر دے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو اس ملک میں اسلام اور ہندو مت ٹکراتے رہیں گے اور ہندو محمد بن قاسم اور محمود کا انتقام مسلمانوں سے لیتے رہیں گے ....

"کل جمعۃ المبارک ہے۔ صبح کی روشنی پھیلنے سے پہلے محاصرہ مکمل ہو جانا چاہیے لیکن آپ کو بتایا جا چکا ہے کہ یہ محاصرہ مکمل نہیں ہو گا۔ شہر کے پیچھے تین اطراف سمندر

ہے۔ سامنے خندق ہے۔ آپ کو قلعے پر یلغار کرنی پڑے گی۔ خندق کو ہم عبور کر لیں گے۔ اصل کام تیر اندازوں کو کرنا ہے۔ وہ قلعے کی دیواروں اور برجوں پر تیروں کا مینہ برسائے رکھیں گے۔ سیڑھیاں تیار کی جا چکی ہیں۔ ان سے دیواروں پر چڑھا جائے گا۔ میں جانتا ہوں کہ یہ خودکشی کی کوشش ہو گی لیکن یہ قلعہ بند شہر فتح کرنے کا اور کوئی طریقہ نہیں؟"

یہ ۶ اور ۷ جنوری ۱۰۲۶ء (جمعرات اور جمعہ) کی درمیانی رات تھی۔ سلطان محمود نے چند لمحے بھی آرام نہیں کیا تھا۔ اس کی سکیم کے مطابق فوجوں کی جو تقسیم ہوئی تھی اس پر عمل ہو رہا تھا۔ دستے نقل و حرکت کر رہے تھے۔ انہیں احکام کے مطابق صبح کی روشنی سے پہلے اپنی اپنی پوزیشن پر پہنچنا تھا۔ سب سے زیادہ مشکل کام ان دستوں کا تھا جنہیں شہر کی دیوار اور دروازوں پر یلغار کرنی تھی۔

سلطان محمود نے اپنے سالاروں کو اپنی سکیم ایک بار پھر بتا دی اور کہا — "اب ہندو اپنی بیٹیوں کو ہماری صفوں میں میٹھے زہر کے طور پر استعمال نہیں کر سکیں گے۔" اس نے سالاروں وغیرہ کو رخصت کر دیا۔

یہ تاریخی حقیقت ہے کہ ہندوؤں نے غزنی کی فوج کے سالاروں اور کمانداروں کو گمراہ کرنے اور معلومات حاصل کرنے کے لیے اپنی حسین اور جوان لڑکیوں سے بہت کام لیا تھا لیکن سومنات والوں کو اس وقت پتہ چلا کہ غزنی کی فوج آ رہی ہے جب یہ فوج سومنات سے ایک دن سے بھی کم مسافت جتنی دور رہ گئی تھی۔ ہندو مہاراجہ کنور رائے کو مہلت ہی نہ ملی کہ وہ لڑکیوں والا حربہ استعمال کر سکتا یا غزنی کی فوج میں کوئی اور زہر پھیلا سکتا۔ ہندو جاسوس بھی بے کار ہو گئے تھے۔

*

جس وقت سلطان محمود اپنے سالاروں کے خون کو گرما رہا تھا، اس وقت سومنات کے مندر میں جیسے رات آئی ہی نہیں تھی۔ دس ہزار پنڈت شیو دیوتے کے بت کے آگے اس کیفیت میں عبادت کر رہے تھے جیسے ماتم ہو رہا ہو۔ وہ زور زور کے بھجن گا رہے تھے۔ سینکڑوں حسین اور نیم عریاں جوان لڑکیاں مسلسل رقص میں تھرک رہی تھیں۔

ایک ناچ تھک کر بیٹھی تو دوسری ناچنے لگتی تھی۔ شہری دوڑتے ہوئے مندر میں داخل ہوتے، پنڈتوں کے ہجوم کو چیرتے ہوئے بُت تک پہنچتے اور رو رو کر بُت کے قدموں میں ماتھے رگڑتے تھے۔ پنڈت، لڑکیاں اور شہری شِودیو کا قہر بیدار کرنے کے جتن کر رہے تھے مگر ان کے انداز میں خوف و ہراس نہیں تھا۔ ولولہ تھا، جوش تھا اور اپنے مذہب پر مٹنے کا عزم تھا۔ مورخ لکھتے ہیں کہ ہندو قہر اور غضب سے پاگل ہوئے جا رہے تھے۔ وہ غزنی کی فوج کو کچا چبا جانے کا عہد کر چکے تھے اور انہوں نے یہ عہد شِودیو کے بُت کے قدموں میں ماتھا رکھ کر کیا تھا۔ کوئی ہندو نہتہ نہیں تھا۔ وہ تلواروں، برچھیوں، تیروں اور کمانوں سے لیس تھے۔ وہ اپنے گھروں کو اور اپنی بہو بیٹیوں کو بھول گئے تھے۔ پنڈتوں نے انہیں یقین دلا رکھا تھا کہ غزنی کی فوج کو شِودیو خود گھسیٹ کر یہاں تک لائے ہیں اور مسلمانوں کو تباہ ہونا ہے۔ ہندوؤں کے جنون کا یہ عالم تھا کہ ایک رقاصہ دوڑتی ہوئی بُت کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اُس کے ہاتھ میں خنجر تھا۔ اُس نے اعلان کیا "میں شِودیو کے قدموں میں دل کا نذرانہ پیش کرتی ہوں" — وہ پہلے ہی نیم عریاں تھی۔ اُس نے جس ریشمی کپڑے سے ستر ڈھانپ رکھا تھا وہ بھی اتار پھینکا۔ مندر کے اندر سناٹا طاری ہو گیا۔ کسی نے اس لڑکی کو نہ روکا۔ وہ جوان تھی اور بہت ہی حسین۔ اُس نے خنجر کی نوک اپنی آخری پسلی کے نیچے رکھی۔ نوک کو دبایا۔ خنجر کو بائیں سے دائیں زور سے جھٹکا دیا۔ اُس کا پیٹ چاک ہو گیا۔ اُس کا سر سے پاؤں تک جسم خون سے لال ہو گیا۔ وہ گری نہیں۔

اُس نے اپنا ہاتھ پیٹ کے اندر کیا۔ تب اُس نے چلا کر کہا "کہاں ہے میرا دل ..... مجھے بتاؤ دل کہاں ہوتا ہے" — وہ اپنے پیٹ کے اتنے بڑے زخم میں ہاتھ ڈال کر دل ٹٹول رہی تھی۔
ایک پنڈت دوڑتا ہوا اُس تک پہنچا۔ لڑکی کا سر ڈولا اور وہ گھٹنوں کے بل گری۔ پنڈت نے اُس کے پیچھے بیٹھ کر اس کی پیٹھ اپنے سینے سے لگا لی اور اس کے پھٹے ہوئے پیٹ میں ہاتھ ڈال کر ہاتھ اوپر سینے میں لے گیا۔ اُس نے خنجر جو

لڑکی کے ہاتھ سے گر پڑا تھا، اٹھا لیا اور اس سے لڑکی کا دل کاٹ کر سب کو دکھایا۔ پھر اُس نے دل بُت کے دل کے مقام پر پھیر کر دل بُت کے قدموں میں رکھ دیا۔

"میں نے ایک نرتکی کا بلیدان شِودیو کے چرنوں میں رکھ دیا ہے" — پنڈت نے بلند آواز سے اعلان کیا "یہ نہ سمجھیں کہ نرتکی مر گئی ہے۔ اِسے شِودیو دوسرا جنم دیں گے"۔

پنڈت رقاصہ کی لاش اٹھا کر کسی اور کمرے میں لے گئے۔
ایسی ہی حسین اور جوان ایک اور رقاصہ دوڑتی بُت کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اُس نے بھی اپنے آپ کو ننگا کر دیا۔ خنجر ابھی پنڈت کے ہاتھ میں تھا۔ رقاصہ نے خنجر اُس کے ہاتھ سے جھپٹ لیا اور اسی طرح اپنا پیٹ چاک کر کے پنڈت سے کہا کہ اُس کا دل شِودیو کے قدموں میں رکھ دیا جائے۔ وہ ابھی زندہ ہی تھی کہ پنڈت نے اُس کا دل نکال کر بُت کے دل کے مقام پر پھیرا اور اُس کے قدموں میں رکھ دیا۔

اس کے بعد باقی داسیوں نے جو رقص کیا وہ جنات کا رقص معلوم ہوتا تھا۔ اس میں موسیقی تو تھی لیکن ناچنے والیوں کا رقص ایسا پُراسرار اور ہولناک تھا جیسے یہ ان کی زندگی کا آخری ناچ ہو۔ شہنائیاں جیسے کسی کی موت پر چیخ چلا کر بین کر رہی ہوں۔ دف جیسے سینہ کوبی کر رہے ہوں۔ ناچنے والیاں جیسے پاگل ہو گئی ہوں۔ ان کے کپڑے اُترتے جا رہے تھے یا وہ خود اتار رہی تھیں حتیٰ کہ وہ مادر زاد ننگی ہو گئیں مگر اُن کے رقص کی تال اور سازوں کی سنگت میں ذرا سی بھی لغزش نہیں آ رہی تھی۔
دوسرے کمروں میں پنڈتوں کی گھنٹالوں اور بھجنوں کے واویلے نے سومنات کی رات پر دہشت طاری کر رکھی تھی۔ ذرا سی دیر میں یہ خبر مندر سے باہر نکل گئی کہ ناچنے والی دو لڑکیوں نے اپنے ہاتھوں اپنے دل نکال کر شِودیو کے قدموں میں رکھ

دیئے ہیں۔ عورتوں نے سندور پر دھاوا بول دیا۔ وہ دونوں لاشوں کے خون میں انگلیاں ڈبو کر اپنے ماتھوں پر تلک لگانے لگیں۔ خون کے تلک جب اُن کے مردوں نے دیکھے تو اُن کے جوش و خروش میں قہر پیدا ہو گیا۔ وہ تو پہلے ہی پھنکار رہے تھے۔

سومنات کی گلیوں میں وہ خبریں جو شہر کی دیواروں کے اوپر سے آئی تھیں، اعلان کے انداز میں سارے شہر کو سنائی جا رہی تھیں اور بہت سی آوازیں گھٹاؤں کی طرح مسلسل گرج رہی تھیں "مسلمانوں کو موت یہاں لے آئی ہے.... بھارت ماتا میں کوئی مسلمان زندہ نہیں رہے گا.... شیو دیو کے پجاریو! مسلمانوں کی بوٹیاں سمندر میں بہا دو.... خبردار.... ہوشیار.... لڑائی میں جو لڑتا ہوا مارا جائے گا اُسے شیو دیو دوسرا جنم دیں گے!"

*

انگریزوں کے دورِ حکومت میں ہندوستان کے سکولوں میں وہ تاریخ پڑھائی جاتی رہی ہے جو ہندوؤں نے لکھی تھی اور جسے انگریزوں نے منظور کیا تھا۔ ان درسی کتابوں میں سلطان محمود غزنوی کے سترہ حملوں میں سومنات کو آخری حملہ لکھا گیا تھا اور اسے ایک عام سی قسم کا حملہ ثابت کر کے یہ بھی لکھا گیا کہ سومنات کا بُت اندر سے کھوکھلا تھا اور اس میں ہیرے جواہرات بھرے ہوئے تھے جو محمود غزنوی نکال کر چلتا بنا۔ انگریز بھی یہی چاہتے تھے کہ ہندوستان کے مسلمان بچوں کو سومنات کے معرکے کے پس منظر اور سلطان محمود کے جذبے سے بے خبر رکھا جائے۔ انگریز ہمیشہ مسلمان سے خائف رہا ہے۔ ہندو کو تو انگریز نے یہاں آتے ہی جسمانی طور پر نہیں بلکہ روحانی طور پر اپنا غلام بنا لیا تھا اور دونوں نے مل کر مسلمانوں کی روایت شکنی اور کردار کُشی کی تھی۔

سومنات کی جنگ کے وہ حالات اور احوال و کوائف جو عینی شاہدوں نے تحریر کیے اور جنہیں اُس دور کے مورخ عنکرؒ اور وقائع نگار البیرونی نے قلمبند کیا اور جو فرشتہ اور دیگر بہت سے مورخوں نے محفوظ کیے ہیں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ سومنات پر سلطان محمود کی فوج کشی اس قدر بڑا اور خطرناک اقدام تھا جو کوئی ایسا بادشاہ کر سکتا تھا

جس کا دماغ چل گیا ہو، یا وہ خوش فہمیوں میں مبتلا ہو یا جنگی قیادت (جنرل شپ) میں غیر معمولی مہارت اور جرأت رکھتا ہو۔ آج کے جنگی مبصر بھی جب سومنات کا ذکر کرتے ہیں تو وہ اسے روس پر نپولین کی فوج کشی سے تشبیہہ دیتے ہیں۔ نپولین، روس میں جا کر تباہ و برباد ہو گیا تھا۔ سلطان محمود بھی بظاہر تباہ و برباد ہونے کے لیے سومنات گیا تھا۔ مورخوں کے مطابق، خود سلطان محمودؒ نے سومنات پہنچ کر محسوس کر لیا تھا کہ اس کے حساب کتاب میں اُسے غلطی لگی ہے، وہ غلط جگہ آ گیا ہے۔ اسی لیے اُس نے اپنے سالاروں سے کہا تھا کہ ہم اس مقام پر آ گئے ہیں جہاں سے واپسی ناممکن ہے۔ ہم سومنات کی فتح کے لیے نہ لڑے تو ہمیں زندہ پسپا ہونے کے لیے بڑی خوفناک لڑائی لڑنی پڑے گی، پھر کیوں نہ ہم اُس مقصد کے لیے لڑیں جس کے لیے آئے ہیں؟

محمد قاسم فرشتہ نے البیرونی اور اُس دور کے دو وقائع نگاروں کے حوالے سے جن میں ایک امام مجاہد بن یونس جو فوج کے امام کی حیثیت سے سومنات آئے تھے، لکھا ہے کہ مسلمانوں کی فوج ایک جذبہ لے کر آئی تھی اور یہ جذبہ لوٹ مار نہیں تھا۔ جذبے کے ساتھ اسے جو قیادت ملی تھی وہ اسے بڑے بڑے دشوار حالات اور خطروں سے بچانے کی اہلیت رکھتی تھی۔ ان وقائع نگاروں نے لکھا ہے کہ سومنات پر فوج کشی جنگی لحاظ سے اور سیاسی لحاظ سے اور مذہبی لحاظ سے ایک حیران کُن اقدام تھی جو ایک عظیم مقصد کا حامل تھا۔

انہی مورخوں اور وقائع نگاروں نے لکھا ہے کہ محمد بن قاسم ہندوستان پر عرب کے قیدیوں کو جنہیں مہاراجہ داہر نے اپنے قید خانے میں ڈال دیا تھا، چھڑانے آیا تھا۔ بعد میں اُس نے یہاں اسلامی حکومت قائم کرنے کی سوچی لیکن سلطان محمود غزنوی صرف اسلام کا پیغام لے کر آیا اور یہ عزم کر کے آیا کہ سومنات کا بت توڑ کر ثابت کرے گا کہ اُن کے چاند کے آقا کی کوئی حیثیت نہیں اور یہ محض ڈھونگ اور سوانگ ہے۔

مورخ اس پر بھی متفق ہیں کہ سلطان محمود اور اُس کا دستِ راست سالار ابوعبداللہ محمد الطائی بالکل بے خبر تھے کہ سومنات کے اندر ہندوؤں کے بچے بھی مرنے مارنے

کے لیے تیار ہیں اور سومنات کا دفاع اس سے کہیں زیادہ مستحکم اور خطرناک ہے جتنا وہ سمجھے تھے۔ سلطان خدا کی مدد کا محتاج تو رہتا ہی تھا لیکن یہاں آکر اس نے محسوس کیا کہ اسے کامیابی یا کامیاب پسپائی خدا ہی عطا کر سکتا ہے۔ اتفاق سے وہ جمعرات کے روز سومنات پہنچا تھا۔ فوج کو آرام کی ضرورت تھی لیکن اس نے جمعہ کے روز حملہ کرنے کا فیصلہ کیا کیونکہ یہ مبارک دن تھا۔ اس نے اپنے سالاروں کو صرف ایک رات کی مہلت دی کہ وہ اپنے اپنے دستے تقسیم کے مطابق پوزیشنوں پر لے جائیں اور رسد کو اس طرح محفوظ کیا جائے کہ دشمن کے چھاپہ مار اس تک نہ پہنچ سکیں۔ غزنی کی فوج کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ اسے رسد اور کمک ملنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔

صحیح الفاظ میں یوں کہنا چاہیے کہ سومنات کا معرکہ اسلام اور ہندومت کا سب سے بڑا معرکہ تھا اور یہ دو مذہبوں کا ہی معرکہ تھا۔ اگر سلطان محمود کو علاقہ فتح کرنا ہوتا اور اس کا مقصد اپنی سلطنت کی توسیع ہوتا تو وہ اتنی دور نہ آتا۔ شمالی اور وسطی ہند کے کئی علاقوں کو وہ فتح کر چکا تھا۔ انہی کو مستقر بنا کر وہ ان سے ملحق علاقے اپنی سلطنت میں شامل کر سکتا تھا۔

*

بروز جمعہ ۷ جنوری ۱۰۲۶ء (۱۵ ذیقعدہ ۴۱۶ ہجری) غزنی کی فوج میں اذان کی صدائے مقدس گونجی اور احکام کے مطابق تمام فوج نے باجماعت نماز پڑھی۔ سلطان محمود بھی فوج کی کسی صف میں کھڑا تھا۔ امام نے گڑگڑا کر فتح کی دعا مانگی اور اس کے فوراً بعد فوج نے سومنات کا محاصرہ کر لیا۔ اس محاصرے میں سب سے نمایاں چیز جو تمام مورخوں نے لکھی ہے وہ غزنی کی فوج کے نعرے تھے جو اس قدر گرجدار تھے کہ خوف کا تاثر پیدا کرتے تھے۔ اس کے جواب میں قلعے کی دیوار پر ہندوؤں کا جو ہجوم تھا، وہ اپنے نعرے لگا رہا تھا۔

سلطان محمود کسی ایک جگہ کھڑا ہو کر احکام نہیں دے رہا تھا۔ وہ مسلسل حرکت میں تھا۔ اس کے قاصد اور محافظ اس کے ساتھ بھاگ دوڑ رہے تھے۔ سب سے

پہلا کام خندق کو عبور کرنا تھا۔ دیواروں کے اوپر سے اور برجوں سے ہندوؤں نے تیروں کا مینہ برسا دیا۔ سلطان محمود نے اپنے ہزاروں تیر اندازوں کو خندق کے کنارے کھڑا کر کے دیواروں اور برجوں پر بلا رکے تیر چلاتے رہنے کا حکم دیا۔ غزنی والوں کی کمانیں بڑی تھیں اور سخت تھیں۔ ان کے چھوڑے ہوئے تیر ہندوؤں کے تیروں کی نسبت دور مار کر سکتے تھے۔

تیر اندازوں نے آنِ واحد میں خندق کے کنارے کھڑے ہو کر تیر چلانے شروع کر دیئے۔ ان سے ہندوؤں کے سر پیچھے ہو گئے اور ان کی تیر اندازی میں کمی آگئی۔ غزنی والوں کی تیر اندازی شدید اور تیز تر ہو گئی۔ اس کے ساتھ میں سلطان محمود کی فوج نے جگہ جگہ سے خندق میں اونٹوں پر لاد کر لائے ہوئے پتھر اور مٹی پھینکنی شروع کر دی۔ یہ عمل ایسا تھا جیسے ایک جگہ سے زمین اکھاڑ کر دوسری جگہ ڈالی جا رہی ہو۔

ہندوؤں نے دیکھا کہ خندق بھرتی جا رہی ہے تو انہوں نے دیواروں پر اپنے آپ کو مسلمانوں کے تیروں کے سامنے کر دیا اور خندق بھرنے والوں پر تیر برسانے لگے۔ وہ مسلمانوں کے تیروں کا نشانہ بن رہے تھے، گر رہے تھے مگر جو گرتا تھا اس کی جگہ ایک اور ہندو آجاتا تھا۔ انہوں نے مسلمانوں کو خاصا نقصان پہنچایا۔ خندق ابھی آدھی بھری تھی کہ مسلمان تیر انداز اپنے ساتھیوں کو تیروں سے زخمی ہوتا دیکھ کر جوش میں آگئے۔ وہ خندق میں کود گئے اور ایک دوسرے کی مدد سے خندق سے اوپر چلے گئے۔ وہ دیوار کے اتنی قریب چلے گئے جہاں سے وہ دیوار کے اوپر کھڑے ہندوؤں کو دیکھ سکتے تھے۔ وہاں سے انہوں نے تیر اندازی شروع کر دی۔

یہ نعرۂ اللہ اکبر کا کرشمہ تھا کہ ان تیر اندازوں نے اپنے آپ کو یقینی موت کے خطرے میں ڈال دیا۔ اوپر سے تیر ان پر موسلادھار بارش کی طرح آرہے تھے۔ غزنی کے مجاہد تیر کھا کر بھی تیر چلاتے تھے۔ یہ تیروں کا معرکہ تھا۔ خندق بھر جانے کے بعد قلعے کے دروازوں اور دیواروں پر ہلہ بولنا تھا۔

خندق اتنی بھر گئی کہ فوج گزر سکتی تھی۔ چار گھوڑ سواروں نے ہاتھوں میں کلہاڑے لیے گھوڑے سرپٹ دوڑا دیئے۔ ان کا رُخ ایک دروازے کی طرف تھا۔ ان کا ارادہ تھا کہ دروازے تک پہنچ جائیں تو کلہاڑوں سے دروازہ توڑیں گے مگر دو تو راستے میں ہی تیروں کا نشانہ بن گئے۔ ان پر اتنے تیر آئے کہ گھوڑوں کے جسموں میں بھی تیر اُتر گئے۔ دو دروازے تک پہنچ گئے مگر دروازے کے دائیں بائیں دیوار میں چوڑے سوراخ تھے جن میں دروازے کی حفاظت کے لیے تیر انداز بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے دونوں سواروں کو ختم کر دیا۔

غزنی کی فوج بند توڑ کر نکل جانے والے سیلاب کی طرح بڑھی۔ ان دستوں کے پاس بڑی مضبوط سیڑھیاں تھیں جن کی لمبائی دیواروں کی بلندی جتنی تھی۔ عقب سے تیر اندازوں نے دیوار کے اوپر اور برجوں پر تیر اور تیزی سے پھینکنے شروع کر دیئے تاکہ اوپر والوں کے سر نیچے رہیں لیکن ہندوؤں نے جان کی بازی لگا رکھی تھی۔ انہوں نے سر نیچے نہ کیے اور اُن مسلمانوں پر تیر برسانے شروع کر دیئے جنہوں نے سیڑھیاں اُٹھا رکھی تھیں۔

دروازے تک پہنچنا ناممکن نظر آ رہا تھا، پھر بھی کچھ جانباز ایسی پوزیشنوں تک پہنچ گئے جہاں سے وہ دروازے کے ساتھ والے سوراخوں میں تیر چلا سکتے تھے۔ ان میں بعض مارے گئے لیکن غزنی والوں کا جوش اور جذبہ پہلے سے زیادہ بڑھ گیا تھا۔ سیڑھیاں دیواروں کے ساتھ لگا دی گئیں مگر اُن پر جو بھی چڑھا وہ جسم میں دو تین تیر لیے ہوئے گرا۔

اِدھر دیواروں پر چڑھنے کی کوشش ہو رہی تھی، اُدھر سمندر کی طرف ایک معرکہ لڑا جا رہا تھا۔ قلعے کا تمام نصف حصہ سمندر میں تھا۔ ایک نائب سالار نے یہ تدبیر اختیار کی اور حکم دیا کہ سمندر میں کشتیاں ڈال کر دیوار تک پہنچا جائے اور دیوار پر چڑھنے کی کوشش کی جائے۔ غزنی کی فوج کے پاس اپنی کشتیاں نہیں تھیں۔ سمندر کا کنارہ کشتیوں سے بھرا پڑا تھا۔ یہ سومنات کی فوج کی کشتیاں تھیں۔ ایک حبشی کشتیوں میں سوار ہو گیا۔ جنوری کا مہینہ تھا، اس لیے سمندر میں جوش نہیں تھا۔ کشتیوں کے ملاح ہندو تھے۔ انہیں

کہا گیا کہ وہ کشتیاں دیوار تک لے چلیں۔ کشتیوں میں سیڑھیاں بھی رکھ لی گئی تھیں۔ یہ کوشش بھی ناکام ہو گئی کیونکہ دیوار کے اوپر سے تیر آنے لگے۔ ہندو ملاح سمندر میں کود گئے۔ غزنی کے مجاہدوں نے خود چپو مارے لیکن دیوار تک پہنچنا خودکشی کے برابر تھا۔

جمعہ کی نماز کا وقت ہو گیا۔ خندق کو ابھی تک بھرا جا رہا تھا تاکہ آگے پیچھے ہونے کی رفتار تیز کی جا سکے۔ دونوں فوجوں کا خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ سلطان محمود نے (مؤرخوں کے مطابق) گھوڑے پر ہی دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور دعا ختم کر کے اس نے شدید حملہ بولنے کا حکم دے دیا۔ وہ خود پیچھے کھڑا نہ رہا۔ بہت آگے چلا گیا۔ وہ فوج کا حوصلہ بڑھانے کے لیے چیخ چلا رہا تھا۔

یہ حملہ اس حد تک کامیاب رہا کہ دروازے کے بالکل اوپر اور دروازے کے ساتھ دائیں اور بائیں جو مورچہ نما برج بنے ہوئے تھے، انہیں صاف کر دیا گیا اور غزنی کے سپاہی اس طرح ان کم بلندی والے مورچوں میں کھڑے ہو گئے کہ اندر سے کوئی ان میں آ کر تیر نہیں چلا سکتا تھا۔

ہندوؤں نے دلیری کا یہ مظاہرہ کیا کہ قلعے کا ایک دروازہ کھول دیا۔ اندر سے گھوڑ سوار ہاتھوں میں برچھیاں لیے تیز رفتار سے آئے اور ایسا حملہ بولا کہ خود تو مارے گئے لیکن غزنی والوں کو پیچھے دھکیل دیا۔ سلطان محمود نے حکم دیا کہ کھلے ہوئے دروازے میں گھس جاؤ۔ ایک ہی بار بہت سے سواروں نے گھوڑوں کو ایڑ لگا دی مگر اندر سے اتنے ہی گھوڑے سرپٹ دوڑتے آ نکلے۔ ان کا ٹکراؤ دروازے میں ہوا۔

اندر سے مزید سوار آتے۔ انہوں نے غزنی کے سواروں کو دروازے کے اندر نہ آنے دیا۔ مؤرخ لکھتے ہیں کہ دونوں طرف کے سپاہی ایک دوسرے [illegible] کے پیاسے نظر آتے تھے۔ غزنی والوں نے نعرے جیسے [illegible] "فتح یا موت" — وہ [illegible] گئے تھے اور [illegible] کو اپنے [illegible]

[illegible]

یہ اطلاع اندر پہنچ گئی کہ غزنی کی فوج نے دروازہ کھول لیا ہے۔ اوپر والے ہندو تیر انداز ایسی جگہ آگئے جہاں سے وہ دروازے پر تیر چلا سکتے تھے۔ انہوں نے تیر برسانے شروع کر دیئے۔ دیوار پر یہ غلط اطلاع بھی پہنچی کہ غزنی کی فوج قلعے میں داخل ہو گئی ہے۔ اوپر والے مسلمانوں کو روکنے کے لیے قلعے کے اندر اتر گئے۔ مسلمانوں کی قیادت بڑی تیز اور ذہین تھی۔ انہوں نے فوراً دیوار کے ساتھ سیڑھیاں لگالیں اور سپاہی ایک دوسرے کے پیچھے اوپر چڑھ گئے۔ ان کے پیچھے فوج چڑھتی جا رہی تھی۔ لگتے لمحے دیوار کے اوپر دست بدست لڑائی شروع ہو گئی۔

مندر تک خبر پہنچ گئی کہ مسلمان اندر آگئے ہیں۔ تمام پنڈت جو عبادت میں مصروف تھے، اس طرح سجدے میں چلے گئے کہ پیٹ کے بل لیٹ کر ماتھے فرش پر رگڑنے لگے۔ چونکہ دروازہ ابھی کھلا تھا اس لیے غزنی کے اللہ اکبر کے نعرے مندر کے اندر تک سنائی دے رہے تھے۔ پنڈت اور دیگر پجاری سپاہی نہیں تھے۔ وہ لڑنا نہیں جانتے تھے۔ سلطان محمود نے اپنا اصول بنا رکھا تھا کہ وہ بت توڑ دیتا، مندر کو اجاڑ دیتا مگر کسی پنڈت اور پجاری پر ہاتھ نہیں اٹھاتا تھا۔

سومنات کے مندر میں پنڈتوں کو پتہ چلا کہ دروازہ کھل گیا ہے اور مسلمان اندر آگئے تو وہ بت کے آگے لیٹ گئے، اور جب اللہ اکبر کے نعروں کی گرج ان کے کانوں تک پہنچی تو چند ایک پنڈت اٹھ کھڑے ہوئے۔ دو یورپی مورخوں ہیگ اور سمتھ نے لکھا ہے کہ مندر میں سینکڑوں نیم عریاں رقاصائیں موجود تھیں۔ ان کا رقص رک گیا تھا۔ وہ شاید سمجھ گئی تھیں کہ ان کا دیوتا ہار گیا ہے۔ ان کے چہروں پر گھبراہٹ تھی۔ چند ایک پنڈت اٹھے اور یہ سمجھ کر ان کی زندگی کا آخری وقت آ گیا ہے، ایک ایک رقاصہ کو پکڑا اور مندر سے ملحقہ کمروں میں لے گئے۔ اس طرح مندر میں بدکاری شروع ہو گئی۔ شہری اس سے بے خبر تھے۔

شہریوں پر خوف و ہراس نہیں تھا۔ مردوں کے ساتھ عورتیں بھی ہتھیاروں سے لیس ہو کر نکل آئی تھیں۔ بوڑھی عورتیں مندر میں اکٹھی ہو کر عبادت میں مصروف ہو گئی تھیں۔

دروازہ کھولنے کی چال سومنات کے مہاراجہ کنور رائے کی تھی۔ وہ غزنی کی فوج کو نقصان پہنچانے میں خاصی حد تک کامیاب تھا مگر اس کا مقابلہ غزنی کے جس جرنیل سے تھا، وہ اس سے زیادہ دانش مند تھا اور وہ ہر موقع سے فائدہ اٹھانے کی اہلیت رکھتا تھا۔ سلطان محمود اور اس کے سالار اعلیٰ ابوعبداللہ نے دروازہ کھلنے سے یہ فائدہ اٹھایا کہ اپنی فوج کے بہت سے آدمی دروازے کے درمیان والے برجوں اور مورچوں میں کھڑے کر دیئے جہاں سے انہوں نے بڑی کارگر تیراندازی کی۔ ادھر فوج دیواروں پر چڑھتی جا رہی تھی۔

مہاراجہ کنور رائے نے یہ صورت حال دیکھی تو اندر سے ایسا حملہ کرایا کہ ہندو گھوڑ سوار غزنی والوں کو دھکیلتے ہوئے باہر لے گئے اور ان کے پیچھے دروازہ بند ہو گیا۔ ہندو سواروں نے اپنا آپ سومنات پر قربان کر دیا۔ وہ اندر نہیں جا سکتے تھے۔ دروازہ بند ہو چکا تھا۔ وہ مسلمانوں کے ہاتھوں کٹ گئے۔ جو مسلمان برجوں پر قابض ہو گئے تھے ان پر ہندو ٹوٹ پڑے۔ وہ سب لڑتے ہوئے کام آئے۔ اس کے ساتھ ہی سومنات کی فوج نے سیڑھیوں کے ذریعے اوپر آنے والے مسلمانوں پر اس قدر تیر برسائے کہ مسلمان ایک دوسرے کے اوپر گرے، اور جو اوپر چلے گئے تھے ان میں سے شاید ہی کوئی زندہ رہا ہو گا۔

دیوار کے اوپر سے اب تیروں کے ساتھ برچھیاں بھی برسنے لگیں۔ سلطان محمود نے دیکھا کہ سورج قلعے کے پیچھے چلا گیا ہے اور فوج تھک گئی ہے اور زخمیوں کی تعداد بھی بڑھتی جا رہی ہے تو اس نے پیچھے ہٹ آنے کا حکم دے دیا۔

وہ رات بھر سویا نہیں۔ سالاروں کو احکام دیتا رہا۔ اس نے زخمیوں کی عیادت بھی کی اور وہ ان دستوں کو دیکھنے بھی گیا جو باہر سے آنے والی ہندو فوجوں کے انتظار میں تھے۔ وہ کچھ فکرمند بھی تھا۔ اسے کامیابی مخدوش نظر آ رہی تھی لیکن وہ ہار ماننے والا آدمی نہیں تھا۔

اگلی صبح طلوع ہوتے ہی اس نے جوش و خروش سے قلعے پر ہلہ بولا۔ سپاہیوں نے دیواروں کے ساتھ سیڑھیاں لگالیں مگر ہندوؤں نے انہیں اوپر نہ جانے

دیا۔ سارا دن یہ عمل جاری رہا لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ شام کو اُس نے دستے پیچھے ہٹا لیے۔

*

۹ جنوری ۱۰۲۶ء بروز اتوار، مہاراجہ کنور رائے نے ایک دلیرانہ چال چلی۔ اُس نے صبح کی روشنی صاف ہونے سے پہلے قلعے کا دروازہ کھول دیا۔ اندر سے کچھ دستے باہر آئے جنہوں نے غزنی کی فوج کے کیمپ پر ہلّہ بول دیا۔ ہندوؤں کا خیال ہوگا کہ غزنی کی فوج ابھی سوئی ہوئی ہوگی یا ابھی تیار نہیں ہوگی، لیکن وہ نماز کا وقت تھا اور فوج ابھی ابھی نماز سے فارغ ہوئی تھی۔ ہندو فوج گھوڑسوار تھی۔ غزنی کی فوج کو گھوڑوں کی تیاری کی مہلت نہ ملی۔ سلطان محمود نے فوری طور پر دائیں اور بائیں اس حکم کے ساتھ قاصد دوڑا دیئے کہ ہندوؤں کی فوج کو گھیرے میں لے لو۔ ہندو بڑی دلیری سے آتے تھے مگر وہ دیکھ نہ سکے کہ انہیں گھیرے میں لیا جا رہا ہے۔

غزنی کے ایک دستے نے یہ حملہ کیمپ سے دور روک لیا اور اس کے ساتھ ہی ہندو دستوں پر دائیں اور بائیں سے حملہ ہو گیا۔ ہندوؤں کو یہ چال بہت مہنگی پڑی مگر معرکہ اتنا شدید اور صبر آزما تھا کہ سلطان محمود کی فوج کا بھی دم خم توڑ گیا۔ کچھ ہندو سوار گھیرے سے نکل گئے اور قلعے کی طرف بھاگے۔ اُن کے لیے دروازہ کھُل گیا۔ غزنی کے بہت سے مجاہد اُن کے تعاقب میں گئے مگر سلطان محمود نے انہیں روک لیا۔ قلعے کا کھلا ہوا دروازہ اُن کے لیے موت کا پھندہ ثابت ہو سکتا تھا۔

ہندو ایسی دلیری کے مظاہرے کر رہے تھے جنہوں نے سلطان محمود کو اپنی سکیم پر نظرِ ثانی پر مجبور کر دیا۔ ہندوؤں کے ساتھ اس کا یہ معرکہ نیا نہیں تھا لیکن یہاں ہندوؤں کے لڑنے کا انداز نیا بلکہ حیرت میں ڈال دینے والا تھا۔ سلطان سوچ ہی رہا تھا کہ اُسے کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے کہ ایک طرف سے شور اُٹھا۔ ایسے شور سے وہ اچھی طرح واقف تھا۔ قلعے کا دوسرا دروازہ کھُل گیا اور سومنات کے دو سوار اور ایک پیادہ دستے نے باہر آ کر برق رفتار حملہ کر دیا مگر اب غزنی والوں کی یہ چال بے کار ہو گئی

نظر آ رہی تھی کہ دشمن پر دائیں اور بائیں سے حملہ کریں کیونکہ دیواروں کے اوپر اور بُرجوں میں تیر اندازوں کا ایک ہجوم تھا جو اپنے حملہ آور دستوں کو پہلوؤں سے تیروں کی بارش سے محفوظ کیے ہوئے تھا۔

سالار ابوعبداللہ نے یہ چال چلی کہ اپنے دستوں کو یعنی محاصرے کو پیچھے ہٹ آنے کا حکم دیا۔ اسے توقع تھی کہ ہندو سوار آگے آ جائیں گے اور انہیں ایک تو گھیرے میں لیا جا سکے گا، دوسرے یہ کہ قلعے کا دروازہ توڑنے یا دھکیلنے کا موقع مل جائے گا، مگر مہاراجہ کنور رائے کا دماغ پوری طرح کام کر رہا تھا اور وہ غیر معمولی جنگی ذہانت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اُس نے اپنے دستوں کو ذہن نشین کرا دیا تھا کہ قلعے کی دیوار سے اتنے فاصلے سے آگے نہ جائیں خواہ کچھ ہی ہو جائے۔ انہوں نے ابوعبداللہ کی چال بے کار کر دی۔ وہ آگے نہیں آ رہے تھے۔

ہندوؤں کی دلیری کا یہ عالم تھا کہ وہ آگے آنے کی بجائے دائیں بائیں کھُل گئے اور انہوں نے محاصرے پر جگہ جگہ حملے شروع کر دیئے۔ وہ محاصرہ توڑنے کی اور غزنی والوں کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان پر جنون کی کیفیت طاری تھی جیسے کوئی نشہ پی کر آئے ہوں۔ یہ مذہب کا جنون تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اُن کا جنون باؤلا پن بن گیا جس کا باعث یہ ہُوا کہ قلعے کی دیواروں سے جہاں سے تیروں کا مینہ برس رہا تھا، نسوانی آوازیں آنے لگیں۔ یہ عورتوں کی للکار تھی۔ وہ اپنے سپاہیوں کو طرح طرح کے نعروں سے گرما رہی تھی۔ ان میں ایک آواز یہ تھی ۔۔۔ "تمہاری ماؤں بہنوں کو مسلمان اٹھا لے جائیں گے"۔ عورتوں کی چیخ و پکار ایسی تھی جیسے وہ کسی ظالم اور درندے کے چنگل میں آ گئی ہوں۔

صورتِ حال اس قدر خونریز اور غزنی والوں کے لیے اس قدر مخدوش ہو گئی کہ (محمد قاسم فرشتہ اور البیرونی کے مطابق) سلطان محمود نے اپنا مرکز اپنے مشیروں وغیرہ کے حوالے کر کے ایک منتخب دستے کی قیادت سنبھال لی اور ہندوؤں پر جوابی حملہ کیا۔ سب سے بڑی مشکل اوپر سے آنے والے تیروں اور برچھیوں نے پیدا کر رکھی تھی۔ سلطان محمود نے اپنے آپ کو ایک ہولناک خطرے میں ڈال دیا تھا۔ غزنی کی فوج کو پسپا کرنے

کے لیے اب صرف ایک تیر کی ضرورت تھی جو سلطان محمود کو لگتا اور جنگ ختم ہو جاتی۔

ابوعبداللہ محمد الطائی نے سلطان کی یہ دلیری اور یہ جذبہ دیکھا تو اُس نے ایک تیر انداز دستے کو حکم دیا کہ وہ دیوار کے اتنی قریب چلا جائے جہاں سے اوپر کے تیر انداز نظر آنے رہیں اور تیروں کا نشانہ بھی بن سکیں۔ اس دستے نے دیکھ لیا تھا کہ سلطان قلب سے آ کر ایک دستے کی قیادت کر رہا ہے۔ اس دستے کے تیر اندازوں نے جان کی بازی لگا دی۔ اب صورت یہ پیدا ہو گئی کہ دونوں طرفوں کے تیر ہوا میں ٹکرا رہے تھے۔ غزنی کے تیر انداز اوپر سے آتی ہوئی برچھیوں سے مر رہے تھے مگر انہوں نے تیر اندازی میں سُستی پیدا نہ کی۔

ابوعبداللہ کی اس چال کا یہ فائدہ ہُوا کہ اوپر کے تیر اندازوں کا رُخ سلطان محمود کے دستے سے ہٹ کر دوسری طرف ہو گیا۔ ایک اور فائدہ یہ ہُوا کہ غزنی کے دوسرے دستوں نے اپنے تیر اندازوں کی یہ جانبازی دیکھی تو اُن میں نیا ہی جوش بلکہ قہر پیدا ہو گیا۔ وہ احکام کے بغیر آگے چلے گئے اور اس قدر تیر برسائے کہ دیوار سے ہندو تیر انداز باہر کی طرف بھی گرنے لگے۔

جو ہندو دستے باہر آئے تھے، وہ جانبازی سے لڑ رہے تھے لیکن وہ اُس حفاظت سے محروم ہو گئے جو دیوار کے اُوپر سے انہیں تیر انداز دے رہے تھے۔ سالار ابوعبداللہ کی نظر سلطان محمود پر تھی۔ سلطان پر جیسے دیوانگی طاری ہو گئی تھی لیکن وہ دماغ کو اپنے قابو میں رکھے ہوئے تھا۔ اُس نے ایسی چال چلی کہ ہندو دستے بکھرنے پر مجبور ہو گئے۔ ابوعبداللہ نے دشمن کو بکھرتے دیکھا تو ایک سوار دستہ قلعے کی دیوار کی طرف سے ہندوؤں پر حملے کے لیے بھیج دیا۔ سینکڑوں گھوڑے سرپٹ دوڑے۔ ہندو بوکھلا گئے۔ انہوں نے غزنی والوں کا بہت نقصان کیا تھا لیکن وہ خود بھی تیزی سے ختم ہو رہے تھے۔

ان میں جو بچ گئے تھے وہ دروازے کی طرف بھاگنے کی کوشش کرنے لگے لیکن مہاراجہ کنور رائے ایسا احمق نہیں تھا کہ اُن کے لیے دروازہ کھول دیتا۔ وہ بُرج میں کھڑا دیکھ رہا تھا کہ غزنی کی فوج ایسی پوزیشن میں آ گئی ہے کہ دروازہ کھلا اور یہ سیلاب کی طرح اندر آ جائے گی۔ اُس نے اپنے ان دستوں پر لکیر پھیر دی۔ ان میں سے کوئی بھی اندر نہ جا سکا نہ کوئی زندہ رہا۔ سلطان محمود کا اصول کچھ اور تھا لیکن سالار ابوعبداللہ نے کانوں کان اپنے نائبین کو اور ان کی معرفت تمام کمانداروں سے کہہ دیا تھا کہ کوئی جنگی قیدی نہیں چاہیئے۔ ہلاک کر دو۔ دشمن کا کوئی آدمی کسی بھی حالت میں سامنے آئے ہلاک کر دو"۔ اب تو جنگ کی صورت ایسی ہو گئی تھی کہ لڑنا اور مرنا تھا۔ جنگی قیدیوں کو کہاں سنبھالتے۔ البتہ دشمن کے تندرست گھوڑے اور ہتھیار جمع کرنے کا حکم دے دیا گیا تھا۔ وہاں قیدیوں کی نسبت گھوڑوں اور ہتھیاروں کی ضرورت زیادہ تھی۔

*

"کیا آپ نے ہندوؤں کو پہلے کبھی اس طرح لڑتے دیکھا تھا؟"۔ رات کو سلطان محمود نے اپنے سالاروں، ان کے نائبین اور کمانداروں سے کہا۔ اُس نے چھوٹے درجے کے عہدیداروں اور کمانداروں کو بھی بُلا رکھا تھا۔ اُس نے کہا۔ "اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس جگہ کو ہندو کتنا مقدس سمجھتے ہیں۔ میں نے آپ سب کو اس لیے بلایا ہے کہ اپنے سپاہیوں کو بتا دو کہ ہندوؤں کا مذہبی جنون دیکھو اور یہی جنون اپنے آپ میں پیدا کرو.... انہیں میری طرف سے خراجِ تحسین پیش کرنا۔ انہوں نے آج احکام کے بغیر جو مظاہرے کیے ہیں، ان کا صلہ انہیں خدا دے گا۔ اس جذبے میں فرق نہ آنے پائے۔ میں کوئی پیش گوئی نہیں کر سکتا کہ کل کیا ہو گا اور اس جنگ کا انجام کیا ہو گا۔ میں اپنی فوج کے مجاہدوں کو یہ پیغام دینا چاہتا ہوں کہ اگر ہم یہاں ہار گئے تو آنے والی نسلیں بھی کہیں گی کہ ہندوؤں کا سومنات دیوتا سچا تھا اور انسانوں کی زندگی اور موت اسی کے ہاتھ میں تھی اور اسلام کوئی مذہب نہیں۔ ہمارے بعد آنے والے لوگ ہمیں لٹیرا اور قاتل کہیں گے۔ ہمیں اسلام کی عظمت اور صداقت کا ثبوت دینا ہے یا یہیں ختم ہونا ہے۔ اس جنگ کو آپ عام قسم کی جنگ نہ سمجھ لینا۔ کل کا دن آج کے دن سے زیادہ جاں لیوا اور ہمت آزما ہو گا۔ آپ کو تاریخ میں ایک نقش چھوڑنا ہے کہ قیامت تک جو غزنی کا نام لے سومنات کا نام بھی ضرور

ہے اور کہیے کہ سومنات غزنی کے قدموں میں پڑا ہے۔"

سلطان محمود نے انہیں جنگی نوعیت کی ہدایات دیں اور انہیں کہا کہ یہ جنگ بہت جلدی ختم کرنی ہے کیونکہ نفری کم ہو رہی ہے، اور رسد میں بھی تیزی سے کمی آ رہی ہے اور یہ کمی پوری کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ ہمارا دشمن عقل مند اور دلیر ہے لیکن وہ یہ طریقہ نہیں سوچ سکا کہ ہم پر حملہ کرنے کی بجائے دفاع میں لڑتا رہے۔ اور محاصرہ طویل ہو جائے تاکہ ہماری رسد ختم کر دیں۔ وہ ہمیں تیروں سے نہیں بھوک سے مار سکتا ہے۔ بیشتر اس کے کہ دشمن یہی چال چل جائے ہمیں شہر میں داخل ہونا ہے۔ میں بھوکی اور زخمی بلی کی طرح نہیں، شیر کی طرح شہر میں داخل ہونا چاہتا ہوں۔"

غزنی والوں نے یہ رات بھی جاگتے گزار دی۔

*

سلطان محمود نے ان لوگوں کو رخصت کیا تو اسے اطلاع دی گئی کہ ایک ہندو رشی جو بہت بوڑھا ہے ایک نوجوان لڑکی کو ساتھ لایا ہے۔ وہ سلطان سے ملنے آیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ قلعے میں سے آیا ہے۔ اس کی اور لڑکی کی جامہ تلاشی لے لی گئی تھی۔ سلطان نے اس خیال سے انہیں بلا لیا کہ مہاراجہ کنور رائے کا کوئی پیغام ہو گا جو صلح کا بھی ہو سکتا تھا، دھمکی کا بھی اور کسی سودا بازی کا بھی۔

وہ بوڑھا سر سے پاؤں تک جوگیا لباس میں تھا۔ اس کے بال عورتوں کی طرح لمبے اور اس کی داڑھی بھی لمبی تھی۔ وہ بوڑھا تھا اور اس کے بال زیادہ تر سفید تھے لیکن اس کی آنکھوں میں جوانی کی چمک اور چہرے پر ایسی رونق تھی جو ہندوؤں کے چہروں پر کم ہی ہوا کرتی تھی۔ سلطان محمود اس سے متاثر ہوا۔ اس بوڑھے کے ساتھ جو لڑکی تھی، وہ چادر میں تھی۔ اس کا سر اور آدھا چہرہ بھی ڈھانپا ہوا تھا۔ بوڑھے نے اس کے سر سے چادر اتار دی۔ سلطان محمود نے چونک کر لڑکی کو دیکھا۔ اس نے اتنی دل کش لڑکی کبھی نہیں دیکھی تھی، یا اس نے کسی عورت کو کبھی غور اور دلچسپی سے نہیں دیکھا تھا۔ اس لڑکی نے اس کی نظروں کو گرفتار کر لیا۔

"آپ کیوں آئے ہیں؟" — سلطان محمود نے بوڑھے سے پوچھا۔ "کیا آپ کو سومنات کے مہاراجہ نے بھیجا ہے؟" — اس نے دونوں کو بٹھا لیا۔ وہ اس بوڑھے کے ساتھ اسی علاقے کے ایک مسلمان کے ذریعے بات کر رہا تھا۔

"میں مہاراجہ کی طرف سے کوئی پیغام نہیں لایا" — بوڑھے نے کہا۔ اس کے لب و لہجے میں ایک تاثر تھا جو سلطان نے محسوس کیا اور وہ سمجھ گیا کہ یہ بوڑھا معمول آدمی نہیں۔ بوڑھا کہہ رہا تھا۔ "میں مہاراجہ کی اجازت سے آیا ہوں۔ اس نے مجھے چار گھوڑسواروں کے ساتھ قلعے سے نکال کر راستہ دکھایا تھا۔ میں اپنا پیغام لایا ہوں۔ میں سومنات کا پنڈت نہیں۔ میں یہاں ہر سال پندرہ بیس دنوں کے لیے آیا کرتا ہوں۔ میرا ٹھکانہ ہمالیہ کے دامن میں ہے جہاں برف جمی رہتی ہے۔ اب بھی یہاں چند دنوں کے لیے عبادت کرنے آیا تھا کہ آپ آ گئے۔ آپ نے تین دنوں میں دیکھ لیا ہے کہ سومنات کے رہنے والے کس طرح قہر بنے ہوئے ہیں۔ اپنے نقصان کو دیکھیں۔ آپ پر جو قہر برسا ہے وہ سومنات کے انسانوں کا نہیں، یہ اس دیوتا کا قہر ہے جس کے پاؤں سمندر میں اور سر آسمانوں میں ہے۔ میں اس کا خاص پجاری ہوں۔"

"کیا آپ مجھے اپنے دیوتا سے ڈرانے آئے ہیں؟" — سلطان محمود نے مسکراتے ہوئے پوچھا — "اور اس لڑکی کو آپ ہندوؤں کے رواج کے مطابق تحفے کے طور پر لائے ہیں؟"

"اپنے آپ کو گمراہ نہ ہونے دیں سلطان!" — بوڑھے رشی نے کہا۔ "میں نہ ڈرانے آیا ہوں نہ کوئی تحفہ لایا ہوں۔ میں آپ کے فائدے اور آپ کی نجات کے لیے آیا ہوں۔ میں آپ کو ایک پیشکش کرنے آیا ہوں۔ شودیو کی طاقت سے آپ واقف نہیں۔ اس طاقت کا صرف ایک ذرہ شودیو نے مجھے دیا ہے۔ یہ ذرہ ایسا ہی ہے جیسے صحرا میں ریت کا ایک ذرہ یا سمندر میں پانی کا ایک قطرہ۔ اس ایک ذرے اور ایک قطرے کی طاقت دیکھنی ہے تو دکھا دوں گا۔ اس سے آپ اس دیوتا کی طاقت کا اندازہ کر سکیں گے۔"

"اور یہ لڑکی؟"

"یہ زندہ نہیں، ایک رُوح ہے"۔ بوڑھے نے کہا۔ "آپ کو شاید کسی نے بتایا نہیں کہ جو مر جاتا ہے اُس کی روح سومنات میں آجاتی ہے۔ یہ رُوح بڑی دُور سے آئی تھی۔ میں نے آج اسے حاضر کیا اور اسے اپنے ساتھ لے آیا۔ اگر یقین نہ آئے تو میں اسے ہوا میں معلق کر کے دکھا سکتا ہوں۔"

اُس نے لڑکی کا سر اپنے ہاتھوں کے پیالے میں لے لیا اور اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سرگوشیوں میں کچھ کہا۔ لڑکی کا سر ڈولنے لگا۔ بوڑھے نے اُسے بازوؤں پر اٹھا لیا اور اُسے کہا۔ "تم پلنگ پر ہو۔ ٹانگیں اور سر سیدھا کر لو"۔ لڑکی کا جسم یوں سیدھا ہو کر اکڑ گیا جیسے پلنگ پر لاش پڑی ہو لیکن وہ بوڑھے کے بازوؤں پر تھی۔ بوڑھے نے اپنے بازو اُس کے نیچے سے نکال لیے۔ لڑکی اکڑی ہوئی ہوا میں معلق رہی۔ بوڑھے نے لڑکی کی چادر اُس پر اس طرح ڈال دی کہ وہ سر سے پاؤں تک چادر میں چھپ گئی۔

سلطان کے دو محافظ خیمے کے دروازے میں اندر کھڑے تھے۔ بوڑھے رشی نے ایک محافظ سے کہا۔ "تلوار نکالو اور اس لڑکی کے پیٹ پر اتنی طاقت سے وار کرو کہ اس کا جسم دو حصّوں میں کٹ جائے۔"

محافظ نے سلطان کی طرف دیکھا۔ وہ بغیر اجازت کوئی حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ سلطان نے اُسے اشارہ کیا کہ بوڑھے نے جو کہا ہے وہ کرو۔ محافظ نے تلوار نکالی اور پوری طاقت سے لڑکی کے پیٹ پر وار کیا مگر وہاں کسی کا پیٹ نہیں تھا جو کٹ جاتا۔ صرف چادر تھی جو تلوار کے ساتھ لپٹ کر زمین پر جا پڑی۔ لڑکی غائب تھی۔

حیرت سے محافظ کا رنگ پیلا پڑ گیا لیکن سلطان محمود مسکرا رہا تھا۔

"یہ جسم نہیں تھا"۔ بوڑھے نے کہا۔ "تلوار سے آپ جسم کو کاٹ سکتے ہیں، روح کو نہیں۔ اگر آپ حکم دیں تو میں آپ کو تھوڑی سی دیر کے لیے اُس دیس میں بھیج سکتا ہوں جہاں سے یہ روح آئی تھی۔"

دو وقائع نگاروں، ابن ظفیر اور سبط ابن الجوزی نے اُس دور کی ایک تحریر

کا حوالہ دے کر یہ واقعہ کچھ اختصار سے بیان کیا ہے۔ ایک بار سلطان محمود کے پیر و مرشد شیخ ابوالحسن خرقانی نے اُسے کہا تھا کہ ہندوستان جادوگروں اور شعبدہ بازوں کی حسین سرزمین ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم یا تمہارے سالار یا انتظامی شعبوں کے وہ حکام جو ہندوستان کے مفتوحہ علاقوں میں رہتے ہیں، اس جادو اور شعبدہ بازی کے اسیر ہو جائیں۔ ہندو وہ قوم ہے جو یہودیوں اور نصرانیوں کی طرح اپنی خوبصورت بیٹیوں کے ذریعے اپنے دشمن کو اُسی طرح پھانس کر چوس لیتی ہے جس طرح مکڑی مکھی کو اپنے جالے میں پھانس لیتی ہے۔ شیخ خرقانی نے سلطان کو تفصیل سے بتایا تھا کہ ہندوستان میں کیسی کیسی شعبدہ بازیاں ہوتی ہیں۔

سلطان محمود خود بھی عالم تھا اور اُسے علم و دانش سے گہری دلچسپی تھی۔ اُس نے ہندوستان کے متعلق بہت کچھ پڑھا اور سنا تھا۔ وہ ہزار ہا جنگی قیدیوں کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ ان میں علم و فضل والے لوگ بھی تھے۔ ان سے اُس نے بہت کچھ حاصل کیا تھا۔ بعض باتیں سُن کر وہ حیران رہ جاتا تھا اور بعض شعبدے دیکھ کر اُسے یقین نہیں آتا تھا کہ کسی انسان میں ایسی شعبدہ بازی کی طاقت ہوتی ہے۔ اُس نے ہمالیہ میں زندگی بسر کرنے والے یوگیوں کے قصے بھی سُنے تھے جن میں سے بعض نے ایسی طاقت حاصل کر رکھی تھی کہ نصف گھنٹے سے بھی زیادہ دیر تک نہ صرف اپنی سانس روک سکتے تھے بلکہ اپنے دل کی حرکت تک ساکن کر لیتے تھے۔ نبضیں رک جاتی تھیں اور کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ شخص زندہ ہے مگر وہ دل کی حرکت خود ہی رواں کر کے زندہ ہو جاتے تھے۔ یوگائیں ساڑھے تین ہزار سال پُرانا علم یا طریقہ تھا جس میں مہارت حاصل کر کے لوگ تندرست کو مریض اور مریض کو تندرست کر لیا کرتے تھے۔

یوگ (یوگا) کو آج کے سائنسدان اور ماہرین طب و نفسیات اہمیّت دے رہے ہیں۔ اس میں اپنے آپ کو اور دوسروں کو ہپناٹائز کرنے کے طریقے خاص طور پر شامل ہیں، اور اس میں ٹیلی پیتھی بھی شامل ہے جسے جدید علم نفسیات اپنی اختراع سمجھتا ہے یہ در اصل ہزاروں سال پہلے کے یوگیوں کے

ایجاد کئے ہوئے طریقے تھے۔

یہ بوڑھا رشی لڑکی کو غائب کر کے سلطان محمود کی طرف یہ کہتا ہوا آہستہ آہستہ بڑھا کر وہ سلطان کو بھی تھوڑی سی دیر کے لیے عالمِ ارواح میں پہنچا دے گا۔ سلطان نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور مسکرا کر اُسے روک دیا۔ وہ نہ رکا تو ایک محافظ نے اُسے بازو سے پکڑ کر روک لیا۔ ترجمان نے اُسے اُس کی زبان میں کہا کہ سلطان کے اشارے کی خلاف ورزی نہ کرے۔

"اور اسے کہو کہ یہ مجھے تھوڑی سی دیر کے لیے روحوں کے دیس میں پہنچا سکتا ہے اور میں اسے اُس دیس میں ہمیشہ کے لیے پہنچا سکتا ہوں"۔ سلطان محمود نے کہا۔ "اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میری تلوار اس کی گردن کاٹ دے گی تو لڑکی خود بخود سب کو نظر آنے لگے گی۔ اسے کہو کہ لڑکی کو فوراً میرے سامنے لائے اور اسے کہو کہ میں یہاں شعبدہ بازی دیکھنے نہیں آیا"۔

بوڑھے رشی نے لڑکی کی چادر دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر جھٹکا دیا اور اپنے بازو آگے کو پھیلا دیئے۔ چادر تن گئی اور لڑکی اس چادر میں سے برآمد ہوئی۔ لڑکی پر غنودگی سی طاری تھی۔ سلطان محمود نے محافظوں سے کہا کہ اس بوڑھے کو باہر لے جائیں۔ اُسے لے گئے تو سلطان نے لڑکی سے کہا کہ وہ بتا دے کہ یہ بوڑھا جادوگر کس ارادے سے یہاں آیا تھا۔ اگر وہ نہیں بتائے گی تو اُسے بہت بُری موت مرنا پڑے گا۔ ان کے درمیان ترجمان موجود تھا۔

لڑکی کچھ دیر سلطان کو دیکھتی رہی۔ اُس کے چہرے پر حیرت کا تاثر تھا۔ اُس نے کہا۔ "مجھے بتایا گیا تھا کہ آپ مسلمانوں کے بادشاہ ہیں.... آپ کیسے بادشاہ ہیں جو مجھے موت کے حوالے کرنا چاہتے ہیں؟.... میں وہ کھلونا ہوں جسے کوئی بادشاہ اور کوئی مہاراجہ کسی دوسرے بادشاہ اور مہاراجہ کو نہیں دینا چاہتا۔ میں اپنی قدر و قیمت سے واقف ہوں"۔

"اور میں اُس مقصد سے واقف ہوں جس کے لیے یہاں آیا ہوں"۔ سلطان محمود نے کہا۔ "میں تم سے پوچھ رہا ہوں کہ اس شعبدہ باز کو مہاراجہ نے بھیجا ہے یا یہ خود آیا

ہے؟ مجھے تمہارے جسم اور تمہارے حسن کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں۔ میں تمہیں عزت سے رخصت کر دوں گا اور مجھے یہ بھی بتاؤ کہ اندر کیا ہو رہا ہے"۔

لڑکی نے ترجمان کی طرف دیکھا اور اُسے کہا۔ "تم باہر چلے جاؤ"۔

ترجمان نے سلطان کو بتایا کہ لڑکی اُسے باہر جانے کو کہہ رہی ہے۔ سلطان نے لڑکی کو خشمگیں نگاہوں سے دیکھا اور بڑی دھیمی آواز میں کہا۔ "اگر تم یہاں مرنے کے لیے آئی ہو تو میں تمہاری موت کا انتظام فوراً کر دوں گا لیکن تمہاری موت تلوار کے ایک وار سے نہیں ہوگی۔ تمہیں ٹخنوں سے باندھ کر رسّی گھوڑے کے پیچھے باندھ دی جائے گی اور گھوڑا شہر کے دروازے کی طرف دوڑا دیا جائے گا۔ وہاں تک تمہاری صرف ہڈیاں رہ جائیں گی"۔

لڑکی نے بتا دیا کہ اُسے مندر کے سب سے بڑے پنڈت اور مہاراجہ نے اپنے پاس بلا کر کہا تھا کہ اس بوڑھے کے ساتھ جاؤ۔ اگر اسے سلطان تک جانے کی اجازت مل گئی تو یہ اپنا کام کرے گا اور اس کے بعد لڑکی اپنا کام کرے گی۔ لڑکی کو سلطان پر اپنے حسن اور نوجوانی کا طلسم طاری کرنا تھا۔ اسے بتایا گیا تھا کہ سلطان انسان ہے۔ وہ اس کے جال میں آ جائے گا، اور شراب ضرور پیتا ہو گا۔ لڑکی نے ایک انگوٹھی پہن رکھی تھی۔ اُس نے انگوٹھی کا اوپر کا حصہ انگوٹھی سے الگ کر دیا اور بتایا کہ اُسے یہ زہر دیا گیا تھا جو اُسے سلطان پر اپنا طلسم طاری کر کے اُسے شراب یا مشروب میں [illegible] نا تھا۔

لڑکی نے انگوٹھی کو اُلٹا کیا تو اس میں سے تھوڑا سا سفوف زمین پر گرا۔ لڑکی نے اس پر پاؤں مار کر اسے مٹی میں ملا دیا۔ اُس نے اندر کی حالت یہ بتائی کہ ایک طرف تو پنڈت بُت کے آگے لیٹ لیٹ کر اور ماتھے رگڑ رگڑ کر رو رہے ہیں، اور دوسری طرف وہ ناچنے والیوں کو اندھیرے کمروں میں لے جا کر بدی میں مصروف ہیں۔ انہیں کہا جا رہا ہے کہ شیو دیو عصمتوں کی قربانی مانگ رہا ہے۔ لڑکی نے شہر کی کیفیت بھی بتائی اور کہا کہ ہر شہری سومنات کو بچانے کے لیے اپنی جان تک قربان کرنے کو تیار ہے لیکن اُن پر خوف بھی طاری ہے۔

"میں اس مندر کی داسی ہوں" — لڑکی نے کہا۔ "ہندو مجھے اور مجھ جیسی لڑکیوں کو پاک اور مقدس سمجھتے ہیں مگر ہم اس مندر اور اس شیو دیوتا کی حقیقت سے آگاہ ہیں۔ نہ ہم پاک ہیں نہ پنڈت اور پروہت پاک ہیں۔ میرا کوئی مذہب نہیں۔ مجھے آپ اپنی داسی بنا لیں۔ یہی میرا مذہب ہے۔"

سلطان محمود نے زیادہ باتیں نہ کیں۔ بوڑھے رشی کو اندر بلایا۔

"مجھے ہندوستان میں آئے پچیس برس گزر گئے ہیں۔" سلطان نے بوڑھے سے کہا۔ "کیا تم میرے پاس یہ سمجھ کر آئے ہو کہ مجھے ہندوستان کی ان شعبدہ بازیوں کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں؟ کیا میں لوگوں کو حیران کن طاقتوں سے واقف نہیں؟ میں ایک سچے مذہب کا پرستار ہوں یوگی مہاراج! میں اس مذہب کا پرستار ہوں جس کی بیٹیوں کی عصمت پر ہم جانیں قربان کر دیا کرتے ہیں۔ ہم ہندوؤں، یہودیوں اور نصرانیوں کی طرح اپنی بیٹیوں کو ننگا نہیں نچایا کرتے اور انہیں دشمن کے خیموں میں نہیں بھیجا کرتے۔"

"میں اس بحث کے لیے نہیں آیا کہ مذہب کس کا سچا ہے۔" بوڑھے نے ایسی باوقار آواز میں کہا جیسے وہ سلطان محمود کو چھوٹا سا آدمی سمجھتا ہو۔ "اپنے وطن اور اپنے مذہب کی خاطر ہماری بیٹیاں اپنا آپ اور اپنی عزت قربان کر دیا کرتی ہیں۔ یہ ہمارے مذہب کا حکم ہے۔ آپ کی عمر مجھ سے بہت کم ہے سلطان! آپ اپنی بیٹیوں کی عصمتوں کی حفاظت کے لیے ہمیشہ زندہ نہیں رہیں گے۔ ہماری بیٹیاں آپ کے مردوں کو عصمتوں کے شیدائی اور سوداگر بنانے کے لیے زندہ رہیں گی۔ میں نے آپ کی بات پوری نہیں ہونے دی تھی۔ مجھے معلوم ہے آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ وہ میں کہہ دیتا ہوں تاکہ آپ کا وقت ضائع نہ ہو۔ یہ ہمارا فرض ہے کہ اپنی بیٹیوں کو یہ سبق دیں کہ اپنے دشمن کو کس طرح بیکار کر سکتی ہیں۔ میں آپ کو راز کی بات اس لیے بتا رہا ہوں کہ میری چال ناکام ہو گئی ہے۔ آپ میرے قتل کا حکم دے دیں۔ اس لڑکی کو بھی مار دیں یا اسے مالِ غنیمت سمجھ کر اپنے پاس رکھ لیں لیکن میں آپ کو یہ بتا دیتا ہوں کہ ہماری لڑکیاں مسلمانوں کے مذہب اور

ایمان کو خرید لیں گی۔ بھارت ماتا میں اسلام نہیں رہے گا۔"

سلطان محمود بوڑھے کی باتیں بڑی غور سے سن رہا تھا۔ اس کے چہرے پر نہ غصے کا تاثر تھا نہ اکتاہٹ کا۔ لطیف سا تبسم تھا جو اس کے ہونٹوں کو ذرا سا خم دیئے ہوئے تھا۔

"قتل ہونے سے پہلے میں آپ کو مہاراجہ کنور رائے کی طرف سے ایک پیشکش کرنا چاہتا ہوں۔" بوڑھے نے کہا۔ "آپ جتنی دولت اور جس قدر زر و جواہرات مانگیں گے آپ کے خیمے میں پہنچا دیئے جائیں گے۔ اس عمر اور اس حسن کی آپ جتنی لڑکیاں مانگیں گے آپ کو پیش کر دی جائیں گی۔ آپ واپس چلے جائیں۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ واپسی کے دوران کوئی فوج آپ کو پریشان نہیں کرے گی۔ اگر آپ کو یہ پیشکش قبول نہیں تو میں آپ کو خبردار کر دیتا ہوں کہ کم از کم تین مہاراجوں کی فوجیں کل شام تک پہنچ جائیں گی، اور آپ پر عقب سے ایسا حملہ ہو گا کہ آپ ہندوستان کی جنگی طاقت اور سومنات کی دیواروں کے درمیان پس جائیں گے۔ آپ کا کوئی ایک بھی سپاہی واپس جا کر یہ بتانے کے لیے زندہ نہیں رہے گا کہ غزنی کی فوج کا انجام کیا ہوا ہے۔"

خیمے میں ایک محافظ کی آواز گرجی۔ "خاموش .... سگِ ہند" اور اس نے تلوار نکال لی۔

سلطان محمود نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا اور کہا۔ "یہ ہمارا قیدی نہیں مہمان ہے۔ اپنے مہاراجہ کا ایلچی ہے۔" سلطان نے بوڑھے سے کہا۔ "میں معافی چاہتا ہوں میرے محافظ نے آپ کو ہندوستان کا کتا کہا ہے۔"

"اگر کسی مہاراجہ کے دربار میں ایسی گستاخی کرتا تو اسے اسی وقت قتل کر دیا جاتا۔" بوڑھے نے کہا۔

"ہم سب اس وقت خدا کے دربار میں ہیں۔" سلطان محمود نے کہا۔ "خدا کے دربار میں کوئی کسی کو قتل نہیں کر سکتا۔ یہ لوگ میرے حکم سے نہیں، خدا کے حکم سے یہاں آئے ہیں۔ مجھے ان کی صرف قیادت کا فرض سونپا گیا ہے۔

میں ان کے جذبات، ان کے غصے اور ان کے قہقہوں کو زنجیریں نہیں ڈال سکتا"

سلطان بولتے بولتے اُٹھ کھڑا ہُوا اور اُس نے محافظ سے کہا — "اس بزرگ کو اور اس لڑکی کو اپنی حفاظت میں عزّت سے قلعے کے دروازے تک چھوڑ آؤ"۔ اُس نے بوڑھے سے کہا — "اپنے مہاراجہ سے کہنا کہ تم سومنات کو ایک بوڑھے یوگی، ایک آبرو باختہ حسین لڑکی اور ذرا سے زہر کے ذریعے نہیں بچا سکتے۔ ہم یہاں سے زندہ نکل جانے کی خواہش لے کر نہیں آئے۔ جائیے یوگی مہاراج! اس لڑکی کو ساتھ لے جائیے"۔

بوڑھا رِشی سلطان کو کچھ دیر دیکھتا رہا، پھر وہ بے اختیار ہو کر آگے بڑھا اور سلطان کا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چُوما اور بولا — "مجھے صاف نظر آنے لگا ہے کہ فتح سلطان کی ہوگی" — اور وہ لڑکی کو ساتھ لے کر محافظ کے ساتھ خیمے سے نکل گیا۔

*

اگر سومنات کی جنگ کا حال لمحہ بہ لمحہ لکھا جائے تو ایک ہزار صفحوں کی کتاب بن جائے۔ ہندوؤں نے غزنی کی فوج اور سلطان محمود کو ذہنی طور پر بیکار کرنے کیلیے زمین دوز حربے استعمال کیے تھے۔ فوج کی نفری نے انفرادی طور پر جس شجاعت اور فرض شناسی کے مظاہرے کیے وہ بڑی لمبی داستان ہے۔ اس جنگ کا شمار تاریخ کی چند ایک مشہور جنگوں میں ہوتا ہے۔ تاریخ اسلام کا تو یہ بہت بڑا معرکہ تھا جسے ہندو مورخوں نے دو چار سطروں میں بیان کر کے اس کی اہمیت پر پردہ ڈال دیا ہے۔

اُس رات۔ جس رات بوڑھا رِشی سلطان کے پاس آیا تھا، ایسی صبح کو جنم دیا جو ہندوستان اور غزنی کی تاریخوں میں اور خصوصاً اسلام کی تاریخ میں کبھی فراموش نہیں کی جائے گی۔ سلطان محمود شہر کی دیواروں اور دروازوں پر نئے انداز سے حملہ کرنے کے احکام دے رہا تھا۔ اسے اطلاع ملی کہ عقب میں دشمن کی دو فوجیں نیم دائرے میں آگئی ہیں اور وہ غزنی کی فوج کو گھیرے میں لے رہی ہیں۔

سلطان نے اس صورتِ حال سے نمٹنے کا بندوبست کر رکھا تھا مگر وہ حیران رہ گیا کہ یہ فوجیں اتنی خاموشی سے کس طرح آگئی ہیں۔ اُس نے سالارِ اعلیٰ ابوعبداللہ

کو محاصرے کی قیادت کے لیے وہیں چھوڑا اور ہدایت دی کہ ابھی حملہ نہ کیا جائے بلکہ تیاری کی حالت میں رہا جائے۔ وہ دشمن کی چال سمجھ گیا تھا۔ اُس نے سالارِ اعلیٰ سے کہا — "پیچھے سے ہم پر حملہ ہوتے ہی شہر کے دروازے کھلیں گے اور اندر کی فوج باہر آکر ہم پر حملہ کرے گی۔ پہلوؤں کو پھیلا دو۔ دشمن جب آگے آجائے تو پہلوؤں سے نکل کر شہر میں داخل ہونے کی کوشش کرنا"۔

پیچھے سے آنے والی ایک فوج راجہ پرم دیو کی تھی جسے بعض مورخوں نے برہم دیو لکھا ہے اور دوسری فوج راجہ دیو آسرم کی تھی۔ سلطان محمود نے جو دستے عقب کا حملہ روکنے کے لیے پیچھے رکھے تھے، ان کا کمانڈر سالار ابوالحسن تھا۔ سلطان گھوڑا سرپٹ دوڑاتا وہاں پہنچا۔ صورتِ حال مخدوش تھی۔ اُس نے جاتے ہی تیزی سے صورتِ حال کا جائزہ لیا اور حکم دیا کہ آمنے سامنے کی ٹکر نہ لی جائے۔ دونوں پہلوؤں سے حملہ کر دیا جائے۔ سلطان خود ایک بلند جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ گھوڑے دوڑ پڑے اور اللہ اکبر کے نعروں سے زمین و آسمان ہلنے لگے۔

اُدھر شہر کے دونوں دروازے کھلے اور سومنات کی فوج بہت تیزی سے باہر آئی اور پھیل کر بڑی خطرناک ترتیب میں ہو کے محاصرے پر حملہ آور ہوئی۔ اب غزنی کی فوج محاصرے میں تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد سلطان محمود کے چہرے پر پریشانی نظر آنے لگی۔ دونوں راجوں کی فوجیں پہلوؤں پر حملے کو روکنے کے لیے تیار تھیں۔ انہوں نے فوراً اپنی ترتیب بدل لی۔

یہ لڑائی نہیں تھی۔ بڑی تیز لڑائی تھی اور بڑی تیزی سے دونوں فریقوں کی نفری کٹ کٹ کر گر رہی تھی۔ اِدھر سالارِ اعلیٰ ابوعبداللہ بڑی کامیابی سے سومنات کی فوج کو روکے ہوئے تھا مگر ہندو زندگی اور موت کا معرکہ لڑ رہے تھے۔

آدھا دن گذر گیا۔ مورخ لکھتے ہیں کہ غزنی والوں کو اپنی شکست صاف نظر آنے لگی تھی۔ اس جنگ پر دو مستند کتابوں کا۔ "ملات التواریخ" اور "تاریخ الفی" میں لکھا ہے کہ راجوں کی فوج کو تازہ دم کمک مل رہی تھی۔ محمد قاسم فرشتہ لکھتا ہے:

"سلطان محمود نے جب دیکھا کہ اس کی کوئی چال کامیاب نہیں ہو رہی تو وہ گھوڑے

سے کود کر اُترا اور قبلہ رُو ہو کر دو نفل پڑھے، پھر دعا مانگی۔ وہ اکثر معرکوں کے دوران ایسے ہی کیا کرتا تھا اور نہ صرف اُس میں بلکہ پوری فوج میں نیا جوش اور تازگی پیدا ہو جاتی تھی.... سالار ابوالحسن اس کے قریب کھڑا تھا۔ سلطان نے ابوالحسن کا ہاتھ پکڑا اور کہا۔ "ابوالحسن! فتح ہماری ہے"۔ اُس نے سالار کو گھوڑے پر سوار ہونے کو کہا، خود بھی سوار ہُوا۔ اُس نے اپنا جھنڈا اونچا کرنے کو کہا اور سپاہیوں کی طرح میدانِ جنگ میں شامل ہو گیا۔ ہر طرف اعلان ہونے لگے۔ "سلطان لڑ رہے ہیں.... غزنی کے مجاہدو! سلطان تمہارے ساتھ ہے"۔

اس کا فوج پر وہی اثر ہُوا جو اس سے پہلے کئی معرکوں میں دیکھنے میں آیا تھا۔ پروفیسر محمد حبیب نے کچھ مورخوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ جب سلطان محمود خود لڑائی میں شریک ہُوا اُس وقت اُس کے ہاتھ میں اپنے مُرشد شیخ ابوالحسن خرقانی کا جُبّہ تھا جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا اور اسے اُس نے عقیدت کے طور پر اپنے گھوڑے کے ساتھ باندھ رکھا تھا۔

فرشتہ کے مطابق سلطان کا یہ حملہ اتنا دہشت ناک تھا کہ دونوں راجوں کی فوجوں کا رابطہ ٹوٹ گیا، پھر ان کی مرکزیت ٹوٹی۔ غزنی کے چند ایک جانبازوں نے دونوں راجوں کے قلب پر حملہ کر کے اُن کے جھنڈے گرا دیئے اور راجے میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اس کے بعد راجوں کی فوج کا قتلِ عام شروع ہو گیا۔ فرشتہ نے لکھا ہے کہ تھوڑی سی دیر میں کم و بیش پانچ ہزار ہندو فوجیوں کی لاشیں غزنی کے گھوڑوں کے قدموں میں کچلی جا رہی تھیں۔ راجوں کے پیچھے کچھ سپاہی بھاگے لیکن غزنی کے گھوڑ سواروں نے انہیں بھاگنے نہ دیا۔

❋

سلطان محمود کو سومنات کی فوج اور اپنے سالارِ اعلیٰ ابوعبداللہ کے معرکے کی رپورٹیں ملیں۔ اُس نے سالارِ اعلیٰ کو پیغام بھیجا کہ لڑتے لڑتے پیچھے ہٹنے کی کوشش کرو۔ سالارِ اعلیٰ نے اس حکم پر عمل کیا تو سومنات کی فوج آگے آ گئی۔ شہر کے دروازے بند تھے۔ سلطان محمود نے سالار ابوالحسن سے کہا کہ وہ سومنات کی فوج کے پیچھے

اُس پر حملہ کرے۔

جب پیچھے سے حملہ کیا گیا تو ہندوؤں کو پتہ چلا کہ اُن کی مدد کے لیے جو فوجیں آئی تھیں وہ ختم ہو چکی ہیں اور وہ اب گھیرے میں آ گئے ہیں۔ وہ دفاعی لڑائی لڑنے لگے اور پیچھے نکل کر شہر کے اندر جانے کی کوشش کرنے لگے مگر وہ نکل نہ سکے۔ غزنی کا ایک جیش جو دروازے اور دیواریں توڑنے کے لیے تربیت یافتہ تھا، دروازے توڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔

دیواروں کے اوپر جو ہندو کھڑے تھے انہوں نے شہر میں خبر پھیلا دی کہ اُن کی فوج کٹ گئی ہے۔ یہ خبر بالکل صحیح تھی۔ ابن الاثر اور ابنِ ظفیر لکھتے ہیں کہ ہندو سپاہی مذہبی جنون سے لڑ رہے تھے لیکن جو مذہبی جذبہ مسلمانوں میں تھا اور جو قیادت مسلمانوں کی تھی، اس کے آگے ہندوؤں کا مذہبی جنون ختم ہو گیا اور وہ جانیں بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگے۔ شہر میں خبر پھیلی تو بہت سے ہندو فوجی پچھلے دروازے سے جو سمندر میں کھلتا تھا، باہر نکلے۔ وہاں سینکڑوں کشتیاں موجود تھیں۔

اس کی اطلاع سلطان کو مل گئی۔ اُس نے حکم دیا کہ اُدھر کے دستے کشتیوں پر قبضہ کر کے اُدھر والے دروازے سے اندر جائیں۔ اس دستے نے فوراً وہاں پہنچ کر بہت سی کشتیوں پر قبضہ کر لیا اور بھاگتے ہوئے ہندو فوجیوں پر تیر برساتے ہوئے کشتیوں میں دروازے تک پہنچ گئے۔ دروازہ کھلا تھا۔ وہاں کوئی مزاحمت نہیں تھی۔

ادھر دونوں دروازے کھول لیے گئے۔ بعض مورخ کہتے ہیں کہ ہندوؤں نے دروازے خود کھولے تھے۔ اُن کا مقصد غالباً یہ تھا کہ غزنی کی فوج کو شہر کی گلیوں کی بھول بھلیوں میں لڑایا جائے۔ غزنی کی فوج شہر میں داخل ہو گئی۔ شہریوں نے مقابلہ کرنے کی کوشش کی۔ وہ گروہ در گروہ مقابلے کے لیے آئے اور کٹ کٹ کر گرے۔ انہوں نے چھتوں سے تیر برسائے۔ ہندو عورتوں نے اوپر سے پتھر مارے جو انہوں نے اسی مقصد کے لیے گھروں میں جمع کر رکھے تھے۔ غزنی والوں نے چند ایک مکانوں کو آگ لگا دی۔ اس کے ساتھ ہی شہر میں یہ خبر پھیل گئی کہ سومنات کی

فوج ایک طرف تو کٹ گئی ہے اور جو اندر تھی وہ پچھلے دروازے سے سمندر کے راستے بھاگ گئی ہے۔ اس سے شہریوں کے حوصلے ٹوٹ گئے اور سومنات کی جنگ ختم ہوگئی۔

اس جنگ میں سومنات کے جو شہری، باہر سے آئے ہوئے زائرین اور جو ہندو فوجی مارے گئے تھے ان کی تعداد پچاس ہزار تھی۔ سمندر کے راستے جو فوجی بھاگے تھے، اُن کی تعداد چار ہزار تھی لیکن یہ سب بھاگ نہ سکے۔ ان میں سے بہت سے غزنی والوں کے تیروں کا نشانہ بن گئے تھے۔ کچھ سمندر میں کود گئے اور ڈوب کر مر گئے۔ چند ایک کشتیاں اُلٹ بھی گئی تھیں۔

سومنات کا مندر سلطان محمود کے قدموں میں پڑا تھا۔ یہ ۹ جنوری ۱۰۲۶ء (۱۶ ذی القعدہ، ۴۱۶ھ) کا دن تھا۔

*

سلطان محمود نے جب مندر دیکھا تو حیران رہ گیا۔ یہ فنِ تعمیر کا شاہکار تھا۔ مندر کی سیڑھیوں پر پنڈتوں کا ہجوم کھڑا تھا۔ سب نے ہاتھ جوڑے ہوئے تھے۔ اُن کے چہروں پر خوف تھا۔ سلطان محمود کے متعلق تاریخوں میں آیا ہے کہ وہ پنڈتوں اور پجاریوں کو نہ قید کرتا تھا نہ انہیں کوئی اور سزا دیتا تھا۔ اُس نے سومنات کے پنڈتوں کو ہاتھ جوڑے اپنے سامنے کھڑے دیکھا تو حکم دیا کہ انہیں کہو ہاتھ نیچے کرلیں، میں سومنات کا بت نہیں ہوں، اور انہیں کہہ دو کہ انہیں کوئی گزند نہیں پہنچے گا۔

سلطان سیڑھیوں پر چڑھ گیا۔ یہ فتح اُسے بہت مہنگی پڑی تھی۔ اُس نے اپنے ایک محافظ سے جنگی کلہاڑا لیا اور اُس چبوترے پر چڑھ کر جس پر شودیو کا بت کھڑا تھا، کلہاڑے سے بت کی ناک توڑ دی اور حکم دیا کہ اس بت کو توڑ دیا جائے۔ بڑا پنڈت اور چند دوسرے پنڈت سلطان کے قدموں میں گر پڑے اور التجا کی کہ وہ سلطان کو سومنات کی تمام دولت دے دیں گے وہ بت نہ توڑے اور مندر کو اسی طرح کھڑا رہنے دے۔ سلطان نے انہیں کہا کہ وہ اتنی دُور سے یہاں غزنی کی ہزاروں ماؤں کے بیٹے مروانے کے لیے نہیں آیا تھا۔

بعض مؤرخوں نے لکھا ہے کہ دو سالاروں نے اور سلطان کے اپنے بیٹے مسعود نے جو اُس کے ساتھ تھا، سلطان سے کہا کہ ان کی پیش کش مان لی جائے (سلطان محمود کے تین بیٹے، عبدالرشید، مسعود اور محمد اس کے ساتھ آئے تھے)۔ سلطان محمود نے مسکرا کر اور شگفتہ سے لہجے میں کہا۔ "کیا تم لوگ میری عاقبت خراب کرنا چاہتے ہو؟ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ روزِ قیامت اللہ تعالیٰ یوں پکارے کہ کہاں ہے وہ محمود جس نے سب سے بڑا بت توڑا تھا۔ میں ڈرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ یوں نہ کہیں کہ لاؤ ہمارے سامنے غزنی کے محمود کو جس نے زروجواہرات کے عوض بت پرستوں کو بت بخش دیا تھا.... کیا یہ میرے لیے بہتر نہیں کہ تاریخ مجھے بت فروش نہ کہے بت شکن کہے؟"

سلطان نے حکم دیا۔ "اس بت کے دو ٹکڑے غزنی جائیں گے۔ ایک میرے گھر کے باہر دروازے میں رکھا جائے گا اور دوسرا غزنی کی جامع مسجد کے دروازے کے باہر جہاں یہ ہر کسی کے پاؤں تلے آئے۔ اس کا ایک ٹکڑا مدینہ منورہ اور دوسرا مکہ معظمہ بھیج دیا جائے۔"

فرشتہ نے اور بہت سے دوسرے مورخوں نے لکھا ہے کہ آج بھی اس بت کا ایک ایک ٹکڑا غزنی میں سلطان کے محل کے بیرونی دروازے میں، دوسرا جامع مسجد کے دروازے میں، تیسرا مدینہ منورہ اور چوتھا مکہ معظمہ میں موجود ہے۔

مندر کی عمارت ساگوان کے ۵۶ ستونوں پر کھڑی تھی۔ سلطان نے شودیو کا بت تڑوا کر باہر پھینک دیا اور مندر سے تمام خزانہ نکال کر ستونوں کو آگ لگا دی۔ تھوڑی دیر بعد ہندوستان کا سب سے بڑا بت خانہ جس میں "جلندر کے آقا" کا بت تھا اور جو مرے ہوئے انسانوں کو دوسرا جنم دیتا تھا، ہیبت ناک گڑگڑاہٹ سے ملبے کا ڈھیر بن گیا۔ غزنی کی فوج نے ملبہ سمندر میں پھینک دیا۔ پیچھے مندر کی صرف بنیادیں رہ گئیں۔

تمام مورخوں نے لکھا ہے کہ ہندوؤں کا یہ الزام غلط اور بے بنیاد ہے کہ سومنات کا بت اندر سے کھوکھلا تھا اور ہیرے جواہرات سے بھرا پڑا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کوئی باقاعدہ تراشا ہوا بت نہیں تھا۔ یہ ایک چٹان کا لمبوترا ٹکڑا تھا جس کے

غدود خال انسانوں جیسے تھے اور اسے مرد کے جنسی جذبے کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ ہندو مذہب جنسیت کی بنیادوں پر کھڑا ہے۔

سومنات کا مہاراجہ کنور رائے لاپتہ تھا۔ سلطان محمود نے وہاں سے جو زر و جواہرات سمیٹے اُن کی مالیت آج کے اربوں روپوں جتنی تھی۔

جب مندر کے اندر آگ لگی ہوئی تھی، سلطان محمود شہر کی دیوار پر کھڑا دیکھ رہا تھا۔ شہر میں کہیں کہیں سے جلتے ہوئے مکانوں کا دھواں اُٹھ رہا تھا۔ لوگ شہر خالی کر رہے تھے۔ سلطان نے باہر دیکھا، منظر ہولناک تھا۔ زمین دور دور تک لال تھی اور لاشوں پر لاشیں پڑی تھیں۔ زخمی اٹھنے اور چلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بعض اٹھتے تھے اور گر پڑتے تھے۔ وہ ہندو تھے۔ انہیں اُٹھانے والا کوئی نہ تھا، کوئی پانی پلانے والا نہ تھا۔ شہر کے لوگ دروازوں سے نکل کر جا رہے تھے۔ وہ اپنے زخمیوں کو دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔

غزنی کے سپاہی اپنے ساتھیوں کی لاشیں اُٹھا رہے تھے اور زخمیوں کو بھی اٹھا اٹھا کر لے جا رہے تھے۔ سلطان محمود کی نظریں میدانِ جنگ میں گھوم رہی تھیں اور اس پر سنجیدگی طاری تھی۔ کوئی نہیں بتا سکتا کہ وہ کیا سوچ رہا تھا۔ اُس نے قلعے کے سامنے والے دونوں دروازوں کو دیکھا۔ اُسے شہر سے جانے والے ہندوؤں میں عورتیں اور بچے نظر آئے۔ اُس نے اپنے ساتھ کھڑے کسی آدمی سے کہا کہ نیچے جا کر شہر کے لوگوں سے کہو کہ وہ ہمارے ڈر سے اپنے گھروں سے نہ بھاگیں۔ انہیں غزنی کی فوج کی طرف سے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔

"کیا یہ لوگ اب بھی نہیں سمجھیں گے کہ فتح اور شکست، زندگی اور موت پتھر کے ایک ٹکڑے کے ہاتھ میں نہیں، خدا کے ہاتھ میں ہے؟" —— سلطان محمود نے کہا۔

اُسے کوئی جواب نہ ملا۔

*

سلطان محمود کے محکمہ جاسوسی نے وہاں کے چند ایک مقامی آدمیوں کو اپنے محکمے میں شامل کر لیا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ جن راجوں کی فوجوں نے غزنی کی فوج

پر پیچھے سے حملہ کیا تھا، وہ راجہ پرم دیو نے کرایا تھا۔ اس حملے میں غزنی کے تین ہزار سپاہی مارے گئے تھے۔ سلطان کو بتایا گیا کہ پرم دیو سومنات کے شمال میں ایک سو بیس میل دور گندادی کے مقام پر ہے اور یہ مقام چاروں طرف سے سمندر میں گھرا ہوا ہے۔

سلطان محمود اس قدر غصے میں تھا کہ اُس نے گندادی کی طرف پیشقدمی کا حکم دے دیا۔ جب سلطان وہاں پہنچا تو اُس نے دیکھا کہ قلعے تک پہنچنا ممکن نہیں کیونکہ چاروں طرف سمندر تھا۔ ایک طرف پانی کم تھا۔ یہ بھی پتہ چلا کہ پرم دیو نے اپنے آپ کو قلعے میں قید کر رکھا ہے۔ محمد قاسم فرشتہ لکھتا ہے کہ ایک رات سلطان محمود نے قرآن کی تلاوت کی، کچھ خاص آیات پڑھیں اور رو کر خدا سے راہنمائی اور مدد کی دعا کی۔ اگلی صبح اُس نے دیکھا کہ سمندر کا پانی پیچھے چلا گیا ہے۔ جدھر سے پانی کم ہوا تھا وہاں دلدل تھی۔ سلطان نے دلدل میں ہی گھوڑے ڈال دیئے اور قلعے تک جا پہنچا۔

غزنی کی فوج نے قلعے پر حملہ کیا اور تھوڑی ہی دیر میں قلعے کا دروازہ کھل گیا۔ پتہ چلا کہ راجہ پرم دیو سمندر کے راستے نکل بھاگا ہے۔ اُس کی فوج سومنات کے میدان میں مسلمانوں سے شکست کھا کر آئی تھی۔ اس نے ہتھیار ڈال دیئے۔ سلطان محمود نے حکم دیا کہ گندادی کو اجاڑ دیا جائے۔

سلطان محمود کچھ دن وہیں ٹھہرا۔ یہ گجرات کا علاقہ تھا جس کی آب و ہوا سلطان کو اتنی اچھی لگی کہ اُس نے گجرات میں سلطنتِ غزنی کا دارالحکومت بنانے کا فیصلہ کر لیا اور اپنے بیٹے مسعود سے کہا کہ وہ غزنی چلا جائے اور وہاں کی سلطنت سنبھال لے۔

"کیا سلجوقی اور خراسانی یہ نہیں کہیں گے کہ سلطان محمود میدان چھوڑ کر بھاگ گیا ہے؟" — مسعود نے کہا۔ "ہم نے خراسان کا علاقہ بڑے جوان مروا کر فتح کیا تھا۔"

"آپ یہاں کسی مقامی راجہ کو اپنا امیر مقرر کر دیں" — ایک مشیر نے کہا — "غزنی ایسا مرکز ہے جو آپ کی غیر حاضری میں اپنی مرکزیت اور اہمیت کھو بیٹھے گا۔"

سلطان محمود مان گیا۔ وہ سومنات واپس چلا گیا اور بہت سوچ بچار کے بعد راجہ دیو آسرم کو سومنات کا گورنر مقرر کر دیا اور غزنی واپس جانے کی تیاری کرنے لگا۔ اُس نے دیو آسرم سے کہا کہ وہ اب ملتان کے راستے واپس نہیں جانا چاہتا

اور کسی اور راستے سے اُسے واقفیت نہیں۔ دیو آسرم نے سلطان کو وہ راستہ بتایا جو رن کچھ میں سے گذر کر بلوچستان کو جاتا تھا۔ بلوچستان سے سلطان آسانی سے غزنی پہنچ سکتا تھا۔

"ہم سلطان کو ایسے آدمی دیں گے جو اُن کی راہنمائی کریں گے"۔۔۔ راجہ دیو آسرم کی رانی بھی موجود تھی۔ کہنے لگی۔۔۔ "رن کچھ اور اس سے آگے کے صحرا میں پانی اُن ہی لوگوں کو مل سکتا ہے جو اس صحرا سے واقف ہیں۔"

*

غزنی کی فوج فاتحانہ انداز سے واپس جا رہی تھی۔ اس کی نفری اب خاصی کم تھی۔ لاشیں سومنات کے ایک میدان میں دفن کر دی گئی تھیں۔ زخمی ساتھ تھے اور بے شمار اونٹ اُس خزانے سے لدے ہوئے تھے جو اس جنگ کا مالِ غنیمت تھا۔ اب فوج اللہ اکبر کے نعرے نہیں لگا رہی تھی، سپاہی مل کر جنگی ترانے گاتے جا رہے تھے۔ وہ سومنات کو جاتے ہوئے بھی صحرا سے گذرے تھے۔ اس ظالم صحرا کو وہ ساری عمر نہیں بھولے ہوں گے۔ اب بھی اُن کے سامنے ویسا ہی اجنبی اور بے رحم صحرا تھا مگر اب ان کے تاثرات اور جذبات کی کیفیت ایسی تھی جیسے اُن کی پیاس ہمیشہ کے لیے بجھ گئی ہو۔ ان کی روحیں فتح سے سرشار اور ترو تازہ تھیں۔

فوج صحرا میں داخل ہو گئی۔ پھر تین چار دن گذر گئے۔ پانی کا کہیں نشان نظر نہ آیا۔ گھوڑوں کو پانی پلانا تھا۔ انسان اپنے لیے جو پانی ساتھ لائے تھے وہ ختم ہو چکا تھا۔ اب سلطان محمود نے ایسا حکم نہیں دیا تھا کہ مشکیزے پانی سے بھر کر اونٹوں پر لاد لیے جائیں کیونکہ گائیڈوں نے اُسے یقین دلایا تھا کہ وہ اُسے ایسے راستے سے لے جائیں گے جہاں پانی کی بہتات ہے۔ اب گائیڈوں سے پوچھا گیا کہ پانی کہاں ہے تو وہ کہتے رہے کہ آگے ہے۔ اس طرح انہوں نے ایک دن اور گذار دیا۔

اگلے دن جب فوج میں بے چینی پھیل گئی، سپاہی پیاس سے نڈھال ہو گئے اور گھوڑوں میں چلنے کی سکت نہ رہی تو سلطان محمود نے اپنے سالاروں ابو عبداللہ محمد الطائی اور ابوالحسن سے کہا کہ اُسے کچھ شک ہو رہا ہے۔ دونوں گائیڈوں کو بلاؤ۔

گائیڈ آئے تو وہ اچھی طرح چلنے کے قابل نہیں تھے۔ ان کے سر ڈول رہے تھے۔

"کیا تم پیاس سے مر نہیں رہے ہو؟"۔۔۔ سلطان محمود نے اُن سے پوچھا۔

"مر رہے ہیں سلطان!"۔۔۔ ایک گائیڈ نے جواب دیا۔

"تم کہتے تھے کہ اس صحرا میں پانی کی افراط ہے"۔۔۔ سلطان محمود نے کہا۔

"ہاں سلطان! اس صحرا میں پانی کی کمی نہیں۔"

"کہاں ہے پانی؟"

"جہاں تک آپ زندہ نہیں پہنچ سکیں گے"۔۔۔ گائیڈ نے جواب دیا۔

"کیا تم دانستہ ہمیں پانی سے دور لے آئے ہو؟"

"دانستہ"۔۔۔ گائیڈ نے کہا۔۔۔ "ہم اپنا کام کر چکے ہیں۔"

"کیا تم ہمیں گمراہ کرنے کے لیے ساتھ آئے تھے؟"۔۔۔ سلطان نے غصے سے پوچھا۔۔۔ "کیا تم جانتے نہیں تھے کہ تم قتل ہو جاؤ گے؟"

"سب کچھ جانتے تھے سلطان!"۔۔۔ گائیڈ نے کہا۔۔۔ "ہم اپنی جانیں شنبو دیو کے حوالے کر کے سومنات سے آپ کے ساتھ چلے تھے۔ آپ کو یاد نہیں جب راجہ دیو آسرم آپ کو راستہ سمجھا رہا تھا تو اُس کی رانی نے کہا تھا کہ وہ آپ کو راہنما دے گی جو آپ کو اُس راستے سے لے جائیں گے جہاں پانی کی کوئی کمی نہیں۔ اُس نے ہمیں بتایا تھا کہ اُس نے آپ سے یہ وعدہ کیا ہے۔ وہ آپ کو یہ دھوکہ نہیں دینا چاہتی تھی سلطان! جب آپ سومنات کو تباہ برباد کر رہے تھے اُس وقت ہم دونوں یہاں نہیں تھے۔ ہم آتے تو تباہی مکمل ہو چکی تھی۔ ہم اتنی راتیں سو بھی نہ سکے۔ ہم نے بہت ترکیبیں سوچیں کہ آپ کو قتل کیا جائے مگر کوئی صورت نظر نہیں آئی۔ ہمیں پتہ چلا کہ آپ کو راہنماؤں کی ضرورت ہے تو ہم دونوں نے

اپنے آپ کو پیش کیا۔ ہم اس صحرا سے واقف ہیں۔ ہم خوش ہوئے کہ صرف آپ سے نہیں، غزنی کی پوری فوج سے انتقام لیں گے۔ ہم آپ کو پانی سے بہت دور لے آئے ہیں۔ ہم کل مر جائیں گے۔ ہم نے شودیو کی توہین کا انتقام لے لیا ہے۔ اب ہمیں زندہ رہنے کی خواہش نہیں۔ اگر آپ ہمیں قتل کر دیں گے تو یہ آپ کا ہم پر کرم ہوگا۔ ہم پیاس کی اذیت سے بچ جائیں گے،،

سلطان نے حکم دیا کہ انہیں قتل کر دیا جائے۔

*

فوج کی حالت ویسی ہی ہو رہی تھی جیسی ان دو گائیڈوں کی تھی۔ گائیڈوں نے غلط نہیں کہا تھا کہ وہ کل تک مر جائیں گے۔ انہوں نے بڑا ہی خوفناک انتقام لیا تھا۔ سومنات کا شودیو سچا معلوم ہوتا تھا۔ اُسی رات (محمد قاسم فرشتہ، فرخی اور "مجموعہ الانصاب" کے مطابق) سلطان محمود نے عشاء کی نماز کے بعد خیمے سے باہر چند نوافل پڑھے۔ اُس کی فوج کے گھوڑے پیاس سے ہنہنا رہے تھے۔ کچھ سپاہی کراہ بھی رہے تھے۔ صحرا کی بے رحمی انتہا کو پہنچ رہی تھی۔ سلطان کو نوافل کے دوران جانوروں اور انسانوں کی پیاسی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ سلطان ان آوازوں کو سمجھتا تھا اور یہ بھی سمجھتا تھا کہ اُس کی فوج میں سے بیشتر سپاہی کل رات اُس کے ساتھ نہیں ہوں گے۔ ظالم ریگزار اُن کے جسموں سے نمی کا آخری قطرہ بھی چوس لے گا۔

سلطان نے دُعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور وہ ایسا رویا کہ اُس کی زبان سے کوئی لفظ نہ نکلا۔ خدا جانتا ہے اُس کے بندوں کے دلوں میں کیا ہے اور خدا یہ بھی جانتا تھا کہ یہ فوج اُس کے نام کے نعرے لگا کر باطل پر ٹوٹی تھی۔ آسمان میں ایک ستارہ ٹوٹا جو شہابِ ثاقب تھا۔ ایک شعلہ ایک سمت کو اُڑا اور صحرا کے تاریک افق پر روپوش ہو گیا۔ فرشتہ نے اسے ایک "پُراسرار روشنی" لکھا ہے لیکن دوسرے مؤرخوں نے اسے شہابِ ثاقب کہا ہے جو زیادہ صحیح ہے۔

سلطان محمود کے دل سے آواز اُٹھی کہ جدھر شہابِ ثاقب گیا ہے، اُسے اُسی

سمت جانا چاہیے۔ اسے وہ خدا کا اشارہ سمجھا اور اُس نے اُٹھ کر بہانگِ بلند اعلان کیا۔ "خدا نے اشارہ دے دیا ہے۔ کل ہم انشاء اللہ پانی پر ہوں گے۔"

اُنہی تاریخ نویسوں نے لکھا ہے کہ اس صحرا میں کبھی پرندہ نظر نہیں آیا تھا۔ یہ رات گذری اور صبح طلوع ہوئی تو سلطان محمود کو اُوپر فضا میں پرندوں کی آوازیں سنائی دیں۔ اُس نے اُوپر دیکھا اور بے اختیار بولا۔ "یہ پانی کے پرندے ہیں"۔ وہ اس غول کو دیکھتا رہا۔ غول دُور جا کر نیچے چلا گیا۔ یہ وہی سمت تھی جدھر رات کو شہابِ ثاقب گیا تھا۔ سلطان نے اُس سمت کو کوچ کا حکم دے دیا۔

دوپہر کے کچھ دیر بعد جب فوج کا دم خم ٹوٹ چکا تھا اور کئی سپاہی ہذیانی حالت میں مبتلا ہو گئے تھے، پانی نظر آ گیا۔ یہ تھوڑا سا پانی نہیں تھا بلکہ وسیع جھیل تھی۔ گھوڑے پانی کی مُشک پا کر بے قابو ہو گئے اور دوڑ پڑے۔ انسان بھی بے قابو ہو گئے اور پانی پی کر وہ تازہ دم ہو گئے۔

*

ابھی ان کی آزمائش باقی تھی۔ فوج گائیڈ کے بغیر جا رہی تھی۔ اب رات کو ستارے اس کی راہنمائی کرتے تھے اور دن کو سورج۔ مؤرخوں میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ سلطان محمود نے کونسا راستہ اختیار کیا تھا۔ اکثر پنجند اور امرکوٹ کا نام لیتے ہیں لیکن یہ سب نے لکھا ہے کہ غزنی کی فوج کا واپسی کا سفر بڑا ہی اذیت ناک اور غیر یقینی تھا۔ بہت آگے جا کر ایک مقامی آدمی کو گائیڈ کے طور پر ساتھ لے لیا گیا۔ وہ فوج کو دریائے سندھ کے کنارے لے گیا۔ وہاں دریا کا پاٹ بہت چوڑا تھا۔

گائیڈ فوج کو دریا کے ساتھ ساتھ کسی اور سمت لے گیا اور رات آگئی۔ پڑاؤ کیا گیا۔ آدھی رات کے وقت فوج میں بھگدڑ مچ گئی۔ اس کے ساتھ عجیب سی چیخ نما آوازیں سنائی دینے لگیں۔ گھوڑے دوڑ رہے تھے۔ سلطان نے گائیڈ کو بلایا مگر گائیڈ لاپتہ تھا۔ تھوڑی دیر بعد پتہ چل گیا کہ کیمپ کے ایک حصے پر حملہ ہو گیا ہے۔ حملہ آوروں کے کچھ آدمی گرا لیے گئے تھے۔ اُن سے پتہ چلا کہ یہ علاقہ ہندو جاٹوں کا

ہے جو جنگجو ہیں اور لوٹ مار بھی کرتے ہیں اور ان کی باقاعدہ ریاست ہے۔ وہ خاصا نقصان کر گئے تھے۔

اس پھندے میں غزنی والوں کو وہ گائیڈ لے گیا تھا جو حملے سے پہلے غائب ہو گیا تھا۔ زخمی جاٹوں نے بتایا کہ اُن کے راجہ کو پتہ چل چکا تھا کہ غزنی کی فوج سومنات کو تباہ کر کے وہاں کا تمام خزانہ لا رہی ہے۔ یہ گائیڈ راجہ کا بھیجا ہوا تھا۔

دوسرے دن فوج نے کوچ کیا تو پچھلے حصے پر جاٹوں نے پھر حملہ کر دیا اور غائب ہو گئے۔ سلطان محمود نے فوج کو وہیں روک لیا اور زخمی جاٹوں سے جنہیں قیدی بنا کر ساتھ رکھ لیا گیا تھا پوچھا کہ ان کا دارالحکومت کہاں ہے۔ قیدیوں نے بتایا کہ وہاں جا کر سلطان پشیمان ہوگا۔ جاٹوں کا کوئی ایک ٹھکانہ نہیں۔

سلطان کے سالاروں نے اُسے مشورہ دیا کہ فوج جم کر لڑنے کے قابل نہیں۔ اس کے علاوہ اس دشمن اور اس علاقے سے ہمیں ذرا سی بھی واقفیت حاصل نہیں، اس کے خلاف لڑائی معلوم نہیں کیسا نقصان پہنچائے۔ زخمی قیدیوں پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ سلطان نے یہ مشورہ قبول کر لیا لیکن کئی جگہوں پر جاٹوں نے غزنی کی فوج پر کبھی رات کو کیمپ پر اور کبھی دن کو پچھلے حصے پر حملے کیے اور گھوڑے سرپٹ دوڑاتے غائب ہو گئے۔

جاٹوں نے غزنی کی فوج کا بہت نقصان کیا لیکن یہ نقصان جانی تھا۔ وہ سومنات کے خزانے تک نہ پہنچ سکے۔ سلطان محمود دانت پیستا رہ گیا۔ فوج کی نفری اور کم ہو گئی۔

*

یہاں ایک اختلاف اور ایک دلچسپ کہانی سنانا ضروری ہے۔ زیادہ تر مؤرخوں نے لکھا ہے کہ سلطان محمود نے راجہ دیو آسرم کو سومنات کا گورنر مقرر کیا تھا جس کے فرائض یہ تھے کہ یہاں سے مالیہ جمع کر کے اس کا کچھ حصہ غزنی بھیجا کرے، اور یہاں ہندو دوبارہ مندر تعمیر نہ کریں۔ عبادت کے لیے کہیں اور مندر کھڑا کر لیں، اور اس علاقے میں جو مسلمان رہتے ہیں انہیں ہندو پریشان نہ کریں۔ کوئی

ہندو کسی مسلمان پر ہاتھ اُٹھائے تو اُسے سزائے موت دی جائے۔

ایک روایت یہ ہے کہ سلطان محمود نے دیو آسرم کو نہیں بلکہ ایک مسلمان کو جس کا نام مٹھا خان تھا، گورنر مقرر کیا تھا۔ اس روایت کا خالق ایک انگریز مصنف میجر واٹسن ہے۔ یہ صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ مٹھا خان پنجابی نام ہے۔ یہ نام غزنی کا معلوم نہیں ہوتا۔

دلچسپ کہانی یہ ہے کہ سومنات کی تباہی کے بعد جب سلطان محمود غزنی چلا گیا تو تھوڑا ہی عرصہ بعد سومنات سے دُور ایک پنڈت مشہور ہو گیا۔ اُس نے اعلان کیا تھا کہ سلطان محمود نے شِودیو کا بُت توڑا نہیں بلکہ اُسے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ پنڈت نے لوگوں سے کہا کہ سلطان محمود بُت کو راستے میں کہیں زمین میں دفن کر گیا تھا۔ پنڈت کو خواب میں شِودیو نے بتایا ہے کہ اپنی گائے کے بچھڑے کو فلاں علاقے میں کھلا چھوڑ دو۔ وہ جہاں رُک کر زمین پر کھُر مارے وہاں سے زمین کھودو۔ وہاں شِودیو کا بُت دفن ہوگا۔ اُسے نکالو اور سومنات کے کھنڈروں میں وہیں جا کے رکھو جہاں سے اسے اٹھایا گیا تھا۔

پنڈت نے لوگوں کو ایک روز اکٹھا کر لیا اور اپنے بچھڑے کو ایک کھلے علاقے میں جا کر چھوڑ دیا۔ بچھڑا دوڑ پڑا اور ایک جگہ رُک کر زمین پر کھُر مارنے لگا۔

پنڈت نے لوگوں سے کہا کہ یہاں سے کھودو۔ لوگوں نے کھدائی کی تو وہاں سے شِودیو کا بُت نکلا۔ سیدھے سادے لوگوں نے شِودیو کی جے کے نعرے لگائے اور وہیں بُت کی پُوجا شروع کر دی۔ پنڈت مہاراج بن گیا۔

لوگوں نے فیصلہ کیا کہ بُت کو اُٹھا کر سومنات کے مندر میں رکھا جائے۔ چنانچہ بُت کو بڑی مشکل سے اٹھا کر سومنات لے جایا گیا۔ سومنات کے پنڈتوں کے سامنے بُت توڑا گیا تھا۔ انہوں نے بُت کو دیکھا تو اس پنڈت کو پکڑ کر راجہ دیو آسرم کے سامنے لے گئے۔ پنڈت نے تسلیم کر لیا کہ اُس نے کوئی ایک مہینہ صرف کر کے اپنے بچھڑے کو سدھایا تھا کہ اس جگہ پہنچ کر کھُر مارے۔ یہ بُت اُس نے دو آدمیوں کو ساتھ ملا کر تیار کیا تھا۔ اس بُت کو سمندر میں پھینک دیا گیا۔

سلطان محمود جب غزنی پہنچا تو شہر میں داخل ہونے سے پہلے اُس نے گھوڑے سے اُتر کر شکرانے کے دو نفل پڑھے۔ اُس نے خدا کا شکر فتح کا نہیں بلکہ خیریت سے غزنی پہنچ جانے کا ادا کیا تھا۔ وہ جس راستے سے آیا تھا اس کی صعوبتوں اور دیگر دشواریوں سے پہلے واقف نہیں تھا۔ وہ ۲ اپریل ۱۰۲۶ء (۱۰ صفر ۴۱۷ھ) غزنی پہنچا تھا۔

غزنی کی ساری آبادی اُمڈ کے باہر آ گئی تھی۔ عورتیں جنگی ترانے گا رہی تھیں اور دُور سے فوج کی بلائیں لے رہی تھیں۔ لوگ ناچ رہے تھے۔ لوگ رات کو بھی نہ سوئے۔ جُوں جُوں لوگوں کو پتہ چلتا جاتا تھا کہ اب کے کیا فتح حاصل کی گئی ہے اُن کی مسرّت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

رات کو سلطان محمود غزنوی غیر معمولی تھکان محسوس کر رہا تھا۔ تھکان تو وہ محسوس کیا ہی کرتا تھا لیکن اب وہ صاف طور پر محسوس کرنے لگا تھا کہ اُس کے اندر کوئی کمزوری پیدا ہو گئی ہے۔ ہر جنگی مہم کے بعد جب سلطان گھر آتا تھا تو اُس کا طبیب اُس کا پورا جسمانی معائنہ کرتا تھا۔ اب بھی رات کو طبیب آ گیا۔ اُس نے نبض پر ہاتھ رکھا، پھر دل پر ہاتھ رکھا اور سلطان سے بہت کچھ پوچھا۔ طبیب کے چہرے پر تشویش کے آثار آ گئے۔

"سلطانِ محترم!" طبیب نے کہا۔ "جتنی تشویش مجھے آپ کی صحت کے متعلق ہے، اتنی آپ کو بھی ہو تو آپ صحت یاب ہو سکتے ہیں۔ آپ بیمار ہیں سلطان! آپ کو کم از کم ایک سال کے آرام کی ضرورت ہے۔"

"کیا بیماری ہے مجھے؟" سلطان نے پوچھا۔ "کیا آپ کو معلوم نہیں کہ میں کہاں سے آ رہا ہوں اور کیا کر کے آ رہا ہوں اور میں نے کتنی کٹھن مسافت طے کی ہے؟ اسے آپ بیماری کہہ رہے ہیں؟"

"جی ہاں سلطانِ محترم!" طبیب نے کہا۔ "جو میں جانتا ہوں وہ آپ نہیں جانتے۔ جس طرح آپ گھوڑے اور اونٹ کے فرق کو جانتے ہیں اسی طرح میں تھکن اور بیماری کے فرق کو پہچانتا ہوں۔"

سلطان کی بیوی اور ایک بیٹی بھی وہاں موجود تھیں۔ انہوں نے گھبرا کر پوچھا کہ سلطان کو کیا بیماری ہے۔ طبیب نے انہیں ٹال دیا۔ سلطان نے انہیں کہا کہ وہ چلی جائیں، یہ صرف تھکن ہے۔

اُن کے جانے کے بعد سلطان نے طبیب سے پوچھا کہ اُسے کیا بیماری ہے۔

"آپ کے جسم میں بیماریوں کے خلاف قوّتِ مدافعت ختم ہو چکی ہے"۔ طبیب نے کہا۔ "میں آپ کو پہلے بھی خبردار کر چکا ہوں۔ کیا آپ محسوس نہیں کرتے کہ آپ کا سانس پھول جاتا ہے؟ ..... میں آپ کو ڈرانا نہیں چاہتا لیکن نہ بتانا بھی خطرناک ہے ..... آپ کو سل کا مرض لاحق ہو چکا ہے۔ ابھی ابتدا ہے۔"

"سل میرا کیا بگاڑ لے گا؟"

"سلطانِ عالی مقام!" طبیب شیخ الاسفند نے جواب دیا۔ "اسے آپ دیمک سمجھ لیں جس طرح دیمک لکڑی کو کھا جاتی ہے اسی طرح سل جسم کو اندر سے کھوکھلا کرتا رہتا ہے۔ اگر آپ طویل آرام کریں اور ذہن سے تفکّرات اور مسائل اُتار دیں تو میں اس مرض کو اسی مرحلے میں روک لوں گا۔ آپ کے اعصاب ختم ہو چکے ہیں۔"

"کیا آپ روحانی قوّت میں یقین رکھتے ہیں شیخ الاسفند؟"

"لیکن روح کب تک ساتھ دے گی؟" طبیب نے جواب دیا۔ "جب جسم روح کو اپنے اندر رکھنے کے قابل نہیں رہتا تو روح اس کی قید سے آزاد ہو جاتی ہے۔"

"میں نے ہندوستان کے یوگی دیکھے ہیں"۔ سلطان محمود نے کہا۔ "انہوں نے اپنے آپ میں ایسی قوتیں پیدا کر رکھی ہیں جو مافوق الفطرت لگتی ہیں لیکن وہ کہتے ہیں کہ ایسی قوت ہر انسان اپنے آپ میں پیدا کر سکتا ہے۔ کیا میں ایسی قوّت سے محروم ہوں؟"

"میں پھر بھی جسم کی بات کروں گا"۔ طبیب نے کہا۔ "اگر جسم کو سل کی دیمک

”میں نے سومنات اسی قوت کے بل بوتے پر فتح کیا ہے شیخ الاسفند!“۔ سلطان محمود نے کہا۔ ”مجھے یاد ہے، ہندوستان کی طرف کوچ سے پہلے آپ نے مجھے خبردار کیا تھا لیکن آپ میری نبض سے پتہ نہیں چلا سکے تھے کہ یہ بیماری اُس وقت بھی مجھے کھا رہی تھی۔ آپ نے مجھے اس کا نام بتا دیا ہے۔ میں اسے صرف بیماری کہتا تھا..... شیخ الاسفند! میں آپ سے ایک وعدہ لینا چاہتا ہوں۔ کسی کو پتہ نہ چلنے دیں کہ میں سل میں مبتلا ہوں۔“

”میں اسے سل کہہ رہا ہوں“۔ طبیب نے کہا۔ ”لیکن مجھے شک ہے کہ یہ انتڑیوں کا دق ہے۔ اگر آپ نے آرام اور پرہیز نہ کیا تو تھوڑے ہی عرصے بعد پتہ چل جائے گا کہ یہ سل ہے یا دق ہے“۔ طبیب نے التجا کے لہجے میں کہا۔ ”اس سے پہلے کہ یہ ظاہر ہو کہ یہ سل ہے یا دق آپ علاج، آرام اور پرہیز کی طرف توجہ دیں۔“

”میرے مرجانے سے کیا فرق پڑے گا؟“۔ سلطان نے کہا۔ ”میرے بیٹے اس قابل ہیں کہ سلطنتِ غزنی کو سنبھال لیں گے۔“

”اس خاندان میں سلطان بہت پیدا ہوں گے“۔ طبیب نے کہا ——
”آپ کے بیٹوں کے بیٹے بھی سلطان ہوں گے مگر ایک اور محمود پیدا نہیں ہوگا۔ کوئی بت شکن پیدا نہیں ہوگا۔ اللہ اور رسول ؐ کا نام تو سب لیں گے مگر ان ناموں پر اپنا آپ قربان کر دینے والا کوئی نہیں ہوگا۔ ہندوستان سے پتھروں کے خداؤں کے ٹکڑے غزنی کی مسجدوں کے آگے پھینکنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ میں آپ کو آپ کے لیے نہیں، آپ کے خاندان کے لیے نہیں، آپ کی سلطنت کے لیے نہیں، اسلام کے لیے اور عالمِ اسلام کی عظمت کے لیے کچھ عرصہ اور زندہ دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”زندگی اور موت آپ کے اختیار میں نہیں شیخ الاسفند!“۔ سلطان نے کہا —— ”مجھے دنیا میں ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ عالمِ اسلام کی طرف کچھ سانپ رینگتے چلے آرہے ہیں۔ مجھے ان کے سر کچلنے ہیں۔ مجھے ہندوستان کے ناگ کو مارنا ہے۔ وہ میری اتنی زیادہ ضربوں سے ابھی مرا نہیں۔ مجھے ہندوستان کے مسلمانوں

کو محفوظ کرنا ہے۔ مجھے سومنات جا کر معلوم ہوا کہ وہاں کے ساحلی علاقوں میں محمد بن قاسم کے وقتوں کے مسلمان رہتے ہیں۔ وہ سومنات کے مہاراجہ کے ظلم کا نشانہ بنے ہوئے تھے۔ اُن کی عظمت دیکھئے کہ وہ ابھی تک عربی زبان بولتے ہیں۔ مجھے سومنات پر حملے کی ترغیب دینے والوں میں یہ مسلمان بھی تھے۔ مجھے ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ میرا فرض ابھی پورا نہیں ہوا۔“

”اور اگر میں نے اپنا فرض پورا نہ کیا تو اسلام کے پاسبان اور علمبردار کا خون میری گردن پر ہوگا“۔ طبیب نے کہا۔ ”میں خدا کو کیا جواب دوں گا۔“

”خدا دیکھ رہا ہے“۔ سلطان نے کہا۔ ”خدا سُن رہا ہے۔ آپ نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔ آپ صرف یہ کرم کریں کہ کسی کو پتہ نہ چلنے دیں کہ میرے جسم کو ایسی دیمک لگ چکی ہے جو اسے تیزی سے کھا رہی ہے۔ اگر یہ خبر میرے دشمنوں تک پہنچ گئی تو وہ میری موت کے انتظار میں دبک کر بیٹھ جائیں گے اور اُس وقت اٹھیں گے جب میرا جنازہ اُٹھ جائے گا۔ شاید میرے بیٹے انہیں دبا نہ سکیں۔ کیا آپ دیکھ نہیں رہے کہ سلجوقی پھر سر اُٹھا رہے ہیں اور وہ سلطنتِ غزنی کے لیے کتنا بڑا خطرہ بن گئے ہیں؟“

”میں سب کچھ دیکھ رہا ہوں سلطان!“

”اور مجھے ہندوستان ایک بار پھر جانا ہے“۔ سلطان محمود نے طبیب کی سنی اَن سنی کرتے ہوئے کہا۔ ”میں جب سومنات سے واپس آ رہا تھا تو راستے میں ہندوؤں کی جاٹ قوم نے میری فوج کو بہت نقصان پہنچایا۔ میری فوج وہاں جم کر لڑ نہیں سکتی تھی لیکن جاٹ چھاپہ مار جنگ لڑ رہے تھے۔ میں نے اس قوم کے جنگی قیدیوں سے معلوم کیا ہے کہ یہ کیسی قوم ہے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ یہ سومنات کے شیودیو کی پجاری قوم ہے اور یہ بہت طاقتور ہے۔ اتنی طاقتور کہ کسی وقت اِردگرد کے مہاراجوں کو ختم کر دے گی اور یہ قوم مسلمانوں کی جانی دشمن ہے..... مجھے اس قوم کی سرکوبی کے لیے جانا ہے۔ اگر اس قوم کا دم خم نہ توڑا گیا تو سومنات کے شیودیو کا بُت کہیں اور کھڑا کر لیا جائے گا اور اس کے قدموں میں مسلمانوں کو ذبح کیا جائے گا۔“

"آپ آرام کر لیں" — طبیب نے کہا "میں دوائی دوں گا"

"دعا بھی دیں شیخ الاسفند!" — سلطان نے کہا "مجھے اب دعاؤں کی زیادہ ضرورت ہے۔"

*

طبیب چلا گیا تو سلطان کی بیوی اور بیٹی آ گئیں۔

"وہ کیا بتا گئے ہیں؟" — بیوی نے پوچھا "آپ نے انہیں باہر کیوں نکال دیا تھا؟"

"طبیب کہتا ہے آرام کرو" — سلطان نے کہا — "اور اپنے فرائض کو بھول جاؤ"

"تو اس کی کوئی وجہ ہوگی نا!" — بیٹی نے کہا۔

"کہتا ہے میرے جسم میں کچھ کمزوری پیدا ہو گئی ہے" — سلطان نے کہا۔

"آپ آرام کریں جیسے شیخ الاسفند کہہ گئے ہیں" — بیوی نے کہا "میری کوکھ سے جن بیٹوں نے جنم لیا ہے وہ آپ کے فرائض پورے کر دیں گے۔"

"وہ سلجوقیوں کو نہیں دبا سکیں گے" — سلطان نے کہا "وہ ہندوستان کے جاٹوں کا سر نہیں کچل سکیں گے۔ میں یہ دونوں کام کر کے مروں گا۔"

البیرونی نے لکھا ہے کہ سلطان محمود کا چہرہ بجھا ہوا تھا۔ اُس کی شوخی ماند پڑ گئی تھی۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ اندرونی کشمکش میں مبتلا ہے۔ طبیب اُسے آرام کے لیے کہہ گیا تھا لیکن سلطان نے اُسی وقت متعلقہ حکام کو بلایا اور انہیں احکام دینے لگا۔ احکام یہ تھے کہ کل وہ دیکھنا چاہتا ہے کہ سومنات کے بُت کا ایک ٹکڑا میرے دروازے کے آگے اور ایک ٹکڑا جامع مسجد کے دروازے کے آگے اس طرح رکھا ہوا ہے کہ اندر آنے اور جانے والوں کے پاؤں ان ٹکڑوں پر پڑتے ہیں۔ مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ کے ٹکڑے صبح ہوتے ہی خلیفہ کو روانہ کر دیئے جائیں۔

اگلے روز اُس کے محل اور مسجد کے آگے ٹکڑے زمین میں اس طرح رکھے گئے کہ اُوپر سے ننگے تھے۔ لوگ انہیں دیکھنے کے لیے جمع ہو گئے اور ان پر پاؤں

رکھ کر گذرنے لگے۔

سلطان محمود نے اگلے ہی روز ہندوستان پر ایک اور فوج کشی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اُس نے اُسی روز لاہور کے گورنر ایاز اور ملتان کے حاکم کے نام پیغام روانہ کر دیئے کہ وہ جاٹوں کے متعلق ہر ایک ضروری اطلاع فراہم کریں۔ ان کی تعداد، ان کا علاقہ، ان کے لڑنے کا طریقہ اور ہر وہ اطلاع جو کام آ سکے۔

سلطان کی فوج خاصی کم ہو گئی تھی۔ اُس نے نئی بھرتی کا حکم دے دیا اور ساتھ یہ حکم بھی دیا کہ چھاپہ ماروں کی تربیت اور مشقیں تیز کر دی جائیں اور ہر سپاہی کو چھاپہ مار جنگ کی اور گھوم پھر کر لڑنے کی تربیت دی جائے۔

سلطان محمود نے طبیب کی تشویش ناک باتوں کو ذہن سے اتار دیا تھا۔ اُس نے آرام کی پروا نہ کی۔ پرہیز کی طرف توجہ نہ دی اور فوج کی ٹریننگ اور سلطنت کے انتظامی کاموں میں مصروف ہو گیا۔

اور وقت بہت تیزی سے گذرتا گیا۔ تین چار ماہ بعد اُسے ملتان اور لاہور سے جاٹوں کے متعلق رپورٹیں ملنے لگیں۔ یہ قوم سندھ کے علاقے میں پھیلی ہوئی تھی۔ تعداد خاصی زیادہ تھی۔ ان کے لڑنے کے طریقوں میں ایک تو شبخون تھے اور دوسرا طریقہ دریائی جنگ تھا۔ وہ کشتیوں میں لڑتے تھے۔ دریائے سندھ نے بہت رُخ بدلے ہیں۔ اُس دور میں جاٹوں کے علاقے میں سندھ کا پاٹ اتنا چوڑا تھا کہ اس میں جزیرے بنے ہوتے تھے جن میں جنگل تھے۔ جاٹ ان جزیروں میں چلے جاتے تھے یا ان کی کچھ تعداد سندھ کے اُن دلدلی جنگلوں میں چلی جاتی تھی جنہیں انگریزوں کے دورِ حکومت میں حُرّوں نے انگریزوں کے خلاف استعمال کیا تھا۔

سلطان محمود کو لاہور اور ملتان سے تفصیلی اطلاعیں ملیں کہ جاٹ مسلمانوں کے لیے خصوصاً بہت بڑا خطرہ بن گئے ہیں اور وہ سومنات کی تباہی کا انتقام ہندوستان کے مسلمانوں سے لیں گے۔ اُس وقت سلطان محمود لاہور، ملتان اور بھیرہ (تقریباً آج کے تمام پنجاب کو) اپنی سلطنت میں شامل کر چکا تھا اور کشمیر سے قنوج تک

کے راجے مہاراجے اُس کے باجگزار تھے اس لیے کوئی خطرہ قبول نہیں کیا جاسکتا تھا۔ تاریخوں میں آیا ہے کہ سلطان محمود جاٹوں کو سزا دینا چاہتا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی سلطنت کے ہندوستانی علاقوں اور ہندوستان کے مسلمانوں کا تحفظ چاہتا تھا اور یہ بھی کہ سومنات کا مندر دوبارہ تعمیر نہ ہو اور ہندو اُس شِو دیو کو پھر سے زندہ نہ کر سکیں جس کے متعلق ہندوؤں کا باطل عقیدہ تھا کہ وہ انسانوں کو دوسرا جنم دیتا ہے۔

اگست، ستمبر ۱۰۲۶ء میں ملتان سے اطلاع گئی کہ جاٹ جنگی تیاریاں کر رہے ہیں۔ اس کا پس منظر یہ بیان کیا گیا کہ ملتان کا ایک مقامی مسلمان جو وہاں جاسوسی کرنے گیا تھا، پکڑا گیا تھا اور وہ کچھ دنوں بعد وہاں سے فرار بھی ہو آیا تھا۔ اُس پر نیم دیوانگی طاری تھی۔ وہ جاٹوں کے علاقے میں ایک بھٹکے ہوئے مسافر کے بھیس میں گیا اور اُس نے وہاں جاکر دلیری یا حماقت یہ کی کہ جاٹوں کے جزیروں کو قریب سے دیکھنے کے لیے چھوٹی سی ایک کشتی چُرائی مگر کشتی رانی نہیں جانتا تھا۔ وہ ساون کی موسلادھار بارشوں کا مہینہ تھا۔ دریا میں طغیانی تھی۔ چھوٹی سی کشتی کو دریا اپنے ساتھ ہی لے گیا، پھر کشتی اُلٹ گئی اور وہ تیرتا ہوا اس حالت میں ایک جزیرے سے جا لگا کہ خشکی پر پہنچتے ہی بے ہوش ہو گیا۔

ہوش میں آیا تو وہ جاٹوں کی ایک جھگی میں پڑا تھا اور دو عورتیں اُس کے قریب بیٹھی تھیں۔ ان میں ایک جوان تھی۔ اُس نے اس آدمی سے پوچھا کہ وہ کہاں کا رہنے والا ہے اور دریا میں کس طرح گر پڑا تھا۔ اُس نے غلط بیانی کی لیکن دو جاٹوں نے آکر اُس کے ساتھ باتیں کیں تو انہیں اس پر شک ہوا۔ اس کی حالت بہت بُری تھی۔ جاٹوں نے اُسے اٹھالیا اور کہا کہ اسے وہ دریا میں پھینک دیں گے۔ اس نے جان کے ڈر سے بتادیا کہ وہ مسلمان ہے، ملتان سے آیا ہے اور وہ جاسوس ہے۔ جاٹوں نے اُسے اور زیادہ پریشان کیا تو اُس نے بتادیا کہ غزنی کی فوج اُن پر حملہ کرنے اور انہیں ختم کرنے آرہی ہے۔ اُسے جو کچھ معلوم تھا وہ اُس نے بتادیا، لیکن جاٹ اُسے رہا نہیں کر رہے تھے۔

جاٹ اُس سے پوچھتے تھے کہ غزنی کی فوج کا لڑنے کا طریقہ کیا ہے۔ وہ بتاتا رہا اور ان پر اعتماد پیدا کرنے کے لیے اُن کا مشیر اور مُخبر بن گیا۔ وہ بڑا نڈر اور خوبصورت جوان تھا۔ وہ جوان عورت جو پہلے روز اُس نے اپنے پاس بیٹھی دیکھی تھی، اُس میں کچھ اور ہی دلچسپی لے رہی تھی۔ اس عورت نے ایک روز اسے بتایا کہ اس کا خاوند قبیلے کے سرداروں میں سے ہے اور بوڑھا ہے، اس لیے وہ یہاں سے بھاگنا چاہتی ہے۔ ملتان کے مسلمان جاسوس نے اُسے کہا کہ وہ یہاں سے نکلنے کا انتظام کرے تو وہ اُسے ملتان لے جائے گا جہاں وہ جنگلی عورت کی طرح نہیں رہے گی بلکہ اُسے رانی بنا کر رکھا جائے گا۔

اس عورت نے اُسے بتایا کہ اس سے پہلے بھی ایک جاسوس پکڑا گیا تھا جس سے جاٹوں نے معلوم کر لیا تھا کہ غزنی کی فوج ان پر حملہ کرنے آئے گی لیکن یہ معلوم کر کے بھی جاٹوں نے اُسے قتل کر دیا تھا۔ اُس روز سے جاٹ لڑائی کی کشتیاں تیار کر رہے تھے۔

ایک رات جب طغیانی ذرا کم تھی، یہ عورت جاسوس کے پاس آگئی اور اسے کہا کہ فوراً اٹھو۔ وہ اُٹھا۔ عورت اُسے دریا کے کنارے لے گئی اور اُسے ایک کشتی میں بٹھایا۔ خود بھی بیٹھی اور دونوں چپّو مارنے لگے۔ ابھی زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ دریا کے کنارے مشعلیں بھاگتی دوڑتی دکھائی دینے لگیں۔ جاٹ انہیں رُک جانے کو للکار رہے تھے۔ چاندنی میں انہیں کشتی نظر آرہی تھی۔ چار پانچ تیر آئے۔ عورت کی چیخ نکل گئی۔ ایک تیر اُس کے پہلو میں اُتر گیا تھا۔ جاسوس محفوظ رہا۔ وہ کشتی میں لیٹ گیا اور کشتی کو دریا کے حوالے کر دیا۔ اُسے سنائی دیتا رہا کہ کشتی میں تیر لگ رہے ہیں۔

جزیرہ چھوٹا تھا اور دریا تیز۔ کشتی جلدی خطرے سے نکل گئی۔ جاسوس نے چپّو مارنے شروع کیے۔ عورت مر چکی تھی۔ کشتی بہت دور جاکر کنارے سے لگی۔ جاسوس کا جسم شل ہو چکا تھا، مگر وہ کہیں گرا اور رُکا نہیں۔ وہ جب بہت دنوں بعد ملتان پہنچا تو اُس سے بولا بھی نہیں جاتا تھا۔ اُس نے جو کچھ جاٹوں کو بتایا تھا

اور جاٹوں کے متعلق اُسے جو کچھ پتہ چلا تھا، وہ اُس نے بتا دیا۔

جب یہ رپورٹ سلطان محمود کے پاس پہنچی تو اُس نے اپنے سالاروں سے مشورہ کر کے ملتان کے حاکم کو پیغام بھیجا کہ جس قدر جلدی ممکن ہو سکے کشتیوں کا ایک بیڑہ تیار کیا جائے۔ ہر کشتی بیس سپاہیوں کے لیے کافی ہو۔ سلطان محمود ایک بار دریائے جیحون میں خوارزم شاہ کی فوج کے خلاف کشتیوں کی جنگ لڑ چکا تھا۔ اس تجربے کے بعد اُس نے خاص قسم کی جنگی کشتیاں بنوائی تھیں۔ اب اس نے انہی کشتی سازوں اور چند ایک تجربہ کار ملاحوں کو ملتان بھیج دیا تاکہ وہ جنگی ضروریات کے مطابق کشتیاں تیار کر لیں۔

*

دسمبر ۱۰۲۷ء کے آخری ہفتے میں سلطان محمود کو ملتان سے اطلاع ملی کہ ایک ہزار کشتیاں تیار ہو چکی ہیں۔ دوسری اطلاع طویل تھی جو جاٹوں کی جنگی تیاریوں سے تعلق رکھتی تھی۔

سلطان محمود پر ایک الزام یہ عائد کیا جاتا ہے کہ وہ لوٹ مار کے لیے ہندوستان میں آتا تھا اور خزانے سمیٹ کر چلا جاتا تھا۔ اس الزام کی تردید میں اس جنگ کا ذکر ضروری ہے جو اس نے جاٹوں کے خلاف لڑی تھی۔ جاٹوں کی کوئی ریاست نہیں تھی اور ان کا کوئی خزانہ بھی نہیں تھا۔ یہ سلجوقیوں کی طرح جنگجو قوم تھی جو مذہب کے رشتے سے مہاراجوں کے کام کی جنگی طاقت بنتی جا رہی تھی۔ اس قوم کو رہزن اور ڈاکو کہا جائے تو زیادہ موزوں ہوگا۔ سلطان محمود کے دل میں جاٹوں کے خلاف یہ عداوت تھی کہ جاٹ شیو دیو کے پجاری تھے اور مسلمانوں کے بدترین دشمن۔ وہ مسلمانوں کو قتل و غارت سے ختم کرنا چاہتے تھے۔ لہٰذا سلطان کے عزم کے پس منظر میں ہندوستان میں اسلام کا احیا تھا۔

مارچ ۱۰۲۷ء (۴۱۸ھ) کے آخری دنوں میں سلطان محمود نے غزنی سے کوچ کیا۔ وہ جب ملتان پہنچا تو اُسے بتایا گیا کہ ایک ہزار چار سو کشتیاں تیار ہو چکی ہیں۔ سلطان نے آرام کیے بغیر کشتیوں کا معائنہ کیا۔ ایک کشتی میں خود بیٹھ کر دریا میں گیا۔ کشتی چلانے والوں کی مہارت دیکھی اور پھر ہر کشتی میں بیس بیس تیر انداز اور برچھی باز سپاہی بٹھا کر پورے بیڑے کو دریا میں اتارا اور کشتیوں کو تیزی سے گھمانے پھرانے کے احکام دیئے۔ اُس نے سپاہیوں کی پھرتی کا جائزہ لیا اور انہیں اکٹھا کر کے مزید ہدایات دیں۔

جس روز سلطان ملتان پہنچا، اُسی روز جاسوس جاٹوں کے علاقے میں بھیج دیئے گئے لیکن سلطان کی تیاریاں بھی پوشیدہ نہیں تھیں۔ ملتان میں اگر جاٹوں کے جاسوس نہیں تھے تو مسلمانوں کے دشمن موجود تھے۔ بعد کی اطلاعوں کے مطابق جاٹوں کو سلطان کی تیاری اور کوچ کا پتہ چل گیا تھا۔ اس کی پہلی تصدیق جاسوسوں نے واپس آ کر کر دی۔ انہوں نے بتایا کہ جاٹوں نے کم و بیش چار ہزار کشتیاں تیار کر لی ہیں اور وہ دریائی جنگ لڑیں گے۔ یا غالباً ان کا منصوبہ یہ تھا کہ غزنی والے کشتیوں پر آ رہے ہیں اور یہاں خشکی پر لڑیں گے اس لیے انہوں نے غزنی والوں کو دریا میں ہی روک لینے اور دریا میں ڈبو دینے کا انتظام کیا تھا۔

جاسوسوں نے یہ بھی بتایا کہ تمام جاٹ اپنی عورتوں اور بچوں کو ساتھ لے کر دریا کے جزیروں میں چلے گئے ہیں۔ خشکی پر یعنی جزیروں کے سوا اور کہیں کوئی جاٹ نہیں ملے گا۔ ان اطلاعوں کے مطابق سلطان محمود نے دریائی جنگ کی تیاری مکمل کر لی اور اپنے سالاروں کو اُس نے بتا دیا کہ اب کچھ بھی ہو جائے، دریا میں ہی لڑا جائے گا۔

جو تاریخیں ہندوستان میں لکھی گئی ہیں، ان میں اس جنگ کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی۔ بعض غیر ہندوستانی مسلمان مصنفوں نے بھی اس کا ذکر سرسری سا کیا ہے لیکن وقائع نگاروں اور گہری تحقیق کرنے والوں کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ جنگ غزنی والوں کی کلاسیکی بحری جنگ تھی جس میں سلطان محمود اور اس کے سالاروں نے بے مثال جنگی بصیرت کا مظاہرہ کیا۔

وہ مقام کسی نے بھی نہیں لکھا جہاں یہ لڑائی لڑی گئی تھی۔ ایک انگریز جان برگس نے جس نے محمد قاسم فرشتہ کی کتابوں کا ترجمہ انگریزی میں کیا ہے، حاشیے

میں لکھا ہے کہ یہ اتفاق کی بات ہے کہ سلطان محمود نے اس مقام پر یہ جنگ لڑی جہاں تیرہ صدیاں پہلے سکندر اعظم نے کشتیوں کا بیڑہ تیار کر کے دریا میں اتارا تھا۔ نقشے پر دیکھیں۔ ملتان دریائے چناب کے کنارے پر ہے۔ وہاں دریائے جہلم، راوی اور چناب ایک دریا بن جاتے ہیں۔ آگے جا کر دریائے ستلج بھی اس میں مل جاتا ہے اور کچھ اور آگے، اُدھر سے بھی آگے یہ دریائے سندھ میں مل جاتے ہیں۔ وہاں پنجاب کے تمام دریا مل کر دریائے سندھ بن جاتے ہیں۔ آگے جا کر دو چھوٹے دریا بھی دریائے سندھ میں گرتے ہیں۔ اُس دَور میں کسی بھی دریا سے نہریں نہیں نکالی گئی تھیں، نہ کسی دریا پر کوئی ڈیم یا بیراج تھا۔ تمام تر پانی بلا روک ٹوک بہتا تھا۔ تصور کیا جا سکتا ہے کہ اتنے سارے دریا مل کر جب دریائے سندھ بنتے تھے تو اُس دَور میں یہ دریا چھوٹا سمندر بن جاتا ہوگا۔ پاٹ بہت چوڑا تھا اس لیے دریا کے درمیان میں جنگلاتی جزیرے بن گئے تھے۔ بعض جزیرے خاصے وسیع تھے۔

*

تاریخ دان اُس تاریخ کے متعلق خاموش ہیں جس دن یہ لڑائی شروع ہوئی تھی۔ سلطان محمود کا چودہ سو کشتیوں کا بیڑہ ملتان سے روانہ ہُوا۔ فرشتہ نے لکھا ہے کہ غزنی والوں کی کشتیاں مضبوط تھیں اور اُن کے اطراف میں، سامنے اور پیچھے برچھیوں کی انیوں کی طرح لوہے کی بڑی بڑی نوکدار انیاں لگا دی گئی تھیں تاکہ دشمن کی کشتیاں ان سے ٹکرائیں تو ٹوٹ جائیں اور دشمن کے آدمی دریا میں اُتر کر کسی کشتی میں سوار نہ ہو سکیں۔ اس اہتمام کے علاوہ سلطان محمود نے پہلی بار آگ پھینکنے کا انتظام کیا تھا۔ جان برگس نے انہیں ہینڈ گرنیڈ کہا ہے لیکن فرشتہ نے انہیں آتش گیر سیال کے ڈبے یا مٹی کے چھوٹے چھوٹے برتن کہا ہے۔

غزنی والوں کا بیڑہ دریا کے بہاؤ کے ساتھ بہتا گیا۔ کشتیوں کو ایک دوسری سے دُور دُور رکھا گیا۔ سلطان محمود کی کشتی درمیان تھی۔ اس کے ساتھ تین کشتیاں قاصدوں کی تھیں جن کے چپو زیادہ تھے۔

پنج ند سے آگے گئے تو جاٹوں کی کشتیاں نظر آنے لگیں۔ وہ نیم دائرے میں تھیں

اور اگلی کشتیوں کے پیچھے ایسے لگتا تھا جیسے وہاں دریا نہیں، کشتیوں کا جنگل ہے۔ سلطان محمود نے آگے پیچھے آنے والی کشتیوں کو ایک صف میں کر کے دریا کی چوڑائی میں کر لیا تاکہ جاٹوں کا نیم دائرہ گھیرے کی صورت اختیار نہ کر سکے۔ پہلے تیر جاٹوں کی طرف سے آئے۔ سلطان نے اپنی درمیان والی کشتیوں کو بھی دائیں اور بائیں ہو جانے اور جاٹوں کے پہلوؤں پر تیر برسانے کا حکم دیا۔ چونکہ غزنی والوں کی کشتیاں بہاؤ کے رُخ جا رہی تھیں اس لیے اُن کی رفتار تیز تھی اور ملاحوں کو چپو مارنے کی ضرورت نہیں تھی۔

قریب جا کر سلطان محمود نے تیر چلانے کا حکم دیا۔ تیر جاٹوں کی پہلوؤں یعنی کناروں والی کشتیوں پر چلائے جا رہے تھے۔ جاٹوں کے تیر مہلک تھے۔ ان کی پچھلی کشتیوں سے بھی تیر آ رہے تھے۔ غزنی والوں کی کشتیاں جاٹوں کے پہلوؤں پر چلی گئیں۔ پیچھے جو کشتیاں آ رہی تھیں، انہیں جاٹوں کے درمیان چلے جانے کو کہا گیا۔ اللہ اکبر کے نعرے گرجنے لگے اور جاٹ اپنی مخصوص آوازیں گیدڑوں کی آوازیں نکال رہے تھے۔ وہ دلیر لڑاکے تھے۔

تھوڑی دیر بعد دونوں طرف کی کشتیاں ایک دوسری میں گڈمڈ ہو گئیں۔ مسلمانوں نے جاٹوں کی کشتیوں پر آگ پھینکنی شروع کر دی۔ جاٹوں نے اس قدر دلیری کا مظاہرہ کیا کہ وہ جلتی ہوئی کشتیوں سے کود کر دریا میں اترے اور مسلمانوں کی کشتیوں پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگے، لیکن مسلمانوں کی کشتیوں کے کناروں پر جو انیاں لگی ہوئی تھی، وہ انہیں بری طرح زخمی کر رہی تھیں۔ اوپر سے مسلمانوں کی برچھیاں انہیں ختم کر رہی تھیں، لیکن جاٹوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اُن کی چار ہزار کشتیوں میں سلطان محمود کی ایک ہزار چار سو کشتیاں نظر نہیں آتی تھیں۔

مسلمانوں کو کشتیاں الٹنے کی ٹریننگ دی گئی تھی۔ ایک خاص زاویے سے کشتی کو کشتی سے ٹکر ماری جاتی تھی۔ اس طرح مسلمانوں نے جاٹوں کی کئی کشتیاں اُلٹ دیں لیکن جاٹ پانی کے کیڑے معلوم ہوتے تھے۔ وہ دریا میں کود جاتے اور مسلمانوں کی کشتیوں پر سوار ہونے کی کوشش کرتے تھے۔ مسلمانوں کا بھی نقصان ہو

رہا تھا۔ انہیں اس لحاظ سے برتری حاصل تھی کہ ان کے پاس کشتیوں کو جلانے کا انتظام بھی تھا۔

جاٹوں نے ایک چال اور چلی۔ پیچھے کی کشتیوں میں جو جاٹ سوار تھے، وہ کشتیاں کناروں پر لے گئے اور خشکی پر چلے گئے۔ یوں پتہ چلتا تھا جیسے بھاگ گئے ہوں لیکن خشکی پر چھپتے چھپاتے غزنی والوں کے قریب کنارے سے اُن پر تیر اور برچھیاں برسانا چاہتے تھے لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ سلطان محمود نے یہ انتظام بھی کیا تھا کہ کناروں سے دُور جاٹوں کی نظروں سے اوجھل اپنی فوج کے دستے رکھے ہوئے تھے۔ یہاں تک یہ کشتیوں میں ہی آئے تھے۔ رات کو انہیں اُتار کر خشکی پر بھیج دیا گیا تھا۔ وہ کناروں سے دُور چلے گئے تھے۔ جاٹ سلطان کے اس اہتمام سے واقف نہیں تھے۔ جو جاٹ خشکی سے غزنی کی کشتیوں پر تیر چلانے گئے تھے وہ دوبارہ نظر نہ آئے۔ انہیں خشکی میں چھپے ہوئے غزنوی مجاہدوں نے تیروں سے ختم کر دیا۔ پھر جو جاٹ کنارے پر جاتا تھا، وہ زندہ واپس نہیں آتا تھا۔ سلطان محمود نے خشکی پر اپنی حفاظت کا یہ انتظام اتنا خفیہ رکھا تھا کہ جاٹ اس سے قبل از وقت باخبر نہ ہو سکے۔

جاٹوں کو سب سے زیادہ نقصان غزنی والوں کے آگ کے گولوں نے (یا جس طریقے سے بھی آگ پھینکی جاتی تھی) بہت نقصان پہنچایا۔ غزنی کے ملاح اپنی کشتیوں کو جاٹوں کی کشتیوں کی طرف کر کے اُن کشتیوں کی طرف دھکیلتے تھے جو جل رہی ہوتی تھیں۔ کوئی انسان جل کر مرنا نہیں چاہتا۔ جاٹ جلتی کشتی سے دریا میں کود جاتے تھے تو مسلمان تیر انداز انہیں اُبھرنے نہیں دیتے تھے۔ لاشیں تیر تیر کر ڈوب رہی تھیں۔ جاٹ ملاحوں نے کشتیاں بہاؤ پر ڈال دی تھیں اور مسلمان اُن کا تعاقب کر رہے تھے۔ کناروں پر بھی اُن کا قتلِ عام ہو رہا تھا۔

دریائے سندھ کا پانی لال ہو گیا تھا۔ زخمی ڈوب رہے تھے۔ سلطان کی یہ چال جاٹوں کے لیے بہت مہلک ثابت ہوئی کہ سلطان نے اپنے ملاحوں سے کہا کہ وہ کشتیاں کناروں کے ساتھ رکھیں۔ اس طرح جاٹ بکھر کر لڑنے کی بجائے درمیان میں اکٹھے ہو گئے۔

کچھ ہی دیر بعد جاٹوں کی جارحیت ختم ہو گئی۔ انہیں طریقے سے لڑانے والا کوئی نہ تھا۔ انہوں نے کشتیوں سے کودنا اور تیر کر خشکی پر جانا شروع کر دیا مگر وہاں موت اُن کی منتظر تھی۔ کشتیاں لڑتے لڑتے کسی جزیرے کے قریب سے گذرتی تھیں تو غزنی کے سپاہی آگ جزیرے پر بھی پھینک دیتے تھے۔ اس طرح دو ایسے بڑے جزیروں کے ایک دو جھونپڑوں کو آگ لگ گئی جن میں جاٹوں کے بیوی بچے تھے۔ جھونپڑوں نے جنگل میں آگ لگا دی۔ جاٹوں کے اوسان خطا ہو گئے۔ ان کے لیے اب دریا میں بھی آگ تھی اور جزیروں میں بھی آگ۔

چند گھنٹوں میں یہ معرکہ ختم ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی جاٹ بھی ختم ہو گئے۔ اس کے بعد سلطان محمود نے خود جزیروں میں اُتر کر دیکھا۔ کوئی بھی جوان یا نوجوان جاٹ کہیں چھپا ہوا نظر آیا اُسے پکڑ کر کشتی میں ڈال لیا گیا۔ پیچھے عورتیں اور بچے رہ گئے۔ جن جزیروں میں آگ لگی تھی وہاں سے عورتیں اور بچے بھاگے اور دریا میں کود گئے۔ انہیں بچانے والا کوئی نہ تھا۔ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی نسل ہی ختم ہو گئی۔ زندہ بچ رہنے والی عورتیں اِدھر اُدھر بکھر گئیں۔ اس کے بعد کسی نے نہ سنا کہ جاٹ بھی کوئی قوم ہُوا کرتی تھی۔

*

سلطان محمود جولائی ۱۰۲۷ء کے آخری دنوں میں واپس غزنی پہنچا۔ اُس طبیب نے اُسے دیکھا تو وہ بہت پریشان ہُوا۔ سلطان کے چہرے پر اب کمزوری اور بیماری کے آثار تھے۔ سبطِ ابن الجوزی اور گردیزی نے لکھا ہے کہ سلطان جب جاٹوں کی سرکوبی کے لیے گیا تو جزیروں کے جنگل میں اُسے ایسے مچھروں نے کاٹا ہو گا جو ملیریا کے جراثیم کے حامل تھے۔ ان سے اُسے ملیریا ہو گیا۔ چونکہ سلطان بیماری کی پرواہ نہیں کیا کرتا تھا اس لیے اس نے اُن طبیبوں کو جو اُس کے ساتھ گئے تھے، نہ بتایا کہ اُسے کوئی تکلیف ہے۔ یہ ملیریا بگڑ کر نمایاں طور پر دق کا مرض بن گیا، یا یہ کہا جا سکتا ہے کہ سل یا دق کا جو عارضہ اُسے لاحق ہو چکا تھا وہ ملیریا کے بخار سے نمایاں ہو گیا۔ دوسرے مؤرخوں نے اسے انتڑیوں کا دق لکھا ہے۔

یہ جو کچھ بھی تھا اس کا باعث یہ تھا کہ سلطان کی ۵۹ سالہ زندگی کے چالیس سال

میدانِ جنگ میں یا کوچ میں یا پڑاؤ میں گزرتے تھے۔ اُس نے ۳۲ سال حکومت کی تھی۔ وہ جب اپنے گھر میں ہوتا تھا تو اُس کے ذہن اور اعصاب پر سوچوں کا بوجھ پڑا رہتا تھا۔

"سلطان نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں کسی کو نہیں بتاؤں گا کہ سلطان ایک مہلک مرض میں مبتلا ہو چکا ہے" ــــ ایک روز سلطان کے طبیب شیخ الاسعد نے سالار ابو عبداللہ محمد الطائی، ارسلان جاذب، ابوالحسن اور وزیر سے کہا ــ "لیکن میں یہ راز آپ سے مزید پوشیدہ نہیں رکھ سکتا۔ سلطان محمود اپنی بیوی اور اپنی اولاد کا مسئلہ نہیں۔ وہ ملّتِ اسلامیہ کا گوہرِ نایاب ہے۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ محمد بن قاسم کے کتنے سو سال بعد غزنی نے دوسرا محمد بن قاسم پیدا کیا مگر اُس وقت تک ہندوستان بُت خانہ بن چکا تھا اور محمد بن قاسم کی جلائی ہوئی شمعِ رسالتؐ ٹمٹمانے لگی تھی۔ اس کا نور سمٹ گیا تھا۔ اب محمود ہاتھ سے جا رہا ہے۔ پھر کون جانے کب کوئی اور قاسم اور کب کوئی اور محمود اُٹھے۔ اُس وقت تک ہند کے بُت خانے اور بُت خانے پھر آباد ہو چکے ہوں گے اور اسلام پر کفر کا خوف و ہراس طاری ہو چکا ہو گا۔"

"کیا ہو گیا ہے سلطان کو؟" ــــ وزیر نے پوچھا۔

"دِق ..... سِل ہے" طبیب نے کہا ــ "میں نے تشخیص اب نہیں کی۔ وہ کئی سالوں سے اس مرض کو اپنے اندر پال رہا ہے۔ ہمارے سلطان نے بڑے بڑے طاقتور دشمنوں کو ہی شکست نہیں دی۔ وہ موت کو بھی شکست دیتا چلا آ رہا ہے۔ وہ جتنے عرصے سے جس مرض کا مریض ہے، کوئی اور ہوتا تو کئی سال پہلے مر چکا ہوتا۔ اُس کا اعصابی نظام پہلے ہی تباہ ہو چکا تھا۔ جسم بیماریوں کے خلاف قوّتِ مدافعت کھو بیٹھا تھا۔ وہ روحانی قوت سے لڑتا رہا ہے۔ سلطان نے ثابت کر دیا ہے کہ ارادہ مضبوط اور عزم بلند ہو، نیّت اور مقصد میں عظمت ہو تو روح کی قوّتیں بیدار ہو جاتی ہیں اور جسم کی کوئی اہمیّت نہیں رہتی۔ سلطان ان خداداد قوّتوں کے بل بوتے پر زندہ ہے۔ کیا آپ لوگ سلطان کو قائل کر سکتے ہیں کہ وہ اب ہر طرف سے توجہ ہٹا لیں اور صرف علاج پر توجہ مرکوز کریں؟ ..... یہ سلطان کے خاندان پر نہیں، عالمِ اسلام پر احسان

ہو گا۔ یہ ہندوستان کے مسلمانوں پر احسان ہو گا جنہوں نے صدیوں بعد فخر سے سر اُٹھایا ہے اور انہیں ہندوستان میں کھویا ہوا وقار مل رہا ہے۔ سلطان اب اس حالت کو پہنچ گیا ہے کہ اسے بستر سے اُٹھنا نہیں چاہیئے۔"

سلطان محمود بستر کا قیدی نہ رہ سکا۔ اُس کا وزیر اور اُس کے سالار اُس کے ماتحت صرف حاکم نہیں تھے بلکہ اُس کے دوست تھے، اُس کے رازداں تھے، اُس کے لنگوٹیے یار تھے۔ انہوں نے شانہ بشانہ تاریخ بنائی تھی۔ موت کو آنکھیں دکھائی تھیں۔ بڑے بڑے لمبے کوچ کیے تھے مگر بیماری کی بات ہوئی تو سلطان اُن کا قائل نہ ہوا۔ اُس نے سب کو ہنس کر ٹال دیا۔ اُس نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ جو قوت مجھ میں ہے وہ تم میں بھی ہے۔ اسے بیدار کرو۔ عزم اور مقصد کو بلند رکھو۔ حکم صرف خدا سے لو۔ قرآن کو مشعلِ راہ بناؤ۔ روحانی قوتیں بیدار ہو جائیں گی۔

اُس کے گھر والے اور اس کے حکام جب اُس کی صحت کے متعلق تشویش میں تھے اُس وقت سلطان ایک اور جنگی مہم پر روانہ ہو گیا۔ یہ سلجوقیوں کے خلاف تھی۔ سلطان کی غیر حاضری میں سلجوقی ہندوستان کے جاٹوں کی طرح ایک قوّت بن گئے اور سلطنتِ غزنی کو بھی للکارنے لگے تھے۔ ان کے خلاف اُس نے آخری جنگ لڑی اور ان کا دم خم توڑ کر اصفہان اور رے کو اپنی سلطنت میں لے لیا اور اپنے بیٹے مسعود کو وہاں کا امیر مقرر کر دیا۔

وہ آب و ہوا کی تبدیلی کے لیے بلخ چلا گیا مگر آرام نہ کیا۔ اپنی تمام سلطنت کے دورے کرتا رہا، سلطنت کے امور اور مسائل نے الجھا رہا۔ اُس نے ۱۰۲۹ء کا موسم گرما اور سرما بلخ میں گزارا مگر وہاں کی آب و ہوا اُسے نہ آئی۔ راس آ بھی نہیں سکتی تھی۔ اب دنیا کی آب و ہوا اُس کے لیے نہیں رہی تھی۔ اُس نے غزنی چلے جانے کا فیصلہ کیا۔

سلطان ۲۰ اپریل ۱۰۳۰ء کے روز غزنی آیا۔ آتے ہی اُس پر نیم غشی طاری ہو گئی۔

طبیب نے دیکھا تو اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اُس نے سلطان کے کان میں کہا — "کچھ کہیے سلطان!" — سلطان نے اپنا ایک ہاتھ اُٹھایا مگر ہاتھ سینے پر گر پڑا۔ اُس کی بیوی نے بلایا۔ بیٹوں نے بلایا۔ سلطان کی صرف سانسیں چل رہی تھیں۔

اُس کے پاس قرآن خواں بٹھا دیا گیا جو خوش الحان تھا۔ جب قرآن کی آواز سلطان کے کانوں میں پڑنے لگی تو اُس کے چہرے پر مسکراہٹ اور آخری وقت کی سفیدی کم ہو گئی۔ کسی کسی آیت پر اُس کا جسم تھرکتا تھا جس سے پتہ چلتا تھا کہ وہ سُن رہا ہے، سمجھ رہا ہے مگر بڑے بڑے دہشت ناک دشمنوں کو گھٹنوں بٹھا دینے والا، پتھر کے "خداؤں" کو ریزہ ریزہ کر دینے والا اب بول نہیں سکتا تھا، ہل نہیں سکتا تھا۔

۳۰ اپریل ۱۰۳۰ء (۲۳ ربیع الثانی ۴۲۱ھ) بروز جمعرات شام پانچ بجے سلطان محمود کے ہونٹوں پر تبسم دیکھا گیا اور اس کے ساتھ ہی اُس نے آخری سانس لیا اور دنیا سے سرخروئی کا تبسم لیے رخصت ہو گیا۔

طبیب دھاڑ مار کر رو دیا اور بآنگِ بلند کہا — "اِس شخص نے موت سے بھی ہتھیار ڈلوا لیے تھے!"

تاریخِ اسلام کے بُت شکن اور ہندوستان میں احیائے اسلام کے علمبردار کو اُسی رات عشاء کی نماز کے بعد مشعلوں کی روشنی میں فیروزی باغ میں دفن کر دیا گیا۔ وہ زندہ تھا تو یہ باغ اُسے بہت پسند تھا۔ ذراستانے کے لیے اسی باغ میں بیٹھا کرتا تھا۔

اُس کے بیٹوں نے مقبرہ تعمیر کرایا۔ اس مقبرے کے ساتھ بہت بے انصافیاں اور زیادتیاں ہوئیں۔ لوگ عقیدت سے مقبرے پر جاتے تھے اور قبر سے مٹی اور دروازوں سے لکڑی کے ٹکڑے برکت کے طور پر تراش کر لے آتے تھے۔ سب سے بڑا ظلم ایک انگریز لارڈ ایلنبرو نے کیا کہ مقبرے کا بڑا دروازہ اکھاڑ کر اس غلط فہمی میں ہندوستان لے گیا کہ یہ سومنات کے مندر کا دروازہ تھا جو سلطان محمود اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ یہ مقبرہ اب اُجڑے ہوئے ایک خاموش کھنڈر کی طرح غزنی سے ڈیڑھ میل دُور کھڑا ہے۔

اگر مقبرے کا نشان مٹ جائے تو بھی سلطان محمود غزنوی زندہ و پائندہ رہے گا۔ محمود ایک روایت کا نام ہے۔ اُنہی سومنات کے شِو دیو کے وہ ٹکڑے زندہ رکھے ہوئے ہیں جو آج بھی غزنی میں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں پڑے ہوئے ہیں اور مسلمان ان پر پاؤں رکھ کر گزرتے ہیں۔